تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲-۱۸۹۰ء)

تصحیح وتنقیح ونظرثانی

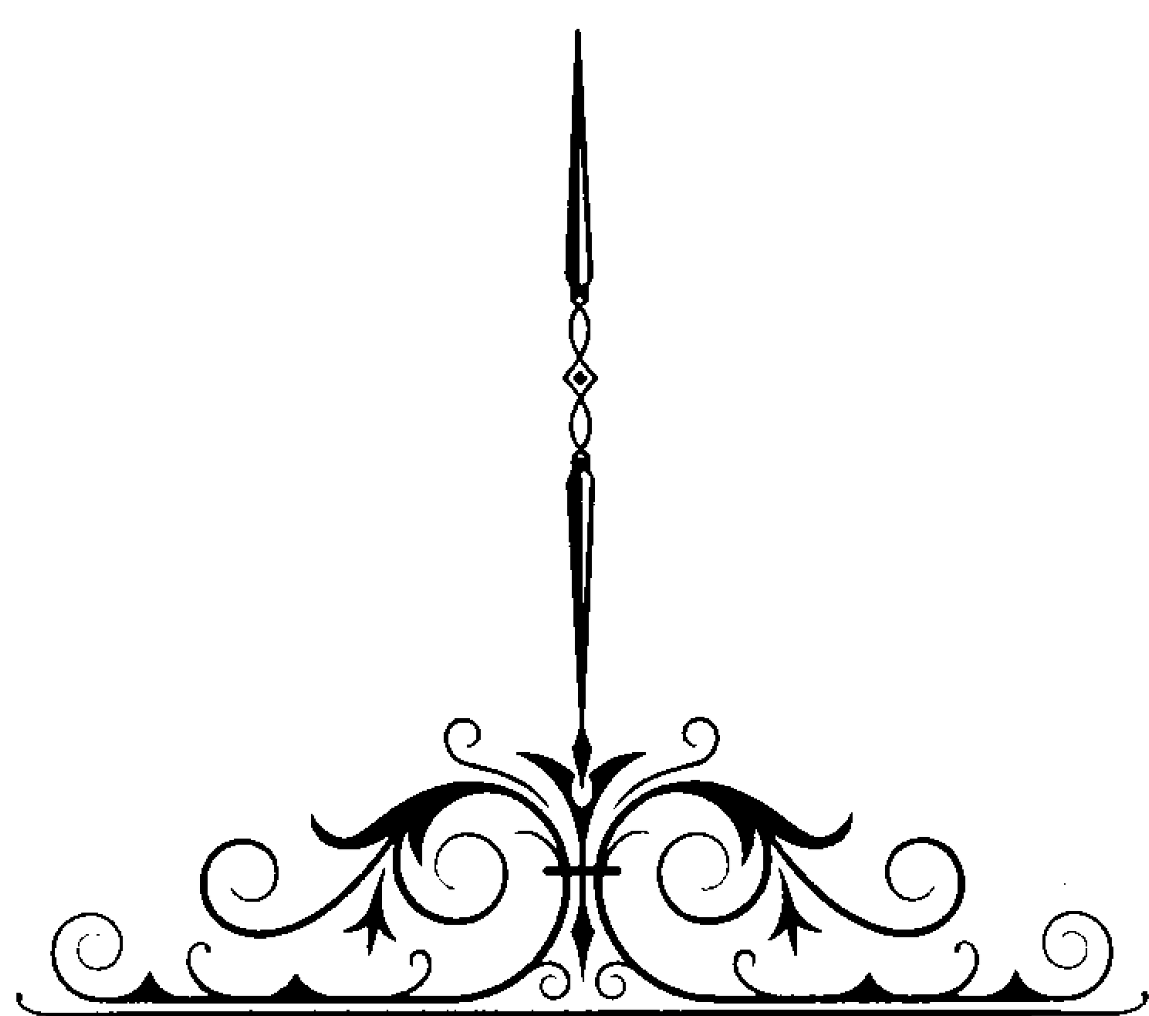
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف | حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل: محمد یحیٰی قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد سوم

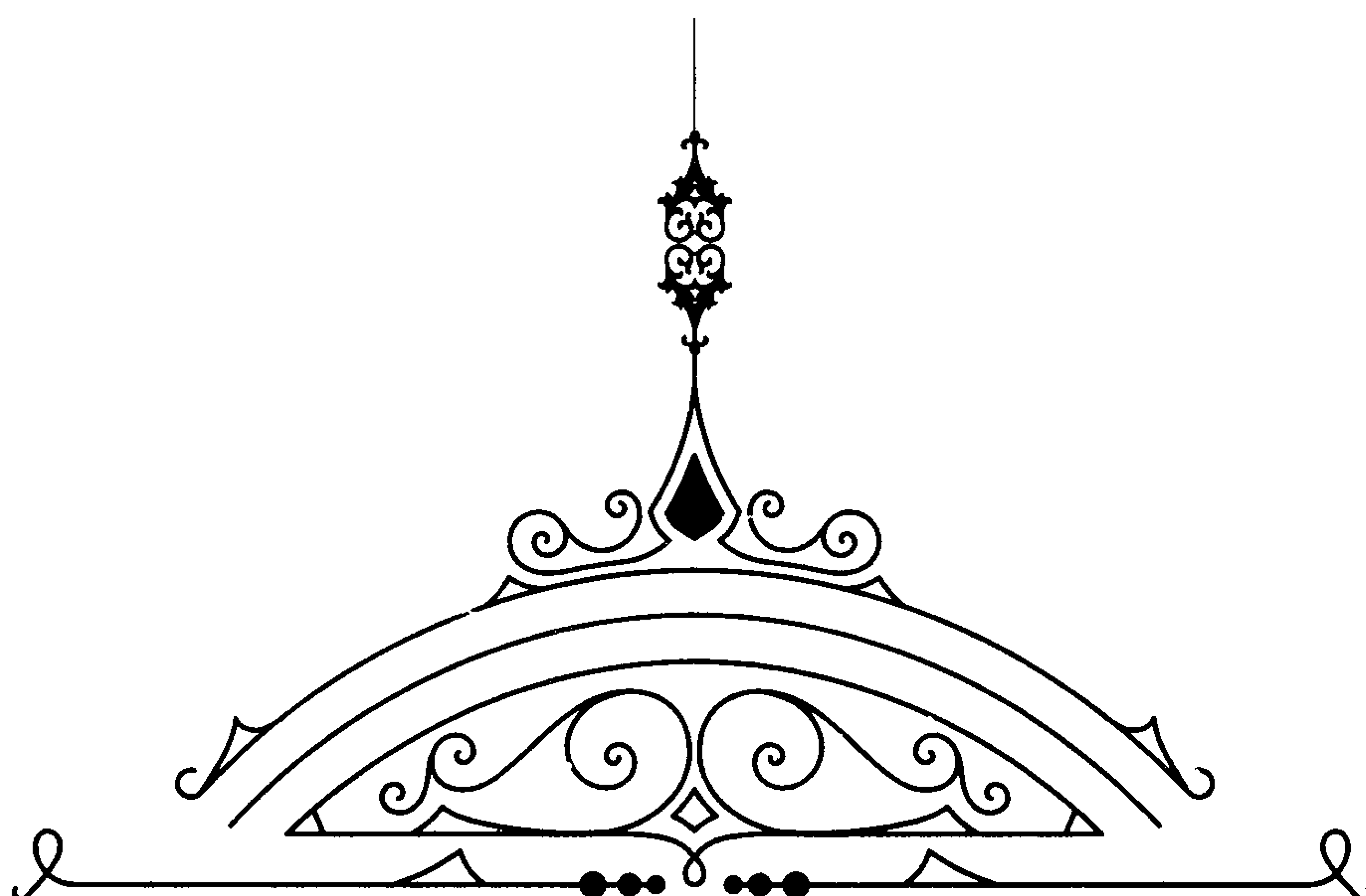
دار ابی الطیب للنشر والتوزیع

مکتبہ قدوسیہ

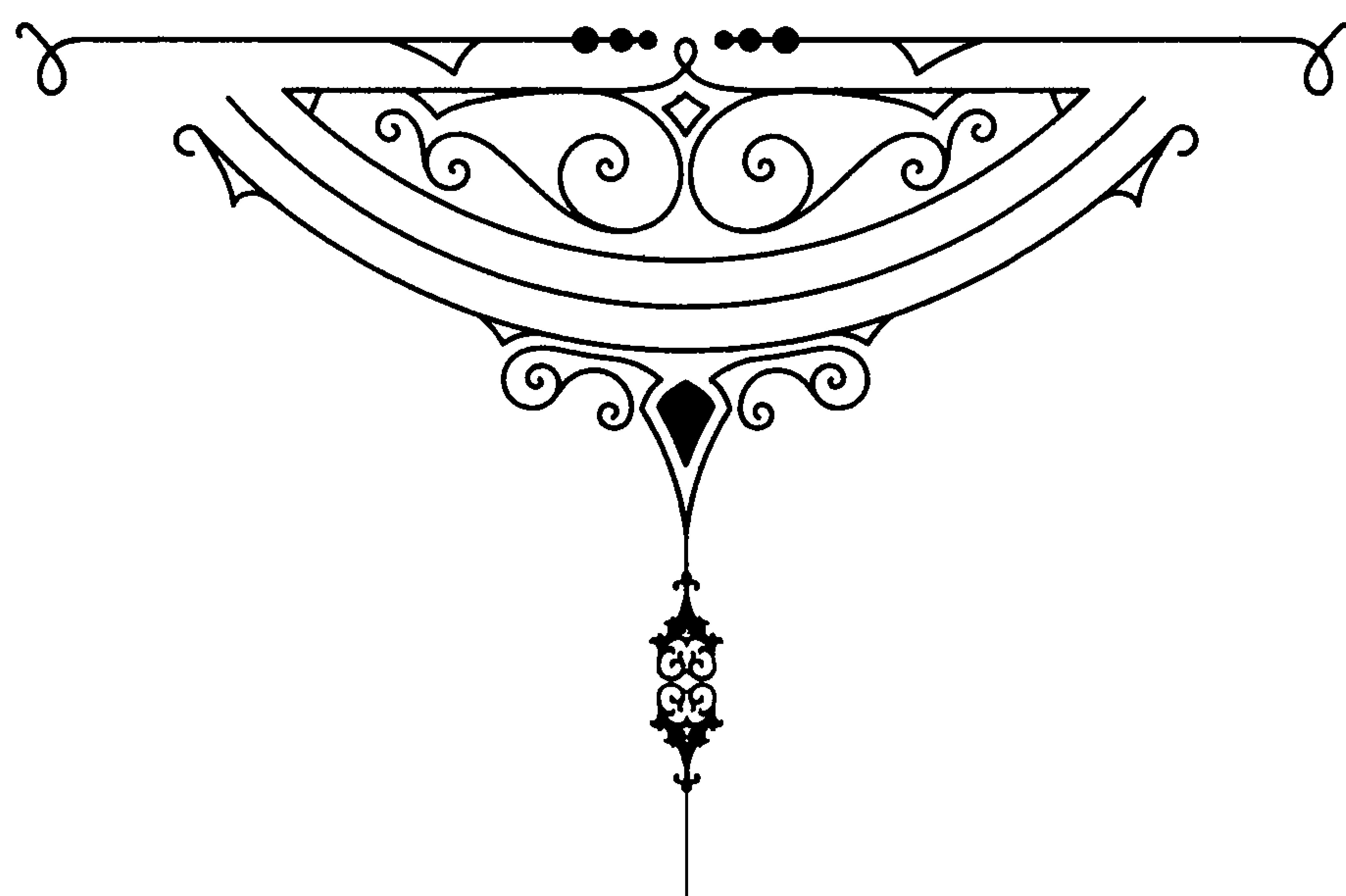


تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان



بسم الله الرحمن الرحيم





نام کتاب: ________ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ________ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

قیمت: ________

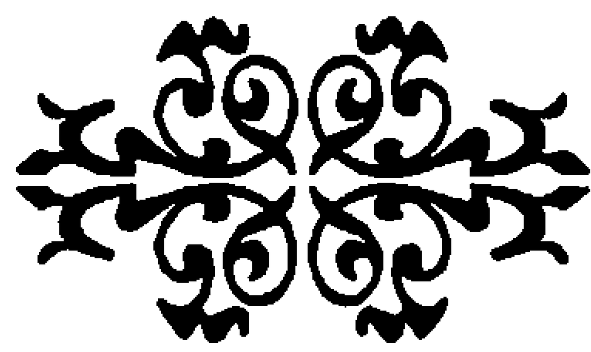
طبع اول: ________ جنوری 2019ء



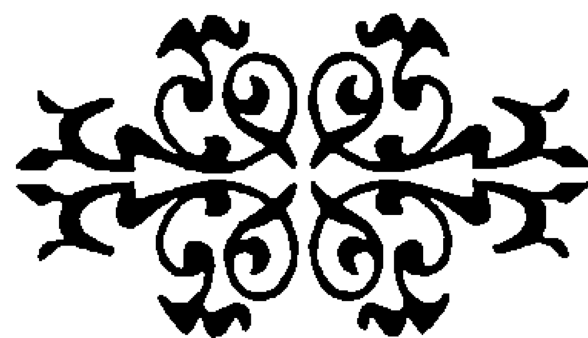
دار أبي الطيب للنشر والتوزيع | گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ
055-3823990

بیت السلام پرنٹنگ پریس
رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
Tel: +92-42-37361371, 37320422 Mob: +92-321-9350001 ,0320-6666123
@bait.us.salam1@gmail.com www.bait-us-salam.com facebook.com/baitussalambookstore

فہرست



فہرست مضامین



سورة الاعراف

سورت اعراف مکی ہے مگر آٹھ آیتیں ﴿ وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ ﴾ [الأعراف: ١٦٣] سے لے کر ﴿ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ ﴾ [الأعراف: ١٧١] تک مدنی ہیں۔ یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما و ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام حسن، مجاہد، عکرمہ، عطا اور جابر بن زید رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اعراف کی ایک آیت: ﴿ وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ ﴾ [الأعراف: ١٦٣] مدنی ہے باقی سب مکی ہیں۔[1] حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو مغرب کی نماز میں دو رکعتوں کے اندر پڑھتے تھے۔[2] اس میں دو سو چھے آیتیں ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صرف اتنا کہا ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓمّٓصٓ ۝١

الٓمّٓصٓ ①

الٓمّٓصٓ کی تفسیر میں اقوال:

سورت بقرہ کے شروع میں حروفِ مقطعات کے متعلق تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا "أَنَا اللّٰهُ أَفْصِلُ". یہی قول سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ اور اس جیسے دوسرے کلمات جن سے سورتوں کا افتتاح ہوا ہے، قسم ہے جو اللہ نے کھائی ہے۔ یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا اس کے معنی: "هُوَ الْمُصَوِّرُ" ہیں۔ قرظی رحمہ اللہ نے کہا: "هُوَ اللّٰهُ الرَّحْمٰنُ الصَّمَدُ" ہیں۔[4] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: "أَنَا اللّٰهُ الصَّادِقُ"۔[5] اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں، لیکن یہ سب اٹکل ہے یا ظن وتخمین کے ساتھ تفسیر ہے۔ ان میں سے کوئی قول بھی حجت نہیں ہے۔ صریح طور پر حق یہی ہے کہ اللہ ہی جانے کہ ان حروف سے کیا مراد ہے۔ یہ اس کی کتاب میں اُس کا ایک راز ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان

[1] الدر المنثور (٣/ ٤١٢) تفسير الخازن (٢/ ٢٠٨)

[2] مسند أحمد (٥/ ٤١٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجال أحمد رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٢/ ٢٩٦)

[3] تفسير ابن كثير (٣/ ١١٧۔ ط: دار الكتاب العربي)

[4] تفسير الطبري (١٢/ ٢٩١۔ ٢٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٣٧)

[5] الدر المنثور (٣/ ٤١٣)

حروف کے معنی نہیں بتائے تو ہم کیا ہیں کہ ان کو سمجھ سکیں۔ دل کو اس بات کا نہایت قلق ہے کہ بعض سلف اور ائمہ خلف نے اس کی طرف توجہ کی ہے، حالاں کہ متشابہات میں غور وخوض کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ.

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(اے نبی!) یہ کتاب آپ کی طرف نازل کی گئی ہے، اس سے آپ کے سینے میں کسی قسم کی تنگی نہیں ہونی چاہیے، تا کہ آپ اس کے ذریعے سے (لوگوں کو) ڈرائیں اور (یہ) مومنوں کے لیے نصیحت ہے② تم اس (ہدایت) کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف نازل کی گئی ہے۔ اور تم اس کے علاوہ (اور) دوستوں کی پیروی نہ کرو، تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو③

قرآن پر غیر متزلزل ایمان اور وحیِ الٰہی کی اتباع کا حکم:

امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ حرج بمعنی شک ہے۔[1] بعض نے کہا کہ اس کے پہنچانے میں اور اس سے ڈرانے میں تنگی نہ کر، بلکہ جیسا صبر اولو العزم رسولوں نے کیا تھا ویسا ہی صبر تو بھی کر، تا کہ تو اس سے کافروں کو خبردار کر دے اور نصیحت ہو مومنوں کے لیے۔ پھر سارے عالم کو مخاطب کر کے یوں فرمایا کہ پیروی کرو نبی اُمی کے آثار کی جو وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کتاب لایا ہے، بلکہ ہر شے کے مالک اور رب کی طرف سے اور سوائے اس کے جو رسول لایا ہے کسی اور کی راہ پر نہ چلو۔ نہیں تو تم اللہ کے حکم سے غیر اللہ کے حکم کی طرف منہ پھیر لو گے۔ تم کو کم ہی دھیان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [يوسف: ١٠٣] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١١٦] ''اور اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔'' مزید فرمایا: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [يوسف: ١٠٦] ''اور ان کے اکثر اللہ پر (اس طرح) ایمان لاتے ہیں کہ وہ مشرک ہی ہوتے ہیں۔''

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ یہاں کتاب سے مراد قرآن ہے، یعنی اتنا جو اس آیت کے نازل ہونے تک اترا

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٢٩٦)

تھا۔ حرج بمعنی ضیق (تنگی) ہے، یعنی اگر لوگ تجھ کو جھٹلائیں یا ستائیں تو بھی تو اس کتاب کو ان کے کان میں ڈال دے، دل تنگ نہ ہو۔ اللہ تیرا حافظ و ناصر ہے لوگوں سے کیا ڈرنا۔ یا یہ مراد ہے کہ اگر لوگ ایمان نہ لائیں تو دل تنگ نہ ہو۔ تجھ پر یہی پہنچانا ہے نہ اور کچھ۔ یا اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہ کر۔ اس بنیاد پر نبیِ اکرم ﷺ کو یہ نہی باب تعریض سے ہے، مراد امت ہے کہ کوئی امتی اس کے کلام اللہ ہونے میں شک نہ کرے۔ یہ کتاب اس لیے اتری ہے کہ لوگوں کو ڈرایا جائے۔ صاحبِ یقین کا اقدام بصیرت سے ہوتا ہے۔ قوتِ نفس سے وہ خود کام کرتا ہے اور اللہ پر توکل کرتا ہے، غرضیکہ کفار کے لیے یہ کتاب ڈرانے کے لیے نہایت موزوں ہے اور مومنین کے لیے نصیحت ہے۔ مومنین کا ذکر خاص طور پر اس لیے ہے کہ اس کا اثر ان میں زیادہ ہوتا ہے، اس سے کفار کو بالخصوص ڈرانے کا حکم نکلا۔

﴿ اِتَّبِعُوْا ﴾ تمام مکلفین کو خطاب ہے۔ ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ سے مراد کتاب ہے اور کتاب ہی کی طرح سنت (حدیث) ہے، دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ۷] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔''[1] (قاله الزجاج) یا یہ نبیِ اکرم ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو حکم ہے یا نبیِ اکرم ﷺ کو حکم دینے کے بعد امت کو حکم دیا کہ تبلیغ کرو۔ گویا یہ کتاب نبیِ اکرم ﷺ کے واسطے سے امت پر اتری ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ لفظ ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ کتاب وسنت دونوں کو شامل ہے۔ ﴿ اِلَيْكُمْ ﴾ اس لیے کہا کہ گویا سب ہی پر نازل ہوئی ہے۔ خطاب کُل کو ہے۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ قرآن وسنت کو عام ہے۔ اللہ سبحانہ کے قول کے مطابق: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ [النجم: ۳۔ ٤] ''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔''[3]

حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اے ابن آدم! تو اتباعِ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ پر مامور ہے۔ واللہ کوئی آیت نہیں اتری ہے مگر تجھ کو یہ جاننا واجب ہے کہ یہ کس کے بارے میں آئی ہے۔[4] یا کفار کو خطاب ہے کہ اے مشرکو! تم اس کتاب پر چلو، کفر وشرک کو چھوڑ دو، مگر پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے۔ امت کو اتباعِ اولیا غیر اللہ سے منع کیا ہے کہ ان کو نہ پوجو، نہ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراؤ، جیسے شیاطین، کاہن، نجومی اور رمال وغیرہم ہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جنوں اور انسانوں کے لیے شیاطین میں سے کسی ایک کو بھی ولی نہ ٹھہراؤ کہ وہ تم کو خواہش پرستی اور بدعات کے پیچھے لگانے کا باعث نہ بن جائیں۔[5]

---

[1] معاني القرآن (۲/ ۳۱٦) [2] تفسير الرازي (۱٤/ ۱٦) [3] تفسير البيضاوي (۳/ ٤)
[4] تفسير الخازن (۲/ ۲۰۹) [5] الكشاف (۲/ ۸۳)

﴿ مِنْ دُوْنِهٖٓ ﴾ کی ضمیر رب کی طرف پھرتی ہے یا ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ کی طرف، یعنی دین میں قرآن وحدیث کے سوا کسی اور شے کی تقلید نہ کرو، نہ اللہ اور رسول کے سوا کسی کو اپنا ولی ٹھہراؤ، جس طرح اہلِ جاہلیت اپنے رؤسا کی اطاعت کرتے تھے اور ان کے حلال اور حرام کرنے پر چلتے تھے۔ مالک بن دینار کی قراءت ''لَا تَبْتَغُوْا'' ابتغاء سے ہے، یعنی اللہ کو چھوڑ کر اور اولیا تلاش کرنا منع ہے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ قیاس کر کے قرآن مجید کے کسی عام حکم کو خاص کرنا جائز نہیں،[2] اس لیے کہ عموم منزل من عند اللہ ہے اور اللہ نے ﴿ مَآ اُنْزِلَ ﴾ کی تابع داری واجب کی ہے تو عمومِ قرآن پر عمل کرنا واجب ٹھہرا، سو جب واجب ہوا تو قیاس پر چلنا منع ہوگا، ورنہ تناقض لازم آئے گا۔ تم تھوڑا دھیان کرتے ہو، غور وفکر نہیں کرتے، ورنہ حق بات سمجھ جاؤ اور باطل سے بچے رہو۔[3]

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝۷

اور بہت سی بستیاں ایسی ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا تو ان کے پاس ہمارا عذاب اس وقت آیا، جب وہ رات کو سوئے ہوئے تھے یا وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے ④ پھر جب ان کے پاس ہمارا عذاب آ گیا تو ان کی پکار بس یہی تھی کہ وہ کہہ اُٹھے: بے شک ہم ہی ظالم تھے ⑤ چناں چہ ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے ⑥ پھر ہم (سب کچھ اپنے) علم سے ان کے سامنے ضرور بیان کریں گے، اور ہم (دنیا میں) غائب (غیر حاضر) تو نہ تھے ⑦

تباہ کردہ بستیوں کے حالات اور سنتِ الٰہی:

یعنی رسولوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بہت سے گاؤں برباد کر دیے گئے۔ ان کو دنیا کی رسوائی اور آخرت کی ذلت حاصل ہوئی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤١] ''اور (اے نبی!) بلاشبہ آپ سے پہلے بھی رسولوں سے استہزا کیا گیا، پھر جن لوگوں نے ان (رسولوں) سے تمسخر کیا، انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ

① الكشاف (٢/ ٨٣) ② تفسير الرازي (١٤/ ١٦) ③ فتح البيان (٤/ ٢٩٩۔ ٣٠١)

تَّمَشِيْدٍ ﴾ [الحج: ٤٥] ''چناں چہ کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جبکہ وہ ظالم تھیں، تو وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر، اور (کتنے ہی) کنویں بے کار، اور (کتنے ہی) مضبوط محل (ویران پڑے ہوئے ہیں!)۔''

مزید فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۚ وَّكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴾ [القصص: ٥٨] ''اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جو گزرانِ زندگی (اپنے سامانِ زیست) پر اِتراتی تھیں، چناں چہ ان کے یہ گھر (اُجڑے پڑے) ہیں، ان کے بعد بہت تھوڑے ہی آباد ہوئے اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہوئے۔'' رات اور دوپہر کا وقت اس لیے فرمایا کہ یہی دونوں غفلت ولہو کے ہوتے ہیں، ایسے وقت میں اللہ کا عذاب اور عقاب آتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٩٧۔ ٩٨] ''کیا پھر بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں؟ یا بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آجائے اور وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں؟''

نیز فرمایا: ﴿ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [النحل: ٤٥۔ ٤٧] ''کیا بے خوف ہوگئے ہیں وہ لوگ جنھوں نے برے مکر کیے کہ اللہ انھیں زمین میں دھنسا دے یا ان پر (وہاں سے) عذاب لے آئے، جہاں سے وہ شعور نہیں رکھتے۔ یا ان کے چلنے پھرنے کے دوران میں وہ انھیں پکڑ لے، پھر وہ اسے عاجز کرنے والے نہیں۔ یا انھیں حالتِ خوف میں مبتلا کر کے پکڑ لے، پھر بلاشبہ تمھارا رب بہت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔''

غرضیکہ جن بستیوں پر اللہ کا عذاب رات یا دن کو آیا تھا وہ عذاب کے وقت اپنے گناہوں کے اعتراف کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ یہی کہنے لگے کہ ہاں ہم اسی قابل ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿١١﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿١٢﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿١٣﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿١٤﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ١١۔ ١٥] ''اور ہم نے کتنی ہی بستیاں تہس نہس کر دیں جو ظالم تھیں، اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اُٹھا کھڑی (پیدا) کیں۔ پھر جب انھوں نے ہمارے عذاب (کی آہٹ) کو محسوس کیا تو وہ لوگ وہاں سے بھاگنے لگے۔ (ان سے کہا گیا:) مت بھاگو، اور لوٹ جاؤ جہاں تمھیں

سامان عیش وعشرت دیا گیا تھا اور اپنے مکانات ومحلات کی طرف، تاکہ تم سے سوال کیا جائے۔ وہ کہنے لگے: ہائے ہماری کم بختی! بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ پھر یہی رہی ان کی پکار، حتی کہ ہم نے انھیں کٹے ہوئے اور بجھے ہوئے بنا دیا۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت میں روایت نبوی ﷺ کی صحت پر واضح دلیل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَا هَلَكَ قَوْمٌ حَتّٰى يُعْذِرُوْا مِنْ أَنْفُسِهِمْ)) ''ہلاک نہ ہوئی کوئی قوم، یہاں تک کہ عذر کیا اپنی جانوں کا۔'' ابوسنان نے عبدالملک سے کہا: یہ کس طرح ہوسکتا ہے، انھوں نے آیتِ باب پڑھی، یعنی جن پر عذاب کیا جاتا ہے وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، تب ہی ان پر عذاب اترتا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا و تکلیف کا نزول استحقاق سے ہوتا ہے نہ کہ ناحق۔

امتوں اور رسولوں کی جواب دہی:

امت سے رسولوں کے بارے میں سوال ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [القصص: ٦٥] ''اور جس دن اللہ انھیں پکارے گا، تو وہ کہے گا: تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا؟'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ [المائدة: ١٠٩] ''اس دن (کو یاد کرو) جب اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر (ان سے) کہے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا تھا تو وہ کہیں گے: ہمیں کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی غیب کی باتوں کو جاننے والا ہے۔'' غرض کہ قیامت کے دن اللہ امتوں سے یہ سوال کرے گا کہ تم نے ہمارے رسولوں کو کیا جواب دیا؟ رسولوں سے پوچھے گا کہ تم نے ہماری بات ان کو پہنچا دی یا نہیں؟ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ''نَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ عَمَّا بَلَّغُوْا''[2]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ ''تم سب راعی ہو، تم سب سے رعیت کے بارے میں سوال ہوگا، لوگوں کے امام و حاکم سے پوچھا جائے گا۔ آدمی سے اُس کے اہل کے بارے میں سوال ہوگا، عورت سے شوہر کے گھر کے بارے میں سوال ہوگا، بندے سے اپنے آقا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (رواه ابن مردويه)'' امام لیث رحمہ اللہ نے کہا: ابن طاؤس نے یہ حدیث مجھ سے بیان کی، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ یہ حدیث صحیحین میں بھی آئی ہے، لیکن اس اضافے کے بغیر۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٣٠٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالملک بن میسرہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ البتہ اس موضوع کی صحیح روایت سنن وغیرہ میں مروی ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٤٧) مسند أحمد (٤/ ٢٦٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٣١)

[2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٠٦) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٤٠) اس کی سند حسن ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧١)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کتاب سامنے لا کر رکھیں گے، وہ ان کے اعمال کا حال کہے گی۔[1] غرض کہ اللہ اپنے بندوں کو ان کے ہر قول و عمل کی خبر دے گا، وہ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ بڑا اہم ہو یا حقیر، اس لیے کہ اللہ ہر چیز پر شہید ہے، کوئی شے اس سے غائب نہیں ہے، نہ کسی شے سے وہ غافل ہوتا ہے، بلکہ آنکھ کے اشارے اور سینے کی چھپی باتوں کو جاننے والا ہے۔ ایک پتا جھڑتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں اگر ایک دانہ ہوتا ہے تو اس کو اس کی بھی خبر ہوتی ہے۔ ہر گیلا سوکھا کتابِ مبین میں لکھا ہوا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ جمع ہوں، مراد خود گاؤں ہے یا گاؤں والے۔ ''بَأسَ'' عذاب کو کہتے ہیں۔ بیات سے مراد رات ہے، یعنی سوتے میں یا قیلولے کے وقت۔ حرف ﴿ اَوْ ﴾ تفصیل کے لیے ہے نہ کہ شک کے واسطے۔ قومِ لوط علیہ السلام پر رات کو عذاب آیا تھا، قومِ شعیب علیہ السلام پر دوپہر کے وقت عذاب آیا تھا۔

قیلولہ خوابِ نیم روز یا صرف استراحت کو کہتے ہیں، یعنی اس وقت گرمی کی شدت کی وجہ سے صرف آرام کرتے ہیں، سوتے نہیں، کیوں کہ یہ دونوں وقت سکون اور آرام کے ہوتے ہیں، اس لیے عذاب کا وقت ان اوقات میں آنا زیادہ سخت، زیادہ کاٹنے والا، زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ ڈر اور خوف دلانے والا ہوتا ہے، تا کہ امن و راحت کے اسباب پر دھوکا نہ کھائیں۔ مطلب یہ کہ ایسے وقت میں اچانک غفلت کی حالت میں عذاب آیا جس کی توقع نہ تھی، نہ پہلے سے اس کی کچھ علامت نظر آئی، اس میں کافروں کے لیے ڈر اور خوف کی وعید ہے۔ گویا ان سے یہ بات کہی ہے کہ تم اسبابِ امن و راحت پر دھوکا نہ کھاؤ، بازی میں نہ آؤ، اللہ کا عذاب جب آتا ہے تو اسی طرح یک دم، یکا یک اور کسی نشانی و گمان کے بغیر آ جاتا ہے۔ لوگ اس وقت اپنے گناہوں کا اقرار کرنے لگتے ہیں۔

دعویٰ بمعنی دعا ہے، یعنی پکارنا، استغاثہ کرنا یا بمعنی اعتراف، یعنی جس دین کا دعویٰ کرتے تھے اب اس کے باطل اور غلط ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، سو ہم ان سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے یہی پوچھیں گے کہ کہو تم نے رسولوں کو ان کی دعوتِ توحید کا کیا جواب دیا؟ ان کا کہنا مانا یا نہیں؟ ان کی بات سنی یا نہیں؟ یہ امتوں اور قوموں کے حق میں وعیدِ شدید ہے اور رسولوں سے بھی دریافت کریں گے کہ تم نے ہمارا حکم ان کو پہنچایا یا نہیں اور انھوں نے تم کو کیا جواب دیا؟ کس نے مانا، کس نے نہ مانا؟ ﴿ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ ﴾ سے انبیا مراد ہیں اور ﴿ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ سے ملائکہ۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ لوگوں سے ﴿ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ کا سوال ہو گا اور ﴿ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ سے تبلیغ کا سوال ہو گا۔ امام سدی رحمہ اللہ کا قول بھی اسی کی مثل ہے۔[2] یہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے: ﴿ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٠٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٠٦)

ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [القصص: ٧٨] ’’اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا۔‘‘ اس لیے کہ مواطنِ آخرت کئی ہیں، کسی موطن میں سوال ہوگا، کسی میں نہیں ہوگا۔ یہی تمام امور کا حال ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے متعارض نظر آتے ہیں، جن کو کسی جگہ ثابت کیا ہے اور کسی جگہ ان کی نفی کی ہے کہ وہ سب تعارضات ٹھہرنے کی جگہوں کی تعداد اور مواطن کے مختلف ہونے پر محمول ہیں۔

حالانکہ اس دن کا طول بھی ایک بڑا طول ہوگا۔ ہم ان کو سارا احوال سنا دیں گے، یعنی رسولوں کو اور جن کی طرف وہ بھیجے گئے ان کو، اس لیے کہ ہم ہر پوشیدہ اور ظاہر بات کے عالم ہیں۔ ہم کچھ رسولوں کے پہنچا دینے اور امتوں کے ان کی دعوت کو قبول نہ کرنے سے غائب اور بے خبر نہ تھے۔ جو کچھ انبیا اور امتوں کے درمیان گزرا ہے وہ سارا حال ہم کو من وعن معلوم ہے۔[1]

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹

اور اس دن (اعمال کا) وزن کیا جانا برحق ہے، پھر جس شخص کے (نیک اعمال کے) وزن بھاری ہوگئے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ⑧ اور جس شخص کے (نیک اعمال کے) وزن ہلکے ہوگئے، تو وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ بے انصافی کرتے تھے ⑨

اعمال کا وزن اور تولا جانا حق ہے:

ہر شخص کے عمل وزن کے موافق لکھے جاتے ہیں۔ اگر صدق سے اور محبت سے اور جیسا حکم دیا گیا تھا اس کے مطابق برمحل وہ کام کیا تو وزن بڑھ گیا اور اگر دکھانے یا ریس کی وجہ سے کیا، یا حکم کے مطابق نہ کیا، یا ٹھکانے پر نہ کیا تو وزن گھٹ گیا۔ آخرت میں وہ کاغذ تولیں گے۔ جس کے نیک کام بھاری ہوئے تو برے کام بخشے گئے اور ہلکے ہوئے تو پکڑا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اعمال کا قیامت کے دن ترازو میں تولا جانا حق ہے، یعنی اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، جیسے اس نے فرمایا: ﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٤٧] ’’اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (عمل) ہوگا تو ہم اسے (تولنے کے لیے) لے آئیں گے، اور ہم حساب کرنے والے کافی ہیں۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً

[1] فتح البیان (٤/ ٣٠١۔ ٣٠٤)

یُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ''بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔''

مزید فرمایا: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۱۔ ۱۰۳] ''پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان میں رشتے داریاں رہیں گی اور نہ وہ باہم سوال کریں گے۔ پھر جس کے پلڑے بھاری ہو گئے تو وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اور جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے تو وہی ہیں، جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔''

کس چیز کا وزن کیا جائے گا؟

قیامت کے دن جو چیز ترازو میں رکھی جائے گی وہ اعمال ہیں، اگرچہ وہ اعراض ہوں گے مگر اللہ اُس دن اُن کو جسم عطا کرے گا۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔[1] جس طرح صحیح میں آیا ہے کہ ''سورت بقرہ اور آلِ عمران قیامت کے دن دو بادل یا دو چھتری یا دو پرندوں کے غول کی طرح آئیں گی۔''[2] اسی طرح قرآن پاک کا ذکر صحیح میں آیا ہے کہ ''وہ قرآن پڑھنے والے کے پاس ایک خوش رنگ جوان کی صورت میں آئے گا، وہ کہے گا: تو کون ہے؟ قرآن کہے گا: میں قرآن ہوں، میں نے تجھ کو رات کو جگایا، دن کو پیاسا رکھا۔''[3]

سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں قبر کے سوال کا واقعہ آیا ہے کہ مومن کے پاس ایک جوان خوش رنگ اور خوش بو کے ساتھ آئے گا، وہ کہے گا: تو کون ہے؟ وہ کہے گا میں تیرا عملِ صالح ہوں۔ اس کے عکس کافر اور منافق کی حالت کا ذکر کیا ہے۔[4] دوسرا قول یہ ہے کہ وزن اعمال کی کتاب کا ہو گا نہ کہ خود اعمال کا، جس طرح حدیثِ بطاقہ میں آیا ہے کہ ایک آدمی کو لا کر ننانوے دفتر یعنی اس کے طومار نامۂ اعمال ایک پلۂ میزان میں رکھیں گے، ہر دفتر اتنا لمبا ہو گا کہ جہاں تک نظر جائے، پھر وہ بطاقہ یعنی کاغذ کا ایک ٹکڑا لائیں گے جس میں ''لا إله إلا الله'' لکھا ہو گا، وہ شخص کہے گا کہ اے رب! ان تمام دفتروں کے ساتھ اس بطاقہ کی کیا ہستی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ پر ظلم نہ ہو گا، پھر اس پرچے کو ترازو کے پلڑے میں رکھا جائے گا، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: « فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ » ''وہ گناہوں کے طومار ہلکے پھلکے ہو جائیں گے اور وہ کاغذ کا پرچہ بھاری ہو جائے گا۔''[5] (رواه الترمذي بنحو هذا و صححه)

---

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢١٥) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٤)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٨١) المعجم الأوسط (٦/ ٥١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٢٩)

[4] مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٥)

مَهْمَا تَفَكَّرْتُ فِيْ ذُنُوْبِيْ خِفْتُ عَلٰى قَلْبِيْ احْتِرَاقَهُ

لٰكِنَّهُ يَنْطَفِئُ لُهَيْبِيْ بِذِكْرِ مَا جَاءَ فِيْ الْبِطَاقَةِ [1]

''میں اپنے گناہوں پر جتنا غور کروں دل اتنا ہی جلتا ہے۔ مگر جب بطاقۂ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو تسلی ہو جاتی ہے۔''

تیسرا قول یہ ہے کہ صاحبِ عمل کو تولیں گے جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ایک موٹا مرد لائیں گے، اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾ [الکھف: ۱۰۵] ''لہٰذا روزِ قیامت ہم ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔'' [1] مناقبِ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ کیا تم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی دونوں پنڈلیوں کے بارے میں تعجب کرتے ہو؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ دونوں ترازو میں کوہِ اُحد سے زیادہ بھاری ہوں گی۔ [2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان آثار کے درمیان اس طرح جمع ممکن ہے کہ یہ سب امور صحیح ہیں، کبھی اعمال کا وزن ہوگا، کبھی محلِ اعمال کا، کبھی اعمال کرنے والے کا اور کبھی نامۂ اعمال کا۔ واللہ أعلم [3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس انصاف کے دن، جس میں ظلم نہیں ہوگا، وزن کا ہونا حق ہے، کیفیتِ وزن میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اعمال کے صحیفے بوزنِ حقیقی موزون ہوں گے، یہی صحیح ہے، اسی پر دلیلیں قائم ہیں۔ کسی نے کہا: نفسِ اعمال تُلیں گے، گو وہ اعراض ہوں۔ کسی نے کہا: نفسِ اشخاص وزن کیے جائیں گے۔ کسی نے کہا کہ وزن اور میزان، عدل اور قضا کے معنی میں ہیں، ان کا ذکر ضرب المثل کے طور پر کیا ہے، لیکن یہ تاویل درست نہیں۔ اگرچہ امام مجاہد اور زجاج رحمہ اللہ اس کے قائل ہیں، مگر پھر امام زجاج رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ صحاح کی اسانید کا اتباع کیا جائے۔ سچ مچ کی ترازو مانی جائے۔ [4]

امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زجاج نے اچھی بات کہی، اس لیے کہ صراط دینِ حق پر، جنت و نار جسموں کے علاوہ صرف روحوں کے وارد ہونے پر، شیاطین اور جن اخلاقِ مذمومہ پر اور ملائکہ قویٰ محمودہ پر محمول ہے۔ زمانۂ اول میں اُمت کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ انھیں تاویل کے بغیر ظواہر کو پکڑنا چاہیے، سو جب تاویل کی ممانعت پر اجماع ہو چکا تو ظاہر کو پکڑنا واجب ہوا۔ یہ ظواہر حکم نصوص (صریح) میں ہو گئے۔ [5] غرض کہ حق بات وہی قولِ اول ہے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٥)

[2] مسند أحمد (١/ ٤٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٥٠)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٢)

[4] تفسير الطبري (١٢/ ٣٠٩۔ ٣١٠) معاني القرآن (٢/ ٣١٩)

[5] فتح القدير (٢/ ٢٦٧)

کہ میزان کا وجود اور صحائفِ اعمال کا وزن کیا جانا ثابت ہے۔ جو لوگ ان ظواہر کو حق سے بعید خیال کرتے ہیں، ان کے پاس اس خیال کی کوئی شرعی دلیل نہیں۔ یہ صرف عقلی طور پر استبعاد (عقل سے بعید خیال کرنا) ہے۔

پس عقل کیا شے ہے جو دین میں حجت ٹھہر سکے؟ ہم نے مانا کہ ان کی عقل اس کو قبول نہیں کرتی تو بے شک نہ کرے اور قوم کی عقل نے، جن کی عقلیں ان کی عقلوں سے زیادہ قوی اور صحیح سالم ہیں، اس ظاہر کو قبول کیا ہے اور وہ قوم صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین و تبع تابعین و گروہِ محدثین و زمرۂ موحدین متبعین کی جماعت ہے۔ پھر بدعات آئیں۔ اہلِ بدعت ظاہر ہوئے، جیسے ایک اندھیری رات اور کالی کوٹھری، جس نے جو چاہا کہا بکا، شرع حق کو پسِ پشت ڈال دیا، کاش! یہ ایسے احکامِ عقلیہ لاتے جن پر عقلاً اتفاق کرتے، ان کا قبول کیا جانا متحد ہوتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنی عقل پر ایسی بات کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کی ہوائے نفس کے مطابق ہے یا اس کے مذہبِ منتحل (گھڑے ہوئے) کے موافق ہے، سو جس طرح ان کے مذہب باہم متضاد ہیں، اسی طرح ان کی عقلیں بھی باہم تضاد رکھتی ہیں۔

اس بات کو ہر منصف جانتا ہے اور جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کو چاہیے کہ اپنی فہم کو تعصب اور تمذہب کے شائبوں سے پاک صاف کرے، اس وقت اس کی آنکھوں میں صبح روشن ہو جائے گی۔ میزان اور وزن کا ذکر قرآن میں بہت جگہ آیا ہے۔ اس بارے میں احادیث بھی کثرت سے آئی ہیں، کتاب وسنت بے نیاز ہیں۔ کسی تاویل، تحریف اور تعطیل کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ اللہ صادق ہے، رسول مصدوق ہیں۔ صبح اس بات سے بے نیاز ہے کہ چراغ سے روشنی لے۔ چراغ کی حاجت سورج کے سامنے ستارے کی ضرورت کی مانند ہے۔ پس جس کسی کے اعمال کا وزن اللہ کے فضل سے بھاری ہو گیا وہ کامیاب ہے اور عذاب سے نجات پانے والا ہے۔

موازین میزان کی جمع ہے۔ میزان کا بھاری ہونا صحائفِ اعمال کے بھاری ہونے سے ہو گا۔ کسی نے کہا ہے کہ موزون کی جمع ہے، یعنی جس کے اعمالِ موزونہ وزن میں بڑھ گئے وہ کامیاب ہے، لیکن پہلا مطلب زیادہ بہتر ہے۔ ظاہر الفاظ یہ ہیں کہ ہر عامل کے لیے کئی ایک میزان ہوں گے، جن میں ہر قسم کا عمل تولا جائے گا۔ بعض نے کہا کہ نہیں بلکہ ایک ہی ترازو ہو گی، مگر اسے جمع کے لفظ سے ذکر کیا ہے، جس طرح کوئی کہے کہ ہم مکہ معظمہ خچروں پر گئے۔ یا اس لیے جمع کیا ہے کہ ترازو میں دو پلے، ایک شاہین اور ایک زبان ہوتی ہے، ان سب کے بغیر وزن نہیں ہو سکتا۔ یہ حال مومنین کا ہو گا کہ ان کی ترازو کا پلہ بھاری ہو گا۔

رہے کفار اور فجار تو ان کی ترازو برائیوں کی وجہ سے اللہ کے عدل کے تقاضے سے ہلکی پڑ جائے گی۔ وہ اللہ کی آیات کی تکذیب اور انکار کی وجہ سے خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اکثر علما کے نزدیک وزن مسلمانوں کے لیے ہو گا، کافروں کے اعمال تو سرے سے ہی ضائع ہوں گے، ان کے لیے تو ترازو قائم

نہ ہوگی، بدلیلِ آیتِ کریمہ: ﴿ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴾ [الکھف: ۱۰۵] ''پس قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔''

بعض نے کہا کہ وزن تو ہوگا گو پلہ بھاری نہ ہو، تاکہ عذاب میں تخفیف کی جائے، ظاہر نظمِ قرآنی یہی ہے۔ پھر جس کے حسنات اور سیئات برابر ہیں، ان کا ذکر نہیں کیا، سکوت فرمایا، ایک قول کے مطابق ایسے لوگ اہلِ اعراف ہوں گے۔ کبھی قسمِ اول میں بھی درج ہو جاتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ﴾ [التوبۃ: ۱۰۲] ''انھوں نے ملا جلا عمل کیا، ایک اچھا اور دوسرا برا، امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔''

﴿ عَسٰى ﴾ کا لفظ اللہ کی طرف سے تحقیق کے معنی میں ہوا کرتا ہے نہ کہ شاید کے معنی میں۔ علما نے اس کی تصریح کی ہے۔ حافظ نے میزان میں ایک مستقل تالیف کی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ میزان کی تعداد یا عدمِ تعداد میں اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ تعداد مقرر نہیں۔ وزن حساب کے بعد ہوگا۔

کافروں کے اعمال میں عذاب کی تخفیف کی جائے گی جس طرح ابو طالب کے حق میں آیا ہے، یہی صحیح ہے۔ (کما قال القرطبي)[1] امام سخاوی رحمہ اللہ نے کہا: یہ ابو طالب کے لیے مخصوص رعایت ہے، لیکن معتمد وہی قرطبی کا قول ہے، اس میں تردد کی کوئی وجہ نہیں۔ حدیثِ بطاقہ کو احمد، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ نے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بطولہ روایت کیا ہے۔ امام حاکم اور ترمذی رحمہما اللہ نے صحیح بتایا ہے، امام احمد رحمہ اللہ کی سند حسن ہے۔[2] سجل بمعنی کتاب و کاتب ہے۔ بطاقہ چھوٹے سے رقعے کو کہتے ہیں، یعنی کاغذ کا ذرا سا پرچہ یا کپڑے کا ٹکڑا۔[3]

حاصلِ مقام یہ ہے کہ وزن سب کے اعمال کا ہوگا، کیا مومن اور کیا کافر! مگر وہ کافر جس کے عمل بالکل ضائع ہیں۔ پھر جس کافر کے کچھ حسنات بھی ہوں گے، اس کا عذاب کسی قدر ہلکا کر دیا جائے گا، آگ کی ہمیشگی سے نجات نہ ملے گی، اس لیے کہ بعض کافروں سے بھی بعض خیر کے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اول تو ان کا عوض دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ مال ملا، اولاد ہوئی، صحتِ بدن رہی، عیش و آرام کیا، عمر زیادہ پائی، دولت و ثروت جمع کی اور اگر بدلا باقی رہا تو وہاں عذاب میں تخفیف ہوگی۔ واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر القرطبي (۷/ ۱٦٤۔ ۱٦٥)

[2] مسند أحمد (۲/ ۲۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤۳۰۰) صحيح ابن حبان (۱/ ٤٦۱) مستدرك الحاكم (۱/ ٤٦) شعب الإيمان (۱/ ۲٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲٦۳۹) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۳٥)

[3] فتح البيان (٤/ ۳۰٤۔ ۳۰۷)

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰

اور بلاشبہہ ہم نے تمھیں زمین میں قدرت دی اور اس میں تمھارے لیے گذران کے اسباب فراہم کر دیے۔ تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو ⑩

زمین کی نعمتیں انسان کے لیے ہیں:

اللہ نے اپنے بندوں پر یہ احسان کیا کہ زمین کو ان کے قرار کی جگہ ٹھہرایا، اس میں پہاڑ رکھے، نہریں بہائیں، منزلیں اور گھر مقرر کیے، زمین کے منافع ان کے لیے حلال اور جائز کر دیے، بادل کو مسخر کیا کہ ان کو روزی دینے کے لیے برسا کرے، زمین کو کام کاج اور معیشت کی جگہ بنایا، کمائی کرنے کے اسباب مہیا کر دیے، تجارت کی راہ نکال دی، اس کے باوجود اکثر لوگ کم شکر کرتے ہیں، بلکہ ناشکرے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [إبراهيم: ٣٤] ''اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں شمار نہ کر سکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے۔''

صحیح یہ ہے کہ لفظ ﴿ مَعَايِشَ ﴾ بغیر ہمزہ کے پڑھا جائے۔ اکثر اسی پر ہیں مگر عبدالرحمان بن ہرمز اعرج نے ہمزہ سے پڑھا ہے،[1] اس کا وزن مفاعل ہے۔ یائے تحتیہ اصل کلمہ ہے بخلاف مدائن وصحائف و بصائر کے کہ ان میں یائے تحتیہ زائد ہے۔ فتح البیان میں کہا ہے کہ تمکین (جگہ دینے) سے مراد مالک بنانا ہے، یعنی ہم نے تم کو زمین کا مالک بنایا، جگہ دی اور تصرف کی قدرت عطا کی۔

معیشت سے مراد کھانا اور پینا ہے جس سے انسان کی زندگی قائم رہتی ہے۔ قاموس میں کہا ہے کہ عیش بمعنی حیات ہے اور طعام اور خبز کے معنی میں ہے۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: معیشت نفع کی تمام وجوہ کو عام ہے جن سے رزق ملتا ہے،[3] جیسے: کھیتی، پھل، اناج، کام کاج، تجارت اور مصنوعات کے منافع۔ یہ سب اللہ کے دینے سے ملے ہیں۔ اسی نے سکھائے پڑھائے ہیں، یہ بندوں پر اس کا انعام واحسان ہے۔ اس کے باوجود وہ شکر کم ادا کرتے ہیں اور کفرانِ نعمت زیادہ کرتے ہیں۔ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو تصور کر کے اس کا اظہار کرے۔ نعمت کو چھپانا یا بھول جانا شکر کی ضد ہے۔[4]

---

① تفسير الطبري (١٢/ ٣١٦) ② القاموس المحيط (١/ ٧٧٣)

③ معاني القرآن (٢/ ٣٢٠) ④ فتح البيان (٤/ ٣٠٨)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾

اور بلاشبہ ہم نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا: تم آدم کو سجدہ کرو، چناں چہ انھوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں (شامل) نہ ہوا ⑪

تخلیقِ آدم، سجودِ ملائک اور شیطان کا استکبار:

اللہ نے بنی آدم (انسان) کو آدم علیہ السلام کے شرف سے آگاہ کیا، ان کے باپ سے ابلیس کی عداوت بیان کی، فرمایا: اس کے جی میں تمھارا اور تمھارے باپ کا حسد تھا، تم اس سے بچ کر چلو، اس کے طریقوں کا اتباع نہ کرو۔ سب فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا مگر ابلیس نے نہ کیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ [الحجر: ۲۸۔ ۲۹] ''بے شک میں سڑے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے ایک بشر تخلیق کرنے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے درست کرلوں اور اپنی روح سے اس میں پھونک دوں تو اس کے آگے سجدہ کرتے گر پڑنا۔'' جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے طینِ لازب سے بنایا، اس کو بشر کی صورت عطا کی، اپنی روح اس کے اندر پھونکی تو اس وقت فرشتوں کو حکم دیا کہ تم رب تعالیٰ جل جلالہ کی تعظیم کے لیے آدم کو سجدہ کرو۔ سب نے یہ حکم سن کر مانا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، حکم عدولی کی۔ یہی بات ابن جریر نے اختیار کی ہے کہ اس سب سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ تم کو پیدا کیا، یعنی مَردوں کی صلبوں (پیٹھوں) میں، پھر تم کو عورتوں کے رحموں میں صورت دی۔[2] بعض سلف نے کہا: اس سے مراد اولاد ہے۔ امام ربیع، سدی، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ ﴿ خَلَقْنٰكُمْ ﴾ سے مراد آدم ہیں اور ﴿ صَوَّرْنٰكُمْ ﴾ سے اولاد مراد ہے،[3] لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مراد آدم ہیں نہ کہ اولاد۔ جمع کا صیغہ اس لیے کہا کہ آدم ابو البشر ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے زمانۂ نبوی کے بنی اسرائیل سے فرمایا: ﴿ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴾ [البقرة: ۵۷] ''اور ہم نے تم پر سایہ کیا بادلوں کا اور (کھانے کے لیے) تم پر من وسلویٰ اتارا۔''

حالانکہ مراد ان کے آبا واجداد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھے، لیکن جب وہ احسان ان کے آبا پر تھا جو

---

① تفسير الطبري (۱۲/ ۳۲۰۔ ۳۲۱)
② مستدرك الحاكم (۲/ ۳۴۹) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
③ تفسير الطبري (۱۲/ ۳۱۸۔ ۳۱۹)

ان کی اصل ہیں تو گویا وہ احسان اولاد پر بھی واقع ہوا۔ بخلاف آیتِ کریمہ کے: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسٰنَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴾ [المؤمنون: ١٢] ''اور بلاشبہہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔'' کہ اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اور سلالہ سے آدم علیہ السلام کی اولاد ہے، کیوں کہ اولاد کی پیدایش نطفے سے ہوئی ہے۔ یہ اس لیے صحیح ہے کہ مرادِ جنسِ انسان کا پیدا کرنا ہے نہ کہ کسی ایک معین شخص کا۔ واللہ أعلم

فتح البیان میں ہے کہ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو پشتِ آدم سے پیدا کیا، پھر ہم نے تم کو صورت دی جب تم سے عہد لیا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب سے بہترین قول ہے۔[1] کہتے ہیں کہ یہ سجدہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے کرایا گیا تھا۔ جمعہ کا دن تھا اور وقت زوال سے عصر تک کا تھا۔ سب سے پہلے جبرائیل علیہ السلام نے سجدہ کیا، پھر میکائیل نے کیا، پھر اسرافیل نے کیا، پھر عزرائیل نے کیا اور پھر ملائکہ مقربین نے کیا۔ ایک ابلیس نے نہ کیا، یہ ان کے بیچ میں منفرد رہا، اس کا ذکر ملائکہ کے ساتھ تغلیب کے طور پر آیا ہے، یا یہ ملائکہ کی اس جنس سے تھا جن کو جِن کہتے ہیں۔[2]

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

اللہ نے کہا: تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا، جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ وہ بولا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے ⑫

ابلیس کے انکار کی وجہ:

﴿ مَا مَنَعَكَ ﴾ کے معنی ہیں ''ما أحوجك، وألزمك واضطرك أن لا تسجد'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول قوی اور حسن ہے[3] اور ابلیس ۔علیه اللعنة۔ کا قول کہ ''میں اس سے بہتر ہوں''، عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ گویا حکم ماننے سے اس لیے باز رہا کہ فضیلت والے کو غیر فضیلت والے کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں ہونا چاہیے۔ پھر جب میں بہتر ہوا اور آدم کم تر تو پھر میرا اس کو سجدہ کرنا کیسا؟! میری بہتری کی وجہ یہ ہے کہ میں آگِ رخشندہ سے پیدا ہوا ہوں، آگ خاک سے بہتر ہے۔ لعین نے اصل عنصر کی طرف نظر کی اور اس بڑی عزت و شرف پر نظر نہ کی کہ اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا، اپنی روح اس میں پھونکی، بلکہ نص میں قیاس فاسد سے مقابلہ کیا۔ سجدہ کرنے والے فرشتوں کی جماعت سے الگ ہو گیا اور سجدے کی برکتوں سے محروم ہو گیا۔ اسی لیے اللہ کی رحمت سے ناامید ہوا اور ابلیس نام پایا۔ قیاس میں چوک گیا، یہ دعویٰ کیا کہ آگ مٹی سے افضل ہے، یہ نہ سمجھا کہ خاک میں مضبوطی، استواری، حلم، اِناءت

[1] تفسير القرطبي (٧/ ١٦٨۔ ١٦٩) [2] فتح البيان (٤/ ٣٠٨۔ ٣٠٩) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٤)

بردباری اور ثابت قدمی کے خواص ہیں، مٹی سے نباتات کی نشوونما اور بڑھوتری اور اصلاح ہے۔ آگ کا کام جلانا، طیش اور تیزی کرنا ہے۔ اسی لیے ابلیس سے اس کے عنصر نے خیانت کی اور آدم کو اپنے عنصر سے نفع ہوا اور رجوع الی اللہ، توبہ، تابعداری، استسلام (فرماں برداری، اطاعت) لامر اللہ، اعترافِ گناہ، طلبِ توبہ ومغفرت بجا لایا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے: ''نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں، ابلیس شعلۂ نار سے اور آدم اس سے جو بیان ہوا، یعنی مٹی سے۔''[1] (رواہ مسلم) روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''فرشتے نورِ عرش سے پیدا ہوئے ہیں، جن آگ سے اور آدم شے موصوف سے۔''[2] (رواہ ابن مردویہ) اس حدیث کے بعض الفاظ میں، سوائے صحیح کے، اتنا اور بھی آیا ہے کہ حورِعین زعفران سے پیدا ہوئی ہیں۔[3] حسن رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے: ''قَاسَ اِبْلِيْسُ وَهُوَ أَوَّلُ مَنْ قَاسَ'' ''ابلیس نے قیاس کیا اور وہ قیاس کرنے والا سب سے پہلا تھا۔'' (رواه ابن جرير و إسناده صحيح) امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: ''أَوَّلُ مَنْ قَاسَ اِبْلِيْسُ، وَمَا عُبِدَتِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ إِلَّا بِالْمَقَايِيْسِ'' ''سب سے پہلے جس نے قیاس کیا وہ ابلیس تھا اور سورج اور چاند کی عبادت بھی قیاس ہی کے ساتھ کی گئی۔''[4] اس کی سند بھی صحیح ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب اس بات کی دلیل ہے کہ صیغۂ امر فوری عمل کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بحث علمِ اصول میں مقرر ہے۔ سوالیہ جملہ یہاں جھڑک دینے کے لیے ہے، ورنہ اللہ جانتا ہے کہ کس لیے سجدہ نہ کیا۔ یہاں ﴿ مَا مَنَعَكَ ﴾ کہا، جب کہ سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴾ [الحجر: ٣٢] ''تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل نہ ہوا؟'' اور سورت صٓ میں کہا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ﴾ [صٓ: ٧٥] ''تجھے کس چیز نے اس (آدم) سجدہ کرنے سے منع کیا، جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا؟'' بیان کرتے وقت عبارتوں کا اختلاف اس بات پر دلیل ہے کہ ابلیس لعین نے ایک نافرمانی میں تین نافرمانیاں کیں: ایک حکم کی مخالفت، دوسری جماعت سے علاحدگی، تیسرے آدم علیہ السلام کی تحقیر کر کے خود تکبر کیا۔

سو ان میں سے ہر ایک معصیت پر اسے لعن طعن کی گئی، لیکن ہر جگہ بیان کرتے وقت ایک ہی معصیت پر اکتفا کیا۔ دوسری جگہوں پر صرف ذکر کر دیا گیا مگر ڈانٹ ڈپٹ سورت بقرہ، بنی اسرائیل، کہف اور طٰہٰ میں سرے سے ترک کی گئی۔ ابلیس نے جواب میں کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، میں آگ سے بنا، وہ مٹی کا پتلا ہے۔ جو فضیلت والا ہو وہ اس کے ساتھ جو فضیلت والا نہ ہو ایسا کام نہیں کرتا۔ یہ اس اعتقاد پر کہا کہ عنصرِ آگ کو عنصرِ خاک سے افضل سمجھا،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٦) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٤)

[3] المعجم الكبير (٨/ ٢٠٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٥٣٩)

[4] تفسير الطبري (١٢/ ٣٢٧)

اس لیے کہ آگ ایک جسمِ نورانی ہے اور مٹی سایہ دار جسم ہے، حالانکہ اللہ کا دشمن اس جگہ چوک گیا، یہ نہ جانا کہ عنصرِ خاک کئی طرح عنصرِ آگ سے بہتر ہے، جیسے رزانت و متانت وسکون وطولِ بقا۔ مٹی میں برداشت، علم، حیا، ثابت قدمی، تحمل، بردباری اور خاکساری ہے۔ آگ میں خفت، سبکی، اضطراب، سرعتِ نفوذ، طیش، ارتفاع، حدت ونخوت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مٹی جنت میں ہوگی نہ کہ آگ میں۔

آگ عذاب ہے، خاک عذاب نہیں ہے۔ آگ تحیز کے لیے خاک کی محتاج ہے۔ مٹی مسجد وطہور ہے۔ تراب سامانِ ممالک ہے، نار سامانِ مہالک ہے۔ آگ مطنۂ خیانت و افناء ہے اور خاک مئنۂ امانت و انما ہے۔ مٹی آگ کو بجھا دیتی ہے، آگ مٹی کو تلف نہیں کر سکتی۔ لعین مٹی کے ان فضائل سے غافل رہ کر قیاسِ فاسد کی بنا پر لغزش کر گیا۔ نسفی نے کہا کہ قیاس نص (صریح حکم) کی موجودگی میں مردود ہے۔ ابلیس کا قیاس ایک واضح اور صریح حکم کے ساتھ عناد تھا اور صحیح نہیں تھا۔[1]

اگر وہ پہلے سے بدبخت نہ ہوتا اور اللہ کا اس کے حق میں فرمان پورا نہ ہوتا تو وہ اطاعت گزار ملائکہ کی اقتدا کرتا۔ اس لیے کہ ملائکہ کا عنصر نورانی ہے، اس کا عنصر ناری ہے۔ ابلیس کا اصل قیاس یہ ہے کہ اس نے نار کو خاک سے افضل اور زیادہ قوی جانا، یہ نہ جانا کہ فضیلت کسی چیز کی اصل یا جوہر سے نہیں ہوتی، بلکہ اطاعت اور فرماں برداری سے ہوتی ہے۔ اسی لیے حبشی مومن قریشی کافر سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم خاکی نژاد کو ایسی چیزوں کے ساتھ خاص کیا ہے جو غیر میں نہیں ہیں، یعنی اپنے ہاتھ سے بنایا، اپنی روح اس کے اندر پھونکی، فرشتوں سے اسے سجدہ کروایا، ہر شے کے نام سکھائے، اجتباء (چن لینا) وتوبہ و ہدایت کا وارث بنایا، اس کے سوا اور بہت سے خصائص ہیں، یہ سب اس لیے ہوا کہ اس کے حق میں پہلے سے عنایتِ خاصہ سبقت لے جا چکی تھی۔ وللہ الحمد.

ابلیس کو اس کے تکبر نے لعنت، دوری اور مردودیت کا وارث بنایا، اس لیے کہ ازل میں وہ بدبخت ٹھہر چکا تھا۔ جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ امرِ دین میں سب سے پہلے جس نے اپنی رائے سے قیاس کیا وہ ابلیس ہے، سو جو کوئی شخص ایسا کرے گا اللہ قیامت کے دن اس کو ابلیس کا قرین (ساتھی) ٹھہرائے گا۔ اس لیے کہ وہ قیاس میں ابلیس کا تابع ہوا ہے۔[2]

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾ قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ﴿١٥﴾

اللہ نے کہا: پھر تو اس (آسمان) سے اتر جا، کیوں کہ تیرے لائق یہ نہیں تھا کہ تو اس میں تکبر کرتا، لہٰذا تو نکل جا، بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے (13) اس نے کہا: تو مجھے (اس دن تک) مہلت دے دے، جب

[1] تفسير النسفي (٢/ ٥)
[2] الدر المنثور (٣/ ٤٢٥) فتح البيان (٤/ ٣١٠ ـ ٣١٢)

لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے ⑭ اللہ نے کہا: بے شک تو مہلت دیے گئے لوگوں میں سے ہے ⑮

ہبوطِ ابلیس اور قیامت تک مہلت اور ذلت:

اللہ پاک نے اس آیتِ پاک میں ابلیس کو بامر قدری کونی مخاطب فرمایا کہ تو نے جو میرا حکم نہ مانا اور میری اطاعت سے باہر ہوا تو اب تجھ کو یہاں رہ کر تکبر کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں سے مراد جنت ہے، بعض نے کہا کہ وہ منزلت ملکوت اعلیٰ جس میں وہ تھا۔ غرض یہ کہ حکم دیا کہ یہاں سے نکل جا، تو ذلیلوں اور حقیروں میں سے ہے، اس نے یہ معاملہ ضد کے ساتھ کیا۔ اس کے تکبر کی سزا یہی تھی کہ خوار و ذلیل کیا جائے۔ اس وقت لعین نے معاملے کو سمجھ کر قیامت تک مہلت کا سوال کیا، اللہ نے قبول فرمایا۔ اس میں اس کی جو حکمت اور مشیت تھی، اس کا کوئی مانع، مخالف اور معقب نہیں ہوسکتا۔ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اترنے کا حکم مخالفتِ امر پر ہوا، یعنی آسمان سے اترنے کا، جو فرماں بردار فرشتوں کا مقام ہے، جہاں وہ اللہ کی کوئی نافرمانی نہیں کرتے، اتر اور زمین پر جا جو عاصی اور مطیع کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس لیے کہ آسمانِ صالح تکبر اور اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کی جگہ نہیں ہے۔ یا جنت سے نکل۔ ہبوط بمعنی نزول (اترنا) و انحدار ہے، اوپر سے نیچے کی طرف۔ قہر و ذلت و خواری کے طور پر یا مراد فرشتوں کے زمرہ سے نیچے اترنا۔

ہبوط کی یہ تفسیر کہ صورتِ ناریہ سے نکل کر صورتِ بد اور تاریک میں ہو جا! باطل تفسیر ہے۔ یہ حکم اس لیے ہوا کہ آسمان یا جنت متکبر اور اللہ کے احکام کے مخالف لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے سوائے اور جگہ پر تکبر جائز ہے۔ بلکہ یہ قید بلا مفہومِ مخالف ہے، کیوں کہ تکبر کسی جگہ بھی درست نہیں۔ پھر امرِ ہبوط کی تاکید یوں کی کہ نکل تو ذلیل و خوار ہے، یعنی اللہ کے نزدیک اور نیک بندوں کے نزدیک۔ ہر انسان تیری مذمت کرتا ہے، ہر زبان تجھ پر لعنت بھیجتی ہے، یہ نتیجہ ہے تیرے غرور اور شخصیت کا۔

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندانِ لعنت گرفتار کرد

”تکبر نے شیطان کو ذلیل کر دیا اور لعنت کی قید میں گرفتار کر دیا۔“

آیتِ شریفہ سے معلوم ہوا کہ ذلت تکبر کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے جو کوئی آدمی تکبر کی چادر اوڑھتا ہے، اس کو ذلت و خواری کی چادر پہنائی جاتی ہے اور جو شخص انکساری اور عاجزی کی چادر اوڑھتا ہے اللہ اس کو بلندی کا لباس پہناتا ہے۔

جوں جوں بلند ہم ہوئے پستی نظر پڑی دیکھا تو خاکساری ہی عالی مقام ہے

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کے دشمن ابلیس نے تکبر کیا تو اللہ نے اس کو ذلت میں گرفتار کیا۔[1] غرض یہ کہ

[1] معاني القرآن (٢/ ٣٢٤)

جب یہ حکم ہوا کہ نکل! تو اس نے یوم بعث تک مہلت مانگی۔ مطلب یہ کہ میں اس دن تک نہ مروں، اللہ نے کہا: تجھ کو مہلت ہے، لیکن پھر آگ کے درجات عذاب کے لیے تیار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہلت کی مدت سورت حجر میں ذکر کی ہے: ﴿ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴾ [الحجر: ۳۷۔ ۳۸] ''اللہ نے فرمایا: بے شک تو مہلت دیے جانے والوں میں سے ہے۔ مقرر وقت کے دن تک۔'' وہ وقت نفخۂ اولیٰ ہے جب ساری خلق مر جائے گی۔ بعض نے کہا کہ اس مہلت دینے میں بندوں کی آزمائش ہے، تاکہ فرماں بردار، نافرمان سے الگ پہچانا جائے۔ آگے اللہ جانے کیا مصلحت ہے۔[1]

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ﴿١٧﴾

وہ بولا: پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، تو میں ان (لوگوں کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور بیٹھوں گا⑯ پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے ان کے پاس ضرور آؤں گا اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے بھی، اور تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائے گا⑰

شیطان کا چاروں طرف سے حملہ آور ہونے کا عندیہ:

اللہ نے خبر دی کہ جب ابلیس کو یوم بعث تک مہلت ملی اور اس کو اس مہلت ملنے کا وثوق ہوگیا تو اس نے دشمنی اور سرکشی پر کمر باندھ لی کہ جس طرح میں گمراہ ہوا ہوں، ایسے ہی ان کو بھی گمراہ کروں گا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ أَغْوَيْتَنِي ﴾ بمعنی ''أَضْلَلْتَنِي'' ہے۔[2] بعض نے کہا: بمعنی ''أَهْلَكْتَنِي'' ہے، یعنی یہ شخص جس کی وجہ سے میں دور پڑا ہوں، اس کی اولاد کو بھی ہر طرف سے آ کر اور بہکا کر حق کے راستے اور صراطِ مستقیم سے دور ڈالوں گا۔ تیسرے جو بندے اس کی نسل سے پیدا ہوں گے، میں راہِ نجات سے ان کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں تاک جھانک میں بیٹھوں گا، تاکہ وہ تیری عبادت نہ کریں۔ تیری توحید کے قائل نہ ہوں۔ جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ان کو خراب و برباد اور تباہ و ہلاک کروں گا۔ بعض نحویوں نے کہا ہے کہ اس جگہ بائے موحدہ قسم کے لیے ہے، یعنی ''فَبِإِغْوَآئِكَ إِيَّايَ'' عون بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی مکے کی راہ پر۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ صراطِ مستقیم عام تر ہے، مکہ وغیرہا سے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: سبرہ بن ابی فاکہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ شیطان ابن آدم کے کئی راستوں پر بیٹھا ہے۔ اسلام کے راستے میں بیٹھ کر کہتا ہے: کیا تو مسلمان ہوتا ہے اور اپنا اور اپنے آبا کا دین

---

① فتح البیان (۴/ ۳۱۲۔ ۳۱۳) ② تفسیر الطبری (۱۲/ ۳۳۲) اس کی سند حسن ہے۔ ③ تفسیر الطبری (۱۲/ ۳۳۵۔ ۳۳۶)

چھوڑتا ہے؟ وہ اس کا کہنا نہیں مانتا اور مسلمان ہو جاتا ہے۔ پھر ہجرت کے راستے پر بیٹھ کر کہتا ہے: کیا تو ہجرت کرتا ہے، اپنی زمین اپنا آسمان چھوڑتا ہے؟ مہاجر کی مثال گھوڑے کی طرح ہے رسی میں جس میں اس کو باندھ کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ اس کا کہنا نہیں مانتا، ہجرت کرتا ہے۔ پھر جان اور مال کے ساتھ جہاد کرنے کے راستے میں اس کے لیے بیٹھ کر کہتا ہے: کیا تو مقابلہ کرے گا، مارا جائے گا، تیری جورو سے نکاح کیا جائے گا، تیرا مال تقسیم ہو جائے گا؟! وہ اس کی نافرمانی کر کے جہاد کرتا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی ان میں سے ایسا کام کر لے گا، یعنی شیطان کا نافرمان ہوگا، پھر مرے گا تو اللہ پر حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے۔ یا اگر کسی جانور نے اس کو گرا کر مارا ہے تو بھی اللہ پر حق ہے کہ اسے بہشت میں لے جائے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''سامنے کا یہ مطلب کہ ان کو ان کی آخرت میں شک ڈالا۔ پیچھے کا یہ مطلب ہے کہ ان کو دنیا میں رغبت دلائی۔ داہنی طرف کا یہ مطلب کہ ان پر ان کے دین کا کام مشتبہ کر دیا۔ بائیں طرف کا یہ مقصد کہ انھیں معاصی (اللہ کی نافرمانی) کا شوق دلایا۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ''سامنے سے مراد دنیا ہے، پیچھے سے مراد آخرت، داہنے سے حسنات اور بائیں سے سیئات۔''[2]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: سامنے سے آ کر یہ کہا کہ نہ دوبارہ زندہ ہونا ہے، نہ جنت ہے اور نہ نار ہے۔ پیچھے سے آ کر دنیا کی طرف بلایا اور دنیا کو مزین کر کے دکھایا۔ دائیں طرف سے آ کر نیکیاں کرنے میں دیر لگائی۔ بائیں طرف سے آ کر گناہوں کے کاموں کو زینت اور رونق بخشی، کہا: آؤ، گناہ کرو، اللہ کے نافرمان بنو۔ اے ابن آدم! شیطان تیرے پاس ہر طرف سے آتا ہے، ایک اوپر کی جانب سے نہیں آتا، یعنی تیرے اور اللہ کی رحمت کے درمیان حائل نہیں ہو سکتا ہے۔

اسی طرح امام ابراہیم نخعی و حکم بن عیینہ و سدی و ابن جریج رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے، مگر انھوں نے یہ کہا ہے کہ سامنے دنیا ہے، پیچھے آخرت۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: سامنے اور داہنے سے دیکھتے ہیں، پیچھے اور بائیں سے نہیں دیکھتے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار قول یہ ہے کہ مراد بھلائی اور برائی کے سارے راستے ہیں۔ خیر سے روکتا ہے، شر کو اچھا کر کے دکھاتا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''مِنْ فَوْقِهِمْ'' نہ فرمایا، اس لیے کہ رحمت فوق (اوپر) سے اترتی ہے۔[4] اس میں رحمان کے عرش پر استوا ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اللہ پاک کے مخلوق سے اوپر اور بلند ہونے کی طرف۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ﴿ شٰكِرِيْنَ ﴾ سے اس جگہ مراد موحدین ہیں۔[5] ابلیس کا یہ قول کہ ان

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٣٤) مسند أحمد (٣/ ٤٨٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٥٢)

[2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٣٨ـ ٣٣٩) ان دونوں کی اسناد حسن ہے۔ [3] تفسير الطبري (١٢/ ٣٣٩ـ ٣٤١)

[4] تفسير الطبري (١٢/ ٣٤١ـ ٣٤٢) اس کی سند میں ''حفص بن عمر عدنی'' ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٢/ ٣٤٢) اس کی سند حسن ہے۔

میں اکثر کو تو شاکر نہیں پائے گا، محض گمان اور وہم ہے۔ مگر اس کا یہ کہنا واقعی صحیح ثابت ہوا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴾ [السبا: ٢٠۔ ٢١] ''اور ابلیس نے ان پر اپنا خیال یقیناً سچ کر دکھایا، چناں چہ سوائے مومنوں کی ایک جماعت کے سب نے اسی کی اتباع کی۔ اور اس (ابلیس) کا ان پر کوئی زور نہ تھا، مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس سے (الگ ہو کر) جو آخرت کے متعلق شک میں ہے؟ اور آپ کا رب ہر چیز پر خوب نگہبان ہے۔'' اس لیے حدیث میں انسان پر شیطان کے ہر طرف سے تسلط پر پناہ مانگنا آیا ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي دِيْنِي وَ دُنْيَايَ وَأَهْلِي وَمَالِي، اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَتِي، وَآمِنْ رَوْعَتِي، وَاحْفَظْنِي مِنْ بَيْنَ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِي وَعَنْ يَمِيْنِي وَعَنْ شِمَالِي وَمِنْ فَوْقِي، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِي» ''اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین، اپنی دنیا اور اپنے اہل و مال میں معافی اور عافیت طلب کرتا ہوں، اے اللہ! میرے عیوب کو چھپا لے اور میری گھبراہٹوں سے مجھے امن دے۔ اے اللہ! میرے آگے سے، میرے پیچھے سے، میرے دائیں سے، میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے میری حفاظت فرما اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں، اس بات سے کہ اپنے نیچے سے اُچک لیا جاؤں۔''[1] (رواه البزار في مسنده و تفرّد به وحسّنه)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان دعاؤں کو صبح و شام نہ چھوڑتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلٰى قَوْلِهٖ وَأَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ أَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِي» امام وکیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحت سے مراد خسف ہے۔[2] (ورواه أبو داود والنسائي و ابن ماجه و ابن حبان والحاكم وقال صحيح الإسناد)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ بائے موحدہ سببیت کے واسطے ہے یا قسم کے لیے ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ قسم کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [صٓ: ٨٢] ''تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کروں گا۔'' اغوا کے معنی ہیں غيّ میں ڈالنا۔ یہاں غی سے مراد ترکِ سجود ہے۔ اللہ نے اس کو اغوا کیا

---

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (٤/ ٦٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٧٤)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٧٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٧١) صحيح ابن حبان (٣/ ٢٤١) مستدرك الحاكم ١٠/ ٦٩٨) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٦٠)

کہ اس نے ضلالت کو ہدایت پر اختیار کیا، یا اغوا سے مراد لعنت ہے، یعنی جب کہ تو نے مجھ کو ملعون کیا تو میں ان کے بہکانے میں کوتاہی نہیں کروں گا۔

لعین کا اس اظہار سے یہ مطلب تھا کہ میں اپنا بدلہ اس شخص سے اس طرح لوں گا کہ اس کی اولاد کو گمراہ کروں گا، ان کا پیچھا نہ چھوڑوں گا، جیسا میں مطرود ہوا ہوں یہ بھی مردود ہوں۔ حق کا سیدھا راستہ جو جنت کو پہنچاتا ہے، ان کے لیے اس راستے پر بیٹھ جاؤں گا اور صحیح راستے پر چلنے سے روکوں گا۔ راہ کی تخصیص کی ضرورت نہیں، سب راہوں سے وہ باز رکھتا ہے، خواہ وہ راہِ مکہ ہو، یعنی ہجرت یا راہِ اسلام یا حج یا جہاد۔ اس راستے کو عام کے معنی میں لینا زیادہ صحیح ہے، مطلب یہ ہے تیری عبادت اور اطاعت نہ کرنے دوں گا، مشرک بدعتی بناؤں گا، تاکہ جنت کی راہ سے باز رہ کر جہنم کی راہ پر چلیں اور مستحقِ نار ٹھہریں۔ نجات نہ پائیں اور ہلاک ہوں، جس طرح سجدہ نہ کرنے سے میں ہلاک، برباد اور تباہ ہو گیا ہوں۔

پھر اپنا ان کے پاس چاروں طرف سے آنا ذکر کیا، اس لیے کہ دشمن کے آنے کی راہیں یہی ہیں۔ اس لیے اوپر اور نیچے کی سمت کا ذکر نہیں کیا۔ سامنے اور پیچھے کو ﴿ مِنْ ﴾ کے حرف سے اور دائیں اور بائیں کو ﴿ عَنْ ﴾ کے حرف سے ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ آگے پیچھے سے جو کوئی آتا ہے وہ غالباً سارے بدن سے بالکل آتا ہے اور جو دائیں اور بائیں طرف سے آتا ہے وہ منحرف ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شیطان کو ان دونوں طرف سے ایک طرح کی دوری رہتی ہے، کیوں کہ دائیں اور بائیں طرف فرشتے بیٹھے رہتے ہیں اور شیطان فرشتوں سے بھاگتا ہے۔ اس لیے پہلی دو طرفوں کے لیے حرف ﴿ مِنْ ﴾ اور دوسری دو اطراف کے لیے حرف ﴿ عَنْ ﴾ زیادہ مناسب ہوا۔ یہ وسوسہ اور جھوٹی باتیں بنانے میں شیطان کی تمثیل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی اُن کے لیے معاصی کو مزین کیا اور باطل کو ان پر مخفی رکھا۔[1] حکم بن عتبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سامنے سے آکر دنیا کو مزین کر کے دکھایا۔ پیچھے سے آکر آخرت سے ہٹایا اور دور ڈالا۔ دائیں سے آکر حق سے روکا اور باز رکھا۔ بائیں سے آکر باطل کو رونق دار دکھایا۔[2] تحت سے اس لیے نہیں آتا کہ تکبر سے وہ علو کو پسند کرتا ہے یا اس لیے کہ تحت سے آنے سے جس کے پاس آوے اس کو گھبراہٹ ہوتی ہے، نفرت کرتا ہے اور شیطان انسان کی تالیف کا محبّ ہے نہ کہ تنفیر کا، لہٰذا انہی چاروں طرف سے آتا ہے نہ نیچے اور اوپر سے۔ یا سامنے کا مطلب ہے کہ جو عمر باقی رہ گئی ہے اس میں اطاعت کی طرف نہ جا سکے۔ پیچھے کا مطلب ہے کہ جو عمر گزر چکی ہے اس سے تائب نہ ہو۔ دائیں طرف سے راہِ غنا سے آتا ہے، تاکہ خرچ نہ کریں، شکر بجا نہ لائیں، بائیں طرف سے راہِ فقر سے آتا ہے کہ محظورات سے باز نہ رہیں۔

---

[1] الدر المنثور (٣/ ٤٢٦۔ ٤٢٧) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٤٠)

شقیق بلخی نے کہا ہے کہ کوئی صبح نہیں ہوتی مگر شیطان چار جگہ میری تاک میں بیٹھتا ہے۔ سامنے آ کر کہتا ہے: تو مت ڈر، اللہ غفور رحیم ہے، میں یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ [طٰہٰ: ٨٢] ''اور بے شک میں بہت بخشنے والا ہوں اس کے لیے جو توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر ہدایت پر رہے۔'' پیچھے آ کر کہتا ہے: اولاد کا خیال کر وہ محتاجی میں نہ پڑیں، میں یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ [ھود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔'' دائیں طرف سے آ کر ثنا کرتا ہے، میں کہتا ہوں: ﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٨] ''اور (اچھا) انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے۔'' بائیں طرف سے آ کر شہوات سجھاتا ہے، میں کہتا ہوں: ﴿ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ﴾ [السبا: ٥٤] ''اور ان کے اور ان چیزوں کے درمیان جنھیں وہ چاہتے ہیں، آڑ حائل کر دی جائے گی۔''[1]

بعض نے کہا کہ ان چاروں سمتوں کا ذکر تاکید اور مبالغے کی غرض سے ہے۔ دل کے اندر وسوسے کا ڈالنا صرف اسی چوراہے ہی پر موقوف نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سب طرح پر جو ممکن ہیں سب بھروسوں کے ساتھ ابن آدم کے پاس آتا ہے، مگر اس کو حقیقی معنی پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے۔ یہ ظاہر کا آنا جانا اضلال اور ظاہرِ حال کے اغوا کے طور پر ہوا، رہا باطن کا گمراہ کرنا سو حدیث میں آیا ہے کہ «اَلشَّيْطَانُ يَجْرِيْ مِنِ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ» یعنی شیطان خون کی طرح رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔[2] غرض یہ کہ آدم کی اولاد کی ظاہری اور معنوی گمراہی کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا، شیطان کی عداوت اور کینہ پروری اور حسد ورزی کا کیا ٹھکانا ہے۔ شیطان کی یہ دشمنی اور انسان کی اس سے یہ دوستی کہ اگر ایمان بھی لاتے ہیں تو بھی کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا رہ کر دشمن کو خوش کر دیتے ہیں، دعویٰ اسلام کا ہے، مدعی ایمان ہیں، مگر پیر پرست، گور پرست، تقلید پرست، بدعت پرست اور نیاز و نذر پرست ہیں۔ إنا لِلّٰه ؎

بقول دشمن پیمان دوست بشکستی — ببین کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی

''دشمن کے کہنے پر دوست کا پیمان تو نے توڑ دیا ہے۔ ذرا دیکھ! کس سے تو نے تعلق توڑ لیا ہے اور کس سے تعلق جوڑ لیا ہے؟!''

شیطان نے کہا: جب میں آدمیوں سے ایسا برتاؤ کروں گا تو اے رب! پھر تو اکثر بنی آدم کو شاکر نہ پائے گا، یعنی بلکہ وہ ناشکرے ہوں گے۔ شکر سے مراد توحید یا ایمان یا طاعت یا سچ مچ شکر ہے۔ یعنی یہ اثر ان میں میرے وسوسے اور اغوا کا ظاہر ہوگا، سو شیطان کی یہ اٹکل انسان کے حق میں ٹھیک پڑی۔ یہ گمان اس نے اس بنیاد پر کیا تھا کہ

---

[1] الکشاف (٢/ ٨٩۔ ٩٠)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٩٣٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١٧٤)

شر کی ابتدا کرنے کے لیے بہت سی جگہیں ہیں اور خیر کو شروع کرنے کی ایک ہی جگہ ہے۔ یا ملائکہ سے سن کر یہ بات کہی، یا لوحِ محفوظ میں لکھا دیکھا، مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔[1]

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ نے فرمایا: نکل جا اس سے ذلیل دھتکارا ہوا، پھر ان میں سے جو تیری پیروی کرے گا، تو یقیناً میں جہنم کو تم سب سے ضرور بھروں گا (18)

شیطان کا دھتکارا جانا اور جہنمی ٹھہرنا:

اللہ نے شیطان پر لعنت وطرد (دھتکارنا) و دوری ونفی کو محل ملائے اعلیٰ سے موکد فرمایا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ مذؤم بمعنی عیب دار ہے۔ ذأم بمعنی عیب، یہ عیب میں ذم سے زیادہ بلیغ ہے۔ ''مدحور'' بمعنی الگ الگ کیے گئے، دور کیے گئے، ایک طرف کیے گئے ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: مذموم و مذؤم ایک چیز ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی صَغِیْرًا مَّقِیْتًا (ذلیل اور مغضوب) امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مقیت مطرود (دور کیا گیا) ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا یعنی لَعِیْنًا مَّقِیْتًا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مَنْفِیًّا مَّطْرُوْدًا، یعنی کھدیڑا ہوا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا: مذؤم بمعنی منفی (جلا وطن)، مدحور بمعنی مصغّر (ذلیل) یعنی نکالا ہوا، ذلیل وخوار کیا ہوا۔[2]

یہ فرمانا کہ میں جہنم کو تم سب سے بھر دوں گا، اس آیت کے مثل ہے: ﴿ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٣- ٦٥] ''اللہ نے فرمایا: جا! پھر ان میں سے جو تیری اتباع کرے گا تو بلاشبہ تمھاری سزا جہنم ہے، پوری پوری سزا۔ اور ان میں سے جن پر بھی تیرا بس چل سکے انھیں اپنی آواز سے بہکا لے اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا، اور مال اور اولاد میں ان کا شریک بن جا، اور انھیں (جھوٹے) وعدے دے، اور شیطان تو انھیں بس فریب ہی کا وعدہ دیتا ہے۔ بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں، اور آپ کا رب کارساز کافی ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نکل یہاں سے، یعنی آسمان یا بہشت یا فرشتوں کی جماعت سے۔ عیبی، حقیر، مردود، مطرود، ممقوت، مُقصی، مُبعد، یہ سب الفاظ معانی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مجھ کو بھی قسم ہے کہ جو

[1] فتح البيان (٤/ ٣١٣- ٣١٦) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٤٢- ٣٤٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٦)

آدمی تیرا تابع ہوگا میں جہنم کو تم سے پر کروں گا۔ اس جواب میں جو ڈانٹ ڈپٹ ہے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس آیت میں تغلیب حاضر غائب پر کی ہے۔ حاضر ابلیس تھا، غائب ناس تھے، جن کا ابلیس نے ستیاناس کیا، اپنے تابعدار بنا کر اپنے ساتھ جہنم کے طبقات میں لے گیا۔[1] اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا

وَيٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾

اور اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو، اور تم دونوں جہاں سے چاہو کھاؤ اور تم دونوں اس درخت کے قریب مت جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (19) پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکانے کے لیے (ان کے دل میں) وسوسہ ڈالا، تاکہ ان کے لیے ان کی شرم گاہیں ظاہر کر دے، جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اور شیطان نے کہا: تمھارے رب نے تمھیں اس درخت سے صرف اس لیے روکا ہے کہ (کہیں) تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ، یا (کہیں) تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ (20) اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ بے شک میں تم دونوں کے خیر خواہوں میں سے ہوں (21)

آدم وحوا کی جنت میں سکونت، شیطان کا پھسلانا اور ان کا شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانا:

حاجتِ شہوت اور حاجتِ استنجا کے عیب ڈھکے تھے۔ جنت میں ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے کہ کبھی اتارنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ اپنے اعضا سے واقف نہ تھے، جب یہ گناہ ہوا تو بشری لوازمات پیدا ہوئے۔ اپنی حاجت سے خبردار ہوئے اور اپنے اعضا دیکھے۔ اللہ پاک نے اس آیتِ شریفہ میں یہ ذکر کیا ہے کہ ہم نے جنت کو آدم اور حوا پر مباح کر دیا تھا کہ جتنے پھل میوے اس میں ہیں جس کو چاہو کھاؤ، اڑاؤ، مگر ایک درخت کے پاس نہ جاؤ۔ اس کا ذکر سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اس پر شیطان نے حسد کیا، مکر و فریب و وسوسہ و دھوکے میں کوشش بجا لایا، تاکہ وہ نعمت اور لباسِ حسن ان سے چھین لیا جائے، آخر جھوٹ اور افترا پردازی کے ذریعے یہ بات بنائی کہ تم کو جو اس درخت سے منع کیا ہے، اس میں یہی بھید ہے کہ کہیں تم اس درخت کا پھل کھا کر فرشتہ یا خالد

---

[1] فتح البیان (٤/ ٣١٦)

(ہمیشہ رہنے والے) نہ ہو جاؤ۔ سو اگر تم اس درخت کو کھاؤ گے تو یہ بات تم کو حاصل ہو جائے گی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَآدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴾ [طٰهٰ: ١٢٠] ''اے آدم! کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور بادشاہی نہ بتاؤں جو پرانی نہ ہو؟'' یعنی تاکہ تم دونوں فرشتے نہ بنو۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور یحییٰ بن کثیر رحمہ اللہ کی قراءت بکسر لام ہے، [1] یعنی کہیں تم اس جگہ بادشاہ اور بیگم نہ ہو جاؤ۔ جمہور کی قراءت بہ فتح لام ہے، پھر اس جھوٹ پر اللہ کی قسم کھائی کہ میں تمھارا خیر خواہ ہوں، دوستی کی راہ سے میں نے یہ بات تم کو سمجھا دی ہے، کیوں کہ میں تم سے پہلے سے اس جگہ پر رہتا بستا ہوں۔ اس دوکان و مقام کو بخوبی جانتا پہچانتا ہوں۔ صیغہ مفاعلت کا یہاں یک طرفی ہے، غرض کہ اللہ کا نام لے کر اللہ کی قسم کھا کر فریب دیا۔ وہ دونوں اس کے مکر میں آ گئے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ ''قَدْ يُخْدَعُ الْمُؤْمِنُ بِاللّٰهِ'' ''مومن اللہ کے نام سے دھوکا کھا جاتا ہے۔'' [2] ضعیف حدیث میں آیا ہے: «اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ، وَّ الْمُنَافِقُ خَبٌّ لَئِيْمٌ» [3] (مومن بھولا اور شریف ہے اور منافق مکار اور کمینہ) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ابلیس نے قسم اٹھائی کہ میں تم سے پہلے پیدا ہوا ہوں، تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں، تم میرے کہنے پر چلو، راہ پاؤ گے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے: ''مَنْ خَدَعَنَا بِاللّٰهِ انْخَدَعْنَا لَهٗ'' ''جو کوئی ہم کو اللہ کا نام لے کر دھوکا دے گا تو ہم اس کے دھوکے میں آ جائیں گے۔'' [4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے جب ابلیس کو نکالا تو آدم سے کہا: جنت تمھارا مسکن ہے۔ کسی نے کہا کہ آدم کے جنت میں داخل ہونے سے قبل حوا پیدا ہوئی تھیں۔ کسی نے کہا: جنت میں داخل ہونے کے بعد۔ کسی نے کہا خطاب معدوم کو ہے، اس لیے کہ وہ معدوم اللہ کے علم میں موجود تھا۔ بہرحال گھر بتا کر فرمایا کہ جنت کے پھلوں اور میووں میں سے جس کو چاہو نوشِ جان کرو، کچھ روک ٹوک نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ﴾ [البقرة: ٣٥] ''اور اس میں سے سیر ہو کر کھاؤ جہاں سے چاہو۔''

﴿ حَيْثُ ﴾ ظرفِ مکان ہے، یعنی جس درجہ و طبقۂ جنت میں چاہو بیٹھ کر کھاؤ، یہاں ﴿ فَكُلَا ﴾ بحرف فا کہا، سورۃ البقرہ میں ﴿ وَكُلَا ﴾ بحرف واؤ فرمایا۔ وہاں جنس مراد ہے، یہاں نوع (قسم) مقصود ہے۔ مگر ایک درخت سے منع کر دیا تھا۔ وہ کون سا درخت تھا اس کا اختلاف سورت بقرہ میں گزر چکا۔ کوئی بھی ہو نہی کا مقتضا کھانے کا حرام ہونا تھا۔ اسی لیے کہا کہ اگر اس کے پاس جاؤ گے تو ظالم ہو جاؤ گے، یعنی اللہ کے نافرمان اور گناہ گار ٹھہرو گے۔ شیطان نے ان کے جی میں وسوسہ ڈالا۔ وسوسہ چھپی ہوئی آواز یا حدیثِ نفس کو کہتے ہیں۔ وسواس شیطان کا نام بھی ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٤٨۔ ٣٤٩) [2] تفسیر ابن كثیر (٢/ ٢٧٧)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٧٩٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٩٦٤) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٩٣٥) البتہ سنن وغیرہ میں ''منافق'' کے بجائے ''فاجر'' کے الفاظ ہیں۔ [4] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥١)

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ زمین میں آسمان تک، پھر جنت تک وسوسہ ڈالتا ہے، یہ قوت اسے اللہ نے دی ہے۔

ابو مسلم اصبہانی کہتے ہیں، بلکہ آدم و ابلیس دونوں جنت میں تھے، اس لیے کہ وہ جنت زمین میں تھی۔[1] بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ابلیس سانپ کے پیٹ میں گھس کر جنت میں گیا، وہاں وسوسہ ڈالا، ایک قصہ رکیک ہے۔ یہ کام شیطان نے اس لیے کیا، تاکہ آدم ننگے لُچے ہو جائیں، کپڑے اتر جائیں، ستر کھل جائے۔ شرم گاہ کو سَوْءٰت اس لیے کہا کہ اس کا ظاہر ہونا برا لگتا ہے۔ پہلے شرم گاہ چھپی ہوئی تھی، نہ خود آدم کو نظر آتی نہ ایک دوسرے کے ستر کو دیکھتا، اب اس تدبیر سے ان کو برہنہ کرنا چاہا۔ جب یہ خطا ان سے ہوئی تو کپڑے اتار لیے گئے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ چھپی ہوئی چیز کا کھل جانا منکرات اور محرمات میں سے ہے، ہمیشہ سے طبیعتوں اور عقلوں میں اسے برا ہی سمجھا گیا ہے۔ جو لوگ اس کی پروا نہیں کرتے، وہ جامۂ انسانیت سے عاری ہیں۔

پھر شیطان نے آدم اور حوا سے کہا: سنو! تم کو جو تمھارے پروردگار نے اس درخت سے روکا ہے اور منع کیا ہے، سو اس لیے کہ کہیں تم فرشتہ صفت ہو کر عالمِ خیر و شر بن کر غذا سے مستغنی نہ ہو جاؤ یا جنت میں رہ پڑو اور مرو نہیں۔ یعنی اگر فرشتہ نہ ہو گے تو خالد (ہمیشہ رہنے والے) تو ہو ہی جاؤ گے، پھر کبھی نہ مرو گے۔ ان دو باتوں میں سے ایک بات تو ضرور ہی تم کو حاصل ہو جائے گی۔

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں کئی جگہ ملائکہ کو ساری مخلوق پر فضیلت دی ہے، جیسے یہ آیت اور وہ آیت: ﴿ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ ﴾ [هود: ٣١] ''اور نہ میں کہتا ہوں کہ بے شک میں فرشتہ ہوں۔'' اور وہ آیت: ﴿ وَلَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴾ [النساء: ١٧٢] ''اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہے۔'' امام ابن فورک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کوئی حجت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ فرشتہ ہونے سے یہ مراد ہو کہ خواہشِ طعام باقی نہ رہے یا عمرِ دراز ملے نہ یہ کہ ملائکہ آدم سے افضل ہیں۔ یہی ابو السعود رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔

اس مسئلے میں لوگوں کا بڑا اختلاف ہے، بڑا لمبا چوڑا کلام کیا ہے، لیکن سچ پوچھو تو ہم اس مسئلے کے ساتھ مکلّف نہیں ہیں، جب نہیں ہیں تو اس میں کلام کرنا فضول ہے۔ ابن العلاء نے قراءت کسرِ لام کا انکار کیا ہے۔ کہا: آدم سے پہلے کوئی بادشاہ نہ تھا جو ان کا بادشاہ ہونا سناتا۔ جس نے کہا: بکسرِ لام ہے، اس کی دلیل لفظ ﴿ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴾ [طٰهٰ: ١٢٠] ''اور بادشاہی نہ بتاؤں جو پرانی نہ ہو۔'' امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قراءتِ شاذ ہے۔[2] پھر شیطان نے آدم و حوا کے سامنے اللہ کی قسم کھائی کہ وہ ان کا دلی خیر خواہ ہے۔ کسی نے کہا: آدم و حوا نے بھی قبول پر قسم کھائی، اس لیے مفاعلت کا صیغہ آیا ہے کہ دونوں طرف سے قسما قسمی ہوئی۔[3]

---

[1] تفسير الخازن (٢/ ٢١٦)
[2] فتح القدير (٢/ ٢٧٤) تفسير أبي السعود (٣/ ٢٢٠)
[3] فتح البيان (٤/ ٣١٧ـ ٣١٩)

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ

چناں چہ شیطان نے ان دونوں کو دھوکا دے کر پھسلا دیا، پھر جب ان دونوں نے اس درخت کا پھل چکھا تو ان دونوں کی شرمگاہیں ان پر ظاہر کر دی گئیں، اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے (تاکہ ستر ڈھانک سکیں)۔

نافرمانی کی وجہ سے ستر کھل جانا:

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''آدم ایک مردِ طویل تھے جیسے کھجور کا درخت، ان کے سر پر بہت بال تھے۔ جب خطا میں پڑے، ستر کھل گیا، پہلے ان کو اپنا ستر نظر نہ آتا تھا، جنت میں بھاگ نکلے۔ بہشت کا ایک درخت سر سے الجھ گیا، اس سے کہا: مجھے چھوڑ دے، اس نے کہا: میں تجھ کو نہ چھوڑوں گا، اتنے میں اللہ پاک نے پکار کر کہا: اے آدم! کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ کہا: اے رب! میں شرماتا ہوں۔'' اس کو ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسناد موقوف ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''وہ درخت جس سے آدم علیہ السلام اور ان کی بی بی کو منع کیا تھا، سنبلہ تھا، جب اس کو کھایا تو ستر کھل گئے، پہلے ناخن ساتر تھے، اب انجیر کے پتے لے کر گانٹھنے لگے۔ آدم جنت میں پیٹھ پھیر کر چلے، ان کے سر سے جنت کا ایک درخت لٹک گیا.... الخ۔''[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''پتوں کو کپڑوں کی طرح گانٹھا اور جوڑا۔'' امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم و حوا کا لباس ان کی شرم گاہوں پر نور تھا، ایک دوسرے کے ستر کو دیکھ نہ سکتا تھا، جب درخت کھایا تو وہ نور جاتا رہا اور ستر نظر آنے لگے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ شیطان نے آدم و حوا کو پھسلا کر قسم کا دھوکا دے کر اس بلند مرتبے سے گرا کر درخت کے کھانے پر لگا دیا یا زمین پر آسمان سے لا کر ڈالا یا ہلاکت میں گرفتار کیا یا فریب دیا یا معصیت پر جراءت دلا کر جنت سے نکلوا دیا۔ یہ سب لفظ تَدْلِيَه کے معنی ہیں۔ جب انھوں نے درخت چکھا تو ان کے ستر کھل گئے، ہر ایک نے اپنی قُبل اور دوسرے کی قُبل اور دُبر دیکھی۔ وہ نور جو ستر پر تھا سمٹ گیا، عیب ظاہر ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ بدن سے کپڑے اتر گئے جو ایک دوسرے کا اندام (شرم گاہ) پوشیدہ تھا وہ دیکھنے میں آیا، ورنہ پہلے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۳۵۲۔ ۳۵٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۱۲/ ۳۵۲۔ ۳۵۳) اس کی سند میں ''حسن بن عمارہ'' متروک راوی ہے۔ [3] تفسیر الطبري (۱۲/ ۳۵۳۔ ۳۵۵)

دونوں کو دکھائی نہ دیتا تھا۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ان کا لباس ناخن تھا سارے بدن پر۔[2] جب وہ لے لیا گیا تو ہاتھ پاؤں میں بطور یادگار و زینت اور انتفاع کے لیے باقی رہ گیا، یعنی چھلکے کی شکل پر سارا تن بدن ناخن قسم کی چیز سے چھپا ہوا تھا۔ درخت کھانے کی سزا کے طور پر وہ چھلکا اتر کر اتنا سا بطور نشانی رہ گیا۔ بعض نے کہا کہ جنت کے کپڑے تھے۔ بظاہر یہی زیادہ حقیقت کے قریب ہے، اس لیے کہ لفظ لباس کا اطلاق کپڑے پر ہونا ذہن میں آتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کا لباس تقویٰ تھا۔[3] لفظ ذوق اس بات پر دلیل ہے کہ اس کا مزہ جاننے کے لیے اس درخت کا ذرا سا مزہ چکھا تھا، جس پر یہ سزا ملی۔ اب جنت کے درختوں کے پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے۔ کسی نے کہا کہ ورق تین تھے، کسی نے کہا کیلے کے پتے تھے، مطلب یہ کہ پتے توڑ کر شرم گاہ سے چپکانے لگے، تاکہ ستر نظر نہ آئے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آدم علیہ السلام جب جنت میں بسے تو ان کو ناخن کا ایک پاجامہ پہنایا، جب ان سے خطا ہوئی تو وہ سربال یعنی ازار لے گئی، انگلیوں کے کناروں پر کچھ باقی رہ گئے۔[4] انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آدم علیہ السلام کا لباس جنت میں یاقوت تھا، جب نافرمانی کی تو سمٹ کر ناخن بن گیا۔[5] زیادہ صحیح یہ ہے کہ کوئی لباس تھا جو اتر گیا۔ وہ اس کے گر جانے سے ننگے ہو گئے۔ اللہ اور رسول جب تک کسی خاص لباس کا تعین نہ فرمائیں یا کسی خاص درخت کے پتوں کا ذکر نہ کریں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کون سا جامہ اور کون سا پتّا تھا۔ اتنا معلوم ہے کہ عورت (پوشیدہ حصے) کو چھپانا عقل کے نزدیک بھی اچھا ہے۔ ابن آدم کا ستر کھل جانا بدنما اور ناجائز ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شرم گاہوں کو چھپانے کے لیے پتوں کو جوڑنے اور چپکانے میں جلدی کی اور شرم گاہوں کے کھل جانے کو بہت برا سمجھا۔[6]

وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور ان کے رب نے ان کو آواز دی: کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا؟ اور میں نے تمھیں یہ (نہیں) کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے؟ (22) انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ ظلم کیا، اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے (23)

---

[1] تفسير البغوي (۳/ ۲۲۰) [2] تفسير الطبري (۱۲/ ۳۵٤) [3] تفسير الطبري (۱۲/ ۳۷۵)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ۱٤٥۲) اس کی سند میں "حسن بن ابی جعفر" ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ۱٤٥۹) اس کی سند میں "رشدین بن سعد" ضعیف راوی ہے۔ [6] فتح البيان (٤/ ۳۲۰۔۳۲۱)

اللہ کا آدم وحوا کو سرزنش کرنا اور ان دونوں کا توبہ کرنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے آدم کو پکار کر فرمایا: اے آدم! کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ کہا: نہیں، لیکن تجھ سے شرماتا ہوں اے میرے رب! فرمایا: جو کچھ میں نے تجھ کو اس جنت میں دیا تھا اور مباح کیا تھا وہ تجھ کو کافی نہ تھا، جو تو نے حرام چیز پر ہاتھ ڈالا؟ کہا: سچ ہے اے رب! لیکن قسم ہے تیری عزت کی! میں نے خیال نہ کیا کہ کوئی شخص تیری جھوٹی قسم بھی کھاتا ہے۔ فرمایا: مجھ کو اپنی عزت کی قسم ہے! میں تجھ کو زمین پر اتاروں گا، پھر تجھ کو محنت، مشقت اور تکلیف سے جینا ملے گا، غرض کہ دونوں کو جنت سے نکال دیا گیا۔ وہاں بے تکلف کھاتے پیتے تھے۔ یہاں آ کر محنت سے کھانا پینا ملا۔ لوہے کی صنعت سیکھی، کھیتی کرنے کا حکم ہوا۔ ہل جوتا، بویا، سینچا، کاٹا، روندا، اڑایا، پھونکا، پیسا، گوندھا، پکایا پھر کھایا۔ سو اس کو بھی نہ پہنچا مگر اتنا جتنا کہ اللہ نے چاہا۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: آدم علیہ السلام نے کہا تھا: اے رب! بھلا اگر میں توبہ کروں، بخشش چاہوں؟ فرمایا: تو پھر تجھے جنت میں داخل کروں گا۔ ابلیس نے توبہ کا سوال نہ کیا، مہلت مانگی، سو ہر ایک کو اس کا سوال دیا۔[2] اَللّٰهُمَّ غُفرا. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام نے درخت سے کھایا تو کہا گیا کہ تو نے اس شجر ممنوعہ سے کیوں کھایا؟ آدم علیہ السلام نے کہا: مجھ سے حوا نے کہا۔ فرمایا: میں نے اس کے پیچھے یہ امر لگایا ہے کہ حاملہ نہ ہو مگر تھک کر، وضع حمل نہ کرے مگر تھک کر، حوا اُس وقت اونچی آواز سے رونے لگیں، کہا گیا کہ یہ رنّہ (آواز نکالنا) تجھ پر اور تیری اولاد پر قائم رہے گا۔[3] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ وہی کلمے ہیں جو آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے سیکھ لیے تھے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ کا ان دونوں کو پکارنا بطور سزا کے تھا کہ جس چیز سے تم کو ڈرایا تھا تم اس سے کیوں نہ بچے؟ تم کو شیطان کی دشمنی کے بارے میں تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دیکھو سجدہ نہ کرنے سے اُس کا حسد اور بغاوت کھل چکی ہے، وہ تم دونوں کا جانی دشمن ہو گیا ہے۔ سو تم پھر اسی کے کہنے پر چلے، جیسے سورت طٰہٰ میں فرمایا: ﴿ فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ ﴾ [طٰہٰ: ١١٧] ''پھر ہم نے کہا: اے آدم! بے شک یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ اُس نے تیری قسم کھائی، میں کیا جانتا تھا کہ تیری مخلوق میں سے کوئی تیری جھوٹی قسم بھی کھاتا ہے۔[5] پھر اپنے گناہ اور ظلم کا اقرار کیا، بخشش اور رحمت چاہی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انبیا علیہم السلام سے بھی لغزش ہو جاتی ہے۔[6]

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥٢۔ ٣٥٣) اس کی سند میں ''حسن بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥٧)
[3] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٤١٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[4] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٥٦) [5] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٥٣) [6] فتح البیان (٤/ ٣٢١)

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿٢٥﴾

اللہ نے کہا: تم اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں زمین میں ٹھہرنا اور ایک (مقررہ) وقت تک فائدہ (اُٹھانا) ہے ﴿24﴾ اور فرمایا: تم اسی (زمین) میں زندہ رہو گے، اور اسی میں تم مرو گے اور (قیامت کے دن) اسی سے تم نکالے جاؤ گے ﴿25﴾

ان کو زمین پر اتارنا:

یہ خطاب جمع کے صیغے سے آدم وحوا وابلیس وسانپ کو ہے، بعض نے سانپ کا ذکر نہیں کیا۔ سب سے زیادہ عداوت میں یہی آدم وابلیس ہیں، لہٰذا سورت طٰہٰ میں فرمایا ہے: ﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۳] ''اس (اللہ) نے فرمایا: تم دونوں یہاں سے اکٹھے اتر جاؤ۔'' حوا تابع آدم ہیں، سانپ کا ذکر اگر صحیح ہو تو وہ تابع ابلیس ٹھہرے گا۔ مفسرین نے ان جگہوں کا ذکر کیا ہے، جہاں ان میں سے ہر ایک اترا ہے۔ ان خبروں کا حاصل اسرائیلیات کی خبروں کی طرف رجوع کرتا ہے، اللہ ہی جانے کہ وہ خبریں صحیح ہیں یا نہیں، اگر ان جگہوں کی تعیین میں کوئی دین ودنیا کا فائدہ ان مکلفین کے لیے ہوتا تو اللہ پاک اپنی کتابِ مستطاب میں اور رسول اللہ ﷺ اپنی سنتِ مطہرہ میں ضرور ان کا ذکر فرماتے۔ پھر فرمایا کہ تمھارے لیے زمین میں ایک مدت معلوم تک ٹھہرنا اور زندگی گزارنا ہے، جس کو قلم نے لکھ دیا ہے اور تقدیر نے گن رکھا ہے اور کتاب اول میں تحریر کر دیا گیا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مستقر زمین کے اوپر اور نیچے ہے۔[1] یعنی روئے زمین پر جینا اور مر کر زیرِ زمین میں قبروں میں جانا اور پھر نکلنا، سب اسی زمین سے ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ﴾ [طٰہٰ: ۵۵] ''ہم نے تمھیں اسی (زمین) سے پیدا کیا اور اسی میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی میں سے تمھیں ایک بار پھر نکالیں گے۔'' اللہ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ زمین آدمی زاد کا گھر ہے، اس دنیا کی زندگی تک، زندگی، موت، قبر اور پھر اٹھنا ان سب کا اسی سے ہوگا۔ قیامت کے دن اللہ سارے پہلوں اور پچھلوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل اور فعل کی جزا وسزا دے گا۔

فتح البیان کا بیان:

یہاں فتح البیان کا بیان یوں ہے کہ خطاب آدم وحوا اور ان کی اولاد کو ہے یا ان کو اور ابلیس کو یا سانپ کے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٥٥)

سمیت سب کو ہے۔ یہ قول طبری اور سدی رحمہ اللہ کا ہے۔[1] کہا: اترو! رستہ کاٹو! گھر جاؤ! تمھارے بعض تمھارے بعض کے دشمن ہیں! تمھاری زندگی کی جگہ زمین ہے! وہاں تم خوب کھاؤ پیو اور پہنو گے! یعنی مرنے تک یا اس دنیا کے ختم ہونے تک یا یومِ قیامت تک۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ اسی زمین میں تم جیو مرو گے، اس سے پھر آخرت کی طرف نکل کھڑے ہو گے۔ یہ چند روز کا جینا سفرِ آخرت کے لیے ہے۔[2]

زیست ایک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿26﴾

اے بنی آدم! بے شک ہم نے تم پر ایسا لباس نازل کیا جو تمھاری شرم گاہیں چھپاتا ہے اور زینت کا باعث ہے، اور پرہیزگاری کا لباس بہت بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں (26)

لباس اور زینت کا اتارنا:

یعنی دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروا لیے، پھر ہم نے تم کو دنیا میں لباس کی تدبیر سکھا دی، اب وہی لباس پہنو، جس میں پرہیزگاری ہو، یعنی مرد ریشمی لباس نہ پہنے، دامن دراز نہ رکھے اور جس سے منع کیا گیا ہے وہ کام نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آئے اور اپنی زینت نہ دکھائے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں کو لباس اور ریش کے بارے میں آگاہ کیا۔ لباس وہ ہے جو عیب ڈھانکے، ستر چھپائے۔ ریش وہ ہے جس سے ظاہر میں آرائش کی جائے، یعنی لباس ضروریات میں سے ہے اور ریش تکمیلِ جمالیات سے ہے۔[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ کلامِ عرب میں مال و اسباب اور کپڑوں کے ظاہر کو ریاش بولتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ریش بمعنی مال ہے۔ یہی امام مجاہد، عروہ بن زبیر، سدی، ضحاک رحمہم اللہ اور بہت سے اہلِ علم کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ریاش کے معنی لباس اور عیش اور نعمتیں ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ ریاش بمعنی جمال ہے۔[4]

امام ابو العلا شامی کہتے ہیں کہ ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے نیا کپڑا پہنا، جب گلے تک پہنچا تو کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ مَا أُوَارِيْ بِهِ عَوْرَتِيْ، وَأَتَجَمَّلُ بِهِ فِيْ حَيَاتِيْ» ”تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس نے مجھے لباس پہنایا، جس سے میں اپنی پوشیدہ چیز کو ڈھانپتا ہوں اور اپنی زندگی میں زینت حاصل کرتا ہوں۔“ پھر کہا کہ میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

---

(1) تفسير الطبري (١٢/ ٣٥٧_ ٣٥٨)
(2) فتح البيان (٤/ ٣٢٢)
(3) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٧٩)
(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ١٦٩٧) تفسير الطبري (١٢/ ٣٦٤_ ٣٦٦)

سے سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے نیا کپڑا لے کر پہنا، جب گلے تک پہنچا تو کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ... الخ» پھر پرانا کپڑا لے کر صدقہ کیا تو وہ شخص اللہ کی ذمے داری، اللہ کی ہمسائیگی اور اللہ کی حمایت میں رہے گا، زندہ اور مردہ۔'' [1] (رواہ أحمد والترمذي و ابن ماجه)

ابو مطر نے دیکھا کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان لڑکے کے پاس آ کر ایک کرتا تین درہم کو مول لے کر پہنا، وہ گھٹنوں سے ٹخنوں تک ہوا، پھر پہنتے وقت کہا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَزَقَنِيْ مِنَ الرِّيَاشِ مَا أَتَجَمَّلُ بِهٖ فِي النَّاسِ، وَأُوَارِيْ بِهٖ عَوْرَتِيْ» کہا یہ تم اپنے جی سے کہتے ہو یا نبیِ اکرم ﷺ سے سنا ہے؟ کہا: اس کو نبیِ اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ کپڑا پہنتے وقت اس طرح کہتے تھے۔ [2] (رواہ أحمد)

لباسِ تقویٰ:

لباسِ تقویٰ سے مراد وہ لباس ہے جو اہلِ تقویٰ قیامت کے دن پہنیں گے۔ امام زید بن علی، سدی، قتادہ اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے: لباسِ تقویٰ ایمان ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا عملِ صالح ہے۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ چہرے میں سمت حسن ہے۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کا ڈر ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ سے ڈر کر ستر چھپائے، یہی لباسِ تقویٰ ہے، [3] یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ جو فقرے ننگے دھڑنگے پڑے پھرتے ہیں اور جاہل لوگ ان کو ولی اللہ سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت ولیِ شیطان ہیں نہ کہ ولی اللہ۔ اللہ کے ولی متقی ہوتے ہیں جو ستر نہ چھپائے وہ متقی نہیں، وہ تو لباسِ تقویٰ سے برہنہ ہے اور جب متقی نہ ہوا تو اللہ کا ولی بھی ہرگز نہ ہوگا: ﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٤] ''اس کے متولی تو متقی لوگ ہی ہیں۔'' نصِ قطعی ہے اولیا اللہ کی شناخت کے بارے میں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے برسرِ منبر کہا تھا: اے لوگو! ان سرائر، یعنی پوشیدہ خصال میں اللہ سے ڈرو، میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا: نہیں چھپایا کسی نے کسی خصلت کو مگر اللہ اُس کو اس سریت (پوشیدگی) کی چادر علانیہ پہنائے گا۔ اگر خیر ہے تو خیر اور اگر شر ہے تو شر، پھر یہ آیتِ باب پڑھی۔ [4] (رواہ ابن جریر بطوله)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لباس کے پیدا کرنے کو اتارنا فرمایا، اس لیے کہ آسمان سے پانی اتر کر زمین سے روئی پیدا ہو کر کپڑا بنتا ہے تو گویا اللہ نے اُس کو اتارا ہے۔ یا ﴿ اَنْزَلْنَا ﴾ سے مراد ''رَزَقْنَا'' ہے، کہتے ہیں کہ سارے زمین

[1] مسند أحمد (١/ ٤٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٥٧) اس کی سند میں ''ابو العلاء شامی'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٥٤٢)

[2] مسند أحمد (١/ ١٥٧) اس کی سند میں ''ابو مطر'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٢٦٣)

[3] تفسير الطبري (١٢/ ٣٦٦۔ ٣٦٨) [4] تفسير الطبري (١٢/ ٣٦٧۔ ٣٦٨) اس کی سند میں ''سلیمان بن ارقم'' ضعیف راوی ہے۔

کے برکات آسمان کی طرف اور انزال کی طرف منسوب ہوتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾ [الحدید: ۲۵] ''اور ہم نے لوہا اتارا۔'' یہ لباس کو اللہ نے پیدا کیا، عیب کو چھپانے والا ہے، جس کو ابلیس نے ظاہر کر دیا تھا، یہاں تک کہ بے چینی میں پتے چپکانے کی حاجت ہوئی تھی، سو اب تم اُس سے اس لباس کے سبب بے نیاز نہ ہو۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کے کچھ لوگ کعبے کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے۔[1] اب بھی ہند کے اطراف میں ایسی قومیں ہیں جو برہنہ رہتی ہیں یا پتوں سے ستر چھپاتی ہیں۔ پوشیدہ جگہوں اور ستر پوشی کے واجب ہونے کا بیان کتبِ فقہ و سنت میں موجود ہے، جیسے فتح المغیث وغیرہ۔ ریش بہ معنی لباس ہے۔ ریش طائر بمعنی بال و پر ہے یا مراد ریش سے عیش و عشرت کی فراوانی ہے، یعنی آسودگیِ حال۔

پھر فرمایا کہ جامۂ تقویٰ بہتر ہے، یعنی اللہ سے ڈرنا۔ جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ خلافِ شرع لباس کبھی نہ پہنے گا، نہ کسی منکر عیش و عشرت کو پسند کرے گا۔ کسی نے کہا: مراد حیا ہے یا اسلام یا صوف اور عاجزی کے طور پر موٹے کپڑے کا لباس یا زرہ اور لوہے کی ٹوپی جو جہاد کا لباس ہے یا نماز میں ستر کو چھپانا یا اچھی شرعی صورت یا پارسائی، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ ہر اس شے پر صادق ہے جس میں اللہ کا خوف اور ڈر ہے، اس کے تحت تمام مذکورہ اقوال آ جاتے ہیں۔ کلامِ عرب میں یہ استعارہ بہت آیا ہے۔ اس کو بہترین لباس اور اجمل زینت فرمایا ہے، اس لیے کہ آخرت کی بدنامی کو چھپانے والا ہے۔

إذا أنت لم تلبس ثيابا من التقى عريت وإن وارى القميص قميص

''اگر تو نے تقوے کا لباس نہیں پہنا تو، تو ننگا ہے، چاہے قمیص کے اوپر قمیص پہن رکھی ہو۔''

یہ لباس کا اتارنا اللہ کے خالق ہونے پر ایک دلیل ہے، شاید یہ لوگ اس نعمت کا شکر کریں۔[2]

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَاۤ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۷

اے بنی آدم! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے، جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا جب اس نے ان دونوں کا لباس اُتروایا تھا، تاکہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھا دے۔ بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں دیکھتا ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنا دیا جو ایمان نہیں لاتے (27)

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٣٦١) [2] فتح البيان (٤/ ٣٢٢۔ ٣٢٣)

فتنۂ شیطان سے خبرداری:

اللہ نے بنی آدم کو ابلیس اور اس کی قوم سے ڈرایا ہے۔ ابو البشر علیہ السلام کے ساتھ اس کی پرانی عداوت بتائی ہے کہ دیکھو ابلیس نے آدم علیہ السلام کو نعمت کے گھر سے نکلوا کر تکلیفوں اور سختیوں کے گھر میں بھجوا دیا، شکِ عورت کا سبب ہوا، پہلے ستر چھپا تھا، اب کھل گیا۔ یہ اس کی دشمنی کا نتیجہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ [الكهف: ٥٠] ''کیا پھر (بھی) تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو، جبکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟ وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اے بنی آدم! کہیں فتنہ وابتلا میں نہ ڈالے تم کو شیطان کہ تم کو جنت میں داخل ہونے سے روک دے۔ یہ نہی اگرچہ شیطان کے لیے ہے، مگر حقیقت میں آدم زاد کے لیے ہے کہ کہیں تم شیطان کے فتنے میں گرفتار نہ ہو جاؤ، جیسا دھوکا اس نے تمھارے ماں باپ کو دیا تھا، ویسا ہی دھوکا تم کو نہ دے۔ جیسا ان کو بہشت سے نکالا تھا ویسا ہی تم کو بہشت سے نکالے۔ دیکھو ان دونوں کے کپڑے اتروا لیے تھے، وہ لباس ناخن تھا یا نور یا تقویٰ یا جامۂ جنت، یہی حقیقت سے زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ اتارنا پہننے کے بعد ہوتا ہے۔ قبیل بمعنی جماعت ہے۔

امام لیث رحمہ اللہ نے کہا: ہر جیل (نسل) جنوں اور انسانوں کا قبیل کہلاتا ہے،[1] مراد اعوانِ شیاطین ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جن اور شیاطین مراد ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ابلیس کی نسل مراد ہے۔[2] غرض کہ کپڑے اتروا کر دو کام کیے: ایک یہ کہ ان کا عیب ان کو دکھایا، دوسرے یہ کہ خود تو اپنے لشکر کے ساتھ مل کر ان کو دیکھتا ہے مگر یہ اس کو نہیں دیکھتے، یعنی جب وہ اپنی اصل صورت پر ہوتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں تو وہ اکثر نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے جنوں کی آنکھ میں ایک ادراک رکھا ہے جس سے وہ انسانوں کو دیکھتے ہیں۔ انسانوں کی آنکھوں میں وہ ادراک نہیں ہے۔ اس لیے یہ جن کو نہیں دیکھ سکتے۔ معتزلہ نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنوں کے اجسام پتلے اور نازک ہیں اور انسانوں کے جسم موٹے اور سخت کثیف ہیں۔

بعض اہلِ علم کا اس آیت سے یہ استدلال صحیح نہیں کہ شیطان کو دیکھنا بالکل ممکن نہیں، کیوں کہ مراد صرف یہی ہے کہ جہاں سے وہ ہم کو دیکھتے ہیں، ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے، نہ یہ کہ ان کو کبھی بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارا ان کو اس وقت نہ دیکھنا جس وقت وہ ہم کو دیکھتے ہیں یہ ثابت نہیں کرتا کہ ان کو دیکھنے کی مطلق نفی کی گئی ہے۔ مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو دشمن تجھ کو دیکھے تو اس کو نہ دیکھے یہ سخت تکلیف دہ چیز ہے، مگر جس کو اللہ بچائے۔[3] معنی یہ ہوئے کہ تم ایسے دشمن سے حذر کرو (ڈرو) جو تم کو دیکھتا ہے تم اس کو نہیں دیکھتے۔ حق یہ ہے کہ جن کی رؤیت احادیثِ صحیحہ کی دلیل سے

[1] تفسير الخازن (٢/ ٢٢١) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٧٦۔ ٣٧٧) [3] تفسير البغوي (٣/ ٢٢٣)

جائز ہے۔ آیتِ باب ان حدیثوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ بعض اوقات میں گوارا ہیں۔ بعض لوگوں کو، نہ کہ باقی دوسروں کو۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ شیطان بنی آدم میں خون کی جگہ پھرتا ہے۔ بنی آدم کے دل (سینے) ان کے مساکن ہیں، مگر جس کو اللہ محفوظ رکھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴾ [الناس: ٥] ''جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔'' سو جن بنی آدم کو دیکھتے ہیں، بنو آدم ان کو نہیں دیکھتے۔ (حکاہ الواحدي وابن الجوزي) امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابلیس نے کہا کہ ہمارے لیے چار چیزیں ہیں: ایک ہم دیکھتے ہیں، دوسرے دکھائی نہیں دیتے، تیسرے تحت الثریٰ سے باہر نکلتے ہیں اور چوتھے ہمارا بوڑھا جوان ہو جاتا ہے۔[1] سو اللہ نے شیاطین کو کفار کا مددگار، ساتھی، ولی اور رفیق کر دیا۔[2]

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَاۤ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۟ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ؕ فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اللہ قطعاً بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے؟ (28) کہہ دیجیے: میرے رب نے انصاف (کرنے) کا حکم دیا ہے اور (یہ کہ) ہر نماز کے وقت اپنے منہ سیدھے (قبلہ رخ) کر لو، اور خالص اسی کی اطاعت کرتے ہوئے اسی کو پکارو، جیسے اس نے تمھیں (پہلے) پیدا کیا (ویسے ہی) تم (اس کی طرف) لوٹو گے (29) ایک فریق کو اس نے ہدایت دی، اور دوسرے فریق پر گمراہی ثابت ہوگئی ہے، یقیناً انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنا لیا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ ہدایت یافتہ ہیں (30)

کفار کا فحاشی کا ارتکاب اور ننگے بدن طواف کرنا اور سند اللہ سے لانا:

یعنی سن چکے کہ پہلے باپ نے شیطان کا فریب کھایا، پھر باپ کی کیوں سند لاتے ہو۔ مجاہد نے کہا کہ مشرکین

[1] تفسیر الخازن (٢/ ٢٢١) [2] فتح البیان (٤/ ٣٢٤۔ ٣٢٦)

خانہ کعبہ کا طواف ننگ دھڑنگ کرتے تھے۔ کہتے جیسا ہم کو ہماری ماؤں نے جنا، ہم ویسا ہی طواف کرتے ہیں، عورت اپنے ستر پر کوئی تسمہ وغیرہ رکھ لیتی، کہتی:

اَلْیَوْمَ یَبْدُوْ بَعْضُهٗ اَوْكُلُّهٗ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا اُحِلُّهٗ[1]

''آج سارا جسم یا کچھ حصۂ بدن کھل جاتا ہے اور جو کھل جائے تو میں اس کو حلال نہیں سمجھوں گی۔''

اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی کہ اللہ کسی کو بے حیائی بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: سوائے قریش کے باقی عرب لباس میں طواف نہ کرتے، کہتے: جن کپڑوں میں معصیت کی ہے، ہم ان کپڑوں میں طواف نہ کریں گے۔ ایک صرف حمس یعنی قریش کپڑے پہنے ہوئے طواف کرتے تھے اور دوسرے کو بھی کپڑا عاریتاً دیتے تھے اور جو کوئی نئے کپڑے میں طواف کرتا تو وہ طواف کے بعد اس کو رکھ دیتا، کوئی اس کو نہ لیتا اور جس کو نیا کپڑا نہ ملتا یا کوئی قریشی اس کو عاریتاً نہ دیتا تو وہ ننگا منگا طواف کرتا۔ کبھی کوئی عورت بھی برہنہ ہو کر طواف کرتی تو اپنی شرم گاہ کو کسی چیز سے تھوڑا سا چھپا لیتی، جیسے لنگوٹی وغیرہ اور اکثر یہ ہوتا تھا کہ عورتیں رات کو طواف کرتیں، اس بدعت کو انھوں نے اپنی طرف سے نکالا تھا، اس میں باپ دادا کے قدم بقدم چلتے تھے، یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ان کے آبا و اجداد کا یہ فعل مستند ہے کسی اللہ کے حکم یا شریعتِ الٰہی کی طرف سے۔ اس پر اللہ نے انکار کیا، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یہ حکم اللہ نے دیا ہے تو اس سے کہو کہ اللہ عیب کے کام کا حکم نہیں دیتا، تم جو یہ بات کرتے ہو یہ بے حیائی اور برائی کا کام ہے، اللہ ایسا حکم کیوں کرنے لگا، کیا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہو جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔[2]

اللہ عدل کا حکم دیتا ہے:

اللہ نے تو عدل و استقامت اور دین پر چلنے کا حکم دیا ہے نہ کہ اس بے شرمی، بے حیائی اور بے عزتی کا کہ لچے لفنگے بنو اور ننگے پھرو۔ اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ تم ہر مسجد میں قبلہ رو ہو کر خاص اسی کی عبادت کرو، عبادت میں استقامت اختیار کرو اور اللہ کے رسول جن کے پاس معجزات ہوں وہ اللہ کی طرف سے جو کچھ خبر دیں اور لائیں، اس کو سچے دل سے مانو، شریعت اور عبادات میں اخلاص برتو، کیوں کہ اللہ کسی عمل کو ان دو خاصیتوں کے بغیر قبول نہیں کرتا: ایک تو یہ بات کہ جو عمل ہو وہ شریعتِ حقہ اور سنتِ مطہرہ کے مطابق ہو، دوسرے وہ کسی قسم کے شریک سے پاک اور خالص ہو۔

شروع کی پیدائش اور دوسری پیدائش کا مفہوم:

شروع کی پیدائش اور دوسری دفعہ کی پیدائش میں اختلاف ہے۔ امام مجاہد نے کہا: یعنی جس طرح پہلے تم کو پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر پیدا کرے گا، یعنی مرنے کے بعد زندہ کرے گا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ جیسا تم کو دنیا

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٧٧) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٨٠-٢٨١)

میں بنایا ہے، اسی طرح دوبارہ قیامت کے دن پھر بنا دے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کو پیدا کیا اور وہ کچھ نہ تھے، پھر لے گیا ان کو، پھر دوبارہ لائے گا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا، جیسے پہلے ابتدا کی ہے، ایسے ہی وہ آخر میں بھی اعادہ کرے گا۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1]

اس مطلب کی تائید اس حدیثِ مرفوع سے ہوتی ہے جس کو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان وعظ کرنے کے لیے کھڑے ہوئے، فرمایا: اے لوگو! تم حشر کیے جاؤ گے، اللہ کی طرف ننگے پاؤں، ننگے بدن، بے ختنہ: ﴿ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَیْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴾ [الأنبياء: ۱۰٤] ''جس طرح ہم نے پہلی تخلیق کی ابتدا کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ (یہ) وعدہ ہمارے ذمے ہے، بے شک ہم اسے (پورا) کرنے والے ہیں۔'' اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[2]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جیسا کچھ تم پر لکھا گیا ہے، ویسے ہی تم ہو گے۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جیسے تم تھے، پھر ویسے ہی ہو گے۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جس کی خلقت ابتدا سے اللہ نے شقاوت اور بدبختی پر رکھی ہے وہ ویسا ہی ہو گا گو اہلِ سعادت جیسے عمل کرے اور جس کی ابتدائے خلقت سعادت پر رکھی ہے وہ ویسا ہی ہو گا گو اہلِ شقاوت جیسے عمل کرے جس طرح سحرہ نے اہلِ شقاء کے سے عمل کیے تھے مگر پھر اپنی ابتدا پر آ گئے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ جس طرح تم کو پیدا کیا ہے کہ ایک فریق ہدایت پر ہے اور دوسرا گمراہی پر، اسی طرح پھر دوبارہ تم ہو جاؤ گے، ماؤں کے پیٹ سے باہر آؤ گے۔[3]

ہدایت و گمراہی مقسوم ازل ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ﴾ (آیتِ باب) اللہ نے ابن آدم کی پیدائش یوں شروع کی ہے کہ کوئی مومن ہے اور کوئی کافر، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴾ [التغابن: ۲] ''وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر اور کوئی مومن ہے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔'' پھر قیامت کے دن ان کو اسی طرح پر اعادہ کرے گا، جیسا کہ شروع میں مومن و کافر بنایا تھا۔[4]

اس قول کی تائید اس مرفوع حدیث سے ہوتی ہے جو صحیح بخاری میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! تم میں سے ایک عمل کرتا ہے جنت والوں کا سا، یہاں تک کہ اس کے اور

---

[1] تفسير الطبري (۱۲/ ۳۸۵) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸٦۰)
[3] تفسير الطبري (۱۲/ ۳۸۳۔ ۳۸٤) [4] تفسير الطبري (۱۲/ ۳۸۲) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ۱٤٦۲) اس کی سند حسن ہے۔

جنت کے درمیان ایک باع (دونوں بازوؤں کا پھیلاؤ) یا ایک ذراع (کہنی تک ہاتھ) کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر اللہ کا لکھا ہوا غالب آتا ہے اور اہلِ نار کے سے عمل کرنے لگتا ہے، پھر نار میں چلا جاتا ہے۔ اور کوئی تم میں سے دوزخ والوں کا سا عمل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور آگ کے درمیان ایک باع یا ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر اللہ کا لکھا ہوا غالب آتا ہے اور وہ بہشت والوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے۔“[1]

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ”بندہ عمل کرتا ہے، لوگوں کے دیکھنے کے مطابق اس کے عمل اہلِ جنت کے سے ہوتے ہیں، حالانکہ وہ اہلِ نار میں سے ہے اور لوگوں کے دیکھنے کے مطابق کوئی اہلِ دوزخ جیسے اعمال کرتا ہے، حالانکہ وہ اہلِ جنت میں سے ہے۔ نہیں ہیں اعمال مگر خاتمے سے۔“ (رواہ البغوي) یہ حدیث اُحد کے دن قصۂ قزمان کے بارے میں صحیح بخاری میں مروی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔[2] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں اس طرح ہے: ”ہر نفس اس حال پر مبعوث ہوگا جس پر وہ تھا۔“ (رواہ ابن جریر)[3]

اس حدیث کو مسلم و ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے، اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: «يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَا مَاتَ عَلَيْهِ» ”اللہ اٹھائے گا ہر بندے کو اس حالت پر جس پر وہ مرا۔“[4] اس کے مثل سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی آیا ہے۔[5] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا اس قول اور اس آیت کے درمیان تطبیق دینا ضروری ہے: ﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ [الروم: ۳۰] ”چناں چہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔“ اگر آیت سے مراد یہی قول ہے۔ اور صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اُس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔“[6]

صحیح مسلم میں سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو حنفاء پیدا کیا ہے، پھر شیطانوں نے آکر ان کو دین سے الگ تھلگ کر دیا۔“[7] (الحدیث)۔ سو اس بنیاد پر اس قول اور آیتِ کریمہ میں موافقت اس طرح سے ہے کہ اللہ نے ان کو اس لیے بنایا کہ کوئی مومن ہو کوئی کافر۔ دوسرے یہ کہ اگر ساری خلق کی فطرت اللہ کی معرفت اور توحید پر ہے تو سب جانتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، چنانچہ ان سے اسی بات کا پکا عہد لیا گیا تھا اور یہ بات ان کی طبیعتوں اور فطرت میں رکھی گئی تھی، اس کے ساتھ تقدیر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٢١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٤٢) تفسير البغوي (٣/ ٢٢٤)
[3] تفسير الطبري (١٢/ ٣٨٤) اس کی سند صحیح ہے۔
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٣٠) [5] تفسير الطبري (١٢/ ٣٨٢)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٨) [7] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)

اس طرح بنائی کہ ان میں سے کوئی بد بخت ہوا اور کوئی نیک بخت: ﴿ هُوَالَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴾ [التغابن: ۲] ''وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر اور کوئی مومن ہے، اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔'' اللہ کی تقدیر اس کی پیدائش میں نافذ ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴾ [الاعلیٰ: ۳] ''اور جس نے اندازہ کیا، پھر ہدایت دی۔'' نیز فرمایا: ﴿ الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾ [طٰہٰ: ۵۰] ''جس نے ہر شے کو اس کی شکل وصورت دی، پھر ہدایت دی۔''

صحیحین میں آیا ہے کہ جو اہلِ سعادت سے ہوتا ہے، اس کے لیے اہلِ سعادت کا کام آسان کر دیا جاتا ہے اور جو اہلِ شقاوت سے ہوتا ہے اس کے لیے اہلِ شقاوت کا سا کام آسان کر دیا جاتا ہے۔[1] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَرِیْقًا هَدٰى وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ﴾ (آیتِ باب) پھر اس کی تعلیل یوں کی ہے کہ انھوں نے اللہ کے سوا شیطانوں کو اپنا دوست بنایا ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اُس شخص کی خطا پر کھلی دلیل ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کسی معصیت کرنے پر یا کسی گمراہ قسم کے اعتقاد رکھنے پر عذاب نہیں کرتا، مگر صرف اسی صورت میں جب وہ صحیح بات معلوم ہو جانے کے بعد بھی صرف اللہ کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے اس گناہ یا گمراہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ اگر بات اسی طرح ہوتی تو اس فریق کے درمیان جو گمراہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتا ہے اور حقیقت میں ہدایت یافتہ فریق کے درمیان کچھ فرق نہ ہوتا، حالانکہ اللہ پاک نے ہر دو فریق کے ناموں اور احکام کے بارے میں اس آیت میں فرق کیا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ فاحشہ وہ گناہ ہے جو قباحت اور فحاشی میں بڑھا ہوا ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں مراد مشرکین کا ننگے ہو کر طواف کرنا ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شرک مراد ہے۔[4] ظاہر یہ ہے کہ لفظ عام ہے جو دونوں امور پر صادق آتا ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ وہ جب کوئی قباحت کو پہنچا ہوا گناہِ بد کرتے تو اس کے کرنے میں دو عذر بیان کرتے: ایک یہ کہ ہم نے اپنے آبا کو اسی فعلِ فاحشہ پر پایا ہے، ہم ان کے مقلد اور مقتدی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ سو یہ دونوں سب سے زیادہ باطل اور سب سے زیادہ منکر ہیں۔ انتہا درجے کے فاسد اور کھوٹے ہیں، اس لیے کہ باپ دادا کا کسی برے کام کا عامل ہونا ان کے لیے دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی وہی کام کریں۔

یہ تو محض ان کی جھوٹی تقلید کرتے ہیں، جس کی کوئی اصلیت نہیں وہ بھی مذہبی امور میں ورنہ دنیاوی کاموں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٧) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٢٨٢)
[3] تفسير الطبري (١٢/ ٣٨٨) [4] تفسير البغوي (٣/ ٢٢٣)

میں ہرگز ان کی تقلید نہیں کرتے۔ کسی نے نہ سنا ہوگا کہ کوئی شخص از خود دریا میں ڈوب کر مرگیا یا اس نے خودکشی کے لیے اپنے آپ کو گرا دینا یا جلا دینا جائز کہا ہو، صرف اس لیے کہ اس کے باپ نے بھی اس طرح اپنی جان کھوئی تھی، یا اگر باپ نے سارا مال لٹا دیا تھا تو یہ بھی سارا مال برباد کر دے۔ رہا اللہ کا حکم کرنا سو معاذ اللہ کہ اللہ پاک کسی ناپاک کام کا حکم کرے! بلکہ اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ نبی کی اتباع کرو، اللہ کی نازل کردہ کتاب پر چلو، پیغمبر کی سنت کو دانتوں سے پکڑو، تم اللہ پر یہ دعویٰ کس دلیل سے کرتے ہو؟ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے کبھی کسی بندے کو کسی معصیت پر عزت نہیں بخشی نہ اس معصیت پر راضی ہوا۔ نہ اس کو وہ معصیت کرنے کا حکم دیا۔ ہاں طاعت پر تم سے راضی ہوتا ہے، معصیت سے تمھیں منع کرتا ہے۔[1]

تقلید کی مذمت و تردید:

حاصل یہ ہوا کہ وہ دونوں عذر باطل ہیں: اول اس لیے کہ یہ تقلیدِ رجال ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اللہ ذوالجلال والاکرام پر افترا ہے۔ سلیمان جمل نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان کی دوسری بات کو رد کیا، پہلی بات سے تعرض نہ فرمایا، اس لیے کہ اس کا فساد واضح تھا، کیوں کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آبائی تقلید کی کوئی دلیل نہیں ہوتی، ہاں دوسری بات پر انکار فرمایا۔ کہا: کیا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو جو نہیں جانتے۔ اس میں سخت قسم کی ملامت ہے، کیوں کہ جب کسی بات کے بارے میں جہالت سے کچھ کہنا برا ہے تو پھر اللہ کے حق میں تو اور بھی برا ہوگا۔ اس آیتِ شریفہ میں ان لوگوں کو سخت ڈانٹ اور سرزنش اور بڑا موثر وعظ ہے جو اپنے آبا و اجداد، مشائخ اور اساتذہ و ائمہ کی تقلید کرتے ہیں، گو وہ مذہبِ حق اور سنتِ برحق کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ اس لیے کہ یہ تقلید اہلِ کفر کی پیروی ہے نہ کہ اہلِ حق کی، کیوں کہ مقلدین کا قول یہ ہے کہ: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۲۳]

''بلاشبہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔''

دوسرا قول یہ ہے: ﴿ وَجَدْنَا عَلَيْهَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ﴾ (آیتِ باب) سو مقلد اسی گھمنڈ میں ہے کہ اس نے اپنے باپ کو اسی مذہب پر پایا ہے اور اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور وہی حق اور درست ہے۔ اگر یہ دھوکا نہ ہوتا تو وہ ہرگز اس خصلت پر باقی نہ رہتا، یہ وہی خصلت ہے جس کے سبب سے یہودی یہودیت پر، نصرانی نصرانیت پر، بدعتی بدعت پر اور مشرک شرک پر باقی ہیں۔ ان کا ان گمراہیوں پر قائم رہنا اسی لیے تو ہے کہ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کو مذہبِ یہودیت، نصرانیت، بدعت اور شرک پر پایا ہے اور حسنِ ظن سے یہ خیال کیا ہے کہ جس طریقے پر وہ تھے اور گزر گئے، وہی سیدھی راہِ حق تھی، اللہ نے ان کو اسی راہ پر چلنے کا حکم دیا تھا، اسی لیے اپنے لیے غور و فکر کرتے ہیں نہ

---

[1] الدر المنثور (۳/ ۴۳۷)

دین اور حق کی طلب سے کچھ سروکار رکھتے ہیں، اسی کا نام تو تقلیدِ خالص، قصورِ خالص، پکی گمراہی، صریح جھوٹ، اللہ پر اسلام کے بارے میں افترا، رسول پر جری ہونا اور نبیِ مقبول کی بے وقعتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ غَفراً.

اے وہ شخص جو مذاہبِ اسلامیہ میں سے کسی ایک مذہب پر پیدا ہوا اور بڑھا ہے، میں تیرے لیے صاف طور پر ڈرانے والا ہوں کہ خبردار تو کبھی یہ نہ کہنا کہ میں باپ کی یا دادا کی یا پردادا کی راہ پر ہوں، اللہ کا حکم اسی طرح ہے، کیوں کہ تیرا یہ کہنا ایسا ہے کہ تو گمراہی پر قائم و دائم ہے۔ اب تو وہ وقت آیا ہے کہ شر خیر کے ساتھ، صحیح غلط کے ساتھ، رائے فاسد روایتِ صحیحہ کے ساتھ خلط ملط ہوگئی ہے، حالانکہ اللہ نے اس امت کی طرف صرف ایک نبی بھیجا ہے، امت کو اس کی اتباع کا حکم فرمایا ہے، اس کی مخالفت سے منع کیا ہے، فرمایا ہے: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ۷] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔''

سو اگر صرف ائمۂ مذاہب کی رائے اور ان کی اتباع لوگوں پر حجت ہوتی تو اس امت کے لیے بہت سے رسول ثابت ہوتے، جن کی تعداد اہل الرائے کی تعداد کے برابر ہوتی جو اس بات کے مکلف ہیں کہ لوگوں کو اس بات کی تکلیف نہ دیں جس کا ان کو اللہ نے حکم نہیں دیا۔ دینِ حق سے ایک عجیب اور بڑی غفلت یہ ہے کہ مقلدین نے کتاب اللہ اور سنتِ مطہرہ کے موجود ہونے کے باوجود لوگوں کی آرا اور کسی ایک خاص شخص یا بہت سے اشخاص کی تقلید کو اختیار کیا ہے، حالانکہ ان کے درمیان ان کے اپنے شہروں، بستیوں، قصبوں اور ملک و اقلیم میں ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں جن سے یہ کتاب و سنت کو لے سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں اور ان کے پاس فہم، عقل اور سمجھ کے تمام ذرائع موجود ہیں۔[1]

بڑی حیرت ہے کہ انھیں علومِ عقلیہ اور فنونِ فلسفیہ میں تو یکتائی کا دعویٰ ہو جن میں بال کی کھال نکالی گئی ہے اور معاش اور خانہ داری کے معاملات میں زمانے بھر کے عقل مندوں کے سردار کہلائیں اور کمال ذہانت و دانائی اور انتہائی عقل مندی اور نکتہ چینی میں کسی کو اپنے برابر نہ جانیں اور باریک نکتوں کے حل اور مشکلات کو دور کرنے اور فہم کی تیزی اور باریک بینی میں مشار الیہ فرقہ رائے ہوں۔ اس کے ساتھ کتاب اللہ کے بارے میں جس کی صفت آیاتِ بینات ہے اور سنتِ مطہرہ کے بارے میں جس کی رات دن کی طرح ہے، اپنے فہم کے قصور کا اقرار کریں۔ اس کے سمجھنے کو آبا و اسلاف و ائمہ میں منحصر رکھیں۔ یہ بھی اتمامِ حجت کے لیے ایک اللہ کی نشانی ہے کہ مقلدین خود کتاب و سنت کو سمجھنے کے لیے اپنی جہالت، نادانی، بے فہمی، بے سمجھی اور عدمِ لیاقت کے معترف ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ علمائے کبارِ امت، جیسے: ابن عبدالبر وغیرہ، نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ مقلدین کا شمار علما کی ایک جماعت میں نہیں ہے، اگرچہ ان کے پاس بہت سی کتابیں ہی کیوں نہ ہوں یا ان کو لوگ بڑا مولوی ملا سمجھیں، کیوں کہ علم قرآن و حدیث اور فرائض کے جاننے کا نام ہے، پس بس۔ سو جس کو اللہ اور رسول کے احکام صحیح

[1] فتح البیان (٤/ ٣٢٦۔ ٣٢٨)

طرح پر معلوم ہیں اور اسلام کے مسائل کو کسی کتابِ فقہ وسنت سے یا کسی عالمِ قرآن وحدیث کی زبان سے سن چکا ہو اور معلوم کر چکا ہو، گو اسے کتبِ درسیہ کے لکھنے اور پڑھنے کی قدرت نہ ہو تو حقیقت میں وہی عالمِ دین ہے نہ کہ وہ گروہ جو کاسہ لیس کفارِ یونان و پرستارِ علماے فلاسفہ ومتبع خطواتِ شیطان ہے۔ ہماری یہ گفتگو ہر چند آج کے دن ہمارے علاتی اور اخیافی برادران پر گراں گزرتی ہے، لیکن ہم اس حق اور صحیح بات کہنے پر مجبور ہیں، ہم سے ہمارے رب معبود نے عہد لیا ہے کہ جو حق ہمیں معلوم ہے، اس کو ظاہر کر دیں، اگر نہ کریں گے تو ملعون ٹھہریں گے۔ عَصَمَنَا اللّٰهُ تعالیٰ.

خیر اگر منکر کو اپنے ہاتھ سے تبدیل کرنے پر قادر نہیں تو ہم گونگے نہیں کہ منہ سے بھی صحیح کلمہ اور قولِ حق نہ نکالیں۔ اگر جان، مال اور آبرو کا خوف ہماری زبان بندی کا مقتضی ہے تو ہمارے دل پر تو کسی کا قابو نہیں ہے اور نہ مہر لگی ہے۔ الحمد للہ کہ اللہ نے ہم کو حق دکھا دیا اور باطل سے بچا لیا۔ رہی توفیقِ عمل، سو اس کے لیے ہم سائل زمان و مکان ہیں اور طالبِ طاقت وتوانائی اور امکان۔ اللهم غفرا.

پھر اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم کفار ومشرکین سے یہ بات کہہ دو کہ میرے رب کا حکم تو یہ ہے کہ عدل ہونا چاہیے۔ امام مجاہد وسدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس پر دلیل ہے کہ اللہ عدل کا حکم کرتا ہے نہ کہ جیسا انھوں نے خیال کیا کہ اللہ پاک بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ ''قسط'' سے مراد ''لا إله إلا الله'' ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی قول ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ عبارت میں حذف ہے، یعنی ''قُلْ أَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ فَأَطِيْعُوهُ''

اس جگہ جو حکم نماز میں چہروں کو سیدھا رکھنے کا دیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب مسجدوں میں ہو تو نماز کے لیے منہ قبلے کی طرف کرو۔ یا یہ مراد ہے کہ اللہ کی عبادت کا قصد کرو مستقیم ہو کر، غیر کی طرف مائل نہ ہو، ہر سجدے کے وقت یا ہر مسجد میں۔ مگر پہلا مطلب زیادہ صحیح ہے، پھر اخلاص کے ساتھ عبادت کا حکم دیا، یعنی موحد بنو، مشرک نہ بنو، تم ویسے ہی عود کرو گے جیسے شروع میں تھے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جیسا اللہ نے تم کو پیدایش کے شروع میں بنایا ہے، ایسا ہی تمھارے فنا ہونے کے بعد پھر ایجاد کرے گا۔[2]

تشبیہ زندہ کرنے اور پیدا کرنے میں ہے نہ کہ کیفیت وترتیب میں۔ مقصود حجت کا قائم کرنا ہے ان لوگوں پر جو دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں کہ ہم دوبارہ زندہ کرنے کے بعد نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی سزا دیں گے۔ یا جس طرح تم ماؤں کے پیٹ سے ہر شے سے تہی دست نکلے تھے، ویسے ہی پھر لوٹو گے، تمھارے پاس کوئی شے نہ ہو گی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ [الأنعام: ٩٤] ''اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جس طرح کہ ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا۔'' بعض نے کہا کہ معنی یہ ہیں کہ جس طرح ہم نے تم کو مٹی سے بنایا ہے، اسی طرح پھر تم مٹی میں ملو گے۔ مجاہد نے کہا: عود کرو گے تم بد بخت اور نیک بخت ہو کر۔[3]

---

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٢٣) [2] معاني القرآن (٢/ ٣٣١) [3] تفسير الطبري (١٢/ ٣٨٤)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مومن اپنے ایمان پر، منافق اپنے نفاق پر مبعوث ہوگا۔[1] اللہ نے ایک فریق کو ہدایت کی اور ایک فریق پر گمراہی رکھی۔ ہدایت والا فریق وہ ہے جو اللہ پر ایمان لایا، انبیا کا تابع ہوا، فریقِ ضلالت وہ ہے جو کفار کا گروہ ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے پاس قدریہ کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا: ”قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَلَيْسَ قَدْ قَالَ اللّٰهُ: فَرِيْقًا... الخ“[2] اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ہدایت و گمراہی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے: ”اللہ نے اپنی خلق کو اندھیرے میں پیدا کیا، پھر ان پر اپنا نور ڈالا، جس کو وہ نور پہنچا، اس نے ہدایت پائی جو چوک گیا وہ گمراہ ہوا۔“ (أخرجه الترمذي)[3]

غرض کہ جس گروہ پر گمراہی ثابت ہوئی اس گروہ نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا اولیا ٹھہرا لیا۔ اس کے ساتھ ان کو یہ خیال ہے کہ وہ راہ یاب اور ہدایت یافتہ ہیں اور ہرگز اپنی گمراہی کا اقرار نہیں کرتے، یہ نہایت درجے کی سرکشی اور دشمنی ہے۔ یہ آیت معتزلہ پر حجت ہے اس بات میں کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ ذوالجلال والاکرام کی طرف سے ہے۔ نیز اس پر دلیل ہے کہ وہ کافر جو اپنا دینِ حق پر ہونا گمان کرتا ہے اور جھگڑتا ہے اور عداوت رکھتا ہے، یہ دونوں کفر میں برابر ہیں اور صرف یہ گمان کہ میں صحیح دین پر ہوں، کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے دین پر قطعی اور یقینی طور پر چلنا ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ نے کفار کی اس بات پر مذمت کی ہے کہ ان کو اپنے ہدایت یافتہ ہونے کا گمان ہے، سو اگر ان کا یہ گمان کرنا اور خیال کرنا قابلِ مذمت نہ ہوتا تو اللہ ان کی مذمت نہ کرتا۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی امرِ باطل کو جاری کرنے والا مذمت کا مستحق ہوتا ہے، خواہ وہ یہ گمان کرے کہ وہ ہدایت پر ہے یا نہ کرے۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱

اے بنی آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو، اور کھاؤ اور پیو، اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک وہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (31)

مسجد جاتے وقت زیبائش اختیار کرنے اور لباس پہننے کا حکم:

یعنی نماز میں لباس پہننا فرض ہے، مرد کو کمر سے زانو تک ڈھانکنا اور عورت کو سارا بدن، مگر لونڈی کو زانو سے نیچے اور بغل سے اوپر کھولنا معاف ہے اور وہ باریک کپڑا جس میں بدن یا بال نظر آئیں معتبر نہیں۔ اور فرمایا حد سے نہ نکلو، یعنی ممنوع کام میں خرچ نہ کرو۔ یہ آیت مشرکین کی تردید میں ہے، کیوں کہ ان کا طواف میں عریانی پر اعتماد تھا،

---

[1] مصنف عبدالرزاق (۳/ ۵۸٦) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مرفوعاً بھی صحیح سند کے ساتھ مروی ہیں۔ دیکھیں: مسند أحمد (۳/ ۳٤٦) صحیح ابن حبان (١٦/ ۳۰٤)

[2] فتح القدير (۲/ ۲۸۱)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲٦٤۲) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۷٦٤)

جس طرح مسلم ونسائی وابن جریر کے نزدیک سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے اور ابن جریر کے الفاظ یہ ہیں: "كَانُوا يَطُوفُونَ بِالْبَيْتِ عُرَاةً، اَلرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ، اَلرِّجَالُ بِالنَّهَارِ وَالنِّسَاءُ بِاللَّيْلِ، وَكَانَتِ الْمَرْأَةُ تَقُولُ:" "وہ ننگے بیت اللہ کا طواف کرتے تھے، مرد بھی اور عورتیں بھی، مرد دن کو طواف کرتے اور عورتیں رات کو۔ عورتیں یہ کہتیں:

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ أَوْ كُلُّهٗ   وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا أُحِلُّهٗ

"آج سارا جسم یا کچھ حصہ بدن کھل جاتا ہے اور جو کھل جائے تو میں اس کو حلال نہیں سمجھوں گی۔"

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (آیتِ باب)۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ لوگ بیت اللہ کا طواف ننگے کرتے تھے، اللہ نے زینت کا حکم فرمایا، یعنی لباس کا جو ستر کو چھپانے والا ہو اور اس کے سوا جو اچھا کپڑا جامہ ہو۔ امام مجاہد، عطا، نخعی، ابن جبیر، قتادہ، سدی، ضحاک، زہری رحمہم اللہ اور بہت سے ائمہ سلف کا یہی قول ہے کہ آیتِ باب مشرکین کے طواف کے بارے میں اتری ہے،[2] مگر سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ "إِنَّهَا نَزَلَتْ فِي الصَّلَاةِ فِي النِّعَالِ" "یہ جوتیوں کے ساتھ نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی۔"

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اس کی صحت میں نظر ہے۔[3] بہرحال اس آیت اور اس سنت سے جو اس بارے میں آئی ہے، نماز کے وقت بالخصوص جمعہ اور عید کے دن تجمل کرنا مستحب ہے۔ اسی طرح خوش بو کا ملنا اور مسواک کرنا بھی زینت میں داخل ہے۔ افضل لباس سفید کپڑا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: "تم سفید کپڑے پہنو، یہ تمھارے بہتر کپڑے ہیں اور ان میں مردوں کو کفن دو، تمھارا بہتر سرمہ اثمد ہے جو نظر کو جلا دیتا ہے اور بال اگاتا ہے۔" (رواه أحمد) یہ حدیث جید الاسناد ہے، اس کے رجال شرطِ مسلم پر ہیں۔ (ورواه أبو داود و الترمذي وابن ماجه) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[4]

سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تم پر لازم ہے کہ تم سفید کپڑے پہنو، وہ سب سے زیادہ پاک صاف ہیں۔ تم ان میں اپنے مردوں کو کفن دو۔[5] (رواه أحمد وأهل السنن بإسناد جيد) امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا کہ تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک چادر ایک ہزار کی خریدی تھی، اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔[6] (رواه الطبراني بسند صحيح)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٥٦) تفسير الطبري (١٢/ ٣٩٠۔ ٣٩١)

[2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٩١۔ ٣٩٤)

[3] الموضوعات لابن الجوزي (٢/ ٩٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٨٣) اس کی سند میں "عباد بن جویریہ" سخت ضعیف راوی ہے۔

[4] مسند أحمد (١/ ٢٤٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٠٥)

[5] مسند أحمد (٥/ ١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨١٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٩٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٣٥)

[6] المعجم الكبير (٢/ ٤٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد (٥/ ٢٣٧)

کھانے پینے میں فضول خرچی سے ممانعت:

بعض سلف نے کہا ہے کہ اللہ نے ساری طب آدھی آیت میں جمع کر دی ہے، یعنی کھاؤ پیو، مت اڑاؤ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''کھا! تو جو چاہ، پہن! جو چاہ، جب تک دو باتیں نہ ہوں: سرف ومخیلہ، یعنی اڑانا اور اِترانا۔''[1] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے کھانا پینا حلال کیا، جب تک اڑانا اور اترانا نہ ہو۔[2] (إسناده صحيح) عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ ''کھاؤ، پیو، پہنو، صدقہ دو، بغیر مخیلہ واسراف کے۔ اللہ چاہتا ہے کہ اپنی نعمت اپنے بندے پر دیکھے۔'' (رواه أحمد والنسائي وابن ماجة بلفظ: «كُلُوْا وَتَصَدَّقُوْا وَالْبَسُوْا فِيْ غَيْرِ إِسْرَافٍ وَّلَا مَخِيْلَةٍ»)[3]

سیدنا مقدام بن معدیکرب کندی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابن آدم نے کوئی برتن اپنے پیٹ سے بدتر نہیں بھرا۔ کافی ہیں ابن آدم کو اکلات، یعنی چند لقمے جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں، پھر اگر ضروری ہے کہ پیٹ بھرے تو ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے رکھے۔ (رواه أحمد والنسائي) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[4] انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ مِنَ السَّرَفِ أَنْ تَأْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ» ''اسراف یہ ہے کہ تو ہر وہ چیز کھائے جس کی تجھے خواہش ہو۔''[5] (رواه أبو يعلى في مسنده والدارقطني في الأفراد وقال هذا حديث غريب تفرّد به بقيّة)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو لوگ کعبے کا برہنہ طواف کرتے ہیں وہ موسم میں اپنے اوپر روغن کھانا حرام کر لیتے تھے۔ اللہ نے کہا: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ یعنی تحریم میں اسراف نہ کرو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی کھاؤ پیو، جو رزق تم کو اللہ نے دیا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ حرام مت کھاؤ، یہ اسراف ہے۔[6] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ کھانے اور پینے میں اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔[7] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی لوگ حلال و حرام میں حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں، وہ لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ حلال میں غلو یہ ہے کہ حرام کو بھی حلال کر لے، حرام میں غلو یہ ہے کہ اس کو حلال سمجھ لے۔ یہ حد سے تجاوز ہے اور کھانے پینے میں زیادتی اور اسراف ہے، بلکہ

---

[1] صحيح البخاري (٥/ ٢١٨٠) [2] تفسير الطبري (١٢/ ٣٩٤) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] مسند أحمد (٢/ ١٨٢) سنن النسائي، رقم الحديث (2559) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٠٥) صحيح الجامع (٤٥٠٥)

[4] مسند أحمد (٤/ ١٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٨٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ١٧٧) صحيح الجامع (٥٦٧٤)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٥٢) مسند أبي يعلىٰ (٥/ ١٥٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ ضعف کی وجوہ ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٤١)

[6] تفسير الطبري (١٢/ ٣٩٤۔ ٣٩٥)

[7] تفسير الطبري (١٢/ ٣٩٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

مناسب یہ ہے کہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے، اسی کا نام عدل ہے، جس کو اللہ نے واجب کیا ہے۔[1] شاعر کا یہ شعر:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ زنہیم بخاطر است   و زامر یاد ماند کُلُوْا وَاشْرَبُوْا مرا

''نہی سے مجھے یہ حکم: ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ'' (نماز کے قریب نہ جاؤ) اور امر سے یہ حکم: ''کُلُوْا وَاشْرَبُوْا'' (کھاؤ پیو) اچھی طرح یاد ہے۔''

اگر اہلِ کفر پر بطورِ طعن کے ہے تو خیر ورنہ خود کفر ہے۔ عیاذاً باللہ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ آیت میں سارے بنی آدم کو خطاب ہے، اگرچہ اس کا ورود کسی خاص سبب سے ہے، کیوں کہ اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ زینت وہ شے ہے جس سے لوگ آرایش کریں، جیسے: لباس کا یہ حکم ہے کہ جب نماز یا طواف کو آؤ تو ننگے نہ آؤ، آیت اس بات پر دلیل ہے کہ حالتِ نماز میں ستر کو ڈھانپنا واجب ہے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے، بلکہ اہلِ علم کے نزدیک ستر کا ہر حال میں چھپانا فرض ہے، اگرچہ آدمی تنہا خالی کیوں نہ ہو۔ صحیح احادیث اسی پر دلیل ہیں، بعض نے کہا: زینت سے مراد لباس کے علاوہ شانہ وعطر ہے۔ یہ بھی ستر ڈھانپنے اور پاک رہنے کی طرح واجب ہے۔ مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس قسم کی زینت کو اگر مستحب کہیں تو ہوسکتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ نماز کی زینت لو، کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: «اِلْبَسُوْا نِعَالَكُمْ فَصَلُّوْا فِيْهَا» ''اپنی جوتیاں پہنو اور ان میں نماز پڑھو۔''[2] (رواہ ابن عدي وأبو الشیخ وابن مردویة) آیتِ باب کی تفسیر میں انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: «صَلُّوْا فِيْ نِعَالِكُمْ» ''اپنی جوتیوں میں نماز پڑھا کرو۔''[3] (أخرجه العقيلي وأبو الشيخ وابن مردوية وابن عساكر) جوتیاں پہن کر نماز پڑھنے کے مشروع ہونے میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔

رہی یہ بات کہ وہ احادیث آیتِ باب کی تفسیر ہیں جس طرح کہ اس حدیث میں آیا ہے۔ سو احادیثِ مذکورہ کی اسناد کا حال معلوم نہیں، ہاں اس بات کی ممانعت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آئی ہے جو صحیحین میں ہے کہ کوئی آدمی ایک کپڑے میں اس طرح نماز پڑھے کہ اس کے کندھے پر کوئی چیز نہ ہو۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٣٩٥)

[2] الكامل لابن عدي (٥/ ١٨٣) الدر المنثور (٣/ ٤٤١) اس کی سند میں ''علی بن ابی علی قرشی'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٠٨٣)

[3] الدر المنثور (٣/ ٤٤١) تاریخ دمشق (٣٦/ ٣٦٢) اس کی سند میں ''عباد بن جویریہ'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٠٨٣)

[4] صحیح البخاري، رقم الحديث (٣٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥١٦)

میں کہتا ہوں: جس چیز کا بدن پر پہننا اور استعمال کرنا جائز ہے اور لغتاً اور عرفاً وہ زینت میں داخل ہے، اس کو نماز کے وقت عمل میں لانا (پہننا) ممنوع نہیں ہے، خواہ وہ چیز پاک جوتا ہو یا دستارِ مکلّف یا تاج جو سر پر پہنا ہو یا ہتھیار یا قوس یا قیمتی کمر بند۔ اسی طرح کھانے پینے کا حکم ہے کہ جو جی چاہے اور میسر ہو اسے بغیر اسراف کے کھاؤ۔ اسراف یہ ہے کہ حلال کو حرام کر لے یا حرام کی طرف ہاتھ بڑھائے یا کھانے پینے میں افراط کرے، مقدار سے زیادہ کھائے یا تکلف میں اسراف کرے، سو جس طرح زیادتی منع ہے اور مال و طعام کا اڑانا حرام ہے، اسی طرح کھانا پینا چھوڑ دینے میں کوئی زہد نہیں ہے، بلکہ اس کا تارک قاتلِ نفس ہے، خودکشی کرنا چاہتا ہے، بلکہ اہلِ نار سے ہے جس طرح احادیثِ صحیحہ میں آچکا ہے اور جو شخص اتنا کم کھاتا ہے کہ بدن ضعیف ہو گیا اور طاعت واجب ادا کرنے سے بھی عاجز ہو گیا، اپنے اہل و عیال کے لیے کمائی نہیں کر سکتا، وہ اللہ کے حکم اور ارشاد کا مخالف ہے۔

اسی طرح جو خرچ کرنے میں اسراف سے کام لیتا ہے، خرچ میں بیوقوفوں کی طرح مال کو اڑاتا ہے، وہ بھی شرعِ الٰہی کے مخالف ہے اور قرآن مجید کی ممانعت میں واقع ہے۔ اسی طرح حلال کو حرام کرنے والا اور حرام کو حلال کرنے والا اسراف کرنے والوں میں داخل ہے اور وہ میانہ رو لوگوں کے زمرے سے خارج ہے۔ بے ضرورت و حاجت کھانا یا بھرے ہوئے پیٹ پر کھانا اسراف میں داخل ہے۔

آیتِ شریفہ اس بات پر دلیل ہے کہ تمام کھانے پینے کی چیزیں حلال ہیں، سوائے ان چیزوں کے جن کو شرع نے خاص کر دیا ہے اور ان کے حرام ہونے کے لیے کوئی دلیل بھی دی ہے، کیوں کہ تمام اشیا کی اصل کا استعمال جائز ہے، مگر وہ جس کو شریعت نے حرام کر دیا اور تفصیلی دلیل سے اس کا حرام ہونا ثابت ہو چکا۔ علی بن حسین بن واقد رحمہ اللہ کا قول اوپر گزر چکا ہے کہ "قَدْ جَمَعَ اللّٰهُ الطِّبَّ كُلَّهُ فِيْ نِصْفِ آيَةٍ" "اللہ نے تمام طب کو اس آیت کے نصف میں جمع کر دیا ہے۔"[1]

غرض کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو، وہ کھانے پینے میں ہو یا پہننے اوڑھنے میں یا مال اڑانے میں، دوست نہیں رکھتا۔ یہ اسراف کرنے والوں کے لیے سخت وعید اور ڈانٹ ہے، کیوں کہ اللہ کی دوستی اس کی رضا مندی سے عبارت ہے۔ بندے سے راضی ہو کر ثواب دیتا ہے، سو جب اللہ اسراف کرنے والوں کا محبّ نہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اُس بندے سے ناراض ہے، یہ کھانے، پینے اور پہننے میں اسراف پر بڑی سخت وعید ہوئی۔ اس وعید کے بڑے عمدہ مستحق آسودہ حال فساق و فجار ہیں۔[2]

[1] تفسیر القرطبي (۷/ ۱۹۲) [2] فتح البیان (٤/ ۳۳۲۔ ۳۳۳)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳۲

(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، وہ کس نے حرام کی ہیں؟ کہہ دیجیے: یہ (پاکیزہ چیزیں) دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو ایمان لائے، جبکہ قیامت کے دن یہ خالص مومنوں ہی کے لیے ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں (32)

امورِ دنیا میں اصل جواز ہے:

یعنی ممنوع کاموں میں خرچ نہ کرے، باقی کھانا پینا سب جائز ہے۔ جو نعمت ہے وہ مسلمانوں کے لیے پیدا ہوتی ہے، دنیا میں کافر بھی شریک ہو گئے، آخرت میں فقط انہی کے واسطے ہے۔ یہ آیتِ پاک ان کی تردید کرتی ہے جو کسی کھانے، پینے اور پہننے کی چیز کو شرعِ الٰہی کے علاوہ اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ تم ان مشرکوں سے جو اپنے فاسد خیالات اور آرا سے خود چیزوں کو حرام کرتے ہیں اور نئے نئے احکام نکالتے ہیں، یہ بات کہہ دو کہ یہ اشیا اللہ نے ان کے لیے پیدا کی، بنائی اور نکالی ہیں جو اللہ پر ایمان لائے ہیں، دنیا میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اگرچہ اس دنیا میں کافر لوگ بھی ان اشیا کے استعمال میں مومنوں کے ساتھ شریک ہو گئے ہیں، لیکن قیامت کو یہ ساری زینت کھانے پینے اور پہننے وغیرہ کی صرف اہلِ ایمان کے لیے ہو گی، وہاں کوئی ایک کافر بھی ان کا شریک نہ ہو گا، کیوں کہ جنت کافروں پر حرام ہے۔ وللہ الحمد.

اللہ پاک نے اس آیت میں کھول کر کہہ دیا ہے کہ اچھا کھانا اور اچھا پہننا کچھ منع نہیں ہے۔ اگر نقصان ہے تو اسی قدر کہ اس دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت اور حکمتِ بالغہ اس بات کی مقتضی ہو گئی ہے کہ کافر بھی اس لباس و طعام میں شریک ہو جائیں۔ ورنہ وہاں آخرت میں تو ٹھاٹھ باٹھ صرف مومنوں مسلمانوں ہی کے لیے ہو گا، کافر محروم رہیں گے۔ وللہ الحمد والمنة. سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ قریش بیت اللہ کے طواف میں عریاں ہو کر سیٹی اور تالی بجاتے، اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی، یعنی کپڑا پہننے کا حکم دیا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ زینتِ لباس وغیرہ اشیا مباح کو کہتے ہیں جس سے آدمی آرایش کرتا ہے، جیسے

(1) المعجم الکبیر (۱۲/ ۱۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفیه یحییٰ الحماني وهو ضعیف" (مجمع الزوائد: ۷/ ۹۳)

جواہر وغیرہ جو معدنیات سے نکلتے ہیں۔ ان کے ساتھ زینت کرنا منع نہیں، یہ کہنا کہ یہاں مراد خاص کپڑے ہی ہیں، بلاوجہ ہے، بلکہ لباس آیتِ شریفہ میں زینت حاصل کرنے والی اشیا میں شامل ہے۔ سو اعلیٰ قسم کا نفیس اور قیمتی جامہ زیبِ تن کرنا منع نہیں، بشرطیکہ وہ محرمات میں سے نہ ہو۔ یا جن چیزوں کا آرایش اور زیب و زینت میں عمل دخل ہے اور شرعی طور پر ان کے استعمال کی ممانعت نہیں ہے تو ایسی چیزوں کے ساتھ آرایش کرنا درست ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ کسی کا یہ گمان کہ اس قسم کی آرایش زہد کے خلاف ہے، واضح طور پر غلط ہے۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص تواضع اور انکساری کی خاطر زینت کرنا ترک کر دے نہ کہ زہد کے خلاف سمجھ کر، کیوں کہ وہ زیادہ بہتر اور افضل ہوتا ہے، جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ بذاذت ایمان ہے،[1] یعنی بے تکلف رہنا، میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے سے عار نہ کرنا ایمان کی نشانی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ آیت تمام زینت کو شامل ہے، یعنی ہر قسم کے لباس اور زیور کی اقسام اس میں داخل ہیں، اگر مردوں کو ریشم اور سونے کے استعمال کی ممانعت کے سلسلے میں واضح حکم نہ ہوتا تو وہ بھی اس عموم میں شامل رہتے۔[2] اللہ نے اس زینت کو اپنے بندوں کے لیے برآمد فرمایا ہے، روئی کتان زمین سے، ریشم کیڑے سے، ٹسر (کچا ریشم) صوف جانور کی اون سے، چھال درخت سے، ہیرے جواہرات معدنیات سے پیدا کیے۔ یہ سب لباس میں داخل ہیں۔

طیبات سے مراد لذیذ کھانے اور پینے کی چیزیں ہیں، طیبات کو چھوڑ دینا کوئی زہد نہیں۔ بعض فقیر درویش لذیذ طعام کو بدمزہ کر کے کھاتے ہیں، کوئی ایک قسم کے کھانے کو دوسری قسم کے کھانے میں ملا کر خراب کرتا ہے، کوئی پانی ملا کر بدمزہ بناتا ہے، کوئی خشک کر کے یا باسی کر کے کھاتا ہے، اس کو تقویٰ اور زہد کا موجب سمجھتا ہے، سو یہ کچھ زہد و تقویٰ نہیں ہے، بلکہ کفرانِ نعمت اور خلافِ سنت ہے۔ عمدہ کھانا جب ایک عمدہ برتن میں سامنے نکل کر تازہ بتازہ آتا ہے تو ایک خاص تجلی اس پر نمایاں ہوتی ہے، اس کا کھانے والا بے اختیار دل سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ فقرے جاہل اس شکر سے محروم رہتے ہیں۔ کاش! نہ ملے پر صبر ہی کرتے تو صابر ہوتے۔ آفت تو یہ ہے کہ دیدہ و دانستہ قصداً وعمداً موجبِ شکر کو ضائع کر کے اجر، شکر، جزا اور نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لا حول ولا قوة إلا بالله.

اس طرح کی بدعات جاہل فقیروں نے بہت کچھ نکال رکھی ہیں اور ان کو نام زہد و قناعت اور ترکِ دنیا کا دے رکھا ہے۔ احمقوں اور بے وقوفوں کو ایسے ہی امور سے اپنا مرید اور معتقد بنا رکھا ہے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ شریعت کا مقصد حق کی موافقت کرنا ہے نہ کہ نفس کی مخالفت۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس نے باوجود قدرت اور حلت کے روئی اور کتان کا کپڑا چھوڑ کر صوف اور بالوں کا لباس پہننا اختیار کیا ہے، یا گیہوں کی روٹی چھوڑ کر مسور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤١)

[2] تفسير الرازي (١٤/ ٥٢)

کی دال اور ساگ کا کھانا پسند کیا ہے، یا گوشت کو شہوت کے خوف سے ترک کر دیا ہے، وہ خطا پر ہے۔[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: طیبات صحت مند (چربی والا) گوشت کا سالن ہے۔[2] کسی نے کہا: گوشت اور گھی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بحائر اور سوائب ہیں، جن کو حرام ٹھہرا رکھا تھا۔[3] بعض نے کہا کہ آیت اپنے عموم پر ہے، کھانوں میں ہر وہ شے جو لذت دار اور اشتہا پیدا کرے وہ اس میں داخل ہے، سوائے ان چیزوں کے جن کو کسی صریح حکم نے حرام کر دیا، یہی حق ہے۔ امام ابو السعود اور بیضاوی رحمہما اللہ نے کہا: آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ تمام کھانوں اور لباسوں اور زیب و زینت حاصل کرنے والی چیزوں کے استعمال کی اجازت ہے،[4] کیوں کہ آیت میں سوال انکار کے لیے آیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ اشیا اصالتاً اور استحقاقاً اہلِ ایمان کے لیے ہیں، گو اس دنیا کی زندگی میں کفار بھی ان کے شریک کیوں نہ ہوں، کفار کی شرکت تبعاً ہے نہ اصالتاً، بالعرض ہے نہ بالذات۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ﴾ [البقرة: ١٢٦] ”میں کافروں کو بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر انھیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا۔“

پھر قیامت میں یہ چیزیں خاص مومنوں ہی کو ملیں گی، وہاں کسی کافر، مشرک کی شرکت نہ ہوگی۔ یا مراد یہ ہے کہ وہ غلاظت، تلخی اور غم سے پاک ہوں گی، اس لیے کہ یہ کبھی دنیا میں واقع ہوتا ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ دنیا کی زندگی میں تمام طیبات میں کافر مسلمین کے ساتھ شریک ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں، اچھا کپڑا پہنتے ہیں، اچھی عورتوں سے بیاہ کرتے ہیں، پھر اللہ ان طیبات کو وہاں صرف ایمان داروں کے لیے مخصوص کر رکھے گا، مشرکوں کو اس میں سے کچھ نہ دے گا۔[5]

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾

کہہ دیجیے: بے شک میرے رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے، چاہے وہ ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی اور گناہ کو اور ناحق ظلم کو بھی اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم اللہ کے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اُتاری، اور یہ (بھی حرام ہے) کہ تم اللہ کے متعلق وہ باتیں کہو جو تم نہیں جانتے (33)

---

(1) تفسير القرطبي (٧/ ١٩٧) (2) الدر المنثور (٣/ ٤٤٦)

(3) تفسير الطبري (١٢/ ٣٩٨) (4) تفسير أبي السعود (٣/ ٢٢٤) تفسير البيضاوي (٣/ ١٧)

(5) تفسير الطبري (١٢/ ٣٩٩) اس کی سند حسن ہے۔ فتح البيان (٤/ ٣٣٤ـ ٣٣٦)

فحاشی، گناہ، بغاوت، شرک اور اللہ پر تہمت باندھنا حرام ہے:

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیرت دار نہیں ہے۔[1] (رواہ أحمد والشیخان) سورت انعام میں ظاہر اور باطن اور بے حیائی کے کاموں پر کلام گزر چکا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اثم معصیت ہے، بغی لوگوں پر ناحق بغاوت کرنا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اثم سارے معاصی ہیں۔ باغی کی بغی اسی کی جان پر پڑتی ہے۔[2] اثم و بغی کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ اثم وہ خطایا ہیں جن کا تعلق نفسِ فاعل سے ہے، بغی وہ ہے جو لوگوں کے ساتھ زیادتی کرنے والا ہو، سو اللہ نے دونوں کو حرام کیا ہے۔ اسی طرح شرک سے منع کیا اور شرک کو بے اصل بات کہا، یعنی اللہ کی عبادت میں کسی اور کو شریک کرنا حرام ہے، تمھارا یہ دعویٰ کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہے یا بیٹی یا ساجھی محض افترا و جھوٹ و دروغ بافی ہے اللہ پر۔ تم اپنی جہالت اور بے علمی سے یہ دعویٰ کرتے ہو جیسے: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ ﴾ [الحج: ۳۰] ''لہٰذا تم بتوں کی گندگی سے بچو۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ فواحش فاحشہ کی جمع ہے۔ اس میں ہر فعلی اور قولی معصیت شامل ہے۔ ظاہر اور باطن سے کھلی ہوئی اور چھپی ہوئی مراد ہے۔ فاحشہ کی زنا کے ساتھ تخصیص بلاوجہ ہے۔ لفظ اثم میں ہر گناہ شامل ہے، بڑا ہو یا چھوٹا۔ اثم کو شراب کے ساتھ مخصوص کرنا بے وجہ ہے، گو شراب اثم میں داخل ہے۔ صحاح میں کہا ہے کہ خمر (شراب) کا ایک نام اثم بھی ہے۔[3] امام حسن اور عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شراب کے ناموں سے ایک نام اثم ہے۔ امام ابن سیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک خمر کا نام اثم رکھنا صحیح ہے، اس لیے کہ شراب پینا اثم ہے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ خمر کا یہ نام جاہلیت میں تھا نہ اسلام میں ہوا۔ ہاں کبھی شراب اثم میں داخل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے: ﴿ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۹] ''کہہ دیجیے: دونوں میں بڑا گناہ ہے۔''[4]

امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے معاصی اثم ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثم وہ ہے جو حق نہ ہو اور لوگوں پر زبان درازی کرنا ہے۔[5] بعض نے کہا: اثم صغیرہ گناہ ہیں اور فواحش کبیرہ گناہ۔ یا اثم وہ ہے جس میں حد نہیں، فاحشہ وہ ہے جس میں حد واجب ہے، یہ قول پہلے قول کے قریب ہے۔ کسی نے کہا کہ لغت میں اثم گناہ کو کہتے ہیں، اس میں بڑے چھوٹے گناہ سب داخل ہیں اور فاحشہ خاص کبیرہ گناہ کو کہتے ہیں اور اثم صرف گناہ کو۔ ان اقوال میں

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٥٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٦٠) مسند أحمد (١/ ٣٨١)
[2] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٠٣) [3] مختار الصحاح (١/ ٦) [4] تفسیر الخازن (٢/ ٢٢٥) [5] فتح القدیر (٢/ ٢٨٣)

سب سے بہتر پہلا قول ہے۔

بغی سے مراد وہ ظلم ہے جو حد سے بڑھا ہوا ہو اور لوگوں پر دست درازی کرنا۔ یہ گناہ بہت بڑا ہے، اس لیے اس کو الگ سے ذکر فرمایا ہے، جیسے کہ فرمان ہے: ﴿ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ﴾ [النحل: ۹۰] ''اور بے حیائی، برے کام اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔'' ہاں اپنا مال حق سے طلب کرنا ناحق ہونے سے خارج ہے۔ شرک سے منع کرنا مشرکوں کے ساتھ تہکم ہے، یعنی ان سے مخول کرنا ہے، اس لیے کہ اللہ ایسی دلیل نہیں اتارتا کہ غیر کو اس کا شریک کیا جائے۔ یہ تو محض ان کا بغیر جانے بوجھے اللہ کی طرف اپنے شرکیہ افعال کو منسوب کرنا ہے کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر اپنے حلال کرنے اور حرام کرنے کے عمل کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔[1]

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۳۴ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۶

اور ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے، تو جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو وہ (اس سے) لمحہ بھر پیچھے ہوں گے اور نہ آگے ہوں گے ﴿34﴾ اے بنی آدم! اگر تمھارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو تمھارے سامنے میری آیتیں بیان کریں تو جنھوں نے پرہیز گاری اختیار کی اور اپنی اصلاح کر لی تو ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿35﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿36﴾

رسولوں کے ساتھ اتمام حجت:

یعنی ہر زمانے اور قوم کے لیے ایک مہلت و مدت معین اور وقت مقرر کیا گیا ہے، جس سے ایک ساعت کی تاخیر یا تقدیم نہیں ہوتی۔ وہ مدت نہ کم ہوتی ہے اور نہ زیادہ۔ پھر آدمیوں کو ڈرایا کہ دیکھو رسول آئیں گے، خوش خبری اور ڈرائیں گے، سو جو کوئی حرام کردہ چیزوں کو چھوڑ دے گا اور اطاعت بجا لائے گا، وہ بے خوف و بے غم ہوگا اور جو نبی کی لائی ہوئی آیتوں کو جھٹلائے گا اور عمل کرنے سے تکبر کرے گا، وہی دوزخ میں ہمیشہ رہے گا۔

[1] فتح البیان (٤/ ٣٣٦۔ ٣٣٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ تمام ہلاک ہونے والی امتوں میں سے ہر امت کے لیے ایک وقت محدود ہے جس میں ان پر عذاب آتا ہے اور ان کو تباہ کر جاتا ہے۔ اجل سے مراد عذاب نازل ہونے کا وقت ہے یا زندگی اور عمر کی مدت ہے۔ اجل پوری مدتِ عمر کو کہتے ہیں اور جزء اخیر عمر کو بھی۔ اوقات کے ناموں میں ساعت قلیل ترین وقت کا نام ہے، اس لیے اس کا ذکر بالخصوص کیا، یعنی ایک دم کا آگا پیچھا اجل میں نہیں ہوتا۔ آیت جمہور کی اس بات پر دلیل ہے کہ ہر میت اپنی اجل سے مرتا ہے، گو اس کی موت قتل سے یا جل جانے سے یا غرق ہو جانے سے یا اونچی جگہ سے گر جانے سے یا اور کسی وجہ سے واقع ہوئی ہو۔ اس میں بڑی بحث ہے، یہ جگہ تفصیل کی نہیں۔

عمر کے گھٹنے اور بڑھنے کی تفسیر:

اس آیت کی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴾ [الحجر: ٥] ''کوئی امت اپنے (مقرر) وقت سے نہ آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔'' امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے تھے کہ یہ قوم کس قدر احمق ہے جو کہتی ہے: ''اَللّٰهُمَّ أَطِلْ عُمُرَهُ'' ''اے اللہ! فلاں کی عمر زیادہ کر۔'' حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ ﴾ (آیتِ باب)[1]

امام ابن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے تو کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر اللہ سے دعا کریں تو ان کی اجل میں دیر ہو، کہا: کیا اللہ نے نہیں کہا ہے: ﴿ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ ﴾ ؟ کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ بھی تو اللہ ہی نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ﴾ [الفاطر: ١١] ''اور بڑی عمر والے کو عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے (وہ) ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے۔''[2] جمہور کا مذہب یہی ہے کہ عمر نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔

گفتم کہ تو ای عمر چرا زود برفتی   گفتا کہ فلانے چہ کنم عمر ہمیں بود

''میں نے کہا: اے عمر! تو کیوں جلدی چلی گئی؟ تو اس نے جواب دیا کہ اے فلاں! میں کیا کروں عمر ہی اتنی تھی۔''

ان کی دلیل یہ آیاتِ بینات ہیں، جیسے: ﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ﴾ [المنافقون: ١١] ''اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا، جب اس کی اَجل آجائے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ﴾ [نوح: ٤] ''بے شک جب اللہ کا مقرر وقت آجائے تو وہ مؤخر نہیں ہوتا۔'' اور اس کا فرمان: ﴿ وَمَا كَانَ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٧١)   [2] مصنف عبد الرزاق (١١/ ٢٢٤)

لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ١٤٥] ''اور کوئی جاندار اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔'' دوسری دلیل وہ احادیثِ صحیحہ ہیں جو اس بارے میں آئی ہیں، جیسے: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ہے کہ جمع کی جاتی ہے تم میں سے ایک کی خلق چالیس دن، پھر علقہ ہوتا ہے، پھر مضغہ، پھر اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے، اس کو چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے، اس سے کہا جاتا ہے کہ لکھ! اس کا عمل، اس کا رزق، اس کی اجل اور یہ کہ وہ بد بخت ہے یا نیک بخت۔[1] (رواہ الشیخان وغیرھما) اس بارے میں اور بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔

رہی وہ آیتِ کریمہ: ﴿ یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴾ [الرعد: ٣٩] ''اللہ جسے چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جسے چاہے) ثابت رکھتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔'' سو اس سے مراد شریعتیں اور فرائض ہیں جو منسوخ، مبدل اور مثبت ہوتے رہتے ہیں، وہ سارے ناسخ منسوخ اللہ کے پاس ام الکتاب یعنی لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں، لیکن یہ آیت کی عمومیت کی تخصیص ہے، بغیر کسی مخصص کے۔ اس کے علاوہ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے، اسے قلم لکھ چکا ہے، جس طرح صحیح احادیث میں آیا ہے۔[2] ان سب باتوں میں ایک شرائع وفرائض بھی ہیں تو یہ عمر کی طرح ٹھہرے کہ جس طرح ان میں کمی بیشی جائز ہے، اسی طرح عمر میں بھی جائز ہے یا آیت سے مراد کراماً کاتبین کے نوشتہ میں سے اُس چیز کا مٹا دینا ہے جو نہ حسنہ ہے نہ سیئہ، اس لیے کہ ان کو اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ انسان کی ہر بات لکھا کریں، اس کا جواب پہلے جواب کی طرح ہے۔

بعض نے کہا کہ بندوں کے بعض گناہ بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے اس کو نہیں بخشتا۔ اس کا جواب بھی پہلے جواب کی طرح ہے یا بعض قوموں کو مٹا دیتا ہے اور بعض کو ثابت رکھتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ ﴾ [یٰس: ٣١] ''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی اُمتیں ہلاک کر دیں؟'' یہ محو ہوا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴾ [المؤمنون: ٣١] ''پھر ہم نے ان کے بعد ایک دوسری امت پیدا کی۔'' یہ اثبات ہوا اس کا جواب بھی اگلی طرح پر ہے۔

کسی نے کہا: یہ وہ شخص ہے جس نے عملِ طاعت کیا، پھر معصیت پر تائب ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کو دیوانِ سیئات سے مٹا کر دیوانِ حسنات میں ثابت کرتا ہے یا دنیا میں محو اور آخرت میں اثبات فرماتا ہے، اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں، لیکن یہ سب جوابات نرے دعوے ہیں، اس میں شک نہیں کہ آیت محو اور اثبات تمام مشیتِ الٰہی کو عام ہے تو اس کو بغیر کسی وجہ کے خاص کر دینا جائز نہ ہوگا، ورنہ اللہ پر طوفان بندھے گا۔ سو اللہ نے اس بات کو شرک ٹھہرایا ہے کہ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠٣٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٧٠٠) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢١٥٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٢٠١٨)

اللہ کی طرف کوئی غلط بات منسوب کی جائے اور اس پر وعید فرمائی ہے، جیسا کہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

رہی آیت: ﴿ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ [الفاطر: ۱۱] ''اور بڑی عمر والے کو عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے (وہ) ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے، بلاشبہہ یہ (بات) اللہ پر نہایت آسان ہے۔'' سو مراد معمر سے طویل العمر اور ناقص سے کم عمر والا ہے، مگر اس میں نظر ہے، اس لیے کہ ضمیر ﴿ مِنْ عُمُرِهٖٓ ﴾ معمر کی طرف عائد ہوتی ہے، قرآن کا ظاہر نظم یہی ہے۔ تاویلِ مذکور تو اس وقت صحیح ہوگی جب کہ ضمیر کسی اور ہی طرف پھرے، سو اس کا وجود نظم میں نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ ﴿ مَا يُعَمَّرُ ﴾ سے عمر آیندہ اور ﴿ لَا يُنْقَصُ ﴾ سے عمر گذشتہ مراد ہے، سو یہ بھی ظاہر کے خلاف ہے، کیوں کہ اس کو نقص نہیں کہتے۔ نقص زیادت کے مقابلے میں ہوتا ہے، یہاں یہ نقص بمقابلہ بقیہ عمر آیا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔

رہی آیت: ﴿ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ﴾ [الأنعام: ۲] ''پھر اس نے (تمھارے لیے) ایک وقت مقرر کیا اور اس کے ہاں (قیامت کا) ایک مقرر وقت بھی ہے۔'' سو اجل اول سے مراد نیند اور دوسری اجل سے مراد وفات ہے، یا اول عمر گذشتہ اور دوم عمر باقی ہے۔ یا اول موت اور دوسری موت اور دوبارہ اٹھنے کے درمیان کا وقفہ ہے۔ اس کے سوا اور بہت کچھ کہا ہے جو نظمِ قرآنی کے مخالف ہے۔

اہلِ علم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ عمر بڑھتی گھٹتی ہے، پہلے دی گئی آیات کی دلیل سے یہ بات کہی، کیوں کہ مٹا دینا اور ثابت رکھنا دونوں عام ہیں، جو عمر و رزق و نیک بختی اور بدبختی کو شامل ہیں۔ صحابہ و تابعین و تبع تابعین کا ایک گروہ اس طرح دعا کرتا تھا: ''اللهم إن كنت كتبتني في أهل السعادة فاثبتني منهم، وإن كنت كتبتني من أهل الشقاوة فامحني واثبتني في أهل السعادة'' اور جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ عمر بڑھتی گھٹتی نہیں ہے، ان کے پاس اس عموم کی تخصیص کرنے والی کوئی دلیل نہیں۔

صحیحین وغیرہ میں ایک جماعتِ صحابہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ صلہ رحم عمر کو زیادہ کرتا ہے۔[1] تقوے سے عمر اور اجل لمبی ہوتی ہے اور رزق فراخ ہوتا ہے۔[2] اچھا اخلاق اور اچھی ہمسائیگی عمر کو بڑھاتی ہے۔[3] جن حدیثوں میں دعا مانگنے کا ذکر آیا ہے، ان میں یہ بات بھی آئی ہے کہ دعا بلاؤں کو دفع کرنے والی اور قضا کو لوٹا دینے والی ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے یہ دعا کی: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْءِ الْقَضَاءِ وَدَرْكِ الشِّقَاءِ وَجَهْدِ الْبَلَاءِ وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ»[4]

---

[1] المعجم الكبير (۸/ ۲٦۱) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۷۹۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۹٦۱) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۵۵۷) مسند أحمد (۱/ ۱٤۳)

[3] مسند أحمد (٦/ ۱۵۹) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۷٦۷)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۹۸۷) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۰۷)

دعائے قنوت میں آیا ہے: «وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ»[1]

پس اگر دعا سے کچھ فائدہ نہ ہوتا اور قضائے سابق ازلی نہ بدلی جا سکتی تو دعا کا حکم لغو ہوتا، بری قضا سے پناہ مانگنا عبث ٹھہرتا، یہ کہنا کہ ہر درد کی دوا اتاری ہے، بے سود ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیات سے مراد یہ ہے کہ جب بھی اجل سر پر آ گئی تو اب یہ نہ آگے ہو نہ پیچھے ہٹے اور اس حالت میں تبدیلی جائز ہے کہ اللہ دعا یا صلہ رحمی یا فعلِ خیر سے اجل کو موخر کر دے یا عملِ شر و قطع رحمی اور انتہائی حرمتِ الٰہی کے سبب سے اجل کو متقدم فرمائے۔ اس بحث کو بڑی تفصیل کے ساتھ تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے، اس جگہ سب دلیلوں کا ذکر کرنا ضروری نہیں، تفسیر مذکور کی طرف رجوع کرنے سے واضح ہو سکتا ہے۔[2]

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

چناں چہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑا، یا اس کی آیات کو جھٹلایا؟ یہی لوگ ہیں جن کا لکھا ہوا نصیب انھیں مل کر رہے گا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس جب ہمارے فرشتے پہنچیں گے، جو ان کو فوت کریں گے، تو وہ ان سے کہیں گے: آج وہ کہاں ہیں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے؟ وہ جواب دیں گے: وہ ہم سے کھو گئے، اور وہ اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کفر کرنے والے تھے (37)

مشرک افترا پرداز اپنا نصیب پا لیں گے:

یعنی بڑا ظالم وہی شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے یا اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ان کو ان کے نصیب کا لکھا ہوا پہنچے گا۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے والے کا منہ سیاہ ہوگا۔[3] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ عاملِ خیر کو جزائے خیر اور عاملِ شر کو جزائے شر ملے گی۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جس کا ان کے ساتھ وعدہ ہے،

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٧٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٢/ ١٧٢)

[2] فتح البیان (٤/ ٣٣٨۔ ٣٥٢)

[3] تفسير الطبري (١٢/ ٤١٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٢/ ٤١١) اس کی سند حسن ہے۔

یعنی خیر وشر سے۔ یہی امام قتادہ وضحاک وغیرہما رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ قرظی رحمہ اللہ نے کہا کہ کتاب سے مراد عمل، رزق اور عمر ہے۔ امام ربیع اور ابن زید رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول معنی میں قوی ہے۔ آیت کا طرز بھی اسی پر دلیل ہے۔ اس آیت کے معنی گویا اس آیت کی طرح ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ﴾ [یونس: ٦٩۔ ٧٠] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: بلاشبہہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَلَا یَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ نُمَتِّعُهُمْ قَلِیْلًا﴾ [لقمان: ٢٣۔ ٢٤] ''اور (اے نبی!) جس کسی نے کفر کیا تو اس کا کفر آپ کو غم میں نہ ڈالے، (بالآخر) ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، چناں چہ ہم انھیں بتائیں گے جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔ ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں۔''

موت کے وقت مشرک کی حالت:

پھر اللہ نے یہ خبر دی کہ جب فرشتے مشرکوں کی جان نکالتے ہیں تو اس وقت ان کو آگ کی خبر دیتے ہیں، جس وقت وہ موت اور روح کے قبض کیے جانے سے گھبرا جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ جن کو تم دنیا کی زندگی میں اللہ کا شریک ٹھہرا کر پکارتے تھے اور پوجتے تھے اب ان کو بلاؤ کہ وہ آ کر تمھیں اس تکلیف سے چھڑائیں جس میں تم اس وقت گرفتار ہو اور آ کر تمھیں رہائی بخشیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ تو ہمارے پاس سے چل دیے۔ اب ہم کو ان سے نہ تو کسی نفع کی امید ہے نہ بھلائی کی توقع۔ خیر یہ ان کا اپنے کفر پر اقرار ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ان جھٹلانے والوں اور تکبر کرنے والوں کو کتاب میں سے ان کا نصیب پہنچے گا، یعنی جو کچھ خیر وشر سے ان کے لیے پہلے سے لکھ دیا گیا ہے وہ پائیں گے۔ انھیں اپنے کفر کے مطابق عذاب دیا جائے گا، یا بدبخت اور نیک بخت۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی پہلے سے لکھا ہوا غالب آئے گا۔[3] مراد قرآن ہے، جس میں کافروں کے عذاب کا ذکر آیا ہے یا لوحِ محفوظ یا نوشتۂ پیشانی۔

رُسل سے مراد یہاں ملک الموت اور اس کے مددگار فرشتے ہیں یا وہ جو ان کو آگ میں داخل کرنے پر مقرر

---

(1) تفسير الطبري (١٢/ ٤١٢۔ ٤١٤) (2) تفسير ابن كثير (٢/ ٢٨٥) (3) تفسير الطبري (١٢/ ٤١٣)

ہیں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے یہ دونوں قول نقل کیے ہیں۔[1] کوئی بھی ہوں، وہ سخت اور جھڑکی والے لہجے میں ان سے یہ سوال کریں گے کہ اللہ کے سوا جو معبود تم نے ٹھہرا رکھے تھے وہ اب کدھر ہیں، کہاں ہیں؟ وہ آئیں اور تمھیں چھڑائیں اور بچائیں۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم نہیں جانتے کہ کدھر غائب ہو گئے۔ اب وقت پر ہمارے کچھ کام نہ آئے، یہ ان کا موت کے وقت اپنے کفر کا اقرار ہو گا۔[2] اللّٰھم احفظنا.

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

اللہ فرمائے گا: تم ان امتوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ، جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے گزر چکی ہیں، جب بھی ایک امت آگ میں داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن (اپنے جیسی دوسری امت) پر لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب اس میں وہ سب اکٹھے ہوں گے تو ان کی دوسری جماعت ان کی پہلی جماعت کے بارے میں کہے گی: اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، لہٰذا تو انھیں آگ کا دوگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا: (تم میں سے) ہر ایک کے لیے دوگنا (عذاب) ہے، مگر تم نہیں جانتے (38) اور ان کی پہلی جماعت ان کی دوسری جماعت سے کہے گی: تمھیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، چناں چہ تم اس کے بدلے میں عذاب (کا مزہ) چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے تھے (39)

اہلِ نار کا ایک دوسرے کو لعن طعن کرنا اور جھگڑنا:

یعنی ایک حساب سے پہلی امت کا گناہ بڑا کہ پچھلوں کو بری راہ پر ڈالا اور ایک طرح پچھلوں کا بڑا کہ پہلوں کا حال دیکھ سن کر عبرت نہ پکڑی، یعنی اللہ ہر امت کو اس کے جوڑ کی امت سے ملائے گا۔ جن ہوں یا انسان۔ کافر کافر سب آگ میں ایک جگہ جمع کیے جائیں گے، تاکہ ہم جنس کا پرواز ہم جنس کے ساتھ ہو۔ ہر امتِ کفر دوسری

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۲۲۷) [2] فتح البیان (۴/ ۳۵۳۔ ۳۵۴)

امتِ کفر کو لعنت کرے گی، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ ﴾ [العنكبوت: ٢٥] ''پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ [البقرة: ١٦٦۔ ١٦٧] ''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بے زار ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی تھی اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے تمام تعلقات کٹ جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے پیروی کی تھی، وہ کہیں گے: کاش کہ ہمارے لیے ایک بار (دنیا میں) واپسی ہو تو ہم بھی ان لوگوں سے اسی طرح بے زار ہو جائیں جس طرح وہ ہم سے بے زار ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ناکام خواہش بنا کر ان کے سامنے دکھائے گا اور وہ آگ کے عذاب سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔''

پھر فرمایا کہ جب وہ سب امتیں اگلی پچھلی آگ میں جمع ہو جائیں گی تو اَتباع (پیروکار) اللہ پاک سے اپنے متبوعین (پیروں) کا شکوہ کریں گے کہ ہم کو سیدھی راہ سے انھوں نے گمراہ کیا ہے، ان کا عذاب دگنا چاہیے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ٦٦۔ ٦٨] ''جس دن آگ میں ان کے چہرے الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تو انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی سخت (اور زیادہ) لعنت کر۔''

یہ جواب کہ ''تم سب کو دگنا عذاب ہے، لیکن تم نہیں جانتے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر کسی کو تم میں سے اور ان میں سے اس کے عمل کے مطابق سزا دی ہے۔ جو تم چاہتے ہو وہ ہم پہلے ہی سے کر چکے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴾ [النحل: ٨٨] ''جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ﴾ [العنكبوت: ١٣] ''اور یقیناً وہ اپنے بوجھ اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کئی اور بوجھ ضرور اُٹھائیں گے۔'' مزید فرمایا: ﴿ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [النحل: ٢٥] ''اور کچھ ان کے بوجھ بھی، جنھیں وہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں۔''

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ متبوع تابع سے کہیں گے کہ جیسے ہم گمراہ ہوئے تھے، ویسے ہی تم بھی گمراہ ہوئے،[1] اب اپنے کیے کو بھگتو، عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ ویسا حال ہے جس کی خبر اللہ نے ان کے محشر کے حالات میں دی ہے:
﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [السبا: ۳۱۔ ۳۳] ”اور (اے نبی!) کاش آپ دیکھیں! جب ظالم لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، جبکہ ان کا بعض بعض کی بات رد کر رہا ہوگا تو جو لوگ (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے، وہ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم مومن ہوتے۔ وہ لوگ جو تکبر کرتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو کمزور سمجھے جاتے تھے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا جب وہ تمھارے پاس آگئی تھی؟ بلکہ تم (خود ہی) مجرم تھے۔ اور وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: (نہیں!) بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں اور وہ (سب دل میں) ندامت چھپائیں گے جب عذاب دیکھیں گے، اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس قول کا قائل اللہ پاک ہے کہ تم آگ میں گزشتہ امتوں کے ساتھ داخل ہو۔ حرف فی بمعنی مع ہے یا یہ جہنم کے داروغے مالک کا قول ہے۔ امم سے مراد کفار جن و انسان امتوں اور قوموں میں سے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ اس حالت کا ذکر ہے جس میں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔ ایک امت کو دوسری امت کی بہن ضلالت یا آگ میں اکٹھے ہونے کے اعتبار سے کہا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مشرکین مشرکین کو، یہود یہود کو، نصاریٰ نصاریٰ کو، صابئین صابئین کو اور مجوس مجوس کو لعنت کریں گے۔[2]

یہ لعنت آگ میں آپس میں ملاقات اور ایک دوسرے کے پیچھے جانے اور اکٹھے ہونے کے وقت ہوگی۔ اُخریٰ سے پہلے زمانے کے لوگ مراد ہیں، اولیٰ سے اگلے زمانے کے۔ یا اُخریٰ سے اتباع کرنے والے یا نیچے والے،

[1] تفسير الطبري (۱۲/ ۴۲۰)
[2] تفسير الطبري (۱۲/ ۴۱۶)

یعنی ماتحت مراد ہیں، اُولیٰ سے سردار اور بڑے لوگ مراد ہیں۔ (قالہ مقاتل) یہ قول زیادہ بہتر ہے۔ اس دلیل سے کہ وہ یوں کہیں گے کہ اے رب! انہی نے ہم کو ہدایت سے گمراہ کیا ہے۔ سو گمراہ کرنے والے وہی رؤسا ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: تم میں سے ہر ایک گروہ کو دوگنا عذاب ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: یہ دوگنا عذاب پیشواؤں کو ان کے کفر اور اپنے ماتحتوں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے اور ان کے متبعین کو ان کے کفر اور تقلید اور بڑوں کی پیروی کرنے کی وجہ سے ہوگا۔ پھر پہلے زمانے کے لوگ بعد والوں سے یا جن کی پیروی کی گئی تھی، وہ اپنے تابعین سے بالمشافہ کہیں گے کہ تم اور ہم اللہ کے ساتھ کفر کرنے اور عذاب کے مستحق ٹھہرنے میں برابر ہیں۔ تم ویسے ہی گمراہ ہو گئے، جیسے ہم تھے۔ یہ خطاب پچھلے گروہ کی تردید ہے، جنھوں نے کہا کہ ﴿ هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا ﴾ (آیت باب) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں فضل سے مراد عذاب کا ہلکا ہونا ہے۔[1] اب چکھو عذاب کفر اور گناہوں کے بدلے۔ یہ قائدین کا اپنے پیروکاروں سے کہنا ہو گا یا پہلی جماعت والوں کا بعد والی جماعت والوں سے ہوگا۔[2]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ۝۴۰ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۱

بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے تکبر کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے، اور ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں (40) ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا، اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں (41)

جھٹلانے والوں کے لیے آسمانی دروازوں کا بند ہونا اور جنت سے محرومی:

دروازہ نہ کھولے جانے سے مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی عملِ صالح یا دعا آسمان پر نہیں جاتی۔ یہ امام مجاہد، سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، یا ان کے ارواح کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ یہ امام سدی رحمہ اللہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک اہلِ علم کا قول ہے۔[3] اسی کی تائید کرتی ہے وہ حدیث جو براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کسی فاجر شخص کی روح کو لے کر فرشتے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں تو

---

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۴۲۰) [2] فتح البیان (٤/ ۳۵۵۔ ۳۵۷) [3] تفسیر الطبري (۱۲/ ۴۲۱۔ ۴۲۳)

جس گروہِ ملائکہ پر گزر ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں: یہ کس کی خبیث روح ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ فلاں ہے اور اس کا بہت برا نام، جس سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا، لیتے ہیں۔ جب آسمان تک پہنچتے ہیں، دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں تو کھولا نہیں جاتا، پھر نبیِ اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ﴾ ''(آیتِ باب)'' (رواہ ابن جریر) یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو ابوداود، نسائی اور ابن ماجہ ؒ نے روایت کیا ہے۔[1]

امام احمد ؒ نے براء بن عازب ؓ سے بطولہ ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا براء ؓ نے کہا کہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک انصاری مرد کے جنازے میں نکلے، جب قبر تک پہنچے تو وہ ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ نبیِ اکرم ﷺ بیٹھ گئے، ہم بھی آپ ﷺ کے ارد گرد بیٹھ گئے، گویا ہمارے سروں پر پرندے تھے۔ نبیِ مکرم ﷺ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر سر اٹھا کر کہا: ''اللہ سے عذابِ قبر کی پناہ مانگو! یہ دو یا تین بار فرمایا، پھر فرمایا: بندۂ مومن جب دنیا سے منقطع ہو کر آخرت کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو آسمان سے سفید منہ والے فرشتے اس کی طرف اترتے ہیں، گویا ان کے چہرے سورج ہیں، ان کے ساتھ جنت کا کفن اور خوش بو ہوتی ہے، اس شخص کی جہاں تک نظر جاتی ہے، وہاں تک بیٹھتے ہیں، پھر ملک الموت آ کر اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے نفسِ مطمئنہ نکل! اللہ کی بخشش اور رضوان کی طرف، وہ روح اس طرح بہتے ہوئے نکل آتی ہے جیسے مشک کے منہ سے پانی کی بوند ٹپکتی ہے۔ وہ اس کو لے کر کفن میں رکھتے ہیں اور خوش بو میں، وہ جان اس طرح نکلتی ہے جیسے بہت عمدہ مشک کی خوش بو ہو جو روئے زمین پر پائی جاتی ہے۔ اس کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں، پھر وہ جس گروہِ ملائکہ کے پاس سے گزرتے ہیں، وہ پوچھتے ہیں: یہ پاک روح کس کی ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں ہے، دنیا میں جو اس کا بہت اچھا نام لیا جاتا تھا، وہ نام لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آسمانِ دنیا تک پہنچ کر دروازہ کھلواتے ہیں، وہ کھول دیا جاتا ہے، ہر آسمان کے مقرب فرشتے دوسرے متصل آسمان تک اس کو پہنچا دیتے ہیں، جب یہ ساتویں آسمان تک لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھو اور اسے واپس زمین کی طرف لے جاؤ، اس لیے کہ میں نے ان کو یعنی بنی آدم کو زمین سے پیدا کیا ہے، اسی میں ان کو لوٹا دوں گا اور اسی سے ان کو دوسری بار نکالوں گا۔ فرمایا کہ اس کی روح پھیر دی جاتی ہے۔ دو فرشتے آ کر اس کو اٹھا کر بٹھا دیتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے، کہتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔ کہتے ہیں یہ کون شخص ہے جو تمھارے بیچ میں بھیجا گیا؟ وہ کہتا ہے: اللہ کے رسول ہیں، کہتے ہیں تو نے کس طرح جانا؟

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٩) تفسير الطبري (١٢/ ٤٢٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦)

وہ کہتا ہے: میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا، اس کی تصدیق کی، تب ایک ندا کرنے والا آسمان سے یہ آواز دیتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا، اس کے لیے جنت کا بچھونا بچھا دو اور جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے ایک دروازہ جنت کی طرف کھول دو، تا کہ اس کو جنت کی ہوا اور خوش بو آتی رہے۔ اس کی قبر جہاں تک نظر جاتی ہے وہاں تک کشادہ کر دی جاتی ہے، فرمایا: اس کے پاس ایک خوب صورت شخص بہت اچھا اور خوش بو دار لباس پہنے ہوئے آتا ہے اور کہتا ہے: تجھ کو اس کی بشارت ہے جو تجھ کو خوش کر دے یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ تھا، وہ اس سے کہتا ہے: تو کون ہے؟ تیرا منہ آج کے دن خیر کی خبر لاتا ہے، کہتا ہے: میں تیرا عملِ صالح ہوں، وہ کہتا ہے: اے میرے رب! قائم کر قیامت، اے رب! قائم کر ساعت، تا کہ میں اپنے اہل وعیال کے پاس پھر کر جاؤں۔

پھر فرمایا کہ کافر بندہ جب اس دنیا سے تعلق توڑ کر آخرت کی طرف جاتا ہے تو آسمان سے سیاہ چہرے والے فرشتے اترتے ہیں، ان کے ساتھ ٹاٹ ہوتا ہے، اس سے جہاں تک نگاہ جاتی ہیں، وہاں تک بیٹھ جاتے ہیں، ملک الموت آ کر سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے خبیث نفس! اللہ کے غصے اور غضب کی طرف نکل! فرمایا: اس وقت روح اس کے بدن میں پریشان ہو جاتی ہے، ملک الموت اس کو اس طرح کھینچتا ہے، جس طرح کوئی سفود یعنی لوہے کی سیخ کو بھیگی ہوئی اُون سے کھینچتے ہیں۔ پھر جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو دوسرے فرشتے اس کے ہاتھ میں اسے آنکھ جھپکنے تک نہیں رہنے دیتے اور لے لیتے ہیں، اس ٹاٹ میں اسے لپیٹ لیتے ہیں، اس سے ایسی بری مردار جیسی بدبو نکلتی ہے جیسے سب سے بری بدبو زمین پر ہوتی ہے۔ اُس کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں، جب بھی ملائکہ کے کسی گروہ پر گزر ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ کس کی ناپاک روح ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں بن فلاں ہے اور جو دنیا میں اس کا سب سے برا نام لیا جاتا ہے، اس کا وہ نام بتاتے ہیں۔ دروازہ کھلواتے ہیں تو کھولا نہیں جاتا، پھر نبیِ اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ﴾ (آیتِ باب) اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اس کی کتاب سجین میں لکھو جو زمین سفلی کے اندر ہے، پھر اس روح کو پھینک دیتے ہیں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ﴾ [الحج: ٣١] ”اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اسے پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا کسی دور دراز جگہ لے جا پھینکے۔“

پس وہ روح بدن میں پھیری جاتی ہے، دو فرشتے آ کر اس شخص کو بٹھا دیتے ہیں، اس سے کہتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے! میں نہیں جانتا، کہتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے! میں نہیں جانتا، وہ کہتے ہیں: یہ کون شخص ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے! میں نہیں جانتا۔ ایک منادی آسمان سے ندا کرتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے، اس کے لیے آگ کا فرش کر دو، دروازہ آگ کا کھولو، اس کو آگ کی ہوا اور لو آتی ہے، قبر

تنگ کر دی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں، ایک مرد بدصورت اور بدلباس بدبودار آ کر اس سے کہتا ہے: تجھے خوشی ہو اس کی جو تجھے برا لگے، یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھ کو وعدہ دیا گیا تھا، وہ کہتا ہے: تو کون ہے؟ یہ کہتا ہے: میں تیرا ناپاک عمل ہوں، وہ کہتا ہے: اے رب! قیامت کو قائم نہ کر۔[1] اس بارے میں مسند اور سنن میں اور بھی حدیثیں ہیں، جن میں نفسِ مطمئنہ مومنین اور نفسِ خبیثہ کفار و فجار کے انجام کا ذکر آیا ہے اور آسمان کے دروازے کھولے جانے اور نہ کھولے جانے کا ذکر ہے۔

جمل کی تفسیر:

پھر اللہ نے کہا کہ یہ لوگ جو اس طرح مرتے ہیں، یعنی کفر و شرک پر، یہ جنت میں نہ جائیں گے، جب تک جمل سوئی کے ناکے میں نہ گھسے، جمل کی تفسیر بعیر کی ہے، یعنی اونٹ۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "هُوَ الْجَمَلُ بْنُ نَاقَةَ" "وہ اونٹ ہے اونٹنی کا بچہ" دوسری روایت میں "زَوْجُ النَّاقَةِ" کہا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا: یعنی یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو۔ یہی امام ابو العالیہ، ضحاک رحمہ اللہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

دوسری قراءت جُمَّلُ ہے، یعنی جیم کی پیش اور میم کی شد کے ساتھ۔ یعنی موٹی رسی، یہ قراءت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ دوسری روایت ہے کہ مراد کشتی کو باندھنے والی موٹی رسی ہے۔[2] مِهَاد بمعنی فرش ہے۔ غَوَاشُ بمعنی لحاف ہے، یہی امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[3] یعنی آگ کی توشک (بستر) آگ کا لحاف ہوگا۔ اوڑھنا بچھونا دوزخ ٹھہرا۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا. یہ ظالموں ستم گاروں کی جزا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں اور تکبر کرنے والوں کے لیے، جب وہ مرتے ہیں تو، آسمان کے دروازے نہیں کھلتے، دروازے مومنوں کی روحوں کے لیے کھلتے ہیں، اُن کی روح ساتویں آسمان تک جاتی ہے، جہاں اللہ پاک ہے، اسی پر صحیح احادیث دلیل ہیں کہ فرشتے جب کافروں کی روح کو لے کر آسمانِ دنیا تک لے جا کر دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں تو نہیں کھلتا، یا یہ مطلب ہے کہ ان کی دعاؤں کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، یعنی دعا قبول نہیں ہوتی، یہ امام مجاہد اور نخعی رحمہ اللہ کا قول ہے،[4] یا مراد ان کے اعمال ہیں کہ وہ مردود ہوتے ہیں اور مقبول نہیں ہوتے، بلکہ ان کے منہ پر مار دیے جاتے ہیں، یا آسمان سے مراد جنت ہے، یعنی ان کے لیے بہشت کا دروازہ نہیں کھلتا، کیوں کہ جنت کو آسمان پر بتاتے ہیں، لیکن آیت کو ارواح، دعاؤں اور اعمال پر محمول کرنے پر کوئی

---

(1) مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦)
(2) تفسير الطبري (١٢/ ٤٢٨۔ ٤٣٢)
(3) تفسير الطبري (١٢/ ٤٣٦)
(4) تفسير الطبري (١٢/ ٤٢٣)

ممانعت نہیں۔ ولوج بمعنی داخل ہونے کے ہے۔ زور سے گھسنے کو ولوج بولتے ہیں۔ اونٹ کا ذکر کیا اور حیوانات کا نہیں کیا، اس لیے کہ عرب کے نزدیک سب حیوانوں سے بڑے جسم والا ہونے پر اونٹ ہی کی مثال دی جاتی ہے، سوئی کے ناکے کا ذکر اس لیے کیا کہ سب سے زیادہ تنگ راستہ (سوراخ) سوئی کا ناکہ ہوتا ہے۔ اونٹ قیامت تک اس میں نہیں گھس سکتا، اس لیے ثابت ہوا کہ جو چیز محال پر موقوف ہے وہ محال ہے، یعنی اس اعتبار سے یہ امر واجب ٹھہرا کہ کافر لوگ جنت میں داخل ہونے سے قطعاً مایوس و ناامید و محروم ہیں۔ إن شاء الله تعالیٰ.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جیم کی پیش اور میم کی شد سے پڑھا (جُمَّل) بمعنی کشتی کا رسہ جس کو قلس کہتے ہیں،[1] یا کئی رسوں کا مجموعہ، یا پابندِ شتر (اونٹ کو باندھنے والا رسہ)، یا وہ رسہ جس سے درخت پر چڑھتے ہیں۔ سم و سام ذرا سے چھید کو کہتے ہیں، بدن میں ہو یا ناک میں، مراد تنگ سوراخ ہے، مسامات کی طرح۔ خیاط کے معنی ہیں سوزن، یعنی سوئی۔ بعض اہلِ معانی نے کہا ہے کہ اس تعلیق سے اللہ کی مراد ابد تک جنت میں داخلے کی نفی ہے۔ عرب جب کسی ناجائز کام کی تعلیق جائز سے کرتے ہیں تو اس سے مراد اُس جائز کا محال ہونا ہوتا ہے، جیسے یہ کہنا کہ ہم تیرے پاس نہ آئیں گے جب تک کہ کوا بوڑھا نہ ہو یا چوہا انڈہ نہ دے۔ یہ سزا ہے مجرموں کی۔ اُن کو اوپر اور نیچے سے جہنم کی آگ گھیرے گی، ظالموں کی جزا ایسی ہی ہوتی ہے۔ جنت میں داخلے سے ناامیدی کے سلسلے میں جرم کا ذکر کیا اور آگ میں داخل ہونے کے سلسلے میں ظلم کا ذکر کیا۔ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ظلم تمام جرموں سے بڑا جرم ہے، اسی لیے شرک کو ظلم عظیم فرمایا ہے۔[2]

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ
صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ وَقَالُوا الْحَمْدُ
لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ
هَدٰىنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُوْدُوْٓا اَنْ
تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو ہم کسی شخص کو اس کی ہمت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (42) اور ان کے دلوں میں جو کینہ ہوگا، وہ ہم نکال پھینکیں گے، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے: سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس

(1) تفسير الطبري (١٢/ ٤٣١) (2) فتح البيان (٤/ ٣٥٧۔ ٣٥٩)

نے ہمیں یہ سیدھی راہ دکھائی اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی تو ہم ہرگز ایسے نہ تھے کہ ہدایت پاتے، بلاشبہہ ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم ان اعمال کے بدلے وارث بنائے گئے ہو جو تم کرتے تھے (43)

صالحین کے احوال اور مآل کا ذکر:

معلوم ہوا کہ نیکوں کے دل میں بھی آپس میں خفگی ہوگی، جنت کے قریب پہنچ کر آپس میں دل صاف ہوں گے، تب جنت میں جائیں گے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم ان لوگوں میں ہیں۔[1] جنت کے وارث فرمایا۔ یعنی آدم علیہ السلام کی میراث پائی۔ اللہ پاک نے اس جگہ بدبختوں کے ذکر کے بعد نیک بختوں کا ذکر فرمایا کہ جن لوگوں کے دل ایمان لائے ہیں اور جوارح سے انھوں نے عملِ صالح کیے ہیں، یہ ان کی ضد ہیں جو اللہ کی آیتوں کے کافر ہوئے اور ان کو قبول کرنے سے تکبر کیا۔ اللہ نے آگاہ کیا کہ ایمان لانا اور ایمان پر عمل کرنا آسان ہے، کیوں کہ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ یہی لوگ اہلِ بہشت ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ ان کے دلوں میں جو کچھ حسد و بغض ہوگا وہ نکال لیا جائے گا، سینہ پاک صاف اور دل بے کینہ ہو کر بہشت میں جائیں گے۔

صحیح بخاری میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب مومنین آگ سے رہائی پائیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل پر روکے جائیں گے۔ ان مظالم کا بدلہ لیا جائے گا جو دنیا میں ان کے درمیان تھے، یہاں تک کہ جب پاک صاف اور شائستہ و آراستہ ہو جائیں گے، تب ان کو جنت میں جانے کا حکم ہوگا، سو قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ان میں سے ہر ایک جنت میں اپنے گھر کو اس سے زیادہ اچھی طرح جان پہچان لے گا جتنا وہ دنیا میں اپنے گھر کو جانتا تھا۔[2]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب جنت والے جنت کی طرف لے جائے جائیں گے تو جنت کے دروازے پر ایک درخت پائیں گے جس کی جڑ میں دو چشمے ہوں گے۔ ایک چشمے کا پانی پئیں گے جو کچھ ان کے دلوں میں کینہ اور خیانت ہوگی وہ سب دور ہو جائے گی، یہ شرابِ طہور ہے۔ دوسرے چشمے میں نہائیں گے تو ان پر نعمتوں کی تازگی ظاہر ہو جائے گی، پھر اس کے بعد نہ کبھی میلے کچیلے ہوں گے نہ بدصورت و بدشکل۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا. اس کے مثل علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[3]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ علی رضی اللہ عنہ کہتے تھے: "إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ أَكُونَ أَنَا وَعُثْمَانُ وَطَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ مِنَ

---

(1) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں آگے آئے گی۔ (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٠٨)

(3) تفسير الطبري (١٢/ ٤٣٨۔ ٤٤١)

الَّذِيْنَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيهِمْ: وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ" "مجھے امید ہے کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو کچھ ان کے دلوں میں کینہ تھا، ہم اس کو دور کر دیں گے۔" امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ علی رضی اللہ عنہ کہتے تھے: فِيْنَا وَاللّٰهِ أَهْلِ الْبَدْرِ نَزَلَتْ۔ یعنی یہ آیتِ نزع ہم بدریوں کے حق میں اتری ہے۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ سارے اہلِ جنت اپنی جگہ دوزخ میں دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو ہم کس طرح راہ یاب ہوتے۔ یہ ان کا شکر ہوگا۔ اور سارے اہلِ دوزخ اپنی جگہ جنت میں دیکھیں گے اور کہیں گے کاش! اللہ ہم کو ہدایت کرتا۔ یہ ان کی حسرت ہوگی۔ اسی لیے جب جنتی جنت میں، دوزخیوں کی جگہ وارث ہو جائیں گے ان کو یہ ندا کی جائے گی: ﴿ اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ ﴾ (آیتِ باب) یعنی تمھارے اعمال کی وجہ سے تم کو یہ رحمت پہنچی کہ تم جنت میں آئے اپنے گھروں میں اپنے اعمال کے مطابق قیام پذیر ہوئے۔ (رواه النسائي و ابن مردوية)[2]

آیتِ شریفہ کو اسی پر محمول کرنا واجب ہے، اس لیے کہ صحیحین میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو چکا ہے کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، کہا: آپ کو بھی اے اللہ کے رسول؟! فرمایا: مجھ کو بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھ کو اپنی رحمت اور فضل میں چھپا لے۔[3] معلوم ہوا کہ عمل موجبِ نجات نہیں ہیں، نجات و جنت محض اللہ کے رحم و کرم سے ملتی ہے، مگر اعمال مطلوب ہیں، اس لیے کہ جنت و نجات کے حصول کے لیے نشان ہیں۔

بجستجوی نیابد کسے مراد ولے　　　کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

"جستجو کے بغیر کسی کو اپنی مراد نہیں ملتی، مراد اس کو ملتی ہے جو ہمیشہ جستجو میں لگا رہتا ہے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم بندوں کو ایسی تکلیف نہیں دیتے جو اُن کی قدرت سے باہر ہو، بلکہ ایسی تکلیف دیتے ہیں جو ان کی وسعت اور قدرت میں داخل ہو اور اسی کے مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ﴾ [الطلاق: ٧] "اللہ کسی شخص پر اتنی ہی ذمے داری ڈالتا ہے جتنا اس نے اسے دیا۔" امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: وسع وہ ہے جس پر انسان قادر ہو اور اس کے کرنے سے عاجز نہ ہو، جن کے نزدیک وسع صرف کوشش کرنے کا نام ہے، وہ غلطی پر ہیں۔[4] مثلاً: یہ تکلیف کہ ایمان لاؤ، اللہ اور رسول کی تصدیق کرو، اچھے عمل بجا لاؤ، برے کاموں

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٤٣٨) ان دونوں کی سند میں انقطاع ہے۔ امام قتادہ اور حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٤٧) مسند أحمد (٢/ ٥١٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥١٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٦)

[4] معاني القرآن (٢/ ٣٣٩)

سے بچو، کوئی ایسا بوجھ نہیں جو ہماری طاقت سے باہر ہو، اسی لیے مومن صالح عمل کرنے والے جنتی ہوں گے، ہمیشہ وہاں رہیں گے، ان کے سینوں کا بغض، حسد اور کینہ سب نکال لیا جائے گا، یہ اللہ کی ایک دوسری نعمت ہوگی کہ سب صاف دل ہو کر ایک دوسرے کے دوست دار ہوں گے، اس لیے کہ اگر دنیا کی طرح وہاں بھی جی میں کچھ کینہ اور دھوکا باقی رہتا ہے تو جنت کی عیش اور نعمتیں مکدر ہو جاتی ہیں، کیوں کہ کسی کینہ ور کا عیش کسی شخص کے بارے میں دل میں کینہ رکھنے کی وجہ سے خوش گوار نہیں رہتا۔

مطلب یہ کہ ہم نے ان کو جنت میں اس حالت پر پیدا کر دیا ہے کہ جانے سے پہلے ان کو ہر قسم کے بغض اور کینہ سے پاک صاف کر دیا ہے۔ نہ یہ کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد ان سے کینہ اور بغض کو نکالا ہے۔ غل کینے کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جنت میں نزعِ غل سے یہ مراد ہے کہ بعض اہلِ جنت فضیلت اور درجات کی بلندی کی وجہ سے بعض اہلِ جنت پر حسد نہ کریں گے، پھر جب اپنے گھروں میں جا ٹھہریں گے تو اللہ کا شکر ادا کریں گے اور کہیں گے کہ اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اس جزائے عظیم کو پہنچایا، یعنی جنت میں ہمیشگی اور دلوں کے کینوں سے نجات کی۔

﴿هَدٰىنَا لِهٰذَا﴾ سے مراد وہ ہدایت ہے جو ایمان اور دنیا میں عملِ صالح کی وجہ سے ملی۔ ہمارے رب کے رسول سچی بات لائے تھے کہ ایمان و عملِ صالح کی جزا جنت ہے۔ پھر اللہ پاک یا ملائکہ آواز دیں گے، کہتے ہیں کہ یہ آواز جنت میں ہوگی، یہ تمھاری بہشت ہے، جس کے تم وارث ہوئے ہو، اہلِ نار سے لے کر اپنے اعمال کے سبب سے۔ کشاف میں کہا ہے کہ یعنی نہ اپنی فضیلت کی وجہ سے جس طرح مبطلہ کہتے ہیں۔[1]

مبطلہ سے مراد اہلِ سنت و جماعت ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اے مسکین! (صاحبِ کشاف) تجھے نہیں معلوم کہ یہ بات کہ جنت میں داخلہ اور فردوس کی وراثت اللہ کی رحمت اور مہربانی سے ہوگی نہ کہ عمل سے، خود نبیِ اکرم ﷺ نے فرمائی ہے نہ کہ کسی اور شخص نے۔ حدیث میں آیا ہے: «سَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَنْ يَدْخُلَ أَحَدُنِ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهِ، قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ؟! قَالَ: لَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ» ''درست عمل کرو اور (حق) کے قریب رہو اور جان لو کہ کوئی بھی اپنے عمل سے جنت میں داخل نہیں ہوگا، لوگوں نے کہا: اور آپ بھی اے اللہ کے رسول؟! فرمایا: میں بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔''[2]

ایک سبب کی صراحت کرنے سے دوسرے سبب کی نفی لازم نہیں آتی۔ اگر عمل کرنے والے پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کو عمل کرنے کی قدرت نہ دیتا تو سرے سے عمل ہی نہ پایا جاتا، سو اگر اس کا اور کوئی فضل و کرم نہ ہوتا سوائے اس کے کہ اس نے عمل کرنے کی قدرت عطا کی تو بھی قائلین تفضّل محق ٹھہرتے نہ کہ مبطل۔ خود قرآن پاک میں آیا ہے: ﴿ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ﴾ [النساء: ٧٠] ''یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا ہے:

---

[1] الکشاف (٢/ ١٠١) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١٠٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨١٦)

﴿ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ﴾ [النساء: ١٧٥] ''تو وہ ضرور انھیں اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا۔'' نیز تیسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [الروم: ٤٥] ''تاکہ اللہ ان لوگوں کو اپنے فضل سے جزا دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، بلاشبہہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''

فتح الباری میں کہا ہے کہ منفی حدیث میں صرف عمل غیر مقبول جنت میں داخل ہونے کا سبب نہیں اور مثبت آیت میں عمل متقبل قبولیت کے حصول اور جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اور فضل وکرم اللہ کی طرف سے ہے۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ جنت اور جنت کے درجات رحمتِ الٰہی کے بغیر نہیں ملتے۔ سو جب اپنے اعمال کی وجہ سے اس میں داخل ہوں گے تو اس کی وراثت اور اس میں داخلہ صرف اللہ کی رحمت سے ہوا، اس لیے کہ ان کا عمل کرنا خود ان پر اللہ کی رحمت اور فضل ہے۔[2] ابو سعید رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ جب جنتی جنت میں جا چکیں گے تو ایک منادی ندا کرے گا: اب تمھارے لیے یہ حکم ہے کہ تم جیتے رہو، کبھی نہ مرو، تندرست رہو، کبھی بیمار نہ پڑو، جوان بنے رہو، بوڑھے نہ ہو، چین میں رہو، کبھی رنجیدہ نہ ہو۔ اسی لیے اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواہ مسلم)۔

معلوم ہوا کہ یہ ندا بہشت کے اندر ہوگی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔ اے اللہ! ہر قسم کے شرکِ خفی وجلی سے بچا کر ظاہر اور مخفی گناہوں کو معاف فرما کر جنت میں لے جا اور دوزخ سے بچا لے۔ اَللّٰهُمَّ آمِيْن۔ جنت کی تعریف تیری کتابِ عزیز اور تیرے رسول کی سنت میں پڑھتے پڑھتے، دیکھتے دیکھتے، سنتے سنتے اب جی بے قرار ہو گیا ہے، اپنے رحم وکرم وفیض سے ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کر کہ ہم آگ کے عذاب سے نجات پائیں اور مرحوم ومغفور اور معافی ہو کر بہشت میں جائیں، کب تک سننے سنانے پر صبر کرتے رہیں ؎

مشتاق دیدنیم شنیدن ز حد گذشت | تا کے بچشم غیر تماشا کند کسے

''ہم تو تیرے دیدار کے خواہش مند ہیں، تیرے متعلق سن سن کر تھک گئے ہیں، کوئی غیر کی آنکھ سے کب تک دیکھتا رہے۔''

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا
مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ
حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ

[1] فتح الباري (١/ ٧٨) [2] تفسير القرطبي (٧/ ٢٠٩)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٧) فتح البيان (٤/ ٣٥٩_ ٣٦٢)

اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور جنت والے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ بے شک ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ ہم نے سچا پایا، تو کیا تم نے بھی وہ وعدہ سچا پایا جو تمھارے رب نے تم سے کیا تھا؟ وہ (دوزخی) کہیں گے: ہاں، پھر ایک اعلان کرنے والا ان میں اعلان کرے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿44﴾ جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور اس میں ٹیڑھ ڈھونڈتے تھے، اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے تھے ﴿45﴾

اہلِ جنت کی اہلِ جہنم کو ملامت:

اللہ پاک نے قرآن شریف میں اکثر گناہوں پر انصاف فرمایا، لیکن ہر گناہ پر لعنت نہیں کی، مگر ایسوں پر جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ جنت اور دوزخ میں جا کر قرار پانے کے بعد جنتی اور دوزخیوں میں بات چیت ہوگی۔ ان کی آپس میں گفتگو ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ہوگی کہ ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا پایا، کہو تم نے بھی سچا پایا کہ نہیں؟ وہ جھک مار کر کہیں گے کہ ہاں ہم نے سچا پایا، جس طرح سورت صافات میں ایک شخص سے جس کا یار کافر تھا، نقل کیا ہے: ﴿ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴾ [الصافات: ۵۵۔ ۵۹] ”پھر وہ جھانکے گا تو اسے جہنم کے درمیان میں دیکھے گا۔ وہ (اس سے) کہے گا: اللہ کی قسم! یقیناً قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر ڈالتا۔ اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں ضرور حاضر کیے ہوؤں (مجرموں) میں سے ہوتا۔ (جنتی ساتھیوں سے کہے گا:) تو کیا پس (اب) ہم مرنے والے نہیں۔ اپنے پہلی بار مرنے کے سوا اور نہ ہمیں عذاب ہی ہوگا۔“

یعنی اس پر اس کی دنیا کی بات کا انکار کرے گا۔ عذاب اور سزا کا طعنہ دے گا۔ فرشتے کہیں گے: ﴿ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الطور: ۱۴۔ ۱۶] ”(کہا جائے گا:) یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا پھر یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں؟ تم اس (دوزخ) میں داخل ہو جاؤ، اب تم صبر کرو یا صبر نہ کرو تمھارے لیے برابر ہے، تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی، جو تم عمل کیا کرتے تھے۔“

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے بدر کے دن کشتگانِ قلیب کو ملامت کی تھی، پکار کر کہا تھا: اے ابوجہل بن ہشام! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ اور ان کے دیگر سرداروں کے نام لے کر فرمایا: «هَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَإِنِّيْ وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِيْ رَبِّيْ حَقًّا» ”میں نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا پا لیا ہے، کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ سچا پایا ہے؟“ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ایسی قوم سے خطاب کرتے ہیں جو مردار ہو گئی؟!

فرمایا: « وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُوْلُ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لَّا يَسْتَطِيْعُوْنَ أَنْ يُّجِيْبُوْا » ''اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میری بات کو ان سے زیادہ نہیں سن سکتے، لیکن ان میں جواب دینے کی طاقت نہیں ہے۔''[1]

اس سے سماعتِ موتی ثابت ہوتی ہے، مگر ہمیشہ کے لیے نہیں، بلکہ جب اللہ چاہے سنوا دے، مگر اس سماعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان سے مرادیں مانگے اور ان کو دنیا میں کسی قسم کا اختیار رکھنے والا جانے، یہ کام خاص اللہ کا ہے کہ برائی کو دور کرے، مقصد کو بر لائے، لوگ اسی دھوکے میں آ کر کہ مردے سنتے ہیں، قبر پرست اور مردہ پرست ہو گئے ہیں، مومن کہلا کر مشرک بن گئے ہیں ؎

تو تا کے گور مُردان را پرستی بگرد کار مردان گر درستی

''تو کب تک دوسرے لوگوں کی قبروں کو پوجتا رہے گا، یعنی دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتا رہے گا،
اگر تو سچا ہے تو باہمت لوگوں کے کام کا عکس بن جا، یعنی خود باہمت بن کر اپنے سہارے زندگی بسر کر۔''

ظالموں پر اللہ کی پھٹکار:

غرض کہ اس بات چیت کے بعد ایک آواز آئے گی کہ ظالموں پر اللہ کی پھٹکار ہے، یعنی ہمیشہ کے لیے، پھر ان کا ظلم بتایا کہ وہ لوگوں کو چاہتے ہیں کہ اللہ کی راہ سے ہٹ جائیں اور کسی اور راہ پر چلیں، سیدھے راستے پر نہ چلیں، پگڈنڈی راہ اختیار کریں، تاکہ کوئی رسول کا تابع نہ ہو، آخرت کے منکر تھے، دارِ آخرت میں اللہ سے ملنے کو جھٹلاتے تھے، اسی لیے دل کھول کر بے پروا ہو کر گناہ کے قول و فعل و عمل میں گرفتار تھے، کیوں کہ ان کو آخرت کے انکار کی وجہ سے نہ تو حساب کتاب کا خوف تھا نہ سزا کا اندیشہ اور نہ عذاب ہی کا ڈر تھا۔ وہ تو بدترین لوگ تھے، اپنے اقوال اور اعمال کے لحاظ سے، بے شبہہ گناہوں پر جرأت کرنا خواہ وہ گناہ کھلے ہوں یا چھپے، دل کے گناہ ہوں یا اعضا کے، اسی شخص سے ہوگا جو قیامت کا اعتقاد نہیں رکھتا اور آخرت کا منکر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو چاہوں سو کروں، کیسا گناہ، کہاں کا ظلم؟! جب مر گئے تو گئے گزرے، کچھ دوبارہ جینا نہیں کہ انصاف کا ڈر ہو۔

من راقب الناس مات غماً وفاز باللذة الجسور

''جس کو لوگوں کا ڈر رہتا ہے، وہ غم سے مر جاتا ہے اور جس کو کسی کا ڈر خوف نہیں ہوتا، وہ لذتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے۔''

گناہ کا ڈر تھوڑا ہو یا بہت، اسی شخص کو ہوتا ہے جس کو آخرت کا یقین ہے اور اللہ کے ملنے پر ایمان رکھتا ہے، یہی یقین اور ایمان اس کو گناہ سے روکتا ہے یا توبہ پر آمادہ کرتا ہے، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ذرہ ذرہ کا حساب کتاب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٤)

ہوگا، شر کی جزا شر اور خیر کی جزا خیر ملے گی۔ اس لیے اکثر گناہوں سے خصوصاً کبیرہ گناہوں اور محرمات سے تو ضرور ہی بچتا ہے جو تقوے کا ادنیٰ درجہ ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب جنت والے جنت میں اور آگ والے آگ میں جا چکیں گے، اپنے اپنے منازل میں قرار پکڑیں گے تو اہلِ جنت، اہلِ نار کو پکاریں گے، یہ پکارنا ان کو کوئی خبر دینے کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ یہ ان کو سرزنش کرنے اور ان پر حسرت کو اجاگر کرنے کے لیے ہوگا، وہ ندا ہوگی کہ ہم نے تو اپنے رب کا وعدہ جو اس نے انبیا و رسولوں کی زبان پر کیا تھا، سچا پایا، تم کہو تم بھی اپنے عذابِ الیم کے وعدے کو پہنچے یا نہیں؟! وہ کہیں گے: ہاں پہنچے۔ ظاہر آیت کا اطلاق عام ہے۔ جمع کا مقابلہ جب جمع سے ہوتا ہے تو ہر فرد ہر فرد پر اپنا حصہ پاتا ہے۔ سو اہلِ جنت کا ہر فریق اہلِ نار کے ہر فریق کو پکارے گا، جس کو دنیا میں جانتا پہچانتا تھا۔ یہ آواز دینے والا یہ آواز دے گا، یعنی ہر دو فریق کے درمیان، اسرافیل علیہ السلام یا کوئی اور فرشتہ، کہ اللہ کے ظالموں پر لعنت ہے، یہ اُس آواز کا مضمون ہے، اس جگہ اذان سے مراد کسی آواز دینے والے سے منادی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قلیبِ بدر (بدر کے پرانے کنویں) پر کھڑے ہوئے تو یہ آیت پڑھی۔[1] (رواه ابن أبي شيبة وأبو الشيخ وابن مردوية)

ظلم کی تفسیر یہ بتائی کہ وہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، لوگوں کو راہِ حق پر چلنے نہیں دیتے، بلکہ نفرت دلاتے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے پر جرح کرتے ہیں اور عیب نکالتے ہیں۔ سننِ مطہرہ کی اتباع میں شکوک و شبہات ڈال کر لوگوں کی تقلید کی طرف بلاتے ہیں، کہتے ہیں: حق وہ ہے جس پر ہم ہیں، جس پر تم ہو وہ حق نہیں، بلکہ ناحق ہے، آخرت کا انکار کرتے ہیں۔[2]

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾

اور ان دونوں (گروہوں) کے درمیان پردہ ہوگا اور اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک (جنتی و دوزخی) کو ان کی خاص علامتوں سے پہچانتے ہوں گے، اور وہ جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلام ہو،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٦٠) مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٣٦١) [2] فتح البيان (٤/ ٣٦٣)

اعراف والے (ابھی) جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے جب کہ وہ اس کی امید رکھتے ہوں گے ﴿46﴾ اور جب ان کی آنکھیں دوزخیوں کی طرف پھیری جائیں گی تو کہیں گے: اے ہمارے رب! تو ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کر ﴿47﴾

اصحابِ اعراف:

جنت و دوزخ کے بیچ میں ایک دیوار ہوگی، اس کے سرے پر نجات والے ہوں گے جو حشر اور حساب سے فارغ ہیں۔ بہشتی اور دوزخی کو نشان سے پہچان کر جنت والوں کو سلامتی کی خوش خبری دیں گے، یہ ابھی امیدوار ہیں، خوش خبری سن کر خوش ہوں گے۔ جب اللہ نے جنت و دوزخ والوں کی آپس میں مخاطبت کا ذکر کیا تو اب یہ بھی جتا دیا کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پردہ، یعنی دیوار ہوگی، جو اہلِ نار کو جنت سے ملنے میں مانع ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا یہ حجاب وہی دیوار یعنی فصیل ہے جس کا ذکر اللہ نے اس آیت میں کیا ہے: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ﴾ [الحدید: ۱۳] ''تب ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔''

یہی دیوار وہ اعراف ہے جس کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ﴾ (آیتِ باب) پھر امام سدی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حجاب وہی سُور (دیوار) ہے۔ وہ سور اعراف پر ہوگا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اعراف بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک حجاب ہے، ایک سُور ہے، جس کا دروازہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اعراف جمع ہے عرف کی، عرب کے نزدیک ہر اونچی چیز کو اعراف کہتے ہیں۔ مرغ کے کیس (کلغی) کو جو عرف بولتے ہیں وہ بھی اسی لیے کہ وہ اونچا اور بلند ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''الأعراف شيء مشرف''، یعنی مرتفع کو کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اعراف مرغ کے کیس کی مثل ایک فصیل ہے۔

تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ اعراف ایک ٹیلہ ہے، جنت اور نار کے درمیان ایک دیوار ہے۔ یہی امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ بہت سے علمائے تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اعراف کو اعراف اس لیے کہتے ہیں کہ اعراف والے لوگوں کو پہچانتے ہوں گے۔ اس بارے میں مفسرین کی عبارتیں کہ اصحابِ اعراف کون لوگ ہیں، مختلف ہیں، مگر سب کا مرجع ایک ہی معنی کی طرف ہوتا ہے، یعنی اعراف والے وہ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہیں۔ [1]

اسی معنی پر حذیفہ و ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور بہت سے سلف و خلف نے نص (صراحت) کی ہے۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس شخص کا حال پوچھا جس کی نیکیاں اور

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۴۴۹۔ ۴۵۵)

بدیاں برابر ہیں، فرمایا: وہ اعراف والے ہیں، جو ہنوز جنت میں نہیں گئے اور طمع رکھتے ہیں۔[1] (رواہ ابن مردویہ) یہ حدیث غریب ہے اور دوسری طرح پر ایک شخص مزینہ سے یوں مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے اُس کا حال پوچھا، جس کی حسنات اور سیئات برابر ہیں اور اصحابِ اعراف کا حال۔ فرمایا: « إِنَّهُمْ قَوْمٌ خَرَجُوْا عُصَاةً بِغَيْرِ إِذْنِ آبَائِهِمْ فَقُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ »[2] (رواہ ابن مردویة) ''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے باپوں کی اجازت کے بغیر جہاد کے لیے نکلے اور اللہ کے راستے میں قتل ہو گئے۔'' عبدالرحمان مزنی کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ سے اصحابِ اعراف کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستے میں آبا کی معصیت میں مارے گئے، آبا کی معصیت نے انھیں جنت کے داخلے سے روکا اور قتل فی سبیل اللہ نے آگ سے روکا۔'' (رواہ سعید بن منصور و ابن مردویة و ابن جریر و ابن أبي حاتم و ابن ماجه مرفوعاً من حدیث أبي سعید الخدري و ابن عباس)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِصِحَّةِ هٰذِهِ الْأَخْبَارِ الْمَرْفُوْعَةِ وَقُصَارَاهَا أَنْ تَكُوْنَ مَوْقُوْفَةً وَ فِيْهِ دَلَالَةٌ عَلٰى مَا ذُكِرَ''[3] کسی نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اصحابِ اعراف کون ہیں؟ کہا: وہ قوم ہے جس کے حسنات اور سیئات برابر ہیں، سیئات نے جنت سے روکا، حسنات نے آگ سے بچایا، سو وہ سُور (اعراف، دیوار) پر ٹھہریں گے، جب تک اللہ ان میں فیصلہ کرے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: « هُمْ قَوْمٌ تَجَاوَزَتْ بِهِمْ حَسَنَاتُهُمُ النَّارَ، وَقَعَدَتْ بِهِمْ سَيِّئَاتُهُمْ عَنِ الْجَنَّةِ، رَوَاهُمَا ابْنُ جَرِيْرٍ فَبَيْنَمَا هُمْ كَذٰلِكَ إِذْ طَلَعَ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ فَقَالَ لَهُمْ: اذْهَبُوْا فَادْخُلُوا الْجَنَّةَ فَإِنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ »[4] ''یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو ان کی نیکیوں نے آگ میں جانے سے روک رکھا ہو گا اور ان کی برائیوں نے جنت میں جانے سے روک رکھا ہو گا، وہ اسی طرح ہوں گے کہ تیرا رب ان کے پاس برآمد ہو گا اور فرمائے گا: جاؤ جنت میں چلے جاؤ، میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔''

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب لیا جائے گا، جس کی نیکیاں برائیوں سے زیادہ ہوں، خواہ ایک ہی سہی، وہ جنت میں جائے گا اور جس کی برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہوں گی، خواہ ایک ہی سہی وہ جہنم میں جائے گا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴾ [الأعراف: ۸] ''پھر جس شخص کے (نیک اعمال کے) وزن بھاری ہو گئے۔'' پھر کہا: ترازو ایک دانے سے ہلکی اور بھاری ہو جاتی ہے، سو جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۹۱) اس کی سند میں ''ابو عباد'' مجہول اور ''سلیمان بن داود'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۹۱)

[3] تفسیر الطبري (۱۲/ ۴۵۸) تفسیر ابن أبي حاتم (۱۴۸۴) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۲۹۱) اس کی سند میں ایک سے زیادہ ضعف کی وجوہ ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۲۷۹۱) البتہ سنن ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں ملی ہے۔

[4] تفسیر الطبري (۱۲/ ۴۵۳۔ ۴۵۲)

ہوں گی، وہ اصحابِ اعراف میں ہوگا۔

یہ لوگ صراط پر ٹھہر کر جنت اور دوزخ والوں کو پہچانیں گے، جب جنت والوں کی طرف نظر کریں گے تو پکار کر السلام علیکم کہیں گے، جب نظر اہلِ نار کی طرف پھیریں گے تو کہیں گے: اے رب! ہم کو ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا۔ ان کے منازل سے پناہ مانگیں گے، حسنات والوں کو ایک نور ملے گا، جو ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف رہے گا، اس کی روشنی میں وہ چلیں گے۔ اس دن ہر بندے اور ہر امت کو ایک نور دیا جائے گا۔ جب صراط پر آئیں گے تو اللہ ہر منافق مرد وعورت کا نور سلب کر لے گا، اہلِ جنت منافقوں کی اس حالت کو دیکھ کر کہیں گے: ﴿ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا ﴾ [التحریم: ٨] ''(اے) ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر۔''

رہے اصحابِ اعراف سو جو نور ان کے سامنے ہوگا وہ ان سے نہ لیا جائے گا۔ اس وقت اللہ فرمائے گا: کہ وہ جنت میں نہیں گئے ہیں، ان کو طمع ہے۔ طمع سے مراد جنت میں داخل ہونے کی اُمید ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: بندہ جب کوئی حسنہ کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، جب سیئہ کرتا ہے تو ایک ہی بدی لکھی جاتی ہے۔ پھر کہا: ''هَلَكَ مَنْ غَلَبَ وَاحِدَتُهُ إِعْشَارَهُ'' ''یعنی برباد ہوا وہ شخص جس کی ایک بدی اس کی دھائی پر غالب آئی۔'' (رواہ ابن جریر)[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''اعراف جنت اور آگ کے درمیان ایک فصیل ہے۔ اعراف والے اس جگہ ہوں گے۔ جب اللہ کا ان کو عافیت دینا (معاف کرنا) منظور ہوگا تو ان کو ایک نہر کی طرف لے جائیں گے، جس کا نام نہرِ حیات ہے۔ اس نہر کے دونوں کنارے سونے کی شاخیں ہوں گی، جن پر موتی جڑے ہوں گے، اس کی مٹی مشک ہے۔ ان کو اس نہر میں ڈال دیں گے، یہاں تک کہ ان کی رنگتیں درست ہوں، پھر ان کے گلے میں ایک سفید تل نکلے گا جس سے وہ پہچانے جائیں گے۔ جب ان کے رنگ درست ہو جائیں گے تو رحمان تبارک وتعالیٰ کے پاس لائے جائیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمنا کرو جو چاہو، وہ اپنی آرزوئیں ظاہر کریں گے، یہاں تک کہ جب تمنا کر چکیں گے، اللہ ان سے فرمائے گا کہ تم کو وہ دیا جو تم نے چاہا اور ستر گنا اور دیا اور وہ جنت میں جائیں گے، ان کے گلوں میں سفید تل ہوگا، جس سے وہ پہچانے جائیں گے، ان کا نام مساکینِ اہلِ جنت ہوگا۔'' (رواہ ابن جریر و ابن أبي حاتم عن عبداللہ بن الحارث من قوله وهذا أصحُّ) یہی قول امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ وغیرہما سے بھی مروی ہے۔[2]

ابو زرعہ بن عمرو بن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحابِ اعراف کے بارے میں پوچھا گیا، فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جن کا فیصلہ تمام بندوں کے فیصلے کے بعد ہوگا۔ جب رب العالمین بندوں کے فیصلے سے فارغ ہوگا تو فرمائے گا، تم وہ قوم ہو جن کو حسنات نے آگ سے نکالا اور جنت میں نہ گئے، اب تم میرے آزاد کیے ہوئے ہو، جاؤ

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٥٣۔ ٤٥٤) اس کی سند میں ''ابوبکر ہذلی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٥٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٨٥۔ ١٤٨٦) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٢)

چرو جنت میں جہاں چاہو۔"[1] (رواہ سنید بن داود) یہ مرسل حسن ہے۔ بعض نے کہا: اعراف والے ولد الزنا ہیں۔ اس کو قرطبی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔[2]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن جنوں کے لیے ثواب اور سزا ہے، ہم نے ان کے ثواب اور ایمان کا حال پوچھا تو فرمایا کہ اعراف میں ہوں گے نہ کہ جنت میں، امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ۔ ہم نے کہا: اعراف کیا ہے؟ فرمایا: جنت کی دیوار ہے، جس میں نہریں جاری ہیں، درخت اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔"[3] (رواہ البیھقي) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: "أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ قَوْمٌ صَالِحُوْنَ فُقَهَاءُ عَلَمَاءُ" امام ابومجلز رحمہ اللہ نے کہا: "هُمْ رِجَالٌ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ يَعْرِفُوْنَ أَهْلَ الْجَنَّةِ وَأَهْلَ النَّارِ"[4] مگر یہ دونوں قول غریب اور سیاق کے خلاف ہیں۔ جمہور کا قول مقدم ہے۔ آیت انھی کے مذہب پر دلیل ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے اصحابِ اعراف کے بارے میں بارہ قول نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ شہدا ہیں، دوسرا یہ کہ صلحا ہیں، آخرت کی شاخوں میں سے نکلے ہیں، لوگوں کے اخبار جانتے ہیں، تیسرا یہ کہ انبیا ہیں۔[5] یہ بات کہ وہ ہر ایک کو اس کے نشان سے پہچانتے ہیں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے، یعنی اہلِ جنت کو ان کے سفید چہرے سے اور اہلِ نار کو سیاہ چہرے سے پہچانیں گے۔ یہی امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے ان کو اس رتبے میں اتارا ہے، تاکہ جنتی دوزخی کو پہچانیں، اہلِ نار کو چہروں کی سیاہی سے پہچان کر اللہ سے پناہ مانگیں گے کہ ان کو ظالموں کے ساتھ نہ کرے اور وہ اس حال میں اہلِ جنت کو سلام کریں گے۔ اگرچہ خود جنت میں داخل نہیں ہوئے ہیں، لیکن داخل ہونے کا طمع رکھتے ہیں، سو وہ ان شاء اللہ تعالیٰ جنت میں داخل ہوں گے۔ امام مجاہد، ضحاک، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔

حسن رحمہ اللہ نے اس آیت کو پڑھ کر کہا: واللہ! یہ طمع ان کے دل میں نہیں رکھی گئی، مگر ان کو اس سے مشرف کرنے کے ارادے سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے تم کو ان کے طمع کی خبر دی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ جب اہلِ نار کی طرف نظر کریں گے تو اللہ سے دعا مانگیں گے کہ انھیں اُن کے ساتھ نہ کرے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اہلِ نار کا کوئی گروہ ان کی طرف سے گزرے گا تو اس وقت وہ یوں کہیں گے کہ اے رب! تو ہم کو ان کے ساتھ نہ کرنا۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوزخیوں کے کالے منہ اور کنجی آنکھیں دیکھ کر یہ کہیں گے۔[6]

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٦١) تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٨٥) [2] تفسیر القرطبي (٧/ ٢١٢)

[3] البعث و النشور (١/ ١٠٨) تاریخ دمشق (٦٣/ ٢٩٨۔ ٢٩٩) اس کی سند میں "ولید بن موسیٰ" ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٥٨۔ ٤٥٩) [5] تفسیر القرطبي (٧/ ٢١١) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٢) [6] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٦٢۔ ٤٦٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ حجاب بمعنی حاجز (پردہ، رکاوٹ) یعنی بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک اوٹ ہوگی جو دیوار اور فصیل کی طرح ہوگی۔ اعراف سے مراد اس دیوار کے کنگرے یا ٹیلے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: اعراف جنت اور جہنم کے درمیان پہاڑ ہیں، وہ ان کی چوٹیوں پر ہوں گے۔ یا مراد صراط ہے۔[1] (قاله ابن جريج) یا اعراف سے نفسِ حجاب مراد ہے (قاله الواحدي)، یا جبلِ احد کو اٹھا کر وہاں رکھ دیں گے۔[2] (قاله القرطبي) رجال سے مراد فاضل مسلمین ہیں، یا جو سب سے آخر میں جنت میں جائیں گے۔ یا جس سے اس کے ماں باپ ناراض تھے۔ اس بارے میں تیرہ اقوال ہیں، ان میں سے خازن رحمہ اللہ نے آٹھ قول ذکر کیے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے پانچ مزید ذکر کیے ہیں۔[3] بعض نے کہا: شہدا ہیں۔ کسی نے کہا: مومنین کے فضلا ہیں، اپنی جان کے شغل سے فارغ ہو کر لوگوں کے حالات کا مطالعہ کریں گے۔ کسی نے کہا: انبیا ہیں، یا وہ جن کی نیکی بدی برابر ہے یا عباس، حمزہ، علی اور جعفر طیار رضی اللہ عنہم ہیں۔ اپنے دوستوں کو سفید چہروں سے اور دشمنوں کو سیاہ چہروں سے شناخت کریں گے۔ یا عدولِ قیامت ہیں کہ خلق کے اعمال پر گواہی دیں گے، یہ ہر امت میں ہوں گے، اس قول کو امام نحاس رحمہ اللہ نے احسن اقوال بتایا ہے۔ یا اولادِ زنا ہیں، یا اطفالِ مشرکین یا علما، فقہا اور صالحین یا ملائکہ موکلین جو مومن کو کافر سے الگ کریں گے، جنت اور دوزخ میں داخل کیے جانے سے پہلے۔[4]

ان اقوال میں اس بات پر دلیل ہے کہ اہلِ اعراف درجات میں اہلِ جنت سے گھٹ کر یا بڑھ کر ہوں گے، لیکن اس بارے میں کوئی واضح حکم یا روشن دلیل موجود نہیں، جس پر یقینِ کامل کیا جا سکے۔ یا وہ قوم ہے جن کے صغیرہ گناہ دنیا کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے دور نہیں ہوئے اور کبائر خود نہ تھے، وہ جنت سے روک لیے جائیں گے، تاکہ ان کا یہ روکا جانا ان کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ٹھہرے۔ یا وہ لوگ ہیں جن کے نہ باپ ان سے راضی تھے نہ مائیں یا ان کی مائیں ان سے خوش تھیں نہ باپ۔ اس بارے میں بعض احادیث مرفوعاً بھی آئی ہیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، پس اگر ان احادیث کا مرفوع ہونا ثابت ہو جائے تو ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ پھر کسی ایک کا قول نہ ہوگا۔ واللہ أعلم.

سِیما بمعنی علامت ہے، یعنی جنتی و دوزخی کو علامت سے پہچان لیں گے، جیسے: چہرے کی سفیدی اور سیاہی۔ یا وضو کی جگہوں کی روشنی یا کوئی اور علامت جو اللہ اس موقف میں مقرر کر دے گا، جس سے نیک بختوں اور بدبختوں کی پہچان حاصل ہوگی۔ آیتِ شریفہ کا حاصل اسی قدر ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک حجاب ہوگا، جو کچھ ہو اور جیسا کچھ ہو اس کی کیفیت اللہ ہی کو معلوم ہے، اور کچھ لوگ جن کے بارے میں کسی مرفوع حدیث سے تعیین معلوم نہیں اونچی جگہ سے ہر ایک شخص کو پہچانیں گے کہ فلاں بہشتی ہے، فلاں دوزخی۔ بہشتی سے صاحب سلامت کریں گے اور خود

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٨٤) [2] تفسیر القرطبي (٧/ ٢١٣)

[3] تفسیر الخازن (٢/ ٢٣٢۔ ٢٣٤) تفسیر القرطبي (٧/ ٢١١۔ ٢١٣) [4] فتح القدیر (٢/ ٢٩٣)

بھی بہشت کے امیدوار ہوں گے اور دوزخی کو دیکھ کر اس کی معیت سے پناہ مانگیں گے۔[1]

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

''دوزخیوں سے پوچھ کہ ان کے لیے جنت اور دوزخ کے درمیان کی جگہ ہی بہشت ہے۔''

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اعراف والے کچھ ایسے لوگوں کو پکاریں گے جنھیں وہ ان کی خاص علامتوں سے پہچانتے ہوں گے، وہ کہیں گے کہ تمھیں تمھارے گروہ نے کوئی فائدہ نہیں دیا اور نہ اس تکبر نے (فائدہ دیا) جو تم کرتے تھے (48) کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ ان پر رحمت نہیں کرے گا؟ (ان سے تو کہہ دیا گیا کہ) تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے (49)

اصحابِ اعراف کی کافروں کو ملامت:

اللہ نے خبر دی ہے کہ اعراف والے مشرکین کے بڑوں اور کافروں کے سرداروں سے ملامت کے طور پر یہ بات کہیں گے کہ کہو تمھاری جمعیت اور کثرت کچھ کام نہ آئی، آخر تم اس عذاب اور سزا میں کیوں پھنس گئے، کیوں جی یہ وہی غریب بے چارے ہیں جن کو تم قسم کھا کر اللہ کی رحمت سے محروم بتاتے تھے۔ پھر ان سے کہیں گے کہ اب تم تو جنت میں جاؤ، تم کو کچھ ڈر اور غم نہیں ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ بات ان سے اللہ تعالیٰ کہے گا کہ تم ہی ان کو جنت سے محروم ٹھہراتے تھے، لو اب وہ جنت میں داخل ہوتے ہیں، نہ خوف ہے نہ غم۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے، مگر سند اس کی نہیں لکھی۔ روایتِ مذکور میں آیا ہے کہ بندوں کے فیصلے کے بعد اللہ تعالیٰ اہلِ اعراف کو حکم دے گا کہ تم شفاعت طلب کرو، وہ آدم، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس جائیں گے۔ ہر پیغمبر عذر کرے گا، آخر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سفارش کے لیے تیار ہوں گے، مقامِ محمود میں شفاعت کریں گے، آخر وہ نہرِ حیوان میں نہا کر مثل روشن تاروں کے ہو جائیں گے، ان کے سینوں میں کچھ سفید تل باقی رہیں گے، جس سے وہ پہچانے جائیں گے، ان کو مساکینِ اہلِ جنت کہا جائے گا۔[3]

[1] فتح البیان (٤/ ٣٦٤۔ ٣٦٨) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٦٩) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٦٩۔ ٤٧٠) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٣۔ ٢٩٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کا سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ البتہ اصحابِ اعراف کے ذکر کے بغیر اس کی اصل صحیح مسلم (١٩٥) اور دیگر کتب میں مروی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اعراف والے کچھ لوگوں سے جن کو جانتے پہچانتے ہوں گے، یہ کہیں گے کہ تمھارے وہ مال و اسباب جو دنیا میں تم نے اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے جمع کیے تھے، آج کچھ کام نہ آئے۔ اس قول کے مخاطب دنیا کے کافروں کے بڑے اور مشرکین کے سردار ہوں گے۔ نہ تو تمھارا وہ ایمان قبول کرنے سے تکبر کرنا اب کوئی فائدہ مند ہوا۔ پھر ان اہلِ جنت مسلمین کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے، جن کو دنیا میں ضعیف سمجھتے تھے، کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ اللہ ان پر رحمت نہ کرے گا۔ یہ کہنا انھیں حسرت دلانے کے لیے ہوگا۔ پھر ان بے چاروں سے کہیں گے کہ تم تو جنت میں جاؤ، نہ تم پر ڈر ہے نہ تم کو غم لگے گا۔[1] یہ بات چیت اعراف والوں کی ہوگی۔ اب دوزخیوں کی جنتیوں کے ساتھ گفتگو سنو۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ۝۵۰ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۵۱

اور دوزخ والے جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم کچھ پانی ہم پر انڈیل دو یا اس رزق میں سے، جو اللہ نے تمھیں دیا ہے، (کچھ ہمیں عطا کر دو) جنتی کہیں گے: بے شک اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں (50) وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا اور انھیں دنیاوی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا، چناں چہ آج ہم انھیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنی اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور جیسے کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے (51)

جنت کی نعمتیں جہنمیوں پر حرام ہیں:

اللہ نے اہلِ نار کی ذلت کی خبر دی ہے کہ وہ جنت والوں سے کھانا پینا بطور بھیک مانگیں گے، پر ان کو کچھ نہ ملے گا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یہاں رزق سے مراد طعام ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی وہ طعام اور شراب کا سوال کریں گے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی اپنے باپ یا بھائی کو پکار کر کہے گا کہ میں جل بھن گیا ہوں، تھوڑا سا پانی مجھ پر ڈالو، حکم ہوگا تم ان کو یہ جواب دو کہ اللہ نے تم پر پانی بہانے اور رزق دینے کو حرام کیا ہے۔[2]

---

[1] فتح البیان (٤/ ٣٦٨) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٧٣۔ ٤٧٤)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ مراد جنت کا طعام و شراب ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے پوچھا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''افضل صدقہ پانی ہے، تو نے نہیں سنا کہ اہل نار جب اہل جنت سے استغاثہ کریں گے تو یہی کہیں گے کہ ہم پر پانی بہاؤ یا رزق دو۔''[1] (رواه ابن أبي حاتم)

امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا کہ ابو طالب بیمار ہوئے، ان سے کہا کہ تم کسی کو اپنے بھتیجے کے پاس بھیج کر کہو کہ تم کو جنت کا ایک خوشہ انگور بھیج دیں، شاید اس سے تم کو شفا ہو، قاصد آیا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے، ابوبکر نے جواب دیا: ''إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِيْنَ''[2]

جیسا عمل ویسا بدلہ:

پھر اللہ نے کفار کا دنیا میں حال بیان کیا کہ ان کا اعتماد دنیا میں لہو و لعب پر تھا۔ زینت اور زیبائش اور دنیا کی رونق نے ان کو آخرت کے لیے عمل کرنے سے روک رکھا تھا، وہ حیاتِ فانی میں مشغول ہو کر آخرت کو بھول گئے تھے، سو ویسا ہی معاملہ اُس دن ان کے ساتھ ہو گا کہ اللہ ان کو دیدہ و دانستہ بھول جائے گا، ورنہ کوئی شے اللہ کے علم سے باہر نہیں ہوتی، نہ ہی وہ فراموش ہوتی ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴾ [طٰهٰ: ٥٢] ''میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ﴾ [الجاثية: ٣٤] ''اور (ان سے) کہا جائے گا: آج ہم تمھیں بھول جائیں گے، جیسے تم اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔'' سو اللہ خیر سے ان کو بھول جائے گا نہ کہ شر سے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ہم ان کو ترک کر دیں گے جس طرح انھوں نے اس دن کا ملنا ترک کر دیا تھا۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ہم ان کو آگ میں چھوڑ دیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ہم ان کو رحمت سے ترک کریں گے، جس طرح انھوں نے اس دن کے ملنے کی خاطر عمل کرنا ترک کیا۔[4] صحیح میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندے سے کہے گا کہ میں نے تجھ کو بیوی نہیں دی، تیری عزت نہیں کی، گھوڑے اونٹ کو تیرے تابع نہیں بنایا، تجھ کو نہیں چھوڑا کہ تو سردار ہو کر چہارم (چنگی) لیتا تھا؟ وہ کہے گا: ہاں! اللہ فرمائے گا: تجھ کو گمان تھا کہ تو مجھ سے ملے گا؟ وہ کہے گا: نہیں، اللہ تعالیٰ کہے گا: ''فَالْيَوْمَ أَنْسَاكَ كَمَا نَسِيْتَنِيْ'' ''آج میں تجھے بھول جاؤں گا، جیسا کہ تو نے مجھے بھلا دیا۔''[5]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩٠) اس کی سند میں ''ابو موسیٰ صغار'' اور ''موسیٰ بن مغیرہ'' مجہول راوی ہیں۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩١) مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٥٧) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٧٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩٢) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩٢)

[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٦٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ افاضہ پانی بہانے کو کہتے ہیں، مطلب یہ کہ دوزخی بہشتیوں سے گڑگڑا کر ذرا سا پانی مانگیں گے، وہ صاف جواب دیں گے کہ یہ تم کو نہیں مل سکتا، اس کو تو اللہ نے تم پر حرام کر دیا ہے، یہ ندا جب ہو گی کہ اعراف والے جنت میں جا چکیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ سائل وہ لوگ ہوں گے کہ جب ان کو ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو بلانے والے سے ہنسی اور دل لگی کرتے تھے، یہ اللہ سے مذاق تھا۔[1] یا وہ لوگ ہیں جن کو شیطان نے وہ سارے برے خصائل اچھے کر دکھلائے تھے جو وہ جاہلیت میں کرتے تھے، مثلاً: بحیرہ، سائبہ کا حرام کرنا اور مکا و تصدیہ وغیرہ۔ یا مراد دین سے اس جگہ عید ہے کہ اس دن بالکل لہو و لعب میں رہتے تھے، اللہ کو ذرا بھی یاد نہ کرتے تھے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو بھول جائے گا، یعنی ان کو بھوکا پیاسا چھوڑ رکھے گا۔[2] ان کی بالکل خبر نہ لے گا کہ مرتے ہیں یا جیتے ہیں، مراد عدم اعتنا (بے پروائی) ہے۔ مطلب یہ کہ جیسا کام بھول جانے والا بھلائے جانے والے کے ساتھ کرتا ہے، ویسا ہی معاملہ ہم ان کے ساتھ کریں گے، اس طرح کا استعارہ قرآن پاک میں بہت آیا ہے، کیوں کہ عالمِ غیب کے معانی کو جاننا ممکن نہیں ہے، سوائے مثالوں کے جو ظاہر جہاں سے ہوں۔ اللہ نے نسیان کی جزا کا نام بھی مجازاً نسیان ہی رکھا، اس لیے کہ اللہ کو کسی چیز کا نسیان نہیں ہوتا۔[3]

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٥٣﴾

اور ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے (اپنے) علم سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جب کہ وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں (52) ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں، صرف اس کے انجام (قیامت) کا انتظار ہے، جس دن اس کا انجام سامنے آئے گا تو وہ لوگ جو اس سے پہلے اس دن کو بھولے ہوئے تھے، کہیں گے کہ واقعی ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے، تو کیا ہمارے لیے کوئی سفارشی ہیں کہ وہ ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے

---

(1) تفسیر الطبري (١٢/ ٤٧٥) اس کی سند حسن ہے۔ (2) تفسیر الخازن (٢/ ٢٣٥) (3) فتح البیان (٤/ ٣٦٩۔٣٧٠)

تو ہم ان اعمال سے ہٹ کر عمل کریں جو ہم (پہلے) کیا کرتے تھے؟ بے شک انھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا اور وہ ساری باتیں ہوا ہو گئیں جو وہ گھڑتے رہتے تھے (53)

کافروں کے پاس عذر کی کوئی گنجایش نہیں:

یعنی کافر راہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں عذاب کی خبر ہے، ہم دیکھ لیں کہ ٹھیک پڑی تب قبول کریں، سو جب ٹھیک پڑے گی، تب خلاصی کہاں ملے گی، خبر اسی لیے ہے کہ آگے سے بچاؤ پکڑیں۔ اللہ نے کفار اور مشرکین سے کتاب بھیج کر اپنا عذر بیان کر دیا، کتاب بھی وہ جو تفصیل کرنے والی، تشریح کرنے والی اور کھول کر بیان کرنے والی ہے، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴾ [هود: ۱] ”(یہ وہ) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، بڑی حکمت والے، بہت خبر رکھنے والے کی طرف سے۔“

پھر فرمایا کہ جو تفصیل ہم نے اس کتاب میں کی ہے، ہم کو اس کی خبر ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ﴾ [النساء: ١٦٦] ”اس نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے جب خسارتِ آخرت کی خبر دی تو یہ بھی ذکر فرمایا کہ ہم نے کتابیں نازل کر کے اور رسولوں کو بھیج کر ان کے تمام اعتراضات اور علتیں دور کر دیں، سارے عذر منقطع ہو چکے، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ”اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔“ اسی لیے کہا کہ وہ تاویل کی راہ دیکھتے ہیں، یعنی جو وعدہ عذاب اور آگ کا ہوا ہے، اس کے منتظر ہیں، یہی امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا قول ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ انتظارِ ثواب کرتے ہیں۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ تاویل اس کی آتی رہتی ہے، یہاں تک کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں جائیں، تب اُس دن وہ تاویل پوری ہو جائے گی۔[1]

کافروں کا کوئی سفارشی نہیں ہوگا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یوم تاویل قیامت کا دن ہے۔[2] اُس دن کہیں گے کہ کوئی سفارشی ملے یا پھر دنیا میں جانا میسر ہو تو اچھا عمل کریں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٧ ـ ٢٨] ”اور اگر آپ انھیں اس وقت دیکھیں جب وہ آتش پر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے: کاش! ایک بار ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور ہم اپنے رب کی آیات کو ہرگز نہ جھٹلائیں گے، اور ہم مومنوں میں سے ہوں گے۔ (نہیں!) بلکہ ان کے وہ کرتوت ظاہر ہو چکے ہوں گے جنھیں وہ پہلے چھپاتے تھے۔ اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔“ بہرحال اس دن اپنی جان ہاریں گے، ان کا وہ سارا افترا غائب ہو جائے گا۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٥) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٧٩) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے ان کو کتابِ مفصل دی ہے، جس کی تفصیل ہمیں معلوم ہے، وہ کتاب ایمان دار قوم کے لیے رحمت اور ہدایت ہے۔ اگر ضمیر کفار کے لیے ہے تو مراد جنسِ کتاب ہے اور اگر نبیِ اکرم ﷺ کے زمانے کے لوگوں کے لیے ہے تو مراد قرآن شریف ہے۔ تفصیل سے مراد کھول کر سنانا ہے۔ نظمِ قرآن میں نو قسمیں بیان کی ہیں جو اس شعر میں منظوم ہیں:

حلال حرام محکم متشابه   بشير نذير قصة عظة مثل

امام سمین رحمہ اللہ نے کہا: تفصیل سے مراد حق کو باطل سے واضح اور علاحدہ کرنا ہے، یا اس کا مختلف فصول میں نازل کرنا ہے، جیسے اللہ کا قول ہے: ﴿ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٦]. کسی نے "فضلناہ" تفضیل سے پڑھا ہے، یعنی دوسری کتبِ آسمانی پر اس کتاب کو فضیلت حاصل ہے۔ تاویل سے مراد وعدۂ سزا یا جزا یا انجام کار ہے۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ سو جس دن وہ آئے گی، اس دن عمل بالقرآن کے تارک، ایمان کو فراموش کر بیٹھنے والے، رسولوں کی صداقت کا اقرار کریں گے اور کسی سفارشی کو ڈھونڈتے پھریں گے یا واپس دنیا میں لوٹ جانے کی تمنا کریں گے، تا کہ پھر کفر کو ایمان سے، شرک کو توحید سے، بدعت کو سنت سے اور تقلید کو اتباع سے بدلیں، سو ان کے سوال کا جواب یہ ہو گا کہ تم ہلاک ہوئے، تمھارا دفتر کھو گیا، وہ شرک کا دعویٰ جھوٹ نکلا، اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔[1]

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۵۴

بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آ لیتی ہے، اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے (54)

زمین و آسمان کی چھے دنوں میں تخلیق:

اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ سارے آسمان ساری زمین اور جو کچھ ان دونوں کے بیچ میں ہے وہ سب ہم نے

[1] فتح البيان (٤/ ٤٧١- ٣٧٢)

چھے دن میں بنایا، یہ مضمون قرآن مجید کی کئی آیتوں میں آیا ہے، چھے دن یہ ہیں: یک شنبہ (اتوار)، دوشنبہ (پیر)، سہ شنبہ (منگل)، چہار شنبہ (بدھ)، پنج شنبہ (جمعرات) اور جمعہ۔ انہی دنوں میں ساری خلق فراہم ہوگئی۔ آدم پیدا ہوئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان دنوں میں سے ہر دن ہمارے ان دنوں کی طرح تھا، جس طرح کہ ذہن میں فوراً یہی بات آتی ہے، یا ہر دن ہزار برس کا تھا، جس طرح کہ امام مجاہد اور احمد رحمہ اللہ نے اس پر نص (صراحت) کی ہے[1] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[2] سینچر یعنی شنبے کا دن خالی رہا۔ اس میں کوئی شے پیدا نہیں ہوئی، کیوں کہ وہ ساتواں دن تھا، اسی لیے اس کو سبت کہتے ہیں، بمعنی قطع، یعنی اس دن خلق کی پیدایش منقطع ہو چکی تھی۔

رہی وہ حدیث جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے تربت یعنی مٹی اور خاک سینچر کے دن پیدا کی، پہاڑ دن احد (اتوار) کے، شجر دن دوشنبہ (پیر) کے، مکروہ چیزیں سہ شنبہ (منگل) کے دن، نور بدھ کے دن، دواب کو پنج شنبہ (جمعرات) کے دن پھیلایا، آدم کو جمعے کے دن عصر کے بعد بنایا، یہ آخری مخلوق ہیں، جمعے کی آخری گھڑیوں میں، یعنی عصر سے لے کر رات تک، سو اس حدیث کو مسلم اور نسائی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے،[3] اس میں سات دنوں کا استیعاب ہوا ہے اور اللہ پاک نے چھے دن کہے ہیں، اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ اور بہت سے حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کو کعب احبار سے روایت کرنا ٹھہرایا ہے، مرفوع نہیں ہے۔[4] واللہ أعلم

استوا علی العرش اور صفاتِ الٰہی سے متعلق سلف کا مذہب:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: استوا علی العرش میں لوگوں کے بہت اقوال ہیں، یہ جگہ ان کے بیان کی نہیں ہے، یہاں سلف صالحین کے مذہب پر چلنا چاہیے، جیسے کہ مالک، اوزاعی، ثوری، لیث، ابن سعد، شافعی، احمد اور

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٨٢)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ نیز سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٨٩) مسند أحمد (٢/ ٣٢٧) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٢٩٣)

[4] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٦)

صحیح مسلم (صفات المنافقین، باب ابتداء الخلق، حدیث: ٢٧٨٩) میں ساتویں دن (ہفتے کو) جو مٹی پیدا کرنے کا ذکر ہے شیخ البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ روایت سنداً بھی صحیح ہے اور قرآن کے خلاف بھی نہیں۔ اس لیے کہ قرآن نے آسمان اور زمین کی تخلیق کے چھے دن بیان فرمائے ہیں اور اس حدیث میں اس سے مختلف یہ بیان ہوا ہے کہ ہفتے کے دن میں اللہ نے مٹی کو پیدا فرمایا۔ "خلق اللہ التربة یوم السبت" جس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو انسانوں کی رہایش کے قابل بنانے کے لیے زمین میں مزید یہ چیزیں پیدا فرمائیں۔ بنا بریں اس میں زمین کی بابت مزید تفصیلات کا ذکر ہے، جس کا کوئی تصادم قرآن کے بیان سے نہیں ہوتا۔ (تعلیقات الألباني علی المشکاة: ٣/ ١٥٩٨، الصحیحة، رقم: ١٨٣٣) [ص۔ ی]

اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ قدیم اور حدیث مسلمین ہیں۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت شریفہ کو جس طرح پر یہ آئی ہے جاری کرے بغیر تکییف تشبیہ اور تعطیل کے اور جو مشبہین کے ذہنوں کی طرف ظاہر اور جلد آ جاتا ہے، وہ اللہ پاک سے منفی ہے، کیوں کہ اس کی مخلوق میں سے کوئی شے اللہ کے مشابہ نہیں ہے: ﴿ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴾ [الشوریٰ: ١١] ''اس جیسی کوئی چیز نہیں، اور وہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔''

بلکہ بات وہ ہے جو ائمہ نے کہی ہے، جیسے نعیم بن حماد خزاعی شیخ بخاری نے کہا کہ جس نے اللہ کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی وہ کافر ہوا اور جس نے اس بات کا انکار کیا جو اللہ نے اپنی ذات کا وصف فرمایا ہے، وہ بھی کافر ہوا اور جو وصف اللہ اور اس کے رسول نے اللہ کے بیان کیے ہیں، ان میں تشبیہ نہیں ہے۔ سو جو کوئی آدمی اللہ کے لیے وہ بات ثابت کرے گا جو آثار صحابہ اور اخبار صریحہ میں جلالِ الٰہی کے شایانِ شان آئے ہیں اور نقائص کو اللہ سے دور کرے گا وہی سبیلِ ہدایت پر چلنے والا ہے۔[1]

میں کہتا ہوں کہ سلف نے ان آیات و احادیث کو، جو صفاتِ الٰہی کو بیان کرتی ہیں، ظاہر پر ہی جاری کیا تھا، بغیر غور و خوض کیے کہ وہ کیسی اور کتنی ہیں اور ان کا عقیدہ تھا کہ ذاتِ الٰہی کسی قسم کی تشبیہ اور تجسیم سے پاک اور منزہ ہے۔ وہ تشبیہ اور تمثیل کا علاج ایک کلمہ اجمالیہ سے کرتے تھے کہ ﴿ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ﴾ ''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔'' یا ﴿ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص: ٤] ''اور کوئی ایک ہی اس کا ہمسر نہیں۔''

خلف کی سعادت مندی اور نجاتِ اخروی اسی میں ہے کہ وہ سلف کی راہ پر چلیں، ہر قسم کی تاویل اور غلط عقیدہ وغیرہ کی آفت سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں، جس معاملے میں ہم کو غور و خوض کرنے کا حکم نہیں، نہ ہی کوئی دلیل تاویل کے واجب ہونے پر موجود ہے، لیکن تینوں زمانے جن کی خیر کی شہادت دی گئی تھی اور چاروں ائمہ مجتہدین اور سارے محدثین کرام اس معاملے میں کسی تاویل و توجیہ کے بغیر ظاہری احکام اور سنن پر گزر گئے ہیں، تو اب پچھلے لوگ ان سے کیا خاک بہتر طریقہ، جو زیادہ علم اور سلامتی والا ہو، نکال سکتے ہیں، جب کہ امتِ اسلام نے اللہ پاک کی ان صفتوں کو من و عن تسلیم کر لیا ہے، جو کتاب اللہ اور سنتِ مطہرہ میں وارد ہوئی ہیں اور اللہ پاک کو مخلوقات و کائنات کی ہر قسم کی تشبیہ سے پاک اور منزہ یقین کر لیا تو اب اعتقاد تجسیم کہاں باقی رہا، ہزار بار کوئی ظاہر صیغہائے و الفاظ مذکورہ سے اللہ کی جسمیت ثابت کرے یا سمجھا کرے مگر ﴿ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ﴾ نفی کے لیے سیفِ قاطع ہے، جس طرح کہ ﴿ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ ایک روشن حجت ہے، عدمِ تمثیل پر۔ وباللہ التوفیق.

یہ ایک بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے قدیماً و حدیثاً دنیا میں بڑے بڑے طوفان اور زلزلے واقع ہو

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٦)

چکے ہیں۔ جاہل متکلمین نے، جو فلسفیوں کا سا مزاج رکھتے تھے، سلف پر کفر و گمراہی کے فتوے لگائے اور لوگوں کے بنائے ہوئے مذاہب کے مقلدین نے بڑے بڑے ائمہ دین کے حق میں بے ادبی ظاہر فرمائی، حالانکہ یہ کچھ ایسی مشکل بات نہیں تھی، جس پر یہ ہنگامہ قائم ہوا۔ اِنَّا لِلّٰهِ.

رات اور دن کا نظام:

پھر یہ فرمایا کہ رات کا اندھیرا دن کے اجالے سے اور دن کا اجالا رات کے اندھیرے سے چلا جاتا ہے، رات اور دن میں سے ہر ایک دوسرے کی طلب میں سرگرم اور تیز رفتار ہے، ذرا سی دیر و سستی و تاخیر نہیں کرتا، بلکہ جیسے ہی ایک گیا، دوسرا جھٹ پٹ اسی دم آ موجود ہوا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿37﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿38﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿39﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٣٧۔ ٤٠] ”اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ نکالتے ہیں، پھر (دن ختم ہونے پر) یکا یک وہ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور سورج اپنے ٹھکانے (پر پہنچنے) کے لیے رواں دواں رہتا ہے، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے (اللہ) کا اندازہ ہے۔ اور چاند کی ہم نے (اٹھائیس) منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، حتیٰ کہ وہ کھجور کے خوشے کی پرانی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ سورج کے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔“

پس رات کے دن سے سبقت لے جانے کی نفی کا یہ مطلب ہے کہ اس کا وقت فوت نہیں ہوتا، کیا ذکر ہے کہ ذرا سی تاخیر ہو، بلکہ دن رات کے پیچھے بغیر کسی درمیانی واسطے کے لگا چلا آتا ہے، ایک دم جھپاٹے سے آ موجود ہوتا ہے، غرض کہ سورج، چاند اور تارے سب کے سب اللہ کے حکم کے مسخر ہیں، اللہ کے قہر و مشیت و تسخیر کے زیر ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسی کا سب ملک اور قبضہ ہے، اس کے سوا نہ کوئی مالک ہے نہ متصرف، وہ بڑی برکت والا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا... الآية ﴾ [الفرقان: ٦١] ”وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس نے آسمان میں ستارے بنائے...“

خلق و امر اللہ ہی کا ہے:

والد عبدالعزیز شامی سے، جو ایک صحابی تھے، مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے عملِ صالح پر اللہ کی حمد نہ کی اور اپنی جان کی حمد کی، وہ کافر ہوا، اس کا عمل اکارت گیا اور جس نے یہ خیال کیا کہ اللہ نے کوئی امر اپنے بندوں کے ہاتھ میں رکھا ہے اس نے اس بات کا کفر کیا جو اللہ نے اپنے نبیوں پر اتاری ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ

وَالْاَمْرُ ﴾ (آیتِ باب)[1] (رواہ ابن جریر)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جو ایک صدا (مقولہ) عوام میں مروج ہے کہ ملک خدا کا حکم فلاں بادشاہ کا یہ کلمہ بہت برا ہے، بلکہ ملک وحکم اسی اکیلے مالک متصرف وحدہ لاشریک لہ کا ہے۔ دعائے ماثور میں ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «اَللّٰهُمَّ لَكَ الْمُلْكُ كُلُّهُ، وَلَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ، وَلَكَ الْأَمْرُ كُلُّهُ، أَسْئَلُكَ مِنَ الْخَيْرِ كُلِّهِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ» ''اے اللہ ساری کی ساری بادشاہی تیرے ہی لیے ہے، تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں اور تمام حکم تیرے ہی لیے ہے، میں تجھ سے ہر قسم کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور ہر قسم کی برائیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''[2]

فتح البیان کا بیان:

اس جگہ فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ پاک نے اس آیتِ پاک میں اپنی ایجاد کرنے کی طاقت اور قدرت کو بیان فرمایا ہے، جس سے اس کے بندوں پر اس کی توحید وعبادت وعبودیت واجب ہوتی ہے۔ لغت میں خلق کے اصل معنی اندازہ کرنا ہے۔ پھر یہ لفظ کسی چیز کو ایجاد کرنے اور پہلی دفعہ بغیر کسی سابق نمونے اور اصل ایجاد کرنے میں استعمال ہوتا ہے، سو اللہ نے ساری خلق چھے دن میں بنائی، دن زمانے کی ایک مقدار کو کہتے ہیں، سورج نکلنے سے ڈوبنے تک کو، یہ ایام دنیا کے برابر تھے یا آخرت کے ایام کے برابر۔ جمہور نے کہا ہے کہ ہر دن ہزار برس کا تھا۔ یہی قول سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔[3] پہلا دن یک شنبہ (اتوار) پچھلا (آخری) دن جمعہ تھا۔

یہی سیدنا عبداللہ بن سلام، کعب الأخبار رضی اللہ عنہم، امام ضحاک اور مجاہد رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اسی کو امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[4] اللہ پاک کو قدرت ہے کہ ایک لحظے میں سب کچھ بنا ڈالتا، کیوں کہ ایک حرف کُنْ سے یَکُوْنُ ہوتا ہے، لیکن اپنے بندوں کی تعلیم وتفہیم کے لیے دیر لگائی، تاکہ امور کی انجام دہی میں نرمی اور دیر کیا کریں جلد بازی نہ کریں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ خلق کو ثابت قدمی کی تعلیم ہے،[5] جس طرح حدیث میں آیا ہے: «اَلتَّأَنِّي مِنَ اللّٰهِ، وَالْعُجْلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ» ''ٹھہراؤ اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے۔''[6] یا اس لیے دیر لگائی کہ اللہ کے پاس ہر ایک شے کے لیے ایک مدت مقرر ہے۔

دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾ [ق: ٣٨] ''اور البتہ تحقیق ہم نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، چھے دنوں میں پیدا کیا،

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٨٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا کلام دیکھیں۔

[2] ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ شعب الإیمان (٤/ ٩٧) اس کی سند میں ''خالد بن یزید عمری'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ٥١٣٨)

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٨٢) [5] تفسیر البغوي (٣/ ٢٣٥)

[6] سنن البیهقي الکبریٰ (١٠/ ١٠٤) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٧٩٥)

اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے چھوا تک نہیں۔'' یہ حدیث کہ اللہ نے زمین یک شنبہ کے دن اور دوشنبہ کے دن بنائی اور پہاڑ اور جو کچھ منافع وغیرہ ان پہاڑوں کے اندر ہیں وہ سہ شنبہ کے دن بنائے ...الخ۔ امام مسلم و حاکم رحمہ اللہ کے نزدیک سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آئی ہے،[1] لیکن اس توزیع (دنوں کی تقسیم) پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ وہاں ایام کہاں تھے؟ کیونکہ سورج چاند نہ تھا نہ یک شنبہ تھا نہ دوشنبہ وغیرہ۔ ایام تو چاند سورج کی گردش سے پیدا ہوتے ہیں۔ سلیمان جمل نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس مقدارِ مدت میں ان کو بنایا، پھر کہا کہ یہ جواب اشکال کو رفع نہیں کرتا۔ كما لا يَخْفى.

استوا علی العرش کے مسئلے میں چودہ اقوال ہیں، سب سے زیادہ حق پر اور بہتر وہی سلف صالحین کا مذہب ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے، بغیر کیفیت کے جس طرح اس کی شانِ عظیم کے لائق ہے اور ان تمام چیزوں سے پاک ہے جو اس کے لیے جائز نہیں۔ لغتِ عرب میں استوا بمعنی بلندی اور قرار پانے کے ہے۔ معتزلہ نے کہا، یعنی استیلا و ظہور ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ استوا کے معنی علو اور ارتفاع کے ہیں۔[2] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ مستقلہ لکھا ہے، جس میں جملہ صفاتِ ربانی کو ظاہر طور پر قبول کرنے کو ثابت کیا ہے، ان صفات میں سے ایک صفت استوا بھی ہے۔

اس رسالے میں تفویض (سونپ دینا) کو مختار اور تاویل (ظاہر سے پھیر دینا) کو غیر مختار ٹھہرایا ہے، حتی کہ معیت اور قرب وغیرہ کی تاویل سے بھی منع کیا ہے۔ ظاہر طور پر تمام صفات پر ایمان لانے کو واجب لکھا ہے۔ مسئلہ استوا میں بڑی تالیف اور کمال کی تصنیف جس میں بہت تحقیق اور تدقیق اس مسئلے کی کی گئی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردِ رشید حافظ ابن القیم رحمہما اللہ نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بلند اور اوپر ہونے کے بارے میں مستقل کتابیں اور رسالے لکھے ہیں، ان کو صفاتِ الٰہی کے ثابت کرنے میں ایک عجیب طرح کی دلچسپی تھی، انصاف کی بات یہ ہے کہ توحید اور اتباع کے جو مباحث اور مسائل ان حضرات نے ہم جیسے غریبوں کو اپنے سچے بیانوں اور تحریروں میں بتائے ہیں وہ دوسرے اہلِ علم حضرات کی تالیفات میں اس تفصیل اور وضاحت کے ساتھ میسر نہیں آتے۔ جزاهم الله عنا خيراً.

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ایک کتاب ''العلو'' اور دوسری کتاب ''العرش'' اس بارے میں لکھی ہے، آیات و احادیثِ واردہ کو تتبع کر کے یکجا جمع کیا ہے۔ متکلمینِ مذاہب کا یہ کہنا کہ محدثین اس مسئلے میں مجسمہ ہیں، افترائے مذہب جدید اور ناروا زیادتی ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''استوا کچھ مجہول نہیں ہے، کیفیت معقول نہیں ہے، استوا کا اقرار ایمان ہے، اس کا انکار کفر ہے۔'' (أخرجه ابن مردوية) مالک بن انس رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، اتنا زیادہ کہا ہے کہ استوا کی حالت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔[3] سوا ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا قول اور مالک رحمہ اللہ کا قول سب

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩٢)

[2] تفسير القرطبي (٧/ ٢٢٠) [3] الدر المنثور (٣/ ٤٧٣)

سے زیادہ مضبوط قول اور سب سے صحیح مذہب ہے، سارے سلف اسی عقیدے پر گزرے ہیں، اس سے زیادہ کچھ پوچھنا یا کہنا بدعت ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرش کی تفسیر سریر یعنی تخت کے ساتھ اور استوا کی تفسیر استقرار کے ساتھ کرنا جس طرح مشبہہ کہتے ہیں باطل ہے۔ ان بے چارے مسکین کو یہ نہیں معلوم کہ لغت میں عرش سریر ہی کو کہتے ہیں اور استواء بہ معنی استقرار آتا ہے۔

حبرِ اُمت ترجمانِ قرآن سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرش اور استوا کی تفسیر یہی کی ہے جس کو یہ غریب باطل بتاتے ہیں، تشبیہ ٹھہراتے ہیں، چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ تفسیر بخاری شریف میں موجود ہے۔[1] اس تفسیر میں ہرگز تشبیہ نہیں، تشبیہ تو بیانِ کیفیت میں ہوتی ہے، بلکہ اس تفسیر کا انکار ایک تعطیل مخالفِ مقصودِ تنزیل، یعنی سلفِ امت اور ائمہ امت کے مذہب کو معطل کرنا ہے، جنھوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی صفات کو اسی طرح جوں کا توں تسلیم کر لینا چاہیے، جس طرح کہ وہ وارد ہیں نہ ان کی کیفیت کا بیان ہو، نہ تاویل ہو، نہ تشبیہ ہو، نہ تمثیل ہو، نہ جحود ہو اور نہ تعطیل۔ احادیثِ صحیحہ میں عرش کی صفت یہ آئی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کو گھیر رکھا ہے۔ واللہ أعلم.

پھر فرمایا کہ رات دن کو ڈھانپ لیتی ہے، یعنی رات کا اندھیرا دن پر پردے کی طرح پڑ جاتا ہے، اس جگہ یہ نہیں کہا کہ دن رات کو چھپا لیتا ہے، حالانکہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو ڈھانپا جاتا ہے جس طرح اور آیت میں فرمایا ہے: ﴿ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ﴾ [الزمر: ٥] ''وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔'' سو یہ ذکر نہ کرنا بطورِ کفایت ہے کہ خود ہی ایک بات سے دوسری بات سمجھ لی جاتی ہے۔ ہاں یہ فرمایا ہے کہ رات سرعت کے ساتھ دن کی طالب ہے، اس کے کسی حال میں فتور نہیں ہوتا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس حرکت کی صفت سرعت شدید بیان کی ہے یہ اس لیے کہ رات دن کا تعاقب فلک اعظم کی حرکت سے ہوتا ہے، یہ حرکت باقی تمام حرکات سے زیادہ تیز ہے۔ انسان جب کہ خوب ہی تیز دوڑے اور ایک قدم اٹھا کر اس کو پھر رکھے، اتنی دیر میں فلک اعظم تین ہزار میل طے کر جاتا ہے،[2] یہ ایک ہزار فرسخ ہوئے، اسی لیے فرمایا: ﴿ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی دن کے پیچھے رات بڑے جھپاٹے سے لگی چلی آتی ہے، کیا ذکر ہے کہ ان دونوں کے درمیان کچھ بھی فصل (علاحدگی) ہو سکے۔

پھر مہر و ماہ و نجوم کی تسخیر کا ذکر فرمایا، تسخیر تذلیل کو کہتے ہیں، کیوں کہ ان سے طلوع و غروب اور سیر و رجوع کا کام لیا جاتا ہے، یہ اپنی ذات سے کچھ قدرت نہیں رکھتے، بلکہ تدبیر کرنے والے کے ارادے اور اس کی مشیت کے مطابق چلتے ہیں۔ خلق سے مراد مخلوق ہے، امر سے مراد ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا

---

[1] أخرجه البخاري، عن أبي العالية ومجاهد، والبغوي عن ابن عباس (١/ ٧٨)
[2] تفسير الرازي (١٤/ ٩٦)

لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [النحل: ٤٠] ”جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرلیں تو اس کے لیے ہمارا صرف یہی قول ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں: ہو جا! تو وہ ہوجاتی ہے۔“ امر سے مراد وہ احکام ہیں جو مخلوقات پر تفصیل اور غلبے کے ساتھ جاری ہوتے ہیں۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرش کے نیچے خلق ہے، عرش کے اوپر امر ہے۔[1] اس سے یہ نکلا کہ اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے، کیوں کہ خلوق و امر میں فرق کیا ہے، جس نے امر کو، جو اللہ کا کلام ہے، مخلوق کی طرح ٹھہرایا وہ کافر ہوا۔

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ کوئی خالق نہیں سوائے اللہ کے، اس میں اس کی تردید ہے، جو اس بات کا قائل ہے کہ سورج، چاند، ستارے اور نیرات وغیرہ اس دنیا میں کچھ اثر رکھتے ہیں، اس لیے کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ اس عالم کا خالق اور مدبر اللہ ہے نہ کہ نیرات مسخرات۔ حکم صرف اسی کا چلتا ہے، اس کے سوا کسی کا امر نہیں ہے۔ وہی آمر و ناہی ہے، جو چاہے کرے جو چاہے حکم دے، جس سے چاہے منع کرے، کسی مخلوق کا یہ مقدور نہیں کہ اس پر اعتراض کر سکے، اس کی برکت بہت وسیع اور بہت زیادہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ہر برکت اللہ تعالیٰ ہی لایا ہے۔[2] بعض نے کہا کہ ہر شے میں اسی کے نام کی برکت ہے۔[3]

خدا کا نام بھی نام خدا کیا راحتِ جان ہے   عصائے پیر ہے، تیغ جوان ہے حرزِ طفلاں ہے

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

تم اپنے رب کو آہ وزاری کرتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (55) اور زمین کی اصلاح کے بعد تم اس میں فساد نہ کرو اور اللہ کو خوف سے اور طمع کرتے ہوئے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے (56)

دعا کے آداب اور ترغیب:

دعا میں یہ بہتر ہے کہ چپکے چپکے مانگے، تاکہ اپنی نمود ونمایش نہ ہو اور دل سے گڑگڑا کر نکلے اور حد سے نہ بڑھے، یعنی اپنے منہ سے بڑی بات نہ مانگے، پھر اصلاح کے بعد فساد سے منع کیا ہے، یعنی اسلام میں کفر کی رسمیں داخل نہ کرو اور اللہ پر دلیر بھی مت بنو اور ناامید بھی مت ہو۔ اللہ نے اس آیت میں ارشاد کیا ہے کہ اے بندو! تم اپنے رب سے دعا مانگا کرو جس میں تمھاری دنیا اور آخرت کی اصلاح ہو، یہ مانگنا بطور زار، نالے اور پوشیدہ کاری کے

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٤٩٨) [2] تفسیر البغوي (٣/ ٢٣٦) [3] فتح البیان (٤/ ٣٧٣۔ ٣٧٧)

ہو، یعنی ذلت اور عاجزی کے ساتھ، مخفی طور پر نہ کہ چلا کر، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ ﴾ [الأعراف: ۲۰۵] ”اور (اے نبی!) اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کیجیے۔“

صحیحین میں آیا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگوں نے اپنی آوازیں دعا کے ساتھ بلند کیں، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَيُّهَا النَّاسُ اِرْبَعُوْا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ أَصَمَّ وَلَا غَائِبًا إِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ .... الحديث» یعنی تم کسی بہرے غائب کو نہیں پکارتے ہو جو چلاؤ چیخو، تم جس کو پکارتے ہو وہ سنتا ہے اور قریب ہے، پھر چپکے سے کیوں نہیں دعا کرتے۔①

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ خفیہ بمعنی سر ہے۔② امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: تضرع بمعنی تذلل و استکانت ہے، یعنی زاری و خواری خفیہ سے۔ مراد خشوعِ قلب اور اپنے اور رب کے درمیان وحدانیت اور ربوبیت پر یقین ہے، سو چپکے سے مانگے نہ چلا کر، سنا کر، نہ دکھا کر۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ کوئی آدمی سارا قرآن جمع کرتا، کوئی نہ جانتا، کوئی بڑا فقیہ ہو جاتا، لوگ نہ جانتے، کوئی اپنے گھر میں بڑی لمبی نماز پڑھتا، گھر میں مہمان ہوتے کسی کو خبر نہ ہوتی، ہم نے ایسے لوگ پائے ہیں کہ زمین پر اگر کوئی پوشیدہ عمل ہو سکتا تو کبھی اس کو علانیہ نہ کرتے، مسلمان دعا میں خوب کوشش کرتے، ان کی آواز سنائی نہ دیتی، ان کے اور رب کے درمیان یہی بھنک ہوتی، یہ اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تم اپنے رب کو گڑگڑا کر چپکے سے پکارو، دیکھو اللہ نے اپنے ایک بندہ صالح کا ذکر کیا ہے، جس کا فعل پسند آیا تھا، فرمایا: ﴿ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴾ [مریم: ۳] ”جب اس نے اپنے رب کو نہایت آہستہ آواز سے پکارا۔“ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ دعا میں آواز کا بلند کرنا اور چیخنا چلانا، آواز بلند کرنا، مکروہ ہے، دعا میں تو خضوع اور عاجزی چاہیے۔③

دعا میں حد سے تجاوز کی ممانعت:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا، یعنی نہ دعا میں نہ غیر دعا میں۔④
امام ابو مجلز رحمہ اللہ نے کہا: یعنی انبیا کے منازل کا سوال نہ کرے۔⑤ سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے کو دعا کرتے سنا کہ وہ یوں کہتا تھا: ”اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَنَعِيْمَهَا وَاسْتَبْرَقَهَا وَنَحْوَ هٰذَا، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَسَلَاسِلِهَا وَأَغْلَالِهَا“ کہا تو نے خیرِ کثیر کا سوال کیا اور شرِ کثیر سے پناہ مانگی، میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: « إِنَّهُ سَيَكُوْنُ قَوْمٌ يَّعْتَدُوْنَ فِي الدُّعَاءِ » ”عن قریب ایک ایسی قوم ہو گی جو دعا مانگنے میں زیادتی کرے گی۔“ دوسرے الفاظ: ((فِي الطُّهُوْرِ وَالدُّعَاءِ)) ”پاکیزگی حاصل کرنے اور دعا میں۔“ ہیں۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۸۳۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۰٤)
② تفسير الطبري (۱۲/ ٤۸٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔
③ تفسير الطبري (۱۲/ ٤۸٥۔ ٤۸۷)
④ تفسير الطبري (۱۲/ ٤۸٦۔ ٤۸۷) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔
⑤ تفسير الطبري (۱۲/ ٤۸٦)

پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا ... الخ ﴾ (آیتِ باب) سو تجھ کو اتنا کہنا کافی ہے: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ" "اے اللہ میں تجھ سے جنت کا اور ایسے قول اور عمل کا سوال کرتا ہوں، جو اس کے قریب کر دے اور تجھ سے آگ اور ایسے قول و عمل سے پناہ مانگتا ہوں جو اس کے قریب کر دے۔" یہ دعا باوجود مختصر ہونے کے نہایت جامع ہے، جس میں ہر خیر ہے اور ہر برائی سے باز رکھتی ہے۔ اس اجمال میں سارے جہان کی تفصیل درج ہے۔ اسی جنس سے وہ قرآنی دعا ہے: ﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ [البقرة: ٢٠١] "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔"[1]

سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو سنا، یہ دعا کرتا تھا: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْقَصْرَ الْأَبْيَضَ عَنْ يَمِيْنِ الْجَنَّةِ إِذَا دَخَلْتُهَا" "اے اللہ میں تجھ سے جنت کے دائیں طرف ایک سفید محل کی دعا کرتا ہوں، جب میں اس میں داخل ہوں۔" کہا: اے بیٹے! اللہ سے جنت مانگ اور آگ سے پناہ مانگ، میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "ایک قوم ہوگی جو دعا میں اور پاکیزگی حاصل کرنے میں زیادتی کرے گی۔"[2] (رواه أحمد و ابن ماجه و أبو داود وهو إسناد حسن لا بأس به)

فساد سے ممانعت:

پھر اللہ نے اصلاح کے بعد فساد سے منع کیا، کیوں کہ جب سب کام ایک سیدھی چال اور درستیِ حال سے چل رہے ہیں تو ان میں اس کے بعد کوئی فساد اور بگاڑ کرے تو بندوں کے لیے اس کا نقصان بہت ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعا و عبادت تضرع اور تذلل کے ساتھ کرنے سے منع کیا اور حکم دیا کہ خوف اور طمع سے دعا کرو، عذاب و سزا کا خوف رکھو اور ثواب و عطا کا طمع رکھو۔ اللہ کی رحمت محسنین کی تاک میں رہتی ہے جو اللہ کے احکام کا تابع اور اللہ کی جھڑکیوں اور دھمکیوں کے باعث اعمال کا تارک ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٦] "اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، چناں چہ جلد ہی میں اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔"

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٧٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٥/ ٢٢٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦٤) مسند أحمد (٥/ ٥٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (١/ ١٦٣)

لفظ ﴿ قَرِيبٌ ﴾ کہا نہ "قَرِيبَة" اس لیے کہ رحمت ثواب (مذکر) کے معنی میں ہے یا اس لیے کہ اللہ کی طرف مضاف ہے۔ یا یہ کہ غیر حقیقی مونث میں خبر کا مبتدا کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ مطروراق نے کہا ہے کہ تم اللہ کی اطاعت کر کے اس سے اپنے وعدے کا پورا کرنا چاہو، اس لیے کہ اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ اس کی رحمت محسنوں کے نزدیک ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے دعا مانگنے کا حکم دیا اور دعا مانگنے والے کے لیے یہ قید لگائی کہ زار و خوار ہو کر چپکے سے مانگے۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ دعا بمعنی عبادت ہے، مگر پہلا مفہوم زیادہ بہتر ہے۔ خفیہ اس لیے فرمایا کہ اس سے ریا کاری کی رگ کٹتی ہے اور اخلاص کے منافی کیفیت دور ہوتی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: تضرع سے مراد خوشامد اور چاپلوسی ہے۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ چھپی اور کھلی دعا میں ستر گنا فرق ہے۔[2]

"اِعْتِدَاء" کے معنی حد سے آگے بڑھنا ہیں، سو جو کوئی دعا یا غیر دعا میں حد سے تجاوز کرتا ہے اللہ اس کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر زمین میں فساد کرنے سے منع کیا، کسی طرح کا فساد کیوں نہ ہو، تھوڑا ہو یا بہت۔ فساد کے کاموں میں سے لوگوں کو قتل کرنا، گھروں کو ویران کرنا، درختوں کو کاٹنا، نہروں کو تنگ کرنا ہے، یا جیسے اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور گناہوں میں واقع ہونا ہے۔ سو جب کہ اللہ نے رسول بھیج کر کتابیں نازل فرما کے شریعتیں مقرر کر کے زمین کی اصلاح کر دی تو اب اس کا بگاڑنا حرام ہے۔ یہی امام حسن، سدی، ضحاک اور کلبی رحمہم اللہ کا قول ہے۔[3] کسی نے کہا: اصلاح سے مراد بارش اور زمین کی سرسبزی و شادابی ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اصلاح اور فساد کو عام معنوں میں لیا جائے، تاکہ وہ ہر قسم کی اصلاح یعنی شرعی و عرفی اور ہر قسم کے فساد یعنی دینی و دنیاوی کو شامل رہے۔

دعا کرنے والے کو چاہیے کہ دعا کے وقت خوف کرنے والا اور طمع رکھنے والا ہو، یعنی اس کے قبول ہونے کا طمع رکھے، سو جب کہ دعا کے وقت وہ خوف اور امید رکھے گا تو اپنے مطلوب کو پائے گا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم دعا کے وقت امید اور خوف کی حالت میں ہوں، اس لیے کہ خوف اور امید انسان کے لیے دو بازوؤں کی مانند ہیں جو اس کو راہِ استقامت پر رکھتے ہیں، سو جب ایک پر ہو گا تو انسان ہلاک ہو جائے گا۔ اس لیے سزا و عذاب سے ڈر کر ثواب کا طمع رکھ کر دعا مانگنی چاہیے۔[4]

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اللہ کے عدل کا خوف اور اس کے فضل و کرم کا طمع ہو یا ریا کاری کا خوف اور دعا کی قبولیت کا طمع ہو۔[5] بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ زندگی کی حالت میں خوف کا غلبہ چاہیے، جب مرنے لگے تو امید

---

[1] معاني القرآن (٢/ ٣٤٤) [2] تفسير البغوي (٣/ ٢٣٧) [3] تفسير البغوي (٣/ ٢٣٨)
[4] تفسير القرطبي (٧/ ٢٢٧) [5] تفسير البغوي (٣/ ٢٣٨)

غالب ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی نہ مرے مگر وہ اللہ کے ساتھ نیک گمان رکھتا ہو۔[1] (اخرجہ مسلم) بیان جاری میں پہلی آیت دعا کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے اور دوسری آیت دعا کے فائدے کے متعلق ہے، پھر یہ خبر دی کہ جو محسن ہیں کسی بھی قسم کا احسان کیوں نہ ہو، ان سے اللہ کی رحمت قریب ہے، اس میں بندوں کو خیر کے کاموں کی ترغیب اور خوشی دلائی گئی ہے، کیوں کہ ہر بندہ چاہتا ہے کہ اس کو اُس رحمت کا قرب حاصل ہو جس سے ہر مطلب کا حاصل ہو جانا آسان ہوتا ہے۔

رحمت نرمی کو کہتے ہیں جو احسان کرنے والے کی طرف خود بخود ہوتی ہے۔ اس کا استعمال کبھی صرف نرمی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان میں آتا ہے، اللہ کے وصف میں صرف احسان ہی مراد ہوتا ہے نہ کہ نرمی۔ بعض نے کہا: بندوں کو خیر ونعمت پہنچانے کے ارادے کو رحمت کہتے ہیں۔ اس بنیاد پر رحمت اللہ کی صفات اور افعال سے ہے، دوسرے معنی پر صفات کی ذات سے ہے۔[2]

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿٥٨﴾

اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت سے پہلے خوش خبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے، حتی کہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم انھیں کسی مردہ شہر کی طرف ہانک دیتے ہیں، پھر ہم ان کے ذریعے سے پانی نازل کرتے ہیں، پھر ہم اس کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (57) اور جو ستھری زمین ہوتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے (خوب) نکلتی ہے، اور جو خراب ہوتی ہے اس کی پیداوار ناقص ہی نکلتی ہے۔ اسی طرح ہم (اپنی) آیات کو ان لوگوں کے لیے پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں جو شکر کرتے ہیں (58)

بارش کے نظام سے مردوں کو زندہ کرنے پر استدلال:

اپنی قدرت اس طرح بیان فرمائی، ہواؤں کا چلنا، مینہ برسانا اور سبزہ نکلنا، اسی طرح سمجھایا مردوں کا نکلنا۔

(1) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۷۷) (2) فتح البیان (٤/ ۳۷۸۔ ۳۸۰)

ایک مردوں کا نکلنا قیامت میں ہے اور ایک دنیا میں یعنی جاہلوں اور ادنیٰ لوگوں میں پیغمبر بھیجنا اور علم دینا اور سردار کرنا، پھر ستھری استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد کم تھی، ان کو بھی فائدہ پہنچا، اگرچہ ناقص سہی، اللہ نے اس ذکر کے بعد کہ اللہ ہی سب آسمانوں اور زمین کا خالق اور وہی اکیلا حاکم، متصرف، مدبر، خلق کو مسخر کرنے والا، بندوں کو ہدایت دینے والا، بغیر طلب کیے ہوئے۔ یہاں اس بات پر آگاہ کیا ہے، کل مخلوق کا رازق اور سارے مردوں کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنے والا بھی وہی ہے نہ کہ کوئی اور۔ مینہ سے پہلے ہوائیں بھیجتا ہے جو بادلوں کو گھیر کر لے آتی ہیں، پھر مینہ کو جو اس کی ایک رحمت ہے، برساتا ہے۔

بعض نے ﴿ بُشْرًا ﴾ کے بجائے ''مُبَشِّرَاتٍ'' پڑھا ہے، بعض نے نون کے ساتھ، یعنی نَشْراً کہا ہے، یعنی ہوائیں ادھر اُدھر چلتی ہیں، یہ بارش کا مقدمہ، یعنی پیش خیمہ ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۸] ''وہی ہے جو لوگوں کے نااُمید ہو جانے کے بعد بارش نازل کرتا ہے اور وہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی کارساز، تعریف کیا ہوا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الروم: ۵۰] ''چناں چہ آپ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھیں، وہ زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد کیسے زندہ (آباد) کرتا ہے، بے شک وہ ضرور مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھائے ہوتی ہیں، کیوں کہ بادل پانی کی کثرت کی وجہ سے بہت بوجھل ہوتے ہیں۔ بوجھل ہونے کی وجہ سے زمین کے نزدیک رہتے ہیں، پھر جو زمین مردہ اور بغیر کسی سبزے کے اور خشک ہوتی ہے وہ بادل اس طرف بھیجا جاتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ښ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۳۳] ''اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں۔'' وہ جب کہ وہاں پہنچ کر برستا ہے تو ہر طرح کے پھل نکلتے ہیں اور میوے پیدا ہوتے ہیں، سو جس طرح ہم مردہ زمین کو پانی برسا کر زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح مردوں کو زمین میں زندہ کر کے باہر نکالیں گے، گو وہ گل سڑ کر مٹی دھول کیوں نہ ہو گئے ہوں۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمان سے چالیس دن تک پانی برسائے گا، اس سے قبروں کے اندر مردے زندہ ہوں گے جس طرح کہ زمین سے دانے اگتے ہیں۔ یہ بات قرآن پاک میں بہت جگہ آئی ہے کہ اللہ نے قیامت کے دن کے لیے زمین کی موت کے بعد اسے زندہ کرنے کی مثال بیان فرمائی ہے، اسی لیے یہ کہا کہ شاید تم سوچو سمجھو دھیان کرو۔ پھر فرمایا کہ جو زمین پاکیزہ اور نفیس ہے اس کا سبزہ جلد اور اچھا نکلتا ہے اور جو ناپاک اور خراب ہے اس

میں جو کچھ نکلے وہ ناقص ہوتا ہے، امام مجاہد وغیرہ نے کہا: جیسے گھورا وغیرہ۔[1]

زمین شور سنبل بر نیارد درو تخم عمل ضائع مگرداں

''شوریلی زمین سنبل نہیں اگاتی، اس میں بیج بونے کے عمل کو ضائع نہ کر۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ کہاوت مومن و کافر کے لیے بیان فرمائی۔[2] ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اُس علم و ہدایت کی مثال جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے، بہت سے مینہ کی مثال ہے، جو زمین کو پہنچا، بعض زمین پاک صاف تھی، اس نے وہ پانی قبول کر لیا، بہت سا گھاس اور سبزہ اُگایا، بعض خشک تھی، اس نے پانی روک رکھا، اللہ نے اس سے لوگوں کو نفع دیا، انھوں نے پیا، پلایا، کھیتی کی، زمین کا ایک ٹکڑا بالکل چٹان تھا، جس نے نہ پانی روکا نہ گھاس اگایا، سو یہ مثال اس شخص کی ہے جو اللہ کے دین میں سوچنے سمجھنے والا ہوا اور اُس کو اس چیز نے نفع دیا جو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا تھا، اُس نے علم سیکھا سکھایا، اور مثال ہے اس آدمی کی جس نے اس طرف سر نہ اٹھایا اور نہ ہی اللہ کی اس ہدایت کو جسے میں لے کر آیا ہوں، قبول کیا۔''[3] (رواه البخاري و مسلم والنسائي) زمین تین طرح کی بتائی، سب پر ایک ہی پانی برستا ہے، مگر اثر ہر ایک کا جدا جدا ظاہر ہوتا ہے۔

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شود بوم خس

''بارش کی لطافتِ طبع میں اختلاف نہیں، مگر جب وہ برستی ہے تو باغ میں لالہ اُگتا ہے اور شوریلی زمین میں گھاس پھوس اُگتا ہے۔''

ایک زمین نقی (پاک، خالص) ہے، جیسے ان زمانوں کے لوگ جن کی بھلائی کی گواہی دی گئی ہے، یعنی صدرِ اول کے لوگ۔ یہ ایسی زمین تھی جو پانی کو جذب کرنے والی یا خوب سبزہ اگانے والی یا دونوں خاصیتوں کی حامل تھی۔ دوسری زمین اجادب ہے، جیسے وسط امت کے لوگ جن کے علم و عمل اور تالیفات اور شرعی احکام کو جمع کرنے سے لوگوں کو حق و باطل میں تمیز کرنا، سنت و بدعت اور توحید و شرک کا فرق کرنا حاصل ہوا، تیسری زمین قیعان ہے (جہاں سبزہ نہ اُگ سکے) جیسے اخیر امت کے لوگ کہ نام کے مسلمان ہیں، ان کو دین اور ہدایت سے کچھ غرض نہیں۔ دین کی ایک بات بھی توجہ کے ساتھ نہیں سنتے اور اگر سنتے ہیں تو قبول نہیں کرتے، اپنی گمراہی اور جہالت اور بدعت میں گرفتار ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں آیا ہے کہ یہ آیت اس نعمت کے بیان کو شامل ہے جو اللہ نے بندوں پر کی ہے۔ وہ نعمت جو اللہ

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٩٧) [2] تفسیر الطبري (١٢/ ٤٩٦۔ ٤٩٧) اس کی سند حسن ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤٢٧)

کی وحدانیت کی اور ثبوتِ الوہیت پر دلیل ہے۔ نَشْرًا ماخوذ ہے نشر سے جو طَیٌّ کے برعکس ہے، جس کے معنی ہیں پیچیدہ اور لپیٹنا۔ یعنی جب تک ہوا ٹھہری تھی، چلتے پھرتے نہ تھے، گویا لپٹے ہوئے دوہرے تھے، اب جو اس کو چلایا اور چھوڑ دیا تو گویا کھل پڑے، پھیل گئے، ادھر اُدھر متفرق ہو گئے۔ یہ وہ ہوا ہوتی ہے جو ہر طرف سے خوش گوار چلتی ہے۔ یا نشر بمعنی زندہ کرنے کے ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا کہ نرم ہوا بادل کو منتشر کرتی ہے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا کہ ہوائے منتشر واسع الھبوب (ہر طرف چلنے والی) ہے۔

﴿بُشْرًا﴾ جمع بشیر ہے، یعنی یہ ہوائیں پانی برسنے کی بشارت دیتی ہیں، ہوا کے بعد مینہ برستا ہے، وہ اللہ کی رحمت ہے۔ جو ہوا مشرق کی طرف لے جاتی ہے، اسے صبا کہتے ہیں وہ بادل کو ابھارتی ہے۔ جو ہوا مغرب کی طرف لے جاتی ہے، اس کا نام دبور ہے، اُس کا کام بادل کو منتشر کرنا ہے۔ جو ہوا شمالی ہے، وہ جامع سحاب ہوتی ہے، قطب شمالی کے نیچے سے چلتی ہے۔ جنوب کی طرف چلنے والی ہوا مدر مطر ہے، یہ قبلے کی طرف سے چلی ہے۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہوائیں آٹھ قسم کی ہیں، چار عذاب والی: قاصف، عاصف، صرصر اور عقیم اور چار باعثِ رحمت ہیں: ناشرات، مبشرات، مرسلات، ذاریات۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر اللہ تین ہواؤں کو اپنے بندوں سے روک لے تو اکثر اہلِ زمین سڑ جائیں۔[1] پھر زمین پر آب پاشی کو مردوں کو قبروں سے نکالنے کی طرح بتایا، یہ ان لوگوں کی تردید ہے جو مر کر جی اٹھنے کے منکر ہیں۔ حاصل یہ ٹھہرا کہ جس کو یہ قدرت ہے کہ سوکھی لکڑی سے تر پھل نکالتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ قبر سے مردوں کو زندہ کر کے نکالے۔ پاک زمین کو سبزہ اگانے کے لیے بالخصوص اللہ کے اذن کے ساتھ مشروط رکھا، حالانکہ دونوں قسم کی زمین سے جو کچھ اگتا ہے وہ اسی کے اذن سے ہوتا ہے، سو یہ تعریف اور اس زمین کی بزرگی ظاہر کرنے کے لیے فرمایا۔

﴿نَكِدًا﴾ کے معنی ہیں قلیل، جس میں کچھ خیر و برکت نہ ہو، یا جو بہت مشکل اور تکلیف سے نکلے۔ بعض نے کہا: یہ مثال ہے تیز ذہن والے اور کند ذہن والے کی کہ پہلا اچھی زرخیز زمین کی طرح ہے اور دوسرا ناپاک اور ناکارہ زمین کی طرح ہے۔ (ذکرہ النحاس) کسی نے کہا کہ مثال دل کی ہے کہ وہ دل جو وعظ کو قبول کرتا ہے، وہ پاکیزہ زمین کی طرح ہے اور جو وعظ کو قبول نہیں کرتا وہ ارضِ سبخہ (بنجر زمین) کی طرح ہے جو پانی قبول نہیں کرتی۔ (قالہ الحسن)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ مومن اور منافق کے دل کی مثال ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آدمیوں میں سے طیب اور خبیث کی کہاوت ہے۔ (قالہ المجاهد)[2] ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جو اوپر گزر چکی ہے وہ فقط آیتِ باب کے

---

[1] تفسير الخازن (٢/ ٢٤٢۔ ٢٤٣) [2] فتح القدير (٢/ ٣٠٣)

مناسب ہے نہ کہ آیتِ پاک کے نزول کا سبب۔ بہر حال اللہ کی طرف سے آیتوں کا یہ پھیر پھار ان لوگوں کے لیے ہے جو شاکر اور ذاکر ہوں، جو اللہ کی نعمتوں کا اعتراف کرنے والے اور قرآن کریم کو سن کر اس سے نفع حاصل کرنے والے ہیں۔[1]

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، چناں چہ اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، بے شک میں تم پر بہت بڑے دن کا عذاب آنے سے ڈرتا ہوں (59) اس کی قوم میں سے بعض سرداروں نے کہا: بے شک ہم تو تجھے کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں (60) نوح نے کہا: اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں، بلکہ میں تو سب جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں (61) میں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں، اور میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (62)

نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر:

اللہ پاک نے سورت کے شروع میں آدم علیہ السلام کا ذکر کیا تھا، جب ان کے متعلقات اور متصلات سے فراغت ہوئی تو اب اور پیغمبروں کا قصہ شروع کیا۔ پہلے نوح علیہ السلام کا ذکر کیا، کیوں کہ آدم علیہ السلام کے بعد زمین والوں کی طرف وہی بھیجے گئے تھے۔ وہ نوح بن لامک بن متوشلخ بن اخنوع ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اخنوع ادریس علیہ السلام کا نام ہے۔ سب سے پہلے ادریس علیہ السلام نے قلم سے لکھا، وہ برد بن مہلیل بن قنین بن یانش بن شیث بن آدم علیہما السلام کے بیٹے ہیں۔ ابن اسحاق ائمہ نسب نے اسی طرح لکھا ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو تکالیف قوم کے ہاتھ سے نوح علیہ السلام کو پہنچیں، وہ کسی نبی کو نہیں پہنچیں، مگر وہ نبی جو قتل کیا گیا۔ یزید رقاشی کہتے ہیں کہ وہ اپنی جان پر بہت نوحہ وگریہ کیا کرتے تھے، اس لیے نوح کہلائے۔[2]

آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک دس قرن گزرے تھے، وہ سب اسلام پر تھے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ علمائے تفسیر

---

[1] فتح البيان (٤/ ٣٨١_ ٣٨٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٠٥)

نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جو بت پرستی ہوئی وہ اس طرح ہوئی کہ صالح لوگوں کی ایک قوم مرگئی، ان کی قوم نے ان پر مسجدیں بنائیں، صورتیں کھینچیں، تاکہ ان کی حالت اور عبادت کو یاد رکھ کے ان کی مشابہت پیدا کریں، جب زمانہ دراز گزرا تو ان تصویروں کے بدن اسی شکل کے بنائے، جب اور زمانہ گزرا تو ان بتوں کو پوجنے لگے۔ انھی صالح لوگوں کے نام ان بتوں پر رکھ دیے، یعنی وَد، سُواع، یَغوث، یَعوق اور نَسر۔ جب یہ شرکیہ عمل عام مروج ہوگیا تو اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کو بھیجا کہ وہ قوم کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی طرف بلائیں۔[1] وللہ الحمد والمنة.

نوح علیہ السلام کی دعوت:

نوح علیہ السلام نے کہا: اے لوگو! صرف اللہ کو پوجو، مجھے ڈر ہے کہ اللہ قیامت کے دن جب تم اس سے مشرک ہوکر ملو گے تو تمھیں عذابِ عظیم دے گا۔ عام لوگوں، سرداروں اور قوم کے بڑے لوگوں نے نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم تجھ کو گمراہ جانتے ہیں، تو ہم کو بتوں کی عبادت ترک کردینے کی طرف بلاتا ہے، اس پر ہم نے اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے۔

فاجروں کا نیکوں کو گمراہی کا الزام دینا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "هَكَذَا حَالُ الْفُجَّارِ إِنَّمَا يَرَوْنَ الْأَبْرَارَ فِيْ ضَلَالَةٍ" "اسی طرح فاسق فاجر لوگوں کا حال ہے، انھیں نیک لوگ گمراہ نظر آتے ہیں۔" جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴾ [المطففين: ٣٢] "اور جب وہ (کافر) ان (مسلمانوں) کو دیکھتے تو کہتے تھے بلاشبہ یہ یقیناً گمراہ لوگ ہیں۔" نیز فرمایا: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ﴾ [الأحقاف: ١١] "اور کفر کرنے والوں نے ایمان لانے والوں سے کہا: اگر وہ (دین) بہتر ہوتا تو وہ (عام لوگ) اس (کو قبول کرنے) مین ہم سے پہل نہ کرتے اور جب انھوں نے اس (قرآن) کے ذریعے سے ہدایت نہ پائی تو اب وہ ضرور کہیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے۔" اس کے سوا اور بہت آیات ہیں۔

نوح علیہ السلام کا جواب:

نوح علیہ السلام نے ان کے جواب میں یہ بات کہی کہ میں گمراہ نہیں ہوں، میں تو اس کا بھیجا ہوا ہوں جو ہر شے کا رب اور مالک ہے۔ اس کی رسالت پہنچاتا ہوں، تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں، جو اللہ کی بات مجھے معلوم ہے وہ تم کو نہیں معلوم۔ سو رسول کی شان یہی ہے کہ وہ مبلغِ فصیح، ناصحِ صریح، عالمِ صحیح اور اللہ کو صحیح طور پر پہچاننے والا ہو۔ کوئی شخص اللہ کی خلق میں اور ان صفات میں اس کو نہ پا سکے۔ جس طرح صحیح مسلم میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفے کے دن جہاں بہت بڑا مجمع تھا، کہا: اے لوگو! تم میرے بارے میں پوچھے جاؤ گے، سو تم کیا کہو گے؟ سب نے کہا: ہم

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٢٩٩)

گواہی دیں گے کہ آپ ﷺ نے ہم کو پہنچا دیا، ادا کر دیا، ہماری خیر خواہی کی، تب آپ ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر پھر اسے جھکا کر یہ فرمایا: « اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ » ''اے اللہ! تو گواہ رہنا، اے اللہ! تو گواہ رہنا۔'' حدیث کے الفاظ یہ ہیں: « فَجَعَلَ يَرْفَعُ اِصْبَعَهُ إِلَى السَّمَاءِ وَيُنْكِتُهَا عَلَيْهِمْ » ''پھر آپ ﷺ نے انگلی کو آسمان کی طرف اٹھانا اور لوگوں کی طرف پھیرنا شروع کر دیا۔''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کئی بار انگلی کو اٹھایا اور پھر لوگوں کی طرف لوٹایا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے آخر عمر میں ایک عظیم الشان اور بڑے مجمعے میں اللہ کے اوپر ہونے کا اشارہ کیا۔ وللّٰه الحمد. آیتِ باب سے یہ بھی نکلا کہ نوح علیہ السلام وغیرہ انبیا سب کے سب قیامت کے قائل تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اللہ نے اس جگہ سے امتوں کے قصوں کا ذکر کرنا شروع کیا، کافروں کو سخت ڈانٹ اور وعید فرمائی، تاکہ یہ امت خبردار اور ہوشیار ہو جائے اور کسی پہلی امت کی، جو حق کی مخالف تھی، مقتدی نہ بنے۔ نوح علیہ السلام نجار (بڑھئی) تھے۔ چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے یا پچاس سال کی عمر میں یا دو سو پچاس سال کی عمر میں یا ایک سو سال کی عمر میں۔ انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: « أَوَّلُ نَبِيٍّ أُرْسِلَ نُوحٌ » ''پہلا نبی جو لوگوں کی طرف بھیجا گیا وہ نوح علیہ السلام ہیں۔''[2] (رواه أبو الشيخ و ابن مردوية)

یزید رقاشی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہت زیادہ نوحہ کرنے کی وجہ سے نوح کہلائے[3] اور ان کا نام عبدالغفار تھا۔ نوحہ کی وجہ یہ تھی کہ قوم پر ہلاک ہونے کی بددعا کر بیٹھے یا اللہ پاک سے اپنے بیٹے کنعان کے بارے میں گفتگو کی یا ایک مجذوم کتے سے کہا: "إِخْسَأْ يَا قَبِيحُ" ''دور ہو اے کتے!'' اللہ نے وحی بھیجی کہ تو نے مجھ پر عیب لگایا ہے یا کتے پر۔ آدمی کی قوم اس کے اقربا ہوتے ہیں جو ایک ہی حد میں رہتے ہوں، ہاں کبھی آدمی اطراف میں رہتا ہے، مجازاً بطور مجاورت ان کو اپنی قوم کہتا ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے: ﴿ قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۲۰] ''اس نے کہا: اے میری قوم! تم رسولوں کی پیروی کرو۔'' حالانکہ وہ ان کے درمیان مقیم تھے، ان میں سے نہ تھے، کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ اُسی قوم کے تھے۔ نوح علیہ السلام کا ذکر سورت آل عمران میں گزر چکا ہے،[4] اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

یہ جو کہا ہے کہ ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام سے پہلے تھے۔ ابن العربی نے اس کو وہم ٹھہرایا ہے۔ مارزی نے کہا کہ اگر ثابت ہو تو اس بات پر محمول ہے کہ ادریس نبی غیر مرسل تھے۔[5] والله أعلم. عذابِ عظیم سے مراد عذابِ قیامت یا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۲۱۸) تفسير ابن كثير (۲/ ۲۹۹۔ ۳۰۰)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۵۰٤) السلسلة الصحيحة (۱۲۸۹)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۵۰۵) [4] رقم الآية (۳۳) [5] فتح القدير (۲/ ۳۰۵)

عذابِ طوفان ہے۔ مَلَاْ قوم کے شرفا اور رؤسا کو کہتے ہیں۔ عدول راہِ حق سے پھر جانے کو کہتے ہیں۔ رسالات رسالت کی جمع ہے جو رسالتوں کے مختلف اوقات اور مختلف معانی کے لحاظ سے ہے۔[1]

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک ایسے آدمی کے ذریعے سے نصیحت آ گئی جو تم میں سے ہے؟ تا کہ وہ تمھیں ڈرائے اور تا کہ تم ڈر جاؤ اور تا کہ تم پر رحم کیا جائے (63) پھر انھوں نے نوح کو جھٹلایا تو ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ (ایمان لانے والے) تھے کشتی میں بچا لیا، اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے، بے شک وہ لوگ (دل کے) اندھے تھے (64)

قوم کا ردِ عمل اور اللہ کی سنت:

یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ تم اس بات پر کیا تعجب کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے ایک شخص پر ازراہِ رحمت، لطف اور احسان تمھارے ڈرانے اور بچانے کے لیے وحی بھیجے۔ انھوں نے نوح علیہ السلام کو جھٹلانا اور ان کی مخالفت کرنا شروع کر دیا۔ بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے، جس طرح دوسری جگہ ذکر آیا ہے۔ سو نوح علیہ السلام اور کشتی والے تو بچ گئے اور جو جھٹلانے والے تھے وہ غرق ہو گئے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴾ [نوح: ۲۵] ”وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کیے گئے، پھر دوزخ میں داخل کیے گئے، تو انھوں نے اللہ کے سوا کوئی اپنا مددگار نہ پایا۔“ اس قوم کو اندھا فرمایا، یعنی ان کو حق نہ سوجھتا تھا، نہ ہی وہ سیدھے راستے پر آتے تھے۔

اللہ نے اس قصے میں اعدا سے انتقام لینے کا اور رسول اور مومنین کو نجات دینے کا بیان فرمایا، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا ﴾ [المؤمن: ۵۱] ”یقیناً ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے۔“ یہ اللہ کی ایک سنت ہے دنیا اور آخرت میں اپنے بندوں کے درمیان کہ عاقبت کی بھلائی متقیوں کے لیے ہوتی ہے، وہی کامیاب اور غالب رہتے ہیں اور انہی کی مدد کی جاتی ہے، جس طرح کہ نوح علیہ السلام کی قوم ہلاک ہوئی اور ان کے ساتھ والے بچ گئے۔ زید بن اسلم نے کہا

---

[1] فتح البیان (٤/ ٣٨٥۔ ٣٨٧)

کہ نوح علیہ السلام کی قوم پر سہل (ہموار زمین) اور جبل (پہاڑ) سب تنگ ہو گیا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ جب اللہ نے قومِ نوح پر عذاب بھیجا، اس وقت زمین ان سے بھری ہوئی تھی۔ زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا نہ تھا جہاں پر کوئی مالک و حائز نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی میں اسی (۸۰) مردوں نے نجات پائی، ان میں ایک جرہم بھی تھا، اس کی زبان عربی تھی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ سوال انکار کے لیے ہیں، ذکر سے مراد وحی، رسالت یا موعظت ہے۔ مراد وہ کتاب ہے جو نوح علیہ السلام پر اتری تھی یا وہ معجزہ ہے جو ان کو ملا تھا، مگر پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری ہی جنس کے آدمی پر جس کو تم جانتے ہو، اس کی زبان پہچانتے ہو، وہ ذکر آیا ہے، اس لیے کہ تم ڈرو تو تم پر رحم ہو۔ آیت کی ترتیب میں عجیب حسن ہے، اس لیے کہ ارسال کا مقصد انذار (ڈرانا)، انذار سے تقویٰ، تقویٰ سے فوز برحمت (رحمت کے ساتھ کامیابی) ہے، لیکن قومِ نوح نے اس انذار کا کچھ خیال نہ کیا، نوح علیہ السلام کی نبوت کی تکذیب پر بدستور جمے رہے، نہ وحی کو مانا نہ نبی کی بات کو سنا۔

آخر اللہ نے نوح علیہ السلام کو تو طوفان سے اور غرق ہونے سے بچا لیا، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جو چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ بعض نے کہا: نو لوگ تھے، تین نوح علیہ السلام کے بیٹے اور چھے اور آدمی اور کشتی مذکور کو دو سال میں بنایا تھا، دسویں رجب کو اس پر سوار ہوئے، دسویں محرم کو اس سے اترے۔ وہ لوگ جو جھٹلاتے تھے اور جنھوں نے توبہ نہیں کی تھی، وہ سب کے سب غرقِ آب ہو گئے اور کیوں نہ ہوتے وہ تو حق سے اندھے تھے، ان کے دل میں کسی نصیحت اور وعظ کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اندھے تھے، یعنی کافر تھے۔[2] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ دل کے اندھے تھے نہ کہ آنکھوں کے۔ حق اور ایمان انھیں سوجھتا نہیں تھا[3] یا نزولِ عذاب سے اندھے ہو رہے تھے۔[4]

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٦٦﴾ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٧﴾ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٠٦۔ ١٥٠٧) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٠٧) اس کی سند میں ''بشر بن عمارۃ'' ضعیف راوی ہے۔
[3] معاني القرآن (٢/ ٣٤٧) [4] فتح البیان (٤/ ٣٨٨۔ ٣٨٩)

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور ہم نے قومِ عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، کیا پھر تم ڈرتے نہیں 65 اس کی قوم میں سے کافر چودھری کہنے لگے: بے شک ہم تجھے بے وقوفی میں پڑا دیکھتے ہیں، اور بے شک ہم تجھے جھوٹوں میں گمان کرتے ہیں 66 (ہود نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، بلکہ میں تو سب جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں 67 میں اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچاتا ہوں اور میں تمھارا خیر خواہ اور امین ہوں 68 کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس ایک ایسے آدمی کے ذریعے سے نصیحت آئی ہے جو تمھی میں سے ہے، تاکہ وہ تمھیں ڈرائے اور یاد کرو، جب اس نے قومِ نوح کے بعد تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تمھیں قد و قامت میں بڑھوتری دی، لہٰذا تم اللہ کی نعمتیں یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ 69

ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا تذکرہ:

اللہ پاک نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے نوح علیہ السلام کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اسی طرح ہود کو قومِ عاد کی طرف بھیجا۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ قوم عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح کی اولاد تھے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ عادِ اولیٰ ہیں، جن کا ذکر اللہ نے کیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ [الفجر: ٦۔٨] ”کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا؟ (عاد) ارم جو اونچے ستونوں والے تھے۔ جن کے مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔“

ان لوگوں نے بہت سخت قوت اور تکلیف کے ساتھ جنگل میں بڑے بڑے محل کھڑے کیے تھے جن میں رہتے بستے تھے۔ یہ عاد بن ارم ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ١٥] ”پھر جو عاد تھے تو انھوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور بولے: قوت میں ہم سے زیادہ سخت کون ہے؟ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ جس نے انھیں پیدا کیا وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ ہماری آیات کا انکار

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٥٠٦)

کرتے رہے۔'' ان کے گھر بار احقاف تھے۔ احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔[1]

سیدنا عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے علی رضی اللہ عنہ کو سنا، حضرموت کے ایک شخص سے پوچھتے تھے تو نے وہ لال ٹیلہ دیکھا ہے جو کلوخ سرخ کا تھا اور حضرموت کی فلاں زمین کے کنارے پر تھا اور جو اِراک کے سامنے تھا اور اس زمین میں بہت سے بیر تھے؟ اس نے کہا: ہاں اے امیر المومنین! واللہ آپ نے تو اس کا ایسا حال بیان کیا، جیسے کوئی شخص جس نے اسے دیکھا ہو وہ کہتا ہو، فرمایا: نہیں، میں نے اس کا حال سنا ہے، حضرمی نے کہا: اس کا کیا حال ہے؟ کہا: وہاں ہود علیہ السلام کی قبر ہے۔[2] (رواہ ابن جریر)

قوم عاد کے ٹھکانے:

اس روایت سے معلوم ہوا کہ عادیوں کے مساکن یمن میں تھے اور ہود علیہ السلام وہیں مدفون ہیں۔ ہود علیہ السلام اپنی قوم میں سب سے اچھے نسب والے تھے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو افضل قبیلہ اور بہترین کنبے میں مبعوث کرتا ہے۔ ہمارے شیخ الشیوخ محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ کا نسب بھی ہود علیہ السلام سے جا ملتا ہے، انھی کی اولادِ خاص میں سے تھے۔ وللّٰہ الحمد. لیکن ہود علیہ السلام کی قوم جس طرح شدید الخلق (لمبے تڑنگے اور مضبوط) تھے، اسی طرح ان کے دل بھی بہت سخت اور درشت تھے۔ یہ قوم حق کو جھٹلانے کے بارے میں سب قوموں سے زیادہ سخت تھی۔ ہود علیہ السلام نے ان کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت اور اطاعت وتقویٰ کی طرف بلایا، اس قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تم کو احمق اور جھوٹا سمجھتے ہیں، تو جو ہم کو کہتا ہے کہ ہم بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پوجیں تو یہ تیری حماقت اور گمراہی ہے۔

قوم کے ساتھ مکالمہ:

اسی طرح دعوت الی اللہ دیے جانے کے وقت قریش کے سرداروں نے کہا تھا: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ [صٓ: ۵] ''کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟'' ہود علیہ السلام نے کہا: سنو بھائی! میں بے وقوف نہیں ہوں، اللہ کا رسول ہوں جو ہر شے کا رب و خالق و مالک ہے۔ میں اس کی رسالت کو پہنچاتا ہوں، تمھارا خیر خواہ ہوں، امانت دار ہوں، یہ وہ صفتیں ہیں جو اللہ کے رسولوں میں پائی جاتی ہیں، یعنی اللہ کا حکم پہنچانا، نصیحت کرنا اور امانت داری۔ تم اس بات پر تعجب نہ کرو کہ اللہ نے تمھیں ڈرانے اور عذاب سے بچانے کے لیے تم میں سے ایک شخص کو رسول بنایا ہے، بلکہ تم کو چاہیے کہ تم اللہ کی حمد و ثنا کرو اور یاد کرو کہ اُس نے تم کو قومِ نوح علیہ السلام کے بعد خلیفہ کیا ہے۔ یہ اللہ کا انعام ہے کہ تم نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہو، کون سے نوح؟ جن کی دعا سے سارے زمین والے ان کی مخالفت اور تکذیب کی وجہ سے ہلاک ہوگئے اور تم کو اللہ نے اپنی مخلوق میں بسطت (کشائش) عنایت فرمائی، یعنی انسانوں میں تمھیں دراز قد، مضبوط جسم، بھاری بھرکم اور شان دار بنایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، قصہ طالوت میں: ﴿ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ [البقرۃ: ۲۴۷] ''اور اسے علم اور جسم (دونوں) میں زیادہ کشادگی دی ہے۔'' سو تم اللہ کی نعمتیں یاد کرو، شاید تمھارا چھٹکارا اور بھلا ہو۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۰۰۔ ۳۰۱)
[2] تفسیر الطبري (۱۲/ ۵۰۷)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قومِ عاد سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے۔ عاد بن اوص بن ارم بن شالخ بن ارفحشد بن سام۔ ان کو عادِ اولیٰ کہتے ہیں، عاد ثانیہ صالح علیہ السلام کی قوم تھی، جن کا نام ثمود ہے۔ دونوں کے درمیان ایک سو سال کا فاصلہ تھا۔ ہود علیہ السلام یا تو ان کے قبیلے سے تھے یا ان کے صاحب اور برادر، اس لیے کہا کہ وہ ان کے مثل ابن آدم تھے۔ یہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] عرب صاحبِ قوم کو اخ قوم بولتے ہیں۔ ہود علیہ السلام عبداللہ بن رباح بن خلود بن عاد کے بیٹے تھے، یہ امام سیوطی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[2] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ ہود علیہ السلام شالخ مذکور کے بیٹے ہیں۔[3] زیادہ صحیح پہلا قول ہے۔ نحویوں کی زبان پر چڑھا ہے کہ لفظ ہود عربی ہے، مگر سیبویہ نے اس کو نوح اور لوط کے ساتھ گنا ہے تو اعجمی ٹھہرا۔

ہود اور نوح علیہما السلام کے درمیان آٹھ سو برس کا فاصلہ ہوا۔ چار سو چونسٹھ برس، جیسے ربیع بن خثیم رحمہ اللہ نے کہا، عاد یمن سے شام تک مورچیوں کی طرح ریگستان میں پھیلے تھے۔[4] جو ریگستان عمان اور حضر موت کے قریب ہے، اس کو احقاف کہتے تھے، اسی جگہ ان کے گھر تھے۔ وہب نے کہا: قومِ عاد کا قد ان کے گز سے ساٹھ گز تھا، ہر مرد کا سر ایک بڑے قبے کی طرح ہوتا، آنکھ کے اندر درندے بچہ دیتے تھے، یہی حال ان کے نتھنوں کا تھا۔ قتادہ نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ لمبائی میں بارہ گز تھے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اسی باع تھے۔[5] لیکن یہ اقوال ضعف و بعد سے خالی نہیں ہیں۔

قرآن پاک سے صرف اتنا ثابت ہوا ہے کہ اور امتوں کی نسبت طویل القامت اور عظیم الجثہ تھے۔ اگر ان کی کیفیت جسمانی کے بیان میں کچھ دینی اور دنیاوی فائدہ ہوتا تو قرآنِ مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکوت نہ فرماتے۔ غرض کہ ان کی قوم نے ان کو خفت، طیش، قلتِ عقل اور جہالت کی طرف منسوب کیا، پھر اس پر بھی کفایت نہ کی، بلکہ ان کے دعوائے رسالت کو جھٹلایا، انھوں نے کہا: سنو میں احمق نہیں، میں تو اللہ کا رسول، مبلغِ رسالت اور تمھارا ناصح و امین ہوں۔ معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت اپنی مدح کرنا جائز ہے۔ انبیا و رسل کا حوصلۂ چشم پوشی اور ترکِ مقابلہ کو دیکھنا چاہیے کہ ان کے جواب میں یہ نہ کہا کہ تم بے وقوف گمراہ ہو، حالانکہ وہ بڑے احمق اور گمراہ تھے۔ یہ ایک ان کا ادب حسن و خلقِ عظیم تھا۔

اللہ نے اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ تم بے وقوفوں اور جاہلوں کے مقابلے میں چشم پوشی کیا کرو، بردباری اور تحمل سے پیش آؤ، بری بات کا جواب اچھا دو، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ [الفرقان: ٦٣] ''اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ

---

[1] معاني القرآن (٢/ ٣٤٧) [2] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٦٦) [3] تفسير البغوي (٣/ ٢٤٢)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٩٢) [5] الدر المنثور (٣/ ٤٨٥)

بَسْطَۃ سے مراد شدت ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قوم عاد کا ایک آدمی ایک پتھر کا کواڑ اٹھا لیتا ہے جو اس امت کے پانچ سو آدمیوں سے نہ اٹھے۔ اپنا پاؤں زمین میں گھساتا تو گھس جاتا۔[2] امام سدی اور کلبی رحمۃ اللہ علیہما نے کہا کہ طویل القامت سو گز کا اور قصیر القامت ساٹھ ستر گز کا ہوتا تھا۔[3] سلف سے قوم عاد کے بڑے جسم کی حکایات منقول ہیں، مگر ان میں بُعد ہے (یعنی غیر مستند ہیں)۔[4]

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾

انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ عبادت کرتے تھے؟ چناں چہ اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہم پر وہ (عذاب) لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے (70) ہود نے کہا: تمھارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہوا ہی چاہتا ہے۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے آبا و اجداد نے رکھ لیے ہیں؟ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، چناں چہ تم انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں (71) پھر ہم نے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ہمراہ تھے، اپنی رحمت کے ساتھ نجات دی، اور ہم نے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی، جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے (72)

قوم ہود کی سرکشی اور عذاب:

اللہ نے یہاں ہود علیہ السلام کی قوم کے تمرد، سرکشی اور دشمنی کی خبر دی کہ انھوں نے ہود علیہ السلام پر انکار کیا، جس طرح کفار قریش نے کہا: ﴿ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥١٠) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (٩/ ٢٧٩٨)
[3] تفسير البغوي (٣/ ٢٤٣) [4] فتح البيان (٤/ ٣٨٩_ ٣٩٢)

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الأنفال: ٣٢] ''اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ۔'' امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ وہ قوم بت پرست تھی، ایک بت کا نام صداء اور دوسرے کا صمود رکھا تھا، کسی کا نام ہبا تھا۔[1] اسی لیے ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم پر اللہ کا عذاب اور غضب آ چکا ہے، یعنی اس کہنے پر۔ لفظ رجس مقلوب رجز ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بمعنی سخط ہے،[2] یعنی خفگی۔ تم ایسی بات میں جھگڑتے ہو جن کو تمھارے آبا و اجداد نے خدا ٹھہرایا وہ نہ نقصان کریں نہ نفع دیں، نہ اللہ نے ان کی عبادت پر کوئی سند مقرر کی ہے، سو تم اور ہم دونوں منتظر ہیں، دیکھو کیا ہوتا ہے، یہ ڈانٹ اور وعید رسولوں کی طرف سے قوم کے حق میں ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ہود علیہ السلام کو ان کے ہمراہیوں کے ساتھ بچا لیا اور جھٹلانے والی قوم کو ہلاک کر دیا۔ اس ہلاکت کی صفت قرآن پاک میں کئی جگہ آئی ہے، ایک تیز آندھی چلی، جس پر سے گزری، اس کو رمیم (پرانا بوسیدہ) کی طرح کر دیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۞ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۞ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴾ [الحاقة: ٦۔ ٨] ''اور جو عاد تھے تو یخ تند و تیز بے قابو آندھی سے ہلاک ہوئے۔ اللہ نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن جڑ کاٹنے (فنا کرنے) کے لیے مسلط رکھا، پھر آپ اس قوم کو پچھاڑے (ہلاک کیے) ہوئے دیکھتے ہو، گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔ پھر کیا آپ ان کی کوئی باقیات دیکھتے ہیں؟''

غرض کہ ان کے تمرد و عتو (سرکشی) پر وہ سناٹے کی ہوا چلی تو یہ حال ہوا کہ آدمی ہوا میں اڑ کر اوندھے منہ گرتا، سر پھٹ کر تن سے جدا ہو جاتا، اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے گرے ہوئے ہیں۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قوم یمن میں عمان سے حضر موت تک رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زمین میں پھیل کر لوگوں کو اپنے قہر اور سختی کا نشانہ بناتے تھے، کیوں کہ اللہ نے ان کو بہت قوت دی تھی۔ بت پرستی کی وجہ سے اللہ نے ہود علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا۔

قوم کو دعوت اور ان کے ساتھ مکالمہ:

یہ ان میں عالی نسب اور بلند رتبہ تھے، ان کو حکم دیا کہ تم اس قوم سے کہہ دو کہ اللہ کی عبادت کرو، ظلم کرنا چھوڑ دو، انھوں نے نہ مانا، ہود کو جھٹلایا، کہا: ہم سے زیادہ کس کی قوت ہے، تھوڑے سے لوگ پوشیدہ طور پر ایمان لائے۔ جب عاد کا فساد زمین میں زیادہ ہوا اور جبر کرنے لگے اور ہر اونچی جگہ پر بے فائدہ عمارت بنانے لگے تو ہود علیہ السلام نے ان سے گفتگو کی اور کہا: ﴿ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۞ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۞ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۞ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ [الشعراء: ١٢٨۔ ١٣١] ''کیا تم ہر اونچی جگہ پر بطور کھیل تماشا

---

[1] تفسیر الطبري (١٢/ ٥٠٧۔ ٥٠٨)
[2] تفسیر الطبري (١٢/ ٥٢٢) اس کی سند حسن ہے۔

یادگاریں بناتے ہو؟ اور تم مضبوط محل بناتے ہو، شاید تم ہمیشہ (یہیں) رہو گے۔ اور جب تم (کسی پر) ہاتھ ڈالتے ہو تو سرکش بن کر ہی ہاتھ ڈالتے ہو۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

انھوں نے کہا: ﴿ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ [ھود: ۵۳۔ ۵۶] ''انھوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں لایا اور ہم (صرف) تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم تجھ پر ایمان لانے والے (بھی) نہیں۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے (دماغی) خرابی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہود نے کہا: بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ سوائے اللہ کے، چناں چہ تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کر لو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، (زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو، بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔''

وفدِ عاد کا واقعہ اور عذاب:

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ عاد نے جب نہ مانا اور کفر پر اڑے رہے تو اللہ نے تین برس تک ان پر پانی نہ برسایا اور وہ نہایت مشکل میں پڑے۔ اس زمانے میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی مشکل پڑتی تو اللہ پاک سے اس کے حرم، مکان اور گھر میں فراخی کی طلب کرتے۔ یہ بات تمام امتوں میں معروف تھی۔ وہاں عمالیق رہتے تھے۔ یہ عاد سلالہ عملیق بن آدم بن سام بن نوح تھے۔ اس وقت ان کا سردار ایک شخص معاویہ بن بکر نام کا تھا، اس کی ماں کلھدہ بنت خیبری قومِ عاد کی تھی۔ عاد نے ایک قافلہ ستر آدمیوں کا حرم کی طرف بھیجا، تاکہ وہاں پہنچ کر استسقا کریں، اللہ پاک سے پانی مانگیں۔ ان کا گزر معاویہ بن بکر پر ہوا۔ وہ مکے کے باہر کی طرف رہتا تھا، یہ لوگ ایک ماہ تک اس کے پاس ٹھہرے، شراب پیتے رہے اور گانا سنتے رہے، ایک ماہ کے سفر میں معاویہ تک پہنچے تھے، جب وہاں ٹھہرنا زیادہ ہوا اور معاویہ کو اپنے ہم قوم ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی تھی، شرم سے نہ کہا کہ اب تم جاؤ، کچھ شعر بنا کر گانے میں سنوائے، درپردہ ان کی واپسی کا اشارہ کیا، تب قوم متنبہ ہوئی اور دعا کے لیے حرم کی طرف چلے۔ دعا کرنے والا جس کا نام قیل بن عنز تھا، اس نے دعا مانگی، تین بادل نمودار ہوئے، سفید، کالا اور لال۔ ایک منادی نے ندا کی کہ ان میں کسی ایک بادل کو پسند کر، اس نے سیاہ بادل کو اختیار کیا اور آواز آئی:

اخترت رمادا أرمداً لايبق من عاد أحدا

ولا والدا تترك ولا ولدا إلا جعلته همدا

ألا بني اللويذية مهندا

''تونے گہرے خاکستری رنگ کو پسند کیا ہے، اب عاد سے کوئی بھی نہیں بچے گا، ہر باپ بیٹے کو تونے موت کی نیند سلا دیا ہے سوائے بنولویذیہ کے۔''

یہ بنولویذیہ عاد کا ایک بطن تھا جو مکے میں رہتا بستا تھا۔ ان کو وہ عذاب نہ پہنچا جو قوم کو پہنچا۔ عاد آخرہ انہی کے نسب اور اولاد سے تھے۔ اللہ نے اس ابرِ سیاہ کو جسے قیل بن عنزہ نے اختیار کیا تھا، عاد کی طرف بھیجا، اس میں نقمت اور آفت تھی، وہ وادیِ مغیث کی طرف سے برآمد ہوا، قوم نے اس کو دیکھ کر کہا: ﴿ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ﴾ [الأحقاف: ٢٤] ''یہ بادل ہم پر بارش برسانے والا ہے'' اور خوش ہوئے۔ اللہ نے کہا: ﴿ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [الأحقاف: ٢٤۔ ٢٥] ''(ہود نے کہا: نہیں!) بلکہ یہ تو وہ (عذاب) ہے جسے تم جلدی طلب کرتے تھے۔ (یہ) آندھی ہے، اس میں نہایت دردناک عذاب ہے۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی۔''

اس عذاب کا معائنہ سب سے پہلے ایک عادیہ عورت نے کیا جس کو ممید کہتے تھے، اس نے پہچان لیا کہ اس ہوا میں بلا ہے، وہ چلا کر بے ہوش ہوگئی، جب ہوش آیا تو اس سے کہا: اے ممید! تو نے کیا دیکھا؟ کہا: اس ہوا میں کوئی آگ جیسی چیز ہے۔ اس کے سامنے کچھ لوگ ہیں جو اس آگ کو کھینچ کر لا رہے ہیں، غرض کہ سات رات، آٹھ دن برابر وہ ہنگامہ رہا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ عاد میں سے کوئی نہ بچا، مگر ہلاک و برباد ہوگیا۔ ہود علیہ السلام چند مومنین کے ساتھ ایک باڑے میں کنارہ کش ہو گئے تھے، ان کو سوائے راحت و آرام کے کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

قوم پر آسمان و زمین کے درمیان پتھر برسے، جس سے ان کے سر ٹوٹے۔ تمیم نے یہ تمام قصہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، قصے کا سیاق غریب ہے، مگر اس میں بہت فوائد ہیں، اسی لیے اللہ نے اس جگہ ہود علیہ السلام کی نجات کا ذکر اپنی رحمت کے ساتھ اور عاد کی ہلاکت کا ذکر عذابِ غلیظ سے فرمایا ہے۔[1] یہ قصہ دیگر عنوان کے ساتھ امام احمد و اہل سنن کے نزدیک بھی تفصیلاً آیا ہے۔ اس میں بنی تمیم کی ایک بڑھیا کا بھی ذکر ہے۔ روایت کے آخر میں یہ ہے کہ جب سے یہ واقعہ ہوا، تب سے جب کوئی قافلہ کسی طرف بھیجا جاتا تو کہتے: ''لَا تَكُنْ كَوَافِدِ عَادٍ'' ''عاد کے وفد کی طرح نہ ہو جانا۔''[2]

---

① تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٠٢۔ ٣٠٣)

② مسند أحمد (٣/ ٤٨٢) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٢٧٤) اس کی سند حسن ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ عاد نے ہود علیہ السلام کی نصیحت کے جواب میں یہ کہا کہ تو ہمارے پاس صرف اکیلے اللہ کی عبادت کرانے کے لیے آیا ہے، تو یہ چاہتا ہے کہ جو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے، وہ ہم ترک کر دیں، سو یہ ہرگز نہ ہوگا تو اگر سچا ہے تو اپنے عذاب کا وعدہ پورا کر۔ یہی جواب مقلدین اہلِ اتباع کو دیتے ہیں اور بدعتی اہلِ سنت کو دیتے ہیں۔ ہود علیہ السلام ان کی سرکشی کی شدت اور حق کے راستے اور صحیح بات کے اتباع سے الٹا پھر جانے پر جس عذاب کا ان سے وعدہ کرتے تھے، عاد نے اس کی جلدی کی، انھوں نے کہا: عذاب کا آنا مقرر ہو چکا ہے۔ تم ان خداؤں کے پیچھے جن کو تمھارے باپ دادا نے مقرر کیا ہے، ناحق مجھ سے بحث اور لڑائی کرتے ہو، اللہ نے تو تمھارے ان باطل دعووں پر کوئی حجت اور دلیل نہیں بھیجی۔ بہتر ہے اب تم اور ہم دونوں منتظر رہیں کہ کب تم پر عذاب آتا ہے اور ہمارا وعدہ پورا ہوتا ہے۔ اللہ نے کہا کہ جب عذاب آیا تو ہم نے ہود کو ایمان والوں کے ساتھ بچا دیا، یہ ہماری رحمت تھی اور قومِ عاد کی ہم نے جڑ کاٹ ڈالی۔

امام ابن عساکر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ ہوا جب ہود علیہ السلام اور مومنین کو باڑے میں لگتی تو ان کا جی خوش ہوتا، فرحت حاصل ہوتی، تن بدن کو چین آتا، وہی ہوا قومِ عاد کو پتھروں پر دے مارتی اور وہ ہلاک ہو جاتے۔ ”اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا“ ”اے اللہ ہماری حفاظت فرما۔“ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہود علیہ السلام کی عمر چار سو بہتر برس کی ہوئی۔ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہود علیہ السلام کی قبر حضرموت میں ہے، لال ٹیلے کے پاس ان کے سرہانے ایک بیری کا درخت ہے۔ ابن ابی العاتکہ نے کہا کہ مسجدِ دمشق کے سامنے ہے۔

امام ابن سابط رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رکن اور مقامِ زمزم کے درمیان نوے نبیوں کی قبریں ہیں، اسی جگہ ہود، صالح، شعیب اور اسماعیل علیہم السلام مدفون ہیں۔[1] کہتے ہیں کہ جس پیغمبر کی قوم ہلاک ہو جاتی، وہ صلحائے قوم کے ساتھ مکے میں آ کر مرتے دم تک اللہ کی عبادت کرتا۔ واللہ أعلم. ایک قوم نے عاد کے قصے میں اور اس قوم کی ہلاکت کے بارے میں بہت لمبا قول لکھا ہے، مگر قرآن مجید میں جو اجمالاً ذکر آیا ہے وہ بے سند تفصیلات سے بے نیاز ہے۔[2]

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ
نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۳ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ

[1] الدر المنثور (۳/ ٤٨٧۔ ٤٨٨) [2] فتح البیان (٤/ ۳۹۳۔ ۳۹۵)

جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ
مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ
اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۷۴ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ
اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ
بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۷۵ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۷۶ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ
رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷۷ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۷۸

اور ہم نے (قوم) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ صالح نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، تحقیق تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ گئی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمھارے لیے خاص نشانی ہے، چناں چہ تم اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے، اور اسے برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمھیں بہت دردناک عذاب پکڑ لے گا (73) اور یاد کرو، جب اس نے تمھیں قومِ عاد کے بعد ایک دوسرے کا جانشین بنایا، اور تمھیں زمین میں ٹھکانا دیا، تم اس کی نرم مٹی سے محلات بناتے ہو اور پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو، چناں چہ تم اللہ کی نعمتیں یاد کرو، اور زمین میں فسادی بن کر مت پھرو (74) اس کی قوم کے وڈیرے جنھوں نے تکبر کیا، کمزور سمجھے جانے والے ایمان داروں سے کہنے لگے: کیا تم یہ بات جانتے ہو کہ واقعی صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا: (ہاں) بلاشبہ ہم اس چیز پر ایمان لانے والے ہیں جس کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے (75) ان لوگوں نے کہا: جنھوں نے تکبر کیا: بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو (76) چناں چہ انھوں نے اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں، اور انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی، اور کہا: اے صالح! اگر تو رسولوں میں سے ہے تو ہم پر وہ (عذاب) لے آ، جس سے تو ہمیں ڈراتا رہتا ہے (77) پھر انھیں زلزلے نے آلیا، چناں چہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل (مردہ) گرے پڑے تھے (78)

قوم ثمود کا نسب اور مساکن:

علمائے تفسیر ونسب نے کہا ہے کہ ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح برادر جدیس بن عابر تھا۔ اسی طرح قبیلہ

طسم یہ سب احیائے عرب عاربہ قبل ابراہیم خلیل علیہ السلام تھے۔ ثمود عاد کے بعد ہوئے۔ ان کے مساکن حجاز اور شام کے درمیان وادیِ قریٰ اور اس کے اردگرد مشہور ہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ نو ہجری کو تبوک کی طرف جاتے ہوئے ان کے دیار اور مساکن پر سے گزرے تھے، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جب تبوک میں اترے تو ثمود کے گھروں کے نزدیک حجر پر پڑاؤ ہوا، جن کنوؤں سے ثمود پانی پیتے تھے، لوگوں نے ان کنوؤں سے پانی لے کر آٹا گوندھا، دیگچی چڑھائی، نبیِ اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ دیگچی اوندھی کر دو، آٹا اونٹوں کو کھلا دو، پھر وہاں سے کوچ کیا، اس کنویں پر اترے جس کا پانی ناقہ (اونٹنی) پیتی تھی۔ لوگوں کو منع کیا کہ عذاب کی ہوئی قوم کی جگہ پر داخل نہ ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ بلا تم کو بھی نہ پہنچے جو ان کو پہنچی تھی۔ سو تم ان پر داخل نہ ہو۔[1] (رواہ أحمد)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ حجر میں تھے، فرمایا کہ تم ان معذبین پر داخل نہ ہو مگر روتے ہوئے اور اگر نہ روؤ تو داخل بھی نہ ہو، کہیں تم کو بھی وہ نہ پہنچے جو ان کو پہنچا تھا۔ (رواہ أحمد) اس حدیث کی اصل صحیحین میں کئی طرح سے آئی ہے۔[2]

سیدنا ابو کبشہ انماری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں لوگوں نے اہلِ حجر کی طرف جلدی کی، ان پر داخل ہونے لگے، یہ خبر نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچی، "اَلصَّلَاۃُ جَامِعَۃٌ" کی صدا ہوئی، میں نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ ایک نیزہ ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے تھے، فرمایا: کیا تم ایسی قوم پر داخل ہوتے ہو جن پر اللہ نے غضب کیا تھا۔ ایک آدمی نے کہا: ہم تعجب کرتے ہیں، ان سے فرمایا کیا میں تم کو اس سے زیادہ عجیب خبر نہ دوں، تم میں سے ایک آدمی تمھیں حال ماقبل اور حال مابعد کی خبر دیتا ہے، سو تم سیدھے رہو، سیدھے چلو، اللہ کو تمھارے عذاب کی کچھ پروا نہیں ہے۔ قریب ہے کہ ایک قوم آئے گی، جو اپنی جان سے کسی شے کو دور نہ کر سکے گی۔[3] (رواہ أحمد) اس حدیث کو اصحابِ سنن میں سے کسی نے روایت نہیں کیا۔ ابو کبشہ کا نام عمر بن سعد یا عامر بن سعد ہے۔ واللہ أعلم.

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: جب نبیِ اکرم ﷺ کا گزر حجر پر ہوا، فرمایا کہ نشانیوں کا سوال نہ کرو، قومِ صالح نے سوال کیا تھا، ناقہ اس گھاٹی سے اور اُس گھاٹی سے جاتی، انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کر کے اس ناقے کو کاٹ ڈالا، وہ ایک دن ان کا پانی پیتی تھی، یہ ایک دن اس کا دودھ پیتے، جب اس کے ٹکڑے کیے تو ان کو ایک چنگھاڑ نے پکڑا، جس سے وہ سب جو زیرِ آسمان تھے، بجھ گئے، مگر ایک آدمی جو حرم میں تھا، پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ کون آدمی تھا؟ فرمایا: ابو رغال، جب وہ حرم سے باہر نکلا تو اُس کو بھی وہی بلا پہنچی جو اس کی قوم کو پہنچی تھی۔[4] (رواہ أحمد)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨١) مسند أحمد (٢/ ١١٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٠) مسند أحمد (٢/ ٧٤)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٣١) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی متکلم فیہ ہیں۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

[4] مسند أحمد (٣/ ٢٩٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٦١٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

صالح علیہ السلام کی دعوت:

یہ حدیث بھی صحاح ستہ میں نہیں ہے، مگر شرطِ مسلم پر ہے۔ آیتِ شریفہ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے صالح کو قبیلہ ثمود کی طرف بھیجا تھا، اس نے ان سے کہا کہ اللہ کو پوجو، سوائے اللہ کے تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ یہی دعوت سارے رسولوں کی تھی کہ عبادت صرف اللہ کی چاہیے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ”اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ”اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“

چٹان سے اونٹنی کا نکلنا:

صالح نے کہا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے، اللہ کی حجت ہے، میرے دعوے کی سچائی پر، کیوں کہ انھوں نے خود صالح علیہ السلام سے سوال کیا تھا، نشانی کا اور یہ فرمایش کی تھی کہ اس سنگِ سخت سے ناقہ نکلے، اس پتھر کو خود ہی متعین کر دیا تھا، وہ حجر کے اوپر کے حصے میں ایک بلند سا پتھر تھا، اس کو کاتبہ کہتے تھے، کہا: اس جگہ اس پتھر سے ایک مادہ حاملہ اونٹنی نکلے، صالح علیہ السلام نے ایمان قبول کرنے کے عہد و پیمان لے کر نماز پڑھ کر دعا کی، وہ پتھر ہلا، پھر پھٹ گیا، اس میں سے ایک اچھی خاصی اونٹنی نکلی، اس کا بچہ اس کے پیٹ میں حرکت کرتا تھا، اس وقت ان کا سردار جندع بن عمرو اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ایمان لے آیا، باقی اشرافِ ثمود نے چاہا کہ ایمان لے آئیں، مگر ذاوٴب بن عمرو بن لبید اور خباب صاحبِ اوثان و رباب بن صمر بن جلمس نے ان کو باز رکھا۔ جندع بن عمرو کا چچا زاد بھائی شہاب بن خلیفہ افاضل ثمود سے تھا، وہ بھی ایمان لانے پر آمادہ ہوا، مگر اس گروہ نے اس کو بھی ایمان قبول کرنے سے روک دیا، اس بارے میں ثمود کے ایک مومن نے کچھ اشعار کہے جن کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ وہ ناقہ اپنے بچے کے ساتھ ایک مدت تک ان کے درمیان رہی، ایک دن ان کے کنویں کا پانی پیتی، یہ اس دن اس کا دودھ دوہتے، جتنے برتن چاہتے بھر لیتے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴾ [القمر: ٢٨] ”اور انھیں بتا دے کہ بے شک پانی ان کے (اور اونٹنی کے) درمیان تقسیم ہوگا، ہر ایک (اپنی) باری پر حاضر ہوگا۔“ نیز فرمایا: ﴿ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴾ [الشعراء: ١٥٥] ”یہ اونٹنی (معجزہ) ہے، (ایک دن) اس کی پینے کی باری ہے اور ایک مقرر دن تمھاری پینے کی باری ہے۔“ ان بعض وادیوں میں وہ ناقہ چرا کرتی، ایک درے سے نکلتی، دوسرے درے سے جاتی، تاکہ اس راہ کو کشادہ کرے، اس لیے کہ خوب تن کر پانی پیتی تھی۔ وہ خوف ناک شکل کی تھی اور چرتی پھرتی تھی، جب اس کا گزران کے ڈھور ڈنگروں پر ہوتا تو وہ ڈر کر بھاگ جاتے۔

اونٹنی کو قتل کرنے کا سبب اور واقعہ:

ایک مدت اس حال پر گزری اور ان کی صالح علیہ السلام کی تکذیب حد سے زیادہ بڑھ گئی تو انھوں نے چاہا کہ اس ناقے کو قتل کر ڈالیں، تاکہ سارا پانی ہر روز انھی کے ہاتھ رہے، اس لیے سب نے متفق ہو کر اس کو مار ڈالنا چاہا، قتادہ نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ جس نے اس ناقے کو قتل کیا وہ سارے لوگوں کے پاس جا کر پوچھ آیا کہ تم راضی ہو یا نہیں، یہاں تک کہ عورتوں سے پردے میں اور بچوں سے بھی پوچھا، سب نے رضا مندی ظاہر کی، تب اس کو قتل کیا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی روشنی میں: ﴿ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا ﴾ [الشمس: ١٤] ”پھر انھوں نے اس کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تو ان کے رب نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان پر تباہی ڈال کر سب کا صفایا کر دیا۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ”اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔“ مزید فرمایا: ﴿ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ ﴾ (آیتِ باب) غرض کہ قتل کی اسناد پورے قبیلے کی طرف فرمائی، یہ ان سب کی رضا مندی پر دلیل ہے۔[1] واللہ أعلم.

امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ علمائے تفسیر نے ذکر کیا ہے کہ ناقہ کو قتل کرنے کا سبب یہ تھا کہ قومِ ثمود کی ایک عورت تھی، اس کو عنیزہ بنت غنم بن مجلز کہتے تھے، اس کی کنیت ام عثمان تھی، وہ ایک بوڑھی کافرہ اور صالح علیہ السلام کے ساتھ شدید عداوت رکھتی تھی، اس کی بیٹیاں خوب صورت اور مال دار تھیں، اس کا شوہر ذاؤب بن عمر ثمود کا ایک سردار تھا۔ ایک دوسری عورت تھی، جس کا نام صدقہ بنت محیا بن زہیر بن مختار تھا، یہ بھی حسب، مال اور جال والی تھی، اس کا شوہر ثمود کا ایک مردِ مسلمان تھا، اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ ان دونوں نے کہا: ہم اس کے پاس رہیں گے، جو ناقہ کے قتل کا ذمے دار ہوگا، صدقہ نے ایک شخص حباب نامی کو بلایا، اپنی جان اس کو پیش کی، اس شرط سے کہ ناقہ کی کونچیں کاٹے، اس نے نہ مانا، تب اپنے چچا کے بیٹے مصدع بن مہرج بن محیا سے کہا، اس نے قبول کیا۔ عنیزہ بنت غنم نے ایک دوسرے آدمی کو راضی کیا، جس کو قدار بن سالف بن جذع کہتے تھے، وہ ایک سرخ رنگ، پستہ قد، ازرق چشم (نیلگوں آنکھوں والا) آدمی تھا۔ لوگ گمان کرتے تھے کہ وہ زنا کی اولاد ہے۔ سالف جس کی طرف منسوب تھا، وہ اس کا باپ نہیں تھا، بلکہ صبیان نامی ایک شخص کے نطفے سے پیدا ہوا تھا، مگر سالف کے گھر میں متولد ہوا تھا، اس لیے اس کی طرف منسوب ہو گیا۔ اس بڑھیا نے اس سے کہا کہ اگر اس ناقے کو عقر کرے (اس کی کونچیں کاٹے) تو میری جس بیٹی سے چاہے گا وہ میں تجھے دوں گی۔

قدار بن سالف اور مصدع بن مہرج دونوں چلے، ثمود کے بدمعاشوں کو پھسلایا، سات لوگ ان کے ساتھ متفق ہوئے، ان کو ملا کر نو آدمی ہو گئے، انھی کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴾ [النمل: ٤٨] ”اور اس شہر میں نو سرغنے تھے، وہ زمین میں فساد پھیلاتے رہتے تھے اور

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٠٥۔ ٣٠٦)

اصلاح نہیں کرتے تھے۔'' یہ نو آدمی اپنی قوم میں سردار اور رئیس تھے۔ انھوں نے اپنی مہارت کے ساتھ سارے کافر قبیلے کو اپنے ساتھ ملا لیا، وہ سب اکٹھے ہو کر ناقے کی تاک میں بیٹھے کہ جب وہ پانی پی کر پھرے تو اس کو ماردیں۔ قدار بن سالف ناقہ کے راستے میں ایک پتھر کی جڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دوسری کمین گاہ میں مصدع بیٹھا۔ ناقہ کا گزر مصدع کی طرف سے ہوا، اس نے ایک تیر مارا، جس سے اس کی پنڈلی کا ایک لوتھڑا چھد گیا، عنیزہ نے نکل کر اپنی بیٹی سے کہا، جو نہایت خوب صورت تھی کہ اپنی صورت دکھا۔ اس نے قدار وغیرہ کے سامنے منہ سے نقاب اٹھا کر اپنا چہرہ سب کو دکھایا۔ قدار تلوار لے کر دوڑا اور اس نے ناقے کی کونچیں کاٹ ڈالیں، وہ زمین پر گر کر بلبلائی، اپنے بچے کو ڈرایا، پھر قدار نے اس کے حلق میں مار کر اس کو نحر کیا۔ اس کا بچہ پہاڑ پر چڑھ گیا، ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُس نے یہ کہا: اے میری ماں کہاں ہے؟ تین بار آواز دے کر اسی پتھر کے اندر غائب ہو گیا۔ بعض نے کہا کہ انھوں نے اس کے بھی پیچھے جا کر اس کو بھی عقر (پھاڑ دیا) کیا۔ واللہ أعلم. بہرحال جب وہ عقر ناقہ سے فارغ ہوئے اور یہ خبر صالح علیہ السلام کو پہنچی، وہ ان لوگوں کے پاس آئے، یہ سب جمع تھے، صالح علیہ السلام ناقہ دیکھ کر روئے، فرمایا: اب تم تین دن اپنے گھروں میں بسر کرو، پس بس۔ چہار شنبہ کے روز ناقہ کو قتل کیا، شام کو ان نو آدمیوں نے عزم کیا کہ صالح علیہ السلام کو مار ڈالیں، اگر یہ سچا ہے تو ہم اسے پہلے مار دیں گے اور اگر جھوٹا ہے تو اس کو ناقے کے ساتھ ملا دیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿49﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿50﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [النمل: ٤٩۔ ٥١] ''انھوں نے کہا: تم آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور صالح اور اس کے اہلِ خانہ پر شب خون ماریں گے، پھر ہم اس کے وارث سے کہیں گے کہ ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے، اور بلاشبہ ہم سچے ہیں۔ اور انھوں نے ایک چال چلی اور ہم نے بھی تدبیر کی، اور وہ شعور بھی نہ رکھتے تھے۔ پھر آپ دیکھیں! ان کی چال کا انجام کیا ہوا، بلاشبہ ہم نے ان (نو سرغنوں) کو اور ان کی سب قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔''

اللہ کا عذاب:

جب اس ارادہ پر آمادہ ہو کر رات کو شب خون مارنے کے ارادے سے نکلے اور اللہ پاک کے نبی پاک کو اچانک دھوکے سے قتل کرنا چاہا تو اللہ نے ان پر آسمان سے پتھر برسائے، پتھروں نے مقررہ دن سے پہلے ان کے سر کچل دیے۔ پنج شنبہ کو ایامِ مہلت کا پہلا دن تھا، ان کے منہ زرد پڑ گئے، جیسا کہ صالح علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا، مہلت کے دوسرے دن یعنی جمعے کے دن سب کے چہرے سرخ ہو گئے، تیسرے دن یعنی سنیچر (ہفتے) کا دن تھا کہ سب کے سب

کالے ہو گئے، اتوار کی صبح کو اللہ کے عذاب اور انتقام کا انتظار کرنے لگے۔ عَیَاذاً بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ.

کچھ نہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، کس طرح پر عذاب آئے گا، جب سورج چمکا تو آسمان کی طرف سے ایک چنگھاڑ ہوئی، زمین میں ایک سخت زلزلہ آیا، ایک دم سب کے سب جسم بے روح ہو کر رہ گئے، کوئی چھوٹا بڑا، مرد وعورت نہ بچا، مگر ایک لڑکی جس کا نام کلب بنت سلق تھا، اس کو زریقہ کہتے تھے، وہ بھی کافرہ تھی اور صالح علیہ السلام کے ساتھ شدید عداوت رکھتی تھی، اس نے جب اس عذاب کو دیکھا تو پاؤں پھیلا کر خوب دوڑی، ایک قبیلے کے پاس آ کر یہ خبر دی کہ قوم پر یوم عذاب آیا، پھر اس نے پانی مانگ کر پیا اور پیتے ہی مر گئی۔[1]

علمائے تفسیر کہتے ہیں کہ ثمود کی اولاد میں سوائے صالح علیہ السلام کے کوئی نہ بچا، مگر وہ جو صالح علیہ السلام کے تابع ہو گئے تھے اور ایمان لے آئے تھے۔ ہاں ایک اور آدمی جس کا نام ابو رغال تھا، وہ جب ثمود پر عذاب آیا تو اس وقت حرم محترم میں مقیم تھا۔ اس کو وہ عذاب نہ پہنچا، جب کچھ دنوں کے بعد وہ شخص نکلا اور ایسی جگہ پہنچا جو حلال تھی، یعنی حرم میں داخل نہیں تھی تو آسمان سے ایک پتھر نے آ کر اس کو قتل کیا۔ کہتے ہیں کہ والدِ ثقیف یہی ابو رغال ہے۔ قبیلہ ثقیف طائف میں بستا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر جب ابو رغال کی قبر پر ہوا تو فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص ہے؟ کہا: اللہ اور اس کے رسول کو معلوم ہے، فرمایا: یہ ابو رغال کی قبر ہے۔ یہ قوم ثمود میں سے ایک شخص تھا، اس وقت یہ اللہ کے حرم میں تھا، اللہ کے حرم نے اس کو عذابِ الٰہی سے روکا، جب حرم سے باہر گیا تو پھر جو کچھ اس کی قوم کے ساتھ پیش آیا تھا، اس کے ساتھ بھی پیش آیا، سو اس کو اس جگہ دفن کر دیا ہے، اس کے ساتھ سونے کی ایک زنجیر بھی مدفون ہے۔ لوگوں نے دوڑ کر تلواروں سے زمین کھود کر وہ سونے کی زنجیر نکالی۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو رغال ابو ثقیف ہے۔[2] اور یہ روایت اس وجہ سے مرسل ہے۔ اور دوسری وجہ سے متصلاً بھی آئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، جب کہ ہم ان کے ہمراہ طائف کی طرف گئے اور ایک قبر پر گزرے، کہا: یہ ابو رغال کی قبر ہے، وہ ثقیف کا باپ ہے اور قوم ثمود میں سے تھا۔ وہ یہاں حرم میں تھا، جب وہاں سے دفع کیا گیا اور باہر نکلا تو اس کو وہی اس جگہ سزا ملی جو اس کی قوم کو مل چکی تھی۔ وہ یہیں دفن کیا گیا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ اس کے ساتھ سونے کی ایک شاخ دفن کی گئی تھی، تم اگر قبر کو کھود کر دیکھو گے تو اس شاخ کو پاؤ گے، لوگ دوڑے اور اس سونے کی شاخ کو نکالا۔[3] (هكذا رواه أبو داود) امام مزی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث حسن عزیز ہے، مگر جب امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس میں ابن عمرو رضی اللہ عنہما پر وقف کا احتمال کیا تو کہا: ہاں، محتمل ہے۔[4] واللہ أعلم

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٥٣١_ ٥٣٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٠٦_ ٣٠٧)

[2] تفسير الصنعاني (٢/ ٢٣٢) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٨٨) اس کی سند میں "بجیر بن ابی بجیر" مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٧٣٦)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٠٧_ ٣٠٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ ثمود ایک قبیلہ ہے جو اپنے باپ کے نام سے مشہور ہوا۔ثمود بن عاد بن ارم بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح۔ صالح علیہ السلام بن عبید بن اسف بن ماسح بن عبید بن حاذر بن ثمود ہیں۔ حجاز اور شام کے درمیان میں ایک جگہ تھی، جس کا نام حجر تھا، وہاں ان کے گھر بار تھے جو وہاں سے لے کر وادیِ قریٰ تک پھیلے ہوئے تھے۔ ابوعمرو بن العلا رحمہ اللہ نے کہا کہ ثمود نام اس لیے ہوا کہ ثمد تھوڑے پانی کو کہتے ہیں، وہاں پانی بہت کم تھا۔[1]

صالح علیہ السلام ان کے برادرِ دینی تھے نہ کہ برادرِ نسبی۔ثمود اور ہود کے درمیان سو سال کا فاصلہ ہے۔ صالح علیہ السلام کی عمر دو سو اسی برس ہوئی، انھوں نے ثمود سے کہا تھا کہ تمھارے پاس اللہ کی نشانی آئی ہے، یعنی معجزہ ظاہرہ اور برہانِ جلی کہ ایک سخت ٹھوس پتھر سے ناقہ نکلی۔ ثمود نے صالح علیہ السلام سے کہا تھا کہ کوئی نشانی دکھاؤ، اگر سچے ہو! انھوں نے کہا: اچھا باہر نکلو، ایک پست پہاڑ پر لے گئے، اس میں ایسی آواز آئی جیسے حاملہ جننے کے وقت کراہتی ہے، اتنے میں پتھر پھٹ گیا، اس کے بیچ میں سے ایک ناقہ نکلی۔ صالح علیہ السلام نے کہا: لو یہ اللہ کی ناقہ نشانی ہے تمھارے واسطے، یہ خطاب کچھ پہلا خطاب نہیں تھا، اس سے پہلے بھی انھیں بہت کچھ نصیحت کر چکے تھے، جس طرح اللہ نے سورت ہود میں ذکر فرمایا ہے: ﴿ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا ﴾ [هود: ٦١] ''اسی نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اسی نے تمھیں اس میں آباد کیا۔''

ناقہ کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے ہے کہ ناقہ کی عزت اور تکریم مقصود ہے۔ اس لیے کہ وہ اونٹنی صالح علیہ السلام کی سچائی ظاہر کرنے کے لیے تھی کہ وہ بغیر نر اور مادہ کے پہاڑ کے ایک ٹھوس پتھر سے نکلی جو ہر لحاظ سے مکمل پیدائش تھی، بغیر حمل اور تدریجی عمل کے۔ کہا اے لوگو! تم اس کو چھوڑ دو، جہاں چاہے اللہ کی زمین میں چرتی پھرے، کیوں کہ جب یہ اللہ کی ایک نشانی ٹھہری تو اس سے تعرض نہ کرنا واجب ہوا۔ یہ اونٹنی اللہ کی ہے۔ یہ زمین بھی اللہ کی ہے، تم اس کے منع کرنے والے کون ہو؟! تم اس کو ہاتھ نہ لگاؤ، کسی طرح کی ایذا نہ دو، اگر دو گے تو سخت عذاب آئے گا۔

ذرا سوچو کہ اللہ نے کس طرح تم کو عاد کے بعد اس زمین کا خلیفہ کیا، بادشاہ بنایا، اس سرزمینِ حجر میں تم کو بسایا، تم یہاں کی نرم زمین سے مٹی لے کر محل تعمیر کرتے ہو اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو، کیوں کہ وہ لوگ اپنے طاقت ور ہونے اور اپنے جسموں کی سختی کی بنا پر پہاڑوں میں غاریں بنا کر رہتے تھے۔ اس لیے کہ گھر اور گھروں کی چھتیں ان کی عمر سے پہلے ہی فنا ہو جاتے تھے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک ایک کی عمر تین سو برس سے ہزار ہزار برس تک کی ہوتی تھی۔ یہی حال ہود علیہ السلام

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٤٧)

کی قوم کا تھا[1] کہ وہ لوگ آسودہ حال اور مال دار تھے۔ صالح علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم اللہ کو یاد کرو، زمین میں فساد نہ کرتے پھرو، قوم کے سرداروں نے مومنین سے کہا، جو غریب اور ضعیف لوگ تھے کہ تم صالح کو رسول برحق جانتے ہو، مگر ہم اس کے منکر ہیں، اسی بنیاد پر ناقہ عقر کرنے کا ارادہ کیا۔ عقر بمعنی زخم لگانا یا کوئی عضو کاٹنا، جس سے اس کی جان کو خطرہ ہو یا اونٹ کی کونچ کاٹنا۔ جب ناقہ عقر کیا تو اس کا بچہ بھاگا، وہی پتھر جس سے ناقہ نکلی تھی، کشادہ ہو گیا، اس کے اندر وہ گھس گیا، بعض کے نزدیک وہ بچہ بھی مارا گیا، کہنے لگے: اے صالح! اگر تم رسول ہو تو اپنا وعدہ سچ کر دکھاؤ، غرض کہ نزولِ عذاب کے لیے جلدی کی، چاہا کہ بلاجھٹ پٹ اترے، یہ ان کا صالح علیہ السلام کے ساتھ استہزا تھا، کیوں کہ وہ ان کو جھوٹا سمجھتے تھے، آخر اللہ پاک نے ان کے اس استہزا اور سرکشی پر عذاب نازل کیا۔ بہت بڑا اور سخت زلزلہ برپا ہوا، ایک چنگھاڑ سخت پیدا ہوئی، جس سے ان کے دل پھٹ گئے، یا اوپر سے صیحہ (سخت چیخ) اور نیچے سے رجفہ (زلزلہ) ہوا، جس طرح دوسری آیت میں آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر جگہ میں ایک ہی قسم کا عذاب ذکر فرمایا۔ اصل میں دونوں ہی عذاب واقع ہوئے۔[2] واللہ أعلم.

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾

تب صالح نے ان سے منہ پھیرا اور کہا: اے میری قوم! بے شک میں نے تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا تھا اور میں نے تمھیں نصیحت کی تھی، لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے (79)

صالح علیہ السلام کا قوم کو ملامت کرنا اور ان سے اعراض کرنا:

یہ صالح علیہ السلام کی طرف سے قوم کو ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش ہے کہ جیسا تم نے کیا، ویسا پایا، یہ تمھاری سرکشی اور انکار کا بدلہ ہے اور ہدایت سے منہ موڑ لینے کا جو تم نے حق کو قبول کرنے سے کیا۔ یہ بات ان کے ہلاک ہونے کے بعد فرمائی اور وہ سنتے تھے۔ جس طرح صحیحین میں آیا ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ بدر پر غالب ہوئے تو تین دن تک وہاں قیام فرمایا، پھر سواری کسنے کا حکم دیا۔ تیسرے دن آخر شب کو سوار ہو کر چلے۔ جب بدر کے کنویں پر آئے تو کھڑے ہو کر فرمایا: اے ابوجہل بن ہشام! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! اے فلاں بن فلاں! کیا تم نے وہ وعدہ سچ پایا جو تمھارے رب نے کیا تھا؟ بے شک میں نے اپنے رب کے وعدے کو سچ پایا! عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ اس قوم سے بات کر رہے ہیں جو مردار ہو چکی ہے؟ فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو کچھ میں ان سے کہہ رہا ہوں تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے۔[3]

---

[1] تفسير البغوي (٤/ ١٨٥) [2] فتح البيان (٤/ ٣٩٥۔ ٤٠٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٤)

سیرت میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تم نبی کا برا کنبہ ہو، تم نے مجھ کو جھٹلایا، لوگوں نے مجھ کو سچا کہا، تم نے مجھ کو نکالا، یعنی شہر سے، لوگوں نے مجھ کو جگہ دی، تم مجھ سے لڑے، لوگوں نے میری مدد کی ''فَبِئْسَ عَشِيْرَةُ النَّبِيِّ كُنْتُمْ لِنَبِيِّكُمْ'' [1] ایک صالح علیہ السلام تھے، جنھوں نے اپنی قوم سے کہا: ﴿ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ﴾ (آیتِ باب) یعنی تم کو کہنے سے فائدہ نہیں ہوا، کیوں کہ تم حق کو نہیں پہچانتے اور نہ نصیحت کرنے والے کی بات مانتے ہو۔ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے، جس نبی کی امت ہلاک ہوئی وہ آ کر حرم میں مقیم ہوا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا گزر وادیِ عسفان پر حج کے وقت ہوا، کہا: اے ابوبکر! یہ کون سی وادی ہے؟ کہا: وادیِ عسفان۔ فرمایا: یہاں سے ہود اور صالح علیہما السلام گزرے ہیں، ان کی اونٹنیوں پر درخت کی چھال کی لگام تھی، ان کی ازاریں عبائیں، ان کی چادریں پوستین کی تھیں، لبیک کہتے ہوئے آئے اور بیتِ عتیق کا حج کیا۔ [2] (رواہ أحمد) یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے، اسی لیے کسی نے اس کو روایت نہیں کیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب صالح علیہ السلام ان کے دعوت قبول کرنے سے ناامید ہو گئے تو پھرے یا قوم کے ہلاک ہونے کے بعد پھرے، پھر ان کی موت کے بعد ان سے قول مذکور کہا۔ پرانی حکایت کی طرز پر جس طرح کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اہلِ قلیبِ بدر سے کہا تھا، یا عین عذاب کے نازل ہونے کے وقت ان کے ایمان کے فوت ہونے اور عذاب سے سلامت نہ رہنے پر یہ خطاب کیا، افسوس فرمایا۔ یہ خطاب اس لیے تھا کہ بعد والے عبرت پکڑ کر اس ناپسندیدہ طریقے سے باز آ جائیں۔ صالح نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اب تمھاری بقا میں تین دن ہیں، پہلے دن چہرہ زرد، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تیسرے دن ان کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا، کفن پہن کر حنوط (خوش بو) مل کر تیار ہوئے، چنگھاڑ نے آ کر سب کو ہلاک کر دیا۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا.

کہتے ہیں: قومِ صالح کے مومن لوگوں کی جماعت چار ہزار افراد تھے، جو ان کے ساتھ شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ جب حضر موت میں پہنچے تو صالح علیہ السلام کی موت کا وقت آ گیا، اس لیے وہ جگہ حضرت موت کہلائی، پھر انھوں نے چار ہزار شہر بنائے، جن کا نام حاضوراء رکھا۔ ایک قوم نے کہا: صالح کی وفات اٹھاون برس کی عمر میں مکے میں ہوئی۔ بیس برس قوم میں رہے۔ [3]

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ھشام (۳/ ۱۸۷)

[2] مسند أحمد (۱/ ۲۳۲) اس کی سند میں ''زمعہ بن صالح'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الترغیب والترھیب: ۱/ ۱۷۹)

[3] فتح البیان (٤/ ٤٠٠۔ ٤٠١)

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور لوط کو بھیجا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے بھی نہیں کی؟ (80) بے شک تم مردوں کے پاس آتے ہو جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہو (81)

لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ اور ان کی خرابی:

لوط بن ہاران بن آزر ابراہیم خلیل علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ ابراہیم کے ساتھ ایمان لائے، ان کے ساتھ ارضِ شام کی طرف ہجرت کی۔ اللہ نے ان کو اہلِ سدوم کی طرف مبعوث کیا۔ انھوں نے سدوم والوں کو اور اس کے ارد گرد گاؤں والوں کو اللہ کی طرف بلایا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت دی۔ انھوں نے ایسے ایسے گناہ اور بے حیائی کے کام اختراع کیے تھے کہ کسی نے بنی آدم میں سے نہ غیر بنی آدم میں سے ویسا کام کیا تھا۔ وہ بے حیائی کا کام یہ تھا کہ مردوں کے ساتھ صحبت کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جو کبھی آدم علیہ السلام کی اولاد میں نہیں ہوئی تھی، نہ بنی آدم کے دل میں اس کام کا خیال تک گزرا تھا، انھی اہلِ سدوم نے یہ برا کام ایجاد اور شروع کیا تھا۔ عَلَيْهِمْ لَعَائِنُ اللّٰهِ.

عمر بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم مرد کو مرد کے اوپر چڑھا ہوا نہیں دیکھتے سوائے قومِ لوط کے۔[1] ولید بن عبد الملک اموی خلیفہ جو جامع دمشق کے بانی ہیں، انھوں نے کہا کہ اگر اللہ عزوجل ہم کو قومِ لوط کی خبر نہ سناتا تو مجھے کبھی گمان نہ ہوتا کہ مرد بھی مرد پر سوار ہوتا ہے۔[2] اسی لیے لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم وہ کام کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو جن کو تمھارے رب نے تمھارے واسطے بنایا ہے، چھوڑ کر مردوں پر گرتے ہو، یہ تمھاری زیادتی اور جہالت ہے، کیوں کہ یہ کسی چیز کو اس کے مقام کے سوا رکھنا ہے۔ اسی وجہ سے دوسری آیت میں کہا: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴾ [الحجر: ۷۱] ''یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں (ان سے نکاح کر لو) اگر تم (کچھ) کرنے والے ہو۔'' یعنی ان کو یہ ہدایت کی کہ تم عورتوں سے ملو۔ انھوں نے کہا: کہ ہم کو عورتوں کی خواہش نہیں ہے، نہ تمھاری بیٹیوں میں ہمارا کچھ حق ہے، تم ہمارے ارادے کو جانتے ہو، یعنی ہماری مراد تمھارے یہ مہمان ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ان میں مرد بعض بعض سے بے نیاز تھے اور اسی طرح عورتیں بعض بعض سے مستغنی تھیں، یعنی مرد مرد سے اور عورت عورت سے کام نکالتے تھے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۲/ ۵٤۸) [2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۰۹)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ لوط خلیل جلیل علیہ السلام کے برادر زادہ ہیں، بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔ خلیل اور لوط علیہما السلام دونوں بابل عراق میں تھے، شام کی طرف ہجرت کی۔ ابراہیم علیہ السلام زمینِ فلسطین میں اترے، لوط علیہ السلام اردن میں نازل ہوئے۔ اردن شام کا ایک گاؤں ہے، اللہ نے ان کو ایک امت کی طرف بھیجا جس کو سذوم کہتے تھے، بذالِ معجمہ۔ وہ حمص کا ایک شہر تھا۔ لوط علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ اس بے حیائی کے کام میں گرفتار ہو کر مردوں کے پیچھے آتے ہیں، ان کو اس فعل سے منع کیا اور سخت ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا: کم بختو! تم سے پہلے یہ کام تو کسی نے بھی نہیں کیا، یہ اس لیے کہا کہ پہلی امتوں میں سے کسی امت میں یہ ناپاک خصلت نہیں تھی، یہ بلا اسی قوم نے نکالی تھی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس کام کا شروع اس طرح ہوا کہ ابلیس ایک خوب صورت لڑکے کی شکل میں، جس کو لوگوں نے دیکھا ہو، بن ٹھن کر ان کے پاس آیا اور ان کو اپنی طرف بلایا، انھوں نے اس سے وہ فعلِ بد کیا، تب سے لواطت کا راستہ چل نکلا۔[1]

آیتِ باب اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس حرکتِ بے برکت سے صرف شہوت کو پورا کرنے کے سوا کوئی غرض نہ تھی، جس کو عقل تسلیم کرے۔ وہ اس فعل میں جانوروں کی طرح تھے کہ ایک دوسرے پر شہوت کی خاطر جست کرتا تھا۔ وہ خفیہ شرم گاہیں جو شہوت پورا کرنے کی مناسب جگہ اور لذت حاصل کرنے کا مقام اور نتیجہ حاصل کرنے کی جگہ ہیں اور اللہ نے ان کو شرع شریف کے مطابق مردوں پر حلال کیا ہے، انھیں چھوڑ کر مردوں کو استعمال کرتے تھے۔ عورتوں کی فروج کے بجائے مردوں کی ادبار (پیٹھوں) پر گزرتے تھے۔[2]

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور اس کی قوم کا جواب بس یہی تھا کہ انھوں نے کہا: انھیں اپنی بستی سے نکال دو، بے شک یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں (82)

قوم کا جواب:

یعنی لوط علیہ السلام کی بات کا کچھ جواب نہ بنا، یہ ارادہ کیا کہ ان کو ان کے ساتھیوں کے ہمراہ جو وہاں موجود ہیں، دیس نکالا دیا جائے اور ان کو شہر سے باہر نکال دیں۔ اس پر اللہ پاک نے لوط علیہ السلام کو صحیح سالم رکھا، انہی کو ان کی زمین میں ذلیل وخوار کر کے تباہ و ہلاک کر دیا۔ قوم نے کہا تو یہ کہا کہ یہ لوگ متطہر ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی بے عیبی کا عیب لگایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی ادبارِ رجال اور ادبارِ نسا سے بچتے اور الگ رہتے ہیں، اسی طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[3]

[1] تاریخ دمشق (٥٠/ ٣١٣) الدر المنثور (٣/ ٤٩٦) [2] فتح البیان (٤/ ٤٠٢۔ ٤٠٣) [3] تفسیر الطبري (١٩/ ٤٨٢۔ ٤٨١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جو لوگ اس بے حیائی میں آلودہ اور گرفتار تھے، انھوں نے لوط علیہ السلام کے منع کرنے کے جواب میں یہ پکا ارادہ کیا کہ اس شخص کو سذوم، جو ملکِ شام کے شہر حمص کا ایک قریہ تھا، اس کی طرف نکال دو، یہی ارادہ گویا ان کی بات کا جواب تھا جو انصاف کے تقاضوں کے بالکل خلاف ہے۔ ان پر یہ قصور لگایا کہ یہ لوگ ادبارِ رجال اور نسا سے پاک صاف رہتے ہیں، یہ اس لائق نہیں کہ ہماری بستی میں بسیں یا یہ بات بطورِ مذاق یا استہزا کے کہی تھی۔ نافرمانیوں اور گناہوں سے دور رہنے کو طہارت بولتے ہیں، جو شخص گناہ سے الگ رہا وہ متطہر ہے۔[1]

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

پھر ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو نجات دی، سوائے اس کی بیوی کے، وہ پیچھے رہنے (ہلاک ہونے) والوں میں شامل ہوگئی (83) اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش برسائی، چناں چہ دیکھ لیجیے مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ (84)

عذاب سے بچنے والے:

مطلب یہ کہ لوط اور ان کے گھر والے بچ گئے۔ ان کے اہلِ بیت کے سوا اور کوئی ان پر ایمان بھی نہ لایا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [الذاريات: ٣٦] ''اور ہم نے وہاں مسلمانوں کا صرف ایک ہی گھرانہ پایا۔'' مگر ان کی عورت کہ وہ ایمان نہ لائی تھی، اپنی قوم کے دین پر تھی۔ وہ قوم کو اسی فعل پر مائل کرتی، جو کوئی مہمان لوط علیہ السلام کے پاس آتا جاتا ان کو خبر دیتی، آپس میں کچھ اشارات مقرر کر لیے تھے، اسی لیے جب لوط علیہ السلام کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے اہل کو لے کر باہر نکلیں تو یہ حکم بھی ہوا کہ وہ عورت نہ جائے، نہ اُس کو شہر سے باہر نکالیں، بعض نے کہا ہے کہ وہ خود ہی ان کے پیچھے لگ گئی تھی، جب عذاب نہ آیا اور اُس نے منہ پھیر کر دیکھا تو وہ عذاب اس کو بھی آ لگا، لیکن اظہر یہ ہے کہ وہ شہر ہی میں رہی، باہر نہیں آئی نہ اس کو معلوم ہوا کہ لوط علیہ السلام نکل کر جا رہے ہیں، وہ قوم کے ساتھ رہ گئی، اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا کہ اُس کی عورت باقی رہ گئی، بعض نے کہا نہیں بلکہ وہ ہلاک ہوگئی۔

عذاب کی صورت:

یہ تفسیر برسنے کی تفصیل کے ساتھ لازم ہے۔ دوسری آیت میں تفصیل اس طرح آئی ہے: ﴿ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴾ [هود: ٨٢۔ ٨٣] ''پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا تو ہم نے اس (بستی) کے اوپر والے (حصے) کو نیچے والا (حصہ) کر دیا اور ان پر کھنگر کے

---

[1] فتح البیان (٤/ ٤٠٤)

پتھر تہ بہ تہ برسائے۔ جو تمھارے رب کے ہاں سے نشان زدہ تھے۔ اور وہ (پتھر یا سزا یا بستی) ان ظالموں (قریش مکہ) سے دور نہیں۔'' اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ دیکھ مجرموں کا انجام کیسا ہوا، یہ خطاب نبیِ اکرم ﷺ کو ہے کہ جو لوگ گناہوں پر جرأت کرتے ہیں، اللہ کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، ان کا حال اسی طرح ہوتا ہے۔

لواطت کی سزا:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ لائط (قومِ لوط کا سا کام کرنے والا) کو پہاڑ ٹیلہ ٹیکری سے نیچے گرا کر پتھر سے چکنا چور کریں، جس طرح قومِ لوط سے کیا گیا تھا اور علما نے کہا ہے کہ سنگسار کیا جائے، خواہ وہ محصن (شادی شدہ) ہو یا غیر محصن۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک یہ قول بھی ہے مگر اس بات میں حجت وہ حدیثِ مرفوع ہے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس کسی کو تم پاؤ کہ قومِ لوط کا کام کرتا ہے تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔[1] (رواه أحمد و أبو داود والترمذي و ابن ماجه) دوسروں نے کہا وہ زانی کی طرح ہے، اگر محصن ہے، یعنی بیوی والا تو رجم کیا جائے گا اور اگر محصن نہیں ہے تو سو کوڑے لگائے جائیں گے، یہی پچھلا قول امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[2]

میں کہتا ہوں کہ نص کے وارد ہو جانے کے بعد جس میں کچھ تفاصیل نہیں ہیں، کسی کے قول و مذہب کی کیا حاجت ہے۔ سب سے مقدم رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ رہا عورتوں کی دبر میں آنا سو یہ لوطیت صغریٰ ہے، باجماعِ علما حرام ہے، سوائے ایک شاذ قول کے جو بعض سلف کا ہے۔ اس کام کی ممانعت میں بہت سی مرفوع احادیث آئی ہیں۔ سورت بقرہ کی تفسیر میں اس مسئلے پر کلام گزر چکا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ لوط سے وہ لوگ مراد ہیں جو نسلی لحاظ سے ان کے ساتھ متصل تھے یا ان کی دونوں بیٹیاں مراد ہیں، عورت مستثنیٰ رہی، اس لیے کہ وہ ایمان نہ لائی تھی۔ وہ کافرہ تھی، اللہ کے عذاب میں باقی رہ گئی۔ غَابِرَات اس لیے نہیں کہا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ تھی جنھیں عذاب کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ قومِ لوط چار لاکھ آدمی تھے، ان پر پتھر برسے جن میں آگ اور گندھک کا میل تھا۔ تو دیکھ کہ انجام مجرمین کا کیسا ہوا۔ یہ خطاب صالح علیہ السلام کو ہے یا خاص نبیِ اکرم ﷺ کو ہے۔ سورت ہود میں یہاں سے مفصل تر اور زیادہ واضح آئے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ جبریل علیہ السلام نے اتر کر اپنا بازو قومِ لوط کے شہروں کے نیچے داخل کر کے ان شہروں کو جڑ سے اکھاڑ کر اور آسمان کی طرف اٹھا کر اوندھا کر کے نیچے گرایا، ان کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا، پھر پتھروں کا مینہ برسایا۔[4]

---

① مسند أحمد (١/ ٣٠٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٨٩)

② تفسير ابن كثير (٢/ ٣١٠) ③ رقم الآية (٢٢٣)

④ تفسير الطبري (١٥/ ٤٤٠۔ ٤٤١) فتح البيان (٤/ ٤٠٤۔ ٤٠٥)

میں کہتا ہوں کہ قومِ لوط کا عمل اگر چہ اہلِ علم کی زبان پر لواط یا لواطت یا دیگر مشتقات کے ساتھ قدیماً و حدیثاً جاری ہو چکا ہے، لیکن قرآن و حدیث میں اس قسم کے مشتقات نہیں آئے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایک نبی اور رسول کے نام شریف سے ایک فعل قبیح کا اشتقاق (نسبت) کریں۔ جو لفظ اللہ اور رسول نے بولا ہے، یعنی عملِ قومِ لوط، وہی لفظ کیوں نہ اپنی بول چال میں رکھیں یا کسی اور مترادف معنی کے لفظ کو تلاش کریں، جیسے اغلام یا علت اُبنہ۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا
لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا
الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْـيَاۗءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۸۵

اور ہم نے اہلِ مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ گئی ہے، لہٰذا تم ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے مت دو، اور تم زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو (85)

شعیب علیہ السلام اور اہلِ مدین کا تذکرہ:

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدین والے سلالۂ مدین بن ابراہیم تھے۔ شعیب بن میکیل بن یشجر ہیں، ان کا نام سریانی میں بثرون تھا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مدین کا اطلاق قبیلہ پر اور مدینہ، یعنی شہر پر آتا ہے، یہ وہ شہر ہے جو معان کے نزدیک حجاز کے راستے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَمَّا وَرَدَ مَاۗءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ﴾ [القصص: ۲۳] ”اور جب وہ مدین کے پانی (کنویں) پر پہنچا تو اس پر اس نے لوگوں کا ایک گروہ پایا، وہ (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہے تھے۔“

قوم کا جرم اور شعیب علیہ السلام کی دعوت:

یہ لوگ ایکہ والے تھے، شعیب علیہ السلام نے ان کو اخلاصِ عبادت اور توحید کی طرف بلایا، یہی دعوت سارے رسولوں کی تھی، ان سے یہ بات کہی کہ اللہ نے میرے صدق پر اپنی حجتیں اور روشن دلیلیں قائم کر دی ہیں، سو تم لوگوں کے ساتھ لین دین میں کمی بیشی نہ کیا کرو کہ یہ ایک طرح کی مالوں میں خیانت ہے، بخس ماپ تول میں چپکے سے کمی

کرنے کو کہتے ہیں، اس کا مقصد دھوکا دینا ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓىِٕكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [المطففين: ١۔ ٦] ”ڈنڈی مارنے والوں کے لیے تباہی ہے۔ وہ کہ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں۔ اور جب وہ انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ بے شک وہ (قبروں سے) اُٹھائے جائیں گے۔ ایک عظیم دن کے لیے۔ جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔“[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ مدین قبیلے کا یا شہر کا نام ہے، پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ باپ کے نام پر قوم مشہور ہوئی۔ مدین ابراہیم علیہ السلام کے فرزند تھے، جس طرح بکر و تمیم آبا کے نام کے ساتھ معروف ہیں۔ یا مدین اس پانی کا نام ہے جس کے قریب وہ رہتے بستے تھے یا دونوں باتوں میں مشترک ہے۔ شعیب میکائیل بن یشجب بن مدین بن ابراہیم کے فرزند ہیں۔ یہی امام عطاء اور ابن اسحاق رحمہما اللہ وغیرہما کا قول ہے۔ شرقی بن القطامی نے کہا ہے کہ شعیب بن عیفا بن ثویب بن مدین ہیں۔ ابن سمعان نے زعم کیا کہ شعیب بن مکیل بن شجر بن مدین ہیں، مکیل کی ماں لوط علیہ السلام کی بیٹی تھیں۔ شعیب گویا لوط علیہ السلام کی نواسی کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا کہ شعیب بن شیرون بن مدین ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ شعیب بن صفوان بن عیفا بن ثابت بن مدین ہیں۔[2] یہ سب سات قول ہوئے شعیب علیہ السلام کے نسب کے بارے میں۔ واللہ أعلم.

شعیب علیہ السلام کا دو بار مبعوث ہونا:

امام عکرمہ و سدی نے کہا کہ اللہ نے کسی نبی کو دو بار مبعوث نہیں کیا مگر شعیب علیہ السلام کو۔ ایک دفعہ مدین کی طرف بھیجا۔ مدین والے چنگھاڑ سے ہلاک ہوئے، دوسری دفعہ اصحابِ ایکہ یعنی بن والوں کی طرف بھیجا، ان پر عذابِ یوم الظلہ آیا۔[3] شعیب علیہ السلام آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ان کو خطیب الانبیا کہتے تھے، اس لیے کہ قوم کو بہت مستحسن جواب دیتے تھے۔ حسنِ مراجعت فرماتے تھے۔ ان کی قوم کافر تھی، ماپ تول میں کمی کرتے، غرض کہ انھوں نے قوم کو خالص اللہ کی عبادت کی طرف بلایا، کہا: دیکھو تمھارے پاس بیّنہ آ چکا، یعنی معجزہ، مگر اس کا بیان قرآن مجید میں نہیں کیا ہے، جس طرح کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر معجزات کا ذکر بھی نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ معجزے سے مراد خود ذاتِ شعیب علیہ السلام ہیں۔ یا معجزے سے مراد ناپ اور تول کو پورا کرنا تھا۔ وہ لوگ اسی قسم کی اجناس کا معاملہ کرتے تھے، لین دین کا بیوپار تھا، اس میں کمی کرتے، ان کو اس بے برکت حرکت سے منع کیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٠١) [2] فتح القدیر (٢/ ٣١٦۔ ٣١٧) [3] الدر المنثور (٣/ ٥٠٢)

ظاہر آیت یہ ہے کہ وہ اشیا میں بخس ونقص کرتے تھے، بخس اس طرح پر ہوتا ہے کہ مال میں کچھ عیب نکال دیا یا بے رغبتی ظاہر کی، یا مالکِ مال کو فریب دیا، یا کوئی حیلہ نکالا، کیوں کہ یہ باطل کے ساتھ اکلِ مال ہے، یعنی مال کھانے کے باطل طریقے۔ بعض نے کہا کہ وہ سب مکاس تھے جو کچھ ان کے بازاروں میں آتا، اُس پر محصول لیتے تھے۔ یہ جو فرمایا کہ زمین میں بعد اصلاح کے فساد نہ کرو سو مراد اصلاح سے یہ ہے کہ اللہ نے رسول بھیجے، عدل قائم کیا۔ شعیب علیہ السلام کے اُس سرزمین میں رسول ہو کر آنے سے پہلے وہاں معصیت کے اعمال ہوتے تھے۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزیں حلال تھیں، خون ریزی ہوتی تھی، یہ زمین کا فساد تھا جب انھوں نے ان کو اللہ کی طرف بلایا تو زمین صالح ہوگئی، جو نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہوتا ہے وہی اس قسم کی اصلاح ہے۔ اس طرح اب نبوت اور رسالت کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد جو عالمِ کتاب و سنت جس گاؤں، قصبے یا شہر میں خلق کو خالص توحید، عبادت، اتباع اور کتاب وسنت کی دعوت دیتا ہے، وہی اس سرزمین اور اس جگہ کے لوگوں کی اصلاح ہے۔ اگر انھوں نے اُس وعظ و نصیحت اور ارشاد و ہدایت پر عمل کیا، فساد دور ہوا اور صلاحیت آئی اور اگر عمل نہ کیا تو اللہ کی حجت تمام ہوگئی، عالم حق بات پہنچا دینے پر بری الذمہ ہوگیا، وہ لوگ مجرم لائقِ عذاب وعقاب ٹھہر گئے۔[1] اللهم احفظنا.

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۸۶ وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۷

اورتم ہر ایک راستے پر مت بیٹھو، تم اس شخص کو ڈراتے اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو جو اس پر ایمان لے آئے، اور تم اس راہ میں ٹیڑھ تلاش کرتے ہو اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، پھر اس نے تمھیں زیادہ کر دیا۔ اور دیکھو! فسادیوں کا انجام کیسا ہوا تھا؟ (86) اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس حکم پر ایمان لے آئے ہیں جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور کچھ دوسرے ایمان نہیں لائے ہیں تو تم ذرا صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (87)

راہزنی سے ممانعت:

شعیب علیہ السلام نے ان کو حسی اور معنوی دونوں طرح کی رہزنی سے منع کیا، کیوں کہ وہ لوگوں کو دھمکاتے تھے کہ تم

[1] فتح البیان (٤/ ٤٠٥۔ ٤٠٧)

ہم کو مال نہ دو گے تو ہم تم کو قتل کر ڈالیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا کہ وہ عشار تھے، یعنی مکاس ہر چیز کا محصول لینے والے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا کہ وہ ان مومنین کو جو شعیب علیہ السلام کے پاس آتے جاتے تھے، ڈرایا کرتے تھے،[1] مگر پہلا قول زیادہ ظاہر ہے، اس لیے کہ ہر راہ پر بیٹھنے کا ذکر کیا ہے۔

رہی دوسری قسم قطع طریق کی سو وہ یہ تھی کہ جو کوئی ایمان لانا چاہتا اس کو مومن بننے سے روکتے اور باز رکھتے تھے۔ چاہتے تھے کہ اللہ کی راہ ٹیڑھی رہے۔ شعیب علیہ السلام نے ان کو ان دونوں کاموں سے منع فرمایا، اللہ نے ان کو یہ بات بتائی کہ تم پہلے قلت کی وجہ سے کمزور تھے، پھر کثرتِ عدد کی وجہ سے عزیز وقوی ہو گئے۔ اللہ کی اس نعمت کا شکر ادا کرو۔ دیکھو جو اگلی امتوں میں مفسد تھے، ان کی کیا گت ہوئی، کیسا عذاب اور سزا ان پر اتری، آخر اس کا سبب یہی تھا کہ انھوں نے اللہ پر جرأت کی، رسولوں کو جھٹلایا، معاصی سے باز نہ رہے۔ پھر کہا: تمھارا حال میرے دعوے کی نسبت مختلف ہے، ایک گروہ ایمان لایا تو دوسرا ایمان نہ لایا، سو ذرا صبر کرو، اللہ کے فیصلے تک، اس اختلاف کا فیصلہ وہی احکم الحاکمین کرے گا، یعنی متقیوں کا انجام نیک، کافروں کا انجام ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہاں صراط سے مراد راہ ہے۔ وہ لوگ ان راہوں پر بیٹھتے جو شعیب علیہ السلام کی طرف جاتی تھیں، یعنی ان کے گھر کے رستوں پر گلی کوچوں پر بیٹھ کر جس کو اس طرف جاتے دیکھتے، دھمکاتے، ڈراتے، کہتے: تم کدھر جاتے ہو، وہ تو بڑا جھوٹا ہے، جس طرح کہ قریش اسی طرح کا برتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے تھے۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ، مجاہد اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ دین کے راستے پر بیٹھ جانا ہے، یعنی جو کوئی دین پر چلنے کا ارادہ کرتا، اس کو روکتے، حقیقتاً کسی راہ پر بیٹھنا مراد نہیں۔

لفظ ﴿ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ اسی کی تائید کرتے ہیں۔ بعض نے کہا: راستے پر بیٹھ کر لوگوں کا مال لے لینا یا سلب کرنے سے ممانعت ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ راہ زنی اور غارت گری نہ کرو، کیوں کہ وہ لوگ یہ دونوں کام کرتے تھے۔ کسی نے کہا: عشار مکاس تھے۔ راہوں میں بیٹھ کر ہر ناکے پر لوگوں کا مال لیتے۔ پہلا قول صحت کے زیادہ قریب ہے، اگرچہ یہ سب اقوال نہی پر محمول ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ تم رستوں پر بیٹھ کر لوگوں کو نہ ڈراؤ۔ وہ کس چیز کا ڈر بتاتے تھے، اس کا ذکر نہیں کیا، تاکہ خیال ہر طرف جائے۔ روکنے سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اس راہ پر بیٹھے ہوتے جو شعیب علیہ السلام تک پہنچتے تھے تو یہ ان کو منع کرتے کہ تم ادھر نہ آؤ، یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ شعیب علیہ السلام کے پاس جانے سے منع کرنا یہی اللہ کی راہ سے روکنا تھا، وہ چاہتے تھے کہ یہ سیدھا کج ہی رہے۔ کوئی راست باز نہ ہو۔

---

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٥٥٧) [2] تفسير القرطبي (٧/ ٢٤٩)

پھر اللہ نے ان کو اپنی نعمت یاد دلائی کہ تم نسل، قوت اور غنا میں بہت تھوڑے تھے، پھر ان سب امور میں بہت سارے ہو گئے۔ تم کو اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے نہ ناشکری۔ اور گذشتہ لوگوں کے حال میں غور کرو کہ جب انھوں نے اللہ پر سرکشی کی، رسولوں کا کہنا نہ مانا، گناہوں پر جمے اور اڑے رہے تو ان کا انجام کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا، اپنا عذاب ان پر نازل کیا، اب ان کا کچھ اتا پتا بھی نہیں چلتا کہ یہاں گئے۔ تم سے قریب لوط علیہ السلام کا زمانہ تھا اور کچھ نہیں تو انہی کی قوم کا انجام دیکھو کہ کس طرح آسمان سے پتھر اور خاک ہوا میں مل گئے، نشان تک باقی نہ رہا اور یہ جو تم میں سے ایک گروہ میری رسالت پر ایمان لے آیا ہے اور اس نے احکامِ شرعیہ کو سچے دل سے قبول کر لیا اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لایا، سو تم صبر کرو اور منتظر رہو، اللہ تمھارے درمیان فیصلہ کر دے گا، وہ سارے حاکموں سے بہتر ہے۔

شعیب علیہ السلام کا یہ بیان بہت سخت ڈانٹ اور بری تاکید والی وعید کے طور پر تھا، یہ مطلب نہیں کہ تم کفر پر شاکر رہو۔ اللہ کا حکم فریقین کے درمیان یہی ہے کہ جو لوگ حق پر چلنے والے ہیں، انہی کی مدد کی جائے گی اور مبطلین (باطل پر چلنے والے اور حق کو نہ ماننے والے) کے لیے عذاب۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴾ [التوبة: ٥٢] ''چناں چہ تم انتظار کرو، بے شک ہم بھی تمھارے ساتھ منتظر ہیں۔'' یا مومنوں کو حکم ہے کہ تم کافروں کی ایذا دہی پر صابر رہو، یہاں تک کہ اللہ تمھاری مدد کرے۔ یا خطاب دونوں فریق کو ہے، یہی ظاہر ہے۔[1] اس آیتِ شریفہ پر قرآن مجید کا آٹھواں پارہ ختم ہوا۔ وللہ الحمد.

آج تیس رمضان المبارک ۱۳۰۳ ہجری روز یک شنبہ ہے۔ ایک بجے دن کے یہ ترجمہ مکمل ہوا۔ والحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذلك.



[1] فتح البیان (٤/ ٤٠٧۔ ٤٠٨)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿88﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿89﴾

اس کی قوم میں سے جو سردار تکبر کرتے تھے، انھوں نے کہا: اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے یا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ گے۔ شعیب نے کہا: کیا (ہم تمھارے دین میں آجائیں) اگرچہ ہم (اس سے) کراہت کرتے ہیں؟ (88) ہم نے (گویا) اللہ پر جھوٹ باندھا اگر ہم تمھارے دین میں لوٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے اور ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس میں لوٹ آئیں، مگر یہ کہ اللہ، ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے گھیر رکھا ہے، ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا ہے۔ (اور ہم دعا کرتے ہیں) اے ہمارے رب! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر، اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (89)

قوم کا فیصلہ:

اللہ پاک نے خبر دی کہ کفار نے اپنے نبی شعیب علیہ السلام سے اور جو لوگ ان پر ایمان لائے تھے، ان سے منہ در منہ یہ بات کہی کہ ہم تم کو اس گاؤں سے نکال دیں گے یا زبردستی تم کو اپنی ملت سے ملائیں گے، جو کام ہم کرتے ہیں اس میں تم کو بھی داخل کریں گے۔ خطاب تو رسول کو ہے مگر اتباع رسول مراد ہیں جو ملتِ رسول پر تھے۔ شعیب علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم باوجود ہماری بیزاری کے ایسا کام کرو گے، ہم اگر تمھاری ملت میں داخل ہوئے تو سمجھو کہ ہم نے اللہ پر بہتان باندھا، اللہ کے لیے شریک و برابر ٹھہرائے، اس کہنے میں اپنی نفرت ان کے اتباع سے ظاہر کی، پھر کہا یہ اور بات ہے کہ اللہ ہی یوں چاہے کہ ہم گمراہ ہو جائیں، تمھارے دین میں داخل ہوں، اللہ کی طرف سے یہ رد نہایت مستقیم ہے، کیونکہ وہ ہر شے کو جانتا ہے، اس کا علم ہر شے کو محیط ہے، ہمارا بھروسا اللہ پر ہے۔ پھر اللہ سے دعا مانگی کہ اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان انصاف کر دے، تُو بہتر حاکم ہے، تیرے انصاف میں ہر گز ظلم نہیں ہوتا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ قوم کے کفار نے صرف ایمان کے ترک کر دینے اور اسلام کی دعوت کو قبول نہ کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ سرکشی، غرور اور شرارتوں سے الٹا ان کو اور مومنوں کو ڈرایا دھمکایا کہ یا تو ہم تم کو اس شہر سے خارج کر دیں گے یا تم ہمارا دین قبول کرو، ان دو کاموں میں سے ایک کام ضرور ہوگا۔ اصل مقصود ان کا ملتِ کفریہ کی طرف لوٹانا تھا، بستی سے نکال دینے اور جلا وطنی کا ذکر تو انھوں نے صرف بطور قسر (زبردستی) و اِلجاء (سپرداری) کے کیا تھا۔ اسی لیے شعیب علیہ السلام نے نکالے جانے کا جواب نہ دیا۔ شعیب کا نام زیادتِ تقریر کے لیے یا سرزنش کے لیے لیا۔ یہ انتہا درجے کی بے حیائی اور بے شرمی تھی۔

عود کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک حالِ اول کی طرف لوٹ جانا، دوسرے ایک حال موجود پر ہو جانا۔ اس جگہ یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ اور اگر معنی اول مراد لیں تو یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح پہلے تم خاموش تھے، اب بھی خاموش رہو، دینِ حق کی طرف دعوت نہ دو۔ رؤساے کفار کا اس کہنے سے کہ تم ہماری ملت میں پھر آؤ، عوام کو دھوکا دینا تھا کہ وہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ لوگ پہلے کفر پر تھے، اب انھوں نے اپنا دین بدل ڈالا ہے۔ شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھیں حق نہیں پہنچتا کہ تم ان دونوں امور کے بارے میں ہم سے زبردستی کرو۔ اس لیے کہ مُکرہ کو کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ زبردستی کی موافقت درحقیقت موافقت نہیں سمجھی جاتی، نہ اس قسم کا لوٹنا ملت کی طرف لوٹنا گنا جاتا ہے۔ اس تقریر سے وہ اشکال دور دفع ہوگیا ہے جو بہت سے مفسرین نے اس جگہ ذکر کیا ہے اور تطویل ذیل فرمائی ہے۔

یہاں افترا سے مراد شرک ہے، جب اللہ نے ہم کو شرک سے بچا لیا تو اب پھر دامِ شرک میں پھنسنا نہیں ہوسکتا اور نہ ہم کو ایسا کام کرنا چاہیے۔ ہاں اگر اللہ چاہے تو وہ اور بات ہے، کیونکہ اُس کا چاہا ہوتا ہے نہ کہ کسی اور کا چاہا، خواہ تم ہو یا ہم ہوں۔ یہی اہلِ سنت کا قول ہے۔ انبیا اور اکابر ہمیشہ سوئے عاقبت و انقلابِ امر سے ڈرتے رہتے تھے۔ خلیل جلیل علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ [إبراهيم: ٣٥] ''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا۔'' ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: «يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ»[1]

کسی نے کہا ہے کہ عود کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے ہمارا اس جگہ رہنا پسند نہ کیا تو اب ہم اس گاؤں میں پھر قدم نہ رکھیں گے، مگر یہ کہ اللہ چاہے تو لوٹ آئیں اور اگر نہیں تو نہیں۔ پھر اللہ کی وسعتِ علم کا ذکر کیا، اپنے توکل اور اللہ پر اعتماد کو ظاہر فرمایا، پھر فتح (فیصلے) کی دعا مانگی۔

فُتاحت بالضم (پیش کے ساتھ) بہ معنی حکومت ہے، اللہ کا حکم نہیں ہوتا مگر یہی کہ محققین (اہلِ حق) کو

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٨٧)

مبطلین (باطل پرستوں) پر نصرت حاصل ہو جس طرح قرآن پاک میں جا بجا یہ مضمون آیا ہے، گویا اس دعا کا مقصود یہ تھا کہ کافروں پر عذاب اترے اور منکروں پر اللہ کا انتقام نازل ہو۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ عمان قاضی کو فاتح وفتاح کہتے ہیں۔ لغت والوں نے کہا ہے کہ یہ لغت قبیلہ مراد کی ہے۔ امام قتادہ، سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے۔[1] جمہور مفسرین بھی اسی طرف گئے ہیں، کسی نے کہا ہے کہ لغت حمیر ہے، ظاہر یہ ہے کہ قومِ شعیب علیہ السلام کی لغت ہو۔[2] واللہ أعلم.

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝۹۰ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۱ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۲

اور اس کی قوم میں سے وہ سردار جنھوں نے کفر کیا تھا، کہنے لگے: اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو بے شک تم ضرور خسارہ پانے والے ہو گے (90) پھر انھیں زلزلے نے آ پکڑا، چناں چہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (91) جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ (یوں ہو گئے) جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ پانے والے تھے (92)

قوم کی سرکشی، پھر بدنصیبی اور عذابِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ نے قومِ شعیب کے کفر وتمرد کی خبر دی، جس گمراہی میں وہ تھے اور جس مخالفتِ حق پر اُن کے دلوں کی جبلت تھی، اُس کا ذکر کیا، اسی لیے انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ تم شعیب کے اتباع سے خستہ وخراب ہو جاؤ گے۔ سو جس طرح انھوں نے شعیب علیہ السلام کو ڈرایا تھا، اسی طرح زلزلے نے ان کو ہلا ہلا دیا۔ سورت ہود میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [هود: ٩٤] ”اور جب ہمارا حکم (عذاب) آیا تو ہم نے نجات دی شعیب کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے، اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں زبردست چیخ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔“ یہ ان کی اس وعید کے عوض ہوا جو وہ مومنوں کو بستی سے نکالنے کے بارے میں سنایا کرتے تھے۔

مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنے اس قول میں ”أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ ... الخ“ تکبر کیا تو صیحہ (چنگھاڑ) نے آ کر ان کو خاموش کر دیا۔ سورت شعرا میں ان کفار کے حال کے متعلق یوں خبر دی ہے: ﴿ فَكَذَّبُوْهُ

[1] تفسير الطبري (١٢/ ٥٦٣۔ ٥٦٥) [2] فتح البيان (٤/ ٤٠٩۔ ٤١٢)

﴿ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۚ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴾ [الشعراء: ۱۸۹] ''چناں چہ انھوں نے اسے (شعیب کو) جھٹلایا، تو انھیں سائے والے دن کے عذاب نے آن پکڑا، بے شک وہ بہت بڑے دن کا عذاب تھا۔'' یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے سیاقِ قصہ میں یوں کہا تھا: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ [الشعراء: ۱۸۷] ''تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا گرا دے۔'' اس پر یہ خبر دی کہ ان پر عذاب یوم الظلہ اترا، وہ عذاب یہ تھا کہ ایک بادل آیا، اُس میں چنگاریاں اور بھڑکتی آگ اور لپٹ تھی، پھر آسمان سے ایک چنگھاڑ ہوئی، پھر زمین سے زلزلہ اٹھا، سب کا دم نکل گیا، بدن ٹھنڈے پڑ گئے، اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ اللہ نے کہا: یا تو رسول اور اتباعِ رسول کو شہر سے نکالتے تھے یا خود ہی عذاب کے حلول کر جانے کے بعد ایسے ہو گئے کہ گویا کبھی اس جگہ رہے ہی نہ تھے۔ پھر ان کی بات کا جواب دیا کہ شعیب کو جھٹلانے والے خراب ہوئے نہ کہ ان کے تابع لوگ۔ وللہ الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ملأ سے مراد وہی مستکبرین ہیں یا کافروں کا کوئی اور گروہ جن کی طرف شعیب مرسل ہوئے (بھیجے گئے) تھے۔ انھوں نے شعیب علیہ السلام کے متبعین سے کہا تھا کہ اگر تم شعیب کے کہنے پر چلو گے تو دین دنیا دونوں برباد جائیں گی، دنیا کی بربادی یہی تھی کہ پورا تولنے اور ناپنے سے مالی نقصان ہوگا، سو اس کہنے پر زلزلہ یا صیحہ آیا، یا شروع میں صیحہ تھا، آخر میں زلزلہ ہو گیا، اس لیے ان کی ہلاکت کی اسناد کبھی قریب کے سبب کی طرف فرمائی اور کبھی دور کے سبب کی طرف۔

بہر حال تینوں مذکورہ عذاب ان کے لیے اکٹھے ہو گئے اور وہ مر کر رہ گئے۔ قصہ صالح علیہ السلام میں اس کی تفسیر گزر چکی ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے شعیب علیہ السلام کو اصحابِ ایکہ اور اہلِ مدین کی طرف بھیجا تھا، ایکہ والے بادل سے ہلاک ہوئے، مدین والوں پر زلزلہ آیا، جبریل علیہ السلام نے ایک ایسی چیخ ماری کہ سب مر گئے۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ سات دن تک ہوا بند رہی، پھر لو چلی اور سب ہلاک ہو گئے۔[1] گویا ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے، ایک دن بھی وہاں آ کر نہ ٹھہرے تھے۔ اس طرح عذاب نے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا۔ وہی خائب و خاسر رہے نہ کہ شعیب علیہ السلام اور ان کے ہمراہی۔[2]

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

پھر شعیب نے ان سے منہ پھیر کر کہا: اے میری قوم! یقیناً میں نے تو اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کی، پھر میں کافر قوم پر غم کیوں کھاؤں؟ (93)

---

[1] تفسیر البغوي (۳/ ۲۵۸) [2] فتح البیان (٤/ ٤١٢۔ ٤١٣)

قوم کو ملامت اور ان کے ہلاک ہونے پر عدم افسوس:

یعنی عذاب کے نزول کے بعد شعیب علیہ السلام وہاں سے چل دیے اور ان سے ڈانٹ اور سرزنش کے طور پر یوں فرمایا کہ میں نے تو اپنی رسالت کی ذمے داری ادا کر دی، تم نے نہ مانا، اب میں تم پر کیوں افسوس کروں؟

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ شعیب علیہ السلام کا وہاں سے نکلنا عذاب کے نازل ہونے سے پہلے یا بعد میں ہوا تھا۔ یہ دو قول ہیں جن کا ذکر قصۂ صالح علیہ السلام میں ہو چکا ہے۔

معلوم ہوا کہ کافروں اور سرکشوں کی ہلاکت پر غم نہیں کرنا چاہیے۔ شعیب علیہ السلام نے یہ بات ان کے ایمان نہ لانے پر بطورِ حسرت کے کہی تھی، اپنے دل کو یوں تسلی دی کہ یہ لوگ کفر کی وجہ سے اس لائق نہیں کہ ان پر غم کیا جائے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مسجدِ حرام میں دو قبریں ہیں: ایک اسماعیل علیہ السلام کی اور دوسری شعیب علیہ السلام کی۔ اسماعیل علیہ السلام کی قبر حجر میں ہے، شعیب علیہ السلام کی قبر حجرِ اسود کے مقابل ہے۔[1] وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام مکے میں آ کر فوت ہوئے، ان کے ہمراہ مومنین بھی آئے، ان سب کی قبریں دار الندوہ اور باب بنی سہم کے درمیان غربی کعبہ میں ہیں۔[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ وہ خطیب الانبیا تھے۔ اپنی قوم سے بہت شائستہ اور سنجیدہ گفتگو کرتے تھے۔[3] (أخرجه ابن أبي حاتم و الحاكم عن يعقوب ابن أبي سلمة مرفوعاً) قوم نے ان کو جھٹلایا، رجم اور شہر سے نکال دینے کا ڈر سنایا، اللہ پر سرکشی کی تو عذاب یوم الظلہ آیا۔[4]

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ۝۹۴ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹۵

اور جب بھی ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو اس بستی والوں کو تنگی اور سختی میں مبتلا کیا، تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں (94) پھر ہم نے (ان کی) بدحالی کو خوش حالی میں بدل دیا، یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے: ہمارے باپ دادا کو بھی سختی اور راحت پیش آئی تھی، تب ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر تک نہ ہو سکی (95)

---

(1) تاریخ دمشق (۲۳/ ۷۹) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' ضعیف راوی ہے۔
(2) تاریخ دمشق (۲۳/ ۷۹۔ ۸۰)
(3) تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱۵۲۲) مستدرك الحاكم (۲/ ۶۲۰) یہ روایت مرسل ہے۔
(4) فتح البیان (۴/ ۴۱۴)

گذشتہ اقوام کی آزمائش:

بندے کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کرے، اور جب گناہ راس آ گیا تو یہ اللہ کا بھلاوا ہے، پھر ہلاکت کا ڈر ہے، جیسے زہر کھایا، اُگل دے تو امید ہے کہ بچ جائے گا اور اگر پچ (یعنی ہضم ہو) گیا تو کام تمام ہوا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اگلی امتوں کے حالات کی خبر دی ہے کہ ہم نے ان کے پاس رسول بھیج کر ان کو جانچا تھا۔

"بأساء" سے مراد امراض و اسقام ہیں، ضراء سے مراد فقر اور حاجت ہے۔ یہ جانچ اس لیے تھی کہ وہ دعا اور گریہ و زاری کریں۔ اللہ کی نازل کردہ آزمائشوں اور تکلیفوں کے دور ہونے کے لیے دعا کریں اور گریہ و زاری کریں۔ پھر ان کا حال بدل دیا، انھیں آسودگی دے دی، یہ بھی ایک امتحان تھا۔ مرض اور تکلیف کے عوض صحت اور عافیت بخشی، فقر و حاجت کے عوض فراخی اور تونگری دی، تاکہ شکر ادا کریں، احسان مانیں، لیکن جب ان کو مال اور اولاد کی کثرت نصیب ہوئی تو یہ کہنے لگے کہ تکلیفوں اور تنگیوں کی خصوصیت کچھ ہمارے ساتھ ہی نہیں ہے۔ یہ حالت ہمارے آبا پر بھی گزر چکی ہے، اللہ نے اس کہنے پر یکایک ان کو پکڑ لیا اور وہ بے خبر رہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو دونوں طرح آزمایا، صحت اور بیماری سے اور فقیری اور تونگری سے، لیکن وہ کسی حال میں بھی اللہ کی طرف تضرع کرنے والے اور رجوع کرنے والے نہ ہوئے۔ بلکہ اپنے حال کی یوں تاویل کرنے لگے کہ یہ کچھ نئی بات نہیں ہے، گردش زمانے کی ہے، کبھی یوں ہوتا ہے اور کبھی ڈوں۔ اللہ کے حکم کو نہ سمجھے نہ اللہ کی آزمائش میں صبر کیا۔

مومن کا رویہ:

اہلِ ایمان کا رویہ دونوں حالتوں میں کافروں سے مختلف ہوتا ہے، جیسا کہ صحیحین میں آیا ہے: « عَجَباً لِلْمُؤْمِنِ لَا يَقْضِي اللّٰهُ لَهُ قَضَآءً إِلَّا كَانَ خَيْراً لَّهُ، إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْراً لَّهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْراً لَّهُ » "مومن کا معاملہ عجیب ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جو بھی فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے وہ بہتر ہوتا ہے، اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے، تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔"[1] سو مومن تنگی اور فراخی میں اللہ کی آزمائش کو سمجھ جاتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ مومن کو بلا (آزمائش) ہمیشہ لگی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں سے پاک صاف ہو کر نکلتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۹۹)

منافق کی مثال جیسے گدھے کی طرح ہے، وہ نہیں جانتا کہ اُس کو اس کے مالک نے کیوں باندھا، کیوں چھوڑا۔[1] بہرحال اللہ نے اچانک ان کو پکڑ لیا، وہ اپنے حال سے غافل تھے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اچانک موت مؤمن کے واسطے راحت ہے اور کافر کے لیے افسوس کی گرفت۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو کوئی نبی کسی گاؤں میں آیا ہے، ہم نے اس جگہ کے لوگوں کو تکلیفوں اور تنگیوں میں پکڑا کہ شاید وہ کفر اور جھٹلانے سے باز آ جائیں۔ پھر یہ ذکر کیا کہ ہم نے بستی والوں کو برائی کے عوض بھلائی عطا فرمائی، تکلیف کو آرام سے بدل دیا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہلِ معاصی کو کبھی شدت ہوتی ہے اور کبھی فراخی، عیش اور آرام۔ یہ ایک طرح کا استدراج ہے ان کے ساتھ۔ اسی لیے جب وہ لوگ مال و اولاد میں بڑھ گئے تو کہنے لگے پہلے ہم تکلیف میں تھے، اب ہم آرام میں ہیں، یعنی یہ ایک زمانے کی قدیم چال ہے، سلف و خلف میں اسی طرح پر ہی ہوتا آیا ہے، یہ اللہ کی طرف سے امتحان نہیں ہے۔ دشمنی، سرکشی اور زیادتی کی شدت پر اللہ نے ان کو سزا کی جلدی کی اور مہلت نہ دی، یکا یک ان کو پکڑ کر زیر و زبر کر ڈالا۔ ان کے عذاب میں تاخیر نہ کرنا یا مہلت نہ دینا اس لیے تھا کہ ان کی حسرت بڑھ جائے، جو کوئی اس قصے کو سنے وہ منزجر ہو (باز آ جائے)، عبرت پکڑے۔[3]

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ۝۹۶ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا
وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ۝۹۷ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا
ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۹۸ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ
اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹۹

اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی

---

① ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ روایت کا پہلا حصہ سنن وغیرہ میں مروی ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٩٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨١٥)

② مسند أحمد (٦/ ١٣٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٣١٢) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ عبداللہ بن عبید بن عمیر رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔ نیز "عبداللہ بن ولید وصافی" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٨٩٦)

③ فتح البيان (٤/ ٤١٥۔ ٤١٦)

برکتوں کے دروازے کھول دیتے، لیکن انھوں نے (دینِ حق کو) جھٹلایا تو ہم نے انھیں (ان کے برے عملوں کے باعث) پکڑ لیا جو وہ کرتے رہے تھے 96 کیا پھر بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو آجائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں؟ 97 یا بستیوں والے اس (بات) سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آجائے اور وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں؟ 98 کیا پھر وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہوگئے ہیں؟ اللہ کی تدبیر سے بے خوف تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو خسارہ پانے والے ہوں 99

ایمان اور تقوے سے برکتیں اترتی ہیں اور کفر سے نحوست:

اس آیت میں اہلِ قریٰ (بستی والوں) کی حالت کی خبر دی ہے، جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے مگر انھوں نے ان کی بات نہ سنی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [یونس: ۹۸] ''پھر کیوں نہ ہوئی کوئی بستی ایسی کہ وہ (عذاب سے پہلے) ایمان لائی ہو، پھر اس کے ایمان نے اسے نفع دیا ہو، سوائے قومِ یونس کے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے دنیاوی زندگی میں ذلت کا عذاب ٹال دیا، اور ہم نے ایک (مقرر) وقت تک انھیں (اس سے) فائدہ (اُٹھانے) دیا۔''

یعنی کوئی ایسا گاؤں اور شہر نہیں ہے جہاں کے سارے لوگ عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان لائے ہوں اور ان کا ایمان قبول کر لیا گیا ہو، یعنی ایمان ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا ہو۔ سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے کہ وہ عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان لے آئی تو ان سے عذاب دور کر دیا گیا، یعنی ان کا ایمان قبول کر لیا گیا اور یوں ایمان نفع مند ثابت ہوا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۝۱۴۷ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [الصافات: ۱۴۷۔ ۱۴۸] ''اور ہم نے اسے ایک لاکھ (انسانوں) کی طرف بھیجا، یا وہ (اس سے کچھ) زیادہ ہوں گے۔ چناں چہ وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے انھیں ایک (مقرر) وقت تک فائدہ (اُٹھانے کا موقع) دیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ [السبا: ۳۴] ''اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا (رسول) بھیجا تو اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہ جس چیز کے ساتھ تمھیں بھیجا گیا ہے ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔''

پھر یہ فرمایا کہ اگر گاؤں والے ایمان لے آئیں یعنی دل سے یقین کریں، رسولوں کو سچا جانیں، ان کی راہ پر چلیں، طاعات بجا لائیں اور حرام کی ہوئی چیزوں کو ترک کر دیں تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیں۔

آسمان سے پانی برسے، زمین سے پیداوار ہو، لیکن انھوں نے یہ کام نہ کیا، بلکہ رسولوں کو جھٹلایا۔ آخر ان گناہوں اور حرام کاموں کی وجہ سے عذاب میں ہلاک ہو گئے۔

اللہ کے عذاب سے غفلت پر وعید:

پھر اللہ نے احکام کی مخالفت اور ممنوعہ باتوں کے ارتکاب سے ڈرایا اور کہا کہ کیا اہلِ قریٰ اس بات سے امن میں ہیں کہ رات کو یا دن کو سوتے ہوئے یا کھیلتے ہوئے ہمارا عذاب ان کو پکڑ لے۔ مراد غفلت و شغل ہے، کیونکہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہو جانا خراب لوگوں کا طریقہ ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن طاعات بجا لاتا ہے اور نافرمانی سے ڈر رکھتا ہے، فاجر گناہ کرتے ہیں اور اللہ کی گرفت سے بے خوف رہتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ برکتوں کو کھول دینے سے مراد ساری بھلائیاں، انعامات اور رزق و آفات سے امن و امان ہیں، یہ سب اللہ کا فضل و احسان ہے۔ آیتِ باب کا سوالیہ انداز ملامت اور جھڑکی اور انکار کے لیے آیا ہے۔ عذاب کبھی رات کو آتا ہے، غفلت اور بے خبری کی حالت میں اور کبھی دن کو لہو ولعب کی حالت میں۔ لعب سے وہ کام مراد ہیں جن میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ مراد اللہ کے مکر سے اللہ کا عذاب وعقاب ہے کفر وفسق پر۔ شبلی نے کہا ہے کہ اللہ کا مکر یہ ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دے جو کچھ وہ کرتے ہیں، ان کو کرنے دے۔[2]

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۱۰۰

کیا ان لوگوں پر واضح نہیں ہوا جو زمین میں (پہلے) بسنے والوں (کی ہلاکت) کے بعد اس کے وارث ہوئے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں مصیبتوں میں مبتلا کر دیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں، پھر وہ (کچھ) نہ سن پائیں؟ (100)

تباہ شدگان سے عبرت خیزی کا حکم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کیا ان پر یہ بات نہیں کھلی کہ ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں پر پکڑ لیں، یہی امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کیا یہ بات ان پر ظاہر و روشن نہیں ہوئی جو زمین میں خلیفہ ہوئے ہیں، اس قوم کے بعد جو ان سے پہلے زمین میں خلیفہ تھے اور اب یہ بھی انہی کی چال پر چلتے ہیں، انہی کے سے کام کرتے ہیں، اپنے رب پر سرکش ہیں، ہم چاہیں تو جو گت ان کی تھی، وہی گت ان کی بھی ان

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۱۳) [2] فتح البیان (٤/ ٤١٦۔ ٤١٨)

کے گناہوں پر کر دیں، ان کے دلوں پر ان کی طرح مہر لگا دیں، یہ نہ نصیحت سن سکیں اور نہ کوئی اور ذکر وغیرہ۔[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۸] ''کیا پھر (اس چیز نے) ان کی راہنمائی نہیں کی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں؟ جن کے مساکن (بستیوں) میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں، بے شک اس میں البتہ عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴾ [السجدۃ: ۲۶] ''کیا ان پر واضح نہیں ہوا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی اُمتیں ہلاک کر دیں، جن کے گھروں میں (اب) وہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک اس میں عظیم نشانیاں ہیں، کیا پھر وہ سنتے نہیں۔''

پھر فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ وَّ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ﴾ [إبراهيم: ٤٤۔ ٤٥] ''(ان سے کہا جائے گا:) کیا تم اس سے پہلے قسمیں نہیں کھاتے تھے کہ تمھارے لیے کوئی زوال نہیں؟ اور تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں آباد تھے، جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴾ [مريم: ۹۸] ''اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، کیا آپ ان میں سے کسی ایک کو محسوس کرتے ہیں یا ان کی کوئی بھنک (آہٹ) بھی سنتے ہیں؟''

نیز فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٦] ''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں، جنھیں ہم نے زمین میں ایسی طاقت دی تھی جو تمھیں نہیں دی اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش نازل کی اور نہریں بنائیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قومیں پیدا کیں۔''

عاد کے ہلاک کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ وَ لَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖۗ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ۲۵۔ ۲۷] ''وہ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی، پھر وہ ایسے ہوگئے کہ ان کے گھروں کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہ

[1] تفسير الطبري (۱۲/ ۵۷۹۔ ۵۸۰)

دیتا تھا، ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ اور یقیناً ہم نے قومِ عاد کو اس چیز کی قدرت دی تھی، جس کی تمھیں قدرت نہیں دی اور ہم نے انھیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تھے، تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا، جبکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے اور انھیں اس (عذاب) نے گھیر لیا، جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔ اور البتہ تحقیق ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں، تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ [السبا: ٤٥] ''اور ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا، جبکہ یہ تو اس کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچتے جو ہم نے ان کو دیا تھا، پس انھوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو کیسا ہوا ان پر میرا (عبرت ناک) عذاب؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴾ [الملك: ١٨] ''اور البتہ یقیناً تکذیب کر چکے وہ جو اُن سے پہلے تھے، چناں چہ (دیکھ لو) میرا عذاب کیسا تھا؟''

نیز فرمایا: ﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [الحج: ٤٥۔ ٤٦] ''چناں چہ کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، جبکہ وہ ظالم تھیں، تو وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر، اور (کتنے ہی) کنویں بے کار، اور (کتنے ہی) مضبوط محل (ویران پڑے ہوئے ہیں!)۔ کیا پھر وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے، یا کان (ہوتے) جن سے وہ سنتے، پس بے شک قصہ یہ ہے کہ (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٠] ''اور (اے نبی!) یقیناً آپ سے پہلے رسولوں سے بھی مذاق کیا گیا تھا، پھر ان میں سے جن لوگوں نے مذاق کیا تھا، انھیں اس عذاب نے آ گھیرا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔''

اقوام کی ہلاکت کے دو بڑے اسباب:

ان آیات سے ثابت ہوا کہ کسی قوم کی ہلاکت کا سبب دو امر ہوتے ہیں: ایک تکذیب اور اللہ کے رسول کے ساتھ استہزا، دوسرا گناہوں کی کثرت اور پہلے گزرے ہوئے حالات پر غور و فکر نہ کرنا۔ جو قوم بھی ہلاک ہوئی وہ انھی دو باتوں سے ہوئی: گناہوں میں مبتلا رہے، خواہ وہ گناہ کبیرہ تھے یا خود شرک و کفر تھا۔ رسولوں کی بات نہ سنی، حالانکہ اگلی امتیں اس پچھلی امت سے زور، زر و جواہر، گھر بار میں بہت بڑھ کر تھیں، کسی قوم کو یہ گمان نہ تھا کہ ہمارا زوال ہو گا، کوئی قوم بڑی ہوشیار، بیدار، چالاک اور شاطر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی وہ شنوائی، بینائی اور ہوش مندی ان کے کچھ کام نہ آئی۔ تم کو ان کے کان، آنکھ اور دل کا دسواں حصہ بھی نہیں دیا گیا۔ تم کس گھمنڈ میں پڑے ہو۔ کہیں تمھارا حال بھی ان کی طرح نہ ہو جائے کہ گھر اوندھے پڑے ہوئے ہیں، کنویں خشک ہو رہے ہیں، بڑے مضبوط محل اجڑ گئے ہیں، یہ انجام ان کے گناہوں اور رسولوں کے جھٹلانے کی وجہ سے ہوا۔ اگرچہ انھوں نے رسولوں کی تکذیب ان کی زندگی میں کی تھی، لیکن اس تکذیب میں ان کی زندگی کی حالت اور بعد کی حالت دونوں برابر ہیں۔

اب جو کوئی خاتم رسل ﷺ کی تکذیب کرتا ہے، وہ شخص اور وہ شخص جس نے حیاتِ نبوی میں ان کی تکذیب کی ہے، برابر ہے۔ خواہ یہ تکذیب اس طرح پر ہو کہ انکارِ نبوت کرے یا اس طرح پر کہ رسالت کا اقرار کر لینے کے بعد عمل بالحدیث کرنے سے انکار کرے، محدثین پر استہزا کرے۔ یہی حال عملِ معاصی کا ہے کہ جیسا گناہ کا حکم عہدِ رسالت میں تھا، ویسا ہی حکم اب بھی باقی ہے۔ گناہوں کا ارتکاب کرنے پر جس عذاب کے مستحق رسولوں کی زندگی میں تھے، وہی حکم اب بھی باقی ہے، گو عذاب ظاہر نہ آئے، لیکن اگر ذرا غور کریں، عقل و ہوش سے کام لیں، واعظ اور ناصح کی بات مانیں تو سمجھ لیں کہ اب بھی اللہ کا عذاب کسی نہ کسی شکل میں گناہوں کی کثرت کے وقت آتا رہتا ہے۔ جو ایک قوم کی ہلاکت کا باعث ہو جاتا ہے، جیسا اہلِ اسلام پر کافروں کا غلبہ، مسلمانوں کی ذلت و محتاجی، قحط کا ہونا، زکات نہ دینے سے وبا کا آنا، زنا کاری کی وجہ سے بے برکتی، سود خوری اور رشوت ستانی کی وجہ سے، دنیا کی تباہی ماں باپ کی نافرمانی کرنے سے۔ غرض کہ دشمنوں پر اللہ کا عذاب اور اولیا پر اس کی نعمت ہمیشہ سے جاری ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ہدایت کے معنی بیان کرنے کے ہیں۔ وارثینِ ارض سے یہاں مراد اہلِ مکہ ہیں۔ اہل سے مراد مشرکین سابقین ہیں۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جس طرح ہم نے موروثین کو ہلاک کر دیا تھا، اسی طرح وارثین کو بھی ہلاک کر سکتے ہیں۔ جس طرح ان کے دلوں پر مہر لگائی تھی، اسی طرح ان کے دلوں پر بھی مہر لگا سکتے ہیں۔ یہ تو ہلاک ہونے والی امتوں کے حالات سنتے تک نہیں ہیں، پھر ان کی خبروں میں غور و فکر کرنے اور ان سے عبرت پکڑنے کا کیا ذکر؟[1]

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾

(اے نبی!) یہ وہ بستیاں ہیں جن کی کچھ خبریں ہم آپ سے بیان کرتے ہیں اور یقیناً ان کے رسول ان

[1] فتح البیان (٤/ ٤١٨)

کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے، چناں چہ جس چیز کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، اس پر ایمان لانے کے روادار نہ ہوئے۔ اللہ اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے (101) اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد (کا پاس) نہیں پایا اور بلاشبہہ ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان ہی پایا (102)

انبیا کے واقعات کے ذکر سے اتمام حجت کا ذکر اور نبی اکرم ﷺ کو تسلی دینا:

اللہ نے پہلے اپنے نبی کو قومِ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کی خبر دی اور یہ بات سنائی کہ ہم نے ان امتوں کے کفار کو ہلاک کیا اور مومنوں کو بچایا، رسولوں کی زبان پر واضح حق سنایا، حجت ظاہر کر دی اور عذر تمام ہوا۔ اب اس آیت پاک میں کہا ہے کہ اے محمد! یہ اخبارِ قریٰ جو ہم نے تم کو سنائے، ان سب اہلِ قریٰ کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلیں اور واضح حجتیں لے کر آئے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ”اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ [هود: ١٠٠۔ ١٠١] ”(اے نبی!) یہ کچھ خبریں ان (تباہ شدہ) بستیوں کی ہیں جو ہم آپ کو سناتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو قائم ہیں اور کچھ تہس نہس کر دی گئیں۔ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن انھوں نے (خود ہی) اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔“

پھر فرمایا: بھلا وہ کب اس پر ایمان لانے والے تھے جو رسول لائے، کیونکہ وہ تو اول ہی تکذیبِ حق کر چکے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معنی امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں، یہ معنی متجہ حسن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٠٩۔ ١١٠] ”اور تمھیں یہ بات کون سمجھائے کہ بے شک جب وہ نشانی آ جائے گی تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔“ [1]

توحید کا عہد اور کافروں کی بدعہدی:

اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا کہ اللہ کافروں کے دلوں پر یوں ہی مہر لگاتا ہے، کافروں کی جو امتیں گزر چکی ہیں، ان میں اکثر بدعہد لوگ تھے جو اپنے اقرار پر قائم نہ رہے۔ عہد سے مراد یہاں وہی عہدِ توحیدِ الوہیت و ربوبیت ہے جو ان سے عالمِ ذر میں لیا گیا تھا، جبکہ وہ اپنے آبا کی اصلاب (پیٹھوں) میں تھے اور انھوں نے اقرار کر لیا تھا کہ ہمارا رب مالک ایک تُو ہی ہے اور نہیں کوئی معبود مگر تُو۔ اپنی جانوں پر اس بات کی گواہی دے کر اور اقراری ہو کر تارکِ عہد

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣١٤)

اور منکرِ اقرار اور مخالفِ حق ہو گئے، بغیر کسی شرعی و عقلی دلیل و حجت کے اور فطرتِ سلیمہ کے برعکس اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجنے لگے، سارے رسول اول سے آخر تک اسی لیے آئے کہ ان کو اس حرکتِ بے برکت سے باز رکھیں، مگر وہ باز نہ آئے۔ صحیح مسلم میں آیا ہے: « يَقُوْلُ اللّٰهُ إِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَآءَ فَجَاءَتْهُمُ الشَّيْطَانُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ، وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَآ أَحْلَلْتُ لَهُمْ »[1] ''میں نے اپنے بندوں کو حنیف (موحد) پیدا کیا، پھر ان کے پاس شیطان آ گئے اور انھیں ان کے دین سے بہکا دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں۔''

صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے: « كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ... الحديث » یعنی ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (اللہ کا ایک معبودِ برحق ہونا سمجھے ہوئے آتا ہے) پھر اُس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔[2] غرض کہ ہر بشر کی اصلی حالت اور کیفیت فطری یہی توحید الٰہی ہے۔ شرک اور کفر میں مبتلا شیاطین کے گمراہ کرنے سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔''

معلوم ہوا کہ رب العالمین کی توحید پر تمام رسولوں کا اجماع رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥] ''اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی اور معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے؟'' یعنی اگر تُو چاہے تو اس اجماع کی تصدیق سب اگلے رسولوں سے کر لے، کوئی رسول بھی تو یہ بات نہ کہے گا کہ سوائے رحمان کے کوئی اور معبود بھی کبھی عبادت کے لائق تھا۔ نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔'' طاغوت سے مراد ہر معبودِ باطل ہے، وہ کوئی شے ہو، کہیں ہو۔ اس طرح کی اور بہت سی آیتیں ہیں۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اقرار میثاق کے دن اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، یعنی اگرچہ اس دم اقرار کرتے ہیں۔ یہی ربیع بن انس رحمہ اللہ کا قول ہے، اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یومِ میثاق کی پہلے سے تکذیب کر چکے ہیں، اب زبردستی سے ایمان لاتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٨] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔''[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٨٥)
[3] تفسير الطبري (١٣/ ٨۔ ٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ قریٰ (بستیوں) کے حالات کا یہ بیان رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تسلی اور قریش وغیرہم کو ڈرانے کے لیے فرمایا ہے۔ ان قریٰ کے اخبار تو بہت کچھ ہیں، یہاں اتنا ہی قصہ، جس میں نصیحت اور دھمکی تھی، بیان کیا۔ کیوں کہ وہ لوگ نعمتوں کی کثرت اور مہلت کے طویل ہونے سے غرور میں پڑ گئے تھے، سمجھے کہ ہم حق پر ہیں۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کی قوم کو ڈرایا کہ تم ان کے سے اعمال سے بچو۔ ان کے پاس رسول آئے تھے، توحید لائے تھے، مگر وہ ان پر ایمان نہ لائے، اس لیے کہ ان رسولوں کے آنے سے پہلے توحید کی تکذیب کر چکے تھے، اب ان کے آنے پر بدستور کفر پر ڈٹے رہے اور سرکشی کو نہ چھوڑا، طاغوت سے منہ نہ موڑا، رسولوں کا آنا کچھ مؤثر نہ ہوا، جیسے وہ پہلے تھے، اب بھی اسی حال پر جمے رہے، اسی چال پر چلے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ اب بھی ہلاک ہونے کے بعد اگر ہم ان کو زندہ کر دیں، پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لیے کہ پہلے جھٹلا چکے ہیں۔

یا یہ مراد ہے کہ معجزات مانگے، جب دیکھے تو ایمان نہ لائے، اس لیے کہ دیکھنے سے پہلے مکذب تھے، پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔ رسولوں کی آمد سے پہلے تکذیب کے معنی یہ ہیں کہ جاہلیت میں جب سنتے کہ رسول آئے تھے، کتابیں اتری تھیں تو اس خبر کی تکذیب کرتے تھے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام اقوال میں زیادہ صحیح بات ابی رضی اللہ عنہ اور ربیع رحمہ اللہ کی ہے کہ اللہ کے علم میں جو منکر ٹھہر چکا ہے وہ کبھی ایمان نہ لائے گا۔[1] سو اللہ کفار کے دل پر اسی طرح کی مہر شدید لگا دیتا ہے، پھر ان پر کسی قسم کی ترغیب اور ترہیب اثر نہیں کرتی، وہ ہر حال میں عہد شکن رہتے ہیں۔ کوئی سا عہد بھی کیوں نہ ہو، عالمِ ذر کا یا اور کچھ، ان میں تو اکثر ایسے ہی ہیں جو طاعت سے باہر ہیں، فاسق ہیں، عہد اور توبہ کو توڑنے والے ہیں۔[2]

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۱۰۳

پھر ان (نبیوں) کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا تو انھوں نے ان (نشانیوں) کو نہ مانا، پھر دیکھیے فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟ (103)

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ اور فسادیوں کا انجام:

یعنی نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے بعد موسیٰ آئے، حجتیں اور روشن دلیلیں بادشاہِ مصر فرعون کے پاس لائے، اُس کے ارکانِ سلطنت نے ان روشن اور واضح براہین کا انکار کیا، یہ ان کا ظلم اور عناد ہوا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٩) [2] فتح البیان (٤/ ٤١٩۔ ٤٢٠)

ہے: ﴿ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ﴾ [النمل: ١٤] ’’اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، جب کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔‘‘ مفسدوں سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، رسولوں کو جھٹلایا۔ سو تو اے پیغمبر! ان کے انجام پر نظر کر کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ موسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے سامنے ان سب کو اول تا آخر غرق کر دیا۔ یہ فعل فرعون اور اس کی قوم کے وبال اور عذاب کے لیے ابلغ تھا اور اولیاء اللہ، یعنی موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم جو ان پر ایمان لائی تھی، ان کے دلوں کے لیے تشفی و تسکین کے لیے تھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قبطی زبان میں ماء یعنی پانی کو مو بولتے تھے درخت کو سا کہتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو پانی اور شجر کے بیچ میں پایا تھا، اس لیے ان کا یہ نام رکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوئی، ان کے اور یوسف علیہ السلام کے درمیان چار سو برس کا فاصلہ تھا اور ابراہیم علیہ السلام سے سات سو برس کا فرق تھا، تحبیر میں اسی طرح کہا ہے۔[1] واللہ أعلم.

آیات سے مراد نشانیاں ہیں، جیسے ید بیضا، عصا اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ معلوم ہوا کہ نبی کے ہمراہ کسی آیت و معجزے کا ہونا بھی ضرور ہے، تا کہ غیر نبی سے ممتاز ٹھہرے، ورنہ اُس کے قول کا قبول کرنا کسی غیر کے قول کو قبول کرنے سے زیادہ بہتر نہ ہوگا۔ زمینِ مصر کے ہر بادشاہ کا لقب عمالقہ کے بعد فرعون ہوتا تھا، جیسے فارس کے بادشاہ کو کسریٰ، روم کے بادشاہ کو قیصر، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی، تاتار کے بادشاہ کو خان بولتے ہیں۔ فرعون کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ یہ قبطی قوم کا بادشاہ تھا جو مصر میں رہتی تھی، اس کی کنیت ابو مرہ یا ابو العباس تھی۔

اس فرعونِ موسیٰ سے پہلے ایک اور فرعون تھا جو اُس کا بھائی تھا، اس کا نام قابوس تھا، اُس کا ذکر قرآن پاک میں نہیں آیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون پارسی تھا، اصطخر کا رہنے والا تھا۔ امام ابن لہیعہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابنائے مصر میں سے تھا۔ ابن منکدر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فرعون تین سو برس جیا۔[2] علی بن ابی طلحہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ قبطی ولد الزنا تھا، سات بالشت کا لمبا تھا۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہمدان سے ایک علج تھا۔ ابن مقسم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چار سو برس تک جیا، کبھی سر میں درد تک نہ ہوا۔[3]

ملأ سے مراد قوم کے شرفا ہیں، اگرچہ رسالت عام تھی، اس لیے کہ شرفا کے علاوہ بمنزلہ اتباع کے ہوتے ہیں۔ اس جگہ ظلم سے مراد کفر ہے، اس لیے کہ وہ ان آیات کے منکر و کافر تھے، جن کو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے، اللہ نے ان کا نام مفسد رکھا، اس لیے کہ کفر و تکذیب فساد کی سب سے بری قسم ہے۔ اپنی جان پر بھی کفر کیا اور دوسروں پر بھی کہ ان کو ایمان لانے سے روکتے تھے۔[4]

---

[1] مذکورہ کتاب نہیں ملی۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٣١) [3] الدر المنثور (٣/ ٥٠٩۔ ٥١٠) [4] فتح البيان (٤/ ٤٢١۔ ٤٢٢)

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ
عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ
جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٠٦﴾

اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون! بے شک میں سب جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں (104) مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ کی طرف سے حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ تحقیق میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے واضح دلیل لایا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے (105) فرعون نے کہا: اگر تو کوئی نشانی لے کر آیا ہے تو وہ پیش کر، اگر تو سچوں میں سے ہے (106)

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مناظرہ اور مدلل بیان:

اللہ پاک نے اس آیتِ پاک میں اس مناظرے کی خبر دی ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوا تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اپنے مدلل بیان اور آیاتِ بینات کے ساتھ اس کی قوم قبط کے سامنے قائل کر لیا اور لاجواب کر دیا۔ کہا: سن اے فرعون! مجھ کو اُس نے بھیجا ہے جو ہر شے کا خالق، مالک اور بادشاہ ہے۔ مجھ کو یہ بات لائق نہیں ہے کہ میں اللہ پر سوائے سچ کے کچھ اور بات کہوں۔ ﴿ حَقِيْقٌ ﴾ بمعنی جدیر وحری (لائق وسزاوار) ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بمعنی حریص ہے۔ اہلِ مدینہ کہتے ہیں کہ بمعنی واجب وحق ہے، یعنی مجھ پر لازم ہے کہ جو بات اللہ کی طرف سے کہوں وہ حق اور سچ کہوں، اس لیے کہ میں اُس کی عزت، جلال، عظمت اور شان وشوکت کو جانتا پہچانتا ہوں۔

﴿ بِبَيِّنَةٍ ﴾ سے مراد حجتِ قاطعہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی سچائی پر دلیل تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ تو بنی اسرائیل کو اپنی قید اور قہر سے چھوڑ دے، وہ جانیں اور تیرے اور ان کے رب کی عبادت جانے، اس لیے کہ یہ ایک نبیِ کریم کے سلالہ (خلاصہ) ہیں، جن کا نام یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل الرحمان تھا اور اسرائیل لقب تھا، فرعون نے کہا کہ نہ میں تیری تصدیق کرتا ہوں، نہ ان کی رہائی میں تیرا کہنا مانوں گا، اگر کچھ دلیل لائے ہو تو دکھاؤ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ڈر اور رعب دلانے کے لیے اپنے کلام کا عنوان یہ رکھا کہ میں رب العالمین کا رسولِ امین ہوں۔ سو جو کوئی ایسی ذات کی طرف سے آئے جو سارے جہان کا مالک ہو، اس کی بات کو قبول کرنا لازم ہے، جس طرح کسی بادشاہ کا کوئی قاصد یا وکیل اس کی رعیت کے پاس جاتا ہے تو وہ یہی بات کہتا ہے کہ مجھ کو بادشاہ نے تمھارے پاس بھیجا ہے، پھر اپنی سفارت کی غرض وغایت اور اپنی وکالت کا بیان کرتا ہے، اس میں

ایک بڑی عظمت و ہیبت ہوتی ہے۔ پھر فرعون سے کہا کہ تو بنی اسرائیل کو آزاد کر دے، یہ اپنے وطن ارضِ مقدسہ میں جا کر رہیں بسیں۔

یہ اس لیے کہا ہے کہ فرعون نے ان کو غلام بنا رکھا تھا، وطن جانے سے روک دیا تھا۔ مصر میں ان کی سکونت کی وجہ یہ تھی کہ اسباط اولادِ یعقوب علیہ السلام اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تھے، مصر میں رہ پڑے، نسل جاری ہوئی، یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد فرعون نسلِ اسباط پر غالب ہو گیا، ان کو اپنا بندہ بنا کر ان سے مشکل کام اور ذلیل اعمال لینا شروع کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے چاہا کہ ان کو فرعون کی قید سے رہا کرا دیں، انھیں ان کے آبا کے اصلی مقام ارضِ شام کو لے جائیں۔ سو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے یہ کام کرا دیا۔ وللہ الحمد. جس دن یوسف علیہ السلام مصر میں آئے اور موسیٰ علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے، دونوں کے بیچ چار سو برس کا فاصلہ ہوا۔ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے نشانی طلب کی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی۔[1]

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٧﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ
فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾

تب موسیٰ نے اپنا عصا (زمین پر) ڈالا تو وہ اسی وقت اژدہا (بن کر) ظاہر ہوا ﴿107﴾ اور موسیٰ نے (بغل سے) اپنا ہاتھ (باہر) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا سفید تھا ﴿108﴾

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نر سانپ ہو گیا، یہی قول امام سدی و ضحاک رحمہم اللہ کا ہے۔[2] حدیث الفتون میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ وہ عصا ایک بڑا سانپ بن گیا، منہ پھاڑ کر فرعون کی طرف لپکا، اس نے جو دیکھا کہ اس کی طرف آتا ہے تو تخت سے اٹھ بھاگا، موسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ کیا کہ مجھے اس سے بچاؤ، انھوں نے بچا دیا۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک بڑا اژدھا ایک شیر کے برابر ہو گیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثعبان نر سانپ کو کہتے ہیں جو منہ پھاڑے ہوئے ہو۔ نیچے کا جبڑا زمین پر اور اوپر کا محل کی فصیل پر رکھے ہوئے ہو۔ اس ثعبان نے جب فرعون کی طرف منہ کیا تو فرعون ڈر کر بھاگا، حدث کر دیا، ورنہ اس سے پہلے کبھی حدث نہ کیا تھا۔ کہا: اے موسیٰ! اس کو پکڑ لے، میں تجھ پر ایمان لایا، بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ کر دوں گا۔ جب جناب موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اٹھا لیا تو وہ عصا ہو گیا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[4]

---

① فتح البيان (٤/ ٤٢٢۔ ٤٢٤) ② تفسير الطبري (١٣/ ١٦۔ ١٧)

③ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: فتح الباري (٦/ ٤٢٧)

④ تفسير الطبري (١٣/ ١٥۔ ١٧)

نزع ید سے یہ مراد ہے کہ ہاتھ جیب میں ڈال کر باہر نکالا، وہ جواہر کی طرح چمکنے لگا، نہ برص تھا نہ مرض، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ [النمل: ١٢] ''اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کر، وہ سفید (چمکتا ہوا) بے عیب نکلے گا۔'' حدیث الفتون میں آیا ہے کہ ﴿ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ﴾ یعنی غَیْرَ بَرَصٍ پھر جب جیب میں ڈالا تو اگلی رنگت پر ہوگیا۔ یہی امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ وہ عصا حَیَّۃٌ عظیمہ (بڑا سانپ) بن گیا۔ اس کے اژدہا ہونے میں کسی طرح کا دھوکا نہ رہا۔ دوسری آیت میں اس کو جَآنٌّ فرمایا ہے۔ جانّ چھوٹے سانپ کو کہتے ہیں، دونوں آیتوں کے درمیان جمع اس طرح پر ہے کہ جثہ کے بڑے ہونے کے لحاظ سے تو اژدہا تھا اور حرکت کرنے کے لحاظ سے چھوٹے سانپ کی مثل تھا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سے ذکر کیا گیا کہ وہ عصا آدم علیہ السلام کا عصا تھا، جب موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف چلے تو ایک فرشتے نے ان کو دیا تھا، رات کو چمکتا تھا، دن کو زمین پر مارتے تو رزق نکلتا، بکریوں کو اس سے ہانکتے۔[2] جب فرعون کے پاس آئے تو وہ صوف کا جبہ پہنے ہوئے تھے، کہنی تک تھا، اس عصا کا نام ماشا تھا، سیدھا ہاتھ جیب سے یا بغل کے نیچے سے نکالا تو وہ چمکنے لگا۔ قرآن میں جیب ہی کا لفظ آیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کی چمک سے لوگوں کو چکا چوند ہوئی۔ اوندھے منہ گر پڑے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ اس کی چمک سورج کی چمک پر بھی غالب تھی، موسیٰ علیہ السلام گندم گوں تھے۔[4]

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٩﴾
يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿١١٠﴾

فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا: بے شک یہ تو ماہر جادوگر ہے ﴿109﴾ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دے، پس تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ ﴿110﴾

مشیروں کا فیصلہ اور مشورہ:

ملأ سے مراد قومِ فرعون کے جمہور سادات ہیں جو فرعون کے موافق تھے۔ جب ان کا ڈر چلا گیا اور فرعون تخت پر بیٹھا اور اُس نے موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر ٹھہرایا تو سب نے اس کے قول سے اتفاق کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴾ [القصص: ٦] ''اور ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان (کمزور لوگوں کے ہاتھوں) سے وہ چیز دکھائیں، جس سے وہ ڈرتے تھے۔''

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ١٨) [2] الدر المنثور (٣/ ٥١٠۔ ٥١١)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٨/ ٢٧٦٠) اس کی سند میں ''یزید بن ابی زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ [4] فتح البیان (٤/ ٤٢٤۔ ٤٢٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کو کثیر العلم بالسحر (بڑا ماہر جادوگر) ٹھہرایا۔ کہا: یہ شخص نظر بندی میں بڑا دانش مند ہے، لوگوں کی آنکھ میں عصا کو اژدہا کر دکھایا۔ اس جگہ اس قول کی نسبت سرداروں کی طرف کی اور سورۃ الشعرا میں فرعون کی طرف نسبت کی۔ معلوم ہوا کہ سب نے فرعون کے ساتھ شامل ہو کر یہی بات کہی تھی، اس لیے سب کی طرف یہ نسبت صحیح ہو سکتی ہے۔ سرداروں کا خطاب قبط کو تھا۔ ارض سے مراد مصر ہے۔ فرعون نے سرداروں سے مشورہ لیا کہ کہو اب کیا کریں یا سرداروں نے فرعون سے حکم مانگا کہ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ صیغہ جمع کا بطورِ تعظیم کہا۔ زیادہ بہتر قول پہلا ہے، بعد کی آیت کی دلیل سے۔[1]

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ
بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

انھوں نے کہا: اسے اور اس کے بھائی (ہارون) کو مہلت دے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دے ﴿111﴾ (تاکہ) وہ ہر ماہر جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں ﴿112﴾

ماہر جادوگروں کی تلاش:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ اَرْجِهْ ﴾ بمعنی أَخِّرْهُ ہے۔[2] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بمعنی أَحْبِسْهُ ہے۔[3] مدائن سے مراد اقالیم ہیں، یعنی جو شہر تیرے قبضۂ حکومت میں ہیں، ان میں آدمی بھیج کر جادوگروں کو جمع کر۔ اُس زمانے میں جادوگر بہت تھے اور ظاہر ظہور تھے۔ کسی کو یہ اعتقاد تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جو بات لائے ہیں، وہ شعبدہ ہے۔ کسی کو یہ وہم تھا کہ جادو ہے۔ اسی لیے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے جادگروں کا جمع کرنا طے پایا کہ وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کی بینات کے مقابلے لیے نظیر لائیں، جیسے اُس نے فرعون کی زبان سے نقل فرمایا، اُس نے کہا: ﴿ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴾ [طٰه: ٥٧۔ ٦٠] ''کہنے لگا: اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اسی لیے آیا ہے کہ اپنے جادو سے ہمیں ہماری سرزمین سے نکال دے؟ چناں چہ ہم تیرے پاس (مقابل) اس جیسا ہی جادو لائیں گے، لہٰذا تو ہمارے

[1] فتح البیان (٤/ ٤٢٥۔ ٤٢٦)

[2] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطا خراسانی رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٢)

اور اپنے درمیان ایک وعدہ ٹھہرا، نہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں اور نہ تو، ایک ہموار جگہ میں۔ اس (موسیٰ) نے کہا: تمھارا وعدہ زینت (جشن) کا دن ہے اور یہ کہ لوگ دن چڑھے اکٹھے کیے جائیں۔ چناں چہ فرعون (محل میں) واپس آیا اور اپنی ساری چالیں جمع کیں، پھر (میدان میں) آ گیا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ارجاء بمعنی تاخیر ہے، جس نے کہا: بمعنی حبس ہے، وہ قول ضعیف ہے، یہ رجاء سے مشتق ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام کو طمع و امید دینا چاہی، یہی مبرد کا قول ہے۔ مدائن مدینے کی جمع ہے، مراد سرزمینِ مصر کے شہر ہیں۔ لفظ حاشرین بہ معنی جامعین ہے، یعنی ان شہروں میں جتنے جادوگر ملیں، سب کو جا کر لے آئیں، وہ موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کریں۔[1]

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور وہ جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انھوں نے کہا: یقیناً ہمارے لیے انعام ہوگا، اگر ہم غالب آگئے ﴿113﴾ فرعون نے کہا: ہاں، اور بے شک تم (میرے) مقرب لوگوں میں سے ہوگے ﴿114﴾

جادوگروں کا آنا اور اجرت کی یقین دہانی چاہنا:

فرعون نے جادوگروں سے وعدہ کیا کہ میں تم کو عطائے جزیل دوں گا اور اپنا مقرب بناؤں گا اگر تم موسیٰ کو ہرا دو گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جادوگروں کی تعداد کے بارے میں سلف کے بیانات مختلف ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ستر جادوگر آئے۔ صبح کو ساحر تھے، شام کو شہید ہو گئے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ بہتر تھے، دو قبط اور ستر بنی اسرائیل، یہی امام مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو آدمی شہرِ نینویٰ کے مجوسی تھے جو جادو سکھاتے تھے۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بارہ ہزار تھے، ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پندرہ ہزار تھے، کسی نے کہا ہے کہ ستر ہزار تھے۔ محمد بن منکدر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی ہزار تھے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ آٹھ لاکھ تھے، کسی نے کہا ہے کہ نو لاکھ تھے۔

اجر جائزہ و عطا و مزد کو کہتے ہیں۔ انھوں نے غلبہ یابی کی توقع کے سبب سے اپنا مزد (معاوضہ) ٹھہرایا۔ فرعون نے کہا: مُزد (معاوضہ) کیسا؟ میں تو تم کو اجر بھی دوں گا اور اپنے نزدیک بھی رکھوں گا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ

---

[1] فتح البيان (٤/ ٤٢٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٨) [3] تفسير البغوي (٣/ ٢٦٤) تفسير الخازن (٢/ ٢٧٠)

سب سے پہلے تم ہی میرے پاس آؤ اور سب سے بعد میرے پاس سے جاؤ۔[1] امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ساری خلق کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ فرعون ایک بندۂ ذلیل وخوار وزار و عاجز ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو جادوگروں سے مدد کیوں چاہتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ساحر قلبِ اعیان پر کوئی قدرت نہ رکھتے تھے، ورنہ مزدوری کیوں مانگتے، اس لیے کہ ان کو قلبِ اعیان پر اگر قدرت ہوتی تو مٹی کو سونا بنا لیتے، مملکتِ فرعون کے خود مالک بن بیٹھتے۔ تمام عالم کے بادشاہ اور تمام ملکوں کے بادشاہ بن جاتے۔

ان آیات سے مقصود انسانوں کو ان دقائق (نکتوں) سے آگاہ کرنا ہے، تاکہ وہ ان جھوٹے لوگوں کے کلمات اور دروغ گوئی پر دھوکا نہ کھائیں۔[2] غرض کہ جب جادوگروں نے فرعون سے اجر کا وعدہ لے لیا تو یوں کہا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝۱۱۵ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝۱۱۶

جادوگروں نے کہا: اے موسیٰ! یا تو تو ڈال یا (پہلے) ہم ہی (اپنا جادو) ڈالیں (115) موسیٰ نے کہا: (پہلے) تم ڈالو، پھر جب انھوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں) ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں (لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپوں سے) ڈرایا، اور وہ بہت بڑا جادو لائے تھے (116)

جادوگروں اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مبارزت:

یہ ایک مبارزہ (مقابلہ) تھا، یعنی جادوگروں کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جنگ تھی کہ پہلے کون اپنا جادو ڈالے، جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ۝۶۵ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ﴾ [طٰہٰ: ٦٥۔ ٦٦] ”(ان جادوگروں نے) کہا: اے موسیٰ! یا تو تو ڈال یا ہم ہی ہوں پہلے ڈالنے والے؟ اس (موسیٰ) نے کہا: بلکہ تمھی ڈالو“ یعنی پہلے تم ہی اپنی کارستانی ظاہر کرو۔

اس میں یہ حکمت تھی کہ لوگ ان کی کاریگری، شعبدہ بازی دیکھ بھال لیں، جب ان کے کام میں خوب غور کر کے فارغ ہوں تو حق، طلب اور انتظار کے بعد کھلا اور واضح طور پر آئے، دلوں میں اس کی وقعت زیادہ ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، انھوں نے لوگوں کی آنکھوں کے خیال میں یہ بات ڈالی کہ ان کے فعل کی حقیقت خارج میں موجود ہے، حالانکہ یہ محض نظر بندی اور خیال تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا: ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝۶۶ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝۶۷ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝۶۸ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ

[1] تفسیر الخازن (٢/ ٢٧١) [2] فتح البیان (٤/ ٤٢٦۔ ٤٢٧)

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴾ [طٰہٰ: ٦٦۔ ٦٩] ’’پھر ناگہاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں بلاشبہ دوڑ رہی ہیں۔ پھر موسیٰ نے اپنے نفس میں خوف محسوس کیا۔ ہم نے کہا: خوف نہ کھا، بے شک تو ہی غالب رہے گا۔ اور جو (لاٹھی) تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اسے ڈال دے، وہ اس کو نگل جائے گی، جو کچھ انھوں نے بنایا ہے، بس انھوں نے تو جادوگر کا فریب بنایا ہے، اور جادوگر جہاں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا۔‘‘

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موٹی موٹی رسیاں اور لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں۔[1] موسی علیہ السلام اپنے بھائی کے ساتھ عصا ٹیکے ہوئے نکلے، جادوگروں کے مجمعے میں آئے، فرعون مملکت کے سرداروں اور اشراف کے ساتھ اپنی مجلس میں تھا، جادوگروں نے جب اپنا جادو ڈالا تو سب سے پہلے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون۔لعنه الله۔ کی آنکھ کو نظر بند کیا، پھر اوروں کی آنکھ پر ڈالا۔ پھر ہر جادوگر نے جو اس کے ہاتھ میں تھا، رسی یا لاٹھی ڈال دی، پہاڑ کے برابر سانپ نظر آنے لگے، سارا جنگل ان سے بھر گیا، بعض بعض پر سوار نظر آتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تیس ہزار سے کچھ اوپر جادوگر تھے، ہر کسی کے پاس رسی اور عصا تھا، جب ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں کو جادو کیا، سب کو ڈرا دیا۔ قاسم بن ابی بزہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون نے ستر ہزار سے ستر ہزار لاٹھی جمع کی تھی، جو چلتے دوڑتے نظر آنے لگے،[2] اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ وہ ایک بڑا جادو لے آئے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ انھوں نے موسی علیہ السلام کو اختیار دیا کہ تمھاری طرف سے ابتدا ہو یا ہم ابتدا کریں۔ یہ بات بطور ادب کے کہی تھی۔ وہ اپنی جانوں پر اعتماد رکھتے تھے کہ وہی غالب ہوں گے، چاہے بعد میں ہی کیوں نہ ڈالیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے انھی کی طرف سے ابتدا کا کہا، ان کی کچھ پروا نہ کی اور نہ ہی ان سے ڈرے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ جادوگر کبھی رب پر غالب نہ ہوں گے، نہ اللہ کے ایام کا ابطال کر سکتے ہیں۔

غرض کہ جب انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں تو ازراہِ تمویہ اور ملمع کاری آنکھوں کو صحیح پہچان سے متغیر کر دیا، کچھ کا کچھ نظر آنے لگا۔ نظر بندی نے خیال کو پھیر دیا۔ اہلِ شعبدہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ یہی فرق ہے سحر (جو بشر کا کام ہے) اور معجزۂ انبیا (جو اللہ پاک کا کام ہے) میں۔ سحر میں آنکھیں کسی چیز کا صحیح ادراک نہیں کر سکتیں۔ معجزے میں دل متاثر ہوتا ہے، چیز بنفسہٖ اپنی حقیقت سے پھر جاتی ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کا عصا سچ مچ سانپ بن کر دوڑنے لگا۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جادوگروں کا یہ واقعہ اسکندریہ میں ہوا تھا۔ یہی امام خازن رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٨) اس کی سند میں ’’ابو سعد سعید بن مرزبان‘‘ ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٧۔ ٢٨) [3] تفسیر الخازن (٢/ ٢٧٢) فتح البیان (٤/ ٤٢٧۔ ٤٢٨)

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا
يَاْفِكُوْنَ ۚ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ﴿۱۱۸﴾
فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۚ﴿۱۱۹﴾ وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ
سٰجِدِيْنَ ۚ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ تو (بھی) اپنا عصا ڈال۔ (جب اس نے ڈالا) تو وہ دیکھتے دیکھتے (اژدہا بن کر ان سانپوں کو) نگلنے لگا، جو وہ (جادوگر) گھڑتے تھے (117) بالآخر حق ثابت ہوگیا اور جو کچھ وہ لوگ کر رہے تھے، باطل ٹھہرا (118) تب وہ جادوگر وہیں مغلوب ہوگئے اور ذلیل وخوار ہو کر پیچھے ہٹ آئے (119) اور جادوگر (بے اختیار) سجدے میں گر پڑے (120) انھوں نے کہا: ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے (121) موسیٰ اور ہارون کے رب پر (122)

موسیٰ علیہ السلام کی طرف لاٹھی پھینکنے کی وحی، احقاقِ حق اور جادوگروں کا ایمان:

اللہ پاک نے خبر دی کہ ہم نے اس موقفِ عظیم اور بہت بڑے مجمعے میں اپنے بندۂ رسول کو وحی بھیجی، حق کو باطل سے جدا کر دکھایا۔ عصا نے ان کا سارا جادو نگل لیا، وہ اس کو حق جانتے تھے، سو ان کا کرتب باطل نکلا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عصا کا گزر جس رسی لاٹھی پر ہوا، اُس کو نگل گیا۔ جادوگروں نے جان لیا کہ یہ آسمانی امر ہے، جادو نہیں ہے۔ سب کے سب سجدے میں گر پڑے اور ایمان کا اقرار کیا۔[1]

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ایک ایک رسی اور لاٹھی کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر چٹ کیا۔ وادی میں ان کے جادو کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل باقی نہ چھوڑا۔ جب میدان صاف ہو چکا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اٹھالیا۔ وہ بدستور ہاتھ میں ایک ہاتھ کی لکڑی کی طرح ہوگیا۔ جادوگروں نے کہا کہ اگر یہ شخص جادوگر ہوتا تو کبھی ہم پر غلبہ نہ پاتا۔ سب سجدے میں گئے، ربِ موسیٰ و ہارون علیہما السلام پر ایمان لے آئے۔ قاسم بن ابی بزہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جادوگروں نے سجدے سے اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک جنت و دوزخ اور ہر دو کام کا انجام دیکھ نہ لیا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب جادوگروں نے اپنا جادو دکھایا تو اللہ نے جبریل علیہ السلام کی زبان سے پیغام بھیجا کہ اب تم بھی اپنا عصا ڈال دو۔ قرآن پاک کی ترکیب اس بات کی مقتضی ہے کہ عصا کا ڈالا جانا اور اُس کا سانپ کی شکل بن جانا دو بار ہوا تھا۔ ایک بار پہلے فرعون کے سامنے جس پر جادوگروں کو بلانے کے بارے میں فیصلہ کیا گیا اور دوسری بار جادوگروں کے سامنے۔ ﴿ فَاَلْقٰى عَصَاهُ ﴾ سے مراد پہلی بار ہے اور یہاں دوسری بار۔ ان دو بار سے پہلے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۲۹) اس کی سند میں ''ابو سعد سعید بن مرزبان'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۰)

بھی ایک دفعہ عصا سانپ بن چکا تھا، لیکن اس وقت سوائے موسیٰ علیہ السلام کے اور کوئی حاضر نہ تھا۔ اس کا ذکر سورت طٰہٰ میں آیا ہے: ﴿ اِذْ رَاٰ نَارًا ...إلى قوله... فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۔ ۲۰] ”جب اس نے (طور پر) آگ دیکھی ... تب وہ دوڑتا ہوا سانپ (بن گیا) تھا۔“

لَقْف پکڑ کر جلدی سے نگل جانے کو کہتے ہیں۔ افک کسی شے کو اس کی صورت سے بدل دینے کو کہتے ہیں، اسی لیے کذاب کو افاک بولتے ہیں، کیونکہ وہ صحیح بات کو بدل کر باطل کر دیتا ہے۔ سو جو کام اپنی صورت سے پھیر دیا جاتا ہے وہ افک ہوتا ہے۔ اللہ نے جادوگروں کے کام کو افک فرمایا، اس لیے کہ درحقیقت وہ کام بے حقیقت تھا۔ واقع میں کذب، جھوٹ، تمویہ اور شَعْوَذت (شعبدہ بازی) تھا۔

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مجمع اسکندریہ میں ہوا تھا، سانپ کی دم دریا کے پار پہنچی، اسی گز تک منہ پھاڑ کر ساری رسیوں اور لاٹھیوں کو نگلنا شروع کر دیا۔[1] موسیٰ علیہ السلام سچے ہوئے اور جادوگر اس مجمع عظیم میں جھوٹے پڑے اور ذلیل وخوار ہوئے۔ گویا کسی مُلقی نے انھیں سجدے میں گرا دیا یا خود وہ اس معجزے کو دیکھ کر سجدے میں گر پڑے۔ کسی نے کہا ہے کہ جادوگر تین سو اونٹ کا بوجھ لے کر آئے تھے، جب موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے سارے وزن کو چٹ کر لیا تو جادوگر سجدے میں گر پڑے، کہنے لگے: ہم رب العالمین پر ایمان لائے، پھر اُس پر بھی اکتفا نہ کیا، کھول کر یہ بات کہی کہ ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے رب کے مومن ہیں، تاکہ فرعون کی قوم کے کسی شخص کو یہ وہم نہ ہو کہ یہ سجدہ انھوں نے فرعون کو کیا ہے، جس کی الوہیت کے وہ پہلے سے قائل تھے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب وہ سجدے میں گرے تو انھیں بہشت دکھلا دی گئی۔[2]

موسیٰ علیہ السلام کا نام پہلے لیا، حالانکہ ہارون علیہ السلام ان سے عمر میں بڑے تھے، یہ اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کا رتبہ بڑا تھا یا اس لیے کہ لفظ ہارون اُس وقت بطور فاصلہ کے واقع ہوا۔ اسی لیے سورت طٰہٰ میں ﴿ رَبِّ مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴾ فرمایا ہے، کیونکہ وہاں فاصلہ، یعنی قافیہ لفظ موسیٰ تھے۔ یا ہر گروہ نے ایک الگ عبارت بولی تھی، اس لیے ایک جگہ بعض فعل کو مجموع کی طرف منسوب کیا، دوسری جگہ دوسرے فعل کو مجموع کی طرف نسبت کر دیا۔[3]

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ

[1] تفسير الخازن (٢/ ٢٧٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٤٢٨) [3] فتح البيان (٤/ ٤٢٩۔ ٤٣٠)

اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۠﴿۱۲۶﴾

فرعون نے کہا: (کیا) تم میرے اجازت دینے سے پہلے اس پر ایمان لے آئے ہو؟ بے شک یہ مکر ہے، تم نے اس شہر میں (مل کر) یہ مکر کیا ہے، تا کہ یہاں رہنے والوں کو اس (شہر) سے نکال دو، پھر جلد ہی (اس کا نتیجہ) تم جان لو گے ﴿123﴾ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرف سے ضرور کاٹ دوں گا، پھر میں تم سب کو ضرور سولی پر لٹکاؤں گا ﴿124﴾ انھوں نے کہا: بے شک ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿125﴾ اور (اے فرعون!) تو ہمیں صرف اس بات کی سزا دے رہا ہے کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لے آئے ہیں، جب وہ ہمارے پاس آ گئیں۔ اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں اس حال میں فوت کر کہ ہم مسلمان ہوں ﴿126﴾

فرعون کا دھمکی آمیز ردِعمل اور مومنوں کا ثبات:

یعنی تم مل کر اس فریب سے شہر کی ریاست لیا چاہتے ہو۔ فرعون نے اس تقریر سے لوگوں کو دشمن بنا لیا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون نے جادوگروں کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے پر جو وعید سنائی تھی اور اپنا مکر وفریب لوگوں پر یہ کہہ کر ظاہر کیا تھا کہ تم نے شہر لینے کے لیے یہ ایک مکر کیا ہے۔ اللہ نے اس کی خبر دی، یعنی میں نے یہ کام تو خاص تمھارے مشورے سے کیا تھا، اب تم کیوں اس رائے سے منحرف ہوتے ہو، جیسے دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ﴾ [طٰہٰ: ۷۱] ”یقیناً یہ تمھارا بڑا ہی تو ہے جس نے تمھیں جادو سکھایا۔“ حالانکہ فرعون اور ہر عقل والا یہ بات جانتا تھا کہ اس ملعون کا یہ قول سب سے بڑا جھوٹ ہے، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے آتے ہی فرعون کو ایمان کی طرف بلایا تھا اور واضح معجزات اور قطعی حجتیں اپنی رسالت کی سچائی پر ظاہر کی تھیں۔

اس وقت فرعون نے ہر شہر میں لوگ بھیج کر مصر کے تمام شہروں سے جادوگر بلا کر جمع کیے، جن کو فرعون اور اس کے سرداروں نے پسند کیا، وہ دربار میں حاضر ہوئے، ان کو بہت بڑے اجر سے نوازنے کا وعدہ کیا۔ ان کو بڑی حرص تھی کہ ہم کسی طرح سے بھی موسیٰ علیہ السلام پر غالب ہو جائیں تو ہم کو فرعون کا تقرب حاصل ہو، موسیٰ علیہ السلام تو ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں پہچانتے تھے، نہ کسی کو دیکھا تھا نہ کوئی ان کے پاس آتا جاتا تھا۔ یہ بات خود فرعون کو معلوم تھی، لیکن اس نے رعایا کی پردہ پوشی اور فریب دہی کے لیے یہ فقرہ کہا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ﴾ [الزخرف: ٥٤] ”تب اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا (اور اس کی عقل مار دی) تو انھوں نے اس کی اطاعت کی۔“ یا جس قوم نے فرعون کی اس کے اس قول میں تصدیق کی تھی: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٤] ”میں تمھارا سب سے

بڑا رب ہوں۔'' وہ تمام مخلوق میں سب سے زیادہ جاہل اور گمراہ تھے۔[1]

سیدنا ابن مسعود، ابن عباس وغیرہم صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات جادوگروں کے سردار سے ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے اُس سے کہا کہ بھلا اگر میں تجھ پر غالب ہو جاؤں تو کیا تو مجھ پر ایمان لائے گا اور اس بات کی گواہی دے گا کہ جو میں لایا ہوں وہ حق ہے، اس نے کہا کہ کل میں وہ سحر لاؤں گا جس پر کسی کا سحر غالب نہ ہو، واللہ! اگر تو مجھ پر غالب ہوا تو میں تیرے ساتھ ایمان لے آؤں گا، تیری حقیقت کی گواہی دوں گا۔ جب یہ گفتگو ہوئی تو فرعون ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔[2] اسی لیے فرعون نے کہا کہ یہ ایک مکر ہے جو تم نے شہر میں کیا ہے۔تم سب جمع ہو کر اپنے لیے دولت اور صولت چاہتے ہو، بڑے بڑے رؤسا کو مصر سے نکال دینے کا ارادہ کرتے ہو، سوتم جلد معلوم کر لو گے کہ میں تمھارے ساتھ کیا کارروائی کرتا ہوں۔ پھر یہ وعید سنائی کہ تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ دوسری آیت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾ [طٰہٰ: ۷۱] یعنی درختوں کی شاخوں پر مار کر لٹکا دوں گا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جس نے سولی پر چڑھایا یا ہاتھ پاؤں مخالف سمت کاٹے، یہی فرعون تھا۔[3] جادوگروں نے کہا کہ ہم کو یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ہم اپنے رب کے پاس پھر کر جائیں گے، اللہ کا عذاب تیرے عذاب سے زیادہ سخت ہے، تو ہم کو کفر کی طرف بلاتا ہے، زبردستی ہم سے سحر کراتا ہے، اللہ کا عذاب اور سزا تجھ سے بڑھ کر ہے، اس لیے ہم آج کے دن تیرے عذاب پر صبر کریں گے، تاکہ اللہ کے عذاب سے رہائی پائیں۔ پھر انھوں نے اللہ سے دین پر صبر کرنے کی، توحید پر ثابت قدم رہنے کی اور اسلام پر مرنے کی دعا مانگی اور فرعون سے کہہ دیا کہ تو جو حکم کرنا چاہتا ہے کر لے، تیرا حکم اسی دنیا میں چلتا ہے، یعنی نہ آخرت میں، ہم تو اپنے رب پر ایمان لائے ہیں، تاکہ وہ ہمارے قصور بخش دے اور اس سحر کرنے کو جو تو نے زبردستی ہم سے کرایا ہے، معاف فرما دے۔ اللہ بہتر و باقی تر ہے، جو کوئی اس کے پاس مجرم ہو کر آتا ہے، اس کے لیے جہنم ہے، جس میں نہ مرے گا نہ جیے گا اور جو کوئی اس کے نزدیک مومن بن کر آتا ہے اور اس نے اچھے کام کیے ہوتے ہیں، اس کے لیے بلند درجات ہیں، غرض کہ دن کے شروع میں وہ جادوگر تھے اور دن کے آخر میں شہید اور نیک ہو گئے۔ وللّٰہ الحمد. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عبید بن عمیر، قتادہ اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "كَانُوْا فِيْ أَوَّلِ النَّهَارِ سَحَرَةً وَفِيْ آخِرِهِ شُهَدَاءَ بَرَرَةً"[4] ''وہ دن کے شروع میں جادوگر تھے اور اُس کے آخر میں شہید اور نیکوکار بن گئے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ فرعون کا کہنا کہ تم میری اجازت سے پہلے ایمان لے آئے، بطورِ انکار اور ڈانٹ کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۱۸۔ ۳۱۹)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۳/ ۳۳)
[3] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳٤) اس کی سند میں ''سفیان بن وکیع'' ضعیف راوی ہے۔
[4] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۵۔ ۳٦)

تھا۔ تم نے اور موسیٰ علیہ السلام نے پہلے سے سازش کر کے یہ حیلہ کیا ہے، تاکہ قبطیوں کو جو اہلِ مصر ہیں، مصر سے باہر نکال دو اور خود بنی اسرائیل کے ساتھ مل کر مصر پر قابض ہو جاؤ۔ یہ بات قبط عوام کی ثابت قدمی کے لیے کہی کہ وہ بھڑک کر اپنے حال پر قائم و دائم رہیں۔ پھر مجملاً ڈرایا کہ دیکھو میں کیا کرتا ہوں، پھر اس اجمال کی تفصیل بیان کی کہ سیدھا ہاتھ بائیں پاؤں سمیت یا سیدھا پاؤں بائیں ہاتھ سمیت کاٹوں گا۔ ''قَطْعٌ مِنْ خِلَافٍ'' اسی کو کہتے ہیں، پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا، کہا کہ تم کو سولی چڑھاؤں گا، یہ اس لیے کہ عذاب کی افراط، سزا کی سختی ثابت ہو۔ انھوں نے کہا کہ اگر تو یہ کام کرے گا تو کر، اس کے بعد جزا کا دن ہے، وہاں اللہ تیرے فعل کی تجھ کو سزا دے گا۔ ہماری مصیبت کا اجر ہم کو بخشے گا۔ یعنی جس طرح فرعون نے ان کو دنیا کے عذاب سے ڈرایا، اسی طرح انھوں نے اس کو عذابِ آخرت یاد دلایا ؎

اے شاہ چہ گوئی چو بہ پُرسند از تو جائیکہ بہ ترسے و نہ ترسند از تو

''اے شاہ! جب لوگ تجھ سے اس جگہ کے متعلق پوچھیں، جہاں ہر کوئی ڈرے اور لوگ تجھ سے نہ ڈریں تو تُو ان کو کیا جواب دے گا؟''

یا یہ مطلب تھا کہ ہم کو ایک دن مرنا ہے، موت تو ضرور ہی آئے گی، تیرے ہی ہاتھ سے سہی ؎

چون خوردنی ست کاسۂ زہرے کہ قسمت ست باجبہ کشادہ نوشد کسے چرا

''جب تقدیر میں لکھا زہر کا پیالہ پینے ہی کے لیے ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی اسے خندہ پیشانی سے نہیں پیتا۔''

تجھ کو ہمارا اللہ کی نشانیوں پر ایمان لانا بُرا لگا۔ حالانکہ یہ امر ایک شرفِ عظیم ہے، خیرِ کامل اور اصلِ مفاخر ہے، نہ محلِ عیب و مکانِ انکار، یہ بات لائقِ تعریف ہے اور تو ناحق اس بات سے بیزار ہوتا ہے، انکار کرتا ہے، یہ کہہ کر اللہ کی طرف مخاطب ہوئے۔ اس محنت پر ثابت قدمی کا سوال کیا۔ اسلام پر مرنا چاہا۔ اس علم میں ان کو جو سحر اور مہارت تھی، وہ شرِ محض تھے اور انجام کے لحاظ سے انھیں کامیابی اور سعادت حاصل ہوگئی، اس لیے کہ انھوں نے جان لیا کہ جو کام موسیٰ سے ہوا وہ بشریت کی طاقت سے باہر ہے، یہ خاص اللہ کا فعل ہے، اس شر سے خیر کی طرف پہنچ گئے، یہ بات فرعون کے اتباع کو حاصل نہ ہوئی جو اس علم کو جانتے نہ تھے۔ سو جبکہ علمِ شر کی مہارت سے یہ فائدہ ہوا تو پھر اس مہارت کا کیا پوچھنا جو کسی کو علمِ خیر میں حاصل ہو۔ اَللّٰهُمَّ انْفَعْنَا بِمَا عَلَّمْتَنَا مِنْ عِلْمِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ، وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا عَلَى الْحَقِّ الْوَاضِحِ، وَأَفْرِغْ عَلَيْنَا سِجَالَ الصَّبْرِ وَالِاسْتِقَامَةِ، وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ، آمِيْنَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

کہتے ہیں کہ فرعون نے ان کے ساتھ جو کہا تھا، ویسا ہی کیا، بعض نے کہا نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [القصص: ٣٥] ''تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب رہیں گے۔''[1]

---

[1] فتح البیان (٤/ ٤٣٠۔ ٤٣٣)

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾

اور فرعون کی قوم کے چودھریوں نے (اس سے) کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دے گا، تا کہ وہ زمین میں فساد کریں اور وہ (موسیٰ) تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے؟ فرعون نے کہا: ہم ان کے (نومولود) بیٹے قتل کر دیں گے اور ان کی بیٹیاں چھوڑ دیں گے اور بے شک ہم ان پر پورا غلبہ رکھتے ہیں (127) موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے، اور (اچھا) انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے (128) انھوں نے (موسیٰ سے) کہا: ہمارے پاس تمھارے آنے سے پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا: امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو (129)

مشیروں کا فرعون کو مومنوں کو سزا دینے پر اُکسانا، مومنوں کا موسیٰ علیہ السلام سے شکوہ کرنا اور اللہ کی نصرت کا وعدہ:

فرعون کے بت یہ تھے کہ لوگوں کو اپنی صورت بنا دیتا تھا کہ اس کو پوجا کریں اور بیٹے مارنے اور بیٹیاں چھوڑنی پہلے بھی کرتا تھا، اب پھر قصد کیا۔ زمین کا وارث کرے، یعنی ملک کا حاکم بنا دے جو آدم علیہ السلام کا حق ہے۔ یہ کلام یعنی ﴿عَسٰی﴾ سے لے کر ﴿فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ تک مسلمانوں کو سنانے کے لیے فرمایا۔ یہ سورت مکی ہے، اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے، پھر پردے میں بشارت بھیجی۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے فرعون اور فرعون کے ارادے اور مافی الضمیر کی خبر دی ہے کہ ان کے دل میں موسیٰ علیہ السلام کا بغض اور انھیں ایذا دینے کا جذبہ اس درجے تک پہنچا ہوا تھا، کہا: موسیٰ کو مت چھوڑو، وہ تمھاری رعیت کو بگاڑ دے گا۔ اللہ کی عبادت کی طرف بلائے گا نہ کہ تیری عبادت کی طرف۔ سبحان اللہ! موسیٰ اور اس کی قوم

سے فساد کا خوف کیا۔ فرعون اور اس کی قوم سے فساد کا خوف نہ کیا جو اصل میں فسادی، بدمعاش اور اوباش تھے! بعض نے کہا ہے کہ فرعون کا ایک معبود تھا، جس کی وہ عبادت کرتا تھا۔[1] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی چھپ کر۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اس کے گلے میں ایک جمانہ لٹکتا تھا، جس کو وہ سجدہ کرتا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب کوئی خوب صورت گائے نظر آتی، فرعون کہتا: اس کو پوجو، یہ اس کے معبود تھے۔ اسی لیے سامری نے بھی بنی اسرائیل کے لیے گائے کا ایک بچھڑا آواز دار نکالا تھا۔[2] بہرحال فرعون نے قوم کو یہ جواب دیا کہ میں ان کا یہ علاج کرتا ہوں کہ بیٹوں کو جان سے ماروں گا، عورتوں کو زندہ رکھوں گا۔ یہ اس ملعون کا اس کام کے لیے دوسرا حکم تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے بھی موسیٰ علیہ السلام کے ڈر سے یہی حکم جاری اور ساری کیا تھا۔

غرض اس حرکتِ بے برکت سے بنی اسرائیل کو ذلیل و خوار کرنا منظور تھا۔ مگر اللہ پاک نے اس موذی کے ارادے کے خلاف خود اس کو ذلیل کیا۔ قوم کے ساتھ دریا میں ڈبو دیا، موسیٰ علیہ السلام نے جب سنا کہ وہ اس طرح کہتا ہے تو اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کچھ مت ڈرو، اللہ سے مدد چاہو، صبر کرو، انجامِ خیر تمھارے ہی لیے ہے۔ زمین پر تمھارا ہی قبضہ ہو جائے گا۔ دشمن ہلاک ہوگا، غرض کہ ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اللہ کی نعمتوں کے حاصل ہونے کے وقت اور ان کی سزا اور آزمائش کے زائل ہونے پر اس کا شکر ادا کریں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ فرعون ربوبیت کا مدعی تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کے اقوال نقل کیے ہیں۔ مثلاً: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [القصص: ٣٨] ”میں تو اپنے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں جانتا۔“ اور: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٤] ”میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔“ اور یہاں فرمایا: ﴿ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ﴾ سیدنا اُبی کی قراءت یہ ہے: ”لِيُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ وَقَدْ تَرَكُوْكَ أَنْ يَّعْبُدُوْكَ“[3] کسی نے کہا ہے کہ وہ گائے پرست تھا۔ کسی نے کہا کہ ستارہ پرست تھا۔ کسی نے کہا کہ بت پرست تھا۔ کسی نے کہا کہ اس کی قوم اس کے تقرب کے واسطے بت پوجتی تھی، اس لیے آلہہ کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے اور اس لیے کہ اس نے یوں کہا تھا: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾۔ یہ امام زجاج رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4] بعض نے کہا کہ آفتاب و کواکب پرست تھا۔ زیادہ قریب حق کے یہ قول ہے کہ فرعون دہریہ، اللہ کے وجود کا منکر تھا، کہتا تھا کہ اس عالم سفلی کے مدبر یہی کواکب ہیں، اس لیے ان کی صورت کی مورت بنائی تھی، اس کی عبادت کرتا تھا، اپنے جی میں یہی کہتا تھا کہ زمین میں مطاع اور مخدوم میں ہی ہوں۔ اسی لیے ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ کا مدعی تھا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣١٩۔ ٣٢٠)
[2] تفسیر ابن کثیر (١٣/ ٣٩۔ ٣٨)
[3] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٧)
[4] معاني القرآن (٢/ ٣٦٧)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھے سو برس زندہ رہا، من جملہ اس کے چار سو برس بادشاہی کی، کبھی کوئی تکلیف نہ دیکھی، اگر اس مدتِ دراز میں ایک دن بھی بھوکا رہتا یا گرفتارِ تپ ہوتا یا کوئی درد اٹھتا تو ربوبیت کا دعویٰ نہ کرتا۔[1] غرض کہ قوم کو اس نے یہ جواب دیا کہ میں بیٹوں کو قتل کروں گا اور عورتوں کو زندہ رکھوں گا، یہ نہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی مار ڈالوں گا، کیونکہ جانتا تھا کہ ان پر قدرت حاصل نہ ہو گی۔ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بعد بنی اسرائیل کی اولاد کو قتل کرنا ترک کر دیا تھا۔ اب جو موسیٰ علیہ السلام رسالت لے کر آئے تو پھر دوبارہ جل کر وہی اگلا حکم جاری کر دیا۔ کہا: ہم زبردست ہیں، یہ زیر دست ہیں، ہم جو چاہیں سو کریں گے، مگر ملعون نے یہ نہ جانا کہ ؎

اے زبردست زیر دست آزار　　　گرم تا کے بماند این بازار

''اے کمزور رعیت کو دکھ دینے والے غالب و طاقتور! تیری یہ گرم بازاری کب تک قائم رہے گی؟''

بنی اسرائیل نے اس بات کی شکایت جناب موسیٰ علیہ السلام سے کی، فرمایا کہ اللہ سے مدد مانگو، محنت پر صابر رہو، زمین اللہ کی ہے، مصر کی ہو یا تمام روئے زمین، وہ جس کو چاہے اس کا وارث کرے، اس میں کسی کی کیا اجارہ داری ہے، گویا موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے فرعون پر مدد کا وعدہ کیا، پھر کہا کہ دنیا اور آخرت میں اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ یا اس جگہ عاقبت سے مراد جنت ہے۔ عاقبت ہر شے کے آخرت کو کہتے ہیں۔ جب انھوں نے کہا کہ ہم تو آپ کے آنے سے پہلے اور بعد بھی اذیت پاتے رہے تو فرمایا: تمھارا رب جلد دشمن کو برباد کر کے تم کو زمین میں خلیفہ کر دے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ داود اور سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں وہ مصر کے مالک ہو گئے۔ یوشع بن نون کے ہمراہ بیت المقدس کو فتح کر لیا۔ فرعون اور اُس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کے سامنے غرق ہو گئی۔ بنی اسرائیل نے اس ملعون کے ہاتھ سے نجات پائی۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم اہلِ بیت ہیں، فاتحہ اور خاتمہ ہم سے ہو گا، بنی ہاشم کی خلافت ضرور واقع ہو گی، تم دیکھو کہ یہ حکومت کون سے بنی ہاشم میں ہوتی ہے۔ یہ آیت: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ... الآیة﴾ (آیتِ باب) انھی کے حق میں اتری ہے۔[2] (أخرجه ابن أبي حاتم) اس اثر کی صحت میں نظر کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ آیت بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئی ہے، جو ماجرا موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوا تھا، اس قصے میں آئی ہے نہ کہ بمقدمہ بنی ہاشم۔[3] لیکن ہو سکتا ہے لفظ کی عمومیت سے دلیل لے لی ہو اور سبب کی خصوصیت پر مقصور (اکتفا) نہ کیا ہو، اس کے ساتھ اثر کا مضمون صحیح نکلا، کیونکہ دولت وصولتِ اسلام سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اولاد سے شروع ہوئی، یہ اس خلافتِ اسلامیہ کی ابتدا تھی، پھر چھے سو برس بعد اس دولت کا خاتمہ بھی انھی پر ہوا۔ جب سے اب تک پھر ویسی دولتِ اسلام کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ یہ ہمارے خلفائے عباسیہ بالیقین بنی ہاشم تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو دعا دی تھی کہ اے اللہ ان کی اولاد میں خلافت رکھ، وہ دعا قبول ہوئی۔[4] وللہ الحمد.

---

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٦٨)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥١٤١)
[3] فتح البيان (٤/ ٤٣٣۔ ٤٣٦)
[4] مشكاة المصابيح (٣/ ٣٤٢) امام البانی رحمہ اللہ نے ان الفاظ کو منکر کہا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳۰ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ
وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا
طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۱

اور بلاشبہ ہم نے آلِ فرعون کو قحط سالی اور پھلوں کے نقصان میں پکڑا، تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں (130) پھر جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے: یہ ہمارے ہی لیے ہے اور اگر انھیں بدحالی آ لیتی تو اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست ٹھہراتے۔ خبردار! ان کی نحوست اللہ کے پاس (مقدور) ہے اور لیکن ان میں اکثر (لوگ) نہیں جانتے (131)

آلِ فرعون کا قحط سالی میں مبتلا ہونا:

یعنی شومیِ قسمتِ بد ہے سو اللہ کی تقدیر سے، بھلائی اور برائی کا اثر آخرت میں ہوگا۔ اس کا جواب یہ نہ فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی، کیونکہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں۔ اصل حقیقت تھی، سو فرمائی کہ دنیا کے حالات تقدیر پر موقوف ہیں، اللہ نے خبر دی کہ ہم نے قحط سے اور پھلوں کے نقصان سے ان کا امتحان لیا تھا۔ رجاء بن حیوہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نخلہ میں کھجور کا ایک ہی دانہ لگتا۔[1] اگر کوئی سال اچھا آتا، پیداوار ہوتی تو کہتے کہ ہم اسی کے مستحق تھے اور جو کوئی سال قحط کا آتا تو موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے فالِ بد لیتے کہ اُن کی شومی سے یہ سال اور حال ہوا۔ اللہ نے فرمایا کہ تم پر جو مصیبتیں آتی ہیں، یہ اللہ کی تقدیر سے ہیں، مگر تم کو کیا، بلکہ اکثر لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتا۔

سنین سے مراد جدب وقحط ہے، یعنی سال در سال ان کو بھوک میں گرفتار رکھا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سنین بمعنی جوع (بھوک) ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے بمعنی جوائح، یعنی آفات ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب اللہ نے ان کو سنین سے پکڑا تو ہر شے خشک ہوگئی، مویشی جاتے رہے، دریائے نیل سوکھ گیا، قوم فرعون کے پاس آئی، کہا: اگر تو ویسا ہی ہے جیسا تجھ کو زعم ہے تو نیل میں پانی جاری کر۔ کہا: صبح کو پانی جاری ہو جائے گا، جب وہ لوگ کہہ کر چلے گئے تو فرعون نے کہا: اگر کل صبح کو پانی جاری نہ ہوا تو پھر کیا ہوگا؟ سب مجھ کو جھٹلائیں گے، آدھی رات کو نہا کر پیرہنِ صوف پہن کر برہنہ پا نیل مصر پر آ کر کہا: اے اللہ! تو جانتا ہے کہ مجھے یہ بات معلوم ہے کہ تو نیل کو پانی سے بھر سکتا ہے، سو اس کو پانی سے بھر دے۔ اس میں پانی بھر گیا، یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کو اس کا پانی میں غرق ہونا منظور تھا۔[3]
نقصِ ثمرات اس طرح پر ہوا کہ آسمان سے مینہ برسنا بند ہو گیا، غلات تلف ہو گئے، میووں پر آفتیں آئیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٦) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٤٢)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٤٢) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سنین کا عذاب اہل بوادی پر آیا۔ پھلوں کے نقصان کا عذاب اہل امصار پر ہوا۔[1] ان کی کھیتی برباد ہوگئی، ان کے باغات تباہ ہو گئے۔ یہ اس لیے ہوا کہ شاید وہ کچھ متنبہ ہوں اور اپنی حالت سے رجوع کریں، مگر کچھ متنبہ نہ ہوا۔ اس طرح کا امتحان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب بھی ہوا کرتا ہے، مگر کوئی توبہ کرنے والا نہیں ہوتا۔ اسی لیے اللہ نے یہ بات بیان کی کہ ان پر عذاب اور آزمائش کے نازل ہونے کے وقت ان کی سرکشی اور کفر بڑھ گیا۔ پیداوار کے سال کو اپنا استحقاق سمجھا اور قحط کے سال کو موسیٰ علیہ السلام کی بدقسمتی جانا، یہ نہ سمجھے کہ وہ اللہ کا فضل تھا اور یہ اس کا عدل ہے۔

بدفالی لینا جاہلیت کا دستور:

عرب جاہلیت کا بھی یہی دستور تھا کہ طیور و حیوانات سے بدفالی لیتے، شومی کا خیال کرتے، حالانکہ سارے حیوانات وطیور بے عقل و بے شعور ہیں، ان کے بیٹھنے اڑنے بولنے میں شوم (بدقسمتی) وسعد (نیک بختی) کا کیا دخل ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ خیر وشر قحط وفراخی کا سبب اللہ کے پاس ہے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس۔ یہ جواب ان کے اعتقاد کے مطابق دیا، لہٰذا خیر اور شر کو لفظ طائر کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ یہ اکثر لوگوں کی نادانی ہے کہ وہ خیر وشر کی نسبت غیر اللہ کی طرف کرتے ہیں، حالانکہ حق یہ ہے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ
...
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ
بِمُؤْمِنِيْنَ ۝١٣٢ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا
مُّجْرِمِيْنَ ۝١٣٣ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ
لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝١٣٤ فَلَمَّا كَشَفْنَا
عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝١٣٥

اور انھوں نے (موسیٰ سے) کہا: خواہ تم ہمارے پاس کوئی نشانی لے آؤ، تاکہ اس کے ذریعے سے ہم پر جادو کر دو تو بھی ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے (132) پھر ہم نے ان پر طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈکوں اور خون (کا عذاب) بھیجا (یہ) الگ الگ نشانیاں تھیں، پھر بھی انھوں نے تکبر کیا اور وہ لوگ تھے ہی مجرم (133) اور جب ان پر کوئی عذاب آتا تو کہتے: اے موسیٰ! تو اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کر جیسا کہ اس نے

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٦)

تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اگر تو ہم سے عذاب ہٹا دے تو ہم ضرور تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ضرور بھیج دیں گے (134) پھر جب ہم ان سے ایک مقرر وقت تک عذاب ہٹا لیتے، جس تک وہ بہر حال پہنچنے والے ہوتے، تو یکایک وہ عہد توڑ دیتے (135)

طرح طرح کی خدائی نشانیاں اور قوم فرعون کی سرکشی:

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے اس بات پر چالیس برس مقابلہ رہا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن جانے دے، اس نے نہ مانا، ان کی بددعا سے یہ بلائیں پڑیں۔ دریائے نیل چڑھ گیا، اس سے کھیت اور باغ اور گھر بہت ضائع ہوئے۔ ٹڈی سبزی کھا گئی، آدمیوں کے بدن اور کپڑوں میں چیچڑیاں پڑ گئیں، اسی طرح ہر چیز میں مینڈک پھیل گئے، ہر پانی خون بن گیا، آخر ہرگز نہ مانا۔ اللہ نے قومِ فرعون کی سرکشی، زیادتی اور حق کے ساتھ دشمنی کی خبر دی۔ باطل پر ان کا ڈٹ جانا بیان کیا، وہ صاف صاف کہتے تھے کہ تم کوئی سی بھی نشانی کیوں نہ لاؤ، ہم ہرگز نہ مانیں گے۔

طوفان سے مراد:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ طوفان سے مراد ایسی بارش ہے جو غرق کرنے والی اور کھیتی اور پھلوں کو ضائع کرنے والی ہو۔ یعنی اتنا پانی برسا کہ ساری زراعت و پیداوار باغات وغیرہ ضائع ہو گئے۔ جس طرح کہ اب بھی بارش کی کثرت سے غلہ برباد ہو کر قحط پڑ جاتا ہے۔ یہ طوفان کا ایک نمونہ ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد طوفان سے کثرتِ موت ہے۔ یہی امام عطاء رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طوفان پانی ہوتا ہے۔ طاعون ہر حال میں ہوتا ہے۔[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ طوفان موت ہے۔[2] (رواه ابن جرير بسنده وكذا ابن مردوية وهو حديث غريب) تیسرے الفاظ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ ہیں کہ طوفان اللہ کا ایک حکم تھا، جس نے ان کو گھیر لیا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴾ [القلم: ١٩] ''تو آپ کے رب کی طرف سے کوئی پھرنے والا (عذاب) اس (باغ) پر پھر گیا، جب کہ وہ سو رہے تھے۔''[3]

ٹڈی کا حکم:

جراد ٹڈی کو کہتے ہیں، ٹڈی کھائی جاتی ہے۔ صحیحین میں ابو یعفور رحمہ اللہ سے آیا ہے کہ ہم نے ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے ٹڈی کا حال پوچھا، کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات بار جہاد کیا، ٹڈی کھایا کرتے تھے۔[4] امام شافعی اور

---

(1) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٢١) تفسير الطبري (١٣/ ٥٠۔ ٥١)

(2) تفسير الطبري (١٣/ ٥٠۔ ٥١) اس کی سند میں ''منہال بن خلیفہ'' ضعیف راوی ہے۔

(3) تفسير الطبري (١٣/ ٥٢)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٥٢)

احمد رحمہ اللہ کے الفاظ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یوں ہیں: «أُحِلَّتْ لَكُمْ مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ: اَلْحُوتُ، وَالْجَرَادُ، وَالْكَبِدُ، وَالطِّحَالُ»[1] ''تمھارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے: مچھلی، ٹڈی، کلیجی اور تلی۔'' (و رواه البغوي عنه مرفوعاً مثله) سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے ٹڈی کا حکم پوچھا، فرمایا: وہ اللہ کے لشکروں میں سب سے زیادہ ہے۔ میں اس کو نہیں کھاتا اور نہ حرام بتاتا ہوں۔[2] (رواه أبو داود)

نبیِ اکرم ﷺ کا ٹڈی کو نہ کھانا بسبب گھن تھا، جس طرح نفسِ شریفہ کو سانڈھے (ضب) کے کھانے سے گھن آتی ہے، مگر اس کے کھانے کی اجازت دی۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ٹڈی کے بارے میں ایک رسالہ جمع کیا ہے، اس میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: ''كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَأْكُلُ الْجَرَادَ وَلَا الْكُلْوَتَيْنِ وَلَا الضَّبَّ مِنْ غَيْرِ أَنْ يُّحَرِّمَهَا، أَمَّا الْجَرَادُ فَرِجْزٌ وَّ عَذَابٌ، وَأَمَّا الْكُلْوَتَانِ فَلِقُرْبِهِمَا مِنَ الْبَوْلِ، وَأَمَّا الضَّبُّ فَقَالَ: أَتَخَوَّفُ أَنْ يَّكُونَ مَسْخاً'' پھر یہ کہا کہ یہ حدیث غریب ہے، میں نے اس کو نہیں لکھا مگر اسی وجہ سے۔ ہاں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس کو پسند کرتے تھے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے جراد کا حال پوچھا، کہا: ''لَيْتَ أَنْ عِنْدَنَا مِنْهُ قَفْعَةً أَوْ قَفْعَتَيْنِ نَاكُلُهُ''[4] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کی بیبیاں طباق میں ٹڈی رکھ کر ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجتی تھیں۔[5] (رواه ابن ماجه) سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ مریم بنت عمران نے اپنے رب سے سوال کیا کہ ایسا گوشت کھلا جس میں خون نہ ہو، اللہ نے ان کو ٹڈی کھلائی۔ مریم نے کہا: ''اَللّٰهُمَّ اَعِشْهُ بِغَيْرِ رِضَاعٍ وَتَابِعْ بَيْنَهُ بِغَيْرِ شِيَاعٍ''(رواه البغوي) نمیر نے کہا: شیاع بمعنی صوت، یعنی آواز ہے۔[6]

ابو زہیر نمیری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: ''لَا تُقَاتِلُوا الْجَرَادَ فَإِنَّهُ جُنْدُ اللّٰهِ الْأَعْظَمِ''[7] (رواه أبو بكر بن أبي داود وهذا غريب جدًا) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ٹڈی مسامیرِ ابواب کو کھا جاتی ہے، لکڑی کو چھوڑ دیتی ہے۔[8] امام

---

[1] مسند الشافعي (١/ ٣٤٠) مسند أحمد (٢/ ٩٧) تفسير البغوي (١/ ١٨٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١١٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨١٣) اس روایت کا مرسل ہونا صحیح ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٥٣٣)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٢١) اس کی سند میں ''حسن بن علی عدوی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[4] مصنف عبدالرزاق (٤/ ٥٣٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٢١) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٢٠) اس کی سند میں ''ابو سعد بقال'' ضعیف راوی ہے۔

[6] المعجم الكبير (٨/ ١٤١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٩/ ٢٥٨) اس کی سند میں ''نمیر بن یزید قینی'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٩٩٢)

[7] المعجم الكبير (٢٢/ ٢٩٧) شعب الإيمان (٧/ ٢٣٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٢٨) امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب یہ فصل کو خراب نہ کرے۔ البتہ یہ فصل کو خراب کرے تو اس کو اسباب اور وسائل کے ساتھ روکنا جائز ہے۔ واللہ أعلم.

[8] تفسير الطبري (١٣/ ٦٧۔ ٦٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٢١)

اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں صحرا کی طرف گیا، آسمان میں ایک دَل ٹڈی کا دیکھا، ایک جرادہ پر ایک شخص ہتھیار باندھے سوار تھا، وہ جدھر سے اشارہ کرتا وہ ٹڈی اسی طرف چلتی، وہ آدمی کہتا تھا: "اَلدُّنْیَا بَاطِلٌ بَاطِلٌ مَّا فِیْهَا، اَلدُّنْیَا بَاطِلٌ بَاطِلٌ مَّا فِیْهَا، اَلدُّنْیَا بَاطِلٌ بَاطِلٌ مَّا فِیْهَا" [1] (رواه ابن عساكر) قاضی شریح رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ ٹڈی کا حال کیا ہے؟ کہا: اللہ اس کا برا کرے، اس میں سات جابر لوگوں کی خلقت ہے: سر جیسے گھوڑی کا، گردن جیسے بیل کی، سینہ جیسے شیر کا، بازو نسر کے سے، پاؤں اونٹ کے سے، دم سانپ کی سی اور پیٹ بچھو کا سا۔ [2] (رواه الحافظ أبو الفرج الحريري)

حماد بن سلمہ رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ حج یا عمرے کے لیے نکلے۔ ہمارے سامنے ایک ٹڈی کا دَل آیا۔ ہم اس کو لاٹھیوں سے مارنے لگے اور ہم مُحرِم تھے۔ نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا، فرمایا: «لَا بَأْسَ بَصَيَدِ الْبَحْرِ» [3] سیدنا انس و جابر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب نبیِ اکرم ﷺ ٹڈی پر دعا کرتے تو یوں فرماتے: «اَللّٰهُمَّ أَهْلِكْ كِبَارَهُ، وَاقْتُلْ صِغَارَهُ، وَأَفْسِدْ بَيْضَهُ، وَاقْطَعْ دَابِرَهُ، وَخُذْ بِأَفْوَاهِهِ عَنْ مَعَايِشِنَا، وَارْزُقْنَا إِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءَ» جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کے رسول! آپ ﷺ بددعا کرتے ہیں، اللہ کے ایک لشکر پر، قطع دابر (ان کی جڑ کاٹ دینے) کی دعا کی؟ فرمایا: «هُوَ نَثْرَةُ حُوْتٍ فِي الْبَحْرِ» [4] (رواه ابن ماجه)

زیاد نے کہا: مجھے خبر دی اس شخص نے جس نے مچھلی کو چھینکتے دیکھا، مچھلی جب ساحلِ سمندر پر انڈے دیتی ہے اور اس جگہ سے پانی خشک ہو جاتا ہے، دھوپ پڑتی ہے تو وہ سب ٹڈی بن کر اڑنے لگتی ہے۔ [5] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ نے ہزار امتیں پیدا کی ہیں، چھے سو دریا میں، چار سو خشکی میں، ان میں سب سے پہلے ٹڈی ہلاک ہو گی۔ [6] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: "لَا وَبَاءَ مَعَ السَّيْفِ وَلَا نَجَاءَ مَعَ الْجَرَادِ" [7] (رواه أبو بكر بن أبي داود وهذا حديث غريب)

"قُمَّل" کی تفسیر:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "قُمَّلَ" سوس کو کہتے ہیں، جو گیہوں سے نکلتا ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ قمل

---

[1] تاريخ دمشق (٣٥/ ٢٠٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٢)

[3] مسند أحمد (٢/ ٣٠٦) اس کی سند میں "ابو المہزم" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٢١٩)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٢١) اس کی سند میں "موسیٰ بن محمد بن ابراہیم" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١١٢)

[5] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٢)

[6] شعب الإيمان (٧/ ٢٣٤) اس کی سند میں "محمد بن عیسیٰ" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: اللآلي المصنوعة للسيوطي (١/ ٧٥)

[7] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٢) اس کی سند میں "مسلم بن سالم بلخی" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٨١١)

دباء ہے، دباء چھوٹی ٹڈی کو کہتے ہیں، جس کے پر نہ ہوں۔ یہی امام مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام حسن اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قمل چھوٹی کالی کالی دواب ہوتی ہیں۔ امام عبدالرحمان بن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قمل بمعنی براغیث ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قمل قملہ کی جمع ہے، قملہ ایک دابہ ہے، قملہ کے مشابہ جو اونٹ کو کھاتا ہے۔ بعض علمائے بصرہ نے کہا ہے کہ قمل عرب کے نزدیک حمنان کو کہتے ہیں۔ حمنانہ، قردان سے چھوٹا اور قمقامہ سے بڑا ہوتا ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا قول:

ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے تو اللہ نے طوفان بھیجا، یعنی مینہ برسا، وہ ڈرے کہ کہیں عذاب نہ ہو، کہا: اے موسیٰ! دعا کرو کہ پانی کھل جائے، ہم بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ بھیج دیں گے، تم پر ایمان لے آئیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، خوب غلہ ومیوہ وگھاس پیدا ہوا، کہا: ہم یہی چاہتے تھے، مگر ایمان نہ لائے اور بنی اسرائیل کو ان کے ہمراہ نہ کیا۔ اللہ نے ان کی پیداوار پر ٹڈی کو مسلط کیا، دیکھا اب کھیتی نہیں بچتی، ناچار موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم دعا کرو کہ یہ ٹڈی دور ہو، ہم ایمان لائیں گے، بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے۔ دعا کی، ٹڈی دور ہوگئی، پھر بھی ایمان نہ لائے، نہ ہی بنی اسرائیل کو چھوڑا۔ جب غلہ خرمن میں گھا کر گھروں میں رکھا، کہا: ہم نے غلہ کا بندوبست کر لیا، اللہ نے قمل کو بھیجا، یعنی گھن کو، دس اجریب چکی میں ڈالتے، تین قفیز بھی آٹا نہ نکلتا۔

پھر موسیٰ علیہ السلام سے وہی دعا کا سوال کیا اور ایمان لانے کا اور بنی اسرائیل کو بھیجنے کا وعدہ کیا۔ جب ان کی دعا سے وہ بلا دور ہوئی تو پھر ایمان نہ لائے اور بنی اسرائیل کو بھیجنے سے انکار کیا۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس بیٹھے تھے کہ اتنے میں مینڈک کی آواز سنی، فرعون سے کہا: تُو اور تیری قوم اس شخص سے کیا کچھ دیکھے گی؟ کہا: اس شخص کا مکر کچھ بھی چلنے والا نہیں ہے، تب وہ لوگ ایمان لانے سے باز رہے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ آدمی کی ٹھوڑی تک مینڈکوں کا ڈھیر ہو جاتا، وہ بات کرنا چاہتا تو مینڈک منہ میں جا پڑتے، موسیٰ علیہ السلام سے کہا: تو اپنے رب سے دعا کر کہ ان مینڈکوں کو دور کر دے، ہم تجھ پر ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ہمراہ کر دیں گے۔

جب اس پر بھی ایمان نہ لائے تو اللہ نے خون بھیجا۔ کنویں اور نہر کا پانی پینا چاہتے تو وہ خون ہو جاتا، برتن میں پانی لیتے تو وہ لہو بن جاتا۔ فرعون سے شکایت کی کہ اب خون میں مبتلا ہیں، ہم کو پانی نہیں ملتا۔ کہا: موسیٰ نے تم پر جادو کیا ہے، کہا: کیوں کر جادو کیا؟ ہم اپنے برتنوں میں پانی بھر کر رکھتے ہیں، وہ سرخ خون ہو جاتا ہے۔ ناچار موسیٰ علیہ السلام کے پاس آکر دعا طلب کی کہ اس خون سے نجات ملے تو ہم تم پر ایمان لے آئیں اور بنی اسرائیل کو

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۵٤_ ۵٦)

تمھارے ساتھ روانہ کریں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ بلا دور ہوئی تو پھر بھی ایمان نہ لائے، نہ بنی اسرائیل کو چھوڑا۔ اسی طرح پر یہ قصہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ سے علمائے سلف سے بھی مروی ہے۔[1]

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کا قول:

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب جادوگر ایمان لے آئے تو اللہ کا دشمن فرعون لعین مغلوب و مغلول ہو کر پھر بدستور کفر کی انتہا اور شر پر قائم رہا، اللہ پاک نے لگاتار اپنی نشانیاں بھیجیں، قحط پڑا، طوفان آیا، ٹڈی گری، گھن لگا، مینڈک پھیل گئے، پانی خون بن گیا، جدا جدا نشانیاں آئیں، پانی برس کر زمین پر ٹھہر گیا، کھیتی نہ کر سکے، بھوک سے مرنے لگے، موسیٰ علیہ السلام سے دعا کروائی، مگر ایمان لانے کا وعدہ پورا نہ کیا، اس پر ٹڈی نے آ کر درخت کھائے، دروازوں کی کیلیں تک چاٹ لیں، در اور گھر سب گرنے لگے، پھر وہی وعدہ کر کے دعا کرائی، مگر وفا نہ کیا، اس پر قمل کا زور ہوا۔ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تم فلاں ٹیلے کو عصا سے مارو، انھوں نے ایک بڑے ٹیلے کو عصا مارا، اس میں سے قمل نکل کر پھیل گئے، گھروں میں کھانوں میں گھس گئے، سونا اور قرار پکڑنا منع ہو گیا ؎

اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ منع ہے

جب سخت تکلیف ہوئی تو پھر ایمان کا وعدہ کر کے دعا کی درخواست کی، لیکن اقرار پورا نہ کیا۔ اللہ نے مینڈک کو بھیجا، کھانے کے برتن سب بھر گئے، جس کپڑے کو اٹھاتے، جس کھانے کو کھانا چاہتے، مینڈک اس میں موجود ہوتے، جب اس آفت سے تنگ آ گئے تو پھر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ دعا کرو، یہ بلا ہم سے دور ہو جائے، ہم ایمان لے آئیں گے، جب ان کی دعا سے تکلیف دور ہوئی تو پھر بھی کسی ایک وعدے کو پورا نہ کیا، اس پر خون بھیجا گیا۔ آلِ فرعون کا سارا پانی خون ہو گیا، جس کنویں یا نہر سے پینا چاہتے یا برتن میں پانی بھرتے، وہ خون کی طرح لال ہو جاتا۔[2] عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ تم مینڈکوں کو مت مارو، اللہ نے ان کی قوم کو فرعون پر بھیجا تھا، ایک مینڈک اللہ کی رضا چاہنے کے لیے تنور میں جا پڑا، اللہ نے اُس آگ کے عوض مینڈکوں کو بہت ٹھنڈی چیز بخشی، یعنی پانی۔ ان کی آواز تسبیح ہے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قومِ فرعون نے تمام مصیبتوں اور قحط سالیوں کے عذاب اور پھلوں کے نقصان کو دیکھ کر استہزاء کے طور پر یہ بات کہی کہ اے موسیٰ! تم اپنے رب کی طرف سے جب بھی کوئی نشانی لاؤ گے، تا کہ ہم پر سحر کرو تو

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٥٦۔ ٦٣) [2] تفسير الطبري (١٣/ ٦٣۔ ٦٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٤٨) اس کی سند میں ''جابر بن یزید جعفی'' ضعیف راوی ہے۔

ہم ہرگز تمھارا یقین نہ کریں گے۔ یہ اس لیے کہا کہ وہ ان نشانیوں کو سحر سمجھتے تھے، اس پر اللہ کی طرف سے سزا نازل ہوئی۔ پانی کا طوفان آیا، یا کثرت سے اموات واقع ہوئیں۔ ہلاک کرنے والی چیز کو طوفان بولتے ہیں۔ موت ہو یا سیلاب، یا کوئی اور امرِ رب ہو، یا طاعون، اہلِ یمن کی لغت میں اسے طوفان کہتے ہیں یا چیچک ہو۔

امام ابو قلابہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے پہلے چیچک کا عذاب قومِ فرعون پر آیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا (کہ پانی ان کی کھیتیوں کو چڑھ آیا۔[1]) آٹھ دن تک، یعنی سینچر سے سینچر تک لگاتار بڑے زور وشور سے پانی برسا، چاند سورج کچھ نظر نہ آیا، کوئی شخص گھر سے باہر نہ نکل سکا، پانی گھروں میں گھس گیا، گردن تک پہنچا، جو کوئی بیٹھا وہ ڈوب گیا، بنی اسرائیل کے گھروں میں ایک بوند بھی نہ گئی۔ جراد جرادہ کی جمع ہے، نر اور مادہ دونوں کو جرادہ کہتے ہیں، اللہ نے اس حیوان کو قبط کی کھیتیوں کو کھانے کے لیے بھیجا۔ اس نے آ کر کھیتی، میوے، گھروں کی چھتیں، کام کے کپڑے سب صاف کر دیے۔ ٹڈیوں پر بھوک مسلط تھی، ان کا پیٹ کسی طرح نہ بھرتا تھا، قبطیوں کے سارے گھر ٹڈیوں سے لبریز ہو گئے۔ بنی اسرائیل محفوظ رہے، ان کے گھر میں ایک ٹڈی بھی نہ گئی۔

قمل بضم قاف و فتح میم مشددہ ہے، حسن رحمہ اللہ نے اس لفظ کو بہ فتح قاف وسکون میم پڑھا ہے۔[2] کسی نے کہا: مراد وبا ہے، یعنی جراد کے اڑنے سے پہلے جو چیز ٹڈی کے کھانے سے بچ گئی تھی، اس کو قمل نے کھا لیا، زمین کو چاٹ کر صاف کر دیا۔ یا قمل سے مراد سوس ہے، یعنی گندم کے دانے کا گھن۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جعلان ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں بھیجی گئی ہوں۔[3] حمنان قراد کی ایک قسم ہے۔ یہ بلا ان پر سینچر سے سینچر تک قائم رہی۔ مینڈک کھانے پینے میں گرتے، بات کرتے وقت منہ میں جا پڑتے۔ آٹھ دن تک یہی حالت رہی۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مینڈک بری تھے، جب آلِ فرعون پر بھیجے گئے تو سمع و طاعت کی وجہ سے ہانڈیوں اور تنوروں میں جوش مارتے ہوئے گر جاتے، اللہ نے ان کو بحری کر دیا۔[4] موسیٰ علیہ السلام جادوگروں کے مغلوب ہونے کے بعد چالیس برس تک آلِ فرعون میں رہے۔ آیاتِ الٰہی دکھلاتے رہے، مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا، نیل کا پانی خون ہو کر بہایا۔ نکسیریں پھوٹیں یا کنوؤں اور نہر کے پانی لہو ہو گئے۔ ایک سینچر سے دوسرے سینچر تک یہی گت رہتی، پھر ایک ماہ تک وہ تکلیف مرفوع ہو جاتی (اٹھا لی جاتی)۔

یہ پانچ نشانیاں الگ الگ آئیں، تاکہ اللہ کی حجت ان پر قائم و تمام ہو جائے، مگر انھوں نے تکبر کیا، ایمان لانے سے منکر ہوئے اور کیوں نہ ہوتے کہ وہ اقوامِ مجرمین تھے، نہ حق کی طرف راہ پاتے اور نہ باطل سے باز رہتے۔ جب ان پر یہ امور بطورِ عذاب اترے تو موسیٰ علیہ السلام سے دعا کروائی۔ رِجز عذاب کو کہتے ہیں، بعض نے کہا: طاعون

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٦٩) [2] تفسير البغوي (٣/ ٢٧٠)
[3] تفسير القرطبي (٧/ ٢٧٠) [4] تفسير الطبري (١٣/ ٦٣)

آیا، ایک دن میں ستر ہزار قبط مر گئے۔ اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ طاعون ایک رجز ہے، جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر ان سے پہلے بھیجا گیا تھا، جب تم کسی زمین پر اس کو سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جس زمین پر وہ ہو تو وہاں سے نکل کر مت بھاگو۔[1] (أخرجه الشيخان)

موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ تھا کہ اگر یہ آفات دور ہو جائیں گی تو ہم تم پر ایمان لے آئیں گے۔ بنی اسرائیل کو تمھارے سپرد کر دیں گے، جہاں چاہو، ان کو لے جانا۔ یہ اس لیے کہ قوم فرعون نے بنی اسرائیل کو اپنا بندہ بنا رکھا تھا۔ ذلت و خواری کے کام ان سے لیتے تھے، ان کو سفر کرنے سے منع کرتے تھے۔ لیکن جب وہ بلائیں موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے دور ہو گئیں اور اللہ نے اس قوم کے غرق ہونے تک ان سے وہ عذاب دور کر دیا تو انھوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا اور وعدہ پورا نہ کیا۔[2]

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

پھر ہم نے ان سے انتقام لیا تو انھیں سمندر میں غرق کر دیا، کیوں کہ انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے بے پروا ہو گئے تھے (136) اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور (اے نبی! اس طرح) بنی اسرائیل کے حق میں آپ کے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا تھا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ تباہ کر دیا جو (کارخانے) وہ بناتے اور جو (محلات کی عمارتیں) وہ اٹھاتے تھے (137)

قوم فرعون کا غرقاب ہونا اور بنی اسرائیل کا ارضِ مقدسہ کا وارث بننا:

موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ یہ سب بلائیں ان پر ایک ایک ہفتے کے فرق سے آئیں۔ پہلے موسیٰ علیہ السلام فرعون کو کہہ آتے کہ اللہ تم پر یہ بلا بھیجے گا، وہی بلا آتی، پھر پریشان ہوتے، موسیٰ علیہ السلام کی خوشامد کرتے، ان کی دعا سے وبا دفع ہوتی، پھر منکر ہو جاتے۔ آخر کو وبا پڑی۔ نصف شب کو سارے شہر میں ہر شخص کا پہلا بیٹا مر گیا، وہ مُردوں کے غم میں لگے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر شہر سے نکل گئے، پھر کئی روز کے بعد فرعون ان کے پیچھے لگا، دریائے قلزم پر جا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢١٨) [2] فتح البيان (٤/ ٤٣٩۔ ٤٤٣)

کر پکڑا، وہاں یہ قوم سلامتی سے گزر گئی اور فرعون ساری فوج سمیت غرق ہوا۔

جس میں برکت رکھی، یعنی شام کی زمین اس میں ظاہر اور باطن کی بہت برکت ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے خبر دی ہے کہ جب فرعون کی قوم نے ان آفاتِ متواترہ کے باوجود، جو لگاتار ایک کے بعد دوسری آئیں، اپنی سرکشی اور زیادتی نہ چھوڑی تو پھر ہم نے ان سے یوں انتقام لیا کہ سب کو دریا میں ڈبو دیا۔ ”یَمّ“ اس دریا کا نام ہے جس کو موسیٰ علیہ السلام پھاڑ کر نکل گئے تھے، بنی اسرائیل کو نکال لے گئے تھے، پھر ان کے پیچھے فرعون اپنے لشکر سمیت آیا، جب یم کے درمیان پہنچا تو دریا کے دونوں ٹکڑے مل گئے، سب کے سب از اول تا آخر غرقِ آب ہو گئے۔ یہ غرق ان کی تکذیب کے سبب سے ہوا کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اس کی نشانیوں سے غفلت اختیار کی۔[1]

پھر اللہ نے یہ خبر دی کہ غرق شدہ قوم کی جگہ پر ہم نے کمزور لوگوں کو اس جگہ کا وارث کر دیا۔ یعنی بنی اسرائیل کو۔ وہ اس سرزمین کے چاروں اطراف کے مالک ہو گئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴾ [القصص: ٥۔ ٦] ”اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں ضعیف جان (کر دبا) لیا گیا تھا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملکِ مصر کے) وارث بنائیں۔ اور (یہ کہ) ہم انھیں زمین (شام و فلسطین) میں اقتدار بخشیں اور ہم فرعون اور ہامان اور ان دونوں کے لشکروں کو ان (کمزور لوگوں کے ہاتھوں) سے وہ چیز دکھائیں، جس سے وہ ڈرتے تھے۔“

نیز فرمایا: ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾ [الدخان: ٢٥۔ ٢٨] ”وہ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔ اور کھیتیاں اور شاندار محل۔ اور سامانِ عیش جن میں وہ مزے کر رہے تھے۔ اسی طرح (ہوا) اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان (سب) کا وارث بنا دیا۔“ امام حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مشارق و مغاربِ ارض سے ملکِ شام مراد ہے جو برکت والا ہے۔[2] اللہ نے بنی اسرائیل کو وہ ملک ان کے صبر کے عوض عطا کیا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ يَعْرِشُوْنَ ﴾ بمعنی يَبْنُوْنَ ہے۔ یہی قول مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ”یَمّ“ وہ دریا ہوتا ہے جس کی تھاہ نہ ملے یا وسط دریا، یا لجہ دریا (دریا کا منجدھار) کو بولتے ہیں۔ ازہری نے کہا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے، عربوں نے اس کو معرب کر لیا۔ شیریں و نمکین دونوں قسم کے سمندروں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٤) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٧٦۔ ٧٧) [3] تفسیر الطبري (١٣/ ٧٨۔ ٧٩)

پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس جگہ یم سے مراد نیلِ مصر ہے، وہ شیریں تھا۔ غرق ہونے کی وجہ یہ فرمائی ایک تو آیات کو جھٹلانا، دوسرے اللہ کے انتقام سے غفلت۔ غفلت سے مراد عدمِ تدبر، یعنی اس پر غور وفکر نہ کرنا ہے۔ عدمِ تدبر پر مؤاخذہ ہوتا ہے، کبھی کسی شے سے منہ پھیر لینے یا اسے یونہی چھوڑ دینے یا ترک کر دینے کو بھی غفلت کہتے ہیں۔

کمزور قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں، کیونکہ وہ قبطیوں کے ہاتھوں ذلیل وخوار اور تکلیف میں تھے۔ فرعون اور قومِ فرعون کی خدمت گاری اور غلامی بجا لاتے تھے۔

ارضِ مقدسہ کی تفسیر:

مشارق ومغارب سے مراد اطراف، جوانب اور سمتیں ہیں۔ ارض سے مراد مصر وشام کی سرزمین ہے۔ یہ زمین فرعون اور قبطیوں کی قوم کے قبضے میں تھی، عمالقہ اور فرعونیوں کے بعد اللہ نے بنی اسرائیل کو اس ملک مبارک کا مالک بنا دیا۔ وہ اس کے چاروں اطراف میں جس طرح چاہتے تصرف کرنے لگے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ساری روئے زمین ہے، اس لیے کہ داود اور سلیمان علیہما السلام من جملہ بنی اسرائیل کے تھے، وہ ساری زمین کے مالک ہو گئے تھے۔[1] یا مراد ارضِ مقدسہ ہے، یعنی بیت المقدس اور جو اس کے مشرق اور مغرب میں متصل تھا۔ برکت یہ تھی کہ وہاں کھیتی اور پھل بہت زیادہ اور نفع والا پیدا ہوتا تھا۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد شام ہے۔[2] ابن شوذب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد فلسطین ہے۔[3] احادیثِ مرفوعہ میں شام کی فضیلت بہت آئی ہے۔ یہ جگہ ان کے ذکر کی نہیں ہے۔[4]

شام کی فضیلت:

میں کہتا ہوں کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: «اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ شَامِنَا ... الحديث» ''اے اللہ! ہمارے لیے ہمارے شام میں برکت عطا فرما...'' دوبار یہ دعا کی۔[5] (رواہ البخاري) زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت اس طرح ثابت ہے: « طُوْبىٰ لِلشَّامِ » قُلْنَا: لِأَيٍّ ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: « لِأَنَّ مَلَائِكَةَ الرَّحْمٰنِ بَاسِطَةٌ أَجْنِحَتَهَا عَلَيْهَا » ''شام کے لیے خوش خبری ہے۔ ہم نے کہا: کس لیے یا رسول اللہ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیونکہ رحمان کے فرشتے اپنے پروں سے اس پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔''[6] (رواہ أحمد والترمذي)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضر موت کی طرف سے آگ کے نکلنے کا ذکر کیا تو ہم نے کہا: ہم کو کیا حکم ہوتا ہے؟ فرمایا: « عَلَيْكُمْ بِالشَّامِ »[7] (رواہ الترمذي) اسی طرح عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث

---

(1) معاني القرآن (٢/ ٣٧١) (2) تفسير الطبري (١٣/ ٧٦) (3) الدر المنثور (٣/ ٥٢٦)

(4) فتح البيان (٤/ ٤٤٣۔ ٤٤٤) (5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩٠)

(6) مسند أحمد (٥/ ١٨٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٩٢٠)

(7) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢١٧) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ١٠٩)

میں مہاجرینِ شام کو بہترین ٹھہرایا۔[1] (رواه أبو داود) ابن حوالہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «عَلَيْكَ بِالشَّامِ فَإِنَّهَا خِيرَةُ اللّٰهِ مِنْ أَرْضِهِ يَجْتَبِيْ إِلَيْهَا خِيرَتَهُ مِنْ عِبَادِهِ، فَأَمَّا إِنْ أَبَيْتُمْ فَعَلَيْكُمْ بِيَمَنِكُمْ وَاسْقُوْا مِنْ غُدُرِكُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ تَوَكَّلَ لِيْ بِالشَّامِ وَأَهْلِهِ»[2] (رواه أحمد و أبو داود) سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ابدال شام ہی میں ہوتے ہیں جن کے سبب سے ان کو دشمن پر فتح ملتی ہے، اہلِ شام سے عذاب پھیر دیا جاتا ہے۔[3] (رواه أحمد)

پھر ایک صحابی سے مروی حدیث میں من جملہ شام کے شہر دمشق کی مدح فرمائی ہے کہ گھر بناؤ تو وہاں جا رہو۔[4] (رواه أحمد) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ خلافت مدینے میں ہے، ملک شام میں ہے۔[5] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ نور کا ایک ستون میرے سر کے نیچے سے نکلا، وہ شام میں جا کر ٹھہرا۔[6] (رواهما البيهقي في دلائل النبوة) لمعات میں کہا ہے کہ خاص یمن اور شام کو اس لیے دعا دی کہ مکہ معظمہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش ہے، وہ یمن سے ہے۔ مدینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن و مدفن ہے، وہ زمینِ شام سے ہے۔[7]

مرقات میں کہا ہے کہ وجہ تخصیص ظاہر ہے، کیونکہ اہلِ مدینہ کا طعام شام و یمن سے آتا ہے۔[8] شام کی ہجرت کرنے کو اس لیے فرمایا کہ جب تمام شہروں میں فتنوں کی کثرت ہوگی اور ان میں کوئی شخص امر اللہ پر قائم نہ ہوگا تو اس وقت ملکِ شام کے شہر محفوظ رہیں گے۔ ان کی سیاست اسلامی لشکروں کے ہاتھ میں ہوگی۔ وہ حق پر غالب ہوں گے، یہاں تک کہ دجال سے جدال و قتال کریں گے، سو جس کسی شخص کو اپنے دین کی حفاظت منظور ہو وہ ہجرت کر کے شام میں جا بسے۔ دمشق، معقل یعنی ملاحم سے مسلمین کی جائے پناہ (قلعۂ اسلام) ہے اور فسطاط ملاحم فرمایا ہے۔ وہاں ایک زمین ہے جس کو غوطہ کہتے ہیں، دو گروہوں کے آپس میں چمٹنے کے دن اہلِ اسلام کا خیمہ گاہ وہی غوطہ ہوگا جو شہرِ دمشق کے ایک طرف ہے۔ دمشق کو شام کا بہتر شہر فرمایا ہے۔ (رواه أبو داود)

پھر اللہ نے فرمایا کہ تیرے رب کی بات پوری ہوئی، یعنی دشمنوں پر مدد اور کامیابی کا اور ان کے املاک پر قبضے

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٠٣)

(2) مسند أحمد (٤/ ١١٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٥٩)

(3) مسند أحمد (١/ ١١٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ شرح بن عبید رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٢٦٦)

(4) مسند أحمد (٤/ ١٦٠) اس کی سند میں ''ابوبکر بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس موضوع کی صحیح روایت دیگر کتب میں مروی ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١١٦)

(5) مستدرك الحاكم (٣/ ٧٥) اس کی سند میں ''سلیمان بن ابی سلیمان'' اور ''ابو سلیمان'' مجہول راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١١٨٨)

(6) دلائل النبوة للبيهقي (٦/ ٤٤٨) اس کی سند میں بھی سابقہ علت ہے۔ (7) مرقاة المفاتيح (٩/ ٤٠٣٨)

(8) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١١٦)

کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہوا، بنی اسرائیل نے فرعون اور قومِ فرعون کی جن مصیبتوں پر صبر کیا تھا، یہ صرف اس صبر کی جزا ملی۔ فرعون اور قومِ فرعون کی کارسازی تباہ و برباد ہوگئی۔ جو عمارتیں اور محلات مصر میں بنائے تھے، وہ سب تباہ ہو گئے، جو باغات، میوہ جات اور انگور تیار کیے تھے وہ سب ہلاک ہوئے۔ یہاں پر فرعون اور اس کی قوم کا قصہ تمام ہوا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور (جب) ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا تو ان کا ایسے لوگوں پر گزر ہوا جو اپنے بتوں کی عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: اے موسیٰ! تو ہمارے لیے ایک معبود بنا دے، جس طرح کہ ان کے معبود ہیں۔ موسیٰ نے کہا: بے شک تم لوگ تو (نرے) جاہل ہو (138) یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یقیناً وہ تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ باطل ہے (139)

بنی اسرائیل کا پوجنے کے لیے بت مانگنا:

جاہل آدمی صرف ایک بے صورت کی عبادت کر کے تسکین نہیں پاتا، جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو۔ وہ قوم دیکھی کہ گائے کی صورت پوجتی تھی، ان کو بھی یہ ہوس ہوئی، آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا۔ اللہ پاک نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ بنی اسرائیل کے جاہلوں نے کیا کیا۔ انھوں نے باوجود اللہ کی آیات اور عظیم سلطان کے مشاہدے کے، دریا کے پار ہوتے ہی ایک قوم پر سے گزرے، وہ بتوں کی پوجا میں لگی ہوئی تھی۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ وہ کنعانی لوگ تھے، کسی نے کہا ہے کہ قبیلہ لخم کے تھے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گائے کی مورت پوجتے تھے، اسی لیے ان کو عبادت گوسالہ میں شبہہ ہوا، ان کا اثر ان پر پڑا، موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی کہ ان جیسا ایک معبود ہمارے لیے بھی مقرر کر دو۔ انھوں نے کہا: تم جاہل ہو،[1] اللہ کی عظمت و جلال کو نہیں جانتے پہچانتے ہو، اللہ کو ہر شریک اور مثیل سے پاک سمجھنا چاہیے۔ یہ لوگ جو کچھ سمجھ رہے ہیں، سب ہلاک ہونے والا اور باطل ہے۔

ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکے سے حنین کی طرف نکلے، وہاں کافروں کا ایک بیر کا درخت تھا، وہ اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے اور وہاں ٹھہرتے تھے، اس کو ذاتِ انواط کہتے تھے، جب ہمارا گزر بیر کے اس بڑے سرسبز درخت پر ہوا، ہم نے کہا کہ اے نبیِ محترم! ہمارے لیے بھی ایک ذاتِ انواط ٹھہرا دو، جس طرح ان

[1] تفسير الطبري (۱۳/ ۸۰)

کے لیے ہے، فرمایا: اللہ کی قسم! تم نے وہی بات کہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی: ﴿ اِجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴾ (آیتِ باب)[1] (رواه ابن جرير بسنده) امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: « اَللّٰهُ أَكْبَرُ، هَذَا كَمَا قَالَتْ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ لِمُوْسٰى اجْعَلْ ... الخ » ''اللہ اکبر! یہ اسی طرح ہے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لیے بھی ایک الٰہ مقرر کر دیں ...الخ'' پھر فرمایا: « إِنَّكُمْ لَتَرْكَبُوْنَ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ » ''بے شک تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلو گے۔''[2] (رواه ابن أبي حاتم أيضاً)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام عاشورا کے دن دریا پار ہوئے، فرعون اپنی قوم کے ساتھ ڈوب گیا۔ اللہ کے شکر کے لیے اس دن روزہ رکھا۔[3] عکوف کسی شے پر اقامت کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ قوم جس پر ان کا گزر ہوا، لخم و جذام تھے۔ شہر رقہ میں ساحلِ بحر پر نازل ہوئے تھے، ان کے بت گائے کی صورت کے تھے، تانبے کی مورتیاں بنا رکھی تھیں۔ جب سامری نے بچھڑا بنایا تو انھیں تماثیل کے مشابہہ تیار کیا۔ یا وہ لوگ کنعانی تھے، جن سے لڑنے کا موسیٰ علیہ السلام کو حکم تھا۔ غرض کہ بنی اسرائیل نے ان تماثیل، یعنی مورتیوں کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ جس طرح ان کے اصنام ہیں، اسی طرح ایک صنم ہمارے لیے بھی بنوا دو کہ ہم بھی اس کو پوجیں۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو اللہ کی توحید میں کچھ شک نہ تھا، مگر یہ چاہا کہ ایک معظّم شے ہمارے پاس بھی ہو کہ ہم اس کی تعظیم کر کے اللہ کا تقرب حاصل کریں۔ یہ گمان کیا کہ یہ بات کچھ بری نہیں۔[4] لیکن اس قول میں ایک بُعد ہے۔ کسی نے کہا ان کو یہ توہم ہوا تھا کہ غیر اللہ کی عبادت جائز ہے، اس جہالت کی وجہ سے انھوں نے یہ بات کہی تھی۔ (قاله الكرخي)

کچھ بھی ہو، یہ بات بعض نے منہ سے نکالی تھی، نہ کہ سب نے، اس لیے کہ انھی میں سے وہ ستر آدمی تھے، جن کو اللہ نے میقاتِ موسیٰ کے لیے پسند کیا تھا، ان سے ایسی بات کا نکلنا بعید ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تم نادان جاہل ہو، جو ایسی درخواست کرتے ہو، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ جس کو ذرا سا بھی علم ہو گا وہ غیر اللہ کی عبادت سے منع کرنے والا ٹھہرے گا، لیکن بنی اسرائیل کی یہ قوم اللہ کی ساری مخلوق میں سے دشمنی، جہالت اور تلون مزاجی میں زیادہ سخت تر تھے، ان کی جہالت کا کچھ ذکر سورت بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہ کہہ کر پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو بتوں کے پجاری ہیں اور جس شغل میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ سب ٹوٹنے والی اور ہلاک ہونے والی چیز ہے، ان کا دین باطل اور ان کا عمل غلط اور مضمحل ہے۔[5]

---

(1) تفسير الطبري (۱۳/ ۸۱۔ ۸۲) اس کی سند صحیح ہے۔

(2) مسند أحمد (۵/ ۲۱۸) تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۵۵۳) اس کی سند صحیح ہے۔

(3) تفسير البغوي (۳/ ۲۷۳) (4) تفسير البغوي (۳/ ۲۷۴) (5) فتح البيان (٤/ ٤٤٥۔ ٤٤٧)

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

موسیٰ نے کہا: کیا میں تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی (اور) معبود تلاش کروں، جب کہ اس نے تمھیں سب جہانوں پر فضیلت دی ہے؟ (140)

اللہ کے علاوہ کون معبود ہے؟

موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں کہ دیکھو کس طرح اس نے تم کو قید وقہرِ فرعون سے اور ہر طرح کی ذلت و خواری سے چھڑا کر اس عزت کو پہنچایا۔ دشمن کی طرف سے تمھارے دل کو ٹھنڈا کیا، اس پر تم یہ خیالِ باطل کرتے ہو ؎

بعد از خدای ہر چہ پرستند خوب نیست بے دولت آنکہ تکیہ بہ غیر اختیار کرد

”ایک اللہ کو چھوڑ کر جس کسی کی بھی پرستش کی جاتی ہے، اچھی بات نہیں۔ جس نے اللہ کے سوا کسی پر بھروسا کیا، وہ بدنصیب بن گیا۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سوالیہ انداز انکار اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے تھا، یعنی بھلا کہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو معبود ٹھہرایا جائے، حالانکہ ساری نعمتیں اسی نے ہم تم سب کو بخشی ہیں۔ سارے زمانے کے لوگوں پر تم کو فضیلت دی ہے، اس جگہ عالمین سے مراد قبطی ہیں کہ ان کو مٹا کر تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ سو اس نعمت کا یہی شکر اور مقابلہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کی خواہش کی جائے؟[1]

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

اور (اے بنی اسرائیل! یاد کرو) جب ہم نے تمھیں فرعون کی قوم سے نجات دی، وہ تمھیں برا عذاب چکھاتے تھے، تمھارے بیٹوں کو قتل کر دیتے تھے اور تمھاری عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی (141)

تفسیر سورۃ البقرہ میں دیکھیے:

یہ کلام موسیٰ علیہ السلام سے حکایت کیا گیا ہے یا ان یہود کو خطاب ہے جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے،

---

[1] فتح البیان (٤/ ٤٤٧)

یعنی اپنے اسلاف کا ماجرا یاد کرو کہ فرعون اور قومِ فرعون کے سامنے ان کا حال کیا تھا، اب اللہ نے تم پر کیسی نعمت ظاہر کی۔ اس آیت کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے، یہاں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ جب اللہ انعام کرنے والا ہے تو پھر غیر کی عبادت کب لائقِ حال ہوسکتی ہے۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ وہ اتنی راتیں کوہِ طور پر گزارے) اور ہم نے انھیں (مزید) دس راتوں کے ساتھ پورا کیا، یوں اس کے رب کی (مقرر کی ہوئی) چالیس راتوں کی مدت پوری ہوگئی۔ اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: تو میری قوم میں میرے پیچھے جانشین بن جا اور (ان کی) اصلاح کرنا اور فساد کرنے والوں کے راستے کی پیروی نہ کرنا﴿142﴾

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لیے چالیس راتوں کی مدت:

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو وعدہ دیا کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ میں تمھاری قوم کو تورات دوں۔ اس مدت میں انھوں نے ایک دن مسواک کی، فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی، وہ جاتی رہی، اس کے بدل دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی۔ اللہ نے بنی اسرائیل پر اس بات کا احسان رکھا کہ ہم نے تم کو ہدایت کی، موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں، تورات دی، اس میں شریعت کے احکام اور ان کی تفصیل ہے۔

مفسرین نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن تک روزہ رکھا، جب میعاد ختم ہوئی تو ایک درخت کی چھال سے مسواک کی، اللہ نے حکم دیا کہ اب دس دن اور پورے کرو۔ اکثر علما کا یہ قول ہے کہ وہ ذی قعدہ کے تیس دن اور ذی الحجہ کے عشرہ (دس دن) تھے۔ امام مجاہد، مسروق اور ابن جریر رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یوں ہی مروی ہے۔[1] اس بنیاد پر نحر کے دن میقات پوری ہوئی۔ اسی دن اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں۔ اسی دن اللہ نے ہمارے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی پسندیدہ دین کامل کر دیا، جیسے فرمایا: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ: ۳] ’’آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے پسند کر لیا تمھارے لیے اسلام کو بطورِ دین کے۔‘‘

اتمامِ میقات کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام نے طور کی طرف جانے کا عزم کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰبَنِيْۤ

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۸۶۔ ۸۷)

اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَوٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ ﴾ [طٰهٰ: ۸۰] ’’اے بنی اسرائیل! ہم نے تمھیں تمھارے دشمن سے نجات دی، اور ہم نے تم سے طور کی دائیں جانب (تورات دینے) کا وعدہ کیا۔‘‘ تو اس وقت اپنے بڑے بھائی ہارون کو قومِ بنی اسرائیل پر اپنی جگہ نائب وخلیفہ کر گئے اور یہ وصیت کی کہ تم اصلاح کرتے رہو، کوئی فساد نہ ہونے پائے۔ یہ وصیت بطورِ تنبیہ وتذکیر تھی، ورنہ ہارون علیہ السلام خود بھی ایک پیغمبر شریف کریم نبیِ عظیم تھے، وجاہت وجلالت سب کچھ رکھتے تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو بلانا تورات دینے کے لیے تھا۔ تیس دن بعد ان سے بات کی، دس دن اور بڑھائے۔ سورت بقرہ میں اس چلّے کا ذکر مجمل آیا تھا، یہاں مفصل فرمایا۔ اس مدت کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمت کے لیے میعاد مقرر کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کلام یومِ نحر کو ہوا۔ تیس اور دس چالیس دن ہوتے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے مگر لفظ اربعین کا ذکر اس لیے کیا کہ کبھی یہ وہم نہ ہو کہ انھی تیس کو ایک عشرہ ثلاثین سے پورا کیا۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام جاتے وقت ہارون علیہ السلام کو قوم میں چھوڑ گئے اور کہہ گئے کہ ان کی سیاست اچھی طرح کرنا۔ نرمی سے ان کو برتنا، ان کے حالات کی خبر رکھنا، ان کو اللہ کی عبادت پر لگائے رکھنا۔ جو لوگ ان سے گناہ گار ہیں، تم ان کی راہ پر نہ چلنا، یعنی ان کے مددگار نہ بننا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرمایا کہ میرے رب نے مجھ سے تیس رات کا وعدہ کیا ہے، میں اپنی جگہ ہارون علیہ السلام کو تمھارے درمیان چھوڑے جاتا ہوں، جب موسیٰ علیہ السلام قوم سے جدا ہو کر چلے، اللہ نے دس راتیں اور زیادہ کر دیں، اسی دہائی میں بنی اسرائیل بہک گئے۔ تیس رات گزر جانے کے بعد سامری نے جبریل علیہ السلام کو دیکھ لیا، ان کے گھوڑے کے نشان سے ایک مٹھی مٹی لے کر بچھڑا بنایا تا آخر قصہ سامری۔[1]

وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىۡۤ
اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ‌ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِىۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ
فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِىۡ‌ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ
جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ
تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾

اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت کے لیے آیا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو موسیٰ نے کہا: اے

[1] الدر المنثور (۳/ ۵۳۵) فتح البیان (۵/ ۷)

میرے رب! مجھے (اپنی جھلک) دکھا کہ میں تجھے دیکھ سکوں۔ اللہ نے فرمایا: تم مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکو گے، لیکن تو اس پہاڑ کی طرف دیکھ، پھر اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا، تو تم مجھے بھی ضرور دیکھ سکو گے۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر (اپنا) جلوہ ڈالا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب وہ ہوش میں آئے تو انھوں نے عرض کی: (اے اللہ!) تو پاک ہے، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا مومن ہوں (143)

تجلی الٰہی اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی:

موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے بزرگی دی کہ فرشتے کے بغیر خود کلام کیا، ان کو شوق آیا کہ دیدار بھی کروں، اس کی برداشت نہ ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ہو سکتا ہے، کیونکہ پہاڑ کی طرف نمود ہوئی، لیکن دنیا کے وجود کو برداشت نہ ہوئی، پہاڑ ٹوٹ گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ تو آخرت کے وجود کو برداشت ہو گی، وہاں دیکھنا محقق ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام وقت پر آئے اور ان سے ہم نے بات کی تو انھوں نے ہمیں دیکھنا چاہا، ہم نے کہا: مجھ کو نہیں دیکھ سکتے۔ معتزلہ کے نزدیک اس جگہ لفظ ﴿ لَنْ ﴾ دنیا اور آخرت میں دیدار کی نفی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ہمیشہ کی نفی کے لیے وضع کیا گیا ہے، لیکن یہ قول سب سے زیادہ ضعیف ہے، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیثِ متواترہ ثابت ہیں کہ مومنین اللہ پاک کو دارِ آخرت میں دیکھیں گے، اس کا بیان زیرِ آیتِ کریمہ: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القيامة: ٢٢۔ ٢٣] ''اس دن (کئی) چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' آئے گا۔[1]

اللہ نے کافروں کے حال کی یہ خبر دی ہے کہ وہ اُس دن اپنے رب سے اوٹ میں ہوں گے: ﴿ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴾ [المطففين: ١٥] ''ہر گز نہیں! بے شک اس روز وہ (کافر) اپنے رب (کے دیدار) سے یقیناً پردے میں رکھے جائیں گے۔'' بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ دنیا میں ہمیشہ کی نفی کے لیے ہے نہ کہ آخرت میں۔ اس بنیاد پر آیت اور دیدار کی صحت کے قطعی ہونے میں قیامت کے دن کو جمع حاصل ہوتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس مقام میں یہ کلام اس کلام کے مثل ہے: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [الأنعام: ١٠٣] ''اس (کی حقیقت) کو نگاہیں نہیں پا سکتیں، اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے اور وہ نہایت باریک بین، بہت باخبر ہے۔'' اس کا بیان سورت انعام میں گزر چکا ہے۔ پہلی کتابوں میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے

---

(1) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٦)

موسیٰ! کوئی زندہ مجھ کو نہیں دیکھتا، مگر مر جاتا ہے اور نہ کوئی خشک مگر لڑھک جاتا ہے، اسی لیے اللہ نے کہا کہ پہاڑ ڈھے گیا، موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے پہاڑ پر تجلی کی تو اپنی ایک انگلی سے اشارہ کیا، پھر اس کو ڈھا دیا، پھر ہم کو ابو اسماعیل نے اپنی سبابہ انگلی سے اشارہ کر کے دکھایا۔ اس اسناد میں ایک شخص مبہم ہے، جس کا نام نہیں لیا گیا۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ باب کو پڑھ کر اپنی انگلی سے اشارہ کیا اور انگوٹھے کو بڑے جوڑ پر چھوٹی انگلی کے قریب رکھا۔ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے تیسرے الفاظ یوں ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھا اور انگوٹھے کو چھوٹی انگلی کے قریب رکھا، پھر فرمایا: ﴿ فَسَاخَ الْجَبَلُ ﴾ حمید نے ثابت سے کہا: کیا یوں اشارہ کیا؟ ثابت نے اپنا ہاتھ اٹھا کر حمید کے سینے پر مارا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا اور میں اس کو پوشیدہ رکھوں۔[2] (رواه ابن جرير وهكذا رواه أحمد في مسنده عن أنس ولفظه قال هكذا يعني أنه أخرج الحنصر) حمید طویل نے کہا: تیرا اس کہنے سے کیا مطلب ہے؟ اس پر ثابت بنانی نے حمید کے سینے کو زور سے ایک دھکا دیا اور کہا: "مَنْ أَنْتَ يَا حَمِيْدُ وَمَآ أَنْتَ يَا حَمِيْدُ يُحَدِّثُنِيْ بِهِ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَتَقُوْلُ مَا تُرِيْدُ إِلَيْهِ وَهَكَذَا"[3] (رواه الترمذي في تفسير هذا الآية ثم قال هذا حديث حسن صحيح غريب لا نعرفه إلا من حديث حميد وهكذا رواه الحاكم في مستدركه عن حماد وقال: هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه ورواه أبو محمد بن محمد الخلال عن حماد بن سلمة فذكره فقال: هذا إسناد صحيح لا علة فيه، وقد رواه داود بن المحبر عن أنس مرفوعاً بنحوه وأسنده ابن مردويه من طريقين مرفوعا ولا يصحّ و رواه الترمذي وصححه الحاكم وقال على شرط مسلم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تجلی نہیں کی رب نے پہاڑ کی طرف مگر بقدر خنصر (چھوٹی انگلی) اُس پر پہاڑ ڈھ گیا، یعنی مٹی ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ صَعِقًا ﴾ بمعنی مَيِّتًا ہے۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہاڑ زمین میں دھنس کر دریا میں جا پڑا، اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ امام ابوبکر ہذلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہاڑ زمین میں گھس گیا، اب قیامت تک ظاہر نہ ہو گا۔[4] بعض خبروں میں آیا ہے کہ زمین میں دھنس گیا، قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔[5] (رواه ابن مردويه)

---

[1] تفسير الطبري (۱۳/ ۹۸) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] تفسير الطبري (۱۳/ ۹۹) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] مسند أحمد (۳/ ۱۲۵) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۷٤) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۵۱) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] تفسير الطبري (۱۳/ ۹۷۔ ۹۸) [5] تفسير ابن كثير (۲/ ۳۲۷)

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب اللہ نے پہاڑ کے لیے تجلی کی تو اللہ کی عظمت سے چھے پہاڑ اور بھی اڑ گئے، تین مدینے میں گرے، تین مکے میں۔ مدینے میں احد، ورقان اور رضوی۔ مکے میں حرا، ثبیر اور ثور۔[1] مگر یہ حدیث غریب ہے، بلکہ منکر۔ عروہ بن رویم نے کہا ہے کہ سارے پہاڑ اس سے پہلے کہ اللہ تجلی کرے، چکنے اور ٹھوس تھے، جب موسیٰ علیہ السلام کے لیے طور پر نمودار ہوا تو ڈھے گئے، پھٹ گئے، ان میں دراڑیں اور غاریں پیدا ہو گئیں۔[2]

امام ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب پردہ اٹھا اور پہاڑ نے نور دیکھا تو چکنا چور ہو گیا۔[3] بعض نے کہا ہے کہ ﴿ دَكًّا ﴾ بمعنی فِتْنَةً ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ پہاڑ تجھ سے زیادہ بڑا اور سخت ہے تو اس کی طرف دیکھ، اگر وہ ٹھم گیا تو پھر تو مجھ کو بھی دیکھ سکتا ہے، جب پہاڑ کی طرف تجلی ہوئی اور ان کی نظر پڑی تو بے قابو ہو گئے، پہاڑ ڈھے گیا، موسیٰ علیہ السلام نے دیکھنا چاہا کہ اب پہاڑ کیا کرے گا، بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ پاک نے پہاڑ کی طرف دیکھا تو وہ پتھر مٹی ہو گیا۔

بعض کی قراءت یوں ہے: "نَظَرَ اللّٰهُ إِلَى الْجَبَلِ فَصَارَ صَخْراً تُرَاباً" "اللہ نے پہاڑ کی طرف دیکھا تو وہ پتھر مٹی ہو گیا۔" امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[4] اس بارے میں ابن مردویہ کے نزدیک ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔[5] معروف یوں ہے کہ "صَعِقَ" بہ معنی "غَشِيَ" ہے۔ جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے تفسیر کی ہے، نہ بمعنی موت جس طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا۔ اگرچہ لغت میں یہ معنی صحیح کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٨] "اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے بے ہوش ہو جائے گا، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر اس میں دوسری بار پھونکا جائے گا تو وہ یکا یک کھڑے (ہو کر) دیکھنے لگیں گے۔" کیونکہ وہاں ایک قرینہ دالّہ موت پر موجود ہے، یہاں قرینے کی دلالت غشی پر ہے، وہ قرینہ یہ لفظ ہے: ﴿ فَلَمَّآ اَفَاقَ ﴾ کیونکہ افاقہ غشی سے ہوتا ہے۔ بہرحال جب یہ حالت گزری تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی پاکیزگی، عظمت اور جلالت بیان کرنے کے لیے ﴿ سُبْحٰنَكَ ﴾ کہا، یعنی تو پاک ہے، اس سے کہ کوئی دنیا میں تجھ کو دیکھ سکے، اگر دیکھے تو مر جائے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٠) اس کی سند میں "جلد بن ایوب" اور "عبدالعزیز بن عمران" سخت ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٦٢)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٠ـ ١٥٦١)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٩٩)

[4] تفسير الطبري (١٣/ ١٠٠ـ ١٠٢)

[5] الدر المنثور (٣/ ٥٤٦)

توبہ کا مطلب امام مجاہد رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ میں دوبارہ دیدار کے سوال سے توبہ کرتا ہوں، میں اول مومنین ہوں، یعنی بنی اسرائیل میں۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سب سے پہلے میں ایمان لاتا ہوں کہ تجھ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے مومنین تھے، لیکن ان کا مطلب یہ تھا کہ میں ان میں پہلا مومن ہوں جو اس بات کے قائل ہیں کہ تجھ کو تیری مخلوق میں سے کوئی قیامت تک نہیں دیکھ سکتا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے "وَهَذَا قَوْلٌ حَسَنٌ لَهُ اِتِّجَاه"[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس جگہ ایک طویل اثر ذکر کیا ہے، جس میں عجیب وغریب چیزیں ہیں، اس کے راوی محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ ہیں۔[2] گویا اس کو اسرائیلیات سے حاصل کیا ہے۔ واللہ أعلم.

موسیٰ علیہ السلام کی بے ہوشی:

موسیٰ علیہ السلام کی بے ہوشی میں دو حدیثیں آئی ہیں: ایک ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے کہ ایک یہودی آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس کے منہ پر طمانچہ لگا تھا، کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! انصار میں سے ایک شخص نے جو آپ کا صحابی ہے، میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے، فرمایا، اس کو بلاؤ، وہ آیا، فرمایا: تو نے اس کو کیوں مارا؟ کہا: اے اللہ کے رسول! میرا گزر اس یہودی پر ہوا، میں نے اس کو سنا، یہ کہتا تھا: "وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُوْسٰى عَلَى الْبَشَرِ" "قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بندوں پر فضیلت دی۔" میں نے کہا: "وَعَلٰى مُحَمَّدٍ" "اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟" اور مجھ کو غصہ آیا، میں نے اسے ایک طمانچہ جڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا تُخَيِّرُوْنِيْ مِنْ بَيْنِ الْأَنْبِيَاءِ...» "مجھے انبیا کے درمیان بڑھا چڑھا کر پیش نہ کیا کرو۔" لوگ قیامت کو بے ہوش ہوں گے، سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا، ناگہاں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ عرش کا ایک پایہ پکڑے ہوئے ہیں، میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے یا طور کی بے ہوشی کے بدلے میں کچھ افاقہ دیا گیا۔ اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بہت جگہ روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے احادیثِ انبیا میں لکھا ہے اور امام ابوداود رحمہ اللہ اس کو کتاب السنہ میں لائے ہیں۔[3]

دوسری حدیث سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ دو آدمیوں نے گالی گلوچ کی، ایک آدمی مسلمانوں میں سے تھا، دوسرا یہودی تھا۔ مسلمان نے کہا: "وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُحَمَّداً عَلَى الْعَالَمِيْنَ" یہودی نے کہا: "وَالَّذِيْ اصْطَفٰى مُوْسٰى عَلَى الْعَالَمِيْنَ" مسلمان کو یہودی پر غصہ آیا، ایک

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ١٠٣۔ ١٠٥) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٧) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٩١۔ ٩٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٦٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٧٤) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٦٦٨)

طمانچہ اسے مار دیا، یہودی نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے حال پوچھا، اس نے خبر دی۔ آپ ﷺ نے مسلمان کو بلایا، اس نے اقرار کیا، فرمایا: « لَا تُخَيِّرُوْنِي عَلَىٰ مُوْسَىٰ فَإِنَّ النَّاسَ يَصْعَقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَكُوْنُ أَوَّلَ مَنْ يُّفِيْقُ فَإِذَا مُوْسَىٰ مُمْسِكٌ بِجَانِبِ الْعَرْشِ فَلَا أَدْرِيْ أَكَانَ مِمَّنْ صَعِقَ فَأَفَاقَ قَبْلِيْ أَمْ كَانَ مِمَّنِ اسْتَثْنَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ » یہ حدیث بھی صحیحین میں آئی ہے۔[1]

حافظ ابوبکر ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شخص جس نے یہودی کو طمانچہ مارا، وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، لیکن صحیحین میں گزر چکا ہے کہ وہ کوئی انصار میں سے ایک شخص تھا۔ سو وہی زیادہ صریح اور صحیح ہے۔ واللہ أعلم. اس جملہ یعنی "لَا تُخَيِّرُوْنِي عَلَىٰ مُوْسَىٰ" پر اسی طرح پر کلام ہے، جس طرح پر جملہ "لَا تُفَضِّلُوْنِي عَلَى الْأَنْبِيَاءِ وَلَا عَلَىٰ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى" پر ہے، یعنی یہ بات بطور تواضع فرمائی تھی یا اس سے قبل کہ ان انبیا پر اپنی فضیلت معلوم ہو۔ یا اس بات سے منع کیا ہے کہ انبیا میں غصے اور تعصب کے طور پر تفاضل کیا جائے۔ یا صرف اپنی رائے اور خواہش سے ایسی بات کی جائے۔[2] واللہ أعلم.

یہ بات کہ لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے، ظاہر یہ ہے کہ وہ بے ہوشی قیامت کے اوقات میں ہوگی، کوئی ایسا امر پیش آئے گا کہ جس سے ہوش غلط ہو جائیں گے۔ واللہ أعلم. ہوسکتا ہے کہ یہ بات اس وقت ہو کہ جب رب تبارک و تعالیٰ فیصلے کے لیے آئے اور تمام مخلوق کے لیے تجلی فرمائے، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام رب تعالیٰ کی تجلی سے بے ہوش ہو گئے تھے ؎

ہوش یاروں کے بجا ہیں، نہ پھر اغیار کے ہوش
منتظر ہیں تیرے اِک جلوۂ دیدار کے ہوش

اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ مجھ سے پہلے وہ افاقے میں آئے یا یہ بدلہ ہے صعقۂ طور کا۔[3] قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کتاب الشفا کے شروع میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے تجلی کی تو اندھیری گھپ رات میں پتھر پر چیونٹی دس فرسخ تک نظر آنے لگی۔ پھر کہا: کیا بعید ہے، اگر ہمارے نبیِ اکرم ﷺ ان امور کے ساتھ مختص ہوں جو ہم نے اس بارے میں ذکر کیے ہیں، اسراء کے واقعے کے بعد جب کہ رب تعالیٰ کی بڑی نشانیوں سے آپ ﷺ محظوظ ہوئے تھے۔ گویا کہ قاضی جی نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے، حالانکہ اس کی صحت میں نظر ہے، اس کی اسناد کے رجال مجہول غیر معروف ہیں۔ ایسی حدیث اس وقت قبول کی جاتی ہے جب کسی ضابطۂ عدل سے آئے اور راویوں کا سلسلۂ عدل وضبط آخر تک پہنچ جائے۔[4] واللہ أعلم.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٣) مسند أحمد (٢/ ٢٦٤)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٢٨) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٤)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٢٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح آیتِ باب کی تفسیر میں اس جگہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام وقتِ موعود پر آئے، اس دن پنج شنبہ روز عرفہ تھا۔ صبح جمعہ کے روز یومِ نحر کو تورات دی گئی۔ اللہ نے اپنا کلام انھیں بغیر واسطے اور بلا کیفیت سنایا، اپنے کلام اور ان کے درمیان کوئی پردہ نہ رکھا، موسیٰ علیہ السلام نے اس کلام کو سنا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ نے کوئی بات ایجاد کی، جس کو موسیٰ علیہ السلام نے سنا ہو، اس لیے کہ اللہ کا کلام قدیم ہے۔ تفاسیر میں یہ بات نظر نہ آئی کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس کلامِ مقدس الٰہی سے کیا سمجھا بوجھا۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے طور کے دن بات کی تو وہ بات اس بات کے علاوہ تھی جو ندا کے دن کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے رب! کیا یہ تیرا کلام ہے جو تو نے مجھ سے فرمایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے گفتگو کی ہے، تجھ سے دس ہزار زبانوں کی قوت سے، مجھ کو ساری زبانوں کی قوت ہے اور اس سے بھی زیادہ طاقت ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس آئے تو کہا: ہم سے کلامِ رحمان کا حال بیان کرو، کہا: تم کو طاقت نہیں، کیا تم نے کڑک کی آوازیں نہیں سنی ہیں جو سب سے زیادہ میٹھی تم سنتے ہو؟ یہ آوازیں اس کے قریب ہیں، اس جیسی نہیں۔[1] (أخرجه البزار و ابن أبي حاتم و أبو نعيم في الحلية والبيهقي في الأسماء والصفات) یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ پاک کی بات چیت دو بدو ہوئی۔

صفتِ کلام پر بحث:

امام زمخشری رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ بعض اجرام میں ایک بولے ہوئے کلام کو پیدا کر دیا تھا جس طرح الواح (تختیوں) میں محفوظ پیدا کیا،[2] معتزلہ کا مذہب ہے، یہ مذہب فاسد و کاسد ہے۔ کتاب و سنت اس مذہب کو رد کرتے ہیں۔ اس درخت اور جسم کا کیا حوصلہ ہے کہ وہ "إِنَّنِيٓ أَنَا اللَّهُ" "بے شک یہ میں ہی اللہ ہوں" کہے۔ حنبلیوں کے سادات اور اہلِ حدیث کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کا کلام حروف اور آواز کے ساتھ مقطعہ اور قدیم ہے اور ان کا یہی مذہب حق ہے، سنتِ مطہرہ بھی اسی کی طرح کہتی ہے۔

جمہور متکلمین کہتے ہیں کہ کلامِ الٰہی ایک صفتِ مغایرہ ہے۔ ان حروف اور آوازوں سے ان کی مراد کلامِ نفسی ہے، لیکن سنتِ مطہرہ سے اس کلامِ نفسی کی کہیں ہوا تک معلوم نہیں ہوتی۔ یہ صرف ان لوگوں کی ہوا بندی ہے۔ اسی طرح شیخ نے تاویلات میں ذکر کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک آواز سنی جو کلام اللہ پر دلیل تھی۔ سو یہ قول بھی ظاہری طور پر باطل،

---

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/ ١٠٥) تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١١٩) حلية الأولياء (٦/ ٢١٠) الأسماء والصفات (٢/ ٣١۔ ٣٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه الفضل بن عيسىٰ الرقاشي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٨/ ٣٧٥)

[2] الكشاف (٢/ ١٤٣)

نصِ قرآنی کے خلاف، سیدِ اِنس و جن ﷺ کی حدیث کے خلاف ہے۔ سلف اور خلف کی ایک جماعت نے صفتِ کلامِ الٰہی کی تاویل میں غور وخوض کرنے سے پرہیز اختیار کی ہے، فقط اتنا کہا ہے کہ اللہ پاک متکلم بکلام قدیم ہے، اس کا کلام حرف اور آواز ہے، مگر اس کی ذات رفیع السموات کے لائق ہے۔ کلامِ مخلوق کے مشابہ نہیں۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ، وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى" "اس جیسی کوئی چیز نہیں، اللہ کے لیے تو بہت ہی بلند صفت ہے۔"

رؤیتِ باری تعالیٰ:

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بات سن کر شوقِ دیدار، برکتِ شعار، فیضِ دِثار اور نورِ آثار ظاہر کیا۔ کہا: اے رب! ذرا تو اپنے آپ مجھے دکھا بھی دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک رؤیتِ الٰہی فی الجملہ جائز تھی، اگر محال ہوتی تو اس کا سوال ہی کیوں کرتے۔ اللہ پاک نے جواب دیا کہ تو مجھ کو نہیں دیکھ سکتا، یعنی اس چشمِ فانی سے بطور سوال، بلکہ چشمِ باقی سے بطریقِ عطا ونوال۔ یا اس وقت کہ تو دیدار کی درخواست کرتا ہے تو نہیں دیکھ سکے گا یا دیکھنے والا جب تک اس دنیا میں ہے، نہیں دیکھ سکتا ؎

بے فنائے خود میسر نیست دیدارِ شما　　　　می فروشد خویش را اول خریدارِ شما

"اپنے آپ کو فنا کیے بغیر تیرا دیدار حاصل نہیں ہوتا۔ تجھے اپنا بنانے والے کو سب سے پہلے اپنا آپ بیچنا پڑتا ہے۔"

ہاں! دارِ آخرت میں حق تعالیٰ کا دیدار ہونا احادیثِ متواترہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ جو شخص سنتِ مطہرہ کو پہچاننے والا ہے اور حدیث شریف کا عالم ہے، اس پر یہ ثبوت مخفی نہیں ہے۔ لڑائی اور گیدڑ بھبکی کرنے سے ایسے مسئلے میں کچھ حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ حق کا راستہ صاف اور کھلا ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کی نشوونما جس مذہب پر ہوتی ہے اور آبا اور اہلِ بلد کو جس مذہب پر پاتا ہے اور لوگوں سے اس شریعتِ حقہ میں جو چیز مطلوب ہے، اس پر آگاہی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو ایسا شخص تعصب وسخن پروری میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ متعصب کی ظاہری آنکھ گو درست ہو، مگر اس کے دل کی آنکھ اندھی ہوتی ہے، اس کے کان حق بات سننے سے بہرے ہوتے ہیں، اس کی زبان حق گوئی سے گونگی ہو جاتی ہے۔ وہ حق بات کی مخالفت اور صحیح بات کو زائل کرنے کے درپے ہوتا ہے اور گمان یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو باطل کو دور کرنے والا سمجھ رہا ہوتا ہے اور جس اعتقاد پر اس کی نشوونما ہوئی ہے، اس کو حق سمجھتا ہے۔

صحیح نظر، کتاب وسنت کی دلیل کو قبول کرنے، قرآن وحدیث کی بات کو مان لینے اور تسلیم کر لینے سے، جو اللہ نے اس پر واجب کیا ہے، غافل، جاہل اور خالی رہتا ہے۔ جب سے یہ مروجہ مذاہب اصول وفروع میں پیدا ہو گئے ہیں، تب سے اہلِ انصاف بہت کم نظر آئے، حق کے دروازے بند ہو گئے اور انصاف کا راستہ مسدود ہو گیا۔ "يَفْعَلُ اللّٰهُ

مَا يَشَآءُ وَيَحۡكُمُ مَا يُرِيدُ'' ''اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسے چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔'' اس جگہ ''لَنْ أُرَى'' نہیں فرمایا کہ کہیں جواز کی نفی نہ سمجھی جائے۔ اگر اس کی ذات پاک مرئی (جو نظر آئے) نہ ہوتی تو ضرور یہ خبر دیتا کہ ''أَنَّهُ لَيۡسَ بِمَرۡئِيٍّ'' کیونکہ وہ حالتِ احتیاج بیان کی تھی۔

اہلِ بدعت، خارجیوں، معتزلہ اور بعض مرجیہ نے ظاہری الفاظ کا سہارا لے کر کہا ہے کہ لفظ ﴿لَنْ﴾ ہمیشگی اور دوام کے لیے ہیں، حالانکہ یہ دعویٰ غلط ہے، اس مدعا پر اہلِ لغتِ عربیہ وغیرہ کے کوئی صریح حکم شاہد نہیں ہے، نہ کوئی شخص اس کا قائل ہے، بلکہ کتاب وسنت اس دعوے کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے حق میں فرمایا ہے: ﴿وَلَنۡ يَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا﴾ [البقرة: ٩٥] ''اس (موت) کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔'' حالانکہ وہ قیامت کے دن موت کی تمنا کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَادَوۡا يٰمٰلِكُ لِيَقۡضِ عَلَيۡنَا رَبُّكَ﴾ [الزخرف: ٧٧] ''اور وہ (داروغۂ جہنم کو) پکاریں گے: اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يٰلَيۡتَهَا كَانَتِ الۡقَاضِيَةَ﴾ [الحاقة: ٢٧] ''کاش! وہی (موت) فیصلہ کن (ثابت) ہوتی۔''

اس بارے میں احادیث تو بے شمار ہیں، بہرحال اس جگہ مراد دنیا کی رؤیت تھی۔ اشعریہ کہتے ہیں کہ تعلیق رؤیت کے ساتھ پہاڑ کے قرار پکڑنے کی دلیل ہے اس بات پر کہ رؤیت جائز ہے، کوئی ممانعت نہیں، لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ وہ آخرت کی رؤیت ایک الگ چیز ہے۔ معتزلہ اور اشعریہ کے درمیان رؤیت اخروی کے بارے میں اختلاف ہے، رؤیتِ دنیاوی کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں بھی اس بارے میں اختلاف رہا ہے۔

پہاڑ کی کیفیت:

''دَكًّا'' بمعنی مدکوک، یعنی مدقوق ہے۔ مطلب یہ کہ پہاڑ خاک ہو گیا یا زمین کے برابر ہو گیا یا ایک چھوٹا سا ٹیلہ بن گیا۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے: دوک چوڑے پہاڑوں کو کہتے ہیں۔ دکاوات مٹی کے ٹیلوں کو کہتے ہیں جو موٹے نہیں ہوتے۔[1] امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہاڑ ایک رَمل ہائل ہو گیا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں ہو گئیں۔[2] کسی نے کہا ہے کہ پہاڑ کا نام زبیر تھا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنا نور منخرِ ثور (بیل کے نتھنے) کے برابر ظاہر کیا۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سوئی کے ناکے کے برابر تجلی تھی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بقدرِ خنصر تجلی کی۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ پہاڑ طور تھا خنصر کے برابر تجلی سے خاک ہو گیا۔[4] سہل بن سعد رضی اللہ عنہ

---

[1] تفسير القرطبي (٧/ ٢٧٩)
[2] تفسير البغوي (٣/ ٢٧٨)
[3] تفسير البغوي (٣/ ٢٧٧_ ٢٧٨)
[4] تفسير الطبري (١٣/ ٩٧)

نے کہا ہے کہ ستر ہزار پردوں میں ایک درہم کے برابر وہ نور ظاہر ہوا تھا۔[1] موسیٰ علیہ السلام اس نور کے ڈر اور ہیبت سے بے ہوش ہو گئے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بے ہوشی جمعرات کے دن یوم عرفہ کو ہوئی تھی، اس کی صبح کو بروز جمعہ یوم نحر کو تورات دی گئی۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب تک اللہ نے چاہا بے ہوش رہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مر گئے۔[3] مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے لفظ ﴿ اَفَاقَ ﴾ کی دلیل سے۔

موسیٰ علیہ السلام کی توبہ کا مطلب:

امام واقدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے تو فرشتوں نے کہا: ابن عمران کو کیا ہوا؟ جو رؤیت کا سوال کیا۔[4] بہر حال جب ہوش میں آئے تو سمجھے کہ میں نے ایک امرِ عظیم کا سوال کیا تھا، جس کا چاہنا لائق نہ تھا، تب "سبحانك" کہا۔ بغیر اجازت سوال کرنے سے معافی چاہی یا رؤیتِ دنیا سے یا سارے نقائص سے یا پھر ویسے سوال کرنے سے توبہ کی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ توبہ کسی گناہ سے نہ تھی، کیونکہ انبیا معصوم ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ قبطی کے قتل سے توبہ کی۔[5] (ذكره القشيري)

لیکن یہ قول اس جگہ بلاوجہ ہے۔ کسی نے کہا ہے: چونکہ رؤیت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی، اس لیے اس سے روکے گئے، تب یہ کہا: ﴿ تُبْتُ اِلَيْكَ ﴾ یعنی ایسے سوال سے توبہ کرتا ہوں۔ یہ قول نہایت بعید ہے۔ پھر کہا کہ میں پہلا ایمان لانے والا ہوں، اپنی موجودہ قوم سے اس زمانے میں اس اعتقاد کے ساتھ کہ تو دنیا میں مرئی نہیں ہوتا باوجود رؤیتِ جواز کے۔[6]

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ! بے شک میں نے اپنے پیغامات پہنچانے اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں میں سے تجھے چن لیا ہے، چناں چہ تو لے لے جو میں نے تجھے دیا ہے اور شکر گزاروں میں (شامل) ہو جا﴿۱۴۴﴾ اور ہم نے اس (موسیٰ) کے لیے (تورات کی) تختیوں میں (زندگی کے) ہر معاملے کے بارے میں نصیحت

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٧٨) [2] تفسير البغوي (٣/ ٢٧٨) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٩٧)
[4] تفسير البغوي (٣/ ٢٧٨) [5] تفسير القرطبي (٧/ ٢٧٩) [6] فتح البيان (٥/ ٨ـ ١٣)

اور ہر پہلو کے متعلق تفصیل لکھ کر دے دی ہے، چناں چہ تو ان (ہدایات) کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کی اچھی اچھی باتوں پر کاربند رہیں۔ جلد ہی میں تمھیں نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا (145)

کلام و رسالت کے لیے موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب:

اس کی بہتر باتیں یعنی جو کرنے کے حکم ہیں اور بری باتیں جن کے نہ کرنے کا حکم ہے اور بے حکموں کا گھر دکھاؤں گا، یعنی اگر تم حکم پر نہ چلو گے تو تم کو اس طرح ذلیل کریں گے جس طرح شام کا ملک ان سے چھین کر تم کو دیا۔ اللہ پاک نے ذکر کیا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ خطاب کیا کہ تم کو ہم نے سارے اہلِ زمان میں سے اپنی رسالت اور کلام کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولادِ آدم علیہ السلام کے سردار ہیں کیا اولین اور کیا آخرین، اسی لیے اللہ نے ان کو ختمِ نبوت اور رسالت کے ساتھ مختص کیا تھا۔ ان کی شریعت قیامت تک جاری رہے گی، ان کے اتباع سارے انبیا اور مرسلین کے اتباع سے زیادہ ہوں گے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بزرگی اور فضیلت سیدنا ابراہیم خلیل علیہ السلام کو ہے، پھر موسیٰ کلیم الرحمان علیہ السلام کو۔ اسی لیے فرمایا کہ اے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنا کلام دیا ہے، تجھ سے سرگوشی کی ہے تو اس بات پر شکر بجا لا، جو بات تیری طاقت میں نہیں ہے وہ مت مانگ۔

الواحِ تورات:

پھر یہ خبر دی ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے واسطے ان تختیوں میں ہر طرح کی نصیحت و موعظت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ تختیاں جواہر کی تھیں، اللہ نے ان تختیوں پر تمام نصیحتیں اور مفصل احکام جن میں حلال اور حرام کی تفصیل تھی، تحریر فرما دیے تھے۔ وہ الواح تورات پر مشتمل تھیں، جس کے بارے میں یوں ارشاد کیا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ ﴾ [القصص: ٤٣] ”اور بلاشبہ ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرت افروز دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی۔“ بعض نے کہا ہے کہ تختیاں تورات سے پہلے دی گئی تھیں، اللہ ہی جانے۔ ہر تقدیر پر یہ تختیاں سوالِ رؤیت کے عوض عطا ہوئی تھیں، رؤیت سے منع کیا گیا تھا۔ واللّٰہ أعلم

فاسقوں کے گھر کی تفسیر:

قوت سے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اطاعت کا پکا عزم رکھو، قوم سے بھی کہہ دو کہ وہ احسن تورات کو پکڑے رہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس امر کے ساتھ مامور تھے جس امر کا حکم قوم کو دیا گیا ہے، اس میں جو امر سخت تر ہو، وہ اس کو اختیار کریں۔[1] فاسقین کے گھر دکھانے سے یہ مراد ہے کہ جو کوئی میرے حکم کے

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ١١٠) اس کی سند میں ”ابو سعد بقال“ ضعیف راوی ہے۔

خلاف کرے گا میں تم کو اس کا انجام دکھا دوں گا کہ کس طرح وہ میری اطاعت سے خروج کرنے کی وجہ سے ہلاکت اور عذاب کی طرف پہنچا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ارشاد ڈانٹ ڈپٹ اور وعید کے طور پر ہے، ان کے لیے جو نافرمان اور مخالفین اور فاسق ہیں۔ یہی معنی امام مجاہد اور حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی مروی ہیں۔[1] یا مراد اہلِ شام ہیں کہ ہم ان کے گھر بار تم کو دیں گے یا مراد قومِ فرعون کی منازل ہیں، مگر اول اول ہے یعنی جس طرح کوئی شخص کسی سے کہتا ہے کہ اب کل تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ مخالف کا انجام کیا ہوگا، اسی طرح یہ تہدید اللہ نے بیان فرمائی۔ واللہ أعلم. کیونکہ یہ ارشاد موسیٰ اور قومِ موسیٰ علیہ السلام کے بلادِ مصر سے انفصال (دور ہو جانے) کے بعد تھا۔ اس خطاب کے مخاطب بنی اسرائیل تھے جو ابھی تیہ کے جنگل میں داخل نہ ہوئے تھے۔

فتح البیان میں الواح کی تفصیل:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اصطفاء اختیار و اجتبا (چن لینا) کو کہتے ہیں۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے معاصرین پر برگزیدہ اور پسند کر لیا، رسول بھی بنایا، کلیم بھی ٹھہرایا، پھر کہا کہ اس شرفِ عظیم اور فضلِ جسیم کا شکر ادا کر۔ بنی اسرائیل دین و دنیا میں جس چیز کے محتاج تھے وہ سب الواح میں لکھ دیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی ہر امر و نہی۔[2] یہی امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[3]

سلف کا اختلاف ہے کہ الواح میں کیا چیز لکھی گئی تھی۔ لکھی ہوئی چیزوں میں تمام اوامر و نواہی کے شامل ہونے پر کوئی چیز مانع نہیں۔ یہی تختیاں تورات تھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ٹھوس پتھر تھیں تو کسی نے کہا ہے کہ خشک لکڑی کی تھیں۔ کسی شے کی بھی ہوں، مگر آسمان سے اتری تھیں۔ تختیوں کی تعداد اور ان کی لمبائی اور چوڑائی کی مقدار کے بارے میں اختلاف ہے۔ لوح کی جمع الواح ہے۔ لوح اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں معانی واضح ہوتے ہیں۔ اللہ نے اس مکتوب کی عزت و شرف کے لیے کتابت کو اپنے نفسِ مقدس کی طرف نسبت کیا۔ ورنہ وہ تختیاں اللہ کے حکم سے لکھی گئی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کتابت کو اللہ نے الواح ہی میں پیدا فرما دیا تھا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا، تورات کو اپنے دستِ مبارک سے لکھا، درخت طوبیٰ اپنے ہاتھ سے لگایا۔[4] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ فردوس کو اپنے ہاتھ سے جمایا۔[5] (رواه الدارمي و ابن النجار وغيرهما عن عبدالله بن الحارث) محفوظ یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے، اس کی سند میں ابو معشر متکلم فیہ ہے۔ سیدنا

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١١٠۔ ١١١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٤) [3] تفسير الطبري (١٣/ ١٠٧)

[4] تفسير البغوي (٣/ ٢٨١) [5] الأسماء والصفات للبيهقي (٢/ ١٢٥)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے چار چیزیں اپنے ہاتھ سے پیدا کی ہیں: عرش، قلم، عدن اور آدم۔[1] میسرہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کسی شے کو نہیں چھوا، سوائے تین چیزوں کے: آدم کو اپنے ہاتھ سے بنایا، تورات اپنے ہاتھ سے لکھی، جنتِ عدن کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔ اسی کے لگ بھگ کعب سے بھی مروی ہے۔[2] (رواه الدارمي) سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ نے الواح موسیٰ علیہ السلام کے واسطے لکھیں، موسیٰ علیہ السلام لوح میں قلموں کی آواز سنتے تھے۔[3]

جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ وہ الواح جو موسیٰ علیہ السلام پر اتریں، جنت کے بیر کی تھیں، ہر لوح کا طول بارہ گز کا تھا۔ (أخرجه ابن أبي حاتم و أبو الشيخ و ابن مردويه) امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ الواح سرخ یاقوت کے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ زمرد کے تھے۔ کتابت سونے کی سنہری تھی، اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔ آسمان والوں کے قلموں کی آواز سنی۔[4] اللہ سعید پر رحم کرے، ان کو ایسی بات اپنے جی سے کہنے کی کیا ضرورت تھی جو بات اپنی رائے سے نہیں کہی جاتی نہ گمان یا اندازے سے کہی جاتی ہے۔

ظنِ غالب یہ ہے کہ اکثر سلف ایسی باتیں یہود سے پوچھا کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کے اقوال مختلف اور مضطرب آئے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ وہ لکڑی کی تختیاں تھیں، دوسرا کہتا ہے کہ یاقوت کی تھیں، تیسرے نے کہا ہے کہ زمرد کی اور چوتھے نے کہا ہے کہ زبرجد کی۔ کسی نے کہا ہے کہ اولے کی۔ کسی نے کہا ہے کہ پتھر کی۔ ٹھیک بات یہ ہے کہ وہ الواح تھیں، ان میں کتاب تورات لکھی تھی، اللہ جانے کس چیز کی تھیں، ہم کو اس مدتِ دراز کے بعد اب اس کے کریدنے کی کوئی ضرورت نہیں، نہ ہم یہود کی بات کو سچا کہہ سکتے ہیں نہ جھوٹا بنا سکتے ہیں، نہ اس بال کی کھال اتارنے میں کوئی دنیا کا نفع ہے اور نہ ہی آخرت کے نفع کا کوئی تصور کیا جا سکتا ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے پیغمبر سے فرمایا ہے، اس پر ایمان لانا اور ہندی کی زیادہ چندی نہ کرنا کافی وافی اور شافی ہے۔ بہرحال تورات مقدس ایک تو بنی اسرائیل وغیرہم کے لیے نصیحت تھی جو کوئی اس سے نصیحت پکڑنا چاہتا۔ نصیحت کی حقیقت تذکیر اور تحذیر (ڈر دلانا) ہے، یعنی یاد دلانا انجامِ نیک کا اور ڈرانا انجامِ بد سے۔ دوسری چیز اس میں ہر شے کی تفصیل تھی، یعنی جن احکام کی وضاحت کی ضرورت تھی جو اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام بیان کرنے کے لائق تھے، ان سب کا ذکر کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ تورات ستر اونٹ کا وزن تھا۔ کسی نے کہا اس کتابِ شریف کو پورا نہ پڑھا، مگر چار شخصوں نے: موسیٰ، یوشع، عزیر اور عیسیٰ علیہم السلام نے۔

قوت سے پکڑنے کا مطلب:

پھر اللہ نے کہا: اے موسیٰ! لے اس کو، یعنی الواح کو، یا رسالات کو، یا ہر شے کو، یا تورات کو بہت کوشش اور نشاط

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٤٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٩/ ٦٩٤) [3] تفسير الطبري (١٣/ ١٢٤) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٣)

سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہوشیاری سے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طاعت سے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اجتہاد سے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ قوتِ قلب سے۔ کسی نے کہا ہے کہ صحتِ عزیمت اور نیتِ صادقہ سے، ہوسکتا ہے کہ لفظِ قوت سے، یہ سب امور مراد ہوں۔

پھر فرمایا کہ قوم کو بھی حکم دو کہ وہ تورات میں جو بہتر چیز لکھی ہے، جس کا اجر دوسری چیزوں سے بڑھ کر اور زیادہ ہے، اس کو لے لیں اور اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [الزمر: ٥٥] ''اور تم اس بہترین چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف نازل کی گئی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ﴾ [الزمر: ١٨] ''پھر جو بہترین بات ہو اس کی اتباع کرتے ہیں۔'' من جملہ احسن کے ایک یہ ہے کہ غیر پر صبر کرے، اس کا قصور معاف کرے، عمل عزیمت پر بجا لائے نہ کہ رخصت پر، فریضہ پر چلے، نہ کہ نافلے پر۔ جس کا حکم دیا گیا ہے اس کو اختیار کرے، جس سے ڈرایا گیا ہے، اسے چھوڑ دے اور جو کچھ مقدر ہے، اس پر صبر و شکر اختیار کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے۔ امثال میں تدبر و تفکر کرے، متشابہ پر متوقف ہو، موسیٰ علیہ السلام ساری قوم سے بڑھ کر عابد تھے، اس لیے جو امر ان کو ہوا وہ قوم کو نہ ہوا۔[2] حسن نے کہا کہ احسن میں واجب، مستحب اور مباح داخل ہے۔

احسن سے مراد زیادہ شدید اور نفس پر بھاری کام کو کرنا ہے یا احسن بمعنی حسن ہے، سو ساری تورات حسن تھی۔ اب میں تم کو فساق، یعنی کفار کا گھر دکھاؤں گا۔ یہی قول ہے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا۔[3]

فاسقوں کے گھر دکھانا:

فاسقین کے گھر سے اس جگہ زمینِ مصر مراد ہے جو فرعون اور اس کی قوم کے پاس تھی۔ (قاله عطية العوفي) یا وہ عاد و ثمود کے منازل تھے، یہ امام کلبی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا جہنم، یہ امام حسن اور عطا رحمہما اللہ کا قول ہے۔[4] یا جبابرہ و عمالقہ کے منازل تھے، تاکہ ان کو دیکھ کر عبرت پکڑیں، یہ امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا ملکِ شام، جہاں قرونِ ماضیہ کے منازل تھے۔ یا مراد دار سے ہلاک شدہ لوگوں کے گھر ہیں، یعنی عنقریب تم کو ہلاکتِ فاسقین کا ملاحظہ کرواؤں گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آخرت کی طرف بازگشت ہے۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دنیا کے منازل ہیں۔[6]

دکھلانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم کو ان گھروں میں بطور وارث داخل کریں گے، بعض نے اسی جگہ سے ساورثکم پڑھا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٠٩) [2] تفسير البغوي (٣/ ٢٨١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٦) اس کی سند میں ''بشر بن عمارة'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير البغوي (٣/ ٢٨١۔ ٢٨٢) [5] تفسير الطبري (١٣/ ١١١) [6] الدر المنثور (٣/ ٥٦٢)

الْأَرْضِ وَمَغْرِبَهَا﴾ [الأعراف: ١٣٧] ’’اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا۔‘‘ (1) (قاله أبو السعود)

یہ قول اس قول کی تردید کرتا ہے کہ اس جگہ گھر سے مراد جہنم ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ سے تعجب ہے کہ انھوں نے کس طرح اس کو تصحیف اور تحریف کے دعوے سے رد کیا ہے، حالانکہ اس کے خلاف بات مقرر ہو چکی۔ حالانکہ کتاب ’’حسن المحاضرة‘‘ میں لکھا ہے کہ اکثر لوگوں کی زبان پر یہ بات مشتہر ہے کہ دار الفاسقین سے مراد مصر ہے۔ حالانکہ ابن الصلاح وغیرہ حفاظ نے کہا ہے کہ یہ غلط ملط تصحیف سے پیدا ہوا ہے۔ مجاہد وغیرہ مفسرین سلف سے ﴿سَأُورِيكُمْ... الخ﴾ کی تفسیر میں مَصِيرَهُمْ آیا ہے، اس کی تصحیف ہوگئی۔ جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل شام کو جا کر پھر مصر کی طرف آئے اور قبطیوں کی زمین اور اموال کے مالک ہو گئے۔ امام قرطبی اور کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ (2) اور یہی قول حسن ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مصر کو پھر کر نہیں آئے، یہ قول سخت ضعیف ہے۔ (3)

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٤٦﴾ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٧﴾

اور جلد ہی میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں (کی نگاہوں) کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اگر وہ ہدایت کی راہ دیکھ لیں تو اسے اختیار نہیں کریں گے۔ اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے اختیار کر لیں گے، یہ اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل رہے ﴿146﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، ان کے عمل برباد ہوگئے۔ انھیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو کچھ وہ (دنیا میں) کرتے رہے تھے ﴿147﴾

متکبر اللہ کی آیات اور علم سے محروم ہیں:

الواح دے کر یہ بھی فرما دیا کہ قوم کو پابند کرو کہ عمل کریں اور یہ بھی فرما دیا کہ جو بے انصاف ہیں اور حق

(1) تفسير أبي السعود (٣/ ٢٧١) (2) تفسير القرطبي (٧/ ٢٧٢) (3) فتح البيان (٤/ ١٤/ ١٧)

پرست نہیں، ان کے دل میں پھیر دوں گا، اس پر عمل نہ کریں گے، یعنی ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔ اسی طرح بہشت اور دوزخ بھی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں حجتوں اور دلیلوں کا فہم و ادراک منع کر دوں گا، یعنی متکبرین کے دلوں پر جو میری اطاعت سے تکبر کرتے ہیں اور لوگوں کو حقیر جانتے ہیں، یعنی جس طرح انھوں نے ناحق غرور کیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہل بنا کر ذلیل وخوار کر دیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ''اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ [الصف: ٥] ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہوگئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔''

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جو آدمی شرمگین یا تکبر کرنے والا ہوتا ہے، اس کو علم نہیں ملتا۔ کسی نے کہا ہے کہ جس نے ایک دم علم حاصل کرنے کے لیے اپنی ذلت پر صبر نہ کیا، وہ ساری عمر جہالت کی ذلت میں رہا۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی میں ان سے قرآن کا فہم چھین لوں گا اور ان کو اپنی آیتوں سے پھیر دوں گا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس امت کو خطاب ہے۔[1] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ ضروری نہیں ہے۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ یہ حکم ہر امت کے حق میں متواتر ہے، اس بارے میں کسی امت اور اس امت کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے۔[2] واللہ أعلم.

یہ ارشاد کہ اگر نشانیاں بھی دیکھیں تو ایمان نہ لائیں، اس آیت کی مثل ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [یونس: ٩٦] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' پھر فرمایا کہ اگر انھیں ہدایت کی راہ اور نجات کا راستہ ظاہر ہو تو بھی اس راستے پر نہ چلیں اور اگر ہلاکت اور گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اسی کو راستہ بنا لیں۔ یہ اس لیے کہ ان کے دل ہماری آیتوں کو جھٹلانے والے اور عمل سے غافل ہیں۔ پھر فرمایا کہ آیات اور آخرت کو جھٹلانے والوں کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، یعنی اگر مرتے دم تک اسی حال پر قائم رہے۔ ان کو جزا ان کے عمل کی ملے گی، خیر کی خیر اور شر کی شر۔ كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم تکبر کرنے والوں کو کتاب، یعنی قرآن پاک کے فہم سے روک دیں گے۔ یہ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیات میں غور وفکر کرنے سے پھیر دیں گے۔[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت سے مراد زمین اور آسمانوں کی پیدایش ہے۔ آسمان و زمین اللہ کی نشانیاں ہیں۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ١١٢۔ ١١٣)
[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٢٩)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٧)
[4] الدر المنثور (٣/ ٥٦٢)

کسی نے کہا ہے کہ ایمان سے پھیر دیں گے، وہ ان آیات کی ہرگز تصدیق نہ کریں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ پھیرنا نفع (فائدہ) سے ہے، یہ ان کے تکبر کی جزا ہے۔ یا یہ مراد ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے۔ وہ غور وفکر اور عبرت حاصل کرنے سے باز رہ جائیں گے۔ پھر کسی نے کہا ہے کہ آیات سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ نازل کی گئی کتابیں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ دنیا کی پیدایش ہے۔ اس بات سے کوئی مانع نہیں ہے کہ آیات کے لفظ کو ان تمام معانی پر محمول کیا جائے۔

تکبر غیر پر اپنے نفس کی بڑائی کے اظہار کو کہتے ہیں، یہ صفت بندوں کے حق میں مذموم ہے، یعنی وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اوروں سے افضل ہیں، ان کا یہ تکبر کرنا ناحق ہے۔ وہ کسی قسم کی بھی نشانیاں دیکھیں، خواہ وہ آیاتِ منزلہ یا تکوینیہ ہوں یا معجزات ہوں، ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ ان کا کام یہ ہے کہ سبیلِ ہدایت کو ترک کر دیں، سرکشی کی راہ پر چلیں۔ رشد سے مراد حق وسیدھا اور صحیح بات ہے، جس کو انھوں نے چھوڑ رکھا ہے۔

غَيّ سے مراد گمراہی اور باطل ہے، جس کو انھوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ تکبر اور آیات پر ایمان نہ لانا، سبیلِ رشد سے اجتناب کرنا اور گمراہی اور سرکشی کے راستے پر چلنا اس لیے ہے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلانے والے ہیں اور ان میں غور وفکر کرنے اور سمجھنے سے غافل ہیں۔ ان میں سے جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور آخرت کے قائم ہونے کو جھوٹ بتلاتے ہیں، ان کے اعمال ضائع یعنی باطل ہیں، گو ظاہر میں وہ طاعت کی صورت ہی میں کیوں نہ ہوں، جیسے صدقہ اور صلہ رحمی۔ اگرچہ حالتِ کفر میں اس قسم کے طاعت کے کام ان کے کسی فائدے کے نہیں ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ وہ باطل ہیں، اس کے باوجود کہ ان سے فائدے کی امید تھی، اگر وہ اسلام کی حالت میں ہوتے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے: "أَسْلَمْتَ عَلىٰ مَا أَسْلَفْتَ مِنْ خَيْرٍ"[1] یہ جزا نہیں ہے، مگر ان کے عمل کی کہ جیسا کرتے ہیں، ویسا ہی پائیں گے۔[2]

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور موسیٰ کی قوم نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا، وہ ایک جسم تھا جس کی آواز گائے کی تھی۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ ان سے کلام نہیں کرتا اور نہ انھیں کوئی راستہ بتاتا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٣)
[2] فتح البيان (٤/ ١٨۔ ١٩)

ہے؟ (پھر بھی) انھوں نے اسے (معبود) بنا لیا اور وہ ظالم تھے ﴿148﴾ اور جب انھیں شرمندگی ہوئی اور انھوں نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں تو کہنے لگے: اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں (شامل) ہو جائیں گے ﴿149﴾

بچھڑا بنانے اور اس کی پوجا کا واقعہ:

اللہ نے ان لوگوں کی خبر دی جو من جملہ بنی اسرائیل کے بچھڑے کو پوج کر گمراہ ہو گئے کہ سامری نے قبطیوں کے زیور سے جو انھوں نے مستعار لیا تھا، ان کے لیے بچھڑے کی شکل بنا کر اس کے منہ میں ایک مٹھی مٹی ڈال دی جو اس نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے پاؤں کے نشان سے لی تھی۔ وہ بچھڑا آواز کرنے لگا۔ ﴿خُوَارٌ﴾ گائے کی آواز کو کہتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام تو میقات پر گئے تھے، ان کے پیچھے انھوں نے یہ بدطوری کی۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو وہیں طور پر اس حال کی خبر دی، چنانچہ فرمایا: ﴿فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ﴾ [طٰهٰ: ٨٥] ''چناں چہ بے شک ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو آزمایش میں ڈال دیا، اور انھیں سامری نے گمراہ کر دیا۔''

مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ گوشت وخون کا دھڑ بن کر آواز کرنے لگا یا بدستور سونے کا رہا۔ اس کے اندر ہوا گھستی اس سے گائے کی سی آواز نکلتی۔ یہ دو قول ہیں۔ واللہ أعلم.

گوسالہ پرستی کی عقلی تردید:

کہتے ہیں کہ جب دھڑ نے آواز کی تو بنی اسرائیل اس کے ارد گرد ناچنے لگے، فتنے میں پڑ گئے۔ سامری نے کہا کہ تمھارا اللہ اور موسیٰ کا اللہ، یعنی معبود یہی دھڑ ہے اور اللہ کو بھول گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ [طٰهٰ: ٨٩] ''بھلا وہ دیکھتے نہیں تھے کہ بلاشبہہ وہ (بچھڑا) ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے کسی نفع ونقصان کا مالک ہے۔'' اور اس جگہ یوں کہا ہے کہ انھوں نے نہ دیکھا کہ وہ ان سے بولتا نہیں ہے، غرض کہ وہ بچھڑے کی محبت میں اندھے بہرے ہو گئے، جس طرح حدیث میں آیا ہے: « حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ » ''کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔''[1] ان آنکھوں پر جہالت اور گمراہی کا پردہ پڑ گیا، پھر جب سمجھے کہ وہ بہک گئے ہیں تو اپنے فعل پر نادم ہو کر اپنے گناہ کا اعتراف کر کے اللہ سے التجا کرنے لگے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام جب طور پر مناجات کے لیے گئے تو یاروں نے اُس زیور سے جو عید کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٣٠) اس کی سند میں ''ابوبکر بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٨٦٨)

آرایش کے لیے قومِ فرعون سے عاریتاً لیا تھا اور پھر یکایک مصر سے نکلنا ہوا تو وہ زیور انھی کے ہاتھ میں رہ گیا۔ فرعون اپنی قوم کے ساتھ ڈوب گیا، یہ اُس کے مالک ہو گئے، اُس زیور سے ایک دھڑ بنایا۔ حُلِيٌ، حِلِيٌ حَلِيٌ ہر تین طریقوں سے آیا ہے۔ وہ زیور سونے چاندی کا تھا، جس سے بچھڑا بنایا، وہ گائے کی جیسی آواز تھی۔ جمہور مفسرین رحمہ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[1]

خوار کے معنی ہیں صیاح (آواز نکالنا) بنایا تو سامری نے تھا، مگر اس کی نسبت قوم کی طرف فرمائی، اس لیے کہ سامری اسی قوم کا ایک شخص تھا، وہ سب اس کے فعل سے راضی تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ گوشت اور خون کا ایک جسم تھا۔[2] بعض نے کہا ہے کہ وہ بے روح کا ایک جسم تھا، ہوا کے آنے جانے سے آواز کرتا تھا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ گائے کی بولی بولتا تھا، وہب نے کہا کہ آواز سنی جاتی، مگر حرکت نہ کرتا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آواز کرتا تھا اور چلتا پھرتا بھی تھا۔[3] بعض نے (خوار کے بجائے) جوار جیم سے پڑھا ہے، بمعنی سخت آواز کے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ کیسا معبود ہے جس کو بات کرنے کی طاقت نہیں ہے، یہ کیا نفع و نقصان پہنچا سکے گا یا کوئی راہ بتائے گا۔ وہ اس کام میں ستم گار نابکار تھے، لیکن جب موسیٰ علیہ السلام میقات سے پھر کر آئے اور ان کو یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہو گئے ہیں، بچھڑے کو پوج کر اور پشیمان ہو کر اللہ سے فریاد، آہ و زاری، دعا اور اپنی معافی کی درخواست کرنے لگے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرنے لگے۔ سورت طٰہٰ میں آئے گا کہ ان کا یہ کلام موسیٰ علیہ السلام کے طور سے واپس آ جانے کے بعد تھا اور یہاں اُس کو موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے سے پہلے ذکر کیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ان سے جو قول و فعل صادر ہوا ہو، اس کا بیان ایک ہی جگہ میں آ جائے۔[4]

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۵۰ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖؗ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۱۵۱

اور جب موسیٰ غصے اور رنج میں بھرے اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو (ان سے) کہا: میرے (جانے

---

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٨٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٦٨)
[3] تفسير الطبري (٦/ ٦٥) [4] فتح البيان (٥/ ٢٠۔ ٢٢)

کے) بعد تم بہت برے جانشین ہوئے ہو! کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے (منہ موڑنے میں) جلدی کی؟ اور انھوں نے (تورات کی) تختیاں (زمین پر) ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ (اس پر) ہارون نے کہا: اے ماں جائے! بے شک ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور وہ مجھے قتل کرنے پر اُتر آئے تھے، چناں چہ تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے اور مجھے ان لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر جو ظالم ہیں ﴿150﴾ موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! تو مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب مہربانوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ﴿151﴾

موسیٰ علیہ السلام کی واپسی پر ناراضی اور بھائی کو سرزنش:

ہارون علیہ السلام اور ان کی اولاد موسیٰ علیہ السلام کی امت میں امام تھے، لیکن جب ان کی جگہ خلیفہ ہوئے تو امت حکم میں نہ رہی۔ خلافت اور کی قسمت میں تھی۔ خلیفہ وہ کہ امت کو دین و دنیا کے بندوبست میں رکھے، جس طرح پیغمبر سنوار گیا، تاکہ حق کی مدد ان کے ساتھ رہے اور امام وہ کہ پیغمبر کا یادگار ہو جو خدمت اور نیاز پیغمبر کی منظور ہو، سو امت ان سے کرے، تاکہ برکت اور قبولیت پائیں۔ تورات میں امام کے لوازم دیکھے تو معلوم ہوا۔ سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اسف شدید غصے کو کہتے ہیں۔[1]

سوئے خلافت سے مراد بچھڑے کی عبادت ہے۔ استعجال امر رب سے یہ مراد ہے کہ تم نے میرا اپنے پاس جلدی آنا چاہا، حالانکہ وہ تو اللہ کی طرف سے ایک مقرر مدت کے لیے تھا۔ تختیاں زمرد یا یاقوت یا برد یا بیری کی لکڑی کی تھیں، جن کو ہاتھ سے ایک طرف رکھ دیا، اس مضمون پر حدیث میں دلیل ہے: ”لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ“[2] ”سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات کی طرح نہیں ہوتی۔“

آیت کا ظاہر سیاق یہ ہے کہ تختیوں کو رکھ دینا قوم پر غصے کے طور پر تھا۔ یہی جمہور سلف اور خلف کا قول ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے اس جگہ پر ایک غریب قول نقل کیا ہے جس کی اسناد امام قتادہ رحمہ اللہ کی حکایت کی طرف صحیح نہیں ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ اور بہت سے علما نے اس کا رد کیا ہے اور یہی لائق بھی ہے، گویا امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس قول کو بعض اہلِ کتاب سے حاصل کیا ہے۔ اہلِ کتاب میں کذاب، وضع کرنے والے، بہتان لگانے والے اور زنادقہ ہوتے ہیں۔[3]

بھائی کا سر پکڑ کر اس لیے کھینچا کہ کہیں انھوں نے برائی سے منع کرنے میں کوتاہی نہ کی ہو جس طرح دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْا ﴿92﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿93﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۱۲۰)

[2] مسند أحمد (۱/ ۲۱۵) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۵۱) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۱۳/ ۱۲۳۔ ۱۲۴) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۳۱)

﴿ تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴾ [طٰہٰ: ۹۲-۹۴]
''اس (موسیٰ) نے کہا: اے ہارون! تجھے کس چیز نے روکے رکھا، جب تو نے انھیں دیکھا کہ وہ بھٹک گئے ہیں۔ کہ تو نے میری اتباع نہ کی؟ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی؟ اس (ہارون) نے کہا: اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور میرا سر نہ پکڑ، یقیناً میں ڈرا کہ تو کہے گا: تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا انتظار نہ کیا۔'' اور یہاں یوں کہا: ﴿ اِبْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ... الخ ﴾ (آیتِ باب) یعنی تو مجھ کو ان گناہ گاروں میں شامل نہ کر۔

ماں کا بیٹا اس لیے کہا کہ زیادہ نرمی پیدا کرے اور نفع دے، ورنہ موسیٰ، ہارون کے حقیقی بھائی ایک ہی ماں باپ سے تھے نہ صرف ماں کی طرف سے۔ موسیٰ علیہ السلام کو ہارون علیہ السلام کی بریت متحقق (ثابت) ہوگئی جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴾ [طٰہٰ: ۹۰] ''اور بلاشبہہ اس سے پہلے ہارون نے ان سے کہا تھا: اے میری قوم! یقیناً اس (بچھڑے) کے ساتھ تم آزمائے گئے ہو، اور یقیناً تمھارا رب رحمان ہے، لہٰذا تم میری اتباع کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو۔'' تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی: ﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ... الخ ﴾ (آیتِ باب)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوْسٰى لَيْسَ الْمُعَايِنُ كَالْمُخْبِرِ أَخْبَرَهُ رَبُّهُ عَزَّوَجَلَّ أَنَّ قَوْمَهُ فُتِنُوْا بَعْدَهُ فَلَمْ يَلْقَ الْأَلْوَاحَ فَلَمَّا رَآهُمْ وَعَايَنَهُمْ أَلْقَى الْأَلْوَاحَ » ''اللہ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے: معاینہ کرنے والا خبر دیے جانے والے کی طرح نہیں ہوتا، اس کو اس کے رب عزوجل نے خبر دی کہ اس کی قوم کی اس کے بعد آزمایش کی گئی ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے تختیاں نہیں رکھیں، پھر جب ان کو (اپنی قوم کو) دیکھا اور معاینہ کیا تو تختیوں کو ڈال دیا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسف شدید غضب ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اسف غضب اور سخت تر غضب کے سوا ایک اور درجہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسف حزن (افسوس) ہے۔ اسیف حزین ہے، امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب ہیں، اس لیے کہ غضب حزن سے اور حزن غضب سے ہوتا ہے۔ جب کوئی ناپسندیدہ امر تیرے پاس تجھ سے کم درجہ شخص کی طرف سے آتا ہے تو اس وقت تجھ کو غضب ہوتا ہے اور جب وہ ناپسندیدہ امر تیرے پاس ایسے شخص کی طرف سے آتا ہے جو تجھ سے اوپر ہوتا ہے تو حزن ہوتا ہے، اس وجہ سے ایک حالت کا نام حزن ہوا، دوسری حالت کا نام غضب ٹھہرا۔[3]

---

[1] مستدرك الحاكم (۲/ ٤١۲) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] الدر المنثور (۳/ ٥٦٤) [3] تفسیر الخازن (۲/ ۲۹۱)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے لوٹنے سے پہلے یہ خبر کر دی تھی کہ ان کی قوم بہک گئی ہے۔ سامری نے قوم کو گمراہ کر ڈالا۔ وہ بڑے غصے اور غم میں بھرے ہوئے تھے۔[1] وہاں سے پھرے اور قوم سے کہا کہ تم نے میرے پیچھے یہ کیا کام کیا؟ قوم کی مذمت اور ان کے کام سے انکار اس لیے کیا کہ قوم آیات کے اس آنے جانے کو دیکھ چکی تھی۔ سب آیات کو جانے دو، بعض آیات ہی کا مشاہدہ شرک و کفر سے ہٹ جانے اور صرف اللہ پر ایمان لانے کے لیے کافی اور شافی تھا، لیکن بنی اسرائیل کی تلون مزاجی اور کاموں میں اضطراب اسی طرح پر تھا کہ جھٹ پٹ بدل جاتے تھے۔

پھر خفا ہو کر کہا کہ تم نے امر ربی یعنی میقات کی مدت میں جلدی کر کے یہ کام کیوں کیا؟ ایک چلّے تک صبر کیوں نہ کیا؟ یا تم نے رب کی ناراضی لینے میں جلدی کی۔ یا بچھڑے کی عبادت میں عجلت کی۔ پھر نہایت غصے میں آ کر جن تختیوں میں تورات تھی، ان کو ایک طرف ڈال دیا۔ یہ بات موسیٰ علیہ السلام سے حمیتِ دین کی وجہ سے سرزد ہوئی، جب کہ قوم کو بچھڑے کی عبادت میں مصروف پایا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب تختیاں زمین پر ڈال دیں تو وہ ٹوٹ گئیں، ان کا چھٹا حصہ رہ گیا، باقی اٹھا لیے گئے۔[2] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اس کے چھے اسباع (سات حصوں میں سے چھے) اٹھا لیے، ایک سبع باقی رہ گیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ڈالنے سے تفصیل چلی گئی، یعنی غیب کی خبریں۔ ہدیٰ باقی رہ گئی یعنی مواعظ اور احکام۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تختیاں نو عدد تھیں، دو مرفوع ہو گئیں، سات باقی رہ گئیں۔[3] حاشیہ زادہ میں لکھا ہے کہ القاء سے مراد یہ ہے کہ ان تختیوں کو ایک طرف رکھ دیا، تاکہ فارغ ہو کر قوم سے گفتگو کریں، نہ کہ بے رغبتی کریں۔ چنانچہ اسی لیے جب گفتگو کر کے واپس آئے تو ان کو بعینہا اٹھا لیا۔

سر کے پکڑنے سے مراد یہ ہے کہ سر اور ڈاڑھی کے بال شدتِ غضب سے پکڑے نہ کہ بطورِ اہانت کے۔

ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ نہایت غصے سے سر کی طرف بڑھایا اور ہارون علیہ السلام کے ساتھ یہ کام کیا، یعنی اس وجہ سے کہ انھوں نے سامری کو منع کیوں نہ کیا اور اس منکر فعل کو بنی اسرائیل سے دور کیوں نہ کر دیا۔ ہارون علیہ السلام نے اپنا عذر ظاہر کیا۔[4]

موسیٰ علیہ السلام کو ابن ام کے لفظ سے یاد کیا، کیونکہ یہ کلمہ ملائمت، نرمی اور مہربانی کا ہے۔ اسی لیے ماں کا حق بہت بڑا ہوتا ہے اور وہ زیادہ تر مراعات کی حق دار ہوتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے بہت سے خوف اور تکالیف کا بوجھ ان کے لیے اٹھایا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ مومنہ بھی تھیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہارون علیہ السلام ماں کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے نہ کہ باپ کی طرف سے۔[5] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہارون، موسیٰ علیہما السلام سے تین برس بڑے تھے،

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٢٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٧٠) [3] الدر المنثور (٣/ ٥٦٤_٥٦٥)
[4] تفسير الخازن (٢/ ٢٩١) [5] تفسير القرطبي (٧/ ٢٩٠)

ان کی ماں کے ہمراہ آئے تھے۔ اسی لیے بنی اسرائیل کو زیادہ ترمحبوب تھے۔ [1]

شماتت کسی کی مصیبت پر خوش ہونے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْءِ الْقَضَاءِ، وَدَرْكِ الشَّقَاءِ، وَجَهْدِ الْبَلَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ» [2] یعنی ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم میرے ساتھ ایسا کام نہ کرو جس سے میرے دشمن خوش ہوں اور مجھ کو گناہ گار قوم میں شمار نہ کرو، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے دعائے مغفرت کی، گویا اپنے فعل پر نادم ہوئے اور اللہ سے رحمت چاہی۔ [3]

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ۝۱۵۲ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۵۳

بے شک وہ لوگ جنھوں نے بچھڑے کو معبود بنایا، جلد ہی ان کے رب کا غضب ان پر آن پہنچے گا اور (انھیں) دنیا کی زندگی میں ذلت نصیب ہوگی اور ہم بہتان باندھنے والوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (152) اور وہ لوگ جنھوں نے برے عمل کیے، پھر ان کے بعد توبہ کی اور ایمان لے آئے، بے شک آپ کا رب اس کے بعد (ضرور انھیں بخش دے گا کیوں کہ وہ) بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (153)

گوسالہ پرستوں کے لیے اللہ کا غضب اور دنیا کی ذلت:

وہ غضب جو بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت پر پہنچا، وہ یہ تھا کہ اللہ نے ان کی توبہ اس وقت تک قبول نہ کی جب تک کہ بعض نے بعض کو قتل نہ کیا۔ جس طرح سورت بقرہ میں گزر چکا ہے: ﴿ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ [البقرة: ٥٤] ''لہٰذا اب تم اپنے پیدا کرنے والے کے حضور توبہ کرو، اور تم اپنے آپ کو قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہت بہتر ہے۔ پھر اللہ نے تم پر توجہ کی، بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' رہی ذلت تو اللہ نے ان کو دنیا کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے ذلیل وخوار کر رکھا ہے۔

یہ ارشاد کہ اسی طرح ہم مفترین کو سزا دیتے ہیں، ہر اُس شخص کو شامل ہے جو بدعت نکالنے والا ہے، کیونکہ بدعت کی ذلت اور ریاست کی مخالفت اس کے دل سے جدا ہو کر اس کے کندھے پر آتی ہے جس طرح امام حسن

---

[1] تفسير أبي السعود (٣/ ٢٧٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٧)

[3] فتح البيان (٥/ ٢٣۔ ٢٥)

بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”إِنَّ ذِلَّ الْبِدْعَةِ عَلٰی أَكْتَافِهِمْ وَإِنْ هَمْلَجَتْ بِهِمُ الْبِغَالُ وَطَقْطَقَتْ بِهِمُ الْبَرَاذِيْنُ“[1] ”بدعت کی ذلت ان کے کندھوں پر سوار ہے، چاہے یہ خراماں خچروں اور عجمی گھوڑوں کی سواری کریں۔“ امام ابو قلابہ جرمی رحمہ اللہ نے اس آیت کو پڑھ کر یوں کہا ہے: ”هِيَ وَاللّٰهِ لِكُلِّ مُفْتَرٍ إِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ“ ”اللہ کی قسم! یہ قیامت تک کے ہر افتراء پرداز کے لیے ہے۔“ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”كُلُّ صَاحِبِ بِدْعَةٍ ذَلِيْلٌ“[2] ”ہر بدعتی ذلیل ہے۔“

ہر گناہ کی توبہ ہے:

پھر اللہ پاک نے اپنے بندوں کو آگاہ کیا کہ اللہ ہر گناہ سے توبہ قبول کرتا ہے، یہاں تک کہ گو شرک یا کفر یا نفاق یا شقاق ہی کیوں نہ ہو، اسی لیے اس قصے کے بعد توبہ پر بخشش اور رحمت کا وعدہ فرمایا ہے۔ امام علقمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اُس شخص کا کیا حکم ہے جس نے ایک عورت سے زنا کیا، پھر اسی سے بیاہ کیا، انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ... الخ﴾ (آیتِ باب) اس آیت کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے دس بار پڑھا، نہ ان کو امر کیا نہ منع کیا۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کو اپنا معبود ٹھہرایا، ان پر اللہ کا غضب پڑا، دنیا میں قتل ہوئے، آخرت میں دیکھیے کیا گت بنتی ہے؟ دنیا میں ذلیل ہوئے: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ﴾ [البقرة: ٦١] ”اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔“ ذلت سے مراد بعض کے نزدیک دیار سے نکالا جانا ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ اس غضب اور ذلت کو دنیا ہی کے ساتھ مخصوص رکھیں، اللہ کے فرمان کی روشنی میں: ﴿فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (آیتِ باب) یہ بلا خاص ان پر پڑی جو بچھڑے کی عبادت کرتے تھے، نہ ان کی بعد والی اولاد پر۔ قتلِ نفس اور شہروں سے نکالے جانے میں غضب اور ذلت دونوں جمع ہو گئے۔

رہی وہ ذلت جو ان کی اولاد کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پہنچی، جس طرح کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[4] سو آیت کی تفسیر اس کے ساتھ صحیح نہیں، مگر اسی صورت میں کہ آیت کو حقیقی معنی پر محمول نہ سمجھا جا سکے اور اس جگہ یہ بات نہیں ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ غضب و ذلت ان کے لیے ہوئی جو بچھڑے کی عبادت کی حالت میں مر گئے، قتل سے بھاگے۔ سو یہ قول گو کسی وجہ سے درست ہو سکے، لیکن جمیع مفسرین کے خلاف ہے۔[5]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٣١) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ١٣٥۔ ١٣٦) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٧٢) اس کی سند صحیح ہے۔
[4] تفسیر الخازن (٢/ ٢٩٢) [5] تفسیر الخازن (٢/ ٢٩٢)

اللہ نے فرمایا کہ جیسا کام ہم نے ان بچھڑے کی عبادت کرنے والوں کے ساتھ کیا، ایسی ہی جزا ہم افترا کرنے والوں کو دیتے ہیں۔ ایوب نے کہا ہے کہ یہ ہر مفتری کی جزا ہے کہ قیامت تک ذلیل رہے گا۔ ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: ''هٰذَا فِيْ كُلِّ مُبْتَدِعٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ'' مالک بن انس رحمہ اللہ نے کہا: ''مَا مِنْ مُبْتَدِعٍ إِلَّا وَهُوَ يَجِدُ مَا فَوْقَ رَأْسِهِ ذِلَّةً'' پھر یہ آیتِ باب پڑھ کر کہا: ''اَلْمُبْتَدِعُ مُفْتَرٍ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ'' ''بدعتی دین اللہ میں افترا کرنے والا ہوتا ہے۔''[1] افترا دروغ بندی کو کہتے ہیں، سو جو کوئی اللہ پر افترا کرتا ہے، اس کو دنیا کی زندگی میں اللہ کا غضب اور ذلت پہنچتی ہے، گو بعینہٖ ویسی نہ ہو جیسی بچھڑے کے عبادت گزاروں کو پہنچی تھی، کیونکہ غضب اور ذلت کے مصداق کوئی چیز ہوسکتی ہے، کسی طرح کا کیوں نہ ہو۔ کوئی افترا اس قولِ سامری سے بڑھ کر نہیں ہے کہ یہ گوسالہ تمھارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے۔

پھر اللہ نے یہ بھی فرما دیا کہ جس نے کوئی گناہ کیا ہے، خواہ کفر ہو یا کفر سے کم تر ہو، جیسے بچھڑے کی عبادت وغیرہ، پھر اس نے توبہ کر لی، ایمان لے آیا تو اے پیغمبر! اللہ اس توبہ کے بعد غفور رحیم ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ساری برائیاں، خواہ وہ صغیرہ گناہ ہوں یا کبیرہ، توبہ میں مشترک ہیں۔ اللہ اپنے فضل سے سارے گناہ بخش دیتا ہے، یہ اس کی رحمت ہے۔ یہ آیت ان گناہ گاروں کے لیے بہت بڑی بشارت ہے جو اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں۔[2] وللہ الحمد والمنة

اے رب! یہ تیرا بندہ عاصی سارے گناہوں سے، خواہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ، ظاہری طور پر اور باطنی طور پر، سچی نیت اور عزم کے ساتھ اس جگہ توبہ کرتا ہے۔ اس دم تک جتنے گناہ تیرے کامل علم میں اور اس کے ناقص علم میں ہوئے ہوں، ان سب کو بخش دے اور آیندہ ایسے سامان کر کہ گناہوں میں مبتلا ہونے سے نجات حاصل رہے۔ انجام مرام تیری رحمت و مغفرت پر ہو، تجھ پر یہ بات کچھ دشوار نہیں ہے۔ آمین

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿١٥٤﴾

اور جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے (تورات کی) تختیاں اُٹھا لیں اور ان کے مضامین میں ان کے لیے ہدایت اور رحمت تھی، جو اپنے رب سے ڈرتے تھے (154)

موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد الواح پکڑنا:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سکوت سے مراد سکون ہے، یعنی جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ کم ہوا، غضب تھا تو تورات

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۲۹۳) [2] فتح البیان (۵/ ۲۶۔ ۲۷)

کی ان تختیوں کو جن کو غیرتِ الٰہی اور شدتِ غضب میں ڈال دیا تھا، اٹھا لیا۔ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ وہ ڈالتے وقت ٹوٹ گئی تھیں، پھر ان کو سمیٹ کر جمع کیا، اس میں ہدایت اور رحمت پائی، تفصیل جاتی رہی۔ لوگوں کا یہ زعم ہے کہ ان تختیوں کے ٹکڑے بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے خزانوں میں ہمیشہ سے دولتِ اسلامیہ تک موجود چلے آتے تھے۔ واللہ أعلم

اس پر دلیل کہاں ہے کہ وہ تختیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں، وہ تو جوہر جنت سے تھیں، اللہ نے تو فقط اتنا فرمایا ہے کہ جب ان الواح کو اٹھا لیا تو ان میں ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کو پایا۔ "رَهْبَت" میں معنی خضوع (عاجزی) کے رکھے گئے ہیں، اسی لیے متعدی بلام ہوئی۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے رب! میں ان الواح میں یہ بات پاتا ہوں کہ ایک امت خیر امم ہوگی، جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گی تو وہ امت میری ہی امت کر۔ اللہ نے فرمایا: وہ امت محمد کی امت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں یہ بھی الواح میں پاتا ہوں کہ ایک امت ہے جو آخرین سابقین ہوگی، یعنی خلق میں آخر اور دخولِ جنت میں سب سے پہلے تو وہ امت میری امت کر۔ فرمایا: وہ احمد کی امت ہے۔

کہا: میں الواح میں پاتا ہوں کہ ایک امت ہے جن کی اناجیل ان کے سینوں میں ہوں گی۔ وہ ان کو پڑھیں گے، اگلے اپنی کتاب کو دیکھ کر پڑھتے ہیں، یہاں تک کہ جب اس کتاب کو اٹھا لیں تو پھر کچھ بھی یاد نہیں، نہ کچھ معلوم رہتا ہے۔ اے امت! اللہ نے تم کو وہ حافظہ دیا ہے جو کسی اور امت کو نہیں دیا۔ کہا: اے رب! وہ امت، میری امت کر! فرمایا: وہ تو احمد کی امت ہے۔

کہا: میں الواح میں پاتا ہوں کہ ایک امت اگلی پچھلی کتابوں پر ایمان لائے گی، اہلِ ضلالت سے جنگ کرے گی، یہاں تک کہ اعور کذاب (دجال) سے لڑے گی، وہ میری ہی امت کر۔ فرمایا: وہ امتِ احمد ہے۔ کہا: میں الواح میں پاتا ہوں کہ ایک امت ہے کہ وہ اپنے صدقات کو آپ کھائے گی اور اس پر اجر پائے گی۔ اگلی امتوں میں جب کسی کا صدقہ قبول ہوتا تو اللہ آگ کو بھیجتا، وہ اس صدقے کو کھا جاتی اور جو قبول نہ ہوتا تو اسے درندے پرندے کھا جاتے۔ اللہ نے تمھارے صدقات امیروں سے لے کر فقیروں کو دلوائے، کہا: اے رب ان کو میری امت کر! فرمایا: وہ احمد کی امت ہے۔

کہا: اے رب! میں الواح میں پاتا ہوں کہ جب کوئی ان میں نیکی کا ارادہ کرے گا اور عمل میں نہ لائے گا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی، اگر عمل میں لائے گا تو اس کے دس سے لے کر سات سو مثل تک لکھا جائے گا۔ اے رب! ان کو میری امت کر، کہا: وہ امتِ احمد ہے۔ کہا: اے رب! میں الواح میں پاتا ہوں کہ ایک امت ہوگی شفیع اور مشفوع لہ (جس کی شفاعت کی جائے)، وہ میری ہی امت کر۔ کہا: وہ امتِ احمد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ہم سے ذکر ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام نے آخر کو یہ کہا: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنْ أُمَّةِ أَحْمَدَ"[1] "اے اللہ مجھے امتِ احمد میں سے کر دے۔"

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٢٣۔ ١٢٤) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الاعراف آیت نمبر (١٥٠) کی تفسیر میں مذکورہ بالا اثر کا اجمالاً ذکر کیا اور اس کا رد بھی کیا۔ دیکھیں: تفسير ابن كثير (٢/ ٣٣١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ رازی رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ﴾ کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلیل ہیں کہ نہ کوئی لوح ٹوٹی، نہ تورات میں سے کوئی شے مرفوع ہوئی۔[1] نقل ومنقول عنہ (جس سے نقل کیا جائے) دونوں کو نسخہ کہتے ہیں۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جو کچھ ان الواحِ شکستہ سے الواحِ جدیدہ میں نقل کیا گیا، اس میں ہدایت اور رحمت تھی۔[2] یعنی گمراہی اور عذاب سے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں تفصیل سے ذکر نہیں ہوا۔[3] رہبت بمعنی خوف ہے۔[4]

وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقرر وقت (پر کوہِ طور پر توبہ و استغفار) کے لیے چُنے، پھر جب ان کو زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی انھیں اور مجھے بھی ہلاک کر دیتا، کیا تو اس کی وجہ سے ہمیں ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا؟ یہ تیری طرف سے آزمائش کے سوا کچھ نہیں تو اس (آزمائش) سے جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تو ہی ہمارا کارساز ہے، لہٰذا ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو ہی بہترین بخشنے والا ہے (155)

حاضری کے لیے ستر لوگوں کا انتخاب اور ان کا مرنا:

موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ اپنی قوم کے ستر آدمی سردار لے گئے۔ جب حق تعالیٰ نے کلام کیا تو سن کر کہنے لگے کہ ہم جب تک نہ دیکھیں، ہم کو یقین نہیں، اس پر ان پر بجلی گری، وہ سب کانپ کر مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو شامل کر کے اس طرح دعا کی، تب بخشے گئے، پھر زندہ ہوئے، یہ شاید بچھڑا پوجنے سے پہلے تھا یا شاید بعد میں تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ اپنی قوم میں ستر آدمی چن کر لاؤ، وہ لے گئے، انھوں نے من جملہ دعا کے یہ بھی کہا کہ اے اللہ! ہمیں وہ دے جو تو نے ہم سے پہلے کسی کو نہیں دیا اور نہ ہمارے بعد

[1] تفسیر الرازي (١٥/ ١٣) [2] تفسیر القرطبي (٧/ ٢٩٣) [3] الدر المنثور (٣/ ٥٦٦) [4] فتح البیان (٥/ ٢٧۔ ٢٨)

پھر کسی کو دینا۔ اللہ کو ان کا یہ کہنا برا لگا، زلزلے میں گرفتار ہوئے، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے دعائے مذکور کی۔[1]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ تم کچھ لوگ لے کر بچھڑے کی عبادت کے گناہ کی معافی مانگنے کے لیے حاضر ہو اور حاضری کا ایک وقت بتا دیا تھا، موسیٰ علیہ السلام ستر آدمی منتخب کر کے اپنے ہمراہ معذرت کے لیے لے گئے، وہ لوگ جب اس جگہ پہنچے، کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہم تم پر یقین نہیں کریں گے، جب تک کہ اللہ کو کھلم کھلا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، تُو نے اللہ سے باتیں کی ہیں، اب ہم کو بھی اللہ کا دیدار کرا دے، اس کہنے پر بجلی گری، سب مر کر رہ گئے، موسیٰ علیہ السلام رونے لگے، کہا: اے رب! میں بنی اسرائیل سے ملاقات کے وقت کیا کہوں گا، جو لوگ ان کے چیدہ و برگزیدہ و سنجیدہ تھے، وہی ہلاک ہو گئے، تُو اگر چاہتا تو ان کو اور مجھ کو اس واقعے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک سے ایک بہتر آدمی منتخب کیا تھا، ان کو اللہ کے پاس لے گئے تھے کہ وہاں جا کر توبہ کریں بچھڑے کی عبادت سے، اور باقی قوم کی طرف سے توبہ کی درخواست پیش کریں۔ وہ لوگ روزہ رکھ کر پاک صاف ہو کر کپڑے پہن کر طورِ سینا کے میقات معین پر جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی تھی، نکلے۔

موسیٰ علیہ السلام اس جگہ بغیر اجازت کے نہ جاتے تھے، ان ستر آدمیوں نے باہر نکل کر موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمایش کی کہ ہم اپنے رب کا کلام سننا چاہتے ہیں، کہا: اچھا صاحب! قریب ہی پہاڑ کے نیچے ایک بڑا سا ابر آیا جس نے سارے پہاڑ کو ڈھانپ لیا، موسیٰ علیہ السلام نزدیک جا کر اس بادل میں گھسے اور قوم سے کہا: نزدیک آ جاؤ۔ اللہ نے وہاں موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں، جب کوئی بات فرماتا تو موسیٰ علیہ السلام کی پیشانی پر ایک نور چمکنے لگتا۔

بنی آدم میں سے کسی آدمی میں یہ طاقت نہیں تھی کہ اس طرف نظر کر سکے، گویا ایک پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ قوم جب پاس آ کر بادل میں داخل ہوئی تو اللہ نے ان کی طرف منہ کیا، قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، جب تک اللہ کو جہرتاً (واضح طور پر) نہ دیکھیں، اس پر ان کو زلزلے نے پکڑا، یعنی بجلی گری، التقائے ارواح (سب روحیں مل گئیں) ہوا، سب کے سب مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کھڑے رہے، اللہ سے دعا کی اور کمال رغبت سے عرض کی کہ اے رب! تو چاہتا تو مجھ کو اور ان کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا، انھوں نے اپنی بے وقوفی سے یہ بات کہی جو بنی اسرائیل میرے پیچھے ہیں، کیا تو ان کو بھی ہلاک کرے گا۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے اثر میں اس قصے کے تحت ہارون علیہ السلام کی وفات کا ذکر آیا ہے۔ بنو اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام پر ان کے قتل کی تہمت لگائی، مگر ثابت نہ ہوئی۔[2] یہ اثر بطولہ غریب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ، مجاہد اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بجلی اس لیے گری کہ انھوں نے اپنی قوم کو بچھڑے کی عبادت سے باز نہ رکھا،[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٤١) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٧٤) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٣/ ١٤٠۔ ١٤٢)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ١٤٣۔ ١٤٤)

یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کی طرف متوجہ ہے: ﴿ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ﴾ (آیتِ باب) فتنے سے مراد آزمایش، ابتلا، اختبار اور امتحان ہے۔ یہی سلف وخلف کی ایک جماعت کا قول ہے۔ اس کے سوا اور کچھ معنی نہیں۔

مطلب یہ کہ نہیں حکم مگر تیرا، تو جو چاہے سو کرے، جسے چاہے گمراہ کرے، جسے چاہے ہدایت بخشے۔ کون ہدایت کرے جسے تو گمراہ کرے، کون گمراہ کر سکے جس کو تو نے ہدایت دی۔ کون دے جس کو تو نے نہ دیا۔ سارا حکم تیرا ہے نہ کہ کسی اور کا۔ خلق اور امر سب تیرے ہی لیے ہے۔ غفر کے معنی ہیں ستر اور گناہ کے مؤاخذہ کو چھوڑ دینا۔ رحمت کا ذکر جب غفر کے ساتھ ہوتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ زمانۂ مستقبل میں۔ پھر اس طرح کے گناہ میں گرفتار نہ ہو۔ تو بہترین غافرین ہے، یعنی گناہوں کو کوئی نہیں بخشتا مگر تو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کا قصہ ہے، جب کہ ستر آدمی چنے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہر قبیلے سے چھے آدمی لیے، بہتر آدمی ہوئے، پھر دو آدمیوں سے کہہ دیا کہ تم ٹھہر جاؤ، انھوں نے تأمل کیا، فرمایا کہ بیٹھنے والے کا اجر نکلنے والے کے برابر ہے۔ یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا رہ گئے، باقی موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ گئے۔ کہتے ہیں کہ بوڑھے ساٹھ ہی آدمی نکلے۔ تب وحی آئی کہ دس جوان لو، صبح کو وہ بھی بوڑھے ہو گئے۔ ان کو موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ تم روزہ رکھو، پاک کپڑے پہنو، پھر طورِ سینا کو چلو۔ (ذكره الخطيب)

میقات سے وقتِ معین مراد ہے۔ یہ لوگ طور پر بچھڑے کی پوجا کرنے کے عمل کی معافی مانگنے گئے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ میقات اور تھی اور میقاتِ کلام اور تھی، وہ اس سے پہلے تھی، لیکن مدت کا بیان نہ کیا۔ "رَجْفَةٌ" لغت میں زلزلۂ شدید کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایسا زلزلہ ہوا، ہل چل پڑا کہ سب کے سب ایک ہی رات میں مر کر رہ گئے۔ وہب رحمہ اللہ نے کہا موت نہیں آئی۔ رعدہ وقلق ورجفہ سے قریب تھا کہ بند بند جدا ہو جائے۔[1] مگر معظم روایات یہی ہیں کہ وہ مر گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مر گئے، پھر اللہ نے ان کو زندہ کر دیا۔[2]

یہ زلزلہ اس بات پر آیا کہ اللہ کو کھلم کھلا دیکھنا چاہا یا بچھڑے کی عبادت سے منع نہ کیا، ساکت رہے، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے رب! تو چاہتا تو اس وقت سے پہلے ہی ان کو اور ہم کو غارت کر دیتا۔ اپنی جان کو اس لیے شریک فرمایا کہ بنی اسرائیل کی تہمت سے ڈرے کہ کہیں یہ نہ کہیں کہ وہ ستر آدمی نہیں مرے، تم نے ان کو لے جا کر تباہ کیا۔ یہ سوالیہ انداز کہ ان بیوقوفوں کے عمل پر تو ہم کو ہلاک کرے گا، اللہ کی مہربانی چاہنے اور عاجزی ظاہر کرنے کی غرض سے تھا، مطلب یہ کہ ایسا نہ کر۔

---

[1] تفسير القرطبي (٧/ ٢٩٥) [2] تفسير الطبري (١٣/ ١٤٨)

بعض نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ کوئی شخص غیر کے گناہ پر ہلاک نہیں ہوتا، لیکن یہ بات اُس طرح پر کہی، جیسے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے: ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ﴾ [المائدة: ١١٨] ''اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں۔'' کسی نے کہا ہے کہ بیوقوفوں سے مراد وہی ستر آدمی تھے یا سامری اور اس کے ساتھی۔ اے رب! یہ تیری آزمایش ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ ﴾ [طٰه: ٨٥] ''چناں چہ بے شک ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو آزمایش میں ڈال دیا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی تیری مشیت ہے،[1] تو جسے چاہے ہدایت دے، جسے چاہے گمراہ کرے اور اسی طرح اللہ کا قول ہے: ﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢] ''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قدریہ پر ظاہری حجت ہے۔ اس آیت کے بعد ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔[2] پھر دعائے مغفرت و رحمت مانگی۔[3]

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ

اور تو ہمارے لیے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھلائی لکھ دے، بے شک ہم نے تیری ہی طرف رجوع کیا ہے۔

حسنہ کی دعا:

پہلے دعا رفع محذور کے لیے تھی، یعنی جس سے ڈرایا گیا، اس کو دور کرنے کے لیے تھی۔ یہ دعا اصل مقصد حاصل کرنے کے لیے ہے کہ ہم کو یہاں اور وہاں دونوں جگہ صاحبِ حسنہ کر۔ حسنہ کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔ ﴿ هُدْنَآ ﴾ کے معنی ہیں: ''تُبْنَا وَرَجَعْنَا وَأَنَبْنَا إِلَيْكَ'' یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر، مجاہد، ابو العالیہ، ضحاک، ابراہیم تیمی، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے۔ لغت میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہود اسی لیے نام ہوا کہ انھوں نے ''إِنَّا هُدْنَا إِلَيْكَ'' کہا تھا۔[4]

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ حسنہ سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں یا یہ مراد ہے کہ ہم پر حیاتِ طیبہ، عافیت اور فراخیِ رزق کے ساتھ اپنا فضل کر اور ہم کو آخرت میں بہشت اور جنت کی نعمتیں عطا کر۔ ہم غوایت (گمراہی) سے باز آئے، تائب ہوتے ہیں۔ ہود بمعنی توبہ ہے۔ یہی جمہور مفسرین کا قول ہے، یہود بھی اسی وجہ سے یہود کہلاتے ہیں کہ

[1] الدر المنثور (٣/ ٥٦٩) [2] تفسير الرازي (١٥/ ١٧) [3] فتح البيان (٥/ ٢٩۔ ٣١)
[4] تفسير الطبري (١٣/ ١٥٣۔ ١٥٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٣٤)

وہ تائب ہوئے تھے۔ موسوی شریعت کے منسوخ ہونے سے پہلے یہ نام تعریف کا تھا، پھر یہ مذمت کا نام ہو گیا۔ اصل ہود رجوع کرنا ہے، سیدھی طرح نرمی سے مُہَادَنہ بمعنی مصالحہ ہے۔ عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دن اس امت کے لیے رحمت لکھی گئی۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ﴿ هُدْنَآ ﴾ بمعنی مَلْنا ہے، یعنی ہم اللہ کی طرف مائل ہوئے۔[2]

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝156

اللہ نے کہا: میں جسے چاہتا ہوں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، چناں چہ جلد ہی میں اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں 156

عذاب مستحق کے لیے اور رحمت متقی مومن کے لیے:

شاید موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں دنیا اور آخرت کی نیکی جو مانگی، اس میں مراد یہ تھی کہ دنیا اور آخرت میں سب اُمتوں پر مقدم رہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقے کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ سو عذاب تو اسی پر ہے جس کو اللہ چاہے۔ رحمت سب کو شامل ہے، لیکن وہ رحمت ان کے نصیب میں خاص طور پر لکھی ہے جو اللہ کی ساری باتوں پر یقین کریں، یعنی آخری امت کہ سب کتابوں پر ایمان لائے گی، سو موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر ایمان لائے، وہ اس نعمت کو پہنچے گا اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا اس کو لگے گی۔

اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے قول: ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ﴾ کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ میں جو چاہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔ ہر چیز میں حکم، ارادہ اور عدل خاص میرا ہی ہے۔ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ یہ آیت: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (آیتِ باب) ایک بڑی آیت ہے جو اپنے اندر عمومیت رکھتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حاملینِ عرش فرشتوں کا قول نقل فرمایا ہے: ﴿ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ﴾ [المؤمن: ٧] "(وہ کہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تو (اپنی) رحمت اور (اپنے) علم سے ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔"

سیدنا جندب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک اعرابی آیا، اونٹنی بٹھا کر پاؤں باندھ کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تو اپنی اونٹنی کا پاؤں کھول کر سوار ہوا، کہنے لگا: "اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّداً وَلَا تُشْرِكْ فِيْ رَحْمَتِنَا أَحَداً" "اے اللہ! تو مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی رحمت فرما اور ہماری اس رحمت میں کسی اور کو

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٧٦) [2] فتح البيان (٥/ ٣١)

شریک نہ کر۔'' نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کیا کہتے ہو اس بارے میں کہ یہ شخص زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ؟ تم نے نہیں سنا کہ اس نے کیا کہا؟ عرض کی کہ ہاں سنا ہے۔ فرمایا: « لَقَدْ حَجَّرْتَ رَحْمَةً وَاسِعَةً » یعنی ''تو نے ایک رحمتِ کشادہ کو تنگ کر دیا۔''

وسعتِ رحمت:

اللہ نے سو رحمتیں پیدا کی ہیں، ان میں سے ایک رحمت اتاری ہے، جس کے سبب سے تمام خلق، کیا جن اور انسان اور کیا جانور، ایک دوسرے پر محبت وعطوفت (مہربانی) کرتے ہیں اور ننانوے حصے رحمت کے اپنے پاس رکھے ہیں۔ اب تم کہو کہ یہ گنوار زیادہ گمراہ ہے کہ اس کا اونٹ؟[1] (رواه أحمد و أبو داود) سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کی روایت کے مرفوع الفاظ یوں ہیں کہ اللہ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے ایک رحمت کے سبب سے مخلوق آپس میں رحم کرتی ہے، وحشی جانور اپنی اولاد پر نرمی کرتے ہیں۔ ننانوے حصے رحمت کے قیامت کے دن کے لیے رکھ چھوڑے ہیں۔[2] (رواه أحمد و تفرد بإخراجه مسلم)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ کی سو رحمتیں ہیں، ننانوے اس کے پاس ہیں اور ایک رحمت تم کو دی ہے جس کی وجہ سے جن وانس اور مخلوق میں تم رحم وکرم کا برتاؤ کرتے ہو، جب قیامت کا دن ہوگا تو اس رحمت کو ان رحمتوں کے ساتھ ملا دے گا۔[3] (تفرد به أحمد من هذا الوجه) سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت یہ ہے کہ اللہ کے لیے سو رحمتیں ہیں، ان میں سے ایک حصے کو مخلوق کے درمیان تقسیم کیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ اور وحشی جانور اور پرندے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحم کرتے ہیں۔[4] (رواه أحمد و ابن ماجه)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قریب ہے کہ میں امتِ محمد ﷺ کے متقیوں کے لیے کرم اور احسان کرنے کی خاطر اپنے اوپر رحمت کا حصول واجب کر لوں گا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ٥٤] ''تمھارے رب نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔'' تقویٰ سے مراد بچنا ہے، شرک اور بڑے گناہوں سے۔ پھر زکات کا ذکر فرمایا۔ مراد تزکیۂ نفس ہے یا تزکیۂ اموال یا دونوں، کیونکہ آیت مکی ہے۔ ایمان سے مراد آیات کی تصدیق کرنا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس جگہ عذاب سے مراد ﴿ الرَّجْفَةُ ﴾ ہے یا ایک دوسرے کو قتل کرنا، یعنی اے

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣١٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٨٥) اس کی سند میں ''ابوعبداللہ جشمی'' مجہول راوی ہے۔
[2] صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٣) مسند أحمد (٥/ ٤٣٩) [3] مسند أحمد (٣/ ٥٥) اس کی سند حسن ہے۔
[4] مسند أحمد (٣/ ٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٩٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٦٧)

موسیٰ! یہ تیرا کام نہیں ہے، بلکہ میری مشیت ہے جو چاہوں سو کروں، ظاہر یہ ہے کہ لفظ عذاب کو شامل ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کا عذاب بھی بدرجۂ اولیٰ شامل ہے، یعنی جس مستحقِ عذاب کو چاہوں عذاب کروں، جس کو چاہوں گمراہ کر دوں، ہدایت کی توفیق سلب کرلوں۔ کسی کو مجھ پر اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا، کیونکہ سب کے سب میری ملکیت اور غلام ہیں۔ میری رحمت مکلفین وغیرہم کو شامل ہے۔ اس عمومیت سے مراد خصوص ہے، اس لیے کہ دنیا میں اللہ کی رحمت سب کے لیے عام ہے، وہ کوئی نیک ہو یا بد، مگر آخرت میں مومنین کے لیے خاص ہے۔[1] (قاله الحسن وقتادة)

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو ابلیس کا حوصلہ بڑھا، کہا: "وَأَنَا مِنْ ذَٰلِكَ الشَّيْءِ" مجھے بھی اس میں سے کچھ ملے گا" اس پر اللہ نے اپنی رحمت کو اس سے کھینچ لیا۔[2] (قاله السدي و ابن جريج) غرض کہ یہ رحمت ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہوں اور شرک سے بچتے ہیں، زکاتِ مفروضہ ادا کرتے ہیں، اللہ کی نشانیوں کو مانتے ہیں، ابلیس مایوس ہے۔ یہود نے کہا تھا کہ ہم متقی، زکات دینے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہیں۔ اللہ نے ان سے رحمت کو منتزع (کھینچ) کر کے اس امت کو دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے سوال کیا، اللہ نے وہ مسئول نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشا، اس آیت میں جو کچھ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے مانگا تھا، وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا۔[3] وللّٰه الحمد.

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چناں چہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی

---

[1] تفسير الطبري (۱۳/ ۱۵۹) [2] الدر المنثور (۳/ ۵۷۲) تفسير الطبري (۱۳/ ۱۵۷)

[3] الدر المنثور (۵/ ۵۷۳) فتح البيان (۵/ ۳۱ـ۳۲)

اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں (157)

تورات وانجیل میں رسول کریم ﷺ کی صفات اور آپ کی اتباع کا حکم:

نبیِ اکرم ﷺ کو پہلی کتابوں میں نبیِ امی بتایا تھا، دو معنوں میں سے: ایک تو ان پڑھے تھے، دوسرے ام القریٰ میں پیدا ہوئے، یعنی مکے میں اور یہود پر سخت احکام تھے، یعنی کھانے پینے کی چیزوں میں تنگی تھی، اس دین میں وہ سب آسان ہوئے، اسی کو بوجھ اور طوق فرمایا۔

نور سے مراد قرآن اور شریعتِ محمد یہ ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی یہ صفت ہے۔ جن پیغمبروں نے نبیِ اکرم ﷺ کے وجودِ مسعود کی بشارت اپنی امتوں کو دی تھی، ان کی کتابوں میں خاتم الانبیا سید الرسل کے حق میں یہی امیت کا وصف لکھا چلا آتا ہے۔ سب مذکورہ امتوں کے انبیا کو نبیِ اکرم ﷺ کی متابعت کا حکم پہنچا دیا تھا۔ یہ صفات ہمیشہ سے ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان کے علما اور احبار ان کو پہچانتے ہیں۔[1]

ابو صخر عقیلی نے کہا ہے کہ مجھ سے ایک اعرابی نے ذکر کیا کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کی زندگی میں مدینے میں حلوا لے کر بیچنے کے لیے گیا، جب وہاں پہنچ گیا تو میں نے کہا کہ میں بھی اس شخص کو دیکھوں، اس کی بات سنوں، وہ مجھ کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان چلتے ہوئے ملے۔ میں ان کے ساتھ لگ گیا۔ ایک یہودی تورات کھولے ہوئے پڑھ رہا تھا۔ اس کا بیٹا جو بہت حسین وجمیل جوان تھا، مر رہا تھا، اس کی تعزیت وہ اپنی جان کو کر رہا تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے اس سے کہا: تجھ کو قسم ہے اس کی جس نے تورات نازل کی، تو اس کتاب میں میری صفت اور میرا مخرج (نکلنے کی جگہ) پاتا ہے یا نہیں؟ اس نے سر سے اشارہ کیا کہ نہیں، اس کے بیٹے نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے تورات اتاری ہے، ہم آپ کی صفت اور آپ کا مخرج اپنی کتاب میں پاتے ہیں اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس یہودی کو تم اپنے بھائی کے پاس سے اٹھا دو، پھر خود اس کے کفن دفن اور نماز کے متولی ہوئے۔[2] (هذا حديث جيد قوي له شاهد في الصحيح عن أنس)

انبیا کے حلیے کی بابت ہشام بن عاص کا عجیب واقعہ:

حاکم نے مستدرک میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہشام بن عاص اموی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں اور ایک اور آدمی ہرقل روم کے بادشاہ کے پاس بھیجے گئے۔ ہم اس کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ہم چل کر غوطۂ دمشق میں پہنچے، جبلہ بن ایہم غسانی کے ہاں گئے، جب اس کے پاس پہنچے تو وہ ایک تخت پر بیٹھا ہوا تھا، اس نے ایک قاصد بھیجا کہ ہم سے بات چیت کرے، ہم نے کہا: واللہ! ہم قاصد سے بات نہ کریں گے، ہم تو بادشاہ کی طرف بھیجے گئے

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٣٥) [2] مسند أحمد (٥/ ٤١١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٦٩)

ہیں۔ اگر ہم کو اجازت دے گا تو ہم اس سے بات کریں گے، ورنہ ہم قاصد سے کلام نہ کریں گے، قاصد نے واپس جا کر یہی بات کہی، اس پر ہم کو اجازت دی۔

کہا: کہو کیا کہتے ہو؟ ہشام بن عاص نے گفتگو کی، اس کو اسلام کی طرف بلایا، وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ ہشام نے اس سے کہا: یہ تمھارے کپڑے کیسے ہیں؟ کہا: میں نے یہ لباس پہن کر قسم کھائی ہے کہ ان کپڑوں کو نہ اتاروں گا جب تک کہ شام سے تم کو نکال نہ دوں۔ ہم نے کہا: واللہ! ہم تجھ سے تیری اس مجلس کو چھین لیں گے، بلکہ ملکِ اعظم (بڑے بادشاہ) کا ملک بھی، ان شاء اللہ تعالیٰ، لے لیں گے۔ ہم کو یہ خبر ہمارے نبیِ اکرم ﷺ نے دی ہے۔ اس نے کہا: تم وہ لوگ نہیں ہو، بلکہ وہ قوم وہ لوگ ہوں گے جو دن کو روزہ رکھتے ہیں، رات کو کھڑے ہوتے ہیں۔ تم کہو: تمھارا روزہ کیسا ہے؟ ہم نے ہاں کہا، اس کا منہ سیاہ ہوگیا، کہا جاؤ اور ہمارے ساتھ ایک قاصد کر دیا کہ وہ ہم کو بادشاہ کے پاس پہنچا دے۔

ہم وہاں سے باہر نکلے، جب شہر کے قریب پہنچے تو جو آدمی ہمارے ساتھ تھا، اس نے ہم سے یہ بات کہی کہ تمھارے یہ جانور شہر میں جانے نہ پائیں گے، تم کہو تو ہم تم کو عربی خچروں پر سوار کر کے لے چلیں۔ ہم نے کہا: ہم انہی سواریوں پر ہی بیٹھ کر جائیں گے۔ اس نے بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا اور کہلا بھیجا کہ یہ لوگ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ خچروں پر سوار ہو کر داخل ہوں، اس نے کہا: انھیں انہی کی سواریوں پر اندر آنے دو۔

ہم تلواریں لگائے ہوئے داخل ہوئے، جب غرفے (شاہی کمرے) کے نزدیک پہنچے تو ہم نے اس کی جڑ میں اپنے اونٹ بٹھائے۔ وہ ہماری طرف دیکھتا جاتا تھا، ہم نے کہا: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" اللہ جانتا ہے کہ وہ غرفہ خرما کے درخت کی طرح ہوگیا، جس کو ہوا ہلاتی ہے۔ پھر ہم کو بلایا، جب ہم آئے تو وہ ایک فراش پر بیٹھا ہوا تھا، اس کے ارد گرد بطارقہ یعنی علمائے روم بیٹھے تھے، اس کی مجلس میں ہر چیز لال رنگ کی تھی، اس کے گرد سب سرخ تھا، وہ خود بھی سرخ لباس پہنے ہوئے تھا۔

جب ہم اس کے قریب پہنچے تو ہم کو دیکھ کر ہنسا، کہا: تمھارا کیا نقصان تھا، اگر تم اپنا سلام ہم کو کرتے؟ اس کے پاس ایک شخص عربی بولنے والا زبان آور تھا، ہم نے کہا: جو تحیت (سلام) ہمارا ہے وہ تمھارے لیے درست نہیں ہے اور جو تحیت تمھارا ہے وہ ہم تم کو نہیں کہہ سکتے۔ کہا: تمھارا تحیت آپس میں کیا ہے؟ ہم نے کہا: السلام علیك۔ کہا: تم اپنے سردار کو کیا تحیت کرتے ہو؟ کہا: یہی۔ کہا وہ تم کو کیا جواب دیتا ہے، ہم نے کہا: یہی۔ کہا: تمھارا بڑا کلام کیا ہے؟ ہم نے کہا: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، اللّٰهُ أَكْبَرُ" جب ہم نے یہ کہا تو اللہ جانتا ہے کہ غرفہ گر پڑا، اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، کہا: اس کلمے کے کہنے سے غرفہ گر گیا۔ کیا جب تم اس کلمے کو اپنے گھروں میں کہتے ہو تو تمھارے غرفے

گر جاتے ہیں؟ ہم نے کہا: نہیں۔ اس کلمے سے یہ بات کبھی نہیں دیکھی، مگر تمھارے پاس۔ کہا: میں چاہتا ہوں کہ جب تم یہ کلمہ کہو تو ہر شے تم پر گر پڑے۔ میں اپنا آدھا ملک چھوڑتا ہوں، ہم نے کہا: کیوں؟ کہا: یہ بات ہمارے لیے آسان ہے، کہیں یہ امرِ نبوت کا حیلہ نہ ہو۔ پھر ہم سے پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟ ہم نے حال بیان کیا، پھر ہم سے ہماری نماز اور روزے کا حال پوچھا، ہم نے بیان کیا، کہا: اچھا جاؤ۔

ہم کو ایک عمدہ گھر میں اتارا، خوب مہمانی کی، ہم تین دن ٹھہرے، پھر ہم کو بلایا، جب ہم آئے تو پھر ہم سے وہی باتیں کیں اور ہم نے بھی وہی جواب دیا، پھر ہم کو ایک بڑی سنہری حویلی میں بلایا، جس میں چھوٹے چھوٹے گھر تھے اور ان کے دروازے تھے، ایک گھر کا دروازہ اور تالہ کھول کر ایک سیاہ رنگ کا ریشمی کپڑا نکال کر پھیلایا، اس میں ایک لال صورت تھی، ایک آدمی بڑی آنکھوں والا بڑی سرین والا تھا کہ ویسی لمبی گردن ہم نے نہیں دیکھی، اس کے منہ پر ڈاڑھی نہ تھی۔ دو بالوں کی لٹیں تھیں، وہ شخص احسن خلق اللہ تھا، کہا: تم اسے پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں، کہا: یہ آدم علیہ السلام ہیں، دیکھا تو وہ سب لوگوں سے زیادہ سر کے بال رکھتے تھے؟ پھر ایک دوسرا دروازہ کھولا، ایک کالا ریشمی کپڑا نکالا، اس میں ایک سفید صورت تھی، اس کے بال سخت گھنگھریالے تھے۔ آنکھیں لال، سر بڑا، ڈاڑھی اچھی، کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ نوح علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھول کر ایک سیاہ رنگ کا ریشمی کپڑا نکالا، اس میں ایک مرد بہت سفید رنگ، خوب صورت آنکھوں والا، کشادہ پیشانی، دراز رخسار سفید ریش تھا، گویا مسکراتا ہے، کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھولا، اس میں ایک سفید صورت تھی، واللہ وہ ہو بہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ کہا: تم اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہم روئے۔

واللہ! وہ کھڑا ہو گیا۔ پھر بیٹھ کر ہم سے کہا: واللہ! کیا یہ وہی ہے؟ ہم نے کہا: ہاں یہ وہی ہیں، گویا تم ان کو دیکھ رہے ہو۔ ایک ساعت چپکا رہا، اس صورت کی طرف نظر کرتا رہا، پھر کہا: واللہ! یہ آخری بیت (کمرہ) تھا، لیکن میں نے تمھارے لیے جلدی کی، تاکہ میں دیکھوں کہ تمھارے پاس کیا ہے؟

پھر ایک دروازہ کھولا، ایک کالا ریشمی کپڑا نکالا، اس میں ایک شکل گندم گوں سانولی زردی مائل تھی، ایک مرد گھنگھریالے بالوں کا، گہری آنکھوں کا تیز نظر برابر دانت والا، موٹے ہونٹوں کا تھا، گویا غصے میں بھرا ہوا ہے، کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں، کہا: یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک اور صورت اسی صورت کے مشابہ تھی، مگر چکنے بال، چوڑی پیشانی، آنکھوں کے کوئے ابھرے ہوئے۔ کہا: تم اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ ہارون بن عمران علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھولا، ایک سفید ریشمی کپڑا نکالا، اس میں ایک گندم گوں سیدھے بالوں والے اور درمیانے قد کے مرد کی صورت تھی، گویا غصے میں ہے۔ کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ لوط علیہ السلام

ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھول کر سفید ریشمی کپڑا نکالا، اس میں ایک سفید اور سرخ رنگ کے مرد کی صورت تھی، ناک اونچی، رخسار سبک، چہرہ خوب صورت۔ کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھول کر ایک سفید حریر نکالا، اس میں ایک صورت اسحاق علیہ السلام کے مشابہ تھی، مگر اس کے ہونٹ پر ایک تل تھا۔ کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں، کہا: یہ یعقوب علیہ السلام ہیں۔

پھر ایک اور دروازہ کھول کر ایک کالا ریشمی کپڑا نکالا، اس میں ایک سفید رنگ کے مرد کی صورت تھی، جو خوب صورت بلند بین اور خوش قامت تھا، جس کے چہرے پر نور چڑھا آتا تھا، خشوع ظاہر ہوتا تھا، رنگ سرخی مائل تھا، کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ کہا: نہیں، کہا: یہ اسماعیل علیہ السلام ہیں، تمھارے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا۔ پھر اور دروازہ کھول کر ایک سفید حریر نکالا، اس میں ایک مرد کی صورت تھی، سرخ رنگ، باریک پنڈلیاں، خرد چشم، کلاں شکم، میانہ قد، تلوار لٹکائے ہوئے تھا، کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ داود علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھول کر ایک سفید حریر نکالا، اس میں ایک مرد گراں سرین، دراز پا گھوڑے پر سوار تھا۔ کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ سلیمان بن داود علیہما السلام ہیں۔ پھر ایک اور دروازہ کھول کر ایک سیاہ ریشمی کپڑا نکالا اس میں ایک سفید صورت تھی، وہ ایک جوان شخص، سیاہ ریش، لمبے بال، خوب چشم، خوب صورت تھا۔ کہا: اس کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ کہا: یہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں۔

ہم نے کہا: تم کو یہ صورتیں کہاں سے ملیں؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ صورتیں انبیا علیہم السلام کی شکل پر ہیں، اس لیے کہ ہم نے اپنے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت برابر دیکھی۔ کہا: آدم علیہ السلام نے اللہ پاک سے سوال کیا تھا کہ ان کی اولاد میں جو انبیا ہوں گے، ان کو دکھا دے۔ تب آدم علیہ السلام پر یہ صورتیں اتریں، یہ صورتیں آدم علیہ السلام کے خزانے میں سورج کے غروب ہونے کے مقام کے قریب تھیں۔ ذوالقرنین نے ان کو مغربِ شمس سے نکال کر دانیال کے سپرد کیا تھا۔

پھر کہا: واللہ! میرا جی خوش ہے، اس بات سے کہ میں اپنا ملک چھوڑ دوں، اگرچہ کسی ایک شریر بد خلق شخص کا مرتے دم تک غلام ہی کیوں نہ بنا رہوں۔ پھر ہم کو بہت اچھا جائزہ دے کر رخصت کیا۔ ہم نے واپس آ کر یہ حال ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیان کیا اور جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا اور جائزہ کا حال کہا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ روئے اور کہا: مسکین ہے۔ اگر اللہ اس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرے گا تو فعل میں لائے گا۔ پھر کہا: ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ وہ لوگ یعنی نصاریٰ اور یہود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت و تعریف اپنے نزدیک پاتے ہیں۔ اس حدیث کو حافظ کبیر بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب "دلائل النبوة" میں حاکم رحمہ اللہ سے اجازتاً اسی طرح مع اسناد روایت ذکر کیا ہے۔[1] اس کی اسناد "لا بأس به" ہے۔

مترجم کہتا ہے: اس روایت میں چودہ پیغمبروں کا حلیہ مذکور ہے، قرآن پاک میں اٹھارہ انبیا کا ذکر آیا ہے۔

---

(1) دلائل النبوة للبيهقي (۱/ ۳۸۵۔ ۳۹۰) اس کی سند میں "عبدالعزیز بن مسلم بن ادریس" کا ترجمہ نہیں ملا ہے۔

چودہ تو یہی ہیں اور چار اور ہیں، جو انبیا زیادہ مشہور ہیں، انھی کی صورتوں پر اس روایت میں اقتصار کیا گیا ہے۔ روایت اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے دل میں نبیِ اکرم ﷺ کی تصدیق آئی، مگر اسلام کا اظہار نہ کیا، اللہ ہی جانے کہ انجام کیا ہوگا۔

عطا بن یسار کی روایت:

امام عطا بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی، کہا: تم مجھ کو تورات اور انجیل میں سے رسول اللہ ﷺ کی صفت کی خبر دو۔ کہا: ہاں، واللہ! وہ تورات میں ویسے ہی موصوف ہیں، جیسے کہ ان کی صفت قرآن میں آئی ہے۔ اے نبی! ہم نے تجھ کو بھیجا ہے، تجھ کو گواہ، خوش خبری سنانے والا، ڈرانے والا اور امان واسطے ان پڑھوں کے، تو میرا بندہ اور رسول ہے، تیرا نام متوکل ہے، تو سخت گو اور سخت دل نہیں ہے۔ قبض نہیں کرے گا، اس کو اللہ یہاں تک کہ اس کے سبب سے ٹیڑھی ملت کو اس طرح سیدھا نہ کر دے کہ لوگ لا إله إلا الله کہنے لگیں۔ وہ بند دلوں کو، بہرے کانوں کو اور اندھی آنکھوں کو کھول دے گا۔ عطا نے کہا: پھر میری ملاقات کعب سے ہوئی، ان سے بھی میں نے یہی بات پوچھی، ایک حرف کا بھی اختلاف نہ کیا۔ اتنی بات ہوئی کہ کعب نے اپنی لغت میں "قُلُوْباً غُلْفاً وَآذَاناً صُمًّا وَأَعْيُناً عُمْياً" کے بجائے "قُلُوْباً غُلُوْفِياً وَآذَاناً صُمُوْمِيًّا وَأَعْيُناً عَمُوْمِيًّا" کہا۔ (رواہ ابن جریر و رواہ البخاري نحوہ)

بخاری کی روایت میں اتنا اور زیادہ ہے کہ بازاروں میں چلّاتا نہیں، نہ بدی کا بدلہ بدی سے کرے، بلکہ عفو اور درگزر کرتا ہے۔[1] پھر سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کا ذکر کر کے کہا، بہت سے سلف کے کلام میں تورات کا اطلاق اہلِ کتاب کی کتب پر واقع ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں بھی اسی کے مشابہ آیا ہے۔ واللہ أعلم.

سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں تجارت کے لیے شام گیا، جب شام کے قریب پہنچا تو مجھے اہلِ کتاب میں سے ایک شخص ملا۔ کہا: تمھارے کوئی مرد نبی ہے، میں نے کہا: ہاں، کہا: بھلا تو اس کی صورت پہچان لے گا جب کہ اس کو دیکھے؟ تو میں نے کہا: ہاں۔ وہ مجھ کو ایک گھر لے گیا۔ وہاں تصویریں تھیں، میں نے نبیِ اکرم ﷺ جیسی کوئی صورت نہ دیکھی، اتنے میں ان میں ایک اور آدمی آیا، کہا: تم کیا کرتے ہو؟ ہم نے اپنا حال کہا، وہ ہم کو اپنے گھر لے گیا۔ داخل ہوتے ہی نبیِ اکرم ﷺ کی صورت نظر پڑی۔ ایک آدمی آپ ﷺ کی ایڑی پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے کہا کہ یہ ایڑی کو پکڑے ہوئے کون شخص ہے؟ کہا جو نبی آیا، اس کے بعد ایک اور نبی آتا گیا، مگر یہ نبی کہ اس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، یہ شخص اس کے بعد خلیفہ ہوگا۔ وہ اتفاقاً سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صورت کا تھا۔[2] (رواہ الطبراني)

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٠١٨) تفسیر الطبري (١٣/ ١٦٤)

[2] المعجم الکبیر (٢/ ١٢٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفیه من لم أعرفهم" (مجمع الزوائد: ٨/ ٤٢٦)

اقرع کی روایت:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے موذن اقرع نے کہا کہ مجھ کو عمر رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری پیشوا کے پاس بھیجا، میں اس کو بلا لایا، عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: بھلا تو مجھ کو بھی اپنی کتاب میں پاتا ہے؟ کہا: ہاں، کہا: کس طرح پر؟ کہا: میں تم کو ایک قرن پاتا ہوں، یعنی حریف، ہمدست، شاخ زن۔ عمر رضی اللہ عنہ نے درہ اٹھایا اور کہا: کیسا قرن؟ اس نے کہا: قرن آہن، امیر شدید۔ کہا: میرے بعد جو شخص ہو گا تو اس کو کیسا پاتا ہے؟ کہا: ایک خلیفہ صالح، اتنی بات ہے کہ وہ اپنی قرابت کو اختیار کرے گا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ عثمان رضی اللہ عنہ پر رحم کرے، تین بار یہ کلمہ کہا۔ پھر پوچھا: بھلا جو شخص اس کے بعد ہو گا، اسے کیسا پاتا ہے؟ کہا: لوہے کا زنگ۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ سر پر رکھ کر کہا: یَا دَفْرَاهُ یَا دَفْرَاهُ۔ دفر گند کو کہتے ہیں، کہا: اے امیر المومنین! وہ خلیفہ صالح ہو گا، لیکن اس وقت خلافت پائے گا جس وقت کہ تلوار ننگی ہو گی اور خون بہایا جائے گا۔[1] (رواہ أبو داود)

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے والے:

پھر اللہ پاک نے فرمایا: ان کو معروف کا حکم دے گا اور ان کو منکر سے منع کرے گا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی صفت ہے۔ پہلی کتابوں میں بھی نبی اکرم ﷺ کا حال اسی طرح پر تھا کہ حکم نہ کرتے مگر خیر کا۔ نہی نہ کرتے مگر شر سے۔ جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب تو اللہ کو سنے کہ ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ فرماتا ہے تو اس پر اپنے کان رکھ کہ کسی خیر کا تجھ کو حکم دیتا ہے یا کسی شر سے نہی فرماتا ہے۔[2] سب سے زیادہ اہم اور بڑا کام جس کے لیے اللہ نے رسول کو بھیجا، یہ امر ہے کہ اکیلے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ یہی بات سارے رسول لے کر آئے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

سیدنا ابو حمید اور ابو اسید رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم میری کوئی حدیث سنو، جس کو تمھارے دل پہچانیں، تمھارے بال اور چمڑے نرم پڑیں اور تم دیکھو کہ وہ حدیث تم سے قریب ہے تو جانو کہ میں اس کے ساتھ اولیٰ تر ہوں اور جب تم کوئی ایسی حدیث سنو جو مجھ سے منسوب ہو۔ جس کا تمھارے دل انکار کریں اور تمھارے بال اور چمڑے اس سے دور بھاگیں اور تم دیکھو کہ وہ بات مجھ سے دور ہے تو میں اس سے دور تر ہوں۔[3] (رواہ أحمد بإسناد جید ولم یخرجه أحد من أصحاب الكتب) معلوم یہ ہوا کہ کلامِ نبوت اثر انداز ہوتا ہے اور جو کلامِ نبوت نہیں ہوتا، اس کو دل بھی قبول نہیں کرتا۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب تم کوئی حدیث نبی اکرم ﷺ سے سنو تو اس کے ساتھ وہ گمان کرو جو اَہدیٰ، اَہنیٰ اتقیٰ ہے۔[4] (رواہ أحمد)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٥٦) اس کی سند ضعیف ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧١٨) اس کی سند حسن ہے۔

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٢)

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٩٧) اس کی سند صحیح ہے۔

خبائث کو حرام اور طیبات کو حلال کرنے والا:

پھر اللہ نے فرمایا کہ وہ نبیِ اُمی تمھارے لیے خبائث کو حرام اور طیبات کو حلال کرتا ہے۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہا جن کو انھوں نے اپنے اوپر حرام کیا تھا، اپنی جانوں کو تنگی میں ڈالا تھا، نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو حلال کر دیا۔ خنزیر کا گوشت اور سود وغیرہ ماکل جن کو اللہ نے حرام کیا تھا اور انھوں نے حلال ٹھہرا لیا تھا، ان کو نبیِ اکرم ﷺ نے حرام فرمایا۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[1] بعض علما نے لکھا ہے کہ جو شے اللہ نے ماکل (کھانے والی چیزوں) میں سے حلال کی ہے وہ طیب اور بدن اور دین کے لیے نافع ہے اور جو شے حرام کی ہے وہ دین اور بدن کے لیے خبیث اور نقصان دہ ہے۔ یہ آیتِ کریمہ اس شخص کی دلیل ہے جو عقلی لحاظ سے کسی کی اچھائی اور برائی کا قائل ہے۔ سو اس کا جواب دیا گیا ہے، مگر اس جگہ اس کا ذکر کرنے کی گنجایش نہیں ہے۔

اسی طرح بعض علما نے اس آیت کو اس بات کی دلیل ٹھہرایا ہے کہ ان چیزوں کو کھانے کی دلیل جن کے حلال یا حرام ہونے پر کوئی نص نہیں آئی ہے، عرب کے لوگوں کا اس چیز کو اچھا سمجھنا اور پسند کرنا اور اس کا فائدہ مند ہونا ہے۔ اسی طرح تحریم کی طرف بھی عرب کے لوگوں کی ناپسند کا خیال رکھتے ہیں، یعنی جس کو وہ ناپاک سمجھیں، وہ حرام ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں بھی طویل کلام ہے۔[2]

بوجھ اتارنے والا:

بوجھ اور طوق دور کرنے سے مراد آسانی پیدا کرنا ہے، جس طرح حدیث میں چند طریق سے آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «بُعِثْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّمْحَةِ»[3] اور جب معاذ اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف روانہ کیا تو یہ ارشاد فرمایا تھا: «بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَيَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا»[4] ''خوش خبری دینا اور نفرت نہ دلانا، آسانی پیدا کرنا تنگی نہ پیدا کرنا اور آپس میں اتفاق کرنا اختلاف نہ کرنا۔'' ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کی صحبت میں رہا اور میں نے آپ کی تیسیر (آسانی پیدا کرنے) کو دیکھا۔[5] جو امتیں ہم سے پہلے تھیں، ان کی شریعتوں میں ان پر مشقت تھی، اللہ نے اس امت پر اس کے سارے کام کشادہ اور آسان کر دیے۔

اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے میری امت سے حدیثِ نفس (دل کے اندر خیال کرنا) پر کوئی مؤاخذہ نہیں رکھا، جب تک کہ کوئی بات زبان سے نہ کہے یا اس پر عمل نہ کرے۔[6] اور میری امت سے بھول چوک کو

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٦٦) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ٢٠٤٥) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٣٨۔ ٣٣٩)

[3] مسند أحمد (٥/ ٢٦٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٢٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٣)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٥٣)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧)

اٹھا لیا اور جس پر زبردستی کی جائے اس کو بھی۔[1] اسی لیے اللہ نے اس امت کو یہ ارشاد کیا ہے کہ وہ یوں کہا کریں:
﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾
[البقرة: ٢٨٦] ''اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کر۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، وہ ہم سے نہ اُٹھوا اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس تو کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔'' صحیح مسلم میں آیا ہے کہ اللہ پاک نے ان سوالات میں سے ہر سوال کے بعد فرمایا: قَدْ فَعَلْتُ یعنی میں نے ایسا ہی کیا، جیسا تم نے مانگا۔[2] وللہ الحمد

معلوم ہوا کہ یہ دعا داعی سے قبول ہوتی ہے نہ کہ رد۔ یہ دعا تمام اہم امور کو شامل ہے۔ اس جگہ تعزیر کے معنی تعظیم کے ہیں، نصرت سے مراد توقیر ہے، نور سے مراد قرآن اور وحیِ الٰہی ہے، جس کو نبی اکرم ﷺ لائے ہیں، سو جو لوگ مومن، معظم، موقر، متبع قرآن و حدیث ہیں، وہی دنیا اور آخرت میں کامیاب ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اس جگہ یوں ہے کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ﴾ سے خاص بنی اسرائیل مراد ہیں۔[3] (قاله الرازي) مگر جمہور کہتے ہیں کہ ساری امت مراد ہے، خواہ اسرائیلی ہوں یا ان کے سوا۔ نبیِ اُمی سے ہماری مراد نبیِ اکرم ﷺ ہیں، باجماع مفسرین اس قید سے سارے اہلِ ملل اور اہلِ کتاب خارج ہوگئے۔ اُمی امتِ اُمیہ کی طرف نسبت ہے، جو نہ لکھے نہ گنے نہ پڑھے۔ یہ لوگ عرب ہیں۔ یا اُم کی طرف نسبت ہے، یعنی اپنی پیدایش کے وقت کی حالت پر باقی ہیں، لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا ہے۔[4] (قاله الزجاج) یا ام القریٰ کی طرف نسبت ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔[5] نظامی گنجوی رحمہ اللہ نے امیت کی ایک اور ہی تاویل کی ہے:

اُمی گویا بزبان فصیح ۔۔۔ از الف آدم و میم مسیح

''ناخواندہ (محمد ﷺ) واضح زبان میں کہہ رہے ہیں کہ الف سے مراد آدم علیہ السلام اور میم سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔''

حافظ شیراز نے قولِ اول کی بنیاد پر یہ شعر کیا خوب کہا ہے:

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت ۔۔۔ بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

''میرا محبوب جو نہ کسی مدرسے میں گیا اور نہ اُس نے کوئی خط لکھا، وہ اپنی آنکھ کے ایک اشارے سے سیکڑوں استادوں کو مسئلے سکھانے والا بن گیا۔''

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٣٦) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٦)
[3] تفسير الرازي (١٥/ ٢٠) [4] معاني القرآن (٢/ ٣٨١) [5] فتح البيان (٥/ ٣٣)

فیضی کا شعر بھی قولِ ثانی کی مناسبت سے بہت اچھا ہے:

خاکی و بر اوج عرش منزل — اُمی و کتاب خانہ در دل

''آپ ہیں تو خاکی، لیکن آپ کی منزل عرش کی بلندی پر ہے۔ آپ ناخواندہ ہیں، لیکن دل میں کتب خانہ رکھتے ہیں۔''

قصیدہ بردہ کا یہ شعر:

فَإِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا — وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمُ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

ایک طرح کے مبالغے سے، جس سے منع کیا گیا ہے، خالی نہیں ہے، اس لیے کہ اس شعر میں سید الانبیا کے لیے عالم الغیب ہونے کا مفہوم نکلتا ہے اور وہ بھی اس شد و مد کے ساتھ کہ لوح و قلم کا علم من جملہ بعض علوم کے ہے، حالانکہ اللہ پاک ہی لوح و قلم کے علم اور جملہ علومِ غیب کے ساتھ متّصف ہے، مگر جتنا جس کو بتا دیا۔ مغیبات کا علم نہ رکھنے میں ساری مخلوق برابر ہے، نہ فرشتوں کو خبر ہے، نہ رسولوں کو تو پھر اہلِ نجاست و رمل و کہانت کا کیا ذکر ہے۔ اسی لیے نجومی، رمال اور کاہن وغیرہم کی تصدیق کرنے والے ایمان سے خارج ہو کر مشرک قرار پا جاتے ہیں۔ لوگوں کو راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم اسلام سے بہکا دیتے ہیں۔ اسی طرح میر آزاد بلگرامی کا وہ شعر ہے:

مَا كَانَ يَعْرِفُ أَلْوَاحاً وَّلَا قَلَماً — وَكَانَ يَعْرِفُ مَا فِيْ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

''آپ تختی اور قلم سے نا آشنا تھے، مگر لوح و قلم کے علم سے واقف تھے۔''

کیونکہ یہ بات کسی صریح آیت سے ثابت ہے نہ کسی صحیح حدیث سے کہ نبیِ اکرم ﷺ کو سارے مرقومات و مکتوباتِ لوح و قلم کا علم حاصل تھا، بلکہ خود آپ ﷺ نے اپنے نفسِ مبارک سے علمِ غیب کی نفی کی ہے، جس کو عموماً و شمولاً ارشاد فرمایا ہے: ﴿ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ﴾ [الأعراف: ۱۸۸] ''اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔'' بلکہ اس بات کا اظہار امت کو بتلانے کے لیے اللہ علام الغیوب کے حکم سے کیا، تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ پیغمبر کو علمِ غیب نہیں ہوتا۔ پھر صحیح حدیث میں ایک جزوی معاملے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: «لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِيْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْيَ»[1] ''بعد میں جو بات میرے سامنے آئی، اس کا علم مجھے پہلے ہو جاتا تو میں قربانی کا جانور ساتھ نہ لاتا۔''

معلوم ہوا کہ آپ کو امور کے انجام سے بالکل بے خبری حاصل رہتی تھی۔ جتنی بات اللہ پاک کی طرف سے بتا دی جاتی تھی، اسی کا علم ہوتا تھا نہ کہ سارے ذاتی اور مخلوق کے معاملات کا۔ یہی عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور جو کوئی یہ سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ یا پہلے انبیا یا ملائکہ مقربین یا اولیائے متقین یا صلحائے متبعین یا ائمۂ دین یا مجتہدینِ شرع

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

مبین عالم الغیب ہیں تو وہ بالیقین مشرک ہے نہ کہ زمرۂ مومنین مسلمین میں سے ہے۔ میر آزاد نے شعر مذکور کو شعر جامی رحمہ اللہ کے ترجمہ کے طور پر نظم کیا ہے، اس لیے کہ انھوں نے مستی محبت وخمار شاعری میں، جس طرح کہ شاعروں کی عادت ہوتی ہے، یوں فرمایا ہے:

بقلم گر نہ رسید انگشتش بود لوح و قلم اندر مشتش

''اگرچہ اس کی انگلی نے کوئی قلم نہیں پکڑا، پھر بھی لوح وقلم اس کی مٹھی میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ ان شعرائے عشاق مزاج کی یہ جراَت و اغراق و مبالغہ معاف فرمائے، کیونکہ حسنِ ظن یہ ہے کہ ان مضامین کو انھوں نے کچھ اپنے عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے ذکر نہیں کیا، بے ساختہ جوش وخروش، الفت ومحبت میں ایسے معانی و الفاظ ان کی زبان سے جاری ہو گئے، اس وقت انھیں تنقید وتنقیح مسائل کا خیال ولحاظ نہ رہا، ورنہ ان کو مسئلہ مذکورہ خوب معلوم تھا اور اسی عقیدے پر وہ ان شاء اللہ تعالیٰ دنیا سے گزر گئے ہیں، لیکن ہم لوگوں کو جو مراتبِ نقصان میں کامل اور مدارجِ کمال سے بڑے نقصان میں شامل ہیں، ان کی تقلید سے ایسے الفاظ کا تلفظ اپنے کلام میں وہ خواہ نثر ہو یا نظم نہیں کرنا چاہیے۔ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ کبھی دیدہ و دانستہ اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کوئی بے ادبی نہ ہونے پائے۔ وباللہ التوفیق

لو ذکر کیا تھا، ہم کدھر نکل گئے۔ نبیِ اکرم ﷺ کا اُمی یعنی بے پڑھا ہونا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ حاشیۂ بیضاوی میں اَم (الف کی زبر کے ساتھ) کی طرف منسوب کہا ہے۔ بمعنی قصد، یعنی مقصود آپ ہی تھے۔ الف کی پیش کو باب تغییر سے منسوب بتایا ہے۔ یعقوب کی قراءت بھی یہی ہے، لیکن پہلی قراءت زیادہ بہتر ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُمی وہ شخص ہے جس کو قراءت و کتابت کی مشق نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی آپ جامع علوم اولین وآخرین تھے۔[1]

یہ جامعیت اس بات کو لازم نہیں کرتی کہ آپ غیب دان تھے، کیونکہ قاریِ قرآن تھے، کوئی رطب و یابس ایسا نہیں ہے جو قرآن میں نہ ہو۔ مقاصدِ قرآن اور معالمِ فرقان کے سب سے زیادہ عالم اور عارف جناب رسالتِ مآب ﷺ تھے۔ اسی لیے عالمِ علوم اولین وآخرین ٹھہرے۔ صلح حدیبیہ میں آپ نے لکھا، جس طرح ظاہر حدیث مشہور ہے، یا لکھا نہیں بلکہ لکھوایا اور بطورِ مجاز آپ کی طرف منسوب ہوا، اس میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اس دن آپ سے کتابت کا صدور بطور معجزے کے ہوا۔ اس بحث کی تفصیل فتح الباری میں ہے۔[2] یہود و نصاریٰ کا مرجع یہی دو کتابیں تھیں: ایک انجیل اور دوسری تورات۔

سو اللہ پاک نے خبر دی کہ نبیِ اکرم ﷺ کا حال ان دونوں کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے: ﴿الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ

---

[1] تفسیر أبي السعود (۳/ ۲۷۹)
[2] فتح الباري (۷/ ۵۰۳۔ ۵۰۴)

﴿مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ﴾ (آیتِ باب) اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انجیل کے نازل ہونے سے پہلے کا کلام تھا۔ گویا آیندہ کی خبر ارشاد فرمائی۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی تعریف اور توصیف دونوں کتابوں میں لکھی تھی، اگر نہ لکھی ہوتی تو اس کلام کا ذکر کرنا، اعظم منفرات سے ہوتا، یہود و نصاریٰ کے واسطے آپ ﷺ کے قول کو قبول کرنے سے، کیوں کہ جھوٹ اور بہتان پر اصرار کرنا ایک بڑی نفرت کی بات ہے۔ کوئی عاقل ایسی بات میں ساعی نہیں ہوتا ہے جو موجب اس کے نقصانِ حال وتنفیرِ ناس کا قبولِ قول سے ہو، لیکن جب یہ بات کہی گئی اور دھڑلے سے صاف صاف اس کو ظاہر کر دیا تو ثابت ہوا کہ بلاشبہہ رسول اللہ ﷺ کی تعریف تورات اور انجیل میں مذکور ہے۔ یہ نبیِ اکرم ﷺ کی نبوت کے صحیح ہونے پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔[1]

تاریخ خمیسی میں ہے کہ لفظ محمد تورات میں سریانی زبان کی لغت میں بطور ''منحمنا'' مذکور ہے۔ اس لفظ کے معنی اس لغت میں محمد ﷺ ہیں۔ محمد وہ ہے جس کی حمد لوگ باگ بہت سی کیا کریں۔ احمد کا لفظ انجیل میں اسی لفظ عربی کے ساتھ آیا ہے۔ احمد وہ ہے جو اکثر اللہ کی حمد وثنا کرتا رہے۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو ان دونوں صفتوں کا جامع بنایا تھا۔ نہ اللہ کی حمد نبیِ اکرم ﷺ سے زیادہ کسی نے کی نہ آپ ﷺ سے زیادہ کسی کی حمد لوگوں نے کی۔ وللّٰہ الحمد والمنۃ

حمد را با تو نسبتی ست درست | بر در ہر کہ رفت بر در تست

''تعریف اور شکر تیرے ہی لیے درست ہے، مانگنے کے لیے جو بھی گیا، وہ تیرے دروازے ہی پر گیا۔''

معروف وہ شے ہے جس کو دل جانتے پہچانتے ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے، جیسے مکارمِ اخلاق اور محاسنِ عادات۔ منکر وہ شے ہے جس کا دل انکار کریں، اس کو نہ پہچانیں، جیسے مساوی اخلاق (برے اخلاق) اور مخاشن صفات (سخت گیری)۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ لوگوں کو خلع انداد (اللہ کے شریکوں کو چھوڑ دینا) اور صلہ ارحام کا حکم کرتے ہیں اور عبادتِ اصنام (بتوں کی پوجا) اور قطع ارحام (قطع رحمی) سے منع فرماتے ہیں۔[2]

مستلذات (لذت دینے والی چیزیں) جنھیں دل پسند کرتے ہیں، انھیں حلال کرتے ہیں۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ہر اس چیز کی اصل جو دل کو اچھی لگے اور نفس کو اور طبیعت کو لذیذ لگے، اس کا حلال ہونا ہے یا اس سے مراد اونٹ کا گوشت اور بھیڑ بکریوں اور گایوں کی چربی ہے، جس کو اہلِ کتاب نے حرام کر رکھا تھا۔ یا اس سے مراد بحیرہ، سائبہ، حام اور وصیلہ ہے جن کو مشرکین نے حرام ٹھہرا دیا تھا۔ خبیث چیزوں کو، جیسے: حشرات، خنزیر، رِبا (سود) اور رشوت وغیرہا ہیں، حرام فرماتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ خبائث سے مراد مردار، خون اور خنزیر کا گوشت ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز ہے جس کو طبیعت خبیث سمجھے، اس سے گھن آئے، کیونکہ کسی چیز کے نقصان دہ ہونے میں اصل اس کا حرام ہونا ہے، مگر جس کے حلال ہونے پر کوئی دلیل آ گئی ہو۔

---

[1] تفسير الرازي (١٥/ ٢١) [2] تفسير القرطبي (٧/ ٩٩) [3] تفسير الخازن (٢/ ٢٩٨)

"إِصْر" ثقل (بوجھ) کو کہتے ہیں۔ مراد تکالیفِ شاقہ ثقیلہ ہیں یا عمل کرنے کا عہد احکامِ تورات پر ہے۔
"أَغْلَل" سخت قسم کی تکالیف سے استعارہ ہے، جو اُن کے گلے بندھی تھیں۔ جیسے توبہ میں اپنے آپ کو قتل کرنا، خاطی (تقصیر کرنے والا) کے لیے اعضا کا کاٹنا، بدن یا کپڑے پر اگر نجاست لگ جائے تو اس کو قینچی سے کاٹ دینا۔ قتل میں قصاص ہی کا تعین کرنا، دیت لینے کو حرام کر دینا، سینچر کے دن میں عمل کرنا، نماز کا کنیسا کے علاوہ کسی اور جگہ پر جائز نہ ہونا، اس طرح کے اور بہت سے سخت احکام ان پر جاری تھے۔

اللہ نے خاتم الانبیا، سید الرسل ﷺ کے طفیل ان سختیوں کو نرمیوں سے بدل دیا۔ سو اب اہلِ کتاب، بلکہ تمام لوگوں میں سے جو کوئی نبیِ اکرم ﷺ پر ایمان لا کر آپ ﷺ کی عظمت اور وقار کا تحفظ کرے گا، دشمن کے مقابلے میں آپ کا مددگار ہوگا، قرآن پاک پر عمل کرے گا، سنتِ مطہرہ پر چلے گا، امر و نہی بجا لائے گا، وہی نجات پانے والا، کامیاب، صاحبِ فلاح و ہدایت ہوگا نہ کوئی اور، وہ کسی امت کا کیوں نہ ہو۔ آیتِ شریفہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہمارے نبی جناب محمد ﷺ کا ذکر پہلی اور پرانی کتابوں میں ثابت ہے۔ وللہ الحمد

فتح البیان میں اس جگہ ایک کراسہ (کتاب کے ایک حصہ) کے قریب پرانی کتابوں میں سے نبیِ اکرم ﷺ کے ذکر کے ثابت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان عبارتوں کا ترجمہ یہاں دینا ضروری نہیں۔[1] مدعا کے ثبوت کے لیے یہی ایک آیت دلیل اور واضح حجت کے طور پر کافی ہے۔ ﴿فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبٰلِغَةُ﴾ [الأنعام: ١٤٩] "پھر مضبوط دلیل تو اللہ ہی کی ہے۔" ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ [النساء: ١٢٢] "اور اللہ سے بڑھ کر کون قول و قرار میں سچا ہے؟" ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ﴾ [المرسلات: ٥٠] "پھر اس (قرآن) کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟"

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِ الَّذِيْ
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ
فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ
وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٨﴾

کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿158﴾

[1] فتح البیان (٥/ ٣٦۔ ٥٢)

نبی اکرم ﷺ کی عمومی رسالت:

اللہ پاک نے اپنے نبیِ اکرم ﷺ کو فرمایا کہ تم یوں کہہ دو کہ یہ خطاب ہر گورے کالے، عربی عجمی کو ہے کہ میں تم سب کی طرف مرسل ہوا ہوں۔ یہ نبیِ اکرم ﷺ کی بزرگی اور عظمت ہے کہ وہ خاتم الانبیا ہیں، سب لوگوں کی طرف مبعوث ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ١٧] ”اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩] ”کہہ دیجیے: اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۚ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ﴾ [آل عمران: ٢٠] ”اور ان اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے پوچھیں: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا ہے۔“ اس بارے میں بہت آیات ہیں، جس طرح احادیث بھی اکثر آئی ہیں۔

یہ بات دینِ اسلام سے بخوبی معلوم ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سارے لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کچھ بحث ہو گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ دلایا، وہ خفا ہو کر چلے گئے، ان کے پیچھے ابوبکر رضی اللہ عنہ گئے، معافی چاہی، انھوں نے معاف نہ کیا، دروازہ بند کر لیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کے پاس تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: اس تمھارے صاحب نے غضب و کینہ و بغض کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ اپنے فعل پر نادم ہوئے۔ سلام کر کے نبیِ اکرم ﷺ کے پاس بیٹھ کر حال کہا، آپ ﷺ کو غصہ آیا، ابوبکر کہنے لگے: واللہ! یا رسول اللہ! میں ہی ظالم ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم میرے صاحب کو میری خاطر ترک نہیں کرتے؟! میں نے کہا تھا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (آیتِ باب) تم نے کہا: تُو جھوٹا ہے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم سچے ہو۔[1] (تفرد به البخاري)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں پانچ چیزیں دیا گیا ہوں، جو مجھ سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٤)

پہلے کسی کو نہیں دی گئیں، یہ بات کچھ فخر کی غرض سے میں نہیں کہتا: میں مبعوث ہوا ہوں سارے لوگوں کی طرف، کیا لال، کیا کالے، میں مدد کیا گیا ہوں رعب کے ساتھ ایک ماہ کی راہ تک، حلال کی گئی ہیں میرے لیے غنیمتیں اور مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوئیں۔ زمین کو میرے لیے پاک اور مسجد بنا دیا گیا، مجھے شفاعت دی گئی ہے، سو میں نے اس شفاعت کو اپنی امت کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ یہ شفاعت اس کے لیے ہو گی جو اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا۔[1] (رواه أحمد و إسناده جيد ولم يخرجوه)

شفاعت صرف اہلِ توحید کے لیے:

معلوم ہوا کہ جو کوئی ایمان اسلام لا کر قبر پرستی، پیر پرستی اور بت پرستی وغیرہ کرتا ہے تو نبیِ اکرم ﷺ اس کے شفیع نہیں ہوں گے۔ شفاعت ان اہلِ کبائر (کبیرہ گناہ کے مرتکب) کی کریں گے جو کسی طرح کا شرک جلی یا خفی نہیں کرتے۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ جس سال غزوۂ تبوک تھا، ایک رات نبیِ اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، کچھ لوگ آپ کے اصحاب میں سے آپ کے پیچھے نگہبانی کے لیے جمع ہو گئے۔ جب نماز پڑھ کر پھرے تو فرمایا: آج کی رات مجھے پانچ چیزیں دی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں: ایک میں ہوں کہ سب لوگوں کی طرف عامتاً بھیجا گیا ہوں۔ مجھ سے پہلے جو لوگ تھے، وہ فقط اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ مجھے اپنے دشمنوں پر رعب سے مدد دی گئی ہے، گو میرے اور ان کے بیچ میں ایک ماہ کی راہ کیوں نہ ہو، وہ میرے رعب سے بھرے ہیں۔ حلال ہوئیں میرے لیے غنیمتیں، یعنی ان کا کھانا، جو مجھ سے پہلے تھے وہ ان کے کھانے کو ایک بہت بڑا امر جانتے تھے، غنیمتوں کو جلا دیتے تھے۔ زمین میرے لیے مسجد اور طہور کر دی گئی ہے، جہاں کہیں مجھ کو نماز پا لے، میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لوں۔ مجھ سے پہلے لوگ اس کو ایک بڑی بات سمجھتے تھے۔ اپنے کنیساؤں اور گرجوں ہی میں نماز پڑھتے تھے۔ پانچویں چیز یہ ہے کہ مجھ سے کہا: کچھ مانگ، اس لیے کہ ہر نبی نے کچھ مانگا ہے۔ سو میں نے اپنا سوال قیامت کے دن پر اٹھا رکھا ہے۔ وہ تمھارے لیے ہے اور اس کے لیے ہے جو گواہی دیتا ہے کہ لا إله إلا الله.[2] (رواه أحمد و إسناده جيد قوي ولم يخرجوه)

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں جس نے مجھ کو سنا، میری امت سے یا یہودی یا نصرانی سے، پھر مجھ پر ایمان نہ لایا تو وہ جنت میں نہ جائے گا۔[3] (رواه أحمد) یہ حدیث صحیح مسلم میں دوسری طرح پر ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے آئی ہے۔ الفاظ یوں ہیں: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، نہ سنے گا مجھ کو کوئی آدمی اس امت سے

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٠١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ٣١٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٢٢) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٣٧)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٩٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٩٣)

یہودی ہو یا نصرانی، پھر ایمان نہ لائے گا مجھ پر تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔[1]

مسند احمد میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ یوں ہیں: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ أَوْ نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَا يُؤْمِنُ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ»[2] (تفرد به أحمد) وَعَنْ أَبِيْ مُوْسٰى رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: «أُعْطِيْتُ خَمْساً بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّطَهُوْراً، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِمَنْ كَانَ قَبْلِيْ، وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ شَهْراً، وَأُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ، وَلَيْسَ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا وَقَدْ سَأَلَ الشَّفَاعَةَ وَإِنِّيْ قَدْ أَخْبَأْتُ شَفَاعَتِيْ، ثُمَّ جَعَلْتُهَا لِمَنْ مَّاتَ مِنْ أُمَّتِيْ لَمْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا»[3] (رواه أحمد وهذا إسناده صحيح ولم أرهم خرجوه وله مثله من حديث ابن عمر بسند جيد أيضاً) اس حدیث کا ترجمہ پہلے دی گئی احادیث سے واضح ہوتا ہے۔ اس حدیث میں شفاعت مشروط ہے غیر مشرک کے ساتھ۔

یہ حدیث صحیحین میں بھی سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: «أُعْطِيْتُ خَمْساً لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ مِّنَ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِيْ: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّطَهُوْراً، فَأَيُّمَا الرَّجُلُ مِنْ أُمَّتِيْ أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تُحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِيْ، وَأُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهٖ وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً»[4] حاصل ترجمہ اس حدیث کا بھی اوپر گزر چکا۔ اس میں شفاعت کا ذکر مطلقاً آیا ہے۔ یہ مطلق محمول ہے مقید پر، یعنی اس کی شرائط ہیں۔

اہلِ بدعت کی خدمت:

اہلِ بدعت جن کو یہ گھمنڈ ہے کہ ہم جو پیروں اور بزرگوں کے نام پر نذر و نیاز دیتے ہیں۔ کسی کا عرس اور کسی کی قبر پر طواف بجا لاتے ہیں، کسی کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، کسی سے مدد مانگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں، ان سے مریض کے لیے شفا طلب کرتے ہیں، عطائے ولد کر کے قبور پر پیش کش لاتے ہیں، وہ اولیا، علما، مشائخ، صوفیہ، قیامت کے روز ہماری شفاعت کر کے ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا کر بہشت میں لے جائیں گے، یہ محض ان کا خیالِ باطل، جھوٹا گمان اور بے کار وہم ہے۔ بلاشبہ انبیا علیہم السلام کے علاوہ دیگر صلحا، شہدا، علما، اطفال اور ملائکہ گناہگاروں

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت صحیح مسلم میں سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت "سنن النسائي الكبرىٰ" میں مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٦٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣) مسند أحمد (٢/ ٣٥٠)

[3] مسند أحمد (٤/ ٤١٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد (٨/ ٤٦٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

کے سفارشی ہوں گے، لیکن شفاعت اسی کے واسطے ہوگی جس نے کسی کو اللہ کی عبادت اور ربوبیت میں کھلے چھپے شریک نہ کیا ہوگا۔ اگر باوجود ایمان و اسلام کے اقرار، نماز، روزہ، حج، زکات، جہاد کے وہ عقیدہ یا عمل میں مشرک تھا، خواہ ذرہ برابر شرک کیوں نہ ہو تو اس کی شفاعت نامعلوم ہے۔ یہ تو شیطان کا ایک دھوکا ہے، جو اس نے ان لوگوں کو دے رکھا ہے۔

اگر یہ لوگ قرآن پاک کو پڑھتے پڑھاتے تو جان لیتے کہ کبھی ظاہری ایمان کے ساتھ شرک بھی جمع ہو جاتا ہے، جس طرح اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۶] ''اور ان کے اکثر اللہ پر (اس طرح) ایمان لاتے ہیں کہ وہ مشرک ہی ہوتے ہیں۔'' یہ بات نہیں ہے کہ جس نے ایمان کا اقرار کیا، کلمہ شہادت پڑھا، نماز روزہ وغیرہ اعمالِ اسلام بجا لایا، اب وہ مشرک نہیں ہو سکتا، مشرک وہی ہوگا جو کلمہ گو نہیں ہے، بت پرستی اور ستارہ پرستی وغیرہ اہلِ جاہلیت و کفر جیسے افعال کرتا ہے، بلکہ تجربے سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ جو شرک ان اہلِ اسلام کے عام لوگوں سے، بلکہ خاص لوگوں سے جو قبر پرست اور پیر پرست ہیں، ان سے ہوتا ہے وہ بالکل ایمان کے اور اسلام کی بنیاد کے منافی ہے۔

اس زمانۂ آخر کے مسلمان اکثر برائے نام ہیں، خالص اللہ پاک کو پوجنے والے، اسی کو نفع رساں و ضرر رساں مدد کرنے والا اور داد رسی کرنے والا سمجھنے والے بہت کم، بلکہ کیمیا کی طرح نایاب ہیں۔ اس جگہ اسلام کا زبانی دعویٰ باوجود اس کے کہ ظاہر و باطن ایک دوسرے کے مخالف ہیں، کچھ کار آمد نہیں ہو سکتا، نہ ایسے مشرکوں کی شفاعت کوئی پیر، پیغمبر، استاد، شہید، صالح، فرشتہ یا بچہ کر سکتا ہے۔ وہ دن تو ایسا ہولناک ہوگا کہ اولوالعزم انبیا کانپیں گے، دوسروں کی کیا ہستی ہے۔ پیر خود درماندہ شفاعت کجا ؎

دراں دم کہ از فعل پرسند و قول　　　اولوالعزم را تن بلرزد زِ ہول

''جس وقت انسان کے اقوال و افعال کے متعلق باز پرس ہوگی تو اس وقت خوف و ہراس کی وجہ سے باہمت لوگوں کے جسم بھی کانپنے لگیں گے۔''

پھر اللہ پاک نے اپنی صفت قولِ رسول ﷺ میں ذکر کی کہ جس نے مجھ کو بھیجا ہے وہی ہر شے کا خالق و رب اور بادشاہ و مالک ہے، اسی کے ہاتھ میں بادشاہت ہے، وہی مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے، اسی کا حکم چلتا ہے ؎

خدایا جہاں بادشاہی ترا ست　　　زما خدمت آید خدائی ترا ست

پناہِ بلندی و پستی توئے　　　ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئے

''اے اللہ! اس کائنات کی بادشاہی تیرے ہی لیے ہے۔ آقائی اور حاکمیت تیرے ہی لیے ہے، ہم تو خدمت گزار ہیں۔ ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو پناہ دینے والا تو ہی ہے، کائنات میں جو کچھ ہے سب فانی ہے اور ہمیشہ رہنے والا تو ہی ہے۔''

اتباعِ نبی کا حکم:

پھر لوگوں کو یہ حکم دیا کہ یہ ہمارے رسول ہیں، تمھاری طرف۔ تم ان کی راہ پر چلو، ان پر ایمان لاؤ۔ یہ وہی نبیِ اُمی ہیں، جن کا تم سے وعدہ ہوا تھا، جن کی بشارت پرانی کتابوں میں دی گئی تھی۔ ان کی یہ صفت ان کتابوں میں لکھی چلی آتی ہے۔ اسی لیے اس جگہ نبیِ اکرم ﷺ کو نبیِ اُمی کے لفظ سے یاد فرمایا ہے۔ تم جب ان کے طریقۂ مستقیمہ پر چلو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب نبیِ اکرم ﷺ کے اوصاف کا ذکر، جو تورات اور انجیل میں لکھا ہوا تھا، ہو چکا تو اللہ پاک نے آپ ﷺ سے فرمایا کہ اب تم ان لوگوں سے ایسی بات کہہ دو جو عمومِ رسالت کی مقتضی ہے، کیونکہ پہلے رسول خاصتاً اپنی ہی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کو اللہ نے ہر سیاہ اور سرخ کی طرف بھیجا ہے۔[1] اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، اس جگہ طولِ کلام کی وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر زمین اور آسمانوں پر اپنی بادشاہت اور علی الاطلاق اپنے معبود ہونے کا ذکر کیا۔ اپنے اکیلے ہونے اور اپنی صفتِ ربوبیت اور زندہ کرنے اور مارنے کی اور اس میں کسی کے شریک نہ ہونے کا بیان کیا۔ سوائے اللہ کے کس کو زندہ کرنے اور مارنے کی طاقت ہے۔ کلمات سے مراد کتبِ منزلہ قدیمہ یا آیاتِ الٰہیہ یا عیسیٰ علیہ السلام یا قرآن ہے، مگر اس بیان کی عمومیت زیادہ بہتر ہے۔ اس آیت میں نبیِ اُمی کی اتباع کا حکم فرمایا ہے۔ یہ اتباع اقوال، افعال، اعتقادات، اعمال اور احوال میں عام ہے۔ پھر اس حکم کی وجہ ہدایت کو ٹھہرایا۔[2] معلوم ہوا کہ کتابِ عزیز سے ثابت ہے کہ ہر امر و ترک میں سنتِ مطہرہ کی اتباع کرنے کا حکم ہوا ہے، یہ اتباع ہدایت ہے۔ اتباع کو توڑنے والی چیز ابتداع (بدعت) ہے۔ اس میں آرا اور مذاہب کی تقلید بھی داخل ہے، وہ گمراہی ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک گروہ (ایسا) ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی (حق) کے ساتھ عدل کرتے ہیں ﴿159﴾

قومِ موسیٰ سے اہلِ عدل و ہدایت کا ایک گروہ:

یہ وہی لوگ تھے کہ جب نبیِ اکرم ﷺ پہنچے تو ایمان لائے، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے

---

[1] الدر المنثور (۳/ ۵۸٤) [2] فتح البیان (۵/ ۵۳)

ہیں کہ اللہ پاک نے بنی اسرائیل کے حال کی خبر دی کہ ان میں ایک تابع حق ہے، حق کے مطابق حکم دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] ''اہل کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۹] ''اور بے شک اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیتیں تھوڑی قیمت کے بدلے نہیں بیچتے، وہی ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [القصص: ۵۲۔ ۵۴] ''وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ ان لوگوں کو ان کا دو بار اجر دیا جائے گا، کیوں کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۲۱] ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہی ہیں خسارہ پانے والے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴾ [بني إسرائيل: ۱۰۷۔ ۱۰۹] ''بلاشبہہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ اور وہ روتے ہوئے اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ (قرآن) ان کے خشوع کو زیادہ کرتا ہے۔''[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۴۱)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ایک عجیب خبر کا ذکر کیا ہے، ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے انبیا کو قتل کیا اور وہ بارہ سبط (قبیلے) تھے تو ایک سبط نے ان سے بیزاری ظاہر کر کے اعتذار (عذر پیش) کیا۔ اللہ عزوجل سے یہ سوال کیا کہ ان کے اور ان اسباط کے درمیان جو قاتل تھے، جدائی کر دے، اللہ نے ان کے لیے زمین میں ایک سرنگ کھول دی، وہ اس راہ سے چل کر چین کے پرے سے نکلے، وہ اس جگہ حنفائے مسلمین ہیں، ہمارے قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٤] ''اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اس زمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو سمیٹ لائیں گے۔'' آخرت کے وعدے سے یہ مراد عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں۔ وہ ایک سال چھ ماہ تک سرنگ کے رستے میں چلے۔ (قال ابن عباس رضی اللہ عنہما) امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک قوم ہے جن کے اور تمھارے بیچ شہد کی نہر ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جب اللہ نے سامری کے قصے کا ذکر کیا اور بنی اسرائیل کے تزلزل (زلزلے) کا بیان فرمایا تو اب ان میں سے اس گروہ کا ذکر کیا جو امتِ مذکورہ کے مخالف تھے کہ وہ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاتے ہیں اور حق کا راستہ دکھاتے ہیں، عدل و انصاف اور حق پرستی کا حکم دیتے ہیں، لین دین، داد دست سب عدل سے ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ قوم تھی جو امتِ موسوی میں سے دینِ حق پر باقی رہے۔ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام لائے تھے اس پر کسی تحریف یا تبدیلی کے بغیر قائم رہے۔ لوگوں کو بھی اسی طرف بلایا۔ امام کلبی، ضحاک اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ قوم مشرق کی طرف دور چین کے ایک درہ میں ایک ندی پر بستی ہے جس کو نہرِ اردن کہتے ہیں۔ کسی کے پاس ان کے دوسرے سے کم مال نہیں ہے۔ رات کو پانی برستا ہے، دن کو کھل جاتا ہے، کھیتی کرتے ہیں، ہم میں سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا، وہ سب دینِ حق پر ہیں[2] تا آخر قصہ۔ یہ قصہ صحت سے دور تر اور وضع (گھڑنے) سے نزدیک تر ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت جن کو علمِ حدیث سے معرفت نہیں ہے وہ اس قصے کے ذکر میں مبتلا ہوگئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس قوم سے وہ بنو اسرائیل مراد ہیں جو قرآن پر اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے: اے رب! میں ایک امت پاتا ہوں، جن کی انجیلیں ان کے دلوں میں ہوں گی۔ فرمایا: وہ امت تیرے بعد ہے اور وہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ کہا: ایک امت پاتا ہوں

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٧٣۔ ١٧٤)
[2] تفسير البغوي (٣/ ٢٩٠)

جو نماز پنج گانہ پڑھے گی، وہ نماز کفارہ ہو گی۔ فرمایا: وہ تیری امت کے بعد امتِ محمد ﷺ ہے۔ کہا: ایک امت پاتا ہوں جو صدقات دے گی، پھر وہ انھی میں پھر کر آ جائیں گے، وہ اس کو کھائیں گے۔ فرمایا: وہ امت تیری امت کے بعد امتِ محمد ﷺ ہو گی۔ کہا: اے رب! مجھ کو امتِ محمد ﷺ سے کر، اس پر اللہ نے یہ آیت باب بطور مرضی (موسیٰ کو راضی کرنے کے لیے) اتاری۔[1]

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٦١﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾

اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) کو بارہ قبیلوں کے لحاظ سے (بارہ) گروہوں میں بانٹ دیا تھا اور جب موسیٰ کی قوم نے اس سے پانی مانگا تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو اپنا عصا (اس) پتھر پر مار۔ (اس نے مارا) تو اس (پتھر) سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، تب ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا، اور ہم نے ان پر مَن اور سلویٰ نازل کیا (اور کہا:) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمھیں دی ہیں، ان میں سے کھاؤ۔ اور (اس کے بعد) انھوں نے (جو کچھ کیا تو) ہم پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے رہے (160) اور جب ان سے کہا گیا: تم اس بستی میں ٹھہرو اور اس میں جہاں سے جی چاہے کھاؤ پیو (رزق حاصل کرو) اور کہو: [حِطَّةٌ] ''ہمیں معاف کر دو'' اور (شہر کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا تو ہم تمھاری خاطر تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے، پھر ہم نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے (161) پھر ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، انھوں نے اس لفظ کو، جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا، اس

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٨٧) فتح البیان (٥/ ٥٤۔ ٥٥)

کے برعکس بدل ڈالا، تب ہم نے آسمان سے ان پر عذاب بھیجا، اس لیے کہ وہ ظلم کرتے تھے ﴿162﴾

یعنی ابھی ایک شہر فتح ہوا ہے، آگے سارا ملک ملے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس ساری آیت کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے، وہ مدنی ہے اور یہ سیاق مکی ہے۔ دونوں سیاقوں میں جو فرق ہے اس سے ہم متنبہ کر چکے ہیں، اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔[1] وللہ الحمد والمنة.

بنی اسرائیل کے بارہ گروہ:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گروہ کر دیا۔ بعض کو بعض سے تمیز بخشا۔ ایک یہ بھی ان پر احسان کیا تھا کہ وہ بارہ قبیلے ہو گئے، ہر قبیلے کا ایک نقیب تھا، جیسے اللہ پاک کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ﴾ [المائدة: ١٢] ''اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے تھے۔'' سبط پوتے کو کہتے ہیں۔ بارہ بیٹوں کی اولاد بارہ گروہ ہو گئے۔ اسباط سے مراد وہی قبائل ہیں، مراد اولادِ یعقوب علیہ السلام ہے۔ یعقوب کا نام اسرائیل ہے، ان کی اولاد اسباط کہلاتی ہے۔ ان کا نام امم اس لیے رکھا کہ ہر سبط ایک کثیرۃ العدد جماعت تھی، جن کی آرا مختلف تھیں، ایک جماعت کا کوئی امام دوسری جماعت کا کوئی امام۔

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل اکہتر فرقے ہو گئے، سب دوزخی ہیں مگر ایک فرقہ۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نصاریٰ بہتر فرقے ہو گئے، سب ناری ہیں مگر ایک فرقہ۔ یہ امت تہتر فرقے ہو جائے گی، سب نار میں ہوں گے مگر ایک فرقہ۔ یہود کے حق میں اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٩] ''اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک گروہ (ایسا) ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی (حق) کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔'' یہی امت یہود میں سے ناجی ہے۔ نصاریٰ کے حق میں کہا ہے: ﴿ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ﴾ [المائدة: ٦٦] ''ان میں سے ایک گروہ درمیانی راہ چلنے والا ہے۔'' یہی امت نصاریٰ میں ناجی ہو گی۔ رہے ہم سو فرمایا: ﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٨١] ''اور جنھیں ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک گروہ (ان لوگوں کا) ہے جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔'' سو یہی امت اس امت سے نجات پائے گی۔[2] (رواه ابن أبي حاتم و أبو الشيخ)

اللہ کے انعامات:

حفاظِ حدیث نے کہا ہے کہ ''كلها في النار'' کا اضافہ صحیح نہیں ہے، نہ مرفوعاً نہ موقوفاً۔ موسیٰ علیہ السلام کو استسقا کا حکم اس وقت دیا گیا جب کہ ان کو تیہ میں پیاس لگی اور پانی نہ تھا، تب فرمایا کہ تم اپنی لاٹھی پتھر پر مارو۔ جب لاٹھی

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٤١)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٥٨٧۔ ١٥٨٨)

ماری تو بارہ چشمے بہہ نکلے۔ ہر سبط کا ایک الگ چشمہ تھا، جس سے وہ پانی پیتے۔ ہر سبط نے اس ضروری علم کے ساتھ جس کو اللہ نے پیدا کیا تھا، اپنا اپنا چشمہ پہچان لیا۔ پھر جب تیہ میں چلتے تو بادل سایہ کرتا تھا، جب ٹھہر جاتے تو بادل بھی ٹھہر کر دھوپ سے بچاتا۔

من وسلویٰ یعنی ترنجبین اور سمانی کھانے کو ملتا۔ یہ سلویٰ پرندوں کی جنس سے تھا، اللہ نے اس طعام کو طیبات (پاک) مستلذات (لذت دینے والا) فرمایا ہے۔ ایک میٹھا دوسرا نمکین تھا، لیکن انھوں نے اس بے مشقت حاصل ہونے والے کھانے کی قدر نہ کی۔ مخالفت کر کے کفرانِ نعمت کیا، اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ان کو یہ کہا تھا کہ تم اس شہر بیت المقدس یا اریحیا میں رہو اور بسو۔ وہاں موجود کھانے کی چیزوں از قسم پھل، زرعی اجناس، سبزیاں اور دانے کھاؤ پیو، کوئی تم کو روکنے والا نہیں ہے۔

حِطّہ میں تحریف اور عذاب:

لفظ ﴿ حِطَّةٌ ﴾ کہتے ہوئے شہر میں جاؤ، دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ اس قول وفعل کو جمع کرو، ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے، جو محسنین ہیں، ان کو مغفرت کے علاوہ اور زیادہ نعمتیں بھی دیں گے۔ ظالموں نے وہ لفظ نہ کہا، کچھ اور ہی کہا، جیسے "حِنْطَةٌ فِي شَعِيْرَةٍ" سجدے کے عوض اپنے چوتڑوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ سورت بقرہ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ آیتِ باب سورت بقرہ کی آیت سے آٹھ طرح پر مختلف ہے۔ خطیب نے ان وجوہ کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر وہ مختلف ہے۔ جب انھوں نے یہ حرکت کی تو اللہ نے ان پر عذاب بھیجا، طاعون آیا، ایک وقت میں ستر ہزار آدمی مر گئے، یہ عذاب ان پر ان کے ظلم کے سبب سے آسمان سے اترا تھا۔ سورت بقرہ میں ہے کہ ان کے فسق کے سبب سے یہ عذاب آیا۔

مطلب یہ ہوا کہ جب انھوں نے اپنے قول وفعل کو بدل ڈالا تو وہ فاسق ٹھہرے، اللہ کی اطاعت سے باہر ہو گئے۔[1] ہر فسق ظلم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ صریح حکم کے الفاظ میں تغیر وتبدل کرنا اور صریح حکم کے بجا لانے میں مخالفت کرنا عذاب کے نازل ہونے اور سزا کے بھیجے جانے کا باعث بنتا ہے۔ اس امت نے بھی جب سے صریح احکام پر قول وفعل کے لحاظ سے عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور لوگوں کی آرا پر چلنے لگے، تب سے ہر طرح کا عذاب اور عقاب آنے لگا، جس جگہ دیکھو وبا وقحط موجود ہے، چیچک سے صدہا بچے مر جاتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دینے سے ہر جگہ فسق وفجور کا زور وشور ہے۔ دین لہو ولعب ٹھہر گیا ہے، جس طرح بنی اسرائیل اپنے انبیا اور رسولوں کے خلیفوں کو قتل کرتے تھے، اسی طرح اب اس امت کے موحدین پر اہلِ بدعت اور اہلِ ہویٰ کی ہر قالب و ہر شکل میں دست درازی ہوتی رہتی ہے۔

---

[1] فتح البیان (۵/ ۵۵۔ ۵۸)

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

اور (اے نبی!) ان (یہودِ مدینہ) سے اس بستی (ایلہ) کے بارے میں پوچھیں جو سمندر کے ساحل پر واقع تھی، جب وہ لوگ سبت (ہفتے کے دن) کے بارے میں حد سے گزر جاتے تھے، جب کہ ان کے یومِ سبت کو ان کی (شکار کی) مچھلیاں ان کے پاس ظاہر (پانی کے اوپر) آجاتی تھیں اور جس دن ان کا ہفتہ نہ ہوتا وہ (ان کے پاس) نہیں آتی تھیں۔ اسی طرح ہم انھیں آزماتے تھے، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے (163)

ایلہ بستی کا واقعہ اور یہود کی ہفتے کے دن میں زیادتی:

داود علیہ السلام کے عہد میں یہ قصہ ہوا ہے۔ یہود پر ہفتے کے دن شکار کرنا منع کیا۔ اللہ نے اس شہر والے لوگ بے حکم دیکھے، ان کو آزمانے لگا۔ ہفتے کے دن مچھلیاں اوپر پھریں اور دنوں میں غائب رہیں، اس پر وہ صبر نہ کر سکے، آخر ہفتے کو شکار کیا۔ اپنی دانست میں حیلہ کیا کہ دریا کے کنارے میں پانی کاٹ لائے کہ مچھلیاں وہاں بند ہو جائیں تو بھی مچھلیاں ہاتھ نہ آئیں، ہفتہ کی شام کو نکل جاتیں۔ آخر ہفتے کے دن ان کے بھاگنے کی راہ بند کی، اتوار کو پکڑ لیا۔ پھر وہ لوگ بندر ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو حلال روزی نہ ملے اور حرام چاہے تو ملے، تو یہ اس کے لیے آزمائش ہے۔ آخر وہ روزی وبال ہو گی، اور معلوم ہوا کہ حیلہ اللہ کے پاس کام نہیں آتا۔ اس سیاق کا اس آیتِ کریمہ پر بھی اطلاق ہوتا ہے: ﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ ﴾ [البقرة: ٦٥] ''اور یقیناً تمھیں ان لوگوں کا علم ہے جنھوں نے تم میں سے ہفتے (کے دن) میں زیادتی کی۔''

اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو فرمایا کہ تم اپنے سامنے ان یہود سے اصحابِ سبت کا قصہ پوچھو کہ کس طرح ان پر اللہ کا انتقام اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر اچانک آ پڑا تھا، پھر ان کو تمھاری اس صفت سے، جس کو وہ اپنی کتاب میں لکھا ہوا پاتے ہیں، چھپانے سے ڈراؤ کہ کہیں ان کا حال بھی ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائے۔ یہ بحیرہ قلزم کے کنارے پر ایلہ نام کی ایک بستی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ بستی مدین اور طور کے درمیان تھی۔ یہی امام عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ عبداللہ بن کثیر قاری نے کہا ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ وہ گاؤں ایلہ تھا۔ کسی نے کہا کہ مدین تھا۔ یہ ایک روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ہے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ اس کا نام مقنا تھا جو مدین اور عینونا کے درمیان تھا۔[1]

سنیچر کے دن وہ لوگ اللہ کے حکم کے خلاف مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٨٠۔ ١٨٢)

کہ مچھلیاں پانی پر پھرتیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر جگہ ظاہر ہوتیں۔[1] اللہ نے ان کو آزمایا، جس دن شکار حرام تھا، اس دن پانی پر مچھلیوں کو ظاہر کیا، جس دن حلال تھا، اس دن حیتان (مچھلیوں) کو ان سے پوشیدہ رکھا۔ یہ بات ان کی آزمایش کے لیے عمل میں آئی، انھوں نے اللہ کے حکم میں حیلہ نکال کر حرمت کی ہتک کی، ظاہر میں ایسے اسباب کیے، جن کا باطن میں تعاطی (ہاتھ چلانا) حرام تھا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ تم وہ کام نہ کرو جو یہود نے کیا تھا۔ اللہ کی حرام چیزوں کو ادنیٰ حیلوں سے حلال کر لیا۔[2] (رواہ الفقیہ الإمام أبو عبداللہ بن بطة) یہ اسناد جید ہے، کیونکہ اس حدیث کے راوی احمد بن محمد بن مسلم کو خطیب نے اپنی تاریخ میں موثق کہا ہے۔ باقی رجال مشہور اور ثقات ہیں۔ ایسی اسناد کو ترمذی اکثر صحیح کہا کرتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ قریہ سے سوال کرنے کا حکم بطور ڈانٹ ڈپٹ کے ہے۔ اس سوال میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہود کو یہ بات جتانا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قصے کے بارے میں علم ہے، اس کی خبر اللہ نے ان کو دی ہے، ورنہ ان کو کہاں سے یہ ماجرا معلوم ہوا۔ یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی دلیل ہے۔ وہ بستی ایلہ یا مدین یا ایلیا تھی، یا کوئی اور گاؤں تھا جو مدینہ اور مصر و مغرب کے درمیان تھا۔ (قالہ ابن عباس) امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طبریہ شام تھا۔[3] بعض نے کہا ہے کہ ساحلِ شام کی بستیوں میں سے ایک بستی تھی، بہرحال دریائے قلزم کے کنارے پر واقع تھا۔ اس جگہ مچھلیاں خاص سنیچر ہی کے دن آتی تھیں اور دنوں میں نہ آتیں۔ پانی پر پھرتیں یا سر اٹھائے ہوئے ظاہر ہوتیں یا گھروں کے دروازوں تک آ جاتیں، یہ ان کے لیے اللہ کا امتحان تھا۔[4]

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے (دوسرے سے) کہا: تم ایسے لوگوں کو وعظ کیوں کرتے ہو جنھیں اللہ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۱۸۳)

[2] إبطال الحیل لابن بطة (۱/ ۴۷) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ۵/ ۳۷۵)

[3] تفسیر الخازن (۲/ ۳۰۲) [4] فتح البیان (۵/ ۵۸۔ ۵۹)

ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: اس لیے کہ (ہم) تمھارے رب کے حضور عذر کرسکیں اور شاید کہ وہ (اللہ سے) ڈریں 164 پھر جب انھوں نے وہ باتیں بھلا دیں جن کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو برے کام سے روکتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو بدترین عذاب کے ساتھ پکڑ لیا، جنھوں نے زیادتی کی تھی، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے 165 پھر جب انھوں نے اس معاملے میں سرکشی کی جس سے انھیں روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا: ہو جاؤ ذلیل بندر 166

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بابت لوگوں کے تین رویے:

ان میں تین فرقے ہوئے: ایک شکار کرتے، ایک منع کرتے رہتے تھے اور ایک تھک کر منع کرنا چھوڑ بیٹھے، لیکن بہتر وہی تھے جو منع کرتے رہے۔ منع کرنے والوں نے شکار کرنے والوں سے ملنا چھوڑ دیا اور درمیان میں دیوار اٹھائی، ایک دن صبح کو اٹھے، دوسروں کی آواز نہ سنی، دیوار پر سے دیکھا، ہر گھر میں بندر ہیں، وہ آدمیوں کو پہچان کر اپنے قرابت والوں کے پاؤں میں سر رکھنے لگے اور رونے لگے، آخر برے حال سے تین دن میں مر گئے۔

اللہ نے اہلِ قریہ کے حال کی خبر دی کہ وہ تین فرقے ہو گئے، ایک فرقہ تو منع کی ہوئی اور ڈرائی ہوئی حرکت کا مرتکب تھا، سنیچر کے دن حیلہ نکال کر مچھلی کا شکار کرتا تھا، ان کا بیان سورت بقرہ میں ہو چکا ہے۔

دوسرا فرقہ ان کو اس کام سے منع کرتا تھا، جب انھوں نے نہ مانا تو کنارہ کش ہو گیا۔ تیسرا فرقہ خاموش رہا، نہ شکار کیا، نہ ان کو منع کیا۔ منع کرنے والے فرقے سے کہا: تم ان کو کیوں نصیحت کرتے ہو، اللہ تو ان کو ہلاک کرے گا یا عذابِ شدید دے گا؟ یعنی جب تم نے سمجھ لیا ہے کہ یہ ہلاک ہونے والے ہیں تو پھر انھیں منع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ اس گروہ نے کہا کہ فائدہ یہ ہے کہ ہم تمھارے رب کے سامنے معذور ٹھہریں گے، ہم سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عہد لیا گیا ہے، اس لیے ہم ان کو منع کرتے ہیں کہ شاید وہ ہمارے منع کرنے سے پرہیزگاری اختیار کریں، سنیچر کے دن شکار کرنا چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اگر وہ توبہ کریں تو اللہ بھی ان کی توبہ قبول کرے گا، رحم و کرم فرمائے گا، لیکن جب انھوں نے نصیحت کرنے والوں کی نصیحت کو قبول نہ کیا، جس سے انھیں منع کیا جاتا تھا، اسے بھلا دیا تو اللہ نے برائی سے منع کرنے والے گروہ کو بچا لیا اور ان ظالموں، نافرمانی کرنے والوں پر سخت عذاب نازل کیا۔ یہ آیت شریفہ نص ہے منع کرنے والوں کی نجات اور ظالموں کی ہلاکت پر۔

نجات پانے والے اور ہلاک ہونے والے:

تیسرے گروہ یعنی جنھوں نے تھک کر منع کرنا چھوڑ دیا تھا، ان کے بارے میں سکوت فرمایا ہے، اس لیے کہ جزا کسی عمل کے کرنے سے ہوتی ہے، وہ نہ تعریف کے مستحق تھے کہ ان کی تعریف کی جاتی نہ کسی ممنوعہ چیز کے مرتکب

تھے کہ ان کی مذمت کی جاتی۔ معہذا ائمہ نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ آخر وہ کیا ٹھہرے، ہلاک ہونے والوں میں رہے یا نجات پانے والوں میں، یہ دو قول ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ دونوں گروہ: منع کرنے والے اور چھوڑ دینے والے بچ گئے۔ فرقۂ خاموش نے اللہ کے لیے نہایت غضب ناک ہو کر یہ بات فرقۂ ناہیہ سے کہی تھی کہ اب تم ان کو نصیحت نہ کرو۔ یہ تو برباد و تباہ ہوا چاہتے ہیں۔ رہا فرقہ ثالثہ جو معصیت کا مرتکب تھا، ہلاک ہوا، آدمی سے بندر بن گئے۔[1]

عکرمہ رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ ہیں کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فرقۂ ساکتہ ناجی ہوا تھا یا نہیں، ہمیشہ اس بات کے پیچھے لگا رہتا تھا، یہاں تک کہ میں نے جان لیا کہ اس گروہ نے نجات پائی۔[2]

عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک دن میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا، وہ رو رہے تھے، مصحف ان کی بغل میں تھا، پہلے تو ان کے نزدیک جانے سے جھجکا، پھر آگے بڑھ کر پاس جا بیٹھا۔ میں نے کہا: تم کیوں روتے ہو؟ میں تم پر فدا ہوں، کہا: ان ورقات نے رلا دیا ہے، وہ ورق سورت اعراف کے تھے۔ کہا: تو ایلہ کو پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، کہا: وہاں ایک قبیلہ یہود کا تھا۔

پھر سنیچر کے دن مچھلی کا شکار کرنے کا قصہ ذکر کیا، اس میں یہ بھی کہا کہ جس رات عذاب آیا، اس کی صبح کو فرقۂ ناجیہ کے ایک مرد نے شہر کی فصیل پر سیڑھی لگا کر جھانکا، دیکھا کہ سب بندر ہو گئے ہیں، چلّاتے ہیں، ان کی دم بھی ہے، دروازے کھول کر ان کے پاس گئے۔ بندروں نے اپنے نسب والے آدمی پہچان لیے، لوگوں نے اپنے نسب والے بندر نہ پہچانے، ہر بندر اپنے قرابتی کے پاس آ کر اس کا کپڑا سونگھتا، روتا، وہ کہتا: ہم نے تجھ کو پہلے ہی منع کیا تھا، وہ سر ہلا کر کہتا: ہاں سچ ہے۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت پڑھی۔ کہا: میں دیکھتا ہوں کہ جو منع کرنے والے تھے، وہ ناجی ہوئے۔

دوسرے گروہ کا حال معلوم نہیں۔ ہم بہت اشیا دیکھتے ہیں، جس کا انکار کرتے ہیں، مگر کچھ کہہ نہیں سکتے۔ میں نے کہا: میں تم پر فدا، تم نہیں دیکھتے کہ جب اس فرقے نے ان کے فعل کو برا جانا اور مخالفِ حق سمجھا تب ہی تو یہ کہا کہ تم کیوں ان کو نصیحت کرتے ہو، اللہ تو ان کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اس پر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے دو موٹے کپڑے مجھ کو پہنائے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ پہلی پوری روایت تفسیر ابن کثیر میں ہے۔[3]

ابن رومان نے کہا ہے کہ مچھلیاں سنیچر کے دن آیا کرتیں، جب پانی ہٹ جاتا تو وہ بھی چلی جاتیں، دوسرے

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۱۸٦) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۱۳/ ۱۸۷) اس کی سند میں "داود بن حصین عن عکرمہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۱۳/ ۱۸۷۔ ۱۸۹) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳٤۳۔ ۳٤٤) اس کی سند میں ایک راوی مجهول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

سنیچر تک نظر نہ آتیں۔ ایک آدمی نے ایک رسی اور ایک میخ لے کر سنیچر کے دن پانی میں ایک مچھلی باندھ رکھی، جب یک شنبہ کی رات ہوئی تو اس کو بھون کر کھایا، لوگوں نے مچھلی کی خوش بو پائی، اس سے پوچھا، اس نے انکار کیا، وہ اس کے پیچھے پڑے رہے، یہاں تک کہ اس نے یہ کہا کہ ایک کھال مچھلی کی مجھے مل گئی تھی۔

جب دوسرا سنیچر آیا تو اس نے پھر وہی کام کیا، یہ نہیں معلوم کہ شاید یوں کہا کہ دو مچھلیاں باندھیں، لیکن جب اتوار کی رات آئی تو مچھلی پکڑ کر تلی، اس کی خوش بو لوگوں نے پائی تو انھوں نے آ کر پوچھا، کہنے لگا: اگر تم چاہو تو میری طرح کرو، کہا: تُو کیا کرتا ہے؟ اس نے تمام حال بیان کیا، وہ بھی اسی کی طرح پر مچھلیاں پکڑنے لگے، یہاں تک کہ یہ ایک راہ نکل گئی، ان کے شہر کی فصیل تھی، اس کے دروازے رات کو بند کر لیا کرتے تھے۔ رات کو وہ مسخ ہو گئے، صبح کو جب ہمسایہ لوگ جو ان کے ارد گرد بستے تھے، اٹھے تو شہر کو بند پایا، پکارا تو کچھ جواب نہ ملا، ناچار شہرِ پناہ کی دیوار پر چڑھے، دیکھا کہ وہ سب بندر ہو گئے ہیں۔ وہ بندر پاس آ کر جس کو پہچانتے تھے، اس کو چھونے لگے۔[1] اس گاؤں کا حال سورت بقرہ میں گزر چکا ہے، وہ کافی و وافی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ فرقۂ ساکتہ بھی ہلاک ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کے تین حصے ہو گئے۔ ایک تہائی نے منع کیا، ایک تہائی نے کہا: تم ان کو کیوں وعظ کرتے ہو، اللہ ان کو ہلاک کرے گا۔ ایک تہائی اصحابِ خطیئہ (گناہ کرنے والے) تھے۔ منع کرنے والوں نے نجات پائی، باقی رہے سہے سب ہلاک ہو گئے۔[2] یہ اسناد جید ہے، لیکن امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عکرمہ رحمہ اللہ کے قول کی طرف رجوع کرنا، جس کے مطابق ساکتین (خاموش رہنے والے) نے بھی نجات پائی، زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ ان کا حال اس کے بعد ظاہر ہو گیا۔ اس آیت میں کہ عذاب سخت میں ان کو پکڑا، اس بات کی دلیل ہے کہ جو بچے، انھوں نے نجات پائی۔[3]

﴿ بَئِيْسٍ ﴾ بمعنی شدید ہے۔ (قاله مجاهد) یا بمعنی الیم یا موجع (المناک یا دردناک) ہے۔ (قاله قتادة)[4] یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ﴿ خٰسِئِيْنَ ﴾ کے معنی ذلیل، حقیر خوار ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امت نے، یعنی اہلِ قریہ میں سے صلحا کی ایک جماعت نے دوسرے لوگوں سے جو شکاریوں کو وعظ کرنے کی کوشش کرتے اور کشش رکھتے تھے، ان کی نصیحت کو قبول کرنے اور اس نافرمانی کا قلع قمع کرنے سے مایوس ہو کر یہ بات کہی کہ تم اس قوم کو جن کو سزا دے کر مٹا دینا اللہ پاک کو منظور ہے، کیوں نصیحت کرتے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١٣/ ١٩٣) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ١٩٣۔ ١٩٤) اس کی سند میں ''داود بن حصین عن عکرمہ'' ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٤٤) [4] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٠٢)

ہو۔ اللہ ان کو ہلاک کرے گا یا کسی سخت عذاب میں پھانسے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قول ان نافرمان لوگوں کا تھا جو سینچر کے دن مچھلیوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ یعنی جب تم کو معلوم ہی ہے کہ ہم ہلاک ہوں گے تو پھر ہم کو نصیحت کرنا کیا ضروری ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس لیے نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ ہم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دینے پر نہ پکڑے اور شاید تم اس گناہ سے باز رہو۔

جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل تین گروہ ہو گئے تھے: ایک گروہ نے عاصی ہو کر شکار کیا تھا، وہ تقریباً ستر ہزار تھے۔ دوسرا گروہ کنارہ کش تھا، اس نے نہ منع کیا نہ شکار کیا، تیسرے گروہ نے منع کیا، نافرمانی نہ کی، یہ بات دوسرے گروہ نے تیسرے گروہ سے کہی تھی، اس غلبۂ ظن پر کہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ نافرمانوں کو ہلاک کرتا ہے یا عذاب کرتا ہے۔ سو جب نافرمانوں نے صلحا کی نصیحت کو نہ مانا، فراموش کر دیا تو اللہ نے فرقۂ ناہیہ (منع کرنے والے) کو نجات دی۔ نافرمانوں کو عذابِ الیم میں پکڑ لیا، اس لیے کہ وہ فاسق تھے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فرقۂ ساکتہ (خاموش رہنے والا) ناجی ہوا۔ یمان بن رباب نے کہا ہے کہ دونوں گروہ: منع کرنے والے اور خاموشی اختیار کرنے والے ناجی ہوئے، شکاری ہلاک ہو گئے۔ یہی امام حسن رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منع کرنے والے ناجی ہوئے، دو گروہ ہلاک ہونے والے ٹھہرے۔ یہ آیت بہت سخت ہے، نہیِ منکر کے ترک کر دینے کے بارے میں۔[1] اللہ نے نافرمانوں سے کہا کہ تم بندر ہو جاؤ، وہ پہلے انسان تھے، مرد و عورت، اب مسخ ہو کر ذلیل بندر ہو گئے۔

بعض نے کہا ہے کہ جوان بندر بن گئے، بوڑھے سؤر ہو گئے۔ تین دن بعد مر گئے۔ ظاہر نظم قرآنی یہ ہے کہ نجات نہ پائی، مگر گروہِ ناہیہ (منع کرنے والے) نے بدلیل: ﴿ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ ﴾ (آیتِ باب) اور عذاب نہ دیا گیا مگر نافرمانوں کے گروہ کو بدلیل: ﴿ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴾ (آیتِ باب) رہا تیسرا گروہ جو نہ منع کرنے والا تھا اور نہ نافرمانی کرنے والا یا تو وہ نافرمان گروہ کے ساتھ ہی مسخ ہو گیا، اس لیے کہ منع کرنے سے خاموشی اختیار کر کے وہ اپنی جانوں پر ظلم کا مرتکب تھا یا وہ گروہ مسخ نہ ہوا، معصیت کا ارتکاب نہ کرنے کی وجہ سے، اور اگر یہ خاموش رہنے والا گروہ منع کرنے والا تھا، دوسرے گروہ کی طرح تو درحقیقت یہ ایک ہی گروہ ٹھہرا، کیونکہ منع کرنے والے اور علاحدگی اختیار کرنے والے مسخ سے نجات حاصل کرنے کے معاملے میں برابر رہے۔ اس کو ایک مستقل گروہ اس لیے ٹھہرایا گیا کہ ان کے اور منع کرنے والے گروہ کے درمیان اس معاملے میں آپس میں گفتگو ہوتی رہی تھی۔[2]

[1] تفسير البغوي (٣/ ٢٩٤) [2] فتح البيان (٥/ ٦٠ـ ٦٢)

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ١ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ١ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝۱۶۷

اور (اے نبی! یاد کرو) جب آپ کے رب نے (یہود کو) خبردار کر دیا تھا کہ وہ قیامت تک ان پر ایسے شخص کو ضرور مسلط رکھے گا جو انھیں سخت عذاب (کا مزہ) چکھاتا رہے گا۔ بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (167)

دائمی ذلت یہود کا مقدر:

تورات میں فرمایا تھا کہ جب تورات کا حکم چھوڑ دو گے تو تم پر اور بندے مسلط ہو جائیں گے، پھر قیامت تک تم ذلیل رہو گے۔ اب یہود کے پاس کہیں کی حکومت نہیں غیر کی رعیت ہیں۔[1] ﴿ تَاَذَّنَ ﴾ تفعل ہے، اذان سے بمعنی أَعْلَمَ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ امر ہے۔ قوتِ کلام مفید معنیٰ قسم ہے، اسی لیے اس کے پیچھے لام آیا ہے، گویا اللہ نے قسم کھالی ہے کہ میں یہود پر کسی نہ کسی کو قیامت تک عذاب دینے کے لیے مسلط رکھوں گا، یہ بلا ان پر اس لیے آئی کہ انھوں نے اللہ کے حکم کے خلاف کیا۔ حیلہ بہانہ کر کے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کا ارتکاب کیا۔

کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان پر سات سال یا تیرہ سال کا خراج لگایا تھا۔ سب سے پہلے خراج موسیٰ علیہ السلام نے باندھا۔ پھر یہود یونانی، کسرانی اور کلدانی بادشاہوں کے قہر میں گرفتار رہے، پھر نصاریٰ کے قہر میں آ گئے، انھوں نے ان کو خوب ہی ذلیل وخوار کیا۔ جزیہ وخراج لیا، پھر اسلام آیا اور یہود اسلام کے زیرِ قہر اور ذمّی ہوئے، خراج اور جزیہ دینے لگے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد مدینے میں مسکنت و اخذِ جزیہ ہے۔ برے عذاب دینے

---

(1) یہ نواب صاحب، فاضل مفسر رحمہ اللہ کے دور کی صورتِ حال ہے۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کی خصوصی سرپرستی اور امریکہ و روس وغیرہ کی حمایت سے ایک یہودی حکومت اسرائیل کے نام سے معرضِ وجود میں آ گئی۔ لیکن یہ اسرائیلی حکومت دراصل عرب مسلمانوں کے خلاف ایک گہری سازش اور امریکہ و برطانیہ کے تعاون پر مبنی ہے۔ گویا اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ امریکہ و برطانیہ کی کٹھ پتلی حکومت ہے۔ اس حکومت کی کوئی اخلاقی اور قانونی بنیاد نہیں ہے۔ یہ غیروں کے سہارے پر محض اس لیے قائم ہے کہ مسلمان ایک منتشر اور مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ دوسرے، ایمانی قوت اور جذبۂ جہاد سے عاری ہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مغضوب علیہ قوم کا مسلمانوں کے علاقے میں تسلط، مسلمانوں پر اللہ کا ایک عذاب ہو۔ کاش! مسلمان، بالخصوص عرب مسلمان اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور توبہ و استغفار کر کے قرونِ اولیٰ کے سے ایمانی کردار سے اپنے کو متصف کر کے اپنے اللہ کو منالیں۔ پھر دیکھیں کہ یہ یہودی حکومت تارِ عنکبوت کی طرح ان شاء اللہ اَوْهَنُ الْبُیُوت ثابت ہوگی۔ [ص۔ ی]

(2) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۴۵)

والے سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ امتِ اسلام قیامت تک ان کو مقہور رکھے گی۔ یہی سعید بن جبیر، ابن جریج، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے: "يَسْتَحِبُّ أَنْ تُبْعَثَ الْأَنْبَاطُ فِي الْجِزْيَةِ"[1]

پھر انجام ان کا یہ ہوگا کہ وہ دجال کے انصار ہو جائیں گے۔ مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ آخر زمان میں ان کو قتل کریں گے۔ جو کوئی اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، خلافِ شریعت کام کرتا ہے، اللہ اس کا حساب کتاب جلد سمجھ لیتا ہے اور جو کوئی توبہ کر کے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، اس کو بخش دیتا ہے۔ اس جگہ رحمت کو سزا کے ساتھ ملایا ہے، تاکہ کلی طور پر ناامیدی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اکثر ترغیب اور ترہیب کا ذکر ایک ہی جگہ فرماتا ہے، تاکہ لوگ امید اور خوف میں رہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ "آذن" مد کے ساتھ بمعنی "أعلم" ہے اور "أَذَّنَ" شد کے ساتھ "نادیٰ" کے معنی میں ہے۔ ہر دو معنی کا حاصل ایک ہی ہے۔ بعض نے کہا: ﴿ تَأَذَّنَ ﴾ بمعنی قَالَ یا حَکَمَ یا عَزَمَ یا آلیٰ یا حَتَمَ وَأَوْجَبَ ہے۔ بعث سے یہاں مراد تسلط ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ﴾ [بني إسرائيل: ٥] "ہم نے تمھارے مقابلے پر اپنے بندے بھیج دیے جو بڑے ہی لڑاکے تھے۔" قیامت کو اس تسلط کی انتہا فرمایا ہے۔

﴿ يَسُومُهُمْ ﴾ کے معنی ہیں: يُذِيقُهُمْ یعنی ان پر ایسا شخص مسلط و غالب کریں گے جو ان کو برا عذاب چکھایا کرے گا۔ یہود کا وعدہ پورا ہوا۔ یہود أَقْمَأَهُمُ اللّٰهُ ہمیشہ اہلِ ملل کے ہاتھ میں ہمیشہ ذلیل اور ضعیف رہتے تھے، پھر اسلام میں بھی زمین کے ہر کونے میں ذلیل و خوار اور بے قدر ہیں۔ ذلت و خواری اور عذاب ان کے گلے کا ہار ہو گئی ہے۔ جان بچانے کے لیے جزیہ دیتے ہیں، مسلمان ان سے وہ خدمت لیتے ہیں جن سے اوروں کو عار آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ نے ان پر بخت نصر و سنجاریب اور ملوکِ روم کو مسلط کر دیا تھا۔ یہ آیت اس بات پر نص ہے کہ ان کے واسطے یہ عذاب قیامت تک اسی طرح رہے گا، اسی لیے اس عذاب کو اہانت و ذلت اور جزیہ و خراج لینے کے ساتھ تفسیر کیا ہے۔ پھر آخرت میں ان کا عذاب اور بھی اعظم اور زیادہ تر سخت ہوگا۔ (اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا وَتُبْ عَلَيْنَا) اللہ کفار پر دنیا میں جلد عذاب بھیجتا ہے، مومنین پر رحمت فرماتا ہے، مغفرت کرتا ہے۔[2]

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿١٦٨﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْأَدْنٰى

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٢٠٥۔ ٢٠٧) [2] فتح البيان (٥/ ٦٢۔ ٦٣)

وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦٩﴾ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٧٠﴾

اور ہم نے انھیں قبیلوں میں بانٹ کر زمین میں پھیلا دیا۔ ان میں سے کچھ نیک تھے اور ان میں سے کچھ اس کے سوا (بد اعمال) تھے۔ اور ہم نے انھیں خوش حالی اور بدحالی کے ساتھ آزمایا، شاید کہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں (168) پھر ان کے بعد نااہل ان کے جانشین بنے، جو کتاب (تورات) کے وارث ہوئے، وہ ادنیٰ (دنیا کا) سامان لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلد ہمیں بخش دیا جائے گا (مگر ان کا حال یہ ہے کہ) کہ اگر اس جیسا گھٹیا (دنیا کا) سامان (دوبارہ) ان کے پاس آئے تو (بغیر کسی عار کے) لے لیں، کیا ان سے کتاب (تورات) میں پختہ وعدہ نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق کے سوا (کچھ) نہ کہیں؟ حالاں کہ انھوں نے پڑھ لیا ہے جو کچھ اس میں ہے اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہت بہتر ہے جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں۔ کیا پھر تم سمجھتے نہیں؟ (169) اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں (انھیں ہم اجر دیں گے)، بے شک ہم نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے (170)

یہود کا زمین منتشر ہو جانا:

یہود کی سلطنت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت کی وجہ سے ہر طرف نکل گئے اور مختلف مذاہب پیدا ہوئے۔ یہ حال اس امت کو سنایا کہ یہ سب کچھ ان پر ہوگا۔ حدیث میں فرمایا کہ اس امت میں بعضے بندر اور سور ہو جائیں گے۔[1] اللہ گمراہی سے پناہ دے۔ پچھلے لوگ رشوت لے کر مسئلے غلط بتانے لگے اور امید رکھتے کہ ہم بخشے جائیں گے، حالانکہ پھر اسی کام کو حاضر ہیں۔ امید بخشنے کی ہے، جب باز آئیں۔ یہ اسبابِ زندگی دنیا کے مال کو فرمایا۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو زمین میں گروہ گروہ، فرقہ فرقہ، امت امت کر دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقُلْنَا مِن بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا﴾ [بني إسرائيل: ١٠٤] ”اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اس زمین میں رہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو سمیٹ لائیں گے۔“ پھر فرمایا کہ ان میں بعض صالح ہیں اور بعض اور طرح پر جیسا کہ جنوں کا قول نقل کیا ہے: ﴿وَأَنَّا مِنَّا الصَّالِحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَٰلِكَ ۖ كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا﴾ [الجن: ١١] ”اور یہ کہ ہم میں سے نیک بھی ہیں اور اس کے سوا بھی ہیں، ہم مختلف طریقوں (مذاہب) پر تھے۔“

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٢٠) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٠٢)

یہود کی آزمایش:

پھر فرمایا کہ ہم نے ان کو حسنات اور سیئات سے آزمایا، یعنی رخاء، شدت و رغبت و رہبت و بلا و عافیت سے، شاید کہ وہ رجوع کریں، سیدھے ہو جائیں، لیکن اس گروہ کے بعد جو صالح اور طالح تھا، ایسے لوگ آئے جن میں کسی طرح کی خیر نہ تھی، وہ کتاب تورات کی دراست (پڑھنے پڑھانے) کے وارث بنے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ نصاریٰ ہیں[1] یا عموماً سارے اہلِ کتاب جو حق بات کے دینے اور صحیح طریقے کو نشر کرنے کے عوض دنیا کا تھوڑا سا مال سمیٹتے اور اپنی جانوں سے توبہ کا وعدہ کرتے، مگر جب اس طرح کا مال دوبارہ ان کے سامنے آ جاتا تو اس کو لینے کے لیے تیار ہو جاتے، توبہ میں دیر لگاتے، جس طرح سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ گناہ کرتے، پھر اللہ سے بخشش مانگتے، اللہ کے سامنے اقرار کرتے، جب وہی گناہ پیش آتا تو کرنے لگتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی دنیا کی شے ان کے سامنے آتی تو اس کو لے لیتے، حلال ہوتی یا حرام۔ اس کے ساتھ تمنا بخشش کی رکھتے۔ کہتے یہ کام ہم کو معاف ہو گا، ہم بخشے جائیں گے۔ پھر وہی کام کرنے لگتے، جب مال ہاتھ آتا۔

ناخلفوں کا کردار:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: واللہ! وہ ناخلف تھے۔ انبیا و رسل کے بعد کتاب کے وارث ہوئے، اللہ نے ان سے عہد لیا تھا، لیکن انھوں نے پورا نہ کیا اور اللہ نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ [مریم: ٥٩] ”پھر ان کے بعد ناخلف (نالائق ان کے) جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز ضائع کی اور خواہشات کی پیروی کی، چناں چہ جلد ہی (آگے) وہ ہلاکت اور گمراہی (کے انجام) سے دوچار ہوں گے۔“ اس دنیائے ادنیٰ کا سامان، اسباب، مال و متاع لیتے اور ﴿سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ کہتے۔ اللہ پر طرح طرح کی تمنا کرتے، دھوکے میں گرفتار رہتے۔ پھر اگر اسی طرح کا سامان سامنے آتا تو لے لیتے، کوئی شے ان کو کسی شے سے مشغول نہ کرتی اور نہ کوئی شے ان کو کسی شے سے باز رکھتی۔ جب دنیا کی کوئی چیز ان کے روبرو آتی یا اس پر نظر پڑتی تو اس کے کھانے کو تیار ہوتے، حلال ہو یا حرام۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل جس کو قاضی بناتے، وہ فیصلہ کرنے میں رشوت لیتا، ان کے خیار (بہترین لوگوں) نے جمع ہو کر بعض نے بعض سے یہ عہد لیا تھا کہ دیکھو تم ایسا کام نہ کرنا، رشوت نہ لینا، لیکن جب کوئی ان میں قاضی و حاکم ہوتا تو رشوت ستانی کرنے لگتا، جب اس سے کوئی شخص یہ بات کہتا کہ تیرا کیا حال ہے تو فیصلہ کرنے میں رشوت لیتا ہے، تو وہ یہ کہتا: ”سَيُغْفَرُ لِيْ“ (مجھے بخش دیا جائے گا) باقی بنی اسرائیل اس پر طعن کرتے،

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٢١٠)

جب وہ مر جاتا تو دوسرا شخص اس طعن کرنے والوں میں سے اس کی جگہ مقرر ہوتا تو وہ بھی رشوت لینے لگتا۔[1]

یہ اس آیت کا مطلب ہے کہ جب اس دوسرے کے سامنے دنیا آئی، مال آیا تو اس نے بھی اس کا لینا شروع کیا۔ اللہ نے فرمایا: کیا ان سے یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ سوائے حق کے نہ کہنا، حق کو نہ چھپانا۔ اللہ نے اس آیت میں ان کے اس کردار پر انکار ظاہر فرمایا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴾ [آلِ عمران: ۱۸۷] ''اور جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرو گے اور اسے ہرگز نہیں چھپاؤ گے، پھر انھوں نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا، پھر کس قدر بری ہے وہ قیمت جو وصول کر رہے ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ اللہ پر اپنے گناہوں کی بخشش کی تمنا رکھتے تھے اور ہمیشہ انہی گناہوں میں پھنسے رہتے۔ عود کرتے رہتے توبہ نہ کرتے۔[2] پھر اللہ نے یہ فرمایا کہ میرا ثواب اس شخص کے واسطے بہتر ہے جو میری حرام کی ہوئی چیزوں سے بچتا ہے، نفسانی خواہشات کو ترک کر دیتا ہے، میری فرماں برداری پر متوجہ ہے، کیا ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے میں دنیا کو لیتے ہیں، اتنی عقل نہیں ہے کہ انجام کار کو سمجھ کر اس بے وقوفی، تبذیر اور رشوت لینے سے باز رہیں۔ پھر ان لوگوں کی تعریف کی، جنھوں نے کتاب کے ساتھ تمسک کیا ہے، وہ کتاب ان کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی طرف کھینچتی ہے، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حال اس کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ سو وہ اس کتاب کو پکڑے ہوئے ہیں، اس کے امر و نہی اور خبر پر چلتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، ان مصلحین صلحا کا اجر برباد نہیں جائے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تقطیعِ یہود سے مراد زمین میں ان کی تفریق ہے، زمین کے اطراف میں، یا تشتیت امر (انتشار) ہے کہ پھر ان کی بات یکجا نہ ہوگی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے یہود کو زمین میں پھیلا دیا، زمین کا کوئی حصہ نہیں، مگر وہاں ان کا ایک گروہ موجود ہے[3] یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے ان کا ایک فرقہ ایک قطر زمین پر پریشان کر دیا ہے، زمین کا کوئی کونا ان سے خالی نہیں، تاکہ ان کی طاقت باقی نہ رہے۔ یہ امام ابو السعود رحمہ اللہ کا قول ہے۔[4]

سو ایسا شہر کوئی کم ہے جہاں صرف یہودی ہوں، نہ ان کا اب کوئی قلعہ رہا ہے، نہ سلطنت، بلکہ متفرق جگہوں میں متفرق ہیں، ملک تُرک، فارس اور ہند وغیرہ سب جگہ رہتے ہیں، مگر ذلت وخواری و اہانت کے ساتھ۔ صلحا سے وہ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۲۱۲۔ ۲۱۳)

[2] تفسیر الطبري (۱۳/ ۲۱۵) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱۶۰۵)

[4] تفسیر أبي السعود (۳/ ۲۸۷)

لوگ مراد ہیں جو ان میں سے نبیِ اکرم ﷺ پر ایمان لائے یا جو بعثتِ محمدیہ سے پہلے اپنے دین کی تبدیلی اور تحریف کے بغیر مر گئے۔

امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا یہ وصف دین سے مرتد ہونے سے قبل تھا،[1] اللہ کے اس فرمان کی دلیل ہے: ﴿ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ ﴾ (آیتِ باب) بعض نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مخالفت میں منہمک ہو گئے۔ اللہ نے ان صلحا و علما کا امتحان خیر و شر سے لیا، آسودگی و تندرستی دی، آزمایش اور سزا بھی ڈالی یا فراخی اور تنگی دکھلائی کہ شاید وہ متنبہ ہو کر اپنے کفر اور معاصی سے باز آئیں، لیکن یہ تو کچھ نہ ہوا۔ جو ان کی جگہ پر دوسرے لوگ آئے اور کتاب کے وارث ہوئے، انھوں نے دنیا کا مال و متاع لینا اختیار کیا۔ خلف بسکون لام بمعنی طالح (بُرا) ہے اور لام کی زبر کے ساتھ بمعنی صالح ہے۔ اس جگہ سکون کے ساتھ ہے، اگرچہ ان دونوں لفظوں کا استعمال اس کے برعکس ایک دوسرے کے معنی میں بھی ہو جاتا ہے۔

"عَرَض" بہ فتح را بمعنی دنیا کا تمام متاع ہے۔ کہتے ہیں: "اَلدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ یَأْکُلُ مِنْهَا الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ"، عرض بسکون را بمعنی تمام مال، سوائے درہم و دینار کے ہے، یعنی سامانِ اسباب۔ ادنیٰ سے یہاں مراد دنیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ کلماتِ الٰہی کی تحریف اور کتاب کی تبدیلی کے مقابلے میں جو مال و منال رشوت و سُحت ان کو ملتا ہے، وہ اس کو لے کر کھاتے ہیں اور تورات کے جو سچے اور صحیح احکامات ہیں، ان کو مخفی رکھتے ہیں۔ ادنیٰ دناءت سے ماخوذ ہے بمعنی سقوط، یعنی دنیا کا یہ متاع ایک حقیر، ساقط، خسیس، دنی، تافہ بے حقیقت شے ہے۔ دنیا ماخوذ ہے دُنُوّ سے بمعنی قُرب۔ دونوں لفظ ایک دوسرے کے قریب ہیں، کیونکہ ساری دنیا حقیر فانی ہے۔ جو شخص دنیا میں راغب ہوتا ہے، وہ دنیا سے بھی زیادہ حقیر اور ذلیل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے تھے، کہا: کچھ لوگ دنیا پر متوجہ ہو کر دنیا کو کھائیں گے، قرآن کی رخصت کی جستجو کریں گے۔ ﴿ سَیُغۡفَرُ لَنَا ﴾ کہیں گے، جو شے دنیا کی ان کے سامنے آئے گی، اس کو لے لیں گے۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں جو اس ادنیٰ کا سامان لیتے ہیں، جو شے دنیا کی ان کو نظر آتی ہے، وہ حرام ہو یا حلال، اس کے خواہش مند ہیں، اس کو لے لیتے ہیں، اگر ویسی ہی کچھ اور چیز ملے تو اس کو بھی لے لیں۔[3] دنیا میں کوئی شے نجس یا حرام، اعلیٰ یا ادنیٰ، بول و براز، کتوں اور خنزیروں کی ہڈیاں تک باقی نہیں ہیں، جس کو لے کر اپنا کام نہیں نکالتے، نہ حلال سے غرض، نہ حرام کی پروا۔

اب جو کوئی شخص اس امتِ اسلام میں سے بھی یہی کام کرے تو وہ بھی انہی کے حکم میں ہوگا۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیتِ باب کو قرآن کی رخصت کی اتباع کرنے والوں پر محمول کیا ہے۔ سبب کی خصوصیت

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٢٠٨) [2] الدر المنثور (٣/ ٥٩٣) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٢١٢)

(شانِ نزول کے واقعے) پر ہی اس کو مقصور نہ رکھا۔ لفظ کی عمومیت کا اعتبار کیا۔ معہذا ان اقوام کا یہ قول ہے کہ ﴿سَيُغْفَرُ لَنَا﴾ یعنی اپنے جیسوں کو باوجود انتہا درجے کی نافرمانی کے بخشش کا وعدہ دے کر پھسلاتے ہیں۔ اللہ پاک پر جھوٹی اور باطل تمنائیں رکھ کر دل بہلاتے ہیں۔ اس کلام سے مراد سخت قسم کی ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ شداد بن اوس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عقل مند وہ شخص ہے جس نے اپنی جان کا حساب لیا اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کیا۔ عاجز وہ شخص ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے، اللہ پر تمنائیں اور آرزوئیں رکھتا ہے۔[1]

معہذا اگر ان کے پاس اس سامان کے مثل کچھ آ جاتا ہے جو لے چکے ہیں تو اب بھی عذاب کی کچھ پروا یا سزا کا خوف کر کے اس کے لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یا مراد مدینے کے یہودی ہیں جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے کہ جس طرح ان کے اسلاف نے لیا دیا ہے، اسی طرح یہ بھی لیتے دیتے ہیں، حالانکہ ان سے یہ عہد پختہ ہو گیا تھا کہ دیکھو کبھی احکام میں رشوت نہ لینا جو بات کہنا وہ سچی بات تورات کے مطابق کہنا، تورات کا درس دینا، مگر انھوں نے وہ عہد ترک کر دیا۔ یہ ترک کرنا ان کا دیدہ و دانستہ تھا، نہ کہ لاعلمی میں، اس لیے اس ترک کا گناہ بہت بڑا اور شدید جرم ٹھہرا، حالانکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو آخرت کا گھر ڈرنے والوں کے لیے کہیں بہتر ہے۔ کیا تم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے؟! اس سوالیہ انداز میں دھمکی اور دھڑکی ہے، جس کا ٹھکانا نہیں ہے، ہاں جو لوگ کتاب کو پکڑے ہوئے ہیں اور نماز بھی پڑھے جاتے ہیں تو ہم ان کا اجر ضائع کرنے والے نہیں۔[2]

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا جو کچھ حال ذکر ہوا کہ وہ پڑھ لکھ کر جان بوجھ کر کتاب اللہ کے حکم کے خلاف کرتے ہیں، تورات کے حکم کو چھوڑ کر رشوت لے کر اپنی رائے سے کچھ اور ہی فتویٰ دیتے ہیں، بعینہٖ یہی حال اس امت کے فقہا کا ہو گیا ہے۔ إلا ما شاء اللہ

پہلے فقہا جو ان زمانوں کے تھے جن کی خیر کی شہادت دی گئی ہے وہ صالح اور زاہد لوگ تھے، ان کے بعد جو خلف آئے وہ بالکل ناخلف ہوئے، سوائے اس کے جس کو اللہ نے بچایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ تم پیروی کرو گے اگلوں کی چال کی دست بدست اور شبر بشبر (بالشت بہ بالشت) الحدیث۔[3] سو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان پورا ہو گیا، ہزار میں سے سو بھی ایسے نظر نہیں آتے جو کتاب کو تھامے ہوئے ہوں، جس کو دیکھو، سنو، وہ اپنی لال کتاب کو لیے ہوئے ہے۔ إنا للہ.

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٠) اس کی سند میں ''ابوبکر بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٣١٩)

[2] فتح البيان (٥/ ٦٤۔ ٦٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٩)

وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور جب ہم نے ان (کے سروں) پر پہاڑ اُٹھا کھڑا کیا گویا وہ ایک سائبان تھا اور انھوں نے خیال کیا کہ یقیناً وہ ان پر گرنے والا ہے۔ (ہم نے کہا:) اس (تورات) کو جو ہم نے تمھیں دی، قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، تا کہ تم (برے کاموں سے) بچ جاؤ﴿۱۷۱﴾

اقرار لینے کے لیے پہاڑ سروں پر کھڑا کرنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ نَتَقْنَا ﴾ بمعنی رفعنا (بلند کرنا) ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ ﴾ [النساء: ١٥٤] ''اور ہم نے ان سے اقرار لینے کے لیے ان پر طور پہاڑ بلند کیا۔'' فرشتوں نے اس پہاڑ کو ان کے سروں پر اونچا کیا۔[1] پھر موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر ارضِ مقدس کی طرف چلے۔ جب غصہ تھا تو تختیاں اٹھا کر ان کو حکم دیا کہ جو وظائف ان میں ہیں، ان پر عمل کرو، یہ بات ان پر گراں گزری، اقرار کرنے سے منکر ہوئے، اللہ نے پہاڑ لا کر ان کے سر پر کھڑا کر دیا، گویا ایک سائبان تھا۔[2] (رواه النسائي بطوله)

سنید بن داود نے اپنی تفسیر میں ابوبکر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے، تم اس کو قبول کرتے ہو، اس میں حلال، حرام اور امر و نہی کا بیان ہے۔ کہا: ہم کو کھول کر دکھاؤ، اگر اس کتاب کے فرائض و حدود سہل اور آسان ہیں تو ہم قبول کر لیں گے۔ کہا: تم مانو جو کچھ اس کے اندر ہے، کہا: نہیں جب تک ہم معلوم نہ کر لیں کہ اس میں کیا ہے؟ کس طرح کے حدود و فرائض ہیں، جب بار بار یہی تکرار کی تو اللہ نے پہاڑ کو وحی بھیجی وہ اٹھ کر آسمان کی طرف اونچا ہو گیا، جب آسمان اور ان کے سروں کے درمیان آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرا رب عزوجل کیا کہتا ہے، اگر تم تورات کو اس سب کے ساتھ جو اس میں ہے، قبول نہ کرو گے تو میں تم پر اس پہاڑ کو پھینک ماروں گا۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اس پہاڑ کی طرف دیکھا تو ہر مرد سجدے میں گرا، بائیں ابرو کی طرف سجدہ کیا، داہنی طرف سے آنکھ اٹھا کر مارے ڈر کے پہاڑ کو دیکھتا رہا کہ کہیں اوپر نہ گر پڑے۔ اسی طرح اب دنیا میں جو کوئی یہودی ہے وہ بائیں ابرو پر سجدہ کرتا ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ اسی سجدے کی وجہ سے وہ عذاب اٹھا لیا گیا تھا۔

ابوبکر نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے تختیوں کو کھولا، اس میں اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ روئے زمین پر کوئی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٠)

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (فتح الباري: ٦/ ٤٢٧)

درخت، پتھر اور پہاڑ باقی نہ رہا، مگر جنبش میں آ گیا، اب بھی کوئی چھوٹا بڑا یہودی پردۂ زمین پر نہیں ہے کہ جس پر تورات پڑھی جائے، مگر وہ اہتزاز میں آتا ہے، یعنی جھوم جاتا ہے اور اپنا سر ہلاتا ہے۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس جگہ پہاڑ سے مراد طور ہے، جس پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام پاک سنا تھا، الواح کو پایا تھا، یا فلسطین کا کوئی اور پہاڑ تھا یا بیت المقدس کا پہاڑ تھا، وہ بنی اسرائیل کے قد و قامت کے مطابق ان کے سروں کے مقابلے میں بلند تھا، جیسے کسی مکان کی چھت ہوتی ہے۔ اس کی بلندی ایک سائبان کی طرح تھی، انھوں نے دیکھا کہ یہ تو ہم پر گرا پڑتا ہے، تب ان سے کہا کہ تم اس کتاب کو زور سے پکڑو اور اس پر قوت سے عمل کرو اور ان احکام کو بخوبی یاد رکھو، کسی طرح انھیں نہ بھلاؤ، ورنہ ابھی تمھارا سر اس پہاڑ سے کچل دیا جائے گا۔ وہ جب پہاڑ کی طرف دیکھتے تو "سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا" کہتے اور جب کتاب کی طرف نظر کرتے تو "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" "ہم نے سنا اور نافرمانی کی" کہتے۔[2] (قاله ابن عباس)

غرض کہ یہود نے سجدہ نہ کیا، مگر ایک جانب پر، اللہ نے ان سے اسی سجدے کو پسند کر لیا۔ انھوں نے اس سجدے کو سنت ٹھہرا دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس پہاڑ کو جڑ سے اکھاڑ کر ان کے سروں پر لا کھڑا کیا،[3] ہر آدمی نے بائیں رخسار و ابرو کے بل سجدہ کیا، دائیں آنکھ سے پہاڑ کو دیکھتا جاتا تھا کہ کہیں اس پر گر نہ پڑے۔ اسی لیے یہود چہرے کے بائیں کنارے پر سجدہ کرتے ہیں۔ اس آیت شریفہ کی تفسیر سورت بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔[4]

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٧٢﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿١٧٣﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿١٧٤﴾

اور (اے نبی! یاد کرو) جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انھیں ان کی جانوں پر گواہ بنایا (اور پوچھا:) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٢١٩)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١١)
[3] تفسير الطبري (١٣/ ٢١٨)
[4] فتح البيان (٥/ ٦٨-٦٩)

ہیں۔ (اللہ نے فرمایا: یہ اس لیے) کہ تم قیامت کے دن یہ (نہ) کہو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے ﴿172﴾ یا تم (یہ نہ) کہو کہ بے شک ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد (ان کی) اولاد تھے، پھر کیا تو ہمیں اس (فعل) کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو گمراہ لوگوں نے کیا تھا؟ ﴿173﴾ اور اسی طرح ہم آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ (لوگ ہماری طرف) لوٹ آئیں ﴿174﴾

اولادِ آدم سے لیا گیا عہد:

اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی، سب سے اپنی الوہیت کا اقرار لیا، پھر انھیں پشت میں داخل کیا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت ہے، باپ کی تقلید نہیں، اگر باپ شرک کرے، بیٹا چاہے ایمان لائے۔ اگر کسی کو شبہہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا، پھر کیا حاصل، تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں رہا ہے اور ہر زبان پر مشہور رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے، سارا جہان قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے، سو اپنی ناقص عقل کے دخل سے، پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔ یہ قصہ یہود کو سنایا کہ وہ بھی عہد سے پھرے ہیں، جیسے مشرک پھرے ہیں۔

کتاب "تقوية الإيمان" میں فرمایا ہے کہ امام احمد نے ذکر کیا ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ نے اولادِ آدم اکٹھی کی، پھر ان کی مثلیں لگائیں، پھر ان کی صورت بنائی، پھر ان کو بولنے کی طاقت دی، سو وہ بولنے لگے، پھر ان سے قول وعہد لیا اور ان سے ان کی جان پر اقرار کروایا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ بولے: کیوں نہیں! فرمایا: سو میں تم پر ساتوں آسمانوں کو گواہ کرتا ہوں اور ساتوں زمینوں کو اور تمھارے باپ آدم کو اس لیے کہ کہیں تم کہنے لگو قیامت کے دن ہم نہ جانتے تھے۔ سو جان رکھو کہ بے شک بات یوں ہے کہ میرے سوا کوئی حاکم اور مالک نہیں ہے اور میرا کوئی شریک مت ٹھہراؤ، بے شک میں خود تمھاری طرف اپنے رسول بھیجوں گا، جو میرے ساتھ کیا گیا قول وقرار تم کو یاد دلائیں گے اور میں تم پر اپنی کتابیں اتاروں گا۔ بولے اقرار کیا ہم نے کہ بے شک تو ہمارا مالک ہے اور حاکم ہے۔ ہمارا کوئی مالک نہیں سوائے تیرے اور ہمارا کوئی حاکم نہیں ہے سوائے تیرے، یعنی اللہ نے سورت اعراف میں فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ ﴾ (آیتِ باب)[1]

سو اس کی تفسیر میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد اکٹھی کی ایک جگہ، اور ان کی جدا جدا مثلیں لگائیں، جیسے پیغمبروں کی مثل جدا، اولیا کی جدا، شہیدوں کی جدا، نیک بختوں کی جدا، حکم برداروں کی جدا، بدکاروں کی جدا، اسی طرح کافروں کی مثلیں لگائیں، جیسے یہود ونصاریٰ، مجوس اور ہندو۔ علیٰ هذا القياس.

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٣٥)

پھران کی صورتیں بنائیں، یعنی ہر کسی کی صورت جیسی دنیا میں بنانی منظور تھی، ویسی ہی وہاں ظاہر کی۔ کسی کو خوب صورت، کسی کو بدصورت، کسی کو گونگا، کسی کو کانا، کسی کو اندھا۔ علی هذا القياس. پھران کو بولنے کی طاقت دی۔ پھر ان سب سے اللہ نے یوں فرمایا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے اقرار کیا کہ تو ہمارا رب ہے۔

پھران سے قول وقرار لیا کہ میرے سوا کسی کو حکم اور مالک نہ جانیو اور کسی کو میرے سوا نہ مانیو۔ ان سب نے ان سب باتوں کا قول وقرار لیا اور اللہ نے اس بات پر آسمان وزمین کو گواہ کیا اور یہ فرمایا کہ اس قول کے یاد دلانے کو پیغمبر آئیں گے اور کتابیں لائیں گے، سو ہر کسی نے جدا جدا اللہ کی توحید کا اقرار کیا اور شرک کا انکار۔ سو شرک کی بات میں ایک دوسرے کی سند نہیں پکڑنی چاہیے، نہ پیر کی، نہ استاد کی، نہ باپ دادا کی، نہ کسی بادشاہ کی، نہ کسی مولوی کی، نہ کسی بزرگ کی۔

اور یہ جو کوئی خیال کرے کہ ہم تو دنیا میں آ کر اس بات کو بھول گئے، پھر بھولی بات کی کیا سند ہے، سو یہ خیال غلط ہے، اس لیے کہ بہت باتیں آدمی کو یاد نہیں ہوتیں، پھر معتبر لوگوں کے کہنے سے یقین کرتا ہے، جیسے کسی کو اپنی ماں کے پیٹ سے اپنا پیدا ہونا یاد نہیں ہوتا، پھر لوگوں ہی سے سن کر یقین کرتا ہے اور اپنی ماں ہی کو ماں سمجھتا ہے اور کسی کو ماں نہیں بتا سکتا۔ پھر اگر کوئی اپنی ماں کا حق ادا نہ کرے، اور کسی کو ماں بتائے تو اس کو سب لوگ برا کہیں گے اور اگر وہ جواب دے کہ مجھے تو اپنا پیدا ہونا کچھ یاد نہیں کہ میں اس کو اپنی ماں جانوں تو سب لوگ اس کو احمق کہیں گے اور بڑا بے ادب سمجھیں گے۔ تو جب عوام الناس کے کہنے سے آدمی کو بہت باتوں کا یقین آ جاتا ہے، پھر پیغمبروں کی تو بڑی شان ہے، ان کے خبر دینے سے کیوں یقین نہ آئے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل توحید کا حکم اور شرک کی ممانعت، اللہ تعالیٰ نے ہر کسی سے عالمِ ارواح میں کہہ دیا ہے اور سارے پیغمبر اسی کی تاکید کے لیے آئے ہیں اور ساری کتابیں اسی کے بیان میں اتری ہیں۔ سو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا فرمانا اور ایک سو چار آسمانی کتابوں کا علم اسی ایک نکتے میں ہے کہ توحید خوب درست کیجیے اور شرک سے بہت دور بھاگیے، نہ اللہ کے سوا کسی کو حاکم سمجھے کہ کسی چیز میں کچھ تصرف کر سکتا ہے، نہ کسی کو اپنا مالک ٹھہرائیے کہ اس سے کوئی اپنی مراد مانگے اور اپنی حاجت اس کے پاس لے جائے۔" تقوية الإيمان کا بیان تمام ہوا۔[1]

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی پوری حدیث یہ ہے کہ جب انھوں نے اس بات کا اقرار کر لیا کہ سوائے تیرے نہ ہمارا کوئی رب ہے نہ معبود تو آدم علیہ السلام نے ان کی طرف جھانک کر دیکھنا شروع کیا۔ غنی، فقیر، خوب صورت، بدصورت دیکھے، کہا: اے رب! تو نے اپنے بندوں میں برابری نہ کی کہ سب ایک طرح کے ہوتے؟ فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ شکر

---

[1] تقوية الإيمان (٤٠۔ ٤٣)

کیا جاؤں۔ پھر آدم علیہ السلام نے انبیا کو دیکھا جیسے چراغ، ان پر نور تھا۔ ان سے ایک اور بھی اقرار رسالت اور نبوت کے سلسلے میں لیا گیا، وہ اقرار اللہ پاک کا یہ قول ہے: ﴿ وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ﴾ [الأحزاب: ۷] ''اور (اے نبی! یاد کریں) جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔'' وہ انھی ارواح میں تھے، ان کو مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ مریم کے منہ کی طرف سے داخل ہوئے۔[1] (رواه أحمد)

اس حدیث کو عبداللہ بن امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اپنے باپ کی مسند میں روایت کیا۔ آیت ﴿ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ ... الخ﴾ کے ذکر کے بعد اتنا اور زیادہ کیا ہے: وهو الذي يقول: ﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الروم: ۳۰] ''چناں چہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' اور اسی جیسا اللہ کا فرمان ہے: ﴿ هَٰذَا نَذِيرٌ مِنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ ﴾ [النجم: ۵۶] ''یہ (رسول) تو پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے۔'' اور اسی طرح کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ﴾ [الأعراف: ۱۰۲] ''اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد (کا پاس) نہیں پایا۔''[2] (ورواه ابن أبي حاتم و ابن جرير و ابن مردويه في تفاسيرهم من رواية أبي جعفر الرازي به)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ نے پشتِ آدم علیہ السلام سے میثاق نعمان، یعنی عرفے میں لیا تھا۔ ان کی پیٹھ سے ساری اولاد جو پیدا کرنی تھی، باہر نکالی اور اپنے سامنے بکھیر دی، جیسے چیونٹیاں، پھر ان سے دو بدو بات کی۔ فرمایا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: ہاں ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم تو اس بات سے غافل تھے یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے آبا نے کیا تھا، ہم ان کے پیچھے ان کی اولاد ہوئے، تو کیا ہمیں ان مبطلین کے فعل پر ہلاک کرتا ہے۔[3] (رواه أحمد وقد روى هذا الحديث النسائي في كتاب التفسير من سننه رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم إلا أنه جعله موقوفاً و أخرجه الحاكم في مستدركه وقال صحيح الإسناد ولم يخرجاه) اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ کثرت سے روایت کیا گیا ہے اور زیادہ ثابت ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] مسند أحمد (۵/ ۱۳۵)

[2] تفسير الطبري (۱۳/ ۲۳۸۔ ۲۳۹) تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۶۱۵) اس کی سند صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا کلام دیکھیں۔

[3] مسند أحمد (۱/ ۲۷۲) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ۳۴۷) تفسير الطبري (۱۳/ ۲۲۲) تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۶۱۳) مستدرك الحاكم (۱/ ۸۰) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے مرفوع ہونے کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۶۲۳)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: "وإسناده لا مطعن فيه"[1] مسلم بن یسار کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ﴾ (آیتِ باب) تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو بنایا، پھر ان کی پیٹھ کو اپنے ہاتھ سے چھوا، ذریت کو اس سے نکالا، فرمایا: ان کو میں نے جنت کے لیے بنایا ہے، یہ اہلِ جنت کا سا کام کریں گے، پھر پیٹھ کو چھوا، ذریت کو اس سے نکالا، فرمایا: ان کو میں نے آگ کے لیے بنایا ہے، یہ اہلِ نار کا سا عمل کریں گے۔

ایک آدمی نے کہا کہ پھر عمل کیوں ہے؟ فرمایا: اللہ جب کسی بندے کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس کو جنت والوں کے کام کرنے کی توفیق دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اہلِ جنت کے سے اعمال میں سے کسی عمل پر مرتا ہے، پھر اس کو بہشت میں داخل کرتا ہے اور جب کسی بندے کو آگ کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس کو اہلِ نار کے سے اعمال میں لگائے رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اہلِ نار کے سے کسی عمل پر مرتا ہے، پھر اس کو دوزخ میں داخل کرتا ہے۔ (رواه مالك و الترمذي و أبو داود و النسائي و ابن أبي حاتم و ابن جرير و ابن حبان في صحيحه كلهم عن الامام مالك) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔[2]

مسلم بن یسار کو عمر رضی اللہ عنہ سے سماعت نہیں ہے۔ یہی ابو زرعہ کا قول ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان نعیم بن ربیعہ کو ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ابوداود میں بھی ہے۔ سو ان دونوں کا قول قولِ مالک سے صحیح ہونے کے زیادہ قریب ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ امام مالک نے نعیم بن ربیعہ کا ذکر عمداً ساقط کر دیا، کیونکہ انھیں نعیم کے حالات کا علم اور پہچان نہیں تھی، کیونکہ وہ غیر معروف ہیں، مگر اسی حدیث میں۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ اگر کسی شخص یا جماعت کو پسند نہیں کرتے تو ان کا ذکر ساقط کر دیا کرتے ہیں۔ بہت سے مرفوعات کو انھوں نے مرسل کر دیا اور بہت سی موصول روایتوں کو منقطع قرار دے دیا۔[3] واللہ أعلم

اولادِ آدم کو پشتِ آدم سے نکال کر ربوبیت پر گواہ بنانا:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ ہم نے ذریتِ بنی آدم کو بنی آدم کی پشتوں سے لے کر

---

[1] فتح البيان (٥/ ٧٣)

[2] الموطأ (٢/ ٨٩٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٠٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٤٧) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٢) تفسير الطبري (١٣/ ٢٣٣۔ ٢٣٤) صحيح ابن حبان (١٤/ ٣٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مسلم بن یسار کا سماع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠٧١) البتہ اس موضوع میں دیگر احادیث صحیح ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨، ٥٠)

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٤٩)

ان کی جانوں پر ان کو اس بات کا گواہ ٹھہرایا کہ ان کا رب اور ملیک وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جس طرح کہ اللہ نے ان کی فطرت و جبلت بھی اسی توحید پر کی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ﴾ [الروم: ٣٠] ''چناں چہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔''[1]

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اسی ملت، یعنی اسلام پر متولد ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی اور نصرانی اور مجوسی کر ڈالتے ہیں، جس طرح بہیمہ، یعنی کوئی چوپایہ ایک سالم بہیمہ جنتا ہے، کیا تم اس میں کوئی کان کٹا دیکھتے ہو؟[2] یہ دوسری حدیث متفق علیہ ہے۔

صحیح مسلم میں عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو حُنَفَاء، یعنی موحد پیدا کیا ہے۔ شیطانوں نے آ کر انھیں ان کے دین سے اچک لیا، ان پر میرے حلال کو حرام کر دیا۔[3] اسود بن سریع رضی اللہ عنہ بنی سعد میں تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ چار بار جہاد کیا۔ قوم نے لڑائی کے بعد ذریت (چھوٹے بچوں) کو مارنا شروع کیا، یہ بات نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچی، آپ ﷺ سخت ناراض ہوئے، فرمایا: لوگوں کا کیا حال ہے؟ جو ذریت کو بھی قتل کرتے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا وہ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں؟ فرمایا: بہتر تم میں ابنائے مشرکین ہیں۔ سن رکھو کہ کوئی جان نہیں ہے جو پیدا ہو مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتی ہے، وہ ہمیشہ اسی فطرت پر رہتی ہے، یہاں تک کہ اس کی زبان کھلے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی کر ڈالتے ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ... الخ ﴾ (آیتِ باب)[4]

(رواه ابن جرير بسنده ورواه أحمد أيضاً وأخرجه النسائي ولم يذكر قول الحسن البصري واستحضاره الآية عند ذلك)

اہلِ یمین اور اہلِ شمال کو علاحدہ علاحدہ کرنا:

ذریتِ آدم کو آدم کی پشت سے نکالنے اور دائیں ہاتھ والوں اور بائیں ہاتھ والوں کو علاحدہ کرنے کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ بعض میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کے رب ہونے پر گواہی لی گئی۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ایک دوزخی کو قیامت کے دن کہیں گے کہ بھلا اگر تیرے پاس ہر وہ چیز ہو جو روئے زمین پر ہے تو کیا

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٤٧) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٩٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٨)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٦٥)

[4] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٣١) مسند أحمد (٣/ ٤٣٥) سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ١٨٤) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٤٠٢)

تو فدیہ دے دے گا؟ وہ کہے گا: ہاں، اللہ فرمائے گا، میں نے تو تجھ سے اس سے بھی زیادہ آسان بات چاہی تھی۔ تجھ سے پشتِ آدم میں اقرار لیا تھا کہ تو کسی شے کو میرا شریک نہ کرنا، سوتو نے نہ مانا، مگر میرے ساتھ شرک کرنا۔[1] (رواہ أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ نے ذریتِ آدم کو ان کی پشت سے بشکل مورچہ نکالا۔[2] (وهو في آذي من المآءِ رواه بن جرير) جابر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضحاک بن مزاحم کا بیٹا چھے دن کا مر گیا، مجھ سے کہا: اے جابر! جب تو اس کو قبر میں رکھے تو اس کا منہ کھول دینا، گرہ کھول دینا، وہ بیٹھے گا، اس سے سوال کیا جائے گا، جب میں یہ کام کر چکا تو میں نے کہا: اللہ تم پر رحم کرے، اس بچے سے کیا سوال ہو گا؟ کون اس سے سوال کرے گا؟ کہا: اس میثاق کا سوال ہو گا جس کا اقرار اس نے صلبِ آدم میں کیا تھا۔ میں نے کہا: اے ابو القاسم! وہ کیا اقرار ہے جس کا عہد اُس نے پشتِ آدم میں کیا تھا؟ کہا: مجھ سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ نے پشتِ آدم پر اپنا ہاتھ پھیرا، اس سے ہر جان کو، جس کو وہ قیامت کے دن تک پیدا کرنے والا ہے، نکالا اور یہ عہد و پیمان لیا کہ اللہ ہی کو پوجے، کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرے، پھر ان کے رزق کی کفالت کا ذمہ لے کر انھیں بدستور پشتِ آدم میں پھیر دیا، سو قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی، جب تک میثاق کرنے والا پیدا نہ ہو جائے۔ پھر جس نے ان میں سے دوسرے میثاق کو پا لیا اور پورا کیا، اس کو اگلا میثاق نفع دے گا اور جس نے دوسرا میثاق نہ پایا اور اس کا اقرار نہ کیا، اس کو پہلا میثاق نفع نہ دے گا اور جو کم عمر میں مر گیا، دوسرا میثاق پانے سے پہلے، وہ اسی میثاقِ اول پر جو اس کی فطرت ہے، مرا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سارے طرق اس بات کو تقویت دیتے ہیں کہ یہ روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔[3] واللّٰه أعلم.

لیکن ایسا وقف رفع کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ ایسی خبر کوئی شخص اپنے جی سے بنا کر نہیں کہہ سکتا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ نے پشتِ آدم سے اس طرح لیا، جس طرح کنگھی سے سر کے بال لیے جاتے ہیں، پھر ان سے کہا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ فرشتوں نے کہا: ہم گواہ ہیں کہ کہیں وہ قیامت کے دن یہ بات کہنے لگیں کہ ہم اس سے غافل تھے۔[4] یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے، اس کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو بنایا، ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، ہر جان جس کو اللہ نے قیامت کے دن تک پیدا کرنا تھا، وہ پشت سے گر پڑی، ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک رکھی، پھر ان سب کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا۔ آدم علیہ السلام نے کہا: اے رب! یہ کون ہیں؟ فرمایا: تیری

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٥) مسند أحمد (٣/ ١٢٧)

(2) تفسير الطبري (١٣/ ٢٢٩) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٣) (3) تفسير الطبري (١٣/ ٢٣٠ـ ٢٣١) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٤٨)

(4) تفسير الطبري (١٣/ ٢٣٢)

اولاد ہے، ایک آدمی کو ان میں سے دیکھا، اس کی آنکھوں کی چمک بہت اچھی معلوم ہوئی، کہا: اے رب! یہ کون ہے؟ کہا: یہ پچھلی امتوں میں سے تیری اولاد میں سے ایک آدمی ہے، اس کو داود کہتے ہیں، کہا: اے رب! اس کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟ فرمایا: ساٹھ برس کی۔ کہا: اے رب میں نے اپنی عمر میں سے چالیس برس اس کو دیے۔ جب آدم علیہ السلام کی عمر پوری ہو چکی تو ملک الموت آیا، کہا: کیا میری عمر میں سے چالیس برس باقی نہیں ہیں؟ کہا: کیا تو نے وہ چالیس برس اپنے بیٹے داود کو نہیں دیے؟ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام مکر گئے، ان کی اولاد بھی مکر گئی، آدم علیہ السلام بھول گئے، ان کی اولاد بھی بھول گئی، آدم علیہ السلام چوک گئے، ان کی اولاد بھی چوک گئی۔ (رواہ الترمذي وقال هذا حديث حسن صحيح) یہ حدیث کئی طرق سے بروایتِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آئی ہے۔ حاکم نے مستدرک میں کہا ہے۔ (صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه ورواه ابن أبي حاتم في تفسيره فذكره نحوه)

لیکن اس لفظ سے کہ پھر وہ ذریت آدم علیہ السلام کو دکھلائی اور کہا: اے آدم! یہ تیری اولاد ہے، اتفاقاً ان میں اجذم (کوڑھے) ابرص (برص والے) اعمی (اندھے) اور طرح طرح کی بیماریوں والے لوگ بھی تھے، آدم علیہ السلام نے کہا: اے رب! یہ تو نے کیوں کیا؟ فرمایا: اس لیے کہ وہ میری نعمت کو یاد کریں، کہا: اے رب! یہ کون ہیں، جن پر نور ظاہر تر ہے؟ فرمایا: یہ انبیا ہیں، پھر داود علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا، جس طرح کہ اوپر گزرا۔[1]

ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک آدمی نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ اعمال ابتدائی ہیں یا قضا جاری ہو چکی؟ فرمایا: اللہ نے ذریتِ آدم کو ان کی پشت سے لے کر ان کی جانوں پر گواہ کیا، پھر ان کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر فرمایا: یہ جنت میں ہیں، یہ دوزخ میں۔ سو جنت والوں کو جنت کا عمل اور اہلِ نار کو نار کا عمل آسان کر دیا گیا ہے۔[2] (رواه ابن جرير و ابن مردويه من طرق عنه)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب اللہ نے خلق کو پیدا کر کے جو حکم دینا تھا، دے دیا تو اہلِ یمین کو اپنے داہنے ہاتھ میں اور اہلِ شمال کو اپنے بائیں ہاتھ میں لے کر کہا: اے اصحابِ یمین! انھوں نے کہا: "لبيك وسعديك". فرمایا: کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ کہا: ہاں، پھر ان کو آپس میں ملا دیا، ایک کہنے والے نے کہا: اے رب! تو نے ان میں خلط کیوں کیا، فرمایا: ان کو اور کام لگے ہیں، اس کے سوا کہ وہ ان کو کر رہے ہیں۔ وہ قیامت کے دن کہنے لگیں گے کہ ہم اس بات سے بے خبر تھے، پھر ان کو صلبِ آدم میں پھیر دیا۔[3] (رواه ابن مردويه)

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٠٨)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٢٤٤) اس کی سند مضطرب ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا کلام دیکھیں۔

[3] المعجم الكبير (٨/ ٢٤٢) اس کی سند میں "جعفر بن زبیر" ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد (٧/ ٣٩٠)

اس کی سند میں جعفر بن زبیر ضعیف ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن اور قتادہ رحمہ اللہ وغیر واحد سلف سے ان احادیث کے مطابق سیاقات آئے ہیں، اس جگہ ان آثار کے بجائے یہی احادیث کافی ہیں۔ وباللہ المستعان

یہ احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ نے ذریتِ آدم کو ان کی پشت سے نکال کر اہلِ جنت کو اہلِ نار سے الگ کیا۔ رہا ان سے شہادت لینا اس بات پر کہ اللہ ان کا رب ہے، سو یہ صرف سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے اور یہ دونوں حدیثیں موقوف ہیں، مرفوع نہیں ہیں، جس طرح اوپر گزر چکا۔ اسی وجہ سے سلف وخلف نے کہا ہے کہ اس گواہی لینے سے مراد ان کی فطرت پر گواہی ہے، جس طرح کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اور عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ اور اسود بن سریع رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث میں گزر چکا ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی اس آیت کی تفسیر یوں ہی کی ہے،[1] اسی لیے اللہ نے یہ کہا: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ ﴾ اور یوں نہ کہا: مِنْ آدَمَ ﴿ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ اور نہ یوں کہا: ''مِنْ ظَهْرِهٖ'' یعنی ان کی نسل ایک قوم کے بعد دوسری قوم اور ایک زمانے کے بعد دوسرا زمانہ مقرر فرمائی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ﴾ [الأنعام: ١٦٥] ''اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ [النمل: ٦٢] ''اور وہ تمھیں زمین میں جانشین بناتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١٣٣] ''جیسے اس نے تمھیں دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا۔''

شہادتوں کی دو صورتیں:

نیز فرمایا: ﴿ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى ﴾ (آیتِ باب) یعنی ان کو ایجاد کیا ہے، اس بات کا گواہ بنا کر۔ وہ اس کے حالاً وقالاً قائل ہیں۔ شہادت کبھی بالقول ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا ﴾ [الأنعام: ١٣٠] ''(تب) وہ کہیں گے: ہم اپنے آپ پر گواہی دیتے ہیں۔'' اور شہادت کبھی بالحال ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ﴾ [التوبة: ١٧] ''مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔'' یعنی ان کا حال شاہد ہے ان پر کہ وہ اس کے قائل ہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴾ [العاديات: ٧] ''اور بے شک وہ اس بات پر (خود بھی) گواہ ہے۔'' جس طرح کہ سوال کبھی قال سے ہوتا ہے اور کبھی حال سے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ﴾ [إبراهيم: ٣٤] ''اور اس نے تمھیں ہر وہ چیز دی، جو تم نے اس سے مانگی۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٢٣١)

اِشہادِ حجت، فطرت یا پھر معرفت؟

اہلِ علم کہتے ہیں کہ ایک دلیل اس بات پر کہ اس قصے سے مراد یہ ہے کہ وہ اشہاد ان کے شرک پر حجت ہے۔ اگر یہ بات واقع ہوتی جس طرح کہ بعض لوگ اس کے قائل ہیں تو ضروری تھا کہ ہر کسی کو یاد ہوتی، تاکہ اس پر حجت ہو، اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ کا خبر دینا کافی ہے تو جواب یہ ہے کہ مکذبین، مشرکین تو پیغمبر کی سب لائی ہوئی باتوں کی تکذیب کرتے ہیں، خواہ یہ بات ہو یا کچھ اور۔ سو اس امر کو ان پر ایک مستقل حجت ٹھہرایا ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ مراد فطرت ہے، جس پر وہ پیدا ہوئے ہیں، وہ فطرت بھی اقرارِ توحید ہے، اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ کہیں وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ ہم تو اس توحید سے غافل تھے یا ہمارے آبا نے شرک کیا تھا۔

فتح البیان میں ہے کہ آیت میں لازم کے ساتھ ملزوم سے اکتفا کیا ہے، کیونکہ آدم سے عہد کا لینا اس بات کو لازم کرتا ہے کہ وہ عہد بنی آدم سے بھی لیا گیا تھا۔ بنی آدم سے عہد کا لینا آدم سے عہد لینے کے بعد تھا۔ اس جگہ ذریت سے مراد سارے بنی آدم ہیں، اگرچہ لفظ ذریت میں واحد اور جمع برابر ہے۔ اللہ نے ذریت کو پشتِ آدم سے نسلاً بعد نسل جس طرح کہ بیٹے باپ سے پیدا ہوتے ہیں، نکالا۔ اسی لیے ﴿ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ کہا نہ کہ مِنْ ظَهْرِ آدَمَ کیونکہ یہ بات معلوم تھی کہ وہ سب بنی آدم ہیں، مفسرین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ پھر ان کو ان کی جانوں پر گواہ کیا، یعنی ان کو پیدا کر کے اس بات پر دلالت کی کہ اللہ ان کا خالق ہے، یہی دلالت ان کی شہادت کے قائم مقام ہوئی، اس بنیاد پر یہ آیت تمثیل ٹھہرتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ظاہر ہے: ﴿ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾ [حم السجدة: ١١] ”تب اللہ نے اس سے اور زمین سے کہا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ، تو ان دونوں نے کہا: ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں۔“ شیخ ابو منصور، زجاج اور زمخشری اسی کے قائل ہیں۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ اللہ نے ارواح کو جسموں کے پیدا کرنے سے پہلے نکال کر ان میں معرفت رکھی، جس سے وہ اللہ کے خطاب کو سمجھ گئے۔ کسی نے کہا اس جگہ بنی آدم سے مراد خود آدم ابو البشر ہیں، جس طرح اور بہت جگہ آیا ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ اللہ نے آدم کو جب پیدا کیا تو اپنا ہاتھ ان کی پیٹھ پر پھیرا، ذریت کو باہر نکالا، اس سے عہد لیا، یہ ذریت اس وقت عام ذر میں تھی، یہی قول حق ہے، جس سے کسی طرح مخالفت کرنا مناسب نہیں ہے، نہ کسی اور طرف جانا صحیح ہے، اس لیے کہ یہ بات حدیث مرفوع سے ثابت ہو چکی ہے۔ وہ حدیث موقوفاً بھی بہت صحابہ سے آئی ہے۔ مجاز کی طرف جانے کی کوئی وجہ نہیں: إِذَا جَآءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلِ ؎

[1] معاني القرآن (٢/ ٣٩٠) الكشاف (٢/ ١٦٦)

باغِ مرا چہ حاجتِ سرو و صنوبر است شمشاد خانہ پرورِما زِکہ کمتر است

''میرے باغ کو سرو و صنوبر کے درخت کی کیا ضرورت ہے؟ گھر کو آباد کرنے والا سیدھا، بلند و بالا شمشاد زیبائش میں کس سے پیچھے ہے؟''

امام بیضاوی اور نسفی رحمہ اللہ نے یہ دونوں قول ذکر کیے ہیں۔ اسی طرح رازی اور ابو السعود وغیرہما بھی قائل ہیں،[1] ان لوگوں کو فلسفہ نے چھوا ہے، حق بات وہی ہے جو مذکور ہوئی۔ جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ حدیث مسلم بن یسار جہنی عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے اوپر گزر چکی، اس کو امام بخاری نے تاریخ میں، امام احمد نے مسند میں، عبد بن حمید، ابن منذر اور ضیا نے مختارہ میں اور ابو الشیخ، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے اسما و صفات میں روایت کیا ہے۔[2] امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طبری نے اس حدیث کے بعض طرق میں یعمر ابن ربیعہ کا نام لیا ہے۔[3] امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس باب میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مرفوع حسن صحیح ہے۔ اس میں آدم علیہ السلام کا داود علیہ السلام کو اپنی عمر میں سے عطا کرنے کا قصہ آیا ہے۔[4]

ذریت نکالنے کی کیفیت:

استخراج کی کیفیت میں اقوال ہیں، جن کی کچھ سند نہیں ہے۔ حق اسی قدر ہے کہ پشتِ آدم سے ذریت کے نکالے جانے، جس طرح اللہ نے چاہا اور حدیث میں آیا ہے، کا اعتقاد رکھنا واجب ہے۔ مقبلی نے ابحاثِ مسددہ میں کہا ہے کہ ان روایات اور احادیث میں تواتر معنوی کا دعویٰ کچھ بعید نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ذریت کو زندہ کر کے نکالا، اس لیے کہ اس کا نام ذریت رکھا، ذریت زندہ اولاد کو کہتے ہیں، اللہ کے اس قول کے مطابق: ﴿ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴾ [یٰسٓ: ٤١] ''بے شک ہم نے ان کی نسل کو (نوح کی) بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جو اللہ نے آدم علیہ السلام کو زمین کی طرف اتارا تو رات کے وقت زمینِ ہند میں اتارا، پھر ان کی پشت کو مسح کیا، ہر جان جس کو اللہ تعالیٰ نے یومِ قیامت تک پیدا کرنا تھا وہ نکالی،

---

[1] تفسیر البیضاوي (٣/ ٧١۔ ٧٢) تفسیر النسفي (٢/ ٤٦) تفسیر الرازي (١٥/ ٣٩۔ ٤٣) تفسیر أبي السعود (٣/ ٢٨٩۔ ٢٩٠)

[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[3] امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس قول کے بجائے امام ترمذی رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض نے اس سند میں مسلم بن یسار رحمہ اللہ اور سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک اور آدمی کا ذکر کیا ہے۔ نیز امام طبری رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بعض طرق میں یعمر بن ربیعہ کے بجائے نعیم بن ربیعہ کا ذکر کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر البغوي (٣/ ٢٩٨) تفسیر الطبري (١٣/ ٢٣٤)

[4] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٧٦) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٢٠٨)

پھر ان سب سے عہد و پیمان لیا، پھر ہر ایک جان کو خود اس پر گواہ ٹھہرایا اور یہ کہا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾، انھوں نے جواب دیا: ﴿ بَلٰى شَهِدْنَا ﴾[1] اس میں اختلاف ہے کہ یہ جواب ان کے زندہ ہونے کی صورت میں زبان سے دیا گیا تھا یا زندہ نہ ہونے کی صورت سے زبانِ حال سے دیا گیا۔ ظاہر بات پہلی ہے اور کیفیت کا علم عالم الغیب کے حوالے ہے۔ ان کا یہ جواب سوال کے مطابق تھا، کیونکہ سوال ربوبیت کے بارے میں تھا نہ کہ الوہیت کے بارے میں، پھر جب اس جہانِ تکلیف میں آئے اور پہلا علم الٰہی اس جگہ ظاہر ہوا تو کوئی موافق نکلا، کوئی مخالف ٹھہرا۔ یہی ابو طاہر قزوینی کا قول ہے۔

عہد لینے کا زمانہ اور جگہ:

کہتے ہیں کہ کفار کے لیے تجلی بہ ہیبت کی اور مومنین کے لیے بہ رحمت کی، مگر سب نے ﴿ بَلٰى ﴾ کہا، لیکن پھر دنیا میں آ کر بھول گئے، وہ ﴿ بَلٰى ﴾ کہنا بَلَا ہو گیا۔ کہتے ہیں یہ ماجرا آدم علیہ السلام کے جنت میں داخلے سے پہلے مکہ اور طائف کے درمیان ہوا تھا۔ (قاله الكلبي)[2] کسی نے کہا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد ہوا۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جنت میں۔ کسی نے کہا زمینِ ہند کے علاقہ سراندیب میں جس جگہ وہ جنت سے نکل کر آئے تھے، غرض کہ یہ سب اقوال محتمل ہیں، ہمیں عہد کے لینے کا عقیدہ رکھنے کے بعد اس جگہ کا علم نہ ہونے سے کوئی نقصان نہیں۔

سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب اللہ نے خلق کو پیدا کیا اور جو حکم دینا تھا وہ دے دیا، تو پیغمبروں سے اس کا عہد لیا، عرش پانی پر تھا، اہلِ یمین کو سیدھے ہاتھ میں اور اہلِ شمال کو دوسرے ہاتھ میں لیا۔ رحمان کے دونوں ہاتھ سیدھے ہیں، کہا: اے اصحابِ یمین! انھوں نے جواب دیا: لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ، فرمایا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ انھوں نے کہا: ہاں... الحدیث۔[3] (رواه عبد بن حميد والحكيم الترمذي و أبو الشيخ) اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ بعض اس آیت کی تفسیر کے ساتھ مقید ہیں اور بعض محض آدم علیہ السلام کی پشت سے ذریت کے نکالے جانے پر مشتمل ہیں اور ان سے عہد لینے پر جس طرح کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں شیخین کے نزدیک آیا ہے۔

رہی روایات اور آثارِ صحابہ آیتِ باب کی تفسیر میں جن میں ذریتِ آدم کا پشتِ آدم سے نکالا جانا عالمِ ذر میں اور ان سے عہد و پیمان کا لیا جانا اور ان کو ان کی جانوں پر گواہ کرنا مذکور ہے، وہ بہت ہیں۔ ایک جماعت سے جو صحابہ کے بعد تھی، اس آیت کی تفسیر میں آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کا نکالا جانا مذکور ہوا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی جو تفسیر فرما دی ہے وہ طوالت سے بے نیاز ہے، اہلِ کلام کہتے ہیں: ﴿ بَلٰى شَهِدْنَا ﴾ مجاز ہے نہ حقیقت۔

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٢٢٤ـ ٢٢٥) [2] تفسير القرطبي (٧/ ٣١٦)

[3] المعجم الأوسط (٧/ ٣٢٥) اس کی سند میں "مسلم بن سالم" ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ٧/ ٣٩٠)

علما ومحدثین کا مذہب:

سو یہ بات جمہور سلف مفسرین کے مذہب کے خلاف ہے۔ ابن الانباری نے کہا ہے کہ اصحابِ حدیث اور بڑے بڑے اہلِ علم کا اس آیت کے بارے میں مذہب یہ ہے کہ اللہ پاک نے ذریتِ آدم کو آدم علیہ السلام کی پشت سے اور اولادِ آدم کی پشتوں سے نکالا، وہ صورتیں مثل ذر کے تھیں، پھر ان سے قول وقرار اپنی خالقیت اور توحید کا اور ان کے مخلوق ہونے کا لیا۔ انھوں نے اقرار کیا، اس عہد کو قبول کیا۔ یہ عہد لینا ان میں عقل کو ترکیب دینے کے بعد ہوا، اس عقل سے انھوں نے اس بات کو پہچان لیا جو ان سے کہی گئی تھی، جس طرح اللہ نے پہاڑوں کو عقل دی، پھر یہ خطاب فرمایا: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ ﴾ [سبا: ۱۰] ''(ہم نے حکم دیا:) اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح دہراؤ'' یا جس طرح اونٹ کو عقل دی کہ وہ نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے جھک گیا، یا درخت کو عقل دی، جس نے نبیِ اکرم ﷺ کا حکم مانا۔[1]

ان کا یہ کہنا: ﴿ شَهِدْنَا ﴾ ربوبیت کا اقرار ہے اور ایک جداگانہ کلام ہے۔ بعض نے کہا: مطلب یہ ہے کہ ہم نے گواہی دی اپنی جانوں پر اس اقرار کی۔ آیتِ شریفہ میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو احادیث کو غلط ثابت کرے۔ احادیث تو اس ماجرے کی صحت اور ثبوت کے طور پر ہیں، اس لیے حدیث کی طرف رجوع کرنا اور آیت اور حدیث کے درمیان جمع کرنا واجب ہے۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے صاحبِ نظم سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث: ''إِنَّ اللّٰهَ مَسَحَ ظَهْرَ آدَمَ فَأَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَّتَهُ'' ''بے شک اللہ نے آدم علیہ السلام کی پیٹھ پر مسح کیا اور اس میں سے ان کی ذریت کو نکالا'' اور آیتِ باب کے درمیان بحمد اللہ تعالیٰ کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لیے کہ جب اللہ نے پشتِ آدم سے ان کو نکالا تو گویا خود ذریت کی پشتوں سے برآمد کیا، کیونکہ آدم علیہ السلام کی ذریت ویسی ہی ہے، جیسی ذریت بعض کی بعض سے۔[2]

عہد یاد نہ ہونے کا جواب، حکمت اور ان روحوں کا انجام:

اگر کوئی یہ بات کہے کہ جب وہ عہد و میثاق ہم سے لیا گیا ہے تو پھر ہمیں کسی طرح وہ اب یاد نہیں تو اس کا جواب سلیمان جمل نے دیا ہے کہ ہاں وہ عہد ہم کو یاد نہیں ہے، اس لیے کہ وہ بنیاد ٹوٹ گئی اور متغیر ہوگئی، اس احوال پر آبا کی پشتوں اور ماؤں کے رحموں میں ایک زمانۂ دراز گزر چکا۔ مختلف شکلوں میں جیسے علقہ، مضغہ، لحم اور عظم ہوتا ہے، نسیان طاری ہوا۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ مجھے وہ عہد جو میرے رب نے مجھ سے لیا تھا، اب تک یاد ہے، اسی طرح سہل بن عبداللہ تستری نے بھی کہا ہے۔ اسی طرح شیخ نظام الدین اولیا دہلوی سے بھی منقول ہے۔

پھر اللہ نے رسول کی زبان اور اصحابِ شریعت کے اقوال پر اس خطاب کی ابتدا کی۔ یہ خطاب ذکر کا قائم

[1] تفسیر الخازن (۲/ ۳۰۹)
[2] تفسیر الخازن (۲/ ۳۱۰)

مقام ہے، اگر وہ عہد فراموش نہ ہوتا، ہر کسی کو یاد رہتا تو محنت و تکلیف بالکل ضائع ہو جاتی۔ ہم کو اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملی کہ وہ ذرات انسان کی شکل وصورت میں تھے۔ عقل کے قریب تر یہ بات ہے کہ انسان کی شکل میں ان کے ہونے کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ سننا اور بولنا صورت کا محتاج نہیں ہے، بلکہ وہ صرف زندگی کی ایک صورت کا متقاضی ہے نہ کسی اور امر کا۔ اگرچہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ان کو انسان کی صورت میں بنایا گیا ہو، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ (آیتِ باب) اور یہ نہ کہا: ذَرَّاتِهِمْ. ذرات کا لفظ مصورین پر آتا ہے، حکمت اس عہد و پیمان کے لینے کی یہ تھی کہ جو کوئی اس عہد کو پورا نہ کرے، اس پر حجت قائم ہو جائے۔ ظاہر یہ ہے کہ جب ان کو پھر پشتِ آدم میں پھیر دیا تو ان کی روحیں قبض کر لی گئیں۔

رہی یہ بات کہ وہ روحیں ذرات سے پشتِ آدم کی طرف لوٹائے جانے کے بعد کدھر گئیں، سو یہ مسئلہ نہایت باریک اور مشکل ہے۔ عقلی نظر اس کی طرف صرف اسی قدر جاتی ہے کہ اپنی پہلی حالت پر، جو ذرات میں حلول کرنے سے پہلے تھی، ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ عہد و پیمان کی تحریر حجرِ اسود کے باطن میں امانت ہے۔ یہ ذکر شعرانی نے رسالہ "قواعد كشقيه في الصفات الإلٰهية" میں کیا ہے۔ اس آیتِ شریفہ پر دس سوال وارد کر کے ہر ایک کا جواب دیا ہے۔ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ جو بات ایسی ہے جس میں صریح حکم کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ کا نہیں آیا، اس میں غور وخوض نہ کرنا، بلکہ اس کو لپیٹ رکھنا زیادہ بہتر واعلیٰ واحوط ہے۔[1] والله أعلم

عہد و میثاق سے مراد:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کو فطرتِ توحید و اسلام پر محمول کیا ہے۔[2] ظاہر مدلول کتاب وسنت کی تاویل فرمائی ہے، سو کچھ ضرورت اس تکلف و تاویل کی نہیں ہے، یہ عہد و میثاق بجائے خود کتاب وسنت سے ثابت ہے اور ہر مولود کی ولادت فطرتِ توحید پر ہونا ایک دوسری بات ہے جو حدیث وقرآن دونوں سے جداگانہ ثابت ہے، کوئی امر اس سے مانع نہیں کہ عالم ذر میں پہلے یہ قول وقرار لیا گیا، گواہی شاہدی ہوئی، پھر جب وقتِ ولادت آیا تو ہر مولود کو اسی عہد و پیمان پر پیدا فرمایا، پھر عقل اور بلوغت کے بعد رسول اور کتابیں اس میثاق وفطرت کی یاد دہانی کے طور پر بھیجے، تین بار تاکید و یاد دہانی سے حجت کے قائم کرنے کو مکمل کر دیا۔ اب اگر کوئی اس تین بار کی یاد دہانی اور نصیحت کے بعد بھی اس عہدِ قدیم کو پورا نہ کرے، توقف کرے یا فراموش کر دے یا بھلا دے تو یہ اس کی بدنصیبی اور بدبختی ہے۔ اللہ پاک نے تو کمال نرمی اور رحمت سے یاد دہانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ والله أعلم

اس عہد و پیمان کا مقصد:

یہ عہد و پیمان اتمامِ حجت اور ہر قسم کے عذر کو دور کرنے کے لیے لیا تھا کہ کہیں قیامت کے دن جب کہ عہد و پیمان

---

[1] فتح البیان (٥/ ٦٩۔ ٧٥) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٥١)

کے توڑ دینے اور اس کو ایفا نہ کرنے اور قول و قرار کو بھول جانے پر مواخذہ ہو تو یہ نہ کہنے لگیں کہ ہم تو اللہ وحدہ لا شریک لہ کے اس پیمانِ توحید سے غافل رہے۔ یہ ایک عذرِ لنگ ہوا، یا یوں کہیں کہ شرک تو ہمارے باپ دادا نے کیا تھا، ہم ان کے مقلد تھے، اس لیے ہم کو سیدھا راستہ معلوم نہ ہوا، ہم نے حق کو نہ پہچانا، اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم کو ان کے فعل پر کیوں ہلاک کیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا عذرِ تقلید ہوا، جو گناہ سے بھی بدتر ہے۔ سو اللہ پاک نے کافروں کی علتِ باطلہ اور معذرتِ ساقطہ کو کاٹ دیا، ان کے لیے اس طرح کی حجت لانے کی کوئی جگہ باقی نہ چھوڑی، تاکہ شاید وہ راہِ راست پر آ جائیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور (اے نبی!) انھیں اس شخص کی خبر پڑھ سنائیں جسے ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، مگر وہ ان (کی پابندی) سے نکل بھاگا تو اسے شیطان نے پیچھے لگا لیا، پھر وہ گمراہوں میں (شامل) ہو گیا﴿175﴾ اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیتوں) کے ذریعے سے اسے بلند درجہ دیتے لیکن وہ زمین کی طرف جھک پڑا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، چناں چہ اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تو بھی ہانپتا ہے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تو بھی ہانپتا ہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، چناں چہ (اے نبی!) آپ (یہود سے) یہ قصہ بیان کر دیں، شاید کہ وہ غور و فکر کریں﴿176﴾ ان لوگوں کی مثال بری ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے﴿177﴾

لالچی ایک درویش کا واقعہ:

موسیٰ علیہ السلام کا لشکر چلا، ایک بادشاہ پر گزر ہوا، اس کے ملک میں ایک درویش صاحبِ تصرف تھا، بادشاہ نے اس سے مدد چاہی، اس کو باطن سے ممانعت ہوئی۔ بادشاہ نے اس کی عورت کو مال کا لالچ دیا، اس نے اس کو راضی کر کے بھیجا، وہاں اپنے کوئی اعمال چلتے نہ دیکھتے، بادشاہ کو حیلہ سکھایا کہ اُس لشکر میں فاحشہ عورتیں بھیجے اور لوگ بدکاری کریں

تو ان پر ذلت پڑے، حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اس کا حیلہ نہ چلنے دیا، لیکن سکھانے والا مردود ہوا، شاید دنیا میں یا آخرت میں اس کو یہ عذاب ہوا کہ کتے کی طرح زبان نکل پڑی۔

حق تعالیٰ نے یہ قصہ یہود کو سنا دیا کہ اگرچہ علم کامل اپنے پاس ہو مگر وہ کام تب آتا ہے جب اس کی پیروی کی جائے اور اگر خود تو حرص کا تابع ہو اور چاہے کہ علم میرے کام آئے تو کچھ نہیں ہوتا۔ اور شاید ہانپتے کتے کی مثال اس میں ہو کہ جب تک وہ حرص سے خالی تھا، اس کو باطن سے صحیح راہنمائی ملی جب دل میں حرص آ گیا تو باطن سے بھی راہنمائی صحیح نہ ہوئی۔ یا اگر مجمل معلوم ہوا اس کو اپنی طبیعت کے موافق سمجھ لیا۔ نقل میں ہے کہ جب وہ چلنے لگا تو چاہا کہ پھر غیب سے کچھ معلوم ہو، تب معلوم ہوا کہ جا، جب راستے میں پہنچا تو ایک فرشتہ ملا، ننگی شمشیر ہاتھ میں لیے ہوئے، اس نے التجا کی کہ اگر حکم نہ ہو تو میں نہ جاؤں، کہا: جا لیکن کچھ بددعا نہ کر، پھر بادشاہ کے پاس پہنچ کر بددعا کرنے لگا، منہ سے خود بخود نیک دعا نکلنے لگی، موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کے لیے ناچار وہ حیلہ سکھایا۔ موضح قرآن کا کلام تمام ہوا۔

بلعم بن باعورا:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک آدمی تھا، اس کو بلعم بن باعورا کہتے تھے۔[1] (رواہ عبدالرزاق) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کا نام صیفی بن راہب تھا۔[2] امام کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ بلقاء میں سے ایک آدمی تھا، اسمِ اکبر جانتا تھا، بیت المقدس میں جبارین کے ساتھ رہا کرتا تھا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اہلِ یمن سے ایک آدمی تھا، جس کا نام بلعم تھا۔ اللہ نے اس کو اپنی آیتیں دی تھیں، اس نے ان آیتوں کو چھوڑ دیا۔[4]

امام مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شخص علمائے بنی اسرائیل میں سے تھا، جس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ تکالیف میں اس کو آگے رکھ لیتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ملک مدین کی طرف روانہ کیا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو اللہ پاک کی طرف بلائے، اس نے جا کر اپنا دین اختیار کر لیا، موسیٰ علیہ السلام کا دین چھوڑ دیا۔[5] امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ بلعم بن باعورا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بلعام تھا، ثقیف نے کہا ہے کہ وہ امیہ بن ابی الصلت تھا۔ یہی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا قول بھی ہے۔[6]

---

① تفسیر الصنعاني (٢/ ٢٤٣) مستدرك الحاکم (٢/ ٣٥٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
② تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔
③ تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٧)
④ تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٨) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
⑤ تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٨) ⑥ تفسیر الطبري (١٣/ ٢٥٤۔ ٢٥٥)

کئی طریق پر ان سے مروی ہے اور اس کی اسناد ان تک صحیح ہے۔ شاید یہ مراد ہے کہ امیہ بن ابی الصلت اسی کی طرح پر ہے، کیونکہ اس کو پہلی شریعتوں کا علم پہنچا تھا، لیکن اس نے اس علم سے کچھ فائدہ نہ لیا، نبیِ اکرم ﷺ کا زمانہ پایا، آپ ﷺ کی علامتیں آیتیں اور معجزے اس کو پہنچے اور ہر ذی بصیرت پر ظاہر ہوئے، معہذا نبیِ اکرم ﷺ سے ملا بھی، لیکن متبع نہ ہوا۔ مشرکین کی دوستی، نصرت اور تعریف میں رہا۔ بدر کے دن جو مشرک مارے گئے تھے، ان کا مرثیہ کہا (قبحه الله تعالىٰ) بعض احادیث میں آیا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی زبان ایمان لائی اور دل ایمان نہ لایا، [1] کیونکہ اس کے اشعار ربانی اور حکمت وفصاحت والے تھے، لیکن اللہ نے اس کا دل اسلام کے لیے نہ کھولا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ ایک آدمی تھا جس کے لیے تین دعاؤں کا قبول ہونا دیا گیا تھا۔ اس کی ایک عورت تھی جس سے اولاد تھی، اس نے کہا تو ایک دعا مجھ کو دے، کہا: اچھا تو کیا چاہتی ہے؟ کہا: اللہ سے دعا کر کہ مجھ کو بنی اسرائیل کی عورتوں میں سب سے زیادہ حسین وجمیل کر دے۔ اس نے دعا کی، اللہ نے اس کو بنی اسرائیل کی عورتوں میں سب سے زیادہ خوب صورت کر دیا۔ جب اس عورت کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ ان میں اس جیسی کوئی عورت نہیں ہے تو اس نے اپنے شوہر سے بے رغبتی کر کے کچھ اور ہی شے کا ارادہ کیا، اس شخص نے دعا کی کہ وہ کتیا ہو جائے، چنانچہ وہ کتیا ہوگئی، اس شخص کی دو دعائیں اس طرح گئیں، اس کی اولاد نے کہا کہ ہم کو اس صدمے پر قرار نہیں ہے، ہماری ماں کتیا ہوگئی ہے، لوگ ہم کو عار دلاتے ہیں، تم اللہ سے دعا کرو کہ پھر وہ اسی اگلے حال پر ہو جائے، اس نے دعا کی، وہ اگلے حال پر ہوگئی۔ تینوں دعائیں اس کی یوں گئیں۔ اس عورت کا نام بسوس تھا۔ [2] یہ اثر غریب ہے۔

سببِ نزول:

اس آیت کے سببِ نزول میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ایک آدمی قدیم زمانۂ بنی اسرائیل میں تھا، جس طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سلف نے کہا ہے یا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ وہ جبارین کے شہر کا ایک شخص تھا، اس کا نام بلعام تھا، اس کو اسمِ اکبرِ الٰہی آتا تھا۔ [3] ابن زید وغیرہ علمائے سلف نے کہا ہے کہ اس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں، جو کچھ اللہ سے مانگتا، وہ اس کو ملتا تھا۔ [4] یہ بات کہ وہ نبی تھا، پھر اس سے نبوت چھین لی گئی، جس طرح کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض لوگوں سے حکایت کی ہے، [5] صحیح نہیں ہے، بلکہ بہت زیادہ غریب اور بعید ہے۔ اس بات کا قائل خطا کار ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ جبارین پر نازل ہوئے تو بلعام

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ اس موضوع کی ایک روایت صحیحین میں مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥٦)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٧۔ ١٦١٨) اس کی سند میں "ابو سعد اعور" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦١٦۔ ١٦١٧) [4] تفسير الطبري (١٣/ ٢٥٨) [5] تفسير الطبري (١٣/ ٢٥٩۔ ٢٦٠)

سے اس کے چچا زاد لوگوں اور قوموں نے آ کر یہ بات کہی کہ موسیٰ ایک سخت اور درشت آدمی ہیں، ان کے ساتھ بڑا لشکر ہے، وہ اگر ہم پر غالب ہوگا تو ہم سب کو ہلاک کر دے گا، تم اللہ سے دعا کرو کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ واپس لوٹ جائیں۔ اس نے کہا کہ اگر میں اللہ سے یہ دعا کروں گا کہ موسیٰ اور ان کے ساتھی واپس چلے جائیں تو میری دنیا اور آخرت برباد ہو جائے گی۔ وہ اس کے پیچھے لگے رہے، یہاں تک کہ اس نے موسیٰ اور ان کے ہمراہیوں پر بددعا کی۔ اللہ نے اس کو منسلخ (گمراہ) کر دیا۔ یہ معنی ہیں اس آیت کے: ﴿ فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ ﴾ (آیتِ باب)[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب چالیس برس گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ﴾ [المائدة: ٢٦] ''بے شک وہ (مقدس زمین) ان لوگوں پر چالیس برس تک حرام کر دی گئی ہے۔''

یوشع بن نون نبی ہوئے، انھوں نے بنی اسرائیل کو دعوت دی اور کہا کہ میں نبی ہوں اور اللہ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں جبارین سے لڑوں، لوگوں نے ان سے بیعت کی اور ان کو سچا کہا، تب بنی اسرائیل کا ایک آدمی جس کو بلعام کہتے تھے اور وہ اسمِ اعظم جانتا تھا، کافر ہو کر وہاں سے چلا (لعنه الله) اور جبارین سے آ کر کہا، تم بنو اسرائیل سے مت ڈرو۔ جب نکل کر ان سے لڑو گے، میں ان پر بددعا کروں گا، وہ سب ہلاک ہو جائیں گے۔ ان کے پاس دنیا تھی، جو یہ چاہتا تھا، لیکن عورتوں کے پاس تعظیماً نہیں جاتا تھا، ایک مادہ خر تھی، جس سے وطی کیا کرتا تھا۔ وهو الذي قال الله تعالىٰ: ﴿ فَانْسَلَخَ مِنْهَا ﴾ ''یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَانْسَلَخَ مِنْهَا ﴾''[2]

شیطان کی پیروی کا نتیجہ:

یہ ارشاد کہ پھر شیطان اس کے پیچھے لگا، اس کا مدعا یہ ہے کہ شیطان اس پر غالب آ گیا، وہ جو حکم کرتا ہے، یہ وہی کام بجا لاتا ہے، اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ وہ غاوین (گمراہوں) میں سے ہو گیا، یعنی ہالک (ہلاک ہونے والا) اور حیران و پریشان۔ اس آیت کے معنی میں ایک حدیث بھی آئی ہے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جن باتوں کا مجھ کو تم پر ڈر ہے، ان میں سے ایک یہ بات ہے کہ ایک آدمی نے قرآن پڑھا، یہاں تک کہ جب اس پر قرآن کی بہجت (تروتازگی) نظر آنے لگی اور اسلام اس کی چادر ہوا اور وہ اس چیز کے سامنے آیا جو اللہ نے چاہا، تب وہ قرآن سے چھوٹ نکلا، اُس نے قرآن کو اپنی پسِ پشت ڈالا اور ہمسایہ پر تلوار لے کر دوڑا اور اُس پر شرک کی تہمت لگائی، میں نے کہا: اے اللہ کے نبی! ان دونوں میں سے شرک کے زیادہ قریب کون ہے؟ مرمی (جس کی طرف پھینکا گیا) یا رامی (پھینکنے والا)؟ فرمایا: بلکہ رامی۔[3] (رواه الحافظ أبو يعلى الموصلي في مسنده وهذا

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٦٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٥٧۔ ٢٥٨)

[3] صحیح ابن حبان (١/ ٢٨١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٠١)

إسناده جيد) اس کی سند میں صلت بن بہرام کوفیوں کے ثقہ راویوں میں سے ہے، سوا ارجا کے اور کوئی تہمت اس پر نہیں ہوئی۔ امام احمد اور یحییٰ بن معین رحمہ اللہ وغیرہما نے اس کو موثق کہا ہے۔

اللہ نے فرمایا کہ ہم چاہتے تو اپنی آیتوں کے سبب سے اُسے دنیا کی گندگیوں سے بچا لیتے، لیکن وہ تو زمین پر گر پڑا، یعنی دنیا کی زیب و زینت کی طرف مائل ہو گیا اور اس نے دنیا کی، جو دارِ فانی ہے، لذتوں اور نعمتوں پر توجہ کی، دنیا نے اس کو ویسا ہی دھوکا دیا جس طرح کہ عقل مند اور ہوشیار لوگوں کو دھوکا دیا تھا۔ ابو راہویہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ یہ تھا کہ ایک اونچے پل پر اُس کو شیطان نظر آیا۔ مادہ خر نے اللہ کو سجدہ کیا، بلعام نے شیطان کو سجدہ کیا، عبدالرحمان بن جبیر اور کئی اہلِ علم کا یہی قول ہے۔[1]

درویش کا جو قصہ موضح قرآن میں سے اوپر گزر چکا ہے، اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے بواسطہ معتمر عن ابیہ یسار سے بطولہ روایت کیا ہے۔ پھر معتمر نے یہ کہا ہے کہ "حَدَّثَنِي بِهَذَا سَيَّارٌ وَّلَا أَدْرِي لَعَلَّهُ دَخَلَ فِيهِ شَيْئٌ مِنْ حَدِيثِ غَيْرِهِ" امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کا نام بلعام تھا، اس کو بلعم بن باعورا بھی کہتے ہیں۔ ابن حران بن آزر بھی بولتے تھے۔ بلقاء کے ایک قریہ میں رہتا تھا۔ امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی شخص تھا جو اسمِ اعظم جانتا تھا، پھر اپنے دین سے منسلخ ہو گیا (نکل گیا)۔ اس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ پھر اس کا قصہ لگ بھگ ابن جریر رحمہ اللہ کی اسی روایت کے وہب رحمہ اللہ وغیرہ سے روایت کیا ہے۔ اس قصے کو محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بھی سالم ابو النضر سے مطولاً حکایت کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس کے ناقل ہیں،[2] اس کی سند نہیں معلوم کیسی ہے، اس لیے کہ اس جگہ نہیں لکھا گیا، قرآن عظیم کا اجمالاً ذکر کرنا دوسری جگہ کے طویل ذکر کا نعم البدل ہے۔

﴿ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ﴾ کی تفسیر:

مفسرین کا ﴿ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابو النضر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلعام کی زبان نکل کر سینے پر آ گئی،[3] اس لیے اس کی دونوں حالتوں میں کتے کے ہانپنے کے ساتھ تشبیہ ظاہر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ گمراہی اور اس پر قائم رہنے اور ایمان کی طرف دعوت کا فائدہ نہ اٹھانے اور دعا نہ کرنے میں کتے کی طرح ہو گیا، جس طرح کہ وہ دونوں حالتوں میں یعنی ڈانٹ ڈپٹ پر اور اس کے چھوڑ دینے پر یکساں ہانپتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کا حال ہوا کہ خواہ اسے نصیحت کرو یا ایمان کی طرف دعوت دو یا نہ کرو، اسے کچھ نفع نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [يٰس: ١٠] "اور ان پر برابر ہے، خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔" نیز فرمایا: ﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٥١ـ ٣٥٣)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٢٦١ـ ٢٦٥) تاريخ دمشق (١٠/ ٣٩٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٥٣ـ ٣٥٥) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٢٦٥)

﴿ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ [التوبۃ: ۸۰] ''(اے نبی!) آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں (برابر ہے) اگر آپ ان کے لیے ستر بار (بھی) بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ انھیں نہیں بخشے گا۔'' اور اسی طرح کی اور آیات۔ بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ کافر، منافق اور گمراہ کا دل ہدایت سے فارغ ہوتا ہے، وہ کثیر الوجیب ہوا کرتا ہے۔ اس حال کو اسی طرح تعبیر فرمایا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔[1]

اس واقعے میں یہود کو غور وفکر کی دعوت:

پھر اللہ نے اپنے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا کہ تم یہ قصہ یہود سے ذکر کرو، شاید بنی اسرائیل جو بلعام کے حال سے واقف ہیں اور اس کی گمراہی اور رحمتِ الٰہی سے دوری کو جانتے پہچانتے ہیں، کچھ دھیان کریں۔ اس لیے کہ اللہ نے اس کو اسمِ اعظم سکھایا تھا۔ جب کچھ مانگتا تو ملتا، جب دعا کرتا تو قبول ہوتی۔ اس نے اس نعمت کو اللہ کی اطاعت کے علاوہ استعمال کیا۔

رحمان کے لشکر، اہلِ ایمان اور موسیٰ بن عمران، جو اللہ کے نبی اور بندے تھے، کے متبعین پر بد دعا کی۔ یہود کو اس قصے میں غور وفکر کرنا چاہیے کہ کہیں اسی ملعون کی طرح یہ بھی نہ ہو جائیں، کیونکہ اللہ نے ان کو بھی علم دیا ہے، تورات مرحمت فرما کر اور اَعراب سے تمیز بخشا ہے۔ ان کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی صفات موجود ہیں، جس کو یہ خوب جانتے پہچانتے ہیں، جیسے لوگ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں، تو اس صورت میں ان پر لوگوں سے زیادہ اس بات کا حق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں، ان کی مدد کریں اور تعاون کریں۔

ان کے انبیا نے پہلے ہی سے ان کو محمد ﷺ کی خبر دی ہے، ان کے اتباع کا حکم دیا ہے، اسی وجہ سے یہ بات ہوئی ہے کہ یہود میں سے جس نے اپنی ہی کتاب کی مخالفت کی اور صفاتِ محمدی ﷺ کو چھپایا، لوگوں کو ان صفات سے بے خبر رکھا، اللہ پاک نے ان پر دنیا میں ایسی ذلت وخواری اور زاری نازل کی جو ذلت آخرت کی ذلت سے ملی ہوئی ہے۔ یہ ان لوگوں کی کیا بری مثال ہے، جو کتوں کی طرح ٹھہرائے گئے، جن کی کچھ ہمت نہیں ہے، مگر یہی کہ کھانے پینے اور شہوت کی چیزیں حاصل کریں۔ سو جو شخص علم و ہدایت سے باہر نکل کر شہوتِ نفس اور خواہشات کی اتباع کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ کتے کی طرح ہیں۔ (بئس المثل مثله) اسی لیے صحیح میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ، الْعَائِدُ فِيْ هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهِ» ''ہمارے لیے بری مثال نہیں ہے، اپنی ہبہ کی ہوئی چیز کو واپس لینے والا کتے کی طرح ہے جو اپنی قے کر کے اپنی قے کو چاٹتا ہے۔''[2] امام شافعی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۵۵)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۴۷۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۲۲)

وما هي إلا جيفة مستحيلة عليها كلاب همهن اجتذابها
فان تجتنبها كنت سلما لأهلها وإن تجتنيها نازعتك كلابها[1]

''یہ ایک مردار ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے کتے لگے رہتے ہیں۔ اگر تو نے اس سے اجتناب کر لیا تو سلامت رہو گے، اگر حاصل کر لیا تو پھر اس کے کتے تجھ سے چھینا جھپٹی میں لگ جائیں گے۔''

یہ ارشاد کہ وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے، اس کا مطلب یہ ٹھہرا کہ اللہ کی ہدایت اور اطاعت سے منہ پھیر کر دارِ فانی کی لذتوں اور خواہشات کے تعاقب میں لگے رہے، یہ ان کا خود ان کی جانوں پر ظلم تھا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس شخص کو آیات کے عطا کیے جانے سے مراد اُس کو کتبِ قدیمہ کا علم اور اسمِ اعظم الٰہی کا تصرف ہے کہ جب اس نام سے اللہ کو پکارتا، فوراً اس کی دعا قبول ہوتی، اللہ نے اس قصے کو اہلِ کتاب، یہود کی نصیحت و یاد دہانی کے لیے ذکر کیا ہے، اس لیے کہ تورات میں مذکور ہے: اس کا نام بلعم یا بلعام تھا، کسی نے کہا ہے کہ ابو عامر بن صیفی تھا، ٹاٹ پہنتا تھا، اس نے نبیِ اکرم ﷺ کا انکار کیا تھا۔ یا امیہ بن ابی الصلت یا ابن راہب تھا جس کے لیے مسجدِ شقاق بنائی گئی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت بسوس کے بارے میں اتری ہے۔ کسی نے کہا: اہلِ کتاب منافقین کے حق میں اتری ہے، کسی نے کہا: یہود و نصاریٰ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مثل ہے جو اللہ نے اس شخص کے لیے بیان کی، جس پر ہدایت کو پیش کیا، مگر اس نے قبول نہ کیا۔[2] آیات سے مراد اسمِ اکبر الٰہی ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس کو کوئی کتاب دی گئی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ حجت و دلیل دی تھی، وہ ان آیات سے یوں باہر نکلا، جیسے سانپ اپنی کینچلی سے باہر نکل آتا ہے، کسی طرح کا اتصال (تعلق) اس کو اس جلد کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سے علم چھین لیا گیا۔[3]

انسلاخ کسی شے سے برہنہ ہونے کو کہتے ہیں۔ آیت میں قلب نہیں ہے، جیسے بعض نے زعم کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اصل عبارت یوں تھی: ''فَانْسَلَخَتْ مِنْهُ'' اس لیے کہ اس قلب کی طرف کوئی ضرورت داعی نہیں ہے۔ بہر حال جب وہ آیاتِ الٰہی سے منسلخ و عاری ہوا، شیطان اس کا قرین بنا۔ اس نے خطوات الشیطان کی پیروی اختیار کی، اپنے نفس کو شیطان کا تابع کر دیا۔ ضلالت و گمراہی میں متمکن ہو گیا۔

﴿ الْغَاوِينَ ﴾ سے مراد کفار ہیں۔ ہم اگر چاہتے تو اس علم کے سبب سے اُس کا درجہ بلند کر دیتے، اُس کو منازلِ علما تک پہنچاتے، لیکن ہم نے یہ بات نہ چاہی، کیونکہ اس نے ہماری آیات سے جدائی اختیار کی، ان پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ یا یہ معنی کہ اگر ہم چاہتے تو اس معصیت سے پہلے اسے موت دے کر جنت کی طرف اٹھا لیتے یا کفر کو اس سے

[1] روح المعاني (٢٩/ ١١٩) [2] تفسير الطبري (١٣/ ٢٧٣) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٢٦١)

مرفوع کر لیتے۔ آیات کو اس کا عاصم (بچانے والا) ٹھہراتے، لیکن اس نے دنیا کا رہنا اور زمین پر بسنا، دارِ فانی کی رغبت میں اور دنیا کا آخرت پر ایثار پسند کیا۔ زمین سے اس جگہ مراد دنیا ہے، اس لیے کہ سارے جنگل اور ویرانے اور شہر اور آبادی اور پیداوار اسی زمین سے ہوتی ہے، جو سبب ہے زیست کا۔ گویا ساری دنیا زمین ہے۔

ہویٰ خواہشِ نفس کو کہتے ہیں، یعنی اس نے عمل کرنا مقتضائے علم پر چھوڑ کر حطامِ دنیا (دنیا کے ساز و سامان) کو اختیار کیا، یا کافروں کا یار بنا، یا جُورو کا فرماں بردار بنا، کیونکہ اس انسلاخ کا باعث وہی عورت تھی۔ یہ آیتِ شریفہ ان علما پر سخت ترین آیات میں سے ہے جو اپنے علم سے دنیا کماتے ہیں۔ ہویٰ کے تابع ہو کر شہواتِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں، سو ایسے شخص کی مثال جو آیات سے منسلخ ہو کر سب سے نچلے رتبے میں جا گرا، اس خسیس ترین حیوان کی طرح اور اس سے قریب تر ہے، کیونکہ وہ سب سے بری صفت میں اس کا مماثل ٹھہرا ہے، خواہ اس کا قصد کریں یا اس کو ترک کریں، وہ ہر حال میں ہانپتا ہے۔

امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر چیز ماندگی یا تشنگی سے ہانپتی ہے، مگر کتا، کہ وہ تکلیف کی حالت میں ہو یا آرام میں، بیماری میں ہو یا صحت میں، سیراب ہو یا تشنہ، بدستور ہانپا کرتا ہے۔ اللہ نے اس کو آیات کے جھٹلانے والوں کی مثل ٹھہرایا ہے کہ اگر اسے وعظ کرو تو گمراہ نہ کرو تو گمراہ، جیسے کتا کہ اگر چھوڑ دو تو ہانپے اور نہ چھوڑو تو ہانپے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۹۳] ”اور اگر تم انھیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمھاری پیروی نہیں کریں گے۔ تمھارے لیے برابر ہے کہ تم انھیں (ہدایت کی طرف) بلاؤ یا خاموش ہو رہو۔“

لہث تعب یا پیاس یا کسی اور سبب سے زبان نکالنے کو کہتے ہیں۔[1] (قاله الجوهري) بعض نے کہا ہے کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگر تو کتے پر کچھ لادے تو وہ بھونک کر بھاگے گا اور اگر تو چھوڑ دے گا تو بھی وہ تجھ پر دوڑے اور بھونکے گا۔ غرض کہ دونوں حالتوں آگے آنے میں اور پیچھے ہٹنے میں اپنی جان کو مشقت میں ڈالتا ہے۔ اس صورت میں اس کی زبان پیاسے کی طرح باہر نکلی رہتی ہے، یہ یہود کے جنون کی مثال ہے۔ علم اور معرفت حاصل ہو جانے کے بعد بھی محمد ﷺ کی صفات کو تحریف اور تبدیل کر کے مخفی رکھا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مثال عام ہے اور ہر اس شخص کو شامل ہے جو آیات کو جھٹلانے والا اور ان کا انکار کرنے والا ہے۔ یہی حق بھی ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ الفاظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔[2]

اس جگہ اللہ پاک نے عالمِ بے عمل کو، جو حق کا منکر ہے، کتا ٹھہرایا ہے اور دوسری آیات میں عالمِ تارکِ عمل کو خر (گدھا)، جو کتابوں کو اٹھائے ہوئے ہو، بتایا ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ عالمِ بے عمل دوزخ میں اپنی آنتوں کو اس

[1] تفسير القرطبي (۷/ ۳۲۲) [2] فتح البيان (۵/ ۷٦۔ ۸۰)

طرح کھینچے پھرے گا جس طرح گدھا چکی کو پھراتا ہے۔[1] اللھم احفظنا. نبی کریم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ یہ قصہ یہود و کفارِ مکہ وغیرہم سے بیان کرو، شاید وہ گمراہی سے تائب ہو کر صحیح راستے کی طرف رخ کریں، پھر فرمایا کہ وہ لوگ تکذیب اور ظلمِ نفس کو اکٹھا کیے ہوئے ہیں۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۷۸

جسے اللہ ہدایت دے، تو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے (اللہ) گمراہ کر دے تو یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں (178)

ہدایت اور گمراہی اللہ کی طرف سے:

یہ اس لیے کہ جو اللہ نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا، اسی لیے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے: «إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَهْدِيْهِ وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ... الحديث»[2] (بتمامه رواه أحمد وأهل السنن وغيرهم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی کو اللہ دین کی طرف ارشاد (راہنمائی) کرتا ہے اور اس کی ہدایت کا متولی ہوتا ہے، وہی شخص اس راہ کی طرف چلتا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور جو بندوں کے لیے مشروع کی گئی ہے اور جن لوگوں کے لیے متولیِ ضلالت ہوتا ہے، وہ لوگ مکمل خسارے میں ہیں۔ جس کو اس نے ہدایت کی، اس کو کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو اس نے گمراہ کیا اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ "مَا شَآءَ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ" "جو اس نے چاہا وہ ہو گیا اور جو اس نے نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔"

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ اپنے خطبے میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے: «مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، أَصْدَقُ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَأَحْسَنُ الْهَدْيِ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٩)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٩٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٩٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٦/ ٣٤٤) البتہ "ونستهديه" کے الفاظ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ دیکھیں: مسند الشافعي (١/ ٦٧) اس کی سند میں "ابراہیم بن محمد اسلمی" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٥٢٥)

هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِيْ النَّارِ» پھر فرماتے: «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ»[1] (اخرجه مسلم والنسائي و ابن ماجه و ابن مردويه والبيهقي في الأسماء والصفات)

سو اگر اللہ کی ہدایت یہی بیان ہوتا، جس طرح معتزلہ کہتے ہیں، تو اس بیان میں کافر و مومن سب یکساں ہیں، کیونکہ یہ بیان دونوں کے حق میں اللہ کی طرف سے ثابت ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ توفیق و عصمت و معرفت اللہ کا کام ہے، اگر یہ بات کافر کے واسطے ہوتی تو وہ بھی مومن کی طرح راہ یاب اور مہتدی ہو جاتا۔[2] ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ [آل عمران: ۸] ''(وہ دعا کرتے ہیں:) اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور عطا کر ہمیں اپنے پاس سے رحمت، بے شک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے۔''

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور تحقیق ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل تو ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں تو ہیں (مگر) وہ ان سے (حق کو) دیکھتے نہیں اور ان کے کان تو ہیں (مگر) وہ ان سے (حق بات) سنتے نہیں، وہ تو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ غافل ہیں ﴿179﴾

کفر اور تقدیر:

یعنی اللہ اور رسول کو پہچاننا اور ان کے حکم کا سیکھنا ہر کسی پر فرض ہے، نہ کریں تو دوزخ میں جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا اور مہیا کیا ہے۔ وہ دوزخیوں کے سے کام کیا کرتے ہیں۔ اللہ نے خلق کے پیدا کرنے سے پہلے معلوم کر لیا تھا کہ وہ ایسے کام کریں گے۔ اس حال کو آسمانوں اور

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٥) الأسماء و الصفات (١/ ٢٠٣)

[2] فتح البيان (٥/ ٨١)

زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے ایک کتاب میں لکھ رکھا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے خلق کی تقدیروں کا اندازہ کر دیا تھا اور اس کا تخت پانی پر تھا۔[1] (رواہ مسلم)

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کے ایک بچے کے جنازے پر بلایا گیا، میں نے کہا: خوشی ہو اس بچے کو! یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے، اس نے کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ کسی برے کام کو فرمایا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کچھ اور اس کے سوا اے عائشہ! اللہ نے جنت بنائی، اس کے لیے لوگ بنائے، وہ لوگ اپنے آبا کی پشتوں میں ہیں، دوزخ بنائی، اس کے لیے لوگ بنائے، وہ اپنے آبا کی پشتوں میں ہیں۔[2] (رواہ مسلم)

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے، اس کو چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے: وہ رزق، اجل، عمل اور شقاوت (بدبختی) یا سعادت (نیک بختی) کو لکھتا ہے۔[3]

یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ اللہ نے جب ذریتِ آدم کو ان کی پشت سے نکالا اور دو فریق ٹھہرائے: اصحابِ یمین اور اصحابِ شمال، تو فرمایا: "هٰؤُلَآءِ لِلْجَنَّةِ وَلَآ أُبَالِيْ، وَهٰؤُلَآءِ لِلنَّارِ وَلَآ اُبَالِيْ" اس بارے میں احادیث بہت ہیں، مسئلہ تقدیر کا بڑا مشکل ہے، یہ اس کے بیان کی جگہ نہیں۔

دل، آنکھ اور کان سے فائدہ نہ اٹھانا:

پھر فرمایا کہ وہ لوگ جو ان جوارح، یعنی دل، آنکھ اور کان میں سے کسی سے فائدہ نہیں اٹھاتے، حالانکہ اللہ نے ان جوارح کو ہدایت کا سبب بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ﴾ [الأحقاف: ٢٦] "اور ہم نے انھیں کان اور آنکھیں اور دل دیے تھے، تو ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا، جبکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے۔" نیز فرمایا: ﴿ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٨] "(وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ (سیدھے راستے کی طرف) نہیں لوٹیں گے۔" یہ منافقوں کے حق میں فرمایا ہے۔

کافروں کے حق میں یوں ارشاد کیا ہے: ﴿ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧١] "وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے وہ عقل نہیں رکھتے۔" حالانکہ وہ نہ بہرے ہیں، نہ گونگے اور نہ اندھے، مگر ہدایت

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٥٣) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٢)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٠٣٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٣)

سے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٢٣] ''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنا دیتا، اور اگر وہ انھیں سنا دیتا تو بھی وہ ضرور پھرتے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [الحج: ٤٦] ''پس بے شک قصہ یہ ہے کہ (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٣٦۔ ٣٧] ''اور جو رحمان کے ذکر سے اندھا (غافل) ہو جائے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ اور بلاشبہہ وہ (شیاطین) انھیں (سیدھے) راستے سے روکتے ہیں، جب کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ ہدایت پر ہیں۔''

چوپائیوں سے تشبیہ:

پھر فرمایا کہ یہ لوگ مثل چوپائے کے ہیں کہ نہ حق سن کر یاد کرتے ہیں، نہ ہدایت کو دیکھتے ہیں، جیسے جانور، چرندے کہ ان کو اپنے حواس میں سے کچھ فائدہ نہیں ہے، مگر یہی کہ اس زندگی میں چارہ کھانا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧١] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس (جانور) کو پکارتا ہے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے وہ عقل نہیں رکھتے۔''

یعنی ان کی مثال جیسے چوپائے کہ جب چرواہا ان کو آواز دیتا ہے تو نہیں سنتے، مگر اس کی آواز اور نہیں سمجھتے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اسی لیے ان کو چوپایوں سے گمراہ تر فرمایا ہے، کیونکہ وہ چرواہے کی آواز پر لگ تو جاتے ہیں اگرچہ اس کی بات نہیں سمجھتے، بخلاف ان لوگوں کے کہ یہ بالکل بے بہرہ ہیں۔ علاوہ اس کے چوپائے وہ کام تو کرتے ہیں جس کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، خواہ اپنے دل سے یا دوسرے کی تسخیر سے، بخلاف کافر کے کہ وہ اسی لیے پیدا کیا گیا تھا کہ صرف اللہ ہی کو پوجے، لیکن اس نے اللہ کے ساتھ کفر و شرک کیا۔ اسی لیے یہ بات ہے کہ جو بشر اللہ کا مطیع ہو جاتا ہے، وہ اپنے مثل سے ملائکہ سمیت قیامت میں اشرف ٹھہرتا ہے اور جو آدمی کفر کرتا ہے چوپائے اس سے بہتر ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ نے کفار کو چوپایوں سے زیادہ گمراہ فرمایا ہے۔ ان کو بے خبر اور غفلت زدہ ٹھہرایا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے جہنم کے عذاب کے لیے جنوں اور انسانوں کی بہت

سی مخلوق بنائی ہے۔ اس کا یہ بنانا آگ کے لیے عدل ہے۔ وہ آگ ہی کے لیے عمل کریں گے۔ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ لَمَّا ذَرَأَ لِجَهَنَّمَ مَنْ ذَرَأَ، كَانَ وَلَدُ الزِّنَا مِمَّا ذَرَأَ لِجَهَنَّمَ » [1] (أخرجه ابن جرير و ابن أبي حاتم و أبو الشيخ و ابن النجار) یعنی اللہ نے ولد الزنا کو جہنم کے واسطے پیدا کیا ہے۔ اس حدیث کی سند پر نظر کرنا ضرور ہے، کیونکہ زنا کا گناہ ماں باپ پر ہے نہ کہ اولادِ زنا پر۔ اللہ کسی شخص کو کسی دوسرے کے گناہ پر نہیں پکڑتا۔ یا مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ ولد الزنا جب ماں باپ کی چال پر چلے گا تو جہنم میں جائے گا، اگرچہ حدیث کے ظاہری الفاظ میں ولد الزنا کے ہمیشہ نار میں رہنے کی دلیل نہیں ہے۔ مگر عبارت کے طرز سے آگ میں ہمیشہ رہنے کا مفہوم نکلتا ہے۔ واللہ أعلم.

فتح البیان میں اس حدیث پر کچھ کلام نہیں کیا۔ فکر، بصر اور سمع (سوچنے، دیکھنے اور سننے) کی نفی سے یہ مراد ہے کہ جو بات ان کی ہدایت اور نفع اور فائدے کی ہے، اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اگرچہ دنیا کی باتیں جو ان کے مطلب کی ہیں، خوب سمجھتے، سنتے اور دیکھتے ہیں۔ گویا یہ ان کا ظاہری دنیاوی فہم، بصر اور سمع ان کی دینی بے بصیرتی اور بے عقلی کی وجہ سے کالعدم ہے، کیونکہ اس دل سے نفع کی بات نہیں سمجھتے، اس آنکھ سے ہدایت اور حق کی راہ کو نہیں دیکھتے۔ اس کان سے سن کر غور وفکر نہیں کرتے اور عبرت نہیں پکڑتے۔

یہ ان مشاعر اور حواس سے نفع حاصل نہ کرنے میں جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر اور گمراہ تر ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنے حواس سے اپنے نفع ونقصان کا ادراک کر لیتے ہیں۔ فائدہ دینے والی چیز سے فائدہ اٹھاتے ہیں، تکلیف دینے والی چیز سے اجتناب کرتے ہیں اور یہ گنوار کی لٹھ جاہل مطلق نفع اور ضرر میں بالکل فرق نہیں کرتے، بلکہ دشمنی سے ایسے اقدام کرتے ہیں جو نار کی طرف لے جاتے ہیں، اسی لیے ان پر غفلتِ کاملہ کا حکم لگایا گیا ہے، کیونکہ جس کو عقل و بصر و سمع ہے وہ حق و باطل میں تمیز کیا کرتا ہے اور ان کو بالکل تمیز نہیں ہے۔ [2]

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۟﴿۱۸۰﴾

اور اللہ ہی کے لیے اچھے نام ہیں، لہٰذا تم اسے ان (ناموں) سے پکارو، اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، جلد اس کی سزا پائیں گے (180)

اسمائے حسنیٰ کا بیان اور اُن میں الحاد کی ممانعت:

یعنی اللہ نے اپنے وصف بتائے ہیں کہ مناجات میں وہ کہہ کر پکارو کہ تم پر متوجہ ہو اور کج راہ نہ چلو۔ کج راہ یہ

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٧٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٢٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[2] فتح البیان (٥/ ٨٢۔ ٨٣)

کہ جو وصف نہیں بتائے وہ کہے، جیسے اللہ کو بڑا کہا لمبا نہیں کہا، یا قدیم کہا پرانا نہیں کہا اور ایک کج راہ یہ ہے کہ ان کو سحر میں چلائے۔ وہ اپنے کیے کا بدلہ پا کر رہیں گے، یعنی اللہ کا قرب نہ ملے گا، وہ مطلب ملے گا بھلا یا برا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ایک کم سو (ننانوے) نام ہیں، جس نے ان ناموں کو یاد کر لیا جنت میں جائے گا۔ اللہ ایک (طاق) ہے، ایک (طاق) کو دوست رکھتا ہے۔[1] (أخرجاه في الصحيحين و رواه البخاري والترمذي بسنده مثله)

پھر ترمذی نے بعد لفظ "يحب الوتر" کے وہ سارے نام ذکر کیے ہیں، لفظ "هُوَ اللّٰهُ" سے "صَبُوْر" تک۔ پھر کہا: یہ حدیث غریب ہے، کئی طرح پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ بہت سی روایتوں میں ہمیں ان اسما کا ذکر معلوم نہیں ہوا، مگر اس حدیث میں۔ اس کو ابن حبان اور ابن ماجہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر کے اسما کو بیان کیا ہے،[2] لیکن کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ۔ معتمد بات جو حفاظ کی ایک جماعت نے کہی ہے، یہ ہے کہ ناموں کا ذکر اس حدیث میں مدرج (راوی کا بیان کردہ ہے، مرفوع نہیں) ہے۔ زہیر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو یہ بات کئی اہلِ علم سے پہنچی ہے کہ ان اسما کو انھوں نے قرآن سے نکال کر جمع کیا ہے۔[3] والله أعلم.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ اسمائے حسنیٰ کچھ انھی ننانوے ناموں میں منحصر نہیں ہیں، سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل سے جس میں یہ الفاظ آئے ہیں: "أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِيْ كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَداً مِّنْ خَلْقِكَ، أَوِاسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ... الحديث"[4] (أخرجه أحمد و أبو حاتم بن حبان البستي في صحيحه بمثله)

ابوبکر بن العربی مالکی نے کتاب "عارضة الأحوذي" شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ بعض علما نے کتاب و سنت سے اللہ کے ہزار نام جمع کیے ہیں۔ والله أعلم. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اسما میں الحاد یہ تھا کہ اللہ سے لات اور عزیز سے عزیٰ کو نکالنا۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ الحاد سے مراد شرک ہے۔[6] مزید کہا کہ تکذیب ہے۔[7] الحاد کی اصل کلامِ عرب میں اصل مقصد سے ہٹ جانا اور میل و ظلم اور انحراف کرنا ہے۔ قبر کو بھی لحد اسی لحاظ سے کہتے ہیں کہ قبلے کی طرف کھودنے کی سمت سے منحرف ہوتی ہے۔[8]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٠٨)
② سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦١) صحيح ابن حبان (٣/ ٨٨)
③ تفسير ابن كثير (٢/ ٣٥٧)
④ مسند أحمد (١/ ٣٩١) صحيح ابن حبان (٣/ ٢٥٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٩)
⑤ الدر المنثور (٣/ ٦١٦)
⑥ تفسير الطبري (١٣/ ٢٨٣)
⑦ تفسير الطبري (١٣/ ٢٨٣) اس کی سند حسن ہے۔
⑧ تفسير ابن كثير (٢/ ٣٥٧۔ ٣٥٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اسمائے الٰہی کا ذکر قرآن میں چار جگہ آیا ہے: ایک اس سورت میں، دوسری بنی اسرائیل میں، تیسری طٰہٰ کے شروع میں اور چوتھی سورت حشر کے آخر میں۔ اللہ پاک نے اس آیت میں اجمالاً یہ خبر دی ہے کہ ہمارے بہت سے نام ہیں، مگر تفصیل نہیں بتائی۔ حسنیٰ احسن کا مؤنث ہے، اپنے اسما کو احسن فرمایا، اس لیے کہ احسن اس بات کی دلیل ہے کہ جس کا وہ نام ہے وہ بزرگ ہستی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث جس میں ننانوے ناموں کا ذکر آیا ہے، اوپر گزر چکی ہے۔[1] اس کو امام احمد، شیخین، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابو عوانہ، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مندہ، ابن مردویہ، ابو نعیم اور بیہقی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔

امام ابن مردویہ اور ابو نعیم رحمہ اللہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ جو کوئی اللہ کو ان ننانوے ناموں سے پکارتا ہے، اللہ اس کی دعا قبول کرتا ہے۔[2] امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں تمام ناموں کو شامل نہیں کیا گیا، نہ ہی یہ مطلب ہے کہ ان ننانوے ناموں کے سوا اور نام نہیں ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اس عدد کو یاد کرنا دخولِ جنت کا باعث ہے۔[3] امام ابن حزم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسمائے حسنیٰ کے ضبط کرنے کے بارے میں احادیثِ مضطربہ آئی ہیں۔ ان میں سے کوئی حدیث بھی صحت کو نہیں پہنچی۔[4] امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو اعداد ذکر کیے ہیں، میں نہیں جانتا کہ اس کی سند کیسی ہے۔ امام محمد باقر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ نام قرآن میں ہیں، پھر سورتاً فسورتاً ان کو ذکر کیا۔[5] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی تلخیص میں ان ننانوے ناموں کا، قرآن مجید سے تتبع کر کے ان کا ذکر کیا ہے۔[6]

سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: «وَهِيَ فِي الْقُرآنِ»[7] (أخرجه أبو نعيم) امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احصا بمعنی حفظ ہے۔[8] اکثر محققین کا یہی قول ہے۔ روایت: «مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ» بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ سب اقوال میں یہی قول زیادہ بہتر ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس جگہ ایک یہ بحث لکھی ہے کہ اسم عین مسمی ہوتا ہے یا غیر مسمیٰ،[9] سو یہ ایسی بات ہے جس کی تکلیف اللہ نے اپنے بندوں کو نہیں دی۔

اسماء میں الحاد کا مطلب:

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ پاک کے نام پاک توقیفی ہیں نہ کہ اصطلاحی۔ مطلب یہ ہوا کہ جو نام خود اللہ نے بتائے ہیں، اللہ کو انھی ناموں سے پکارنا چاہیے، دعا اور ندا کے وقت انھی اسما کو استعمال میں لانا مناسب

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] الدر المنثور (٣/ ٦١٤) [3] المنهاج للنووي (١٧/ ٥)
[4] المحلیٰ (٨/ ٣١) [5] الدر المنثور (٣/ ٦١٥۔ ٦١٦) [6] التلخيص الحبير (٤/ ٤٢٤۔ ٤٢٥)
[7] الدر المنثور (٣/ ٦١٥) [8] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٥٧) [9] تفسير الرازي (١٥/ ٥٥)

ہے۔ اور جو نام اللہ نے اپنے لیے نہیں بتائے ہیں، ان کو اللہ کے لیے نہیں استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ یہ بھی ایک طرح کا الحاد اور شرک ہے، اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ تم ان لوگوں کو چھوڑ دو جو ہمارے نام میں الحاد کرتے ہیں۔ یہ الحاد تین طرح پر ہوتا ہے:

① ایک تغیر و تبدل کر کے، جیسے مشرکین نے منان سے منات اور عزیز سے عزیٰ نکالا۔

② دوسرے زیادتی کے ساتھ، یعنی اپنی طرف سے کوئی نام اختراع و ایجاد کرے جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔ اہلِ معانی نے کہا ہے کہ الحاد یہ ہے کہ اللہ کا وہ نام رکھے جس کے ساتھ اس نے خود اپنے نفسِ مقدس کو مسمی نہیں کیا اور نہ ہی اس بارے میں کتاب وسنت میں کوئی واضح حکم آیا ہے، کیونکہ اللہ پاک کے سارے نام توقیفی ہیں، ان میں کسی ایسے نام کا ملانا جائز نہیں جو شرع میں پہلے سے وارد نہیں ہوا، بلکہ اس کو ان ناموں سے پکارنا چاہیے جو قرآن وحدیث میں آئے ہیں اور یہ پکارنا اس کی تعظیم کے طور پر اور اپنی خاکساری کے طور پر ہو۔

③ تیسرے نقصان کے ساتھ کہ بعض ناموں کے ساتھ اللہ کو پکارے اور بعض کے ساتھ نہ پکارے۔ یا ایسا نام لے جس کے معنی معلوم نہیں ہیں، یا اس نام میں کسی طرح کی غرابت ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ وغیرہ مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ایک مرد مسلمان کے حق میں نازل ہوئی ہے جو اپنی دعا میں یا رحمان یا رحیم کہتا تھا، ایک مشرک مرد نے کہا کہ کیا محمد ﷺ کو یہ زعم نہیں ہے کہ وہ ایک رب کے عابد ہیں، پھر یہ شخص کیوں دو رب کو پکارتا ہے؟ یہ بات امام قرطبی رحمہ اللہ نے نقل کی ہے۔[1]

میں کہتا ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے نام بھی توقیفی ہیں، جو نام نبی اکرم ﷺ نے اپنا نہیں بتایا، وہ نام نبیِ اکرم ﷺ کا اپنی طرف سے نہ رکھے کہ یہ بھی ایک طرح کا الحاد، یعنی قصد سے انحراف ہے۔ اللہ اور رسول کے اوصاف وصفات بیان اور ذکر کرنے کے لیے کتاب وسنت میں وارد اسما و صفات کافی، وافی اور شافی ہیں۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

اور جنھیں ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک گروہ (ان لوگوں کا) ہے جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں (181)

حق وعدل پر قائم امت:

یعنی شرع کے مطابق انصاف کرتے ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ من جملہ امتوں

---

[1] تفسیر القرطبي (۷/ ۳۲۵) فتح البیان (۵/ ۸۳۔ ۸۶)

کے بعض بعض امت ایسی ہے جو قولاً و عملاً حق پر قائم و دائم ہے۔ سچ بات کہتی ہے، سچ بات کی طرف بلاتے ہیں، سچا حکم و انصاف کرتی ہے۔ بعض آثار میں آیا ہے کہ اس جگہ اس امت سے مراد امتِ محمدیہ ہے۔ علیٰ صاحبها الصلاة والتحية.

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ جب اس آیت کو پڑھتے تو فرماتے: «هَذِهِ لَكُمْ وَقَدْ أُعْطِيَ الْقَوْمُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ مِثْلُهَا وَمِنْ قَوْمِ مُوْسىٰ أُمَّةٌ الْآيَة»[1] امام انس بن ربیع رحمہ اللہ مرفوعاً کہتے ہیں: «إِنَّ مِنْ أُمَّتِي قَوْماً عَلَى الْحَقِّ حَتّٰى يَنْزِلَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ مَتىٰ مَا نَزَلَ»[2] (أخرجه ابن أبي حاتم) صحیحین میں معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَا تَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ» دوسری روایت میں یوں ہے: «حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلىٰ ذٰلِكَ» تیسری روایت میں یوں ہے: «وَهُمْ بِالشَّامِ»[3]

فتح البیان میں ہے کہ یہ امت مہاجرین اور انصار اور ان کی متبع بالاحسان ہیں۔[4] (قاله ابن عباس) امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنین سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔[5] کسی نے کہا ہے کہ مراد علما اور دین کی طرف دعوت دینے والے لوگ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ فرقہ ہے جو ہمیشہ حق پر غالب رہے گا، جس طرح کہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: « هَذِهِ أُمَّتِيْ يَحْكُمُوْنَ وَيَقْضُوْنَ وَيَأْخُذُوْنَ وَيُعْطُوْنَ»[6] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ»

میں کہتا ہوں کہ جب سیرت اور تاریخ کی کتابوں کو دیکھا جاتا ہے تو کوئی گروہ ان صفات کا حامل سوائے اہل القرآن و الحدیث کے کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ واللہ أعلم. بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ہر زمانے کا اجماع حجت ہے۔ اس مسئلے کی تفصیل علمِ اصول میں مفصل ہے۔[7]

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، ہم ضرور انھیں بتدریج پکڑیں گے جہاں سے انھیں علم تک نہ ہوگا (182)

اور میں انھیں مہلت دیتا ہوں، بے شک میری تدبیر نہایت مضبوط ہے (183)

---

(1) تفسير الطبري (١٣/ ٢٨٦) یہ روایت مرسل ہے۔ (2) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٧) (4) تفسير البغوي (٣/ ٣٠٨)

(5) الكشاف (٢/ ١٧٠- ١٧١) (6) تفسير الطبري (١٣/ ٢٨٥) الدر المنثور (٣/ ٦١٧) یہ روایت مرسل ہے۔

(7) فتح البيان (٥/ ٨٧- ٨٨)

جھٹلانے والوں کی تدریجاً پکڑ اور مہلت:

مطلب یہ کہ ہم ان کے لیے دنیا میں رزق اور وجوہِ معاش کے دروازے کھول دیں گے، یہاں تک کہ وہ دھوکے میں آ جائیں اور یہ اعتقاد کر لیں کہ وہ ٹھیک بات پر ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٤٤۔ ٤٥] ’’پھر جب انھوں نے وہ نصیحت بھلا دی جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، حتی کہ جب وہ ان چیزوں پر اترانے لگے جو انھیں دی گئی تھیں، تو ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا، پھر وہ نا امید ہو کر رہ گئے۔ پھر اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔‘‘ اسی لیے اللہ نے یوں کہا کہ ہم ان کو فرصت دے رہے ہیں، ان کے حال میں، کیونکہ ہماری تدبیر خوب قوی و مضبوط ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ نے اس امتِ صالحہ کا حال بیان کیا تو اب ان کا ذکر فرمایا جو اس امتِ مرحومہ اسلامیہ کے مخالف ہیں۔ مکذبین سے مراد آیاتِ الٰہی کے تمام مکذبین ہیں، یعنی تمام روئے زمین کے کافر ہیں یا اہلِ مکہ کے کافر مراد ہیں۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ عموم کا صیغہ سب کو شامل کرتا ہے، مگر جس کو دلیل اس سے خارج کرے۔

استدراج تدریج سے درجہ بدرجہ پکڑنے کو کہتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ ہم ان کو تھوڑا تھوڑا ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں، اپنی نعمتیں ان کو دے کر شکر کرنا بھلا دیتے ہیں، وہ غوایت میں منہمک ہو کر ہدایت کے طریق سے الگ تھلگ رہ جاتے ہیں، ان کو یہ دھوکا ہے کہ ہم اللہ کے نزدیک عزیز و قریب ہیں۔ جب ہی تو ہم کو یہ آسایش و آرام ملا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عذابِ بدر ہے،[1] مگر عموم زیادہ بہتر ہے۔ بدر اس میں بدخولِ اولیٰ داخل رہے گا۔ یحییٰ بن المثنی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جب کوئی نیا گناہ کرتے ہیں تو ایک نئی نعمت ان کو دی جاتی ہے، وہ استغفار کرنا بھول جاتے ہیں۔[2] یہی امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[3]

امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اپنی نعمت ان پر پوری کرتے ہیں اور نعمت کا شکر کرنے سے ان کو باز رکھتے ہیں۔ کسی نے ثابت بنانی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ استدراج کیا ہے؟ کہا: اللہ کا مضیّعین کے ساتھ مکر ہے۔[4] امام کلبی نے کہا:

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٢٤) (2) الدر المنثور (٣/ ٦١٨)

(3) تفسیر البغوي (٣/ ٣٠٨) (4) الأسماء و الصفات للبیهقي (٢/ ٤٤٣)

ہم زینت دیتے ہیں، ان کے اعمال کو، پھر ہم ان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔[1] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس جب خزائن کسریٰ لائے گئے تو کہا: ”اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ أَنْ أَكُوْنَ مُسْتَدْرِجاً فَإِنِّيْ سَمِعْتُكَ تَقُوْلُ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ“[2]

املا مہلت دینے اور طول دینے کو کہتے ہیں، یعنی ہم نے ان کی مدت لمبی کی ہے، تاکہ کفر و معاصی میں زیادہ ہوں۔ سزا کو ان سے موخر کر رکھا ہے، ہماری پکڑ ہمارا مکر شدید لا یطاق ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کا مکر عذاب اور سزا ہوتا ہے۔[3]

کشاف میں کہا ہے کہ کید اس لیے نام رکھا ہے کہ مانند کید ہے، کیونکہ ظاہر میں احسان حقیقت میں خذلان ہے۔[4] آیت مسئلۂ قضا و قدر پر دلیل ہے اور اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اللہ جو چاہے کرے، جو ارادہ کرے وہ حکم دے۔ اس کے کام کے بارے میں اس سے نہیں پوچھا جاتا اور سب سے سوال ہوتا ہے۔[5]

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۸۴

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی (نبی) کو کوئی جنون (لاحق) نہیں؟ وہ تو صاف صاف (اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والے ہیں (184)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دیوانگی کی تردید اور صفتِ اِنذار کا اثبات:

رفیق (صاحب) پیغمبر کو فرمایا کہ ہمیشہ ان کے پاس ہے، اس کے حال سے واقف ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنون نہیں ہے، بلکہ وہ تو اللہ کے رسول ہیں، سچے ہیں، حق کی طرف بلاتے ہیں، جس کو عقل و شعور ہے اور دل اور ہوش رکھتا ہے، اس کو ڈراتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴾ [التکویر: ۲۲] ”اور (اے اہلِ مکہ!) تمھارا ساتھی (محمد) دیوانہ نہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴾ [سبا: ۴۶] ”بس میں تو تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک (ہو کر) کھڑے ہو جاؤ، پھر تم غور و فکر کرو، تمھارے ساتھی (نبی) میں کوئی دیوانگی (کی بات) نہیں، وہ تو صرف تمھیں ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔“

---

[1] تفسير البغوي (۳/ ۳۰۸) [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (۶/ ۳۵۷) [3] الدر المنثور (۳/ ۶۱۸)
[4] الكشاف (۲/ ۱۷۱) [5] فتح البيان (۵/ ۸۸۔ ۸۹)

یعنی تم سے مطلب یہ ہے کہ تم خالص اللہ کے لیے قیام کرو، جس میں تعصب و عناد نہ ہو، خواہ اکٹھے ہو کر، یا علاحدہ علاحدہ، پھر سوچو کہ جو یہ شخص اللہ کی طرف سے رسالت لایا ہے، اس میں کچھ دیوانگی ہے یا نہیں، کیونکہ جب تم یہ کام کرو گے تو تم کو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ سچے پکے رسول ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پر کھڑے ہو کر قریش کو پکارا، ایک ایک قبیلے کو یا بنی فلاں یا بنی فلاں کہہ کر بلایا، پھر ان کو اللہ کے عذاب اور وقائع سے ڈرایا، ایک شخص نے کہا: یہ تمھارا صاحب مجنون ہے، شام سے صبح تک چلاّتا ہے، اس پر یہ آیت اتری۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سوالیہ انداز انکار کے لیے ہے، کیونکہ انھوں نے شانِ رسول میں تفکر نہ کیا، بغیر سوچے سمجھے کہ کون سی بات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں جنون کی ہے، دیوانہ کہنے لگے، اگر غور و فکر کرتے تو اپنے زعم کو باطل پاتے، اسی بات کو جھوٹ اور بہتان سمجھ لیتے، یا یہ ان کے قول کا رد ہے: ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ [الحجر: ٦] ”اے وہ شخص! جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے، یقیناً تو تو مجنون ہے۔“ انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون اس لیے کہا تھا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اقوال و افعال میں ان کے مخالف تھے، دنیا سے منہ موڑنے والے، آخرت کی طرف توجہ کرنے والے، اللہ کی طرف دعوت دینے میں مشغول تھے، دن رات لوگوں کو بغیر کسی ملال، اکتاہٹ اور بے چینی کے اللہ کے عذاب اور انتقام سے ڈرایا کرتے تھے۔ اللہ نے جنون سے ان کی براءت ثابت فرمائی، خود انھی کو پاگل بتایا۔[2]

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی میں اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں ڈالی، اور (اس پر غور نہیں کیا کہ) شاید ان کی موت قریب آگئی ہو؟ پھر اس (قرآن) کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ (185)

زمین و آسمان کی ملکوت اور موت میں دعوتِ فکر:

یعنی اللہ کی نشانیوں کو یہ جھٹلانے والے اگر اللہ کے ملک اور سلطنت میں اور جو چیزیں اس نے پیدا کی ہیں، ان میں غور و تامل کرتے اور تدبر و عبرت پکڑتے تو جان لیتے کہ یہ اس شخص کی صفت ہے، جس کا کوئی نظیر اور شبیہ نہیں

(1) تفسیر الطبري (١٣/ ٢٨٩) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٥٨۔ ٣٥٩) یہ روایت مرسل ہے۔ البتہ یہ واقعہ دوسرے الفاظ کے ساتھ صحیحین میں مروی ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٩٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٠٨)

(2) فتح البیان (٥/ ٨٩۔ ٩٠)

ہے۔ یہ اس ذات کا فعل ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت یا کسی کے لیے دین کو خالص کرنا لائق نہیں ہے۔ پھر ایمان لا کر رسول کی تصدیق کرتے، اللہ کی اطاعت کی طرف متوجہ ہوتے، اللہ کے شریکوں اور بتوں کو چھوڑ دیتے اور اس بات سے ڈرتے کہ کہیں ان کی موت نزدیک نہ ہو اور وہ کفر پر مر کر عذابِ الیم اور عقابِ عظیم میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اب خاتم الرسل کے ڈرانے کے بعد کس کے خوف دلانے، ڈرانے اور ہیبت دلانے پر ایمان لائیں گے، جب کہ اس حدیث، یعنی کتاب اللہ کی جس کو وہ لے کر آئے ہیں، تصدیق نہیں کرتے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سوالیہ انداز انکار اور ڈانٹ ڈپٹ اور ان کے اعراض پر تعجب کرنے کے لیے ہے کہ وہ ان آیاتِ بیّنات میں جو اللہ کی کمال قدرت اور وحدانیت اور تفرید ربوبیت کی دلیل ہیں، کیوں غور وفکر اور نظر نہیں کرتے، حالانکہ ہر شے میں اللہ کی توحید اور تفرید ربوبیت کی دلیل موجود ہے۔ ملکوت ملکِ عظیم کو کہتے ہیں، کیونکہ اگر وہ اس مخلوقات میں غور وفکر کرتے تو ایمان کی راہ پا لیتے، بلکہ وہ تو ضلالت کی طرف جلدی کرتے ہیں، اپنی ہی گمراہی میں مصروف و مشغول ہیں، نہ اعمال کی فکر کریں، نہ کسی اور چیز پر گہری نظر ڈالیں۔ اللہ کی ساری مخلوقات میں سے کوئی بھی شے کیوں نہ ہو، عبرت پکڑنے والوں کے لیے عبرت ہے اور غور وفکر کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے، خواہ وہ جلیل القدر مصنوعات سے ہوں، جیسے ملکوتِ ارض و سماوات، خواہ وہ چھوٹی مخلوق ہو، جیسے ساری پیدا کی گئی چیزیں، یہ بھی نہیں سوچتے کہ کہیں ان کی موت قریب نہ آئی ہو، پھر اسی طرح کفر پر مر جائیں، اب اس قرآن کریم یا رسولِ رحیم یا اجلِ مذکور کے بعد کس بات پر یقین کریں گے۔[1]

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور وہ انھیں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں ﴿186﴾

اللہ کے گمراہ کردہ کے لیے ہدایت کہیں نہیں:

یعنی جس پر ضلالت لکھ دی گئی ہے اس کو کوئی شخص ہدایت نہیں کر سکتا، گو وہ خود اپنے معاملے میں نظر کیوں نہ کرے، یہ کچھ اس کے کام نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ﴾ [المائدۃ: ٤١] ''اور جسے اللہ فتنے میں ڈالنا چاہے تو آپ اللہ کی طرف سے اس کے بارے میں قطعاً کچھ اختیار نہیں رکھتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا

[1] فتح البیان (۵/ ۹۰۔ ۹۱)

﴿ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [یونس: ۱۰۱] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔''

فتح البیان میں ہے کہ یعنی یہ غفلت ان کی ان امور سے اسی لیے ہے کہ اللہ نے ان کو گمراہ ٹھہرا دیا ہے، وہ اپنی طغیانی اور زیادتی میں حیران و متردد ہیں، ان کو راہ نہیں ملتی۔ [1]

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

(اے نبی!) وہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس کے واقع ہونے کا وقت کون سا ہے؟ کہہ دیجیے: اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اسے اس کے وقت ہی پر ظاہر کرے گا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری (حادثہ) ہوگی۔ وہ (قیامت) تمھارے پاس بس اچانک ہی آئے گی۔ وہ (لوگ) آپ سے سوال کرتے ہیں جیسے آپ اس (کے وقت) سے بخوبی واقف ہیں۔ کہہ دیجیے: اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (187)

قیامت کے وقت کے متعلق سوال:

اللہ نے کہا ہے کہ تجھ سے قیامت کا حال پوچھتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ﴾ [الأحزاب: ٦٣] ''لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' یہ آیت قریش کے حق میں اتری ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہودی لوگوں کے بارے میں ہے۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ آیت مکی ہے۔ وہ لوگ ساعت کے وقت کے بارے میں اس لیے سوال کرتے تھے کہ قیامت کے واقع ہونے کو بعید از قیاس جانتے تھے، قیامت کے واقع ہونے کو جھٹلاتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [الملك: ٢٥] ''اور وہ (کافر) کہتے ہیں: یہ (قیامت کا) وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴾ [الشوریٰ: ۱۸] ''جو لوگ اس (قیامت) پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور وہ جانتے ہیں

[1] فتح البیان (۵/ ۹۱)

کہ وہ برحق ہے۔ آگاہ رہو! بلاشبہ جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، وہ دور کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''مُرْسٰی'' بمعنی منتہٰی ہے۔[1] ﴿ اَيَّانَ ﴾ سے مراد آخر مدتِ دنیا ہے اور وہ اول وقت ساعت ہوگا۔ اللہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ جب وہ تم سے قیامت کے وقت کا سوال کریں تو تم علمِ ساعت کو اللہ کی طرف پھیر دو۔ اللہ ہی جانے کس وقت وہ گھڑی آئے گی۔ اس کی حد اللہ ہی کو معلوم ہے، سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا، نبی ہو یا فرشتہ، پھر کسی دوسرے کی کیا ہستی ہے۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ اس کا آنا زمین اور آسمانوں پر بھاری ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی علم اس کا گراں ہے، آسمانوں اور زمین پر، وہ بھی تو اس کو نہیں جانتے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی ساعت جب آئے گی تو اہلِ سماوات و ارض پر بھاری ہوگی۔[2]

قیامت کی نشانیاں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کوئی شے مخلوق میں سے نہیں ہے، مگر اس کو کچھ نہ کچھ ضرر قیامت کے دن پہنچے گا۔[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب قیامت آئے گی، آسمان پھٹ جائیں گے، تارے بکھر جائیں گے، سورج تہ کر دیا جائے گا، پہاڑ چل نکلیں گے، یہ ہے اس کا بھاری ہونا۔ ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ساعت کے بھاری ہونے سے مراد اہلِ آسمان و زمین پر وقتِ ساعت کا علم ہے، جس طرح قتادہ رحمہ اللہ نے کہا تھا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وھو کما قالاہ کقولہ تعالیٰ: ﴿ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ﴾ (آیتِ باب) سو یہ کچھ اہلِ سماوات و ارض پر اس کی آمد کے بوجھل پن کے منافی نہیں ہے۔ واللہ أعلم.[4]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ثقلت'' بہ معنی ''خَفِيَتْ'' (پوشیدہ ہے) ہے۔ اس کے قیام کو، جب کہ وہ قائم ہوگی، نہ کوئی فرشتۂ مقرب اور نہ کوئی نبیِ مرسل جانتا ہے۔ وہ تو یکایک غفلت میں آ جائے گی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا یہی حکم ہے کہ وہ ناگہاں آ جائے۔[5]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی، یہاں تک کہ سورج مغرب سے نکلے، جب ادھر سے نکلے گا اور سب لوگ اس کو دیکھیں گے تو اس وقت کسی کو اس کا ایمان لانا نفع نہ دے گا، جو پہلے اس سے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنی حالتِ ایمان میں، اس نے کوئی بھلائی، بہتری یا نیکی نہ کمائی تھی۔ البتہ قیامت قائم ہوگی اور دو آدمی آپس میں کپڑے کی خرید و فروخت کرتے ہوں گے، وہ اس کپڑے کو تہ نہ کر پائیں گے کہ اتنے میں قیامت قائم ہو جائے گی۔ کوئی آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے کر آتا ہوگا، وہ اس کو پینے نہ پائے گا کہ قیامت آ جائے گی۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۲۹٤) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱٦۲۷)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱٦۲۷) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسیر الطبري (۱۳/ ۲۹٦) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳٦۰) [5] تفسیر الطبري (۱۳/ ۲۹۵_ ۲۹۷)

کوئی آدمی اپنے حوض کو لیپتا ہوگا اس کا پانی پینے نہ پائے گا کہ ساعت قائم ہو جائے گی، کسی آدمی نے نوالہ کھانے کا منہ کی طرف اٹھایا ہوگا اس کو کھا نہ پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ (رواه البخاري) یہ مضمون حدیثِ مسلم میں بھی مختصراً آیا ہے۔[1]

قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے:

﴿حَفِيٌّ﴾ کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گویا تیرے اور ان کے درمیان دوستی ہے، تو ان کا دوست ہے تو ان کو یہ بات بتا دے گا۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ اس کا علم خاص مجھ کو ہے، میں نے کسی مقرب فرشتے یا رسول کو اس کی اطلاع نہیں دی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: قریش نے نبیِ کریم ﷺ سے عرض کی کہ ہم آپس میں ایک برادری ہیں، تم ہم کو اشارہ کر دو کہ قیامت کب آئے گی۔ یہی امام مجاہد و عکرمہ رحمہما اللہ کا قول بھی ہے۔ امام ابو مالک اور سدی رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہ ایک قول ہے، لیکن امام مجاہد رحمہ اللہ سے صحیح قول اس طرح پر ہے: ''اِسْتَحْفَيْتُ عَنِ السُّؤَالِ حَتّٰى عَلِمْتُ وَقْتَهَا'' یہی امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے: یعنی ''كَأَنَّكَ عَالِمٌ بِهَا''[3] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ قول معنی میں پہلے قول سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ اس لیے کہ حدیثِ جبریل میں آیا ہے: ''مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ'' پھر نبیِ اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ [لقمان: ٣٤] ''بے شک قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔'' جب جبریل نے قیامت کی شرطوں کے بارے میں سوال کیا تو ان کو بیان فرما دیا، پھر کہا: ''فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ'' پھر یہ آیت پڑھی۔ جبریل علیہ السلام ہر جواب کے بعد کہتے: آپ نے سچ کہا، اسی لیے صحابہ نے سائل کے سوال کرنے اور پھر اس کے جواب کی تصدیق کرنے پر تعجب کیا تھا۔ یہ حدیث مع اپنے جملہ طرق و الفاظ کے صحاح وحسان و مسانید میں مروی ہے، اول شرح بخاری میں۔[4] وللہ الحمد والمنة.

رسول اللہ ﷺ کا جواب دینے کا حکیمانہ انداز:

ایک اعرابی نے نبیِ کریم ﷺ سے پکار کر کہا تھا کہ ساعت کب ہے؟ فرمایا: افسوس ہے تجھ کو ساعت آنے والی ہے، تُو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ کہا: میں نے بہت کچھ نماز روزہ نہیں کیا ہے، لیکن میں اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہوں۔ فرمایا: «اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ» ''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی۔'' اس دن جیسے مسلمان اس بات سے خوش ہوئے، کسی چیز سے خوش نہیں ہوئے۔ یہ حدیث متعدد طرق سے ایک جماعتِ صحابہ سے صحیحین وغیرہ میں آئی ہے۔[5] بہت سے حفاظ متقنین کے نزدیک متواتر ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٤)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٢٩٨۔ ٢٩٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٢٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٦٠۔ ٣٦١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦۔ ٥٨١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠۔ ٢٦٣٩)

نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ یوں تھی کہ جب کوئی ایسی بات پوچھتا جس کے معلوم کرنے کی حاجت نہ تھی تو اس کو ایسی بات بتاتے جو اس کے حق میں اہم ہوتی۔ یعنی تیاری کرنا اور اس کے واقع ہونے کے بارے میں ڈرتے رہنا اگرچہ اس کا وقت معین اس کو معلوم نہیں ہے۔ اسی جگہ سے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اعراب (بادیہ نشیں) نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آ کر ساعت کا سوال کرتے۔ نبیِ اکرم ﷺ ان میں سے ایک کم عمر آدمی کی طرف نظر کر کے فرماتے کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو یہ بڑھاپا نہ پائے گا، یہاں تک کہ تمھاری ساعت قائم ہو جائے گی۔[1]

(رواہ مسلم و انفرد بہ)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ ساعت کب ہو گی؟ آپ نے سکوت کیا، پھر ایک لڑکے کی طرف، جو ازدِشنوءہ کا آپ کے سامنے تھا، نظر کر کے فرمایا: اس کی عمر کو بڑھاپا نہ آئے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ لڑکا میرا ہم عمر تھا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ ایک لڑکا مغیرہ بن شعبہ کا جو میرے باپ کی بیٹی کا تھا، نکلا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: « إِنْ يُّؤَخَّرْ هٰذَا لَمْ يُدْرِكْهُ الْهَرَمُ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ » ''اگر اس کی عمر لمبی ہوئی تو اس کو بڑھاپا نہیں آئے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔'' سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ لڑکا میرے برابر تھا۔[2] (رواھما مسلم)

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح ذکر کی ہے کہ اہلِ بادیہ میں سے ایک مرد نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! قیامت کب قائم ہو گی... الحدیث، پھر اس حدیث کے آخر میں غلام مغیرہ بن شعبہ کے گزرنے کا ذکر کیا ہے۔[3] یہ اطلاق ان روایات میں « سَاعَتِكُمْ » (تمھاری ساعت) پر مقید ہونے پر محمول ہے (یعنی قیامت قائم ہونے سے مراد تمھاری قیامت ہے، یعنی اتنے عرصے تک موت سے ہم کنار ہو جاؤ گے، گویا تمھاری قیامت آ جائے گی) جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے۔

انبیا کا قیامت کے وقت سے لاعلمی کا اظہار:

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو سنا، آپ ﷺ اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے فرماتے تھے، تم مجھ سے ساعت کا سوال کرتے ہو، سو اس کا علم اللہ کے پاس ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں اللہ کی! کہ آج کے دن زمین کی پشت پر کوئی ایسا نفس منفوسہ نہیں ہے جس پر سو برس گزریں۔[4] (رواہ مسلم) صحیحین میں بھی اسی کے مثل آیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی مراد اس قرن (صدی) کا انخرام (ختم ہونا) تھا۔[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٢) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٥) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٧)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شبِ معراج میں دیکھا، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو، انھوں نے ذکر قیامت کا کیا، پھر ابراہیم علیہ السلام کے حوالے کیا، ابراہیم علیہ السلام نے کہا: مجھ کو اس کا علم نہیں، موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کیا، انھوں نے بھی یہی کہا کہ میں نہیں جانتا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے کیا، انھوں نے کہا کہ قیامت کی گڑگڑاہٹ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ہاں میرے رب نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ اس سے پہلے دجال نکلے گا... الحدیث۔ اس حدیث کے آخر میں یہ ہے کہ « إِذَا كَانَ كَذَٰلِكَ فَإِنَّ السَّاعَةَ كَالْحَامِلِ الْمُتِمِّ لَا يَدْرِيْ أَهْلُهَا مَتَىٰ تَفْجَأُهُمْ بِوِلَادَتِهَا لَيْلًا أَوْ نَهَاراً »[1] (رواه أحمد بطوله و ابن ماجه بسنده نحوه) ''جب اس طرح ہوگا تو ساعت پورے وقت کی حاملہ کی طرح ہوگی کہ اس کے اہل والے نہیں جانتے کہ یہ کب بچہ جنے گی، رات کو یا دن کو۔''

یہ رسولوں میں سے اکابر اولو العزم ہیں ان کے نزدیک ساعت کے وقت کا کوئی تعین نہ تھا۔ جب انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے کیا تو عیسیٰ علیہ السلام نے قیامت کی نشانیوں کو بیان کیا، کیونکہ وہ اس امت کے آخر میں نزول فرما ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو نافذ کریں گے، مسیح علیہ السلام دجال کو ماریں گے، انہی کی دعا کی برکت سے یاجوج ماجوج ہلاک ہوں گے، جو جتنی بات اللہ نے ان سے کہی تھی، اسی کی انھوں نے خبر دی۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کا حال پوچھا، فرمایا: کہ اس کا علم میرے رب عزوجل کے پاس ہی ہے۔ اس کو اس کے وقت پر ہی کھولے گا، مگر ہاں میں تم کو قیامت کی نشانیوں کی خبر دیتا ہوں اور جو کچھ اس سے پہلے ہوگا۔ قیامت سے پہلے فتنہ اور ہرج ہے۔ کہا: فتنے کو تو ہم پہچانتے ہیں، مگر ہرج کیا ہے؟ فرمایا: زبانِ حبشہ میں ہرج قتل کو کہتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ لوگوں کے درمیان تناکر (ایک دوسرے سے لاعلمی) ڈالا جائے گا، کوئی کسی کو نہ پہچانے گا۔[2] (رواه أحمد ولم يروه أحد من أصحاب الكتب من هذه الوجه) طارق بن شہاب نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ساعت کے حال کا ذکر فرمایا کرتے، یہاں تک کہ آیتِ باب اتری۔[3] (رواه النسائي، وهذا إسناد جيد قوي)

اب دیکھو کہ یہ ہمارے نبیِ اُمی سید المرسلین، خاتم النبیین، نبی الرحمۃ، نبی التوبۃ، نبی الملحمۃ، عاقب، مقفی اور حاشر ہیں، جن کے قدموں پر سب لوگوں کا حشر ہوگا اور جنھوں نے یہ کہا ہے: « بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ » ''میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں۔'' پھر سبابہ کو پاس کی انگلی سے ملایا۔[4] ان کو اللہ نے یہ حکم دیا کہ تم ساعت کے وقت کے علم کو اللہ کی طرف پھیر دو اور کہہ دو: ﴿ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٨١) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٣١٨)

[2] مسند أحمد (٥/ ٣٨٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٧١)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٥٠٦) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ''جید قوی'' کہا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ٢/ ٣٦٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٠)

﴿ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت باب) تو پھر وہ دوسرا کون شخص ہے جو قیامت کے وقت کو تعیین کے ساتھ بتا سکے۔ بعض دعوے دارانِ اہلِ کشف وشہود وسلوک نے ازراہ کشف والہام وحدس صائب جو تعیین بتائی تھی، وہ کچھ شرعی حجت یا نصِ قطعی نہ تھی، اسی لیے اب تک وہ سب خلافِ واقع ٹھہرے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ساعت سے مراد قیامت ہے، قیامت کو ساعت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اچانک آ جائے گی، یہی ساعت اس کے واقع ہونے کو محتمل ہے۔ یا سرعتِ حساب کی وجہ سے ایک دم سب حساب کتاب ہو جائے گا۔ یا اللہ کے نزدیک ایک ساعت کے برابر ہے، گو بجائے خود لمبی کیوں نہ ہو۔

ارساء بمعنی استقرار ہے، ساعت اس وقت کا نام ہے جس میں ساری مخلوق مر جائے گی۔ سوال کا مطلب یہ تھا کہ ساعت کا وقتِ معین کون سا ہے؟ اس کا جواب یہ فرمایا کہ اس کا علم اللہ کو ہے نہ کہ کسی اور کو۔ یہ بات اطاعت کی طرف ابھارنے والی اور معصیت سے ڈرانے والی ہے۔ تجلیہ کسی شے کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں، یعنی اللہ ہی اس کو اس کے وقت پر ظاہر کرے گا، کوئی ایک مخلوق بھی اس پر آگاہ نہ ہوگی کہ وہ اب آتی ہے۔ اللہ نے جو یہ علم اپنے ساتھ خاص کیا ہے، اس میں ایک بڑی حکمت اور تدبیرِ بلیغ ہے، جس طرح باقی مخفی چیزوں میں ہے۔

قیامت زمین وآسمان والوں پر بھاری ہے۔ عالم علوی وسفلی پر گراں ہے اور بہت سخت ہے، کیونکہ جس چیز کا علم مخفی رہتا ہے، وہ دلوں پر بوجھل ہوتی ہے۔ یا یہ مدعا کہ آسمان وزمین اس کی طاقت کے متحمل نہیں ہو سکتے، کیونکہ آسمان شق ہو جائیں گے، تارے تتر بتر اور دریا خشک ہو جائیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ بوجھل اس لیے ہے کہ اس میں ان کی فنا اور موت ہوگی، دلوں پر مرنا بھاری ہوتا ہے، ملائکہ اور ثقلین (انسان اور جن) سب ہی اس کی طرف سے کھٹکے میں پڑے ہیں، چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس کا علم حاصل ہو جائے۔ مخفی رہنا قیامت کے قائم ہونے کا شاق گزرتا ہے۔ سو بڑا گزرا کرے وہ تو یکا یک خلق کی غفلت کے وقت آ موجود ہوگی۔ اس بارے میں بہت سی صحیح حدیثیں آئی ہیں۔ ''حَفِيّ'' کے معنی اس جگہ عالم کے ہیں۔ اے نبی! آپ کہہ دیں کہ قیامت کا علم اللہ ہی کو ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے کہ کس لیے اللہ نے اس کو مخفی رکھا ہے۔[1]

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٨﴾

کہہ دیجیے: میں اپنی جان کے لیے نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا

[1] فتح البیان (٥/ ٩٢۔ ٩٤)

ہوتا تو بہت سی بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو ڈرانے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں، ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں (188)

رسول نفع ونقصان کا مالک ہے نہ مستقل عالم غیب ہی:

اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم اپنے سب کام ہمارے سپرد کر دو اور اپنے حال سے لوگوں کو یوں خبر دو کہ میں کسی غیب کو مستقل نہیں جانتا، نہ مجھ کو کسی شے پر غیب کی طرف سے کچھ اطلاع ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ﴾ [الجن: ٢٦] ''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی اگر میں جانتا کہ میں کب مروں گا تو عملِ صالح کرتا۔ اسی طرح ابن جریج رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے،[1] مگر اس قول میں نظر ہے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کا عمل دائمی تھا، ایک روایت میں آیا ہے: ((كَانَ إِذَا عَمِلَ عَمَلًا أَثْبَتَهُ))[2] ''جب آپ کوئی عمل کرتے تو اس کو مستقل مزاجی سے کرتے۔'' سو سارے اعمال نبی اکرم ﷺ کے ایک ہی طرز پر تھے، گویا سارے حالات میں نظر اللہ کی طرف رکھتے تھے۔ مگر یہ مراد ہو کہ دوسروں کو ہدایت اس عمل کے کرنے کی کریں۔ واللہ أعلم.

اس بارے میں سب سے اچھا قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے، یعنی اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سا مال جمع کر لیتا۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اگر کسی شے کو خریدتے وقت میں یہ جانتا کہ مجھ کو اس میں کیا نفع ہوگا تو میں کوئی شے بیع نہ کرتا، مگر اس میں نفع حاصل کرتا، مجھ کو محتاجی نہ لگتی۔[3] بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اگر میں غیب دان ہوتا تو قحط کے سال کے لیے پیداوار کے سال سے اور مہنگائی کے زمانے کے لیے ارزانی کے زمانے سے بندوبست کر لیتا اور شر سے اس کے واقع ہونے سے پہلے بچتا رہتا۔ معلوم ہوا کہ انبیا کو کسی طرح کا غیب کا علم نہیں ہوتا، نہ جزئی نہ کلی مگر اتنا ہی جو اللہ نے صاف صاف بتا دیا ہے، جیسے قیامت کی نشانیاں وغیرہ۔

بشیر ونذیر:

پھر یہ کہا کہ میں تو عذاب سے ڈرانے والا اور مومنوں کو خوش خبری سنانے والا ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ [مریم: ٩٧] ''یقیناً ہم نے تو اس (قرآن) کو آپ کی زبان (عربی) میں خوب آسان کر دیا ہے، تاکہ آپ اس سے متقین کو بشارت دیں اور اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو ڈرائیں۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٠٢)　[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٢٩) اس کی سند میں ''بشر بن عمارۃ'' ضعیف راوی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ نفع اور ضرر سے مراد ہدایت اور ضلالت ہے۔[1]
اس جملے میں اگلے مضمون کی تاکید ہے جو قیامت کے بارے میں علم نہ ہونے کے بارے میں تھا، اس لیے کہ جس کو نفع حاصل کرنے اور نقصان کو دور کرنے کی کچھ قدرت نہیں ہے، اس کو کب اس چیز کے علم پر قدرت ہوسکتی ہے، جس کا علم صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں کمال عبودیت کا اظہار ہے اور کمال عاجزی کا اقرار ہے، ان امور کے بارے میں جو بندے کے لائق نہیں ہیں۔

سو جب کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ضعف کا اعتراف کر رہے ہیں تو پھر یہ آیت اس شخص کے لیے ایک بہت بڑی سرزنش اور نصیحت ہے جو کسی ایسی شے کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کے لائق نہیں یا علمِ غیب کا دعویٰ کرتا ہے، علم نجوم یا رمل یا زجر یا کسی اور طریقے سے کرتا ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی میں ایک کمزور بندہ ہوں، اپنے لیے نفع اکٹھا کر لینے اور نقصان دور کرنے کا مالک نہیں، جیسا کہ ممالیک (مملوک) کا حال ہوتا ہے، مگر جو میرا مالک چاہے نفع دینے یا نقصان دور کرنے کے لیے۔[2] اس جگہ استثنا منقطع ہے، یہ عاجزی کے اظہار کے لیے بہت مؤثر طریقہ ہے۔

پھر اس مضمون کی اس طرح سے تاکید کی کہ اگر میں جنسِ غیب کو جانتا تو جو بات بھلائی کی ہوتی اس کو اپنے لیے حاصل کر لیتا اور جو بات بری ہوتی، اس سے دور رہتا، تاکہ وہ برائی مجھے نہ لگے۔ لیکن میں تو ایک بندہ ہوں، میں کیا جانوں کہ میرے لیے میرے رب کے نزدیک کیا ہے، اس نے میرے حق میں کیا حکم دیا ہے اور میرے لیے کون سا امر مقرر کیا ہے۔ جب اتنا بھی مجھے معلوم نہیں تو پھر اور کسی بات کا معلوم ہونا کیسا یا اگر میں جانتا کہ اللہ کا میرے ساتھ کیا ارادہ ہے تو قبل اس کے کہ اللہ مجھے جتائے تو میں وہی کام کرتا یا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لڑائی میں کب فتح مندی حاصل ہوگی تو میں لڑتا اور مغلوب نہ ہوتا۔ یا اگر میں غیب دان ہوتا تو ہر سوال کا جواب دیا کرتا، زیادہ بہتر یہ ہے کہ آیت کو عمومیت پر محمول کریں، تاکہ یہ سب امور اور جو ان کے سوا ہیں، وہ سب اس کے تحت داخل ہوں۔

﴿ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ﴾ ایک جداگانہ کلام ہے، یعنی جیسا کہ تم خیال کرتے ہو کہ مجھے جنون ہے سو وہ بات نہیں ہے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کو پہلے کلام کے ساتھ ملا ہوا رکھیں، یعنی اگر میں غیب جانتا تو مجھ کو کوئی برائی نہ چھوتی، ہر بدی سے بچتا رہتا۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا "أَيْ لَا يُصِيْبُنِي الْفَقْرُ"[3] "مجھے فقر نہ پہنچتا۔" میں تو ایک ڈرانے والا آگ سے کافروں کو اور مومنوں کو جنت کی خوش خبری سنانے ولا ہوں نہ کہ عالمِ غیب ہوں۔ رہی وہ غیب کی باتیں جن کی خبر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث میں دی ہے سو وہ معجزات کے قبیل سے ہیں نہ کہ علم الغیب کے باب سے۔ جس

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٠٢) [2] تفسير النسفي (٢/ ٥٠)

[3] یہ قول ابن جریج رحمہ اللہ کے بجائے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٢٩) اس کی سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔

نے یہ کہا کہ یہ بات نبیِ اکرم ﷺ نے تواضع اور ادب کے طور پر کہی ہے، وہ بہت دور گیا، بلکہ نبیِ اکرم ﷺ کا یہ قول دلی اعتقاد کے طور پر تھا، کیونکہ علمِ غیب کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہی خاص ہے۔

معجزات اس عموم سے خاص کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ [الجن: ۲۷] ''سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے۔''[1] جو کوئی اللہ کے سوا کسی اعلیٰ یا ادنیٰ مخلوق کے حق میں غیب دانی کا اعتقاد رکھتا ہے، وہ بے شبہہ مشرک ہے، گو کلمہ گو مسلمان ہو، اس لیے کہ ایمان کے ساتھ کبھی شرک بھی جمع ہو جاتا ہے، جس طرح خود قرآن پاک سے ثابت ہے: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۶] ''اور ان کے اکثر اللہ پر (اس طرح) ایمان لاتے ہیں کہ وہ مشرک ہی ہوتے ہیں۔'' بلکہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر مومنین مشرک ہوتے ہیں، اسلام کا دعویٰ کرنے والوں میں اہلِ توحید اور صاحبِ ایمان بہت کم نکلتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے تمھیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے، پھر جب اس (کسی مرد) نے بیوی سے صحبت کی تو اسے ہلکا سا حمل ہوگیا، تو وہ اسے لیے پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو ان دونوں نے اپنے رب، اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں تندرست بچہ دیا تو ہم ضرور (تیرے) شکر گزاروں میں سے ہوں گے (189) چناں چہ جب اللہ نے انھیں تندرست بچہ دیا تو انھوں نے اس (بچے) میں، جو اللہ نے انھیں دیا تھا، اس کے شریک ٹھہرا لیے، اللہ تو اس سے بہت اونچا ہے جو وہ شرک کرتے ہیں (190)

انسانیت کی اصل اور نسل:

موضح قرآن میں فرمایا ہے: بعضے کہتے ہیں کہ آدم اور حوا علیہما السلام پر یہ حال گزرا جو پہلا حمل ہوا۔ ابلیس ایک نیک مرد کی صورت میں آیا اور ڈرایا کہ تیرے پیٹ میں شاید کچھ بلا ہے، جب دونوں دعا کرنے لگے، تب یہ کہا کہ میرے

[1] فتح البیان (۵/ ۹۵۔۹۷)

دعا کرنے سے یہ بلا بدل کر بیٹا پیدا ہوگا، اس کا نام عبدالحارث رکھنا، حارث شیطان کا نام تھا، وہی کیا۔ اس قصے میں پیغمبروں سے شرک ثابت ہوتا ہے یا یہ قصہ غلط ہے۔ اس آیت میں مرد و عورت کا ذکر کیا ہے، آدم و حوا علیہما السلام کا نہیں، گو پہلے ان کا ذکر ہو چکا۔ یا یوں کہیے کہ جو کچھ انسانوں میں ہونا مقدر تھا، وہ آدم علیہ السلام میں اول ظہور پکڑ گیا، اس میں وہ نمونہ تقدیر تھے، اولاد کے گناہ ان میں نظر آئے، جیسے آئینے میں صورت۔ چنانچہ نفس کی خواہش اور اللہ کی بے حکمی اور کہہ کر بھول جانا اور دے کر منکر ہونا یہ سب اولاد کی عادتیں ان میں نظر آ چکیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ آگاہ کرتا ہے کہ اس نے سارے آدمیوں کو آدم علیہ السلام سے پیدا کیا ہے۔ آدم علیہ السلام سے ان کی زوجہ حوا کو بنایا، پھر آدم اور حوا سے سارے بشر پھیل گئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ [الحجرات: ١٣] ”اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔“

نیز اس آیت میں یوں کہا: ﴿ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ﴾ یعنی تاکہ اس بی بی کے پاس مالوف و ساکن ہو کر رہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ﴾ [الروم: ٢١] ”اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو، اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔“ سو کسی زوجین میں وہ الفت نہیں ہوتی جو میاں بیوی میں ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ کبھی جادوگر اپنے مکر و فریب سے مرد اور بیوی کے درمیان تفرقہ اور جدائی ڈال دیتا ہے۔ غشیان سے مراد وطی ہے۔

حملِ خفیف و استمرار:

حملِ خفیف سے مراد اول حمل ہے، عورت کچھ اس کا دکھ نہیں پاتی، کیونکہ وہ نطفہ ہوتا ہے، پھر علقہ، پھر مضغہ۔ مرور سے مراد استمرار ہے، یہی امام حسن، ابراہیم نخعی اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ میمون بن مہران نے کہا: ﴿ فَمَرَّتْ بِهٖ ﴾ کے معنی ہیں: ”اِسْتَخَفَّتْهُ“[1] ایوب نے حسن سے پوچھا: ﴿ فَمَرَّتْ بِهٖ ﴾ کے کیا معنی ہیں؟ کہا: اگر تو عربی مرد ہوتا تو پہچان جاتا، اس کے معنی ”اِسْتَمَرَّتْ بِهٖ“ کے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَمَرَّتْ بِهٖ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا حمل کھل گیا۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: ”اِسْتَمَرَّتْ بِالْمَآءِ قَامَتْ بِهٖ وَ قَعَدَتْ“ یعنی آبِ نطفہ کو کھڑے بیٹھے لیے پھرتیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”اِسْتَمَرَّتْ بِهٖ فَشَكَّتْ أَحَمَلَتْ أَمْ لَا“ یعنی ان کو یہ شک

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٣٢)

لگا رہا کہ اللہ جانے حمل ہے کہ نہیں۔ جب بوجھل ہوئیں تو جانا کہ ہاں حمل ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''أَثْقَلَتْ''
کے یہ معنی ہیں کہ بچہ پیٹ میں بڑا ہوا، تب یہ دعا کی کہ پورا بشر ہو۔

اولاد ہونے پر شرک کرنے کی تفسیر میں روایات و آثار اور ان کا محاکمہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ دونوں اس بات سے ڈرے کہ کہیں کوئی بہیمہ نہ ہو۔ ابو البختری اور ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ڈرے کہ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ انسان نہ ہو۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دعا کی کہ اگر تُو ہم کو بیٹا دے گا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے، جب اللہ نے بیٹا دیا تو اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگے۔[1] مفسرین نے اس جگہ بہت سے آثار و احادیث بیان کیے ہیں، ہم ان کو لا کر ان کا حال بیان کریں گے، پھر ان کے بعد اس بارے میں صحیح بات لکھیں گے۔

حسن نے سمرہ رضی اللہ عنہ سے، سمرہ رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جب حوا نے بچہ جنا، ابلیس ان کے گرد پھرا۔ حوا کا کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تھا۔ ابلیس نے کہا تو اس کا نام عبدالحارث رکھ، وہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے عبدالحارث رکھا تو وہ زندہ رہ گیا۔ یہ بات وحی و امرِ شیطان سے ہوئی تھی۔ (رواه الإمام أحمد في مسنده وهكذا رواه ابن جرير و رواه الترمذي في تفسير هذه الآية وقال: هذا حديث حسن غريب لا نعرفه إلا من حديث عمر بن إبراهيم و رواه بعضهم عن عبد الصمد ولم يعرفه) اس کو حاکم نے بھی اپنی مستدرک میں عبد الصمد سے مرفوعاً روایت کر کے کہا ہے: ''هذا حديث صحيح الأسناد ولم يخرجاه وكذا رواه ابن مردويه في تفسيره من حديث شاذ بن فياض مرفوعاً'' شاذ کا نام ہلال ہے، شاذ اس کا لقب ہے۔[2]

غرض یہ کہ یہ حدیث تین طرح سے معلول ہے: ایک یہ کہ اس کی سند میں عمر بن ابراہیم مصری ہے، ابن معین نے اس کو ثقہ کہا ہے، لیکن ابو حاتم رازی کہتے ہیں: ''لَا يُحْتَجُّ بِهِ'' ''وہ قابلِ حجت نہیں'' ہاں اس حدیث کو ابن مردویہ نے حدیث معتمر عن ابیہ عن الحسن عن سمرۃ مرفوعاً روایت کیا ہے۔ واللہ أعلم. دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث قول سمرہ سے مروی ہے، مرفوع نہیں، جس طرح ابن جریر نے کہا ہے: ''عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ، قَالَ: سَمّٰى آدَمُ ابْنَهُ عَبْدَ الْحَارِثِ''[3] تیسری وجہ یہ ہے کہ خود حسن نے اس آیت کی تفسیر اور طرح پر کی ہے۔ اگر ان کے پاس سمرہ سے مروی مرفوع حدیث موجود ہوتی تو کبھی اس سے اختلاف نہ کرتے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حسن رحمہ اللہ نے کہا: ''كَانَ هٰذَا فِيْ بَعْضِ أَهْلِ الْمِلَلِ وَلَمْ يَكُنْ بِآدَمَ'' معمر نے کہا: حسن کہتے ہیں اس قصے سے مراد ذریتِ آدم ہے اور وہ لوگ جنھوں نے آدم کے بعد شرک کیا۔

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٠٤۔ ٣٠٦)

[2] مسند أحمد (٥/ ١١) تفسير الطبري (١٣/ ٣٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩٤) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٤٢)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٣١٠)

حسن رحمہ اللہ کا تیسرا قول یہ ہے: "هُمُ الْيَهُودُ وَالنَّصَارىٰ رَزَقَهُمُ اللّٰهُ أَوْلَاداً فَهَوَّدُوْا أَوْ نَصَّرُوْا" [1] یہ اسانید تا حسن رحمہ اللہ صحیح و ثابت ہیں۔ انھوں نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے، یہ تفسیر سب سے بہترین تفسیر ہے۔ آیت کو اس پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، اگر حدیث مذکور ان کے نزدیک محفوظ ہوتی تو وہ اس کی مخالفت کیوں کرتے نہ وہ نہ کوئی اور۔ خصوصاً باوجود اس تقویٰ اور ورع کے۔ یہ بات اس پر دلیل ہے کہ وہ حدیث موقوف ہے۔ صحابہ پر یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حدیث مذکور کو مومنین اہلِ کتاب سے لیا ہو، جیسے کعب یا وہب بن منبہ وغیرہما۔ چنانچہ اس کا ذکر آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ، مگر ہم تو عہدۂ مرفوع سے بری ہو چکے ہیں۔ واللہ أعلم.

رہے آثار، سو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حوا آدم علیہ السلام کے لیے اولاد جنتیں، ان کو اللہ کا بندہ ٹھہراتیں، عبداللہ و عبیداللہ اور اس طرح کے نام رکھتیں، ان کو موت آ جاتی۔ ابلیس حوا اور آدم علیہما السلام کے پاس آیا، کہا: تم دونوں اگر بچے کا نام اس کے علاوہ رکھو جو تم رکھتے ہو تو وہ زندہ رہیں۔ حوا کے بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام عبدالحارث رکھا، اس پر یہ آیت اتری۔ [2] ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ شیطان نے آ کر ان دونوں سے یہ کہا کہ تم جانتے ہو کہ تمھارے کیا پیدا ہوگا یا کیا تمھیں معلوم ہے کہ کوئی چوپایہ ہے یا نہیں، ان دونوں کے لیے باطل کو رونق بخشی۔ شیطان کھلا گمراہ کرنے والا ہے، اس سے پہلے حوا دو بچے جن چکی تھیں، وہ دونوں مر چکے تھے۔ شیطان نے ان دونوں سے کہا کہ اگر تم میرے نام پر ان کا نام نہ رکھو گے تو وہ بچہ پورا پیدا نہ ہوگا اور مر جائے گا، جیسے پہلا بچہ مر گیا ہے۔ [3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ ابلیس نے آ کر ان سے کہا کہ میں تمھارا صاحب ہوں، میں نے تم کو جنت سے نکالا تھا، تاکہ تم میری اطاعت کرو، ورنہ پیٹ میں سینگ گاڑ کر پھاڑ ڈالوں گا، یہ کروں گا، وہ کروں گا، دونوں کو ڈراتا تھا، وہ نہ مانتے تھے، آخر بچہ پیدا ہوا، پھر جب تیسرا پیٹ رہا تو پھر آ کر وہی باتیں کیں، دونوں کو اولاد کی محبت نے پھانسا، اس کا نام عبدالحارث رکھا۔ [4] اس اثر کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت نے لیا ہے، جیسے امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ اور طبقہ ثانیہ سے قتادہ، سدی وغیرہ سلف اور ایک جماعت خلف نے۔ [5]

رہے مفسرینِ متاخرین سو وہ اتنی جماعتیں ہیں جن کا شمار ممکن نہیں، گویا اس اثر کی اصل اہلِ کتاب سے لی گئی ہے۔ واللہ أعلم. کیوں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو ابی بن کعب سے روایت کیا ہے: "كَمَا رَوَاهُ ابْنُ أَبِيْ حَاتِمٍ عَنْ مُجَاهِدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما عَنْ أُبَيِّ ابْنِ كَعْبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ لَمَّا حَمَلَتْ حَوَاءُ أَتَاهَا الشَّيْطٰنُ فَقَالَ لَهَا أَتُطِيْعِيْنِيْ وَيُسْلَمُ لَكِ وَلَدُكِ سَمِّيْهِ عَبْدُ الْحَارِثِ فَلَمْ تَفْعَلْ فَوَلَدَتْ فَمَاتَ ثُمَّ حَمَلَتْ فَقَالَ لَهَا مِثْلَ ذٰلِكَ فَلَمْ تَفْعَلْ ثُمَّ حَمَلَتِ الثَّالِثَةَ فَجَاءَهَا فَقَالَ إِنْ تُطِيْعِيْنِيْ يُسْلَمْ وَإِلَّا فَإِنَّهُ

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٣١٤۔ ٣١٥) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٣١٠) اس کی سند میں "داود بن حصین عن عکرمہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (١٣/ ٣١٠۔ ٣١١) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٣٤) اس کی سند میں "خصیف اور شریک" متکلم فیہ راوی ہیں۔ [5] تفسیر الطبري (٣١١۔ ٣١٤)

يَكُونُ بَهِيمَةً فَهَيَّبَهُمَا فَأَطَاعَا'' ان آثار پر یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آثار اہلِ کتاب سے ہیں اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب اہلِ کتاب تم سے کوئی بات کہیں تو تم ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، پھر اخبار اہلِ کتاب تین طرح پر ہیں: ایک وہ خبر جس کی صحت ہم کو کتاب وسنت کی دلیل سے معلوم ہوگئی ہے۔ دوسری وہ خبر جس کا جھوٹ قرآن وحدیث سے معلوم ہو چکا۔ تیسری وہ خبر جس پر سکوت اختیار کیا گیا ہے، اس کی روایت کرنے کی اجازت ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق: « حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ »[1] سو یہی وہ خبر ہے جس کی تصدیق یا تکذیب نہیں کی جاتی، اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں: « فَلَا تُصَدِّقُوهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ »[2]

رہی یہ بات کہ یہ خبر قسم ثانی میں سے ہے یا قسم ثالث میں سے تو اس میں نظر ہے، لیکن جس صحابی یا تابعی نے اس کو روایت کیا ہے، وہ اس کو قسم ثالث سے خیال کرتا ہے اور ہم تو حسن بصری رحمہ اللہ کے مذہب پر ہیں اس بارے میں، یعنی آیتِ شریفہ باب کے سیاق سے مراد آدم وحوا علیہما السلام نہیں، بلکہ آدم وحوا کی مشرک اولاد مراد ہے اور اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ اللہ برتر ہے ان کے شریک بتانے سے۔

آدم وحوا علیہما السلام کا ذکر جو پہلے آیا ہے وہ بعد میں آنے والے والدین کے لیے تمہید کے طور پر تھا، گویا یہ استطراداً ہے کہ ایک شخص کا ذکر کر کے اس کی جنس کی طرف چلے گئے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُومًا لِّلشَّيٰطِينِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴾ [الملك: ٥] ''اور البتہ یقیناً ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے، اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' یہ بات معلوم ہے کہ مصابیح یعنی نجوم جو آسمان کی زینت اور رونق ہیں، ان سے رمی نہیں کی جاتی، بلکہ یہ ایک استطراد ہے مصابیح سے اس کی جنس کی طرف۔ اس چیز کی بہت مثالیں قرآن پاک میں ہیں، والله أعلم.[3]

فتح البیان کا بیان:

اس آیتِ شریفہ کی تفسیر میں فتح البیان کا بیانِ فاتح یوں ہے کہ ﴿ خَلَقَكُمْ ﴾ سے اہلِ مکہ کو خطاب ہے، ﴿ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ سے آدم علیہ السلام مراد ہیں، جمہور مفسرین کا قول یہی ہے۔ یہ کلام اللہ کی نعمتوں کے ذکر پر متضمن ہے، جو اُس نے اپنے بندوں پر کی ہیں اور اس بات پر کہ انھوں نے ان نعمتوں کا بدلہ شکر اور اعترافِ عبودیت کے ساتھ نہ کیا اور اللہ کو متفرد بالوہیت نہ جانا۔ زوج سے مراد حوا علیہا السلام ہیں جو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں، ان کی موانست اور اطمینان کے لیے۔ کیونکہ جنس اپنی ہی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے اور سکون حاصل کرتی ہے۔ یہ معاملہ جنت میں ہوا تھا، اس کے بعد اس معاملے کا ذکر کیا جو دنیا میں گزرا۔

''تغشی'' وقاع (ہم بستری) سے کنایہ ہے۔ یہ کنایہ نہایت خوب ہے، اس لیے کہ غشیان مرد کے عورت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٧٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٤٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٠٠) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٦٤_٣٦٦)

کے پاس آنے کو کہتے ہیں۔ حوا کو جماع کے بعد حمل رہ گیا، ابتدا سے انتہا تک کچھ بوجھ معلوم نہ ہوا، جس طرح اور عورتوں کو بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ حملِ خفیف کا مطلب ہے، وہ اس حمل کے بعد بدستور چلتی پھرتی اٹھتی بیٹھتی تھیں، اپنا کام کاج کرتیں، کچھ محنت، مشقت، کلفت اور بوجھ نہ پاتیں، لیکن جب بچہ پیٹ میں بڑھا اور بوجھل ہوگئیں تو آدم و حوا علیہما السلام دونوں نے دعا مانگی کہ اگر ہم کو تو ولدِ صالح دے گا، یعنی بیٹا صحیح اعضا والا تو تیری اس نعمت کا شکر ادا کریں گے۔

اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ جو پیٹ کے اندر ہے وہ اسی جماع کا اثر ہے اور انھی کی جنس کی کوئی شے ہے جس سے ان کی نسل ثابت رہے گی، لیکن جب وہ بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ابلیس نے آ کر حوا سے کہا: اگر تیرے بچہ پیدا ہو تو اس کا نام میرے نام پر رکھنا، کہا: تیرا کیا نام ہے؟ کہا: حارث اور اگر اپنا اصلی نام بتا دیتا تو وہ پہچان جاتیں، انھوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا، یہ ان سے شرک ہوا، لیکن نام رکھنے میں نہ کہ عبادت میں، لیکن جب ان کا قصد یہ ٹھہرا تھا کہ یہ نام بچے کی نجات کا سبب ہوگا، اس لیے ان پر عتاب ہوا کہ مسبب سے قطع نظر کر کے سبب پر کیوں نگاہ ڈالی۔

یہ روایت صحابہ و تابعین کی ایک جماعت سے کئی طرق اور الفاظ سے مروی ہے۔ سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام حوا علیہا السلام نے کیا تھا نہ کہ آدم علیہ السلام نے۔ تثنیہ کا صیغہ کچھ اس مدعا کے منافی نہیں ہے، کیونکہ کلامِ عرب میں فعلِ واحد کی سند دو فاعل یا ایک جماعت کی طرف کافی استعمال ہوتی ہے، بلکہ خود قرآن پاک میں اس کی مثالیں موجود ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ﴾ [البقرة: ٣٧] ''پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمے سیکھ لیے۔''

پھر اسی سورت میں یوں کہا ہے: ﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ﴾ [الأعراف: ٢٣] ''انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ ظلم کیا۔'' یا فرمایا: ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٢٩] ''تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے)۔'' اور مراد فقط زوج ہے۔ (قالہ الفراء) یا کہا: ﴿ نَسِيَا حُوْتَهُمَا ﴾ [الكهف: ٦١] ''(تو) وہ اپنی مچھلی بھول گئے۔'' حالانکہ ﴿ نَسِيَا ﴾ (صیغۂ تثنیہ) سے مراد فقط یوشع تھے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام۔ یا فرمایا: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمان: ٢٢] ''ان دونوں سمندروں سے موتی اور مرجان (مونگے) نکلتے ہیں۔'' حالانکہ یہ فقط بحرِ نمکین سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ شیریں سے۔

نیز فرمایا: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنعام: ١٣٠] ''اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے؟'' حالانکہ رسول صرف انسانوں میں ہوئے ہیں نہ جنوں میں، لیکن اجتماعی خطاب کے سبب سے یہ ترکیب صحیح ٹھہری۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ ﴾ [ق: ٢٤]

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

''جہنم میں ڈال دو۔'' حالانکہ خطاب ایک کو ہے نہ کہ دو کو۔ حدیثِ مرفوع میں آیا ہے: ﴿إِذَا سَافَرْتُمَا أَذِّنَا﴾ [1] حالانکہ مراد ایک کے اذان دینے سے ہے نہ کہ دو سے۔ امرء القیس نے کہا ہے:

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حبيب و منزل

کلامِ شعرا میں ذکر لفظ خلیلی کا بصیغہ تثنیہ بہت آیا ہے، حالانکہ مراد ایک ہی ہوتا ہے، نہ دو۔ واواء دمشقی کہتے ہیں ع

بالله ربكما عواجا على سكنى دعا تباه لعل العتب يعطفه

اس بنیاد پر آیتِ شریفہ کے معنی یہ ہیں کہ بھلا سے مراد فقط حوا علیہا السلام ہیں نہ کہ آدم علیہ السلام۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ کتاب و سنت اور کلامِ عرب کا محاورہ اسی طرح پر مروج ہے تو یہ تاویل متعین رہے گی کہ اس سے مراد صرف حوا علیہا السلام کا ذکر کرنا ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے اس آیت کو مشکل سمجھا ہے، اس لیے کہ ظاہری نظم مبارک صریح طور پر آدم علیہ السلام سے شرک کا واقع ہونا ظاہر کرتا ہے، حالانکہ انبیا شرک سے معصوم ہوتے ہیں، پھر اس اشکال سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر ایک عالم اور مفسر ایک مذہب کی طرف گیا ہے، ان کے اقوال آیت کی تاویل میں انتہائی درجہ تک مختلف پائے گئے ہیں، یہاں تک کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس قصے کا انکار کیا ہے، جیسے فخر الدین رازی اور ابو السعود وغیرہم۔ [2] مفسرین کے اقوال فتح البیان میں مع جوابات مذکور ہیں۔ [3]

رہ گئی یہ بات کہ حوا علیہا السلام نے یہ کام آدم علیہ السلام کی اجازت سے کیا تھا، سو یہ دلیل کی محتاج ہے اور دلیل موجود نہیں ہے۔ بہر حال جو کچھ ہوا، وہ حوا علیہا السلام سے ہوا نہ کہ آدم علیہ السلام سے۔ اس صورت میں آیت پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اس جگہ جمہور مفسرین متقدمین اور متاخرین کو حیرانی ہوئی ہے۔ کیا موضح القرآن اور کیا فتح الرحمان اور کیا تفسیر ابن کثیر وغیرہم، یہ نکتۂ نفیسہ فقط صاحبِ فتح البیان ہی کے حصے میں مقدر تھا۔ [4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٣٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٨)

[2] تفسير الرازي (١٥/ ٧٠_ ٧١) تفسير أبي السعود (٣/ ٣٠٤_ ٣٠٥) [3] فتح البيان (٥/ ٩٧_ ١٠٣)

[4] نواب صاحب فاضل مفسر رحمہ اللہ کی دو باتیں محلِ نظر ہیں: ایک تو یہ کہ یہ کام حضرت حوا نے کیا نہ کہ حضرت آدم نے۔ لیکن اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ پہلے آدم و حوا کا ذکر ہے۔ لیکن اس کے بعد ان سے پیدا ہونے والی نسل کے جوڑے کا ذکر ہے جنھوں نے اس شرک کا ارتکاب کیا۔ "أحسن البیان" میں ''یعنی یہ نسلِ انسانی اس طرح بڑھی اور آگے چل کر جب ان میں سے ایک زوج، یعنی میاں بیوی نے ایک دوسرے سے قربت کی'' آگے اسی نسلِ انسانی کے کردار کا ذکر ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں ''یشرکون'' شرک کرنے والوں کا ذکر جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے۔ دوسری محلِ نظر بات نواب صاحب کا یہ قول ہے کہ اس نکتۂ نفیسہ کا بیان صاحبِ فتح البیان کے حصے میں مقدر تھا۔ اول تو نواب صاحب کا بیان کردہ ''نکتۂ نفیسہ'' ہی ایسا ہے جسے مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرے، یہ دعویٰ کہ ابن کثیر سمیت سبھی مفسرین کو ←

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾
وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَاِنْ
تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ
اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ
اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٩٤﴾
اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ
لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ قُلِ
ادْعُوْا شُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿١٩٥﴾ اِنَّ
وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ڮ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩٦﴾
وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٧﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ
يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿١٩٨﴾

کیا وہ ان کو (اللہ کے) شریک ٹھہراتے ہیں جو کوئی چیز بھی پیدا نہیں کرتے، جبکہ وہ تو خود پیدا کیے جاتے ہیں (191) اور وہ ان (مشرکین) کی مدد کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اپنی مدد ہی کر سکتے ہیں (192) اور اگر تم انھیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمھاری پیروی نہیں کریں گے۔ تمھارے لیے برابر ہے کہ تم انھیں (ہدایت کی طرف) بلاؤ یا خاموش ہو رہو (193) (اے مشرکو!) بے شک وہ لوگ، جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ تمھی جیسے بندے ہیں (اچھا تو) جب تم ان کو پکارو تو انھیں تمھاری پکار کا جواب دینا چاہیے اگر تم سچے ہو (194) (اے نبی! مشرکین سے پوچھیے) کیا ان کے (معبودوں کے) ایسے پاؤں ہیں کہ وہ ان سے چلتے ہوں؟ کیا ان کے ایسے ہاتھ ہیں کہ وہ ان سے پکڑتے ہوں؟ کیا ان کی ایسی آنکھیں ہیں کہ وہ ان سے دیکھتے ہوں؟ کیا ان کے ایسے کان ہیں کہ وہ ان سے سنتے ہوں؟ کہہ دیجیے: تم اپنے شریکوں کو بلاؤ، پھر تم

← اس آیت کی تفسیر میں حیرانی ہوئی ہے، صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر سب سے زیادہ صحیح اور اَولیٰ قول حسن بصری ہی کے قول کو قرار دیا ہے اور اس کے برعکس روایت کو تین وجوہ سے ضعیف کہا ہے۔ جیسا کہ خود نواب صاحب نے بھی ان کی اس رائے کو نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح منقول آثار کی بابت بھی کہا ہے: ”يظهر علي -والله أعلم- أنها من آثار أهل الكتاب“ اور جو مرفوع روایت مدارِ استدلال ہے، اس کے مرفوع ہونے کو تسلیم نہیں کیا ہے اور کہا: ”إلّا أننا برئنا من عهدة المرفوع -والله أعلم-“ (تفسير ابن كثير). [ص-ي]

میرے خلاف (جو چاہو) تدبیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو (پھر دیکھو وہ میرا کیا بگاڑتے ہیں؟)﴿195﴾ (کہہ دیجیے:) بے شک میرا کارساز تو اللہ ہی ہے جس نے یہ کتاب نازل کی اور وہی نیک لوگوں کی کارسازی کرتا ہے﴿196﴾ اور جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ تمھاری مدد کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ وہ اپنی مدد کر سکتے ہیں﴿197﴾ اور اگر تم انھیں ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ سن نہ پائیں گے، اور (اے نبی!) آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ (بظاہر) وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، حالاں کہ وہ نہیں دیکھتے﴿198﴾

مشرکوں کے خدا پیدا کر سکتے ہیں نہ نفع ونقصان کے مالک ہیں:

یہ اللہ کی طرف سے مشرکوں کا انکار ہے جو اللہ کے ہمراہ غیر اللہ کو پوجتے ہیں، جیسے انداد، اوثان اور بت کہ وہ سب اللہ کی مخلوق اور تربیت یافتہ اور بنائی ہوئی ہیں، کسی چیز کے نفع ونقصان اور مدد کرنے کے قابل نہیں ہیں، بلکہ جماد غیر متحرک ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں، ان سے تو ان کی عبادت کرنے والے زیادہ مکمل ہیں کہ آنکھ کان بطش (پکڑنے کی صلاحیت) رکھتے ہیں، اسی لیے یہ فرمایا کہ کیا تم ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہو جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ خود بنائے گئے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۚ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿73﴾ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [الحج: ۷۳۔ ۷۴] ''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، لہٰذا تم اسے غور سے سنو، بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے، اگرچہ وہ (سارے بھی) اس کے لیے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب ومطلوب (عابد ومعبود دونوں) کمزور ہیں۔ انھوں نے اللہ کی قدر (اس طرح) نہیں کی، جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے، بے شک اللہ بہت قوت والا، نہایت غالب ہے۔''

اللہ نے خبر دی کہ اگر مشرکوں کے تمام معبود اکٹھے ہو جائیں تو کیا مجال کہ ایک مکھی کو پیدا کر سکیں، بلکہ اگر مکھی ان کی کوئی شے لے بھاگے، جیسے تھوڑی سی کھانے کی چیز، تو وہ اتنی قدرت اور طاقت بھی تو نہیں رکھتے کہ اس کو چھڑا لیں۔ سو جس کی یہ صفت اور حالت ہے، وہ کیسے کسی کا معبود ہو سکتا ہے اور کسی کو رزق دے یا اس کی مدد کرے، اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ وہ کسی شے کے خالق نہیں ہیں، بلکہ خود مخلوق ومصنوع ہیں، جس طرح خلیل جلیل علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴾ [الصافات: ۹۵] ''کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنھیں تم خود تراشتے ہو؟''

پھر اللہ نے یہ کہا کہ وہ اپنے عابدوں کی مدد نہیں کر سکتے ہیں اور نہ اپنی جان کی، اگر ان کے ساتھ کوئی برائی سے پیش آئے۔ خلیل علیہ السلام کو دیکھو کہ انھوں نے اپنی قوم کے بت توڑ ڈالے، ان بتوں کی نہایت درجہ توہین کی،

جیسے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے: ﴿ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴾ [الصافات: ٩٣] ''پھر وہ انھیں دائیں ہاتھ سے مارتا ہوا متوجہ ہوا۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأنبیاء: ٥٨] ''چناں چہ اس نے ان کے بڑے (بت) کے سوا ان (سب) کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔''

عمرو بن جموح کا واقعہ:

معاذ بن عمرو بن الجموح و معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما دو نوجوان شخص تھے، جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں آئے تو وہ مسلمان ہو گئے۔ رات کو مشرکوں کے بتوں کو توڑتے، تلف کرتے، رانڈوں کو جلانے کے لیے دے دیتے تاکہ ان کی قوم عبرت پکڑے۔ عمرو بن جموح اپنی قوم کا سردار تھا، اس کا ایک بت تھا، جس کی وہ عبادت کرتا، خوش بو ملتا، یہ دونوں شخص رات کو جا کر اس کو اوندھا کر کے نجاست لگا آتے، عمرو بن جموح آ کر دیکھتا تو دھو کر خوش بو ملتا، اس کے پاس ایک تلوار رکھ کر جاتا کہ تُو اسی سے بدلہ لے، وہ دونوں پھر آ کر یہی کام کر جاتے، وہ پھر وہی کام کرتا، ایک بار اس کو مردار کتے کے پاس ڈال دیا، پھر ایک رسی سے باندھ کر ایک کنویں میں لٹکا دیا، عمرو بن جموح نے جب یہ حال دیکھا تو معلوم کیا کہ جس دین پر وہ ہے وہ دین باطل ہے ع

تاللّٰہ إن کنت إلٰھاً مستدن   لم تك والكلب جميعا في قرن

''اللہ کی قسم! اگر تو وہ معبود ہوتا جس کا قرب تلاش کیا جاتا ہے تو اور کتا ایک ساتھ نہ ہوتے۔''

پھر مسلمان ہو گیا، اچھا پکا مسلمان، یہاں تک کہ اُحد کے دن شہید ہوا[1] (رضي الله عنه وأرضاه وجعل جنة الفردوس مأواه)

بت کسی کی پکار نہیں سنتے:

پھر اللہ نے فرمایا کہ وہ بت پکارنے والے کی پکار کو نہیں سنتے، ان کے نزدیک داعی اور واحی برابر ہے، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴾ [مریم: ٤٢] ''اے میرے باپ! تو اس کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ تیرے کچھ کام آئے؟'' پھر اللہ نے کہا کہ وہ تو عبید ہیں، عابدین کی طرح کے، یعنی ان کی طرح مخلوق ہیں، بلکہ بشر تو ان سے اکمل ہیں کہ سنتے، دیکھتے اور ہاتھ سے پکڑتے تو ہیں، یہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

بتوں سے مدد لینے کی دعوتِ مبارزت:

پھر کہا تم ان سے کہہ دو کہ اچھا اپنے شرکا کو بلاؤ وہ ہم پر تمھاری مدد کریں، ہم کو ایک دم کی مہلت لینے نہ دو،

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٣٠٠ـ ٣٠١) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٦٧)

اپنی پوری کوشش کر گزرو، مجھے اللہ پاک کافی وافی ہے، وہ میرا ناصر ہے، مجھ کو اس پر تکیہ ہے، اسی کی پناہ ہے، وہی دنیا اور آخرت میں میرا اور بلکہ میرے بعد ہر صالح کا دوست دار ہے، وہی ولی ہے۔

یہ ویسی بات ہے کہ قومِ ہود نے ہود علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ﴾ [هود: ٥٤] ''ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے (دماغی) خرابی میں مبتلا کر دیا ہے۔'' اس پر ہود علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴾ [هود: ٥٤۔ ٥٦] ''بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ سوائے اللہ کے، چناں چہ تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کر لو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، (زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو، بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔''

یا جیسے خلیل جلیل علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴾ [الشعراء: ٧٥۔ ٧٨] ''کیا بھلا دیکھا تم نے جن کو تم پوجتے آرہے ہو؟ تم اور تمھارے اگلے باپ دادا؟ تو بلاشبہ وہ میرے دشمن ہیں، سوائے رب العالمین کے۔ جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔'' یا جس طرح انھوں نے اپنے باپ اور قوم سے فرمایا تھا: ﴿ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ ۝ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٢٦۔ ٢٨] ''بلاشبہ میں ان (بتوں) سے بری الذمہ ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ سوائے اس (اللہ) کے جس نے مجھے پیدا کیا، تو بے شک وہی جلد میری راہنمائی فرمائے گا۔ اور ابراہیم اسی (کلمۂ توحید) کو (اپنی اولاد میں) اپنے پیچھے ایک پائندہ و تابندہ بات بنا گئے، تاکہ وہ (اللہ کی طرف) رجوع کریں۔''

اس کے بعد جو آیت ہے وہ پہلی آیت کی تاکید مزید کرنے والی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ وہ بصیغہ خطاب تھے، اس جگہ صیغہ غیب ہے، اسی لیے یہ کہا کہ وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں نہ اپنی جان کی، تو اگر ان کو ہدایت کی طرف بلائے گا تو وہ نہ سنیں گے۔ وہ تیری طرف نگاہ کرتے ہیں، مگر کچھ سوجھتا نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا یُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِیْرٍ ﴾ [الفاطر: ١٤] ''اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن بھی لیں تو وہ تمھیں جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن وہ تمھارے (اس) شرک کا انکار کر دیں گے اور کوئی آپ کو خوب باخبر (اللہ) کے مانند خبر نہیں دے گا۔''

مطلب یہ ہوا کہ وہ تیرے سامنے ان آنکھوں سے آتے ہیں، گویا وہ دیکھ رہے ہیں اور حقیقت میں جمادات

کی طرح پر ہیں، اسی لیے ان کے ساتھ معاملہ اس چیز کی طرح کیا گیا ہے جو عقل نہ رکھتی ہو کہ صورت میں تو آدمی ہیں، مگر سیرت جماد کی سی رکھتے ہیں ؎

این کہ می بینی خلاف آدم اند نیستند آدم غلاف آدم اند

''یہ لوگ جن کو تُو بنی آدم کے خلاف دیکھتا ہے، درحقیقت یہ لوگ انسان نہیں ہیں، بلکہ انسان کا چربہ ہیں۔''

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مشرکین ہیں، یہی امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول بھی ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1] (وقاله قتادة)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ سوالیہ انداز ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کے لیے اختیار کیا گیا ہے، یعنی یہ اہلِ مکہ کہ کس طرح اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، جو نہ کسی شے کو پیدا کر سکے نہ نفع اور نقصان پر قدرت رکھے، بلکہ وہ بت اور شیاطین جن کو انھوں نے شریک قرار دیا ہے، وہ سب خود مخلوق ہیں، انھی کے ہاتھوں سے بنے ہیں، نہ اپنے پوجنے والوں کی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی جانوں کی، کیونکہ جو کوئی اپنی مدد سے عاجز ہے، وہ غیر کی مدد کرنے سے زیادہ عاجز ہوتا ہے۔

لفظ ﴿ تَدْعُوْهُمْ ﴾ میں مشرکین کو خطاب ہے یا بتوں کو یا مومنین کو، یعنی تمھارا ان کو پکارنا یا خاموش رہنا دونوں امر برابر ہیں، کیونکہ جن کو وہ پکارتے ہیں، وہ تمھاری طرح عاجز بندے ہیں، تم تو زندہ بھی ہو، بولتے، سنتے، چلتے اور دیکھتے ہو، اصنام اور اوثان تو ایسے بھی نہیں ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ملائکہ ہیں جن کو وہ پوجتے تھے،[2] مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

اصنام کو باوجود اس بات کے کہ وہ جمادات ہیں، لفظ عباد کے ساتھ تعبیر کیا کہ ان کے اعتقاد میں وہ عقل رکھنے والے لوگوں کی طرح تھے، پھر یہ فرمایا کہ اچھا ان کو پکارو، وہ تم کو جواب دیں، اگر سچے ہو، یعنی اس بات میں کہ ان کو نفع و نقصان پر قدرت حاصل ہے اور وہ معبود ہیں۔ پھر ان شرکا کے چلنے، پکڑنے، دیکھنے اور سننے کی طاقت کی نفی فرمائی۔ پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اچھا ان کو بلاؤ اور تم اپنا سارا مکر کر گزرو، ہمیں مہلت نہ دو، دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں۔ اس تحدی اور تعجیز (ان کی عاجزی) کے بعد اب کوئی بات باقی نہیں رہی۔

پھر اللہ پاک کا اپنے اور صالحین کے لیے ولی ہونا ثابت کیا اور شرکا کا عاجز ہونا ذکر فرمایا، پھر کہا: ان مشرکوں کی ہیئے کی پھوٹی ہیں (یعنی وہ بے وقوف ہیں)، ظاہر میں آنکھیں رکھتے ہیں، مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ یا اصنام کی آنکھیں ہیں، مگر وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے، اس لیے کہ بتوں کی آنکھیں جواہر وغیرہ سے بناتے تھے اور عام دیکھنے والوں کی طرح ان کی آنکھیں ٹھہراتے تھے۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٢٤۔ ٣٢٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٦٨) [2] تفسير البغوي (٣/ ٣١٥) [3] فتح البيان (٥/ ١٠٤۔ ١٠٨)

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

آپ (ان سے) درگزر کیجیے، اور نیک کام کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کیجیے ﴿199﴾ اور اگر آپ کو شیطان کا کوئی وسوسہ اُبھارے تو اللہ کی پناہ مانگیے، بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ﴿200﴾

درگزر کرنے، نیکی کا حکم دینے، جاہلوں سے منہ موڑنے اور شیطانی وسوسے کے وقت تعوذ کا حکم:

نیک کام کا کہتے رہیے اور جاہلوں سے پرے رہیے، لڑنے نہ لگیے، نہیں تو آپ بھی جاہلوں کی طرح ہو جائیں گے اور رحمان کے کام میں شیطان کا کام بھی شامل ہو گیا اور اگر ایک وقت شیطان جھڑپ کروا دے تو جب یاد آئے تو فوراً اللہ کی پناہ پکڑیے اور سنبھل جایئے، اپنے جہل میں نہ چلے جایئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو تجھ کو معاف ہوا ہے ان کے مالوں سے کھالے اور جو چیز وہ لائے ہیں تُو لے لے۔ یہ حکم براءت کے نزول سے پہلے تھا، پھر اس میں فرض صدقات کی تفصیل آ گئی اور ان کو بتا دی۔[1] (قاله السدي)

دوسرا قول یہ ہے کہ انفاق فضل کر، یعنی جو حاجت سے زیادہ ہو وہ خرچ کر دے۔[2] گویا مراد عفو سے اس جگہ فضل اور زیادت ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دس برس پر مشرکین سے عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا۔ پھر حکم دیا کہ ان پر سختی اور درشتی کرو۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی بات کو اختیار کیا ہے۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی لوگوں کے اخلاق و اعمال کی جاسوسی نہ کرو۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عفو اختیار کرو لوگوں کے اخلاق سے۔[4] دوسرا قول یہ ہے کہ "خُذْ مَا عُفِيَ لَكَ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ"[5] سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت لوگوں کے اخلاق کے بارے میں اتری ہے۔[6] (رواه البخاري) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس کے مثل آیا ہے۔[7] عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا تیسرا قول یہ ہے: "وَاللّٰهِ لَأَخُذَنَّهُ مِنْهُمْ مَا صَحِبْتُهُمْ"[8] یہ قول تمام اقوال سے زیادہ مشہور ہے۔

سفیان بن عیینہ عن ابی سے بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے جبریل! یہ کیا ہے؟ کہا: "إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَكَ أَنْ تَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَكَ، وَتُعْطِيَ مَنْ حَرَمَكَ، وَتَصِلَ مَنْ قَطَعَكَ" "بے شک اللہ نے آپ کو حکم

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۲۸) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱٦۳۸) اس کی سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۲۸۔ ۳۲۹) [4] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۲۷۔ ۳۲۸) [5] تفسیر الصنعاني (۲/ ۲٤۵)
[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤۳٦۷) [7] الدر المنثور (۳/ ٦۲۹) [8] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۳۰)

کیا کہ آپ معاف کر دیں، اس کو جو آپ پر ظلم کرے اور عطا کریں اس کو جو آپ کو محروم رکھے اور اُس سے ناتا ملائیں جو آپ سے قطع تعلق کرے۔“[1] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم نحوه وهذا مرسل على كل حال، وقد رُوي له شواهد من وجوه آخر، وقد رُوي مرفوعاً عن جابر و قيس بن سعد أسندهما ابن مردويه)

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے مل کر پہلے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ کو فضیلت والے اعمال کے بارے میں خبر دیں، فرمایا: اے عقبہ! صلہ رحم کر اُس سے جو قطع رحم کرے تجھ سے، دے اس کو جو محروم رکھے تجھ کو، درگزر کر اس سے جو ظلم کرے تجھ پر۔[2] (رواه أحمد والترمذي نحوه وقال حسن) لیکن اس حدیث کی سند میں علی بن یزید اور اس کا شیخ قاسم دونوں ضعیف ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرف بمعنی معروف ہے۔ عیینہ بن حصن بن حذیفہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ”يَا ابْنَ خَطَّابٍ، فَوَاللّٰهِ مَا تُعْطِيْنَا الْجَزْلَ، وَلَا تَحْكُمُ بَيْنَنَا بِالْعَدْلِ“ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو نہایت غصہ آیا، چاہا کہ کچھ سزا دیں، حر بن قیس نے کہا: اے امیر المومنین! اللہ نے اپنے نبیِ اکرم ﷺ کو حکم دیا ہے: ﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) سو یہ شخص جاہلین میں سے ہے۔ واللہ! جب یہ آیت پڑھی تو پھر عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ تجاوز نہ کیا، وہ کتاب اللہ کا حکم آنے پر رک جانے والے تھے۔[3] (رواه البخاري بطوله)

سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ کا گزر ایک کاروان پر ہوا جو شام کا تھا، اس میں ایک جرس تھا، انھوں نے کہا کہ جرس سے ممانعت آئی ہے، انھوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں، مگر وہ جلجل کبیر ہے، رہا یہ جرس سو اس کا کچھ ڈر نہیں ہے۔ سالم چپ ہو گئے، کہا: ﴿ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴾[4] (رواه ابن أبي حاتم) یہ قول بخاری کا کہ عرف سے مراد معروف ہے، امام عروہ بن زبیر، سدی، قتادہ، ابن جریر رحمہ اللہ وغیر واحد نے اس پر نص کی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں: ”أَوْلَيْتُهٗ مَعْرُوْفًا وَ عَارِفًا وَ عَارِفَةً“ یہ سب الفاظ بہ معنی معروف ہیں اللہ نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ تم ہمارے بندوں کو معروف کا حکم دو۔ اس میں ساری طاعات داخل ہیں۔ جاہلوں سے درگزر کرنے کو فرمایا۔

یہ آیت اگرچہ نبیِ اکرم ﷺ کو حکم ہے، مگر اس میں ساری خلق کے لیے ادب کی تعلیم ہے کہ جو کوئی تم پر ظلم و زیادتی کرے، تم اس کو برداشت کرو۔ یہ بات نہیں ہے کہ جو کوئی حق واجب اللہ کو نہ مانے، اس سے درگزر کرو یا کافر باللہ اور اللہ کی وحدانیت کو نہ ماننے والا ہو یا مسلمین سے لڑنے والا ہو، اس سے درگزر کرو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ اخلاق ہیں، اللہ نے ان کا حکم اپنے نبی کو دیا ہے۔[5] بعض حکما نے اس معنی کو دو بیت میں نظم کیا ہے ع

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٣٠) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٣٨) الدر المنثور (٣/ ٦٢٨) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] مسند أحمد (٤/ ١٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٠٦) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٣٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٦) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٣٩)

[5] تفسير الطبري (١٣/ ٣٣١_ ٣٣٢)

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِعُرْفٍ كَذَا أُمِرْتَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ
وَلِنْ فِيْ الْكَلَامِ لِكُلِّ الْأَنَامِ فَمُسْتَحْسِنٌ مِنْ ذَوِي الْجَاهِ لِيْنٌ

بعض علما نے کہا ہے کہ لوگ دو طرح کے ہیں: ایک محسن سو تو اس کا احسان لے، طاقت سے زیادہ اس کو تکلیف نہ دے اور نہ اُس کو زیادہ تنگ کر۔ دوسرا مُسی (برائی کرنے والا، تنگ کرنے والا) اس کو معروف کا حکم کر، اگر اپنی گمراہی پر جما رہے اور تیرا یہ کہنا نہ مانے اور اپنی جہالت پر ڈٹا رہے تو پھر اس سے اعراض کر، شاید یہ برتاؤ اس کے مکر و فریب کو پھیر دے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴾ [حمٓ السجدة: ۳۴۔ ۳۵] ”آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکا یک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو۔ اور یہ (خصلت) انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو۔“ مراد وصیت ہے۔

یہ تینوں آیتیں اعراف، مومنون اور سورت سجدہ میں ہیں، چوتھی جگہ نہیں ہیں۔ اللہ پاک نے ان آیات میں یہ ارشاد کیا ہے کہ گناہ گار کے ساتھ معاملہ امر بالمعروف کا چاہیے، یہ خصلت بہت اچھی ہے۔ اس سے اس کا تمرد (سرکشی) اللہ تعالیٰ کے اذن سے دور ہو جائے گا۔ پھر یہ ارشاد کیا کہ شیطان جن سے پناہ مانگو، کیونکہ اس کو تمھارا احسان نہیں روکتا، وہ بالکل تمھاری ہلاکت اور تباہی کے درپے رہتا ہے اور تمھارا اور تم سے پہلے تمھارے باپ کا دشمن ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر شیطان تم کو غصے میں لا کر جاہل سے درگزر کرنے سے روکے اور بدلہ لینے پر آمادہ کرے تو اللہ سے پناہ مانگو، وہ جاہل کے جہل کو سننے والا ہے اور تمھاری پناہ چاہنے کی دعا کو بھی سنتا ہے، اس پر کوئی شے مخفی نہیں ہے جو کچھ خلق میں ہوتا ہے وہ یا شیطانی وسوسہ یا ورغلانا ہو یا اللہ سے پناہ چاہنا ہو، اسے سب معلوم ہے۔[1]

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ خُذِ الْعَفْوَ ... الخ﴾ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ اے رب! غصے کا کیا علاج ہے؟ تب یہ آیت آئی: ﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ ... الخ﴾ (آیتِ باب)[2] دو آدمیوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک دوسرے کو گالی گلوچ کی تھی، ایک کو ان میں سے نہایت غصہ آیا، ناک خاک آلودہ کی، فرمایا: مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص وہ کلمہ کہے تو اس کا غصہ جاتا رہے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ» کسی نے اس شخص کو بتایا، وہ بولا مجھ کو جنون نہیں ہے۔[3] نزغ اصل میں فساد کو کہتے ہیں، خواہ غضب سے ہو یا اور طرح پر،

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۳۲۔ ۳۳۳)

[2] تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۳۳) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز ”ابن زید“ ضعیف راوی ہے۔

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱۰۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۱۰)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقُلْ لِعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ﴾ [بني إسرائيل: ٥٣] ''اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بات کہیں جو احسن ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے۔'' عیاذ کے معنی ہیں التجا کرنے اور شر سے پناہ مانگنے کے۔ ملاذ (پناہ گاہ) کا استعمال طلبِ خیر میں آتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کو جو یہ حکم دیا کہ تم عفو کیا کرو، یہ ایک طرح کی تیسیر (آسانی) ہے، جس کا حکم نبیِ اکرم ﷺ کیا کرتے تھے۔ صحیح میں آیا ہے: «يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا» [1] ''آسانی پیدا کرو، تنگی پیدا نہ کرو۔ خوش خبری دو اور نفرت نہ دو۔'' اس جگہ عفو سے مراد جھگڑا کرنے کی ضد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فاضل چیز اور وہ چیز جو بغیر محنت و مشقت کے حاصل ہو۔ اسے عفو کہتے ہیں ہر شے میں سہولت دینے کو، یعنی صدقہ لینے میں تشدد نہ کرو، یہ حکم زکات کے فرض ہونے سے پہلے تھا۔ عرف ہر وہ خصلت ہے جس کو عقل پسند کرے، نفس اس سے مطمئن ہو اور جس کو شارع علیہ السلام نے معروف فرمایا ہو۔ عطاء رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ''لا إله إلا الله'' کہنے کا حکم دو، [2] مگر اس کی عمومیت زیادہ بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ جب تو نے امر بالمعروف کے سلسلے میں حجت قائم کر دی اور انھوں نے وہ کام نہ کیا تو اب ان سے اعراض کر، لڑ جھگڑ مت۔ ان کی بے وقوفی کا بدلہ بے وقوفی سے نہ کر۔ کہتے ہیں کہ آیتِ سیف اس آیت کی ناسخ ہے۔ عطا اور ابن زید رحمہ اللہ نے یوں ہی کہا ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محکم ہے۔ [3] قیس بن سعد رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا: واللہ! میں ان میں سے حمزہ کے عوض ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا، تب جبریل علیہ السلام یہ آیت لائے۔ [4] (أخرجه ابن مردويه)

نزغ وسوسہ کو کہتے ہیں، اسی طرح نغز و نخس و نسغ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نزغ ادنیٰ حرکت ہے اور شیطان کی طرف سے ادنیٰ وسوسہ۔ [5] اصل نزغ فساد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بمعنی اغوا ہے، یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو فرمایا کہ جب تم شیطان کا وسوسہ پاؤ تو اس کے دور کرنے کے لیے اللہ سے پناہ طلب کرو۔ اللہ کی طرف التجا کرو، یہ بات بطورِ فرض اور تقدیر فرمائی ہے، ورنہ نبیِ اکرم ﷺ وسوسۂ شیطانی سے معصوم تھے۔ [6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٤) [2] تفسير البغوي (٣/ ٣١٦)
[3] فتح القدير (٢/ ٣٩٩) [4] الدر المنثور (٣/ ٦٢٨) [5] معاني القرآن (٢/ ٣٩٦) [6] فتح البيان (٥/ ١٠٨۔ ١٠٩)

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَيْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ ﴿٢٠٢﴾

بے شک جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آلیتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں، پھر وہ یکا یک سوجھ بوجھ والے ہو جاتے ہیں (201) اور ان کے بھائی (شیطان) انھیں گمراہی میں کھینچ لے جاتے ہیں اور وہ اس میں کوئی کمی نہیں کرتے (202)

وسوسہ کے وقت اہلِ تقویٰ کی بصیرت:

اللہ نے اہلِ تقویٰ کے حال کی خبر دی ہے کہ وہ امر کی اطاعت کرنے والے ہیں اور ممنوعہ چیزوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔ طَيْفٌ وَطَائِفٌ دونوں قراءتیں مشہور ہیں۔ حدیث میں بھی آئی ہیں، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور بعض نے فرق کیا ہے۔ کسی نے غضب کے ساتھ تفسیر کی ہے، کسی نے کہا ہے کہ شیطان کا صرع کے ساتھ چھو جانا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ گناہ کا قصد کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ گناہ کرنا ہے۔ تذکر سے مراد اللہ کے عذاب اور اس کے عطائے ثواب کو یاد کرنا ہے۔ اللہ کے وعدے اور وعید میں اس کو یاد کر کے توبہ اور رجوع الی اللہ اور اس کی پناہ چاہتے ہیں، جلد اس سے رجوع کرتے ہیں، سیدھے ہو جاتے ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی، اس کو طیف تھا، کہا: اللہ سے دعا کرو کہ مجھے شفا دے، فرمایا: اگر تُو چاہے تو میں دعا کروں، اللہ تجھ کو شفا دے گا اور اگر تُو چاہے تو صبر کر، تجھ پر کچھ حساب نہ ہوگا۔ اس نے کہا: میں صبر کروں گی، مجھ پر کچھ حساب نہ ہو۔[1] (رواه ابن مردويه و غير واحد من أهل السنن) مگر سنن کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھ کو مرگی آتی ہے، میں ننگی ہو جاتی ہوں، فرمایا: اگر تُو کہے تو دعا کروں کہ تجھ کو شفا ہو، اور اگر تُو صبر کرے گی تو تجھ کو جنت ملے گی۔ اس نے کہا: "بَلْ أَصْبِرُ وَلِيَ الْجَنَّةُ"، لیکن آپ یہ دعا کریں کہ میں ننگی نہ ہوا کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا کی، پھر وہ ننگی نہ ہوتی تھی۔[2] (وأخرجه الحاكم وقال: صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه)

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ترجمہ عمرو بن جامع کے ذیل میں لکھا ہے کہ ایک جوان مسجد میں

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٤٤١) صحيح ابن حبان (٧/ ١٦٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٥٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣٥٣) مستدرك الحاكم (٤/ ٢٤٣)

عبادت کیا کرتا تھا، ایک عورت نے اس پر فریفتہ ہو کر اس کو اپنے نفس کی طرف بلایا، اس کے پیچھے پڑی رہی، یہاں تک کہ قریب تھا کہ وہ اس کے گھر میں جائے، اس کو یہ آیت یاد آئی، بے ہوش ہو کر گر پڑا، ہوش میں آ کر اس آیت کو یاد کیا، مر گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر اس کے باپ سے تعزیت کی، رات کو دفن کیا، اس کی قبر پر ساتھیوں کے ساتھ آ کر نماز پڑھی، پکار کر کہا: اے جوان: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمن: ٤٦] ”اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، اس کے لیے دو باغ ہیں۔“ اس نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر! اللہ نے مجھ کو دو جنتیں دی ہیں۔[1]

گمراہی میں اخوان الشیاطین کا معاونت کرنا:

اخوان الشیاطین سے اس جگہ مراد انسان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٧] ”بے شک فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں۔“ یہ اخوان وہ لوگ ہیں جو شیطان کے تابع ہوتے ہیں، شیطانوں کی حکم برداری کرتے ہیں۔ گناہوں میں ان کے مساعد اور مددگار ہیں، گناہوں کو آسان اور خوب کر کے دکھلاتے ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مد بمعنی زیادت ہے، یعنی جہالت اور بے وقوفی میں ان کو بڑھاتے ہیں۔[2] اسی طرح شیطان انسانوں کے مددگار ہیں، کچھ کوتاہی ان کے اعمال میں نہیں کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نہ انسان اپنے عمل میں کمی کرتے ہیں اور نہ شیطان اُن سے باز رہتے ہیں۔[3]

دوسرا قول یہ ہے کہ جن انسانوں میں اولیا کی طرف وحی کرتے ہیں، پھر کمی نہیں کرتے۔[4] یہی امام سدی رحمہ اللہ وغیرہ کا قول بھی ہے،[5] یعنی جو لوگ شیطانوں کے دوست دار ہیں، شیطان اُن کی امداد سے نہیں تھکتے، اُن کو شر میں اغوا کیا کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ ان کی طبیعت ہے۔ یہ خصلت ان سے نہیں جاتی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴾ [مريم: ٨٣] ”کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے کافروں پر شیطان چھوڑ رکھے ہیں، وہ جو انھیں خوب خوب (گناہوں پر) اُبھارتے ہیں؟۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ ”تُزْعِجُهُمْ إِلَى الْمَعَاصِيْ إِزْعَاجاً“، یعنی معاصی کی طرف پھیر پھار کر لاتے رہتے ہیں۔[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے کہا کہ اہلِ تقویٰ کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ کے حکم کو یاد کر کے اللہ کی پناہ طلب کرتے رہتے ہیں اور اُس سے التجا کرتے رہتے ہیں، جب کہ شیطان ان کو ذرا سا بھی چھیڑتا ہے۔ وسوسہ وجنون وغضب

---

[1] تاریخ دمشق (٤٥/ ٤٥٠) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٣٨۔ ٣٣٩) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٧١)

[3] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٣٨) [4] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٣٨) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[5] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٣٨) [6] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٧١)

کو طیف بولتے ہیں، اس لیے کہ وہ شیطان کا لمہ ہے، لمہ خیال کے مشابہ پہلی آیت میں نزغ فرمایا ہے، وہ طیف سے ہلکا تھا، کیوں کہ شیطان کی حالت انبیا کے ساتھ دوسروں کی نسبت زیادہ کمزور ہوتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ آدمی ہے جو گناہ پر جھکتا ہے، پھر اللہ کو یاد کر کے اس گناہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خطا سرزد ہو جانے کے مقامات کو غور وفکر اور نصیحت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

اخوان الشیاطین سے مراد فجار لوگ ہیں، مطلب یہ کہ شیطان گمراہی میں انسان کی مدد کیا کرتے ہیں۔ یہی جمہور نے قول کا مطلب لیا ہے۔ اسی پر عام مفسرین ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جو شیاطین جاہلین یا غیر متقین کے بھائی ہیں وہ جاہلین یا غیر متقین کی مدد کرتے ہیں، ان کی گمراہی کو بڑھاتے ہیں۔ یہ تفسیر امام قتادہ رحمہ اللہ نے کی ہے۔[1] یا یہ معنی کہ گمراہی میں یعنی جہالت میں شیطانوں کے بھائی ہیں، بخلاف اس اخوت کے جو اللہ کے لیے ہوتی ہے کہ اس میں مدد اطاعت پر کی جاتی ہے۔ اِقصار کسی شے سے باز رہنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ شیطان کافروں کو گمراہی کی طرف کھینچنے میں کوتاہی نہیں کرتے اور نہ گمراہی سے باز رہتے ہیں اور نہ کافر نصیحت پکڑ کر باز رہتا ہے۔[2]

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۲۰۳

اور (اے نبی!) جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے تو وہ کہتے ہیں: تم خود کیوں نہیں بنا لائے؟ کہہ دیجیے: میں تو صرف اس چیز کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ تمھارے رب کی طرف سے روشن دلائل ہیں، اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں (203)

مشرکوں کا نشانیاں طلب کرنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اجتباء سے مراد اس جگہ تلقی ہے، دوسری دفعہ کہا: مراد احداث و انشا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تو نے اپنے جی سے کچھ کیوں نہ نکالا؟ یہی امام قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تُو نے ان کو کیوں نہ لیا۔ آسمان سے لے کر آتا۔[3]

آیت سے یہاں مراد معجزہ و خارق (خلافِ معمول) ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٤] ''اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اُتار دیں،

[1] اللباب في علوم الكتاب (٩/ ٤٣٥) [2] فتح البيان (٥/ ١٠٠۔ ١١١) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤١۔ ٣٤٣)

پھر اس کے آگے ان کی گردنیں جھکی ہی رہ جائیں۔'' غرض کہ رسول سے یہ بات کہتے ہیں کہ تم اپنی جانوں کو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی مشقت طلب آیات میں نہ ڈالو۔ اس بنیاد پر کہ ہم ان کو دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ اللہ نے اس بات کا جواب یہ دیا ہے کہ میں تو کسی شے میں اللہ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ اُس کا جو حکم آتا ہے اس کو بجا لاتا ہوں، اگر کوئی نشانی آئے تو قبول کرتا ہوں، اگر نہ آئے تو ابتداءً اپنی طرف سے سوال نہیں کرتا، مگر اسی صورت میں کہ خود وہ مجھے اجازت دے، کیونکہ وہ حکمت والا اور علم رکھنے والا ہے، پھر یہ فرمایا کہ یہ قرآن بہت بڑا معجزہ اور سب دلیلوں سے بیّن دلیل اور سب حجتوں اور دلیلوں میں سب سے سچی ہے، اسی لیے اس پر الفاظ بصائر و ہدی اور رحمت کے الفاظ کا اطلاق کیا ہے۔

بصیرت، ہدایت اور رحمت تین درجے:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اہلِ مکہ کو جب کوئی نشانی ان کی فرمایش کے مطابق آتی تو کہتے کہ تم نے خود اپنی طرف سے کیوں نہ بنائی، اللہ نے اس کا جواب یہ سکھلایا کہ تم یوں کہو کہ میں تو وحی کا تابع ہوں، یہ قرآن مومنوں کے لیے بصیرت و ہدایت اور رحمت ہے، لوگوں کے علم کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں، کوئی علمِ توحید میں وہاں تک پہنچا کہ مشاہد کے مثل ہو گیا، یہ لوگ عین الیقین والے ہیں۔ کوئی درجہ استدلال ونظر تک پہنچا، یہ علم الیقین والے ہیں، کوئی صرف مسلمان تسلیم کرنے والا ہے، یہ عام مومنین اصحاب الیقین ہیں۔ سو قرآن پہلے فریق کے لیے بصائر ہے، درمیانے درجے کے لوگوں، یعنی استدلال کرنے والوں کے لیے ہدایت اور عام مومنین کے لیے رحمت ہے۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن شریف کا بصائرِ قلوب کی منزل پر ہونا سب کی نسبت سے متحقق ہے، قرآن ہی سے سب پر حجت قائم ہوتی ہے۔ اس کا ہدایت اور رحمت ہونا خاص مومنین کے لیے ہے، اس لیے کہ یہی لوگ اس کے انوار کو لینے والے اور اس کے آثار کو حاصل کرنے والے ہوتے ہیں۔[1]

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے (کان لگا کر) سنو اور خاموش رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے (204)

خاموشی اور توجہ سے قرآن سننے کا حکم:

یعنی جب کوئی قرآن پڑھے تو اوروں پر واجب ہے کہ باتیں نہ کریں، دھیان سے سنیں، شاید دل میں ہدایت پڑے، لیکن پڑھنے والا باتوں کی مجلس میں پکار کر پڑھنے لگے تو اس کی خطا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ذکر کیا کہ قرآن بصائر و ہدایت و رحمت ہے تو اب یہ حکم دیا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی عظمت

[1] تفسير أبي السعود (٣/ ٣٠٩) فتح البيان (٥/ ١١٢۔ ١١٣)

اور احترام کی خاطر اس وقت سب لوگ خاموش رہیں، جس طرح قریش کرتے تھے، وہ کام نہ کرے، کیونکہ ان مشرکوں کا یہ قول تھا: ﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ [حمٓ السجدة: ٢٦] ''تم اس قرآن کو مت سنو، اور (جب پڑھا جائے تو) شور وغل کرو، تاکہ تم غالب آ جاؤ۔'' لیکن یہ خاموشی فرض نماز کی حالت میں جب کہ امام اونچی آواز سے پڑھے، زیادہ موکد (تاکید کی گئی) ہے، جس طرح صحیح مسلم میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ امام اس لیے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ پڑھے تو تم چپ رہو۔[1] (وكذا رواه أهل السنن من حديث أبي هريرة أيضاً و صححه مسلم بن الحجاج أيضاً ولم يخرجه في كتابه)

ابراہیم بن مسلم ہجری نے ابو عیاض سے، ابو عیاض نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لوگ نماز میں باتیں کیا کرتے تھے، جب یہ آیت اتری اور دوسری آیت تو خاموش رہنے کا حکم ہوا۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارا یہ حال تھا کہ بعض ہمارے بعض پر نماز میں سلام کرتے، پھر قرآن یعنی آیتِ باب نازل ہوئی۔[3] (رواه ابن جرير) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک دن نماز پڑھی، کچھ لوگوں کو سنا کہ امام کی قراءت کے ساتھ قراءت کرتے ہیں، جب نماز پڑھ کر پھرے تو کہا: ''أَمَا إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَفْهَمُوْا أَمَا إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَعْقِلُوْا؟'' کیا ابھی تم کو وہ وقت نہیں آیا کہ تم سمجھو بوجھو، جب قرآن پڑھا جائے تو چپکے سے اس کو سنو، جس طرح کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔[4] (رواه ابن جرير) امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک انصاری جوان کے بارے میں اتری ہے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے تو وہ بھی پڑھتا۔[5]

نماز میں قراءت کا مسئلہ:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نماز پڑھ کر پھرے، اس میں اونچی آواز کی قراءت کی تھی۔ فرمایا: تم میں سے کسی نے اس وقت میرے ساتھ قراءت کی ہے؟ ایک مرد نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! فرمایا: جب ہی میں یوں کہتا ہوں، مجھ کو کیا ہو گیا ہے جو میں قرآن میں الجھتا ہوں۔ تب سے لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونچی آواز میں قراءت کرنے سے رک گئے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہر سے قراءت فرماتے تھے، جب سے انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سنی۔ (رواه أحمد و أهل السنن) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔[6] (وصححه أبو حاتم الرازي)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٠٣۔ ٦٠٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٣٠، ٩٢١)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٥) اس کی سند میں ''ابراہیم ہجری'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ میتب بن رافع رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٦) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٤٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٦) یہ روایت مرسل ہے۔

[6] مسند أحمد (٢/ ٣٠١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٩١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٤٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٣٦)

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام کے پیچھے جس نماز میں وہ اونچی آواز سے پڑھے، قراءت نہ کرے، ان کو امام کی قراءت کفایت کرتی ہے، اگرچہ وہ امام کی آواز کو نہ سنیں۔ ہاں جس میں امام جہر نہیں کرتا، اس میں چپکے سے اپنے جی میں قراءت کریں۔ کسی کو مناسب نہیں کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں اس کے ساتھ ساتھ آہستہ یا اونچی آواز میں کچھ پڑھے، کیونکہ اللہ نے کہا ہے: ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ... الخ﴾[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک گروہِ علما کا مذہب ہے کہ مقتدی پر جہری نماز میں قراءت کرنا واجب نہیں ہے جس میں امام اونچی آواز سے پڑھے نہ فاتحہ اور نہ فاتحہ کے علاوہ۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم قول اور امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے۔ ایک روایت امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یوں ہی آئی ہے، پہلے دی گئی دلیلوں سے۔ قولِ جدید میں یوں ہے کہ امام کے سکتات میں فاتحہ پڑھے، یہی قول ایک گروہِ صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد والوں کا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مقتدی پر قراءت کرنا واجب نہیں ہے، قراءت کرنا اصلاً نہ سری نماز میں، نہ جہری میں۔ اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے: «مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقِرَاءَتُهُ قِرَاءَةٌ لَهُ» اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور یہ حدیث موطا میں بطریق وہب بن کیسان جابر سے موقوفاً آئی ہے،[2] یہی زیادہ صحیح بھی ہے، یہ مسئلہ غیر اس مقام میں مبسوط ہے، امام ابوعبداللہ بخاری نے ایک مصنف علاحدہ اس بارے میں لکھا ہے، وجوبِ قراءت کو امام کے پیچھے سری اور جہری نماز میں اختیار کیا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سنو اور چپ رہو، یعنی فرض نماز میں۔[3] یہی بات عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، عبید بن عمیر و عطا بن ابی رباح رحمہما اللہ باہم باتیں کرتے تھے، قاص یعنی واعظ وعظ کہتا تھا، طلحہ بن عبیداللہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تم ذکر نہیں سنتے، مستوجب موعود ہوتے ہو، وہ طلحہ کی طرف نظر کر کے پھر باتیں کرنے لگے، طلحہ نے پھر وہی کہا، پھر دیکھ کر باتیں شروع کیں، پھر کہا تو تیسری بار نظر کر کے یہ جواب دیا: "إِنَّمَا ذَلِكَ فِي الصَّلَاةِ"[4] (رواہ ابن جریر) یعنی خاموشی قرآن کو سننے کے وقت نماز میں ہوتی ہے نہ نماز سے باہر، اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نماز میں ہے۔ دوسرے الفاظ امام مجاہد رحمہ اللہ کے یہ ہیں کہ کچھ ڈر نہیں، اگر کوئی شخص نماز کے علاوہ بات کرے۔ یہی امام سعید بن جبیر، ضحاک، نخعی، قتادہ، شعبی، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ کا قول ہے کہ اس آیت سے مراد حالتِ نماز ہے۔[5] تیسرا قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ یوم الجمعہ میں ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "فِي الصَّلَاةِ وَعِنْدَ الذِّكْرِ" سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چپ رہنا اضحیٰ و فطر

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٥٠)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٠) مسند أحمد (٣/ ٣٣٩) الموطأ (١/ ٨٤) اس کی سند میں "جابر جعفی" ضعیف راوی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام طرق معلول ہیں۔ (التلخيص الحبير: ١/ ٢٣٢)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٩) اس کی سند حسن ہے۔ [4] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٦) [5] تفسير الطبري (٣٤٧_ ٣٤٩)

اور جمعے کے دن اور اس نماز میں ہے جس میں امام پکار کر پڑھے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، کہا: مراد انصات سے خاموشی ہے، نماز و خطبہ میں جس طرح کہ حکم چپ رہنے کا امام کے پیچھے اور خطبے کے دوران میں آیا ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ اس بات کو مکروہ جانتے تھے کہ جب امام کا گزر کسی آیتِ خوف یا آیتِ رحمت پر ہو تو کوئی اس کے پیچھے کچھ کہے، بلکہ خاموش رہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تُو قرآن کے پاس بیٹھے تو اس کے لیے خاموش رہ۔[3] امام حسن رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی ایک آیتِ کتاب اللہ پر کان رکھے، اس کے لیے حسنہ مضاعفہ (کئی گنا نیکیاں) لکھا جاتا ہے اور جس نے اس آیت کی تلاوت کی، اس کے لیے قیامت کے دن نور ہوگا۔[4] (رواه أحمد و تفرد به)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ابو البقا نے کہا کہ ضمیر ﴿فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ﴾ اللہ کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی ''لِاَجْلِهٖ''، مگر اس میں بُعد ہے، ظاہر یہ ہے کہ ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ حکم نماز کے وقت کے لیے خاص ہے، جب امام قراءت کرے، لیکن لفظ اس سے زیادہ تر گنجایش رکھتے ہیں۔ عام کا اقتصار سبب پر نہیں ہوتا تو پھر استماع اور انصات (غور سے سننا اور خاموش رہنا) قراءتِ قرآن کے وقت ہر حال میں اور ہر صفت پر سننے والے پر واجب ہوگا۔ کسی نے کہا کہ یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے ساتھ خاص ہے، مگر اس کی کوئی وجہ نہیں۔ ظاہر وجوب کا حکم ہے۔ یہی امام حسن اور اہلِ ظاہر کا قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ندب و استحباب ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں آواز بلند کرتے تھے۔[5] دوسری روایت یہ ہے کہ اپنے کام کاج کی باتیں کرتے تھے، اس پر سکوت کا حکم ہوا۔ جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔[6] (كما في المعالم والكشاف وأنوار التنزيل و حاشية الكمالين وغيرها) امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کفار کو خطاب ہے، جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر حجت قائم کرنے کے لیے قرآن پڑھیں اور اس کو اپنی نبوت کی صداقت پر معجزہ ٹھہرائیں تو خاموش رہنا اس بنا پر واجب ہے کہ دشمنوں کی ساری حجت اس آیت کے ساتھ ہر طرح سے ختم ہو جاتی ہے۔ پھر کئی وجوہ سے آیت کو اسی مدعا پر محمول کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ اگر ہم اس آیت کو مقتدی پر قراءتِ خلف امام کی ممانعت پر محمول کریں تو تمام نظم خراب ہو جائے گا اور ترتیب بگڑ جائے گی۔[7]

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٥١۔ ٣٥٢) [2] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٤٧)

[4] مسند أحمد (٢/ ٣٤١۔ تفسير ابن كثير (٢/ ٣٧٢۔ ٣٧٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ٢١٥)

[5] تفسير الطبري (١٣/ ٣٤٦۔ ٣٤٧) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عامر اسلمی'' ضعیف راوی ہے۔

[6] تفسير البغوي (٣/ ٣١٨۔ ٣١٩) الكشاف (٢/ ١٨١) تفسير البيضاوي (٣/ ٨٦) [7] تفسير الرازي (١٥/ ٨٥)

اس سے ثابت ہوا کہ معنی مذکور پر اس کو محمول کرنا زیادہ درست ہے۔ اس آیت میں حالتِ نماز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ قاضی نے اشارہ کیا ہے کہ ان کا اس آیت سے حجت پکڑنا ضعیف ہے۔ قاضی کے بعض ساتھیوں نے کہا ہے کہ یہ خیال مردود ہے، صحیحین کی اس حدیث کی روشنی میں: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»[1] حدیث کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ لَمْ يَقْرَءْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»[2] (رواه الدارقطني وقال: إسناده صحيح و صححه ابن القطان) اس حدیث کا ایک شاہد ہے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی لفظ مذکور سے مرفوعاً مروی ہے جس کو ابن خزیمہ اور ابن حبان وغیرہما نے روایت کیا ہے۔[3] احمد کے الفاظ یہ ہیں: «لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ لَا يُقْرَأُ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ»[4] اس بارے میں اور بہت سی حدیثیں آئی ہیں، سب اس بات پر دلیل ہیں کہ سورت فاتحہ کا ہر رکعتِ نماز میں پڑھنا متعین ہے۔ یہی امام مالک، شافعی اور جمہور علما رحمہم اللہ کا مذہب ہے تابعین ومن بعدھم سے۔ گویا حدیث اس پر دال ہے کہ سورت فاتحہ نماز کی شرطوں سے اور صحتِ نماز سے ہے نہ کہ صرف واجباتِ نماز سے۔ حنفیہ کے نزدیک واجب یہ ہے کہ آیتِ قرآن ہو۔

اس مسئلے کی تمام بحث فتح البیان میں مخالفین کے جوابات کے ساتھ مرقوم ہے۔ اس کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قراءتِ خلف الامام میں سری و جہری نماز میں اختلاف ہے، لیکن سنتِ مطہرہ میں سورت فاتحہ کو امام کے پیچھے پڑھنے کا حکم آیا ہے۔ احادیثِ مذکورہ صحیحین وغیرہما میں مروی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیتِ باب سورت فاتحہ کے علاوہ کے بارے میں آئی ہے، یہ حکم ہم کو اسی نے دیا ہے جو ہمارے پاس قرآن لایا ہے۔ سو جب اللہ کی نہر آ گئی تو معقل کی نہر باطل ٹھہری، یعنی نقلِ ثابت کے آگے عقلِ ناقص کا کیا کام ہے؟! جو سنت سے ثابت ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے، وہی ٹھیک ہے، آخر اس آیت کو بھی تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے پڑھتے تھے۔[5] واللہ أعلم بالصواب.

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿٢٠٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ۩ ﴿٢٠٦﴾

اور (اے نبی!) اپنے رب کو صبح اور شام اپنے دل میں یاد کیجیے، عاجزی سے اور ڈرتے ہوئے پست اور ہلکی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)
[2] سنن الدارقطني (١/ ٣٢١) امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔
[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٤٨) صحيح ابن حبان (٥/ ٩١) اس کی سند صحیح ہے۔
[4] مسند أحمد (٥/ ٧٨) اس میں ایک راوی مجہول ہے، اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[5] فتح البيان (٥/ ١١٣ـ ١٢١)

آواز سے۔ اور آپ غافلوں میں (شامل) نہ ہوں ﴿205﴾ بے شک جو (فرشتے) آپ کے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، وہ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اسی کو وہ سجدہ کرتے ہیں ﴿206﴾

صبح شام دل میں گڑ گڑاتے ہوئے اللہ کا ذکر کرنے کا حکم:

یعنی مقرب فرشتے بھی اس کی یاد سے غافل نہیں تو انسان کے لیے تو اور بھی ضروری ہے کہ اس کے سوا اور کسی کو سجدہ نہ کرے۔ اس جگہ پر سجدہ آتا ہے، سب قرآن میں پندرہ جگہ سجدہ ضروری ہے، سب کا ایک ہی حکم ہے۔ حنفی مذہب میں واجب اور شافعی مذہب میں سنت ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اپنے امر کا ذکر دن کے اول و آخر میں بہت فرمایا کرتا ہے، جس طرح کہ ان دو آیتوں میں فرمایا ہے: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾ [قٓ: ٣٩] ”اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں، طلوعِ آفتاب سے پہلے اور غروبِ آفتاب سے پہلے۔“ یہ حکم شبِ معراج میں نماز پنج گانہ کے فرض ہونے سے پہلے تھا، کیونکہ یہ آیت مکی ہے۔

غدو اول نہار کو کہتے ہیں، آصال اصیل کی جمع ہے، اصیل آخر نہار کو کہتے ہیں۔ اللہ کا یہ ذکر دل میں تضرع و رغبت کے ساتھ چاہیے اور زبان سے مگر اونچی آواز سے نہیں، اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ لہٰذا مستحب ہے کہ ذکر اونچی آواز سے نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تھا: کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں یا بعید ہے کہ ہم اُس کو پکاریں، اس پر اللہ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرة: ١٨٦] ”اور (اے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کرے۔“

صحیحین میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ کسی سفر میں لوگوں نے بلند آواز سے دعا مانگنا شروع کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « يَاَيُّهَا النَّاسُ ارْبَعُوْا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ أَصَمَّ وَلَا غَائِباً، إِنَّ الَّذِيْ تَدْعُوْنَهُ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ أَقْرَبُ إِلٰى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ »[1] ”لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، اس لیے کہ جس کو تم پکار رہے ہو، وہ نہ بہرہ ہے اور نہ غائب۔ بے شک تم جس کو پکار رہے ہو، وہ سننے والا بھی ہے اور قریب بھی۔ اتنا قریب کہ اتنی قریب اس کی سواری کی گردن بھی نہیں ہے۔“ یا اس آیت سے مراد وہ مطلب ہے جو دوسری آیت میں آیا ہے: ﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] کیونکہ مشرکین قرآن کو سن کر گالیاں دیتے تھے، قرآن کے اتارنے والے کو اور جو اس کو لایا ہے۔ اس پر اللہ نے حکم دیا کہ نہ اتنی اونچی آواز سے پکار کر پڑھو کہ مشرک گالی بکنا شروع کریں، اور نہ اتنا چپکے پڑھو کہ تمھارے اصحاب نہ سنیں، بلکہ خفیہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٤)

آواز اور اونچی آواز کے درمیان پڑھو۔

اسی طرح اس آیت میں فرمایا ہے کہ جہر بالقول نہ کرو اور غافل بھی نہ رہو، بلکہ صبح و شام ذکر اذکار کرتے رہو۔ امام ابن جریر اور ابن زید رحمہ اللہ نے یہ زعم کیا ہے کہ اس آیت سے مراد قرآن سننے والے کو حکم ہے کہ قرآن سننے کے وقت خاموش رہے اور ذکر اس طریقہ پر کیا کرے۔[1] سو یہ بات اس خاموشی سے بعید اور منافی ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خاموش رہنا اس وقت افضل ہے جب زبان کے ساتھ ذکر ہو، خواہ خفیہ آواز سے یا اونچی آواز سے۔ سو ان دونوں کا قول متابع علیہ نہیں ہے، بلکہ آیتِ باب کا مقصد صبح و شام کے وقت بندوں کو کثرت پر ابھارنا ہے، تاکہ اہلِ غفلت میں سے نہ ہوں۔

فرشتوں کی متابعت میں سجدے کا حکم:

اسی لیے فرشتوں کی مدح کی ہے کہ وہ رات دن تسبیح کیا کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔ فرشتوں کا ذکر اسی غرض سے فرمایا ہے کہ لوگ کثرتِ اطاعت اور عبادت میں ان کے مقتدی ہو جائیں، لہٰذا اس جگہ ہمارے لیے سجدہ کرنا مشروع کیا گیا ہے، کیونکہ فرشتوں کے سجدے کا ذکر فرمایا ہے، جس طرح حدیث میں آیا ہے: «أَلَا تَصُفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا، يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْأَوَّلَ وَ يَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ»[2] ”تم صفیں اس طرح کیوں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس باندھتے ہیں، وہ پہلے اول صفیں پوری کرتے ہیں اور چونا گچ دیوار کی طرح صف میں باہم ملے ہوتے ہیں۔“ یہ قرآن پاک میں پہلا سجدہ ہے جو تلاوت کرنے والے اور سننے والے کے لیے بالاجماع مشروع ہوا ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سجدے کو من جملہ قرآن مجید کے سجدوں میں گنا ہے۔[3] (رواہ ابن ماجہ) امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”هٰذَا آخِرُ تَفْسِيْرِ سُوْرَةِ الْأَعْرَافِ“ وللّٰه الحمد والمنة.[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ خطاب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لیکن امت اس میں داخل ہے، کیونکہ خطاب تمام مکلفین کو عام ہے۔ ذکر سے مراد عام ہے، قرآن ہو یا کوئی اور ذکر دوسروں کے ذکر میں سے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: اس ذکر کے معنی میں اختلاف نہیں ہے کہ اس سے اس جگہ دعا مراد ہے۔[5] بعض نے کہا ہے کہ مراد خاص قرآن ہے کہ اس کو

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٥٣_ ٣٥٤) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣٠)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٥٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٧٣_ ٣٧٤) اس کی سند میں ”عثمان بن فائد“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: ضعيف أبي داود (٢/ ٧٣_ ٧٥)

[4] تفسير ابن كثير (٣/ ٥٣٩) طبعة: دار طيبة. [5] تفسير القرطبي (٧/ ٣٥٥)

تأمل اور تدبر کے ساتھ پڑھے۔ چپکے پڑھنے کا حکم اس لیے فرمایا ہے کہ اخفا کو اخلاص میں بڑا دخل ہے۔ وہ حسنِ تفکر سے قریب تر ہے اور قبول کرنے کے لیے زیادہ مؤثر دعوت کا ذریعہ ہے۔ تضرع سے مراد خوف سے چلا کر نہ پڑھے، جہر سے کم اور سِرّ سے اوپر کی آواز سے پڑھے۔ یعنی میانہ روی اختیار کرے۔

اس ذکر کے اوقات صبح اور شام ہیں۔ غدو طلوعِ فجر سے طلوعِ آفتاب تک کو کہتے ہیں۔ اصیل عصر کے بعد مغرب تک کو کہتے ہیں۔ ابو صخر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آصال ظہر اور عصر کے درمیانی وقت کو بولتے ہیں۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد صبح و عشا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غدو آخرِ فجر سے نماز صبح تک ہے۔ آصال آخرِ عشی سے نمازِ عصر تک ہے۔[2] یہ دونوں وقت اشرف ہیں، اس لیے بالخصوص ان کا ذکر کیا گیا۔ صبح کو انسان خواب سے جو برادرِ مرگ ہے، اٹھتا ہے، اس لیے استقبال حالتِ انتباہ کا نوم سے ذکر کے ساتھ مستحب ٹھہرا، تاکہ بیداری کے بعد اس کا پہلا عمل یہی اللہ کا ذکر ہو۔ آخر دن میں انسان نیند کے استقبال میں ہوتا ہے، اس لیے اس وقت ذکر میں مشغول ہونا مستحب ہوا، کیونکہ وہ آنے والی حالت موت کے مشابہ ہوتی ہے، شاید اس نیند سے نہ جاگے تو موت اللہ ہی کے ذکر پر ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اعمال کا اوپر چڑھنا انھی دو وقتوں میں ہوتا ہے، رات کا عمل صبح کے وقت اور دن کا عمل عصر کے غروب تک اوپر جاتا ہے، اس لیے دن کے شروع میں اور آخر میں ذکر کا مستحب ہونا مقرر ٹھہرا، تاکہ عمل کی ابتدا اور اختتام ذکر پر ہو۔

اس کے سوا اور بھی قول ہیں، مراد ہر وقت اور ہمیشہ اللہ کا ذکر ہونا ہے، تاکہ اس کا شمار اہلِ غفلت میں نہ ہو۔ جو اللہ کے پاس ہیں، ان سے مراد ملائکہ ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بالا جماع۔[3] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے نزدیک ہونے سے مراد اللہ کا قرب ہے[4] یا عرش کا قرب۔ اللہ عرش پر مستوی ہے اور اس کا علم ہر جگہ ہے، وہ خلق سے بذاتِ خود جدا ہے۔ یا مراد اللہ کے رسول ہیں۔ یا یہ وصف بطورِ عزت و تکریم فرمایا کہ ان کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ یہ قرب ان کا عزت و تکریم میں ہے نہ فاصلے میں، ان کو اللہ کی عبودیت سے کسی طرح استکبار (تکبر) نہیں، بلکہ ہر دم تسبیح کرتے ہیں، گو ساجد ہیں۔

سجدے سے مراد خضوع اور ذلت ہے، ملاءِ اعلیٰ کا ذکر کرنے میں بنی آدم کے لیے مثال ہے کہ یہ سجدہ عزائم میں سجودِ قرآن سے ہے۔ احادیث اور آثارِ صحابہ سجدۂ تلاوت، ان کی تعداد، ان کی جگہ اور ان کے طریقے کے بارے میں آئے ہیں۔ وہ کتبِ احادیث میں درج ہیں۔[5]

۲۵ر ذوالحجہ ۱۳۰۳ھ روز شنبہ عصر کے وقت سورۃ الاعراف کی تفسیر تمام ہوئی۔ اگر کتابت سے وہ دن خارج کیے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٤٨)
[2] تفسير الطبري (١٣/ ٣٥٥_ ٣٥٦)
[3] تفسير القرطبي (٧/ ٣٥٦)
[4] معاني القرآن (٢/ ٣٩٨)
[5] فتح البيان (٥/ ١٢٢_ ١٢٤)

جائیں، جب کام نہیں ہوا تو معمول کی کتابت کے حساب کے مطابق اس تحریر کا ختم ۱۱ ذوالحجہ سنہ مذکور کو ہوتا ہے، اس طرح پر کہ ۱۷ رمضان روز دوشنبہ نو نواختہ روز سے اس کا لکھنا شروع کیا، پھر سی ام (تیسواں) رمضان تک پارہ ہشتم کو ختم کیا، پھر ۲۷ ذی قعدہ روز یک شنبہ کو پارہ نہم سے آغاز کیا، پھر روز شنبہ تاریخ ۲۵ ذوالحجہ کو سورت تمام ہوئی۔ درمیان میں دوسری مصروفیات کی وجہ سے کتابت کا حرج ہوا، ۱۴ یوم تک، ایک بار پھر لکھا، پھر چار دن ماہ ذی قعدہ کے، پھر گیارہ دن ذی الحجہ کے اور مع حساب ناغہ ۲۵ دن ذوالحجہ کے لکھا۔ یہ تمام مدت ضائع شدہ ایام کو نکالنے سے ۲۹ دن ہوتے ہیں۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ مُحَمَّدٍ أَشْرَفِ الْبَرِيَّاتِ، وَعَلٰى آلِهِ وَصَحْبِهِ أُوْلِى الْفَضَائِلِ وَالدَّرَجَاتِ.



سورت انفال

سورت انفال مدنی ہے، اس میں چھہتر آیتیں، ایک ہزار چھے سو اکتیس کلمے، پانچ ہزار دو سو چورانوے حرف ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اس کو کسی چیز کے بغیر مدنی کہا ہے، یہی حسن، عکرمہ، جابر بن زید، عطا رحمہم اللہ،[1] عبداللہ بن زبیر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ سورت بدر میں اتری ہے[3] اور کبھی یوں کہا کہ یہ سورتِ بدر ہے۔[4] کبھی کہا کہ یہ مدنی ہے مگر سات آیات: ﴿ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ إلى آخرها ﴾ کہ یہ مکی ہیں،[5] لیکن گو یہ آیات شانِ واقعۂ مکہ مکرمہ میں آئی ہوں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مکی ہوں، بلکہ ان کا نزول مدینے میں مکے کے واقعہ کی یاد دہانی کے طور پر ہوا ہے، اس لیے یہ قول ضعیف ہے۔ زیادہ صحیح وہی بات ہے کہ ساری سورت مدنی ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ جملہ آیات اس سورت کی پانچ یا چھے یا سات اور ستر ہیں۔

نبی کریم ﷺ اس کو نمازِ مغرب میں پڑھتے۔[6] (كما أخرجه الطبراني بسند صحيح عن أبي أيوب)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

(اے نبی!) وہ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو، اور باہمی اصلاح کر لو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو ①

انفال کی تفسیر:

جنگ میں بعض آگے بڑھے، بعض پشت پر رہے، جب غنیمت جمع ہوئی، بڑھنے والوں نے کہا: یہ ہمارا حق ہے کہ فتح ہم نے کی اور پشت والوں نے کہا کہ تم ہماری قوت سے لڑے، اللہ نے دونوں کو خاموش کیا کہ فتح اللہ کی مدد

---

[1] تفسیر القرطبي (٧/ ٣٦٠) [2] الدر المنثور (٤/ ٣) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٣١) [5] تفسير القرطبي (٧/ ٣٦٠)

[6] المعجم الكبير (٤/ ١٣٠) فتح البيان (٥/ ١٢٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٢/ ٢٩٧)

سے ہے، زور کسی کا پیش نہیں جاتا۔ سو مال کا مالک اللہ ہے اور اس کا نائب رسول ہے، پھر آگے بہت دور تک یہی بیان فرمایا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے، اپنی قوت سے نہ سمجھو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ انفال سے مراد غنائم ہیں۔ یہ سورت بدر میں اتری ہے، یہ غنائم خاص تھے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس میں کسی کا کچھ نہ تھا۔[1] امام مجاہد، عکرمہ، عطا، ضحاک، قتادہ، عطاء خراسانی، مقاتل بن حیان، ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں کہ انفال سے مراد غنیمتیں ہیں۔[2]

ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ یہ انفال کیا ہیں؟ کہا: گھوڑے اور چھوڑا ہوا مال انفال میں ہے، پھر پوچھا، پھر یہی جواب دیا، پھر بار بار سوال کیا، یہاں تک کہ وہ تنگ ہوئے اور کہا تم جانتے ہو کہ اس شخص کی کیا مثال ہے، یہ مثل صبیغ کے ہے، جس کو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مارا تھا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے جب کوئی کچھ پوچھتا، کہتے: ”لَا آمُرُكَ وَلَا أَنْهَاكَ“ میں نہ تجھے حکم دیتا ہوں، نہ منع کرتا ہوں۔“

پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ نے اپنے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بھیجا مگر خبر کرنے والا، حکم کرنے والا، حلال کرنے والا، حرام کرنے والا۔[3] غرض کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح ثابت ہوا کہ انھوں نے نفل کی تفسیر یہ کی ہے کہ امام بعض لوگوں کو اصل غنیمتوں کی تقسیم کے بعد کسی سلب (مقتول کا سامان) وغیرہ سے جو دیتا ہے، اس کو نفل کہتے ہیں۔ اکثر فقہا کے فہم میں نفل ہی اس معنی کے قریب قریب آتا ہے۔ واللہ أعلم.

شانِ نزول:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ میں سے چار حصوں کے بعد پانچویں حصے کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، اس پر یہ آیت اتری۔[4] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نفل دونوں فوجوں کے آپس میں ملنے کے دن نہیں ہوتا، نفل تو صفوں کے آپس میں ملنے سے قبل ہوتا ہے۔[5] امام عطا رحمہ اللہ نے انفال کی تفسیر فے کے ساتھ کی ہے، یعنی جو چیز کفار سے بغیر لڑے بھڑے ہاتھ آئے، وہ نفل ہے، جانور ہو یا غلام یا لونڈی یا سامان، وہ چیز خاص نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو چاہیں کریں۔[6] اور لوگوں نے کہا ہے کہ انفال سے مراد سرایا ہیں، یعنی جو چیز امام بعض سرایا کو ان کے حصے سے زیادہ بطور نفل عطا کرے، باقی لشکر کے ساتھ، اسی کی صراحت شعبی نے بھی کی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار بھی یہی ہے کہ انفال وہ چیز ہے جو تقسیم شدہ حصے سے زیادہ ہو۔[7] اس کی تائید سببِ نزول سے بھی ہوتی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٦٨) تفسير الطبري (١٣/ ٣٧٨)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٣٦٠۔ ٣٦٢) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٤٩)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٣٦٤) [4] تفسير الطبري (١٣/ ٣٦٥) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٢۔ ١٦٥٣)

[6] تفسير الطبري (١٣/ ٣٦٣) [7] تفسير الطبري (١٣/ ٣٦٥۔ ٣٦٦)

امام احمد رحمہ اللہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب بدر کے دن میرا بھائی عمیر مارا گیا تو میں نے سعید بن العاص کو قتل کر کے اس کی تلوار، جس کو ذوالکتیفہ کہتے تھے، لے لی اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، فرمایا: جا اس کو قبض، یعنی مالِ غنیمت میں ڈال دے، میں وہاں سے پھرا، اللہ ہی جانے کہ مجھ کو اپنے بھائی کے قتل کا کتنا صدمہ تھا اور اخذِ سلب کا۔ میں ذرا ہی سا چلا تھا کہ سورت انفال اتری، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جا اپنا سلب لے لے۔[1]

امام احمد رحمہ اللہ نے سعد بن مالک رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت اس طرح کی ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ نے آج میرا جی مشرکوں سے ٹھنڈا کیا، مجھ کو یہ تلوار دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تلوار نہ تجھ کو ملے گی نہ مجھ کو، تُو اس کو رکھ دے۔ میں وہاں سے پھرا، جی میں کہتا تھا، قریب ہے کہ یہ تلوار اس کو دی جائے گی، جس نے میری طرح قتال میں سعی نہیں کی ہے۔ اتنے میں ایک شخص نے پیچھے سے مجھ کو پکارا۔ میں نے کہا: اللہ نے کوئی بات میرے بارے میں اتاری ہے؟ فرمایا: تو نے یہ تلوار مجھ سے مانگی تھی، وہ میری نہ تھی، جس کی تھی اس نے مجھ کو دے دی، اب اس کو تُو لے جا اور اللہ نے یہ آیت اتاری۔ اس کو امام ابو داود، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسن صحیح ہے۔[2]

امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ کے الفاظ سعد رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ میرے حق میں چار آیتیں آئیں: بدر کے دن میں نے ایک تلوار پائی، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا اور کہا کہ آپ یہ مجھ کو دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تُو نے جہاں سے لی ہے، وہیں جا کر رکھ دے۔ دوبارہ اسی طرح فرمایا، جب پھر میں نے کہا تو فرمایا: جا رکھ دے، اس کو جہاں سے لیا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ تمام حدیث نزولِ آیات کے بارے میں ہے۔ ﴿ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسٰنَ بِوٰلِدَيْهِ حُسْنًا ﴾ [العنكبوت: ٨] ''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کی وصیت کی۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ ... ﴾ [المائدة: ٩٠] ''بے شک شراب اور جوا... الخ'' اور آیتِ وصیت ہے۔[3] (رواه مسلم من حديث شعبة)

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیدنا مالک بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے بدر کے دن ابن عائذ کی تلوار پائی، اس کو مرزبان کہتے تھے، جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ جو نفل ان کے پاس ہو وہ لوٹا دیں، تو میں نے بھی وہ تلوار لا کر نفل میں ڈال دی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ سائل کو منع نہ کرتے۔ ارقم مخزومی نے اس

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٨٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن عبید اللہ ثقفی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] مسند أحمد (١/ ١٧٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٤٨) مستدرك الحاكم (٢/ ١٤٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٨) مسند الطيالسي (١/ ٢٨)

تلوار کو دیکھ کر مانگا، نبی اکرم ﷺ نے وہ ان کو دے دی۔[1] (و رواه ابن جرير من وجه آخر)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عبادہ سے انفال کا حال پوچھا، کہا: ہم اصحابِ بدر کے حق میں آئی ہے، نفل میں ہمارا اختلاف ہوا، بدخلقی ہوئی، اللہ نے انفال کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کر نبیِ اکرم ﷺ کے سپرد کیا۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان یکساں تقسیم فرما دیا۔[2] (رواه أحمد)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یوں ہیں کہ ہم نبیِ کریم ﷺ کے ساتھ نکلے، پس میں بدر میں حاضر ہوا اور لوگوں کا سامنا ہوا۔ اللہ نے دشمن کو شکست دی۔ ایک گروہ دشمن کے پیچھے لگا، ان کو بھگایا اور مارا، دوسرا گروہ لشکر پر جھکا، ان کا مال و متاع جمع کیا، تیسرا گروہ نبیِ اکرم ﷺ کے گرد رہا کہ کہیں دھوکے سے دشمن آپ ﷺ پر حملہ نہ کر دے، جب رات ہوئی اور لوگوں کا خلط ملط ہوا تو غنیمت جمع کرنے والوں نے کہا کہ یہ غنیمت ہم نے جمع کی ہے، اس میں کسی کا حصہ نہیں ہے۔ دوسرے گروہ نے، جو دشمن کے پیچھے گیا تھا، کہا: تم ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، دشمن کو ہم ہی نے مار بھگایا اور روکا ہے۔ تیسرے گروہ نے کہا: ہم کو یہ ڈر تھا کہ کہیں دشمن دھوکے سے نہ آ پڑے، اس لیے ہم مشغول رہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ نبیِ اکرم ﷺ نے وہ مالِ غنیمت سب مسلمانوں میں بانٹ دیا۔ نبیِ اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب زمین پر ہلہ کرتے تو ایک چوتھائی نفل دیتے اور جب پھرتے تو ایک تہائی تنفیل کرتے اور انفال کو مکروہ رکھتے۔[3] (و رواه الترمذي، وقال: هذا حديث حسن، و ابن ماجه والحاكم وقال: صحيح الإسناد على شرط مسلم ولم يخرجاه)

امام ابو داود، نسائی، ابن جریر، ابن مردویہ، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بدر کے دن فرمایا کہ جو کوئی ایسا ایسا کام کرے گا، اس کے لیے ایسا ایسا ہوگا، جوانانِ قوم نے شتابی (جلدی) کی، جھنڈے کے نیچے بوڑھے لوگ رہ گئے، جب غنیمتیں جمع ہوئیں، جوان لوگ آ کر مانگنے لگے، بوڑھوں نے کہا کہ ہم کو چھوڑ کر تم نہ لو، کیونکہ ہم تمھاری کمک پر تھے، تم اگر ہار جاتے تو ہمارے ہی پاس آتے، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری۔ ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ تک۔[4] (هذا لفظ ابن مردويه)

بہرحال نبیِ اکرم ﷺ نے بدر کی غنیمتوں کو اللہ کے مشورے کے مطابق مسلمانوں میں ان کا خمس نکالے بغیر

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٧٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[2] مسند أحمد (٥/ ٣٢٢) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٥٦)

[3] مسند أحمد (٥/ ٣٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٥٢) مستدرك الحاكم (٢/ ١٤٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٣٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣/ ٣٦٨) صحيح ابن حبان (١١/ ٤٩٠) مستدرك الحاكم (٢/ ١٤٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

تقسیم فرما دیا، جس طرح کہ حدیثِ سعد میں گزرا۔ پھر اس کے بعد آیت خمس آئی، اس نے پہلی آیتوں کو منسوخ کر دیا۔ امام مجاہد، عکرمہ اور سدی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ محکم ہے۔[1] ابو عبید نے کہا ہے کہ اس بارے میں آثار آئے ہیں۔ اصل انفال تمام غنیمتیں ہیں، ہاں ان میں سے پانچواں حصہ مخصوص ہے اہلِ خمس کے لیے نزول آیت کے مطابق اور جس طرح سنت نے فیصلہ کیا۔

نفل و خمس کا فرق، صورتیں اور اس امت کی خصوصیت:

کلامِ عرب میں انفال کے معنی ہر وہ احسان ہے جو کرنے والا وجوب کے علاوہ ازراہِ تفضیل و مہربانی کرتا ہے، یہی وہ نفل ہے جو اللہ نے مومنوں کو دشمن کے اموال میں سے حلال کیا ہے۔ اس شے کو اللہ نے ان کے لیے خاص طور پر بطورِ احسان حکم دیا ہے، ورنہ پہلی امتوں پر یہ غنیمتیں حرام تھیں، اللہ نے اس امت کو عنایت فرمائیں۔ یہ نفل کی اصل ہے، اس اصل کی شاہد سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے جو صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي...» ”مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں...۔“ من جملہ اس کے یہ فرمایا: «وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تُحَلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي»[2] ”(ان میں سے ایک یہ ہے کہ) میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئیں، مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے حلال نہیں کی گئیں۔“

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا: اسی جگہ سے جو چیز کہ امام کسی مجاہد کو بطورِ نفل دیتا ہے وہ لشکر میں سے بعض کی بعض پر کسی شے کے ساتھ فضیلت ہوتی ہے۔ سوا ان کے سہام (حصے) کے۔ یہ کام ان کے ساتھ اسلام میں غنیٰ کے مطابق اور دشمن میں نکایت (تکلیف پہنچانے یا نقصان کرنے) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ امام کے اس نفل عطا کرنے کے چار طریقے ہیں، ہر ایک سنت کے لیے ایک علاحدہ جگہ ہے دوسری جگہ سے۔ اس میں نفل ایک طریقہ ہے، جس میں خمس نہیں ہوتا ہے، وہ سَلب ہے۔ دوسری اس نفل میں ہوتی ہے جو خمس نکالنے کے بعد غنیمت میں سے ہوتا ہے۔ یہ اس طرح پر ہے کہ امام ایک لشکرِ خرد (چھوٹا لشکر) کسی جنگ کے لیے بھیجے، وہ وہاں سے غنیمتیں لائے تو اس صورت میں اُس لشکر کو اس غنیمت کا ایک چوتھائی یا ایک تہائی دیا جائے گا۔ تیسری صورت میں نفل میں سے پانچویں حصے میں سے ہوتی ہے، اس طرح کہ ساری غنیمت جمع کر کے خمس نکالا جائے، جب وہ خمس امام کے ہاتھ میں آئے تو اس میں نفل اپنی تجویز کے مطابق نکالے۔ چوتھے غنیمت میں سے خمس نکالنے سے پہلے نفل ہوتی ہے، اس طرح کہ راہ بتانے والوں، چرواہوں اور ہانکنے والوں کو دے، ان صورتوں میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انفال یہ ہے کہ راسِ غنیمت سے خمس سے پہلے کوئی چیز سوائے سَلب کے نہ نکالے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٨٠۔ ٣٨١)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوسری وجہ نفل کی وہ شے ہے جو ان کے حصے سے زیادہ ہوتی ہے خمسِ نبیِ اکرم ﷺ سے، اس لیے آپ ﷺ ہر غنیمت سے ایک خمس الخمس ہے، اس لیے کہ امام کو چاہیے کہ جب دشمن زیادہ ہوں اور شوکت بڑھ جائے اور مسلمان ان کے مقابلے میں کم ہوں تو تنفیل میں کوشش کرے رسول اللہ ﷺ کی سنت کا اتباع کرتے ہوئے اور جب یہ صورت نہ ہو تو نفل نہ دے۔ نفل کی تیسری وجہ یہ ہے کہ جب امام کوئی چھوٹا یا بڑا لشکر روانہ کرے تو دشمن سے مڈبھیڑ سے پہلے ان سے کہہ دے کہ جو شخص کچھ لوٹے گا وہ خمس کے بعد اسی کا ہے تو وہ غنیمت اسی لشکر کی امام کی شرط کے مطابق ہو جاتی ہے۔ لِأَنَّهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ غَزَوْا وَ بِهٖ رَضُوْا اور اس قول میں کہ بدر کی غنیموں میں خمس نہیں نکالا گیا، نظر ہے۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے، ان دو جوان اونٹوں کے بارے میں جو یومِ بدر کے خمس میں سے ان کے ہاتھ لگے تھے، اس قول کی تردید کرتی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”وَقَدْ بَيَّنْتُ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابِ السِّيْرَةِ بَيَاناً شَافِياً“ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ انفال نفل کی مُحرَّ کا جمع ہے۔ نفل غنیمت کو کہتے ہیں، یعنی وہ یہ پوچھتے ہیں کہ غنائم کس کے لیے ہیں، کون اس مالِ غنیمت کو لے گا؟ اصل نفل بمعنی زیادت ہے۔ غنیمت کو نفل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اس مقدار پر جو اللہ نے اس امت کے لیے حلال کیا ہے اور ان کے غیر پر پہلے حرام تھا، زیادہ ہے یا اس اجر پر زیادہ ہے جو مجاہدین کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے سوا نفل کے اور معنی بھی ہیں، لیکن اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ تطوع کو نافلہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ مقدار واجب پر زیادہ ہوتا ہے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اس آیت سے: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ﴾ [الأنفال: ٤١] ”اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مالِ غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے۔“ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت محکم مجمل ہے۔[2] اللہ نے اس کے مصارف کا بیان آیتِ خمس میں کیا ہے، امام کو اختیار ہے کہ لشکر میں سے جس کو جتنا چاہے خمس نکالنے سے پہلے دے دے۔

باہمی صلح اور تقویٰ:

پھر اللہ نے ان کو حکم دیا کہ تم اللہ سے ڈرو باہم صلح رکھو۔ اس سے اسلامی اپنائیت مراد ہے اور اللہ اور رسول کے حکم کو مانو، باہمی اختلاف چھوڑ دو، اگر ایمان رکھتے ہو، کیونکہ ایمان ان تینوں امور کے بجا لانے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، بلکہ اصلاً ایمان کا ثبوت ایسے شخص میں پایا نہیں جاتا جو ان تینوں باتوں کا حامل نہ ہو۔ جو شخص متقی نہیں ہے وہ مطیع

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٧٥۔ ٣٧٨) السيرة النبوية لابن كثير (٢/ ٤٦٦۔ ٤٦٩) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٨١)

نہیں اور جو اللہ اور رسول کا مطیع نہیں وہ مومن نہیں ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''طَاعَةُ اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اتِّبَاعُ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ''[1] (أخرجه ابن أبي حاتم)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تم اللہ سے ڈرو، اپنے معاملات میں اور آپس کا معاملہ درست کرلو، آپس میں جھگڑا اور تنازعہ نہ کرو۔ جو ہدایت اور علم اللہ نے تم کو دیا ہے وہ تمھارے لیے اس چیز سے بہتر ہے جس کے سبب سے تم باہم جھگڑتے ہو، یہ تقسیم جو تمھارے درمیان اللہ کے ارادے سے عدل و انصاف کے طور پر ہوئی ہے، اس میں اللہ اور رسول کے فرماں بردار رہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ اللہ اور رسول کی طرف سے تقویٰ اور باہمی صلح و بہتری کے لیے تحریج ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی آپس میں گالی گلوچ نہ کرو۔[2]

ابو یعلیٰ موصلی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے، اتنے میں آپ ہنسے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت ظاہر ہوئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ کس بات پر ہنستے ہیں؟ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! فرمایا: دو آدمی میری امت کے رب العزت کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑے ہوئے، ایک نے کہا: اے میرے رب! میرے لیے اس بھائی سے میرا مظلمہ (داد خواہی) لے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تُو اپنے بھائی کا مظلمہ دے۔ اس نے کہا: اے میرے رب میری نیکیوں میں سے کچھ بھی تو باقی نہیں رہا، یعنی میں کہاں سے دوں، مظلوم نے کہا: اے رب! یہ میرے گناہ اس پر لاد دے، یہ کہہ کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو آنکھوں سے نکل پڑے، پھر فرمایا: وہ دن بڑا سخت ہے، اس دن لوگ اس بات کے محتاج ہوں گے کہ کوئی ان کے گناہ اٹھالے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے سے کہے گا: تُو اپنی آنکھ اٹھا کر جنت کی طرف دیکھ، تو وہ سر اٹھا کر عرض کرے گا: اے رب! میں چاندی کے شہر اور سونے کے گھر دیکھتا ہوں، جو موتیوں میں لدے پھندے ہیں، یہ کس نبی، کس صدیق، کس شہید کے لیے ہیں؟ اللہ فرمائے گا: یہ اس کے لیے ہیں جو اس کی قیمت دے، وہ کہے گا: اے رب! بھلا اس کی قیمت کون دے سکتا ہے؟ فرمائے گا: تُو دے سکتا ہے، وہ کہے گا: اے رب! بھلا اس کی کیا قیمت ہے؟ فرمایا: تُو اپنے بھائی کو مظلمہ بخش دے، وہ کہے گا: اے رب! میں نے معاف کیا۔ اللہ فرمائے گا: اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ اور جاؤ تم دونوں جنت میں، پھر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ﴾ کیونکہ اللہ قیامت کے دن مومنوں کے درمیان صلح کرا دے گا۔[3]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٤) فتح البیان (٥/ ١٢٧۔ ١٢٨) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٨٤)

[3] مستدرك الحاكم (٤/ ٦٢٠) اس کی سند میں ''سعید بن انس'' مجہول اور ''عباد بن شیبہ'' ضعیف راوی ہے۔ ضعیف الترغیب والترھیب (٢/ ٧١)

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

(سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں ② وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے، اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں ③ یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے اپنے رب کے ہاں درجے ہیں اور بخشش ہے اور باعزت رزق ہے ④

سچے مومنوں کے اوصاف:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ منافقوں کے دل میں اللہ کا کچھ بھی ذکر نہیں آتا کہ وہ فرائض کو ادا کریں اور نہ وہ اللہ کی آیتوں ہی پر ایمان لاتے ہیں اور نہ اللہ پر توکل کرتے ہیں اور جب آنکھ سے غائب ہوتے ہیں تو نماز نہیں پڑھتے اور نہ زکات نکالتے ہیں۔ اللہ نے خبر دی کہ یہ مومن نہیں ہیں۔ پھر مومنوں کا وصف بیان کیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے وقت ڈر جاتے ہیں۔[1]

اللہ کا ڈر:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ وَجِلَتْ ﴾ کے معنی ہیں فَرُقَتْ یعنی فَزِعَتْ وَخَافَتْ، یہی کئی ایک اہل علم کا قول ہے۔[2] سو جو کوئی پکا مومن سچا مسلمان ہوتا ہے وہ اللہ سے ڈر کر اللہ کے احکام بجا لاتا ہے اور زواجر (ڈانٹ ڈپٹ والے کاموں) کا تارک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۳۵] ''اور وہ لوگ جب کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کر گزرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے، پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے؟ اور وہ اپنے کیے پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝۴۰ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾ [النازعات: ۴۰۔ ۴۱] ''لیکن جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے

① تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۸۶) اس کی سند حسن ہے۔ ② تفسیر الطبري (۱۳/ ۳۸۶)

روکا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔'' امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا: میں نے امام سدی رحمہ اللہ کو سنا، وہ اس آیت کے بارے میں کہتے تھے: یہ وہ شخص ہے جو کوئی ظلم کرنا چاہتا تھا یا کسی گناہ کا ارادہ رکھتا تھا، کسی نے اس کو کہا کہ اللہ سے ڈر، اس کا دل ڈر گیا۔[1]

ام درداء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ وجل یعنی خوف دل میں ہوتا ہے، جیسے پتوں میں آگ لگے، اس سے تیرے بال کھڑے نہیں ہو جاتے؟ کہا: ہاں، کہا: جب تو یہ حالت پائے تو اس دم اللہ کو پکار، دعا اس کو دور کر دے گی۔[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ یہ ہیں کہ نہیں ہے وجل (ڈر) مومن کے دل میں، مگر ایک شعلۂ برگ کی طرح، سو جب کوئی تم سے ڈرے تو اسی دم دعا کرے۔[3]

ایمان کا بڑھنا:

معلوم ہوا کہ دعا دل پر خوف کے غلبے کے وقت قبول ہوتی ہے۔ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٢٤] ''اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو (طنزاً) کہتے ہیں: تم میں سے کس کو اس (سورت) نے ایمان میں زیادہ کیا ہے؟ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔'' امام بخاری وغیرہ ائمہ رحمہم اللہ نے اس آیت اور اس سے مشابہ دوسری آیتوں سے استدلال کیا ہے کہ ایمان دلوں میں زیادہ اور فاضل ہوتا رہتا ہے۔[4] یہی جمہور امت کا مذہب ہے۔ کئی ایک نے جیسے شافعی، احمد اور ابو عبید رحمہم اللہ ہیں، اس پر اجماع ذکر کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''كَمَا بَيَّنَّا ذٰلِكَ مُسْتَقْصًى فِيْ أَوَّلِ شَرْحِ الْبُخَارِيِّ'' ولله الحمد والمنة.[5]

توکل:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایمان کے بڑھنے سے مراد تصدیق کا زیادہ ہونا ہے۔[6] مراد توکل سے یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے امید نہیں رکھتے اور اس ذات پاک کے سوا کسی کا قصد نہیں کرتے اور اس کے آستانۂ رحمت کے سوا کسی کی پناہ نہیں پکڑتے اور اس کے در کے سوا کسی سے اپنی حاجات طلب نہیں کرتے، نہ اس کے سوا کسی سے رغبت ہی کرتے ہیں۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ ملک میں اسی ایک وحدہ لاشریک لہ کا تصرف ہے، پس بس۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ اُس کے حکم کو پھیر دے یا اس میں دیر لگائے، تاخیر کرے، وہ سریع الحساب ہے۔ اسی لیے سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پر توکل کرنا، مکمل ایمان کا حصہ ہے۔[7]

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٥) (2) تفسير الطبري (١٣/ ٣٨٧) (3) الدر المنثور (٤/ ١١)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (١/ ٧) (5) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٧٩)

(6) تفسير الطبري (١٣/ ٣٨٦) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٦) اس کی سند حسن ہے۔ (7) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٦)

نماز قائم کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا:

پھر اللہ نے خرچ کرنے کا ذکر کیا، اس میں ذکرِ اعتقاد کے بعد ان کے اعمال پر تنبیہ ہے۔ یہ اعمال تمام قسم کی بھلائیوں کو شامل ہیں۔ نماز قائم کرنا اللہ پاک کا حق ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اقامت سے مراد نماز کے اوقات، وضو، رکوع اور سجود پر محافظت (پابندی) ہے۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے تلاتِ قرآن وتشہد و درود کو زیادہ کیا ہے۔[1] رہا انفاق سو وہ اخراجِ زکات اور بندوں کے جملہ حقوق کو شامل ہے، خواہ واجب ہوں یا مستحب۔ ساری خلق اللہ کی عیال ہے، اللہ کا بڑا دوست وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ کی مخلوق کے لیے بہت زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت میں کہا ہے کہ یہ اموال تمھارے پاس عاریت و ودیعت (عارضی طور پر سونپے گئے) ہیں قریب ہے کہ تم ان سے جدا ہو جاؤ گے۔[2]

سچے مومن:

پھر اللہ نے ان صفت والوں کو سچا مومن ٹھہرایا۔ حارث بن مالک انصاری کا گزر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا، فرمایا: کہو کیسے ہو؟ کہا: سچا مومن ہوں۔ فرمایا: دیکھ تو کیا کہتا ہے، ہر چیز کے لیے ایک حقیقت ہوتی ہے، تیرے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ کہا: میں نے اپنے نفس کو دنیا سے جدا کیا، پھر میں رات کو جاگتا رہا اور دن کو پیاسا رہا، گویا میں اپنے رب کے عرش کو واضح اور ظاہر دیکھتا ہوں۔ اور گویا میں اہلِ جنت کو دیکھتا ہوں کہ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے پھرتے ہیں اور گویا دیکھتا ہوں میں دوزخ والوں کی طرف وہ دوزخ میں بھونک رہے ہیں۔ فرمایا: اے حارث! تو نے پہچان لیا، اب تُو اس کام کو لازم پکڑے رہ، تین بار یہی فرمایا۔[3] (رواہ الطبراني)

درجات اور مغفرت:

عمرو بن مرہ رحمہ اللہ نے آیتِ باب کے بارے میں کہا ہے کہ قرآن زبانِ عرب میں اترا ہے، یہ آیت: ﴿ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ﴾ (آیتِ باب) اس قول کی طرح ہے: "فُلَانٌ سَيِّدٌ حَقًّا" حالانکہ قوم میں سادات ہیں، یا "فُلَانٌ تَاجِرٌ حَقًّا" حالانکہ قوم میں تجار ہیں یا "فُلَانٌ شَاعِرٌ حَقًّا" حالانکہ قوم میں شعرا ہیں۔[4] درجات سے مراد منازل و مقامات ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٦٣] "ان کے لیے اللہ کے پاس درجے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔" مغفرت سے یہ مراد ہے کہ اللہ ان کے سیئات بخش دے گا، ان کے حسنات کا شکر مانے (قدر کرے) گا۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٧)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٧)
[3] المعجم الكبير (٣/ ٢٦٦) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٨)

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: درجات سے یہ مراد ہے کہ بعض اہلِ جنت بعض سے اونچے ہوں گے، جس کا فضل بلند ہوگا، وہ آپ کو نچلے طبقے والوں سے بلند خیال کرے گا اور جو نچلے درجے کا ہے وہ یہ خیال نہ کرے گا کہ کوئی اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔[1] اور اسی لیے صحیحین میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ علیین کو سافلین اس طرح دیکھیں گے، جس طرح تم ایک تارے کو آسمان کے افق میں دیکھتے ہو۔ کہا: اے اللہ کے رسول! یہ انبیا کے منازل ہوں گے، غیر انبیا کب ان کو پا سکیں گے۔ فرمایا: «بَلٰی، وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ رِجَالٌ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِيْنَ»[2]

احمد اور اہلِ سنن کے نزدیک ابو سعید سے مروی دوسری مرفوع حدیث یہ ہے کہ جنت والے اونچے درجے والوں کو اس طرح دیکھیں گے، جس طرح تم ایک ستارے کو دور آسمانوں کے کنارے پر دیکھتے ہو۔ سیدنا ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما انہی میں سے ہیں اور چین میں ہوں گے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ کے ذکر کے وقت دل کا ڈرنا اللہ کی عظمت اور ہیبت اور اس کے جلال کے سبب سے ہوتا ہے۔ وجل ڈرنے گھبرانے کو کہتے ہیں۔ یہ دہشت وخشیت، کامل ایمان لانا مومنین کی شان ہوتی ہے، جو مخلص ہوتے ہیں، سو یہ خشیت کا احاطہ کرنا کمال ایمان کے اعتبار سے ہوتا ہے نہ کہ اصل ایمان کے اعتبار سے۔ ایک شخص نے کہا: مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ میری دعا کس وقت قبول ہوتی ہے، کہا: کیونکر؟ کہا: جب میرے بال کھڑے ہو جاتے ہیں، میرا دل دھڑکنے لگتا ہے، آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں، وہ وقت قبولیتِ دعا کا ہوتا ہے۔

اس آیت میں دل کے ڈرنے کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں طمانیتِ دل کا ذکر فرمایا ہے۔ تطبیق دونوں میں اس طرح ہے کہ ذکر کے ساتھ اطمینان صفاتِ جمال سے ہوتا ہے اور وجل ذکرِ وعید اور صفاتِ جلال سے ہوتا ہے۔ تلاوت سے مراد آیاتِ منزلہ کی تلاوت ہے یا آیاتِ تکوینیہ میں اللہ تعالیٰ کی کاری گری اور کمال قدرت سے تعبیر ہے جس کو سن کر ایمان والوں کے دلوں میں خشوع پیدا ہو جاتا ہے۔

زیادتِ ایمان سے مراد آیات کی تلاوت کے وقت انشراحِ صدر وطمانیتِ قلب وانفلاحِ خاطر ہے۔ بعض نے کہا: زیادتِ عمل ہے، اس لیے کہ ایمان ایک شے ہے، نہ بڑھے نہ گھٹے، لیکن اکثر آیات اور احادیثِ متواترہ اس کو رد کرتی ہیں اور آیت ایمان کے زیادہ ہونے کے بارے میں صریح ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ ایمان کے کچھ اوپر ستر شعبے ہیں۔ اعلیٰ ان میں کلمہ طیبہ کی گواہی دینا ہے اور ادنیٰ اس میں راستے سے ایذا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٨) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣١)

[3] مسند أحمد (٣/ ٦١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٨٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٣٠)

دینے والی چیزوں کو ہٹا دینا ہے۔[1] (أخرجه الشيخان) یہ اس پر دلیل ہے کہ ایمان میں اعلیٰ ادنیٰ ہوتا ہے، سو جب یہ بات ٹھہری تو ایمان قابلِ زیادت ونقصان ہوا۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے عامہ اہلِ علم سے نقل کیا ہے کہ جس کے پاس دلائل زیادہ اور قوی تر ہوں گے، اس کا ایمان بھی زیادہ تر ہوگا۔[2] بعض نے کہا ہے کہ وہ جب کوئی نئی آیت سنتے تو نیا اقرار، نئی تصدیق لاتے ہیں، گویا یہ ان کے ایمان میں اضافہ ہے۔ اللہ پر توکل کرنا یوں ہوتا ہے کہ اپنے سارے کام اس کو سونپ دے، غیر سے کوئی امید نہ رکھے۔ اقامتِ نماز سے یہ مراد ہے کہ فرض نماز کو اس کے وقت میں اس کی حدود وارکان کے ساتھ ادا کرے۔ انفاق سے یہ مراد ہے کہ زکات، حج، جہاد، نیکی اور نزدیکیوں کی تمام اقسام میں مال خرچ کرے جو کہ نماز، صدقہ ہر بھلائی کی اصل اور بنیاد ہے، اس لیے خاص کر ان کا ذکر کیا ہے۔ ایسے ایمان والے، ایمان کے اعلیٰ درجات اور انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔ حق سے یہ مراد ہے کہ ان کے ایمان میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی کفر سے بری ہیں، ایمان داری میں خالص اور سچے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ درجات سے مراد فضیلت و رحمت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نیکی اور نرمی کے اعمال ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اہلِ جنت ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: مغفرت سے مراد گناہوں کا ترک کر دینا ہے۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا کہ جب تم اللہ کو رزاق کریم کہتے سنو تو وہ جنت ہے۔[3]

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا، اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا⑤ وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے، گویا کہ انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور وہ (اسے) دیکھ رہے تھے⑥

بدر کے لیے نکلتے وقت کا اختلاف اور اتباعِ نبی میں خیر:

یعنی غنیمت کا جھگڑا بھی ویسا ہی ہے جیسے نکلتے وقت عقل کی تدبیریں کرنے لگے اور آخر صلاح وہی نکلی جو

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٥) (2) تفسير الرازي (١٥/ ٩٦)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٧۔ ١٦٥٨) فتح البيان (٥/ ١٢٩۔ ١٣٢)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ تم ہر کام میں یہی اختیار کرو کہ حکم برداری میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَمَآ اَخْرَجَكَ ﴾ کے کاف کی بیس وجہیں ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جس طرح تیرے رب نے تجھ کو تیرے گھر مدینے سے نکالا، اسی طرح وہ قتال کے لیے نکلنے میں جھگڑتے ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: مراد نبی اکرم ﷺ کا بدر کی طرف نکلنا،[1] یا مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کے لیے نکلنا ہے، مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ جمہور مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وعدہ مومنین کے لیے حق ہے آخرت میں، جس طرح کہ تیرا گھر سے نکلنا حق واجب ہے، سو اللہ نے تجھ سے اپنا وعدہ پورا کیا اور دشمن پر ظفر یاب کیا۔[2]

امام جمل رحمہ اللہ میں کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور مومنین کا نکلنا قافلے کی غارت گری کے لیے تھا، اس میں ان کو کچھ کراہت نہ تھی۔ کراہت تو نکلنے کے بعد بدر کے قریب پہنچ کر پیدا ہوئی، جب کہ ان کو خبر ملی کہ قافلہ نکل گیا اور قریش بدر میں آ گئے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اب ان سے لڑنا چاہیے، کیونکہ وہ لوگ بے سروسامان نکلے تھے، ارادہ لڑنے کا نہ تھا، بلکہ قافلہ لوٹنے کا تھا۔ کہنے لگے کہ اگر ہم کو پہلے سے جنگ کی خبر دی ہوتی تو ہم جنگ کا ساز و سامان لے کر آتے، لیکن پھر ان کو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ نبی اکرم ﷺ کا ہر حکم ٹھیک ہوتا ہے، وہ جو کچھ حکم دیتے ہیں، سو اللہ کے حکم سے دیتے ہیں۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٧ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٨

اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے، اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے، وہی تمھارے ہاتھ لگے، اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے ⑦ تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے، اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں ⑧

معرکۂ بدر، اللہ کا وعدہ اور حضور کا اہلِ اسلام سے مشورہ:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ قافلہ یا مدد ہمارے ہاتھ لگے گا۔ لوگ چاہنے لگے کہ قافلہ ہاتھ لگے اور بہتر یہی ہوا کہ کفر کا زور ٹوٹا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بدر کا قصہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یوں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٥٩) [2] تفسير القرطبي (٧/ ٣٦٨)

نے سنا کہ ابوسفیان شام سے آ تا ہے، مسلمانوں سے کہا کہ اس قافلے میں قریش کے اموال ہیں، تم باہر نکلو، شاید اللہ تم کو عطا کرے۔ کچھ لوگ نکلے اور کچھ لوگ بھاری ہو گئے۔ اس لیے کہ ان کو یہ گمان نہ تھا کہ نبیِ اکرم ﷺ لڑنے کو نکلتے ہیں۔ ابوسفیان جب حجاز کے نزدیک پہنچا تو خبر لینے کو جاسوس چھوڑے، جو قافلہ ملتا، اس سے حال پوچھتا، اس ڈر سے کہ مبادا اس کے قافلے پر کوئی آ پڑے، یہاں تک کہ بعض کارواں سے خبر ملی کہ نبیِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ تیرے قافلے پر آیا چاہتے ہیں۔ مجبوراً ضمضم بن عمرو غفاری کو اجرت دے کر اہلِ مکہ کی طرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ قریش کو جمع کر کے لے آ اور کہہ کہ آ کر اپنے اموال بچاؤ، کیوں کہ نبی مکرم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ راہ میں حائل ہوئے ہیں۔ ضمضم جلد روانہ ہوا، ادھر وہ گیا، ادھر نبیِ اکرم ﷺ وادیِ ذفران تک پہنچ گئے، خبر لگی کہ قریش اموال کی حفاظت کے لیے آتے ہیں۔

نبیِ کریم ﷺ نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے اچھا مشورہ دیا۔ مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: اللہ کے رسول جو حکم آپ کو اللہ نے دیا ہے وہ جاری کریں، ہم آپ کے ساتھ ہیں، واللہ! ہم آپ سے وہ بات نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی: ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ [المائدة: ٢٤] ”چناں چہ تو اور تیرا رب جائے، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔“ یعنی آپ اور آپ کا رب جائیں، بلکہ ہم اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ ہیں، مقاتلہ کریں گے، قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں برک الغماد، یعنی شہرِ حبشہ کو لے جائیں گے تب بھی آپ کے ساتھ چل کر لڑیں گے، یہاں تک کہ آپ وہاں پہنچ جائیں۔

نبیِ کریم ﷺ نے مقداد کو دعا دی، پھر فرمایا: اے لوگو! تم مجھ کو مشورہ دو۔ یہ خطاب انصار کو تھا، اس لیے کہ وہی لوگ زیادہ تھے، انھوں نے عقبہ میں نبیِ اکرم ﷺ سے بیعت کر کے یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی ذمے داری سے بری ہیں، یہاں تک کہ آپ ہمارے گھر، یعنی مدینے آ جائیں، تب ہم آپ کی حفاظت کے ذمے دار ہوں گے۔ ہم جس طرح اپنے بچوں اور بیویوں کی نگہبانی کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی نگہبانی کریں گے۔ نبیِ اکرم ﷺ کو یہ ڈر تھا کہ مبادا ان کی نصرت جب ہو کہ کوئی دشمن ان کے گھر پر چڑھ آئے اور یہ اپنے گھروں سے نکل کر باہر نہ چلیں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: شاید آپ ہم سے پوچھتے ہیں؟ فرمایا: ہاں، سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپ کی تصدیق کی اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ سچ ہے اور اس پر ہم نے عہد و پیمان باندھا ہے اور سمع و طاعت کا پکا اقرار کیا ہے۔ سو جو کچھ اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے، آپ ویسا ہی کریں، قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہمیں اس دریا کے سامنے کریں گے اور خود اس کے اندر گھسیں گے، ہم بھی آپ کے ساتھ اس دریا میں گھس پڑیں گے، ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا اور ہم اس بات سے ہرگز ناخوش نہیں ہیں کہ کل ہم کو دشمن سے لڑنا ہو گا۔ ہم جنگ کے وقت صابر ہیں اور دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت صادق ہیں اور کیا تعجب ہے کہ اللہ آپ کو خواب میں ایسی بات دکھائے جس سے آپ کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ اللہ کی برکت

کے ساتھ چلیں، ہم بھی چلتے ہیں۔

نبیِ اکرم ﷺ اس بات سے بہت خوش ہوئے، پھر فرمایا: چلو، اللہ کی برکت پر اور خوش خبری لو، اللہ نے مجھ سے ان دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: گو اس وقت میں اپنی آنکھ سے مصارع (لاشوں کے گرنے کی جگہوں) کو دیکھ رہا ہوں۔ بہت سے علمائے سلف وخلف نے اسی طرح کہا ہے۔[1]

دو گروہوں سے مراد:

فتح البیان میں ہے کہ دو گروہوں سے مراد ایک ابوسفیان کا گروہ مع عیر (سامان سے لدے اونٹ) کے ہے، دوسرا گروہ ابوجہل کا مع نفیر (لشکر) کے ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارا مسخر ہو جائے گا، تم ان پر غالب ہو کر جو چاہو سو کرو، قتل کرو، اسیر بناؤ، غنیمت حاصل کرو۔ وہ گروہ تم کو دور نہ کر سکے گا۔ اس میں اپنی نعمت کی یاد دہانی کی۔ تم یہ چاہتے ہو کہ جو قافلہ بغیر ہتھیاروں کے ہے، اس پر کامیابی حاصل کرو اور بغیر لڑے بھڑے غنیمت کا مال ہاتھ آ جائے۔ یہ قافلہ ابوسفیان کا تھا، لیکن اللہ کا یہ ارادہ ہوا کہ اپنا کہا پورا کرے، تم کو ہتھیاروں والے قافلے پر فتح بخشے۔ قریش کے سردار مارے جائیں، بہت سے لوگ قید میں آئیں، ان کے مالوں کو تم لوٹو، حق کو غلبہ حاصل ہو، باطل مغلوب ہو۔ یہ اچھا یا وہ؟ گو مشرکوں کو برا لگے۔ واقعۂ بدر کا قصہ کتبِ حدیث وسیرت اور تاریخ میں مفصل آیا ہے۔[2]

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰

(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمھاری فریاد قبول کر لی (اور کہا) کہ بے شک میں ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا ⑨ اور اس (مدد) کو اللہ نے خوش خبری بنا دیا، تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو جائے اور مدد تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ بے شک اللہ غالب ہے، خوب حکمت والا ⑩

مسلمانوں کا فریاد کرنا اور اللہ کا فرشتے اتار کر مدد کرنا:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بدر کے دن نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کی طرف دیکھا، وہ تین سو سے کچھ اوپر آدمی تھے۔ مشرکوں کی طرف نظر کی وہ ہزار یا زیادہ تھے، اپنی چادر وازار میں قبلہ رو ہو کر کہا: «اَللّٰھُمَّ

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٣٩٩ـ ٤٠٠) [2] فتح البیان (٥/ ١٣٥ـ ١٣٧)

أَنْجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي » ''اے اللہ اپنا وعدہ پورا کر جو مجھ سے کیا۔'' دو بار اسی طرح کہا: پھر فرمایا: « اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هَذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ فَلَا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ أَبَدًا » ''اے اللہ اگر تو نے ان اسلام والوں کی جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر کبھی بھی زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔'' یہاں تک اللہ سے فریاد اور دعا کی کہ چادر آپ ﷺ کے کندھے سے گر گئی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آ کر چادر اٹھائی، پھر پیچھے سے تھام کر کہا: اے اللہ کے نبی! رب سے اتنا کافی ہے، وہ آپ سے اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ اس پر یہ آیت اتاری۔ جب دشمن کا سامنا ہوا، اللہ نے مشرکوں کو شکست دی، ان کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے۔

قیدیوں کے بارے میں مشورہ اور عتابِ الٰہی:

نبیِ اکرم ﷺ نے سیدنا ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کہ کیا کرنا چاہیے، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ ہمارے چچا زاد اور خاندان کے لوگ اور بھائی بند ہیں، میری رائے یہ ہے کہ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے، جو کچھ ہم نے ان سے لیا ہے وہ ہمارے لیے کفار پر قوت ہے اور شاید اللہ ان کو ہدایت دے تو پھر یہ ہمارے دست و بازو ہوں گے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عمر بن خطاب! تم اپنی رائے بتلاؤ! یہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: میری وہ رائے نہیں ہے جو ابوبکر کی رائے ہے، لیکن میری رائے یہ ہے کہ فلاں کو میرے سپرد کر دیں میں اس کی گردن ماروں، وہ عمر کا رشتے دار تھا، عقیل پر علی کو قدرت دیں کہ وہ اس کی گردن ماریں اور حمزہ کو اس کے فلاں بھائی پر متمکن کریں کہ وہ اس کی گردن ماریں، تاکہ اللہ بھی جان لے کہ ہمارے دلوں میں مشرکوں کی کچھ طرف داری نہیں ہے۔ یہ اہلِ شرک کے بڑے سردار اور سالار ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات مانی، میری نہ مانی، فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا۔

دوسرے دن جب میں نبی کریم ﷺ اور ابوبکر کے پاس گیا، دیکھا دونوں رو رہے ہیں، میں نے کہا: آپ اور آپ کے صاحب کیوں روتے ہیں؟ اگر رونے والی بات ہو تو میں بھی روؤں اور اگر نہ روسکوں تو رونے والا منہ بناؤں۔ نبی کریم ﷺ نے اس شخص سے کہا جس نے فدیہ لینے کی صلاح دی تھی کہ تمھارا عذاب مجھ پر اس درخت سے بھی زیادہ قریب پیش کیا گیا، وہ درخت اس جگہ قریب ہی تھا نبیِ اکرم ﷺ کے۔ اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ﴾ [الأنفال: ٦٧۔ ٦٩] ''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامانِ دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم

نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا۔ پھر جو حلال، پاکیزہ غنیمت تم نے حاصل کی ہے، اس میں سے کھاؤ۔“

اُحد کی مصیبت:

پھر جب اُحد کا دن آیا تو بدر کے دن فدیہ لینے کے عوض سزا یاب ہوئے، ان کے ستر آدمی مارے گئے، اصحاب نبیِ اکرم ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے کے رباعی دانت ٹوٹ گئے، سر کی کھوپڑی پر چوٹ آئی، خون منہ پر بہنے لگا، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [آل عمران: ١٦٥] ”بھلا تمھارا کیا حال ہے جب (اُحد میں) تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ حالاں کہ (بدر میں) تم نے اس سے دگنی مصیبت کافروں کو پہنچائی تھی۔ کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔“ یعنی بسبب تمھارے فدیہ لینے کے۔[1] (رواه أبو داود و مسلم والترمذي و ابن جرير و ابن مردويه)

مردفین کی تفسیر اور فرشتوں کی تعداد:

لفظ مردفین کے یہ معنی ہیں کہ یَرْدِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی مُتَتَابِعِيْنَ یا ردف سے مراد نَجدَتْ ہے، یعنی مدد۔ امام مجاہد، ابن زید اور ابن کثیر قاری رحمہم اللہ نے کہا: أَيْ مُمِدِّيْنَ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: ”وَرَآءَ كُلِّ مَلِكٍ مَلَكٌ“، کسی نے کہا: ”بَعْضُهُمْ عَلٰى أَثَرِ بَعْضٍ“، یہی ابوظبیان، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے۔[2]

ابن جریر سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ جبریل علیہ السلام ہزار فرشتے مددگار لے کر نبی کریم ﷺ کی دائیں جانب اترے اور اسی طرف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور میکائیل علیہ السلام بھی ہزار فرشتے لے کر نبی اکرم ﷺ کی بائیں جانب اترے اور میں اسی طرف تھا۔[3] یہ اسناد اگر صحیح ٹھہرے تو ثابت ہوا کہ ہزار کے ساتھ ایک ہزار اور تھے۔ اس لیے کہ بعض نے ”مردفین“ کو بفتح دال مہملہ پڑھا ہے۔ واللہ أعلم. لیکن مشہور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہے کہ کل ایک ہزار فرشتے تھے، پانچ سو جبریل علیہ السلام کے ساتھ اور پانچ سو میکائیل علیہ السلام کے ساتھ۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨١) تفسير الطبري (١٣/ ٤٠٩) مسند أحمد (١/ ٣٠)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٤١٢۔ ٤١٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٨٤)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٤١٧) اس کی سند میں ”عبدالعزیز بن عمران“ ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٣/ ٤٢٣۔ ٤٢٤) اس کی سند حسن ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ایک مشرک کے پیچھے دوڑتا تھا کہ اتنے میں ایک چابک اور ایک سوار کی آواز سنتا، وہ کہتا ہے: قدم حیزوم، دیکھا تو وہ مشرک چابک کی چوٹ سے سامنے گر پڑا اور اس کا منہ شق ہو گیا۔ سارے مشرکوں کی یہی گت ہوئی۔ ایک انصاری نے آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ کہا، فرمایا: تو نے سچ کہا، یہ مدد تیسرے آسمان کی ہے۔ غرض کہ اس دن ستر آدمی مارے گئے اور ستر آدمی گرفتار ہوئے۔[1]

حاضرینِ بدر کا مقام:

امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب شھود الملائکة بدراً" میں رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، کہا: تم اہلِ بدر کو کیسا جانتے ہو؟ کہا: وہ افضل مسلمین ہیں یا اس کے قریب کوئی اور کلمہ فرمایا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: اسی طرح وہ ملائکہ افضل ہیں جو بدر میں حاضر ہوئے۔ اس روایت کے ساتھ امام بخاری متفرد ہیں۔ اس کو طبرانی رحمہ اللہ نے معجم کبیر میں حدیث رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے،[2] لیکن وہ خطا ہے۔ صحیح یہی روایت ہے جو بخاری کی ہے۔ واللہ أعلم.

صحیحین میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: جب کہ انھوں نے حاطب بن ابی بلتعہ کے قتل کا مشورہ دیا کہ وہ حاضرِ بدر تھا تو کیا جانے شاید اللہ اہلِ بدر پر مطلع ہوا ہو اور کہا: "اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ"[3]

فرشتوں کی حاضری اور مسلمانوں کے ہاتھوں کافروں کو مروانے میں حکمتیں:

اللہ نے کہا کہ فرشتوں کا بھیجنا اور تم کو اس امر کا علم دینا بطورِ بشارت وطمانیتِ قلب کے ہے، ورنہ اللہ قادر ہے کہ تم کو تمھارے اعدا پر نصرت بخشے، کیونکہ نصرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مدد کے بغیر بھی ہو سکتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛ ؕ وَلَوْ یَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّیَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَیَهْدِیْهِمْ وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَیُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ﴾ [محمد: ٤۔ ٦] "چناں چہ جب تم (جہاد میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو (ان کی) گردنیں مارو، حتی کہ جب تم انھیں خوب قتل کر چکو تو (قیدیوں کو) بیڑیوں میں مضبوطی سے باندھ دو، پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے، حتی کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے، (حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا، لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے، اور جو

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٦٣) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٧٧١) المعجم الکبیر (٤/ ٢٧٧)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٨٤٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩٤)

لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے، تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ وہ جلد ان کی راہنمائی کرے گا اور اُن کے حال کی اصلاح کرے گا۔ اور وہ انھیں (اس) جنت میں داخل کرے گا جس کی ان کو خوب پہچان کروا چکا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [آل عمرن: ۱۴۰۔ ۱۴۱] ''ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔ اور (تمھیں یہ زخم اس لیے لگے کہ) اللہ جاننا چاہتا تھا کہ کون ایمان والے ہیں؟ اور وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ دینا چاہتا تھا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور (ایک وجہ یہ تھی کہ) اللہ ایمان والوں کو پاک صاف کر دینا اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔''

ان حکمتوں کے لیے اللہ نے مومنین کے ہاتھوں سے کفار کا جہاد شروع کیا ہے، ورنہ پہلی امتوں کو، جنھوں نے انبیا کو جھٹلایا تھا، اللہ نے عام عذاب فرمایا تھا، جس طرح کہ قومِ نوح علیہ السلام کو طوفان سے اور عادِ اولیٰ کو تیز ہوا سے اور ثمود کو چیخ سے اور قومِ لوط کو خسف (دھنسانا) الثانے اور سجیل کے پتھروں سے اور قومِ شعیب کو الظلہ سے ہلاک کیا، پھر جب موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے اور اللہ نے ان کے دشمن فرعون کو اس کی قوم کے ساتھ دریا میں غرق کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری، اس میں شریعت رکھی، کفار نے کہا کہ یہ حکم باقی شریعتوں میں موسیٰ کے بعد جاری رہے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ [القصص: ۴۳] ''اور بلاشبہہ ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی جو لوگوں کے لیے بصیرت افروز دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

مومنوں کا کافروں کو قتل کرنا، کافروں کی بڑی اہانت تھی اور مومنین کے سینوں کے لیے بڑی شفا تھی، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس امت کے مومنوں کو فرمایا ہے: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [التوبة: ۱۴] ''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا۔''

اسی طرح قریش کے رئیس اور سردار اپنے ان دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے، جن کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس میں قریش کی توہین اور بے عزتی ہوئی اور ایمان والوں کا دل ٹھنڈا ہوا، جیسے ابوجہل کا قتل ہونا۔ معرکہ میں مرنا اس کی بہت توہین تھی، بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے بستر پر مرتا، کسی عذاب قارعہ یا صاعقہ یا اس جیسے کسی اور عذاب سے مر جاتا، جس طرح ابولہب ۔لعنہ اللہ۔ عدسہ سے مر گیا، اُس کا کوئی قریبی اس کے پاس نہ گیا، بلکہ دور سے اُس پر پانی ڈالا اور اتنے پتھر پھینکے کہ وہ چھپ گیا، اسی لیے فرمایا کہ اللہ زور آور ہے، یعنی دنیا اور آخرت میں عزت اللہ کو

اس کے رسول کو اور مومنین کو ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [الغافر: ٥١] ”بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔“ پھر فرمایا کہ اللہ حکیم ہے، یعنی صاحبِ حکمت، باوجود اس کے کہ کافروں کو ہلاک اور نیست و نابود کرنے پر اپنی قوت سے بذاتِ خود قادر ہے، لیکن کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کو مشروع کیا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں یہ ہے کہ جب مسلمانوں نے یہ جانا کہ ہتھیار بند گروہ سے لڑنا ضرور ہے اور اللہ کا یہی حکم اور ارادہ ہے اور دیکھا تو اپنے آپ کو کم اور ان کو بہت زیادہ پایا تو اللہ سے فریاد رسی کرنے لگے اور بعض نے کہا کہ صرف نبی کریم ﷺ ہی مستغیث تھے۔ اللہ نے وہ قصہ ان کو یاد دلایا اور اپنی مدد ہی کا ذکر کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ کریم ﷺ کی مدد ایک ہزار سے زیادہ فرشتوں سے نہیں کی گئی، تین ہزار اور پانچ ہزار کا ذکر فقط بشارت کے طور پر کیا گیا ہے۔[1]

سلیمان جمل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بدر کے سوا کسی اور جنگ میں ملائکہ کا لڑنا ثابت نہیں ہوا، ہاں ملائکہ کا نزول مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے ہوتا تھا، جس طرح حنین میں اتفاق ہوا، لیکن جنگ کسی جگہ نہیں کی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہمیں اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ بدر کے دن ملائکہ ہمارے ہمراہ تھے اور بدر کے بعد اللہ جانے۔[2] کچھ بھی ہو، اور حقیقت میں مددگار اللہ ہی ہوتا ہے۔ فرشتوں کا اس امر میں دخل نہیں ہے۔ وہ تو مدد کے دوسرے اسباب کی طرح ایک سبب ہیں، جن کو اللہ نے مدد کا سبب ٹھہرایا تھا۔

اس آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ مسلمان پر واجب ہے کہ تمام امور میں صرف اللہ ہی پر توکل کرے اور اللہ کے بغیر کسی اور سے مدد نہ چاہے، کیونکہ کامیابی اور عنایت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔[3]

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝۱۱

(یاد کرو) جب وہ (اللہ) اپنی طرف سے تمھیں امن و سکون دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا، اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا، تاکہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسوں کو لے جائے اور تاکہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے، اور تاکہ اس کی وجہ سے (تمھیں) ثابت قدم رکھے ⑪

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٤١٨) [2] الدر المنثور (٤/ ٣١) [3] فتح البيان (٥/ ١٣٧۔ ١٣٩)

ثابت قدمی دل کی مضبوطی اور شیطانی وساوس کو دور کرنے کے لیے اونگھ اور بارش کا امتزاج:

جب دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے، رات کو مسلمانوں کو غسل کی حاجت ہوگئی اور پانی پینے کا بھی نہ تھا اور زمین ریتلی تھی، جہاں پاؤں نہ ٹھہریں، صبح کو لڑائی درپیش۔ یہ چیزیں دیکھ کر مسلمان ڈرے کہ شکست کے آثار ہیں، اس وقت خوب بادل برسا کہ غسل اور پیاس کے لیے کافی ہوا اور زمین جم گئی اور ایک اونگھ آ پڑی، اس سے چونکے تو دل کا خوف جاتا رہا۔

احد میں اُونگھ:

اللہ نے اپنی نعمت یاد دلائی کہ دیکھو کس طرح تم پر ہم نے اونگھ ڈال دی، جس کے سبب وہ ڈر، جو دشمن کی کثرت سے تم کو تھا، وہ جاتا رہا۔ اسی طرح احد کے دن بھی اتفاق ہوا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجٰهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴾ [آل عمران: ١٥٤] ''پھر اس نے (غم کے بعد) تم پر سکون نازل کیا جس سے تمھارے ایک گروہ پر اونگھ طاری ہوگئی اور دوسرا گروہ جس کے نزدیک ساری اہمیت اپنی ذات ہی کی تھی، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلانہ طور پر گمان کرنے لگا۔ وہ کہتے تھے: کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دیجیے: سب اختیار اللہ ہی کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ (ﷺ) کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دیجیے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا لکھا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے، اور یہ اس لیے ہوا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور تاکہ تمھارے دلوں میں سے وسوسے صاف کر دے اور اللہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔''

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں انھی میں تھا جن کو احد کے دن اونگھ آئی تھی، کئی بار میرے ہاتھ سے تلوار گر پڑی، پھر میں نے اٹھائی میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ڈھالوں کے نیچے جھکی جاتی تھی۔[1] سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم میں بدر کے دن کوئی سوار نہ تھا، مگر مقداد، جس کو ہم دیکھتے تھے وہ سوتا تھا، مگر رسول اللہ ﷺ کہ ایک درخت کے نیچے نماز

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٤١) تفسير الطبري (٧/ ٣١٧)

پڑھتے اور روتے تھے، یہاں تک کہ صبح ہوئی۔[1]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: لڑائی سے اونگھنا اللہ کی طرف سے امن ہے اور نماز میں اونگھنا شیطان کی طرف سے ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اونگھ سر میں ہوتی ہے اور نیند دل میں۔[3] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اونگھ ان کو احد کے دن ہوئی تھی، یہ ماجرا مشہور ہے۔

بدر میں اُونگھ:

رہا بدر کا دن سو یہ آیت سیاقِ بدر میں ہے اور دلیل ہے کہ اُس دن اونگھ واقع ہوئی تھی۔ یہ اونگھ مومنوں کے لیے لڑائی کی شدت کے وقت اس لیے تھی کہ ان کے دل اللہ کی مدد پر مطمئن ہو جائیں۔ یہ ان کے حال پر اللہ کی ایک رحمت اور نعمت تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الانشراح: ٥۔ ٦] ''پھر بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔'' صحیح میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بدر کے دن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک جھونپڑی میں دعا کرتے تھے، اتنے میں نبی کریم ﷺ کو نیند کا جھونکا آنے لگا، چونک کر تبسم فرمایا اور کہا: اے ابوبکر خوش ہو جاؤ، یہ جبریل موجود ہیں، ان کے دانتوں پر گرد ہے، پھر جھونپڑی کے دروازے سے نکلے، اس آیت کو پڑھتے تھے: ﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ [القمر: ٤٥] ''عن قریب وہ جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ بدر کی طرف چلے، مشرکین اور پانی کے درمیان ریت کا ایک ٹیلہ تھا، اس دن مسلمانوں کو شدید ضعف پہنچا، شیطان نے ان کے دلوں میں غصہ ڈالا، یہ وسوسہ کیا کہ تم اپنے آپ کو اللہ کا دوست دار شمار کرتے ہو اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں، حالانکہ مشرکین پانی پر غالب آ گئے، اب تم حالتِ جنابت میں نماز پڑھو گے، اللہ پاک نے خوب ہی پانی برسایا، مسلمانوں نے پیا اور نہا دھو کر پاک ہو گئے، شیطان کا وہ وسوسہ دور ہو گیا، بارش سے ریت سخت پڑ گئی، آدمی اور جانور سب اس پر بخوبی چل کر قوم کی طرف چلے۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ اور مومنوں کی امداد کے لیے ایک ہزار فرشتے بھیجے۔ اسی کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ کئی روایات لکھی ہیں، سب کا حاصل مطولاً و مختصراً ایک ہی ہے۔[5]

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٢٥) مسند أبي يعلىٰ (١/ ٢٤٢) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٣١)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٤١٩) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٦٤) اس کی سند صحیح ہے۔ [3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٦٤)

[4] صحیح بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی، البتہ اس موضوع کی روایت مروی ہے۔ نیز ان الفاظ کے ساتھ روایت آیت کے ذکر کے بغیر امام بیہقی رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥٨) دلائل النبوة (٣/ ٨٠۔ ٨١)

[5] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٨٦۔ ٣٨٧)

تطہیر کی تفسیر:

تطہیر سے مراد حدثِ اصغر یا اکبر سے پاک ہونا ہے، یہ تطہیر ظاہر ہوئی اور دل سے وسوسۂ شیطان اور برے خیالات کا دور کرنا تطہیرِ باطن ہوئی۔ جس طرح کہ اللہ نے اہلِ جنت کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ﴾ [الدھر: ۲۱] ''ان (کے تن) پر باریک، سبز اور دبیز ریشم کے کپڑے (لباس) ہوں گے، اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔'' یہ ظاہری زینت ہوئی۔ ﴿وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ [الدھر: ۲۱] ''اور اُن کا رب انھیں شرابِ طہور پلائے گا۔'' یعنی جو انھیں کینہ، حسد اور آپس کے بغض سے پاک کرنے والی ہوگی، یہ زینت اور طہارت باطن کی ہوئی۔ پھر دل کو مربوط کیا، یعنی صبر اور لڑنے والے دشمنوں پر غلبہ دے کر، یہ شجاعتِ باطن ہوئی اور قدموں کو ثابت رکھنا یہ شجاعتِ ظاہر ہوئی۔ واللہ أعلم

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نعاس (اونگھ) سے مراد ہلکی نیند ہے۔ یہ اونگھ اس رات کو آئی جس کی صبح کو لڑائی ہونے والی تھی۔ اس اونگھ سے دو فائدے ہوئے: ایک جنگ کے لیے استراحت (آرام وسکون) دوسرے ان کے دلوں سے رعب کا دور ہو جانا۔ اور بعض نے کہا: یہ اونگھ دونوں صفوں کی مڈبھیڑ کے وقت آئی تھی۔ اسی طرح کا قصہ سورت آل عمران میں بھی اُحد کے دن کا گزر چکا ہے۔[1]

غرض کہ یہ اونگھنا دو بار ہوا تھا: ایک احد میں اور دوسرے بدر میں۔ کسی نے کہا: یہ اونگھ معجزے کے حکم میں تھی، اس لیے کہ ایک ایسا امر تھا جو خلافِ معمول تھا، پھر اونگھ کے بعد پانی برسایا اس سے پہلے کفار نے آگے بڑھ کر پانی پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمان بے آب رہ گئے تھے۔ اللہ نے شبِ بدر میں خوب پانی برسایا، جس سے غبار بیٹھ گیا، ریت سخت پڑ گئی، چلنے پر مدد ملی، پاؤں زمین پر جمنے لگے، ورنہ پہلے قدم ریت میں دھنستے تھے۔ مگر سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں یوں ہے کہ پانی کی طرف مسلمان بڑھ گئے اور قریش بارش کی وجہ سے پانی تک نہ پہنچ سکے۔[2]

تطہیر سے مراد حدث اور جنابت کا دور ہونا ہے اور رجزِ شیطان سے مراد دل کے وسوسے ہیں، جن کی وجہ سے کفار کی کثرتِ تعداد کے خیال سے ڈر کر ہمت ہارے جاتے تھے۔ گویا موت کی طرف لیے جاتے ہیں، اللہ نے ان کے دلوں کو مدد اور یقین سے باندھا، دل قوی ہو گئے، جنگ اور قتال کے وقت ثابت قدم نکلے، جنگ کے معرکوں میں جمے رہے اور ہموار رہے۔[3]

[1] سورت آلِ عمران [الآیۃ: ۱۵٤] [2] السیرۃ النبویۃ لابن ھشام (۳/ ۱٦۷) [3] فتح البیان (۵/ ۱٤۰۔ ۱٤۲)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝۱۲ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۳ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۝۱۴

(اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، چناں چہ تم ان کو ثابت (قدم) رکھو جو ایمان لائے ہیں، میں جلد ہی ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا جنھوں نے کفر کیا، چناں چہ تم (ان کی) گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر (ہر) پور پر ضرب لگاؤ⑫ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے⑬ پس تم یہ (سزا) چکھو اور بے شک کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب (تیار) ہے⑭

اللہ کی فرشتوں کو ہدایات اور جنگ میں ان کی عملی مشارکت:

کافروں کے دل فرشتوں کے الہام کے قابل نہیں، اس لیے رعب ڈالنا اپنے ذمے لیا اور مسلمانوں کے دل ثابت کرنے کے لیے حکم فرمایا، اس جنگ میں فرشتے ہاتھوں سے بھی لڑے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مخفی نعمت تھی جس کو اللہ نے ظاہر کیا، تاکہ اس کا شکر بجا لائیں، یعنی ان فرشتوں کو جن کو نبی اور مومنین کی مدد کے لیے بھیجا تھا، یہ حکم دیا کہ تم مسلمانوں کے دلوں کو بھی مضبوطی دو اور خود بھی ان کی مدد کرو اور ان کے ہمراہ ہو کر لڑو اور ان کے گروہ کو بڑھاؤ، یہ اس طرح پر ہوتا تھا کہ فرشتہ ایک صحابی کے پاس آتا اور کہتا: میں نے مشرکوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر یہ مسلمان ہم پر حملہ کریں گے تو ہم بھاگ اٹھیں گے، پھر مسلمان آپس میں اس کا چرچا کرتے، ان کے دلوں کو قوت اور طاقت آتی۔[1] (حکاہ ابن جریر)

پھر فرمایا کہ سر کو توڑو، گردن کو کاٹو، اطراف کو قطع کرو، مراد ہاتھ پاؤں ہیں۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: لوگ بدر کے دن فرشتوں کے ہاتھوں مارے ہوئے لوگوں کو پہچانتے تھے، کسی کا سر گردن پر سے اڑا دیا تھا اور کسی کے پوروں پر ضرب پہنچائی تھی، جیسے کہ آگ سے جلا دیتے ہیں اور داغ پڑ جاتا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ابوجہل

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٤٢٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٨٧)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٦٨)

نے کہا تھا کہ ان مسلمانوں کو یکبارگی قتل نہ کرو، بلکہ پکڑ لو، تاکہ جو کچھ طعن انھوں نے تمھارے دین میں کیا ہے اور لات وعزیٰ سے بے رغبت ہوئے ہیں (منہ موڑا ہے) وہ ان کو جتلا دو۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ تم ان کی گردنیں اور جوڑ کاٹو، ہم ان کے دل میں تمھارا رعب ڈال دیں گے۔ چنانچہ انہتر آدمیوں کے درمیان ابوجہل مارا گیا اور عقبہ بن ابی معیط گرفتار ہو کر بطور صبر (باندھ کر، بطور ٹارگٹ کلنگ) مقتول ہوا۔

یہ سب ستر لوگ مارے گئے،[1] اللہ نے فرمایا: یہ اس لیے ہوا ہے کہ یہ ایک شق (حصے) میں رہے اور شرع و ایمان کو دوسرے حصے میں چھوڑ دیا۔ سو اللہ اپنے مخالف اور دشمن پر غالب ہوتا ہے۔ کوئی شے اس سے بچ نہیں سکتی اور نہ کوئی شے اس کے غضب کا سامنا کر سکتی ہے۔ "لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ"، پھر کفار کو خطاب کیا کہ لو اب دنیا کا عذاب اور سزا چکھو اور آخرت میں آگ کا عذاب الگ ہو گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں مدد اور معاونت کے ساتھ تمھارے ہمراہ ہوں۔ ابوامامہ بن سہل کہتے ہیں کہ میرے باپ نے مجھ سے کہا: اے بیٹے! ہم نے بدر کے دن دیکھا کہ ہم میں سے ایک شخص اپنی تلوار مشرک کی طرف اٹھاتا ہے، ابھی تلوار اس کو نہیں لگی کہ اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔[2] تثبیت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح شیطان کو ابن آدم کے دل میں برے وسوسے ڈالنے کی قوت ہے، اسی طرح فرشتے کو انسان کے دل میں اچھے خیالات القا کرنے کی قوت ہے۔ سو القائے شیطانی کا نام وسوسہ ہے اور القائے فرشتہ کا نام لمہ والہام ہے۔ فهذا هو التثبيت.

رعب سے مراد خوف ہے، یعنی کفار کو مارے ڈر کے ثابت قدمی نصیب نہ ہو گی۔ یہ اللہ کا ایک احسان تھا مومنوں کے حال پر کہ کافروں کے دل میں ان کا رعب اور خوف ڈال دیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ فرشتوں کو بنی آدم کا سا لڑنا نہیں آتا، اس لیے اللہ نے ان کو قتال کا طریقہ بتایا کہ گردن پر انگلیوں پر مارو، یہ اس لیے کہ جب سر اڑ گیا یا ہاتھ پاؤں کٹ گئے تو اب دشمن لڑ نہیں سکتا۔ اللہ نے حکم دیا کہ جسم کے اوپر کے حصے پر مارو کہ وہ سر ہے۔ سر پر مارنے سے انسان کی ہلاکت ہے اور حکم دیا کہ سب سے کمزور اعضا کو مارو کہ وہ پور ہیں، ان کو مارنے سے انسان کی حرکت معطل ہو جاتی ہے، اس کے اندر جسم کا ہر عضو داخل ہے۔[3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝۱۵ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۳۸۸) [2] الدر المنثور (٤/ ۳۳) [3] فتح البیان (٥/ ١٤٢۔ ١٤٣)

لِقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

اے ایمان والو! جب تمھارا ان لوگوں کے لشکر سے مقابلہ ہو جنھوں نے کفر کیا تو تم ان سے پیٹھیں نہ پھیرو ⑮ اور جو شخص اس دن ان سے پیٹھ پھیرے گا، سوائے اس شخص کے جو لڑائی کے لیے پینترا بدلنے والا ہو یا (اپنے) کسی گروہ کی پناہ لینے والا ہو، تو یقیناً وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے ⑯

میدانِ جنگ سے بھاگنے کی ممانعت اور گناہ:

یعنی جب مقابلہ میدان میں ہو تو بھاگنا بہت بڑا گناہ ہے اور جو ڈر ہو یا غارت (جنگی چال) تو بھاگنا بہتر ہے۔ اللہ نے میدانِ جنگ سے بھاگنے پر آگ کی وعید سنائی، مگر اس صورت میں کہ وہ بھاگنا کسی گھات کے لیے یا دوسرے گروہ کی مدد کے لیے ہو، مثلاً: بھاگنے سے دشمن یہ خیال کرے کہ اس سے ڈر کر بھاگا ہے مگر پھر موقع پر پہنچ کر اور پھر کر اس کو قتل کرے، اس طرح کے بھاگنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سعید بن جبیر اور سدی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] یا ایک سرے سے نکل کر امیر لشکر یا امام اعظم کی طرف جائے کہ اس طرح کا بھاگنا رخصت میں داخل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے لشکروں میں سے ایک چھوٹے لشکر میں تھا کہ اتنے میں لوگ یکسو ہو گئے، میں بھی انھی میں تھا جو ہٹ آئے تھے۔ میں نے کہا کہ اب کیا کریں، ہم تو لڑائی میں سے بھاگے اور اللہ کا غصہ لے کر پھرے، اگر شہر میں پہنچ جائیں تو رات وہیں بسر کریں، پھر ہم نے کہا: نہیں، بلکہ اپنی جانوں کو نبیِ اکرم ﷺ پر پیش کریں، اگر ہمارے لیے توبہ ہو تو بہتر، وگرنہ پھر چل دیں، ہم صبح کی نماز سے پہلے نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آئے، آپ ﷺ نے نکل کر کہا: « مَنِ الْقَوْمُ؟ » یعنی تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا: ''نَحْنُ الْفَرَّارُوْنَ''، یعنی ہم بھگوڑے ہیں، فرمایا: « لَا بَلْ أَنْتُمُ الْعَكَّارُوْنَ، أَنَا فِئَتُكُمْ وَأَنَا فِئَةُ الْمُسْلِمِيْنَ » یعنی بلکہ تم مکرر (لوٹ کر) حملہ کرنے والے ہو، میں تمھارا اور سب مسلمانوں کا گروہ ہوں، ہم نے آپ ﷺ کا ہاتھ چوما۔ (رواه أحمد وهكذا رواه أبو داود والترمذي و ابن ماجه) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ پھر نبیِ اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ ﴾ (آیتِ باب)[2]

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٧٠)

② مسند أحمد (٢/ ٧٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٠٤) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٧١) اس کی سند میں ''یزید بن ابی زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ (إرواء الغليل: ٥/ ٢٧)

اہلِ علم نے کہا ہے کہ عَكَّارُوْنَ کے معنی ہیں: ''اَلْعَطَّافُوْنَ'' (لوٹ کر آنے والے)۔ ابو عبید جب مجوسیوں کے لشکر کی زیادہ تعداد کے سبب ان کے کنارے پر زمینِ فارس کے پال پر مارے گئے تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر میرے پاس آ جاتا تو میں اس کا لشکر ہوتا، پھر کہا: اے لوگو! میں تمھاری فوج ہوں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''أَنَا فِئَةُ كُلِّ مُسْلِمٍ''[1] (میں ہر مسلمان کی جماعت ہوں)۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ''مُتَحَيِّزٌ'' سے مراد وہ ہے جو بھاگ کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کے پاس آیا، اسی طرح آج کے دن جو کوئی بھاگ کر امیر کے یا اصحاب کے پاس آئے وہ متحیز ہے۔[2]

رہا بغیر کسی ایسے سبب کے بھاگنا جن کا ذکر کیا گیا ہے، سو وہ حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو! کہا: وہ کیا ہیں؟ فرمایا: لڑائی کے دن پیٹھ پھیرنا...الحدیث (لمبی حدیث)۔[3] اور اسی لیے اللہ نے کہا ہے کہ وہ اللہ کا غصہ لے کر پھرا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے کہ تین چیزیں ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی عمل فائدہ نہیں کرتا، شرک باللہ وعقوق والدین (والدین کی نافرمانی یا انھیں ستانا) وفرار من الزحف (میدانِ جنگ سے بھاگنا)۔[4] (رواه الطبراني وهو غريب جدا)

ایک مذہب یہ ہے کہ فرار صحابہ پر حرام تھا، اس لیے کہ جہاد ان پر فرضِ عین تھا یا خاص انصار پر حرام تھا، کیونکہ انھوں نے حالتِ نشاط وکراہت میں سمع وطاعت پر بیعت کی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد خاص اہلِ بدر ہیں، صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے، اس لیے کہ ان کا کوئی گروہ سوا ان کی جماعت کے شوکت دار نہ تھا، جس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هَذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ»[5] اس لیے امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حکم بدر کے دن تھا۔ آج اگر کوئی بھاگ کر اپنے گروہ یا شہر کی طرف آ ملے تو اس پر کچھ ڈر نہیں ہے۔

یزید بن ابی حبیب رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ نے دن بدر کے بھاگنے والوں پر آگ واجب کی تھی، لیکن جب احد کا دن آیا تو فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۵۵] ''بے شک جب دو لشکر (احد میں) آپس میں ٹکرائے تھے تو تم میں سے جن لوگوں نے پسپائی اختیار کی، یقیناً وہ اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب شیطان کے بہکاوے میں آ گئے تھے اور بلاشبہ اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔''

---

[1] تفسير الطبري (۱۳/ ۴۳۹۔ ۴۴۰) [2] تفسير الطبري (۱۳/ ۴۳۵۔ ۴۳۶)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۶۱۵) صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۹)

[4] المعجم الكبير (۲/ ۹۵) اس کی سند میں ''یزید بن ربیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۳۸۴)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۶۳)

پھر سات برس کے بعد حنین کا دن آیا تو اللہ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴾ [التوبة: ٢٥] ''پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے۔'' ﴿ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [التوبة: ٢٧] ''پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا مہربانی فرمائے گا۔'' ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آیت اہلِ بدر کے حق میں اتری ہے۔[1] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سب اس کے منافی نہیں ہے کہ زحف سے فرار غیر اہلِ بدر پر بھی حرام ہو۔ گو نزول آیت کا اہلِ بدر ہی کے حق میں ہوا ہے، اس لیے کہ اوپر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سات ہلاک کرنے والے گناہوں کے بارے میں گزر چکی ہے۔ کما هو مذهب الجماهير. والله أعلم.[2]

میں کہتا ہوں کہ فتح البیان میں بھی اسی عمومیت کو ترجیح دی ہے اور یہی قابلِ ترجیح ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے، خصوصیتِ سبب کا نہیں۔ یہ ضابطہ اہلِ اصول کے ہاں مسلّم ہے۔ ولله الحمد.

زحف کے اصل معنی کم کم نزدیک ہونا ہے، جیسے چوتڑوں کے بل سرکنا۔ پھر جنگ کی طرف ہر چلنے والے کو زاحف کہنے لگے۔ اللہ نے مومنوں کو کفار کے مقابلے کے وقت ان کے مقابلے سے پشت پھیرنے سے منع کیا۔ ظاہر آیت ہر مومن کے حق میں عام ہے، ہر زمانہ اور ہر حال میں مگر تحرف اور تحیز کے وقت۔ ایک جماعت صحابہ سے آیا ہے کہ دشمن سے مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھیرنا کبیرہ گناہ ہے۔ تحرف سے مراد انعطاف و میل ہے، یعنی قتال کی غرض سے کنارہ کشی ہو کہ دشمن کو دھوکا دے کر مارے، کیونکہ لڑائی دھوکے کا نام ہے۔ متحیز سے وہ شخص مراد ہے جو منضم (ملا ہوا) اور اہلِ اسلام کی جماعت کی طرف ہوتا ہے۔ اگر بغیر اسباب کے بھاگا ہے تو پھر اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اس آیت میں زحف بھاگنے والے کے لیے وعیدِ شدید ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ میدانِ جنگ سے فرار کبیرہ گناہ اور ہلاک کر دینے والا گناہ ہے۔[3]

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۷ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ
كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۸

چناں چہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا، اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٤٣٨۔ ٤٣٩) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٩٠) [3] فتح البيان (٥/ ١٤٥۔ ١٤٧)

اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ⑰ یہ تھی بات (ہماری حکمت) اور بے شک اللہ کافروں کی چال کمزور کرنے والا ہے ⑱

قتل اور خاک اندازی کی اللہ کی طرف نسبت:

جب جنگ کی شدت ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے ایک مٹھی کنکریاں اس لشکر کی طرف پھینکیں، اللہ کی قدرت سے ہر کسی کی آنکھ میں خاک پہنچی اور اس کے بعد شکست کھائی۔ یہ فرمایا کہ مسلمان سمجھیں کہ فتح ہماری قوت سے نہیں، بلکہ سب اللہ کی مدد سے ہے تو کسی بات میں اپنا دخل نہ کریں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ سارے افعالِ عباد کا خالق اللہ ہے، جو بھلائی اللہ کے بندوں سے صادر ہوتی ہے، اس پر تعریف اللہ ہی کی ہوتی ہے، کیونکہ اس خیر کی توفیق دینے والا اور اس پر اعانت کرنے والا وہی ہے۔ اسی لیے یوں کہا کہ تم ان کو نہیں مارا، بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا، یعنی تمھارا ان دشمنوں کو قتل کرنا، باوجود ان کی کثرت اور تمھاری قلت کے کچھ تمھاری طاقت اور قوت سے نہیں ہوا، بلکہ اللہ نے تم کو ان پر کامیابی عطا کی۔

یہ کام اللہ کا تھا، نہ کہ تمھارا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ﴾ [آل عمران: ۱۲۳] ”اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔“ نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴾ [التوبة: ۲۵] ”یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جب کہ تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا، تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے۔“

اللہ نے یہ بات بتائی کہ نصر (مدد) کچھ کثرتِ عدد اور ہتھیار پہننے پر نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے ہے، جیسے اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ۲۴۹] ”کئی بار چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

پھر اللہ نے اس مشتِ خاک کے بارے میں بھی جو نبیِ اکرم ﷺ نے کافروں کے منہ پر پھینکی تھی اور کہا تھا: «شَاهَتِ الْوُجُوْهُ» اور آپ ﷺ نے یہ جھونپڑی (خیمے) سے نکلنے کے بعد اور اللہ سے دعا، عاجزی اور استکانت کے بعد پھینکی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تھا کہ اس پھینکنے کے ساتھ ہی حملہ کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور وہ کنکریاں مشرکوں کی آنکھوں میں جا لگیں، کوئی نہ بچا، جس کو وہ نہ پہنچی ہوں اور اُس کو اس کے حال سے مشغول نہ کر دیا ہو۔ اللہ نے اس بارے میں یوں فرمایا کہ یہ مشتِ خاک تو نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور اسی نے ان کی آنکھوں میں یہ

خاک جھونکی نہ کہ تو نے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن ہاتھ اٹھا کر کہا کہ اے رب! اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو پھر کوئی تجھ کو زمین میں نہ پوجے گا، تب جبریل علیہ السلام نے کہا کہ ایک مٹھی خاک اٹھا کر ان کے منہ میں جھونکو۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ ان کی آنکھوں اور نتھنوں اور منہ میں خاک جا گھسی۔ پشت پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے کہا: مجھ کو کچھ کنکریاں زمین پر سے اٹھا دے۔ انھوں نے خاک آلودہ سنگ ریزے اٹھا دیے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قوم کے منہ پر پھینکے۔ کوئی مشرک نہ بچا، مگر وہ خاک اس کی آنکھوں میں پڑی، مومنین دوڑ پڑے، ان کو قتل کرنا اور گرفتار کرنا شروع کر دیا، اس پر یہ آیت اتری۔ امام محمد بن قیس اور قرظی رحمہما اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ کہا ہے اور یہ ذکر کیا کہ مٹی پھینکنے کے وقت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « شَاهَتِ الْوُجُوْهُ » (چہرے مسخ ہو جائیں) اسی وقت ان کو شکست ہوئی۔[2]

امام ابن زید رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کنکریاں پھینکیں: ایک دائیں طرف، دوسری بائیں طرف، تیسری دشمن کے سامنے، اور « شَاهَتِ الْوُجُوْهُ » کہا۔ وہ بھاگ اٹھے، اللہ نے ان کو شکست دی۔[3] یہ قصہ امام عروہ، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور بہت سے ائمہ رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت بدر کے دن مٹی پھینکنے کے بارے میں اتری ہے۔[4] اگرچہ حنین کے دن بھی ایسا ہی اتفاق ہوا تھا[5] اور یہ قول کہ اس کا نزول یومِ خیبر یا یومِ احد کے بارے میں ہوا ہے، سخت غریب ہے۔ شاید یہ کہنے والوں کی مراد یہ ہو گی کہ آیت کا بعموم ان پر بھی اطلاق ہوتا ہے نہ یہ کہ اس کا نزول خاص طور پر ان کے حق میں ہوا ہے۔

پھر اللہ نے کہا کہ یہ ایمان والوں پر ایک اللہ کی نعمت تھی۔ اللہ جانتا ہے کہ نصر اور غلبے کا مستحق کون ہے۔ پھر دوسری بشارت سنائی کہ ہم کفار کی تدبیر کو سست کر دیتے ہیں، ان کی ساری کارستانی ہلاکت میں پڑ جاتی ہے اور نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ جب تم نے اللہ کی مدد کا حال معلوم کر لیا کہ اس نے ملائکہ بھیجے اور کفار کے دلوں میں رعب ڈالا تو اب تم یہ بھی جان لو کہ اُن کا قاتل اللہ ہے، نہ کہ تم۔ یہ خطاب تو مومنوں کو فرمایا اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ یہ رمی اللہ کی طرف سے ہوئی ہے، کچھ تم نے نہیں کی۔ غرض کہ نبی اور امت دونوں سے فعل کی نفی فرمائی، اپنی ذات پاک کو بندوں کے افعال کا خالق ٹھہرایا۔ اس رمی میں کئی قول ہیں: ایک یہ کہ حنین کے دن تھی، دوسرے یہ

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٤٥) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٤٤۔ ٤٤٥)
[3] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٤٥)
[4] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٤٢۔ ٤٤٣)
[5] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٩١)

کہ خیبر کے دن تھی، تیسرے یہ کہ بدر کے دن تھی، یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ بندے کے فعل کی نسبت بندے کی طرف ہوتی ہے کسبی لحاظ (کرنے کے اعتبار) سے اور پیدائشی لحاظ سے اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پہلے بندے سے فعل کے سرزد ہونے کا اثبات کیا، پھر اس کی نفی بندے سے کر کے اس کا اثبات اپنے نفس کے لیے فرمایا۔ پس یہ نفی و اثبات ثابت ہوئی۔ امام کرخی کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فعل کی نفی باعتبار ایجاد کے کی، اس لیے کہ موجد حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی ہے۔ پھر فعل کا اثبات ان کے اور نبی کریم ﷺ کے واسطے باعتبار کسب و صورت کیا۔ لفظ بلا (آزمایش) کا استعمال خیر و شر دونوں میں آتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ﴾ [الأعراف: ١٦٨] ''اور ہم نے انھیں خوش حالی اور بدحالی کے ساتھ آزمایا۔'' یہاں بلا سے مراد خیر و نعمت ہے، اسی پر مفسرین کا اجماع ہے، یعنی اللہ نے مومنین پر انعامِ جمیل کیا، ان کو غنیمت ملی اور کفار کا مکر سست پڑا۔[1]

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

(کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے تھے تو فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ (پہلے کی طرح) کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح کریں گے (تمھیں سزا دیں گے) اور تمھاری جماعت اگرچہ زیادہ ہی ہو وہ تمھیں ہرگز کچھ فائدہ نہ دے گی اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے ⑲

مشرکوں کے فیصلہ مانگنے کا جواب:

مکے کی سورتوں میں ہر جگہ کافروں کا کلام نقل فرمایا کہ ہر گھڑی کہتے ہیں: ''مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ'' ''یہ فیصلہ کب ہوگا؟'' سو اب جواب فرمایا کہ یہ فیصلہ آ پہنچا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے کہتا ہے کہ تم جو ہر بار نصر فیصلے اور حکم کا مطالبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ کب تمھارے اور مومنوں کے درمیان، جو تمھارے دشمن ہیں، فیصلہ ہوگا، سو تمھارا جواب اب آ گیا ہے۔ محمد بن اسحاق، عروہ اور زہری عبداللہ بن ثعلبہ سے راوی ہیں کہ ابوجہل نے بدر کے دن کہا تھا: ''اَللّٰهُمَّ أَيُّنَا كَانَ أَقْطَعُ لِلرَّحِمِ'' ''اے اللہ! کون ہم میں سے رشتوں کو توڑنے والا ہے؟'' یہ کہنا اس کی طرف سے استفتاح تھا۔ اس پر یہ آیت اتری۔

[1] فتح البیان (۵/ ۱۴۸۔ ۱۵۰)

اس کو امام احمد اور نسائی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شرطِ شیخین پر صحیح ہے۔[1] اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، قتادہ، یزید بن رومان رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم سے مروی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب مشرک مکے سے بدر کی طرف نکلے تو کعبہ کے پردے کو پکڑ کر اللہ سے مدد طلب کی اور کہا: "اَللّٰهُمَّ انْصُرْ أَعْلَى الْجُنْدَيْنِ، وَأَكْرَمَ الْفِئَتَيْنِ، وَخَيْرَ الْقَبِيلَتَيْنِ" اللہ نے کہا: اگر تم طالبِ فتح، یعنی فیصلہ چاہتے ہو، تو فیصلہ آ پہنچا، جو تم کہتے ہو ویسا ہی ہو گا۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم منصور ہوں گے، تم مقہور ہو گے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کے حالات کی خبر اس طرح دی: ﴿ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ ﴾ [الأنفال: ٣٢] "اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے۔"[2]

پھر اللہ نے کہا کہ اگر تم اللہ کے ساتھ کفر اور رسول اللہ کی تکذیب سے باز رہو گے تو یہ دنیا اور آخرت میں تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر کفر اور گمراہی کی طرف لوٹو گے تو ہم بھی اسی طرح کے واقعات کی طرف عود کریں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر پھر تم اس طرح کا استفتاح کرو گے تو ہم پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دیں گے اور دشمنوں پر ان کی مدد کریں گے اور کامیابی عطا کریں گے۔[3] لیکن پہلا قول زیادہ مضبوط ہے۔ تم کتنی ہی بھیڑ لاؤ، تمھارے کچھ کام نہ آئے گی، کیونکہ جس کے ساتھ اللہ ہے، وہی غالب رہے گا، سو اللہ مومنین کے ہمراہ ہے۔ وَهُمُ الْحِزْبُ النَّبَوِيُّ وَالْجَنَابُ الْمُصْطَفَوِيُّ.[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ آیتِ باب میں کفار کو بطریق تہکم (استہزا و مذاق کے طور پر) خطاب ہے، اس لیے کہ ہلاکت اور ذلت انھی پر آئی، مطلب یہ ٹھہرا کہ اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فتح یاب ہونا چاہتے ہو تو فتح آئی، ہلاکت کا نام مذاق کے طور سے فتح وظفر رکھا اور بعض نے کہا کہ یہ مومنوں کو خطاب ہے کہ تم فتح مانگتے تھے تو اللہ نے بدر کے دن تم کو کامیاب کیا، اب اگر تم غنیمتوں کے حاصل کرنے، قیدیوں کا فدیہ لینے سے، اجازت ملنے سے پہلے، باز رہو گے اور جنگ میں سستی کا مظاہرہ نہیں کرو گے تو یہ تمھارے لیے بہتر ہو گا اور اگر پھر ویسا ہی کام کرو گے تو ہم بھی پھر ویسی ہی ڈانٹ ڈپٹ کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ [الأنفال: ٦٨] "اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا۔" لیکن یہ قول خلاف معنی ﴿ لَنْ تُغْنِيَ

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٣١) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٥٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٥٧) امام احکام اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٥٣) [3] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٥٦) [4] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٩٢۔ ٣٩٣)

عَنْکُمْ ... الخ﴾ (آیتِ باب) ہے اور اس کی توجیہ بغیر تکلیف و تعسف کے نہیں ہو سکتی، یعنی بغیر تکلیف اور بے راہ روی کے اس کی توجیہ نہیں ہو سکتی اور یہ بات کہ آیت کا پہلا حصہ مومنین کو خطاب ہے اور آخری حصہ کافروں کو خطاب ہے، اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے کہ قرآنی نظم کو درہم برہم کیا جائے۔[1]

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے نہ پھرو، حالاں کہ تم سن رہے ہو (20) اور تم ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ، جنھوں نے کہا: ہم نے سن لیا، حالاں کہ وہ سنتے نہیں تھے (21) بے شک اللہ کے نزدیک چلنے پھرنے والوں میں بدترین وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل نہیں رکھتے (22) اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنا دیتا، اور اگر وہ انھیں سنا دیتا تو بھی وہ ضرور پھرتے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں (23)

اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم:

موضح قرآن میں کہا ہے، یعنی جیسے یہود نے تورات کا حکم زور آوری سے قبول کیا اور دل سے ناقبول رکھا یا جیسے منافق زبان سے حکم بردار ہیں اور دل سے نہیں، سو جانوروں سے بدتر ہیں۔ وہ آدمی جو دینِ حق کو نہ سمجھیں، اللہ نے ان کے دل میں ہدایت کی لیاقت نہیں رکھی۔ جن میں لیاقت رکھی ہے انہی کو ہدایت دیتا ہے اور جو بغیر لیاقت کے سنتے ہیں تو انکار کرتے ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو حکم اس بات کا کرتا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور پیغمبر کی مخالفت اور کافروں جیسی روش اختیار کرنے پر سرزنش فرمائی، نہ سننے والوں سے مراد مشرکین ہیں۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد منافقین ہیں۔[2]

بدترین لوگ:

پھر اللہ نے خبر دی ہے کہ اس طرح کے لوگ بنی آدم میں بدترین مخلوق ہیں، حق بات کو سننے سے بہرے ہیں، حق بات کو کہنے سے گونگے ہیں، یہ بدترین جانور ٹھہرے، اس لیے کہ ان کے سوا ہر جاندار اللہ کا مطیع ہے، اس کام میں

(1) فتح البیان (۵/ ۱۵۱۔ ۱۵۲) (2) تفسیر الطبري (۱۳/ ۴۵۸)

جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ لوگ عبادت کے لیے بنائے گئے ہیں، لیکن انھوں نے کفر کیا اور عبادت سے انکار کیا، اسی لیے یہ چوپایوں کے مشابہ ٹھہرے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ۚ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٧١] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس (جانور) کو پکارتا ہے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے وہ عقل نہیں رکھتے۔''

دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٧٩] ''وہ تو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔'' کہا ہے کہ ان لوگوں سے قبیلہ بنی عبدالدار کے منجملہ قریش کے کچھ لوگ ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقین مراد ہیں سو جو کچھ فرق مشرکین اور منافقین کے درمیان نظر نہیں آتا وہ اس لیے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک سے صحیح فہم چھین لیا گیا ہے اور وہ عملِ صالح سے محروم ہے۔ اللہ نے خبر دی کہ ان کا نہ فہم صحیح ہے اور نہ ارادہ ہی صحیح ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ فہم رکھتے ہیں تو ان کو سمجھایا جائے، لیکن جبکہ وہ فہم ہی نہیں رکھتے تو پھر کس کو سمجھایئے، بلکہ اگر سمجھایا جائے تو فہم کے بعد قصداً اور عناداً پشت پھیر لیں گے اور منہ موڑ لیں گے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے جہاد کے معاملے میں مومنوں کو اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس لیے کہ اس میں جان اور مال خرچ ہوتا ہے اور پشت پھیرنے سے منع کیا ہے کہ تم رسول کو چھوڑ کر نہ چلے جاؤ، کیونکہ طاعتِ رسول دراصل اس کو بھیجنے والے کی اطاعت ہے، رسول کا مطیع اللہ کا مطیع ہوتا ہے۔ یہ تفسیر اس بنیاد پر ہے کہ خطاب مومنوں کو فرمایا ہے۔ جمہور اسی کے قائل ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ خطاب منافقوں کو ہے، یعنی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاَلْسِنَتِهِمْ فَقَطْ''۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مطلب اگرچہ باوجود بُعد کے محتمل ہے، لیکن سخت ضعیف ہے، کیونکہ اللہ نے مخاطب کا وصف ایمان کے ساتھ کیا ہے۔ مراد اس کے ایمان کی تصدیق ہے اور منافقین کے ایمان کی تصدیق نہیں کی جاتی۔ اس سے بڑھ کر بعید تر وہ قول ہے کہ خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ یہ قول آیت سے بالکل ہی اجنبی ہے۔[3]

پھر کہا تم وہ حجتیں، دلائل اور قرآن اور نصیحتیں سنتے ہو جو تم پر پڑھے جاتے ہیں اور تم ان کی تصدیق کرتے ہو، کچھ بہرے گونگے نہیں ہو، سو تم مشرکوں یا منافقوں یا یہود کی طرح نہ ہو جاؤ کہ ان سبھوں نے کہا کہ ہم نے سنا، یعنی

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٦٠۔ ٤٦١) [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٩٣) [3] تفسیر القرطبي (٧/ ٣٨٧)

اپنے کانوں سے بغیر فہم وعمل کے اور حقیقت میں کچھ نہیں سنتے ، یعنی غور سے سننے، غور و تدبر کرنے اور نصیحت حاصل کرنے سے محروم ہیں، جب وہ سنی ہوئی بات سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے تو گویا سرے سے کچھ سنا ہی نہیں۔ یہ مشرکین اور منافقین کی صفت ہے۔ چوپائے کے لفظ کا اطلاق انسان پر حقیقی ہے، کیونکہ لغت کی کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ دابہ کا اطلاق ہر حیوان (چلنے پھرنے والے جاندار) پر ہوتا ہے، اگرچہ وہ آدمی ہو۔

مصباح میں کہا ہے کہ دابہ ہر جانور ہے جو زمین پر چلے، وہ ممیّز ہو (جس کو پہچانا جا سکے) یا غیر ممیّز۔[1] سو بدترین دوابّ اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو بہرے، گونگے ہیں، کچھ سنتے سمجھتے نہیں ہیں۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں اتری ہے۔[2] اللہ اگر کچھ خیر ان کے اندر جانتا تو ان کو سناتا اور اگر بالفرض خیر معلوم کر کے کچھ سناتا تو یہ عناد اور انکار کی وجہ سے راہ پر نہ آتے، قبولِ حق سے منہ موڑ لیتے، کیونکہ اللہ کے علم میں یہ بات پہلے سے آچکی ہے کہ وہ کسی طرح ایمان نہیں لائیں گے۔[3]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول (کی بات) کو قبول کرو جب وہ تمھیں اس (امر) کے لیے بلائے جو تمھیں زندگی بخشتا ہے اور تم جان لو کہ یقیناً اللہ بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿24﴾

اللہ و رسول کا حکم بجا لانے کا حکم:

یعنی حکم بجا لانے میں دیر نہ کرو، شاید اس وقت دل ایسا نہ رہے۔ دل اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اللہ اول کسی کے دل کو روکتا نہیں اور مُہر نہیں کرتا۔ جب بندہ کاہلی کرے تو اس کی جزائیں روک دیتا ہے یا ضد کرے، حق پرستی نہ کرے تو مُہر کر دیتا ہے۔ صحیح بخاری میں ابوسعید بن المعلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: میں نماز میں تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجھ پر گزر ہوا، مجھ کو پکارا میں آپ کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ نماز پوری کر کے حاضر ہوا، فرمایا: تجھ کو میرے پاس آنے کے لیے کس چیز نے روکا، کیا اللہ نے نہیں کہا؟: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ... الآية﴾[4] (آیتِ باب)

---

[1] المصباح المنير (١/ ١٠٠) [2] فتح القدير (٢/ ٤٢٩)

[3] فتح البيان (٥/ ١٥٢۔ ١٥٤) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٠)

یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے عظیم مرتبے پر ایک عظیم دلیل ہے کہ نماز جیسی حالت میں بھی نبی کریم ﷺ کے پکارنے کا جواب دے اور حکم بجا لائے، ورنہ گناہ گار ہوگا، لیکن یہ پکار کا جواب دینا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مختص ہے، کسی اور کے پکارنے پر نماز نہیں توڑی جاتی۔ یہ استجابت بعموم اللہ اور رسول کی ہر دعوت کو قبول کرنے کو بھی شامل ہے، جبکہ کسی مسلمان کو اللہ اور رسول کا قول پہنچے، یعنی احکامِ شرعیہ کے کسی بھی حکم کے بارے میں اس کو اس کی طرف عمل کرنے کے لیے جلدی کرنا واجب و لازم آتا ہے، کوئی سا حکم بھی ہو اس کو فی الفور بجا لائے اور جو رائے اس کے خلاف ہو اس کو ترک دے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ لِمَا يُحْيِيكُمْ ﴾ یعنی الحق۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہی قرآن ہے جس میں نجات، بچت اور زندگی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اسلام ہے، کیونکہ اس میں کفار کو مر جانے کے بعد زندہ کرنا ہے، اگرچہ وہ کفر کے سبب سے مرے ہوں۔[1] عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تم کو جب رسول اللہ ﷺ جہاد کے لیے بلائیں تو حاضر ہو، کیونکہ اسی جہاد کی بدولت اللہ نے تم کو ذلت کے بعد عزت اور ضعف کے بعد قوت اور دشمن کے قہر و غضب کے بعد منعت و حفاظت عطا فرمائی ہے۔[2]

اللہ کا بندے اور اس کے دل کے درمیان حائل ہونا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ مومن اور کفر کے درمیان حائل ہوتا ہے، اور اسی طرح کافر اور ایمان کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ یہی امام مجاہد، سعید، عکرمہ، ضحاک، ابو صالح، عطیہ، مقاتل بن حیان اور سدی رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ امام مجاہد کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ "حَيْلُوْلت" (حائل ہو جانے) سے مراد یہ ہے کہ اللہ اس کو لا یعقل چھوڑ دیتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی پھر وہ نہ ایمان لا سکے اور نہ کفر کر سکے، مگر اس کے اذن سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴾ [ق: ١٦] "اور ہم (اس کی) شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں۔"[3] اس آیت کے مناسب نبیِ اکرم ﷺ سے احادیث آئی ہیں۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے: « يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ » ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم ایمان لائے ہیں آپ پر اور جو کچھ آپ لائے اس پر بھی، سو کیا آپ کو ہم سے ڈر ہے؟ فرمایا: ہاں، دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ ان کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔[4] (رواه أحمد وهكذا رواه الترمذي وقال: حسن) سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ یہ دعا کرتے: « يَا مُقَلِّبَ

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٤٦٤ـ ٤٦٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٧٩)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٤٦٨ـ ٤٧١) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٩٤)

[4] مسند أحمد (٣/ ١١٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٨٧)

الْقُلُوْبِ، ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ ﴾[1] (رواه أحمد هذا حديث جيد الإسناد إلا أن فيه انقطاعاً وهو مع ذلك على شرط أهل السنن ولم يخرجوه)

سیدنا نواس کلابی رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ﴿مَا مِنْ قَلْبٍ إِلَّا وَهُوَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ إِذَا شَآءَ أَنْ يُّقِيْمَهُ أَقَامَهُ وَإِذَا شَآءَ أَنْ يَّزِيْغَهُ أَزَاغَهُ ﴾[2] (رواه أحمد والنسائي وابن ماجه) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کرتے: ﴿يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ... الخ ﴾ میں نے کہا: آپ یہ دعا بہت کیا کرتے ہیں؟ فرمایا: ﴿إِنَّ قَلْبَ الْآدَمِيِّ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ فَإِذَا شَآءَ أَزَاغَهُ وَإِذَا شَآءَ أَقَامَهُ ﴾[3] (رواه أحمد)

امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں ﴿يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ... الخ ﴾ بہت کہتے، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا دل پلٹتے ہیں؟ فرمایا: ہاں، ﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ بَشَرٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ إِلَّا أَنَّ قَلْبَهُ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَإِنْ شَآءَ أَقَامَهُ وَإِنْ شَآءَ أَزَاغَهُ الحديث ﴾[4] (رواه أحمد) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا لفظ مرفوع یہ ہے: ﴿إِنَّ قُلُوْبَ بَنِيْ آدَمَ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَّاحِدٍ يُصَرِّفُهَا كَيْفَ شَآءَ ﴾ پھر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ﴿اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا إِلٰى طَاعَتِكَ ﴾[5] (أخرجه أحمد و انفرد به مسلم عن البخاري)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جمہور نے کہا: مطلب یہ ہے کہ تم طاعت قبول کرو قرآن کے اوامر ونواہی کی، کیونکہ اس میں حیاتِ ابدی اور نعمتِ سرمدی ہے۔ یا مراد جہاد ہے کہ ظاہر میں وہ سببِ حیات ہوتا ہے، کیونکہ جب دشمن سے جنگ نہ کی جائے تو وہ جنگ کرے گا۔[6] (قاله ابن إسحاق) یا مراد ایمان ہے، کیونکہ کافر مردہ ہوتا ہے، ایمان اس کو زندہ کر دیتا ہے۔[7] (قاله السدي) کسی نے کہا: مراد شہادت ہے، کیونکہ شہدا زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں، بہرحال یہ آیتِ شریفہ مدلل اور صریح احکام پر عمل کا ایک بڑا باعث ہے اور مذاہب کی تقلید کو چھوڑ دینے کا

---

1. مسند عبد بن حمید (۱/ ۱۴۰) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔
2. مسند أحمد (۴/ ۱۸۲) سنن النسائي الكبرىٰ (۴/ ۴۱۴) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۹۹) صحيح الجامع، رقم الحديث (۵۷۴۷)
3. مسند أحمد (۶/ ۹۱) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔
4. مسند أحمد (۶/ ۳۰۱) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۰۹۱)
5. صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۵۴) مسند أحمد (۲/ ۱۶۸)
6. تفسير الطبري (۱۳/ ۴۶۵)
7. تفسير الطبري (۱۳/ ۴۶۴)

اور کتاب و سنت کے خلاف امر کو کسی گنتی اور شمار میں نہ لانے کا باعث ہے، خواہ کوئی سا بھی امر ہو۔

بندے اور دل کے درمیان اللہ کے حائل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مرنے سے پہلے جلدی سے حق کو قبول کرنے کی طرف مائل کر دیا۔ تمھارے دلوں میں جو دشمنوں کی طرف سے ڈر ہے، ہم اس کو امن کے ساتھ تبدیل کر دیں گے اور ان کے امن کو خوف سے بدل دیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات کی خبر دیتی ہے کہ دلوں پر اللہ کا قبضہ اشخاص کی نسبت زیادہ تر ہے۔ انسان کسی شے کا ادراک نہیں کر سکتا مگر اللہ ہی کی مرضی سے۔[1] آیتِ باب اور اس سلسلے کی احادیث صفات کی قبیل سے ہیں، ان کو ظاہری معانی پر بغیر تاویل کے رکھنا اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔[2]

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور اس فتنے سے ڈرو جو تم میں سے خاص طور پر (صرف) ان لوگوں کو نہیں پہنچے گا جنھوں نے ظلم کیا، (بلکہ سب اس کی زد میں آسکتے ہیں) اور تم جان لو کہ بے شک اللہ سخت سزا والا ہے ﴿25﴾

عمومی فتنے سے خبردار کرنا:

یعنی حکم میں کاہلی کرنے سے ایک تو دل ہٹتا ہے، دم بدم وہ کام زیادہ مشکل پڑتا ہے، دوسرے نیکیوں کو کاہلی سے گناہ گار بالکل چھوڑ دیں گے تو رسمِ بد پھیلے گی، اس کا وبال سب پر پڑے گا، جیسے جنگ میں دل پرستی نہ کریں تو نامرد بھاگ ہی جائیں، پھر شکست پڑے تو دلیر بھی نہ تھام سکیں۔ اللہ نے اپنے مومن بندوں کو ڈرایا ہے۔ فتنہ، یعنی آزمائش اور امتحان سے، جس میں سب نیک و بد پھنس جائیں۔ گناہ گاروں کی کچھ تخصیص نہ ہو اور نہ گناہ کرنے والے کی، بلکہ عام ہو، کسی سے بھی وہ فتنہ نہ دور ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت علی، عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے بارے میں اتری ہے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے ایک زمانے تک یہ آیت پڑھی، ہم نہ جانتے تھے کہ ہم اس آیت کے اہل ہیں۔ اچانک معلوم ہوا کہ مراد اس سے ہم ہی ہیں۔ یہ زبیر رضی اللہ عنہ سے کئی طرح پر مروی ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت خاص اہلِ بدر کے حق میں آئی ہے۔ جمل کے دن اس کا ظہور ہوا کہ آپس میں قتال کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد خاص اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے مومنوں کو حکم دیا کہ وہ منکر کو اپنے درمیان میں نہ ٹھہرنے دیں، ورنہ پھر عام عذاب آئے گا۔[3] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تفسیر بہت خوب ہے، اسی لیے امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ یہ

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۴۷۱۔ ۴۷۲)
[2] فتح البيان (۵/ ۱۵۴۔ ۱۵۷)
[3] تفسير الطبري (۱۳/ ۴۷۳۔ ۴۷۴)

آیت تمھارے واسطے بھی ہے۔ یہی امام ضحاک اور یزید اور کئی ایک کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کوئی شخص نہیں ہے، لیکن وہ مشتمل ہے فتنے پر، اللہ نے کہا ہے: ﴿ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ [التغابن: ١٥] ''بلاشبہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ (آزمایش) ہیں۔'' سو جو کوئی تم میں پناہ مانگے، وہ اللہ کی پناہ چاہے تم کو گمراہ کرنے والی چیزوں اور فتنوں سے۔[1]

یہ قول کہ یہ ڈرانا صحابہ وغیرہم کو عام ہے، اگرچہ خطاب انھی کو ہے، صحیح ہے۔ جو احادیث فتنوں سے ڈرانے کے لیے آئی ہیں، وہ سب اس پر دلیل ہیں۔ "وَلِذٰلِكَ كِتَابٌ مُسْتَقِلٌّ يُوْضَحُ فِيْهِ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى كَمَا فَعَلَهُ الْأَئِمَّةُ وَأَفْرَدُوْهُ بِالتَّصْنِيْفِ"[2] (قاله ابن كثير) سیدنا عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ سمعاً و رفعاً کہتے ہیں کہ اللہ عام آدمیوں کو خواص کے عمل سے عذاب نہیں کرتا، یہاں تک کہ وہ اپنے درمیان منکر کو دیکھتے ہیں اور وہ اس سے منع و انکار کر سکتے ہیں، لیکن نہیں کرتے۔ سو جب یہ کام کرتے ہیں تو اللہ خواص اور عوام سب کو عذاب کرتا ہے۔[3] (رواه أحمد)

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب میری امت میں گناہ ظاہر ہوں گے تو ان سب پر اپنے پاس سے عذاب کرے گا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ان میں نیک لوگ نہیں ہوں گے؟ فرمایا: ہاں، ہوں گے۔ میں نے کہا: پھر ان کا کیا حال ہوگا؟ کہا: جو مصیبت لوگوں کو پہنچے گی وہ ان کو بھی پہنچے گی، پھر ان کا انجام بخشش اور اللہ کی رضا مندی کی طرف ہوگا۔[4] (رواه أحمد) عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب زمین میں بدی ظاہر ہوتی ہے تو اللہ اہلِ زمین پر اپنا عذاب اتارتا ہے، ان میں اللہ کے مطیع لوگ بھی ہوتے ہیں، پھر ان کا انجام اللہ کی رحمت کی طرف ہوگا۔[5] (رواه أحمد)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ آیتِ باب میں مطلقاً مومنوں کو خطاب ہے، خواہ صالح ہوں یا طالح (بُرے)۔ فتنے سے مراد دنیا کا عذاب ہے، جیسے قحط و گرانی یا ظالم حکمران کا تسلط۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ فتنے سے مراد آزمایش اور امر شدنی ہے۔[6] ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد افتراقِ کلمہ ہے اور بعض کا بعض کے ساتھ مخالفت کرنا ہے۔[7] رہی آیت: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الفاطر: ١٨] ''اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٤٧٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٩٥۔ ٣٩٦) [2] تفسير ابن كثير (٤/ ٣٨) طبعة: دار طيبة.

[3] مسند أحمد (٤/ ١٩٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣١١٠)

[4] مسند أحمد (٦/ ٣٠٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد بإسنادين رجال أحدهما رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٧/ ٥٢٩)

[5] مسند أحمد (٦/ ٤١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣١٥٦)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٨١) [7] تفسير البغوي (٣/ ٣٤٦)

سو کچھ آیت باب کے منافی نہیں ہے، کیونکہ جب لوگ کھلم کھلا برائی کرنے لگیں تو پھر ہر دیکھنے والا اگر قدرت رکھتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس برائی کو ختم کرے اور جب اس نے سکوت کیا تو سب کے سب گناہ گار ہوئے، ایک اس کو کرنے کے سبب سے اور دوسرا اس پر راضی ہو جانے کے سبب سے اور اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تقاضے کے تحت راضی ہو جانے والے کو بھی برائی پر عمل کرنے والے کے حکم میں رکھا ہے، اس لیے راضی ہونے والا بھی اس برائی کے عامل کی سزا میں شامل ہوگا۔

برائی پر راضی ہو جانے کی علامت یہ ہے کہ اس گناہ کے کام سے دین میں جو خلل واقع ہوتا ہے اس سے اس کے دل کو کوئی دکھ درد نہ ہو۔ آدمی کارِہْ (کسی چیز کو ناپسند کرنے والا) اسی وقت سمجھا جاتا ہے جبکہ خلل مذکور سے ایسا رنجیدہ ہو، جیسے کوئی مال یا اولاد کے گم ہونے سے رنج وصدمہ اٹھاتا ہے، سو جس کسی شخص کا حال اس طرح پر نہیں ہے وہ اس منکر کے ساتھ راضی ہے، اس لیے سزا اور مصیبت اس کو بھی شامل ہوگی۔ اللہ کی سزا سخت ہوتی ہے، یہ آیت اگرچہ خاص ہے، لیکن اس کا حکم عام ہے۔[1]

وَاذْكُرُوٓا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِى الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَـَٔاوَىٰكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِۦ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾

اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک (نہ) لے جائیں تو اللہ نے تمھیں ٹھکانا دیا، اور اپنی نصرت کے ساتھ تمھاری تائید کی، اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، تاکہ تم (اس کا) شکر کرو ﴿26﴾

خوف اور قلت و ذلت کے بعد نعمت و نصرت اور موت کی یاددہانی اور شکر:

اللہ پاک نے اس آیت پاک میں اپنے مومن بندوں کو آگاہ کیا کہ ہماری نعمت کو یاد کرو، ہمارا احسان نہ بھولو، دیکھو تم تھوڑے تھے، تم کو بہت کر دیا۔ تم کمزور تھے، تم کو زور آور بنا دیا۔ تم فقیر، محتاج، تہی دست اور مفلس تھے، تم کو مالِ غنیمت وغیرہ سے آسودہ حال کر دیا۔ غرض کہ مکے میں مومنین کا حال اسی طرح پر تھا کہ بہت تھوڑے، پوشیدہ، پریشان حال قابلِ ترس تھے، سارے شہروں کے لوگ مشرک، مجوسی، رومی سب ان کے جانی دشمن تھے، ان کو فقیر، حقیر، قلیل، ذلیل، ضعیف، کمزور سمجھ کر اچک لیتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے مدینے کی طرف ہجرت کا حکم دیا اور مدینے میں یار اور مددگار میسر کر دیے، جنھوں نے جان اور مال سے ان کی یاری اور غم خواری کی، اللہ اور رسول کی اطاعت میں جان لڑا دی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کا یہ قبیلہ ذلیل ترین لوگوں کا تھا، وہ اکثر اوقات میں بہت زیادہ

[1] فتح البیان (٥/ ١٥٨۔ ١٦٠)

شقی القلب اورنہایت گرسنہ شکم اور ننگے بدن والا تھا۔ گمراہی میں کھلا ہوا، جو کوئی جیا وہ بدبخت جیا اور جو کوئی مرا وہ آگ میں گرا، لوگ ان کو کھائے لیتے تھے، یہ کسی کو نہ کھاتے۔ واللہ! میں نہیں جانتا کہ اس دن روئے زمین پر کوئی قبیلہ ان سے زیادہ کم رتبہ ہوگا، یہاں تک کہ اللہ اسلام لایا، اس کے طفیل ان کو شہروں میں جگہ ملی، رزق کی فراوانی ہوئی، یہ لوگوں کی گردنوں کے مالک ہوئے، بادشاہ بنے، یہ سب اسلام کے صدقے میں حاصل ہوا، سو اللہ نے کہا کہ تم ہماری نعمت کا شکر کرو، تمھارا رب انعام کرنے والا ہے، شکر کرنے کو پسند کرتا ہے، اہلِ شکر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور زیادہ عطا ہوتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب نبیِ اکرم ﷺ اور مہاجرین کو نعمت کی یاد دہانی کے لیے ہے کہ دیکھو کس طرح دشمنوں سے نکال کر تم کو مدینے میں پہنچایا اور جگہ دی اور مدد دی۔ اس آیت کا نزول واقعۂ بدر کے بعد ہوا ہے۔ اَرض سے مراد مکہ ہے اور ناس سے مراد مشرکینِ قریش اور کفارِ مکہ ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد کفارِ عرب ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ فارس اور روم ہیں۔[2] (قالہ وھب)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۷ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۸

اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ تم آپس کی امانتوں میں خیانت کرو، جب کہ تم جانتے ہو (27) اور جان لو یقیناً تمھارے مال اور تمھاری اولاد فتنہ ہیں اور (جان لو) بے شک اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے (28)

اللہ اور رسول کی خیانت اور بددیانتی سے ممانعت اور سببِ نزول:

اللہ اور اس کے رسول کی چوری یہ بھی ہے کہ اپنی اولاد اور مال کے بچاؤ کی خاطر چھپ کر کافروں سے ملیں، جیسے مہاجرین میں سے اکثر کے گھر مکے میں تھے اور یہ بھی ہے کہ مالِ غنیمت چھپا کر رکھیں اور سردار کے پاس ظاہر نہ کریں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں عبدالرزاق اور زہری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری ہے، نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو بنی قریظہ کے پاس بھیجا تھا، تاکہ ان کو آپ ﷺ کے حکم پر راضی کریں، انھوں نے ان سے مشورہ لیا، انھوں نے مشورہ دیا اور ہاتھ سے حلق کی طرف اشارہ کیا، یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم پر ذبح کرنا ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۴۷۸۔ ۴۷۹)
[2] تفسیر الطبري (۱۳/ ۴۷۷۔ ۴۷۸) فتح البیان (۵/ ۱۶۰۔ ۱۶۱)

پھر یہ سمجھے کہ میں نے اس امر میں اللہ اور رسول کی خیانت کی، اس لیے قسم کھائی کہ کچھ نہ کھاؤں گا، یہاں تک کہ مر جاؤں یا اللہ میری توبہ قبول کرے، پھر مدینے کی مسجد میں آ کر اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھا اور نو دن تک بندھے رہے، یہاں تک کہ تکلیف سے غش کھا کر گر جاتے، اللہ نے ان کی توبہ اپنے رسول پر نازل کی، لوگوں نے آ کر ان کو توبہ قبول ہونے کی بشارت دی اور چاہا کہ ستون کھول دیں، انھوں نے قسم کھائی کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے کوئی ان کو اپنے ہاتھ سے نہ کھولے گا، جب نبی کریم ﷺ نے کھولا تو عرض کی کہ میں نے یہ نذر مانی ہے کہ میں اپنا سارا مال صدقہ کر دوں گا، فرمایا: تجھ کو ایک تہائی مال کا صدقہ کرنا کافی ہے۔[1]

سیدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں اتری ہے۔[2] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ ابوسفیان مکے سے نکلے تھے، جبریل علیہ السلام نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا کہ ابوسفیان فلاں جگہ پر ہے، آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا کہ وہ فلاں جگہ میں ہے، وہاں چلو اور پوشیدہ رکھو، ایک منافق مرد نے ان کو لکھ کر بھیجا کہ محمد ﷺ تمھارا ارادہ رکھتے ہیں، تم اپنے بچاؤ کے لیے ہوشیار ہو جاؤ، اس پر یہ آیت اتری۔[3] (رواہ ابن جریر) لیکن یہ حدیث نہایت غریب ہے، اس کی سند اور سیاق میں نظر ہے۔

صحیحین میں حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصہ آیا ہے کہ جس سال مکہ فتح ہوا، انھوں نے قریشِ مکہ کو لکھ بھیجا کہ نبیِ اکرم ﷺ تمھارا قصد کرتے ہیں، اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اس بات پر آگاہ کر دیا، آدمی بھیج کر وہ خط منگوا لیا، حاطب نے حاضر ہو کر اقرار کیا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کیا میں اس کی گردن نہ مار دوں؟ اس نے اللہ، اس کے رسول اور مومنین کی خیانت کی ہے، فرمایا: اس کو چھوڑ دو، یہ بدر میں حاضر ہوا تھا۔ ”لَعَلَّ اللّٰہَ أَطَّلَعَ عَلٰی أَھْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ، فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ“[4]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے اور اگر یہ ثابت ہو کہ سبب خاص پر وارد ہوئی ہے تو بھی الفاظ کی عمومیت پر اعتبار کرنا چاہیے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ جمہور علما کے نزدیک اسی طرح مقرر ہے۔ خیانت عام ہے صغیرہ گناہ ہوں یا کبیرہ گناہ، لازم ہوں یا متعدی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ امانت وہ اعمال ہیں جن پر اللہ نے بندوں کو امین کیا ہے، یعنی فریضہ، مراد یہ ہے کہ فریضہ کو ناقص نہ کرو۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تارکِ سنت اور معصیت کا مرتکب نہ ہو۔[5] عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ تم رسول کے سامنے حق ظاہر کرو،

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ٤٨١۔ ٤٨٢) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] تفسیر الطبري (۱۳/ ٤٨٢) اس کی سند میں ”یونس بن حارث طائفی“ ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۱۳/ ٤٨٠) اس کی سند میں ”محمد محرم“ ضعیف راوی ہے۔
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٨٤٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٩٤)
[5] تفسیر الطبري (۱۳/ ٤٨٥)

جس سے تم ان کو راضی کرو، پھر باطن میں اس کے خلاف کرو کہ یہ تمھاری امانت کی ہلاکت ہے اور تمھارے نفس کی خیانت ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ اور رسول کی خیانت کی تو گویا اپنی امانتوں میں خیانت کی۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے ایک بات سنتے، اس کو افشا کرتے، وہ مشرکوں تک پہنچتی۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم کو اس بات کا حکم کیا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی خیانت نہ کرو جس طرح منافقین نے کی۔[2]

مال اور اولاد کا فتنہ:

پھر مال و اولاد کو فتنہ فرمایا، یعنی یہ مال اور اولاد تم کو اس لیے دیے ہیں کہ دیکھے تم اس عطا کا شکر کرتے ہو اور طاعت بجا لاتے ہو یا ان اشیا میں مشغول ہو جاتے ہو اور اللہ کے بجائے ان چیزوں کو اختیار کرتے ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ [الأنبياء: ٣٥] ''اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے برائی اور بھلائی سے آزماتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [المنافقون: ٩] ''اے ایمان والو! تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تمھیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ [التغابن: ١٤] ''اے ایمان والو! بے شک تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں، لہٰذا تم ان سے محتاط رہو۔''

اجرِ عظیم سے مراد ثواب وعطا و باغات ہیں، یعنی یہ اشیا تمھارے واسطے تمھاری اولاد اور اموال سے بہتر ہیں، کیونکہ ان میں کبھی بعض دشمن ہوتے ہیں اور اکثر تمھارے کچھ کام نہیں آتے۔ رہا اللہ تعالیٰ سو وہ علی الاطلاق دنیا و آخرت کا مالک و متصرف ہے، اس کے پاس قیامت کے دن بہت بڑا ثواب اور اجرِ عظیم ہے۔ اثر میں آیا ہے کہ اے ابن آدم تو مجھے طلب کر، تو مجھ کو پائے گا، پھر جب تو نے مجھ کو پا لیا تو سب کچھ پا لیا اور اگر میں نہ مل سکا تو ہر چیز تجھ سے فوت ہوئی اور میں ہر چیز سے زیادہ تجھ کو محبوب ہوں۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا... الحديث»[3] بلکہ نبی کریم ﷺ کی محبت اولاد و اموال و نفوس پر مقدم ہے، جس طرح حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ، لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَّفْسِهِ وَأَهْلِهِ وَمَالِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ»[4]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٨٤) [2] تفسير الطبري (١٣/ ٤٨٤۔ ٤٨٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٣٩٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤) مسند أحمد (٤/ ٣٣٦)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٩﴾

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمھارے لیے نکلنے کی راہ بنا دے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا۔ اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے (29)

تقویٰ کے ثمرات:

شاید فتح بدر میں مسلمانوں کے دل میں آیا ہو کہ یہ فتح اتفاقی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے چھپا کر کافروں پر احسان کریں کہ ہمارے گھر بار کو نہ ستائیں۔ سو پہلی آیت میں چوری کو منع فرمایا اور دوسری آیت میں تسلی دی کہ آگے فیصلہ ہو جائے گا تمھارے گھر بار کافروں میں گرفتار نہ رہیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سدی، مجاہد، عکرمہ، ضحاک، قتادہ، مقاتل بن حیان اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ فرقان سے مراد نجات ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی دنیا اور آخرت میں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد نصر ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد حق و باطل کے درمیان فصل ہے۔[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن اسحاق کی تفسیر جو پہلے گزر چکی ہے اس سے عام تر ہے اور سب اقوال کو مستلزم ہے، اس لیے کہ جو کوئی اللہ سے ڈر کر احکام بجا لاتا ہے اور جن چیزوں سے منع کیا جاتا ہے، ان کو ترک کرتا ہے، اسے حق و باطل کی پہچان کی توفیق ہوتی ہے۔ اس کا یہ عارف ہونا امورِ دنیا سے علاحدگی اور بے رغبتی اور نصر و نجات کا سبب بنتا ہے اور قیامت کے دن سعادت کا موجب ہوتا ہے اور گناہوں سے انکار اور عیوب کی بخشش کا باعث ہو جاتا ہے۔ اسی ڈر سے بڑا ثواب اور اجرِ عظیم ہاتھ آتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحدید: ٢٨] ”اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دو حصے (اجر) دے گا، اور تمھارے لیے ایسا نور بنائے گا کہ تم اس کے ساتھ چلو گے، اور وہ تمھیں بخش دے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“[2]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے تقویٰ کو جعل مذکور (آیت میں مذکور چیزیں عطا کرنے کے لیے) کی شرط ٹھہرایا ہے۔ تقویٰ اسلام کے مخالف کاموں سے بچنے اور ممنوعہ کاموں میں خود پڑ جانے یا ان کا حکم کرنے سے بچنے

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٤٨٩۔ ٤٩٠) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٨٦) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٩٩)

کو کہتے ہیں۔ فرقان وہ ہے جس سے حق و باطل جدا ہو جائے۔ سیئات سے مراد صغیرہ گناہ ہیں اور غفرانِ ذنوب سے کبیرہ گناہ۔[1]

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے، تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے (30)

رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے، قید کرنے یا جلاوطن کرنے کے لیے کافروں کی سازشیں:

بٹھا دیں، یعنی قید کر رکھیں۔ یہ فرمایا کہ جیسے اللہ نے پیغمبر کو بچا لیا ہے، اسی طرح چاہے تو تمھارے گھر بار کو بھی بچا رکھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اثبات سے مراد وثاق یعنی قید کرنا ہے۔[2] امام عطا اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا: یعنی حبس کرنا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثبات سے مراد حبس کرنا یا قید کرنا ہے۔ یہ تفسیر ان تمام اقوال کو شامل ہے۔ جو کوئی کسی کے ساتھ برائی کرنا چاہتا ہے تو غالباً وہ یہی کام کرتا ہے۔

امام عبید بن عمیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یہ مشورہ کیا کہ نبیِ اکرم ﷺ کو قید کریں یا قتل یا نکال دیں تو آپ کے چچا ابو طالب نے کہا: تجھے کچھ معلوم ہے کہ لوگوں نے کیا سوچا ہے؟ کہا: ہاں، یہ چاہتے ہیں کہ مجھے قید کریں یا مار ڈالیں یا شہر سے نکال دیں۔ کہا: تجھے کس نے خبر دی؟ فرمایا: میرے رب نے، کہا: تیرا رب بہت اچھا رب ہے، تو اس کے حق میں خیر کی وصیت مان لے، کہا: میں کیا وصیت مانوں، بلکہ وہ میرے حق میں وصی بالخیر ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔[3]

لیکن اس روایت میں ابو طالب کا ذکر نہایت غریب ہے، بلکہ منکر ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت مدنی ہے اور یہ قصہ اور قریش کا یہ اجتماع اور ان کا مشورہ ہجرت کی رات میں ہوا تھا اور ہجرت ابو طالب کی موت کے تقریباً تین سال بعد ہوئی تھی، بلکہ یہی ابو طالب کا مر جانا ہی قریش کے اس حوصلے کا سبب بنا تھا، اس لیے کہ وہ نبیِ اکرم ﷺ کے حامی اور مددگار تھے، اس پر دلیل محمد بن اسحاق صاحبِ مغازی کی روایت ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ چند لوگ اشرافِ قریش کے ہر قبیلے سے دار الندوہ جانے کے ارادے سے جمع ہوئے، راستے میں ان کے سامنے ابلیس ایک بزرگ کی صورت میں آیا، انھوں نے اس کو دیکھ کر کہا: تُو کون ہے؟ کہا: میں نجد کا ایک شیخ ہوں، میں نے سنا کہ تم سب جمع ہوئے ہو، میں بھی آیا کہ میری رائے اور نصیحت بھی سنو، کہا: اچھا آؤ! ابلیس ان کے ساتھ گھر میں گیا۔ کہا:

[1] فتح البیان (٥/ ١٦٤) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٩١۔ ٤٩٢) [3] تفسیر الطبري (١٣/ ٤٩٣) یہ روایت مرسل ہے۔

اس شخص کے بارے میں کچھ سوچ بچار کرو، واللہ! عنقریب یہ تم پر قابو پائے گا۔

جب سب نے نظر کی تو بعضوں نے کہا کہ اس کو ایک وثاق میں گرفتار کرو، پھر زمانہ کی آفت کا انتظار کرو، یہاں تک کہ پہلے شعراء کی طرح ہلاک ہو جائے، جیسے زہیر اور نابغہ ہلاک ہو گئے، کیونکہ یہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ شیخ نجدی اٹھا اور چل پڑا کہ واللہ! یہ کچھ رائے نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم اس کو محبوس کرو گے تو اس کا امر (یعنی تمھاری یہ بات) تمھارے اس پچھلے دروازے سے جس کو تم نے بند کیا ہے، اس کے ساتھیوں کی طرف نکل جائے گا اور لگتا ہے کہ وہ کود پڑیں اور تم سے لڑ بھڑ کر اس کو تمھارے ہاتھوں سے نکال لے جائیں۔ مجھ کو امن نہیں ہے کہ پھر وہ تم کو تمھارے ان شہروں سے نکال دیں، سب نے کہا: شیخ سچ کہتا ہے، کچھ اور صلاح کرو۔ بعض نے کہا کہ اس کو اپنے درمیان سے نکال دو، پھر چین سے بیٹھو، کیونکہ جب وہ ہم میں سے نکل جائے گا تو پھر جو کچھ کرے گا اس کا ضرر تم کو نہ ہو گا اور جب وہ تم سے غائب ہو گیا تو پھر ستا نہ سکے گا اور تم چین میں ہو جاؤ گے، اس کا واسطہ اَوروں سے جا پڑے گا۔

شیخ نجدی نے کہا: واللہ! میری تمھارے لیے یہ رائے نہیں ہے۔ کیا تم نے اس کے قول کی مٹھاس اور اس کی زبان کی فصاحت نہیں دیکھی ہے کہ کس طرح اس کی بات دلوں کو پکڑ لیتی ہے؟ واللہ! اگر تم ایسا کرو گے تو پھر وہ سامنے آئے گا، لوگ اس کے پاس جمع ہو جائیں گے، وہ چڑھائی کر کے تم کو تمھارے شہروں سے نکال دے گا اور تمھارے اشراف کو قتل کر دے گا۔ بولے: اس نے سچ کہا۔ واللہ! اب کوئی اور رائے دیکھو! ابوجہل نے کہا: میں تم کو وہ رائے بتاتا ہوں جو اب تک تم کو نہیں سوجھی۔ کہا: وہ کیا رائے ہے؟ کہا: ہر قبیلے سے ایک جوان لڑکا لے کر ہر ایک کو ایک ایک تیز تلوار دو، وہ سب مل کر ایک شخص کی طرح تلواریں ماریں، جب قتل کر لیں گے تو اس کا خون سارے قبیلوں میں متفرق ہو جائے گا، مجھ کو گمان نہیں کہ بنی ہاشم کا یہ ایک قبیلہ قریش کے سارے قبیلوں سے جنگ کرنے پر قوی ہو، بلکہ جب وہ یہ حال دیکھیں گے تو دیت قبول کریں گے اور ہم سکون میں ہو جائیں گے، ہماری اذیت دور ہو جائے گی۔

شیخ نجدی نے کہا: واللہ! یہی رائے ہے اور بات یہی بات اس جوان کی ہے، میں بھی اس کے سوا اور رائے نہیں دیتا۔ یہ مشورہ کر کے سب الگ ہوئے، سب کا اس امر پر اجماع ہوا۔ جبریل علیہ السلام نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا کہ آج تم اپنی خواب گاہ میں نہ سونا۔ قوم نے یہ مکر طے کیا ہے۔ اس رات نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں نہ سوئے اور اللہ نے وہاں سے نکلنے کی اجازت دے دی۔

جب مدینے میں آئے تو ان کے اس قول کے بارے میں کہ ”تَرَبَّصُوْا بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنَ حَتّٰى يُهْلَكَ كَمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَهٗ مِنَ الشُّعَرَآءِ“ یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴾ [الطور: ٣٠] ”کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟“ غرض کہ اس دن کا نام یوم الزحمہ رکھا گیا، اس لیے کہ سب کی رائے اس دن اسی زحمت پر اکٹھی ہوئی تھی۔

امام سدی رحمہ اللہ بھی اسی سیاق کے راوی ہیں اور وہ جو انھوں نے اخراج کا ارادہ کیا تھا، اس کے بارے میں یہ آیت آئی ہے: ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٦] ''اور بلاشبہہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس زمین (مکہ) سے اُکھاڑ دیں، تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں، اور تب آپ کے پیچھے وہ تھوڑا ہی ٹھہر پاتے۔'' اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عروہ بن زبیر، موسیٰ بن عقبہ، قتادہ، مقسم اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ سے منقول ہے۔①

میں کہتا ہوں کہ یہی حال نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے بعض آحاد پر بھی منافقین اور کذابین کے ہاتھ سے گزرا کہ انھوں نے بغیر کسی دینی یا دنیاوی وجہ کے محض حسد و کینہ کی بنیاد پر حبس کرنے، قتل کرنے یا نکال دینے کا ارادہ کیا، مگر اللہ پاک نے جس طرح اپنے پیغمبر عالی قدر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہر سہ بلا سے بچایا، اسی طرح اس احقر اہلِ بیت کو باوجود ہزار عصیان و گناہوں کے شریروں اور مفسدوں کے ہاتھ سے محفوظ رکھا۔ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

یہ واقعہ ۱۳۰۱ھ سے اب تک سیاق میں ہے: ﴿ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾ [يوسف: ٦٤] ''چناں چہ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔'' ع

تَمَنّٰى رِجَالٌ اَنْ أَمُوْتَ وَإِنْ أَمُتْ فَتِلْكَ سَبِيْلٌ لَسْتُ فِيْهَا بِأَوْحَدِ

''لوگوں نے میرے مرنے کی خواہش کی، اگر میں مر گیا تو اس راہ میں مَیں اکیلا نہیں۔''

ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم کے انتظار میں ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ جب قریش نے اکٹھے ہو کر مکر کیا اور قتل کا ارادہ کیا تو جبریل علیہ السلام نے آ کر کہہ دیا کہ آج تم اس مکان میں نہ سوؤ جس میں سوتے ہو۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ آج میرے بستر پر تم سو رہو، وہ اپنی سبز چادر لپیٹ کر لیٹ رہے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر قوم پر آئے اور ایک مٹھی خاک لے کر ان کے سروں پر ڈالی، کسی نے آپ کو نہ دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورت یٰسین پڑھتے تھے، إلی قوله: ﴿ فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴾ [يٰس: ٩] ''پھر ہم نے ان (کی آنکھوں) کو ڈھانک دیا، لہٰذا وہ دیکھ نہیں سکتے۔''②

امام ابن حبان اور حاکم رحمہما اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتی ہوئی آئیں، فرمایا: کیوں روتی ہو؟ کہا: کیسے نہ روؤں، یہ قریش کا گروہ حجر میں باہم لات، عزیٰ اور منات کی قسمیں کھا کر عہد کر رہا ہے کہ اگر آپ کو دیکھ لے گا تو اٹھ کر قتل کر ڈالے گا، ان میں سے ہر ایک نے آپ کے خون سے اپنا عہد کر لیا ہے، فرمایا: وضو کا پانی لاؤ، وضو کر کے مسجد میں آئے، گروہ نے دیکھ کر کہا کہ

---

① تفسير الطبري (١٣/ ٤٩٤۔ ٤٩٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٠٠۔٤٠١) ② تفسير ابن كثير (٢/ ٤٠١)

یہ وہی ہیں، پھر اپنے سر نیچے کر لیے، گردنیں سامنے ڈال دیں، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مٹھی مٹی لے کر ان پر پھینکی اور فرمایا: « شَاهَتِ الْوُجُوْهُ » وہ خاک جس کسی پر پڑی وہ بدر کے دن کافر مارا گیا۔ حاکم نے کہا کہ یہ حدیث شرطِ مسلم پر ہے، اس میں کوئی علت نہیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیتِ باب کے متعلق کہا ہے کہ ایک رات قریش نے مکے میں مشورہ کیا، بعض نے کہا کہ صبح کو مشکیں باندھو، بعض نے کہا: بلکہ مار ڈالو، بعض نے کہا: نہیں بلکہ شہر سے نکال دو۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو اس بات کی اطلاع دے دی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نبیِ کریم ﷺ کے بستر پر سو رہے اور نبی کریم ﷺ نکل کر غار میں جا چھپے، مشرکین رات بھر علی رضی اللہ عنہ کی حراست کرتے رہے، اس گمان پر کہ وہ آپ ﷺ ہیں، جب صبح ہوئی، آ کر دیکھا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے، اللہ نے ان کا مکر پھیر دیا۔ کہا: تیرا صاحب کدھر ہے؟ کہا: مجھے نہیں معلوم، نشانِ قدم پر چلے، جب پہاڑ تک پہنچے تو نشان خلط ملط ہو گیا، پہاڑ پر چڑھ کر غار پر سے گزر گئے، دیکھا کہ مکڑی نے جالا بُن رکھا ہے، کہا: اگر اس غار میں گھستے تو مکڑی کا یہ جالا نہ ہوتا۔ نبی کریم ﷺ تین رات اس غار میں رہے۔[2] امام عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ بہتر مکر (خفیہ تدبیر) کرنے والا ہے، ایسا مضبوط مکر ان کے ساتھ کیا کہ نبیِ اکرم ﷺ کو رہائی بخشی۔[3]

اللہ کے احسانات اپنے عاجز بندوں پر بے شمار ہوتے ہیں، اس حقیر جان، جو خاک برابر ہے، کے ساتھ بھی یاروں نے مکر کے ذریعے زہر دینے اور قتل وغیرہ میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر خیر الماکرین ارحم الراحمین نے ان کا مکر چلنے نہ دیا۔ قے اور دست سے زہر کا اثر زائل ہوا، قاتل کا کوئی قابو نہ چلا، اس طوفانِ بدتمیزی میں کوئی اور ہی مارا گیا ؎

لو حضرت دل اور سنو تازہ خبر اور   ہوتا ہے وہاں مشورہ قتل ہمارا

اللہ پاک کا ارشادِ حق بنیاد: ﴿ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ﴾ [الفاطر: ۴۳] ”اور بری چال اس کے چلنے والے ہی کو گھیرتی ہے۔“ صادق آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آخرت میں تو اس کا وقوع یقینی طور پر ہو گا اور دنیا میں بھی اگر یہ شر پسند اور فاسق و فاجر لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائیں تو اللہ قہار و جبار کی حکمتِ بالغہ سے کچھ بعید نہیں ؎

گر ختم سوختی پروانہ آتش بجانے را   تو ہم شب رابسر کے میبری اے شمع کمفرصت

”اے کم مہلت شمع! تو بھی رات کیوں کر پوری کرے گی، مان لیا کہ تو نے آگ کے پروانے کی ہستی ختم کر دی۔“

---

[1] صحيح ابن حبان (١٤/ ٤٣٠) مستدرك الحاكم (١/ ٢٦٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٢٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٤٨) اس کی سند میں ”عثمان جزری“ ضعیف راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١١٢٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٨٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو وہ نعمتِ عظمیٰ یاد دلائی جوان پر کی تھی، یعنی مکہ مکرمہ میں کفار اور مشرکین کے مکر اور فریب سے نجات دینا، کیونکہ یہ واقعہ ہجرت سے پہلے مکے میں ہوا تھا۔ اگر چہ سورت مدنی ہے، مگر عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت مکی ہے۔[1] مکر دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے حیلہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اثبات سے مراد زخمی کرنا ہے یا باندھ رکھنا یا یہ کلمہ بیات سے مشتق ہے، بمعنی شب خون مارنے کے۔ قتل کی رائے ابوجہل نے دی تھی، سو وہ خود بدر کے دن مارا گیا۔ اخراج کی رائے ہشام بن عمرو نے دی تھی۔ شیخ نجدی اس رائے میں ابوجہل کی رائے کے موافق تھا۔[2]

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾

اور جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں: یقیناً ہم نے سن لیں اگر ہم چاہیں تو اس طرح (کا کلام) ہم بھی کہہ سکتے ہیں، یہ تو اگلے لوگوں ہی کی داستانیں ہیں (31)

قران کو اساطیر قرار دینا اور اس جیسا بنانے کا دعویٰ کرنا:

یعنی ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ اب تو دیکھ لیا کہ یہ قصے نہ تھے، وعدۂ عذاب تمھارے لیے بھی آیا، جیسے پہلوں پر آیا تھا۔ اللہ پاک نے اس آیت میں قریش کے کفر، سرکشی، حد سے بڑھنا اور دشمنی کی خبر دی ہے اور اس باطل دعوے کے متعلق بتایا ہے جو وہ آیت سن کر کرتے تھے کہ ہم بھی ایسا قرآن بنا سکتے ہیں، حالانکہ ان کا یہ قول ایسا ہے جو کبھی وہ پورا نہ کر سکے، کیونکہ ان کو بارہا کہا گیا کہ اچھا اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ، لیکن انھوں نے کوئی رستہ نہیں پایا۔ ان کا یہ کہنا محض اپنے جی کو اور اپنے متبعین کو دھوکا دینا ہے۔

کہا گیا کہ یہ بات کہنے والا النضر بن الحارث ـلعنه الله۔ تھا۔ سعید بن جبیر، سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ کا قول یہی ہے،[3] کیونکہ وہ ملعون بلادِ فارس کی طرف جا کر وہاں کے بادشاہوں کی خبریں لے آیا تھا۔ رستم اور اسفند یار کے قصے کہانیاں یاد رکھتا تھا۔ جب وہاں سے یہاں آیا، نبیِ اکرم ﷺ کو مبعوث پایا، دیکھا کہ وہ لوگوں پر قرآن پڑھتے ہیں، جب نبیِ کریم ﷺ اس مجلس سے اٹھ کھڑے ہوتے تو نضر وہاں بیٹھ جاتا، ان لوگوں کی خبریں بیان کرتا، پھر کہتا کہ "بِاللّٰهِ أَيُّنَا أَحْسَنُ قَصَصًا، أَنَا أَوْ مُحَمَّدٌ؟" اس لیے جب بدر کے دن اللہ نے اس پر قابو دیا اور وہ گرفتار ہوا تو نبیِ اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ اس کی گردن مار دیں، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ وللہ الحمد.

مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے اس کو گرفتار کیا تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ سعید بن جبیر سے راوی ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ

---

(1) تفسیر الطبري (١٣/ ٥٠٢) (2) فتح البیان (٥/ ١٦٥۔ ١٦٦) (3) تفسیر الطبري (١٣/ ٥٠٣۔ ٥٠٤)

نے بدر کے دن عقبہ بن ابی معیط وطعیمہ بن عدی ونضر بن حارث کو بطور صبر، یعنی بھوکا پیاسا رکھ کر قتل کیا۔ نضر کو مقداد نے اسیر کیا تھا، جب اس کے قتل کا حکم دیا تو مقداد نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میرا اسیر ہے، فرمایا: اللہ کی کتاب میں قیل و قال کرتا تھا، جب قتل کا حکم دیا تو مقداد نے پھر وہی کہا: ”یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَسِیْرِيْ“ فرمایا: ”اَللّٰھُمَّ اغْنِ الْمِقْدَادَ مِنْ فَضْلِكَ“ مقداد نے کہا: بس میں یہی چاہتا تھا۔ اسی بارے میں یہ آیت اتری۔[1]

اساطیر اسطورہ کی جمع ہے، مراد قصوں کی کتابیں ہیں، یعنی نبی اکرم ﷺ کہانیاں سیکھ کر لوگوں کو سناتے ہیں، یہ اس مردود کا خالص جھوٹ تھا، جس طرح اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان: ٥۔ ٦] ”اور انھوں نے کہا: یہ اگلوں کے افسانے ہیں (جو) اس نے اپنے لیے لکھوائے ہیں اور وہ صبح و شام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اسے اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہے، بلاشبہ وہ غفور (اور) رحیم ہے۔“ یعنی جو کوئی توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اس کے گناہوں سے درگزر فرماتا ہے۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۲

اور جب انھوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر دردناک عذاب لے آ (32)

مشرکوں کا فیصلہ اور عذاب طلب کرنا:

ابوجہل جب مکے سے نکلنے لگا تو یہی دعا کی، کعبے کے سامنے وہی پیش آئے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا ایسی دعا مانگنا ان کی جہالت کی کثرت، تکذیب کی شدت، دشمنی اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔ یہ دعا ان کے جملہ عیوب میں سے ایک عیب سمجھی گئی، کیونکہ اگر دعا کرنا تھا تو یوں کرتے: ”اَللّٰھُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاهْدِنَا لَهٗ، وَوَفِّقْنَا لِاتِّبَاعِهٖ“ لیکن انھوں نے اپنے نفس پر فیصلہ چاہا اور عذاب میں جلدی کی اور عذاب چاہا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٥٣] ”اور یہ لوگ آپ سے جلد عذاب مانگ رہے ہیں اور اگر (عذاب کا)

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٥٠٤) یہ روایت مرسل ہے۔

وقت مقرر نہ ہوتا تو انھیں عذاب ضرور آلیتا اور یقیناً وہ انھیں اچانک ہی آ لے گا اور انھیں خبر تک نہ ہوگی۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ [صٓ: ١٦] ”اور انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا (عذاب کا) حصہ یومِ حساب سے پہلے جلد دے دے۔“ نیز فرمایا: ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ﴾ [المعارج: ١۔٣] ”ایک سائل نے عذاب مانگا جو واقع ہونے والا ہے۔ کافروں پر، کوئی اسے ٹالنے والا نہیں۔ اس اللہ کی طرف سے جو اونچے درجوں والا ہے۔“

اسی طرح سابقہ امتوں کے جاہل لوگوں نے بھی کہا تھا، جیسے شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا: ﴿ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٨٧] ”لہٰذا اگر تو سچوں میں سے ہے تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا گرا دے۔“ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس کلمے کا کہنے والا ابوجہل بن ہشام تھا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ ﴾ [الأنفال: ٣٣] (رواه البخاري)[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس قول کا کہنے والا النضر بن حارث بن کلدہ تھا۔ اس پر یہ آیت آئی: ﴿ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴾ یہی امام مجاہد، عطا، سعید بن جبیر اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔

امام عطا رحمہ اللہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴾ [صٓ: ١٦] ”اور انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا (عذاب کا) حصہ یومِ حساب سے پہلے جلد دے دے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ [الأنعام: ٩٤] ”اور یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جس طرح کہ ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا۔“ امام عطا رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے بارے میں دس سے کچھ اوپر آیتیں کتاب اللہ کی آئی ہیں۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے احد کے دن عمرو بن عاص کو ایک گھوڑی پر سوار دیکھا وہ کہتا تھا: ”اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ مَا يَقُوْلُ مُحَمَّدٌ حَقًّا فَاخْسِفْ بِيْ وَبِفَرَسِيْ“ امام قتادہ رحمہ اللہ نے آیتِ باب کے بارے میں کہا ہے: ”ذٰلِكَ سَفَهَةُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَجَهَلَتِهَا فَعَادَ اللّٰهُ بِعَائِدَتِهِ وَرَحْمَتِهِ عَلٰى سَفَهَةِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَجَهَلَتِهَا“[2]

فتح البیان میں ہے کہ یہ قول کفار و مشرکین کا انکار اور کفر میں ایک مبالغہ تھا کہ انھوں نے اللہ سے سوال کیا کہ ان پر آسمان سے پتھروں کی بارش کی جائے۔[3]

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۳۳

اور (اے نبی!) اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ آپ بھی ان کے درمیان (موجود) ہوں، اور اللہ انھیں عذاب دینے والا نہیں، جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں (33)

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧١)
(2) تفسير الطبري (١٣/ ٥٠٥۔ ٥٠٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٠٢۔ ٤٠٣)
(3) فتح البيان (٥/ ١٦٧)

رسول اللہ ﷺ کا وجودِ مسعود اور مشرکوں کا استغفار... عذاب کی راہ میں رکاوٹ:

یعنی مکے میں نبیِ اکرم ﷺ کے قدم سے عذاب رک رہا تھا، اب ان پر عذاب آیا، اسی طرح جب تک گناہ گار نادم رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا، اگرچہ بڑے سے بڑا گناہ ہو۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ گناہ گاروں کے لیے دو چیزیں پناہ ہیں: ایک میرا وجود اور دوسرے استغفار۔[1]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اے پیغمبر! جب تک تم زمینِ مکہ میں موجود ہو ان کو عذاب سے مہلت ہے۔ عذاب سے مراد استیصال (بالکلیہ ہلاک کرنا) ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے: کیونکہ عذاب جب اترتا ہے تو عام ہوتا ہے اور کسی امت کو بھی اس وقت تک عذاب نہیں ہوا، جب تک پیغمبر اور مومنین اس جگہ سے نکل نہ گئے۔[2] وہ طواف میں کہتے تھے: غُفْرَانَكَ، اس پر یہ آیت ﴿ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ تک اتری۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "كَانَ فِيْهِمْ اَمَانَانِ: النَّبِيُّ ﷺ، وَالْاِسْتِغْفَارُ، فَذَهَبَ النَّبِيُّ وَبَقِيَ الْاِسْتِغْفَارُ"[3] ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے مجھ پر دو امانیں میری امت کے لیے اتاری ہیں: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ ... الخ﴾ (آیتِ باب) سو جب میں چلا جاؤں گا تو ان میں استغفار چھوڑ جاؤں گا۔[4] (رواه الترمذي و ضعفه) کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتے جو ایمان لائے ہیں اور استغفار کرتے تو اللہ ان کو عذاب نہ کرتا۔

بعض نے کہا ہے کہ استغفار کا مرجع مسلمین کی طرف ہے، یعنی جب تک ان کفار کے درمیان استغفار کرنے والے مسلمین تھے، اللہ نے ان کو عذاب نہ کیا، جب مسلمان ان کے بیچ سے نکل گئے تو بدر کے دن اور بدر کے بعد انھیں عذاب کیا گیا۔ کسی نے کہا: مراد یہ ہے کہ ان کی پشت میں وہ لوگ ہیں جو استغفار کریں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کو اسلام اور استغفار کی اس کلمے کے ساتھ دعوت ہے۔ امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ استغفار سے مراد اسلام ہے، یعنی اگر اسلام لے آتے تو انھیں عذاب نہ دیا جاتا۔[5] اہلِ معانی نے کہا ہے کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ استغفار عذاب سے امان اور سلامتی ہے۔

احادیث صرف استغفار کے متعلق بکثرت آئی ہیں، جو کتبِ احادیث میں دی گئی ہیں[6] اور رسالہ محو الحوبہ میں تحریر

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۸۲) اس کی سند میں "عباد بن یوسف" مجہول اور "اسماعیل بن مہاجر" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۶۹۰)

[2] تفسير الجلالين (۱/ ۲۳۲)
[3] تفسير الطبري (۱۳/ ۵۱۲)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۸۲) اس کی سند میں "عباد بن یوسف" مجہول اور "اسماعیل بن مہاجر" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۶۹۰)

[5] تفسير الطبري (۱۳/ ۵۱۵)
[6] فتح البيان (۵/ ۱۶۷۔ ۱۶۸)

ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مشرک بیت اللہ کا طواف کرتے تو کہتے: "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے: قَدْ قَدْ وہ کہتے: إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ، پھر کہتے: غُفْرَانَكَ غُفْرَانَكَ، اس پر یہ آیت اتری۔ یزید بن رومان اور محمد بن قیس کہتے ہیں کہ بعض قریش نے بعض سے کہا کہ اللہ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے درمیان مکرم کیا (عزت بخشی) پھر کہا: "اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ... الخ" جب ایمان لائے تو اپنے کہے پر نادم ہوئے اور کہا: غُفْرَانَكَ اللّٰهُمَّ اس پر آیتِ باب آئی۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اس امت میں دو امانیں رکھی ہیں، وہ ہمیشہ عذاب کی سختیوں سے بچے ہوئے ہیں اور پناہ میں ہیں، جب تک کہ وہ امانیں ان کے درمیان ہیں۔ پھر اللہ نے ایک امان اٹھالی اور دوسری امان تمھارے درمیان باقی ہے۔[2] یہی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔[3] ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شیطان نے کہا کہ قسم ہے تیری عزت کی، میں ہمیشہ تیرے بندوں کو بہکاؤں گا، جب تک کہ ان کی جانیں ہیں ان کے بدنوں کے اندر۔ رب نے فرمایا: مجھے بھی اپنی عزت اور جلال کی قسم ہے! ان کو میں ہمیشہ بخشتا رہوں گا، جب تک وہ مجھ سے استغفار کرتے رہیں گے۔[4] (رواہ أحمد وقال الحاكم: صحيح الإسناد ولم يخرجاه) فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ بندہ اللہ کے عذاب سے امن میں ہے، جب تک اللہ عزوجل سے استغفار کرتا رہے۔[5] (رواہ أحمد)

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور (اب) ان کے لیے کونسی وجہ ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جبکہ وہ (لوگوں کو) مسجد حرام سے روکتے ہیں، حالاں کہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو متقی لوگ ہی ہیں اور لیکن ان میں سے اکثر (اس

---

[1] تفسير الطبري (۱۳/ ۵۱۱۔ ۵۱۲) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۶۹۲۔ ۱۶۹۳) [3] تفسير الطبري (۱۳/ ۵۱۳۔ ۵۱۴)

[4] مسند أحمد (۳/ ۲۹) مستدرك الحاكم (۴/ ۲۹۰) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۰۴)

[5] مسند أحمد (۶/ ۲۰) تفسير ابن كثير (۲/ ۳۰۳۔ ۳۰۴) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ نیز "رشدین بن سعد" ضعیف راوی ہے۔

حقیقت کو) نہیں جانتے 34 اور بیت اللہ کے پاس ان (مشرکین) کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں تھی، چناں چہ تم عذاب چکھو اس کفر کی وجہ سے جو تم کرتے تھے 35

مسجد حرام سے روکنا اور قبیح کاموں کا ارتکاب کرنا عذاب کا باعث:

قریش آپ کو اولادِ ابراہیم سمجھ کر کعبے کا مختار ٹھہراتے تھے اور مسلمانوں کو آنے نہ دیتے تھے۔ سو فرمایا کہ اولادِ ابراہیم میں جو پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے اور بے انصافوں کا حق نہیں کہ جس سے آپ ناخوش ہوئے، اسے نہ آنے دیا۔ اللہ نے خبر دی ہے کہ یہ لوگ اس لائق ہیں کہ انھیں عذاب کیا جائے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے ان کے درمیان قیام کی برکت سے ان پر عذاب نہ آیا، لہٰذا جب وہ ان کے درمیان سے نکل گئے تو بدر کے دن ان پر عذاب ٹوٹ پڑا اور قریش کے بڑے بڑے رئیس اور سردار مارے گئے، ان کے سردار گرفتار ہوئے، اللہ نے ان کو ان گناہوں سے جن میں آلودہ تھے، یعنی شرک و فساد سے استغفار کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوم استغفار نہ کرتی تھی، اگر استغفار کرتی تو انھیں عذاب نہ ہوتا۔[1] ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

اگر ان میں استغفار کرنے والے کمزور مسلمان مومن نہ ہوتے تو ان پر ایسا عذاب آتا جو ٹل نہ سکتا۔ لیکن وہ عذاب ان سے ان ضعیف مسلمانوں کے استغفار کرنے سے ٹل گیا، جس طرح اللہ نے حدیبیہ کے دن فرمایا: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ [الفتح: ٢٥] ''یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجدِ حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے۔''

ابن ابزیٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکے میں تھے، اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ﴾ پھر آپ ﷺ مکے سے نکل کر مدینے میں آئے، اللہ نے یہ آیت اتاری: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (آیتِ باب) یہ لوگ باقی ماندہ مسلمان تھے جو مکے میں رہ گئے تھے اور اللہ سے استغفار کرتے تھے، جب

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٥١٤) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٥١٧)

وہ بھی وہاں سے نکل آئے، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ ﴾ (آیتِ باب) یہ فتح مکہ اللہ کا اذن تھا۔ یہ فتح اہلِ مکہ کے لیے عذابِ موعود تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو مالک، ضحاک اور کئی ایک سے اسی طرح مروی ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس قول کی ناسخ ہے۔ ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) اس بنیاد پر کہ مراد خود ان سے استغفار کا صادر ہونا ہے۔ امام عکرمہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس آیت کو دوسری آیت جو اس کے بعد ہے، نے منسوخ کر دیا: ﴿ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ إلى قوله فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) پھر مکے میں مقاتلہ ہوا، بھوک اور نقصان پہنچا۔[2]

مسجدِ حرام کے اہل اور متولی مشرک نہیں مومن ہیں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی اللہ ان کو کیوں کر عذاب نہ کرے، حالانکہ وہ مومنین اہلِ مکہ کو مسجد الحرام میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں اور طواف نہیں کرنے دیتے۔[3] اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ وہ کچھ مسجد الحرام کے اہل نہیں۔ مسجد کے اہل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [التوبة: ۱۷۔ ۱۸] ''مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ انہی لوگوں کے (سب) اعمال برباد ہوگئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں تو صرف وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا، لہٰذا امید ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [البقرة: ۲۱۷] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ اور وہ (کافر) تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ حالتِ کفر ہی پر مر جائے تو

[1] تفسير الطبري (۱۳/ ۵۰۹۔ ۵۱۱) [2] تفسير الطبري (۱۳/ ۵۱۷) [3] تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۵۹۳)

انہی لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت (دونوں) میں برباد ہوگئے اور وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آپ کے اولیا کون ہیں؟ فرمایا: ہر متقی، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (آیتِ باب)[1] (رواہ ابن مردویہ) سیدنا رفاعہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو جمع کر کے فرمایا: کیا تم میں کوئی غیر ہے؟ کہا: ہم میں ہمارے بھانجے اور ہمارے ہم قسم اور ہمارے غلام ہیں، فرمایا کہ ہمارے حلیف اور بھانجے اور ہمارے غلام ہم میں سے ہیں، لیکن میرے اولیا تم میں وہ ہیں جو متقی ہیں۔[2] (رواہ الحاکم وقال: هذا صحيح ولم يخرجاه) امام عروہ، سدی اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ باب سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مجاہد لوگ ہیں، کوئی ہوں، کہیں ہوں۔[3]

مشرکوں کی عبادت سیٹیاں اور تالیاں بجانا:

پھر اللہ نے مسجد حرام میں ان کے معاملے کا ذکر کیا۔ سیدنا ابن عمرو، ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو رجا عطاردی، محمد بن کعب قرظی، حجر بن عنبس، نبیط بن شریط، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا کہ ﴿ مُكَآءً ﴾ سے مراد سیٹی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی انگلیاں مونہوں میں داخل کرتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُكَآءً ﴾ صفیر (آواز یا چہچہاہٹ) ہے، سفید پرندہ کی صفیر جس کو مکاء کہتے ہیں۔ یہ سفید پرندہ حجاز کے علاقے میں ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قریش خانہ کعبہ کا طواف کرتے، ننگے بدن ہوتے، سیٹی لگاتے، تالیاں بجاتے۔ مکاء سیٹی بجانا ہے اور تصدیہ تالیاں بجانا۔ یہی تابعین وغیرہم کی ایک جماعت کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ وہ اپنے گال زمین پر رکھ کر سیٹی لگاتے، تالی بجاتے۔[4] قرہ نے کہا ہے کہ عطیہ نے ہم کو ابن عمر کی طرح کر کے دکھایا، سیٹی بجائی، گال جھکایا، دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی۔[5]

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بیت اللہ کا شمال کی جانب پر طواف کرتے تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کرتے تھے کہ نماز نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلط ہو جائے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنوں کے ساتھ استہزا کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن زید اور ابن جبیر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تصدیہ سے مراد ان کا لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔[6] عذاب سے مراد وہ آفت ہے جو بدر کے دن ان کو پہنچی، کوئی مارا گیا، کوئی پکڑا گیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے[7] اور کوئی دوسرا قول بیان نہیں کیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ اقرار کے عذاب سے مراد تلوار کے ساتھ اور اہلِ تکذیب کے ساتھ چیخ اور زلزلہ کا عذاب ہے۔[8]

---

[1] المعجم الأوسط (٣/ ٣٣٨) اس کی سند میں ''نوح بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٠٤)
[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٨) ....؟؟ [3] تفسير الطبري (١٣/ ٥٢٠) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٩٤ـ ١٦٩٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٩٥ـ ١٦٩٦) [5] تفسير الطبري (١٣/ ٥٢٣)
[6] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٩٦ـ ١٦٩٧) [7] تفسير الطبري (١٣/ ٥٢٨) [8] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٦٩٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جب اللہ نے یہ ذکر کیا کہ ان کے عذاب سے دو امر مانع ہیں: ایک ان کے درمیان نبیِ اکرم ﷺ کا وجود اور دوسرے استغفار کا موجود ہونا۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ مکے کے کفار عذاب کے مستحق ہیں، قبیح چیزوں کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے، یعنی کون سی چیز ان کے عذاب سے مانع ہے، ان کا بدر کے دن قتل ہونا اور قیدی بننا یا آخرت کا عذاب، حالانکہ وہ لوگوں کو مسجدِ حرام میں آنے سے روکتے ہیں جس طرح سالِ حدیبیہ میں نبیِ اکرم ﷺ کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ خانہ کعبہ سے روک دیا تھا، سو یہ لوگ کچھ اللہ کے دوست نہیں ہیں، جس طرح کہ زعم کرتے ہیں۔ ان کا شرک کے باوجود یہ کہنا کہ ہم بیت اللہ کے متولی اور اللہ کے ولی ہیں، مردود ہے۔

اللہ کے دوست وہ لوگ ہوتے ہیں جو پرہیزگار ہیں، شرک اور معاصی سے بچتے ہیں، خواہ کوئی ہوں، کہیں ہوں، مکے میں ہوں یا عجم میں، لیکن اکثر لوگ جہالت اور بے علمی کی وجہ سے یہ بات نہیں جانتے، بلکہ صرف مکے میں رہنے کو اور بیت اللہ کا والی اور خادم ہونے کو اللہ کے ساتھ اپنی ولایت اور دوستی کا سبب خیال کرتے ہیں۔ سو یہ محض جہالت اور نری حماقت ہے، کیونکہ اگر یہ اللہ کے دوست ہوتے تو نماز کے بجائے سیٹی نہ لگاتے، تالیاں نہ بجاتے۔ بھلا یہ بھی کوئی عبادت ہے، اس جگہ جو کام چاہیے تھا، یعنی نماز پڑھتے، ذکر کرتے، وہ تو فوت کر دیا، بجائے اس کے اس کھیل وخرافات اور ہوس میں گرفتار ہو گئے۔ اس ذکر سے مراد مشرکین کو ڈانٹنا ہے، اب وہ اس کفر کے بدلے میں بدر کا عذاب چکھیں۔ رہا آخرت کا عذاب سو وہ آخرت میں ہوگا، ایسے ہی لوگ دنیا اور آخرت میں خسارہ پانے والے اور ذلیل ہوتے ہیں۔[1]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ
حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ
يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ
وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا
فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں، تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں تو وہ ابھی (اور) مال خرچ کریں گے، پھر وہ ان کے لیے باعثِ حسرت ہوگا، پھر وہ مغلوب ہو جائیں

[1] فتح البیان (٥/ ١٦٩۔ ١٧٠)

گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ﴿36﴾ تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے، اور ناپاک (لوگوں) کو (ایک دوسرے پر) اوپر تلے رکھ کر سب کا ڈھیر لگا دے، پھر اسے جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿37﴾

راہِ خدا میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے کفار کا مال خرچ کرنا، ان کے لیے وبال وحسرت اور شانِ نزول:

یعنی آہستہ آہستہ اللہ اسلام کو غالب کرے گا، اس بیچ میں کافر اپنے جان و مال کا زور خرچ کر لیں گے، تاکہ نیک اور بد جدا ہو جائے، یعنی جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکیں اور جن کو کفر پر مرنا ہے، وہی اکٹھے دوزخ میں جائیں گے۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب قریش بدر کے دن مارے گئے اور بچے کھچے مکے میں آئے اور ابوسفیان اپنے قافلے سمیت پہنچے تو عبداللہ بن ابی، ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ نے دوسرے قریش کے ہمراہ جن کے باپ، بھائی اور بیٹے بدر میں مارے گئے تھے، ابوسفیان سے گفتگو کی اور سوداگرانِ قریش سے جو اس معرکے میں شریک تھے، کہا کہ اے گروہِ قریش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم کو بے دم کر دیا اور تمھارے اچھے اچھے لوگ مار ڈالے، اب تم اس مال سے ہماری مدد کرو کہ ہم ان مصیبت زدوں کا بدلہ لیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس پر بقول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

یہی تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول ابوسفیان بن حرب کے بارے میں ہوا ہے، اس نے بہت سا مال نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احد میں جنگ کرنے کے لیے صرف کیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ بدر کے بارے میں اتری ہے۔[2] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر تقدیر پر یہ آیت عام ہے، اگرچہ اس کے نزول کا سبب خاص ہو۔

اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ کافر اپنا مال حق راستے کے اتباع سے روکنے کے لیے خرچ کیا کرتے ہیں، سو ابھی یہ اور خرچ کریں گے۔ جب سارا مال خرچ ہو چکے گا تو حسرت اور ندامت میں گرفتار ہوں گے، کیونکہ جو ان کا مطلب تھا وہ ہاتھ نہ آیا، یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ اللہ کا نور بجھ جائے۔ ان کی بات کلمۂ حق سے بلند ہو جائے، سو یہ تو نہ ہوا، اللہ نے اپنا نور پورا کیا۔ کافروں کو اگر برا لگا کرے تو لگا کرے۔ وہ اپنے دین کا مددگار اپنے بول کا بالا کرنے والا اور اپنی شرع کا غالب کرنے والا ہے، یہ دین اس کا ہر دین پر غالب ہو جائے گا۔ ان کو دنیا میں رسوائی، خواری اور آخرت میں دوزخ کا عذاب ہوگا، جو کوئی ان میں زندہ رہے گا، وہ آنکھ اور کان سے مکروہ شے دیکھے سنے گا اور جو کوئی ان میں مقتول ہوگا یا مرے گا اس کا انجام ابدی رسوائی اور ہمیشہ کا عذاب ہے۔[3]

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٥٣٢ـ ٥٣٣)　[2] تفسیر الطبري (١٣/ ٥٣٣)　[3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٠٥)

ناپاک کو پاک سے الگ کرنے کی تفسیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خبیث کو طیب سے ممیّز کرنے کا مطلب بد بخت لوگوں کو نیک بخت لوگوں سے جدا کرنا ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومن کا کافر سے ممیّز کرنا ہے۔ احتمال ہے کہ یہ تمیز آخرت میں ہو گی، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴾ [يونس: ٢٨] ''اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے، جنھوں نے شرک کیا، کہیں گے: تم اور تمھارے شریک اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر ہم ان کے درمیان جدائی ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے: تم ہماری عبادت تو کرتے ہی نہیں تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ ﴾ [الروم: ١٤] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے۔'' نیز دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴾ [الروم: ٤٣] ''اس دن وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴾ [يٰس: ٥٩] ''اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔''

یا یہ تمیز اس طرح پر دنیا میں ہو کہ ان کے اعمال مومنوں پر کھل جائیں اور یہ لام تعلیل کے واسطے آیا ہو، یعنی ہم نے ان کو یہ قدرت مالوں کے خرچ کرنے پر اس لیے دی ہے کہ ناپاک پاک سے جدا ہو جائے، یعنی کون اللہ کا مطیع ہو کر اپنے دشمن کافروں سے جنگ کرتا ہے اور کون گناہ گار بن کر اس امر سے باز رہتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَاتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴾ [آل عمران: ١٦٦۔ ١٦٧] ''اور اُحد کے دن جب دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا، وہ اللہ کے حکم سے تھا، اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں۔ اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے میں لڑو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٥٣٤۔ ٥٣٥) اس کی سند حسن ہے۔

فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۱۷۹] ''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علاحدہ کر دے اور نہ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۴۲] ''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔''

اس آیت کی نظیر سورت براءت میں بھی ہے۔ اس بنیاد پر آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم نے جو تم کو کفار کے ساتھ جنگ میں مبتلا کیا ہے اور ان کو تمھارے مقابلے میں اپنے مال خرچ کرنے کی قدرت دی ہے سو یہ اس لیے کیا ہے کہ خبیث طیب سے جدا ہو جائے اور بعض خبیث بعض پر سوار ہو، پھر سب کو جمع کر کے دوزخ میں جھونک دیا جائے۔ یہی لوگ دونوں جہان میں گھاٹے میں ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بدر، احد اور احزاب کے دن رؤسائے قریش نے اپنا مال نبی اکرم ﷺ سے جنگ کرنے میں خرچ کیا۔ اللہ نے خبر دی کہ یہ خرچ کریں گے، لیکن اس کا انجام افسوس ہو گا، ہرگز اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ خبیث اور طیب سے مراد یا تو مالِ حرام و حلال ہے یا عملِ صالح و طالح یا اللہ کے راستے میں اور شیطان کے راستے میں خرچ کرنا، کچھ بھی ہو، یہ سب جہنم میں جائے گا۔[1]

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ
مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۸ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ
الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۳۹ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

(اے نبی!) جن لوگوں نے کفر کیا ان سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا، وہ انھیں معاف کر دیا جائے گا، اور اگر وہ دوبارہ وہی کریں گے تو بلاشبہ اگلے لوگوں کا (جو) طریقہ گزر چکا ہے

[1] فتح البیان (۵/ ۱۷۱۔ ۱۷۲)

(وہی ان کا انجام ہوگا)38 اورتم ان سے لڑو حتی کہ فتنہ (شرک) نہ رہے اور (ہر کہیں) سارے کا سارا دین اللہ ہی کا ہو، پھر اگر وہ (کافر) باز آ جائیں تو بے شک اللہ ان کے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے 39 اور اگر وہ پھریں تو جان لو کہ یقیناً اللہ ہی تمھارا کارساز ہے، وہ بہترین کارساز اور بہترین مددگار ہے 40

کافروں کو توبہ کی ترغیب اور کفر کے انجام سے خبردار کرنا:

لڑو جب تک فساد نہ رہے، یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ تم ان کافروں کو کہہ دو کہ اگر تم کفر و مخالفت اور عناد سے باز رہ کر اسلام، اطاعت اور انابت میں داخل ہو جاؤ گے تو تمھارے گناہ اور خطائیں اور کفریہ اعمال بخش دیے جائیں گے، جس طرح کہ صحیح میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ «مَنْ أَحْسَنَ فِي الْإِسْلَامِ لَمْ يُؤَاخَذْ بِمَا عَمِلَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَمَنْ أَسَاءَ فِي الْإِسْلَامِ أُخِذَ بِالْأَوَّلِ وَالْآخِرِ»[1] ''جس نے اسلام لانے کے بعد اچھے عمل کیے تو پہلے زمانۂ جاہلیت میں کیے ہوئے عملوں پر مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اسلام لانے کے بعد اگر برے عمل کیے تو اول اور آخرت سب (برائیوں) پر مواخذہ ہوگا۔''

توبہ پچھلے گناہ مٹا دیتی ہے:

صحیح کے دوسرے الفاظ مرفوعاً یوں ہیں: «اَلْإِسْلَامُ يَجُبُّ مَا قَبْلَهُ، وَالتَّوْبَةُ تَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهَا»[2] ''اسلام، ماقبل کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے اور توبہ، ماقبل کے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے۔'' پھر فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرو گے، بلکہ کفر اور اس جیسے اعمال پر جمع رہو گے تو ہمارا طریقہ پہلے مکذبین اور عناد پر برقرار رہنے والوں کے حق میں اس طرح چلا آیا ہے کہ ہم ان کے عذاب اور سزا میں جلدی کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بدر کے دن قریش کا عذاب اور دیگر امتوں کا عذاب ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہی یوم بدر ہے۔

حکایت اور ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ کی تفسیر:

فتنہ ابن الزبیر میں دو آدمی ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے، کہا: تم نے دیکھا کہ لوگوں نے کیا کیا، تم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، تم کو باہر نکلنے سے کون روکتا ہے؟ کہا: یہ بات روکتی ہے کہ اللہ نے مسلمان بھائی کا خون حرام کیا ہے۔ کہا: کیا اللہ نے نہیں فرمایا: ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١) مسند أحمد (٤/ ١٩٨) البتہ دوسرا جملہ کہیں نہیں ملا ہے، لیکن اس کے ہم معنی روایت سنن وغیرہ میں مروی ہے۔ دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٠٨)

لِلّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳] ’’اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔‘‘ کہا: ہم نے قتال کیا، یعنی رسول اللہ ﷺ کے عہد میں، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا، سارا دین اللہ ہی کے لیے ہو گیا اور تم فتنے کے لیے جنگ کرنا چاہتے ہو، تاکہ دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔‘‘ (رواہ ابن مردویہ) اس کی اصل صحیح بخاری میں مطولاً مروی ہے۔[1]

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں کبھی اس شخص سے نہ لڑوں گا جو لا إله إلا الله کہتا ہے۔ سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے بھی یوں ہی کہا کہ واللہ! میں بھی ایسے شخص سے کبھی قتال نہ کروں گا۔ ایک آدمی نے کہا: کیا اللہ نے نہیں فرمایا: ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ (آیتِ باب) انھوں نے کہا کہ ہم قتال کر چکے، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا، سارا دین اللہ کا ہو گیا۔[2] (رواہ ابن مردویہ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ فتنے سے مراد شرک ہے۔ یہی امام ابو العالیہ، مجاہد، حسن، قتادہ، ربیع بن انس، سدی، مقاتل بن حیان اور زید بن اسلم رحمہم اللہ کا قول ہے۔ عروہ بن زبیر وغیرہ علما نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں: ’’حَتّٰى لَا يُفْتَنَ مُسْلِمٌ عَنْ دِيْنِهِ‘‘

رہی بات کہ سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ’’يَخْلُصَ التَّوْحِيْدُ لِلّٰهِ‘‘ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام حسن، قتادہ اور ابن جریج رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ’’أَنْ يُّقَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ‘‘ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کا لفظ یہ ہے: ’’يكون التوحيد خالصاً لله ليس فيه شرك و يخلع ما دونه من الْأَنْدَادِ‘‘ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ’’أَيْ لَا يَكُوْنُ مَعَ دِيْنِكُمْ كُفْرٌ‘‘[3] صحیحین میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت اس طرح ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک مرد براہِ شجاعت لڑتا ہے اور کوئی براہِ حمیت اور کوئی براہِ ریا، ان میں سے کون سا مرد اللہ کی راہ میں لڑتا ہے، فرمایا: وہ شخص جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو، وہ اللہ کی راہ میں ہے۔[4]

پھر اللہ نے کہا کہ اگر یہ کفار تمھارے لڑنے کی وجہ سے کفر سے باز رہیں تو تمھیں ان کے باطن کا حال معلوم نہیں ہے تو اللہ تو ان کے اعمال کو دیکھتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبۃ: ۵] ’’پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ [التوبۃ: ۱۱] ’’تو وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں۔‘‘ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۹۳] ’’اور ان

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٣) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٠٨)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٥٣٨ـ ٥٣٩) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٠١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٤)

سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی جائز نہیں۔''

صحیح میں آیا ہے کہ اسامہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص پر تلوار اٹھائی، اس نے کہا: لا إله إلا الله، انھوں نے تلوار مار کر اس کو قتل کر دیا، جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَقْتَلْتَهُ بَعْدَ مَا قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ فَكَيْفَ تَصْنَعُ بِلَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟» ''کیا لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد تو نے اس کو قتل کر دیا؟ قیامت کے دن تو لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرے گا؟'' کہا: اے اللہ کے رسول! اس نے یہ کلمہ اپنے بچاؤ میں کہا تھا۔ فرمایا: «هَلْ شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ؟» ''کیا تو نے اس کے دل کو چیر کر دیکھا تھا؟'' پھر بار بار یہی فرماتے رہے: «مَنْ لَكَ بِلَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟» اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہاں تک کہ میں نے تمنا کی کہ میں اسلام نہ لایا ہوتا مگر اسی دن۔[1] پھر اللہ نے یہ کہا کہ اگر وہ تمھارے خلاف اور محاربے پر بدستور رہیں گے تو تم جان لو کہ اللہ تمھارے دشمنوں پر تمھارا مالک، سید، مولیٰ اور ناصر ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان نے عروہ کو ایک خط لکھا تھا، جس میں کئی ایک سوال تھے، عروہ نے اس کا جواب لکھا، اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکے سے نکل کر مدینے کی طرف جانے کا حال بھی ذکر کیا اور دو فتنوں کا پتا دیا ہے: ایک وہ فتنۂ کفار جس میں بعض صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسرا وہ فتنہ جس میں خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے سے مدینے کی طرف کوچ کیا۔ یہ آیت: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى ... الخ﴾ اس دوسرے فتنے کے بارے میں اتری ہے۔ اس خط کی اسناد عروہ بن زبیر تک صحیح ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس خط کو بطولہ نقل کیا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس جگہ ﴿لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ سے مراد ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ تم ان کو یہ بات کہہ دو، خواہ اسی عبارت سے یا دوسری طرح پر کہ اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور مسلمین کی جنگ سے باز رہ کر اسلام میں داخل ہو جاؤ گے تو تمھارے پہلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اسلام پہلے گناہوں کو مٹانے والا ہے۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ نے جب میرے دل میں اسلام ڈالا تو میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ ہاتھ بڑھائیں، میں بیعت کرتا ہوں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، فرمایا: کیا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦)

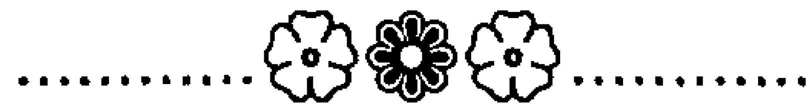
[2] تفسير الطبري (١٣/ ٥٣٩۔ ٥٤٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٠٩)

بات ہے؟ میں نے عرض کی کہ میں ایک شرط پر بیعت کرنا چاہتا ہوں، فرمایا: کیا شرط؟ میں نے کہا: آپ میرے لیے استغفار کریں، فرمایا: تو نے نہیں جانا کہ اسلام پہلے کے گناہوں کو مٹانے والا ہے اور ہجرت ہادِمِ ماقبل (پہلے کے گناہوں کو مٹانے والی) ہے اور حج ہادِمِ ماقبل ہے۔[1] (رواه أحمد و مسلم) یعنی جو گناہ پہلے ان سے ہوئے وہ ان اعمالِ صالحہ سے منہدم ہو جاتے ہیں، ان کا وبال گناہ گار پر باقی نہیں رہتا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں: «اَلْإِسْلَامُ يَجِبُّ مَا قَبْلَهُ، وَالتَّوْبَةُ تَجِبُّ مَا قَبْلَهَا» یہ حدیث صحیح میں آئی ہے۔[2] یحییٰ بن معاذ رازی کہتے ہیں کہ جس صورت میں توحید ہدمِ کفر ماقبل سے عاجز نہیں ہوئی تو ہدمِ گناہ مابعد سے کیوں کر عاجز ہو گی؟[3] پھر اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد پھر مرتد ہو جائیں گے اور کافر ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑیں گے تو اللہ کی یہ عادت مقرر ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو ہلاک کر کے اپنے اولیا کی مدد فرماتا ہے، لیکن پھر ہم ان سے اس کفر میں پلٹ جانے کا انتقام لیں گے۔ اس عبارت میں وعید اور سخت ڈانٹ ڈپٹ ہے اور پہلی امتوں کے ہلاک ہونے کی مثال ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد بدر کا دن ہے۔[4] فتنے سے مراد شرک ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آزمایش ہے۔[5] جمہور نے کہا ہے کہ مراد کفر ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔[6]

دین سے مراد خاص اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”حَتّٰى يُقَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، عَلَيْهِ قَاتَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَإِلَيْهِ دَعَا“[7] بعض نے کہا ہے: ”يَضْمَحِلُّ عَنْهُمْ كُلُّ دِيْنٍ بَاطِلٍ وَيَبْقٰى فِيْهِمْ دِيْنُ الْإِسْلَامِ وَحْدَهُ“ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں، پھر فرمایا کہ اللہ اچھا مولا اور اچھا مددگار ہے۔[8]

اس آیتِ باب پر قرآن کریم کا نواں پارہ ختم ہوا، اب اس کے بعد دسواں پارہ ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ ﴾ شروع ہو گا۔ وللہ الحمد.



---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١) مسند أحمد (٤/ ١٩٨)
[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[3] تفسير البغوي (٣/ ٣٥٦)
[4] تفسير الطبري (١٣/ ٥٣٧)
[5] تفسير الطبري (١٣/ ٥٣٨)
[6] رقم الآية (١٩٣)
[7] تفسير الطبري (١٣/ ٥٣٨)
[8] فتح البيان (٥/ ١٧٣۔ ١٧٥)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مالِ غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا، جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا، اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے (41)

غنیمت اور فَے کا حکم:

یعنی اللہ نے اپنے رسول پر فتح اور نصرت اتاری جس سے تم غالب ہوئے اور وہ قادر ہے کہ آیندہ اور فتح سے نوازے۔ جو مال کافروں سے لڑ کر لیں وہ غنیمت ہے، اس میں پانچواں حصہ اللہ کی نیاز ہے رسول کے خرچ کرنے کے لیے کہ رسول کو اپنی ذات اور اپنے قرابت داروں کے لیے خرچ کی ضرورت ہے اور حاجت مند مسلمانوں کے لیے بھی ضرورت ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے بعد بھی سردار کے خرچ ہوتے ہیں۔ اور جو مال صلح سے لیا وہ سارا خرچ مسلمانوں کا ہے۔ پھر غنیمت میں چار حصے رہے، وہ حصے لشکر میں تقسیم کیے جاتے ہیں، دو حصے سوار کے لیے اور ایک حصہ پیادے کے لیے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کی تفصیل بیان کرتا ہے جو اس نے خاص طور پر پہلی تمام امتوں میں سے اس امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے غنیمتوں کو حلال کر کے مشروع کی ہے۔ غنیمت وہ مال ہے جو کفار سے چڑھائی کر کے لیں، خواہ وہ سوار ہوں یا پیادہ۔ فَے وہ مال ہے جو بغیر لڑے بھڑے ہاتھ آئے، جیسے وہ مال جس پر باہم مصالحت ہو جائے یا اہلِ اموال کی وفات کی وجہ سے لاوارث رہ جائے یا جزیہ و خراج ہو اور اس طرح کا مال۔

شافعی اور سلف و خلف کے علما کے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے اور بعض علما نے فَے کا غنیمت پر اور غنیمت کا فَے پر بھی اطلاق کیا ہے۔ اسی لیے امام قتادہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ آیت سورت حشر کی اس آیت کی ناسخ ہے:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر: ۷] ”اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں والوں

(کے مال) سے جو کچھ لوٹا دے، تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، تا کہ وہ (مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

اس آیت سے یہ آیتِ انفال منسوخ ہوگئی اور غنیمتیں چار خمس ٹھہریں جو مجاہدین کے لیے ہیں اور ان میں سے ایک خمس ان کے لیے ہے جن کا ذکر کیا گیا،[1] لیکن یہ قول بعید ہے، کیونکہ اس آیت کا نزول واقعۂ بدر کے بعد ہوا ہے اور وہ آیت بنی نضیر کے بارے میں اتری ہے اور اس بارے میں علمائے سیرت اور مغازی کا اتفاق ہے کہ بنی نضیر واقعۂ بدر کے بعد ہوا ہے۔ اس معاملے میں کچھ شک وشبہہ نہیں، لیکن جس نے فے اور غنیمت کے بارے میں فرق کیا ہے وہ کہتا ہے کہ وہ آیت اموالِ فے کے بارے میں آئی ہے اور یہ آیت غنیمتوں کے بارے میں اور جس نے فے اور غنیمت کو امام المسلمین کی رائے کی طرف لوٹانے کو ضروری نہیں سمجھا اس کا قول یہ ہے کہ آیتِ حشر اور آیتِ تخمیس (آیتِ باب) کے درمیان کوئی تصادم نہیں، جبکہ وہ امام کی رائے کے مطابق ہو۔ واللہ أعلم

خمس کی تفصیل:

یہ قول: ﴿ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ ﴾ ہر قلیل وکثیر مال کا پانچواں حصہ نکالنے کی تاکید ہے، یہاں تک کہ وہ مال اگرچہ ایک دھاگہ اور سوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٦١] ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر ہی تھے تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔''

پھر مفسرین کا اختلاف ہوا، بعض نے کہا کہ خمس میں سے اللہ کا حصہ کعبے میں رکھا جائے۔ ابو العالیہ ریاحی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب نبیِ کریم ﷺ کے پاس غنیمت آتی تو اس کے پانچ حصے کرتے، چار حصے جنگ میں شریک ہونے والے مجاہدین کو دیتے، پانچویں حصے میں اپنا ہاتھ مارتے، جتنا مٹھی میں آتا، اس کو کعبے کے لیے رکھتے، یہ اللہ کا سہم یعنی حصہ ہوتا، پھر باقی کو پانچ سہم پر تقسیم کرتے، ایک سہم رسول کا ہوتا، دوسرا ذوی القربیٰ کا، تیسرا سہم یتامیٰ کا، چوتھا مساکین کا اور پانچواں سہم ابن السبیل (مسافر) کا۔[2] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جگہ اللہ کا ذکر تبرک کے طور پر ہے، پھر نبیِ کریم ﷺ کا سہم ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ جملہ مفتاحِ کلام ہے، کیونکہ جو کچھ سارے آسمانوں اور زمین میں

---

[1] تفسیر الطبري (١٣/ ٥٤٦) [2] تفسیر الطبري (١٣/ ٥٠٠۔ ٥٥١) یہ روایت مرسل ہے۔

ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔ گویا اللہ اور رسول کا سہم ایک ہی ٹھہرا۔ یہی امام نخعی، حسن بن محمد بن حنفیہ، حسن بصری، شعبی، عطا، ابن بریدہ، قتادہ، مغیرہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا قول ہے کہ اللہ اور رسول کا سہم (حصہ) ایک ہے۔[1] پھر اس قول کے کہنے والے مختلف ہوئے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے تھے، پھر چار قاتلین (مجاہدین جنھوں نے وہ جنگ لڑی ہوتی) کو ملتے اور ایک حصے کے پھر پانچ حصے کیے جاتے، ایک ربع اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو ملتا، خود نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس میں سے کچھ نہ لیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کے لیے ہے۔[2] عبداللہ بن بریدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا حصہ نبی کے لیے ہے اور نبی کا حصہ ان کی ازواج کے لیے ہے۔ عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خمس اللہ اور رسول کا ایک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو چاہیں وہ اس میں کریں۔[3] یہ قول اعم و اشمل ہے، یعنی جو خمس اللہ نے اپنے لیے مقرر کیا ہے اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا ہے کہ چاہیں تو امت میں واپس کریں یا جس طرح جی چاہے اس کو خرچ کریں۔

مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے تھے، وہاں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ اور حرث بن معاویہ کندی بھی تھے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی باتیں چل پڑیں۔ سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عبادہ! تم فلاں فلاں غزوے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کلمات کا ذکر کرو کہ آپ نے غنیموں کے خمس کے بارے میں کیا فرمایا تھا۔ عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوے میں غنیمت کے ایک اونٹ کی طرف منہ کر کے ان کو نماز پڑھائی، جب سلام پھیرا تو کھڑے ہو کر ایک مشت صوف انگلیوں میں لے کر فرمایا کہ یہ تمھاری غنائم میں سے ہے، اس مال میں تمھارے ساتھ میرا کچھ حصہ نہیں ہے مگر ایک خمس، اور وہ خمس بھی تم پر لوٹایا گیا، سو تم تمام غنیموں کو لے آؤ، سوئی دھاگا یا اس سے کم و بیش ہو اس مقدار سے، اور خیانت نہ کرو، کیونکہ خیانت نار اور عار ہے اپنے اصحاب پر دنیا اور آخرت میں، اور لوگوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، وہ نزدیک ہوں یا دور اور اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کرو اور حضر اور سفر میں اللہ کی حدود کو قائم کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو کہ جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک بڑا دروازہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کے سبب سے ہمّ اور غم سے نجات دیتا ہے۔[4] (رواہ أحمد هذا حديث حسن عظيم ولم أره في شيئ من كتب الستة من هذا الوجه) ہاں امام احمد، ابو داود اور نسائی رحمہم اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس کے مانند قصہ خمس اور اس میں کسی قسم کی خیانت کی ممانعت کے بارے میں روایت کیا ہے۔[5]

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۵۴۹) تفسیر ابن کثیر (۲/ ٤١٠) [2] تفسیر الطبري (۱۳/ ۵۵۱) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱۷۰٤۔ ۱۷۰۳) [4] مسند أحمد (۵/ ۳۱٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۹۷۲)

[5] مسند أحمد (۲/ ۱۸٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (۲٦۹٤) سنن النسائي، رقم الحديث (۳٦۸۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۷۸۷۳)

یہ حدیث قولِ مذکور کی شاہد ہے۔

عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو غنیمت کے ایک اونٹ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھائی، پھر سلام پھیر کر اس اونٹ کے کچھ بال اکھیڑ کر فرمایا کہ مجھے تمھاری غنیمتوں میں سے ان مٹھی بھر بالوں کے برابر بھی حلال نہیں مگر خمس اور وہ خمس بھی تم کو واپس کیا جاتا ہے۔[1] (رواہ أبو داود والنسائي) لیکن نبیِ اکرم ﷺ غنائم میں سے کوئی چیز اپنے لیے چن لیتے، غلام یا کنیز یا گھوڑا یا تلوار یا اس جیسی کوئی چیز اور جس طرح کہ محمد بن سیرین اور عامر شعبی نے اس پر نص کی ہے اور اکثر علما انہی کے تابع ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بدر کے دن ذوالفقار نامی تلوار غنیمت کے طور پر لی۔ اس سیف کے بارے میں اُحد کے دن خواب دیکھا تھا۔[2] (رواہ أحمد والترمذي وحسنہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ صفیہ رضی اللہ عنہا من جملہ صفی (مالِ غنیمت سے منتخب) کے تھیں۔[3] (رواہ أبو داود في سننہ) ابو داود کے دوسرے الفاظ مع نسائی کے یزید بن عبداللہ رحمہ اللہ سے اس طرح ہیں کہ ہم مربد میں تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آیا، اس کے پاس چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا، ہم نے اس کو پڑھا، اس میں لکھا تھا: "مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى بَنِيْ زُهَيْرِ بْنِ أُقَيْشٍ، أَنَّكُمْ إِنْ شَهِدْتُّمْ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَأَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَ آتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَأَدَّيْتُمُ الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَسَهْمِ النَّبِيِّ وَسَهْمِ الصَّفِيِّ أَنْتُمْ آمِنُوْنَ بِأَمَانِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" ہم نے کہا کہ تجھ کو یہ خط کس نے لکھ کر دیا ہے؟ کہا: رسول اللہ ﷺ نے۔[4]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ احادیث جید ہیں، یہ اموال غنیم میں سے چن لینے اور اس کو مقرر رکھنے کا ثبوت اور دلیل ہیں، اسی لیے بہت سے علما نے اس کو نبیِ اکرم ﷺ کی خصوصیت میں رکھا ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ امام خمس میں مسلمین کی مصلحت کے لیے تصرف کر سکتا ہے، جس طرح کہ وہ فے کے مال میں تصرف کر سکتا ہے۔ ہمارے شیخ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی قول مالک رحمہ اللہ اور اکثر سلف کا ہے اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد خمس کا حکم:

سو جب یہ بات ثابت اور معلوم ہو چکی تو پھر اس میں اختلاف ہے کہ وہ خمس جو نبیِ اکرم ﷺ لیا کرتے تھے، اب آپ ﷺ کے بعد اس خمس میں کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ خمس والیِ امر لے، یہی ابوبکر، علی، قتادہ رحمہ اللہ اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۷۵۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۷۶۶۱)

[2] مسند أحمد (۱/ ۲۷۱) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۵۶۱) مستدرك الحاکم (۲/ ۱۴۱) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۹۹۴) مستدرك الحاکم (۲/ ۱۴۰) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۹۹۹) سنن النسائي، رقم الحدیث (۴۱۴۶) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۸۵۷)

ایک جماعت کا قول ہے۔ اس بارے میں مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔[1] اوروں نے کہا ہے کہ وہ خمس مسلمین کی بہتری کے لیے خرچ کیا جائے۔ دوسروں نے کہا ہے: بلکہ وہ باقی قسموں میں پھیرا جائے، یعنی ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل پر۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اوروں نے کہا ہے: بلکہ سہمِ نبی اور سہمِ ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل پر پھیر دیا جائے گا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ عراق کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ سارا خمس ذوی القربیٰ کو ملے گا۔ منہال بن عمرو کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن محمد بن علی و علی بن الحسین سے خمس کا حال پوچھا، کہا: وہ ہمارا حق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (آیتِ باب) مراد ہمارے یتامیٰ اور مساکین ہیں۔[3] سفیان ثوری، ابونعیم اور ابو اسامہ قیس بن مسلم سے راوی ہیں کہ قیس نے کہا: میں نے حسن بن محمد بن حنفیہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا، کہا: "هٰذَا مِفْتَاحُ كَلَامِ اللّٰهِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ"

پھر لوگوں کا ان دونوں حصوں کے بارے میں اختلاف ہے، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد۔ بعض نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کا حصہ بعد میں ہونے والے خلیفہ کو دینا چاہیے۔ دوسروں نے کہا: بلکہ رسول اللہ ﷺ کے قرابت والوں کو دینا چاہیے۔ اوروں نے کہا کہ قرابت والوں کا حصہ خلیفہ کے قرابت والوں کے لیے ہے۔ اس بات پر اہلِ علم کی رائے متفق ہوئی کہ ان دونوں حصوں کو گھوڑے اور اللہ کی راہ میں دوسرے سامان میں رکھنا چاہیے۔ چنانچہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانۂ خلافت میں اسی طرح ہوا۔ ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا کہ دونوں پہلے خلفائے راشدین نے نبیِ اکرم ﷺ کا حصہ جانوروں (گھوڑوں وغیرہ) اور اسلحہ میں رکھا۔ اعمش نے پوچھا کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اس میں کیا قول تھا؟ کہا: وہ ان سے بھی زیادہ تر سخت تھے، اس بارے میں۔ ایک بڑی جماعتِ علما کا یہی قول ہے۔[4] رحمهم الله تعالىٰ.

رشتے داروں کا حصہ:

سہمِ ذوی القربیٰ (رشتے داروں کا حصہ) سو اس کا مصرف بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں، اس لیے کہ بنو مطلب بنو ہاشم کے جاہلیت اور اسلام کے شروع میں مددگار رہتے تھے اور شعب میں ان کے ساتھ نبیِ اکرم ﷺ کی حمایت و غضب کے لیے داخل ہوئے تھے۔ پھر ان میں جو مسلمان تھے وہ بطورِ اطاعت اللہ اور رسول داخل ہوئے تھے اور جو کافر تھے وہ خاندانی حمیت اور ابو طالب کی الفت اور اطاعت کے طور پر رہے۔ بنو عبد شمس و بنو نوفل سو وہ اگرچہ نبیِ اکرم ﷺ کے چچا زاد تھے، لیکن اس کام میں ان کے موافق نہ رہے، بلکہ ان سے لڑائی کی اور ان کو چھوڑ دیا اور کہا کہ بطونِ قریش

---

[1] مسند أحمد (۱/ ٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٧٦)

[2] تفسير الطبري (١٣/ ٥٥٩) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٥٥٩)

[4] تفسير الطبري (١٣/ ٥٥٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٤١١۔ ٤١٢)

(قریش کا خاندان) رسول کے ساتھ لڑائی پر ہیں، اسی لیے ابو طالب نے قصیدہ لامیہ میں دوسروں کی نسبت ان کی زیادہ مذمت کی ہے، اس لیے کہ قربت کے لحاظ سے یہ زیادہ نزدیک تھے، لیکن اس کے باوجود یہ نبیِ اکرم ﷺ کے ہمدرد و مددگار نہ ہوئے۔ امام جبیر بن مطعم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس گئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بنو مطلب کو خمسِ خیبر میں سے دیا اور ہم کو چھوڑ دیا، ہم اور وہ آپ سے ایک ہی جیسی قرابت داری رکھتے ہیں، فرمایا کہ بنو ہاشم و بنو مطلب ایک ہیں۔[1] (رواہ مسلم)

اس حدیث کی بعض روایات میں آیا ہے کہ «إِنَّهُمْ لَمْ يُفَارِقُونِي فِي جَاهِلِيَّةٍ وَلَا إِسْلَامٍ» یعنی وہ مجھ سے ان دونوں حالتوں میں جدا نہیں ہوئے۔[2] یہی جمہور علما کا قول ہے کہ مراد یہی دونوں ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے: اور لوگ کہتے ہیں کہ مراد بنی ہاشم ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے جان لیا کہ بنو ہاشم میں فقرا ہیں، اس لیے ان کے لیے بجائے صدقے کے خمس مقرر فرمایا۔ ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد رسول اللہ ﷺ کی قرابت ہے جن کو صدقہ لینا حلال نہیں ہے۔ علی بن حسین سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دوسروں نے کہا ہے، بلکہ مراد سارے قریش ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ ذوی القربیٰ کون ہیں؟ کہا: ہم کہتے تھے کہ ہم ہیں، لیکن ہماری قوم نے یہ بات نہ مانی اور کہا کہ سارے قریش ذوی القربیٰ ہیں۔[3] اس صحیح اثر کو مسلم اور اہلِ سنن نے روایت کیا ہے،[4] مگر اس کی سند میں ضعف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے کہا: «رَغِبْتُ لَكُمْ غُسَالَةَ الْأَيْدِي لِأَنَّ لَكُمْ مِنْ خُمُسِ الْخُمُسِ مَا يُغْنِيكُمْ أَوْ يَكْفِيكُمْ»[5] یہ حسن الاسناد ہے۔

یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل:

یتامیٰ سے مراد مسلمین کے یتامیٰ ہیں۔ علما کا اختلاف ہے کہ یہ حکم فقرا کے یتیموں کے لیے خاص ہے یا اغنیا اور فقرا کے یتیموں کے لیے عام ہے دو قول پر۔ مساکین سے مراد حاجت مند ہیں جن کو اتنا میسر نہیں کہ وہ اپنی فقیری اور

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٨٩) صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٨٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٣٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٧٨)

③ تفسير الطبري (١٣/ ٥٥٣ـ ٥٥٥)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٨٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٣٣) تفسير الطبري (١٣/ ٥٥٥) حدیث کا آخری جملہ ''اور کہا کہ سارے قریش ذوی القربیٰ ہیں'' تفسیر طبری میں مروی ہے اور اس کی سند میں ''ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن'' ضعیف راوی ہے۔ اور ضعف کا اشارہ انہی الفاظ کی طرف ہے۔ واللہ أعلم.

⑤ تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٠٥)

کمزوری کو دور کر سکیں اور گزر اوقات کے مطابق نہیں پاتے، یعنی کفاف میں بھی تنگی و ترشی ہوتی ہے۔ ابن السبیل سے مراد مسافر ہے یا وہ شخص جو اتنے سفر کا ارادہ رکھتا ہو جس کا فاصلہ اتنا ہو کہ اس پر نماز قصر ہو سکے اور اس کے پاس اتنا نہیں کہ سفر میں خرچ کرے۔ اس کی تفسیر، ان شاء اللہ تعالیٰ، سورت براءت میں صدقات کی آیت کے تحت آئے گی۔[1]

خمس ادا کرنا ایمان سے ہے:

پھر اللہ نے فرمایا کہ ہم نے خمس کا جو حکم غنیمتوں میں مشروع کیا ہے تم اس کو بجا لاؤ، اگر اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور قرآن کو مانتے ہو۔ اسی لیے صحیحین میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالقیس کے وفد سے فرمایا: تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان لانا کیا ہے؟ اس بات کی گواہی دینا کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکات دینا اور غنیمتوں سے خمس کا ادا کرنا۔[2] (الحديث بطوله) غرض کہ خمس کو ادا کرنا ایمان سے ٹھہرایا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر باب منعقد کر کے کہا ہے کہ باب أَداءِ خُمسِ من الإيمان پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہی حدیث اس میں ذکر کی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

یوم بدر یوم فرقان:

پھر اللہ نے خلق کے ساتھ اپنے انعامات اور احسان سے آگاہ کیا، اس طرح کہ حق کو باطل سے جدا کر دیا، اپنے دین کو غلبہ بخشا، اپنے نبی اور اس کی جماعت کی مدد کی۔ بدر کے دن انھیں فتح یاب فرمایا، اس دن کا نام یوم الفرقان رکھا، اس لیے کہ اس دن کلمۂ ایمان کو کلمۂ باطل سے اونچا اور بلند کر دیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یوم الفرقان یومِ بدر ہے۔ اللہ نے اس دن حق و باطل کے درمیان جدائی کر دی۔ یہی امام مجاہد، مقسم، عبیداللہ، ضحاک، قتادہ، مقاتل بن حیان رحمہ اللہ وغیر واحد کا قول ہے کہ اس دن سے مراد بدر کا دن ہے۔ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3]

یومِ بدر پہلا مشہد ہے، جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تھے۔ اس دن مشرکوں کا سردار عتبہ بن ربیعہ تھا، جمعے کا دن تھا اور رمضان کے انیس یا سترہ دن گزرے تھے کہ جنگ ہوئی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کچھ اوپر تین سو تھے اور مشرک نو سو اور ہزار کے درمیان تھے۔ اللہ نے مشرکوں کو شکست دی اور کچھ اوپر ستر کا فر قتل ہوئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے۔

حاکم نے شرطِ شیخین پر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا: لیلۃ القدر کو تلاش کرو جب رمضان

---

[1] رقم الآية (٦٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧)

[3] تفسير الطبري (١٣/ ٥٦١- ٥٦٣) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٠٦)

کی گیارہ راتیں باقی رہتی ہوں، کیونکہ اس کی صبح کو بدر کا دن تھا۔[1] حسن بن علی رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: "لَیْلَةُ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ" سترھویں رمضان کو تھی۔[2] اس کی اسناد جید ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ صباح شب التقاء جمعین کو کہ وہ جمعے کی شب تھی، رمضان کے سترہ دن گزرے تھے، اہلِ مغازی اور اہلِ سیرت کے نزدیک یہی صحیح ہے۔ یزید بن ابی حبیب امام دیارِ مصریہ نے کہا ہے کہ یومِ بدر دوشنبہ کے دن تھا، لیکن ان کے اس قول پر ان کا کوئی متابع نہیں۔ قولِ جمہور کو اس پر فوقیت حاصل ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا اس آیتِ شریفہ کی تفسیر میں یہ بیان ہے کہ قرطبی نے اس بات پر علما کا اتفاق بیان کیا ہے کہ اس جگہ غنیمت سے مراد کفار کا مال ہے جس کو مسلمان غلبے اور قہر سے حاصل کریں۔ اگرچہ لغت میں اس معنی کی تخصیص نہیں کی گئی، لیکن شریعت نے اس لفظ کو اسی قسم کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اس بات پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ آیت اللہ کے اس قول کے بعد اتری ہے: ﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ﴾ اور غنیمت کے چار حصے غنیمت حاصل کرنے والوں پر تقسیم کیے جاتے ہیں اور ﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ﴾ کا نزول اس وقت ہوا جب کہ اہلِ بدر نے بدر کی غنیمتوں میں اختلاف کیا۔ اکثر مالکیہ کا قول یہ ہے کہ ﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ﴾ آیتِ محکمہ ہے منسوخ نہیں ہے۔

غنیمت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے، غانمین کے درمیان تقسیم نہیں کی جاتی۔ اسی طرح ان ائمہ کے لیے ہے جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آئیں۔ اس کو ماوردی نے حکایت کیا ہے اس مطلب پر ان کی دلیل یہ ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ زبردستی فتح کیا اور اہلِ مکہ پر احسان رکھ کر پھیر دیا۔ غانمین کے درمیان تقسیم نہیں کیا اور اس کو فے نہ ٹھہرایا۔ اسی طرح قصہ حنین حجت ہے، لیکن اہلِ علم کی ایک جماعت نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، بیان کیا ہے کہ غنیمت کے چار حصے غانمین کے لیے ہوتے ہیں، اس کو ابن منذر، ابن عبدالبر، داودی، مازری، قاضی عیاض اور ابن عربی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔

جو حدیثیں غنیمت کو غانمین کے درمیان تقسیم کرنے اور غنیمتوں کی کیفیت کے بارے میں آئی ہیں، وہ بہت ہیں، امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ کسی عالم نے آیت: ﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ ...الآیة ﴾ کو آیت: ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ ﴾ (آیتِ باب) کا ناسخ کہا ہو، بلکہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ ﴾ ناسخ ہے، یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں کہ جن پر کتاب اللہ کی تحریف اور تبدیلی جائز نہیں ہے۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٣/ ٢٣) [2] تفسير الطبري (١٣/ ٥٦٢) اس کی سند میں "یحییٰ بن یعقوب" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٤١٤)

رہا قصہ فتح مکہ کا سو اس میں کچھ حجت نہیں، اس لیے کہ علما کا اس کی فتح میں اختلاف ہے اور حنین کا قصہ یوں تھا کہ جب انصار نے یہ کہا کہ نبیِ اکرم ﷺ غنائم قریش کو دیتے ہیں اور ہم کو چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک ان کا خون ٹپکتا ہے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ دنیا لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر واپس جاؤ، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے۔[1] سو یہ بات سوائے نبیِ اکرم ﷺ کے کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا، یہ بات آپ ﷺ ہی کے ساتھ خاص تھی۔[2]

پھر لفظ ﴿ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ ﴾ ہر شے کو شامل ہے، جس پر غنیمت کا نام صادق آئے، تھوڑی ہو یا زیادہ۔ اجماع نے آیت کی اس عمومیت سے قیدیوں کو خاص کر لیا ہے کہ ان میں بغیر اختلاف کے امام کو اختیار ہے۔ اسی طرح مقتول سے سلب کیے ہوئے مال میں جب امام پکار دے۔ بعض نے کہا: اسی طرح غنیمت میں حاصل کی گئی زمین کا حال ہے، لیکن یہ آخری قول مردود ہے، اس لیے کہ زمین کے بارے میں اجماع نہیں ہوا۔

پھر اللہ اور رسول کے حصے (خمس) کی کیفیت میں چھے اقوال پر اختلاف ہے، یہ اقوال گزر چکے ہیں۔ چھٹا قول امام مالک رحمہ اللہ کا تھا کہ اس خمس کی تقسیم امام کی صوابدید اور اجتہاد کے سپرد ہے، بغیر اس کے اندازے کے، لے کر اپنے اجتہاد سے غازیوں کو دے اور باقی مسلمین کی اصلاح اور بہتری کے لیے خرچ کرے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی خلفائے اربعہ کا قول ہے، اسی پر انھوں نے عمل کیا تھا۔ یہ حدیث: «مَا لِيْ مِمَّآ أَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ إِلَّا الْخُمُسُ، وَالْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ عَلَيْكُمْ»[3] بھی اسی پر دلیل ہے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ نے اس کی تقسیم اخماس (پانچ حصے کر کے) اثلاث (تین حصے کر کے) نہیں کی۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ١ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ [البقرة: ٢١٥] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: تم اپنے مال میں سے جو بھی خرچ کرو، تو اپنے والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے (خرچ کرو)۔'' حالانکہ غیر میں خرچ کرنا، یعنی ان کے علاوہ، جب کہ مصلحت نظر آئے، بالاجماع جائز ہے۔[4] پھر اس میں اختلاف ہے کہ ذوی القربیٰ کا حصہ اب بھی ثابت ہے کہ نہیں، اکثر کا مذہب ہے کہ ثابت ہے، فقرا اور اغنیا دونوں کو دے، خمس کے خمس میں سے، ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾ [النساء: ١١] امام مالک و شافعی رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ثابت نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٥٩)
[2] تفسير القرطبي (٨/ ١-٤)
[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[4] تفسير القرطبي (٨/ ١١) معاني القرآن (٢/ ٤١٦)

نبیِ اکرم ﷺ اور ان کا حصہ آپ ﷺ کی وفات سے ساقط ہو گیا اور باقی تین حصے سب کا مصرف ٹھہرے۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے، جمہور کی حجت یہ ہے کہ ذوی القربیٰ کے حصے پر کتاب و سنت دلیل ہیں۔ خلفائے راشدین نے بھی نبیِ اکرم ﷺ کے بعد اسی طرح کیا تھا کہ خمس ان کو دیتے تھے اور غنی پر فقیر کو ترجیح نہ دیتے، جس طرح کہ نبیِ اکرم ﷺ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو باوجود کثرتِ غنا کے حصہ دیا تھا، اسی طرح آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی کیا تھا۔

یتیم سے مراد چھوٹے بچے ہیں، جن کے باپ نہ رہیں، حاجت کے وقت اس کو دینا چاہیے۔ مساکین سے مراد مسلم فاقہ کش ہیں۔ ابن السبیل سے وہ مسافر مراد ہیں جو اپنے مال اور اسباب سے دور اور راہِ سفر میں منقطع ہے، یہ خمسِ غنیمت کے مصرف ہیں، باقی چار حصے غانمین جو جنگ میں حاضر تھے اور اموالِ غنیمت کو حاصل کرنے والے تھے، ان میں تقسیم کرنے چاہئیں۔ سوار کو تین حصے، ایک حصہ اس کا دو حصے اس کے گھوڑے کے، پیادے کا ایک حصہ، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آئی ہے،[1] اکثر اہلِ علم اسی کے قائل ہیں۔ یہی امام ثوری، اوزاعی، مالک، ابن مبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ ہاں ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ سوار کو دو حصے اور پیادے کو ایک حصہ دینا چاہیے، لیکن صحیح حدیث اس قول کو رد کرتی ہے۔

پھر ظاہر آیت اس بات پر دلیل ہے کہ عقار (غیر منقولہ چیز، یعنی زمین) اور منقول (جو سامان منتقل کیا گیا ہو) کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک امام کو عقار کے بارے میں اختیار ہے کہ خواہ اس کو تقسیم کرے یا اصلاحی کاموں کے لیے وقف کر دے اور جس مسلمان نے کسی مشرک یا کافر کو قتل کیا ہے، غنیمت کے مال میں سے اس کے سلب کا مستحق وہی شخص ہے، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے: «مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا فَلَهُ سَلَبُهُ»[2] (أخرجه الشيخان وغيرهما) رہی لشکر میں سے بعض کی تنفیل غنیمت میں سے، سو وہ جائز ہے۔

یوم الفرقان سے مراد یومِ بدر ہے۔ بدر مکے اور مدینے کے درمیان ایک پانی (کنویں) کا نام ہے۔ یوم التقاء سے مراد مسلمین اور کفار کے درمیان مقابلہ اور جنگ ہے، یہ پہلا مشہد ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ حاضر ہوئے تھے۔ اللہ نے قلیل تعداد والوں کو کثیر تعداد والوں پر کامیاب فرمایا، یہی معنی ہیں اس کے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥١)

[3] فتح البيان (٥/ ١٧٦۔ ١٨٣)

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۴۲﴾

جب کہ تم (میدانِ بدر کے) قریب والے کنارے پر تھے اور وہ (کافر) دور والے کنارے پر تھے اور (قریش کا تجارتی) قافلہ تم سے بہت نیچے (بحیرۂ قلزم کے ساحل کی طرف) تھا۔ اور اگر تم (دونوں فریق جنگ کے لیے) آپس میں وعدہ کرتے تو مقررہ وقت پر ضرور اختلاف کرتے اور لیکن (ہوا یہ کہ دونوں گروہ آمنے سامنے آ گئے) تا کہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو ہونے والا تھا، تا کہ جو ہلاک ہو وہ حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے، اور بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (42)

معرکۂ بدر کی کچھ تفصیلات:

یعنی قریش اپنے قافلے کی مدد کو آئے تھے اور تم قافلے کو غارت کرنے کے لیے۔ قافلہ تو بچ گیا اور دو فوجیں ایک میدان کے دو کناروں پر آ پڑیں، ایک کو دوسرے کی خبر نہیں، یہ اللہ کی تدبیر تھی۔ اگر تم قصداً آتے تو ایسا بروقت نہ پہنچتے اور اس فتح کے بعد کافروں پر پیغمبر کی سچائی واضح ہو گئی جو مرا وہ بھی یقین جان کر مرا اور جو جیتا رہا وہ بھی حق پہچان کر، تا کہ اللہ کا الزام پورا ہو۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اس ناکے پر تھے جو مدینے سے قریب تھا اور وہ اس ناکے پر تھے جو مدینے سے مکے کی طرف بعید تھا اور تم سے فروتر ابوسفیان کے ہمراہ تجارت کا قافلہ تھا، جو دریا کے کنارے سے متصل تھا، اگر تمھارے اور مشرکوں کے درمیان کسی مقررہ جگہ پر پہنچنے کا معاہدہ ہوتا تو بھی میعاد میں فرق پڑ جاتا، لیکن اللہ کو اپنا ارادہ پورا کرنا تھا، وہ ارادہ یہ تھا کہ اسلام عزت پائے اور شرک ذلت اٹھائے۔ مسلمان غالب ہوں اور مشرکین پست پڑیں، سو اللہ نے کر دکھایا، حالانکہ تم کم اور وہ بہت تھے، یہ اللہ کا لطف و کرم ہے، پس بس۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان قریش کے قافلے کی غارت گری کے ارادے سے نکلے تھے، اللہ نے بغیر کسی پیشگی میعاد مقرر کیے دونوں کو جمع کر دیا۔[1] عمیر بن اسحاق رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ابوسفیان

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٩)

اپنے قافلے کے ساتھ شام کی طرف سے آئے اور ابوجہل مکے سے نکلا، تا کہ نبی اکرم ﷺ اور اصحاب کو کاروان کو نقصان پہنچانے سے روکے، دونوں کی ملاقات بدر کے مقام پر ہوئی نہ ان کو ان کی خبر نہ ان کو ان کی خبر، یہاں تک کہ پانی بھرنے والوں کی باہم ملاقات ہوئی، بعض نے بعض کو دیکھا۔[1]

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سیدھے اپنے سامنے چلے، جب صفرا کے قریب پہنچے تو بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی الزغباء رضی اللہ عنہما کو ابوسفیان کی خبر پانے کے لیے بھیجا، یہ دونوں بدر میں پہنچے، ایک ٹیلے پر اپنے اونٹ بٹھا کر مشک لے کر پانی بھرنے کو گئے، وہاں دو لڑکیاں آپس میں جھگڑ رہی تھیں، ایک دوسری سے کہتی تھی، میرا حق دے، دوسری کہتی تھی کہ کل یا پرسوں قافلہ آئے گا، میں تیرا حق دے دوں گی۔ ان کے درمیان مجدی بن عمرو نے آ کر کہا: تو سچ کہتی ہے۔ بسبس اور عدی یہ سن کر اپنے اونٹوں پر چڑھ کر چل دیے اور آ کر نبی اکرم ﷺ کو خبر دی۔

ادھر ابوسفیان قافلے سے آگے آگے چلا آتا تھا، اس نے مجدی سے کہا کہ تو نے اس پانی پر کسی غیر شخص کی کچھ آہٹ تو نہیں پائی، اس نے کہا: لا واللہ! لیکن میں نے دیکھا کہ دو سوار اس ٹیلے کے پاس ٹھہر کر اپنی مشک میں پانی بھرنے کے لیے آئے تھے، پھر چلے گئے، ابوسفیان اس ٹیلے کے پاس آیا اور اونٹ کی مینگنی لے کر توڑی، اس کے اندر گٹھلی پائی، کہا: واللہ! یہ چارہ یثرب کا ہے، پھر جلدی سے پھر کر اپنا قافلہ لے کر ساحلِ بحر پر آ گیا، جب دیکھا کہ قافلے کی خوب نگہبانی کر لی ہے، تب قریش کے پاس کسی کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اللہ نے تمھارے قافلے اور اموال اور لوگوں کو بچا لیا، اب تم واپس جاؤ۔ ابوجہل نے کہا: واللہ ہم نہ لوٹیں گے، یہاں تک کہ بدر میں جائیں (بدر عرب کے بازاروں جیسا ایک بازار تھا)۔ ہم وہاں تین دن ٹھہر کر کھانا کھائیں گے، اونٹ ذبح کریں گے، شراب پئیں گے، گانے والیاں گائیں گی اور عرب ہمارا آنا سنیں گے، پھر اس کے بعد ہم سے ہمیشہ ڈرا کریں گے۔ اخنس بن شریق نے کہا: اے گروہِ بنی زہرہ! اللہ نے تمھارے مال بچا دیے، تمھارے صاحب کو نجات دی، اب تم پھر جاؤ، وہ اس کے کہنے پر واپس چلے گئے۔ یہ اور بنی عدی دونوں اس واقعے میں حاضر نہ تھے۔[2]

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب بدر کے قریب پہنچے تو علی بن ابی طالب، سعد بن ابی وقاص اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کو اصحاب کے چند لوگوں میں سے خبر لینے کے لیے روانہ کیا، انھوں نے سقاۃ قریش (پانی پلانے والے) کو پایا، ان میں سے ایک بنی سعد بن العاص کا غلام اور بنی الحجاج کا غلام تھا۔ دونوں کو نبی اکرم ﷺ کے پاس لائے، آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، اصحاب نے ان دونوں سے سوال کرنا شروع کیا کہ تم کن کے غلام ہو؟ انھوں نے کہا: ہم سقاۃِ قریش ہیں، ہم کو پانی بھرنے کے لیے بھیجا تھا، لوگوں نے اس خبر کو مکروہ جانا اور یہ خیال کیا کہ یہ ابوسفیان کے قافلے کے ہوں گے، ان کو مارا، جب وہ عاجز ہوئے تو کہنے لگے کہ ہم ابوسفیان کے

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٥٦٧) [2] السيرة النبوة لابن هشام (٣/ ١٦٤_ ١٦٦)

قافلے کے ہیں، تب ان کو چھوڑ دیا۔

نبیِ اکرم ﷺ نے ایک رکوع اور دو سجدے کر کے سلام پھیرا اور فرمایا کہ ان دونوں نے جب تم سے سچ بولا تو تم نے ان کو مارا اور جب جھوٹ بولا تو تم نے ان کو چھوڑ دیا، یہ دونوں واللہ سچ کہتے ہیں کہ قریش کے ہمراہ ہیں، ہاں تم مجھ کو قریش کی خبر دو، انھوں نے کہا: وہ اس گھاٹی کے پیچھے ہیں، جس کو تم دور کا ناکا دیکھتے ہو، گھاٹی سے مراد عقنقل ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کتنے لوگ ہیں؟ کہا: بہت ہیں۔ فرمایا: گنتی بیان کرو، کہا: ہم نہیں جانتے، فرمایا: کتنے اونٹ روزانہ ذبح کرتے ہیں، کہا: کسی دن دس، کسی دن نو، فرمایا: نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں۔ پھر پوچھا: اشرافِ قریش میں سے کون کون ان میں آیا ہے؟ کہا: عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو البختری بن ہشام، حکیم بن حزام، نوفل بن خویلد، حرث بن عامر بن نوفل، طعیمہ بن عدی، نضر بن حارث، زمعہ بن الاسود، ابو جہل، امیہ بن خلف، نبیہ و منبہ، پسرانِ حجاج، سہیل بن عمرو اور عمرو بن عبدود۔ نبیِ اکرم ﷺ نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: «هَذِهِ مَكَّةُ قَدْ أَلْقَتْ إِلَيْكُمْ أَفَلَاذَ كَبِدِهَا» یعنی اس مکے نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمھاری طرف ڈالے ہیں، یعنی وہاں کے چیدہ اور برگزیدہ لوگ آ پھنسے ہیں۔[1]

سعد بن معاذ نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا: کیا ہم آپ کے لیے ایک چھپر نہ ڈالیں، جس میں آپ ٹھہریں اور آپ کی سواریاں بیٹھیں اور ہم دشمنوں سے مقابلہ کریں گے، اگر اللہ نے ہم کو ان پر فتح اور کامیابی نصیب کی اور غلبہ بخشا تو یہی ہم چاہتے ہیں اور اگر کچھ اور طرح پر ہوا، یعنی اللہ نخواستہ شکست پڑی تو آپ اپنی سواریوں پر بیٹھ کر ہماری قوم میں جو ہمارے پیچھے ہے، جا ملیں۔ واللہ! آپ سے وہ قبائل چھوٹ رہے ہیں جو ہم سے زیادہ آپ کو چاہتے ہیں اور ہم ان سے زیادہ آپ کی محبت میں نہیں ہیں، اگر وہ جانتے کہ آپ لڑیں گے تو کبھی پیچھے نہ رہتے، بلکہ آپ ﷺ کے یار و مددگار ہوتے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے سعد کی تعریف کی اور دعائے خیر دی۔ سعد نے آپ ﷺ کے لیے ایک چھپر ڈالا، اس میں نبیِ اکرم ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، ان کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صبح کو قریش نے کوچ کیا، جب سامنے آئے اور نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو دیکھا کہ عقنقل سے اترتے ہیں اور گھاٹی سے وادی کی طرف آتے ہیں، فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هَذِهِ قُرَيْشٌ قَدْ أَقْبَلَتْ بِخُيَلَاءِهَا وَفَخْرِهَا تَحَادُّكَ وَتُكَذِّبُ رَسُوْلَكَ اَللّٰهُمَّ أَحْنِهِمُ الْغَدَاةَ»[2] محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی حجت کے بعد انکار کرے، وہ کافر ہو، کیونکہ آیت و عبرت کو دیکھ چکا ہے اور ایمان لائے ایمان لانے والا۔[3]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٣/ ١٦٣) [2] السيرة النبوية لابن هشام (٣/ ١٦٨) [3] تفسير الطبري (١٣/ ٥٦٨)

اقامتِ حجت:

اسی طرح امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تفسیر جید ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارا یہ تم کو تمھارے دشمن کے ساتھ ایک جگہ میں بغیر کسی پیشگی معاہدے کے جمع کرنا اس لیے ہوا کہ اللہ تم کو ان پر نصرت دے اور حجتِ حق کو باطل پر بلندی بخشے، تاکہ امر ظاہر ہو جائے اور قطعی حجت اور برہان قائم ہو جائے، پھر کسی کے لیے کوئی دلیل اور شبہہ باقی نہ رہے، اس صورت میں وہی ہلاک ہو گا جو ہلاک ہونے والا ہے، یعنی کفر پر قائم رہے گا جو کفر ہی پر مستمر ہے، اس کے باوجود کہ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ باطل پر ہے، کیونکہ اب ایسے شخص پر حجتِ الٰہی قائم اور تمام ہو گئی اور جو کوئی زندہ رہنے والا ہے، وہ زندہ رہے، یعنی مومن ایمان لے آئے۔ دلیل یعنی حجت و بصیرت سے، کیونکہ ایمان دلوں کی زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ ﴾ [الأنعام: ۱۲۲] ”کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا، اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے۔“[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ”عُدْوَۃ“ کنارۂ صحرا کو کہتے ہیں اور ابو عمرو نے کہا ہے کہ جائے بلند کو، یعنی ٹیلہ۔ ”دُنْیَا“ بہ معنی قریب ہے اور ”قُصْوٰی“ بہ معنی بعید۔ ایک ٹیلہ پر مسلمان تھے، دوسرے ٹیلے پر مشرک۔ رہا قافلہ وہ دریا سے متصل نشیبی زمین میں تھا۔ رکب شتر سواروں کو کہتے ہیں، یہ بدر سے تین میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے پر تھے۔ اس ہیئت کذائی کے بیان کرنے سے مراد دشمن کی قوت و شان و شوکت کی دلیل ہے، اس لیے کہ جس ناکے پر دشمن تھے، وہاں پانی تھا اور زمین سخت تھی اور جس ناکے پر مسلمان تھے، یہاں ریت کی وجہ سے زمین میں پاؤں دھنستے جاتے تھے اور پانی بھی نہ تھا اور قافلہ دشمن کی پشت پر تھا اور دشمن کی تعداد زیادہ تھی۔ اللہ نے مسلمانوں پر احسان کیا کہ باوجود اس نازک حالت کے ہم نے تم کو ان پر فتح یاب کیا، اگر تم اور وہ پہلے سے کہہ سن کر اس جگہ میں جمع ہونا چاہتے، تب بھی وقت پر اکٹھے نہ ہوتے، کیونکہ تم تھوڑے ہوتے اور وہ بہت، بعض بعض کے خلاف کرتے، لیکن اللہ نے بغیر کسی عہد کے تمھیں اور ان کو ایک ہی جگہ دے دی، تاکہ اپنا کام پورا کرے، وہ کام یہی اپنے اولیا کی مدد اور اپنے دشمنوں کی ذلت، دینِ حق کی عزت اور کفر و شرک کی ذلت تھی۔ مسلمان اس لیے نکلے تھے کہ قافلے کو راستے میں لوٹ کر مالِ غنیمت حاصل کریں، کافر اس لیے نکلے کہ قافلے کو لوٹ مار سے بچائیں۔ کسی ایک گروہ کے خیال میں یہ بات نہ تھی کہ اس طرح پر ایسا اتفاق پڑے گا۔ یہ محض اللہ کی حکمت اور رحمت ہوئی۔[2] وللہ الحمد

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۱۴۔ ۴۱۶) [2] فتح البیان (۵/ ۱۸۴۔ ۱۸۵)

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

(اے نبی! یاد کریں) جب اللہ نے آپ کے خواب میں آپ کو ان کی تعداد کم دکھائی اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تم ضرور ہمت ہار دیتے اور اس معاملے میں آپس میں اختلاف کرتے، لیکن اللہ نے (تمھیں) بچا لیا۔ بے شک وہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے (43) اور (اے مسلمانو! یاد کرو) جب تم (کافروں کے) آمنے سامنے ہوئے تو اللہ نے انھیں تمھاری نظروں میں تھوڑا دکھایا اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھایا، تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو ہونے والا تھا۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں (44)

اللہ تعالیٰ کا ہر گروہ کو دوسرے کی آنکھ میں کم دکھانا:

نبی مکرم ﷺ کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے، تاکہ مسلمان مقابلے کے وقت جرأت سے لڑیں۔ پیغمبر کا خواب غلط نہیں، ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے، اکثر وہ تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو نبی اکرم ﷺ کے خواب میں تھوڑا دکھلایا۔ یہ خواب آپ ﷺ نے اصحاب سے فرمایا، ان کے دل مضبوط اور ثابت ہو گئے۔ یہی امام ابن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض سے حکایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو اسی آنکھ سے، جس میں خواب آتا ہے، قلیل دیکھا۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے ﴿فِيْ مَنَامِكَ﴾ یعنی بِعَيْنِكَ۔[2] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول غریب ہے، کیونکہ اس جگہ صریح لفظ "مَنَام" (نیند) آیا ہے۔ تاویل بے دلیل کی کوئی حاجت نہیں۔[3]

بہرحال مشرکوں کا یہ تھوڑا دکھلانا بھی مسلمانوں کے لیے اللہ کا ایک لطف و کرم تھا کہ ان کی آنکھ میں کفار کو قلیل کر دیا، تاکہ جرأت بڑھے۔ اگر وہ بہت نظر آتے تو یہ نامردی کر جاتے اور ان کے آپس میں اختلاف پڑ جاتا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہماری آنکھ میں ایسے کم دکھائی دیے کہ ایک مرد میرے پاس آیا تھا، میں نے اس سے کہا کہ کیا یہ لوگ ستر ہوں گے، اس نے کہا: نہیں، بلکہ سو کے قریب معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ہم نے ادھر کا ایک آدمی پکڑ لیا، اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ہم ایک ہزار آدمی تھے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: حَضَّضَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔

عباد بن عبداللہ بن زبیر نے کہا ہے کہ قضائے امر سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے دونوں کو باہم لڑا دیا، تاکہ جس

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١٣/ ٥٧٠ـ ٥٧١) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٠٩) (3) تفسير ابن كثير (٢/ ٤١٦)

سے انتقام لینا ہے، اس سے انتقام لے اور جس پر انعام کرنا ہے اس پر انعام کرے۔[1] اور ہر ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی آنکھ میں تھوڑا کر دکھایا، تا کہ ایک دوسرے میں طمع کرے۔ یہ تھوڑا کر دکھانا اس وقت ہوا جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے، پھر جب ہنگامۂ کارزار گرم ہوا تو اللہ نے مومنوں کی مدد ہزار فرشتوں سے کی۔

ایمان والے کافروں کی جماعت کو ناتواں دیکھنے لگے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورت آل عمران میں فرمایا: ﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [آل عمران: ١٣] ”تحقیق تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک بڑی نشانی ہے جو (بدر میں) باہم ٹکرائے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ وہ (کافر) ان (مسلمانوں) کو اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے، ظاہری آنکھوں سے اور اللہ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے، بے شک اس میں بصیرت والوں کے لیے عبرت ہے۔“ یہ ان دونوں آیتوں کے درمیان مطابقت کا طریقہ ہے، کیونکہ ان دونوں آیات میں سے ہر ایک حق اور صدق ہے۔ وللہ الحمد

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے کفار کو خواب میں تھوڑا دیکھا، یہ قصہ اصحاب سے کہا: اس سے ان کے دل مضبوط ہو گئے، اللہ نے ان کو نامردی اور تنازعہ سے بچا لیا۔ کسی نے کہا منام سے مراد نیند کی جگہ یعنی آنکھ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مذہب حسن ہے، لیکن پہلا بیان عربیت کے لحاظ سے زیادہ خوش گوار ہے۔[2] پھر جس طرح مسلمین کو مشرکین کم نظر آئے، اسی طرح مشرکین کو مسلمین کم معلوم ہوئے۔ کہنے والے نے کہا کہ ایک اونٹ کے کھانے والے ہیں۔ اس کم کم نظر آنے کی مصلحت یہ تھی کہ جب مسلمانوں کو تھوڑا دیکھیں گے تو جنگ پر اقدام کریں گے، بے خوف ہو کر حملہ آور ہوں گے، پھر جب مسلمان ان کو زیادہ نظر پڑیں گے تو ہمت ہار کر بھاگ کھڑے ہوں گے، اس وقت گھیرا انہی پر ہو گا اور اللہ کا عذاب اور سزا اترے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[3] وللہ الحمد

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝45 وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝46

اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمھارا آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تا کہ تم

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٧١٠) [2] معاني القرآن (٢/ ٤١٩) [3] فتح البیان (٥/ ١٨٦۔ ١٨٦)

فلاح پاؤ ﴿45﴾ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿46﴾

مقابلے کے وقت کے آداب: ثابت قدمی، ذکرِ الٰہی، اطاعتِ رسول اور اتفاق:

ہوا جاتی رہے گی، یعنی پیش قدمی کے بجائے پسپائی آئے گی۔ ثابت قدمی سے مراد ظاہری اسباب نہیں، بلکہ اس سے مراد دل کی استقامت اور اللہ کی یاد اور سردار کی حکم برداری اور ایک دوسرے کی بھلائی چاہنا مراد ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس آیت پاک میں دشمن کے سامنے آ جانے کے وقت دشمن کا سامنا کرنے اور شجاعت کے طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے۔ صحیحین میں عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ایام میں جن میں دشمن کا سامنا ہوا، اتنا انتظار کیا کہ سورج ڈھل گیا، پھر کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے لوگو! تم دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور جب ملاقات ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور یہ جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے، پھر کھڑے ہو کر فرمایا: «اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ، وَمُجْرِيَ السَّحَابِ، وَهَازِمَ الْأَحْزَابِ، اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ»[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے الفاظ یوں ہیں کہ جب دشمن سے ملاقات ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو، پھر اگر وہ چڑھ آئیں اور چلائیں تو تم چپ رہو۔[2] (رواہ عبدالرزاق) حدیث مرفوع جو زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس میں ہے کہ اللہ تین وقت میں خاموشی کو پسند کرتا ہے: ایک تلاوتِ قرآن کے وقت، دوسرے زحف یعنی جنگ کے وقت اور تیسرے جنازہ کے وقت۔[3] (رواہ الطبراني) دوسری مرفوع روایت میں یوں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”عَبْدِيْ كُلُّ عَبْدِيَ الَّذِيْ يَذْكُرُنِيْ وَهُوَ مُلَاقٍ قِرْنَهُ“ یعنی پورا بندہ میرا وہ شخص ہے جو مجھ کو یاد کرتا ہے، حالانکہ وہ اپنے ہم سر سے ملاقات کرتا ہے،[4] یعنی اس کا یہ حال بھی میرے ذکر اور مجھ سے دعا اور استغاثہ سے خالی نہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے: ”اِفْتَرَضَ اللّٰهُ ذِكْرَهُ عِنْدَ أَشْغَلِ مَا يَكُوْنُ عِنْدَ الضِّرَابِ بِالسُّيُوْفِ“[5] امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنگ کے وقت خاموش رہنا اور اللہ کا ذکر کرنا واجب ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے پوچھا کہ کیا اونچی آواز سے ذکر کریں؟ کہا: ہاں۔ امام کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ کو کوئی چیز قراءتِ قرآن اور ذکر سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ اسی لیے لوگوں کو نماز اور قتال کا حکم کیا۔ تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے جنگ کے وقت ذکر کا حکم کیا ہے۔[6] عنترہ نے کہا ہے ع

---

① صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۸۰٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷٤۲)

② مصنف عبد الرزاق (٥/ ۲٥۰) اس کی سند میں ”عبدالرحمٰن بن زیاد“ ضعیف راوی ہے۔

③ المعجم الکبیر (٥/ ۲۱۳) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (ضعیف الجامع: ۱۷۰۳)

④ سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳٥۸۰) اس کی سند میں ”عفیر بن معدان“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة: ۳۱۳٥)

⑤ تفسیر الطبري (۱۳/ ٥۷٤) ⑥ تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ۱۷۱۱)

وَلَقَدْ ذَكَرْتُكِ وَالرِّمَاحُ شَوَاجِرٌ فِيْنَا وَبِيْضُ الْهِنْدِ تَقْطُرُ مِنْ دَمِيْ

”میں نے تمھیں اس لمحے یاد کیا جب نیزے باہم پیکار تھے اور اعلیٰ قسم کی تلواریں میرے خون سے قطرے ٹپکا رہی تھیں۔“

غرض کہ اللہ پاک کا حکم یہ ہے کہ دشمن سے جنگ کے وقت ثابت قدم رہو، ان کی لڑائی پر ثابت قدم رہو، بھاگو نہیں اور نامرد نہ بنو اور ہمت نہ ہارو، بلکہ اس حال میں بھی اللہ کا ذکر کرنے والے بنو اور بھولو نہیں، اسی سے مدد مانگو اور اسی پر بھروسا رکھو، اسی سے دشمن پر مدد طلب کرو۔ اس حال میں بھی اللہ اور رسول کے مطیع رہو، جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے وہ بجا لاؤ، جس سے منع کیا ہے اس سے باز رہو، باہم تنازع نہ کرو کہ مختلف ہو جاؤ، یہ بات تمھاری ذلت کا سبب ہو گی اور اس سے تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ہوا سے مراد وحدت کی قوت ہے، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شجاعت اور اللہ اور رسول کے احکام بجا لانے کا جو جذبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر تھا وہ پہلی امتوں اور زمانوں میں سے کسی میں نہ تھا اور نہ ان کے بعد پھر کسی میں ہو گا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور برکت کے سبب سے مشرق و مغرب میں دلوں اور سلطنتوں کو تھوڑی مدت میں فتح کر لیا، حالانکہ ان کی تعداد بہت قلیل تھی اس کے برعکس دشمن کے لشکروں، جو روم، فارس، ترک، صقالیہ، بربر اور حبشی سلطنتوں میں سے تھے اور سوڈان کے اصناف اور قبطی اور بنی آدم کے دوسرے گروہوں میں سے تھے، مسلمان ان پر غالب آ گئے، یہاں تک کہ اللہ کا بول بالا ہوا اور اس کا دین تمام ادیان پر غالب آیا۔ اور ممالکِ اسلامیہ زمین کے چاروں کونوں تک پھیل گئے۔ یہ سب کچھ تیس برس سے بھی کم مدت میں ہو گیا، فَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لقاء سے مراد جنگ ہے اور فئۃ سے مراد جماعت۔ ثابت قدمی کا حکم اس حالت میں ہے جب وسعت و فراخی ہو، کیونکہ بوقتِ ضرورت تحرف اور تحیز جائز ہوتا ہے (یعنی جنگی حکمتِ عملی کے تحت میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹنا، تاکہ اپنے لشکر کے ساتھ ملا جائے) اللہ کا ذکر کرنے کا حکم اس لیے ہے کہ دل کی گھبراہٹ کے وقت سختیوں پر ثابت قدم رہنے کے لیے اللہ کا ذکر مددگار ہوتا ہے۔ یا مراد دل سے ثبات اور زبان سے ذکر ہے، کیونکہ کبھی دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت دل ساکن ہوتا ہے اور زبان مضطرب ہوتی ہے، اس لیے حکم ذکر کا کیا ہے، تاکہ دل اور زبان کا ثبات دونوں جمع ہو جائیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ اس حالت میں اس طرح ذکر کرے جس طرح طالوت کے اصحاب نے کیا تھا: ﴿ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۰] ”اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور اس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔“

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۱۶۔ ۴۱۷)

ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنے کے مشروع ہونے کے لیے یہ آیت دلیل ہے، یہاں تک کہ ایسی حالت میں جہاں دل کانپتے ہیں اور آنکھیں جھپکتی ہیں۔ حدیثِ سہل بن سعد رضی اللہ عنہما میں مرفوعاً آیا ہے کہ دو جگہ ہیں، جہاں دعا رد نہیں ہوتی: ایک ندا کے وقت، دوسرے جنگ کے وقت، جب بعض کا بعض سے التحام (آمنا سامنا) ہو۔[1] (رواہ الحاکم وصححہ)

تنازع سے مراد اختلافِ رائے ہے، کیونکہ اس اختلاف سے لڑائی میں بزدلی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس حجت کے منافی ہے جو اظہارِ حق کے لیے ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل: ١٢٥] وہ اور ہے، بلکہ اس کا تو حکم ہے۔ اس میں ارادہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات حق ہو وہ کسی ایک جھگڑنے والے کی زبان پر ظاہر ہو جائے۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس کے ظاہر ہونے سے زبانِ خصم پر خوشی ہو۔

ریح سے مراد قوت وغلبہ، رحمت ونصرت اور دولت ہے۔ خازن میں کہا ہے کہ اس جگہ ریح کا لفظ امر کے اپنی مراد کے مطابق نافذ اور جاری ہو جانے پر کنایہ ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ریح مدد ہے، مدد کبھی نہیں ہوئی مگر ہوا سے۔ اللہ ایک ہوا بھیجتا ہے جو دشمنوں کے منہ کو مارتی ہے۔[2] اسی جگہ سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ»[3] پھر اللہ نے صابرین کے ساتھ اپنی معیت کا ذکر فرمایا، یہ کیا خوب معیت ہے کہ جس کو نصیب ہوتی ہے اس پر کوئی غالب نہیں ہوتا اور وہ شخص کسی طرف سے مغلوب نہیں رہتا، اگرچہ بہت سی جہتیں (سمتیں) ہوں۔[4] اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا وَكُنْ مَعَنَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿47﴾
وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ
لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَاۗءَتِ
الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ
اَرٰي مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿48﴾
اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٤٠) مستدرك الحاكم (١/ ٣١٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٧٩)

[2] تفسير البغوي (٣/ ٣٦٤) تفسير الخازن (٣/ ٣٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠٠) [4] فتح البيان (٥/ ١٨٧_١٨٩)

دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنی شان) دکھاتے ہوئے نکلے اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے ﴿47﴾ اور (یاد کرو) جب شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے سجا کر پیش کیے اور وہ کہنے لگا: آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور بے شک میں تمھارا ساتھی ہوں، پھر جب دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ الٹے پاؤں پھر گیا اور کہنے لگا: بے شک میں تم سے بَری ہوں۔ بے شک میں وہ (فرشتے) دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے ﴿48﴾ جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، یہ کہتے تھے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو بے شک اللہ زبردست خوب حکمت والا ہے ﴿49﴾

بدر کے دن مشرکوں کے نکلنے کی کیفیت:

جب کافر جمع ہو کر لڑائی کے لیے نکلے، راستے میں ایک بوڑھا شخص ملا، کہا: میں بھی مسلمانوں کا دشمن ہوں، تمھاری رفاقت کے لیے آیا ہوں اور جنگ کا بڑا ماہر ہوں، پھر جب لڑائی ہونے لگی، ابوجہل سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا، وہ شخص نہ پہلے کسی نے دیکھا تھا نہ بعد میں کسی نے دیکھا، وہ شیطان تھا۔ جب اس نے مسلمانوں کی طرف جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام دیکھے تو بھاگ گیا۔ مسلمانوں کی دلیری دیکھ کر منافق اس طرح طعن کرنے لگے تھے، سو اللہ نے فرمایا کہ یہ غرور (دھوکا) نہیں توکل ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلے اللہ نے مومنوں کو یہ حکم دیا تھا کہ تم جنگ میں اخلاص کرو، اللہ کا ذکر کثرت سے بجا لاؤ، اب ان مشرکین کے ساتھ مشابہت کرنے سے منع فرمایا کہ جس طرح وہ لوگ اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے نکلتے ہیں، یعنی حق کو مٹانے کے لیے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے، یعنی فخر اور تکبر کرتے ہیں، جس طرح ابوجہل نے کہا تھا کہ ہم بدر میں قیام کرنے کے بغیر واپس نہ جائیں گے، شراب کباب اڑا کر گانا سن کر یہاں سے چلیں گے، تاکہ عرب کو ہمارا یہ دن یاد رہے اور وہ اس کا چرچا کریں، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا، جب بدر کے پانی پر آ کر ہلاک ہوئے تو بدر کے کنوؤں میں مار کر اوندھے منہ ڈال دیے گئے۔ ذلیل، حقیر اور بدبخت ہو کر عذابِ سرمدی اور ابدی میں گرفتار ہوئے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے قابو میں ہے جو کرتے ہیں اور اس لیے ان کو ان کے اعمال کا بدلہ بد سے بدتر دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے آیت باب کے بارے میں کہا ہے کہ

ان اترانے والوں سے مراد مشرکین ہیں جو بدر کے دن نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آئے تھے۔ محمد بن کعب نے کہا ہے کہ قریش گانا بجانا لے کر مکے سے بدر کی طرف نکلے تھے، اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی۔[1] پھر فرمایا کہ شیطان نے ان کو ان کے اعمال اچھے کر کے دکھائے اور یہ سمجھایا کہ آج کے دن تم پر کوئی غالب نہ ہوگا، میں تمھارا ہمسایہ ہوں۔ بنی بکر جو تمھارے دشمن ہیں، تم ان سے بالکل نہ ڈرو، وہ تمھارے دیار میں نہ آ سکیں گے۔

شیطان کا انسانی شکل میں آنا اور فرشتوں کو دیکھ کر بھاگ جانا:

شیطان ان کے سامنے سراقہ بن مالک کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ یہ قبیلہ بنی مدلج کا سردار تھا۔ یہ سب کارروائی شیطان کی طرف سے ہوئی، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [النساء: ۱۲۰] ''شیطان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے فریب کے سوا کچھ نہیں۔'' لیکن جب نوبت آمنے سامنے آنے کی آئی اور شیطان نے دیکھا کہ فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لیے آئے ہیں تو پیٹھ پھیر کر چل دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ شیطان بنو مدلج کے ایک شخص کی شکل میں شیطانوں کے ایک لشکر اور جھنڈے کے ساتھ آیا اور مشرکوں سے بات چیت کی، جب صف آرائی ہوئی تو نبیِ اکرم ﷺ نے ایک مٹھی مٹی لے کر مشرکوں کے منہ پر ماری، وہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جبریل علیہ السلام نے ابلیس کی طرف منہ کیا، ابلیس نے جب ان کو دیکھا، اس وقت اس کا ہاتھ ایک مشرک کے ہاتھ میں تھا، ہاتھ چھڑا کر پیٹھ پھیر کر چل دیا، اس کے ساتھی بھی چل دیے۔ ایک مرد نے کہا کہ اے سراقہ تُو تو کہتا تھا کہ تُو ہمارا رفیق اور ہمسایہ ہے، کہا: میں جو دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھتے، میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔ یہ اس وقت کہا جب اس نے فرشتوں کو دیکھا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یوں ہیں کہ ابلیس قریش کے ہمراہ سراقہ کی شکل میں نکلا، جب جنگ میں حاضر ہوا اور فرشتوں کو دیکھا تو الٹے پاؤں پھرا۔ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے اس کو پکڑا، اس نے اس کے منہ پر ایک دھکا دیا، وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا، اس سے کہا: اے سراقہ! تو ایسے حال میں ہم کو چھوڑ کر بھاگا جاتا ہے اور ہم سے بیزار ہوتا ہے؟ کہا: میں تم سے بری ہوں، جو میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھتے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب لوگ بھڑ گئے تو نبیِ اکرم ﷺ ایک ساعت کے لیے بے ہوش ہو گئے، پھر ہوش میں آ کر لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ جبریل علیہ السلام فرشتوں کے ایک لشکر کے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۳/ ۵۸۰۔ ۵۸۱) [2] تفسیر الطبري (۱۴/ ۷) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۱۹) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' ضعیف راوی ہے۔

ساتھ فوج کے داہنی طرف اور میکائیل ایک دوسرے لشکر کے ساتھ فوج کے بائیں طرف اور اسرافیل ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ موجود ہیں اور ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں مشرکین کے ساتھ تدبیر کر رہا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ آج کے دن تم پر کوئی غالب نہ ہوگا۔ جب اللہ کے دشمن نے فرشتوں کو دیکھا تو پسپا ہو کر چل دیا اور کہا: میں تم سے بری ہوں، جو میں دیکھتا ہوں وہ تم نہیں دیکھتے۔ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے اس کو سراقہ بن مالک بن جعشم سمجھ کر پکڑا، اس نے حارث کے سینے پر ایک دھکا مارا، حارث گر پڑا اور ابلیس چل دیا اور جا کر دریا میں گر پڑا اور اپنا کپڑا اٹھا کر کہا: ”يَا رَبِّ مَوْعِدُكَ الَّذِيْ وَعَدْتَنِيْ“[1]

طبرانی میں رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ سے اسی کے لگ بھگ تفصیل سے مروی ہے جس کو ہم نے سیرت میں ذکر کیا ہے۔[2] ابلیس کا یہ قصہ تابعین اور اہلِ سیرت کی ایک جماعت سے بہت سے الفاظ کے ساتھ مختصراً اور مطولاً منقول ہے۔ شیطان لعین کی عادت ہے کہ اپنی اطاعت کراتا ہے، پھر جب حق و باطل کا مقابلہ ہوتا ہے تو انسان کو شر میں چھوڑ کر خود الگ ہو جاتا ہے: ﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الحشر: ١٦] ”ان کی مثال شیطان کی سی ہے، جب وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے: بے شک میں تجھ سے بَری ہوں، میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [إبراهيم: ٢٢] ”اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا، مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چناں چہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

سیدنا امام مالک بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جب کہ وہ اندھے ہو گئے تھے، ایک بار یہ ذکر کیا کہ اگر اس وقت میں تمھارے ساتھ بدر میں ہوتا اور نظر والا ہوتا تو تم کو وہ گھاٹی بتا دیتا جس طرف سے فرشتے نکل کر آئے تھے۔ مجھ کو نزولِ ملائکہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤١٩) الدر المنثور (٤/ ٧٨)

[2] المعجم الکبیر (٥/ ٤٢) تفسیر ابن کثیر (٢/ (٤١٨۔ ٤١٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه عبد العزيز بن عمران وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٦/ ١٠٨)

میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے، فرشتے آدمی کی شکل میں کسی شناسا شخص کے پاس آتے اور کہتے کہ تجھ کو بشارت ہو، یہ لوگ کچھ چیز نہیں ہیں، تیرے ساتھ اللہ ہے۔ وہ آدمی ان پر حملہ کرتا، ابلیس نے اس حال کو دیکھ کر گریز کیا اور اپنی براء ت ظاہر کی، وہ سراقہ بن مالک کی صورت میں تھا۔ ابوجہل اپنے اصحاب کو آمادہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ سراقہ نے تم کو چھوڑ دیا، اس سے تم کچھ خوف نہ کرو، اس لیے کہ اس نے محمد ﷺ اور اصحابِ محمد ﷺ سے وعدہ کر لیا تھا، پھر کہا: ”وَالّٰاتِ وَالْعُزّٰى، لَا نَرْجِعُ حَتّٰى نُقَرِّنَ مُحَمَّداً وَّ أَصْحَابَهُ فِي الْحِبَالِ، فَلَا تَقْتُلُوْهُمْ، وَخُذُوْهُمْ أَخْذاً“ یعنی قسم ہے لات وعزیٰ کی! ہم واپس نہ جائیں گے، جب تک محمد اور ان کے اصحاب کو رسیوں میں باندھ نہ لیں، تم ان کو قتل نہ کرو، پکڑ لو۔[1]

ابوجہل ۔لعنہ اللہ۔ کا یہ کہنا فرعون کے قول کی طرح تھا کہ جب جادوگر مسلمان ہو گئے تو کہا: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ﴾ [الأعراف: ۱۲۳] ”بے شک یہ مکر ہے، تم نے اس شہر میں (مل کر) یہ مکر کیا ہے، تاکہ یہاں رہنے والوں کو اس (شہر) سے نکال دو۔“ یہ بالکل اس کا بہتان اور افترا تھا، لہٰذا ابوجہل اس امت کا فرعون ٹھہرا۔

طلحہ بن عبیداللہ بن کریز رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ ابلیس نظر نہ آیا، کسی دن اصغر واحقر وادحر واغیظ عرفہ کے دن سے، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی رحمت اور بخشش گناہوں کی دیکھتا ہے۔ بدر کے دن بھی وہ بڑا خوار وزار نظر آیا تھا۔ پوچھا گیا کہ اس دن اس نے کیا دیکھا؟ کہا کہ جبریل کو دیکھا کہ وہ ملائکہ کو ہشکار رہے ہیں۔[2] یہ روایت اس وجہ سے مرسل ہے۔

بیمار دلوں اور منافقوں کا طعنہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب بعض لوگ بعض سے نزدیک ہوئے، اللہ نے مسلمانوں کو مشرکوں کی نظر میں اور مشرکوں کو مسلمانوں کی نظر میں تھوڑا کر دکھایا۔ مشرکوں نے کہا کہ یہ اپنے دین پر مغرور ہیں، یہ اس لیے کہا کہ مسلمان ان کی نظر میں تھوڑے دکھائی دیے اور انھوں نے یہ گمان کیا کہ ہم ان کو شکست دے کر مار لیں گے۔ ان کو اس معاملے میں کچھ شک نہ تھا۔ اللہ نے کہا کہ جو کوئی اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو اللہ زبردست حکمت والا ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکوں نے مسلمانوں کے گروہ کو دیکھا کہ اللہ کے حکم کی سختی سے تعمیل کرتے ہیں۔ یہ بات اس لیے کہی کہ یہ اپنے دین کے دھوکے میں ہیں۔ ابوجہل نے نبیِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو جھانک کر سرکشی اور اپنے دل کی سختی کی وجہ سے یہ کہا تھا: ”وَاللّٰهُ لَا يُعْبَدُ بَعْدَ الْيَوْمِ“

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (۳/ ۵۲۔ ۵۳) [2] الموطأ (۱/ ۴۲۲) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (۵/ ۱۷۱۷) اس کی سند حسن ہے۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول کہنے والے منافقین تھے جو بدر کے دن مکے سے آئے تھے۔ عامر شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگ مکے کے اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، وہ مشرکوں کے ہمراہ مکے سے بدر میں آئے تھے، جب مسلمین کی قلت کو دیکھا تو کہنے لگے: ﴿ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ﴾ (آیتِ باب) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مقولہ مشرکین کے ایک گروہ کا تھا، جیسے ابوقیس ابن الولید بن مغیرہ، ابوقیس بن الفاکہ بن مغیرہ، حرث بن زمعہ بن اسود بن مطلب، علی بن امیہ بن خلف اور عاص بن منبہ بن حجاج۔ یہ لوگ مکے سے قریش کے ساتھ نکلے تھے اور دل میں شک رکھتے تھے، ان کے شک نے ان کو روک رکھا تھا، جب اصحابِ رسول اللہ ﷺ کی قلت کو دیکھا تو کہنے لگے: ﴿ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ﴾ (آیتِ باب) یعنی اگر یہ دھوکے میں نہ ہوتے تو اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کے ہوتے ہوئے اس جگہ پیش قدمی کر کے کیوں آتے۔[1] (وهكذا قال ابن إسحاق سواء) امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک قوم تھی جو بدر کے دن جنگ میں حاضر نہ ہوئی، اس لیے ان کا نام منافقین ہوا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے فرمایا تم ان لوگوں کی طرح اترانے اور تکبر کرنے میں نہ ہو جو مکے سے اتراتے ہوئے نکلے، لوگوں کو دکھانے کے لیے کہ کہیں تمھارا حال بھی ان کے حال جیسا نہ ہو جائے۔ ''بَطَرَ''، نعمت میں سرکشی اور شکر کو ترک کر دینے کو کہتے ہیں، جس کو اللہ کی ناراضی کا وسیلہ ٹھہرائیں اور رِیا کہتے ہیں اچھی بات کا اظہار کرنا اور قبیح بات کو چھپانا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ وہ دولہا یا دلہن کا گھوڑے وغیرہ سواریوں پر نکاح اور شادی کے موقعے پر شہر کا چکر لگانا، جیسا کہ ہندوستان کے لوگوں کی عادت ہے، جائز نہیں ہے۔ یہ استدلال بہت خوب ہے، کیونکہ اس طرح نکلنا بھی غرور اور ریاکاری ہی کے لیے ہوتا ہے، اس میں کچھ شک وشبہہ نہیں ہے۔ پھر اللہ نے کہا کہ وہ کچھ صرف نکلنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اوروں کو اللہ کی راہ سے روکتے بھی ہیں، سو اللہ ان کے اعمال کو گھیرنے والا ہے۔ شیطان نے ان کو ان کے برے اعمال بھی اچھے کر کے دکھائے ہیں اور ان سے کہہ دیا ہے کہ تم ہی غالب رہو گے، لیکن جب مقابلے کا وقت آیا تو الٹے پاؤں پھرا اور ساتھ نہ دیا اور صاف کہہ دیا کہ میں تم سے بیزار ہوں۔

منافقین سے مراد وہ منافق ہیں جو مدینے میں سکونت رکھتے تھے اور اہلِ مرض سے مراد مکے کے وہ لوگ تھے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ان کا ایمان مضبوط نہ ہوا تھا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بیمار دل وہ لوگ تھے جو بدر

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٣_ ١٤) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧١٦_ ١٧١٧)

میں حاضر نہ ہوئے تھے، ان کا نام منافق ٹھہرا۔[1] ﴿ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ﴾ کا کلمہ کہنے والوں سے مشرکین مراد ہیں یا مدینے اور اس کے اردگرد کے یہود ہیں کہ انھوں نے یہ بات مدینے کے منافقین کی موافقت میں کہی تھی۔[2]

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۵۰ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۵۱

اور کاش! آپ دیکھیں، جب کہ فرشتے کافروں کو فوت کرتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہیں اور (کہتے ہیں کہ) تم جلا دینے والا عذاب چکھو (50) یہ اسی کا بدلہ ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور یہ (جان لو) کہ بے شک اللہ (اپنے) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (51)

فرشتوں کا کافروں کو روح قبض کرتے وقت مارنا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے پیغمبر! اگر تم کبھی کفار کی حالتِ موت دیکھو تو تم کو ایک عظیم اور ہولناک چیز نظر آئے جو بہت دور کرنے والی اور منکر ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ادبار سے مراد استاہ (سُرین، چوتڑ) ہیں، یہ ماجرا بدر کے دن ہوا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مشرک جو منہ مسلمانوں کی طرف کرتے تھے تو مونہوں پر تلوار کھاتے اور جب پشت پھیرتے تو فرشتے پیچھے سے مارتے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ادبار سے استاہ ہیں، لیکن اللہ نے کنایہ کیا۔[3] امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے ابوجہل کی پشت پر مثل خار کے دیکھا۔ فرمایا: وہ فرشتوں کی مار ہے۔[4] ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سیاق کا سبب اگرچہ واقعہ بدر ہے، لیکن یہ آیت ہر کافر کے بارے میں عام ہے، لہٰذا اللہ نے اس کو اہلِ بدر کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، بلکہ عام فرمایا۔

اس سورت میں بھی اسی طرح پر آیا ہے اور سورت انعام میں بھی گزر چکا ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ [الأنعام: ٩٣] "کاش! آپ ظالموں کو اس حال میں دیکھیں جب وہ موت کی سختیوں میں گرفتار ہوتے ہیں، اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں۔" یعنی فرشتے اللہ کے حکم سے مارنے کو ہاتھ بڑھاتے ہیں، جبکہ ان کی جانیں نکلنے سے رکتی ہیں تو پھر زبردستی ان کو نکالتے ہیں، یہ جب ہوتا ہے کہ ان کو عذاب اور اللہ کے غضب کی بشارت سناتے ہیں۔

سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ملک الموت جب کافر کے پاس اس کی موت کے وقت ایک

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ١٤)
[2] فتح البیان (٥/ ١٨٩۔ ١٩٢)
[3] تفسیر الطبري (١٤/ ١٦)
[4] تفسیر الطبري (١٤/ ١٦۔ ١٧) یہ روایت مرسل ہے۔

شناسا صورت میں آتا ہے تو کہتا ہے کہ اے ناپاک جان نکل گرم ہوا اور پانی اور بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش کی طرف چلنے کے لیے! تو اس وقت اس کی جان بدن میں پھیل جاتی ہے، پھر فرشتے اس کو جسم سے اس طرح کھینچ کر نکالتے ہیں جس طرح گرم سیخ کو موئے نم میں سے نکالا جائے۔ اس جان کے ساتھ اس کے رگ و پٹھے کھچ جاتے ہیں،[1] اسی لیے اس جگہ فرمایا کہ فرشتے یوں کہتے ہیں: چکھو مزا عذابِ حریق (جلانے والے عذاب) کا۔

برے اعمال کی سزا:

پھر فرمایا یہ تمھارے ان برے اعمال کی سزا ہے جو تم دنیا کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ اللہ نے ان اعمال کا یہ بدلہ تم کو دیا، اللہ اپنی مخلوق میں سے کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا۔ وہ تو حاکمِ عدل ہے، کہاں وہ اور کہاں ظلم وستم؟ اس کی ذات ظلم وستم سے پاک، بے نیاز، تعریف والی، مقدس اور منزہ ہے۔ اسی لیے صحیح مسلم میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے ظلم کو اپنی جان پر حرام کیا ہے اور اس کو تمھارے درمیان حرام کیا ہے، سو تم آپس میں ظلم نہ کرنا، میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں، جن کو میں نے گن رکھا ہے، سو جو کوئی خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو کوئی کچھ اور پائے وہ ملامت نہ کرے، مگر اپنی جانوں کو۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس جگہ کفار سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدر میں مارے نہیں گئے یا وہ جو وہاں مارے گئے ہیں۔ وُجوہ سے مراد سامنے کی جہت ہے، ادبار سے مراد پشت کی جہت ہے، یعنی لوہے کے ہتھوڑوں سے ان کی پیٹھ پر مارتے ہیں، یہ اس بات پر نص ہے کہ فرشتے کافر کی روح نکالتے وقت اس کو مارتے پیٹتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب جلانے والا عذاب چکھو۔ اگرچہ ہم کو یہ حال دکھائی سنائی نہیں دیتا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ مار موت کے وقت پڑتی ہے، آگ کے کوڑوں سے پیٹتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت میں "توفی" کا ذکر اسی معنی میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ مار قیامت کے دن دوزخ کی طرف لے جانے کے وقت پڑے گی۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آگے پیچھے مارنے سے مراد یہ ہے کہ سارے بدن کو مارتے ہیں۔[3] کہتے ہیں کہ بدر کے دن فرشتوں کے ہاتھ میں آگ میں گرم کیے ہوئے لوہے کے ہتھوڑے تھے، جن سے وہ کفار کو مارتے تھے، آگ ان کے زخموں میں بھڑکتی اور جہنم کے خزنہ (دربان) قتل کے وقت کہتے کہ جلانے والے عذاب کا مزا چکھو۔ یہ مار اور جلانا اور عذاب اور قتل برے اعمال اور گناہوں کا بدلہ ہے۔ یہ قول بھی فرشتوں کا ہے، اللہ کچھ ظالم نہیں ہے، ظالم تو خود یہی ہیں۔[4]

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) مستدرك الحاكم (١/ ٩٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٧٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٢١) [3] تفسير البغوي (٣/ ٣٦٨) [4] فتح البيان (٥/ ١٩٣۔ ١٩٤)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

ان کی عادت آلِ فرعون اور ان لوگوں کی عادت جیسی ہے جو اُن سے پہلے تھے، انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں پکڑ لیا۔ بے شک اللہ بہت طاقتور، سخت سزا والا ہے ﴿52﴾

جھٹلانے والوں کے متعلق اللہ کی سنت:

اللہ نے فرمایا: اے پیغمبر! یہ لوگ جو آپ کو جھٹلاتے ہیں، ان کا فعل پہلی جھٹلانے والی امتوں کی مانند ہے، سو ہم نے بھی ان سے وہی چال چلی جو کہ ہماری عادت ہے، ان جیسے مکذبین کے حق میں۔ فرعون والے اور ان سے اگلے لوگوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا، ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا، ہم نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا۔ ہمارا عذاب سخت ہوتا ہے، کوئی اس کو دور نہیں کر سکتا اور نہ کوئی بھاگنے والا اس سے بچ سکتا ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اہلِ بدر کے عذاب کے بعد وہ بات ذکر کی جو اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کی سنت و عادت کافروں اور جھٹلانے والوں کے بارے میں اس طرح پر جاری ہے کہ وہ ان کو ان کے گناہوں پر پکڑ لیتا ہے۔ چنانچہ آلِ فرعون اور اس سے پہلی امتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کر چکا ہے، وہ بھی انھی کی طرح آیاتِ الٰہی کے منکر تھے۔[1]

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

یہ اس لیے کہ بے شک اللہ کوئی نعمت، جو اس نے کسی قوم کو بخشی ہو، نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ خود اپنے نفسوں کی حالت بدلیں۔ اور بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے ﴿53﴾ ان کی عادت آلِ فرعون اور ان لوگوں کی عادت جیسی ہے جو اُن سے پہلے تھے، انھوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا، اور ہم نے آلِ فرعون کو غرق کر دیا۔ اور وہ سب ظالم تھے ﴿54﴾

زوالِ نعمت کے متعلق اللہ کی سنت:

اپنی جیون کی بات بدلیں، یعنی اعتقاد و نیت جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی۔ اللہ

[1] فتح البیان (۵/ ۱۹۴)

نے اس آیت میں اپنے عدل و انصاف پر مبنی اس حکم کے بارے میں خبر دی ہے کہ ہم کسی قوم سے دی ہوئی نعمت واپس نہیں لیتے، مگر اس کے گناہ کے سبب سے جس طرح فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴾ [الرعد: ۱۱] ''بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، حتی کہ وہ اسے بدل لیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔ اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی (عذاب) کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے کوئی واپسی نہیں، اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔''

معلوم ہوا کہ گناہ کرنا زوال اور نعمت کے چھن جانے کا موجب ہوتا ہے۔ فرعون والوں نے جب گناہ کرنے شروع کیے تو اللہ نے ان سے اپنی نعمت چھین لی، نہ وہ باغات رہے، نہ وہ نہریں اور کھیتیاں، نہ وہ خزانے نہ وہ خاصے خاصی محل، حالانکہ پہلے ان نعمتوں میں خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے، خوب چین اڑاتے تھے۔ اللہ نے ہرگز ان پر کچھ ظلم نہیں کیا، بلکہ خود وہی کمبخت نابکار ظالم اور ستم گر تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ نعمت سے مراد اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے قریش پر انعام کیا کہ نبی اکرم ﷺ کو ان میں بھیجا، جب قریش انکار اور تکذیب سے پیش آئے تو اللہ نے ان کو انصار کی طرف منتقل کر دیا۔ اپنی حالت سے مراد اخلاق و احوال ہیں، یعنی اللہ کی نعمت کا کفران کرنے لگے، ناشکرے ہو گئے۔ اللہ کے احسان کو نہ مانا۔ اوامر و نواہی کو ترک کر دیا۔ یہ تغییر پسندیدہ اور ناپسندیدہ حال کو شامل ہے، کیونکہ جس طرح اچھا حال بدل کر حالِ بد کی طرف ہوتا ہے اسی طرح ناپسندیدہ حالت کی تبدیلی اور زیادہ بدتر حالت کی طرف بھی ہوا کرتی ہے۔ جس طرح کا حال اور انجام آلِ فرعون اور ان سے پہلے والے لوگوں کا ہوا یا قریش اور ان جیسے مشرک لوگوں کا ہوا کہ اللہ نے تو ان پر دنیا کی بھلائی کے دروازے کھول دیے اور رسول بھیج کر احسان بھی کیا اور کتابیں نازل کر کے احسان کیا، ان نعمتوں کا شکر انھوں نے یہ کیا کہ منکر ہو گئے، لہٰذا وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ ان کی نعمتوں کو بدل دیا جائے، جس طرح انھوں نے اپنے طور طریقے اور چال بدل دی۔ فرعون والوں کا حال یاد کرو کہ ان کا انجام کیا ہوا، یہی ہوا کہ گناہوں کی کثرت کی وجہ سے وہ اور ان سے پہلے لوگ ہلاک و برباد ہو گئے، فرعون ڈوب کر مر گیا، یہ سب یعنی آلِ فرعون اور ان سے پہلے والے اور قریش ظالم تھے، اپنی جانیں ظلم و گناہ کر کے برباد کر دیں۔[1]

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۵ۖ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ

[1] فتح البیان (۵/ ۱۹۵۔ ۱۹۶)

فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾

بے شک زمین پر چلنے پھرنے والوں میں سے، اللہ کے نزدیک، بدترین وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا، پھر وہ ایمان نہیں لاتے (55) وہ جن سے آپ نے معاہدہ کیا، پھر وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں اور وہ (اللہ سے ذرا) نہیں ڈرتے (56) پھر اگر آپ ان کو لڑائی میں پائیں تو ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی بھگا دیں جو ان کے پیچھے ہوں، شاید کہ وہ نصیحت پکڑیں (57)

کفر پر جمے رہنے والے چوپائیوں سے بھی بدتر:

اللہ نے کفار کو جو روئے زمین پر ہیں، بدترین حیوانات فرمایا، ان کی عادت یہ بتلائی کہ وہ جب عہد باندھتے ہیں تو اس پر ثابت قدم نہیں رہتے، ادھر مضبوطی اقرار کی کی، ایمان لائے، ادھر جھٹ پٹ عہد شکنی کی۔ اس گناہ کا ان کو اللہ کی طرف سے کچھ ڈر اور خوف نہیں ہے۔ ایسوں کا یہ علاج ہے کہ جب لڑائی میں ان پر قابو پایا جائے تو ان کو خوب سزا دی جائے جو اوروں کو بھی یاد رہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن بصری، ضحاک، سدی، عطا اور ابن عیینہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یعنی اس لفظ کے معنی یہ ہیں: "غَلِّظْ عُقُوْبَتَهُمْ وَأَثْخِنْهُمْ قَتْلًا لِيَخَافَ مَنْ سِوَاهُمْ مِنَ الْأَعْدَآءِ مِنَ الْعَرَبِ وَغَيْرِهِمْ وَيَصِيْرُوْا لَهُمْ عِبْرَةً"[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جو زمین پر چلتے ہیں، ان سب میں اللہ کے حکم اور فیصلے کے مطابق، سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو کفر پر جمے ہوئے ہیں، گمراہی میں بڑھے ہوئے ہیں، ان کو تمام چوپائیوں میں سب سے بدتر فرمایا، بدترین انسان نہیں فرمایا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ انسانیت سے نکل کر غیر انسان کی جنس میں داخل ہو گئے ہیں، جن کو عقل ہے نہ شعور، بلکہ ان میں بھی تمام جانوروں میں سب سے زیادہ بدتر ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴾ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت کا نزول یہود کی چھے قوموں کے حق میں ہوا ہے۔ ان میں سے ایک ابن تابوت بھی تھا۔[2]

عہد توڑنے والوں کو سخت سزا دینے کا حکم:

اور اس لیے فرمایا ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں، یعنی ان کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ کبھی مومن نہ ہوں اور نہ اپنی گمراہی سے رجوع کریں۔ اس حکم کی ترتیب ان کے کفر کی انتہا اور گمراہی میں پھنس جانے کی وجہ سے ہے۔ ان پر اس بات کی طومار ہے کہ وہ اہلِ طبع (مہر والے) ہیں، ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے، کوئی ان کو

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٥/ ١٧١٩) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٢٢)
[2] الدر المنثور (٤/ ٨١)

ان کی حالت سے ہٹا نہیں سکتا۔ ان سے مراد قبیلہ قریظہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے انھوں نے عہد کیا تھا کہ ہم آپ کے مقابلے میں کفار کی مدد نہ کریں گے، لیکن اس عہد کو پورا نہ کیا، بلکہ ہر بار عہد کو توڑ ڈالا۔ ہتھیاروں سے کافروں کی مدد کی اور کہا کہ ہم کو اپنا عہد یاد نہ رہا۔ پھر دوبارہ عہد کیا، پھر پورا نہ کیا۔

غرض کہ ان کا حال یہی تھا کہ عہد کو توڑنے اور غداری کرنے میں اللہ کا کچھ ڈر نہ رکھا اور نہ ہی برے انجام کا کچھ خوف کیا اور نہ ہی غداری کے اسباب سے پرہیز کیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ جب لڑائی میں تم کو ان پر قابو ملے تو خوب قتل کرو اور سزا اور عقوبت دو، تاکہ اور مشرک جو مکے میں ہیں وہ ڈر جائیں اور تم سے جنگ کرنے سے باز رہیں، اس خوف سے کہ مبادا ان کی گت بھی ایسی ہو جیسی گت ان کی ہوئی۔[1]

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾

اور اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو برابری (کی سطح) پر ان کا عہد ان کے منہ پر دے ماریں۔ بے شک اللہ خیانت (بدعہدی) کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (58)

برابری کی سطح پر عہد توڑنے کا حکم:

یعنی اگر ایک قوم نے کافروں سے صلح کی ہو تو پھر ان کی طرف سے دھوکا دہی ہو چکی ہو، اب ان کو بے خبر مارے اور اگر دغا نہیں ہوا، لیکن اندیشہ ہے تو انھیں خبردار کر کے جواب دیجیے برابری کی سطح پر، یعنی جو قوم لڑائی کا ارتکاب صلح سے پہلے کر سکتی ہے سو اب بھی کر سکتی ہے، اس میں کچھ بدقولی نہیں ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے کہ اگر تم کو کسی قوم سے عہد شکنی کا ڈر ہو تو تم اس عہد کو چھوڑ دو اور ان کو بتلا دو کہ ہم نے تمھارا عہد توڑ ڈالا، تاکہ انھیں پتا چل جائے کہ اب تمھارے اور ان کے درمیان جنگ ہے نہ کہ صلح۔ ان کو یہ اطلاع کرنے سے تم اور وہ بیزار ہو جاؤ گے۔ اللہ کو دغا بازی پسند نہیں، اگرچہ وہ کفار کے ساتھ کی جائے۔

سلیم بن عامر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ روم کے علاقے میں سیر کرتے تھے، ان کے اور رومیوں کے درمیان ایک مدت طے پا گئی تھی، معاویہ رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ ان سے نزدیک ہوں، جب وہ معاہدہ ٹوٹ جائے تو وہ ان سے جنگ کریں۔ ایک بوڑھا آیا، وہ ایک چارپائے پر سوار تھا اور کہا: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَفَاءٌ لَا غَدَرٌ" نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے، جس کسی کا کسی قوم کے ساتھ کوئی عہد ہو اس کو نہ توڑے اور نہ سخت گیری کرے، یہاں تک کہ اس کی مدت پوری ہو جائے یا ان سے کہہ دے کہ ہم تم بیزار ہیں، یعنی اب ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی قول و قرار باقی

---

[1] فتح البیان (۵/ ۱۹۷۔ ۱۹۸)

نہیں رہا۔ جب یہ بات معاویہ کو پہنچی تو وہ اپنے ارادے سے باز رہے، وہ شیخ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔[1] (رواہ أحمد وأبو داود الطیالسي و أبو داود والترمذي والنسائي وابن حبان قال الترمذي: حسن صحیح)

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک قلعہ یا شہر تک پہنچے اور اپنے اصحاب سے کہا: ”دَعُوْنِيْ أَدْعُوْهُمْ كَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَدْعُوْهُمْ“ پھر کہا: میں ان میں سے ایک مرد تھا، اللہ نے مجھ کو اسلام کی راہ دکھائی سو اگر تم اسلام لے آؤ گے تو تمھارے لیے وہی ہے جو ہمارے لیے ہے اور تم پر وہی ہے جو ہم پر ہے اور اگر انکار کرو گے تو ہم تم کو اسی طرح چھوڑ دیں گے برابری کی بنیاد پر۔ اللہ دغا بازوں کو دوست نہیں رکھتا۔ تین دن تک ان سے اسی طرح کہا سنا، چوتھے دن صبح کو لوگوں نے اس پر چڑھائی کر کے اللہ کی مدد سے فتح کر لیا۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ ہیں کہ اگر تم اے اللہ کے رسول کسی معاہدے والی قوم سے کسی طرح کی عہد شکنی اور دھوکا کسی ظاہری علامت کے ساتھ دیکھو تو ان کو ان کی طرف پھینک دو، مراد قریظہ و نضیر ہیں۔ نبذِ عہد سے مراد ان کو اس بات کی اطلاع دینا ہے کہ آج کے بعد اب ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی عہد نہیں، یہ ایک برابری کا طریقہ ہے، یعنی ان سے صاف صاف کہہ دو کہ باہمی عہد اب قائم نہیں رہا اور یکا یک بے خبری میں ان پر حملہ آور مت ہو، تاکہ وہ تم کو بدعہدی کا الزام نہ دیں۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت ہر معاہدہ کرنے والے کے بارے میں عام ہے، جس سے عہد شکنی کا خوف ہو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآنی الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی قریظہ کا معاملہ تو الفاظ ﴿مَنْ خَلْفَهُمْ﴾ [الأنفال: ٥٧] ”جو ان کے پیچھے ہوں۔“ تک ختم ہو چکا، پھر اللہ نے اس آیت سے ابتدا کی ہے۔[3]

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٦٠﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ سبقت لے گئے ہیں۔ بے شک وہ (اپنی چالوں سے

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١١١) مسند الطیالسي (١/ ١٥٧) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٧٥٩) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٥٨٠) سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ٢٢٣) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٣٥٧)

[2] مسند أحمد (٥/ ٤٤٠) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٢٢۔ ٤٢٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری رحمہ اللہ کا سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسیر القرطبي (٨/ ٣١) فتح البیان (٥/ ١٩٨۔ ١٩٩)

اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے (59) اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت (تیر و تفنگ) اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو، جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا (60)

کافروں کی بے نوائی کا تذکرہ اور جنگی تیاری کا حکم:

حکم دیا کہ جہاد کا اہتمام کرو، جو ہو سکے۔ تیر اندازی کا زور دیا۔ اور ہتھیاروں کا حاصل کرنا بھی اسی میں داخل ہے اور گھوڑے پالنے میں جو خرچ ہو اس کی خوراک پر، بلکہ اس کا فضلہ سب قیامت کے دن ترازو میں چڑھے گا، یہ رعب ڈالنے کے لیے ہے، تاکہ یہ نہ سمجھیں کہ ان اسباب سے فتح ہو گی۔ فتح تو اللہ کی مدد سے ہوتی ہے اور وہ لوگ جن کو تم نہیں جانتے وہ منافق ہیں کہ ظاہر مسلمان کے پردے میں ہیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے پیغمبر کو فرماتا ہے کہ تم یہ خیال نہ کرو کہ جو لوگ کافر ہیں، وہ ہم سے چھوٹ چکے ہیں، ہم کو ان پر قدرت نہیں ہے، بلکہ وہ تو ہماری قدرت کے نیچے مقہور و مجبور ہیں اور ہمارے قبضۂ مشیت میں ہیں، وہ ہم کو عاجز نہیں کر سکتے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٤] ”کیا جو لوگ برے عمل کرتے ہیں انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے۔ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴾ [النور: ٥٧] ”اور کافروں کی بابت آپ یہ خیال نہ کریں کہ وہ زمین میں (اللہ کو) عاجز کر دینے والے ہیں، اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور بلاشبہ وہ واپسی (کی) بری (جگہ) ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ۝١٩٦ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴾ [آل عمران: ١٩٦۔ ١٩٧] ”ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔“

پھر اللہ نے یہ حکم دیا کہ جنگی ساز و سامان تیار کرو، تاکہ بھرپور طاقت کے ساتھ ان سے جنگ اور مقابلہ کیا جائے اور حتی الامکان اور استطاعت کے مطابق جنگ عمل میں آئے۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، منبر پر فرماتے تھے: «اَلَا، إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ» دو بار اسی طرح فرمایا۔[1] (رواه مسلم و ابن ماجه و أبو داود) اس

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١٣)

حدیث کے کئی ایک طریق ہیں، عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے بعض کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔[1] امام احمد و اہلِ سنن نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تیر چلایا کرو، گھوڑوں پر سواری کرو، اگر تیر اندازی کرو گے تو یہ سوار ہونے سے بہتر ہے۔[2]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ گھوڑے تین شخصوں کے لیے ہیں: ایک شخص کے لیے اجر ہیں اور ایک کے لیے پردہ اور ایک پر گناہ۔ جس کے لیے اجر ہیں، یہ وہ شخص ہے جس نے اس کو اللہ کی راہ میں باندھا ہے اور اسی میں اٹکا کر کسی چراگاہ میں یا چمن میں چھوڑا ہے، سو جو کچھ وہ اس باغ یا چمن سے کھائے گا وہ اس شخص کے لیے نیکیاں ہوں گی اور اگر وہ رسی تڑا کر کسی ایک دو بلند جگہ پر چڑھ جائے گا تو اس کے آثار و ارواث یعنی لید اس کے لیے نیکیاں ہوں گی اور اگر وہ کسی نہر پر گزر کر کے پانی پیے گا، حالانکہ اس کا ارادہ پانی پلانے کا نہیں تھا تو یہ بھی اس شخص کے لیے حسنات ہوں گی، یہ گھوڑا اس شخص کے لیے اجر ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس نے گھوڑا سہولت اور پارسائی کے لیے باندھ رکھا ہے اور اس کی گردن میں اللہ کے حق کو فراموش نہیں کیا اور نہ اُس کی پشت میں تو یہ گھوڑا اس کے لیے پردہ دار ہے۔ تیسرا وہ شخص ہے جس نے کوئی گھوڑا فخر اور ریا کے لیے باندھا ہے، یہ اس پر گناہ ہے۔[3] (رواه البخاري و مسلم)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح روایت کیا ہے کہ گھوڑے تین طرح کے ہیں: ایک رحمان کا، ایک شیطان کا اور ایک انسان کا۔ رحمان کا گھوڑا وہ ہے جو اللہ کی راہ میں باندھا جاتا ہے، اس کا چارہ، لید اور پیشاب یعنی سب ترازو میں ہو گا اور ذکر کیا جو اللہ نے چاہا۔ شیطان کا گھوڑا وہ ہے جس سے گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلیں۔ انسان کا گھوڑا وہ ہے جو آدمی اپنے شکم کے لیے باندھتا ہے، یعنی روزی کمانے کے لیے۔ وہ محتاجی سے پردہ ہے۔[4] اکثر علما کا مذہب یہی ہے کہ تیر اندازی شہسواری سے بہتر ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سواری تیر اندازی سے بہتر ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جمہور کا قول حدیث کے سبب سے زیادہ قوی ہے۔ واللہ أعلم

سیدنا معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کا ابوذر رضی اللہ عنہ پر گزر ہوا، وہ کھڑے ہوئے اپنے گھوڑے کی خدمت کر رہے تھے، کہا: تم کیوں یہ مشقت کرتے ہو؟ کہا: مجھ کو گمان ہے کہ اس گھوڑے کی دعا قبول ہو۔ کہا کہ جانوروں میں سے ایک جانور

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٣)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٣٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١١) اس کی سند میں ''خالد بن زید'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: ضعیف أبي داود (٢/ ٣٠٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٧)

[4] مسند أحمد (١/ ٣٩٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٣٣٨)

کی دعا کیا ہوگی؟ کہا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کوئی گھوڑا نہیں ہے، مگر وہ ہر صبح دعا کرتا ہے اور کہتا ہے: ”اَللّٰھُمَّ أَنْتَ خَوَّلْتَنِيْ عَبْداً مِّنْ عِبَادِكَ، وَجَعَلْتَ رِزْقِي بِيَدِهِ، فَاجْعَلْنِي أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَهْلِهِ وَمَالِهِ وَ وَلَدِهِ“ دوسرے طریق میں یہ روایت مرفوعاً آئی ہے۔[1] (رواه النسائي)

سیدنا سہل رضی اللہ عنہ کی روایت کے مرفوعاً یہ الفاظ ہیں: گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر بندھی ہوئی ہے، قیامت کے دن تک۔ گھوڑے والے ان پر قیامت کے دن تک مدد کیے جاتے ہیں، جس نے اللہ کی راہ میں کوئی گھوڑا باندھا تو اس پر خرچ کرنا اس شخص کی طرح ہے کہ جس نے اپنا ہاتھ صدقہ دینے کے لیے بڑھایا، پھر اس کو نہیں کھینچتا۔[2] (رواه الطبراني) گھوڑوں کے پالنے کے سلسلے میں بہت احادیث آئی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے: «اَلْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِي نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ: اَلْأَجْرُ، وَالْمَغْنَمُ»[3]

دشمن اور دوسروں سے مراد:

آیتِ باب میں ﴿عَدُوَّ﴾ سے مراد کفار ہیں اور ﴿اٰخَرِيْنَ﴾ سے بنو قریظہ۔ (قاله مجاهد) امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد فارس ہیں۔ ابن یمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد شیاطین ہیں جو گھروں میں رہتے ہیں۔[4] اس بارے میں ایک حدیث بھی آئی ہے: ابن غریب نے کہا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَآخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ هُمُ الْجِنُّ»[5] (رواه الطبراني) لیکن یہ حدیث سخت ضعیف ہے۔ مقاتل بن حیان اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد منافقین ہیں۔[6] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والا قول ہے اور اس کا شاہد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ﴾ [التوبة: ۱۰۱] ”اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں ان میں بعض منافق ہیں اور بعض اہلِ مدینہ بھی نفاق پر اَڑے ہوئے ہیں۔ (اے نبی!) آپ انھیں نہیں جانتے، ہم انھیں جانتے ہیں۔“

جہاد کی راہ میں خرچ کرنے کا ثواب:

پھر فرمایا کہ جو کچھ تم جہاد میں خرچ کرو گے وہ پورا تم کو وہاں ملے گا، اسی لیے ابو داود میں مروی حدیث میں

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٦٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤١٤)

[2] المعجم الكبير (٦/ ٩٨) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩٧)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٣۔ ١٧٢٤)

[5] المعجم الكبير (١٧/ ١٨٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه مجاهيل“ (مجمع الزوائد: ٧/ ١٠٠)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٤)

مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ایک درہم کا ثواب مضاعف (کئی کئی گنا) ہوتا ہے، سات سو گنے تک،[1] جس طرح کہ سورت بقرہ کی اس آیت میں گزر چکا ہے: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ٢٦١] ''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی سی ہے، جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حکم نہ کرتے صدقہ کرنے کا مگر اہلِ اسلام پر، یہاں تک کہ یہ آیت باب اتری، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر سائل پر خواہ وہ کسی دین کا ہو، صدقہ کرنے کا حکم دیا۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) یعنی کسی دین کا سائل ہو، اس کو صدقہ دینا درست ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ کافر لوگ اگرچہ واقعہ بدر سے بھاگ نکلے، لیکن وہ دنیا کے عذاب میں قتل کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے عذاب میں ڈالے جائیں گے۔ اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ جو مشرک ایسے ہیں جن سے انتقام نہیں لیا گیا وہ کچھ بچ نہیں جائیں گے، ان پر بھی دونوں جہانوں کی بلا آئے گی۔ پھر اللہ نے جنگ کے ساز و سامان کی تیاری کا حکم دیا، عہد شکنوں یا مطلق کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے۔ دوسری قسم کا ذکر زیادہ صحیح اور پہلی قسم بھی ان میں ہر طرح سے شامل ہے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ قوت کی تفسیر رمی (تیر اندازی) کے ساتھ فرمائی ہے[4] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قوت رمی و تلواریں اور ہتھیار ہیں۔[5] سیدنا عباد بن عبداللہ بن زبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گھوڑوں کی تعداد ہے۔[6] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوت نر گھوڑے ہیں اور رباط مادہ گھوڑے۔ ابن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوت تیر اندازی اور گھوڑے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: حُصُوْن (قلعے) ہیں۔[7] بعض نے کہا ہے کہ ہر آلہ جس سے جہاد میں مدد لی جائے، وہ تمام چیزیں جن کا نام لیا گیا وہ اعداد کے ساتھ قوت میں شامل ہیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قوت کی تفسیر رمی کے ساتھ کرنا کچھ ان معانی کے منافی نہیں ہے جو عام چیزیں جن سے جنگ میں مدد لی جائے کو ظاہر کرتے ہیں، بلکہ ''اَلْحَجُّ عَرَفَةُ وَالنَّدَمُ تَوْبَةٌ'' کی طرح اس بات پر دلیل ہیں کہ رمی زیادہ افضل اور اہم مقصد ہے۔

---

[1] سنن ابی داود میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ دیگر کتب میں روایت مروی ہے۔ دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٦١) اس کی سند میں ''خلیل بن عبداللہ'' مجہول راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٣٩٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٤) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٢٣۔ ٤٢٥)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٧) [5] الدر المنثور (٤/ ٨٣)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢١) [7] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٢)

آیتِ باب کا مطلب یہ ہے کہ تم لڑائی کی تیاری رکھو کہ دشمن کے ساتھ جنگ اور جہاد کیا جائے، کسی بھی آلے سے کیوں نہ ہو، جیسے: تیر، تفنگ، تلوار، زرہ، گھڑسواری کی تعلیم اور دفاع کے طریقے سیکھنا کہ یہ سب ان فروضِ کفایات میں سے ہیں جن کا حکم دیا گیا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کے وقت میں عمدہ قوت رمی تھی، اس لیے اس کا ذکر فرمایا، اس زمانے میں جنگ کے اسباب و آلات مختلف انواع اور اقسام کے ایجاد ہو چکے ہیں اور استعمال میں آتے ہیں، ان سب کا حکم وہی ہے جو رمی کا حکم ہے۔ رباط سے مراد دشمن کے مقابلے میں گھوڑوں کا سرحد پر باندھنا ہے، خواہ وہ مال خمس سے ہوں یا اور ہوں۔ گھوڑوں کا باندھنا جہاد کی استعانت کے بڑے اسباب میں سے ہے۔

امام ابن محیریز رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صف بندی کے وقت صحابہ کرام نر گھوڑوں کو زیادہ پسند کرتے تھے اور شب خون اور غارات کے وقت مادہ گھوڑوں کو پسند کرتے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ نر گھوڑے مادہ گھوڑوں سے زیادہ بہتر ہیں، اس لیے کہ کروفر میں قوی تر ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ لفظ خیل عام ہے اور نر و مادہ دونوں کو شامل ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی جنگ کی نیت سے باندھے گا تو وہ باندھنا اللہ کی راہ میں ہوگا۔ علما کی ایک جماعت نے ایک مستقل کتاب الخیل لکھی ہے۔ اس بارے میں بہت احادیثِ فضائل آئی ہیں۔

اعداء اللہ سے مراد مشرکینِ مکہ وغیرہ عرب ہیں اور ﴿ اٰخَرِيْنَ ﴾ سے یہود یا فارس یا روم مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ منافقین، لیکن اس میں بُعد ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن ہیں۔ پھر اس کو قابلِ ترجیح بتایا جاتا ہے،[2] لیکن یہ بہت بعید ہے۔ یا وہ لوگ مراد ہیں جن کی عداوت معلوم نہیں ہے۔ سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خاص بنو قریظہ مراد ہیں،[3] لیکن ان معنوں کو متعین کرنے میں توقف کرنا زیادہ بہتر ہے ﴿ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ﴾ سے۔

پھر یہ فرمایا کہ جو کچھ تم جہاد میں خرچ کرو گے، تھوڑا ہو یا بہت، کم و بیش، یسیر حقیر و جلیل تو اس کی جزا بھرپور تم کو ملے گی۔ ہر حسنہ دس گنا ہوتا ہے سات سو گنے تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ تم پر اس خرچ میں کچھ ظلم نہ ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ۴۰] ''اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۹۵] ''تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا۔''[4]

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۶۱ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ

[1] تفسير البغوي (۳/ ۳۷۲) [2] تفسير الطبري (۱۴/ ۳۷) [3] تفسير القرطبي (۸/ ۳۸) [4] فتح البيان (۵/ ۲۰۰ ـ ۲۰۴)

اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾

اور (اے نبی!) اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیں اور اللہ پر بھروسا رکھیں، بے شک وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (61) اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو بے شک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی (62) اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی، اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ ہی نے ان میں اُلفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے (63)

اگر دشمن صلح کا خواہاں ہو تو صلح کا حکم:

عرب کی قوم آپس میں پہلے ہمیشہ دشمنی رکھتے تھے اور یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ پھر نبیِ اکرم ﷺ کے سبب سے سب متفق اور دوست ہو گئے۔ اللہ نے کہا کہ اگر وہ صلح کرنا چاہیں تو تم بھی صلح کر لو، انکار نہ کرو۔ لہٰذا جب سالِ حدیبیہ میں مشرکوں نے صلح چاہی اور نو برس تک جنگ کو موقوف کرنے کا ارادہ کیا تو نبیِ اکرم ﷺ نے مان لیا، دوسری شرطوں کے ساتھ جو انھوں نے پیش کی تھیں۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ قریب ہے کہ اختلاف ہوگا یا کوئی اور معاملہ، پس اگر تجھ سے ہو سکے تو صلح کر لے تو کر لے۔[1] (رواہ أحمد)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت بنو قریظہ کے بارے میں اتری ہے،[2] لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ سارا سیاق واقعۂ بدر میں ہے اور بدر کا ذکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، زید بن اسلم، عطا، عکرمہ، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، آیتِ سیف کے ساتھ جو سورت براءت میں آئی ہے: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة: ۲۹] ''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔''[3] لیکن اس میں بھی نظر ہے، اس لیے کہ آیتِ براءت میں ان سے قتال کا حکم ہے، اگر ممکن ہو اور اگر دشمن کثیف ہوں تو پھر ان سے صلح کرنا جائز ہے، جس طرح یہ آیت اس مدعا پر دلیل ہے اور نبیِ اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے دن اسی طرح کیا تھا تو ان دونوں آیتوں کے درمیان کچھ تضاد نہیں، نہ کوئی منسوخ ہوئی اور نہ ہی کوئی مخصوص ہوئی۔ واللہ أعلم.

---

[1] مسند أحمد (۱/ ۹۰) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ۷/ ۴۷۳)

[2] تفسیر الطبري (۱۴/ ۴۳) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۵/ ۱۷۲۵) الدر المنثور (۴/ ۹۹)

اللہ پر بھروسے کا حکم اور اہلِ ایمان کے دلوں میں محبت ڈالنے کی نعمت کا تذکرہ:

پھر اللہ پر توکل کرنے کو کہا کہ وہ تیرا ناصر ہے اور تجھ کو کفایت کرے گا اور اگر ان کا مطلب صلح سے یہ ہے کہ قوت پکڑ کر بخوبی تیار ہو جائیں، تب بھی اکیلا اللہ تجھ کو کافی ہے۔ پھر اپنی نعمت یاد دلائی کہ ہم نے مہاجرین اور انصار سے تجھے کیسی مدد دی اور سب کو ایمان کے ساتھ تیری طاعت و مدد اور پشت پناہی پر متفق کر دیا، تو اگر سارے جہان کا مال خرچ کرتا تو بھی وہ بغض و عداوت جو ان کے دلوں میں تھی، ہرگز الفت میں تبدیل نہ ہوتی، کیونکہ انصار کے درمیان زمانۂ جاہلیت میں اوس وخزرج کے درمیان بڑی بڑی لڑائیاں آپس میں ہو چکی تھیں اور ایسے معاملات پیش آئے تھے کہ ان کا شر اور فساد مسلسل چلا آتا تھا، یہاں تک کہ اللہ نے ایمان کے نور سے اس شر کو کاٹ دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۰۳] ''اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے، شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔''

صحیحین میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حنین کی غنیمتوں کے بارے میں انصار پر خطبہ پڑھا تو فرمایا: « يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ، أَلَمْ أَجِدْكُمْ ضَلَالًا فَهَدَاكُمُ اللّٰهُ بِيْ، وَعَالَةً فَأَغْنَاكُمُ اللّٰهُ بِيْ، وَكُنْتُمْ مُتَفَرِّقِيْنَ فَأَلَّفَكُمُ اللّٰهُ بِيْ؟! » غرض کہ آپ ﷺ جو بات کہتے وہ جواب میں عرض کرتے: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَمَنُّ''[1] اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ اللہ نے ان میں الفت بخشی، اللہ ہی غالب ہے۔ اس پر کوئی توکل کرنے والا اس کی جناب سے خائب و خاسر نہیں ہوتا۔ اس کے سارے افعال اور احکام عین حکمت ہوتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رشتے داری کی قرابت منقطع ہو جاتی ہے اور اسی قطع کی وجہ سے کفرانِ نعمت کیا جاتا ہے، ہاں ان دلوں کے آپس میں قریب ہو جانے کی مثل کوئی شے دیکھی نہیں گئی اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (آیتِ باب) یہ بات شعر میں بھی موجود ہے:

ولقد صحبت الناس ثم سبرتهم ... وبلوت ما وصلوا من الأسباب
فإذا القرابة لا تقرب قاطعا ... وإذا المودة أقرب الأسباب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦١)

میں لوگوں کے ساتھ رہا، ان کو پرکھا اور ان کے اسبابِ وصل کو آزمایا۔ قرابت قطع تعلق کرنے والے کو قریب نہیں کرتی، درآں حالیکہ محبت تمام اسبابِ وصل سے قریب تر ہے۔“

امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ شعر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام کے ساتھ موصول ہیں یا پھر راوی نے ذکر کیے ہیں۔[1] حاصل یہ ٹھہرا کہ مودت کا رتبہ قرابت کے درجے سے زیادہ بلند و بہتر اور نفع بخش ہوتا ہے۔ قرابت تو قطع بھی ہو جاتی ہے، لیکن مودت باقی رہتی ہے:

اَلْقَوْمُ إِخْوَانٌ صِدْقٌ بَیْنَهُمْ سَبَبٌ مِنَ الْمَوَدَّةِ لَمْ یَعْدِلْ بِهِ نَسَبٌ

خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی مگر بنائی مودت کہ خالی از خلل ست

”تجھے دکھائی دینے والی ہر عمارت تباہ ہونے والی ہے، لیکن محبت کی عمارت کبھی برباد نہیں ہوتی۔“

اللہ کے لیے محبت کا درجہ:

خصوصاً وہ محبت و مودت جو خالص اللہ پاک کے لیے اور اس کی راہ میں کسی نفسی غرض یا دنیوی مطلب اور مال و جاہ کی غرض کے شائبے کے بغیر ہوتی ہے۔ ایسی محبت سب سے زیادہ نفع بخش اور خیر و برکت والی ٹھہرتی ہے اور اسی لیے اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والے قیامت کے دن عرشِ رحمان کے سائے تلے نور کے منبروں پر ہوں گے۔ یہ بات ان لوگوں کو حاصل نہ ہو گی جو صرف قرابت داری کی وجہ سے یا کسی اور دنیوی سبب سے دوستی اور یاری رکھتے تھے، کیونکہ ایسی محبت و مودت غالباً معصیت سے خالی نہیں ہوتی۔ آدمی اپنے قریبی رشتے داروں کا دوست دار ہوتا ہے اور وہ فاسق و فاجر ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ ان کی محبت ترک نہیں کرتا، یہ اخلاص ایمان اور اسلام میں صریح نقصان ہے، بخلاف اس محبت کے جو صرف اللہ پاک کے لیے ہوتی ہے کہ وہ اسی بندہ صالح کے ساتھ ہو گی، جو اللہ کا بڑا مطیع و محبّ و تابع ہے، وہ ایسا شخص ہے جو سنت کے اتباع اور معصیت سے اجتناب کرنے اور ظاہر و باطن میں تقویٰ و طہارت کو اختیار کرنے میں پیش قدم ہے، اسی لیے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب کے بارے میں کہا ہے: ”هُمُ الْمُتَحَابُّوْنَ فِي اللهِ“ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں اتری ہے جو صرف اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔[2] (رواه النسائي والحاكم وقال: صحيح) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں: ”اِنَّ الرَّحِمَ لَتُقْطَعُ، وَاِنَّ النِّعْمَةَ لَتُكْفَرُ، وَإِنَّ اللّٰهَ إِذَا قَارَبَ بَيْنَ الْقُلُوْبِ لَمْ يُزَحْزِحْهَا شَيْئٌ“ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ لَوْ اَنْفَقْتَ ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواه الحاكم)

---

[1] شعب الإيمان (٦/ ٤٩٥)

[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٥٢) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٥٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

عبدہ بن ابی لبابہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میری ملاقات مجاہد رحمہ اللہ سے ہوئی، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: جب اللہ کی راہ میں محبت کرنے والے دو شخص ملاقات کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ہنستا ہے تو ان دونوں کی خطائیں ایسے جھڑ جاتی ہیں، جیسے درخت سے پتے جھڑتے ہیں۔ میں نے کہا: یہ بات تو بہت آسان ہے، کہا: یوں نہ کہہ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ﴾ (آیتِ باب) عبدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے جانا کہ وہ مجھ سے زیادہ ترفقیہ ہیں۔ یہ اثر امام مجاہد رحمہ اللہ سے بطریق ولید بن ابی مغیث بھی آیا ہے۔ عمیر بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: ”كُنَّا نَتَحَدَّثُ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ الْأُلْفَةُ“[1] عمیر کا یہ کہنا بہت درست نکلا، اس وقت ہماری الفت عنقا و کیمیا ہوگئی ہے، مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ نہیں سکتا، پھر کسی اور دین والے کا کیا ذکر ؎

کیا چھپ رہی ہے جا کے کہیں یا کہ مرگئی اے جان تمھارے دور میں الفت کدھر گئی

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ مسلمان جب اپنے بھائی مسلمان سے ملتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑتا ہے تو دونوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، جیسے کہ سوکھے درخت سے آندھی کے دن پتے جھڑتے ہیں، یا دونوں بخش دیے جاتے ہیں، گو ان کے گناہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔[2] (رواه الطبراني) ہاتھ پکڑنے سے مراد مصافحہ کرنا ہے، یہ سنتِ صحیحہ سے ثابت ہے، یہ مصافحہ ایک ہاتھ سے ہوتا ہے نہ کہ دونوں ہاتھوں سے اور دل کی محبت پر دلیل ہے اور بخشش اور قربِ باہمی کا موجب ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ۔ یہ آیت محکم ہے نہ کہ منسوخ، کیونکہ مراد جزیہ کو قبول کرنا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان سے بعد والوں نے جزیہ لے کر صلح جائز رکھی ہے، اس صورت میں خاص طور پر اہلِ کتاب کے ساتھ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ اگر وہ اس صلح میں دغا بازی کریں گے تو اللہ کافی و وافی ہے، آخر اللہ ہی نے تیری مدد کی۔ رہی یہ بات کہ جب اللہ موید اور ناصر ٹھہرا تو پھر مومنین کی مدد کے ذکر کی کیا ضرورت ہے۔ سو بات یہ ہے کہ تائید اور مدد تو اکیلے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن مدد کبھی ایسے اسباب سے ہوتی ہے جو خفیہ ہوتے ہیں اور معلوم نہیں ہوتے اور کبھی ایسے اسباب سے ہوتی ہے جو ظاہر اور معلوم ہوتے ہیں، جو نصرت اسبابِ باطنہ سے ہوتی ہے اس آیت سے وہی مراد ہے: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ ﴾ (آیتِ باب) کیونکہ اس نصر کے اسباب باطن ہیں بغیر کسی معلوم واسطوں کے اور جو نصر ظاہری اسباب سے ہوتی ہے وہ لفظ

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٦۔ ٤٨)

[2] المعجم الكبير (٦/ ٢٥٦) اس کی سند میں ''سالم بن غیلان'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٦٦٣)

﴿ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ سے مراد ہے، کیونکہ اس کے اسباب ظاہری معلوم واسطوں کے ذریعے جانے جاتے ہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے، اسی نے مومنین کو سید المرسلین کی مدد کے لیے کھڑا کیا۔ پھر مومنین کی تائید کی کیفیت بیان فرمائی کہ ہم نے ان کے دل آپس میں محبت و الفت کرنے والے بنا دیے۔ قرآنی آیت کا ظاہری نظم عام ہے اور مومنین کے دلوں میں الفت کا پیدا ہونا نصرت کے جملہ اسباب میں سے ہے۔

جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد اوس و خزرج ہیں کہ ان کی آپس کی عصبیت شدید اور الفت (انانیت) عظیم تھی، باہم سخت دشمنی رکھتے تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ان کی آپس میں عظیم جنگیں اور نفرتیں ایک سو برس سے زیادہ عرصے سے چلی آ رہی تھیں، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ دو دل ہی آپس میں محبت کی طرف مائل ہوں، لیکن اللہ نے ایمان کی برکت سے وہ حالت بدل دی، جاہلیت کی حمیت دور ہو کر کلمۂ توحید پر اجماع ہو گیا، وہ عداوتیں محبت للہ و فی اللہ میں تبدیل ہو گئیں، سب نے طاعت پر اتفاق کیا، سب لوگ رسول اللہ ﷺ کے مددگار اور اعانت کرنے والے بن گئے، آپ ﷺ کی طرف سے لڑنے مرنے اور کٹنے کے لیے آمادہ ہو گئے، یہ ایسا کام تھا جس پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہ تھی۔ اس کا ظہور نبی اکرم ﷺ کا معجزۂ باہرہ ہوا جو آپ ﷺ کی سچائی کی دلیل تھا۔

یا مراد مہاجرین و انصار کے درمیان الفت کا پیدا کرنا ہے، لیکن آیت عمومیت کی حامل ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب ایک دوسرے کو کھائے لیتے تھے، کسی کے مال اور خون کا کچھ احترام نہ کرتے، یہاں تک کہ اسلام آیا، سب ایک دل ہو گئے، عصبیت اور انفیت اور جاہلیت کی حمیت دور ہو گئی۔ وہ آپس کی دشمنی ایسی تھی کہ اگر کوئی دنیا کا سارا مال خرچ کر کے ان میں الفت پیدا کرنا چاہتا تو بھی ممکن نہ تھا، یہ تو اللہ کی قدرت کی شان ہے کہ اس نے ان میں الفت ڈال دی۔

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ دل اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس طرح چاہے اسے پھیرے۔ مومنوں کے درمیان الفت کا ہونا اور اللہ کا ان مومنوں سے اللہ کے رسول کی تائید کرانا رافضہ پر رد کی دلیل ہے جو صحابہ کے بارے میں اللہ کی پیدا کی ہوئی الفت کے خلاف فاسد عقیدہ رکھتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عرش پر لکھا ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ أَنَا اللّٰهُ وَحْدِيْ، لَا شَرِيْكَ لِيْ، مُحَمَّدٌ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ، أَيَّدْتُّهُ بِعَلِيٍّ، وَذٰلِكَ قَوْلُهُ هُوَ الَّذِيْ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ" [1] (رواہ ابن عساکر) اس حدیث کی سند کو دیکھنا چاہیے کہ کیسی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾

اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی جو مومنوں میں سے آپ کی پیروی کرتے ہیں (64)

[1] تاریخ دمشق (۴۲/ ۳۶۰) فتح البیان (۵/ ۲۰۴۔ ۲۰۷) اس کی سند میں ''محمد بن سائب کلبی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

رسول اور مومن پیروکاروں کو اللہ ہی کافی ہے:

نبی اکرم ﷺ نے مدینے میں آ کر مسلمان شمار کروائے، قابلِ جنگ مرد چھ سو ہوئے، سب خوش ہوئے کہ اب ہم کو کس کافر کا ڈر ہے، اس کے بعد یہ آیت اتری۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَحَسْبُ مَنْ شَهِدَ مَعَكَ" اسی طرح عطا خراسانی اور عبدالرحمان بن زید رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے[1] اور اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ کو اللہ نے حکم دیا کہ تم مومنوں کو جہاد کا شوق دلاؤ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس ترکیب میں مفسرین اور نحویوں کے دو مذہب ہیں: ایک یہ کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تجھ کو اور مومنوں کو کافی ہے، دوسرے یہ کہ اللہ اور مومنین تجھ کو کفایت کرتے ہیں، پھر پہلے معنی کو قابلِ ترجیح ٹھہرایا ہے، یہی حق ہے اس لیے کہ اکیلا اللہ ہر بندۂ مومن کو کافی و وافی ہے۔ اسی طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہ اللہ بھی گئے ہیں۔[2] علی مہائمی کا میلِ خاطر دوسرے معنی کی طرف ہے، اس تقریر سے کہ اللہ تجھ کو بس کرتا ہے، اگرچہ تیرے ہمراہ کوئی نہ ہو ؎

خدا خود میر سامان است اسباب توکل را

اور اگر تو سببیت کی طرف نظر کرے گا تو جو مومنین تیرے ساتھ ہیں اور تیرے تابع ہیں وہ تجھ کو بس کرتے ہیں، کیونکہ تیری متابعت کو سببیت نصر میں ایک بڑا اثر ہے، لیکن پہلے معنی حقیقت کے زیادہ مشابہ اور ظاہر ہیں۔

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت انصار کے بارے میں اتری ہے[3] اور کسی نے کہا ہے کہ سارے مہاجرین و انصار کے بارے میں ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ تینتیس مرد اور چھ عورتیں اسلام لائیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔[4]

شیخ معین الدین جامع البیان میں لکھتے ہیں کہ اس قول پر یہ اعتراض آتا ہے کہ ساری سورت انفال مدنی ہے اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام ہجرت سے پہلے تھا تو یہ بات ٹھیک نہ ہوگی، لیکن خازن و سلیمان جمل نے کہا ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق مدنی سورت میں لکھی گئی۔[5] بعض نے کہا ہے کہ اس کا نزول بیداء میں غزوۂ بدر کے وقت جنگ شروع ہونے سے پہلے ہوا۔[6]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٧) [2] مجموع الفتاویٰ (١/ ٢٩٣) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٨)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٨) تفسير الخازن (٣/ ٤٨) [5] تفسير الخازن (٣/ ٤٨) [6] فتح البيان (٥/ ٢٠٨-٢٠٩)

مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝٦٥ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ
فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا
مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ
وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝٦٦

اے نبی! مومنوں کو جہاد پر اُبھاریں، اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو (کافروں) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں ایک سو (صابر) ہوں تو وہ ہزار (کافر) پر غالب آئیں گے، اس لیے کہ وہ لوگ کچھ بھی سمجھ نہیں رکھتے (65) اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور اس نے جان لیا کہ تمھارے اندر کچھ کمزوری ہے، چناں چہ اگر تم میں ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دوسو (کافروں) پر غالب آئیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایک ہزار (ایسے) ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (66)

قتال کی ترغیب، قلت و کثرت کا تناسب اور نصرت کی بشارت:

یعنی یقین نہیں رکھتے اللہ پر اور ثواب پر، جس کو یقین ہے وہ موت پر دلیر ہے۔ اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنا کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے، تب یہ حکم ہوا کہ اپنے سے دوگنا پر جہاد کریں، یہی حکم اب بھی باقی ہے، لیکن اگر اپنے سے دوگنے سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کے وقت میں ایک ہزار مسلمان اسّی ہزار سے لڑے ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اور مومنوں کو جنگ اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے اور بستیوں سے جنگ کرنے کا شوق دلایا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ ان کو دشمنوں پر غلبہ پانے کے لیے کافی اور مددگار ہیں اور ان کی مدد کریں گے، اگر چہ دشمنوں کی گنتی زیادہ ہو اور مدد ان کی لگاتار چلی آئے اور مسلمان کم ہوں۔

اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ صف بندی کے وقت اور دشمن کے سامنے ہوتے وقت انھیں قتل کرنے پر ابھارتے تھے، جیسے بدر کے دن کیا تھا، جبکہ مشرک اپنی حدود اور تعداد سے سامنے آئے تو آپ ﷺ نے اصحاب سے فرمایا: «قُوْمُوْا إِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ» عمیر بن الحمام نے کہا: ”عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ؟“ فرمایا: ہاں، کہا: ”بَخٍ بَخٍ“ فرمایا: تو نے بخ بخ کس لیے کہا؟ جواب دیا کہ اس امید پر کہا کہ میں اہلِ جنت میں سے ہوں، فرمایا: «إِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا» اس نے آگے بڑھ کر اپنی تلوار کا میان توڑ ڈالا اور کچھ کھجوریں کھانا شروع کیا، پھر باقی

کھجوریں پھینک کر کہا کہ اگر میں اتنا جیا کہ ان کو کھا لوں تو یہ تو ایک لمبی مدت ہے، آگے بڑھ کر قتال کیا، یہاں تک کہ خود قتل ہوا۔[1] رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ.

شانِ نزول:

سعید بن مسیب اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت اتری جب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مکے میں ایمان لائے تھے، زمینِ حبشہ کی طرف ہجرت کے بعد اور مدینے کی طرف ہجرت سے پہلے۔ پھر اللہ پاک نے مومنوں کو یہ بشارت سنائی کہ اگر تم بیس ہو گے اور صابر رہو گے تو دو سو کافروں پر غالب آؤ گے اور اگر ایک سو ہو گے تو ایک ہزار پر بڑھ جاؤ گے، یعنی تمھارا ایک آدمی دشمن کے دس کے مقابلے میں ہو، پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور بشارت باقی رہی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں پر شاق گزری، کیونکہ یہ حکم تھا کہ ایک شخص دس آدمیوں کے سامنے سے نہ بھاگے، پھر تخفیف آئی، اللہ نے گنتی کم کر دی۔ تعداد کی کمی کے مطابق صبر بھی گھٹ گیا، اب سو کو دو سو کے مقابلے سے نہ بھاگنا چاہیے۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ابن مبارک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[2] اب یہ ٹھہرا کہ مسلمانوں کو اپنے سے دوگنے عدد سے فرار زیبا نہیں ہے، اگر دوگنے سے زیادہ ہوں تو پھر ان سے لڑنا واجب نہیں جائز ہے کہ ان کے مقابلے سے الگ ہو جائیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عطا اور عکرمہ رحمہم اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت ہم اصحاب رضی اللہ عنہم کے بارے میں اتری ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ تحریض لغت میں کسی چیز کی رغبت دلانے میں مبالغہ کرنے اور مشکل کام میں سہولت پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر اللہ نے ان کو بشارت دی، ان کے دلوں کو مضبوط کرنے اور ان کو سکون پہنچانے کے لیے کہ وہ اپنے سے دس گنا پر غالب رہیں گے۔ اس جگہ صبر سے مراد قوت و شجاعت ہے، دشمن پر برابری کا دار و مدار صرف عدد کے لحاظ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کی کیفیت پر غور و فکر کرنے سے ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس آیت کے فصاحتِ کلام کے وجوہ لکھے ہیں، اس نئی قسم کو احتباک کہتے ہیں۔

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جماعت مسلمین تھوڑی ہو یا زیادہ، اس پر دس گنے کافر کسی حال میں بھی غالب نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی یہ بات کہے کہ اس کے خلاف بھی واقعہ پایا گیا ہے، یعنی کفار کا ایک گروہ دس گنے مسلمانوں پر غالب ہوا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کچھ آیت کے مفہوم کے خلاف نہیں ہے، اس بات کا احتمال ہے کہ وہ اہلِ اسلام کا گروہ مقابلے کے وقت صبر کی صفت کا حامل نہ ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خبر بمعنی امر ہے، یعنی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٦)

[3] تفسير الطبري (١٤/ ٥٢) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٢٨۔ ١٧٢٩) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٢٧۔ ٤٢٨)

مومنوں کو حکم ہے کہ وہ اپنے سے دس گنا کے مقابلے سے الگ نہ ہوں، بلکہ ثابت قدم رہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بیرونی عوامل اس آیت کے منافی نہیں ہیں، اس لیے کہ مراد مومنین کامل ہیں، اگر نام کے مسلمان دس گنے کا مقابلہ نہ کریں تو وہ اس آیت سے خارج ہیں، زمانۂ خیر قرون کے بعد، خصوصاً جس قدر زمانہ عہدِ نبوت سے دور ہوتا گیا، اسی قدر ایمان اور صبر میں ضعف آتا گیا۔

اگر پچھلے مسلمان پہلے مسلمانوں کی طرح ہوں تو آیت کا مصداق یقیناً اب تک بخوبی موجود ہوسکتا ہے۔ خطیب نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سرایا (لشکر) بھیجتے تھے، غالب یہ تھا کہ وہ سریہ بیس لوگوں سے کم نہ ہوتا اور نہ سو سے زیادہ۔ اسی لیے اللہ نے ان دو اعداد کا ذکر کیا ہے۔ پھر اللہ نے تخفیف کر کے یہ بات واجب کی کہ ایک شخص دو شخص کا مقابلہ کرے۔ سفیان اور ابن شبرمہ نے کہا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم بھی اسی طرح پر ہے[1] کہ اگر دو آدمی ہوں تو ان کو امر و نہی کرے اور اگر تین ہوں تو پھر چھوڑ دینے میں گنجایش ہے۔ یہ جو حکم کیا ہے کہ سو دو سو پر غالب ہوں گے اور ایک ہزار دو ہزار پر اس میں مسلمانوں کو بشارت ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بیس اور سیکڑوں سے تجاوز کر کے ہزاروں تک پہنچے گی۔

پھر صابرین کو اپنی معیت کی بشارت دی۔ اس میں صبر کی ترغیب ہے اور صبر کو لازم پکڑنے کی تاکید ہے اور صبر کرنے کی وصیت ہے اور یہ بات ہے کہ صبر نجات و فلاح اور نصر وظفر کا سب سے بڑا سبب ہے، اس لیے کہ جس کے ساتھ اللہ ہے، کسی کو اس پر غالب ہونے کی قدرت نہیں ہوتی۔ نصر اباذی نے کہا ہے کہ یہ تخفیف امت کے لیے ہے نہ کہ رسول کے لیے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو یوں کہا ہے: "بك أصول وبك أحول"[2] اور جس پر کوئی شے بھاری نہ ہو اس سے کیا تخفیف کی جائے گی۔ بعض اہلِ علم نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ یہ تخفیف منسوخ ہے یا نہیں، لیکن اس اختلاف سے کچھ خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔[3]

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۷ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۶۸ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖۗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۹

کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل)

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٣٢) روح المعاني (١٠/ ٣٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٥٧)

[3] فتح البيان (٥/ ٢١٠۔ ٢١٢)

کرے۔ (مسلمانو!) تم سامانِ دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے 67 اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا 68 پھر جو حلال، پاکیزہ غنیمت تم نے حاصل کی ہے، اس میں سے کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے 69

بدر کے قیدیوں کا معاملہ، صحابہ کے مشورے اور عتابِ الٰہی:

بدر کی لڑائی میں ستر کافر پکڑے گئے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے مشورہ پوچھا کہ ان کو کیا کریں؟ اکثر مسلمانوں کی مرضی ہوئی کہ مال لے کر چھوڑ دیں اور بعضوں کی مرضی ہوئی کہ سب کو قتل کریں۔ سیدنا عمر اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کا یہی مشورہ تھا۔ آخر مال لے کر چھوڑ دیا تو یہ عتاب کی آیت اتری، یعنی نبیوں کو جہاد سے مال سمیٹنا منظور نہیں، بلکہ کافروں کی ضد توڑنی مقصود ہے۔ وہ بات اسی میں ہے کہ قتل کرے، تاکہ قتل کے خوف سے کفر کی ضد چھوڑ دیں۔ پہلے سے لکھی ہوئی بات یہ تھی کہ ان قیدی لوگوں میں بہتوں کی قسمت میں مسلمان ہونا تھا۔ یعنی ڈرتے رہو گے اور کچھ خطا بھی ہو جائے گی تو اللہ بخش دے گا۔ قیدیوں کا حکم سن کر مسلم ڈرے۔ غنیمت سے بھی یہ ان کو تسلی فرما دی کہ وہ اللہ کی عطا ہے، خوشی سے کھاؤ، لیکن غنیمت کے لیے جہاد نہ کرو۔ اب حنفی کے نزدیک یہ ہے کہ اگر کافر پکڑے جائیں تو ان کے مال کو لے کر چھوڑنا ناجائز نہیں اور نہ مفت چھوڑنا کہ پھر کافروں میں جا ملیں، مگر انھیں غلام بنا کر رکھنا یا چھوڑ دینا جائز ہے کہ ملکِ اسلام میں رعیت ہو کر رہیں اور شافعی کے پاس وہ بھی جائز ہے۔ سورت محمد میں فرمایا: ﴿ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ﴾ [محمد: ٤] ''پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے۔''

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے لوگوں سے بدر کے قیدیوں کے متعلق مشورہ لیا اور فرمایا: اللہ نے تم کو ان پر قدرت بخشی ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! ان کی گردنیں مارو۔ آپ ﷺ نے اعراض کیا، پھر دوبارہ ارشاد کیا کہ اے لوگو! اللہ نے تم کو ان پر قابو دیا ہے، یہ کل کے دن تمھارے بھائی تھے، عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر پھر وہی کہا کہ ''اِضْرِبْ أَعْنَاقَهُمْ'' ''ان کی گردنیں ماریں'' آپ ﷺ نے پھر اعراض کیا، پھر وہی سوال دہرایا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول! میری رائے یہ ہے کہ آپ ان کو معاف فرمائیں اور فدیہ قبول کریں، اس پر آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر جو غم تھا وہ دور ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ ... الخ ﴾ (آیتِ باب)[1]

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٢٤٣) اس کی سند میں ''علی بن عاصم'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیح مسلم میں مروی ہے، جیسا کہ اگلی روایت میں اشارہ ہے۔

سورت کے شروع میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث گزر چکی ہے اور صحیح مسلم میں اس کے مانند آیا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بدر کے دن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم قیدیوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ابوبکر نے کہا کہ یہ آپ کی قوم اور لوگ باگ ہیں، آپ ان سے توبہ طلب کریں، شاید اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انھوں نے آپ کو جھٹلایا، مکے سے نکالا، ان کی گردنیں ماریں۔

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ اس وادی میں ہیں، یہاں لکڑی بہت ہے، آگ جلا کر ان کو اس میں ڈال دو۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، کچھ جواب نہ دیا، پھر اٹھ کر اندر چلے گئے، لوگوں نے کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات کو لینا چاہیے، کچھ لوگوں نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل کرنا چاہیے۔ بعض نے کہا کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بات ٹھیک ہے۔ پھر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکل کر فرمایا کہ بے شک اللہ بعض لوگوں کے دل نرم کرتا ہے، یہاں تک کہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہوتے ہیں اور بے شک اللہ بعض لوگوں کے دل سخت کرتا ہے، یہاں تک کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت تر ہوتے ہیں۔ اے ابوبکر! تیری مثال ابراہیم علیہ السلام کی مثل ہے، انھوں نے کہا تھا: ﴿ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [إبراهيم: ٣٦] ”پھر جو میری اتباع کرے، تو یقیناً وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے، تو بلاشبہ تو غفور (اور) رحیم ہے۔“

اور اے ابوبکر! تیری مثال عیسیٰ علیہ السلام کی مثل ہے، انھوں نے کہا تھا: ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [المائدة: ١١٨] ”اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔“ اور اے عمر! تیری مثال موسیٰ علیہ السلام کی ہے کہ انھوں نے کہا تھا: ﴿ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [يونس: ٨٨] ”اے ہمارے رب! ان کے مال و زر غارت کر دے اور ان کے دل سخت کر دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب (نہ) دیکھ لیں۔“ اور عمر تیری مثال نوح علیہ السلام کی سی ہے کہ انھوں نے کہا تھا: ﴿ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] ”اور نوح نے کہا: (اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔“ تم لوگ محتاج ہو، ان قیدیوں میں سے کوئی نہ چھوٹے مگر فدیہ دے کر یا گردن مروا کر۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مگر سہیل بن بیضاء کو کہ وہ اسلام کا ذکر کرتا تھا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، سو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن سے زیادہ کسی دن خوف ناک تر نہ دیکھا، مجھ پر آسمان سے پتھر گریں، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مگر سہیل بن بیضا، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ ﴾

[1] سورة الأنفال [رقم الآية: ٩] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٣)

(آیتِ باب)[1] (رواه أحمد و الترمذي والحاكم وقال صحيح الاسناد ولم يخرجاه)

اسی کے لگ بھگ ابن مردویہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ اس بارے میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب بدر کے دن قیدی قید ہوئے تو عباس کو بھی ایک انصاری نے قید کیا اور قتل کا وعدہ کیا۔ یہ خبر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو فرمایا: میں آج کی رات اپنے چچا عباس کی وجہ سے نہیں سویا، انصار اس کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں ان کے پاس جاؤں؟ فرمایا: ہاں۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر کہا کہ تم عباس کو چھوڑ دو؟ کہا: واللہ! ہم اس کو نہ چھوڑیں گے، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بھلا اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی یہی ہو، کہا: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہے تو تم لے جاؤ۔ جب عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا ہاتھ پکڑا، کہا: اے عباس! مسلمان ہو جاؤ، واللہ! اگر تم مسلمان ہو جاؤ گے تو مجھ کو خطاب کے مسلمان ہونے سے بھی یہ بات زیادہ ترمحبوب تر ہے اور یہ بات میں اس لیے کہتا ہوں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ ان کو تمھارا اسلام لانا بہت پسند آتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آپ کا کنبہ ہے، آپ ان کو چھوڑ دیں۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا تو انھوں نے کہا: ان کو قتل کر دو۔ اس پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا، اللہ نے یہ آیتِ باب اتاری۔[2] (رواه ابن مردويه والحاكم وقال: صحيح الإسناد ولم يخرجاه)

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے بدر کے دن آ کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے اصحاب کو ان قیدیوں کے بارے میں اختیار دو چاہیں فدیہ لیں، چاہیں قتل کریں، آیندہ سال میں ان سے اتنے ہی مقتول ہوں گے۔ انھوں نے کہا: ہم فدیہ لیں گے اور اتنے ہی ہم میں سے مارے جائیں۔[3] (رواه الترمذي والنسائي وابن حبان وهذا حديث غريب جدا) سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن قیدیوں کے بارے میں فرمایا کہ اگر تم چاہو تو ان کو قتل کرو اور اگر چاہو تو فدیہ لو اور تونگر بن جاؤ، لیکن تم میں سے اتنے ہی آدمی شہید ہوں گے۔ سو ان ستر آدمیوں میں سے پچھلے آدمی جو یمامہ کے دن مارے گئے وہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ ہیں۔[4] یہ روایت مرسلاً بھی آئی ہے۔[5]

امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے علم میں سابق ہو چکا تھا کہ اہلِ بدر میں سے کسی ایک کو بھی عذاب نہ

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٤) مستدرك الحاكم (٣/ ٢٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا سماع اپنے والد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٢٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٥٩)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٦٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٢٠٠) صحيح ابن حبان (١١/ ١١٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٤٨۔ ٤٩)

[4] مستدرك الحاكم (٢/ ١٥١) دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ١٣٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٤/ ٦٧)

کرے گا۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور امام عطا رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر اللہ کی کتاب اہلِ بدر کی بخشش کے متعلق سابق نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب آتا۔ اسی طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ام الکتاب میں یہ ہو چکا ہے کہ غنیمتیں اور قیدی تمھیں حلال ہیں، اگر یہ نہ ہو چکتا تو عذاب آتا، ایک جماعت تابعین کا یہی قول ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[2]

غنیمت کا مال کھانے کی اجازت:

صحیحین میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کی شاہد ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ کو پانچ چیزیں ملی ہیں، جو کسی نبی کو نہیں ملیں، ان سب میں سے ایک غنیمتوں کا حلال ہونا ہے۔[3] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ غنیمتیں سیاہ سر والوں کے لیے سوائے ہمارے حلال نہیں ہیں۔[4] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا... الآية ﴾ (آیتِ باب) اس پر انھوں نے قیدیوں سے فدیہ لیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن اہلِ جاہلیت کا فدیہ چار سو مقرر کیے۔[5] (رواه أبو داود)

جمہور کے نزدیک قیدیوں کا حکم:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہی حکم قیدیوں کے بارے میں چلا آ رہا ہے۔ امام کو اختیار ہے چاہے قتل کرے جس طرح بنو قریظہ مارے گئے یا مال کا فدیہ لے کر چھوڑ دے، جس طرح کہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ کیا گیا یا ان مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا جو قید میں آ گئے تھے۔ چنانچہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو عورتیں جو سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے پاس قید تھیں، واپس کر کے ان کے عوض دو مسلمانوں کو، جو مشرکوں کے پاس تھے، واپس لیے[6] اور اگر امام چاہے تو قیدیوں کو غلام بنا کر رکھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور علما کے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے اور اس مسئلے میں ائمہ کے درمیان اور اختلاف بھی ہے جو کتبِ فقہ میں دیا گیا ہے۔[7]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اس آیت میں احکامِ جہاد میں سے ایک دوسرے حکم کا بیان ہے۔ اسریٰ اسیر کی جمع

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣٠) تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٣٥)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٣٤) تفسير الطبري (١٤/ ٧٠۔ ٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥١٩٦)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩١) اس کی سند میں "ابو العنبس" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٤٤)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٥) [7] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣٠)

ہے، اساری بھی جمع ہے۔ اسیر اس کو کہتے ہیں جس کی رسی یا تسمہ وغیرہ سے مشکیں باندھی جائیں۔ ابو عمرو بن العلا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسریٰ وہ قیدی ہیں جو باندھے نہ جائیں اور اساری وہ قیدی ہیں جو باندھے جائیں۔[1] اِثخان کثرتِ قتل کو کہتے ہیں، مبالغہ کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ فقط کفار کو قید کر لے، بلکہ خوب سے خون ریزی کرے اور زمین پر خون بہائے۔

اللہ نے خبر دی کہ بدر کے دن مشرکوں کا قتل کرنا قید کرنے اور فدیہ لے کر چھوڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے۔ پھر جب مسلمان کثرت سے ہو گئے تو اللہ پاک نے رخصت دی اور فرمایا: ﴿ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ﴾ [محمد: ٤] ''پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے۔'' جس طرح کہ سورت محمد میں آیا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس حکم کو زائل کرتی ہے جو آیتِ باب میں ہے، حالانکہ یہ بات نہیں ہے، بلکہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کے موافق ہیں اور دونوں اس بات پر دلیل ہیں کہ پہلے اثخان کرے (اچھی طرح خون بہائے) پھر پکڑنے کے بعد فدیہ لے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ پہلے خون ریزی کرے کہ اس سے اسلام کو قوت اور عزت حاصل ہوتی ہے اور سورۂ قتال (محمد) میں جو اختیار دیا ہے اس کا مقام کثرتِ قتال کے ساتھ اسلام کی شوکت و عظمت کے ظہور کے بعد ہے۔ اس صورت میں دونوں آیتوں کے درمیان کچھ تعارض (تصادم) نہیں ہے۔

پھر اصحابِ پیغمبر کو خطاب فرمایا کہ تم دنیا کے فائدے کا ارادہ کرتے ہو، یعنی وہ فدیہ جو تم نے قیدیوں سے لیا۔ فدیہ کا نام عرض رکھا، اس لیے کہ جلدی زوال پذیر ہونے والا ہے جس طرح کہ اعراض جواہر کے مقابلے میں زائل ہو جاتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے بدر کے دن چار ہزار درہم لے کر ان کو چھوڑ دیا۔[3] ہر اسیر کا فدیہ چالیس اوقیہ تھا۔ اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، اس کا میزان ایک ہزار چھے سو درہم ہوئے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ عرض سے مراد خراج ہے۔[4]

پھر مفسرین نے اختلاف کیا ہے کہ اس کتاب سے جو سابق ہو چکی، کیا مراد ہے؟ کسی نے کہا: سابق فی علم اللہ ہے، یعنی اس امت کے ہاتھ غنیمتیں اور قیدی آئیں گے جو پہلی تمام امتوں پر حرام تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ اہلِ بدر کی مغفرت مراد ہے کہ ان کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کیے گئے، جس طرح کہ صحیح حدیث میں آیا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ عَلٰى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ، فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ »[5] کسی نے کہا یہ مراد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے ہم ان کو عذاب نہ کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [الأنفال: ٣٣] ''اور (اے نبی!) اللہ ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ آپ بھی ان کے درمیان (موجود) ہوں۔''

---

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٤٥) [2] تفسير الرازي (١٥/ ١٦١) [3] تفسير الطبري (١٤/ ٦٠)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٣٣) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)

بعض نے کہا ہے کہ اللہ کسی کو ایسے گناہ کے عوض عذاب نہیں کرتا جو اس نے ازراہِ جہالت (لاعلمی) کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ مراد اللہ کا فیصلہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے بچنے والوں کے صغیرہ گناہ مٹا دیتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ کسی کو عذاب نہیں کرتا مگر حجت قائم کرنے اور منع کرنے کے بعد کرنے والے کو اور اس سے پہلے اس بات کی ممانعت نہیں کی تھی (فدیہ لینے کی) یہ سب چھے اقوال ہوئے۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ سب معانی اس لفظ کے تحت شامل ہیں اور لفظ ان سب کے لیے عام اور شامل ہے۔[1]

یہ فرمانا کہ اگر کتاب سابق نہ ہو چکی ہوتی تو تم کو عذابِ عظیم پہنچتا، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب ہے کہ زیادہ صحیح چیز کو ترک کیا، اس لیے کہ زیادہ صحیح یہ تھا کہ قتل کی کثرت سے ان کا تدارک کرتے اور فدیہ نہ لیتے، یہ عتاب کچھ حرام کام کرنے پر نہ تھا، اس لیے کہ جنابِ نبوت اس سے منزہ ہیں۔ پھر اس عتاب کے بعد غنیمتوں کے حلال ہونے کا ذکر فرمایا اور کہا کہ غنیمت حلال طیب ہے، تم اس کو خوشی سے کھاؤ۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: «لَمْ تُحَلَّ الْغَنَائِمُ لِأَحَدٍ قَبْلَنَا، ثُمَّ أَحَلَّ اللّٰهُ لَنَا، وَذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى رَاٰى ضُعْفَنَا وَعَجْزَنَا فَأَحَلَّهَا لَنَا»[2] (رواه الشيخان)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝70 وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝71

اے نبی! جو قیدی تمھارے ہاتھوں گرفتار ہیں، آپ ان سے کہہ دیں: اگر اللہ تمھارے دلوں میں بھلائی جان لے گا تو تمھیں اس (فدیے) سے کہیں بہتر عطا کرے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (70) اور (اے نبی!) اگر وہ آپ سے خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ پہلے ہی اللہ سے خیانت کر چکے ہیں، پھر اس نے انھیں تمھارے قبضے میں دے دیا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (71)

قیدیوں کے ساتھ، ان میں اچھائی کی صورت میں، نعم البدل کا وعدہ:

پہلے اللہ سے اس کے حکم کا کفر اور انکار کر کے دغا کر چکے ہیں۔ یا یہ بعض ہاشمیوں کو فرمایا ہو کہ ابوطالب کی زندگی میں سب عہد کر کے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے پر متفق ہوئے تھے اور اب کافروں کے ساتھ ہو کر آئے اور یہ

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٧٠_ ٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٧) فتح البيان (٥/ ٢١٣_ ٢١٦)

وعدہ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا۔ جو مسلمان ہو کر آئے اللہ نے ان کو بے شمار دولت بخشی اور جو مسلمان نہ ہوئے وہ خراب ہو کر تباہ ہو گئے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ بنو ہاشم کے کچھ لوگ زبردستی نکالے گئے ہیں، ان کو ہم سے لڑنے کی کچھ حاجت نہیں تو جس کسی کو تم ان میں سے ملو تو اس کو قتل نہ کرو اور جس کو ابو البختری بن ہشام ملے وہ اس کو جان سے نہ مارے اور جو عباس بن عبدالمطلب کو پائے وہ ان کو قتل نہ کرے کہ وہ زبردستی نکالے گئے ہیں۔ ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہم اپنے باپ، بھائی، بیٹوں اور کنبے کو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں، واللہ! اگر میں اس کو ملوں گا تو تلوار کو اس کی لگام کروں گا۔ یہ بات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابوحفص! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا دن تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس کنیت سے یاد فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا منہ تلوار سے مضروب ہو گا؟ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ اگر حکم دیں تو میں اس کی گردن اڑا دوں، واللہ! وہ منافق ہو گیا ہے۔ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ بعد اس کے کہتے تھے: واللہ! میں امن میں نہیں ہوں، اس کلمے کی وجہ سے جو میں نے کہا تھا اور میں ہمیشہ اس سے خائف رہتا ہوں، مگر یہ کہ اللہ اس کو مجھ سے دور کر دے، یعنی مجھے شہادت دے کر معاف کر دے۔ وہ یمامہ میں شہید ہو گئے۔[1] رضي الله عنه.

میں کہتا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس قوتِ ایمانی کو دیکھنا چاہیے کہ حالتِ جنگ میں جو ایک بات منہ سے نکل گئی جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے خلاف تھی، حالانکہ اس کا ارتکاب بھی نہ ہوا، وہ اللہ سے اس قدر خائف رہے کہ اس کا کفارہ اپنی شہادت ٹھہرائی۔ ایک وہ حال تھا اور ایک یہ حال کہ اہلِ رائے بمقابلہ اقوالِ آحادِ امت جنابِ رسالت کی سنتِ صحیحہ کو دیدہ و دانستہ کمال جرأت سے ترک کر کے صریح طور پر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں اور اہلِ سنن کے حق میں جو کچھ زبان پر آتا ہے جاری فرماتے ہیں اور ابھی تک نفاق سے بری ہیں اور مومن کامل ہیں! کفارہ کا کیا ذکر ہے، اس حال پر اللہ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں، فسبحان الله وبحمده. شاید ان کے نزدیک یہ آیت قرآن مجید میں نہیں آئی ہے: ﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [النور: ٦٣] ”جو لوگ اس (اللہ اور اس کے رسول) کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اس (بات) سے ڈریں کہ انھیں کوئی آزمائش آ پڑے یا انھیں دردناک عذاب آ لے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے عم مکرم عباس رضی اللہ عنہ کے لیے تڑپ اور ان کا فدیہ اور اسلام:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن شام کی اور اس وقت قیدی محبوس

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ١٤٠۔ ١٤١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

تھے۔ آپ ﷺ اول رات کو جاگتے رہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ آپ ﷺ کیوں نہیں سوتے؟ عباس رضی اللہ عنہ کو ایک انصاری شخص نے گرفتار کیا تھا۔ کہا: میں نے قید میں عباس کی آواز سنی، ان کو کھول دو، جب عباس خاموش ہوئے تب آپ ﷺ سوئے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بدر کے دن اکثر قیدی عباس کے فدای تھے (ان کا فدیہ عباس رضی اللہ عنہ نے دیا)، یہ اس لیے کہ عباس ایک آسودہ حال شخص تھے، اپنی جان کی طرف سے ایک سو اوقیے سونے کے دیے۔[1]

صحیح بخاری میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ کچھ انصاریوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ چھوڑ دیں؟ فرمایا: لا واللہ! تم ان سے ایک درہم بھی نہ چھوڑو۔[2]

امام زہری رحمہ اللہ ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں کہ قریش نے اپنے قیدیوں کا فدیہ دینے کے لے روپیہ بھیجا۔ ہر قوم نے اپنے قیدی کو حسبِ مرضی فدیہ دے کر چھڑایا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں پہلے ہی مسلمان تھا۔ فرمایا: اپنے اسلام کا اعلام کرو۔ اگر بات یہی ہے جو تم کہتے ہو تو اللہ تم کو جزا دے گا۔

رہا ظاہر حال سو وہ ہم پر لازم ہے، تم اپنی طرف کا فدیہ دو اور اپنے دونوں برادر زادوں کا نوفل بن حارث بن عبدالمطلب اور عقیل بن ابی طالب اور اپنے حلیف کا فدیہ دو، یعنی عتبہ بن عمر برادرِ بنی حارث بن فہر کا۔ کہا: اے اللہ کے رسول! میرے پاس اتنا مال کہاں ہے؟ فرمایا: وہ مال جو تم نے اور اُم الفضل نے دفن کیا، کہاں ہے؟ تم نے ام الفضل سے کہا تھا کہ اگر میں اس سفر میں مارا جاؤں تو یہ مدفون مال اولادِ فضل و عبداللہ و قثم کے لیے ہے۔ کہا: واللہ! اے اللہ کے رسول! میں جانتا ہوں کہ تم اللہ کے رسول ہو، یہ وہ بات ہے جس کو سوائے میرے اور ام الفضل کے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اب اللہ کے رسول آپ وہ بیس اوقیے جو آپ نے میرے مال میں سے لیے ہیں، وہ حساب میں سے مجرا کر دیں، فرمایا: یہ نہیں ہوگا، وہ تو ہم کو اللہ نے تم سے دلوائے ہیں۔ اس پر عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف کا اور ہر دو برادر زادہ اور حلیف کی طرف کا فدیہ دیا۔ اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ إلى قوله غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (آیتِ باب) عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ نے مجھ کو بیس اوقیہ کی جگہ اسلام میں بیس غلام دیے، جن کے ہاتھ میں مال ہے، جس کا وہ لین دین کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھ کو اللہ سے بخشش کی امید ہے۔ اسی روایت کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[3]

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آیت میرے ہی بارے میں اتری ہے۔ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو اپنے اسلام کی خبر دی اور کہا کہ بیس اوقیے جو مجھ سے لیے ہیں وہ حساب میں رکھیں۔ نبیِ اکرم ﷺ نے نہ مانا، اللہ نے اس کے بدلے میں مجھے بیس غلام دیے ہیں جو سب کے سب تاجر ہیں، میرا مال ان کے ہاتھ میں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ١٤١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٩٣) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣١)

نے کہا کہ اسریٰ سے مراد عباس اور ان کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا: ہم ایمان لائے، اُس پر جو آپ اللہ کے پاس سے لائے ہیں اور گواہی دیتے ہیں ہم کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، ہم آپ کے خیر خواہ رہیں گے اپنی قوم پر۔ اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ ﴾ (آیتِ باب) یعنی بصورتِ ایمان و تصدیق تم کو اس سے بہتر بدلہ دے گا، جو تم سے لیا گیا ہے اور جس شرک پر اب تک تم تھے، وہ بخش دے گا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں دوست نہیں رکھتا کہ یہ آیت ہمارے حق میں نہ اترتی اور ہم کو ساری دنیا مل جاتی، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ ﴾ سو اللہ نے جو ہم سے لیا تھا اس سے سو گنا بہتر ہم کو دیا اور ﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ﴾ فرمایا۔ مجھے امید ہے کہ مجھ کو بخش بھی دیا ہو گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عباس رضی اللہ عنہ بدر کے دن قید ہو گئے۔ چالیس اوقیے سونے کے دے کر چھوٹے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت پڑھی تو کہا: اللہ نے مجھے دو خصلتیں دیں، میں نہیں جانتا کہ ان کے عوض میرے لیے ساری دنیا ہو۔ میں بدر کے دن قید ہو گیا، چالیس اوقیے دے کر میں نے اپنی جان چھڑائی۔ اللہ نے مجھ کو چالیس غلام دیے، اب میں بخشش کا امیدوار ہوں، جس کا اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔

بحرین کے مال کی تقسیم:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ہم سے یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس جب بحرین کا اسّی ہزار مال آیا۔ آپ ﷺ نمازِ ظہر کے لیے وضو کر چکے تھے تو نہ کسی ہتھیار بند کو دیا اور اس دن کسی سائل کو محروم نہ رکھا، یہاں تک کہ سارا مال تقسیم کر دیا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم بھی لو لپ بھر بھر کر! عباس رضی اللہ عنہ کہتے تھے: "هٰذَا خَيْرٌ مِمَّا أُخِذَ مِنَّا، وَأَرْجُو الْمَغْفِرَةَ"[1] حمید بن ہلال کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابن حضرمی نے بحرین سے اسّی ہزار بھیجے، نبیِ اکرم ﷺ کے پاس اس سے زیادہ مال نہ آیا تھا نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ ایک چٹائی پر پھیلا دیا، اذان برائے نماز ہوئی، نبیِ اکرم ﷺ آئے اور اس مال پر کھڑے ہوئے اور مسجد والے بھی آئے، اس دن نہ گنتی تھی نہ تول، یہی لپ بھر کر لینا تھا۔

عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آئے، ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے، اس میں لپ بھر بھر کر لیا، پھر اٹھ کر جانے لگے تو اس کو اٹھا نہ سکے، تب سر اٹھا کر نبیِ اکرم ﷺ کی طرف دیکھا اور کہا: اے اللہ کے رسول! اس کو اٹھوا دو، آپ ﷺ مسکرائے، یہاں تک کہ دندان مبارک نظر آئے اور فرمایا، ایک حصۂ مال شمار کر کے لو، جتنا تم سے اٹھ سکے، انھوں نے ایسا ہی کیا۔ عباس رضی اللہ عنہ جب چلے گئے تو کہتے جاتے تھے: "أَمَّا إِحْدَى اللَّتَيْنِ وَعَدَنَا اللّٰهُ فَقَدْ أَنْجَزَنَا، وَمَا نَدْرِي مَا يَصْنَعُ

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٧٣۔ ٧٤)

فِي الْأُخْرىٰ" پھر کہا: "هٰذَا خَيْرٌ مِمَّا أُخِذَ مِنَّا وَمَا أَدْرِي مَا يَصْنَعُ اللّٰهُ فِي الْأُخْرىٰ" غرض کہ نبیِ اکرم ﷺ مال پر متوجہ رہے، یہاں تک کہ اس میں سے ایک درہم بھی باقی نہ رہا اور اپنے گھر والوں کو ایک درہم بھی نہ دیا، پھر آ کر نماز پڑھی۔[1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس بحرین کا مال آیا، فرمایا: میری مسجد میں پھیلا دو۔ سب سے زیادہ یہی مال آپ ﷺ کے پاس آیا تھا۔ پھر نماز کے لیے نکلے، لوگوں کی طرف کچھ توجہ نہ کی، جب نماز پڑھ چکے تو بیٹھے، جس کو دیکھا اس کو دیا، اتنے میں عباس رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا کہ مجھے بھی دیں، میں نے اپنی اور عقیل کی طرف کا فدیہ دیا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: لو۔ انھوں نے لپ بھر کر اپنے کپڑے میں لیا، پھر اس کو اٹھانے لگے، لیکن وہ اٹھ نہ سکا۔ کہا: کسی کو حکم دیں کہ اس کو اٹھوائے، فرمایا: نہیں، کہا: آپ ہی اٹھا دیں، فرمایا: نہیں، تب اس میں سے گرا کر اپنے کندھے پر لاد کر چلے۔ نبیِ اکرم ﷺ ان کی طرف دیکھتے رہے، یہاں تک کہ چھپ گئے، ان کی حرص سے تعجب فرماتے تھے۔ جب آپ ﷺ وہاں سے اٹھے تو ایک درہم بھی وہاں باقی نہ تھا۔[2] (رواہ البيهقي وقد رواه البخاري في مواضع من صحيحه تعليقا بصيغة الجزم)

مالی اور ایمانی خیانت:

پھر اللہ نے کہا کہ اگر یہ لوگ تجھ سے خیانت کریں تو اس سے پہلے یہ اللہ کی خیانت کر چکے ہیں، یعنی کفر کے ساتھ۔ اس لیے اللہ نے آپ کو ان پر قابو دیا، وہ گرفتار ہو گئے، اللہ ان کے افعال کو جانتا ہے، حکیم و دانا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں اتری ہے جو کاتب تھا، جب کہ وہ مرتد ہو کر مشرکین میں جا ملا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ عباس اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہے، جبکہ انھوں نے یہ بات کہی تھی: "لَنَنْصَحَنَّ لَكَ عَلٰى قَوْمِنَا" مگر امام سدی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر عموم میں کی ہے، یہ تفسیر اشمل واظہر ہے۔ واللہ أعلم۔[4] (قاله ابن كثير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس جگہ خیر سے مراد حسنِ ایمان، صلاحِ نیت اور خلوصِ طویت ہے۔ اور ماخوذ سے مراد فدیہ ہے، یعنی اللہ اگر تم میں بھلائی دیکھے گا تو اس فدیے کے عوض دنیا ہی میں اس سے بہتر رزق دے گا جو تمھارے لیے سب سے زیادہ نفع دینے والا ہو گا یا آخرت میں تمھارے لیے اعمالِ صالحہ کا ثواب لکھے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب اہلِ مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو

---

[1] مستدرك الحاكم (٣/ ٣٧٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٤٥٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٣٧۔ ١٧٣٨) [4] تفسير الطبري (٢/ ٤٣٣)

زینب بنتِ رسول اللہ ﷺ نے ابو العاص کے فدیے میں ایک قلادہ بھیجا، جب نبی اکرم ﷺ نے اس قلادہ کو دیکھا تو آپ پر سخت رقت طاری ہوگئی اور کہا: اگر تمھاری رائے ہو تو میں اس اسیر کو چھوڑ دوں۔[1] (رواه الحاكم وصححه والبيهقي)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰي يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰي قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٧٢﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجروں کو اپنے ہاں) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو لوگ ایمان لے آئے، مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں، حتی کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ تم سے دین (کے معاملے) میں مدد مانگیں تو تم پر مدد لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف نہیں کہ جن کے اور تمھارے درمیان کوئی معاہدہ ہو، اور تم جو کام کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے ﴿72﴾

مہاجرین و انصار کا باہمی رشتہ اور قربانیاں:

نبیِ اکرم ﷺ کے اصحاب دو قسم کے تھے: مہاجر اور انصار۔ مہاجر گھر چھوڑنے والے اور انصار جگہ دینے والے اور مدد کرنے والے، یعنی جتنے مسلمان نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ حاضر ہیں، ان سب کی صلح اور جنگ ایک ہے۔ ایک کا موافق سب کا موافق اور ایک کا مخالف سب کا مخالف اور جو مسلمان اپنے ملک میں ہیں جہاں کافروں کا زور ہے، ان کی صلح و جنگ میں یہاں والے شریک نہیں۔ اگر ان کا صلحی (جن سے ان کا عہد و پیمان ہو) ان سے لڑے تو یہ مدد نہ کریں اگر ان کے صلحی پر قابو پائیں تو درگزر نہ کریں اور اگر اجنبی ان پر ظلم کرے اور مدد چاہیں تو مدد کریں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے مومنین کے اقسام بیان فرمائے ایک وہ لوگ ہیں جو اپنا گھر بار مال متاع چھوڑ کر اللہ اور رسول کی مدد کو نکلے، دین کو قائم کیا، اس کام میں مال و جان جھونک دیا، مکے سے نکل کر مدینے میں آ رہے[2] ع

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩٢) مستدرك الحاكم (٣/ ٣٦٦) سنن البيهقي الكبرىٰ (٦/ ٣٢٢) فتح البيان (٥/ ٢١٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٥/ ٤٣)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣٣)

طُوبىٰ لِقَومٍ هَاجَرُوا وَتَوَطَّنُوا تِلْكَ الدِّيَارَ مُعَاوِنُ الْإِيمَان

''اس قوم کے لیے خوش خبری ہے جس نے ہجرت کی اور ان دیار کو اپنا وطن بنایا، وہ ایمان کے معاون ہیں۔''

دوسرے وہ لوگ ہیں جو اہلِ مدینہ ہیں، انھوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو جگہ دی، اپنے گھروں میں رکھا، مال و منال سے اللہ اور رسول کی دلجوئی کی، انصار ہوئے، دشمنوں سے لڑے بھڑے۔ سو بعض ان کے بعض کے رفیق اور دوست ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ حق رکھتا ہے۔ ہر ایک سے اس لیے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری ایک دوسرے کے بھائی ٹھہرے تھے، اس وجہ سے ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ یہ وراثت قرابت پر مقدم تھی، یہاں تک کہ اللہ نے اس حکم کو وراثت کی آیت سے منسوخ فرمایا۔ یہ بات صحیح بخاری میں بروایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آئی ہے۔[1] امام مجاہد، عکرمہ، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ اور بہت سے لوگ اسی کے قائل ہیں۔[2]

جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «اَلْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَالطُّلَقَاءُ مِنْ قُرَيْشٍ وَالْعُتَقَاءُ مِنْ ثَقِيفٍ، أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ»[3] (رواه أحمد وتفرد به) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «اَلْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ وَالطُّلَقَاءُ مِنْ قُرَيْشٍ وَالْعُتَقَاءُ مِنْ ثَقِيفٍ، أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ»[4] (رواه أبو يعلىٰ)

انصار و مہاجرین کے فضائل:

اللہ اور رسول نے بہت سی آیات و احادیث میں مہاجرین اور انصار کی تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [التوبة: ١٠٠] ''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبولِ اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے، اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١١٧] ''یقیناً اللہ نے نبی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧٠) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٧٩۔ ٨٠)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٣٦)

[4] مسند أبي يعلىٰ (٨/ ٤٤٦) اس کی سند میں ''عکرمہ بن ابراہیم'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی، جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ۸۔ ۹] ”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے، جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔ اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو اُن کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے، جو اُن (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو۔“

دلوں میں تنگی نہ رکھنے کی بہترین تفسیر میں سب سے بہتر قول یہ ہے: ”لَا يَجِدُوْنَ عَلٰى فَضْلِ مَّا أَعْطَاهُمُ اللّٰهُ عَلٰى هِجْرَتِهِمْ“ کیونکہ آیات کا ظاہر مہاجرین کو انصار پر مقدم رکھتا ہے اور یہ بات علما کے درمیان مجمع علیہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اسی لیے بزار رحمہ اللہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت اور نصرت کے درمیان اختیار دیا، میں نے ہجرت اختیار کی، پھر بزار رحمہ اللہ نے کہا: ”لا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْهِ“[1]

ہجرت نہ کرنے والوں کی ولاء:

تیسرے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ہجرت نہ کی بلکہ اپنے جنگلوں میں رہے، سو ان کا کوئی حصہ غنیمتوں میں نہیں ہے اور نہ خمس میں، مگر جس لڑائی میں کہ حاضر ہوں، جس طرح کہ ایک طویل مرفوع حدیث میں بریدہ بن خصیب اسلمی رضی اللہ عنہ سے آیا ہے: ”اُدْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَجَابُوْكَ فَأَقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلٰى دَارِ الْمُهَاجِرِيْنَ، وَأَعْلِمْهُمْ إِنْ فَعَلُوْا ذٰلِكَ أَنَّ لَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِيْنَ، وَأَنَّ عَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِيْنَ، فَإِنْ أَبَوْا وَاخْتَارُوْا دَارَهُمْ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِيْنَ، يَجْرِيْ عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللّٰهِ الَّذِيْ يَجْرِيْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ، وَلَا يَكُوْنُ لَهُمْ فِي الْفَيْئِ وَالْغَنِيْمَةِ نَصِيْبٌ إِلَّا أَنْ يُّجَاهِدُوْا مَعَ الْمُسْلِمِيْنَ الحديث“[2] (انفرد به مسلم)

---

[1] مسند البزار (۷/ ۳۳۷) اس کی سند میں ”علی بن زید“ ضعیف راوی ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۳۱) مسند أحمد (۵/ ۳۵۲)

غیر مہاجر کی مدد اور معاہدے کی پاسداری:

پھر اللہ نے یہ فرمایا کہ اگر یہ اعراب غیر مہاجر قتالِ دین پر تم سے مدد مانگیں اپنے دشمن پر تو تم ان کی مدد کرو کہ یہ مدد کرنا تم پر واجب ہے، کیونکہ وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔ ہاں اگر ایسے کفار پر مدد چاہیں جن سے تم سے ایک مدت تک کے لیے صلح کا معاہدہ ہے تو تم ان کی صلح نہ توڑو اور اپنے معاہدے سے نہ پھرو، یہ معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اس سورت کو ذکرِ موالات پر ختم کیا ہے، تا کہ ہر فریق اپنے دوستدار کو پہچان لے۔ ان کا نام مہاجر رکھا، اس لیے کہ سنہ چھے سے پہلے سالِ حدیبیہ میں انھوں نے ہجرت کی تھی۔ اس کی دلیل آیتِ باب سے بعد والی آیت ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا ﴾ [الأنفال: ٧٥] ''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی۔'' یہ ہجرت حدیبیہ کے سال کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے تھی۔

پھر انصار کا ذکر کیا اور فرمایا کہ وہ مدد و معاونت یا میراث میں ایک دوسرے کے رفیق اور ولی ہیں، لیکن میراث کا حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا: ﴿ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ ﴾ [الأنفال: ٧٥] ''اور (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔'' پھر کہا کہ جو لوگ مکے میں رہے اور انھوں نے ہجرت نہ کی ان کا تم سے نصرت اور میراث کا کچھ واسطہ نہیں، مگر اس صورت میں کہ ہجرت اختیار کریں۔ ہاں اگر وہ تم سے مشرکین پر طالبِ نصرت ہوں تو تم کو ان کی مدد کرنا واجب ہے۔ ان کفار سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے ساتھ تمھارا صلح کا عہد و پیمان ہو چکا ہے کہ اس کو توڑنا نہ چاہیے۔ اللہ تمھارے اعمال کا بصیر ہے، وہ دیکھتا ہے کہ شرع کی حد سے کون تجاوز کرتا ہے۔[2]

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ
فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝ۭ73

اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (اے مسلمانو!) اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا (73)

کافر ایک دوسرے کے دوست ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ نہیں:

یعنی تمھاری دشمنی میں کافر آپس میں ایک ہیں، جہاں پائیں گے ضعیف مسلمانوں کو ستائیں گے۔ سو تم مسلمانوں کو سنا دو کہ جو ہمارے پاس ہو اس کا ذمہ ہمارا ہے اور جو اپنے گھر رہے وہ جس طرح جانے سمجھ لے۔ اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٨٣) [2] فتح البيان (٥/ ٢١٩۔ ٢٢٠)

نے جب مومنین کی باہم دوستی اور رفاقت کا ذکر کیا تو مومنوں اور کفار کے درمیان دوستی ختم کرنے کا ذکر بھی فرمایا۔ سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: «لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ، وَلَا يَرِثُ مُسْلِمٌ كَافِراً، وَلَا كَافِرٌ مُسْلِماً» پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت باب پڑھی۔[1] (رواه الحاكم وقال: صحيح الإسناد ولم يخرجاه)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیحین میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے رفعاً یوں آئی ہے: «لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ كَافِراً وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ»[2] مسند وسنن میں ان الفاظ سے مروی ہے: «لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتّٰى»[3] (رواه الترمذي عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده وقال: حسن صحيح) امام زہری رحمہ اللہ کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: «أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَخَذَ عَلٰى رَجُلٍ دَخَلَ فِي الْإِسْلَامِ فَقَالَ: تُقِيْمُ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وأَنَّكَ لَا تَرىٰ نَارَ مُشْرِكٍ إِلَّا وَأَنْتَ لَهُ حَرْبٌ»[4] (رواه ابن جرير وهذا مرسل من هذا الوجه وقد روي متصلا من وجه آخر) عن رسول اللّٰه ﷺ أنه قال: «إِنَّمَا أَنَا بَرِيْءٌ مِّنْ كُلِّ مُسْلِمٍ بَيْنَ ظَهْرَانِي الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ قَالَ لَا تَتَرَا آى نَارَاهُمَا»[5]

ابو داود میں کتاب الجہاد کے آخر میں سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے: «أَمَّا بَعْدُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ»[6] امام ابو حاتم مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «إِذَا أَتَاكُمْ مَّا تَرْضَوْنَ دِيْنَهُ وَخُلُقَهُ فَانْكِحُوْهُ إِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ الحديث»[7] (أخرجه ابن مردويه وأبو داود والترمذي بنحوه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «إِذَا أَتَاكُمْ مَّنْ تَرْضَوْنَ خُلُقَهُ وَدِيْنَهُ فَزَوِّجُوْهُ إِلَّا تَفْعَلُوْا... الخ»[8] (رواه الترمذي)

مطلب یہ ٹھہرا کہ اگر تم مشرکوں سے الگ نہ رہو گے اور مومنین کے دوست دار نہ بنو گے تو لوگوں میں فتنہ برپا

---

① مستدرك الحاكم (٢/ ٢٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦١٣)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٤)

③ مسند أحمد (٢/ ١٩٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩١١) امام ترمذی رحمہ اللہ نے سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کرنے کے بعد عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما والی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٠٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦١٤)

④ تفسير الطبري (١٤/ ٨٢۔ ٨٣) یہ روایت مرسل ہے۔

⑤ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٠٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٨٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤٦١)

⑥ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٣٠)

⑦ المراسيل لأبي داود (٢٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٠)

⑧ سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٠)

ہوگا۔ فتنہ سے مراد دینی معاملے میں شکوک وشبہات پیدا ہونا اور مومنین کا کافروں کے ساتھ اختلاط (میل جول) ہے۔ اس سے ایک ایسا فساد پیدا ہوگا جو چاروں طرف پھیل جائے گا۔[1]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ بعض کافر بعض کے دوست دار اور مددگار اور وارث ہوتے ہیں، اس میں اس بات کا اظہار ہے کہ مومن کافروں کے ساتھ اس قسم کی دوستی اور نصرت نہیں کرتے۔ پھر فرمایا کہ اگر تم مومنین کی نصرت نہ کرو گے اور کافروں کے ساتھ دوستی کو ترک نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور دین میں ایک بڑا فساد قائم ہوگا، یعنی کفار طاقتور ہوں گے اور مسلمین کمزور ہو جائیں گے۔[2]

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝74 وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝75

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے (74) اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ (مل کر) جہاد کیا تو وہ بھی تمھی میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (75)

سچے مومن:

یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سردار کے ساتھ والے مسلمان گھر بیٹھنے والے مسلمانوں سے اعلیٰ ہیں اور آخرت میں ان کو بخشش زیادہ اور دنیا میں باعزت روزی یعنی غنیمت ملے گی اور بھی ان کا حق ہے۔ مہاجرین میں جتنے ملتے جائیں، سب شریک ہیں اور ناتے والا اگرچہ بعد میں مسلمان ہوا یا ہجرت کر کے آیا، پہلے ناتے والے مسلمان مہاجر کا حقدار ہے، یعنی میراث وہی لے گا، اگرچہ پرانا ساتھ اوروں سے ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے مومنین کے لیے دنیا کا حکم بیان کیا تو ان کی آخرت کا حال بھی بیان کیا اور ان کی حقیقتِ ایمان کی خبر دی، جیسے سورت کے شروع میں گزر چکا ہے اور یہ وعدہ کیا کہ اللہ ان کو بخش دے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۳۴۔ ۴۳۵) [2] فتح البیان (۵/ ۲۲۰)

گا اور ان کے گناہوں سے تجاوز (درگزر) کرے گا اور رزقِ کریم دے گا، یعنی ایسا رزق جو حسن ہو، کثیر، طیب، شریف، دائمی، ہمیشہ رہنے والا، غیر منقطع اور نہ ختم ہونے والا ہوگا۔ جس میں حسن اور تنوع (طرح طرح کی حسین قسمیں) کی وجہ سے نہ سآمت ہو نہ ملامت، یعنی اس سے نہ اکتاہٹ ہو اور نہ ملال۔ لفظ کریم سے رزق کی ساری اوصاف مراد ہیں۔

سچے مومنوں کے پیروکاروں کا درجہ:

پھر یہ ذکر کیا کہ جو لوگ دنیا میں ان کے تابع ہوئے ایمان اور عملِ صالح میں، وہ آخرت میں ان کے ساتھ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٠٠] ''اور (قبولِ اسلام میں) سبقت کرنے والے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحشر: ١٠] ''اور (فے ان کے لیے ہے) جو اُن (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

متفق علیہ حدیث بلکہ متواتر حدیث میں طرقِ صحیحہ سے مرفوعاً فرمایا ہے: ''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ''[1] اور دوسری حدیث میں ہے: ''مَنْ أَحَبَّ قَوْماً فَهُوَ مِنْهُمْ''[2] ایک روایت میں یوں ہے: ''حُشِرَ مِنْهُمْ''[3] امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ جریر رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلْمُهَاجِرُوْنَ وَالْأَنْصَارُ أَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ وَالطُّلَقَاءُ مِنْ قُرَيْشٍ، وَالْعُتَقَاءُ مِنْ ثَقِيْفٍ، بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ »[4]

رشتے داروں کی وراثت:

کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم ہے۔ اولوالارحام سے بالخصوص وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن پر فرائض کے عالم اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں، یعنی وہ قرابت جن کے لیے نہ فرض ہے نہ عصبہ (باپ کی طرف کا مرد رشتے دار)، جیسے خالہ، ماموں، پھوپھی، بیٹیوں کی اولاد، بہنوں کی اولاد اور اسی طرح کے رشتے دار جس طرح کہ بعض نے گمان کیا ہے اور اس آیت سے حجت پکڑی ہے اور صریح یہی اعتقاد اس مسئلے میں اپنا لیا ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ آیت عام ہے سارے

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

(2) ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

(3) المعجم الكبير (٣/ ١٩) مستدرك الحاكم (٣/ ١٨) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی مجہول ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٨٠٣)

(4) مسند أحمد (٤/ ٣٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٣٦)

قریبی رشتے داروں کو شامل ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ رحمہم اللہ وغیر واحد نے اسی پر نص کی ہے کہ یہ آیت حلف اور بھائی چارے کی وراثت کو منسوخ کرتی ہے، جس کے سبب سے وہ وارث بنتے تھے۔ اس بنیاد پر آیت ذوی الارحام کو شامل ہے، باسمِ خاص، اور جو وارث نہیں، اس کے لیے اور دلیلیں ہیں، سب سے زیادہ قوی دلیل یہ حدیث ہے: «إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطیٰ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ»[1] سو اگر حق دار ہوتا تو کتاب اللہ میں صاحبِ فرض کا نام لیا جاتا۔ لیکن جب حق دار نہ ہوا تو وارث بھی نہ ٹھہرا۔ واللہ أعلم. امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "هٰذَا آخِرُ تَفْسِيْرِ سُوْرَةِ الْأَنْفَالِ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ"[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ مومن حق سے مراد بغیر کسی شک و شبہے کے اس شخص کی سچائی ثابت ہونا کہ وہ شخص جو ایمان لا کر دار الشرک میں ہی سکونت پذیر رہا۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ ایمان میں کامل یہی لوگ ہیں۔ اس لیے کہ ایمان کے تمام تقاضے پورے کیے، وطن سے ہجرت کی، اہل و عیال اور گھر بار کو چھوڑا، دین اور آخرت کی خاطر دنیا کے مال و دولت سے منہ موڑا۔ اللہ نے ان لوگوں کا انجامِ اخروی بتایا، وہ گناہوں کی بخشش اور رزقِ کریم کا عطا ہونا ہے۔ پھر جو لوگ ان کے بعد ان کی چال پر چلیں گے ان کو بھی انھی کے ساتھ ان دونوں باتوں میں ملایا۔ بعد سے مراد حدیبیہ اور بیعتِ رضوان کے بعد ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ اس کے بعد والی ہجرت پہلی ہجرت سے کم درجہ تھی۔ دوسری ہجرت وہ ہے جس میں صلح ہوئی اور لڑائی موقوف ٹھہری، پھر مکہ فتح ہوا۔[3] بعض نے کہا ہے کہ بعد سے مراد اس آیت کے نزول کے بعد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مراد ہجرتِ ثانیہ والے لوگ ہیں، اس لیے کہ وہ پہلی ہجرت کے بعد تھے، کیونکہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منقطع ہو گئی، اس لیے کہ مکہ دار الاسلام ہو گیا۔[4]

اللہ نے کہا ہے کہ لوگ بھی دوستی و باہمی امداد و کمالِ ایمان و بخشش و رزقِ کریم میں استحقاق کے لحاظ سے تمھارے ہی حکم میں ہیں، یعنی تمھارے برابر ہیں۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ مہاجرین کو پہلے والے مہاجرین کے ساتھ ملحق کیا ہے اور ان کو ان کے ساتھ ٹھہرایا ہے، سو یہ ان کی تعریف اور شرف کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر مہاجرین

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧١٣) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٨٧)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣٥۔ ٤٣٦)

[3] تفسير القرطبي (٨/ ٥٨)

[4] تفسير الخازن (٢/ ٣٣٠) الطبعة: دار الكتب العلمية۔ بيروت.

اولین افضل و اشرف نہ ہوتے تو یہ الحاق صحیح نہ ٹھہرتا۔ جمل نے کہا ہے کہ اس جگہ اس بات سے آگاہ نہیں کیا کہ وراثت کا حکم ہجرتِ ثانیہ سے مثل ہجرتِ اولیٰ کے ثابت ہے یا ہجرتِ ثانیہ کے رتبہ کی کمی کے سبب سے ثابت نہیں ہے۔ ہاں خطیب میں کہا ہے: "فَأُولَئِكَ مِنكُمْ، أَيْ مِنْ جُمْلَتِكُمْ، فَلَهُمْ مَالَكُمْ، وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْكُمْ مِّنَ الْمَوَارِيْثِ وَالْغَنَائِمِ وَغَيْرِهِمَا"

پھر اللہ پاک نے یہ بیان فرمایا کہ بعض قرابت دار زیادہ نزدیک ہیں بعض کے بہ نسبت ان کے غیر کے جن کے درمیان کوئی میراث کا کوئی ناتا نہیں۔ پس آیت ہر قرابت کو شامل ٹھہری۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ مراد عصبات ہیں، لیکن یہ چیز پوشیدہ نہیں ہے کہ اس جگہ اس لفظ کے غیر عصبات پر اطلاق سے کوئی مانع نہیں ہے۔ جو علمائے میراث ذوی الارحام ثابت کرتے ہیں ان کی دلیل یہی آیت ہے۔ ذوی الارحام وہ ہیں جو عصبہ نہ ہوں اور نہ وہ وراثت کے حق داروں میں ہوں، یہ علم مواریث رکھنے والوں کے مطابق ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس مسئلے میں اختلاف مشہور ہے اور بجائے خود وہ چلا آ رہا ہے۔

پھر کسی نے کہا کہ اس آیت نے میراث بالموالات والنصرۃ کو منسوخ کیا ہے۔ یہ اس کے نزدیک ہے جس نے بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ کی تفسیر وراثت کے ساتھ کی ہے اور جس نے اس کی تفسیر معاونت کے ساتھ کی ہے اس کے نزدیک یہ آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع ہے کہ بعض قرابت دار دوسرے قرابت داروں کی نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اللہ کی کتاب یعنی حکم یا لوحِ محفوظ یا قرآن میں، کیونکہ وراثت کی تقسیم سورت نسا میں مذکور ہے جو کتاب اللہ یعنی قرآن عظیم ہے۔

اسی طرح فروض (وراثت کے حصوں) کو ان کے اہل کو دینے کا ذکر بھی موجود ہے، پھر جو بچا کھچا ہو گا وہ عصبات کا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اصحابِ ابوحنیفہ کو یہی جواب دیا تھا۔ ہاں اس اولیت میں میراث بھی بدرجہ اولیٰ داخل ہے، قرابت کے وجود کے سبب۔ اللہ ہر چیز کا عالم ہے، کوئی بھی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، کچھ بھی ہو، کہیں ہو، ان سب چیزوں میں سے ایک وراثت کا قانون بھی ہے، جس پر یہ آیتیں ایمان اور ہجرت کے تقاضے سے شامل ہیں، اگرچہ یہ قرابت کے علاوہ ہوں جو منسوخ ہو چکا ہے اور قرابت کے تقاضے کی وجہ سے بھی شامل ہوں، اگرچہ ہجرت اور نصرت میں شریک نہ ہوئے ہوں۔ واللہ أعلم۔[1]

اس سورت کی تفسیر لکھنے کا آغاز ماہِ رمضان ۱۳۰۴ ہجری چہار شنبہ کے روز ہوا تھا۔ دس دن میں یہ تحریر ختم ہوئی۔ آج دوشنبہ کا دن یازدہم شوال سنِ مذکور ہے درمیان میں لکھنا بند رہا، نو پارے اور دسویں پارے کا ایک چوتھائی اس پر

---

[1] فتح البیان (۵/ ۲۲۱۔ ۲۲۳)

ختم ہوا۔ اس کے بعد سورت توبہ ہے۔ ہر بشر خطاوار ہے اور کوئی کم اور کوئی زیادہ گناہ گار ہوتا ہے اور میں سب سے زیادہ معاصی میں مبتلا ہوں اور اللہ سے توفیق اور انابت کا طالب رہتا ہوں، اس لیے اس جگہ پر تمنا کرتا ہوں کہ جس طرح یہ سورت ختم ہو کر سورت توبہ آئی، اسی طرح میرا خاتمہ بھی حسنِ عمل پر ہو کر مجھ کو توبۂ نصوح نصیب ہو اور جو حادثات ۱۳۰۱ ہجری کی ابتدا سے لگا تار مینہ کی طرح اس دم تک برس رہے ہیں وہ سب منقطع ہو کر مکمل امن و امان ملے اور یہ بقیہ عمر فانی کتاب اللہ اور استغفار کے ساتھ بسر ہو جائے۔ اَللّٰھُمَّ آمِیْنَ. سنت توبہ ہے، واجب ترکِ دنیا ہے، فرض صحبتِ حق تعالیٰ جل شانہ ہے، لیکن ہم سب کچھ تمنا کریں اور باتیں بنائیں مگر جب تک کہ اللہ کی توفیق ہمارا ہاتھ نہیں پکڑتی بیڑا پار نہیں ہوتا ؎

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو



''دعا کی توفیق بھی تیری ہی عنایت سے نصیب ہوتی ہے اور اس کی قبولیت بھی تجھ ہی پر منحصر ہے۔ امن و سلامتی بھی تجھ سے اور خوف و تقویٰ بھی تجھ ہی سے ہے۔''

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا، وَتُبْ عَلَیْنَا، وَاجْعَلْ خَیْرَ عُمُرِنَا آخِرَہٗ، وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ ظَاھِراً وَّبَاطِناً، وَّأَوَّلاً وَّآخِراً.

............❀❀❀............

سورت توبہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔ یہ بسم اللہ شروع تفسیر کی ہے نہ کہ سورت براءت کی۔ اس سورت میں ایک سوتیس یا ایک سوستائیس آیتیں ہیں۔ اس کے نام بہت ہیں:

سورت توبہ کے نام:

① ایک سورت توبہ، اس لیے کہ اس میں مومنین پر توبہ کا ذکر ہے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تم اس کا نام توبہ رکھتے ہو اور یہ سورۃ العذاب ہے۔[1]

② دوسرا نام فاضحہ ہے، اس لیے کہ اس میں فلاں فلاں کو فضیحت (رسوا) کیا گیا ہے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ کسی کو نہ چھوڑے۔

③ تیسرا نام بحوث ہے، اس لیے کہ اس میں اسرارِ منافقین کی بحث ہے۔

④ چوتھا نام مبعثرہ ہے، بعثرت کے معنی بحث کے ہیں۔

⑤ پانچواں نام مقشقشہ ہے، اس لیے کہ نفاق سے بری کرتی ہے۔

⑥ چھٹا نام مخزیہ ہے، اس لیے کہ اس نے منافقوں کو رسوا کر دیا۔

⑦ ساتواں نام مثیرہ ہے، اس لیے کہ ان کے بھیدوں کو ابھارتی ہے۔

⑧ آٹھواں نام حافرہ ہے، اس لیے کہ نفاق کے اسرار کریدتی ہے۔

⑨ نواں نام منکلہ ہے، اس لیے کہ اس میں تنکیل ہے ان کی، یعنی ان کے عذاب کا بیان ہے۔

⑩ دسواں نام مدمدمہ ہے، اس لیے کہ ان کو ہلاک کرتی ہے۔

خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت کے سب نام صیغۂ فاعل پر ہیں، سوائے بحوث کے کہ یہ صیغۂ مبالغہ ہے بمعنی اسم فاعل۔[2] میں کہتا ہوں اسی طرح براءت وتوبہ وسورت عذاب صیغۂ فاعل پر نہیں ہے۔

مقام نزول:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مدینے میں نازل ہوئی۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] الدر المنثور (٤/ ١٢٠) [2] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي للخفاجي (٤/ ٢٩٥)

[3] تفسير القرطبي (١٠/ ٩٣) الطبعة: مؤسسة الرسالة.

نے کہا ہے کہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مدینے میں اتری۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آخری سورت جو پوری اتری ہے وہ براءت ہے۔[2] (رواه البخاري)

شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجوہات:

علما نے اس سورت سے بسم اللہ کے ساقط کرنے میں کئی قول پر اختلاف کیا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ عرب کی عادت تھی کہ جب ان کے اور کسی قوم کے درمیان عہد ہوتا اور وہ اس عہد کو توڑنا چاہتے اور خط لکھتے تو اوپر بسم اللہ نہ لکھتے۔ جب سورت براءت میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے درمیان عہد کو توڑنے کے بارے میں آیات نازل ہوئیں اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بھیج کر یہ سورت ان کو پڑھ کر سنائی تو ان کی عادت کے موافق اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں رکھی۔[3]

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بسم اللہ امان ہے اور براءت تلوار زنی کا حکم لائی ہے،[4] اس میں بسم اللہ لکھنے کو ترک کرنے کی وجہ کی طرف اشارہ ہے۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ قول سب اقوال سے زیادہ صحیح ہے۔[5] امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مالک بن انس رحمہ اللہ، ابن عجلان اور ابن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورت سورت بقرہ کے برابر یا اس کے قریب تھی، جب سورت کا پہلا حصہ ساقط ہوا تو بسم اللہ بھی ساقط ہوگئی۔ ایک قول یہ ہے کہ خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں جب مصاحف لکھے گئے تھے تو صحابہ میں اختلاف ہوا، کسی نے کہا کہ براءت اور انفال ایک ہی سورت ہے اور کسی نے کہا کہ دو سورتیں ہیں، لہٰذا دونوں کے درمیان فرجہ (شگاف) چھوڑ دیا گیا، بسم اللہ نہ لکھی، دونوں فریق راضی ہو گئے۔ یہی خارجہ اور ابو عصمہ وغیرہما کا قول ہے۔[6]

جس نے کہا کہ دونوں ایک سورت ہیں، اسی کا قول زیادہ ظاہر ہے، اس لیے کہ یہ دونوں لڑائی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور ان دونوں کی کل دو سو پانچ آیتیں ہوتی ہیں اور یہ دونوں سات لمبی سورتوں میں سے ساتویں سورت گنی جاتی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بسم اللہ اس لیے نہیں لکھی گئی کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم نہیں دیا جس طرح حاکم رحمہ اللہ کی ایک روایت میں آیا ہے۔[7] سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اور بیان نہ کیا کہ یہ دونوں ایک ہیں یا دو، اس لیے ہم نے دونوں کو پاس پاس لکھا اور درمیان میں بسم اللہ نہ لکھی۔[8] (أخرجه الترمذي وحسنه)

---

[1] الدر المنثور (٤/ ١١٩) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٠٦) [3] فتح القدير (٢/ ٤٧٥)
[4] الدر المنثور (٤/ ١٢٢) [5] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي للخفاجي (٤/ ٢٩٥)
[6] تفسير القرطبي (٨/ ٦٢۔ ٦٣) [7] تفسير الجلالين (١/ ٢٣٩)
[8] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٨٦، ٧٨٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٤١) اس کی سند میں "یزید فارسی" مجہول راوی ہے۔ نیز متن میں بھی نکارت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ضعيف أبي داود (١/ ٣٠٦)

صحیح یہ ہے کہ بسم اللہ اس لیے نہیں لکھی گئی کہ جبریل علیہ السلام اس سورت میں بسم اللہ نہیں لائے، یہ امام قشیری رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت کا ان ناموں سے مشہور ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ایک مستقل سورت ہو اور سورت انفال کا ٹکڑا نہ ہو اور یہ بات کہ یہ شہرت خاص ان لوگوں کے نزدیک ہے جو اس کو ایک مستقل سورت جانتے ہیں، ٹھیک نہیں، بلکہ بسم اللہ کو چھوڑنے میں حکمت یہ ہے کہ اس کا نزول امان کے اٹھا لینے کے بارے میں ہوا ہے، اس لیے سورت کے شروع میں بسم اللہ کا لکھنا جو رحمت کے وصف کو ظاہر کرتا ہے، اصل مقاصد کے خلاف ہے، جس طرح ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے اور یہ ترک کرنا کچھ اس لیے نہیں ہے کہ سورت کے مستقل ہونے میں کچھ شبہہ ہو جس طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور نہ اختلافِ صحابہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ بات نکلتی ہے کہ بسم اللہ قرآن میں سے نہیں ہے، بلکہ دو صورتوں کے درمیان علاحدگی ظاہر کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے، جس طرح قدیم حنفیہ سے منقول ہے۔

مصاحف میں بسم اللہ کا اثبات یا چھوڑ دینا جامع قرآن کی رائے پر منحصر ہے نہ کہ توقیف پر اور اس میں کچھ شک نہیں کہ صحیح مذہب یہی ہے کہ بسم اللہ قرآن پاک کی ایک جداگانہ آیت ہے جو فصل اور تبرک کے لیے اتری ہے۔ اس کے اثبات اور ترک میں کسی شخص کی رائے کو کوئی دخل نہیں، بلکہ اس جگہ پیروی توقیف اور وحی کی کی جاتی ہے۔ اس جگہ اس کے نازل ہونے میں کچھ شک نہیں، ورنہ استقلال میں شبہہ اور اختلاف کا واقع ہونا ممتنع ہوتا، موضع بیان میں شارع کی طرف سے اس کو بیان نہ کیا جانا، اس کے موجود نہ ہونے کا بیان ہے۔ فتح البیان کا بیان مکمل ہوا۔[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورتِ کریمہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب کے بعد اتری ہے۔ جس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے براء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔[3] اس میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بسملہ نہیں لکھی اور کہا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بیان نہیں فرمایا کہ یہ سورت انفال میں داخل ہے یا علاحدہ ہے۔[4] اس سورت کا آغاز اس وقت ہوا جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس ہوئے اور لوگ حج میں تھے۔

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ مشرک اس سال حسبِ عادت خود حج کریں گے اور ننگے بدن طواف بجا لائیں گے تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے ساتھ ملنا پسند نہ آیا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج مقرر فرما کر اس سال مکے کو روانہ کیا، تاکہ لوگوں کو مناسکِ حج پر قائم کریں اور مشرکوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس سال کے بعد پھر حج نہ کرنے

---

(1) تفسير القرطبي (٨/ ٦٣) (2) تفسير أبي السعود (٤/ ٣٩) فتح البيان (٥/ ٢٢٥۔ ٢٢٨)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٠٦)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٨٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١٠) اس کی سند میں ''یزید فارسی'' مجہول راوی ہے۔ نیز متن میں بھی نکارت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: ضعيف أبي داود (١/ ٣٠٦)

پائیں گے اور لوگوں میں ﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ کا اعلان کر دیں، جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کوچ کیا تو ان کے پیچھے سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو بھی روانہ کیا، تاکہ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس حکم کی تبلیغ کریں، اس لیے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عصبہ تھے۔[1] موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمایا کہ یہ سورت براءت کوئی الگ سورت ہے یا کسی اور سورت کی آیتیں ہیں۔ سورت کا نشان بسم اللہ تھا اور وہ نازل نہ ہوئی اس لیے اس پر بسم اللہ نہیں اور یہ کسی اور سورت میں داخل بھی نہیں۔

سُوْرَةُ التَّوْبَة

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

(اے مسلمانو!) جن مشرکین سے تم نے عہد کر رکھا تھا، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان سے (اعلانِ) براءت ہے ① چناں چہ (اے مشرکو!) تم زمین میں چار ماہ چل پھر لو، اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ②

اہلِ معاہدہ مشرکوں سے براءت کا اعلان:

مفسرین کا اس جگہ اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ یہ آیت صرف عہد والوں کے لیے ہے، جن کے لیے کوئی وقت مقرر نہ تھا یا ان کے لیے جن سے چار مہینے سے کم کا معاہدہ تھا۔ اب چار ماہ کی مدت پوری کر دی، سو جن کے لیے عہد کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، ان کی مدت جب تک پوری ہو، تب تک عہد تھا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ﴾ [التوبة: ٤] ”تو ان سے (مقررہ) مدت تک ان کا عہد پورا کرو۔“ اور جس کسی کے ساتھ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا وقت مقرر تھا وہ اس وقت کے پورا ہونے تک تھا۔ یہ قول تمام اقوال سے زیادہ مضبوط اور اچھا ہے۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے اور امام کلبی اور قرظی رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم سے مروی ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ نے ان کے لیے حد باندھی جنھوں نے اس کے رسول سے عہد کیا تھا چار ماہ کی کہ وہ اس مدت میں جہاں چاہیں چلیں پھریں کچھ روک ٹوک نہیں ہے اور جس کے ساتھ عہد نہ تھا اس کے لیے عہد مقرر کیا کہ اشہر حرم یوم نحر (دس ذوالحجہ) سے لے کر ماہِ محرم کے آخر تک عہد کی مدت ہے، یہ پچاس راتیں ہوئیں اور اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ محرم ختم ہو جائے تو تم ہتھیار پکڑو اور جس کے ساتھ تمھارا عہد نہیں ہے اس

① تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٣٦۔ ٤٣٧) ② تفسیر الطبري (١٤/ ١٠٢)

سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہوں اور جن کے ساتھ عہد تھا ان کے لیے یہ حکم دیا کہ جب چار مہینے گزر جائیں یوم نحر سے دسویں ربیع الآخر تک تو پھر ان میں تلوار چلے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ موسمِ حج مقرر کر کے نو ہجری میں بھیجا، پھر سورت براءت کی تیس یا چالیس آیتیں دے کر علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا، انھوں نے وہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور مشرکوں کو چار ماہ کی مہلت دی اور ان کی منازل میں بھی جا کر یہ سورت سنا دی اور کہہ دیا کہ اس موجودہ سال کے بعد اب کوئی مشرک حج نہ کرے گا اور نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف کر پائے گا۔[1] معلوم ہوا کہ سیدنا ابوبکر اور علی رضی اللہ عنہما کی خدمت جدا جدا تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ امیرِ حج تھے اور علی رضی اللہ عنہ مبلغِ سورت، دونوں شخصوں کو دو کام پر الگ الگ روانہ کیا تھا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عہد والے خزاعہ اور مدلج ہیں اور ان کے علاوہ جن سے عہد تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے لوٹے اور حج کا ارادہ کیا تو فرمایا کہ وہاں مشرک آ کر ننگے طواف کریں گے، میں نہیں چاہتا کہ ان کے ہوتے ہوئے حج کروں۔ سیدنا ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما کو بھیج دیا کہ وہ لوگوں میں پھر کر ذی المجاز اور ان کی دو کانوں میں جہاں وہ لین دین کرتے تھے اور ساری جگہوں میں حکم پہنچا دیں۔ انھوں نے اصحابِ عہد کو خبردار کر دیا کہ تم کو چار ماہ تک امن ہے، دس ذی الحجہ سے دس ربیع الآخر تک، پھر کوئی عہد نہیں اور سب لوگوں کو اشتہارِ جنگ دے دیا، مگر یہ کہ وہ ایمان لے آئیں۔ امام سدی اور قتادہ رحمہما اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس مدت کی ابتدا شوال اور انتہا سلخ محرم (محرم کا اخیر) تھا،[2] لیکن یہ قول غریب ہے اور حکم سے پہلے کا زمانہ کس طرح مدت میں شمار ہو سکتا ہے، حالانکہ اس حکم کا ظہور نحر کے دن ہوا، جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے اعلان کیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ براءت کسی شے کو اپنے نفس سے زائل کرنے کو اور اس سبب کے کاٹ دینے کو کہتے ہیں جو اس کے اور دوسرے کے درمیان تھا، یا کسی امرِ مکروہ سے ہمسائیگی کا دور ہونا۔ مراد عہد سے صرف عہد ہے یا چار ماہ سے کم یا زیادہ کا۔ عہد مضبوط اقرار کو کہتے ہیں جو قسم کے ساتھ ہو۔ مسلمانوں نے اللہ کی اجازت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مندی سے مشرکوں کے ساتھ عہد کیا تھا۔ جب کفار نے وہ عہد توڑ دیا تو اللہ اور رسول نے مسلمانوں کو خبر دی کہ اب اس عہد کی پابندی تمھارے لیے بھی ضروری نہ رہی، بلکہ تم پر بھی اپنے عہد کو توڑ دینا واجب ہوا، اس لیے کہ عہد شکنی کی پہل مشرکوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ چار ماہ تک اجازت سیاحت کی دی گئی ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٩٨۔ ١٠٠) [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٩٩۔ ١٠١)

سیاحت اطرافِ زمین میں چلنے پھرنے کو کہتے ہیں، یعنی اس مدت میں تم چل پھر کر جو کچھ سامانِ جنگ مہیا کرنا چاہتے ہو کرلو، پھر مہلت نہ دی جائے گی، بلکہ لڑائی ٹھہرے گی، یہ مدت قلیل اس لیے مقرر فرمائی کہ مسلمان اس وقت میں صاحبِ قوت تھے، بخلاف صلح حدیبیہ کے کہ وہ مدت مسلمین کے ضعف کی وجہ سے دس سال تک قرار پائی تھی۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرک دو طرح کے تھے، ایک وہ جن کی مدتِ معاہدہ چار ماہ سے کم تھی ان کو چار ماہ کی مہلت دی، دوسرے وہ جن کی مدت چار ماہ سے زیادہ تھی، ان کی مدت کو چار ماہ قائم رکھا، تاکہ اپنا ساز و سامان تیار کرلیں، پھر اس کے بعد جنگ ہے جہاں کہیں کوئی کافر مشرک ملے گا وہ مارا جائے گا۔ اور یہ اور بات ہے کہ وہ توبہ کر کے ایمان لے آئے۔ اس مدت کی ابتدا یومِ حجِ اکبر سے تھی اور دس ربیع الآخر تک تھی اور جن سے عہد نہ تھا، ان کی مدد حرمت والے مہینے کے ختم ہونے تک تھی، جس کے پچاس دن ہوتے ہیں۔[1]

مدت کے متعین کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے لیے احتیاط کرلیں اور جان لیں کہ اس مدت کے بعد یا اسلام ہے یا قتل اور کچھ نہیں۔ شاید اس سبب سے مسلمان ہو جائیں اور مسلمانوں کو غدر اور عہد شکنی کی تہمت نہ لگے۔ بعض نے یہ گمان کیا ہے کہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو جو سورت براءت کی ابتدائی آیات دے کر بھیجا تو اس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت کی معزولی تھی، سو یہ خیال بالکل جہالت ہے، بلکہ امیر ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور علی رضی اللہ عنہ ان کے وزیر تھے، تمام بحث اپنے موقع پر مذکور ہے۔ ترمذی، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ، اور بیہقی میں جو حسن صحیح روایت آئی ہے: ''فَكَانَ عَلِيٌّ يُنَادِيْ فَإِذَا أَعْيَا قَامَ أَبُوْبَكْرٍ يُنَادِيْ بِهَا''[2] اس بارے میں صحیحین وغیرہما میں بہت سی احادیث وارد ہیں مگر جس کو اللہ گمراہ کرے، اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

''برائی پسند آنکھ کی ضائع ہو جائے، وہ ایسی ہے کہ اس کی نظر میں ہنر بھی عیب ہی دکھائی دیتا ہے۔''

پھر اللہ نے یہ سنا دیا کہ یہ مہلت دینا کچھ عاجزی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس مصلحت سے ہے کہ جس کسی کو توبہ کرنا ہو وہ توبہ کر لے یا اپنے ہتھیار تیار کر لے، کیونکہ اللہ کو کافروں کا رسوا کرنا منظور ہے، دنیا میں مارے پکڑے جائیں گے اور آخرت میں گرفتارِ عذاب و مستحقِ نار ہوں گے۔[3]

---

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٦٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩١) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٤٥) مستدرك الحاكم (٣/ ٥٣) دلائل النبوة للبيهقي (٥/ ٢٩٦_ ٢٩٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ٣٠٣) نیز مذکورہ حوالہ میں سنن ترمذی کے علاوہ سب میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جگہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے۔

[3] فتح البيان (٥/ ٢٢٩_ ٢٣١)

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳

اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ بلاشبہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بریٔ الذمہ ہیں، لہٰذا (اے مشرکو!) اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے (حق سے) منہ موڑے رکھا تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور (اے نبی!) آپ ان کافروں کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیں ③

چھٹے برس نبیِ کریم ﷺ کی مکے کے لوگوں سے صلح ہوئی تھی اور بھی کئی فرقوں سے جن کا ذکر سورت ﴿اِنَّا فَتَحْنَا﴾ میں ہے اور عرب کی بہت سی قوموں سے صلح تھی۔ جب مکہ فتح ہوا تو اس کے ایک سال بعد حکم نازل ہوا کہ کسی مشرک سے صلح نہ رکھو اور یہ بات حج کے دن، یعنی عید قربان کو حج کے سب قافلوں میں پکار کر کہہ دو، تاکہ سب کو خبر پہنچ جائے اور صلح کا جواب دے کر چار مہینے کی مہلت دی کہ اس میں خواہ لڑائی کے لیے تیار رہیں، یا وطن چھوڑ جائیں، یا مسلمان ہو جائیں۔ موضح قرآن میں اسی طرح ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یومِ حجِ اکبر سے نحر کا دن مراد ہے، اس لیے کہ یہ ایامِ مناسک میں سب سے افضل واظہر واکبر دن ہے۔ ایسی جمعیت اور دن میں نہیں ہوتی۔

مشرکوں پر حج کرنے اور ننگا طواف کرنے پر پابندی:

بخاری شریف میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ اس حج میں جہاں اور پکارنے والے تھے ان میں مجھ کو بھی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قربانی کے دن منیٰ میں بھیجا تھا، ہم سب یوں پکارتے تھے: "لَا يَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوْفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ" حمید بن عبدالرحمان راوی نے کہا پھر نبیِ کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ردیف کیا اور یہ حکم دیا کہ تم آیاتِ براءت سنا دو۔[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ علی رضی اللہ عنہ بھی اہلِ منیٰ میں یوم نحر کو براءت سناتے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سال کے بعد اب کوئی مشرک حج یا برہنہ طواف کرنے نہ پائے گا۔[2] (رواه البخاري أيضاً) چنانچہ پھر آیندہ سال حجۃ الوداع میں جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے حج کیا، کسی مشرک نے حج نہ کیا۔[3] (هذا لفظ البخاري في كتاب الجهاد)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تو میں ان کے ہمراہ تھا، پوچھا: تم

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٩) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢)
③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٠٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٣٨)

کیا پکارتے تھے؟ کہا: ہم یہ کہتے تھے کہ نہ جائے گا جنت میں مگر نفسِ مومن اور کوئی شخص برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرے اور جس کسی کے درمیان اور نبیِ اکرم ﷺ کے درمیان عہد ہو، اس کی مدت چار ماہ ہیں، جب چار ماہ گزر جائیں گے تو اللہ اور رسول مشرکوں سے الگ ہیں اور اس برس کے بعد اب کوئی مشرک اس گھر کا حج نہ کرے گا۔ میں نے اتنا پکارا کہ میری آواز بیٹھ گئی۔[1] (رواہ أحمد) روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ پکارتے، جب ان کی آواز بیٹھ جاتی تو میں پکارتا۔[2] (رواہ ابن جریر)

یومِ حج اکبر سے مراد:

ابو جحیفہ، عطا، عمر بن خطاب، سعید بن مسیّب، ابن عباس، ابن زبیر رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ اور طاؤس رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یومِ حج اکبر سے مراد عرفے کا دن ہے۔ دوسرا قول ہے کہ مراد نحر کا دن ہے۔ سیدنا علی، عبداللہ بن اوفی، مغیرہ بن شعبہ، ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابو جحیفہ، سعید بن جبیر، عبداللہ بن شداد، نافع بن جبیر، شعبی، ابراہیم نخعی، مجاہد، عکرمہ، امام باقر، زہری اور ابن زید رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[3] اور صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ "إِنَّ أَبَا بَكْرٍ بَعَثَهُمْ يَوْمَ النَّحْرِ يُؤَذِّنُونَ بِمِنًى"[4] اس بارے میں اور بھی حدیثیں آئی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے نحر کے دن میں جمرات کے نزدیک کھڑے ہو کر فرمایا: «هَذَا يَوْمُ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ»[5] (رواہ ابن جریر و ابن مردویہ) سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ یومِ حجِ اکبر یومِ نحر کے دوسرے دن کو کہتے ہیں۔[6] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حج کے سارے ایام ہی یومِ حجِ اکبر ہیں۔ سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یومِ حجِ اکبر کہنا ایسا ہے، جیسے یومِ جمل یومِ صفین کہتے ہیں، یعنی سارے حج کے دن یومِ حجِ اکبر ہیں۔[7] حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حج کو کیا پوچھتے ہو، اس سال نبیِ اکرم ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ کر کے بھیجا تھا کہ لوگوں کو حج کرائیں۔[8] امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے اور اہلِ وبر نے باتفاق حج کیا۔[9]

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٥٨) مسند أحمد (٢/ ٢٩٩) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٤/ ٣٠١) البتہ دوسری روایت میں نبی کریم ﷺ کے عہد کے متعلق تفصیل کچھ یوں ہے کہ نبی کریم ﷺ کا عہد اپنی مدتِ مقررہ تک ہے اور جس عہد کی مدت مقرر نہیں ہے، اس کی مدت چار ماہ ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٧٠)

[2] تفسير الطبري (١٤/ ١٠٣) [3] تفسير الطبري (١٤/ ١١٤۔ ١٢٧) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٧٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٥٥) تفسير الطبري (١٤/ ١٢٤) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٤٨)

[7] تفسير الطبري (١٤/ ١٢٧) [8] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٤٨) [9] تفسير الطبري (١٤/ ١٢١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اذان بہ معنی ایذان یعنی اعلام (بتلا دینا) جیسے امان وعطا بمعنی ایمان و اعطا ہے۔ لفظ ناس میں سارے لوگ داخل ہیں۔ کسی قوم کی خصوصیت نہیں ہے۔ جس طرح براءت خاص طور پر ان لوگوں سے تھی جن سے عہد و پیمان تھا۔ اس دن کے حج کو حجِ اکبر اس لیے کہا ہے کہ لوگ اس میں بہت جمع ہوتے ہیں یا اس لیے کہ بڑے بڑے کام حج کے اسی دن بجا لائے جاتے ہیں یا عمرے سے علاحدہ کرنا ہے کہ وہ حجِ اصغر کہلاتا ہے، کیونکہ اس کے اعمال حج کے اعمال کی نسبت تھوڑے ہوتے ہیں، کیونکہ حج میں کنکریاں مارنا اور رات کو منیٰ میں رہنا پڑتا ہے اور یہ کام عمرہ میں نہیں ہیں، اس اعتبار سے گویا وہ حجِ اکبر ہے۔ اس دن کو یوم الحج اس لیے کہتے ہیں کہ بڑے افعالِ حج اسی دن میں پورے کیے جاتے ہیں۔

راجح یہی ہے کہ اس دن سے یوم النحر مراد ہے، اگرچہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یومِ عرفہ ہے۔ جو احادیث اس کے یوم النحر ہونے میں آئی ہیں وہ صحیحین وغیرہما میں ثابت ہیں، اس لیے وہ روایات جن میں اس کا یومِ عرفہ ہونا آیا ہے وہ صحیحین کی احادیث سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یا سارے ایامِ منیٰ یوم الحج الاکبر ہیں یا وہ دن مراد ہیں جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے حج کیا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد قرآن ہے۔[1] پھر یہ فرمایا کہ اللہ اور رسول شرک کرنے والوں سے بے زار ہیں، اگر تم کفر سے توبہ کرو گے تو یہ بہتر ہے تمھارے لیے۔ اس میں توبہ کرنے اور شرک سے علاحدہ ہونے کی ترغیب دی ہے، کیونکہ شرک سے جہنم واجب ہو جاتی ہے، پھر کہا کہ اگر توبہ نہ کرو گے تو کچھ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اچھائی نہ کرو تو عذابِ الیم میں پڑے رہو گے۔[2]

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (4)

لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا ہے، پھر انھوں نے تمھارے حق میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان سے (مقررہ) مدت تک ان کا عہد پورا کرو۔ بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے (4)

جو پیمان پورا کرتا ہے اس کا پیمان پورا کرنے کا حکم:

یہ مدت اس مدتِ چار ماہ سے استثنا ہے جو مطلق عہد والوں کے ساتھ بغیر توقیت مقرر کی تھی کہ وہ اس مدتِ چار ماہ میں چل پھر کر جہاں کہیں جس طرح پر اپنی نجات چاہیں اس کا بندوبست کر لیں اور جس کے ساتھ عہد موقّت ہے،

---

(1) تفسیر البغوي (٤/ ١٢) (2) فتح البیان (٥/ ٢٣٢۔ ٢٣٤)

اس کی اجل اسی مدتِ مقرر تک ہے، جس کا عہد ان کے ساتھ ہو چکا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ عہد کرنے والے اپنا عہد نہ توڑیں اور غیروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہوں۔ ایسے شخص کے ساتھ جو عہد و ذمہ ہو چکا ہے وہ پورا کیا جائے گا اور اسی لیے اللہ نے عہد پورا کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ پرہیزگار ہیں، یعنی اپنا اقرار پورا کرتے ہیں، اللہ ان کو دوست رکھتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ لوگ قریش تھے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکینِ قریش تھے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے زمانے میں عہد کیا تھا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ بنو ضمرہ تھے، یہ کنانہ کا ایک قبیلہ ہے۔ محمد بن عباد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنو جذیمہ بن عامر ہیں۔[3] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ پہلی عہد شکنی کا تدارک چاہنا ہے جس میں جنگ کو چار ماہ تک مؤخر کیا گیا تھا،[4] مگر اس شرط پر کہ دشمنوں کی مدد نہ ہو، جس طرح بنو بکر نے خزاعہ کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت کر کے زیادتی کی تھی اور قریش ہتھیار لے کر ان کے مددگار بن گئے۔ سو ان کا عہد پورا کرنا ضروری ہے، جب تک کہ اس عہد کی مدت پوری نہ ہو، اگرچہ چار ماہ سے زیادہ ہی ہو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کے نزول کے بعد پھر کسی کے ساتھ کوئی عہد نہ کیا۔[5]

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انھیں پکڑ لو اور ان کا محاصرہ کر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (5)

جن سے وعدہ ٹھہر گیا تھا اور ان سے عہد شکنی نہ دیکھی ان کی صلح قائم رہی اور جن سے وعدہ کچھ نہ تھا، ان کو چار مہینے کی فرصت ملی اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دل کی خبر اللہ کو ہے۔ ظاہر میں جو مسلمان ہو، اس کو سب کے برابر امان ہے۔ اور ظاہری مسلمان کی نشانی یہ ٹھہرائی کہ ایمان لانا، کفر سے توبہ کرنا، نماز و زکات ادا کرنا، اسی لیے جب کوئی شخص نماز چھوڑ دے یا زکات نہ دے تو پھر اس سے امان اٹھ گئی۔ جنابِ صدیق رضی اللہ عنہ نے زکات کے منکروں کو کافروں کی طرح قتل فرمایا۔

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٤٩) (2) تفسير الطبري (١٤/ ١٣٣) (3) فتح القدير (٢/ ٤٨٥)
(4) تفسير أبي السعود (٤/ ٤٢) (5) الدر المنثور (٤/ ١٣١)

حرمت والے مہینوں سے مراد:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ اشہر حرم (حرمت والے مہینے) سے اس جگہ کیا مراد ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ مہینے ہیں جن کا ذکر دوسری آیت میں ہے: ﴿ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٣٦] ”ان میں سے چار (مہینے) حرمت والے ہیں، یہی سیدھا دین ہے، چناں چہ تم ان (مہینوں) میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان لو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔“ (قاله أبو جعفر الباقر) لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے حق میں آخری حرمت والا مہینا محرم ہے، یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اور ضحاک کا مذہب ہے، لیکن اس میں نظر ہے اور ظاہر یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عمرو بن شعیب، محمد بن اسحاق، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں کہ ان مہینوں سے مراد وہی چار مہینے ہیں جن کا ذکر ہو چکا۔ ﴿ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ ﴾[1] [التوبة: ٢]

یہ مہینے گزرنے کے بعد قتال کا حکم:

اس کے بعد فرمایا کہ جب یہ چار مہینے گزر جائیں جن میں کہ ہم نے تم پر قتال کو حرام کیا تھا تو اب تم خوب دل کھول کر لڑو بھڑو۔ اس امر کا حکم اسی سورت میں اس کے بعد دوسری آیت میں آئے گا۔ ظاہر حکم یہ ہے کہ جس کسی جگہ مشرکوں کو پاؤ مارو۔ یہ ایک عام حکم ہوا، لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ قتال کو حرام کرنا حرم شریف کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ﴾ [البقرة: ١٩١] ”اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انھیں قتل کرو۔“

پکڑنے سے مراد گرفتار کرنا ہے، یعنی جی چاہے تو مار ڈالو اور جی چاہے تو قید کر لو، پھر اس پر بھی اکتفا کرنا کچھ ضروری نہیں ہے، بلکہ ان کو قلعہ میں بند کر لو اور رستوں کو ان پر تنگ کر دو اور لڑائی یا اسلام کی طرف انھیں مضطر (مجبور) کر دو۔ ہاں اگر وہ تائب ہو کر نماز، زکات ادا کریں تو پھر تم ان سے کچھ تعرض نہ کرو۔ اسی جگہ سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس آیتِ شریفہ سے مانعینِ زکات سے جنگ کرنے پر استدلال کیا، کیونکہ ان افعال کے کرنے والوں سے قتال کرنا حرام ہے، یعنی جبکہ وہ اسلام میں داخل ہو گئے اور واجباتِ دین ادا کرنے پر قائم ہو گئے تو اب ان کا راستہ چھوڑ دینا چاہیے، کسی طرح کی چھیڑ خانی ضروری نہیں۔

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٣٣۔ ١٣٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٢)

نماز اور زکات کی اہمیت:

اعلیٰ واجبات کا ذکر کر کے ادنیٰ واجبات پر آگاہ فرمایا، کیونکہ ارکانِ اسلام میں دو گواہیوں کے بعد اشرف ارکان یہی نماز ہے جو اللہ کا بندوں پر حق ہے، پھر نماز کے بعد زکات ہے جس کا فائدہ فقرا اور محتاجوں کو پہنچتا ہے۔ یہ ان اعمال میں سے افضل ہے جن کا تعلق مخلوق سے ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں اللہ نے اکثر جگہ نماز اور زکات کو ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوْا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوْا الزَّكَاةَ» [1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "أُمِرْتُمْ بِإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَمَنْ لَّمْ يُزَكِّ فَلَا صَلَاةَ لَهُ" عبدالرحمان بن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں: "أَبَى اللّٰهُ أَنْ يَّقْبَلَ الصَّلَاةَ إِلَّا بِالزَّكَاةِ" پھر کہا: "يَرْحَمُ اللّٰهُ أَبَا بَكْرٍ مَا كَانَ أَفْقَهَهُ" [2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پھر جب وہ اس کی گواہی دیں گے اور منہ کریں گے ہمارے قبلے کی طرف اور ہمارا ذبیحہ کھائیں گے اور ہماری نماز پڑھیں گے تو ہم پر ان کے خون اور مال حرام ہو جائیں گے مگر حق سے، ان کے لیے وہی ہوگا جو اور مسلمانوں کے لیے ہے اور ان پر وہی ہوگا جو اور مسلمانوں پر ہے۔ [3]

(رواه أحمد ورواه البخاري وأهل السنن إلا ابن ماجه)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دنیا کو اس حالتِ اخلاص (توحید) پر چھوڑا کہ اللہ کی عبادت میں شرک نہ کرتا تھا تو اس نے دنیا کو اس حالت میں چھوڑا کہ اللہ اس سے راضی ہے۔ پھر سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہی ہے اللہ کا وہ دین جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور رب کی طرف سے لوگوں کو پہنچایا ہے۔ قبل ہرجِ احادیث اور اختلافِ اہواء کے۔

توبہ اور اقامتِ صلاۃ و ادائے زکات:

اللہ کی کتاب میں اس کی تصدیق سب سے آخر میں اتری ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبة: ١١] "پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢) [2] تفسير الطبري (١٤/ ١٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٥) مسند أحمد (٣/ ١٩٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٠٣)

تو وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں۔"[1] (رواہ ابن مردویہ ومحمد بن نصر المروزي في کتاب الصلاۃ له) رسالہ "وسیلة النجاة" اور رسالہ "ضوء الشمس" میں یہ بات دلیل سے ثابت کی گئی ہے کہ شہادتین ونماز وروزہ وزکات وحج کو ادا کرنے اور ترک کر دینے کے بارے میں حکم برابر ہے، یہ سب چیزیں اسلام کی بنیاد ہیں، ایک بنیاد کو ترک کرنا ویسے ہی باقی بنیادوں کا ترک کرنا ہے۔ اگر ان میں سے ایک رکن بجا لایا اور چار کو ترک کر دیا یا دو کو بجا لایا اور تین کو ترک کر دیا یا تین کو بجا لایا اور دو کو ترک کر دیا یا چار کا پابند رہا اور ایک کو چھوڑ دیا تو اس کا اسلام صحیح نہیں ہے اور نہ اس کا جان و مال محفوظ ہے۔

مسلمان جب ہی ٹھہرے گا کہ سب کو فرض ہونے کے بعد ہمیشہ ادا کرتا رہا یا بجا لاتا رہا اور بغیر کسی شرعی عذر کے اس کا تارک نہ ہوگا اور اگر عمداً بغیر کسی شرعی عذر کے ترک کرے گا اور نماز کا وقت یا روزے کا مہینا یا زکات کا سال یا حج کا موسم نکل جائے گا تو کافر ہو جائے گا، گو زبان سے کلمہ گو ہو اور ان ارکان کو فرض جانتا ہو۔ یہاں نیت کا اعتبار عمل کے ساتھ ہے۔ خالی نیت عمل کے بغیر مفید نہیں ہوتی۔ اگرچہ جمہور کے نزدیک ایسا چھوڑنے والا جو فرضیت کا قائل ہو کافر نہیں ہوتا لیکن اللہ اور رسول ﷺ کے صریح احکام اس کے کفر کو ثابت کرتے ہیں، مسلمان کو چاہیے کہ اگر لا علمی سے اس سے ایسا کام ہو جائے تو فوراً زبان پر کلمۂ شہادت سچے دل سے جاری کرے اور فوراً تائب ہو کر جو کچھ ہو چکا ہے اس کی تلافی کرے، ورنہ وہ مسلمان نہ ہوگا اور نہ اس لائق کہ مسلمین کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔

تلوار کشی کی آیت:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیتِ شریفہ وہی آیتِ سیف ہے جس کے حق میں ضحاک نے کہا ہے کہ ہر عہد کی ناسخ ہے جو نبیِ اکرم ﷺ اور کسی مشرک کے درمیان ہوا تھا۔ اس سے ہر عہد اور مدت منسوخ ہو گئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب سے یہ آیت اتری کسی مشرک کے لیے کوئی عہد اور ذمہ باقی نہ رہا۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ وہ ان پر تلوار نکالیں، جن سے پہلے عہد ہو چکا تھا، اگر وہ لوگ اسلام میں داخل نہ ہوں۔ جو اقرار و پیمان ان سے پہلے ہوا تھا، اب وہ ٹوٹ گیا، اگلی شرط جاتی رہی۔[2]

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ چار تلواریں دے کر بھیجے گئے: ایک مشرکینِ عرب کے حق میں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواہ ابن أبي حاتم هكذا

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠) تفسير الطبري (١٤/ ١٣٥) تعظيم قدر الصلاة للمروزي (١/ ٨٦۔ ٨٧) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٧١٩)

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٩٨) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٥٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٥٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

مختصرا) میں گمان کرتا ہوں کہ دوسری تلوار قتالِ اہلِ کتاب ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ۲۹] ''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔''

تیسری تلوار قتالِ منافقین ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [التوبة: ۷۳] ''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا (اصل) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بدترین جگہ ہے۔'' چوتھی تلوار باغیوں کے ساتھ قتال ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الحجرات: ۹] ''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر (ان) دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔''

پھر مفسرین کا اختلاف ہے کہ آیتِ سیف منسوخ ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ: ﴿ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ﴾ [محمد: ٤] ''پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے۔'' امام ضحاک و سدی رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں اور قتادہ رحمہ اللہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ اَنْسَلَخَ الْاَشْهُرُ ﴾ سے مراد مہینوں کا پورا ہو جانا ہے۔ ﴿ اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ ﴾ سے مراد ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب ہیں، تین ان میں لگاتار ہیں اور ایک اکیلا ہے۔ اس بنیاد پر آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ان مشرکوں سے جن کے ساتھ کوئی عہد نہیں ہے۔ ان مہینوں میں جنگ سے باز رہنا واجب ہے۔ نحر کے دن یہ بات پکار کر کہہ دی گئی تھی کہ اب عہد نہیں رہا۔ اس حساب سے حرمت والے باقی ماندہ مہینوں میں سے پچاس دن رہ گئے جو محرم کے ختم ہو جانے پر پورے ہوتے ہیں۔ اس وقت اللہ نے حکم دیا کہ اب جہاں کہیں مشرکوں کو پاؤ، مارو۔ اہلِ علم کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے اور یہی ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار بھی ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ مراد عہد کے مہینے ہیں جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿ فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ﴾ [التوبة: ٤] ان کا نام حرم

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٣۔ ٤٤٤)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ١٣٤)

اس لیے رکھا کہ اللہ نے ان مہینوں میں مسلمانوں پر مشرکوں کے خون حرام کر دیے تھے اور ان سے تعرض کرنا منع فرما دیا تھا، ایک جماعت کا مذہب یہی ہے۔

﴿ مَرْصَدٍ ﴾ تاکنے کی جگہ کو کہتے ہیں، مراد ہر راستہ ہے یا خاص مکے کا راستہ کہ وہاں نہ آ سکیں۔ اس آیت میں حکم ہے کہ حرمت والے مہینے گزر جانے کے بعد مشرکوں کو قتل کرو۔ یہ حکم ہر مشرک کے لیے عام ہے۔ اس حکم سے کوئی مشرک خارج نہیں ہے مگر جس کو سنت نے خاص کر دیا ہے، جیسے بچہ اور عاجز جو لڑائی نہیں کر سکتا۔ یہ آیت ناسخ ہے ہر اس آیت کی جس میں مشرکین کی ایذا دہی پر صبر کرنے اور ان سے اعراض کرنے کا ذکر ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں آیتیں محکم ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے، اس لیے کہ مَنّ (احسان) اور قتل اور فدیہ ہمیشہ نبیِ اکرم ﷺ کے حکم سے جاری رہا، پہلی لڑائی سے جو بدر میں ہوئی تھی۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کے موافق ہیں اور دونوں اس بات پر دلیل ہیں کہ پہلے اثخان، یعنی قتل و خون ریزی ہے، پھر اس کے بعد فدیہ لینا ہے۔[2] پھر اگر شرک سے جو قتل کا سبب ہے توبہ کریں اور اس توبہ کو اسلام کے سب سے بڑے ارکان، یعنی اقامتِ نماز سے ثابت کریں تو پھر ان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ نماز کا تعلق بدن سے ہے، اس لیے عباداتِ بدنیہ میں نماز پر اکتفا کیا۔ زکات کا تعلق مال سے ہے، اس لیے عباداتِ مالیہ میں زکات پر اکتفا کیا۔[3]

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

اور (اے نبی!) اگر مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیں، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں، اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے ⑥

اگر مشرک امان طلب کرے تو اسے امان دے دی جائے:

یعنی اتنی امان کا مضائقہ نہیں کہ کچھ پوچھنا سننا چاہے وہ سن لے، پھر بھی جہاں اسے ڈر نہ ہو، وہاں تک پہنچا دینا، اس کے بعد وہ سب کافروں کے برابر ہے۔ اللہ پاک نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ ہم نے تم کو جن مشرکوں سے لڑنے کا حکم دیا ہے ان میں سے اگر کوئی تم سے امان چاہے تو تم اس کو امان دو، یہاں تک کہ وہ قرآن جس کو تم اس پر پڑھتے ہو سن لے اور امر دین کہ جو تم ذکر کرتے ہو، اس کی حجت اس پر قائم ہو جائے، پھر اس کو اس کے گھر بار تک امن و امان سے پہنچا دو۔ یہ امان ہم نے اس لیے مشروع کی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے دین کو جان پہچان لیں اور

[1] تفسیر القرطبي (٨/ ٧٣) [2] تفسير الرازي (١٥/ ١٦١) [3] فتح البيان (٥/ ٢٣٦۔ ٢٣٨)

دعوتِ الٰہی اس کے بندوں میں پھیل جائے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ایک انسان تمھارے پاس آتا ہے، تاکہ تمھارا کہنا سنے اور جو قرآن تم پر اترا ہے اسے معلوم کرے تو وہ امن میں ہے، یہاں تک کہ وہ آکر اللہ کا کلام سن جائے اور پھر اپنے گھر اور شہر تک پہنچ جائے، جہاں سے کہ وہ آیا تھا۔[1] اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ اس شخص کو امان دیتے تھے جو رشد کا طالب ہو کر آتا یا کسی کا کوئی پیغام لاتا، جس طرح حدیبیہ کے دن قریش کی طرف سے ایک جماعت ان کے نمایندوں کی آئی تھی، ان میں عروہ بن مسعود، مکرز بن حفص اور سہیل بن عمرو وغیرہم تھے۔ اس معاملے میں جو ان کے اور نبیِ اکرم ﷺ کے درمیان تھا، ایک کے بعد دوسرا آتا تھا، انھوں نے مسلمانوں کا رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کرنا دیکھا تو حیران رہ گئے، کیونکہ اس طرح کی تعظیم کبھی کسی بادشاہ و قیصر کے ہاں بھی نہیں دیکھی تھی، پھر آکر اپنی قوم کو خبر دی اور یہ اکثر کے لیے ہدایت کا ایک بڑا سبب بنا۔

اسی لیے جب مسیلمہ کذاب کا قاصد آیا اور اس سے کہا کہ کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے؟ اس نے کہا: ہاں، تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَوْ لَا أَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ عُنُقَكَ»[2] چنانچہ پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب وہ کوفے کے امیر تھے تو اللہ نے ایسا ہی کیا کہ اس کذاب کی گردن ماری گئی، اس کو ابن النواحہ کہتے تھے، اس نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسیلمہ کذاب کی رسالت کی گواہی دی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو کہلا بھیجا کہ اب تو مسیلمہ کا ایلچی نہیں ہے، پھر اس کی گردن مارنے کا حکم دیا۔[3] لَا رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَلَعَنَهُ.

غرض کہ جو کوئی دار الحرب سے پیغام رسانی یا تجارت یا صلح طلب کرنے یا جزیہ دینے یا مہادنہ (باہم صلح کرنا) کے لیے دار الاسلام میں آئے یا کسی اور کام کے لیے آئے اور امام یا نائب امام سے امن چاہے تو اس کو امن دیا جائے گا، جب تک کہ وہ دار الاسلام میں چلتا پھرتا رہے گا، یہاں تک کہ امن و امان سے اپنے گھر اور وطن پہنچ جائے، لیکن علما نے کہا ہے کہ دار الاسلام میں ایک سال سے زیادہ نہ ٹھہرنے دیا جائے۔ ہاں چار مہینے یا ایک سال سے کم مدت کے لیے اسے قیام کرنے دینا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ اہلِ علم کا یہی قول ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر کوئی مشرک ان لوگوں سے جن سے حرمت والے مہینوں کے گزرتے ہی عہد

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٣٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٦١) مسند أحمد (٣/ ٤٨٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٣٣٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٦٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٢٠٥) مسند أحمد (١/ ٣٩٠) صحيح الجامع (٥٣٢٨)

ختم کر کے جنگ کرنا ٹھہرا ہے، اگر قتل سے امن چاہے تو اس کو امن دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سمجھ بوجھ لے اور اسلام کی دعوت کی حقیقت سے واقف ہو اور جان لے کہ یہ مخلوق کا کلام نہیں۔ صرف سننے کا ذکر کرنے پر اکتفا اس لیے کیا کہ ان کی تالیف میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ وہ لوگ اہلِ فصاحت ہیں، پھر اگر وہ اپنے گھر جانا چاہے تو اسے اس کے گھر پہنچا دو، تاکہ وہ اپنے معاملے میں خوب غور وفکر کر لے اور جان لے کہ ایمان لانے پر ثواب ملے گا اور شرک پر جمے رہنے سے عذاب ہوگا۔ پھر جب وہ گھر پہنچ جائے تو اب اس سے قتال کرو، اس میں نہ کوئی غدر ہے اور نہ خیانت، کیونکہ وہ تمھاری امان سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں آ گیا کہ اس کا خون کرنا جائز ہے اور جہاں ملے اس کا قتل کرنا واجب ہے۔

سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ [التوبة: ٣٦] ”اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔“[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قیامت تک کے لیے محکمہ ہے۔[3] یہ قوم جاہل ہے، انھیں اس وقت تک امان دینا ضروری ہے جب تک وہ قرآن کو سن اور سمجھ نہیں لیتے، اس میں غور وفکر نہیں کر لیتے اور پھر اپنی امن کی جگہ تک پہنچا نہیں دیے جاتے۔[4]

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

بھلا مشرکوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد کیونکر ہو سکتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے قریب عہد لیا تھا، پھر (جب تک) وہ تمھارے ساتھ سیدھے رہیں تو تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو۔ بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے ⑦

عہد شکن مشرکوں سے براءت کی تاکید:

صلح والوں کی تین قسمیں بیان فرمائیں: ایک وہ جن سے مدت نہیں ٹھہری ان کو جواب دیا، مگر جو مکے کی صلح میں شامل تھے، جب تک وہ عہد شکنی نہ کریں، یہ مکے کا احترام ہے، اور تیسرے جن سے مدت ٹھہری وہ صلح قائم رہی، لیکن آخر سب مشرک عرب کے ایمان لائے۔ اللہ نے اپنی وہ حکمت بیان فرمائی جو مشرکوں سے براءت کے اظہار

---

① الدر المنثور (٤/ ١٣٤) ② تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٥٦)
③ تفسير البغوي (٤/ ١٤) ④ فتح البيان (٥/ ٢٣٩ـ ٢٤٠)

میں اور انھیں چار مہینے تک کی مہلت دینے، پھر ان پر تلوار کشی میں تھی اور کہا کہ ان کو کس طرح امان مل سکتی ہے اور وہ کس طرح اپنے حال پر چھوڑے جا سکتے ہیں، حالانکہ وہ مشرک اور کافر ہیں اور اللہ اور رسول کے منکر ہیں۔

ہاں وہ لوگ جن سے حدیبیہ کے دن عہد ہو چکا تھا، ان سے ان کا عہد پورا کرو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ﴾ [الفتح: ۲۵] ''یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے۔'' جب تک کہ وہ اپنے جنگ نہ کرنے کے عہد پر قائم رہیں، وہ عہد دس برس تک کا تھا۔

چنانچہ نبیِ اکرم ﷺ اور مسلمانوں نے اس عہد اور ہدنہ یعنی صلح کو اہلِ مکہ کے ساتھ سنہ چھے ہجری تک نبھایا، یہاں تک کہ قریش نے اپنا عہد توڑ ڈالا اور ان کے حلیفوں بنوبکر نے خزاعہ پر چڑھائی کی۔ یہ نبیِ اکرم ﷺ کے حلیف تھے اور قریش نے ان کے ساتھ ہو کر حرم میں قتل کیا۔ اب مجبوراً نبی مکرم ﷺ کو ماہِ رمضان آٹھ ہجری میں ان سے لڑنا پڑا، اللہ تعالیٰ نے بلدِ حرام (مکہ) کو نبیِ اکرم ﷺ پر مفتوح فرمایا اور ان پر غلبہ بخشا۔ وللّٰہ الحمد والمنة. پھر ان میں سے جس نے بھی قہر و غلبہ کے بعد اسلام قبول کیا، اس کو رہائی دی، ان کا نام طلقاء ہوا، یہ تقریباً دو ہزار افراد تھے اور جو کوئی کفر پر جما رہا اور بھاگ گیا، ان کو امان دی کہ چار مہینے تک جہاں چاہو چلو پھرو۔ ان میں صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل وغیرہما تھے۔ پھر اللہ نے اس کے بعد ان کو مکمل اسلام کی ہدایت بخشی۔ وَاللّٰهُ مَحْمُوْدٌ عَلٰى جَمِيْعِ مَا يَقْدِرُهٗ وَيَفْعَلُهٗ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سوالیہ انداز کہ مشرکوں کے لیے کیوں کر عہد ہو سکتا ہے انکار کے لیے ہے۔ ان مشرکوں سے مراد وہی لوگ ہیں جنھوں نے عہد توڑ ڈالا، کیونکہ سورت براءت انھی کے بارے میں اتری ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کو امان دینا مشکل ہے۔ یہ اپنے جی میں تمھارے مخالف ہیں، بے وفائی اور عہد شکنی رکھتے ہیں، تم ان سے طمع نہ رکھو۔ جس نے اپنا عہد نہ پورا کیا، اللہ اور رسول کو کیا پڑی ہے کہ وہ ان سے اپنا عہد پورا کریں۔ پھر ان میں سے ان لوگوں کو الگ کر لیا جن سے عہد ہو چکا تھا اور انھوں نے عہد شکنی بھی نہیں کی تھی کہ ان سے لڑنا ضروری نہیں۔ مسجدِ حرام

سے مراد مسجدِ حرام کے قریب ہے، یعنی یوم حدیبیہ۔ یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1]

مسجدِ حرام سے مراد سارا حرم ہے اور یہ قرآن کریم کی عادت کے مطابق ہے، مگر جہاں کہ استثنا کیا ہے۔ سو جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اپنے قول و قرار پر قائم رہو، مراد بنو بکر ہیں یا بنو کنانہ و بنو ضمرہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد قریش ہیں۔ یہی امام ابن زید رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنو جذیمہ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنو خزاعہ ہیں۔[2]

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۸

کس طرح (مشرکوں سے عہد رہ سکتا ہے؟) جب کہ ان کا یہ حال ہے کہ اگر وہ تم پر غلبہ پالیں تو وہ تمھارے معاملے میں رشتے داری کا لحاظ کریں گے نہ کسی عہد کا۔ وہ اپنے مونہوں (زبانوں) سے تمھیں خوش کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں ⑧

مشرکوں کی بدطینتی:

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ان کی دشمنی پر ابھارا کہ ان سے بیزار ہو جاؤ، وہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان سے عہد کیا جائے، وہ تو اللہ کے ساتھ مشرک اور رسول کے منکر ہیں۔ اگر ان کو مسلمانوں پر غلبہ ہو جائے تو ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں اور کسی قرابت اور عہد کا لحاظ نہ کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "اِلّ" سے مراد قرابت اور ذمّہ سے مراد عہد ہے۔ یہی امام ضحاک اور سدی رحمہما اللہ کا قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِلّ" سے اللہ ہے، یعنی نہ اللہ کا خیال کریں نہ کسی اور کا۔ ابو مجلز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا لحاظ نہ کریں۔[3] اسی جگہ سے موضح قرآن میں لفظ "اِلّ" کا ترجمہ دینداری کیا ہے، لیکن امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ ظاہر اور زیادہ مشہور ہے، اس پر اکثر لوگ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ "اِلّ" سے مراد عہد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِلّ" بمعنی حلف ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ صحاح میں ہے: "اِلّ" عہد و قرابت کو کہتے ہیں۔[5] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِلّ" کے معنی میں لغتاً حدت نکلتی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اِلّ" سے مراد قرابت ہے، کسی نے کہا ہے کہ "اِلّ" کے معنی

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٣)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ١٤١۔ ١٤٤) فتح البيان (٥/ ٢٤٠)
[3] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٦۔ ١٤٧)
[4] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٧۔ ١٤٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٥)
[5] الصحاح للجوهري (٥/ ٣١٢)

جوائز ہے، یعنی تحالف (حلف اٹھاتے یا عہد و پیمان) کے وقت آواز اونچی کرنا۔ قاموس میں ''اِلّ'' بمعنی عہد و حلف و قرابت وغیرہ کہا ہے۔ امام ابن زید، سدی اور ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اِلّ'' عہد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ذمہ ہے۔[1]

امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبرانی میں ''اِلّ'' اللہ کا نام ہے اور ذمہ بمعنی عہد ہے یا بمعنی ضمان۔ امام ابوعبیدہ اور زہری رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ذمہ بمعنی امان ہے، جیسے نبی اکرم ﷺ کے فرمان میں ہے: «يَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ أَدْنَاهُمْ»[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اِلّ'' حلف ہے۔[3] امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ''اِلّ'' اللہ ہے۔[4]

پھر فرمایا کہ یہ لوگ باتیں بنا کر تمھارا جی خوش کر دیتے ہیں اور ان کے دل میں کچھ اور ہی بسا ہوا ہے، یہ تم کو نقصان و ضرر و زیان پہنچانا چاہتے ہیں، جس طرح اہلِ نفاق اور ذو وجہین (دو چہروں والے) کا حال ہوتا ہے کہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں اور ایسے کیوں نہ ہو کہ اکثر ان کے سرکش، بے باک اور دائرۂ حق سے خارج ہیں، انھوں نے عہد توڑ ڈالے اور اپنے قول و قرار کا کسی طرح سے خیال نہ رکھا، پھر ان کا یہ وصف بیان کیا:[5]

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱

انھوں نے اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت میں بیچا، پھر (لوگوں کو) اس کے راستے سے روکا، بے شک برا ہے جو وہ کرتے ہیں ⑨ وہ کسی مومن کے معاملے میں رشتے داری کا لحاظ کرتے ہیں نہ کسی عہد کا، اور وہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں ⑩ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں تو وہ دین میں تمھارے بھائی ہیں۔ اور ہم (اپنی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں ⑪

دنیا کے لیے دین بیچنے والے اور توبہ:

یعنی یہ جو فرمایا کہ حکمِ شرع میں بھائی ہیں، اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہری مسلمان ہے، دل سے یقین نہیں رکھتا، اس کو ظاہری حکم میں مسلمان گنیں اور معتمد و دوست نہ پکڑیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٧۔ ١٤٨) فتح القدير (٢/ ٤٨٧)

[2] فتح القدير (٢/ ٤٨٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٥١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٨٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٧١٢)

[3] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٧) [4] تفسير الطبري (١٤/ ١٤٦) الدر المنثور (٤/ ١٣٤) [5] فتح البيان (٥/ ٢٤١۔ ٢٤٣)

ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں مشرکوں کی مذمت کی ہے اور مومنوں کو ان کے قتال پر ابھارا ہے کہ وہ لوگ دنیا کے خسیس امور کے عوض کتاب اللہ کے اتباع سے باز رہتے ہیں اور مسلمانوں کو اس راہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ باقی آیت کی تفسیر گزر چکی۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے دنیا کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ خالص اللہ کی عبادت کرتا تھا، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا اور نماز قائم کی اور زکات دی تو اس نے دنیا کو چھوڑا کہ اللہ اس سے راضی ہے۔ یہی وہ اللہ کا دین ہے جو اس کے رسول لائے اور اللہ کی طرف سے ان کو پہنچایا۔ ہرج احادیث اور خیالات وخواہشات کے اختلاف سے پہلے۔ اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں ہے: ﴿فَاِنْ تَابُوْا... الخ﴾ (آیتِ باب) یعنی اگر توبہ کر کے بت پرستی چھوڑ دیں اور نماز پڑھیں، زکات دیں تو پھر ان سے کچھ تعرض نہ کرو۔ (رواہ البزار) دوسری آیت میں کہا ہے: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ﴾ (آیتِ باب) پھر امام بزار رحمہ اللہ نے کہا کہ میرے نزدیک حدیث کا آخری لفظ رَاضٍ تک ہے۔ باقی کلام ربیع بن انس رحمہ اللہ کا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ انھوں نے آیاتِ قرآن کو، جن میں عہد پورا کرنے کا حکم تھا، ایک تھوڑی قیمت سے بدل لیا، یعنی حطامِ دنیا (دنیا کی معمولی چیزیں) اور شہوات کی پیروی کو اختیار کیا۔ اس حقیر ثمن (قیمت) سے مراد وہ طعمہ (کھانا) ہے جو ابوسفیان نے ان کو کھلا کر عہد شکنی پر آمادہ کیا تھا، اس پر وہ راہِ حق سے پھر کر لوگوں کو بھی پھیرنے لگے۔ اہلِ طائف نے اموال سے ان کی مدد کی کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے لڑنے پر زبردست ہو جائیں۔ ان کی یہ عہد شکنی اور شرک اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکنا بہت برا کام ہے، یہ نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد و پیمان کا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ الفاظ کا دہرانا نہیں ہے، بلکہ اول سے مراد سارے مشرکین تھے اور اس سے مراد خاص یہود ہیں، اس پر دلیل یہ ہے کہ قلیل قیمت کے عوض آیاتِ الٰہی کو بیچنے والے یہی یہودی تھے۔[2]

اس آیت میں علی الاطلاق حقوقِ مومنین مراد ہیں اور پہلی آیت میں مراد خاص مومنین کی جماعت تھی۔ یہ لوگ حلال کو چھوڑ کر حرام کی طرف جاتے ہیں، یعنی عہد توڑ کر یا شرارت اور سرکشی میں انتہا درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ اس کے ساتھ اگر شرک اور عہد شکنی سے توبہ کر لیں اور بقول قتادہ رحمہ اللہ لات اور عزیٰ کو چھوڑ کر شہادت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ بجا لائیں اور احکامِ مفروضۂ اسلام کی پابندی کریں، جیسے نماز اور زکات ہے، تو پھر وہ دینِ اسلام میں تمھارے بھائی ہیں،[3] نفع ونقصان میں تمھارا اور ان کا ایک جیسا حال رہے گا۔ ہم نے یہ پتے اہلِ علم کو دیے ہیں۔ علما کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ ان پتوں سے فائدہ علم والوں کو ہوتا ہے نہ کہ جاہلوں اور بے وقوفوں کو۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠) مسند البزار (١٣/ ١٣٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٥۔ ٤٤٦) ضعيف الجامع (٥٧١٩)

[2] تفسير القرطبي (٨/ ٨٠) [3] تفسير الطبري (١٤/ ١٥٢)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت نے اہلِ صلات کے ساتھ لڑائی کرنا اور ان کا خون بہانا حرام کر دیا۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "أُمِرْتُمْ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ، فَمَنْ لَّمْ يُزَكِّ فَلَا صَلَاةَ لَهُ" امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: "أُفْتُرِضَتِ الصَّلَاةُ وَالزَّكَاةُ جَمِيعاً، لَمْ يُفَرِّقْ بَيْنَهُمَا وَأَبَى أَنْ يُقْبَلَ الصَّلَاةُ إِلَّا بِالزَّكَاةِ"

پھر کہا: اللہ ابوبکر پر رحم کرے، بڑے فقیہ تھے،[2] یعنی انھوں نے مانعینِ زکات کے حق میں کہا تھا: "وَاللّٰهِ لَا أُفَرِّقُ بَيْنَ شَيْئَيْنِ جَمَعَ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا" مراد نماز اور زکات ہے۔[3] میں کہتا ہوں کہ یہی حکم اسلام کے باقی بنیادی ارکان کا بھی ہے، یعنی روزہ، حج اور شہادتین۔ اس کی تقریر پہلے گزر چکی ہے۔ یہی مختار ہے ابن القیم وغیرہ اہلِ علم کا جو کتاب الصلاۃ وغیرہ میں ہے۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝۱۲

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں طعن کریں تو کفر کے (ان) سرداروں سے جنگ کرو، بے شک ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں، شاید کہ وہ باز آئیں (12)

بدعہد، طعنہ زن اور قسمیں توڑنے والے ائمۂ کفر سے لڑنے کا حکم:

یعنی اگر یہ ثابت ہو کہ ایک کافر ہمارے دین پر طعنہ زنی کرتا ہے تو وہ ذمی نہ رہا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یہ مشرک جن سے ایک مدت معین پر تمھارا عہد ہوا ہے، اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور تمھارے دین پر عیب جوئی کریں اور اس کو ناقص بتائیں اور تحقیر کریں تو پھر تم ان سے لڑو وہ کفر کے پیشوا ہیں۔ اسی جگہ سے یہ کہا ہے کہ جو کوئی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہے یا گالی دے یا دینِ اسلام میں طعن کرے یا اسلام کا ذکر عیب کے ساتھ کرے، وہ قتل کیا جائے۔ پھر اللہ نے کہا کہ شاید وہ اس قتال کے سبب سے اپنے کفر و دشمنی اور گمراہی سے باز رہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ائمۂ کفر سے مراد ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور اُمیہ بن خلف جیسے لوگ ہیں۔ اسی طرح اور لوگوں کا نام لیا۔[4]

مصعب رحمہ اللہ نے کہا: میرے باپ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا گزر ایک خارجی شخص کے پاس سے ہوا، اس خارجی نے کہا کہ یہ شخص ائمۂ کفر سے ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: تو جھوٹا ہے، بلکہ میں نے تو ائمۂ کفر سے قتال کیا ہے۔[5] (رواه ابن مردويه)

---

[1] فتح القدير (٢/ ٤٨٨) [2] تفسير الطبري (١٤/ ١٥٣)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٧١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٨/ ١٧٧) اس کی سند صحیح ہے۔ فتح البيان (٥/ ٢٤٣ـ ٢٤٤)

[4] تفسير الطبري (١٤/ ١٥٤) [5] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٦)

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "مَا قُوْتِلَ أَهْلُ هَذِهِ الْآيَةِ بَعْدُ"[1] سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2] صحیح یہ ہے کہ آیت عام ہے اگرچہ یہ مشرکینِ قریش کے حق میں اتری ہے، لیکن قریش وغیرہم کو شامل ہے۔ واللہ أعلم.

عبدالرحمان بن جبیر بن نفیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں لوگوں کی طرف گیا، جب کہ انھوں نے کچھ آدمی شام کی طرف روانہ کیے، فرمایا تم ایسی قوم پاؤ گے جن کے سر اندر سے خالی ہیں، سو معاقد شیطان (شیطان کے ساتھ عہد کرنے والے) کو تلواروں سے مارو، سو قسم ہے اللہ کی کہ اگر میں ان میں سے ایک آدمی کو قتل کروں تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ اس کے سوا دوسرے ستر آدمی قتل کروں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ فَقَٰتِلُوٓاْ أَئِمَّةَ ٱلۡكُفۡرِ ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواه ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر وہ عہد شکنی کریں اور اس پر دین میں بھی عیب لگائیں تو پھر ان ائمہ کفر سے لڑو، یہ لڑنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ ائمہ امام کی جمع ہے، مراد صنادیدِ مشرکین، یعنی کافروں کے سردار ہیں جو عموماً ریاست رکھتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جیسے ابوسفیان و سہیل بن عمرو وغیرہما کہ انھوں نے اللہ کا عہد توڑ ڈالا تھا اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے سے نکال دینا چاہا تھا۔ یہی بات مالک بن انس رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد قریش کے رؤسا ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دیلم ہیں۔[4]

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اب تک اس آیت والے لوگ نہیں آئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فارس وروم ہیں۔[5] زیادہ قریب صحت کے یہ ہے کہ آیت کسی خاص زمانے یا گروہِ مقرر کے ساتھ مقید کرنے کے آیت عام ہے اور تمام رؤسائے کفر کے بارے میں ہے، لفظ کی عمومیت کی وجہ سے، اگرچہ سبب خاص ہو۔ چنانچہ ابن جبیر کی روایت جو اوپر گزری، وہ یہی مفہوم ظاہر کرتی ہے۔

﴿ أَيۡمَٰنَ ﴾ "يَمِيْن" کی جمع ہے، عہد کا نام یمین رکھا، اس لیے کہ قسم غالباً عہد پر مشتمل ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی قسمیں سچی نہیں ہیں، اگرچہ ظاہر میں قسم کھا لیتے ہیں، ہمارے نزدیک کافر کی قسم شرعی ہے اور یہ استدلال کہ کافر کی قسم کچھ قسم نہیں، ظاہری طور پر ضعیف ہے، کیونکہ اس سے عہد و پیمان کی نفی ہوتی ہے قرینے سے اگرچہ وہ اپنی قسم توڑ ڈالیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ یہ قسم توڑنے والے لوگ جو دین میں طعن کرتے ہیں، کچھ اللہ پر ایمان نہیں لائے ہیں کہ ان کے خون اور مال کی حفاظت مسلمانوں پر لازمی ہو، بلکہ ان سے لڑنا مسلمانوں پر واجب ہے شاید وہ اس قتال کی وجہ سے کفر، عہد شکنی اور دین میں طعن کرنے سے باز رہیں۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ذمی دین

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٥٥) [2] الدر المنثور (٤/ ١٣٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٦١) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٦)
[4] تفسير الطبري (١٤/ ١٥٥) الدر المنثور (٤/ ١٣٦) [5] تفسير البغوي (٤/ ١٧)

میں طعن کرنے سے قتل نہیں کیا جائے گا، جب تک کہ عہد شکنی نہ کرے۔

یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کے قتل کا حکم دو شرط پر دیا ہے: ایک عہد شکنی، دوسرے دین میں طعن کرنا۔ رہے امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ وغیرہما سو ان کا مذہب یہ ہے کہ دین میں طعن کرنے پر قتل کیا جائے گا، اس لیے کہ اس طعن سے عہد ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ذمی سے صرف عہد شکنی ہو بغیر طعن فی الدین کے تو بھی وہ مارا جائے گا۔[1]

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٥﴾

کیا تم ان لوگوں سے نہیں لڑو گے، جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ ڈالیں اور رسول کو (مکہ سے) نکالنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے ہی پہلے پہل تم سے لڑائی شروع کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالاں کہ اللہ ہی زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو ⑬ ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا ⑭ اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے ⑮

عہد شکنوں سے قتال کرنے کی ترغیب اور اس کے فوائد:

اس میں بھی ایک طرح سے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے اور ابھارا گیا ہے کہ وہ عہد شکن مشرکوں سے قتال کریں، جنھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ نبیِ اکرم ﷺ کو مکہ معظمہ سے نکال دیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴾ [الأنفال: ٣٠] ''اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے، تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر

[1] فتح البیان (٥/ ٢٤٤۔ ٢٤٦)

رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴾ [الممتحنة: ١] "وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلا وطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم میرے راستے میں نکلے ہو، جہاد اور میری رضا ڈھونڈنے کے لیے (تو کفار کو دوست نہ بناؤ)، تم ان کو دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو، اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا، تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔" نیز فرمایا: ﴿ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٦] "اور بلاشبہ قریب تھا کہ وہ آپ کو اس زمین (مکہ) سے اُکھاڑ دیں، تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں، اور تب آپ کے پیچھے وہ تھوڑا ہی ٹھہر پاتے۔"

﴿ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ سے مراد بدر کا دن ہے کہ اس وقت وہ کاروان کی مدد کے لیے نکلے تھے، جب قافلہ بچ گیا اور انھوں نے جان لیا کہ ہاں بچ گیا تو چاہیے تھا کہ واپس چلے جاتے، لیکن اپنے ارادے پر جنگ کے لیے ڈٹے رہے۔ یہ ان کا تکبر اور سرکشی تھی، چنانچہ یہ حال مفصلاً اوپر گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد اپنے حلیفوں کے ساتھ عہد شکنی اور لڑائی ہے۔ بنو بکر ان کے حلیف تھے، بنو خزاعہ نبیِ اکرم ﷺ کے حلیف تھے، یہاں تک کہ فتح کے سال نبیِ اکرم ﷺ ان کی طرف روانہ ہوئے۔ وَكَانَ مَا كَانَ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

پھر اللہ نے کہا کہ تم ان سے کیا ڈرتے ہو، مجھ سے ڈرو کہ ڈرنے کے لائق میں ہوں۔ بندوں کو میری پکڑ اور سزا کا ڈر ہونا چاہیے، ہر امر کا اختیار تو میرے ہاتھ میں ہے۔ مَا شِئْتُ كَانَ وَمَا لَمْ أَشَأْ لَمْ يَكُنْ.

پھر مومنوں کو شریعتِ جہاد کی حکمت بتائی اور عزیمت دلائی اور کہا کہ باوجود اس کے کہ ہم دشمن کو ہلاک کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، چاہیں تو ایک دم میں سب کو خاک سیاہ کر دیں، لیکن مصلحت یہی ہے کہ وہ تمھارے ہاتھوں سے عذاب اور رسوائی میں پڑیں اور تم فتح یاب ہو کر اپنا جی ٹھنڈا کرو۔ یہ حکم تمام مومنین کے حق میں عام ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قومِ مومنین سے مراد خزاعہ ہیں۔[1]

امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب عائشہ رضی اللہ عنہا کو غصہ آتا تو نبیِ اکرم ﷺ ان کی ناک پکڑ کر فرماتے: اے عویش! کہہ: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ اِغْفِرْ ذَنْبِيْ وَاذْهَبْ غَيْظَ قَلْبِيْ وَأَجِرْنِيْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ»[2] پھر فرمایا کہ اللہ جس کی چاہتا ہے توبہ قبول کرتا ہے، اس کو اپنے بندوں کی مصلحت معلوم ہے وہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٦٣)

[2] تاریخ دمشق (٦٨/ ١٨١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤٢٠٧)

اپنے افعال واقوال کونیہ وشرعیہ میں حکیم و دانش مند ہے، جو چاہے سو کرے اور جس طرح چاہے حکم دے۔ فَهُوَ الْعَادِلُ الْحَاكِمُ الَّذِيْ لَا يَجُوْرُ أَبَداً وَلَا يُضِيعُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ خَيْرٍ وَشَرٍّ بَلْ يُجَازِيْ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ بھلا وہ قوم جس نے اپنی قسم توڑ ڈالی اور دار الندوہ میں اکٹھے ہو کر یہ صلاح کی کہ اللہ کے پیغمبر کو مکے سے نکال دیں، گو وہ ان کے نکالے نہ نکلے، بلکہ اللہ کے حکم و اذن سے ہجرت کی، کب اس لائق ہے کہ ان کو بے لڑے بھڑے چھوڑ دیا جائے۔ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ انھوں نے تین امور میں سے ایک امر کا پختہ ارادہ کیا تھا: قتل کرنے یا محبوس کرنے یا نکال دینے کا۔ یہاں ذکر فقط نکال دینے کا کیا ہے، اس لیے کہ ایسے امر کا کچھ اثر تو ظاہری طور واقع ہوا۔ دار الندوہ ایک جگہ تھی، جہاں باتوں کے لیے جمع ہوتے تھے۔ قصی نے اس کو بنایا تھا، اب وہ مسجد میں داخل ہو گئی ہے۔ مقامِ حنفی وہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مجھ پر بھی اسی قسم کا ماجرا گزرا کہ ہر تین مذکور امور کا ارادہ میرے ساتھ ہوا، لیکن اللہ پاک نے محض اپنے رحم و کرم سے مجھ کو بچا لیا، فقط ایک ذرا سا اثر ناتمام نکالے جانے کا یوں ہوا کہ ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں آٹھ ماہ تک رہنا پڑا، پھر حالت بدستور ہو گئی۔ وللہ الحمد والمنة.

اول بار سے یومِ بدر مراد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ اس امر کی ہدایت سنہ سات ہجری میں عمرۂ حدیبیہ میں ہوئی تھی۔ قریش نے یومِ حدیبیہ کو طے پانے والا اپنا عہد توڑ ڈالا اور قصد کیا کہ اگر یہ لوگ مکے میں آئیں تو ان کو نکال دینا چاہیے، یہ نکالنے کے بارے میں ان کا ارادہ تھا، لیکن خزاعہ نے اس بات پر اتفاق نہ کیا جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے سے نکلے تو قریش نے خزاعہ سے کہا کہ تم نے ہم کو ان کے اخراج سے اندھا کر دیا، پھر اس پر خزاعہ کے کچھ لوگ مار ڈالے۔[1] اللہ نے فرمایا کہ اس ڈر سے کہ تمھیں کوئی غیر پسندیدہ چیز پہنچے تم ان سے لڑنا نہیں چاہتے تم کو تو یہ چاہیے کہ صرف اللہ ہی سے ڈرو، اگر اللہ پر ایمان لائے ہو، کیونکہ ایمان کا حکم اسی امر کو واجب کرتا ہے۔

پھر بعد والی آیت سے اس بات کی تاکید فرمائی اور اس امر پر کئی فائدے مرتب کیے: ایک مومنوں کے ہاتھوں کافروں کا قتل اور گرفتاری۔ دوسرے ان کو قید کر کے رسوا کرنا یا ذلیل و خوار کر کے۔ تیسرے ان پر مسلمانوں کو فتح یاب کرنا۔ چوتھے ان مومنین کے دل ٹھنڈے کرنا جو جنگ میں حاضر نہ تھے۔ پانچویں دلوں کے غصے کا دور ہونا ایک ہی چیز ہے تو یہ ایک بات کو دہرانا ہے، سو دل سینے کی نسبت ایک خاص چیز ہے یا سینوں کی شفا میں فتح کے وعدے کا اشارہ ہے اور دلوں کے غصے کا دور ہونا فتح کے واقع ہونے کا اشارہ ہے اور یہ سب باتیں واقع ہوئیں۔ وللہ الحمد.

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول خزاعہ کے بارے میں ہے۔ امام مجاہد، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح روایت ہے۔[2] اس قصے کو ابن اسحاق نے اپنی کتابِ سیرت میں تفصیل سے لکھا ہے۔[3] پھر اللہ نے خبر دی کہ

---

[1] الدر المنثور (٤/ ١٣٧۔ ١٣٨)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٦٣) الدر المنثور (٤/ ١٣٨)
[3] دلائل النبوة للبيهقي (٥/ ٥۔ ٩) الدر المنثور (٤/ ١٣٨۔ ١٣٩)

بعض کفار اپنے کفر سے توبہ کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فتح مکہ کے دن بعض اہلِ مکہ اسلام لائے اور اچھے مسلمان بن گئے، جیسے: ابوسفیان، عکرمہ، سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہم، حالانکہ یہ پہلے ائمہ کفر تھے، اللہ نے ان پر احسان کیا کہ مسلمان ہو گئے۔ [1]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمھیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا؟ جب کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہیں بنایا اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ ان کی خوب خبر رکھتا ہے ⑯

جہاد کی ایک حکمت... اہلِ ایمان کا امتحان:

اللہ نے فرمایا: اے ایمان والو! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم بے کار چھوڑ دیے جاؤ گے، تمھارا امتحان ان کاموں میں نہیں ہوگا جن سے سچے اہلِ عزم جھوٹوں سے ظاہر ہو جائیں۔ ﴿ وَلِيْجَةً ﴾ سے مراد بِطَانَه و دَخِيْلَه ہے، یعنی ہمراز و دمساز۔ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۱۔۳] ”الٓمّٓ۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے، چناں چہ اللہ ان لوگوں کو ضرور ظاہر کرے گا جنھوں نے سچ بولا، اور وہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جو جھوٹے ہیں۔“

نیز فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۴] ”(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلیں) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ

[1] فتح البیان (۵/ ۲۴۷۔ ۲۴۹)

اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۱۷۹] ''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علاحدہ کر دے اور نہ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

حاصل یہ ہے کہ جب اللہ نے جہاد کو مشروع کیا تو اس میں اس کی جو حکمت تھی وہ بیان فرمائی۔ وہ حکمت یہ ہے کہ بندوں کا امتحان لے کہ کون مطیع اور کون نافرمان ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ جو ہو چکا اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کو جاننے والا ہے اور یہ بھی وہ جانتا ہے کہ جو بات نہیں ہوئی وہ اگر ہوتی تو کیونکر ہوتی، اس کو ہر چیز کا علم اس کے ہونے سے پہلے ہی سے ہے اور اس چیز کے حال کے مطابق اس کو علم ہے۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ وَلَا رَادَّ لِمَا قَدَّرَهُ وَأَمْضَاهُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ وَلِيْجَةً ﴾ ''وَلُوْج'' سے مشتق ہے بمعنی داخل ہونا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَلِيْجَةً ﴾ سے مراد بطانہ یعنی وہ شخص ہے جو کسی کے امورِ باطن میں مداخلت کرے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَلِيْجَةً ﴾ بہ معنی خیانت ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بمعنی خدیعت۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ معنی معتمد علیہ۔[2]

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۱۷ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۸

مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ انھی لوگوں کے (سب) اعمال برباد ہو گئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ⑰ اللہ کی مسجدیں تو صرف وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا، لہٰذا امید ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے ⑱

---

[1] معاني القرآن للفراء (۲/ ۹۷) [2] تفسير الخازن (۳/ ٦٧) فتح البيان (٥/ ٢٥٠۔ ٢٥١)

مشرک اللہ کی مساجد کے آباد کار نہیں:

مشرکوں کا کام نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں اور خود کفر پر قائم رہیں۔ وہ لوگ خراب ہو گئے ان کے اعمال اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ پر ایمان لائیں، آخرت کے دن پر ایمان لائیں، نماز قائم کریں، زکات دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ سو امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت والوں میں ہوں۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ مسجدیں صرف اللہ کے نام پر بنائی جاتی ہیں، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، مشرکوں کو ان مساجد کو آباد کرنے اور بنانے کا کوئی حق نہیں۔ جس نے مسجد (واحد) پڑھا ہے اس کی مراد مسجدِ حرام ہے، کیونکہ وہ تمام مساجد سے اشرف ہے جو زمین میں پہلے دن ہی سے خالص اللہ کی عبادت کے لیے خلیل الرحمان (حضرت ابراہیم) نے بنائی ہے، لیکن بعد میں اس کے متولی بننے والے لوگ اپنی جان پر شرک کی گواہی دیتے اپنی زبانِ حال اور قال سے کفر کا اقرار کرتے ہیں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو اگر کسی نصرانی سے پوچھے کہ تیرا دین کیا ہے؟ تو وہ یہی کہے گا کہ میں نصرانی ہوں، یہودی کہے گا کہ میں یہودی ہوں، مشرک کہے گا کہ میں مشرک ہوں، صابی کہے گا کہ میں صابی ہوں۔[1] سو ان لوگوں کے اعمال اکارت گئے، یعنی شرک کے سبب سے، یہ تو ہمیشہ دوزخ میں بود و باش کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الأنفال: ٣٤] ''اور (اب) ان کے لیے کونسی وجہ ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جبکہ وہ (لوگوں کو) مسجد حرام سے روکتے ہیں، حالاں کہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو متقی لوگ ہی ہیں اور لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔''

مساجد کی آباد کاری اہلِ ایمان کا شیوہ:

اس لیے اس کے بعد مساجد کو تعمیر کرنا مومنوں کی طرف منسوب کیا اور اللہ تعالیٰ نے مساجد تعمیر کرنے والے کے ایمان کی شہادت دی۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جب کسی آدمی کو دیکھو کہ مسجد سے تعلق رکھتا ہے تو اس کے لیے ایمان کی گواہی دو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ ... الخ ﴾ (آیتِ باب)[2] (رواه أحمد والترمذي و ابن مردويه والحاكم)

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٦٥)

[2] مسند أحمد (٣/ ٦٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٣) مستدرك الحاكم (١/ ٣٣٢) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٠٩)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ مرفوع یہ ہیں کہ مسجدوں کو آباد کرنے والے اہل اللہ ہیں۔ (رواہ عبد بن حمید) ابوبکر بزار کے الفاظ بھی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح ہیں: ”إِنَّمَا عَمَّارُ الْمَسَاجِدِ هُمْ أَهْلُ اللّٰهِ“[1] دارقطنی نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ان الفاظ میں بیان کی ہے: ”إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ عَاهَةً نَظَرَ إِلٰى أَهْلِ الْمَسَاجِدِ فَصَرَفَ عَنْهُمْ“ یہ حدیث غریب ہے۔[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھ کو اپنی عزت اور جلال کی قسم! میں زمین والوں پر عذاب کا قصد کرتا ہوں، پھر جب ان لوگوں کی طرف دیکھتا ہوں جو میرے گھروں کو آباد رکھتے ہیں اور میرے سبب سے آپس میں محبت رکھتے ہیں اور سحر کے وقت استغفار کرتے ہیں تو میں ان سے اس عذاب کو پھیر دیتا ہوں۔[3] (رواه الحافظ البهاء في المستقصٰی وقال ابن عساكر: حديث غريب)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، جیسے بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ جو بکری دور اور کنارے پر ہوتی ہے اس کو پکڑ لیتا ہے۔ سو بچو تم راہوں سے اور لازم پکڑو جماعت و عامہ و مسجد کو۔[4] (رواه أحمد) عمرو بن میمون اودی کہتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو پایا، وہ کہتے تھے کہ مساجد زمین پر اللہ کے گھر ہیں۔ اللہ پر حق ہے کہ ان گھروں کی زیارت کرنے والوں کی عزت و اکرام کرے۔[5] (رواه عبدالرزاق)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو کوئی نماز کی اذان سن کر اس کا جواب نہ دے اور مسجد میں نہ آئے تو اس کی نماز نہیں ہوئی وہ اللہ اور رسول کا نافرمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ ﴾ (آیتِ باب) (رواه ابن مردويه) دوسری وجہ سے یہ حدیث مرفوعاً بھی آئی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ”وَلَهُ شَوَاهِدُ مِّنْ وُجُوْهٍ آخَرَ لَيْسَ هٰذَا مَوْضِعُ بَسْطِهَا“ اقامتِ نماز کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ نماز بدنی عبادت میں سب سے بڑی عبادت ہے اور زکات افضل اعمال متعدیہ ہے۔ ایسا شخص جب سوائے اللہ کے کسی سے نہیں ڈرتا تو وہ راہ یاب ہوتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو کوئی اس چیز پر ایمان لایا جو اللہ نے اتاری ہے اور نماز پڑھی، زکات دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا، یعنی عبادت نہ کی مگر اللہ کی تو وہ پرہیزگار ہوا۔ اس جگہ ”عسیٰ“ کا لفظ اس آیت

---

[1] المعجم الأوسط (٣/ ٦٧) مسند عبد بن حميد (١/ ٣٨٧) مسند البزار (١٣/ ٣٢٩) اس کی سند میں ”صالح بن بشیر مری“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٦٨٢) البتہ اس موضوع میں دوسری روایت صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٢٨)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٤٨) اس کی سند میں ”عثمان بن دینار“ ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٣٤٥)

[3] شعب الإيمان (٣/ ٨٢) اس کی سند میں ”صالح مری“ ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٧٥١)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٣٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ علاء بن زیاد کا سماع سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٤٧٧)

[5] تفسير الصنعاني (٣/ ٦١)

کی مثل ہے: ﴿عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [بني إسرائیل: ۷۹] ''امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر کھڑا کرے گا۔'' اس مقام سے مراد شفاعت ہے۔ قرآن میں ہر ''عسیٰ'' واجب کے لیے آتا ہے۔ امام محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ نے کہا: ''عسیٰ'' اللہ کی طرف سے حق ہے، یعنی ثابت ہے۔[1]

شہادت سے مراد:

فتح البیان میں ہے کہ لفظ ﴿مَا كَانَ﴾ کے معنی ہیں: ''مَا یَنْبَغِيْ وَلَا یَصِحُّ''. تعمیر سے مراد عمارت معتد بہا (قابلِ اعتبار) ہے، مساجد سے مراد مسجدِ حرام ہے۔ بدلیل ''عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ''۔ اسمائے جنس میں جمع سے واحد مراد لینا جائز ہوتا ہے اور ایک قراءت مسجد ہے۔ اس میں سب مسجدیں داخل ہیں اور مسجدِ حرام بدخولِ اولیٰ داخل ہے۔ شہادت سے مراد اظہارِ کفر ہے کہ اس میں بت کھڑے کیے جائیں، ان کی پوجا کی جائے، انھیں الٰہ ٹھہرایا جائے، گو اپنی زبان سے اس کفر کا انکار کیوں نہ کریں۔ سو یہ دونوں امر جو ایک دوسرے کے منافی ہیں جمع نہیں ہو سکتے، کیونکہ مسجدوں کا تعمیر کرنا مومنین کی شان ہے اور اپنی جان پر کفر کی شہادت دینا اس شخص کی شان نہیں ہے جو عمارتِ مساجد سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ طواف میں کہتے تھے: ''لَبَّیْكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ إِلَّا شَرِیْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ'' اور پھر یہ کہتے تھے کہ ہم لات و عزیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

غیر مسلم کا عمل:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ شہادت سے مراد بتوں کو سجدہ کرنا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفر کی بات منہ سے نکالنا ہے۔[2] سو جو لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں اور ان کو یہ گمان ہے کہ یہ مساجد کی تعمیر عملِ خیر ہے، مثل حجابت (دربان بننے) اور سقایت (پانی پلانے) وفکِ اسیر (قیدیوں کو چھڑانے) کے تو ان کے اعمال کفر کے ہوتے ہیں، کچھ خیر کا اثر نہیں رکھتے، بلکہ وہ خود آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ اس آیتِ شریفہ سے باشارۃ النص یا خطاب کے ذریعے سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ اگر غیر مسلم کوئی مسجد بنائے تو اس وجہ سے کہ اس کا عمل ضائع ہے، وہ جگہ مسجد کے حکم میں نہیں ہوگی اور نہ اس کو یہ لائق تھا کہ وہ کافر ہو کر ایسا کرے اور اگر کیا ہے تو اسے اس کا کچھ ثواب نہیں ملے گا، وہ خود تو ناری ہے اور اس کا یہ عمل تباہ، اور وہ مسجد حکمِ زمین میں ہوگی نہ کہ اللہ کا گھر۔ اس جگہ پر اس مسئلے میں کسی مفسر نے اعتراض نہیں کیا، حالانکہ اظہر ہے، کیونکہ اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے، خصوصیتِ سبب کا نہیں اور یہ بات کیسے ہوسکتی ہے کہ کافر کی بنائی مسجد عملِ خیر ٹھہرے یا وہ اس عمل پر اجر کا مستحق ٹھہرے، اس لیے کہ مسجد کا تعمیر کرنا اہلِ ایمان کا کام ہے جو زمین کے کناروں میں کسی جگہ بھی ہو۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ١٦٧۔ ١٦٨) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٤٨۔ ٤٤٩) [2] تفسیر البغوي (٤/ ٢٠)

تعمیر سے مراد:

تعمیر سے مراد عمارت کا بنانا اور اس کی تزئین اس کے فرش و چراغ وغیرہما سے ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ عمارت سے مراد عموم ہے۔ اس میں شکستہ مسجد کی مرمت اس کی صفائی اور اس میں علوم کی درس و تدریس اور اسی طرح کے کام داخل ہیں۔[1] مسجدِ حرام کا اس میں اندراج کچھ حال کے مقتضا کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ ایجاب مثل سلب (چھین لینا) کے نہیں ہوتا۔ اس جگہ مراد مسجد کی عمارت کا حقیقی وجود ہے نہ کہ مسجد کی عمارت کا عالی شان اور اعلیٰ پائے کی ہونا۔

یوم آخر:

یومِ آخر سے مراد ایمان لانا ہے، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اعمال کا حساب و کتاب اور بدلہ وغیرہ پر۔ یہ قرآنی آیت کے عین مطابق ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ بَنٰی لِلّٰهِ مَسْجِداً صَغِیْراً کَانَ أَوْ کَبِیْراً بَنَی اللّٰهُ لَهٗ بَیْتاً فِي الْجَنَّةِ»[2] (أخرجه الترمذي) سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: «مَنْ بَنٰی مَسْجِداً یَّبْتَغِيْ بِهٖ وَجْهَ اللّٰهِ بَنَی اللّٰهُ لَهٗ بَیْتا فِي الْجَنَّةِ»[3] مسجد کی ملازمت و تعمیر اور اس کے دوسرے کاموں میں تردد (کوشش) کرنا اللہ کو خوش کرنے کے لیے، اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔

آیت میں کافروں کے لیے ایسے کاموں سے کسی قسم کے فائدہ پہنچنے کے امکان اور طمع کو بالکل ختم کر دیا ہے، کیونکہ حق کی ہدایت کا نصیب ہو جانا صرف ان لوگوں کے حق میں فرمایا ہے جن میں مذکورہ چاروں اوصاف پائے جاتے ہیں۔ سو کفار میں ان میں سے ایک وصف بھی موجود نہیں ہوتا۔[4]

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٩﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ

---

[1] تفسیر أبي السعود (٤/ ٥١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣١٩) اس کی سند میں "عبدالرحمان مولیٰ قیس" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٦٧١٧)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٣)

[4] فتح البیان (٥/ ٢٥١_ ٢٥٥)

وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجدِ حرام کو آباد کرنا اس شخص کے (اعمال کے) مانند قرار دے رکھا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا⑲ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں⑳ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے رحمت اور رضا مندی اور ایسے باغوں کی خوش خبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہوں گی㉑ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ بے شک اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے㉒

حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجدِ حرام کی عمارت سازی ایمان و جہاد کے برابر نہیں:

اوپر سے یہاں تک پانچ آیتیں نازل ہوئیں، اس پر سیدنا علی اور عباس رضی اللہ عنہما میں کچھ گفتگو ہوئی۔ آخر کو سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر تم اول ہجرت کرتے تو جہاد میں حاضر ہوتے اور بلند مرتبے پاتے، جیسے ہم نے پائے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم بھی اللہ کے کام میں تھے، حاجیوں کی خدمت کی اور مسجدِ حرام آباد کی۔ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کام ان کے برابر نہیں اور مشرکوں کی خدمت قبول نہیں، کوئی مسلمان خدمت کرے تو وہ قبول ہے۔[1]

ان آیتوں کو سمجھ کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کو مکے سے نکال دیا اور ہمیشہ کے لیے حکم ہوا کہ کافر مکے میں نہ جائیں۔ علما نے لکھا ہے کہ کافر اگر مسجد بنانا چاہے تو اسے منع کرنا چاہیے۔ اس سے یہ نکلتا ہے کہ پیغمبر کی قرابت سے عمل کا درجہ بڑا ہے کہ عباس رضی اللہ عنہ قرابت میں تھے اور علی رضی اللہ عنہ عمل میں زیادہ تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مشرکین کہتے تھے کہ بیت اللہ کی تعمیر کرنا اور حاجیوں کو پانی پلانا ایمان لانے اور جہاد کرنے سے بہتر ہے۔ وہ حرم پر فخر کرتے تھے اور اس بات کا گھمنڈ رکھتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں، اللہ نے ان کے تکبر کرنے اور منہ پھیرنے کا ذکر کیا اور مشرکینِ اہلِ حرم سے کہا: ﴿ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٦٦۔ ٦٧] ”تحقیق میری آیات تم پر تلاوت کی جاتی تھیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتے تھے۔ تکبر کرتے ہوئے، (اور) اس کے بارے میں افسانہ خوانی کرتے ہوئے تم بیہودہ گوئی کرتے تھے۔“

---

① تفسیر الطبري (١٤/ ١٧٠)

پھر ایمان لانے اور نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ جہاد کرنے کو خانہ کعبہ کی تعمیر کرنے اور حاجیوں کو پانی پلانے سے بہتر فرمایا کہ یہ کام شرک کے ساتھ ان کو کچھ نفع نہیں دیتے گو وہ بیت اللہ کی تعمیر کریں یا حاجیوں کو پانی پلائیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو اہلِ عمارت (خانہ کعبہ کو تعمیر کرنے والا) خیال کیا تھا، اللہ نے ان کا نام ظالم اور ستم گر رکھا۔ بھلا شرک کے ہوتے ہوئے مسجد کا آباد کرنا کہیں کچھ کام آ سکتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب عباس بدر کے دن اپنے یاروں کے ساتھ گرفتار ہوئے، مسلمانوں نے ان کو عار دلائی کہ تم مشرک ہو، سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ ہم عامرِ مسجدِ حرام تھے، قیدی کو چھڑاتے، بیت اللہ کی دربانی کرتے، حاجیوں کو پانی پلاتے، اس پر یہ آیت آئی۔ یعنی یہ کام تم نے شرک کی حالت میں کیے تھے اور جو کام شرک کی حالت میں ہوتا ہے اللہ اس کو قبول نہیں کرتا۔

شانِ نزول:

امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول سیدنا علی اور عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں ہوا ہے۔ ان دونوں کے درمیان یہ بات چیت ہوئی تھی۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ طلحہ بن شیبہ قبیلۂ بنی عبدالدار اور عباس بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم نے باہم افتخار کیا۔ سیدنا عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں صاحبِ خانہ ہوں، بیت اللہ کی کنجی میرے پاس ہے، میں اگر چاہوں تو رات کو کعبے کے اندر رہا کروں۔ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ساقی ہوں، زمزم کا داروغہ ہوں، اگر چاہوں تو رات مسجد میں بسر کروں۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نہیں جانتا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے سب لوگوں سے چھے ماہ پہلے قبلے کی طرف نماز پڑھی ہے اور میں صاحبِ جہاد ہوں، اس پر یہ آیت اتری۔

اسی طرح امام سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے مگر ان الفاظ کے ساتھ کہ علی، عباس اور شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہم نے فخر کیا۔ حسن رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت کا نزول علی، عباس، عثمان اور شیبہ کے حق میں ہوا ہے، انھوں نے اس بارے میں بات چیت کی تھی۔ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ مجھے سقایہ (پانی پلانا) چھوڑنا پڑے گا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی سقایہ پر قائم رہو، تمھارے لیے اس میں بہتری ہے۔[1] اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے۔

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے کہا: میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں اسلام لانے کے بعد کوئی عمل نہ کروں سوائے اس کے کہ حاجیوں کو پانی پلاؤں۔ دوسرے نے کہا: میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ کوئی عمل بجا لاؤں اسلام کے بعد مگر یہ کہ مسجدِ حرام کو آباد رکھوں۔ تیسرے شخص نے کہا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا افضل ہے تمھاری باتوں سے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم نبیِ اکرم ﷺ کے منبر کے نزدیک اپنی آوازوں کو اونچا مت کرو، وہ جمعے کا دن تھا۔ انھوں نے کہا: کہ جب ہم جمعہ پڑھ چکیں گے تو نبیِ اکرم ﷺ کے پاس جا کر پوچھیں گے، اس پر یہ آیت اتری۔[2] (رواہ عبدالرزاق)

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٧٠ـ ١٧٢) [2] تفسير الصنعاني (٢/ ٢٦٨)

اس حدیث کا دوسرا طریق یہ ہے کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”كُنْتُ عِنْدَ مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ نَفَرٍ مِّنْ أَصْحَابِهِ فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْهُمْ: مَا أُبَالِيْ أَنْ لَا أَعْمَلَ عَمَلًا بَعْدَ الْإِسْلَامِ إِلَّا أَنْ أَسْقِيَ الْحَاجَّ، وَقَالَ آخَرُ: بَلْ عِمَارَةُ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَقَالَ آخَرُ: بَلِ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِمَّا قُلْتُمْ، فَزَجَرَهُمْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ وَقَالَ: لَا تَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُمْ عِنْدَ مِنْبَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَذٰلِكَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، دَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَفْتَيْتُهُ فِيْمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ، قَالَ: فَفَعَلَ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ: أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ اِلَخْ“[1]

(رواه مسلم في صحيحه وأبو داود وابن جرير وهذا لفظه وابن مردويه وابن أبي حاتم في تفاسيره وابن حبان في صحيحه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے ان اعمال کے درمیان، جو جاہلیت میں کیے جاتے تھے، جن کی صورت خیر کی سی ہے، گو اس سے فائدہ مند نہ ہوں اور ایمان اور جہادِ مومنین کے درمیان برابری کا انکار کیا ہے۔ مشرکوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر پر بڑا فخر تھا اور اس کو مسلمانوں کے اعمال پر فضیلت دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کے درمیان ان کے اعمال کی فضیلت کے بارے میں صراحت کر دی اور ان کے مرتبوں کا فرق اور ان کا غیر مساوی ہونا ظاہر کر دیا کہ وہ گروہ جو پانی پلانے والا اور مسجدِ حرام کی تعمیر وغیرہ کرتا ہے کافر ہے اور یہ گروہ جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لایا ہے اور اللہ کے رستے میں اس نے جہاد کیا ہے، مومن ہے۔ اس برابری کی نفی سے فضیلت کی نفی ثابت ہوئی، کیونکہ جس صورت میں کافروں کے اعمال مومنوں کے اعمال کے برابر نہیں ٹھہرے تو پھر ان کا بہتر ہونا بالاولیٰ نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ اپنے ظلم یعنی شرک کی وجہ سے تو ہدایت پانے کا حق بھی نہیں رکھتے، چہ جائیکہ مسلمانوں کی برابری کر سکیں۔ پھر اس فریق کی تصریح فرمائی جو افضل ہے اور ان کو اپنے نزدیک اعظم درجہ (بلند درجہ) کا حامل ٹھہرا کر فائز بتایا اور اللہ کی رحمت، رضوان اور جنات کی بشارت دی ایمان و ہجرت اور جہاد کے بدلے میں۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان پر کفر کو پسند کریں تو تم (ہرگز) انھیں دوست نہ بناؤ۔ اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائیں گے، تو وہی لوگ ظالم ہیں (23)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٧٩) تفسير الطبري (١٤/ ١٧٠۔ ١٧١) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٦٧) صحيح ابن حبان (١٠/ ٤٥١)

[2] فتح البيان (٥/ ٢٥٦۔ ٢٥٧)

مشرکوں سے ترکِ موالات کا حکم، خواہ عزیز ہی ہوں:

بعض شخص دل سے مسلمان ہیں، لیکن برادری سے تعلق توڑ نہیں سکتے کہ مسلمان ظاہر ہو جائیں، ان کا حال یہاں سے سمجھو۔ اللہ نے کفار سے جدا ہونے کا حکم دیا، گو وہ باپ بھائی کیوں نہ ہوں اور ان کی دوستی سے منع کیا، جبکہ وہ کفر کو ایمان پر اختیار کریں اور اس پر وعید اتاری، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [المجادلة: ٢٢]

''(اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، کہ وہ ان سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کا کنبہ قبیلہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی تائید کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ، اور وہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، جان لو! بے شک (جو) اللہ کا گروہ ہے، وہی فلاح پانے والا ہے۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن شوذب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بدر کے دن ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے باپ نے آلہہ (اللہ کے علاوہ اپنے خداؤں) کی تعریف کرنی شروع کی، ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اس سے کنارہ کرتے تھے، جب وہ بتوں کی تعریف میں حد سے بڑھے، تب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس کا قصد کیا اور قتل کر ڈالا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا... الخ ﴾.[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ دوست نہ بنانے سے انھیں اپنا بطانہ (راز دار اور جگری دوست) اور یار بنانا مراد ہے کہ تم اپنے بھید ان پر کھولو اور ہجرت کو چھوڑ کر ان کے ساتھ بود و باش کرو۔ یہ سارے مسلمانوں کو خطاب ہے اور یہ حکم تا قیامت باقی ہے۔ ان لوگوں سے دوستی توڑ دینے کی دلیل ہے، یعنی مومنین اور کافروں کے درمیان دوستی نہیں ہونی چاہیے۔ مراد ہر فرد کو منع کرنا ہے کہ وہ مشرکین میں سے کسی کے دوست دار نہ بنیں۔ یہ ممانعت کسی خاص گروہ سے دوستی کرنے کی نہیں ہے، کیونکہ ان الفاظ سے دلالتاً یہ مفہوم نکلتا ہے نہ عبارتاً۔

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (۹/ ۲۷) امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا منقطع"

اہلِ علم کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول ہجرت کرنے اور کفر کے شہروں کو چھوڑنے کی ترغیب دینے کے لیے ہوا ہے۔ سو یہ ان مومنوں کو خطاب ہے جو مکہ وغیرہ بلادِ عرب میں تھے۔ ان کو اس بات سے منع کیا ہے کہ وہ اپنے آبا اور بھائیوں کی محبت کی وجہ سے بلادِ کفر میں سکونت رکھیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کو ہجرت کے حکم پر محمول کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ یہ سورت فتح مکہ کے بعد اتری ہے اور نزول میں سارے قرآن کے اخیر میں ہے۔ زیادہ قریب مفہوم یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ جب اللہ نے یہ حکم دیا کہ مشرکوں سے بیزار ہو جاؤ تو کہا کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ آدمی اپنے باپ بھائی سے جدا ہو جائے۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ مرد کا اپنے اہل واقارب سے قطع تعلق کرنا دین میں واجب ہے۔ مسلمان کافر کا دوستدار نہیں ہوتا، گو وہ اس کا باپ، بھائی اور بیٹا کیوں نہ ہو۔

شانِ نزول:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اگلی آیت سے ملی ہوئی ہے اور سیدنا عباس اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے قصے میں اتری ہے، جبکہ وہ ہجرت سے باز رہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ ہجرت کر کے مدینے میں آ جائیں تو بعض لوگوں کے اہل و اولاد نے کہا کہ ہم تم کو اللہ کی قسم دیتے ہیں کہ تم ہم کو برباد نہ کرو۔ وہ لوگ رِقت سے وہیں رہ گئے، ہجرت نہ کی، اس پر یہ آیت آئی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول ان نو آدمیوں کے بارے میں ہوا جو اسلام سے مرتد ہو کر مکے چلے گئے۔ اللہ نے مومنوں کو ان کے ساتھ دوستی رکھنے سے منع فرما دیا اور یہ آیت اتاری،[1] لیکن اعتبار عمومیتِ الفاظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ پھر ان لوگوں پر ظلم کا اطلاق کیا جنھوں نے ایسے لوگوں کو چاہا جو کفر کو ایمان پر دوست رکھتے ہیں، خواہ وہ باپ ہوں یا بھائی۔ معلوم ہوا کہ کافر رشتے داروں کو دوست رکھنا ان کے پاس رہنا اور ہجرت و جہاد کو چھوڑ دینا بہت بڑا شدید قسم کا گناہ ہے۔[2]

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؀۲۴

(اے نبی!) کہہ دیں: اگر تمھارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور تمھارا کنبہ قبیلہ اور جو مال تم نے کمائے اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جنھیں تم پسند کرتے ہو (یہ سب)

[1] تفسیر البغوي (٤/ ٢٤) [2] فتح البیان (٥/ ٢٥٨۔ ٢٥٩)

تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا﴿24﴾

اللہ اور رسول کی محبت کو ہر محبت پر فوقیت ہے:

آخر حکم بھیجا کہ اس ملک سے کافر باہر نکل جائیں، تب اکثر کافر مسلمان ہوئے۔ اللہ نے ان لوگوں کو وعید سنائی جنھوں نے اہلِ قرابت اور کنبے قبیلے والوں کو اللہ اور رسول اور جہاد فی سبیل اللہ پر اختیار کیا کہ اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ عزیز ہیں تو اب تم منتظر رہو کہ اللہ کا عذاب اور سزا آ جائے۔ زہرہ بن معبد عن جدہ کہتے ہیں کہ ہم نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! اللہ کے رسول! آپ مجھے ہر چیز سے محبوب تر ہیں، سوائے اپنی جان کے۔ فرمایا: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ نَفْسِهِ» عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "فَأَنْتَ الْآنَ، وَاللّٰهِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي" فرمایا: «اَلْآنَ يَا عُمَرُ»[1] (رواه أحمد و انفرد بإخراجه البخاري)

جدِ زہرہ کا نام عبداللہ بن ہشام ہے۔ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوتا جب تک کہ میں اسے زیادہ پیارا نہ ہوں اس کے باپ، بیٹے اور سب لوگوں سے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مسموع اور مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ جب تم عینہ (سودی معاملات) کی بیع کرو گے اور گائے کی دم پکڑو گے اور کھیتی باڑی سے راضی رہو گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ذلت وخواری مسلط کر دے گا، وہ اس ذلت کو اس وقت تک دور نہ کرے گا، یہاں تک کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹو۔[3] (رواه أحمد) یہ حدیث ماقبل کی شاہد ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عشیرہ جماعتِ مجتمعہ کو کہتے ہیں جو ایک نسب وعقد و ودّ (دوستی) کی ہو، جیسے عقد عشرۂ عشیرہ مرد کا اس کے اہل و رشتے دار قریب ہوتے ہیں جو مل جل کر رہتے ہیں، خواہ دس ہوں یا زیادہ، یہ لفظ اسمِ جمع ہے۔ اقتراف کے معنی ہیں اکتساب، یعنی کمائی کرنا۔ تجارت وہ مال ہے جس کے لین دین میں نفع ہو۔ کساد سے مراد یہ ہے کہ اس مال کی نکاسی نہ ہو، اس لیے کہ اس کی بیع کا وقت جاتا رہا، بسبب ہجرت و جہاد اور وطن سے دور ہونے کے۔

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ تجارت سے مراد بیٹیاں اور بہنیں ہیں، ان کا کساد یہی ہے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٥٧) مسند أحمد (٤/ ٢٣٣)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤- ١٥)
[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٦٢) مسند أحمد (٢/ ٤٢) السلسلة الصحيحة (١١)

کہ گھر میں پڑی رہ جائیں، ان کا کوئی خواست گار نہ ہو۔[1] لیکن یہ تفسیر غریب ہے۔ مساکن سے مراد وہ گھر ہیں جن کو جی نے پسند کیا ہے اور ان میں رہنا بسنا چاہتے ہیں۔ اچھے اچھے مکانات اور حویلیاں ہیں آرام کے لیے۔ ان آٹھ چیزوں کی محبت میں جہاد چھوڑ دیتے ہیں، ہجرت نہیں کرتے۔ اس محبت سے مراد محبت اختیاری ہے نہ کہ محبت طبعی، کیونکہ وہ ایک جبلی امر ہے، اس کا ترک کرنا ممکن نہیں اور نہ اُس پر مواخذہ ہے اور نہ انسان اس کا مکلف ہے۔ اللہ کے امر سے تحفظ کرنے سے مراد اللہ کا عذاب ہے یا جنگ یا فتح مکہ۔ اس میں بُعد ہے، کیونکہ اس سورت کا نزول فتح مکہ کے بعد ہوا ہے یا جلد آنے والا عذاب یا اپنے وقت پر آنے والا عذاب ہے۔

بہرحال اس آیت میں سخت قسم کی وعید اور بڑا ڈراوا اور دھمکی ہے۔ امر کے بارے میں ابہام اور عدم تصریح نے اس کو اور زیادہ مؤکد کر دیا، تاکہ دل ہر طرف جائے اور مختلف قسم کی عقوبتوں میں تردد کرے۔ یہ دھمکی اس لیے ہے کہ انھوں نے دنیا کی لذتوں کو آخرت کی نعمتوں پر ترجیح دی اور اختیار کیا، اس بات سے کم میں کوئی شخص رہائی پاتا ہے، اسی لیے کہا ہے کہ "إِنَّهَا أَشَدُّ آيَةٍ نَعَتْ عَلَى النَّاسِ"کشاف میں اس کی تفصیل کی ہے۔[2] یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جب دین کی مصلحتوں میں سے کسی مصلحت اور دنیا کی اہم چیزوں میں سے کسی چیز کے درمیان کچھ تعارض واقع ہو تو اس وقت دین کو دنیا پر ترجیح دینا واجب اور ضروری ہے، تاکہ دین سلامت رہے۔ اللہ ان لوگوں کو، جو اس کی اطاعت سے باہر ہیں اور اس کے امر و نہی کے بجا لانے سے نفرت کرتے ہیں، ہدایت نہیں کرتا۔[3]

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ۝۲۵ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۷

یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جب کہ تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا، تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے (25) پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور اس نے ایسے

[1] تفسیر القرطبي (٨/ ٩٥) [2] الكشاف (٢/ ٢٤٥) [3] فتح البيان (٥/ ٢٦٠۔ ٢٦١)

لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے ㉖
پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا مہربانی فرمائے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ㉗

غزوۂ حنین اور فلسفۂ نصرت:

فتح مکہ کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے سنا کہ مکہ اور طائف کے درمیان لوگ لڑائی کے لیے جمع ہیں۔ آپ ﷺ دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ ان سے جنگ کے لیے چلے۔ دو ہزار اور مل گئے۔ مکے سے فوج کا پہاڑوں کے بیچ میں سے گزرنا بہت تنگی سے تھا، کم کم گزرنے لگے۔ دشمن کی قوم ہوازن اردگرد چھپی تھی، جب مکے والے گزرنے لگے تو وہ ان پر آ گرے، یہ الٹے بھاگے، نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ والے بھی بکھر گئے، آپ ﷺ پیادہ ہو کر جنگ کے لیے مستعد ہو گئے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے انصار کو پکارا، اس آواز پر مہاجر اور انصار پہنچے، تب لڑائی ہوئی اور اللہ نے فتح دی۔ پہلے والے مسلمانوں نے کہا تھا کہ ہم تھوڑوں کو بہت جگہ مدد ملی ہے، اب تو ہم دس ہزار ہیں، اللہ نے ان کو ادب سکھایا، تا کہ اسباب پر نظر نہ رکھیں۔ پھر ان کافروں میں اکثر مسلمان ہوئے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو براءت میں اتری۔[1] اللہ نے مومنوں کو اپنا فضل و احسان یاد دلایا جو ان پر کیا تھا اور بہت سی جگہوں میں ان کو فتح دی تھی، جہاں جہاں وہ نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ لڑے تھے۔ اللہ نے یہ ذکر کیا کہ یہ تائید اور تقدیر اللہ کی طرف سے تھی نہ کہ ان کی تعداد اور دشمن کی نااہلی کی وجہ سے تھی، تا کہ انھیں اس بات سے آگاہی رہے کہ مدد اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، کچھ فوج کی قلت اور کثرت پر موقوف نہیں ہے۔ دیکھو تم حنین کے دن اپنی جماعت کی کثرت پر اترائے تھے، اس کے ساتھ وہ کثرت کچھ کام نہ آئی، بلکہ تم پیٹھ پھیر کر چل دیے، مگر تھوڑے لوگ جو نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ رہ گئے۔ پھر اللہ نے رسول اور مومنین پر اپنی نصرت و تائید اتاری، تا کہ وہ معلوم کر لیں کہ فتح دینا صرف اللہ کا کام ہے، اسی کی مدد سے فیروزی حاصل ہوتی ہے، اگرچہ جمعیت قلیل ہو: ﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٤٩] ”کئی بار چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ بہتر صحابہ چار ہیں اور بہتر سرایا چار سو ہیں اور بہتر لشکر چار ہزار ہیں اور مغلوب نہیں ہوتے بارہ ہزار قلت کی وجہ سے۔[2] (رواه أحمد وأبو داود والترمذي وقال: حديث حسن غريب، وقد رواه ابن ماجة و البيهقي وغيره عن أكثم بن الجون عن رسول الله ﷺ)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٥١)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٩٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦١١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٢٧) سنن البيهقي (٩/ ١٥٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٨٦)

واقعات:

واقعہ حنین فتح مکہ کے بعد شوال سنہ آٹھ ہجری میں ہوا تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ مکہ فتح کر کے جب وہاں کا بندوبست کر چکے اور عام اہلِ مکہ اسلام لے آئے اور آپ ﷺ نے ان کو عام معافی دے دی تو نبیِ اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ ہوازن آپ کے ساتھ لڑنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، ان کا امیر مالک بن عوف نصری ہے اور سارے ثقیف ان کے ساتھ ہیں۔ بنوجشم و بنوسعد بن بکر اور بنو ہلال کے کچھ متفرق لوگ اور کچھ بنوعمرو بن عامر اور عون بن عامر بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ وہ اپنی سب عورتوں، بچوں، بکریوں اور اونٹوں کے ساتھ نکل آئے تھے۔ نبیِ اکرم ﷺ اس لشکر کے ساتھ جو فتح مکہ کے لیے آیا تھا اور وہ دس ہزار مہاجرین اور انصار اور قبائل عرب تھے، باہر نکلے اور جو لوگ مکے والے اسلام لے آئے تھے اور طلقاء (معافی یافتہ) تھے، وہ بھی دو ہزار افراد ساتھ ہو گئے تھے۔

جب دشمن کی طرف چلے تو مکہ اور طائف کے درمیان وادی میں جس کو حنین کہتے تھے، وہاں پر علی الصباح اندھیرے میں لڑائی ہوئی، جبکہ یہ میدان میں اترے تھے اور ہوازن کمین گاہ میں تھے۔ مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ وہ ان کی گھات میں ہیں۔ یکا یک تلواریں کھینچیں اور تیر چلائے اور سب نے مل کر یکبارگی حملہ کیا، جیسے کوئی ایک آدمی حملہ کرتا ہو، یہ حملہ امیر کے حکم سے کیا، اس وقت مسلمان پیٹھ دے کر ہٹے جس طرح اللہ نے کہا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ اپنے خچر شہباء پر سوار تھے، ثابت قدم رہے اور اس کو دشمنوں کی طرف بڑھایا، آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ اس کی سیدھی رکاب پکڑے ہوئے تھے۔ رکاب ابوسفیان بن حرث بن عبدالمطلب کے ہاتھ میں تھی، وہ اس خچر کو روکتے تھے کہ تیز نہ چلے اور نبیِ اکرم ﷺ اپنا نام لے کر لوگوں کو پکارتے تھے کہ اے اللہ کے بندو! ادھر آؤ، کہاں جاتے ہو، میری طرف آؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اسی حال میں یہ بھی فرماتے تھے: «أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ» آپ ﷺ کے ساتھ تقریباً ایک سو صحابی ثابت قدم رہے اور کسی نے کہا کہ قریباً اسّی صحابی تھے، ان میں ابوبکر، عمر، عباس، علی، فضل بن عباس، ابوسفیان بن حرث، ایمن بن ام ایمن اور اسامہ بن زید وغیرہم رضی اللہ عنہم تھے۔

پھر آپ ﷺ نے اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، کیونکہ وہ بلند آواز تھے کہ خوب چلا کر پکارو: اے اصحابِ شجرہ! یعنی وہ لوگ جنھوں نے درخت کے نیچے نہ بھاگنے کی بیعت کی تھی، چنانچہ انھوں نے پکارا: "يا أصحاب السمرة!" اور کبھی "أصحاب سورة البقرة!" کہا۔ وہ "يا لبيك يا لبيك" کہنے لگے اور لوگ نبیِ اکرم ﷺ کی طرف لوٹ کر آنا شروع ہوئے، یہاں تک کہ کوئی آدمی جب کہ اس کا اونٹ نہ مڑتا تو وہ اپنی زرہ پہن کر اتر پڑتا اور اونٹ کو چھوڑ دیتا اور خود آپ ﷺ کے پاس آ جاتا۔

جب اس طرح پر کچھ لوگ فراہم ہو گئے تو نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو حملہ کرنے کا حکم دیا اور ایک مٹھی مٹی لے کر

اللہ سے دعا کرنے اور مدد مانگنے کے بعد اس قوم کی طرف پھینکی اور کہا: ”اَللّٰهُمَّ أَنْجِزْ لِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ“ یعنی اے اللہ! اپنے وعدے کو پورا کر، دشمنوں کی جماعت کا کوئی بھی شخص ایسا باقی نہ رہا، جس کی آنکھ میں یا منہ میں وہ خاک نہ پہنچی ہو اور اس کو لڑنے سے باز نہ رکھا ہو۔ پھر ان کو شکست ہوئی، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور قتل کرنا اور پکڑنا شروع کیا، جب باقی لوگ لوٹ کر آئے تو نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے قیدیوں کو جمع پایا۔[1]

ابوعبدالرحمان فہری، جن کا نام یزید بن انیس یا کرز ہے، کہتے ہیں کہ میں غزوۂ حنین میں نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ تھا، وہ دن نہایت گرم تھا، لُو چلتی تھی، ہم درختوں کے سائے کے نیچے اترے، جب سورج ڈھل گیا تو میں نے اپنا خود سر پر رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ خیمے میں تھے۔ میں نے کہا: ”السلام عليك يا رسول الله ورحمة الله وبركاته“ کوچ کا وقت آیا، فرمایا: ہاں پھر بلال کو پکارا اور وہ ببول کے ایک درخت کے نیچے تھے، جس کا سایہ ایک طائر کے سائے کے برابر ہوگا، وہ وہاں سے جھپٹ کر آئے اور کہا: ”لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَأَنَا فِدَاءُكَ“ فرمایا: میرا گھوڑا کس دو، بلال نے زین اٹھایا، جس کا تنگ چھال کا تھا، اس میں نہ کچھ اشر تھا نہ بطر، یعنی نہ کوئی فخر والی چیز تھی نہ تکبر والی۔ جب وہ کسا گیا تو نبیِ اکرم ﷺ سوار ہوئے اور ہم بھی سوار ہوئے، تیسرے پہر سے رات تک صف بندی رہی۔

جب دونوں طرف کے سوار ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو مسلمان ہٹ گئے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) آپ ﷺ نے کہا! اے اللہ کے بندو! میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، اے گروہِ مہاجرین! میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں، پھر گھوڑے سے اتر کر ایک مٹھی مٹی لی جو شخص مجھ سے زیادہ آپ ﷺ کے قریب تھا، اس نے مجھے خبر دی کہ وہ مٹی ان کے مونہوں پر مار کر فرمایا: « شَاهَتِ الْوُجُوْهُ » اللہ نے ان کو شکست دی۔

یعلی بن عطا نے کہا ہے کہ مجھ سے ان کے ابناء نے اپنے آبا سے یہ بات ذکر کی کہ انھوں نے کہا کہ ہم میں سے کوئی باقی نہ رہا، لیکن اس کی آنکھ اور منہ خاک سے بھر گیا اور ہم نے آسمان اور زمین کے درمیان ایک زنجیر کی سی آواز سنی جیسے کوئی لوہا لوہے کے طشت پر گرتا ہے۔[2] (رواه أحمد وهكذا رواه البيهقي في دلائل النبوة من حديث أبي داود الطيالسي)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مالک بن عوف رضی اللہ عنہ اپنے لوگوں کے ساتھ حنین کی طرف نکلے اور نبیِ اکرم ﷺ سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے، وہ لوگ جنگل کے تنگ راستوں میں اور پہاڑوں کے دروں

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٣٣) مسند أحمد (٥/ ٢٨٦) دلائل النبوة للبيهقي (٥/ ١٤١) امام البانی رحمہ اللہ نے ”السلسلة الصحيحة“ (رقم الحديث: ٢٨٢٤) پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کا ذکر کیا اور اس کو حسن کہا ہے۔

میں تیار تھے۔ نبیِ اکرم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ صبح کے اندھیرے میں میدان کے اندر اترے، یکا یک دشمنوں کے سوار ظاہر ہوئے، یہ بات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر بہت سخت گزری، لوگ بھاگنے لگے، کوئی کسی کی طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ نبیِ اکرم ﷺ داہنی طرف کو ہو گئے اور فرمایا اے لوگو! میری طرف آؤ، میں اللہ کا رسول ہوں، میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ جب کچھ اثر نہ ہوا اور بعض بعض کے پیچھے چل دیے تو نبیِ اکرم ﷺ نے لوگوں کا یہ حال دیکھ کر سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اونچی آواز سے کہو: اے گروہِ انصار! اے اصحابِ سمرہ! انھوں نے کہا: لبیک لبیک۔ کوئی شخص اپنے اونٹ کو پھیرتا مگر پھیر نہ سکتا، ناچار اپنی زرہ گردن میں ڈال کر تلوار اور کمان لے کر اس آواز کی طرف آتا، یہاں تک کہ قریب ایک سو اشخاص نبیِ اکرم ﷺ کے نزدیک جمع ہو گئے اور جنگ ہونے لگی۔ پہلی بار انصار کو پکارا تھا، پھر خزرج کو، یہ لوگ جنگ پر بڑے صابر اور ثابت قدم تھے، نبیِ اکرم ﷺ اپنی سواری پر سے قوم کے مجمع کو جھانک رہے تھے، فرمایا: ''اَلْآنَ حَمِيَ الْوَطِيْسُ'' یعنی اب ہنگامۂ حرب گرم ہو گیا، تنورِ جنگ بھڑک اٹھا۔ واللہ! جب باقی لوگ پھر کر نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آئے، دیکھا کہ بہت سے قیدی آپ کے سامنے پڑے ہیں، بعض کو اللہ نے قتل کیا اور بھاگنے والے بھاگ گئے، ان کا مال اور ان کی اولاد آپ ﷺ کو ملی۔[1] (رواہ محمد بن اسحاق)

صحیحین میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے ابوعمارہ! تم نبیِ اکرم ﷺ کو چھوڑ کر حنین کے دن بھاگ گئے، کہا لیکن آپ ﷺ تو نہیں بھاگے۔ ہوازن ایک تیرانداز قوم تھی، ہم نے جب ان کا مقابلہ کیا اور حملہ آور ہوئے تو انھوں نے شکست کھائی، لوگ لوٹنے پر گر پڑے، انھوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا، اس لیے لوگ بھاگے۔ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا اور ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ سفید خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھے اور آپ ﷺ فرماتے تھے: «أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ»[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ انتہا درجے کی بہادری ہے، ایسے دن میں کہ لڑائی گرم تھی اور لشکر چل دیا تھا اور نبیِ اکرم ﷺ ایک ایسے خچر پر سوار تھے جو نہ چلنے میں تیز تھا اور نہ ہی وہ کسی کر و فر کے لائق تھا اور نہ بھاگ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ نبیِ اکرم ﷺ اس کو ایڑ دیتے اور دشمن کی طرف بڑھاتے تھے اور اپنا نام مبارک ذکر کرتے تھے، تاکہ جو کوئی آپ کو نہ پہچانتا تھا وہ بھی پہچان لے۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ دَآئِماً إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

یہ سب صرف اللہ کے وثوق سے اور اس پر بھروسا کرنے سے تھا، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ کو یقین تھا کہ اللہ عنقریب نصرت فرمائے گا اور رسالت کو پورا کرے گا اور اپنے دین کو تمام ادیان پر غلبہ بخشے گا، اسی لیے اللہ نے فرمایا

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٥/ ١٢٦۔ ١٢٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٣) صحیح مسلم اور دیگر کتب میں یہ روایت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٦)

کہ اللہ نے اپنے رسول پر سکینہ یعنی طمانیت وثبات اتاری اور فرشتوں کا لشکر بھیجا۔[1]

عبدالرحمان مولیٰ ام برثن رحمہ اللہ نے کہا: مجھ سے ایک شخص نے جو مشرکوں کے ہمراہ تھا، ذکر کیا کہ جب حنین کے دن ہمارا اور اصحاب نبی اکرم ﷺ کا سامنا ہوا تو وہ ہمارے لیے اتنا بھی نہ تھمے کہ جتنی دیر بکری کا دودھ دوہتے رہتے ہیں۔ جب وہ چل دیے اور پیچھے سے ہم ان کو ہانکتے تھے تو ہم ایک سفید خچر والے کے پاس پہنچ گئے، دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے، ہم نے ان کے پاس کچھ لوگ سفید خوب صورت دیکھے، آپ ﷺ نے فرمایا: «شَاهَتِ الْوُجُوْهُ اِرْجِعُوْا» یعنی جاؤ تمھارے منہ کالے ہو گئے، ہم سب نے شکست کھائی، ایک پر ایک گرتے ہوئے بھاگا۔ یہ ماجرا اس واقعہ کا ہوا۔[2] (رواہ ابن جریر)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حنین کے دن نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، لوگوں نے پیٹھ پھیری، مہاجرین اور انصار میں سے صرف اسّی مرد آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے، ہم آگے بڑھے، ہم نے پیٹھ نہیں دی، انھی لوگوں پر اللہ نے تسکین اتاری اور آپ ﷺ اپنے سفید خچر پر آگے کو بڑھتے تھے، خچر کا زین ڈھیلا پڑ گیا، گرنے کو ہوا، میں نے کہا: ''اِرْتَفِعْ رَفَعَكَ اللّٰهُ''، فرمایا: ایک مٹھی خاک اٹھا دے، میں نے اٹھا دی، آپ ﷺ نے وہ مٹی ان کے منہ پر دے ماری، ان کی آنکھیں خاک سے بھر گئیں، فرمایا: مہاجرین اور انصار کہاں ہیں؟ میں نے کہا: یہ ہیں، فرمایا: ان کو پکارو، میں نے پکارا، وہ اپنے ہاتھوں میں تلواریں لیے ہوئے آئے، گویا آگ کے تارے تھے، مشرکین پشت دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔[3] (رواہ البیهقي)

غیبی لشکروں کی مدد:

شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے حنین کے دن جب دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ اکیلے رہ گئے ہیں تو اپنے باپ اور چچا کو یاد کیا کہ علی وحمزہ رضی اللہ عنہما نے ان کو قتل کیا تھا، آج کے دن موقعہ ہے، میں ان کا بدلہ نبی اکرم ﷺ سے لے لوں، میں چلا اور آپ ﷺ کے داہنی طرف سے آیا، دیکھا کہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آپ کے پاس کھڑے ہیں، ایک سفید زرہ پہنے ہوئے گویا چاندی ہے اور غبار کو آپ ﷺ سے دور کر رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ ان کے چچا ہیں، بھلا یہ کب ان کی مدد نہ کریں گے۔ تب بائیں طرف سے آیا، دیکھا کہ ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ موجود ہیں، میں نے کہا یہ ان کے چچا زاد بھائی ہیں، یہ بھی ان کو بے مدد نہ چھوڑیں گے۔ ناچار میں پشت کی جانب سے آیا، اتنی ہی دیر تھی کہ تلوار کا ایک وار کروں کہ اچانک آگ کا ایک شعلہ میرے اور ان کے درمیان اونچا ہو گیا، گویا کہ بجلی ہے۔ میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۵۳۔ ۴۵۴) [2] تفسیر الطبري (۱۴/ ۱۸۶)

[3] مسند أحمد (۱/ ۴۵۳) دلائل النبوة (۵/ ۱۴۲) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ رحمہ اللہ کا سماع اپنے باپ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس روایت میں ثابت نہیں ہے۔

ڈرا کہ کہیں مجھ پر نہ گر پڑے، میں نے اپنا ہاتھ آنکھ پر رکھا اور الٹے پاؤں پھرا، نبیِ اکرم ﷺ نے التفات فرما کر کہا: اے شیبہ، اے شیبہ، میرے پاس آ! اے اللہ اس سے شیطان کو دور کر، میں نے آنکھ اٹھا کر آپ ﷺ کی طرف دیکھا وہ مجھ کو میرے آنکھ اور کان سے زیادہ محبوب ہو گئے، فرمایا: اے شیبہ! کافروں سے لڑ![1] (رواه البيهقي)

شیبہ رضی اللہ عنہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں حنین کے دن نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ نکلا، واللہ! مجھ کو اسلام اور اس کی معرفت نے نہیں نکالا تھا، لیکن میں نے ہوازن کا قریش پر غلبہ نہ چاہا، میں نبیِ اکرم ﷺ کے پاس کھڑا تھا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں ابلق گھوڑے دیکھتا ہوں، فرمایا: اے شیبہ! ان کو نہیں دیکھتا مگر کافر، پھر میرے سینے پر اپنا ہاتھ مارا اور یہی کہا: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ شَيْبَةَ" "اے اللہ! ہدایت کر شیبہ کو" پھر دوسری بار یہی کہا: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ شَيْبَةَ" پھر تیسری بار ہاتھ مارا اور یہی کہا: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ شَيْبَةَ" واللہ! آپ ﷺ نے ابھی اپنا ہاتھ میرے سینے پر سے نہ اٹھایا تھا کہ آپ ﷺ سے زیادہ مجھے اللہ کی مخلوق میں کوئی محبوب نہ تھا، پھر باقی حدیث بیان کی، جس میں دونوں طرف کے لوگوں کا مقابلہ، مسلمانوں کی شکست، عباس رضی اللہ عنہ کا پکارنا اور رسول اللہ ﷺ کا مدد مانگنا بیان کیا، یہاں تک کہ مشرک ہار گئے۔[2]

سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ تھا، حنین کے دن اور لوگ قتال کر رہے تھے، اچانک میں نے دیکھا کہ آسمان سے کالے کمل اترتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ہمارے اور دشمنوں کی قوم کے درمیان گرے، وہ پھیلی ہوئی چیونٹیاں تھیں جن سے سارا جنگل بھر گیا۔ قوم نے شکست کھائی، ہم کو کچھ شک نہیں کہ وہ فرشتے تھے۔[3] یزید بن عامر سوائی رضی اللہ عنہ حنین کے دن مشرکوں کے ساتھ تھے، پھر مسلمان ہو گئے۔ سائب بن یسار نے اس دن کے رعب کا حال پوچھا جو اللہ نے مشرکوں کے دلوں میں ڈالا تھا، انھوں نے کنکری اٹھا کر طشت میں ماری، اس کی آواز ہوئی، کہا: ہم اپنے اندر اس کی مثل پاتے تھے۔[4] صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: « نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَأُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ »[5] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے رسول اور مومنوں پر سکینہ اتارا اور لشکر بھیجا جس کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو ان کے کفر کا بدلا عذاب سے دیا۔ وللہ الحمد.

باقی ہوازن کی توبہ:

پھر باقی ماندہ ہوازن کو توبہ نصیب ہوئی، وہ مسلمان ہو کر آئے اور مکے کے قریب جعرانہ میں نبیِ اکرم ﷺ

---

[1] دلائل النبوة (٥/ ١٤٥) اس کی سند میں "ابوبکر ہذلی" ضعیف راوی ہے۔

[2] دلائل النبوة (٥/ ١٤٥۔ ١٤٦) اس کی سند میں "ایوب بن جابر" ضعیف راوی ہے۔

[3] دلائل النبوة (٥/ ١٤٦) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[4] المعجم الكبير (٦/ ٢٦٩) دلائل النبوة للبيهقي (٥/ ١٤٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٦/ ٢٦٩)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣)

سے آملے۔ یہ ماجرا واقعہ حنین کے بیس دن بعد ہوا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ اپنے قیدی لے جائیں یا اپنا مال، انھوں نے اپنے قیدی اختیار کیے، وہ سب عورتیں اور بچے ملا کر چھے ہزار تھے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے ان قیدیوں کو لوٹا دیا اور ان کا مالِ غنیمت کے مستحقین میں بانٹ دیا اور طلقا (فتح مکہ کے دن نئے مسلمان ہونے والوں) میں سے کچھ لوگوں کو تالیفِ قلب کی خاطر زیادہ دیا، جس کو تنفیل کہتے ہیں۔ ایک ایک شخص کو سو سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ جن لوگوں کو سو سو اونٹ دیے تھے، ان میں سے ایک مالک بن عوف نصری ہیں، ان کو ان کی قوم پر عامل مقرر کر دیا تھا، جس طرح کہ وہ پہلے سے ان کے سردار تھے، مالک نے قصیدۂ مدحیہ کہا، اس میں یہ شعر بھی ہیں:

ما إن رأيتُ ولا سمعت بمثله — في الناس كلِّهم بمثل محمد
أوفى وأعطى للجزيل إذا اجتُدِي — ومتى يشا يخبرك عما في غد
وإذا الكتيبة عردت أنيابها — بالسمهري وضرب كل مهند
فكأنه ليث على أشباله — وسط الهباءة خادر في مرصد [1]

'میں نے سارے لوگوں میں محمد ﷺ جیسا کوئی دیکھا نہ سنا۔ جب ان سے کوئی عطیہ مانگا جاتا تو بے بہا عطا کرتے، وہ جب چاہیں تمھیں کل کی بات بتا سکتے ہیں۔ جب فوج کا دستہ مضبوط نیزوں اور نفیس تلواروں کے ساتھ اپنے دانت نکالتا ہے۔ تو محمد ﷺ اس شیر کی طرح نکلتے ہیں جو غبار کے وسط میں اپنے بچوں کو لے کر گھات میں بیٹھا ہوتا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اس آیت میں مومنوں پر جو اپنی نعمت کی تھی، یاد دلائی۔ وہ جگہیں جن میں اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی، وہ یومِ بدر، قریظہ اور نضیر ہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کے غزوات جیسے کہ صحیحین میں آیا ہے، انیس ہیں۔[2] سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اتنا اور زیادہ ہے کہ ان غزوات میں سے آٹھ میں آپ ﷺ نے خود جنگ کی۔[3] اور ایک قول یہ ہے کہ کل غزوات و سرایا و بعوث ستر ہیں اور کسی نے کہا ہے کہ اسی ہیں۔ حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے۔ دونوں کے درمیان اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے، جیسا کہ خازن میں کہا گیا ہے۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہاں نبیِ اکرم ﷺ نے ہوازن اور ثقیف سے قتال کیا۔ ہوازن کے سردار مالک بن عوف تھے اور ثقیف کے عبد یا لیل بن عمرو۔[5] یہ واقعہ ماہِ شوال سنہ آٹھ ہجری میں رمضان کے بعد ہوا، اس میں آپ ﷺ فتح یاب ہوئے۔ یہ قصہ کتبِ حدیث و سیرت میں مفصل مذکور ہے۔

---

(1) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٥) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٤)
(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨١٤) (4) تفسير الخازن (٣/ ٧٢) (5) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٧٢)

مسلمانوں کو اپنی کثرت پر اس لیے تعجب ہوا کہ وہ گیارہ یا بارہ ہزار تھے یا سولہ ہزار اور کافر چار ہزار تھے۔[1] (قاله السيوطي) لیکن شرح مواہب میں ہے کہ وہ بیس ہزار سے زیادہ تھے، مسلمان چار مارے گئے اور کافر ستر۔ بعض نے یہ کہا تھا کہ ہم قلت کے سبب سے آج مغلوب نہ ہوں گے، اس پر وہ اس بات کی طرف سونپ دیے گئے۔ ان کا یہ اترانا کچھ کام نہ آیا۔ سیرتِ شامی میں ہے کہ جو لوگ حنین میں ثابت قدم رہے، ایک سو تینتیس مہاجر اور ستر انصار تھے۔ زمین باوجود چاروں طرف کی وسعت کے ان پر اس لیے تنگ ہوگئی کہ ان کے دل میں دشمن کا خوف و بیم سما گیا تھا۔

امام ابن منذر رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ جب اہلِ مکہ و مدینہ جمع ہوئے، کہا: اب ہم خوب لڑیں گے کہ ہم سب ایک ہو گئے ہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کو ان کا یہ کہنا اچھا نہ لگا اور ان کا اترانا مکروہ معلوم ہوا۔ جب دشمن کا سامنا ہوا، بھاگ نکلے، یہاں تک کہ کوئی کسی کا مقابلہ نہ کرتا۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے عرب کے قبیلوں کو پکارا اور کہا: « إِلَيَّ » یعنی میری طرف آؤ، کوئی اپنی جگہ پر نہ تھمتا، جگہ چھوڑ کر چل دیتا۔ تب انصار کی طرف التفات کیا، وہ ایک الگ طرف تھے، ان کو پکار کر کہا: "يَا أَنْصَارَ اللّٰهِ! وَأَنْصَارَ رَسُوْلِهِ إِلٰى عِبَادِ اللّٰهِ! أَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ" وہ اپنے گھٹنوں کے بل ہو کر رونے لگے اور کہا: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَرَبِّ الْكَعْبَةِ! إِلَيْكَ وَاللّٰهِ" پھر سر جھکا کر آنسو بھر لائے اور تلواریں کھینچ کر نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے دشمنوں کو مارنے لگے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کو فتح یاب کیا۔[2] بعض نے کہا ہے کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے ان کو پکارا، کان پر انگلی رکھ کر چلائے، ان کی آواز ایسی بلند تھی کہ آٹھ میل تک جاتی تھی۔ اللہ نے اپنے پیغمبر اور اہلِ ایمان پر سکینہ اتارا، ان کا ڈر جاتا رہا۔ پیٹھ پھیرنے کے بعد مشرکین کے ساتھ قتال کرنے کا حوصلہ کیا اور نبیِ اکرم ﷺ ثابت قدم تھے، اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں، بھاگنا کیسا۔

مومنین سے وہ لوگ مراد ہیں جو بھاگے نہیں اور جمے رہے اور خوب لڑے۔ فرشتوں سے جو مدد کی گئی اس کی گنتی میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا: پانچ ہزار تھے، کسی نے کہا: آٹھ ہزار تھے، کسی نے کہا: سولہ ہزار، لیکن یہ تعداد طریقِ نبوت سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ فرشتوں نے بھی اس دن مقاتلہ کیا کہ نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ملائکہ نے بدر کے دن کے سوا قتال نہیں کیا۔ بدر کے دن کے سوا ان کا حاضر ہونا اہلِ ایمان کے دلوں کی تقویت کے لیے تھا، تاکہ مشرکوں کے دلوں میں رعب پڑے، اگرچہ وہ ان کو دیکھتے نہ تھے۔ بعض نے کہا ہے کفار نے ان کو دیکھا تھا۔ کفار کے عذاب سے مراد قلت کرنا، قیدی بنانا، ان کا مال لے لینا اور ان کی اولاد کی گرفتاری ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ تلوار سے مارے گئے[3] اور چھے ہزار عورتیں اور بچے قید ہو کر آ گئے۔ اس سے زیادہ بڑی کوئی غنیمت ہاتھ نہ آئی تھی،

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٢٤٣) [2] الدر المنثور (٤/ ١٥٨) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٧٤)

کیونکہ بارہ ہزار اونٹ اور لاتعداد بکریاں اس میں تھیں اور اس کے سوا اور بہت سا مال تھا۔ وللہ الحمد. اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں کافروں کی یہ جزا ہے آخرت کے عذاب کے علاوہ۔[1]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٨﴾ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰي يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾

اے ایمان والو! بلاشبہ مشرک تو ہیں ہی پلید، لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجدِ حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔ اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف ہے تو اگر اللہ چاہے گا تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (28) ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں (29)

موضح القرآن کا بیان:

مسجدِ حرام میں مشرک کو جانا حرام ہے، بلکہ سارے حرم میں اور مسجد میں معاف ہے اور پلیدی ان کی دل میں ہے بدن پر نہیں۔ فقر سے ڈرتے ہو، یعنی آمد ورفت موقوف ہوگی مشرکوں کی تو سوداگری کے معاملات بند ہوں گے۔ سو اللہ نے سارا ملک مسلمان کر دیا، سب کاروبار جاری ہوا۔ پہلے حکم ہوا کہ مشرکوں سے لڑو اور ملک سے نکالو، اب اہلِ کتاب سے لڑائی کا حکم ہوا۔ یہ بھی دینِ حق کے منکر ہیں اور جیسے اللہ اور آخرت کو ماننا چاہیے، ویسے نہیں مانتے، لیکن ان سے جزیہ قبول رکھا، بشرطیکہ ان کے ادنیٰ اور اعلیٰ سب ذلیل ہو کر جزیہ دیا کریں۔ عرب کے باقی مشرکوں سے جزیہ ہرگز قبول نہیں اور جہاں کے مشرک سے ملتِ حنفی کا ہونا قبول ہے۔ جزیہ ہر مہینے میں پانچ آنے یا دس آنے یا سوا روپیہ موافقِ حال اور ذلیل رہنا یہ کہ سواری میں، لباس میں، راہ چلنے میں اور ہتھیار باندھنے میں مسلمان کی برابری نہ کریں اور بھی بہت بندوبست ہیں۔ انتهىٰ ما في موضح القرآن.

---

[1] فتح البیان (٥/ ٢٦٢۔ ٢٦٥)

مشرکوں کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روکنا:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ نے اپنے ایمان دار بندوں کو دین اور ذات میں یہ حکم دیا کہ مشرکوں کو، جو دین میں پلید ہیں، مسجدِ حرام سے نکال دو۔ اس آیت کے اترنے کے بعد اب وہ اس کے قریب نہ آئیں۔ یہ آیت سنہ نو ہجری میں اتری تھی، اس لیے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ اس سال روانہ کر کے حکم دیا کہ وہاں جا کر اعلان کر دیں کہ اب کوئی مشرک اس سال کے بعد حجِ خانہ کعبہ نہ کرے اور نہ ہی کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف بجا لائے۔ اللہ نے اس امر کو پورا کیا اور یہ حکم شرعاً وقدراً دیا۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں کہا ہے مگر یہ کہ غلام یا اہلِ ذمہ ہو۔[1] یہ روایت دوسری وجہ سے مرفوعاً بھی آئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "لَا يَدْخُلُ مَسْجِدَنَا هَذَا بَعْدَ عَامِنَا هَذَا مُشْرِكٌ إِلَّا أَهْلُ الْعَهْدِ وَخَدَمُكُمْ"[2] (تفرد به الإمام أحمد مرفوعا والموقوف أصح إسنادا) امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ تم یہود و نصاریٰ کو مساجدِ مسلمین میں آنے سے منع کرو، اللہ تعالیٰ کے حکم ممانعت کے تحت: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ (آیتِ باب) اور امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارا حرم مسجد ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا﴾[3] (آیتِ باب)

مشرک کی ناپاکی:

یہ آیتِ کریمہ مشرک کے ناپاک ہونے کی دلیل ہے جس طرح کہ صحیحین میں آیا ہے: «اَلْمُؤْمِنُ لَا يَنْجِسُ»[4] رہی بدن کی نجاست سو جمہور اس پر ہیں کہ بدن اور ذات نجس نہیں ہیں، کیونکہ اللہ نے اہلِ کتاب کے کھانے کو حلال کیا ہے۔ ہاں بعض ظاہریہ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے بدن بھی پلید ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی ان سے مصافحہ کرے وہ ہاتھ دھوئے۔[5] (رواه ابن جرير)

خوفِ فقر پر تونگری کا وعدہ:

خوفِ فقر پر غنی کا وعدہ کیا، یہ اس لیے کہ لوگوں نے کہا تھا کہ ہمارے بازار بند ہو جائیں گے اور ہماری تجارت جاتی رہے گی۔ منافع حاصل نہ ہوں گے۔ پھر ذلیل ہو کر جزیہ دینے کا ذکر کیا، یہ اس کا بدلہ ہوا جو کہ ان کو بازاروں

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ١٩٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٩٢) اس کی سند میں "اشعث بن سوار" ضعیف راوی ہے۔ نیز حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٤/ ١٩١۔ ١٩٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧١)

[5] تفسير الطبري (١٤/ ١٩٢)

کے بند ہونے کا خوف تھا، یعنی جب شرک کا معاملہ ختم ہو گیا تو اہلِ کتاب سے جزیہ دلوایا، تاکہ نقصان پورا ہو جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ اور ضحاک وغیرہم رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اللہ جانتا ہے اپنی مصلحتوں کو، وہ حکمت والا ہے، لہٰذا ان کو اپنے مالوں کی آمدنی کے عوض اہلِ کتاب سے، جو ذمی ہیں، جزیہ دلوایا[1] ۔

خدا گر بہ حکمت بہ بندد درے کشاید بہ فضل و کرم دیگرے

''اللہ اگر اپنی حکمت و دانائی سے ایک دروازہ بند کر دیتا ہے تو اپنے فضل و کرم سے کوئی دوسرا دروازہ کھول دیتا ہے۔''

اہلِ کتاب سے قتال:

چونکہ اہلِ کتاب اپنے نفس الامر میں نبیِ اکرم ﷺ کے منکر تھے تو گویا ان کا ایمان کسی رسول کے ساتھ بھی صحیح نہ رہا، بلکہ وہ اپنی رائے اور خواہشات اور باپ دادا کے تابع ہیں۔ وہ بھی اس لیے نہیں کہ وہ اللہ کی شریعت اور دین ہے، کیونکہ اگر وہ اس کتاب پر جو ان کے ہاتھ میں ہے، ایمان رکھتے ہوتے تو یہ ایمان ان کو نبیِ اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی طرف کھینچ لاتا، اس لیے کہ سارے پیغمبروں نے نبیِ اکرم ﷺ کی بشارت دی ہے اور ان کے احکام کی اتباع کا حکم دیا ہے، لیکن جب آپ ﷺ آئے اور انھوں نے انکار کیا اور وہ تمام رسولوں سے اشرف تھے تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ پہلے انبیا کی شریعت کے پابند نہیں تھے، اس لیے کہ وہ شریعت اللہ کے پاس سے آئی تھی، بلکہ وہ تو اپنی خواہشات، حظوظ و آرا اور آبا کے پیچھے چلنے والے ہیں، اس لیے کہ ان کا باقی انبیا پر ایمان لانا ان کے لیے کچھ کارآمد نہیں ہے، حالانکہ جو سب انبیا کے سردار اور سب سے افضل اور سب کے خاتم اور سب میں اکمل ہیں، انہی کا انکار کیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قٰتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (آیتِ باب)۔

یہ آیتِ کریمہ اہلِ کتاب کے ساتھ قتال کرنے کا پہلا حکم ہے امورِ مشرکین کو سیدھا کرنے کے بعد، جب کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہو گئے اور جزیرۂ عرب کا معاملہ سیدھا ہو چکا، تب اللہ نے ہر دو اہلِ کتاب کے ساتھ قتال کا حکم دیا۔ یہ حکم سنہ نو ہجری میں نازل ہوا، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے روم کے ساتھ جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور لوگوں کو بلا کر یہ امر ظاہر فرمایا اور کچھ لوگ قبائلِ عرب کے پاس جو مدینہ منورہ کے اردگرد رہتے تھے، بھیج کر ان کو اسلام کی طرف بلایا۔ چنانچہ تقریباً تیس ہزار افراد جو جنگ کے قابل تھے، جمع ہو گئے اور کچھ لوگ اہلِ مدینہ میں سے اور مدینہ کے اردگرد سے منافقین حاضر نہ ہوئے اور یہ حکم اس سال میں ہوا جو سال خشکی اور گرمی اور لُو کا تھا اور نبیِ اکرم ﷺ روم سے جنگ کے ارادے سے شام کی طرف نکلے اور تبوک میں جا کر اترے اور وہاں تقریباً بیس دن

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٤٥٥۔ ٤٥٦)

رہے، پھر اللہ سے واپسی کے بارے میں استخارہ کیا، عام لوگ حالات کی تنگی اور کمزوری کی وجہ سے واپس پھرے، چنانچہ اس کا بیان، ان شاء اللہ تعالیٰ، آئے گا۔

جزیہ کن کے ساتھ خاص ہے:

یہ آیت اس شخص کی دلیل ہے جس کے نزدیک جزیہ صرف اہلِ کتاب سے لیا جاتا ہے یا جو ان کے مشابہ ہیں، جیسے مجوس۔ صحیح میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مجوسِ ہجر سے جزیہ لیا ہے۔[1] امام شافعی اور احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے عجمیوں سے لینا چاہیے، چاہے اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین۔ رہے عرب سو ان سے نہ لیا جائے مگر اہلِ کتاب سے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ جزیے کا مقرر کرنا سارے کفار پر، خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا مجوسی یا وثنی وغیرہ، جائز ہے۔ وَلِمَآخِذِ هَذِهِ الْمَذَاهِبِ وَذِكْرِ أَدِلَّتِهَا مَكَانٌ غَيْرُ هَذَا وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.

ذلت و مقہوری:

ہاتھ سے مراد قہر و غلبہ ہے، یعنی مقہور ہو کر اور ذلیل و خوار بن کر جزیہ ادا کریں، اس لیے اہلِ ذمہ کی عزت افزائی اور ان کو مسلمانوں سے بلند رکھنا یا فوقیت دینا جائز ہے، بلکہ وہ ذلیل اور چھوٹے اور بد بخت ہیں، جس طرح کہ صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «لَا تَبْدَؤُا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ بِالسَّلَامِ وَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ فِي طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُمْ إِلَىٰ أَضْيَقِهِ»[2] اسی لیے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان پر وہ امور شرط کیے تھے جو ان کی ذلت، چھوٹے ہونے اور حقارت میں مشہور ہیں۔ چنانچہ ائمہ حفاظ نے عبدالرحمان بن غنم اشعری سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے جبکہ انھوں نے اہلِ شام کے نصاریٰ سے صلح کی یہ عہد نامہ لکھا:

"بسم الله الرحمن الرحيم. هذا كتاب لعبد الله عمر أمير المؤمنين من نصارىٰ مدينة كذا وكذا، إنكم لما قدمتم علينا سألنٰكم الأمان لأنفسنا وذرارينا و أموالنا وأهل ملتنا وشرطنا لكم على أنفسنا أن لا نحدث في مدينتنا ولا فيما حولها ديرا ولا كنيسة، ولا قلاية ولا صومعة راهب، ولا نجدد ما خرب، ولا نحيي منها ما كان خططا للمسلمين، وأن لا نمنع كنائسنا أن ينزلها أحد من المسلمين في ليل ولا نهار، وأن نوسع أبوابها للمارة وابن السبيل، و أن ننزل من مر بنا من المسلمين ثلاثة أيام نطعمهم، ولا نؤوي في كنائسنا ولا منازلنا جاسوسا، ولا نكتم غشا للمسلمين، ولا نعلم أولادنا القرآن، ولا نظهر شركا، ولا ندعو إليه أحدا؛ ولا نمنع أحدا من ذوي قرابتنا الدخول في الإسلام إن أرادوه، و أن نوقر المسلمين، وأن نقوم من مجالسنا إن أرادوا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۸۷)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۱۶۷)

الجلوس، ولا نتشبه بهم في شيء من ملابسهم، في قلنسوة، ولا عمامة، ولا نعلين، ولا فرق شعر، ولا نتكلم بكلامهم، ولا نكتني بكناهم، ولا نركب السروج، ولا نتقلد السيوف، ولا نتخذ شيئا من السلاح، ولا نحمله معنا، ولا ننقش خواتيمنا بالعربية، ولا نبيع الخمور، و أن نجز مقاديم رؤسنا، وأن نلزم زينا حيثما كنا، وأن نشد الزنانير على أوساطنا، وأن لا نظهر الصليب على كنائسنا، وأن لا نظهر صلبنا ولا كتبنا في شيء من طرق المسلمين ولا أسواقهم، ولا نضرب نواقيسنا في كنائسنا إلا ضربا خفيفا، وأن لا نرفع أصواتنا بالقراءة في كنائسنا في شيء من حضرة المسلمين، ولا نخرج شعّانين ولا بعوثا، ولا نرفع أصواتنا مع موتانا، ولا نظهر النيران معهم في شيء من طرق المسلمين ولا أسواقهم، ولا نجاورهم بموتانا، ولا نتخذ من الرقيق ما جرى عليهم سهام المسلمين، وأن نرشد المسلمين، ولا نطلع عليهم في منازلهم"

جب میں یہ کتاب لکھ کر لایا تو عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں اتنا اور زیادہ کر دیا:

"ولا نضرب أحدا من المسلمين، شرطنا لكم ذلك على أنفسنا وأهل ملتنا، وقبلنا عليه الأمان، فإن نحن خالفنا في شيء مما شرطناه لكم ووظفنا على أنفسنا، فلا ذمة لنا، وقد حل لكم منا ما يحل من أهل المعاندة والشقاق" [1] انتہیٰ کلام ابن کثیر رحمہ اللہ.

"بسم الله الرحمن الرحيم- فلاں فلاں شہر کے عیسائیوں کی طرف سے امیر المومنین عمر بن خطاب کے نام خط۔ آپ جب ہمارے پاس آئے تو ہم نے آپ سے اپنی جانوں، مالوں، اولاد، اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے امان طلب کی، ہم نے اپنے اوپر یہ شرط رکھی کہ ہم اپنے شہر اور اس کے مضافات میں کوئی نیا گرجا، عبادت گاہ، دَیر اور راہب کا حجرہ نہیں بنائیں گے، ایسے کسی اور ان مقام کو ازسر نو تعمیر نہیں کریں گے اور ایسے کسی خطے کو بھی آباد نہیں کریں گے جو مسلمانوں کا ہو، دن ہو یا رات کسی وقت میں ہمارے گرجے کسی مسلمان مسافر کے لیے بند نہیں ہوں گے، گزرنے والوں اور مسافروں کے لیے ان کے دروازے کھلے رکھیں گے، اپنے پاس گزرنے والے مسلمانوں کو تین دن کھانا کھلائیں گے، اپنے گرجوں اور گھروں میں کسی جاسوس کو پناہ نہیں دیں گے، مسلمانوں کو دھوکا نہیں دیں گے، اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم نہیں دیں گے، شرک کا اظہار نہیں کریں گے، اور اس کی دعوت بھی نہیں دیں گے، ہمارے عزیزوں میں سے جو مسلمان ہونا چاہے اس کو منع نہیں کریں گے، مسلمانوں کی توقیر کریں گے، اگر وہ بیٹھنا چاہیں تو ہم ان کے لیے اپنی مجلسوں سے اُٹھ جائیں گے، ہم ٹوپی، کپڑے، عمامے، جوتوں، سر کے درمیان

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٦۔ ٤٥٧)

مانگ نکالنے میں ان کی مشابہت اختیار نہیں کریں گے، ان کی زبان نہیں بولیں گے، ان کی کنیتیں نہیں رکھیں گے، گھوڑوں کی زینوں پر سوار نہیں ہوں گے، تلواریں نہیں لٹکائیں گے اور کسی قسم کا اسلحہ نہ رکھیں گے نہ اپنے ساتھ اٹھائیں گے، اپنی انگوٹھیوں پر عربی نقش نہیں بنوائیں گے، شراب نہیں بیچیں گے، اپنے سر کے سامنے کے بالوں کو کاٹیں گے، اپنا مخصوص لباس ہی پہنیں گے، کمر میں زنار باندھ کر رکھیں گے، اپنے گرجوں میں صلیب ظاہر نہیں کریں گے، مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں بھی اپنی صلیبوں اور کتابوں کو کھلے عام نہیں رکھیں گے، اپنے گرجوں میں آہستہ آواز سے ناقوس بجائیں گے، مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے گرجوں میں بلند آواز سے نہیں پڑھیں گے، ایسٹر سے پہلے والی اتوار کی عید اور بارش کی دعا کا جلوس نہیں نکالیں گے، اپنے مردوں کے ساتھ آوازیں بلند نہیں کریں گے، مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں اپنے مردوں کے ساتھ آگ لے کر نہیں نکلیں گے، اس طرح وہاں اپنے مردے لے کر بھی نہیں گزریں گے، مسلمانوں نے غلاموں کے جو حصے مقرر کیے ہوں، ان سے کچھ نہیں کہیں گے، مسلمانوں کی راہنمائی کریں گے اور ان کے گھروں میں نہیں جھانکیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اضافہ کیا:

اور کسی مسلمان کو ماریں گے بھی نہیں، ہم نے اپنی جانوں اور اہلِ مذہب پر یہ شرطیں رکھیں ہیں، انہی شرطوں پر ہم امان قبول کرتے ہیں، اگر ہم نے ان شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی مخالفت کی تو ہمارے لیے کوئی امان اور ذمہ نہیں ہوگا اور تمھارے لیے ہمارے خلاف ہر وہ کام کرنا جائز ہوگا جو مخالفت اور دشمنی رکھنے والوں کے خلاف جائز ہوتا ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مشرک نجس ہیں، یعنی صاحبِ نجاست ہیں، کیونکہ ان کے پاس وہ شرک ہے جو بمنزلہ نجاست ہے، گویا وہ عین پلیدی ہے بسبب خبث باطن کے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کی عیون (آنکھیں) نجس ہیں کتے اور خنزیر کی طرح۔[1] امام قتادہ و معمر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ نجاست کے ساتھ موصوف ہیں، کیونکہ طہارت و غسل نہیں کرتے اور نہ نجاستوں سے بچتے ہیں۔[2] یہ نجاستیں ان کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ مشرکین سے اس جگہ بت پرست مراد ہیں نہ اور اوصافِ کفار۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی ساری قسمیں وغیرہم۔ ظاہریہ، جو نجاستِ ذات کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہی آیت ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے ہی مروی ہے۔[3] حسن بن صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے

---

[1] تفسير الرازي (١٦/ ٢٠) [2] فتح القدير (٢/ ٥٠٠) [3] فتح القدير (٢/ ٥٠٠)

کہ ''مَنْ مَسَّ مُشْرِكاً فَلْيَتَوَضَّأْ''[1] یعنی جو کوئی مشرک کو چھوئے تو ہاتھ دھوئے، لیکن جمہور سلف و خلف مع ائمہ اربعہ اس طرف گئے ہیں کہ کافر نجس الذات نہیں ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کے قول و فعل سے ذات کی عدمِ نجاست ثابت ہے، کیونکہ ان کے برتنوں میں کھایا ہے اور ان کا پانی پیا ہے اور اس سے وضو کیا ہے اور ان کو اپنی مسجد میں اتارا ہے اور یہی حق بھی ہے۔ یہ جو فرمایا کہ وہ مسجدِ حرام کے نزدیک نہ ہوں، یہ متفرع ہے ان کی نجاستِ باطنی پر۔

حرم اور مساجد میں مشرک کا داخل ہونا:

گویا حرم میں داخل ہونے کی ممانعت مبالغہ ہے اور مشرکوں کی قربت سے ممانعت اس طرف لوٹتی ہے کہ مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ ان کو مسجد میں آنے دیں۔ مراد مسجدِ حرام سے سارا حرم ہے، یہ آیت اس کی تائید کرتی ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾ [بني إسرائيل: ١] ''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔'' کیونکہ اس جگہ مراد حرم ہے، کیونکہ نبیِ اکرم ﷺ کا اسرا امِ ہانی کے گھر سے ہوا تھا اور بعض نے کہا کہ نفسِ مسجدِ حرام مراد ہے، اس صورت میں پورے حرم میں داخل ہونے سے منع نہیں کیا جائے گا۔

رہیں اور مساجد سو اہلِ مدینہ کا مذہب یہ ہے کہ ہر مشرک کو ہر مسجد سے منع کیا جائے گا اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک آیت سارے مشرکوں کے حق میں عام ہے اور مسجدِ حرام کے ساتھ خاص ہے تو اور مسجدوں میں آنے سے نہ روکے جائیں۔ نبیِ اکرم ﷺ نے ثمامہ بن اثال کو مسجد میں باندھا تھا[2] اور وفدِ ثقیف کو وہاں اتارا تھا۔[3] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے مطابق ہے اور اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ ذمی کا ساری مسجدوں میں داخل ہونا جائز ہے بغیر حاجت کے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کو حاجت کے ساتھ مشروط کیا ہے اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات ذمی کے لیے جائز ہے مشرک کے لیے جائز نہیں ہے۔[4]

کافر کے لیے بلادِ اسلام کی صورتیں:

حاصل یہ ہوا کہ کفار کے لیے بلادِ اسلام تین طرح کے ہیں: ایک حرم اس میں کافر کا کسی حال میں بھی داخل ہونا درست نہیں، ذمی ہو یا مستامن، ظاہرِ آیت کی دلیل سے۔ امام شافعی، احمد اور مالک رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں، اگر دار الکفر کا کوئی قاصد آئے اور امام حرم میں ہو تو اس کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے، بلکہ امام خود اس کے پاس نکل کر جائے یا کسی اور شخص کو بھیج دے کہ جا کر حرم سے باہر اس کی بات سنے۔

---

[1] تفسير الخازن (٣/ ٧٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث ٣٠٢٦) اس کی سند میں ''حسن بصری'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ روایت کر رہا ہے۔ نیز حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے محلِ اتفاق نہیں ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٣١٩)

[4] فتح القدير (٢/ ٥٠٠)

دوسرا حجاز اس کی حد مابین یمامہ ویمن ونجد و مدینہ ہے۔ کہتے ہیں کہ نصف مدینہ تہامی ہے اور نصف حجازی اور بعض نے کہا ہے کہ سب حجاز ہے۔ ابن الکلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حجاز کی حد مابین کوہِ طیّ و طریقِ عراق ہے۔ حربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تبوک حجاز میں سے ہے۔ کفار کو ارضِ حجاز میں اجازت لے کر داخل ہونا درست ہے، لیکن تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرے۔[1] احادیثِ صحیحہ کی رو سے جو اس بارے میں آئی ہیں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسموعاً و مرفوعاً کہتے ہیں: "لَأُخْرِجَنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ حَتّٰى لَا أَدَعَ إِلَّا مُسْلِماً"[2]

پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ان کو نکال دیا اور ان کے تاجر کے لیے تین دن کی میعاد مقرر کی اور جزیرۂ عرب اقصیٰ عدن سے ریفِ عراق تک طول میں اور جدہ سے اطرافِ شام تک عرض میں ہے۔ تیسری قسم تمام بلادِ اسلام ہیں، اس میں کافر کو عہد و امان اور ذمہ کے ساتھ قیام کرنا درست ہے، لیکن مسجدوں میں نہ آئیں، مگر مسلمانوں کی اجازت سے اور وہ بھی حاجت اور ضرورت کی صورت میں۔

پھر یہ حکم کہ اس سال کے بعد مسجدِ حرام سے نزدیک نہ ہوں، اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ یہ حکم سنہ نو ہجری میں ہوا، دوسرا یہ کہ سنہ دس ہجری میں ہوا، یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے اور مقتضائے لفظ کے مطابق ہے اور یہ قول کہ یہ حکم نو ہجری میں نازل ہوا تھا جس سال کہ اعلان کیا گیا نہایت عجیب ہے،[3] لیکن اس کا جواب دیا گیا ہے، اسی طرح راجح یہ ہے کہ یہ نہی کچھ حج و عمرہ کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ ہر وقت خواہ مناسک کا موسم ہو یا نہ ہو اور اس کو بعض اوقات کے ساتھ خاص کرنا دلیل کا محتاج ہے۔

فقر کے خوف سے نجات:

پھر اللہ نے فرمایا کہ اگر تم کو محتاجی کا ڈر ہو گا تو اللہ تم کو تونگر کر دے گا، تم یہ فقر کا خوف ناحق کرتے ہو۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان پر اہلِ ذمہ کے ساتھ جزیہ کا دروازہ کھول دیا، اس فرمان کے تحت: ﴿ قٰتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (آیتِ باب) امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو بار بار کے انعامات، پے در پے فتوحات اور اسلام کی سلطنت کے پھیل جانے سے غنی کر دیا۔[4] عرب مسلمان ہو گئے اور مکے میں تجارت کا مال و اسباب لائے جس کے سبب سے ان کو آسودگی حاصل ہوئی۔ یا مالِ فَی سے ان کو غنی کر دیا۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جدہ، صنعا اور جرش اسلام لے آئے اور بہت سا غلہ مکے میں لائے، اللہ نے اہلِ مکہ سے فقر کا خوف دور کر دیا۔[5] امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کا جزیہ سے عوض کر کے انھیں تونگر کر دیا۔ مشیت کی قید اس لیے لگائی ہے کہ بندوں کو چاہیے کہ زمانہ مستقبل کے متعلق اپنے ہر کلام میں ان

[1] تفسیر الخازن (٣/ ٧٨) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٦٧) [3] أحكام القرآن لابن العربي (٢/ ٤٧١)
[4] تفسیر القرطبي (٨/ ١٠٦) [5] تفسیر البغوي (٤/ ٣٣)

شاء اللہ تعالیٰ کہا کریں اور دعا و تضرع سے اکتا نہ جائیں اور جان لیں کہ غنا، جس کا وعدہ کیا گیا ہے، بعض کو ہوتی ہے اور بعض کو نہیں ہوتی اور کسی سال میں ہوتی ہے کسی میں نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے، وہ علیم اور حکیم ہے جو اس نے چاہا وہ ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

اہلِ کتاب کا کفر اور ان سے قتال:

پھر اللہ نے مشرکین وغیرہم کے ساتھ جنگ کا حکم دیا اور اس بات پر نص کی کہ اہلِ کتاب مومن نہیں ہیں، یہود اس لیے کافر ٹھہرے کہ انھوں نے اللہ کی کچھ قدر نہ کی اور نہ اللہ کی صفاتِ کمال کو پہچانا اور اللہ اور رسول پر ایمان لانے کے درمیان فرق کیا اور عزیر علیہ السلام کے حق میں غلو کیا، ان کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا۔ نصاریٰ کا کفر یہ ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کے حق میں غلو کرتے ہیں اور ثالثِ ثلاثہ بتاتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت جب اتری کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو روم کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر غزوۂ تبوک ہوا۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نزول قریظہ و نضیر کے یہود کے بارے میں ہوا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مصالحہ کر لیا، یہ پہلا جزیہ تھا جو کہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور پہلی ذلت تھی جو اہلِ کتاب کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے پہنچی۔[1] اور اللہ نے اس بات پر نص کی ہے کہ یہ لوگ ایمان دار نہیں ہیں، نہ آخرت ہی پر یقین رکھتے ہیں، اگرچہ بظاہر جنت اور نار کو ثابت کرتے ہیں اور بعض تو ارواح کے دوبارہ اٹھائے جانے کے قائل ہیں نہ کہ جسموں کے اور کہتے ہیں کہ جنت میں کھانا پینا اور نکاح کرنا کچھ نہ ہوگا، سو اس اعتقاد کا آدمی مومن نہیں ہوتا، گو وہ اپنے آپ کو مومن سمجھے۔ اسی طرح اللہ اور رسول کی حرام کردہ چیزوں کو یہ حرام نہیں جانتے، جیسے: چربی، خنزیر اور شراب۔

اہلِ کتاب سے مراد:

یا مراد تورات اور انجیل کی تحریف ہے یا احبار اور رہبان کی تقلید ہے اور دینِ حق سے مراد، جس کو انھوں نے اختیار نہیں کیا، دینِ اسلام ہے جو تمام ادیان کا ناسخ ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ خاتم النبیین کی بعثت کے بعد اُن کا دین باطل ہو گیا۔ اس جگہ کتاب والوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، یعنی اہلِ تورات اور انجیل۔ اس پر اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [المائدة: ٦٨] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم ہرگز اصل دین پر کاربند نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ تم تورات و انجیل اور جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے لگو۔“ سو اہلِ کتاب کے لفظ سے یہی دونوں فریق مراد ہوتے ہیں اور جہاں لفظ بنی اسرائیل آتا ہے، وہاں

[1] تفسير البغوي (٤/ ٣٣)

فقط یہود مراد ہیں اور جہاں لفظ نصاریٰ آتا ہے ان سے فقط عیسائی مراد ہوتے ہیں اور یہ صاحب انجیل ہیں۔ رہے مجوس سو وہ اہل کتاب نہیں ہیں، اس حدیث کی روشنی میں: «سَنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ»[1] (أخرجه البخاري من حديث عبد الرحمن بن عوف ويدلّ له أيضا قوله تعالى ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ﴾ [الأنعام: ۱۵۶])

مجوس اور جزیہ:

یہ اس بات کی تصریح ہے کہ مجوس یعنی پارسی اہل کتاب نہیں ہیں۔ پھر جزیہ کو انتہائی عقوبت ٹھہرایا۔ جزیہ اس مال کا نام ہے جو معاہد کے ذمے بطورِ تحقیر و ذلت ہر سال لگایا جاتا ہے جس کو آج کل ٹکس (چنگی یا ٹیکس) بولتے ہیں۔ ہاتھ سے دینے کے یہ معنی ہیں کہ ان سے بزور لیا جاتا ہے یا وہ خود اپنے ہاتھ میں رکھ کر پیش کرتے ہیں، کسی اور کی معرفت نہیں دیتے، یا نقد ادا کرتے ہیں نہ کہ نسیہ (ادھار) یا تمھارا ان سے یہ لینا ایک طرح کا تمھارا ان پر انعام ہے۔ ہاتھ انقیاد (تابع ہونا) سے کنایہ ہے، مطلب یہ کہ ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ جزیہ بخوشیِ خاطر و اتباع اور بلا اکراہ ادا کریں اور جب جزیہ کا زبردستی سے لینا ٹھہرے گا تو پھر ذمہ کا عہد باقی نہ رہے گا۔

ائمہ ثلاثہ اور ان کے اصحاب، ثوری، اوزاعی اور ابوثور رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سوائے اہل کتاب سے اور کسی کا جزیہ قبول نہیں ہوتا اور مالک اور اوزاعی کے نزدیک ہر قسم کے کافر سے جزیہ لیا جاتا ہے کوئی ہو کہیں ہو۔ پہلے قول کے مطابق مجوس اہل کتاب میں داخل ہیں۔ امام ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے ان سے جزیہ لینے میں کسی کی ممانعت معلوم نہیں۔[2] سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مجھے مجوس کا حال سب سے زیادہ معلوم ہے، ان کے پاس ایک علم تھا جس کے یہ عالم تھے اور ایک کتاب تھی جس کو وہ پڑھتے پڑھاتے تھے، لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔[3] (كما قاله ابن القيم)

صحیح بخاری میں آیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجوس سے جزیہ لینے میں توقف کیا، یہاں تک کہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے گواہی دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسِ ہجر سے جزیہ لیا ہے[4] اور اہل بحرین سے اور وہ بھی مجوس تھے،[5] اس سے ثابت ہوا کہ ہر سہ گروہ سے جزیہ لینا چاہیے۔ بالاتفاق اہل کتاب سے بنص قرآن اور مجوس سے بنص سنت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے پیش نظر: «سَنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ أَهْلِ الْكِتَابِ»[6]

---

(1) صحیح بخاری میں ان الفاظ کے بجائے اس موضوع کی روایت مروی ہے جو زیرِ تفسیر آیت میں بھی گزر چکی ہے، البتہ ان الفاظ کے ساتھ دیگر کتب حدیث میں مروی ہے۔ دیکھیں: سنن البيهقي الكبرىٰ (۹/ ۱۸۹) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ محمد بن علی باقر رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (۵/ ۸۸)

(2) فتح القدير (۲/ ۵۰۲)

(3) سنن البيهقي الكبرىٰ (۹/ ۱۸۸) أحكام أهل الذمة لابن القيم (۱/ ۸۳۔ ۸۴) اس کی سند میں ''ابوسعد بقال'' ضعیف راوی ہے۔

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۸۷) (5) صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۹۸۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۹۶۱)

(6) اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

جزیہ کی مقدار:

اب رہی جزیہ کی مقدار سو اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ مقدار نہیں جو قول و قرار ٹھہر گیا ہو، اس کے مطابق لیا جائے۔ یہی امام یحییٰ بن آدم، ابو عبید اور ابن جریر رحمہم اللہ کا قول ہے، لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ کم سے کم جزیہ ایک دینار ہے، اس سے کم نہ لینا چاہیے، یہی امام ابو ثور رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ایک دینار سے زیادہ پر صلح کی ہے تو زیادہ لینا درست ہے، جبکہ وہ خوشی سے زیادہ دیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے چار دینار ہیں سونے والوں پر اور چالیس درہم چاندی والوں پر۔ اس میں امیر و غریب سب برابر ہیں اور اگر مجوسی ہے تو نہ زیادہ نہ کم۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اصحابِ ابو حنیفہ، محمد بن حسن، احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ بارہ اور چوبیس اور اڑتالیس ہیں۔[1]

جزیہ کس پر واجب ہے:

بچے، دیوانے اور عورت پر بالاتفاق جزیہ واجب نہیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کے لیے روانگی کے وقت خط دیا تھا اس میں ہر حالم (بلوغت کو پہنچنے والا) یعنی بالغ پر ایک دینار لکھا تھا۔[2] اس قید سے عورت اور بچے خارج رہے، مگر ابن حزم رحمہ اللہ نے بدلیل "حالمة" جو ایک روایت میں آئی ہے عورت پر بھی واجب کہا ہے، لیکن حفاظِ حدیث کے نزدیک یہ الفاظ ثابت نہیں، لہٰذا اس مذہب کو ضعیف ٹھہرایا گیا ہے۔ اب رہا غلامِ سود تو اگر اس کا سید مسلمان ہے تو پھر اس پر بالاتفاق کوئی جزیہ نہیں اور سامریہ پر ہے، اس لیے کہ وہ یہودیوں میں ایک کثیر تعداد میں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب بہت سے شہر فتح کیے تو ان کو جزیہ تسلیم کر لینے پر برقرار رکھا، اسی طرح ائمہ اور خلفائے مابعد نے کیا ہے۔

صابئہ سے جزیہ:

رہے صابئہ سو امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک بڑی امت ہے ان کے اکثر فلاسفہ ہیں اور ان کے مقالات (نظریات) مشہور ہیں، ان سے بھی جزیہ لیا جاتا ہے، کیونکہ یہ مجوس کے مقابلے میں احسن الحال ہیں۔ جب مجوس سے لیا تو ان سے بالاولیٰ لینا چاہیے، کیونکہ مجوس دین و مذہب میں سب سے خبیث امت ہیں۔[3] بنو تغلب جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے وہ حکمِ نصاریٰ میں ہیں۔ صاحبِ قوت و شوکت تھے، جب اسلام آیا تو انھوں نے جزیہ

[1] فتح القدير (٢/ ٥٠٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٢٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٥٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔(إرواء الغليل: ٣/ ٢٦٩)

[3] أحكام أهل الذمة (١/ ٢٣٦۔ ٢٤٢) ملخصاً.

دینے میں عار و انکار کیا، اس لیے ان پر دوگنا صدقہ باندھا گیا جزیہ کے بدلے۔

غرض کہ وہ طوائف جن سے جزیہ لیا جاتا ہے، یہ ہیں جس مقدار اور معاملے پر ان سے مصالحت ہوگئی ہو وہ ہی ٹھیک ہے اور یہودِ خیبر وغیرہم عمومِ آیت میں داخل ہیں، ان کو خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں آئی۔ نبیِ اکرم ﷺ نے جو ان سے اور مدینہ کے یہود سے جزیہ نہ لیا، اس کا سبب یہ تھا کہ ان کو مدینے سے نکال دیا تھا اور بعض سے قتال کیا، وہ قتال جزیہ کا حکم آنے سے پہلے تھا۔ خیبر والوں سے جزیہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے صلح کر لی تھی اور یہ حکم تو سنہ نو ہجری میں آیا تھا۔

مذکورہ گروہوں کے علاوہ کافروں سے جزیہ:

رہے وہ لوگ جو ان کے علاوہ تھے جن کا ذکر کیا گیا کہ ان سے جزیہ لینا چاہیے یا نہیں اس کے بعد کہ دونوں اہلِ کتاب اور مجوس سے جزیہ لینے پر اتفاق ہے۔ سو حنفیہ کہتے ہیں کہ بت پرستانِ عجم سے لینا چاہیے نہ بت پرستانِ عرب سے۔ ان کی دلیل سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ مرفوع حدیث ہے: «أُرِيدُ مِنْهُمْ كَلِمَةً تَدِينُ لَهُمْ بِهَا الْعَرَبُ وَتُؤَدِّي الْجِزْيَةَ بِهَا إِلَيْهِمُ الْعَجَمُ»[1] (رواه أحمد والترمذي) امام مالک اور ابو یوسف رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ جزیہ عربی وثنی سے لیا جائے گا، اس حدیث کی دلیل سے جو بریدہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں آئی ہے اس میں فرمایا ہے: «إِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَادْعُهُمْ إِلٰى ثَلَاثِ خِصَالٍ إِلٰى قَوْلِهٖ فَإِنْ هُمْ أَبَوْا فَسَلْهُمُ الْجِزْيَةَ فَإِنْ هُمْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ»[2]

جزیہ کی جنس اور وقت:

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جزیہ ہر کافر سے لینا چاہیے، کیونکہ اس حدیث میں کسی کافر کا استثنا نہیں کیا اور حدیث کے الفاظ سے جزیے کو اہلِ کتاب کے ساتھ خاص کر دینے کا مفہوم نہیں نکلتا اور نبیِ اکرم ﷺ کی فوج اور لشکر اکثر اہلِ عرب کے بت پرستوں سے لڑتے تھے اور عام کفار سے جزیہ لیتے تھے بدلیلِ سنت اور اہلِ کتاب سے لیتے تھے بدلیلِ قرآن۔ اور خود نبیِ اکرم ﷺ نے مجوس سے جو آتش پرست تھے جزیہ لیا ہے اور ان کو بت پرستوں سے جدا نہیں سمجھا۔ پھر جزیہ میں کچھ سونا چاندی ہی لینا متعین نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کا مال جو وہ رکھتے ہوں، کپڑا، ہتھیار، لوہا، تانبا اور غلہ وغیر ذلک وہی لیا جا سکتا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ کی سنت اسی طرح پر ہے۔ چنانچہ اہلِ نجران سے حلہ (کپڑا) اور سلاح لیا تھا نہ کہ زر و سیم۔

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣٢) اس کی سند میں "یحییٰ بن عمارہ" مجہول راوی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" (رقم الحديث: ٦٠٤٢) پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کیا ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣١)

غرض کہ شریعت میں جزیہ کا اندازہ اس طرح پر کہ کم وبیش نہ ہو یا اس کی جنس مقرر ہو، نہیں ہے۔ رہا وقت جزیہ لینے کا سو جب سال گزر جائے تب واجب ہوتا ہے، اس سے پہلے مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہی امام احمد اور شافعی رحمہما اللہ کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک، سال کے شروع میں لینا واجب ہے، ماہوار کے حساب سے لیا جائے، مگر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفا سال کے آخر پر مطالبہ کرتے تھے، اس لیے یہی راجح اور قواعدِ شریعت کے مقتضا کے مطابق ہے۔

ذلت سے مراد:

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صغار یعنی ذلت سے یہ مراد ہے کہ کھڑے ہو کر دے نہ کہ بیٹھ کر۔[1] کسی نے کہا ہے کہ پا پیادہ لائے نہ کہ سوار ہو کر اور دیر تک لیے ہوئے کھڑا رہے، پھر اس کو اس جگہ تک کھینچ کر لایا جائے جو جزیہ کے وصول کرنے کے لیے مقرر ہو۔ کشاف میں کہا ہے کہ اس کا گریبان پکڑ کر کھینچیں اور کہیں کہ جزیہ ادا کر اور اس کی پیٹھ پر ایک آدھ گھونسا جڑیں، گو وہ دینے ہی کے لیے آیا ہو۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کو گریبان پکڑ کر لے چلیں اور ایک آدھ لات مار دیں۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ڈاڑھی پکڑ کر دو ایک دھپ لگائیں اور اس سے کہیں کہ اے اللہ کے دشمن! اللہ کا حق دے۔ اس کے سوا اور بہت اقوال ہیں، جن کی دلیل کوئی نہیں ہے اور نہ یہ آیت کا مقتضا ہے اور نہ ہی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں اور نہ اصحاب سے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ صغار سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام ان پر لازمی طور پر جاری کیے جائیں اور ان سے جزیہ لیا جائے کہ یہی خواری اور زاری کافی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور من جملہ صغار کے وہ عہد نامہ ہے جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شام کے نصاریٰ سے صلح کے وقت لکھوایا تھا اور اوپر گزر چکا ہے۔

شروطِ جزیہ کی حیثیت اور اہلِ جزیہ سے سلوک:

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان شرائط کی شہرت اسناد سے بے نیاز کرتی ہے، ائمہ نے ان شروط کو قابلِ قبول کر کے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان کی حجت لائے ہیں اور ہمیشہ یہ شروطِ عمریہ ان کی زبان پر اور کتابوں میں مذکور ہوتی رہی ہیں[4] اور خلفا نے ان کو جاری رکھا اور ان کے مطابق عمل کرتے رہے۔ بہرحال جن سے جزیہ لیا جاتا ہے ان کو تکلیف غیر مقدور نہ دینا چاہیے اور نہ ان کو محبوس کریں اور جزیہ ادا کرنے پر عذاب نہ دے، نہ مارے پیٹے۔ امام ابوعبید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما کا ایک قوم پر گزر ہوا جن کو فلسطین میں جزیے کے بارے میں عذاب دیا جاتا تھا۔ ہشام رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا وہ فرماتے تھے: «إِنَّ اللّٰهَ يُعَذِّبُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

---

[1] تفسير القرطبي (٨/ ١١٥)　[2] الكشاف (٢/ ٢٥٠)　[3] فتح القدير (٢/ ٥٠٣)

[4] أحكام أهل الذمة (٣/ ١١٦٤-١١٦٥)

الَّذِيْنَ يُعَذِّبُوْنَ النَّاسَ فِي الدُّنْيَا»[1] سیدنا عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے[2] اور امام زہری رحمہ اللہ نے اس کو عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ سے بھی روایت کیا ہے۔[3]

امام جبیر بن نفیر رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بہت سا مال لائے، کہا: میں گمان کرتا ہوں کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا، کہا: واللہ! ہم نے نہیں کیا، مگر آسانی سے فرمایا: "بِلَا سَوْطٍ وَّلَا نَوْطٍ؟" کہا: ہاں، فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَجْعَلْ ذٰلِكَ عَلٰى يَدَيَّ وَلَا فِيْ سُلْطَانِيْ"[4] سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک مرد کو عکبری پر عامل مقرر کیا اور اس سے کہا: دیکھ ان کا گدھا اور گائے اور کپڑا اور کوئی جنس بابت خراج کے فروخت نہ کرنا، بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرنا اور خود سوئی والے سے سوئی اور رسی والے سے رسی اور اسی طرح کی اشیا لیتے۔

امام ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے یہ چیزیں جزیہ کی مقدار کے درہموں کی قیمت کے بدلے لیتے، ان کو نرمی اور تخفیف کے طور پر ان اشیا کے فروخت کرنے کی تکلیف نہ دیتے، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو دینار کے بدلے معافری کپڑا لینے کا حکم دیا۔[5] یہ سب اہلِ ذمہ کے ساتھ نرمی تھی، تاکہ ان کا سامان فروخت نہ کیا جائے، بلکہ جو قیمت میں ان پر آسان ہو وہی ان سے لیا جائے۔[6] اس بارے میں رسالہ "إفادة الأمة في أحكام أهل الذمة" تالیف سید محمد اسماعیل امیر یمنی رحمہ اللہ نہایت جامع ہے۔[7]

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٣٠﴾

اور یہودیوں نے کہا: عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا: عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کے مونہوں کی بات ہے، یہ اس سے پہلے کے کافروں کی بات کی ریس کرتے ہیں، اللہ انھیں ہلاک کرے، یہ کہاں پھرے جاتے ہیں (30)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦١٣) مسند أحمد (٣/ ٤٦٨)

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٠٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٠٠) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦١٣)

[4] كنز العمال (٤/ ٨٢١)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٢٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٥٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل (٣/ ٢٦٩)

[6] أحكام أهل الذمة (١/ ١٤١۔ ١٤٣) [7] فتح البيان (٥/ ٢٦٦۔ ٢٨٠)

یہود و نصاریٰ کا شرک و کفر:

یعنی اہلِ کتاب ہو کر مشرکوں کی ریس کرنے لگے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی طرف سے ایمان داروں کو مشرکین، کفار اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ابھارنا ہے، ان کے اس قولِ شنیعہ پر جو انھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا فرزند ٹھہرایا۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا.

امام سدی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ شبہہ یہود کو اس طرح ہوا کہ جب عمالقہ بنی اسرائیل پر غالب ہوئے اور انھوں نے علمائے بنی اسرائیل کو قتل کر ڈالا اور ان کے اکابر کو قید کر لیا، عزیر علیہ السلام باقی رہ گئے، وہ بنی اسرائیل اور علم کے چلے جانے پر روتے تھے، یہاں تک کہ ان کی پلکیں گر گئیں۔ اتفاقاً ایک دن ان کا گزر ایک عید گاہ پر ہوا، ایک عورت کو دیکھا کہ وہ ایک قبر کے نزدیک رو کر کہتی تھی: ”وَامُطْعِمَاهُ وَاكَاسِيَاهُ“ انھوں نے اس سے کہا: افسوس ہے تجھ پر! اس صاحبِ قبر سے پہلے کون تجھے روٹی کپڑا دیتا تھا؟ اس نے کہا: اللہ، فرمایا: اللہ زندہ ہے وہ کبھی نہ مرے گا۔ اس نے کہا: اے عزیر! بنی اسرائیل سے پہلے لوگوں کو کون علم سکھاتا تھا؟ فرمایا: اللہ، اس نے کہا: پھر تم ان پر کس لیے روتے ہو؟ انھوں نے جان لیا کہ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ان کو وعظ کیا گیا ہے۔

پھر ان کو حکم ہوا کہ فلاں نہر پر جاؤ اور نہا کر دو رکعت نماز پڑھو، تم کو وہاں ایک بوڑھا آدمی ملے گا وہ جو کچھ تم کو کھلائے وہ تم کھا لینا، انھوں نے جا کر یہی کیا، شیخ کو وہاں پایا، اس نے کہا: اپنا منہ کھول، انھوں نے منہ کھولا، اس نے ایک چیز مثل بڑے اخگر کے ان کے منہ میں ڈال دی، تین بار اسی طرح کیا، عزیر علیہ السلام وہاں سے پھرے، تورات کے سب سے بڑے عالم تھے، کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمھارے پاس تورات لایا ہوں، انھوں نے کہا: عزیر تو جھوٹا آدمی نہ تھا، عزیر نے اپنی ایک انگلی پر قلم باندھ کر ساری تورات لکھ دی۔ جب لوگ اپنے دشمن سے فارغ ہو کر واپس آئے اور بقیہ علما بھی پھر کر واپس آئے تو ان لوگوں نے ان کو عزیر علیہ السلام کا حال بتایا، انھوں نے تورات کے وہ نسخے جو پہاڑوں میں چھپا کر رکھے تھے، ان کو نکالا اور ان کے لکھے ہوئے سے مقابلہ کیا، سب صحیح پایا، تب بعض جاہلوں نے یہ کہا کہ یہ کام جو عزیر نے کیا ہے یہ اس لیے کیا ہے کہ یہ اللہ کا بیٹا ہے۔[1]

نصاریٰ مسیح علیہ السلام کے حق میں اس طرح پر گمراہ ہوئے کہ ان کو ثالثِ ثلاثہ ٹھہرا دیا، اس لیے اللہ نے ان دونوں گروہوں کو جھٹلایا اور فرمایا کہ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں، کوئی سند اس بات کی نہیں ہے سوائے افتراق و اختلاق اور بہتان کے۔ جیسی باتیں اگلے کافروں نے کی تھیں، ویسی ہی باتیں یہ بھی بناتے ہیں اور انہی کی طرح گمراہ ہیں۔ اللہ ان کو مارے، برباد کرے! سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”أَيْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ كَيْفَ يُضِلُّوْنَ عَنِ الْحَقِّ وَهُوَ ظَاهِرٌ وَيَعْدِلُوْنَ إِلَى الْبَاطِلِ“[2]

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٢٠٣۔ ٢٠٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٨٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٨) اس کی سند میں ”بشر بن عمارہ“ ضعیف راوی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ سارے یہود و نصاریٰ کا مقالہ ہے اور کسی نے کہا کہ یہ آیت عموم پر ہے، لیکن معنی اس کے خصوص ہیں، کیونکہ قائل اس کے بعض اہلِ کتاب ہیں۔ نقاش رحمہ اللہ نے کہا کہ اب کوئی یہودی قائل اس کا باقی نہیں ہے، بلکہ قائل اس کے ختم ہو گئے ہیں[1] یا ایک جماعت نے یہ بات نبیِ اکرم ﷺ سے کہی تھی مگر آیت اس حکایت کے ضمن میں اتری، اس لیے بعض کا کہنا سب پر لازم آتا ہے۔ نصاریٰ نے جب دیکھا کہ مسیح مُردوں کو جلاتے ہیں (زندہ کرتے ہیں) اور ان کا کوئی باپ نہیں ہے تو یہ بات کہنے لگے مگر زیادہ قریب یہ ہے کہ انھوں نے یہ وصف انجیل میں پایا کہ کہیں ان کو ابن انسان کہا ہے اور کہیں ابن اللہ۔ چنانچہ اس میں کئی جگہ یہ محاورہ موجود ہے، لیکن یہ نہ سمجھے کہ یہ بات عزت و تکریم کے قصد سے کہی گئی یا ان پر اپنے اسلاف کی تحریف ظاہر نہ ہوئی کسی غرض کی وجہ سے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلیل کا لفظ ابراہیم علیہ السلام کے حق میں ان کے شرف اور کرامت کے طور پر آیا ہے، اسی طرح ابن کا لفظ انجیل میں مسیح علیہ السلام کے شرف کے طور پر وارد ہوا ہے۔ نصاریٰ نے مبالغہ کیا، ابن کی تفسیر کو حقیقی اولاد کے معنوں میں جاہلوں نے قبول کر لیا اور یہ فاسد مذہب عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں پھیل گیا۔[2]

اللہ نے فرمایا کہ ان کا یہ کہنا محض زبان سے ہے نہ کہ کسی بیان اور دلیل سے، جس طرح بت پرستوں نے لات، عزیٰ اور منات کو اللہ کی بیٹیاں کہا تھا، ویسا ہی انھوں نے مسیح علیہ السلام کو بیٹا کہا یا جیسے عرب کے کافر فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، اسی طرح کی بات انھوں نے کہی یا جس طرح ان کے اسلاف نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا فرزند کہا تھا، ویسے ہی انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہا۔ اللہ نے ان پر ہلاک ہونے کی دعا کی اور فرمایا کہ یہ دلیل کی وضاحت اور اللہ وحدہ لاشریک لہ کی وحدانیت کی حجت قائم ہو جانے کے بعد حق سے باطل کی طرف پھرتے ہیں۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا.[3]

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں کو (اپنا) رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو (بھی)، حالاں کہ انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک معبود (اللہ) کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس شرک سے پاک ہے جو وہ کرتے ہیں (31)

---

[1] تفسير القرطبي (٨/ ١١٧) [2] تفسير الرازي (١٦/ ٢٨) [3] فتح البيان (٥/ ٢٨١۔ ٢٨٣)

علما، درویشوں اور عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنانا:

ان کے عالم یا درویش اپنی عقل سے جو مقرر کر دیتے وہ سمجھتے کہ اللہ کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا اور وہ لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یا کسی طمع و لالچ سے کچھ ٹھہراتے تھے۔ ایک عالم کا قول عوام کے لیے سند ہے، اگر وہ شریعت سے معلوم کر کے کہے۔ جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے طمع کے لیے کہا تو پھر وہ سند نہیں ہے۔ سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کو جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی تو وہ شام کی طرف بھاگ گئے اور جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ ان کی بہن اور ان کی قوم کی ایک جماعت قید میں آ گئی تھی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بہن پر احسان کیا اور عطا کیا، اس نے واپس آ کر اپنے بھائی کو اسلام کی ترغیب دی اور کہا کہ تم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔ عدی مدینے میں آئے، یہ اپنی قوم کے سردار تھے۔ قوم طی تھی، ان کے باپ حاتم طائی سخاوت کے ساتھ مشہور ہیں، لوگوں نے ان کے آنے کا چرچا کیا، یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، ان کے گلے میں ایک سونے کی صلیب تھی، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیتِ باب کو پڑھ رہے تھے، عدی نے کہا: انھوں نے تو اپنے احبار اور رہبان کو نہیں پوجا۔ فرمایا: ہاں، احبار و رہبان نے ان پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا تھا، انھوں نے ان کی پیروی کی، علما اور درویشوں کے واسطے یہی ان کی عبادت ہوئی۔ اور فرمایا: اے عدی! تیرا کیا نقصان ہے، اگر تو اللہ اکبر کہے، کیا تو جانتا ہے کہ کوئی چیز اللہ سے بڑی ہے؟ بھلا تجھے کیا ضرر ہے اگر تو لا إله إلا الله کہے؟ کیا تو اللہ کے سوا کوئی اور خدا جانتا ہے؟ پھر ان کو اسلام کی طرف بلایا، وہ مسلمان ہو گئے اور شہادتِ حق ادا کی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر خوشی ظاہر ہوئی، پھر فرمایا: یہود "مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ" ہیں اور نصاریٰ "ضَآلِّيْن" ہیں۔[1] (رواہ أحمد والترمذي وابن جرير من طرق وهكذا قال حذيفة بن اليمان و عبدالله بن عباس وغيرهما في تفسير الآية، إنهم اتبعوهم فيما حللوا و حرموا)

علما کو حلال و حرام کا اختیار دینے کی مذمت اور تقلید:

معلوم ہوا کہ چیزوں کے حلال اور حرام ہونے کے بارے میں کسی عالم یا درویش کے بے سند قول پر چلنا گویا ان کو الٰہ ٹھہرانا اور ان کی عبادت کرنا ہے، اسی کو تقلیدِ مذہب کہتے ہیں۔ یہ بلا اس امتِ اخیر میں بھی آ گھسی۔ اس بیماری کی اصل یہود و نصاریٰ سے ہے۔ اللہ نے احبار و رہبان کو رب بنانے کے ساتھ مسیح بن مریم کا بھی ذکر کیا ہے، یہ اس بات پر قرینۂ واضحہ ہے کہ کسی عالم یا درویش کی اللہ کے دین میں تقلید شرک ہوتی ہے۔ شرک کے لیے یہی کچھ ضروری نہیں کہ کسی شخص کو اللہ کہہ کر پوجے، بلکہ جب کسی کے کہنے کے مطابق کسی چیز کو حلال یا حرام سمجھ لیا اور اس کا وہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٥) تفسير الطبري (١٤/ ٢٠٩۔ ٢١١) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٩٣)

قول کتاب وسنت کی سند کے بغیر تھا تو یہ مقلد اس کا عابد اور وہ شخص اس کا معبود ٹھہرا۔ چنانچہ عدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس بات پر صریح دلیل ہے۔ فقہائے امتِ اسلام میں اس کی دلیل یہ ہے کہ ربا کا حرام ہونا نصِ کتاب وحدیث سے ثابت ہے۔

اللہ نے سود خوری کو اپنے اور رسول کے ساتھ جنگ فرمایا ہے اور ربا کے حرام ہونے کا حکم بالکل واضح بغیر کسی تخصیص کے وارد ہے۔ اب جس نے کہا ہے کہ ربا دار الحرب میں درست ہے اور دار الاسلام میں حرام، اس نے اللہ اور رسول کے صریح مخالف کہا، اب اگر کوئی عام آدمی یا عالم قائل سے اس قول کو قبول کرے گا اور مذہب کا فتویٰ سمجھ کر اس پر عامل ہوگا تو وہ اس مفتی کا عابد ٹھہرا اور اس آیتِ شریفہ کا مصداق ہوا اور اس پر شرک ثابت ہو گیا۔ یہ اس بات کی مثال ہے کہ عالم کے کہنے سے حرام کو حلال سمجھ لیا اور اس حلتِ حرام میں اس کی پیروی کی۔ اسی طرح حلال کے حرام کر دینے کی بہت مثالیں ہیں۔ یہ آیتِ شریف حرمتِ تقلید پر واضح نص ہے۔ سارے قرآن میں اہلِ کتاب اور مشرکین سے حکایاتِ تقلید دی ہیں۔ تمام کتاب اللہ اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تقلید کے واجب، بلکہ جائز ہونے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں ہے اور جس کا یہ دعویٰ ہے کہ کسی آیت یا سنتِ صحیحہ سے تقلید کا ثبوت نکلتا ہے وہ براہِ مہربانی اس آیت یا حدیث کو پیش کریں مگر اس میں غلو کرنے والوں کی تحریف اور جاہلوں کی تاویل اور مبطلین کا انتحال (دوسروں کا کلام اپنا ظاہر کرنا) نہ ہو۔ ہم پر اس کی شکر گزاری واجب ہو گی۔

باقی رہے احبار اور رہبان کے مقالات (نظریات)، سو ان کا اتباع کرنا اس حکم میں بعینہٖ آیتِ باب اور عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے مصداق ہے، جس کا جواب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جب ہم کسی مولوی یا درویش کے کہنے سے تقلید کو واجب جانیں گے تو ہم نے اس کو گویا رب ٹھہرایا، اب ہم اور اہلِ کتاب اس بارے میں برابر ہوئے، مغضوب علیہ اور ضال ٹھہرے۔ عیاذاً باللہ

رب بنانے کی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ احبار حِبر کی بکسر و فتح اول جمع ہے، یہ بہ معنی عالم ہے۔ رہبان راہب کی جمع ہے بمعنی درویش۔ احبار یہود میں ہوتے تھے اور رہبان نصاریٰ میں۔ آیتِ شریفہ کے معنی یہ ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے عالموں اور درویشوں کی امر و نہی میں اطاعت کی، یہ اطاعت اس کے برابر ہوئی کہ ان کو اپنا رب ٹھہرا لیا۔ امام ربیع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو العالیہ رحمہ اللہ سے کہا: ربوبیت کس طرح پر تھی؟ کہا: اکثر یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اللہ کی کتاب میں کوئی بات احبار اور رہبان کے قول کے خلاف پاتے تو اس جگہ ان کے اقوال لے لیتے اور کتاب اللہ کے حکم کو قبول نہ کرتے۔[1]

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٢١٢)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ ہمارے شیخ نے کہا کہ میں نے فقہا کے مقلدین کی ایک جماعت دیکھی، ان پر آیاتِ قرآنی بعض مسائل کے بارے میں پڑھیں، ان کے مذہب ان آیات کے خلاف تھے، انھوں نے ان آیتوں کو قبول نہ کیا اور نہ ہی ان کی طرف توجہ کی اور میری طرف تعجب سے دیکھنے لگے، یعنی ظاہری آیات پر، باوجود اس بات کے کہ ہمارے اسلاف سے ان کے خلاف روایت آئی ہے، کیونکر عمل ہوسکتا ہے؟ تو اگر کما حقہ غور کرے گا اور سوچے گا تو اس بیماری کو اکثر اہلِ دنیا کی رگوں میں جاری وساری پائے گا۔[1]

دوسرا قول اس ربوبیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ جاہل وحشویہ جب اپنے شیوخ اور اکابر کی تعظیم میں مبالغہ کرتے ہیں تو ان کی طبیعت حلول اور اتحاد کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور یہ شیخ جبکہ دنیا دار اور دین سے برکنار ہوتا ہے تو اپنے اتباع اور اصحاب کو حکم کرتا ہے کہ اس کو سجدہ کریں اور کہتا ہے کہ تم سب میرے بندے اور غلام ہو اور حلول اور اتحاد کی کچھ باتیں ان کی طرف القا کرتا ہے اور اگر کبھی کسی احمق کے ساتھ تنہا ہونے پر اتفاق ہو جاتا ہے تو اکثر ربوبیت کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ سو جب کہ یہ حال اس امت میں دیکھنے کو ملتا ہے تو پھر اس کا پہلی امتوں میں ثبوت کیا بعید ہے۔ غرض کہ اس ربوبیت سے دو باتوں کا احتمال ہے: ایک یہ کہ اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف ان کی اطاعت کی جائے اور دوسری یہ کہ ان سے کفر کی دیگر اقسام کو قبول کیا جائے۔ سو یہ حرکات اس کے بجائے ہیں کہ ان کو ارباب ٹھہرایا گیا ہے۔

پھر اللہ نے ذکر کیا کہ نصاریٰ نے مسیح بن مریم کو اپنا رب ٹھہرا لیا۔ فتح البیان میں اس جگہ ردِ تقلید پر ایک مدلل تقریر آیتِ باب کے حوالے سے بہت حسن و جمال کے ساتھ کی ہے۔[2] لوگ کہتے ہیں کہ اردو کی یہ تفسیر بہت خوب ہے، اگر اس میں ردِ تقلید کا جابجا ذکر نہ ہوتا۔

ردِّ تقلید:

میں کہتا ہوں کہ جو شخص کتاب اللہ کے معانی بیان کرنے کا ارادہ کرے اور وہ کتاب اللہ کے اتباع کا حکم دینے والی آیات جو انکارِ تقلید کو بیان کرتی ہیں کے تحت نصاً و دلالتاً ردِ تقلید کا ذکر کرنا چھوڑ دے تو وہ بلاشبہ خیانت اور اللہ کے حکم کی مخالفت کا مرتکب ہے، پھر اس کے لیے تفسیر ہی لکھنا کیا ضروری ہے۔ اللہ نے تو علما پر یہ بات واجب کی ہے کہ وہ حق کی تبلیغ کریں اور اللہ کا کوئی حکم لوگوں سے پوشیدہ نہ رکھیں، پھر انکارِ تقلید اور اتباعِ سنت کی ترغیب کی صراحت کرنا یا اس کی طرف اشارہ کرنا ترک کر دینا چہ معنی دارد؟ ؎

گویند رمز عشق میگوئید ونشوید   مشکل حکایتے ست کہ تقریر مے کنند

''عشق ومحبت کی باتیں اشاروں کنایوں میں چھپا کر بیان کرتے ہیں۔ کہی جاتی ہیں مگر سنی نہیں جاتیں، وہ بڑی پیچیدہ باتیں ہوتی ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں۔''

---

[1] تفسير الرازي (١٦/ ٣١) [2] فتح البيان (٥/ ٢٨٤ـ ٢٨٧)

خصوصاً جب احکام کو جان کے طمع اور لوگوں کی خوشی کے لیے چھپایا جاتا ہے تو ایسا شخص اہل کتاب کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ یہ بعینہٖ انہی لوگوں کا شیوہ تھا کہ وہ حق بات کی تحریف کرتے تھے اور اسے چھپاتے تھے، جس طرح کہ آیتِ رجم کو چھپا دیا تھا یا صفاتِ نبی آخر الزمان ﷺ کو بھی چھپا دیا تھا۔ اب علمائے دنیا دار اور فقہائے نامدار نے بھی یہی کام اختیار کیا، بلکہ بعض جاہلوں نے یہ جرأت کی ہے کہ تفسیرِ قرآن میں ایسے مواضع پر تقلید کو ثابت کرنے کے درپے ہیں، یہ درحقیقت قرآن کریم سے جھگڑنا اور رب کریم کا مقابلہ کرنا ہے۔ وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ مِنْهُ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ! اَللّٰهُمَّ هَادِيَ الضَّالِّ، وَمُرْشِدَ التَّائِهِ، وَمُوَضِّحَ السَّبِيْلِ، اِهْدِنَا إِلَى الْحَقِّ وَأَرْشِدْنَا إِلَى الصَّوَابِ، وَ أَوْضِحْ لَنَا مَنْهَجَ الْهِدَايَةِ.

اس کے بعد اللہ نے فرمایا کہ ان کو پرانی کتابوں میں جو ان کے انبیا پر اتری تھیں، یہی حکم تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، یعنی یہ حکم نہیں تھا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور مشائخ کو ارباب ٹھہرائیں کہ یہ عین شرک ہے۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ سورت براءت میں آیتِ باب پڑھ رہے تھے، فرمایا: «اَمَا اِنَّهُمْ لَمْ يَكُوْنُوْا يَعْبُدُوْنَهُمْ وَلٰكِنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا أَحَلُّوْا لَهُمْ شَيْئًا اِسْتَحَلُّوْا وَإِذَا حَرَّمُوْا عَلَيْهِمْ شَيْئًا حَرَّمُوْهُ»[1] (أخرجه ابن سعيد وعبد بن حميد والترمذي وحسنه وابن المنذر وابن أبي حاتم وأبو الشيخ وابن مردويه والبيهقي في سننه)

یہ حدیث کئی طریق سے ثابت ہے اور آیتِ شریفہ کی تفسیر مرفوع ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی اور شخص کی تفسیر پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، جب اللہ کی نہر آ جائے تو معقل کی نہر سے کیا کام! امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے لوگوں سے نصیحت چاہی، اللہ کی کتب کو پسِ پشت ڈال دیا، اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ (آیتِ باب) یعنی حرام وہی شے ہے جس کو اللہ حرام کر دے اور حلال وہی شے ہے جس کو وہ حلال فرما دے، اسی کی شرع کا اتباع کرنا چاہیے، اسی کا حکم جاری ہے۔ اللہ شریکوں، نظیروں، مددگاروں اور اضداد اور اولاد سے پاک و منزہ ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.[2]

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٥) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٨٤) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ١١٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٩٣)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٥٩)

رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ انکار کرتا ہے، مگر یہ کہ اپنا نور پورا کرے، خواہ کافروں کو برا ہی لگے (32) وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، خواہ مشرکین کو برا ہی لگے (33)

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

یعنی جیسے کوئی پھونک سے چراغ بجھائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی جھوٹی باتوں سے دینِ اسلام کو نہ پھیلنے دیں، یہ دین سب سے اوپر ہے، عقل کے نزدیک اور اللہ کے نزدیک، یعنی جو اس سے قربت ملی وہ اور سے نہیں۔ اللہ کے نور سے مراد وہ ہدایت اور دینِ حق ہے جو اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو دے کر بھیجا، یہ صرف اپنے جھگڑے اور افترا پردازی سے اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں، ان کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی سورج چاند کی روشنی پھونک مار کر بجھانا چاہے، بھلا وہ کہیں بجھ سکتی ہے؟! اسی طرح جو نور نبیِ اکرم ﷺ اللہ کے پاس سے لائے ہیں وہ پورے کا پورا ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اسی لیے اللہ نے ان کے قصد اور ارادے کے مقابلے میں یہ فرمایا کہ اللہ اس نور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا، کافر برا مانتے ہیں تو مانتے رہیں۔ کفر کے اصل معنی کسی شے کو چھپانا ہے، اس لیے رات کو کافر کہتے ہیں کہ وہ چیزوں کو چھپا دیتی ہے اور زراع کو بھی کافر بولتے ہیں کیونکہ وہ دانے کو زمین میں چھپاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ﴾ [الحدید: ۲۰] ”اس سے (پیدا شدہ) نباتات کسانوں کو خوش کرتی ہیں۔“

غلبۂ اسلام:

ہدیٰ سے مراد سچی خبریں، صحیح ایمان اور نفع دینے والا علم ہے اور دینِ حق سے مراد اعمالِ صحیحہ ہیں جو دنیا اور آخرت میں نفع دیتے ہیں، کل دین سے مراد جہان بھر کے سارے دین ہیں، جس طرح کہ صحیح میں نبیِ اکرم ﷺ سے آیا ہے کہ «إِنَّ اللّٰهَ زَوَى لِيَ الْأَرْضَ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَسَيَبْلُغُ مُلْكُ أُمَّتِي مَا زُوِيَ لِي مِنْهَا»[1] قبیصہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے: «سَتُفْتَحُ لَكُمْ مَشَارِقُ الْأَرْضِ وَمَغَارِبُهَا وَإِنَّ عُمَّالَهَا فِي النَّارِ إِلَّا مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ وَأَدَّى الْأَمَانَةَ»[2] (رواہ أحمد)

تمیم داری رضی اللہ عنہ مسموعاً مرفوعاً کہتے ہیں: «لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْأَمْرُ مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ، وَلَا يَتْرُكُ بَيْتَ

---

(1) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۸۹)

(2) مسند أحمد (۵/ ۳۶۶) اس کی سند میں ”قبیصہ اور شفیق“ مجہول راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۳/ ۲۳۷)

مُدُرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ هَذَا الدِّينَ يُعِزُّ عَزِيزاً وَيُذِلُّ ذَلِيلًا عِزًّا يُعِزُّ اللّٰهُ بِهِ الْإِسْلَامَ وَذِلًّا يُذِلُّ اللّٰهُ بِهِ الْكُفْرَ » پھر تمیم داری رضی اللہ عنہ کہتے تھے: "وَقَدْ عَرَفْتُ ذَلِكَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، لَقَدْ أَصَابَ مَنْ أَسْلَمَ مِنْهُمُ الْخَيْرَ وَالشَّرَفَ وَالْعِزَّ وَلَقَدْ أَصَابَ مَنْ كَانَ كَافِراً مِّنْهُمُ الذُّلَّ وَالصَّغَارَ وَالْجِزْيَةَ"[1] (رواہ أحمد) یعنی یہ ارشاد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا میں نے اپنے ہی گھر میں دیکھ لیا کہ جو کوئی میرے گھر والوں میں سے اسلام لایا، اس نے بہتری اور بزرگی پائی اور جو کوئی ان میں کافر رہا وہ خوار وزار جزیہ گزار ہوا۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: « لَا يَبْقَىٰ عَلَىٰ وَجْهِ الْأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا دَخَلَتْهُ كَلِمَةُ الْإِسْلَامِ يُعِزُّ عَزِيزاً وَيُذِلُّ ذَلِيلًا إِمَّا لِغَيْرِهِمْ فَيَجْعَلُهُمْ مِّنْ أَهْلِهَا وَإِمَّا يُذِلُّهُمْ فَيَدِينُونَ لَهَا »[2] (رواہ أحمد)

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، مجھ سے فرمایا: اے عدی! اسلام لا تو سلامت رہے گا، میں نے کہا: میں اہلِ دین میں سے ہوں، فرمایا: میں تیرے دین کو زیادہ جانتا ہوں۔ میں نے کہا: آپ میرے دین کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں؟ فرمایا: ہاں، کیا تو رکوسیہ میں سے نہیں ہے اور تو اپنی قوم سے چہارم (چوتھا حصہ) لے کر کھاتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، فرمایا: تیرے دین میں یہ کب حلال ہے؟ میں نے خاکساری کا اظہار کیا، فرمایا: جس سبب سے تو اسلام نہیں لاتا وہ بھی مجھے معلوم ہے، تو کہتا ہے کہ اس پیغمبر کے تابع وہ لوگ ہیں جو ضعیف ہیں، کچھ قوت نہیں رکھتے، عرب نے ان کو نکال کر پھینک دیا ہے۔ بھلا تو حیرہ کو نہیں پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: میں نے اس کو نہیں دیکھا، مگر سنتا ہوں، فرمایا: قسم ہے! اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اللہ اس کام کو پورا کرے گا یہاں تک کہ ایک ظعینہ (مسافرہ عورت) حیرہ سے نکلے گی اور اس گھر کا طواف کرے گی، بغیر کسی شخص کی پناہ کے اور البتہ مفتوح ہوں گے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے۔ میں نے کہا: کسریٰ بن ہرمز کے؟ فرمایا: ہاں کسریٰ بن ہرمز کے اور مال خرچ کیا جائے گا، یہاں تک کہ کوئی اس کو قبول نہ کرے گا۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ ظعینہ ہے کہ حیرہ سے نکل کر بغیر کسی کی پناہ کے بیت اللہ کا طواف کرتی ہے اور میں ان لوگوں میں تھا جنھوں نے کسریٰ کے خزانوں کو فتح کیا اور قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اب تیسری بات بھی ہوگی، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے۔[3] (رواہ أحمد)

میں کہتا ہوں کہ اس تیسری بات کا وقت زمانہ مہدیِ موعود منتظر ہوگا یا زمانہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ میں ہو چکا ہے کہ کثرتِ فتوحات و اموال سے مال لینے والے ہاتھ نہ آتے تھے یا زمانہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ میں بھی اسی کے لگ بھگ تھا۔ واللہ أعلم.

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٣) السلسلة الصحيحة رقم الحديث (٣)

[2] مسند أحمد (٦/ ٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٦/ ٨)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٥٧) مستدرك الحاكم (٤/ ٥٦٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مسموع اور مرفوع الفاظ یہ ہیں: «لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى تُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزَّى، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُ لَأُظُنُّ حِيْنَ أَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ الآية أَنَّ ذٰلِكَ تَامٌّ، قَالَ: إِنَّهُ سَيَكُوْنُ مِنْ ذٰلِكَ مَا شَآءَ اللّٰهُ عَزَّوَ جَلَّ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ رِيْحاً طَيِّبَةً فَيَتَوَفّٰى كُلُّ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةِ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيْمَانٍ فَيَبْقٰى مَنْ لَا خَيْرَ فِيْهِ، فَيَرْجِعُوْنَ إِلٰى دِيْنِ آبَاءِهِمْ»[1] (رواہ مسلم)

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جب یہ دین حق و ہدایت مطلق اپنی حدِ کمال کو پہنچ جائے گا تو پھر آخر زمانہ میں کفر کا غلبہ یہاں تک ہو گا کہ وہی سابق بت پرستی لات وعزیٰ کی ہونے لگے گی اور ایک خوشگوار ہوا چلنے سے ہر ایمان دار مر جائے گا، وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جو اپنے باپ دادا کی چال پر چلیں گے، سلف کے مقلد ہوں گے نہ کہ متبع ہدیٰ۔ لات وعزیٰ کی عبادت سے مراد شرک و کفر میں گرفتاری ہے تو یہ حالت اب موجود ہو چلی ہے، کیونکہ شرکِ تقلید و شرکِ پیر پرستی نے ایک جہان کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے اور پھر بھی وہ اپنے آپ کو مسلمان جانتے ہیں اور مومن کہتے ہیں اور جن کے جی میں جو کچھ توحید و اتباع تھا وہ دنیا سے چل بسے، إِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ اور اگر اس سے مراد لات وعزیٰ کی بعینہا عبادت ہے تو یہ واقعہ قیامت کے قریب زمانۂ ظہورِ مہدی و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہونے والا ہے۔ واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیتِ باب میں ان کی ایک دوسری قسم کی گمراہی اور حق سے دوری ذکر فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ یہ قصد کرتے ہیں کہ اپنی جھوٹی اور غلط باتوں سے حق کو مٹائیں، حالانکہ وہ صرف کلماتِ ساذجہ اور مجادلاتِ زائفہ ہیں۔ یہ ان کے دینِ حق اور نبوتِ نبیِ صدق کو مٹانے کے لیے ان کے عزم کی تمثیل ہے، اس شخص کے حال کے ساتھ جو یہ چاہتا ہے کہ ایک نورِ عظیم پر جس سے دنیا منور ہوگئی ہے اور سارے جہان کا اندھیرا دور ہو گیا، پھونک مارے، تاکہ اس کی وہ چمک دمک اور اجالا جاتا رہے، سو یہ بات ہرگز ہونے والی نہیں ہے، اس روشنی سے مراد اللہ کی شریعت اور ہدایت کی براہین و دلیلیں ہیں۔ دلائل کا نام نور رکھا، اس لیے کہ یہ سیدھی راہ دکھاتے ہیں، جس طرح چراغ سے رستہ دیکھ کر چلتے ہیں، یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سچائی پر دلائلِ حجتِ صحیحہ ہیں اور کئی ایک امور ہیں جیسے واضح معجزات اور خرقِ عادات اور قرآن عظیم یہ وہ معجزہ ہے کہ ابد تک باقی رہے گا۔ تیسرے دینِ اسلام کہ جس میں اللہ رب العزت کی تعظیم اور اللہ کے امر و نہی کی اتباع اور اللہ کے سوا ہر معبود سے بیزاری ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٠٧)

سو یہ سب امور جو صاف اور روشن ہیں، یہ واضح دلائل ہیں نبیِ اکرم ﷺ کی رسالت کی سچائی پر، جو کوئی چاہے کہ اپنے جھوٹ سے ان کو دور کر دے وہ خائب و خاسر ہوگا، اس کی کوشش بیکار اس کا عمل باطل ہے، کیونکہ اللہ کو تو اس نور کا پورا کرنا منظور ہے، گو کافر اس سے ناخوش ہوں، ان کی ناخوشی سے اس امر کا مکمل ہونا رُک نہیں سکتا، اللہ کو ان کی کراہت کی کچھ پروا نہیں ہے، وہ خوش ہوں تو کیا اور ناخوش ہوں تو کیا، اسی لیے اس کے بعد نبیِ اکرم ﷺ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجنے کا ذکر فرمایا اور تمام دینوں پر اس کے غالب ہونے کا بیان فرمایا۔ وہ دین یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اسی دین کے مطابق کی جائے، اب کوئی دین اسلام کے خلاف نہیں ہے، لیکن بعض جگہوں پر مسلمان اس پر قاہر و ظاہر ہو گئے، گو سارے مواضع پر غالب نہ ہوں۔ چنانچہ یہود پر قاہر کر ان کو بلادِ عرب سے نکال دیا، بلادِ شام پر ظاہر ہو کر نصاریٰ پر غلبہ پایا۔ ناحیۂ روم سے لے کر مغرب مجوس تک ملک چھین لیا۔ تُرک و ہند کے بت پرستوں کو پست کر دیا، یہی سارے ادیان کا حال ہوا، دنیا میں کوئی ملک ایسا کم ہوگا بلکہ نہ ہوگا کہ جہاں اسلام نہیں پہنچا، تھوڑا یا بہت۔ پہلے ملک امریکہ کی خبریں لوگوں کو نہ تھیں، اب جو چھے ساتھ سو برس سنہ ہجری کے بعد اس ملک پر سلاطین کا قبضہ ہوا تو وہاں بھی اسلام کے آثار پائے گئے، پرانی مسجدیں نظر آئیں، وعلی هذا القياس۔ غرض کہ دینِ حق کی یہ روشنی ساری روئے زمین کے پردے پر پہنچ گئی، کوئی مورخ اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ غیب کی خبر جو اللہ پاک نے اس آیت میں اور نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی حدیثوں میں دی تھی، وہ جوں کی توں ثابت اور واقع ہوئی۔ وللہ الحمد.

اس پر بھی اگر اسلام نہ لائیں تو بجز بدقسمتی اور ابدی بدنصیبی کے اور کیا ہے اور کسی نے یوں کہا ہے کہ اس خبر کا وقوع زمانۂ نزولِ عیسیٰ وظہورِ مہدی علیہما السلام میں ہوگا، جبکہ سارے دین والے دینِ اسلام میں داخل ہو جائیں گے، چنانچہ احادیث اس پر دلیل ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «تُهْلَكُ فِيْ زَمَانِهِ الْمِلَلُ كُلُّهَا إِلَّا الْإِسْلَامُ»[1]

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کے دین کو تمام دینوں پر غالب کر دیا، اس طرح پر کہ ہر سننے والے پر ظاہر کر دیا کہ حق یہی ہے اور جو دین کے برخلاف ہے وہ باطل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے امیین کو مقہور کیا، یہاں تک کہ وہ طوعاً و کرہاً دینِ اسلام میں داخل ہو گئے اور بت پرستوں کو یہاں تک قتل و قید کیا کہ بعض نے اسلام قبول کیا اور بعض نے جزیہ دینا قبول کیا اور ان پر اسلام کا حکم جاری ہوا۔ یہ ہے اس دینِ حق کا سارے ادیان پر ظہور۔

بعض نے کہا ہے کہ مراد اس کا کل ادیانِ جزیرۂ عرب پر ظہور ہے اور یہ بات بحمدہ تعالیٰ بخوبی حاصل ہو گئی کہ وہاں ایک کافر تک بھی باقی نہ رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو ساری شریعتوں سے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٨٩)

واقف اور مطلع کر دیا تھا، یہاں تک کہ کوئی چیز آپ پر مخفی نہ رہی۔ یا مراد اس کا حجت اور بیان سے ظاہر (غالب) ہونا ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ اس کا ظہور حجت اور برہان سے تو پہلے ہی سے تھا، یہ وعدہ تو اس کے وقوع کا ہے، بہر حال اللہ نے اس دین کو قاہر اور غالب فرمایا، اب اگر مشرک اس ظہور سے ناخوش ہیں تو ہوتے رہیں۔

پہلے ذکر کفر کا کیا تھا، اب لفظ شرک فرمایا، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ پہلے انھوں نے رسول کے ساتھ کفر کیا تھا، اب اس کفر کے ساتھ یہ شرک باللہ مل گیا، "وَهَذَا آخِرُ الْآيَاتِ الَّتِي أَمَرَ عَلِيًّا بِالتَّأْذِيْنِ بِهَا فِيْ مَوْسِمِ الْحَجِّ" "یہاں تک آپ ﷺ نے حضرت علی کو حج کے ایام میں اعلان کرنے کا حکم دیا تھا۔" پھر جب اللہ پاک نے اتباع احبار و رہبان سے، جن کو انھوں نے اپنا رب ٹھہرایا تھا، فراغت پائی تو اب ان کے متبوعین اور ان کے اپنے متبعین کو اغوا کرنے کا ذکر کیا اور فرمایا:[1]

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

اے ایمان والو! بے شک اکثر علما اور درویش لوگوں کا مال ناحق ہی کھاتے ہیں اور وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، تو آپ انھیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں (34) جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کے ماتھوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا:) یہ وہ (مال) ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا، لہٰذا (اب اس کا مزہ) چکھو جو تم جمع کرتے رہے تھے (35)

علمائے سُو اور گمراہ عبادت گزاروں سے خبردار کرنا:

اللہ کے راستے میں خرچ کرنا یہ ہے کہ زکات اور قرض اور حق دار کا حق دیتا رہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احبار یہود میں ہوتے ہیں اور رہبان نصاریٰ میں،[2] کیونکہ احبار علمائے یہود کو کہتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[1] فتح البيان (٥/ ٢٨٧۔ ٢٩٠)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ٢١٦)

﴿ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ﴾ [المائدة: ٦٣] ''رب والے اور ان کے علما انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟'' اور رہبان عبادِ نصاریٰ کو کہتے ہیں اور ان کے علما قسیسین کہلاتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا ﴾ [المائدة: ٨٢] ''اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک ان میں کچھ عالم ہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ برے علما اور گمراہ عابدین کو ڈرایا جائے، جس طرح سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''مَنْ فَسَدَ مِنْ عُلَمَائِنَا كَانَ فِيْهِ شِبْهٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ، وَمَنْ فَسَدَ مِنْ عُبَّادِنَا كَانَ فِيْهِ شِبْهٌ مِّنَ النَّصَارٰى''[1] ''ہمارے جن علمائے اسلام میں فساد آیا، ان میں یہود کی کچھ خصلتیں ہیں اور ہمارے جن عابدوں میں فساد آیا، ان میں نصاریٰ کی کچھ خصلتیں ہیں۔'' اور صحیح حدیث میں آیا ہے: « لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذْوَ الْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ، قَالُوْا: اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى قَالَ: فَمَنْ؟ »[2] اور ایک روایت میں فرمایا ہے: « فَارِسَ وَالرُّوْمَ وَمَنِ النَّاسِ إِلَّا هٰؤُلَاءِ » یعنی اگر یہ لوگ مراد نہیں ہیں تو پھر کون لوگ مراد ہیں؟[3]

حاصل اس کا یہ ہے کہ اقوال اور احوال میں تشبہ سے بچا جائے، اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا کہ وہ لوگوں کے مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ دنیا، دین، منصب اور ریاست سے حاصل کرتے ہیں، جس طرح کہ علمائے یہود کو اہلِ جاہلیت پر شرف تھا اور وہ ان کا خرچ اٹھاتے تھے اور تحفے تحائف بھیجتے تھے اور ان کے پاس ٹیکس کا مال آتا تھا۔ جب اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا تو وہ بدستور اپنی گمراہی اور کفر اور عناد پر اسی طمع سے جمے رہے کہ ان کی وہ ریاستیں باقی رہیں گی، مگر اللہ نے نورِ نبوت سے ان کے شرف کو بجھا دیا اور ان کی وہ ریاستیں ان سے چھین لی گئیں اور اس کے عوض انھیں ذلت وخواری ملی۔ وہ اللہ کا غصہ لے کر پھرے، پھر باوجود باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کے انھیں اتباعِ حق سے روکتے، حق کو باطل سے ملاتے اور جو جاہل ان کے تابع تھے، ان پر یہ ظاہر کرتے کہ ہم تم کو خیر کی طرف بلاتے ہیں، حالانکہ حقیقت ان کے زعم کے مطابق نہ تھی وہ تو آگ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت کے دن ان کی کوئی مدد نہ کی جائے گی۔

خزانے جمع کرنے والوں اور زکات نہ دینے والوں کا انجام:

پھر اللہ نے کنز کا ذکر کیا۔ یہ لوگوں کے سرداروں کی تیسری قسم ہے، کیونکہ لوگ عالموں، عابدوں کے محتاج ہوتے ہیں اور مال داروں کے بھی محتاج ہوتے ہیں، سو جب ان کے حالات بگڑے تو لوگوں کے احوال بھی فاسد ہو

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٦٠)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٦٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٩) مسند أحمد (٤/ ١٢٥)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٨٨٨)

گئے۔ جس طرح کہ ابن مبارک رحمہ اللہ نے کہا ہے:

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ وَأَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا [1]

''دین کے بگاڑ کے ذمے دار بادشاہ، علمائے سُوء اور جاہل صوفی ہیں۔''

رہا کنز سو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ وہ مال ہے جس کی زکات نہ دی جائے اور جس کی زکات دے دے وہ کنز نہیں ہے، اگرچہ سات زمینوں کے نیچے کیوں نہ ہو اور جو مال کہ زمین کے اوپر ہے مگر اس کی زکات نہیں دی جاتی، وہ کنز ہے۔[2] یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس، جابر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔[3]

یعنی جس مال کی زکات دے دی گئی ہے وہ کنز نہیں، گو زمین میں مدفون ہو اور جس کی زکات نہیں دی گئی وہ کنز ہے، اس سے مال والے کو داغ دیں گے، اگرچہ وہ مال روئے زمین پر ہو۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ یہ آیت زکات کے فرض ہونے سے پہلے اتری ہے، جب زکات نازل ہوئی تو اللہ نے اس کو مال کی طہارت (پاکیزگی) ٹھہرایا۔[4] اسی طرح عمر بن عبدالعزیز اور عراک بن مالک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو آیت: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [التوبة: ۱۰۳] ''(اے نبی!) ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے (تاکہ) آپ اس کے ذریعے سے انھیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لیے دعا کریں، بے شک آپ کی دعا ان کے لیے سکون (کا باعث) ہے، اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' نے منسوخ کر دیا۔[5] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تلواروں کا زیور من جملہ کنز کے ہے۔ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ چار ہزار اور جو اس مقدار سے کم ہو وہ نفقہ ہے اور جو مال اس سے زیادہ ہے وہ کنز ہے۔[6] (وهذا غريب)

زیادہ مال جمع کرنے کی مذمت اور بہتر مال:

مال و دولت کم رکھنے کی تعریف میں اور زیادہ مال جمع کرنے کی مذمت میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تَبًّا لِلذَّهَبِ تَبًّا لِلْفِضَّةِ'' ''ہلاکت ہے سونے کے لیے، ہلاکت ہے چاندی کے لیے۔'' تین بار اسی طرح فرمایا۔ اصحاب پر یہ بات شاق گزری۔ کہا: پھر ہم کون سا مال جمع کریں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھہرو میں تمھارے لیے اس بات کو معلوم کرتا ہوں، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یہ امر آپ کے اصحاب پر سخت گزرا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم کون سا مال لیں، فرمایا: ذکر کرنے

[1] تفسير القرطبي (٨/ ١٢٠) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٢١٧) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٤/ ٢٢٥) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٤١١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٩) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٨٩) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٨٩۔ ١٧٩٩)

والی زبان، شکر کرنے والا دل اور ایسی بیوی جو دین پر مدد کرے۔[1] (رواه عبد الرزاق) اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی طریق ابن ابی الہذیل رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تیسری روایت ان الفاظ سے ہے: «قَلْباً شَاكِراً وَلِسَاناً ذَاكِراً وَزَوْجَةً تُعِيْنُ أَحَدَكُمْ عَلىٰ أَمْرِ الْآخِرَةِ»[3] (رواه الترمذي وحسنه وابن ماجة) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں پر گراں گزری، کہا: ہم میں کوئی اپنی اولاد کے لیے اب مال نہیں چھوڑ سکتا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تم سے اس مشکل کو آسان کرتا ہوں، وہ چلے، ان کے ساتھ ثوبان رضی اللہ عنہ ہوئے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا: اے نبی اللہ! آپ کے اصحاب پر یہ آیت سخت گزری، فرمایا کہ اللہ نے صرف اس لیے زکات فرض کی ہے کہ اس کے سبب سے تمھارے باقی مال پاکیزہ ہو جائیں اور تمھارے باقی مال میں وراثت کو فرض کیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَلَا أُخْبِرُكَ بِخَيْرِ مَا يَكْنِزُ الْمَرْءُ الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ الَّتِي إِذَا نَظَرَ إِلَيْهَا سَرَّتْهُ وَإِذَا أَمَرَهَا أَطَاعَتْهُ وَإِذَا غَابَ عَنْهَا حَفِظَتْهُ»[4] (رواه ابن أبي حاتم وأبو داود والحاكم وابن مردويه وقال الحاكم: صحيح على شرطهما ولم يخرجاه)

سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ جب لوگ مال گاڑیں تو تم یہ کلمات جمع کرو: "اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الثَّبَاتَ وَالْأَمْرَ، وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ، وَأَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ حُسْنَ عِبَادَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ قَلْباً سَلِيْماً، وَأَسْأَلُكَ لِسَاناً صَادِقاً، وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ، إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ"[5] (رواه أحمد) پھر جو لوگ مال گاڑ رکھتے ہیں، ان سے بطور سرزنش و حجت کہا جائے گا: ﴿ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) یہ ایک قسم کا ان سے مذاق بھی ہو گا، جیسے اللہ تعالیٰ کے قول سے ظاہر ہے: ﴿ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾ [الدخان: ٤٩] أَيْ هٰذَا بِذَاكَ، وَهٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ لِأَنْفُسِكُمْ.

جیسا عمل ویسی سزا:

اسی جگہ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ جو کوئی شخص کسی شے کو چاہتا ہے اور اس کو اللہ کی اطاعت پر مقدم رکھتا ہے

---

1. تفسير الصنعاني (٢/ ٢٧٣) تفسير الطبري (١٤/ ٢٢٠۔ ٢٢٢) میں ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بجائے سالم بن ابی الجعد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ یہ روایت مرسل ہے۔
2. مسند أحمد (٥/ ٣٦٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٠٧)
3. مسند أحمد (٥/ ٢٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٧٦)
4. تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٨٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٦٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٦٣) اس کی سند میں ''عثمان بن عمیر'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣١٩)
5. مسند أحمد (٤/ ١٢٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٢٨)

وہ اسی شے کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ اسی طرح مال دار لوگ جنھوں نے اللہ کی رضا کے مقابلے میں مال کو اختیار کیا ہے، انھیں مال کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ جس طرح ابولہب ۔لعنہ اللہ۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عداوت کی سعی کرتا رہتا تھا اور اس کی بیوی اسے اس کام میں مدد دیتی تھی۔ وہ قیامت کے دن بھی اس کے عذاب پر مددگار ہو گی، اس کے گلے میں مونجھ کی رسی پڑی ہوگی، وہ لکڑیاں جمع کر کے آگ میں ڈالے گی، اسی آگ میں ابولہب کو عذاب کیا جائے گا۔ یہ عذاب دینے کے لیے سب سے موثر طریقہ ہے۔ اسی طرح یہ مال جبکہ دنیا میں ان کے لیے سب سے زیادہ پیاری چیز تھے، جو انھیں اکٹھا کرتے تھے تو قیامت میں بھی یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہوں گے اور آگ میں تپا کر ان سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پشتیں گرم کی جائیں گی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! وہ بندہ جس نے مال گاڑا ہے اس طرح پر کہ کوئی دینار دینار کو اور کوئی درہم درہم کو چھوتا ہو تو اس کو اس طرح عذاب کیا جائے گا کہ اس کی کھال وسیع کی جائے گی اور ہر ایک دینار اور درہم تپا کر الگ الگ اس پر رکھ کر اسے داغا جائے گا۔[1] اس کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے، لیکن اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے۔[2] طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ کنز قیامت کے دن ایک سانپ ہو جائے گا اور اپنے صاحب کے پیچھے لگے گا، وہ اس سے بھاگے گا، یہ کہے گا کہ میں تیرا کنز ہوں، جو کچھ اس سے پائے گا، اس کو پکڑ لے گا۔[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنے مال کی زکات نہیں دیتا، مگر اس کا مال قیامت کے دن ایک آگ کے تختے کی شکل میں بنایا جائے گا اور اس سے اس کا ماتھا اور کروٹ اور پشت مسلسل داغا جائے گا اور اس دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال کا ہوگا، یہاں تک کہ بندوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا، پھر وہ اپنا راستہ دیکھے گا، خواہ جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔[4] الحدیث.

مال کے حوالے سے سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا موقف:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں زید بن وہب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ زید نے کہا: میرا گزر ابوذر رضی اللہ عنہ پر ہوا، جب وہ ربذہ کے مقام پر تھے، میں نے کہا: تم اس زمین پر کیوں کر اترے؟ کہا: ہم شام میں تھے، ہم نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ... الخ﴾ (آیتِ باب) معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا یہ آیت ہمارے حق میں نہیں ہے، یہ صرف اہلِ کتاب کے حق میں ہے۔ میں نے کہا: "إِنَّهَا لَفِيْنَا وَفِيْهِمْ"[5] یعنی یہ آیت عام

---

[1] المعجم الکبیر (۹/ ۱۵۰) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٤٦٢) [3] تفسیر الصنعاني (۲/ ۲۷٤)
[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۸۷) [5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٣٨٣)

ہے سب کے حق میں ہے، اہلِ کتاب کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے سچ کہا ہے، اس لیے کہ عبرت عمومِ لفظ کے واسطے ہوتی ہے۔ (ورواه ابن جرير أيضاً)

اس میں اتنا زیادہ ہے کہ پھر میرے اور معاویہ کے درمیان بات اونچی آواز میں ہوئی، معاویہ رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو میری شکایت لکھی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے مجھ کو لکھا کہ تم میرے پاس آ جاؤ، میں ان کے پاس آیا۔ جب میں مدینے میں پہنچا، لوگ مجھ پر چڑھے آتے تھے، گویا اس دن سے پہلے انھوں نے کبھی مجھ کو نہ دیکھا تھا، میں نے اس بات کی شکایت عثمان رضی اللہ عنہ سے کی۔ انھوں نے کہا: میرے قریب آؤ، میں نے کہا: "وَاللّٰهِ لَنْ أَدَعَ مَا كُنْتَ أَقُوْلُ"[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ اہل وعیال کے نفقہ سے زیادہ مال ذخیرہ کرنا حرام ہے، وہ اسی کا فتویٰ دیتے تھے اور لوگوں کو اس پر ابھارتے تھے اور حکم دیتے تھے اور اس کے خلاف کرنے میں سختی کرتے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو منع کیا، انھوں نے نہ مانا، تب اس ڈر سے کہ کہیں لوگوں کو ضرر نہ پہنچے، ان کی شکایت امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھی اور کہا کہ آپ ان کو یہاں سے بلا لیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو مدینے بلا بھیجا اور ربذہ میں اکیلا اتار دیا، ان کا انتقال اسی جگہ ہوا، یعنی خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں۔

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ابوذر رضی اللہ عنہ کا امتحان لیا کہ دیکھیے ان کا عمل ان کے قول کے موافق ہے یا نہیں، ان کو ایک ہزار دینار بھیجے، انھوں نے اسی دن سب بانٹ دیے، پھر اس شخص کو جو ان کے پاس دینار لے کر گیا، پھر بھیجا، اس نے جا کر کہا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھ کو تمھارے علاوہ کسی اور کے پاس بھیجا تھا میں غلطی سے تمھیں دے گیا، وہ دینار واپس کر دو، کہا: افسوس ہے تجھ کو وہ تو خرچ ہو گئے، جب میرا مال آئے گا تو میں تجھ کو اس میں سے اتنا ہی دے دوں گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ یہ آیت عام ہے۔[2] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اہلِ قبلہ کے حق میں ہے۔[3]

احنف بن قیس کہتے ہیں کہ میں مدینے گیا، میں اشرافِ قریش کے ایک حلقے میں بیٹھا تھا کہ ایک مرد درشت جامہ، درشت بدن اور درشت چہرہ آیا اور حلقے پر کھڑے ہو کر کہا: "بَشِّرِ الْكَانِزِيْنَ بَرَضْفٍ يُّحْمٰى فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَيُوْضَعُ عَلٰى حَلَمَةِ ثَدْيِ أَحَدِهِمْ حَتّٰى يَخْرُجَ مِنْ نُغْضِ كَتِفِهٖ وَحَتّٰى يَخْرُجَ مِنْ حَلَمَةِ ثَدْيِهٖ يَتَزَلْزَلُ"، قوم نے اپنے سر نیچے کر لیے، میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کو کچھ جواب دیا ہو، جب وہ مرد پشت پھیر کر چلا، میں اس کے پیچھے لگا، یہاں تک کہ وہ ایک ستون کے پاس جا کر بیٹھ گیا، میں نے کہا: تو نے ان لوگوں کو دیکھا کہ ان کو تیری بات بری لگی، کہا: "إِنَّ هٰٓؤُلَاءِ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا"[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٢٢٧) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٦٣) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٨٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٢)

صحیح بخاری میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «مَا يَسُرُّنِي أَنَّ عِنْدِي مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً يَمُرُّ عَلَيَّ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ وَعِنْدِي مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا دِينَارًا أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ»[1] شاید یہی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ بات کہنے کا باعث ہوئی ہوگی۔ واللہ أعلم. سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: «إِنَّ خَلِيلِي عَهِدَ إِلَيَّ أَنْ أَيُّمَا ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ أُوكِيَ عَلَيْهِ فَهُوَ جَمْرٌ عَلَى صَاحِبِهِ حَتَّى يُفْرِغَهُ فِي سَبِيلِ اللهِ عَزَّوَ جَلَّ»[2] (رواه أحمد) ابوسعید رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: "إِلْقَ اللهَ فَقِيراً وَلَا تَلْقَهُ غَنِيًّا قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! كَيْفَ لِي بِذَلِكَ؟ قَالَ مَا سُئِلْتَ فَلَا تَمْنَعْ وَمَا رُزِقْتَ فَلَا تَخْبَأْ. قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! كَيْفَ لِي بِذَلِكَ؟ قَالَ هُوَ ذَاكَ وَإِلَّا فَالنَّارُ"[3] (رواه ابن عساكر وإسناده ضعيف)

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرد اہل صفہ میں سے مرگیا، وہ دو دینار یا دو درہم چھوڑ کر مرا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ دو داغ ہیں، نماز پڑھو تم اپنے صاحب پر۔[4] (رواه أحمد) ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہل صفہ میں سے ایک مرد مرگیا، اس کی ازار میں ایک دینار پایا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک داغ ہے، ایک دوسرا شخص مرگیا، اس کی کمر میں دو دینار پائے، فرمایا دو داغ ہیں۔[5] (رواه أحمد)

سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ نے کہا ہے کہ نہیں ہے کوئی مرد کہ مرے اور اس کے پاس سرخ یا سفید ہو، یعنی سونا چاندی، لیکن کرے گا اللہ ہر قیراط کے بدلے ایک تختہ آگ کا جس سے اُس کو پاؤں سے لے کر ٹھوڑی تک داغ دیا جائے گا۔[6] (رواه ابن أبي حاتم) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «لَا يُوضَعُ الدِّينَارُ عَلَى الدِّينَارِ، وَلَا الدِّرْهَمُ عَلَى الدِّرْهَمِ، وَلَكِنْ يُوَسَّعُ جِلْدُهُ فَيُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ، وَجُنُوبُهُمْ، وَظُهُورُهُمْ، هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ، فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ»[7] (رواه أبو يعلى) اس کی سند میں سیف بن محمد ثوری کذاب متروک ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اس جگہ یوں ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بہت سے عالم اور درویش لوگوں کا مال ناحق

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٧٩) [2] مسند أحمد (٥/ ١٧٥) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢٢٦)

[3] تاريخ دمشق (٦٦/ ٥٠۔ ٥١) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٧٤٢)

[4] مسند أحمد (١/ ١٠١) اس کی سند میں "عتیبہ اور برید" مجہول راوی ہیں۔

[5] مسند أحمد (٥/ ٢٥٣) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢٢٧) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٩٠)

[7] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٦٤) امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کو "الدر المنثور" میں ذکر کر کے اس کی نسبت ابویعلیٰ اور ابن مردویہ کی طرف کی ہے۔ دیکھیں: الدر المنثور (٤/ ١٧٩)

کھا جاتے ہیں۔ لفظ کثیر اس بات پر دلیل ہے کہ تھوڑے لوگ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو ایسا مال نہیں کھاتے اور نہ حق کو باطل سے ملاتے ہیں، بلکہ اپنے دین پر بغیر تحریف اور تبدیل کیے ہوئے اور بغیر دنیا کی طرف راغب ہوئے باقی ہیں۔ شاید یہ وہ لوگ ہوں گے جو کہ نبیِ اکرم ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے تھے۔ مال کے لینے کو مال کے کھانے سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ مال کو جمع کرنے کا بڑا مقصد کھانے ہی میں اس کا استعمال کرنا ہے، اس کے استعمال کی بہت شکلیں ہیں۔ باطل سے مراد وہ کتابیں ہیں جو انھوں نے لکھی ہیں، اللہ نے نہیں اتاریں۔

ان کتابوں کے حوالے سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول سے ظاہر ہے: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ۷۹] ”چناں چہ ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔“ یا یہ معنی ہیں کہ لوگوں کا مال باطل طریقے سے لیتے ہیں، جیسے رشوت جو احکام کو ہلکا کر کے پیش کرنے اور شرعی امور میں آسانی پیدا کرنے کے لیے لیتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ لوگ عوام کے پاس یہ دعویٰ کرتے تھے کہ کامیابی اور اللہ کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی، مگر ہماری خدمت اور اطاعت کر کے اور مال خرچ کر کے ہماری رضا جوئی سے۔

عام لوگ ان کی ان جھوٹی اور باطل باتوں پر دھوکا کھاتے۔ بعض نے کہا ہے کہ تورات تو محمد ﷺ کے مبعوث ہونے کے بارے میں مدلل آیات پر مشتمل تھی، وہ ان آیات کی غلط طریقے سے تاویل کرتے، پھر کہتے کہ دینِ حق کو مضبوط کرنا واجب ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کے فقہا کے پاس بہت سا مال ہو اور ان کے پاس بڑے اجتماع ہوں۔ اس طریقے سے وہ عام لوگوں کو اپنی ذات اور اپنے مال سے اپنی خدمت کے لیے ابھارتے۔ یہ ہے وہ باطل طریقہ جس سے وہ لوگوں کے مال کھاتے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وَهِيَ بِأَسْرِهَا حَاضِرَةٌ فِيْ زَمَانِنَا، وَهُوَ الطَّرِيْقُ لِأَكْثَرِ الْجُهَّالِ وَالْمُزَوِّرِيْنَ إِلٰى أَخْذِ أَمْوَالِ الْعَوَامِّ وَالْحُمُقٰى مِنَ الْخَلْقِ“[1] یہ فقہا اور مشائخ مسلمین جو اس زمانے میں موجود ہیں لوگوں کا مال کھانے میں اکثر بطریق باطل احبار و رہبانِ اہلِ کتاب کے مقتدی ہیں اور ہر زمانے میں اس قسم کے مولوی اور فقیر لا تعداد گزرے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی اس زمانے کے ان بڑے بڑے نامور مشائخ اور جھوٹے پیروں کے متعلق غور کرے گا تو وہ جان لے گا کہ یہ آیات انھی حضرات کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور انھی کے حالات کی تشریح کرتی ہیں۔ تو دیکھتا ہے کہ ان میں سے ایک دعویٰ یہ کرتا ہے کہ اس کو دنیا سے کوئی لالچ اور توجہ نہیں ہے اور وہ ساری مخلوق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور طہارت و عصمت میں مقرب فرشتوں کی طرح

[1] تفسير الرازي (١٦/ ٣٤)

ہے، لیکن جب کام پڑتا ہے تو ایک روٹی پر جان دیتا ہے اور انتہا درجے کی ذلت وخواری اور کمینگی بھی اس کے حاصل کرنے میں اٹھاتا ہے۔[1] کسی نے کیا خوب کہا ہے:

عَجِبْتُ مِنْ شَيْخِي وَمِنْ زُهْدِهٖ وَذِكْرِهِ النَّارَ وَأَهْوَالَهَا
يَكْرَهُ أَنْ يَّشْرَبَ فِيْ فِضَّةٍ وَيَسْرِقُ الْفِضَّةَ إِنْ نَّالَهَا

”مجھے شیخ پر اور اس کے زہد اور اس کے جہنم کی ہولناکیوں کے ذکر پر تعجب ہوتا ہے، چاندی کے برتن میں کچھ پینا تو ناپسند کرتا ہے، مگر موقع ملے تو چاندی چرانے سے گریز نہیں کرتا!“

میں کہتا ہوں کہ جب رازی اپنے زمانے کے لوگوں کے اس طرح شاکی اور حاکی ہیں جن کو صد ہا سال کا زمانہ گزر گیا تو اب ہم اس زمانے کے لوگوں کو جو قیامت سے لگ بھگ ہے، کیا روئیں۔ اب تو عام بگاڑ یہاں تک ہو گیا ہے کہ جو اچھے عقیدے کے مدعی ہیں اور بڑے عالم و دین دار یا عابد اور پرہیز گار کہلاتے ہیں اور سچے مُوحّد اور پکے متبع توحید وسنت مشہور ہیں وہ باطل طریقے سے مال کھانے میں اہلِ دنیا اور درہم و دینار کے بندگان کے بھی کان کترتے ہیں۔ نعوذ باللہ من غضب اللہ. آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ سے روکنا یہ ہے کہ دینِ اسلام سے اور نبیِ اکرم ﷺ پر اور اس چیز پر ایمان لانے سے روکتے ہیں جو ان کی شریعت میں ان کے منسوخ ہونے سے پہلے ثابت تھے، بسبب اس کے کہ لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے تھے۔

رہا سونے چاندی کا گاڑنا سو معاویہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ حال اہلِ کتاب کا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک مسلمانوں کا حال ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مانعینِ زکات کے بارے میں اتری ہے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب اور مسلمین دونوں کے حق میں آئی ہے۔[2] حق کے زیادہ قریب یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کریں، اس لیے کہ لفظ بہت وسیع ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کنز ہر وہ چیز ہے جس کو جمع کریں، زمین کے اندر یا زمین کے اوپر کچھ زر وسیم کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔[3]

پھر جس مال کی زکات دی ہے وہ ایک قوم کے نزدیک کنز نہیں ہے اور دوسری قوم کے نزدیک کنز ہے، بہت سے صحابہ جیسے عبد الرحمان بن عوف اور طلحہ رضی اللہ عنہما مال جمع کرتے اور اس میں سے خرچ کرتے اور کوئی ان پر مال جمع کرنے کا اعتراض نہ کرتا، اس لیے کہ مال جمع کرنے سے بچنا افضل چیز کو اختیار کرنا ہے اور جمع کرنا مباح ہے اور اس کو جمع کرنے والے پر کچھ مذمت نہیں آتی۔

﴿ يُنْفِقُوْنَهَا ﴾ کی ضمیر فضہ (چاندی) کی طرف لوٹتی ہے، اس لیے کہ فضہ اعم اغلب ہے اور اس طرح کی ضمیریں قرآن پاک میں کئی جگہ آئی ہیں، جیسے: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۚ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ ﴾ [البقرة: ٤٥] ”اور تم

[1] تفسير الرازي (١٦/ ٣٤) [2] تفسير الخازن (٣/ ٨٦) [3] تفسير الطبري (١٤/ ٢٢٥)

صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ کی مدد طلب کرو، اور بے شک یہ بہت بھاری ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا ﴾ [الجمعة: ۱۱] ''اور (اے نبی!) جب وہ تجارت ہوتی یا کوئی تماشا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔'' کیونکہ نماز اور تجارت اعم ہے۔ اس کے علاوہ اس ضمیر کی اور وجوہ بھی لکھی ہیں، جن کا بیان فتح البیان میں ہے۔

لفظ بشارت کا اطلاق خوشی اور غم دونوں کے لیے آتا ہے۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے سائے میں بیٹھے تھے، مجھ کو دیکھ کر فرمایا: « هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ » میں نے کہا: ''فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ'' وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: « هُمُ الْأَكْثَرُوْنَ أَمْوَالًا إِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَعَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ » الحديث.[1] (أخرجه مسلم وفرقه البخاري في موضعين) پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغنے کے لیے اس لیے خاص کیا کہ ان جگہوں پر درد اور تکلیف زیادہ سخت ہوتی ہے یا اس لیے کہ چاروں طرف، یعنی آگے پیچھے داہنے اور بائیں داغ دیے جائیں گے یا اس لیے کہ خوب صورتی چہرے میں اور قوت پشت اور پہلو میں ہوتی ہے اور انسان مال کو اسی جمال اور قوت کے لیے طلب کرتا ہے۔[2]

﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۬ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ أَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۶ ﴾

بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد بارہ مہینے ہی ہے، اللہ کی کتاب میں، جس دن (سے) اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار (مہینے) حرمت والے ہیں، یہی سیدھا دین ہے، چناں چہ تم ان (مہینوں) میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔ اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان لو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے (36)

سال کے بارہ مہینے اور چار حرمت والے:

شریعت کے حکم میں ہمیشہ سے سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے نہ کم اور نہ زیادہ۔ دینِ ابراہیم میں چار مہینے حرمت والے تھے: ذی قعدہ، ذی حجہ، محرم اور رجب، کہ ان میں ملکِ عرب میں لڑنا حرام تھا، تاکہ لوگ دور ونزدیک کے حج

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٦٢، ١٣٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٠) [2] فتح البيان (٥/ ٢٩٠۔ ٢٩٥)

اورعمرہ کرسکیں۔ اب اکثر کے نزدیک یہ حکم نہیں ہے۔ اس آیت سے یہ بھی نکلتا ہے کہ کافروں سے ہمیشہ جنگ کرنا درست ہے اور آپس میں ظلم کرنا ہمیشہ گناہ ہے، ان مہینوں میں زیادہ گناہ ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اگر کوئی کافر ان مہینوں کا ادب مانے تو ہم بھی اس سے جنگ کی ابتدا نہ کریں۔

ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے حج کے خطبے میں پڑھا، فرمایا: خبردار ہو جاؤ کہ زمانہ پھر کر اسی شکل پر آ گیا جس دن اللہ نے زمین و آسمان کو بنایا تھا۔ سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے، ان میں سے چار حرمت والے ہیں، تین لگا تار: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب جمادیٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔ پھر فرمایا: یہ کون سا دن ہے؟ ہم نے کہا: اللہ اور رسول جانیں! نبیِ اکرم ﷺ خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ اس دن کا کچھ اور ہی نام رکھیں گے، سوا اس کے نام کے، پھر فرمایا: کیا یہ نحر کا دن نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں، پھر فرمایا: یہ کون سا مہینا ہے؟ ہم نے کہا: اللہ اور رسول جانیں! آپ ﷺ خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم کو گمان ہوا کہ اس کے سوا اس کا کوئی اور نام رکھیں گے، فرمایا: کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں، فرمایا: یہ کون سا شہر ہے؟ ہم نے کہا: اللہ اور رسول جانیں، آپ ﷺ چپ رہے، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ اب اس کے نام کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے۔ فرمایا: کیا یہ بلدِ حرام نہیں ہے؟ ہم نے کہا: ہاں، فرمایا: تمھارے خون اور تمھارے مال، مجھ کو گمان ہے کہ پھر کہا تمھاری آبروئیں تم پر اس طرح حرام ہیں جیسے کہ یہ دن تمھارا حرام ہے، تمھارے اس شہر میں اور اس مہینے میں اور قریب ہے کہ تم اپنے ربّ سے ملو گے تو وہ تم سے تمھارے اعمال کا سوال کرے گا، خبردار! جو تم میرے بعد گمراہ ہو کر پھر جاؤ، بعض گردن مارنے لگے بعض کی۔ ”أَلَا، هَلْ بَلَّغْتُ؟“ سن لو کیا میں نے پہنچا دیا؟ اب چاہیے کہ تمھارا حاضر پہنچا دے غائب کو، شاید وہ شخص جس کو پہنچایا گیا سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہو۔[1] (رواہ أحمد والبخاري في تفسیرہ وغیرہ و مسلم) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کے اول کو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے لفظ شعبان تک مرفوعاً روایت کیا ہے۔[2] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اس کے راوی ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں بمقام منیٰ ایامِ تشریق کے وسط میں یہ خطبہ پڑھا۔[3] (رواہ ابن جریر و ابن مردویہ نحوہ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾ یہی چار ماہ مذکور ہیں۔[4]

نبیِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد کہ زمانہ اپنی اصل شکل میں آ گیا، اس سے مراد معاملے کی تقریر اور تثبیت ہے۔ اللہ کے کرنے کے مطابق بغیر ان مہینوں کو آگے پیچھے کیے ہوئے یا ان میں کچھ کمی بیشی یا آگے پیچھے یا تبدیل کیے ہوئے جس طرح کہ تحریمِ مکہ میں فرمایا تھا کہ اللہ نے اس شہر کو حرمت دی ہے جس دن کہ آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا، سو وہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٨٥، ٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٩) مسند أحمد (٥/ ٣٧)

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٢٣٥) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٤/ ٢٣٤) اس کی سند میں ”موسیٰ بن عبیدہ“ ضعیف راوی ہے۔ [4] الدر المنثور (٤/ ١٨٤)

اللہ کے حرمت بخشنے سے حرام ہے قیامت کے دن تک۔ اسی طرح اس جگہ زمانے کے گھوم کر اپنی اصل ہیئت پر آ جانے کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ بعض مفسرین اور متکلمین نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ اس استدارتِ زمان سے مراد ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو حج کرنے کا اتفاق بھی اس برس کے مہینے ذوالحجہ میں ہوا۔

عرب لوگ نَسِيءُ کو بھول کر بہت سے سالوں میں حج کرتے تھے، بلکہ غیر ذی الحجہ میں کرتے تھے اور ان کو گمان تھا کہ صدیق رضی اللہ عنہ کا حج سن نو ہجری میں ذوالقعدہ کے مہینے میں ہوا تھا، لیکن اس میں نظر ہے جبکہ ہم "نَسِيء" پر کلام کریں۔ اس سے زیادہ غریب وہ بات ہے جس کو امام طبرانی رحمہ اللہ نے بعض سلف سے روایت کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ و مسلمین کا حج ایک ہی دن یومِ نحر کو حجۃ الوداع کے سال میں اتفاقاً واقع ہوا۔[1] واللہ أعلم.

اس کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے شیخ علم الدین سخاوی رحمہ اللہ سے وجہ تسمیہ بارہ ماہ کی رسالہ "مشهور في أسماء الأيام والشهور" سے نقل کی ہے، اس جگہ اس کے بیان کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔[2] کتاب ہدایۃ السائل میں یہ بحث بہت تفصیل سے لکھی گئی ہے اور جاہلیت کے بارہ مہینوں کے نام بیان کیے گئے ہیں۔ رجب کو مضر کی طرف اس لیے مضاف کیا کہ ربیعہ رجب کو شعبان اور شوال کے درمیان بتاتے ہیں، یعنی ماہِ رمضان کو۔ سو مضر کا کہنا کہ رجب جمادیٰ اور شعبان کے درمیان ہے، ٹھیک تھا۔ اس لیے نبیِ اکرم ﷺ نے اس کو بیان کر دیا کہ مہینوں کی ترتیب میں ہماری مراد مضر کا رجب ہے نہ کہ ربیعہ کا مضر۔ تین مہینے لگاتار اور ایک مہینا اکیلا اس لیے رہا کہ ان میں مناسکِ حج اور عمرہ ادا کیے جاتے ہیں۔

حرمت کی وجہ اور ان میں ظلم و گناہ کی شدید ممانعت:

سو ذوالقعدہ اس لیے حرام ہوا کہ اس میں لڑنے سے بیٹھ رہتے تھے۔ ذوالحجہ اس لیے حرام ٹھہرا کہ اس میں حج کرتے تھے اور مناسک ادا کرنے میں مشغول ہوتے۔ محرم اس لیے حرام ہوا کہ اس میں اپنے دور دراز شہروں تک امن و امان کے ساتھ پھر کر واپس پہنچ جائیں۔ رجب وسط سال میں اس لیے حرام ہوا کہ اس میں زیارتِ خانہ کعبہ کریں، عمرہ بجا لائیں اور جو کوئی جزیرۂ عرب کے دور کناروں سے عمرے کو آئے وہ عمرہ کر کے امن سے اپنے وطن کو لوٹ جائے۔

اس کو دینِ قیم، یعنی شرع مستقیم فرمایا، کیونکہ اس میں حرمت والے مہینوں کے بارے میں اللہ کے حکم کی بجا آوری کی جاتی ہے تو اب ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم و ستم نہ کرنا چاہیے کہ یہ گناہ کو زیادہ کرتا ہے اور بڑھاتا ہے جس طرح کہ بلدِ حرام میں گناہ کرنا اس کی سزا کو کئی گنا کر دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ [الحج: ٢٥] "اور جو اس میں ظلم کے ساتھ کج روی کا ارادہ کرے، ہم اسے نہایت

---

[1] المعجم الكبير (٧/ ٢٥٦) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٦٥۔ ٤٦٦)

دردناک عذاب چکھائیں گے۔“

اسی طرح ماہِ حرام میں گناہ زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، اسی لیے اس مہینے میں امام شافعی اور اہلِ علم کی ایک کثیر تعداد کے نزدیک اس شخص کے لیے جس نے حرم میں کسی کو قتل کیا ہے یا ذومحرم کو مارا ہے اس کے لیے غلیظ دیت مقرر کی جاتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، یعنی ان سارے مہینوں میں،[1] کیونکہ ان میں حرمت کی عظمت کی وجہ سے گناہ بہت بڑھ جاتا ہے اور عمل صالح کا اجر بھی اعظم ٹھہرتا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اور مہینوں کی نسبت حرمت والے مہینوں میں ظلم، خطا اور گناہ کا بدلہ بہت بڑا ہوتا ہے، اگرچہ ظلم ہر حال میں عظیم ہے، لیکن اللہ جس امر کو چاہے اعظم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے مہینوں میں سے رمضان کو اور حرمت والے مہینوں کو چن لیا اور دنوں میں سے یومِ جمعہ کو اور راتوں میں سے شبِ قدر کو، سو تم تعظیم کرو ان چیزوں کی جن کی اللہ نے تعظیم کی ہے۔ یہ تعظیم اہلِ فہم اور اہلِ عقل کیا کرتے ہیں۔

ماہِ حرمت میں جنگ کی ابتدا کا حکم:

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان مہینوں میں ظلم کرنا ایسے ہوتا ہے کہ ان کے حرام کو حلال اور حرام کو حلال کر دے، جس طرح کہ اہلِ شرک نے کیا تھا، کیونکہ وہ نسی جس کو کرتے تھے وہ کفر میں زیادتی تھی۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2] علما اس میں مختلف ہیں کہ شہرِ حرام میں جنگ کی ابتدا کرنا منسوخ ہے یا محکم۔ زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ منسوخ ہے، اس لیے کہ اللہ نے اس جگہ ظلمِ نفس سے منع فرما کر مشرکین سے قتال کا حکم دیا ہے اور ظاہر سیاق اسی کو مقرر کرتا ہے کہ یہ ایک عام معاملہ ہے، اگر حرمت والے مہینے میں حرام ہوتا تو اس پر انسلاخ (مہینے کے گزر جانے) کی قید لگائی جاتی، اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ طائف کا محاصرہ حرمت والے مہینے میں کیا تھا وہ ذوالقعدہ کا مہینا تھا۔

جس طرح صحیحین میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ماہِ شوال میں ہوازن کی طرف نکلے، جب ان کو شکست دے کر ان کے اموال لے کر واپس لوٹے تو انھوں نے واپس طائف جا کر مورچہ باندھا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف پہنچ کر ان کا محاصرہ چالیس دن تک کیا اور واپس آئے اور فتح نہ کیا۔[3]

معلوم ہوا کہ یہ محاصرہ حرمت والے مہینے میں تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حرمت والے مہینے میں جنگ کی ابتدا حرام ہے اور مہینے کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾ [المائدۃ: ۲] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ حرمت والے مہینوں کی۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى

---

[1] تفسیر الطبري (۱۴/ ۲۳۸) [2] تفسیر الطبري (۱۴/ ۲۳۸۔ ۲۴۰) [3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۵۹)

عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [البقرة: ۱۹٤]
''(تم پر) ماہِ حرام (کی پابندی اُن کی طرف سے) ماہِ حرام (کی پابندی) کے بدلے میں ہے اور حرمتیں بدلے کی چیزیں ہیں، پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم اس کے برابر اس پر زیادتی کرو جو زیادتی اس نے تم پر کی، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [التوبة: ٥] ''پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔''

قتال کا بدلہ قتال:

یہ بات پہلے گزر چکی کہ حرمت والے مہینوں سے مراد وہی چار مہینے ہر سال کے ہیں نہ کہ اپنی سہولت اور آسانی کی بنیاد پر جس طرح کسی نے کہا۔ پھر یہ ارشاد کہ مارو مشرکوں کو ہر حال میں جس طرح کہ وہ تم کو مارتے ہیں ہر حال میں ابھارنے اور ترغیب دلانے کی قسم سے ہے، یعنی جس طرح وہ تم سے لڑنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں، جب جنگ کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح تم بھی ان سے جنگ کرنے کے لیے اپنی جمعیت بہم پہنچاؤ یا یہ مومنوں کو مشرکین کے ساتھ حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنے کی اجازت ہے، جبکہ لڑائی کی ابتدا ان کی طرف سے ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ [البقرة: ۱۹٤] ''(تم پر) ماہِ حرام (کی پابندی اُن کی طرف سے) ماہِ حرام (کی پابندی) کے بدلے میں ہے اور حرمتیں بدلے کی چیزیں ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ۱۹۱] ''اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔''

یہی نبیِ اکرم ﷺ کا اہلِ طائف کا محاصرہ کرنے کا جواب ہے، یہاں تک کہ مہینا حرام کا آ گیا، کیونکہ یہ محاصرہ ہوازن اور ان کے احلاف ثقیف کے ساتھ جنگ کا اخیر تھا۔ انھوں نے لوگوں کو جمع کر کے جنگ کے لیے بلا کر جنگ کی ابتدا کی تھی، اب نبیِ کریم ﷺ کو بھی ان کا قصد کرنا پڑا، جب وہ طائف میں قلعہ گیر ہو گئے تو نبیِ اکرم ﷺ نے چاہا کہ وہ قلعوں سے اتر آئیں، انھوں نے مسلمین کی ایک جماعت کو قتل کر ڈالا، یہ محاصرہ مسلسل چالیس دن تک رہا، وہ منجنیق چلاتے رہے، اس کی ابتدا شہرِ حلال (حلال مہینے) میں ہوئی، پھر شہرِ حرام آ گیا، چند روز تک محاصرہ جاری رہا، پھر نبیِ اکرم ﷺ نے کوچ کیا، اس لیے کہ جو بات دوام میں معاف کی جاتی ہے وہ شروع کرنے میں معاف نہیں ہوتی۔ وهذا أمر مقرر وله نظائر كثيرة والله أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اس جگہ کفار کی ایک دوسری قسم کی قباحت ذکر فرمائی کہ جب ہم نے ہر وقت میں ایک خاص حکم جاری کیا تو انھوں نے ان اوقات کو نسی اور کبیسہ سے بدل ڈالا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سال کے بارہ مہینے ہیں: محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الثانیہ، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ یہ بارہ مہینے سال قمری کے ہوئے جو چاند کی مختلف منزلوں میں دورہ کرتے ہیں۔ مسلمان عرب کے انہی مہینوں کا شمار روزوں، مواقیتِ حج اور عیدین اور دوسرے تمام امور اور احکام میں کرتے ہیں۔ ان مہینوں کے تین سو چپن دن ہوتے ہیں اور شمسی سال فلک میں سورج کے چکر لگانے کے حساب سے چلتا ہے، اس کے تین سو پینسٹھ دن اور ایک چوتھائی دن ہوتا ہے۔ قمری اور شمسی سال میں دس دن کا فرق ہوتا ہے، اسی وجہ سے کبھی حج اور روزہ گرمی میں اور کبھی جاڑے میں پڑتا ہے۔

کتاب اللہ سے مراد قرآن ہے، اس لیے کہ قرآن ایسی آیات ہیں جو چاند کے حساب اور منازل پر دلالت کرتی ہیں یا مراد لوحِ محفوظ ہے یا مراد حکم واجب ہے۔ یہ آیت اس امر کو واضح کرتی ہے کہ ان مہینوں کو اللہ ہی نے وضع کیا ہے اور ان کے نام اس معروف ترتیب سے رکھے۔ یہ ترتیب اس دن سے ہے جس دن سے آسمان اور زمین بنا ہے اور اجرامِ فلکی اور زمانے پیدا ہوئے۔ اسی کو سارے انبیا لائے تھے اور اسی کے مطابق کتب نازل ہوتی رہیں۔ وہ مہینے جو اصطلاحِ عجم وروم وقبط وغیرہم ہیں اور کسی مہینے کو تیس دن کا اور کسی کو زیادہ اور کسی کو کم ٹھہراتے ہیں، سو ان کا کچھ اعتبار نہیں۔

پھر سال میں چار مہینے محترم ہیں، عرب جاہلیت میں ان کی تحریم کرتے تھے، اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا، بلکہ احترام اور تعظیم کو بڑھا دیا۔ ان میں حسنات و طاعات کئی گنا ہو جاتی ہیں اور برائیاں اور گناہ زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ ان کی حرمات کی ہتک نہ کرنی چاہیے، یہی ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا دینِ مستقیم ہے۔ عرب نے اس کو بطورِ وراثت ان سے حاصل کیا تھا۔ یا یہ حساب صحیح ہے اور یہ عدد مستوفی (کافی) ہے یا یہ ایسا حکم ہے جو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ان مہینوں میں ان کی حرمت کی ہتک کر کے یا جنگ میں کود کر اپنی جانوں پر ظلم نہ کرنا چاہیے، اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سارے مہینے مراد ہیں، لیکن پہلی بات حق کے زیادہ قریب ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ مشرکین سے جنگ کرنا واجب ہے، اگر بعض نہ کریں تو پھر فرض عین ہو جاتا ہے۔[1]

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ
عَامًا وَّيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوا

[1] فتح البیان (٥/ ٢٩٦۔ ٢٩٩)

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۷﴾

بلاشبہ (کسی مہینے کو) آگے پیچھے کر دینا کفر میں زیادتی ہے، اس کی وجہ سے کافر گمراہ کیے جاتے ہیں، وہ ایک سال اسے حلال کر لیتے ہیں اور دوسرے سال اسے حرام (خیال کرتے ہیں) تاکہ ان (مہینوں) کی تعداد پوری کریں جو اللہ نے حرام ٹھہرائے ہیں، پھر وہ حلال ٹھہرا لیں جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے مزین کر دیے گئے۔ اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿37﴾

نسی کی گمراہی اور رائے سے شریعت میں تصرف کی مذمت:

کافروں نے ایک یہ گمراہی نکالی تھی کہ آپس میں لڑتے، اس میں اگر حرمت والا مہینا آ جاتا اس کو ہٹا دیتے تھے، کہتے تھے کہ اب کے سال صفر پہلے آیا محرم بعد میں آئے گا تو ماہ حرام میں لڑتے اس حیلے سے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ نے مشرکوں کی ان کے اللہ کی شرع میں تصرف کرنے پر مذمت کی ہے جو وہ اپنی آرائے فاسدہ سے کرتے تھے اور اللہ کے احکام کو اپنی خواہشات سے تبدیل کر دیتے تھے اور اس بات پر بھی مذمت کی کہ انھوں نے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا، کیونکہ ان میں قوتِ غضبیہ، شہامت (خودداری) اور حمیت تھی، اس لیے انھوں نے تین ماہ کی مدت بڑھا دی اور جو ان مہینوں میں تحریم تھی وہ ان کو اپنا مطلب حاصل کرنے اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں مانع تھی، لہٰذا اسلام سے پہلے محرم کی تحلیل کی مدت نکال کر محرم کو صفر تک موخر کر دیا تھا۔ حرمت والے مہینے کو حلال اور حلال مہینے کو حرام ٹھہرا کر چار ماہ کی مدت موافق کر دی تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جنادہ بن عوف بن امیہ کنانی ہر سال موسم میں آتا، اس کی کنیت ابو ثمامہ تھی، وہ پکار کر کہتا: ”إِنَّ أَبَا ثُمَامَةَ لَا يُجَابُ وَلَا يُعَابُ أَلَا وَإِنَّ صَفَرَ الْعَامِ الْأَوَّلِ حَلَالٌ“، لوگ اس کو حلال کر لیتے، وہ ایک سال صفر کو حرام کرتا، دوسرے سال محرم کو۔ فذلك قوله تعالى: ﴿ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ ﴾ یعنی ایک سال محرم کی حرمت کو ترک کرتے ہیں، دوسرے سال اس کو حرام ٹھہرا لیتے ہیں۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی بنی کنانہ کا ہر سال موسم میں ایک گدھے پر سوار ہو کر آتا اور کہتا: ”إِنِّي لَا أُعَابُ وَلَا أُجَابُ وَلَا مَرَدَّ لِمَا أَقُولُ إِنَّا قَدْ حَرَّمْنَا الْمُحَرَّمَ وَأَخَّرْنَا الصَّفَرَ“ پھر آئندہ سال آتا اور اسی طرح کہتا اور پکارتا: ”إِنَّا حَرَّمْنَا الصَّفَرَ وَأَخَّرْنَا الْمُحَرَّمَ“ یہ مطلب ہے اس آیت کا: ﴿ لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٢٤٦۔ ٢٤٧)

﴿ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ﴾ (آیتِ باب) یعنی چار ماہ کا حساب حرمت والے مہینے کو موخر کر کے اور اللہ کے حرام کو حلال ٹھہرا کر چوکس کر دیتے۔ امام ابو وائل، ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ کہا ہے۔[1]

﴿ اَلنَّسِیْٓءُ ﴾ کی شکلیں اور تاریخ:

﴿ اَلنَّسِیْٓءُ ﴾ کی کئی شکلیں امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عقبہ پر کھڑے ہوئے، اللہ نے جتنا چاہا اتنے مسلمان آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و ثنائے الٰہی کے بعد آیتِ باب پڑھی اور فرمایا کہ محرم کو ایک سال حرام کرتے تھے اور حلال کرتے تھے صفر و محرم کو، یہی ہے نسیٔ۔[2] امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے ''کتاب السیرۃ'' میں نسی میں بہت عمدہ اور مفید کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عرب میں مہینوں میں نسی کی اور اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا وہ قلمس ہے، یعنی حذیفہ بن عبد فقیم بن عدی بن عامر۔ اس کا نسب عدنان سے ملتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کام پر اس کا بیٹا عباد، پھر اس کا بیٹا قلع، پھر اس کا بیٹا عباد، پھر اس کا بیٹا امیہ، پھر اس کا بیٹا عوف، پھر اس کا بیٹا ابوثمامہ جنادہ بن عوف، یہ سب کے بعد تھا، اس پر اسلام قائم ہوا۔ عرب حج سے فارغ ہو کر اس کے پاس جمع ہوتے، وہ کھڑا ہو کر ان میں خطبہ پڑھتا، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کو حرام ٹھہراتا اور محرم کو ایک سال حلال کر دیتا اور محرم کے بجائے صفر کو حرام کر دیتا، پھر دوسرے سال اس کو حرام ٹھہرا دیتا، تاکہ گنتی پوری ہو جائے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ نسیٔ بروزن فعیل مفعول ہے، یعنی مؤخر۔ عرب حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنا حرام جانتے تھے، لیکن جب ان کو قتال کی حاجت ہوتی تو ان مہینوں میں لڑتے اور ان کے عوض اور مہینوں کو حرام کر لیتے، مثلاً: اگر محرم میں قتال ہوتا تو صفر کو حرام کر لیتے، اسی طرح باقی مہینوں کا حال تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا، جو لوگ ان کو لوٹتے، یہ موقع پا کر ان کا مال تاراج کرتے، اس لیے ان کی آپس میں جنگیں لگی رہتیں۔ یہ تین مہینے لگاتار ہیں، ان میں جب فاقہ کشی آتی اور ان کی حاجت زیادہ ہوتی اور حرمت کی وجہ سے لڑ نہ سکتے تو بعض مہینوں کو حلال کر کے اور ان کے بجائے دوسرے مہینے حرام کر لیتے تو اس کو نسی کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس نسی کا مُوجدِ اول قلمس ہے، کسی نے کہا ہے کہ عمرو بن لحی ہے، بعض نے کہا ہے کہ نعیم بن ثعلبہ بنی کنانہ قبیلہ سے ہے۔ واللہ أعلم.

اللہ نے فرمایا یہ نسی کفر میں زیادتی ہے، یعنی معصیت بالائے معصیت ہے۔ انھوں نے اس تحریم کو وراثت میں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٩٤) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٦٨۔ ٤٧٠)

بطورِ شریعت پایا تھا۔ پھر جب حرام کو حلال کر لیا تو یہ کفر ہوا۔ وہ اس نسی کی وجہ سے گمراہ ہو گئے یا دوسروں کو گمراہ کر دیا، کیونکہ ایک سال حلال دوسرے سال حرام ٹھہرایا کرتے ہیں، یہ اس لیے کہ گنتی پوری ہو جائے۔ مہینے حرام کے چار ہی مقرر ہیں۔ مواطات بمعنی موافقت ہے۔ قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صفر کو لے کر حرمت والے مہینوں پر زیادہ کر دیا، پھر حرمت میں محرم سے ملا دیا۔ یہی بات امام طبری رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔[1] شیطان نے اس کام کو ان کی نظر میں اچھا کر دکھایا تھا، سو اللہ کافروں کو راہ نہیں دکھاتا۔[2]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ
الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾
اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا
غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

اے ایمان والو! تمھیں کیا ہوگیا ہے، جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین کی طرف بوجھل ہو جاتے ہو، کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی پر ریجھ گئے ہو؟ چناں چہ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت (کے مقابلے) میں بہت ہی حقیر ہے (38) اگر تم نہیں نکلو گے تو وہ (اللہ) تمھیں دردناک عذاب دے گا اور بدل کر تمھارے علاوہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (39)

جنگِ تبوک کا ذکر:

یہاں سے جنگِ تبوک کا ذکر ہے، جب اسلام غالب ہوا اور عرب میں پھیلا۔ شام کے رئیس قوم غسان کے شاہِ روم کے تابع تھے، انھوں نے سوچا کہ شاہِ روم کو اس طرف لائیں اور جنگ میں ڈالیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کو خبر ہوئی، آپ ﷺ ہی نے ان پر قصد کیا اور روم کے شاہ کو خط لکھا اور دینِ اسلام کی دعوت دی۔ اس پر آپ ﷺ کی نبوت ثابت ہوئی مگر اس کی قوم نے رفاقت نہ کی اور وہ بھی اسلام سے محروم رہا۔ جب شام والوں نے خبر پائی کہ نبیِ اکرم ﷺ کا کیا ارادہ ہے، انھوں نے شاہِ روم سے ظاہر کیا، اس نے مدد کا ذمہ نہ لیا، ان لوگوں نے اطاعت کی، لیکن مسلمان نہ ہوئے۔ پھر عنقریب نبیِ اکرم ﷺ کی وفات ہوئی، اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں تمام ملک شام فتح ہوا۔ اس جنگ میں دشمن قوی نظر آیا اور سفر دراز دیکھا اور اسباب کم تو منافق بہانے بنانے لگے، نبیِ اکرم ﷺ نے سب کو

[1] تفسیر القرطبي (٨/ ١٣٩) [2] فتح البیان (٥/ ٢٩٩۔ ٣٠١)

رخصت دی، جب اللہ کے فضل سے غالب اور منصور ہو کر واپس آئے، تب منافق پشیمان ہوئے، اس سورت میں اکثر منافقوں کی باتیں بیان ہوئی ہیں۔

جہاد سے سستی کرنے پر عتاب:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے عتاب کا شروع ہے جو غزوۂ تبوک میں نبی اکرم ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ میوہ پکنے کا اور درختوں کے سایہ دار ہونے کا وقت تھا اور موسم سخت گرم تھا، انھوں نے یہ حیلہ کر کے نبی اکرم ﷺ کا ساتھ نہ دیا، اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی اور دنیا میں بے رغبتی دلائی اور فرمایا کہ تمھارا کیا حال ہے کہ جہاد کو چھوڑ کر کاہلی سے آرام طلبی کے لیے نقشِ زمین بن گئے ہو، کیا تم نے دنیا کو آخرت کے بدلے پسند کر لیا ہے تو یہ دنیا آخرت کی نسبت قلیل اور حقیر ہے، اس پر گرنے کا کیا فائدہ؟ اس سلسلے میں مستورد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَا الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا كَمَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ هٰذِهٖ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ تَرْجِعُ وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ»[1] (رواه أحمد وانفرد به مسلم) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مسموعاً مرفوعاً کہا ہے کہ "إن الله يجزي بالحسنة ألفي ألف حسنة" پھر آیت پڑھی: ﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ فَالدُّنْيَا مَا مَضٰى مِنْهَا وَمَا بَقِيَ مِنْهَا عِنْدَ اللّٰهِ قَلِيْلٌ"[2] (رواه ابن أبي حاتم) امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے: "إِلَّا قَلِيْلٌ أَيْ كَزَادِ الرَّاكِبِ"

عبدالعزیز بن مروان رحمہ اللہ جب مرنے لگے تو کہا: میرا کفن لاؤ، جس میں میں کفن دیا جاؤں گا، دیکھوں کیسا ہے؟ جب سامنے لا کر رکھا تو دیکھ کر کہا: بہت سی دنیا جو چھوڑ کر جاتا ہوں اس میں سے میرے لیے بس یہی ہے، پھر پشت پھیر کر رونے لگے اور کہتے تھے: "أُفٍّ لَكَ مِنْ دَارٍ إِنْ كَانَ كَثِيْرُكَ لَقَلِيْلٌ، وَإِنْ كَانَ قَلِيْلُكَ لَقَصِيْرٌ وَإِنْ كُنَّا مِنْكَ لَفِيْ غُرُوْرٍ"[3]

ترکِ جہاد پر وعید:

پھر اللہ نے ترکِ جہاد پر وعید فرمائی کہ اگر تم نہ نکلو گے تو تم کو دردناک عذاب دیا جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عرب کے ایک قبیلے کو جہاد کے لیے طلب کیا تھا، وہ کسل مندی اور کاہلی سے نہ نکلے، اللہ نے ان سے مینہ روک لیا، یہ ان کا عذاب ہوا۔[4] اللہ نے کہا کہ اگر تم نہ نکلو گے تو ہم دوسری قوم کو لائیں گے جو پیغمبر کی مدد کرے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٨) مسند أحمد (٤/ ٢٢٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٩٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٧٠) اس کی سند میں "زیاد جصاص" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٩٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٠٦) تفسير الطبري (١٤/ ٢٥٤۔ ٢٥٥) اس کی سند میں "نجدہ بن نفیع" مجہول راوی ہے۔ (ضعيف أبي داود: ٢/ ٣٠٣)

﴿ أَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ٣٨] ''اور اگر تم پھرو گے تو اللہ تمھارے سوا دوسرے لوگ بدل لائے گا، پھر وہ تم جیسے (نافرمان) نہ ہوں گے۔'' تم اگر بیٹھ رہے اور جہاد کو نہ نکلے تو اس میں اللہ کا کچھ نقصان نہیں ہے، کیونکہ اس کو ہر چیز پر قدرت ہے، وہ تمھارے بغیر بھی دشمنوں سے مقابلہ کرسکتا ہے۔

کہا ہے کہ یہ آیت اور آیت: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ [التوبة: ٤١] ''تم ہلکے (بھی) نکلو اور بوجھل (بھی)۔'' اور آیت: ﴿ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ١٢٠] ''اہلِ مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں کے لائق نہیں تھا کہ وہ (جہاد میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں۔'' منسوخات ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ: ﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴾ [التوبة: ١٢٢] ''اور مومنوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب ہی نکل کھڑے ہوں، تو ہر فرقے میں سے ایک گروہ دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ نکلا، تاکہ وہ جب اپنے قبیلے میں واپس جائیں تو انھیں خبردار کریں، تاکہ وہ (پیچھے والے بھی اللہ سے) ڈریں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، حسن اور زید بن اسلم رحمہم اللہ سے یوں ہی مروی ہے۔[1] مگر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت ان کے حق میں ہے جن کو نبیِ اکرم ﷺ نے جہاد کے لیے بلایا تھا، ان پر آنا لازم تھا، اگر نہ آتے تو انھیں سزا ملتی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''وَهٰذَا لَهُ اتِّجَاهٌ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ''[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب میں مومنین کو قتال کرنے کی ترغیب ہے۔ اس میں غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والوں پر عتاب فرمایا ہے۔ یہ غزوہ ماہِ رجب سنہ نو ہجری میں فتح مکہ سے ایک سال بعد اور طائف سے واپس آنے کے بعد ہوا۔ تبوک شام کی طرف مدینے سے دس مرحلے پر ایک جگہ ہے۔ منصرف اور غیر منصرف دونوں طرح پر مستعمل ہے۔ اس غزوے کا قصہ سیرت حلبی میں مفصل لکھا ہوا ہے۔[3]

نفر جلدی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف نقل کرنے کو کہتے ہیں۔ استنفار یہ ہے کہ امام لوگوں کو جہاد کے لیے بلائے۔ اس سے نفیر اسم ہے۔ ہندی میں اس کا معنی ہے پکارا۔ ﴿ اِثَّاقَلْتُمْ ﴾ کے معنی ہیں دیر لگانا اور ہمت ہار جانا۔ متاعِ دنیا اس لیے قلیل ہے کہ اس کی لذتیں فی نفسہا خسیس اور آزمایشوں سے بھری ہوئی اور جلد ختم ہونے والی ہیں

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٥/ ١٧٩٨)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ٢٥٥_ ٢٥٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٧١)
[3] السيرة الحلبية للإمام علي الحلبي (٣/ ٩٩_ ١٢٧)

اور آخرت کے فائدے شریف، بلند مرتبہ، آفات سے خالی اور ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، اس سے یقین حاصل ہوتا ہے کہ بے شک آخرت کے مقابلے میں دنیا حقیر و قلیل و ذلیل ہے۔ یا قلیل سے مراد عدم (غیر موجود) ہے، کیونکہ کسی زائل ہو جانے والی چیز کو باقی رہنے والی چیز کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہوتی۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ تثاقل سب سے واقع نہیں ہوا، اس لیے کہ سب کا گراں بار ہو جانا بعید ہے، بلکہ جس طرح بعض کے فعل کو کل کی طرف نسبت کرتے ہیں، اسی طرح یہ بھی تھا۔

بہر حال آیتِ کریمہ جہاد کے واجب ہونے پر ہر حال اور ہر وقت میں دلیل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر نص کی ہے کہ ان کا یہ تثاقل ایک امرِ منکر ہے، اگر منکر نہ ہوتا تو وہ عتاب نہ فرماتا اور عذابِ الیم کا وعدہ نہ کرتا۔ اس عذاب سے مراد احتباسِ مطر (بارش کو روک لینا) وغیرہ ہے دنیا میں۔ یا عام ہے اس لیے کہ عذابِ الیم آخرت ہی میں ہوتا ہے۔

آیت سخت قسم کی ڈانٹ اور وعیدِ مؤکد ہے، ان پر جنھوں نے نبیِ کریم ﷺ کے ہمراہ کوچ نہ کیا۔ قوم مستبدل (وہ قوم جو ان کے بدل ہوگی) میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اہلِ یمن مراد ہیں، کسی نے کہا ہے کہ اہلِ فارس، لیکن بغیر دلیل کے کسی خاص قوم کو متعین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس ترکِ نفیر (کوچ نہ کرنے) میں اللہ کا کچھ نقصان نہیں، اس لیے کہ وہ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔ دشمنوں پر اپنے رسول کا مددگار ہے، وہ ہرگز پیغمبر کو مخذول (رسوا) نہ کرے گا۔ اس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے، کچھ انھی لوگوں پر فتح و شکست کا دار و مدار نہیں جو بیٹھ رہے۔[1]

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جب کہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل کی اور ایسے لشکروں سے اس کی مدد کی جنھیں تم نے نہیں دیکھا، اور اس نے کافروں کی بات کو پست کر دیا، اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہے۔ اور اللہ بہت زبردست ہے، خوب حکمت والا ہے (40)

---

[1] فتح البیان (۵/ ۳۰۱۔ ۳۰۳)

سفرِ ہجرت اور اللہ کے رسول کی مدد:

اللہ نے فرمایا اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرتے تو نہ کرو، اللہ خود اپنے رسول کا ناصر، مؤید و کافی و حافظ ہے۔ دیکھو جب ہجرت کے سال میں کافروں نے نبیِ اکرم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکلنے پر مجبور کیا اور قید کرنا چاہا یا مار ڈالنا چاہا تھا تو اس وقت نبیِ اکرم ﷺ اپنے صدیق یعنی دوست ابوبکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مکے سے نکل گئے اور تین دن تک غارِ ثور میں رہے، تاکہ جو لوگ ان کی جستجو میں ان کے نشانِ پا پر نکلے ہیں وہ واپس لوٹ جائیں، تب وہ وہاں سے مدینے کی طرف چلیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ فکر تھا کہ کہیں کوئی شخص اطلاع پا کر نبیِ اکرم ﷺ کو ایذا نہ دے، آپ ﷺ ان کو تسکین دیتے اور ثابت قدمی کی تلقین کرتے اور فرماتے کیا گمان ہے تیرا ان دو شخصوں کے بارے میں جن کا تیسرا ساتھی اللہ ہے، جیسے امام احمد رحمہ اللہ نے کہا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا کہ جب ہم غار کے اندر تھے کہ ان میں سے اگر کوئی شخص اپنے پاؤں کی طرف دیکھے گا تو ہمیں دیکھ لے گا، فرمایا: «يَا أَبَا بَكْرٍ! مَا ظَنُّكَ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟»[1] (أخرجاه في الصحيحين)

اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی تسکین نبیِ اکرم ﷺ پر اتاری۔ سکینہ سے مراد زیادہ مشہور اقوال میں نصرت و تائید ہے۔ اور کسی نے کہا ہے کہ ضمیر ابوبکر کی طرف پھرتی ہے کہ ان کو تسکین بخشی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہر وقت سکینہ تھا،[2] لیکن یہ بات اس موقع پر ایک خاص سکینہ نئے سرے سے اترنے کے منافی نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے ملائکہ کے لشکر سے تائید کی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کلمۂ کفار جس کو نیچا کر دیا، سے مراد شرک ہے اور اللہ کا کلمہ جس کو اونچا کر دیا، لا إله إلا الله ہے۔[3] ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ایک آدمی شجاعت سے لڑتا ہے، کوئی حمیت سے، کوئی ریا سے، ان میں سے کون سا لڑنا اللہ کی راہ میں ہے؟ فرمایا: جو اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو، وہی لڑنا اللہ کی راہ میں ہے۔[4] (رواه الشيخان)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ اگر تم نبیِ اکرم ﷺ کی مدد نہ کرو گے تو اللہ ان کا متکفل ہے، تم اعانت کرو یا نہ کرو، اللہ نے ان کی مدد قلت میں بھی کی ہے اور دشمن پر غلبہ اور قہر بخشا، سو جس نے ایسے وقت میں مدد کی کہ سوائے ایک شخص کے کوئی دوسرا ہمراہ نہ تھا، وہ اب بھی مدد کر سکتا ہے۔ غار ایک بڑے سوراخ کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨١) مسند أحمد (١/ ٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٠١) [3] تفسير الطبري (١٤/ ٢٦١) اس کی سند حسن ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٤)

اندر ہو۔ ثور ایک پہاڑ ہے مکے کے قریب، ایک ساعت کا راستہ۔ نبیِ کریم ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ مکے سے نکل کر اس غار میں جا چھپے تھے، یہ قصہ تفصیل کے ساتھ سیرت اور حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ ہجرت کی حدیث جو بہت طویل ہے وہ بخاری سے منفرد روایت ہے۔[1] معیت سے مراد ہمیشہ کی معیت ہے، جس کے اردگرد حزن وغم نہیں آتا۔ خفاجی نے کہا ہے کہ یہ معیت مخصوصہ تھی، ورنہ یوں تو اللہ ہر کسی کے ساتھ ہے۔[2]

مطلب یہ ہوا کہ جس کے ساتھ اللہ ہے، اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور جب وہ مغلوب نہ ٹھہرا تو پھر غم کس لیے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صرف خوف طلب تھا، یعنی کہیں کفار جگہ نہ جان لیں اور یہ غم نبیِ اکرم ﷺ کے لیے تھا نہ کہ اپنی جان کے لیے۔ اسی لیے انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ اگر میں مر گیا تو ایک آدمی تھا اور اگر آپ مر گئے تو امت اور دین ہلاک ہوا۔ سیدنا انس اور مغیرہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ نے کفار کو غار سے اندھا کر دیا، ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے، کہیں اتا پتا نہ چلا۔

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات اس آیت میں داخل ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ [النحل: ١٢٨] ”بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیز گاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں۔“ اور اس میں نبیِ اکرم ﷺ کے عظیم توکل کا بیان ہے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے۔[3] یہ ان کی بڑی منقبت ہے کہ وہ نبیِ اکرم ﷺ کے یارِ غار تھے اور اللہ نے ان کا ذکر اپنی کتاب میں کسی اچھے عنوان کے تحت کیا ہے۔ رضي الله عنه.

امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں سارے اہلِ ارض پر سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عتاب کیا۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی نہیں ہیں، وہ نصِ قرآنی کی رو سے کافر ہوا۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: تو حوض پر میرا ساتھی ہے اور غار میں میرا صاحب ہے۔[5] (أخرجه الترمذي وقال: حديث حسن صحيح غريب) امام ابوالسعود رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں صدیق رضی اللہ عنہ کے بلند مرتبہ اور ان کی سابقہ صحبت کے بارے میں جو دلیل ہے وہ مخفی نہیں ہے۔[6] کشاف میں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبتِ نبوی کا منکر کافر ہے، اس لیے کہ اس نے کلام اللہ کا انکار کیا۔ یہ بات تمام صحابہ کے لیے نہیں ہے۔[7]

اہلِ علم نے اس آیت سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت پر بہت سے وجوہ نکالے ہیں۔ سکینہ سے مراد دل سے اسبابِ خوف کا زائل ہونا ہے۔ ملائکہ اس غار کی نگہبانی کرتے تھے۔ کافروں کی نظریں اس طرف سے پھیر دیتے تھے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٩)
[2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي للخفاجي (٤/ ٣٢٦)
[3] المنهاج للنووي (١٥/ ١٥٠) [4] تفسير البغوي (٤/ ٤٩)
[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٠) اس کی سند میں ”کثیر بن اسماعیل“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٩٥٦)
[6] تفسير أبي السعود (٤/ ٦٦) [7] تفسير الكشاف (٢/ ٢٦٠)

جس طرح بدر کے دن حراست کی تھی اور اگر ضمیر کو نبیِ اکرم ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں کی طرف پھیریں تب بھی کوئی ڈر نہیں ہے۔ قرآن کریم اور کلامِ عرب میں یہ محاورہ عام ہے۔ کلمۂ کفار شرک اور بتوں کو پکارنا تھا اور اللہ کا کلمہ توحید اور دعوت الی الاسلام کا کلمہ ہے۔ یہ قیامت تک غالب و بلند اور باقی رہے گا۔[1] وللّٰه الحمد والمنة.

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۱

تم ہلکے (بھی) نکلو اور بوجھل (بھی)، اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو (41)

ہر حالت میں جہاد کے لیے نکلنے کا حکم:

مسلم بن صبیح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورت براءت میں سب سے پہلے یہی آیت اتری ہے۔[2] حضرمی نے کہا کہ لوگوں میں کوئی بیمار یا بوڑھا ہوتا وہ کہتا: میں گناہ گار نہ ہوں گا۔[3] اللہ نے غزوۂ تبوک کے لیے عام لوگوں کو نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ نکلنے کا حکم دیا، تاکہ اللہ کے دشمنوں اور کفارِ روم کے ساتھ جنگ کریں جو اہلِ کتاب تھے اور مومنوں پر واجب کیا کہ وہ ہر حال میں خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے، تنگی کی حالت میں یا آسانی کی حالت میں نکلیں۔ سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: یعنی خواہ بوڑھے ہوں یا جوان اللہ نے کسی کا عذر نہ سنا، بلکہ فرمایا کہ شام کی طرف نکل کر لڑے، یہاں تک کہ مارا جائے۔[4]

دوسری روایت میں یوں ہے کہ انھوں نے سورت براءت پڑھی، جب اس آیت پر پہنچے: ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ (آیتِ باب) کہا: میں اپنے رب کو دیکھتا ہوں وہ جوانوں اور بوڑھوں کو لڑنے کے لیے پکارتا ہے، اے میرے بیٹو! میرے لیے سامان تیار کرو، ان کی اولاد نے کہا: اللہ آپ پر رحم کرے، آپ تو نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ جہاد کر چکے ہیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انتقال کیا، پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر لڑ چکے ہو، یہاں تک کہ ان کی بھی وفات ہوئی، اب ہم آپ کی طرف سے جنگ کریں گے، انھوں نے نہ مانا، آخر دریا پر سوار ہوئے، کوئی جزیرہ نہ ملا، جہاں ان کو دفن کریں مگر نو دن کے بعد دیکھا کہ بالکل حالت تبدیل نہ ہوئی، وہاں ان کو دفن کیا۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ، صالح، حسن بصری، ابن عطیہ، مقاتل بن حیان، شعبی اور زید بن اسلم رحمہم اللہ نے بھی ﴿خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ کی تفسیر بوڑھے اور جوان کے الفاظ سے کی ہے۔ یہی امام عکرمہ، ضحاک رحمہما اللہ اور کئی

[1] فتح البيان (٦/ ٣٠٤_ ٣٠٦)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ٢٦٩)
[3] تفسير الطبري (١٤/ ٢٦٦_ ٢٦٧)
[4] تفسير الطبري (١٤/ ٢٦٢)
[5] مسند أبي يعلىٰ (٦/ ١٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٠٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٩/ ٥١٨)

ایک اہلِ علم کا قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ جوان اور بوڑھے اور غنی اور مسکین ہیں۔ یہی ابو صالح رحمہ اللہ کا قول ہے۔ حکم بن عقبہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی مشاغیل (کسی کام دھندے میں لگے ہوئے) اور غیر مشاغیل۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی نشاط (خوشی) اور غیر نشاط، یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: انھوں نے کہا تھا کہ ہم ثقیل و صاحبِ حاجت وصنعت و شغل اور سہولت والے وغیرہم سب طرح کے آدمی ہیں۔ اللہ نے یہ آیت بھیجی اور کسی کا عذر نہ سنا، یعنی کسی حال میں کیوں نہ ہو، باہر نکل پڑو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تنگی اور آسانی میں۔[1] یہ سب معانی آیت کی عمومیت کے تقاضے کے مطابق ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی غنی، فقیر، قوی اور ضعیف سب نکلیں۔ ایک بڑے موٹے آدمی نے آ کر شکایت کی اور اذن چاہا، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کیا، اس دن یہ آیت اتری، لوگوں پر گراں گزری، تب اللہ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [التوبة: ٩١] ”ضعیفوں اور بیماروں پر اور جو لوگ کوئی چیز نہیں پاتے کہ وہ خرچ کریں، ان پر (پیچھے رہنے میں) کوئی گناہ نہیں، جبکہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خیر خواہی کرتے ہیں۔“[3] ابو ایوب رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بدر میں حاضر ہوئے تھے، پھر مسلمین کے کسی غزوے میں پیچھے نہیں رہے، مگر ایک سال۔ وہ کہتے تھے: ”لَا أَجِدُنِي إِلَّا خَفِيفاً أَوْ ثِقَالًا“[4] (رواه ابن جرير)

ابو راشد حبرانی کہتے ہیں میں نے مقداد بن الاسود کو حمص میں ایک صراف کی دکان پر بیٹھے ہوئے دیکھا، یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوار تھے اور جنگ کے ارادے سے نکلے تھے، بوڑھے ہو گئے تھے، میں نے کہا: اللہ نے تم کو معذور کر دیا ہے، کہا کہ سورت بعوث میں: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ (آیتِ باب) اترا ہے۔[5] حبان بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم صفوان بن عمرو والیِ حمص کے ہمراہ نفیرِ عام میں افسوس (شہر کا نام) کی طرف جو جراجمہ کی جانب ہے نکلے، ایک بڑے بوڑھے شخص کو دیکھا جس کی ابروئیں آنکھوں پر گری پڑی تھیں، وہ اہلِ دمشق میں سے تھا، ایک سواری پر تھا اور ان لوگوں میں شامل تھا جو حملہ کرنے کے لیے نکلتے تھے۔ میں نے اس سے کہا: اے چچا! اللہ نے تم کو معذور کہا ہے۔ اپنی ابروئیں اٹھا کر کہنے لگا: اے بھتیجے! اللہ نے ہم کو استنفار کیا ہے اور فرمایا ہے: ﴿ خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ سن لے! اللہ جس کو دوست رکھتا ہے اسی کی آزمایش کرتا ہے، پھر اس کو اعادہ کر کے اللہ کے بندوں میں باقی رکھتا ہے۔ اللہ کے بندوں میں آزمایشیں انھی کو آتی ہیں جو شاکر، صابر اور ذاکر ہیں اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔[6]

---

① تفسیر الطبري (١٤/ ٢٦٢۔ ٢٦٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٠٢۔ ١٨٠٣)
② تفسیر الطبري (١٤/ ٢٦٩)
③ تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٠٣۔ ١٨٠٤)
④ تفسیر الطبري (١٤/ ٢٦٧)
⑤ تفسیر الطبري (٤/ ٢٦٨)
⑥ تفسیر الطبري (١٤/ ٢٦٤۔ ٢٦٥)

جہاد میں خرچ کرنے کی ترغیب:

اس کے بعد اللہ نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی رغبت دلائی ہے اور اس بات کی کہ اپنی جان اس کی مرضی میں صرف کرو، یہ جہاد اپنی جان و مال سے کرنا دارین میں تمھارے لیے بہتر ہے، اس لیے کہ یہ غرامتِ نفقہ (یعنی نقصان) تھوڑی ہے، اس کے عوض جو مال غنیمتوں کا دنیا میں ہاتھ آتا ہے اور جو عزت آخرت میں ذخیرہ ہوتی ہے وہ کہیں بڑھ کر ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: «تَكَفَّلَ اللّٰهُ لِلْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ إِنْ تَوَفَّاهُ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ أَوْ يَرُدَّهُ إِلٰى مَنْزِلِهِ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيْمَةٍ»[1]

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرة: ٢١٦] ”تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمھارے لیے ناگوار ہے اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“ اسی قبیل سے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ایک شخص سے کہا کہ مسلمان ہو جا! اس نے کہا: میں آپ کو کارہ (ناپسند) پاتا ہوں، فرمایا: «أَسْلِمْ وَإِنْ كُنْتَ كَارِهاً»[2] (رواه أحمد)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ﴿ خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ کے معنی یہ لکھے ہیں کہ تم جہاد کرنے کے لیے نکلو، ایسی حالت میں کہ جہاد تم پر ہلکا ہو اور ایسی صورت میں بھی کہ جہاد تم پر بھاری ہو اور ان دونوں صورتوں کے تحت بہت سی اقسام داخل ہیں، اس لیے ان دونوں الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کی عبارتیں مختلف ہوئی ہیں: کسی نے کہا ہے کہ اکیلے یا اکٹھے۔ کسی نے کہا: جنگ کی طرف سبقت کرنے والے، یعنی طلائع (ہراول دستہ) اور متاخر عنہ (بعد والے)، جیسے لشکر۔ بعض نے کہا: کم ہتھیار والے اور بہت ہتھیار والے۔ بعض نے کہا: تندرست اور بیمار۔ کسی نے کہا: شادی شدہ (بیوی والے) اور غیر شادی شدہ۔ کسی نے کہا: خفاف یعنی حاشیہ بردار و اتباع (نوکر وغیرہ) ثقال یعنی بہت سے خُدّام اور جاہ وحشم رکھنے والے۔ کسی نے کہا: بجز دنفیر کے جلدی کرنے والے اور سامان درست کر کے دیر سے نکلنے والے۔

اس کے علاوہ بہت سی تفسیریں ہیں، لیکن آیت کو ان تمام معانی پر محمول کرنے سے کوئی ممانعت نہیں ہے، کیونکہ مطلب یہ ہے کہ تم نکلو، خواہ تمھارے لیے حرکت کرنا آسان ہو یا مشکل، اس لیے زیادہ بہتر یہی ہے کہ یہ تمام

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٩٥٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٧٦)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٠٩) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٩٧٤)

حالات اور اوقات کے لیے عام ہے۔ اور صیغۂ امر کو وجوب پر محمول کرنا چاہیے اور بعض نے کہا: ندب پر اور آیت محکم ہے نہ کہ منسوخ اور اس آیت سے اندھے لنگڑے ضعیف اور بیمار کا خارج ہونا بابِ تخصیص سے ہے نہ کہ بابِ نسخ سے۔ اگر ان کا آیتِ باب کے حکم میں داخل ہونا فرض کیا جائے تو صحیح نہیں، کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ لوگ اس آیت کی عمومیت میں سرے سے داخل ہی نہیں ہیں، اس کی دلیل اس آیت کا غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہونا ہے اور نبیِ اکرم ﷺ نے اس غزوے کے وقت عورتوں اور بعض مردوں کو مدینے میں چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ جہاد ان چیزوں میں سے ہے جو فرضِ کفایہ ہیں نہ کہ فرضِ عین اور فرضِ عین ہونے کے لیے دوسری شکل ہے۔

پھر اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے کا حکم دیا اور اس کو اپنے بندوں پر واجب کیا۔ فقرا اپنی جان سے کریں اور غنی لوگ اپنی جان کے ساتھ اپنے مالوں سے بھی جہاد کریں۔ جہاد دینِ اسلام کے فرائض اور بڑے بڑے واجبات میں سے ہے، یہ فرض کفایہ ہے، جب کہ کچھ لوگ جہاد اور دشمن کو ہٹانے پر قائم ہوں اور جب کہ دشمن کے مقابلے میں قیام ممکن نہ ہو مگر صرف تمام مسلمانوں کے جمع ہونے کی صورت میں زمین کے ہر طرف سے تو ان سب پر فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ تمھارے لیے یہ نکلنے اور جہاد کرنے کا حکم بہتر ہے اور فی نفسہٖ عظیم القدر ہے، سکون اور آرام سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگر تم کو امورِ فاضلہ کی شناخت کا سلیقہ آتا ہے اور فضول چیزوں کو علاحدہ کرنا جانتے ہو تو تم ایسا کرو۔ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے بارے میں ہوا تھا جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور انھوں نے نبیِ اکرم ﷺ کا ساتھ نہ دیا تھا۔[1]

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

اگر مال (غنیمت) قریب الحصول اور سفر درمیانہ ہوتا تو وہ (منافق) آپ کے ساتھ ضرور چلتے، اور لیکن کٹھن منزل ان پر دور ہوگئی، اور عن قریب وہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں (42)

منافقوں کے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے کے اسباب اور بہانے:

اللہ نے ان کو ملامت کی ہے جنھوں نے غزوۂ تبوک میں ساتھ نہ دیا اور نبیِ اکرم ﷺ سے اذن لے کر پھر بہانہ بنا کر بیٹھ رہے اور اپنا عذر ظاہر کیا، حالانکہ وہ سچے نہ تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عرضِ قریب سے مراد غنیمت ہے۔[2] اور سفرِ قاصد سے مراد قریب، یعنی اگر کسی نزدیک جگہ جانا ہوتا اور وہاں جھٹ پٹ مالِ غنیمت

[1] فتح البیان (٥/ ٣٠٧۔ ٣٠٨) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٠٤) اس کی سند میں ''بشر بن عمارۃ'' ضعیف راوی ہے۔

ملنے کی امید ہوتی تو ساتھ دیتے، لیکن شام کے سفر کا فاصلہ دور دراز نظر آیا، اب جو تم لوٹ کر آئے تو وہ عذر بیان کرنے لگے کہ ہم قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے تمھارے ساتھ نہیں گئے، اگر عذر نہ ہوتا تو ضرور ساتھ چلتے، اللہ نے فرمایا کہ یہ جھوٹے ہیں، اپنی جان کو اس تخلف (پیچھے رہ جانے)، جھوٹ اور عذرِ باطل سے ہلاک کرتے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ عرضِ قریب سے مراد ایسی غنیمت ہے جو جلد ہی آسانی سے ہاتھ آ جائے اور اس میں دیر نہ لگے اور سفر قاصد سے مراد ایسا سفر ہے جو درمیانے فاصلے کا ہو، یعنی نہ قریب کا ہو اور نہ دور کا۔ افراط وتفریط کے درمیان یعنی متوسط قاصد کو کہتے ہیں۔ عرض کے معنی اصل میں وہ چیز ہے جو منافع اور دنیا کے مال ومتاع میں سے سامنے آتی ہے، اسی لیے کہا ہے: ”اَلدُّنْیَا عَرَضٌ حَاضِرٌ یَّأْکُلُ مِنْهُ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ“

﴿ اَلشُّقَّةُ ﴾ کے معنی ہیں دور دراز کے علاقے کی طرف سفر کرنا۔ شقہ اس مسافت کو بھی کہتے ہیں جو جو مشقت سے طے کی جائے۔ شقہ سے اس جگہ غزوۂ تبوک مراد ہے کہ وہ ایک دور کا دشوار گزار سفر تھا، وہ لوگ غزوہ روم کو ایک عظیم امر سمجھتے تھے، جبھی تو وہاں جانے سے جی چراتے تھے اور نہ گئے۔ یہ ارشاد کہ اب وہ قسمیں کھائیں گے، غیب کی اطلاع ہے، اس لیے کہ اس آیت کا نزول تبوک سے واپس لوٹنے سے پہلے ہوا تھا۔ انھوں نے حلفاً یہ عذر ظاہر کیا کہ ہمارے پاس سفر کا سامان تیار نہ تھا یا ہم بیمار تھے، اگر یہ موانع نہ ہوتے، یعنی رکاوٹیں نہ ہوتیں تو ہم بھی ضرور باہر نکلتے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ ایک روشن معجزہ تھا۔

اللہ نے کہا: جھوٹی قسم کھانے والا اپنی جان کو ہلاک کرنے والا ہوتا ہے، اسی لیے حدیث میں آیا ہے: «اَلْیَمِیْنُ الْفَاجِرَةُ تَدَعُ الدِّیَارَ بَلَاقِعَ»[2] یعنی جھوٹی قسم ملکوں کو ویران کر دیتی ہے، گھر اجڑ جاتے ہیں، اللہ جانتا ہے کہ یہ اپنے عذروں میں جھوٹے ہیں، ان کو نکلنے کی استطاعت تھی، مگر گھر سے باہر نہ نکلے۔[3]

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿٤٣﴾ لَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالْمُتَّقِیْنَ ﴿٤٤﴾ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾

(اے نبی!) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا، آپ نے ان (منافقین) کو اجازت کیوں دی؟ (آپ اجازت

---

[1] سنن البیهقي الکبریٰ (۱۰/ ۳۵) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۹۷۸) [2] فتح البیان (۵/ ۳۰۸۔ ۳۰۹)

نہ دیتے) یہاں تک کہ آپ پر ظاہر ہو جاتے سچے لوگ اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے (43) (اے نبی!) جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ آپ سے اجازت نہیں مانگتے، اس سے کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کریں۔ اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے (44) آپ سے اجازت تو صرف وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں، لہٰذا وہ اپنے شک میں پڑے تردد کر رہے ہیں (45)

منافقین کو اجازت دینے پر نبیِ رحمت ﷺ کو عتابِ لطیف:

عون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کبھی تم نے اس سے بہتر عتاب بھی سنا ہے کہ عتاب سے پہلے عفو کی آواز کی اور فرما دیا کہ ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ﴾ یہی بات مورق عجلی وغیرہ نے بھی کہی ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ پر عتاب کیا، جس طرح تم سنتے ہو، پھر وہ آیت اتاری جو سورت نور میں ہے اور اذن دینے کی رخصت دی، اگر جی چاہے تو پڑھ لو جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [النور: ٦٢] ''چناں چہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیں، اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' اسی طرح عطاء خراسانی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں اتری ہے جنھوں نے یہ بات کہی تھی کہ نبیِ اکرم ﷺ سے رخصت مانگو، اگر دیں تو بیٹھ رہو اور اگر نہ دیں تو بیٹھ رہو،[2] اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا﴾ (آیتِ باب) یعنی عذر کا اظہار کرنے میں ان کا سچ کھل جائے اور جھوٹے معلوم ہو جائیں، کیونکہ ان کو جنگ سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ رہنے پر اصرار تھا، اسی لیے اللہ نے کہا کہ جو ایمان دار ہیں وہ اجازت طلب نہیں کرتے، کیونکہ ان کو جہاد سے بیٹھ رہنا منظور نہیں ہے۔ وہ تو جان و مال سے اللہ کی راہ میں لڑنا چاہتے ہیں اور جہاد کو قربت جانتے ہیں اور محض نکلنے کے حکم کی بجا آوری پر آمادہ ہیں۔ اللہ پرہیزگاروں سے واقف ہے اور جن کو کچھ عذر نہیں وہی لوگ بیٹھ رہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کو دارِ آخرت کے ثواب کی امید نہیں ہے۔ ان کے دل شک میں پڑے ہیں۔ وہ حیران اور ہالک (ہلکان) ہو رہے ہیں، نہ ادھر ہیں نہ ادھر، سو جس کو اللہ گمراہ کرے وہ کب راہِ راست پر آئے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٠٥)
[2] تفسیر الطبري (١٤/ ٢٧٣) تفسیر ابن کثیر (٤٧٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں سوالیہ انداز انکار کے لیے ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو اس سے پہلے اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ جنگ میں نہ جائیں اور بیٹھے رہیں کہ سچے جھوٹوں سے ممتاز ہو جائیں۔ معافی کا ذکر اس بات پر دلیل ہے کہ یہ جو اجازت نبی اکرم ﷺ سے صادر ہوئی، یہ خلافِ اولیٰ تھا، اس میں اللہ کی طرف سے عتابِ لطیف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ عتاب اس بیٹھ رہنے کے اذن پر نہیں تھا، بلکہ اس پر تھا کہ آپ نے منافقوں کو بیٹھے رہنے کی اجازت کیوں دی، امام طبری رحمہ اللہ نے ایسے ہی کہا ہے۔[1]

پہلی تعبیر اولیٰ ہے، اس لیے کہ سورت نور میں رخصت کی اجازت دی ہے۔ دونوں آیتوں میں جمع اس طرح ہے کہ یہاں عتاب ہوا ہے، استثبات (ان کے دلوں کی حالت واضح ہو جانے) سے پہلے اجازت دینے پر اور وہاں استثبات کے بعد۔ عفا اللہ عنك. افتتاحِ کلام ہے، جس طرح یوں کہتے ہیں: "أَصْلَحَكَ اللّٰهُ وَأَعِزَّكَ وَرَحِمَكَ كَيْفَ فَعَلْتَ كَذَا وَكَذَا" لیکن پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے۔

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اجتہاد کرنا جائز ہے، یہ مسئلہ اصولِ فقہ میں مدون ہے، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جلدی کرنے اور ظاہری امور پر مغتر (دھوکا کھانا) ہونے سے بچنا ضروری ہے۔ عمرو بن میمون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اجتہاد سے دو کام کیے، جن کا حکم نہ تھا: ایک یہ کہ منافقین کو پیچھے بیٹھ رہنے کی اجازت دی، دوسرے یہ کہ اسیرانِ بدر سے فدیہ لیا۔ دونوں امور پر اللہ نے عتاب فرمایا۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: "أُنْظُرْ هٰذَا التَّلَطُّفَ بِهِ، بَدَءَ بِالْعَفْوِ قَبْلَ أَنْ يُّعِيْرَهُ بِالذَّنْبِ"[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ منافقوں کو پہچانتے نہ تھے، یہاں تک کہ سورت براءت اتری۔[3]

پھر اللہ نے اہلِ ایمان کی عادت بیان کی کہ وہ لوگ نبی اکرم ﷺ سے جہاد سے پیچھے ہٹ کر بیٹھ رہنے کی اجازت طلب نہیں کرتے، بلکہ ان پر ایسا اذن شاق گزرتا ہے۔ اذن چاہنا تو ان کی عادت ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ انتالیس آدمی منافق تھے، ان کے دل میں شک یعنی نفاق تھا، وہ حیرت اور تردد میں گرفتار تھے، یہ ساری آیت محکم ہے۔[4]

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝۴۶

---

(1) تفسیر الطبري (١٤/ ٢٧٢ـ ٢٧٣)
(2) تفسیر البغوي (٤/ ٥٤ـ ٥٥)
(3) تفسیر القرطبي (٨/ ١٥٥)
(4) فتح البیان (٥/ ٣١٠ـ ٣١٢)

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لیے کچھ سامان ضرور تیار کرتے، لیکن اللہ کو ان کا اُٹھنا پسند نہ تھا، اس لیے اس نے انھیں ہلنے نہ دیا اور (ان سے) کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو (46) اگر وہ (منافق) تمھارے ساتھ نکلتے بھی تو وہ تمھیں خرابی ہی میں زیادہ کرتے اور تمھارے اندر فتنہ (کھڑا کرنے) کی خواہش لیے دوڑے دوڑے پھرتے۔ اور تم میں بعض ان کے جاسوس ہیں۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے (47)

منافقوں کا پول کھولنا:

﴿ سَمّٰعُوْنَ ﴾ سے مراد باتوں کے پیچھے لگنے والے اور ان کی جاسوسی کرنے والے ہیں۔ امام مجاہد، زید بن اسلم اور ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جاسوس ہیں کہ تمھاری باتیں سن کر ان کو پہنچاتے ہیں، لیکن اس کو ان کے مومنین کے ہمراہ نکلنے کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عام بات ہے تمام حالات میں، اور اگلے معنیٰ اس سیاق کی مناسبت سے خوب ظاہر ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان اہلِ شرف میں سے جنھوں نے نبی اکرم ﷺ سے پیچھے رہنے کی اجازت طلب کی تھی، عبداللہ بن اُبی بن سلول اور جد بن قیس تھا، یہ لوگ اپنی قوم کے اشراف میں تھے، اللہ نے ان کو بوجھل کر دیا، کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ اگر نکلیں گے تو لشکر کو بگاڑ دیں گے، کیونکہ فوج میں ان کے دوست اور آشنا تھے جو ان کی بات مانتے تھے۔[1]

پھر اللہ نے اپنے علم سے خبر دی کہ ہم جانتے ہیں جو ہوا اور جو ہوگا اور جو نہیں ہوا کہ اگر وہ ہوتا تو کیونکر ہوتا، اسی لیے فرمایا کہ اگر وہ نکلتے تو خرابی ڈالتے، لیکن وہ نہیں نکلے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۲۸] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴾ [الأنفال: ۲۳] ''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنا دیتا، اور اگر وہ انھیں سنا دیتا تو بھی وہ ضرور پھرتے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٢٨١۔ ٢٨٢)

عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٦۔ ٦٨] ''اور اگر بے شک ہم ان پر فرض کر دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کرو یا تم اپنے گھروں سے نکلو تو ان میں سے چند ایک کے سوا کوئی بھی یہ کام نہ کرتا۔ اور اگر بے شک وہ مان لیتے جس کی انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا باعث ہوتا۔ اور تب ہم ضرور انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے۔ اور ہم ضرور انھیں سیدھے راستے پر چلاتے۔'' اس بارے میں بہت آیات ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو جہاد کی تیاری کرتے جس طرح اور مومنین نے کی، لیکن وہ بالکل نکلنا نہیں چاہتے اور اللہ بھی ان کا نکلنا پسند نہیں کرتا ہے، اسی وجہ سے ان کو بٹھا رکھا، ان کا نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ نکلنا ایک عظیم فساد تھا، لہٰذا نبیِ اکرم ﷺ پر عتاب ہوا۔ ان سے کہا کہ تم بیٹھ رہو، اس کا کہنے والا شیطان تھا، اس نے ان کے جی میں یہ وسوسہ ڈال دیا۔ بعض نے بعض سے کہا، یا نبیِ اکرم ﷺ نے غصے سے فرمایا۔ اللہ نے ان کے جی میں یہ بات ڈالی، تاکہ وہ مخذول ہوں، یعنی رسوا ہوں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔[1] قاعدین سے مراد اندھے، بیمار اور عورتیں ہیں، اس میں ان کی جو مذمت اور تنقیص کی ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ یہ لوگ اگر نکلتے تو فساد برپا کراتے، اس میں نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منافقین کے پیچھے رہ جانے سے تسلی دی ہے۔

خبال سے مراد شر، فساد، نمیمہ (چغل خوری) اور اختلاف پیدا ہونا اور اراجیف (افواہیں پھیلانا) ہے۔ خبال کے اصل معنی اضطراب اور ایسی بیماری ہے جس سے عقل متاثر ہو، جیسے: جنون۔ ان کا یہ مطلب تھا کہ تم میں فتنہ ڈالیں اور تم کو ایسا ڈرائیں کہ تم شکست کھا جاؤ، حالانکہ تم میں بھی ایسے لوگ ہیں جو ان کی بات سنتے ہیں اور ان کی باتوں کا ان میں اثر ہوتا ہے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے اور اس کو معلوم ہے کہ اگر یہ نکلتے تو کیا خرابی پڑتی، لہٰذا اس کی حکمتِ بالغہ نے یہی چاہا کہ وہ نہ نکلیں، اسی لیے اس سورت میں آگے چل کر فرمایا ہے: ﴿ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴾ [التوبة: ٨٣] ''(اے نبی!) پھر اگر اللہ آپ کو واپس لے آئے ان (منافقین) میں سے کسی گروہ کی طرف، پھر وہ آپ سے (جہاد پر) نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دیجیے: تم اب میرے ساتھ کبھی بھی (جہاد پر) نہیں نکلو گے اور نہ کبھی میرے ساتھ (مل کر) دشمن سے لڑو گے، یقیناً تم پہلی بار (پیچھے) بیٹھ رہنے پر راضی ہو گئے تھے تو (اب بھی) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔''

نیز سورت فتح میں ارشاد کیا ہے: ﴿ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا

[1] تفسير الجلالين (١/ ٢٤٨)

لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [الفتح: ١٥] ''جب تم غنیمتیں لینے جانے لگو گے تو جھٹ سے یہ پیچھے چھوڑے ہوئے لوگ کہنے لگیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجیے، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدل دیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے، وہ اس کا جواب دیں گے (نہیں نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو، (اصل بات یہ ہے) کہ وہ لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔''

بہرحال یہ آیت منافقوں کے لیے وعید اور ڈانٹ ڈپٹ ہے جو مومنوں کے درمیان فتنے اور شبہات پیدا کرتے ہیں۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاید یہ وعید ''سَمّٰعِيْنَ'' (کان لگا کر سننے والے) اور قاعدین (بیٹھے رہنے والے) دونوں کے لیے ہے۔[1]

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

(اے نبی!) یقیناً انھوں نے اس سے پہلے بھی فتنہ (پھیلانا) چاہا تھا اور آپ کے معاملات بگاڑنے کی کوشش کی تھی، یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم غالب ٹھہرا، جبکہ وہ ناپسند ہی کرتے رہے (48)

پہلے بھی منافقوں کی خرابی ڈالنے کی کوشش:

اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو منافقین کے احوال سے آگاہ فرمایا کہ انھوں نے آپ کے اور اصحاب کے فریب دینے کے لیے خوب بڑھ چڑھ کر فکر اور رائے زنی کی ہے، یہ چاہتے ہیں کہ دین رسوا ہو جائے، ایک مدتِ دراز تک خامد (بجھا) رہے۔ جب شروع میں نبیِ اکرم ﷺ مدینے آئے تھے تو سارے عرب نے ایک ہی کمان سے آپ ﷺ پر تیراندازی کی تھی اور یہود اور منافقینِ مدینہ جنگ سے پیش آئے تھے۔ جب اللہ نے بدر کے دن فتح یاب کیا اور اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا تو ابن اُبی اور اس کے یاروں نے کہا کہ اب تو یہ امر متوجہ ہوا (ظاہر ہو گیا) لہٰذا تم اوپر اوپر سے اسلام میں داخل ہو جاؤ، پھر جس قدر اللہ اسلام اور اہلِ اسلام کو عزت بخشتا ان کا غیظ و غصہ بڑھتا جاتا اور دین کی ترقی ان کو بری لگتی، اس لیے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴾ (آیتِ باب)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ لوگ پہلے ہی سے چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں فساد، خرابی، تفریق کلمۂ مومنین، پریشانی اور پراگندگی پیدا ہو، کچھ اس غزوۂ حال پر ہی موقوف نہیں ہے جس سے وہ پیچھے ہٹے رہے۔ ابن اُبی اُحد کے دن بھی اپنے ہمراہی لوگ لے کر چل دیا، اسی طرح یہ ہمیشہ تدبیریں، حیلہ سازی اور فریب دہی کرتے رہتے ہیں، مگر

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ٧١) فتح البيان (٥/ ٣١٢ ـ ٣١٦)

اس سے کیا ہوگا کہ اللہ کا حکم سب پر غالب ہے، یہ بے شک برا مانا کریں[1] ۔

چاہا ہم نے ولے نہ چاہا اس نے اس کا چاہا ہوا ہمارا چاہا نہ ہوا

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور ان میں سے کوئی آپ سے کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں۔ سن لو! وہ فتنے میں تو پڑ چکے ہیں۔ اور بے شک جہنم یقیناً کافروں کو گھیرنے والا ہے (49)

زعم پارسائی کا بہانہ اور شانِ نزول:

ایک منافق جد بن قیس تھا، اس نے بہانا بنایا کہ روم کی عورتیں خوب صورت ہیں، اس ملک میں جا کر بدی میں گرفتار ہو جاؤں گا، اس لیے مجھے رخصت دیں کہ سفر میں نہ جاؤں، لیکن مال سے مدد کروں گا۔ اللہ نے فرمایا کہ ان منافقوں میں سے ایک وہ ہیں جو یہ بات کہتے ہیں کہ ہم اگر نکلیں گے تو روم کی جوروؤں اور عورتوں کی وجہ سے فتنے میں پڑیں گے، اللہ نے فرمایا کہ وہ تو خود اسی قول کے سبب فتنے میں گرفتار ہیں۔

امام زہری، یزید بن رومان، عبداللہ بن ابی بکر، عاصم بن قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے جہاد کی تیاری کے دوران ایک دن جد بن قیس (یہ جد اخی بن سلمہ ہے) سے کہا تھا: «هَلْ لَّكَ يَا جَدُّ الْعَامَ فِي إِجْلَاءِ بَنِي الْأَصْفَرِ» اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''أَوَ تَأْذَنُ لِي وَلَا تُفْتِنِّي فَوَاللّٰهِ لَقَدْ عَرَفَ قَوْمِي مَا رَجُلٌ أَشَدُّ عَجَباً بِالنِّسَاءِ مِنِّي، وَإِنِّي أَخْشَىٰ إِنْ رَأَيْتُ نِسَاءَ بَنِي الْأَصْفَرِ أَنْ لَّا أَصْبِرَ عَنْهُنَّ، فَأَعْرَضَ عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ وَقَالَ قَدْ أَذِنْتُ لَكَ'' سو یہ آیت جد بن قیس کے بارے میں اتری ہے، یعنی اگر اس کو زنانِ روم کے فتنے کا ڈر ہے تو وہ یہ عذرِ بے جا کر کے اس سے زیادہ فتنے میں گرفتار ہوا کہ نبیِ اکرم ﷺ کا ساتھ چھوڑا، جہاد سے جی چرایا اور لڑنے سے منہ موڑا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور کئی ایک نے بھی کہا ہے کہ اس آیت کا نزول جد بن قیس کے بارے میں ہوا ہے۔[2] یہ شخص بنی سلمہ کے اشراف میں سے تھا۔ صحیح میں آیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے پوچھا کہ اے بنی سلمہ! تمھارا سردار کون ہے؟ کہا: جد بن قیس، حالانکہ ہم اس کو بخیل جانتے ہیں۔ فرمایا: بخیل سے بڑھ کر اور کون سی بدتر بیماری ہوگی، لیکن تمھارا سردار جوان جعد ابیض بشر بن البراء بن معرور ہے۔[3] جہنم کے احاطہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ وہ دوزخ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

---

[1] فتح البیان (٥/ ٣١٦) [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٢٨٧)

[3] المعجم الکبیر (١٩/ ٨١) مستدرك الحاکم (٣/ ٢٤٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھ کو فتنے میں نہ ڈالو، یعنی اگر میں آپ کے اذن کے بغیر پیچھے رہ جاؤں گا تو گناہ گار ہوں گا یا مجھ کو نکال کر ہلاکت میں نہ ڈالو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جد بن قیس سے کہا: «مَا تَقُوْلُ فِي مُجَاهِدَةَ بَنِي الْأَصْفَر؟» اس نے کہا: "إِنِّي امْرُءٌ صَاحِبُ نِسَاءٍ وَمَتٰى أَرٰى نِسَآءَ بَنِي الْأَصْفَرِ أَفْتَتِنْ فَائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي" اس پر یہ آیت اتری۔[1] اللہ نے کہا ہے کہ وہ تو خود نفسِ فتنہ میں پڑا ہے۔ مراد فتنۂ تخلف ہے جہاد سے۔ سقوط محض داخل ہو جانے سے زیادہ سخت ہے۔ جہنم ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے۔[2]

اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَيَتَوَلَّوۡا وَّهُمۡ فَرِحُوۡنَ ۝۵۰ قُلۡ لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوۡلٰٮنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۵۱

(اے نبی!) اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو انھیں بری لگتی ہے۔ اور اگر آپ پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے معاملے میں پہلے ہی احتیاط برتی تھی اور وہ خوش خوش لوٹ جاتے ہیں (50) (اے نبی!) کہہ دیجیے: ہمیں تو صرف وہی (مصیبت) پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی، وہی ہمارا کارساز ہے۔ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے (51)

منافقوں کی عداوت اور خبثِ باطن:

اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی عداوت جتلائی کہ جب تم کو دشمنوں پر فتح و نصرت و کامیابی ہوتی ہے جس سے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو خوشی ہو تو ان کو یہ بات بری لگتی ہے اور اگر کوئی مشکل تم پر آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے سے متابعت نہیں کی تھی اور خوش ہو کر پھرتے ہیں۔ اللہ نے اس بات کا جواب سکھایا کہ تم یوں کہو کہ ہم تو اللہ کی مرضی اور تقدیر کے تابع ہیں، وہ ہمارا مولیٰ و سید و ملجا ہے، ہم کو جو حال ملے گا وہ اسی کی تقدیر ہے، ایمان والوں کا کام یہی ہے کہ وہ ہر کام میں اللہ پر بھروسا کریں۔ وھو حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ حسنہ سے مراد کامیابی ہے اور مصیبت سے ہزیمت (شکست)۔ یہ منافقین کے ایک اور خبثِ باطن کا بیان ہے، کیونکہ ان کی یہ حرکت ان کی اسلام کے ساتھ شدید ترین عداوت کی دلیل ہے۔ اس جگہ حسنہ کے مقابلے میں مصیبت کا بیان کیا نہ کہ سیئہ کا، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورت آل عمران میں فرمایا: ﴿وَاِنۡ

[1] المعجم الکبیر (۱۲/ ۱۲۲) اس کی سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔ [2] فتح البیان (۵/ ۳۱۷)

تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ [آل عمران: ١٢٠] ”اور اگر تم کو برائی پہنچے تو خوش ہوتے ہیں۔“ اس لیے کہ یہاں خطاب نبیِ اکرم ﷺ کو ہے، یہ آپ کے حق میں مصیبت ہے، جس پر ثواب ملے گا نہ کہ سیئہ ہے کہ جس پر عتاب کیا جائے اور وہاں خطاب مومنین کو تھا۔ یہ منافق اپنی رائے کی تعریف کرتے ہیں کہ دیکھو ہمارا احتیاط کرنا ہمارے کام آیا، ہم نے جو یہ ہوشیاری کی کہ ہم لڑنے کو نہ نکلے تو جو مصیبت کہ مومنین کو پہنچی، ہم اس سے بچ گئے، اس طرح خوش ہو کر اپنے گھر میں آتے ہیں، اللہ نے کہا کہ تم ان کی اس خوشی کے مقابلے میں یوں کہو کہ اللہ نے لوحِ محفوظ میں یا اس قرآنِ منزل میں جو کچھ ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے وہی ہوگا۔ یہ جواب اس لیے مفید ہے کہ جب آدمی یہ جان لیتا ہے کہ تقدیر نہیں ٹلتی، خیر ہو یا شر، اور اللہ کی قضا و قدر پر راضی رہتا ہے تو اس پر مصائب آسان ہو جاتے ہیں وہ شماتتِ اعداء (دشمن کا تکلیف پر خوش ہونا) کی تلخی نہیں پاتا۔ جب اللہ مولیٰ ٹھہرا تو اب حق یہی ہے کہ ایمان دار اسی پر تمام امور میں اعتماد کریں، کسی غیر پر بھروسا نہ کریں۔[1]

سب کام اپنے کرنا تقدیر کے حوالے نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝۵۳ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۵۴

(اے نبی!) کہہ دیجیے: تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے بس ایک (فتح یا شہادت) کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمھارے حق میں یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تمھیں اپنے پاس سے عذاب دے یا ہمارے ہاتھوں (عذاب دلوائے)، چناں چہ تم انتظار کرو، بے شک ہم بھی تمھارے ساتھ منتظر ہیں (52) (اے نبی!) کہہ دیجیے: تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، بے شک تم نافرمان لوگ ہو (53) اور ان کے خرچ کیے ہوئے مال قبول کیے جانے میں صرف یہ (امر) مانع ہے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا۔ اور وہ نماز کے لیے سست ہو کر ہی آتے ہیں اور وہ ناگواری ہی سے خرچ کرتے ہیں (54)

---

[1] فتح البیان (٥/ ٣١٨۔ ٣١٩)

اِحدی الحسنیین اور بے اعتقاد کے مال کی عدم قبولیت:

اور وہ جو مدد خرچ دینے لگا تھا سو جواب ملا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں۔ دو خوبیوں سے مراد ایک شہادت دوسری فتح اور کامیابی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔[1] سو جس طرح تم کو انتظار ہے، اسی طرح ہم بھی ان دو باتوں کے منتظر ہیں کہ یا غیب سے عذاب پڑے یا ہمارے ہاتھ سے۔ پھر خرچ کے قبول نہ ہونے کا سبب بیان فرمایا کہ قبولِ اعمال کے لیے صحیح ایمان چاہیے اور ان کا یہ حال ہے کہ نماز میں کاہل اور سست ہیں، نہ قدم صحیح رکھتے ہیں نہ عمل میں ہمت والے ہیں۔ خرچ بھی کرتے ہیں تو ناخوشی سے۔ حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا »[2] « وَإِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا »[3] اسی لیے ان کا خرچ اور عمل قبول نہ کیا: ﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [المائدة: ٢٧] ”اللہ صرف پرہیزگاروں سے (قربانی) قبول کرتا ہے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ﴾ سے یا تو نصرت اور غنیمت مراد ہے یا مغفرت و شہادت۔ حسنیٰ تانیث (مونث) ہے احسن سے۔ اس سوالیہ انداز میں ڈانٹ ڈپٹ ہے اور ﴿ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ﴾ [التوبة: ٥١] کی وضاحت کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کے عذاب سے مراد کوئی آسمانی عذاب ہے اور ہاتھوں کے عذاب سے قتل و قید ہونا ہے۔ اللہ نے ان کے خرچ کرنے کو قبول کرنے سے انکار ان کے نفاق کی وجہ سے کیا۔ خطیب نے کہا ہے کہ یہ آیت اگرچہ خاص کر منافقین کے خرچ کرنے کے بارے میں آئی ہے، لیکن یہ ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو اپنا مال اللہ کی خوش نودی کے بغیر خرچ کرتا ہے، ریاکاری اور سمعہ کے لیے خرچ کرتا ہے۔ سو اس سے ایسا مال قبول نہیں کیا جاتا۔ ان کا نماز پڑھنا سستی اور گراں باری کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ نہ ثواب کی امید رکھتے ہیں اور نہ عقاب کی دہشت اور ڈر۔ ان کی نماز صرف لوگوں کے دکھانے کے لیے ہے۔ یہ ظاہر میں مسلمان ہیں، باطن میں اسلام کے خلاف ہیں، مال کا خرچ کرنا ناخوشی سے ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ مال بے موقع و بے محل جاتا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ اور رسول کے وعدے پر ایمان نہیں رکھتے۔[4]

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

چناں چہ ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں، یقیناً اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیاوی زندگی ہی میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالتِ کفر ہی میں نکلیں (55)

---

(1) تفسير الطبري (١٤/ ٢٩٢)
(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨٢)
(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٥)
(4) فتح البيان (٥/ ٣١٩_ ٣٢١)

منافقوں کے مال اور اولاد سے عدم اعتنا:

یعنی تعجب نہ کریں کہ بے دین کو اللہ نے نعمت کیوں دی۔ بے دین کے حق میں اولاد اور مال وبال ہے کہ ان کے پیچھے دل پریشان ہے اور مرتے دم تک ان کے فکر سے چھوٹنے نہ پائیں، یہاں تک کہ توبہ کرے یا نیکی پکڑے۔ اللہ تعالیٰ نے نبیِ اکرم ﷺ کو تعجب کرنے سے منع فرمایا: ﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴾ [طٰهٰ: ١٣١] ''اور (اے نبی!) ان چیزوں کی طرف آپ اپنی نگاہیں نہ اُٹھائیں جو چیزیں زندگانیِ دنیا کی آرائش کی ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں، تاکہ ہم انھیں ان کے ذریعے سے آزمائیں، اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ۝٥٥ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴾ [المؤمنون: ٥٥۔ ٥٦] ''کیا وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک ہم جو بھی ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ (تو) کیا ہم ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ، وہ (اصل حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے۔''

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ عذابِ دنیا سے مراد یہ ہے کہ زکات دیں اللہ کے راستے میں خرچ کریں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں تقدیم تاخیر ہے، یعنی آگے پیچھے کیا گیا ہے، یعنی تُو ان کے مال و اولاد سے تعجب نہ کر، اللہ ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب کرنا چاہتا ہے۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام حسن رحمہ اللہ کا قول اختیار کیا ہے، یہی پہلا قول قوی وحسن ہے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ جب مریں تو کافر مریں کہ اس میں نکایت اور شدتِ عذاب زیادہ ہے۔ عیاذا باللہ من ذلك. یہ ان لوگوں کے ساتھ ایک طرح کا استدراج ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کسی شے سے تعجب کرنا یوں ہوتا ہے کہ اس شے کی خوبی سے خوش اور راضی ہو اور ایک طرح کا فخر بھی کرے اور یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ جو کچھ میرے پاس ہے ویسا دوسرے کے پاس نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جو اموال اور اولاد ان کے پاس ہے تم ان پر خوش نہ ہو اور ان کے ساتھ اپنی رضا مندی ظاہر نہ کرو کہ یہ ایک طرح کا استدراج ہے، اس لیے کہ اللہ کی مراد تو یہ ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں معذب ہوں، مسلمان ان کے اموال لوٹیں، ان کی اولاد زبردستی پکڑ لیں، ان کو اس سے غم واندوہ حاصل ہو، کیونکہ یہ اشیا انھوں نے بڑی مشقت اور تکلیف سے جمع کی تھیں۔ اس کے برخلاف مومن کے مال اور اولاد اس کے حق میں دنیا کا عذاب نہیں ہوتے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہوں اور یہاں پر جو مصیبت مجھ پر آتی ہے اس پر مجھ کو ثواب ملے گا۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٢٩٥۔ ٢٩٧)

منافق سرے سے آخرت کا اعتقاد نہیں رکھتا اور نہ وہاں اجر کی امید رکھتا ہے تو جو تکلیف اور غم اس کو مال اور اولاد پر ہوتا ہے وہ اس کے لیے دنیا میں عذاب ہے۔ زہوق کہتے ہیں سختی سے جان کا نکلنا۔ یہاں اس سے مراد استدراج ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ﴾ [آل عمران: ۱۷۸] ''ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔'' امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ ہمیشہ اپنی نعمتیں ان پر جاری رکھے، یہاں تک کہ وہ کفر کی حالت پر مریں، اسی تمتع میں مشغول رہیں، عاقبت کی طرف نظر نہ کریں۔[1]

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ۝۵۶ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝۵۷

اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ بے شک وہ تم میں سے ہیں، حالاں کہ وہ تم میں سے نہیں، بلکہ وہ تو ڈرپوک لوگ ہیں (56) اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ یا غاریں یا کوئی اور گھس بیٹھنے کی جگہ پائیں تو اس کی طرف رسیاں تڑا کر ضرور بھاگ نکلیں (57)

منافقوں کی بزدلی اور جھوٹی قسمیں:

اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو ان کی جزع فزع اور ہلع (بے صبری) کی خبر دی کہ وہ قسم کھا کر آپ کو تم میں شامل کرتے ہیں، لیکن نفس الامر میں شامل نہیں ہیں، ان کا قسم کھانا مارے ڈر کے ہے، کیونکہ یہ کوئی جگہ بچاؤ کی قلعہ یا غار یا تہ خانہ زمین کے اندر نہیں پاتے کہ وہاں جا گھسیں اور تم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں، ان کا ملنا جلنا تم سے ناخوشی کے ساتھ ہے، نہ محبت کی راہ سے۔ یہ تو اپنی غرض وضرورت سے ملتے جلتے ہیں، اسی لیے ہمیشہ رنج وغم میں رہتے ہیں، کیونکہ عزت ونصرت ورفعتِ اسلام اور اہلِ اسلام روز افزوں دیکھتے ہیں، اسی لیے ان کو مسلمانوں کا نکلنا برا لگتا ہے، یہ نہیں چاہتے کہ ان کے ساتھ مخالطت کریں (ملیں) مگر مجبور ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ لوگ اس بات پر قسم کھاتے ہیں کہ وہ دین اسلام میں ہو کر رسول اللہ ﷺ کے فرماں بردار ہیں، حالانکہ ان کی یہ قسم صرف ظاہری طور پر ہے۔ باطن میں کچھ اور ہیں، ان کو ڈر ہے کہ کہیں ہم پر بھی وہی بلا نہ آئے جو مشرکوں پر آئی ہے کہ مارے گئے، پکڑے گئے، اس لیے تقیہ کے طور پر اسلام کا اظہار کرتے ہیں، حقیقت میں مسلمان نہیں ہیں۔ اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ ملے، جیسے: کوئی قلعہ، جزیرہ، پہاڑ کی چوٹی، کوئی غار، مغاک،

[1] الکشاف (۲/ ۲٦۸) فتح البیان (۵/ ۳۲۱۔ ۳۲۲)

سردابہ (سرد خانہ)، تہ خانہ، کہف یا کوئی اور جگہ ان کے علاوہ گھسنے کے لیے پائیں تو وہ جھپاٹے سے ادھر کو چل پڑیں، گو یہ چیزیں بدترین اور نہایت تنگ جگہیں ہیں۔ ان کا یہ بھاگنا مسلمانوں سے شدید قسم کی دشمنی کی وجہ سے ہے، تاکہ کسی مسلمان کی صورت نہ دیکھیں اور ان سے پوشیدہ رہیں۔[1]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ آپ پر صدقات (کی تقسیم) میں عیب جوئی کرتے ہیں، چناں چہ اگر انھیں اس میں سے کچھ دے دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر اس میں سے نہ دیا جائے تو وہ جھٹ ناراض ہو جاتے ہیں (58) اور (کیا ہی اچھا ہوتا) اگر وہ اس پر راضی رہتے، جو اللہ نے اور اس کے رسول نے انھیں دیا۔ اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی، بے شک ہم اللہ ہی کی طرف راغب ہیں (59)

رسول کی تقسیم پر اعتراض اور شانِ نزول:

یہ منافقین کی ایک دوسری قسم بتائی کہ وہ صدقات کی تقسیم پر طعنہ زن ہیں، رسول پر تہمت لگاتے ہیں، اگر ان کو ملے تو خوش، نہ ملے تو خفا ہیں۔ داود بن ابی عاصم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس صدقہ آیا تھا، آپ ﷺ نے اِدھر اُدھر بانٹ دیا، سب مال تقسیم ہو گیا۔ ایک انصاری مرد نے دیکھ کر کہا کہ یہ کچھ عدل نہ ہوا، اس پر یہ آیت آئی۔ (رواہ ابن جریر) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لَمز کے معنی ہیں طعن کے۔ ہم نے سنا ہے کہ ایک صحرائی مرد جو اعرابیت کے ساتھ تازہ تازہ تعلق رکھتا تھا، وہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ سونا چاندی تقسیم کر رہے تھے، اس نے کہا: اے محمد (ﷺ)! اگر اللہ نے تم کو عدل کا حکم دیا ہے تو تم نے کچھ عدل نہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: «وَيْلَكَ فَمَنْ ذَا يَعْدِلُ عَلَيْكَ بَعْدِيْ؟!»

پھر فرمایا: اس شخص سے بچو اور اس سے بھی جو اس طرح کا ہو۔ بے شک میری امت میں اس جیسے لوگ ہوں گے جو قرآن پڑھیں گے اور وہ ان کے گلے سے نیچے نہ اترے گا، وہ لوگ جب خروج کریں تو تم ان کو قتل کرو۔ تین بار یہی الفاظ فرمائے: «فَاِذَا خَرَجُوْا فَاقْتُلُوْهُمْ» ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ

[1] فتح البیان (۵/ ۳۲۳۔۳۲۴)

بِيَدِهِ مَا أُعْطِيكُمْ شَيْئًا أَمْنَعُكُمُوهُ إِنَّمَا أَنَا خَازِنٌ[1] یہ جو امام قتادہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی طرح ہے، جو صحیحین میں قصہ ذی الخویصرہ حرقوص نام سے آئی ہے، نبی اکرم ﷺ حنین کی غنیمتیں تقسیم کر رہے تھے، اس شخص نے کہا: ”اِعْدِلْ فَإِنَّكَ لَمْ تَعْدِلْ“ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ خِبْتُ وَخَسِرْتُ إِنْ لَمْ أَكُنْ أَعْدِلُ»

پھر جب وہ پیٹھ پھیر کر چلا گیا تو فرمایا: «إِنَّهُ يَخْرُجُ مِنْ ضِئْضِئِ هَذَا قَوْمٌ يَحْقِرُ أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ مَعَ صَلَاتِهِمْ وَصِيَامَهُ مَعَ صِيَامِهِمْ يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ مُرُوقَ السَّهْمِ مِنَ الرَّمِيَّةِ، فَأَيْنَمَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاقْتُلُوهُمْ فَإِنَّهُمْ شَرُّ قَتْلَىٰ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ... الحديث» یہ حدیث خوارج کے حق میں ہے، ان کو سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا، یہ لوگ جہنم کے کتے ہوں گے۔[2]

مسلمان کا رویہ:

اس کے بعد اللہ نے فرمایا کہ اگر یہ اللہ اور رسول کے عطیے پر راضی رہتے تو کیا اچھا ہوتا۔ اس آیت میں اللہ نے ادب عظیم اور سر شریف ذکر کیا ہے کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ آدمی صرف اللہ پر بھروسا کرے جو کچھ اللہ دے اس پر راضی رہے، حَسْبُنَا اللّٰهُ کہے۔ توفیقِ الٰہی اور اطاعتِ رسول میں راغب ہو۔ حکم بجا لائے اور نہی کو ترک کر دے، خبر کی تصدیق کرے، اثر کی پیروی بجا لائے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ”لَمز“ عیب لگانے کو کہتے ہیں۔ صدقات سے مراد زکات اور غنیمتیں ہیں، یعنی اگر خاطر خواہ ملا تو خوش، ورنہ ناخوش ہیں۔ یہ نفاق کی ایک قسم ہے۔ کاش یہ اللہ اور رسول کے عطیے پر راضی رہتے اور اللہ کو کافی سمجھ کر اس کی طرف راغب ہوتے۔ یہ آیت ذی الخویصرہ تمیمی کے حق میں اتری ہے، جس طرح کہ بخاری اور نسائی وغیرہما میں آیا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حنین کی غنیموں کی تقسیم کے وقت ایک آدمی نے کہا تھا: ”إِنَّ هَذِهِ الْقِسْمَةَ مَا أُرِيدَ بِهَا وَجْهُ اللّٰهِ“ میں نے نبی اکرم ﷺ سے ذکر کیا، فرمایا: «رَحِمَ اللّٰهُ مُوسَىٰ لَقَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هَذَا» پھر صبر کیا، اس پر یہ آیت آئی۔[4] والله أعلم.

إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِى

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٠٢) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ١٥٩) الدر المنثور (٤/ ٢١٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٢) فتح البيان (٥/ ٣٢٤۔ ٣٢٦)

سَبِيلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۶۰﴾

زکات تو صرف فقیروں اور مسکینوں اور ان اہلکاروں کے لیے ہے جو اس (کی وصولی) پر مقرر ہیں اور ان کے لیے جن کی دلداری مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے اور قرضہ داروں (کے قرض اتارنے) کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں، (یہ) اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے ⑥⓪

مصارفِ زکات:

جس کے پاس مال نہ ہو وہ مفلس ہے گو کہ حاجت چلی جائے، جیسے ہر روز کے محنتی اور محتاج وہ جس کی حاجت بند ہو اور زکات کے عامل مہینے کی تنخواہ پائیں خرچ کے مطابق۔ اور جن کا دل پرچاتا ہے وہ لوگ تھے کہ طمع پر مسلمان ہوئے تھے، لیکن قوم کے سردار تھے، ان کے طفیل سچے بھی مسلمان ہوئے، اب بعض علما ان کو نہیں گنتے[1] اور گردن چھڑانی، یعنی غلام کی آزادی یا قیدی کی رہائی اور قرض دار اگرچہ مالدار ہو اور قرض کے برابر مال نہ رکھتا ہو اور اللہ کی راہ، یعنی جہاد کا خرچ اور مسافر جو بے خرچ ہو، اگرچہ گھر میں سب موجود رکھے۔

اللہ نے منافقین کے اعتراض کے بعد یہ فرمایا کہ صدقات کی یہ تقسیم ہم نے مقرر کی ہے، ہم خود اس کے متولی ہوئے ہیں، کسی اور کے سپرد یہ تقسیم نہیں کی۔ پھر اس کا تجزیہ ان لوگوں کے لیے کیا جن کا ذکر آیتِ باب میں کیا ہے۔ زیاد بن حرث صدائی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، ایک مرد نے آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: مجھے صدقے میں سے کچھ دو، فرمایا: اللہ نے صدقات میں کسی نبی وغیرہ کا حکم پسند نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ خود ہی حکم دیا اور آٹھ حصے کیے، اگر تو ان آٹھ میں ہو تو میں تجھ کو دوں۔[2] ان آٹھ اقسام میں علما کا اختلاف ہے کہ آیا سب کو دیا جائے یا ان میں سے جو مل جائیں۔

یہ دونوں قول ہیں: ایک یہ کہ سب اقسام کو دینا چاہیے، امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تمام قسموں کا استیعاب کچھ واجب نہیں ہے، بلکہ ایک قسم کو دینا بھی جائز ہے، گو باقی اصناف موجود

---

① یہ احناف کا موقف ہے کہ اب مؤلفۃ القلوب پر زکات کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے، لیکن ان کی یہ رائے کسی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ اس مدّ پر خرچ کرنے کی ضرورت ہر وقت ہی رہے گی۔ آج بھی ہم غیر مسلم اقلیت (ہندو، عیسائی اور مرزائی وغیرہ) پر اس مد سے رقم خرچ کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کر سکتے ہیں یا ان میں سے اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ تعاون کر کے ان کو اسلام پر ثابت قدم رکھ سکتے ہیں۔ [ص۔ ی]

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٣٠) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن زیاد'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٢٠)

ہوں، مالک اور سلف و خلف کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ سیدنا عمر، حذیفہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام ابو العالیہ، سعید بن جبیر، میمون بن مہران رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: "وَهُوَ قَوْلُ عَامَّةِ أَهْلِ الْعِلْمِ"[1] اس بنیاد پر اس جگہ اصناف کا ذکر بیانِ مصرف کے لیے ہے نہ کہ استیعاب کے وجوب کے لیے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "وَلِوُجُوهِ الْحِجَاجِ وَالْمَآخِذِ مَكَانٌ غَيْرُ هَذَا" والله أعلم.[2]

فقیر اور مسکین کی تعریف:

فقرا کا ذکر دوسری قسموں سے پہلے اس لیے کیا ہے کہ یہ دوسروں کی نسبت زیادہ محتاج ہوتے ہیں، ان کو حاجت اور فاقہ کشی تک نوبت پہنچتی رہتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مسکین کا حال فقیر سے بدتر ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے بھی یوں ہی کہا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فقیر وہ نہیں ہے جو مال نہیں رکھتا، لیکن فقیر وہ ہے جو محنت اور مزدوری سے پیٹ پالتا ہے اور جنگ کرتا ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن بصری اور ابن زید رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ فقیر اس پارسا کو کہتے ہیں جو لوگوں سے کچھ نہیں مانگتا اور مسکین وہ شخص ہے جو سوال کرتا ہے اور گدائی پیشہ کرتا ہے، پھرتا رہتا ہے، لوگوں کے پیچھے پڑ کر بھیک مانگتا ہے۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ اور کئی ایک نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فقیر وہ ہے جو دکھیارا، بیمار ہو، مسکین وہ ہے جو صحیح سالم ہو۔ ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد فقرائے مہاجرین ہیں۔ امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی اعراب کو اس میں سے کچھ نہ دے، یہی سعید بن جبیر اور سعید بن عبدالرحمان رحمہما اللہ کا قول ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم فقرائے مسلمین کو مساکین نہ کہو۔ مساکین تو اہلِ کتاب ہیں۔[6]

اب وہ حدیثیں سنو جو آٹھ قسموں کے بارے میں آئی ہیں، تو فقرا، سو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے: «لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلَا لِذِي مِرَّةٍ سَوِيٍّ»[7] (رواه أحمد و أبو داود والترمذي ولأحمد أيضا والنسائي وابن ماجة عن أبي هريرة مثله) عبیداللہ بن عدی کہتے ہیں کہ دو لوگوں نے ان سے ذکر کیا کہ ہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ مانگنے کے لیے گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو غور کی نظر سے دیکھا اور مضبوط پا کر فرمایا کہ اگر تم چاہو تو میں تم کو دوں، لیکن اس میں غنی اور مضبوط اور کمانے والے کے لیے کچھ حق نہیں ہے۔[8] (رواه أحمد وأبو داود والنسائي بإسناد جيد قوي)

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٣٢٢ـ ٣٢٣) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٧٨) [3] تفسير الطبري (١٤/ ٣٠٨)

[4] تفسير الطبري (١٤/ ٣٠٥ـ ٣٠٥) [5] تفسير الطبري (١٤/ ٣٠٨ـ ٣٠٩) [6] تفسير الطبري (١٤/ ٣٠٦ـ ٣٠٨)

[7] مسند أحمد (٢/ ١٦٤ـ ٣٧٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٥١)

[8] مسند أحمد (٤/ ٢٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٣٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٣/ ٣٨١)

رہے مساکین، سو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: «لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ بِهٰذَا الطَّوَافِ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ فَتَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، قَالُوْا: فَمَا الْمِسْكِيْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ وَلَا يُفْطَنُ لَهُ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ وَلَا يَسْأَلُ النَّاسَ شَيْئًا» (رواہ الشیخان) یعنی مسکین یہ پھرنے والا نہیں جو ایک یا دو لقمے، ایک یا دو کھجور مانگتا ہے، بلکہ وہ ہے جو بقدرِ حاجت نہیں پاتا اور نہ کوئی اس کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے اور نہ وہ خود بھیک مانگتا ہے۔[1]

وصولی کرنے والے:

عاملین سے مراد جباۃ اور سعاۃ ہیں جو صدقات اکٹھے کرتے ہیں، اس میں سے کچھ ان کو بھی دیا جاتا ہے، لیکن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا کو دینا جائز نہیں، جن پر صدقہ حرام ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں عبدالمطلب بن ربیعہ اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا کہ ہم کو صدقہ اکٹھا کرنے پر عامل مقرر کر دیں، فرمایا: صدقہ محمد اور آلِ محمد پر حلال نہیں ہے، یہ تو لوگوں کا میل کچیل ہے۔[2]

مولفۃ القلوب:

رہے مؤلفۃ القلوب، سو وہ کئی قسم کے ہوتے ہیں، کسی کو مسلمان ہونے کے لیے دیا جاتا ہے، جس طرح کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ کو حنین کی غنیموں میں سے دیا تھا، حالانکہ وہ حنین میں بحالتِ شرک حاضر ہوئے تھے۔ صفوان کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مجھ کو دیتے رہے، یہاں تک کہ آپ مجھے تمام لوگوں میں سے سب سے زیادہ محبوب ہو گئے، جب کہ اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں میرے نزدیک سب سے بڑے دشمن ہوا کرتے تھے۔ سعید بن مسیب نے صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: "أَعْطَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَوْمَ حُنَيْنٍ وَأَنَّهُ لَأَبْغَضُ النَّاسِ إِلَيَّ فَمَا زَالَ يُعْطِيْنِيْ حَتّٰى أَنَّهُ لَأَحَبُّ النَّاسِ إِلَيَّ"[3] (رواہ أحمد ورواہ مسلم والترمذي) اور کسی کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس کا اسلام اچھا ہو جائے اور دل ثابت رہے۔ چنانچہ حنین کے دن بڑے بڑے سرداروں اور اشراف میں سے جو طلقا تھے، ان کو ایک ایک سو اونٹ دیے اور فرمایا: «إِنِّيْ لَأُعْطِي الرَّجُلَ وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ خَشْيَةَ أَنْ يَكُبَّهُ اللّٰهُ عَلٰى وَجْهِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ»[4]

صحیحین میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے یمن سے کچھ سونا مع خاک کے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٤٠٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٣٩) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٧٢)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣١٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٦٦٦) مسند أحمد (٦/ ٤٦٥)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٠)

بھیجا، نبیِ اکرم ﷺ نے اس کو چار لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا: اقرع بن حابس، عیینہ بن بدر، علقمہ بن علاثہ، زید الخیل رضی اللہ عنہم [1] اور کسی کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس جیسے لوگوں کے مسلمان ہونے کی امید کی جاتی ہے اور کسی کو اس لیے دیا جاتا ہے کہ آس پاس والوں سے صدقہ اکٹھا کرے یا حوزۂ مسلمین اور ارد گرد کے علاقوں سے ضرر کو دور کر دے۔ اس کی تفصیل کی جگہ کتب الفروع ہیں۔ واللہ أعلم.

عہدِ رسالت کے بعد مؤلفۃ القلوب کا حکم:

رہی یہ بات کہ نبیِ اکرم ﷺ کے بعد بھی مؤلفۃ القلوب علی الاسلام کو دینا چاہیے یا نہیں، سو اس میں علما کا اختلاف ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور شعبی رحمہ اللہ اور ایک جماعت سے روایت ہے کہ نہیں دینا چاہیے،[2] اس لیے کہ اللہ نے اسلام اور اہلِ اسلام کو عزت بخشی اور شہروں پر متمکن کیا (حاکم کیا) اور لوگوں کی گردنوں کو مسلمین کے واسطے ذلیل کر دیا۔ دوسروں نے کہا: بلکہ دینا چاہیے، اس لیے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو فتح مکہ اور ہوازن کی کمر توڑ دینے کے بعد دیا ہے اور یہ ایسا امر ہے جس کی ضرورت ہے، لہٰذا ان پر خرچ کرنا مناسب ہے، لیکن رقاب کے بارے میں حسن بصری، مقاتل بن حیان، عمر بن عبدالعزیز، سعید بن جبیر، نخعی، زہری اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ رقاب سے مراد مکاتبین ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، یہی امام شافعی اور لیث رحمہما اللہ کا قول ہے۔

گردنیں چھڑانا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گردنوں کو آزاد کرنے کے لیے زکات میں سے خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ یہی امام احمد، مالک اور اسحاق رحمہم اللہ کا مذہب ہے،[3] یعنی رقاب عام تر ہے اس سے کہ مکاتب کو دے یا کوئی لونڈی غلام خرید کر مستقل طور سے آزاد کر دے۔ اِعتاق اور فک رقبہ (لونڈی غلام آزاد کرنا) کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں اور اللہ آزاد کیے جانے والے کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کا ہر عضو دوزخ کی آگ سے آزاد کرتا ہے، یہاں تک کہ شرم گاہ عوض شرم گاہ کے۔ یہ اس لیے ہے کہ جزا جنسِ عمل سے ہوتی ہے۔ ﴿وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ٣٩] ''تمھیں بس اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو تم عمل کرتے تھے۔'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ پر حق ہے تین شخصوں کا کہ ان کی مدد کرے: ایک اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، دوسرا مکاتب، جو معاہدے کی رقم ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور تیسرا پارسائی کے ارادے سے نکاح کرنے والا۔[4] (رواه أحمد وأهل السنن إلا أبا داود)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٣١٥)

[3] تفسير الطبري (١٤/ ٣١٦۔ ٣١٧) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٢٣۔ ١٨٢٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٧٩۔ ٤٨٠)

[4] مسند أحمد (٢/ ٢٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٥٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٥٠)

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے وہ کام بتائیں جو مجھ کو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے۔ فرمایا: جان آزاد کر، گردن چھڑا، اس نے کہا: کیا یہ دونوں کام ایک نہیں ہیں؟ فرمایا: نہیں: عِتق نسمة یہ ہے کہ تُو اس کو آزاد کرے، فك رقبة یہ ہے کہ تُو اس کی قیمت میں مدد کرے۔[1]

غارمین:

اب رہے غارمین سو وہ کئی طرح کے ہیں: ایک وہ جو حامل حمالہ ہیں، یا ضامنِ قرض جو اس کے ذمے پر لازم ہوا ہے، مال کم پڑ گیا یا قرض کے ادا کرنے میں تاوان آیا، یا کسی معصیت میں پھر اس سے توبہ کر لے تو ایسے لوگوں کو دینا چاہیے۔ اصل اس بارے میں وہ حدیث ہے جو قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے۔ کہا: مجھ پر حمالہ تھا، میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ سوال کروں، فرمایا: ٹھہر، یہاں تک کہ صدقہ آئے، پھر ہم تجھ کو دلوا دیں گے۔ پھر فرمایا: اے قبیصہ! مسئلہ، یعنی سوال کرنا حلال نہیں، مگر تین میں سے ایک شخص کو: ایک وہ شخص جو حامل حمالہ (کسی کی ضمانت اٹھانے والا) ہے، اس کو سوال کرنا حلال ہے، یہاں تک کہ وہ حمالہ کے برابر پا لے پھر رک جائے۔ دوسرا وہ شخص کہ اس کو کوئی آفت پہنچے، اس کا مال برباد ہو گیا، اس کو سوال کرنا حلال ہے، یہاں تک کہ زندگی قائم رکھنے کے برابر پا لے اور تیسرا وہ شخص کہ اس کو فاقہ پہنچا ہے تو اس کو بھی سوال کرنا حلال ہے، یہاں تک کہ زندگی قائم رکھنے کے برابر پا لے۔ اس کے سوا جو سوال کرنا ہے وہ سُحت یعنی حرام ہے۔ اس کو مانگنے والا حرام کے طور پر کھاتا ہے۔[2] (رواہ مسلم)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص کو ان پھلوں کے بارے میں آفت پہنچی جو اس نے خریدے تھے، اس کا قرض بہت ہو گیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا: لے لو جو تم پاؤ، تمھارے لیے بس اسی قدر ہے۔[3] (رواہ مسلم) سیدنا عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ قرض دار کو قیامت کے دن بلائے گا اور اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھے گا: اے ابن آدم! تُو نے یہ قرض کس لیے لیا اور لوگوں کے حق کس کام میں ضائع کیے، وہ کہے گا: اے رب! تُو جانتا ہے کہ میں نے یہ قرض لیا، نہ کھایا، نہ پیا، نہ ضائع کیا، لیکن میرے ہاتھ پر حرق (جلانے والی کوئی چیز) آیا یا سرق (چوری ہو گیا) یا وضیعہ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندے نے سچ کہا، میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ آج تیری طرف سے اس کو ادا کر دوں۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک شے کو طلب فرما کر اس کے پلۂ ترازو میں رکھ دے گا، اس وقت اس کی حسنات کا پلڑا سیئات پر بھاری ہو جائے گا، اللہ کے فضل و رحمت سے وہ جنت میں داخل ہو گا۔[4] (رواہ أحمد)

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٩٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجالہ ثقات" (مجمع الزوائد: ٤/ ٤٣٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٤) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٥٦)

[4] مسند أحمد (١/ ١٩٧) اس کی سند میں "قیس بن زید" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٣٣٨)

فی سبیل اللہ اور ابنِ سبیل:

سبیل اللہ سے مراد غازی ہیں جن کا کوئی حق دیوان میں نہیں ہے۔ امام احمد، حسن اور اسحاق رحمہ اللہ کے نزدیک حدیث کی دلیل سے حج بھی اللہ کی راہ میں داخل ہے۔[1] اسی طرح ابن السبیل سے مراد مسافر ہے جو کسی شہر میں گیا ہے، اس کے پاس کچھ نہیں جس سے اپنے سفر پر مدد لے، اس کو صدقات میں سے بقدرِ کفایت دینا چاہیے کہ وہ اپنے شہر میں پہنچ جائے، اگرچہ گھر میں اس کے پاس مال ہو۔ اسی طرح جو شخص اپنے شہر سے سفر کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو اس کو مالِ زکات میں سے اتنا دینا چاہیے کہ اُس کی آمد و رفت کے خرچ کے لیے کافی ہو۔ اس پر دلیل آیتِ باب ہے۔

سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا کہ غنی کو صدقہ دینا حلال نہیں ہے مگر پانچ قسم کے غنی کو: ایک وہ جو صدقات وصول کرنے پر عامل ہے، دوسرا وہ شخص جس نے صدقے کو اپنے مال سے خریدا ہے، تیسرا قرض دار، چوتھا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا یا مسکین جس پر صدقہ کیا گیا اور اس نے وہ صدقہ بطور ہدیہ کسی غنی کو بھیجا۔[2] (رواه أبو داود وابن ماجة) اس حدیث کے دوسرے مرفوع الفاظ یہ ہیں: «لَا تَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ إِلَّا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ أَوْ جَارٍ فَقِيْرٍ يُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ فَيُهْدِيْ لَكَ أَوْ يَدْعُوْكَ»[3] یہ تین شخص ہوئے اور پہلی حدیث میں پانچ شخص ہیں۔ اللہ نے صدقات کی یہ تقسیم فرض کی ہے۔ وہ ظاہر اور باطن کے امور خوب جانتا ہے، بندوں کی مصلحتوں کو بھی خوب جانتا ہے اور اپنے قول و فعل و شرع میں حکمت والا ہے۔ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ حرف إِنَّمَا حصر کے واسطے ہیں، یعنی ان سب کو شامل کرنے کے لیے ہے اور صدقات کی تعریف جنس کے واسطے، یعنی ان صدقات کو ان آٹھ قسم کے مستحقین میں ہی تقسیم کرتے ہیں، ان سے تجاوز نہیں کرتے۔ بلکہ یہ خاص انہی کے لیے ہیں نہ کہ غیر کے لیے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے کچھ تعلق نہیں اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خود ان میں سے کچھ لیا ہے۔ فقیر و مسکین کے درمیان فرق کرنے کے سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں۔ مسکین کی کیفیت کے بارے میں سب سے اچھا بیان حدیث: "تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ" ہے[4] جو اوپر گزر چکی ہے۔

عاملین وہ ہیں جن کو امام نے زکات لینے کے لیے بھیجا ہے، وہ ایک قسط کے مستحق ہیں، مقدار میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا: بقدرِ ثمن۔ امام مجاہد اور شافعی رحمہ اللہ سے یہی مروی ہے۔ بعض نے کہا: بقدرِ اجرِ عمل۔ یہ ابوحنیفہ اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٨٩۔ ١٩٩٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٥٠)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٣٧) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ گزشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٩)

اصحابِ ابوحنیفہ سے مروی ہے،[1] لیکن اس کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ ان کے لیے کچھ حصہ صدقہ سے ہے تو پھر اس سے ان کا ممنوع ہونا کیوں ہو گا کہ صدقے میں سے نہ دیا جائے اور غیر صدقہ سے دیا جائے۔

رہی یہ بات کہ ہاشمی عامل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تو ہر طرف ایک جماعت گئی ہے، بعض نے کہا ہے کہ غیر صدقہ سے ان کو دے اور عامل صرف ساعی جابی ہی نہیں ہوتا، بلکہ تقسیم کرنے والا، لکھنے والا، اکٹھا کرنے والا، عریف (حساب کتاب رکھنے والا) سب عاملین میں داخل ہیں۔ مؤلفۃ القلوب اسلام کے ابتدائی زمانے میں تھے۔ نبیِ اکرم ﷺ جو کفار قہر اور تلوار سے اسلام میں داخل نہ ہوتے، بلکہ عطا سے اسلام قبول کرتے، ان کو دیتے تھے یا وہ لوگ مراد ہیں جو ظاہر میں مسلمان ہو گئے مگر اچھی طرح اسلام نہ لائے۔ نبیِ اکرم ﷺ ان کی دل جوئی کے لیے ان کو دیتے۔ یا وہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو اسلام لاتے تھے یا مشرکین کے بڑے لوگوں کی ایک جماعت تھی کہ ان کے اَتباع (پیروکار) ہوتے تھے، ان کو اس لیے دیا جاتا تھا کہ ان کے اتباع اسلام لائیں۔ نبیِ اکرم ﷺ نے ایک ایسی جماعت کو بھی دیا ہے جو ظاہر میں مسلمان ہو گئے تھے، ایک ایک کو سو سو اونٹ عطا کیے۔

اصحاب الرائے کا مذہب یہ ہے کہ یہ صنف اب باقی نہیں رہی، لیکن آیت کے ظاہری الفاظ کے مطابق اس قسم کا حصہ باقی ہے، یہی امام شافعی کا قول ہے۔ پہلے قول کے مطابق ان کا حصہ باقی سب حصوں پر خرچ کیا جائے گا۔ مؤلفین میں اگرچہ وہ کفار بھی شامل ہیں جن کے شر اور فساد کا ڈر ہے، اگر ان کو دیا جائے تو ان کا شر دور ہو، لیکن مؤلفین ایسے لوگوں کو زکات یا غیر زکات سے نہ دینا چاہیے، اس پر اتفاق ہے۔ تفصیل اس مقام کی جمل میں ہے۔

رقاب سے مراد مکاتیب ہے یا بردہ (غلام) خرید کر آزاد کرنا، آیت دونوں کو شامل ہے۔

غارمین سے مراد قرض دار ہیں، جن پر قرض سوار ہے اور ادا کرنے کے لیے کچھ نہیں، ان کو دینے میں کچھ اختلاف نہیں ہے، ہاں جس نے اپنی بے وقوفی سے قرض لیا ہے اس کو نہ دے، زکات سے نہ غیر زکات سے، مگر اس صورت میں کہ وہ توبہ کر لے، نبیِ اکرم ﷺ نے حامل حمالہ (قرض دار کا ضامن) کی اعانت کی ہے اور لوگوں کو اس کی اعانت کے لیے ارشاد فرمایا ہے۔[2] امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصلاح ذات البین کے لیے بھی دے، اگرچہ وہ تونگر ہوں،[3] جبکہ وہ اس کام کے لیے قرض خواہ ہوں۔

سبیل اللہ سے مراد غازی مرابط ہیں، گو غنی ہوں۔ اکثر علما کا یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے ہیں۔ امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ نے حج کو سبیل اللہ میں داخل کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ غازی کو اس وقت دے جب وہ فقیر منقطع ہو۔[4] بعض نے کہا ہے کہ سبیل اللہ کا

---

[1] فتح القدير (٢/ ٥٣١) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٤)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٢٥٠) [4] فتح القدير (٢/ ٥٣٢)

لفظ عام ہے اس کو کسی خاص قسم ہی پر لاگو کرنا درست نہیں ہے، بلکہ خیر کی تمام وجوہ اس میں داخل ہیں، جیسے: مُردوں کی تکفین، پل، قلعہ اور مسجد وغیرہ کی تعمیر اور اس قسم کے اور کام، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ جمہور کا اجماع اسی پر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں غازی مرابط میسر نہیں آتے، البتہ حاجی اور عمار (عمرہ کرنے والے) بہت ملتے ہیں، ان کے سوا طالب علم اور خیرات کے اور وجوہ کثرت سے پیش آتے ہیں، اس صورت میں سبیل اللہ کے لفظ کو عام رکھنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے جو غیر ملک میں منقطع ہو گیا ہے، گو اپنے گھر میں آسودہ ہو اور اس کو کوئی قرض دینے والا بھی مل سکتا ہو، لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر قرض دہندہ ملتا ہے تو پھر اس کو نہ دے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مہمان ہے۔[1] فقہائے عراق نے کہا ہے کہ حاجی ہے جو سفر میں منقطع ہو گیا ہے، یعنی خرچ کے نہ ہونے کی وجہ سے عاجز اور حیران ہے، لیکن پہلی تاویل زیادہ بہتر ہے۔

یہ حکم کہ صدقات صرف انھی آٹھ اقسام ہی میں محدود ہیں لازمی حکم ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے اور ان اصناف سے تجاوز کرنے کو منع فرمایا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صدقات کا ان کے سوا اور لوگوں میں خرچ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی ان قسموں میں سے کسی قسم پر خرچ کرنے سے منع کرنا درست ہے۔ جب یہ اصناف مقرر ہو گئیں اور موجود ہوں تو امام سب پر اور یکساں و برابر تقسیم کرے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بعض قسم کو بعض پر فضیلت دے۔[2] ظاہر آیت اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ تمام قسموں کو تقسیم میں شامل کرنا چاہیے، اس کی تمام بحث تفسیر جمل میں ہے۔[3]

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾

اور ان (منافقوں) میں سے بعض وہ ہیں جو نبی کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ (تو صرف) کان ہے۔ (ہر ایک کی سن اور مان لیتا ہے) آپ کہہ دیجیے: وہ تمھارے لیے خیر کا کان ہے، وہ اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مومنوں (کی باتوں) پر یقین رکھتا ہے، اور تم میں سے جو ایمان لائے، ان کے لیے رحمت ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے (61)

منافقوں کی علامات رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینا:

منافق نبیِ اکرم ﷺ کو طعن کرتے کہ یہ شخص کان ہی رکھتا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ اپنے وقار کی خاطر جھوٹے کا

---

[1] تفسیر الطبري (۱۴/ ۳۲۱) [2] تفسیر الجلالین (۱/ ۲۵۰) [3] فتح البیان (۵/ ۳۲۷۔ ۳۳۲)

جھوٹ پہچانتے تو بھی نہ پکڑتے اور اس سے تغافل برتتے۔ وہ بے وقوف سمجھتے کہ انھوں نے سمجھا نہیں۔ سو اللہ نے فرمایا کہ نبی کی یہ عادت تمھارے حق میں بہتر ہے، نہیں تو اول وہلے میں ہی تم پکڑے جاؤ۔ اللہ نے فرمایا کہ تمام منافقین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو نبیِ اکرم ﷺ کو ایذا دیتے ہیں، ان کے حق میں کلام کرتے ہیں کہ یہ تو نرے کان ہیں جو کوئی ان سے کچھ بات کہہ دیتا ہے اس کو ہمارے حق میں سچ جان لیتے ہیں، پھر جب ہم آ کر قسم کھاتے ہیں تو ہم کو سچا جانتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔[1]

اللہ نے کہا کہ وہ تو گوش حق نیوش ہیں، سچے کو جھوٹے سے خوب پہچانتے ہیں، مومنوں کی تصدیق کرنے والے اور کافروں پر حجت ہیں۔ اب جو کوئی ان کو ستائے گا، اس کو عذاب دیا جائے گا۔ یعنی یہ بات نہیں کہ وہ سچے اور جھوٹے کی تمیز نہیں رکھتے، بلکہ ان کا جھوٹ سے چشم پوشی کرنا اور تغافل برتنا عزت و وقار کے طور پر ہے۔ یہ منافقین کی فضیحت کی ایک دوسری قسم تھی جو اس جگہ مذکور ہوئی۔ ان کا نبیِ اکرم ﷺ کو کان کا کچا کہنا مذمت اور طعن کے طور پر تھا، وہ آپ ﷺ کے متعلق زبان درازی کرتے، جب اس کی خبر نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچتی تو حاضر ہو کر عذر پیش کرتے، آپ ﷺ ان کے عذر کو کمال خوش خوئی سے قبول فرماتے اور یہ سمجھتے کہ آپ ﷺ صحیح اور باطل میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ آپ ﷺ کے علم اور درگزر پر دھوکا کھا کر آپ ﷺ کا نام کان رکھا تھا، اللہ نے جواب دیا کہ ہاں کان ہیں، لیکن خیر کے کان ہیں، نہ کہ شر کے کان۔ جو لوگ ایمان دار ہو کر اخلاصِ ایمان سے کوئی بات کہتے ہیں تو بے شک ان کی بات قبول کرتے اور ان سے خوش ہوتے ہیں۔ منافقوں کی بات کو نہیں مانتے، یہ اہلِ نفاق کے حق میں رحمت ہے، کیونکہ ان کا پردہ فاش نہیں ہوتا۔ مگر ان منافقوں کو جو ایسی باتیں کر کے نبی کریم ﷺ کو ایذا دیتے ہیں، دردناک عذاب ہوگا۔

شانِ نزول:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبتل بن حارث نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آتا، بیٹھ کر باتیں سنتا، پھر آپ ﷺ کی بات چیت منافقوں سے جا کر بیان کرتا، اسی نے تو ان سے کہا تھا کہ محمد ﷺ نرے کان ہیں جو کوئی ان سے کچھ کہہ دیتا ہے وہ اس کی تصدیق کرتے ہیں، اس پر یہ آیت اتری۔[2] عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت میرے حق میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ عمیر اہلِ مدینہ کی باتیں سن کر نبیِ اکرم ﷺ کے پاس سرگوشی کرتے اور چپکے سے خبر کر دیتے، ان لوگوں کو عمیر کی وجہ سے ایذا ہوتی، ان کا نبیِ اکرم ﷺ کے پاس بیٹھنا ناپسند کرتے اور کہتے وہ تو کان ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی کہ ہاں کانِ خیر ہیں، نہ کہ کانِ شر۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٣٢٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٢٦) الدر المنثور (٤/ ٢٢٧)

[3] مسند الشاميين للطبراني (٣/ ٣٨٦)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ
اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝٦٢ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ
مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ
خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝٦٣

(اے مسلمانو!) وہ (منافقین) تمھارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تمھیں راضی رکھیں، حالاں کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ وہ انھیں راضی رکھیں، اگر یہ لوگ مومن ہیں (62) کیا انھیں معلوم نہیں ہوا کہ بے شک جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو بلاشبہ اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، یہ بہت بڑی رسوائی ہے (63)

جھوٹی قسم کھا کر لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش:

کسی وقت نبیِ اکرم ﷺ ان کی دغا بازی پکڑتے تو مسلمانوں کے روبرو قسمیں کھاتے کہ ہمارے دل میں بری نیت نہ تھی، تاکہ انھیں راضی کر کے اپنی طرف کریں، یہ نہیں جانتے تھے کہ اس قسم کی فریب بازی اللہ اور رسول کے ساتھ نہیں چلتی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک منافق نے کہا تھا: واللہ! یہ لوگ ہمارے بہترین اور بزرگ لوگ ہیں اور محمد ﷺ جو کچھ کہتے ہیں گو وہ حق ہو مگر وہ گدھوں سے بدتر ہیں۔ ایک مسلمان نے سن کر کہا: واللہ! محمد ﷺ جو کچھ کہتے ہیں وہ حق ہے اور تو گدھے سے بھی بدتر ہے۔ یہ خبر نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچی، آپ ﷺ نے اس منافق کو بلایا اور کہا تو نے یہ بات کس لیے کہی تھی، وہ قسم کھانے لگا کہ میں نے ہرگز یہ بات نہیں کہی۔ مسلمان نے کہا: اے اللہ! سچے کو سچا اور جھوٹے کو جھوٹا کر دے، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری اور کہا کہ اللہ اور رسول کا مخالف آگ میں ہمیشہ رہنے والا ہو گا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ منافقین اپنی خلوتوں میں مومنوں پر اور نبیِ اکرم ﷺ پر طعن کرتے، جب وہ بات نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچتی تو آ کر قسمیں کھاتے کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی ہے، اپنے قول سے مکر جاتے، یہ اس لیے کہ نبیِ اکرم ﷺ اور مومنوں کو راضی رکھیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جھوٹی قسموں سے ان کو خوش کر دینا کچھ بات نہیں، اگر اللہ سے ڈر کر نفاق چھوڑتے تو مومن ہو جاتے، کیا ان منافقوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو کوئی اللہ اور رسول سے مخالفت اور مخاصمت کرتا ہے اس کا انجام جہنم کی آگ ہے، یہ بہت بڑی رسوائی ہے کہ ہمیشہ کے لیے آگ میں گیا۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٢٩۔ ٣٣٠) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] فتح البیان (٥/ ٣٣٤۔ ٣٣٦)

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

منافقین (اس بات سے) ڈرتے ہیں کہ ان (مسلمانوں) پر کوئی سورت نازل کر دی جائے جو انھیں (ہر بات) بتا دے، جو ان (منافقوں) کے دلوں میں ہے۔ کہہ دیجیے: تم مذاق کرتے رہو، بے شک اللہ وہ باتیں ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈرتے ہو﴿64﴾

راز کھل جانے کا ڈر:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپس میں باتیں کرتے پھرتے، کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا بھید فاش نہ کر دے۔[1] یہ آیت اس آیت کی شبیہ ہے: ﴿ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [المجادلة: ٨] ”اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس (کلمے) کے ساتھ سلام کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے ساتھ آپ کو (کبھی) سلام نہیں کہا، اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں: اللہ ہمیں اس کی وجہ سے کیوں عذاب نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں؟ ان کے لیے جہنم کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے۔“

نیز اس آیت میں یوں کہا ہے کہ تم ٹھٹھا کیے جاؤ، قریب ہے کہ اللہ اپنے رسول پر وہ سورت اتارے جو تم کو رسوا کر دے گی اور تمھارا حال کھول دے گی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ﴾ [محمد: ٢٩۔ ٣٠] ”کیا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں روگ ہے، یہ سمجھ رکھا ہے کہ اللہ ان کے کینے ہرگز ظاہر نہیں کرے گا۔ اور اگر ہم چاہتے تو یقیناً آپ کو وہ (منافق) دکھا دیتے، پھر آپ انھیں ان کے چہرے کی علامتوں سے ضرور پہچان لیتے، اور یقیناً آپ انھیں گفتگو کے لب و لہجے سے پہچان لیں گے۔“ اسی لیے امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت کا نام فاضحہ (رسوا کرنے والی) ہے، یہ منافقوں کو فضیحت (رسوا) کرتی ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ منافق سورت کے نزول سے ڈرتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کو حکم ہے کہ وہ اس سے ڈریں۔ سورت کے جتانے سے یہ مراد ہے کہ مسلمانوں کو ان کے دلوں کے حال کی اطلاع دی جائے، سو اللہ بغیر اطلاع دیے نہ رہے گا، جس بات کا ان کو ڈر ہے وہ ظاہر ہو گی، خواہ اللہ خبر کر دے یا رسول بتا دے۔[3]

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٣٣١) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٣٣٢) [3] فتح البيان (٥/ ٣٣٧)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور البتہ اگر آپ ان سے پوچھیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو صرف شغل کے طور پر باتیں اور دل لگی کرتے تھے۔ کہہ دیجیے: کیا تم اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے؟ (65) (اب) بہانے مت بناؤ، یقیناً تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تو دوسرے گروہ کو اس وجہ سے عذاب دیں گے کہ وہ مجرم تھے (66)

بہانے بازی، جھوٹی عذرخواہی اور دین کو مذاق بنانا:

جو کوئی دین کی باتوں میں ٹھٹھا کرے، اگرچہ دل سے منکر نہ ہو تو وہ کافر ہوا، نہیں تو منافق البتہ ضرور ہوا۔ دین کی بات میں ظاہر و باطن با ادب رہنا ضروری ہے۔ محمد بن کعب قرظی وغیرہ نے کہا ہے کہ ایک مردِ منافق نے کہا تھا کہ ہم نہیں دیکھتے ان قاریوں کو مگر یہ بڑے پیٹ کے راغب اور زبان کے بڑے جھوٹے اور لڑائی میں بڑے نامرد ہیں۔ یہ بات نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچی، آپ ﷺ اس پر اونٹنی پر سوار ہو کر روانہ ہو رہے تھے۔ اتنے میں وہ آدمی آیا اور اس نے کہا اللہ کے رسول! ہم تو خوض ولعب کرتے تھے، یعنی گپ شپ تھی، کچھ یہ بات ہم نے حقیقتاً نہیں کہی تھی، اس کے پاؤں پتھر سے ٹھوکر کھاتے تھے، نبیِ اکرم ﷺ نے اس کی طرف توجہ نہ کی، وہ آپ ﷺ کی تلوار سے لٹک گیا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص نے غزوۂ تبوک میں مجلس میں کہا: "مَا رَأَيْتُ مِثْلَ قُرَّاءِنَا أَرْغَبُ بُطُونًا، وَلَا أَكْذَبَ أَلْسِنًا وَلَا أَجْبَنَ عِنْدَ اللِّقَاءِ" ایک شخص نے مسجد میں کہا: تو جھوٹا ہے اور منافق ہے۔ میں نبیِ اکرم ﷺ کو اس بات کی خبر کر دوں گا۔ یہ بات نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچی، قرآن نازل ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے اس کو دیکھا وہ آپ ﷺ کے ناقہ کو پکڑے تھا، پتھر کی ٹھوکریں کھاتا تھا اور چلتے چلتے کہتا تھا: "يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ" اور نبیِ اکرم ﷺ فرماتے تھے: ﴿ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾[2] (آیتِ باب)

ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقوں کی ایک جماعت تھی، ان میں ودیعہ بن ثابت برادر بنی امیہ بن زید اور ایک آدمی قبیلہ اشجع حلیف سلمہ جحش بن حمیر نام کا تھا۔ یہ نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ تبوک کو گئے تھے۔ بعض نے بعض

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٣٥) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٣٣۔ ٣٣٤) اس کی سند صحیح ہے۔

سے کہا: کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ بنی الاصفر کی لڑائی ایسی ہے جیسی لڑائی بعض عرب کی بعض کے ساتھ ہے، واللہ! گویا میں تم کو دیکھتا ہوں کہ کل تم لوگ رسیوں میں جکڑے ہوئے ہو گے، یہ بات مسلمانوں کو ڈرانے اور بزدل کرنے کے لیے کہی تھی۔ جحش بن عمیر نے کہا: واللہ! میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر اس پر صلح ہو کہ ہم میں سے ہر مرد کو سو سو کوڑے مارے جائیں تو یہ بہت اچھا ہے اس بات سے کہ ہم لوٹیں تو ہمارے حق میں تمھاری اس گفتگو پر قرآن نازل ہو۔

نبیِ اکرم ﷺ نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ قوم کی خبر لے کہ وہ جل گئی اور ان سے پوچھ کہ انھوں نے کیا کہا؟ اگر انکار کریں تو کہہ کہ تم نے یہ یہ کہا ہے؟ عمار گئے اور ان سے یہ بات کہی، وہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آ کر عذر کرنے لگے۔ ودیعہ بن ثابت نے کہا اور نبیِ اکرم ﷺ سواری پر کھڑے تھے اور وہ حقب راحلہ کو پکڑے ہوئے تھے، اے اللہ کے رسول! ہم تو کھیل اور مذاق کر رہے تھے۔ جحش بن حمیر نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ کو میرا نام اور میرے باپ کا نام لے بیٹھا، اللہ نے جحش کو معاف فرمایا، اس کا نام عبد الرحمان ٹھہرا۔ جحش نے اللہ سے دعا کی کہ اس کو ایسی جگہ شہید کر دے کہ کوئی وہ جگہ نہ جانے۔ چنانچہ یمامہ کے دن وہ مارے گئے اور ان کا کچھ پتا نہ چلا۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ غزوۂ تبوک کو جاتے تھے، آپ ﷺ کے سامنے کچھ منافق بھی چل رہے تھے، انھوں نے کہا: یہ شخص گمان کرتا ہے کہ روم کے محل اور قلعے فتح کر لے گا، افسوس ہے! افسوس ہے! اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو ان کی گفتگو سے مطلع کر دیا اور فرمایا ان کو حاضر کرو، وہ آئے، فرمایا: تم نے یہ بات کہی ہے؟ وہ کہنے لگے: ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے، یعنی یہ ذکر بطور ہزل تھا، نہ بطریق جد (حقیقت) امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان لوگوں میں ایک آدمی تھا، جن کا قصور اللہ تعالیٰ نے معاف کیا ہے، وہ کہتا تھا: ''اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْمَعُ آيَةً أُعْنَى بِهَا، تَقْشَعِرُّ مِنْهُ الْجُلُوْدُ، وَتَجِلُ مِنْهُ الْقُلُوْبُ، اَللّٰهُمَّ فَاجْعَلْ وَفَاتِي قَتِيْلًا فِي سَبِيْلِكَ لَا يَقُوْلُ: أَحَدٌ: أَنَا غَسَّلْتُ، أَنَا كَفَّنْتُ، أَنَا دَفَنْتُ'' وہ یمامہ کے دن مارا گیا، اس کے سوا ہر مسلمان ملا، وہ نہ ملا۔[2] پھر اللہ نے کہا کہ تم کافر ہو گئے، تمھارا یہ عذر قبول نہ ہو گا، ہاں بعض کو معاف کیا جائے گا نہ سب کو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ پاک نے قسم کھا کر فرمایا کہ اگر تُو ان سے پوچھے گا کہ تم کس لیے دین میں طعن کرتے ہو اور مسلمانوں کی عیب جوئی میں لگے ہو؟ تو وہ یہ کہیں گے کہ ہم تو راستے کو کاٹنے یعنی سفر طے کرنے کے لیے گپ شپ اور کھیل میں لگے ہوئے تھے، ہمارا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم کسی کی برائی کریں۔ اللہ نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا مذاق کرنے کے لیے اللہ اور رسول اور اللہ کا کلام اور مسلمان ہی رہ گئے ہیں نہ کوئی اور۔ یہ تو تمھارا ایک بہانہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤٨٢/٢) [2] تفسیر الطبري (٣٣٤/١٤) یہ دونوں روایتیں مرسل ہیں۔

ہے، تم اس گفتگو پر کافر ہو گئے۔ تمھارا یہ کہنا کلمۂ کفر تھا، جس نے تم کو کافر کر دیا۔ اب ایسے اعتذاراتِ باطلہ (جھوٹے عذر) تم سے سنے نہیں جائیں گے، وہ یہ کہتے تھے کہ نبیِ اکرم ﷺ کو یہ زعم ہے کہ ہم اپنے اصحاب میں قرآن چھوڑ جائیں گے، یہ قرآن تو ان کا کلام ہی ہے۔ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو ان کی اس بات چیت سے آگاہ کر دیا اور فرما دیا کہ تم ایمان کا اظہار کرنے کے بعد دل میں یہ کفر رکھتے ہو تو اب ہم تم میں سے مخلصین کو معاف کر دیں گے اور مجرمین کو سزا دیں گے۔[1]

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿67﴾

منافق مرد اور منافق عورتیں ان کے بعض بعض سے ہیں (سب ایک جیسے ہیں) وہ برے کام کا حکم دیتے ہیں اور نیک کام سے روکتے ہیں اور (خرچ کرنے سے) اپنے ہاتھ روک کے رکھتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اس نے بھی انھیں بھلا دیا۔ بے شک منافقین ہی نافرمان ہیں ﴿67﴾

منافقوں کی کچھ دوسری خصلتیں:

یعنی بے اعتقاد کی اصلاح کا کیا اعتبار، اس کو فاسق ہی کہیے۔ اللہ نے منافقین پر انکار کیا کہ یہ مومنین کی صفات کے برخلاف ہیں، جب ایمان دار لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں تو یہ امر بالمنکر اور نہی عن المعروف بجا لاتے ہیں اور اپنا ہاتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں۔ سو جس طرح یہ اللہ کو بھول گئے ہیں، اسی طرح کا معاملہ اللہ نے ان کے ساتھ کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا﴾ [الأعراف: ۵۱] ”چناں چہ آج ہم انھیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انھوں نے اپنی اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔“ یہ لوگ طریقِ حق سے خارج اور طریقِ ضلالت میں داخل ہیں۔

فتح البیان میں ہے کہ منافق تین سو تھے اور منافقات ایک سو ستر۔ یہ دین میں ایک دوسرے کے مشابہ تھے، جیسے ایک چیز کے کئی ٹکڑے ہوں، یہ ذکر ان کا مجملاً کیا، پھر بالتفصیل فرمایا کہ وہ منکر کا حکم کرتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں۔ منکر ہر قبیح کام کو کہتے ہیں جو شرعاً اور عقلاً برا ہے۔ معروف ہر اچھے کام کو کہتے ہیں جو شرعاً وعقلاً خوب ہے۔ ہاتھ کے قبض کر لینے سے مراد بخل ہے، یعنی صدقہ و صلہ رحمی اور جہاد میں مال خرچ کرنے سے ہاتھ روک لے۔ جس طرح کہ ہاتھ کا کھولنا، جود و سخا (سخاوت) و کرم سے عبارت ہے۔

نسیان سے مراد ترک کرنا ہے۔ اللہ کا ترک کرنا یہی ہے کہ اللہ کا ذکر کرنا چھوڑ دے۔ نسیان کا اللہ پر اطلاق

---

[1] فتح البیان (۵/ ۳۳۷۔ ۳۳۸)

کرنا باب مشاکلہ سے ہے۔ فسق کہتے ہیں طاعت سے نکل کر نافرمانی کی طرف آنا اور ہر خیر سے باہر ہو جانا۔ آیتِ باب کی عبارت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ فسق میں کامل ہیں۔ موضع اضمار میں اس کا اظہار زیادتِ تقریر یا توہین یا تحقیر کے لیے ہے۔[1]

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾

اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ (دوزخ) انھیں کافی ہے۔ اور اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے (68)

منافقوں سے جہنم کا وعدہ:

یہ وعدہ اس فعل پر ہوا جس کا ذکر ہو چکا، ان پر آگ میں ہمیشہ رہنے کا حکم لگایا اور آگ کو ان کے لیے کافی ٹھہرایا اور ان پر لعنت کی اور راندہ گیا اور دور کیا گیا، اور دائمی عذاب کا وعدہ فرمایا۔ ﴿وَعَدَ﴾ کا لفظ خیر و شر دونوں میں بولا جاتا ہے، یہ عذاب ایک دوسری قسم کا ہے، آگ کے عذاب کے سوا جو کبھی ان سے الگ نہ ہوگا، جیسے: زمہریر۔ یا مراد دنیا کا عذاب ہے، یعنی وہ تکلیف جو نفاق کی وجہ سے اٹھاتے ہیں، ہمیشہ اس بات کا عذر کرتے ہیں کہ کہیں مسلمان ان کے نفاق کو جان نہ لیں۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾

(منافقو!) تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے، وہ قوت میں تم سے کہیں زبردست اور مال و اولاد میں کہیں زیادہ تھے، چناں چہ وہ (دنیا میں) اپنا حصہ برت چکے، پس تم نے (بھی) اپنا حصہ برت لیا، جس طرح ان لوگوں نے اپنا حصہ برت لیا جو تم سے پہلے تھے۔ اور تم (بھی) فضول باتوں میں اُلجھے رہے، جس

[1] فتح البیان (٥/ ٣٣٩۔ ٣٤٠)

طرح وہ فضول باتوں میں الجھے رہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں برباد ہوگئے اور یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں (69)

گزرے ہوئے کافروں سے مشابہت:

اللہ نے کہا ان کو دارین میں عذاب پہنچا جس طرح اگلوں کو ان سے عذاب پہنچا تھا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلاق سے مراد دین ہے،[1] خوض سے مراد جھوٹ اور باطل میں گھسنا ہے۔ حبطِ عمل سے مراد کوشش کا بیکار جانا ہے، یعنی ان اعمال پر کچھ ثواب نہ ملے گا۔ اس لیے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں وہ عمل بیکار ہیں اور یہ لوگ نقصان میں ہیں، ان کو ان کے کیے کا کچھ اجر نہ ملے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ میں کہا ہے: "مَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ! ﴿ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ هٰؤُلَاءِ بَنُوْ إِسْرَائِيْلَ شَبَّهَنَا بِهِمْ لَا أَعْلَمُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَتَتَّبِعُنَّهُمْ حَتّٰى لَوْ دَخَلَ الرَّجُلُ مِنْهُمْ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ"[2] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ، وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ، وَبَاعاً بِبَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ، قَالُوْا: وَمَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَهْلُ الْكِتَابِ؟ قَالَ: فَمَنْ؟» (رواه ابن جريج وكذا أبو معشر وزاد: «قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: إِقْرَؤُوْا إِنْ شِئْتُمُ الْقُرْآنَ ﴿ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ الآية قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ: اَلْخَلَاقُ الدِّيْنُ، ﴿ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ﴾ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! كَمَا صَنَعَتْ فَارِسُ وَالرُّوْمُ؟ قَالَ: فَهَلِ النَّاسُ، إِلَّا هُمْ» اس حدیث کا ایک شاہد صحیح میں بھی ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ منافقین کو کفار سابقین کے مشابہ ٹھہرایا، غائب سے التفات خطاب کی طرف کیا کہ تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے یا تم نے اگلی امتوں کے سے کام کیے، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا اور اپنے ہاتھ بند کر دیے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے کافروں سے جہنم کا وعدہ ویسا ہی کیا ہے جیسے کہ اگلے لوگوں سے وعدہ کیا تھا۔[4] پھر یہ کہا کہ اگلے لوگ طاقت اور قوت میں زیادہ سخت تھے اور مال اور اولاد بھی رکھتے تھے۔ وہ دنیا کی لذتوں میں سے اپنا حصہ استعمال کر گئے اور باطل میں گھسے رہے۔ تم نے بھی دنیا میں اپنا حصہ استعمال کر لیا، جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٣٤٣) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٣٤١۔ ٣٤٢) اس کی سند میں "عمر بن عطاء" ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسير الطبري (١٤/ ٣٤١) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨٨) [4] معاني القرآن (٢/ ٤٦٠)

اس تمثیل سے ان منافقوں اور کافروں کی مذمت مراد ہے کہ یہ لوگ شہواتِ فانیہ اور زائل ہو جانے والی لذتوں کو حاصل کرنے میں اور آخرت کے لیے کوشش کرنے سے منہ موڑنے میں گزری ہوئی امتوں کی طرح ہیں۔ وہ بھی اسبابِ دنیا اور لہو ولعب میں ایسے ہی گھسے ہوئے ہیں، جیسا کہ وہ لوگ کرتے تھے۔ یا نبیِ اکرم ﷺ کے جھٹلانے میں لگے رہے، سو ان سب کے اعمال اگرچہ بظاہر وہ فرماں برداری کی صورت میں ہوں، دارین میں ضائع ہو گئے، دنیا میں اس طرح کہ ان کو وسعت اور درستی حاصل نہ ہوئی۔ غنا کے عوض فقر ملا، عزت کے عوض ذلت ملی اور قوت کے عوض ضعف ملا۔ آخرت میں ان کا انجام آگ ہے۔ ان اطاعت اور قربت کے اعمال سے ان کے ہاتھ کوئی فائدہ نہیں آئے گا۔ یہ تو دونوں جہانوں کے نقصان میں کامل ہیں۔ معلوم ہوا کہ نفاق اور کفر کے ہمراہ کوئی عملِ خیر کارآمد نہیں ہوتا۔[1]

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۷۰

کیا ان کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے تھے (یعنی) قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم اور مدین والے اور الٹی ہوئی بستیوں والوں کی۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر آئے، پھر اللہ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (70)

گزری ہوئی امتوں سے عبرت حاصل کرنے کی نصیحت:

اللہ نے ان منافقین اور مکذبینِ رسل کو نصیحت کی اور فرمایا: کیا تم کو اگلی امتوں کی خبر نہیں ملی کہ اس تکذیبِ رسل کی وجہ سے ان کا انجام کیا ہوا۔ قومِ نوح کو غرق کرنے والا ایسا عذاب پہنچا جس نے تمام زمین والوں کو غرق کر دیا۔ اس عذاب سے صرف وہی شخص بچا جو اللہ اور اس کے بندے اور رسول نوح علیہ السلام پر ایمان لایا۔ قومِ عاد نے جب ہود علیہ السلام کو جھٹلایا تو وہ تیز ہوا سے ہلاک کر دی گئی۔ قومِ ثمود نے جب صالح علیہ السلام کی تکذیب کی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ دیں تو ان کو ایک صیحہ (چیخ) نے پکڑ لیا۔ قومِ ابراہیم علیہ السلام پر اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو فتح یاب کیا اور معجزاتِ ظاہرہ سے ان کی تائید فرمائی، ان کے بادشاہ نمرود بن کنعان بن کوش۔ لعنہ اللہ۔ کو ہلاک کیا۔ مدین والے شعیب علیہ السلام کی قوم تھے، ان کو رجفہ، یعنی زلزلہ پہنچا، عذابِ یوم الظلہ ہوا۔ الٹی بستی والی قوم قومِ لوط تھی، مدائن میں رہتی تھی، دوسری آیت میں فرمایا ہے: "والمؤتكفة أهوى"، یعنی امت واژگون، ان کا بڑا گاؤں سدوم تھا۔

[1] فتح البیان (۵/ ۳۴۱۔ ۳۴۳)

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان سب کو از اول تا آخر لوط علیہ السلام کی تکذیب اور بے حیائی کے کام، یعنی اغلام (لونڈے بازی) پر جو سارے جہان میں سے کسی نے ان سے پہلے نہ کیا تھا، ہلاک کر دیا۔ ان سب امتوں کے پاس ان کے پیغمبر حجتیں اور روشن دلیلیں لائے تھے۔ یہ کچھ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ اپنی حجت کو ان پر قائم کر دیا تھا کہ رسول بھیجے اور علتیں دور کیں، بلکہ وہ خود ظالم تھے کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا، حق کی مخالفت اختیار کی، ناچار ان کا انجام عذاب، تباہی اور ہلاکت ہوا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے منافقین کو خطاب کیا اور چھے ہلاک ہونے والی قوموں کا ذکر کیا، جن کے حالات عرب نے سنے ہوئے تھے اور ان کے آثار باقی تھے اور ان کے شہر شام، عراق اور یمن میں تھے، یہ سب ملک سرزمین عرب سے نزدیک ہیں۔ عرب ان شہروں پر سے گزرا کرتے تھے اور ان کے احوال کو جانتے پہچانتے تھے۔ ایک قومِ نوح یہ طوفان سے ہلاک ہوئی، یہ قوم سب سے پہلی تھی، دوسری عاد، تیسری ثمود، چوتھی قومِ ابراہیم، ان پر مچھر مسلط کر دیے گئے تھے، ان کی ساری نعمت چھین لی گئی۔ پانچویں قومِ شعیب تھی، چھٹی قومِ لوط، ان پر پتھر برسے تھے۔

یہ بستیاں موتفکات کہلاتی ہیں اور اگر مراد صرف بستی ہے تو وہ سب خسف (زمین میں دھنسنا) نہیں ہوئے ان کا حال بدل گیا، خیر سے شر کی طرف پھیل گئے۔ ائتفاک انقلاب کو کہتے ہیں۔ ان سب طوائف کے پاس رسول آئے تھے یا اصحابِ مؤتکفات کے رسول مراد ہیں کہ ان کے رسول لوط علیہ السلام تھے۔ یہ ان تمام بستیوں میں سے ہر بستی کی طرف بھیجے گئے تھے۔ بیّنات سے مراد کھلے معجزے اور ظاہری حجتیں تھیں جو رسولوں کی سچائی کی دلیلیں تھیں۔ انھوں نے ان کو جھٹلایا اور ان کے حکم کے خلاف کیا۔ سو اب تم کو بھی ڈرنا چاہیے کہ کہیں تمھاری گت بھی انھی کی سی نہ ہو جائے۔

اللہ نے جو ان طوائف کو ہلاک کر دیا تو یہ کچھ ظلم نہیں کیا، کیونکہ ان کی سزا میں کچھ جلدی نہیں فرمائی، بلکہ اپنے رسول بھیج کر حجت پوری کر دی اور ان کو ڈرا دیا، جب وہ نہ ڈرے اور گمراہ ہی رہے تب ان پر عذاب اتارا، یہ ان کا خود اپنی جانوں پر ظلم تھا کہ اپنے کفر کرنے اور انبیا کی اطاعت اختیار نہ کرنے پر عذاب آیا۔ عبارت کی ترکیب اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا ظلم برقرار تھا، یعنی وہ کبیرہ گناہوں پر مستقل طور پر قائم تھے۔[1]

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

---

[1] فتح البیان (۵/ ۳۴۳۔ ۳۴۴)

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکات دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ عن قریب رحم فرمائے گا۔ بے شک اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے ﴿71﴾

اہلِ ایمان کے اوصافِ حمیدہ:

جب اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی مذموم صفتیں بیان کیں تو اب مومنین کے اوصافِ حمیدہ بیان فرمائے: ایک یہ کہ بعض ولی ہیں بعض کے، یعنی ان کے مددگار، بازو اور معاون جس طرح صحیح حدیث میں آیا ہے: «اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُمْ بَعْضاً، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ»[1] دوسری حدیث میں فرمایا ہے: «مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ إِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالْحُمّٰى وَالسَّهَرِ»[2] یعنی ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند — کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چو عضوے بہ درد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

''آدم کی اولاد ایک دوسرے کے لیے ایک جسم کے مختلف حصوں کی مانند ہیں، کیونکہ ان کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے، ان میں سے اگر ایک حصے کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرے حصوں کا چین وسکون بھی برقرار نہیں رہتا۔''

دوسرے یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، اللہ کے فرمان کے مطابق: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ١٠٤] ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے، جو خیر کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔'' تیسری یہ کہ نماز پڑھتے ہیں اور زکات دیتے ہیں، یعنی اللہ کے عابد، فرماں بردار اور مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہیں۔ چوتھے یہ کہ ہر معاملے میں اللہ اور رسول کے فرماں بردار ہیں۔ سو جس کسی شخص میں یہ اوصاف جمع ہوں گے، اللہ اس پر رحم فرمائے گا، کیونکہ وہ اپنے مطیع کو عزت دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٦)

وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [المنافقون: ۸] ''اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے، اور مومنوں کے لیے۔''
اپنی اس تقسیمِ صفات میں وہ صاحبِ حکمت و دانش ہے جو اوصاف اہلِ نفاق کو دیے ہیں وہ بھی حکمت پر مشتمل ہیں اور جو صفات ایمان داروں کو بخشے، وہ بھی عین حکمت ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی دوستی سے مراد یہ ہے کہ مومنین کے دل محبت اور مودت میں اتفاق کلمہ اور ایک دوسرے کی معاونت اور مدد میں ایک شے کی مثل ہیں، دین و ایمان نے ان سب کو یک لخت کر دیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''آخَاهُمْ فِيْ اللّٰهِ يَتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِ اللّٰهِ''[1] اس سے دونوں فریقوں کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا۔ پھر مومنین کے اوصافِ حمیدہ ذکر فرمائے، جس طرح کہ پہلے منافقین کے مذموم اوصاف ذکر کیے تھے، پھر ان ایمان کی صفات پر رحمت کا وعدہ کیا، اس جگہ حرف سین مبالغے کے لیے ہے۔ وعدۂ رحم کے پورا کرنے میں یہ آیت اللہ کا ڈر اور اس کی رغبت دلاتی ہے۔[2]

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور سدا بہار باغوں میں پاکیزہ محلات کا (وعدہ ہے) اور اللہ کی رضا مندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی، یہی عظیم کامیابی ہے (72)

مومنوں سے جنتوں اور رضائے الٰہی کا وعدہ:

اس آیت میں خیرات اور قائم رہنے والی نعمتوں کا ذکر ہے جس میں ایمان دار لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « جَنَّتٰنِ مِنْ ذَهَبٍ، آنِيَتُهُمَا وَمَا فِيْهِمَا، وَجَنَّتٰنِ مِنْ فِضَّةٍ آنِيَتُهُمَا وَمَا فِيْهِمَا، وَمَا بَيْنَ الْقَوْمِ وَبَيْنَ أَنْ يَّنْظُرُوْا إِلٰى رَبِّهِمْ إِلَّا رِدَاءَ الْكِبْرِيَآءِ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْ جَنَّةِ عَدْنٍ »[3] دوسری حدیث میں آیا ہے کہ مومن کے لیے جنت میں خالی موتی کا ایک خیمہ ہو گا جس کا طول آسمان

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٢٣٤) [2] فتح البیان (٥/ ٣٤٥۔ ٣٤٦)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٩٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٠)

کی طرف ساٹھ میل ہوگا، اس میں مومن کے گھر والے ہوں گے جن کے پاس وہ جائے گا، کوئی کسی کو نہ دیکھے گا۔[1]

(أخرجاه في الصحيحين)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جو کوئی اللہ اور رسول پر ایمان لایا اور قائم کی اس نے نماز اور روزہ رکھا رمضان کو تو اللہ پر حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے۔ ہجرت کی اس نے اللہ کی راہ میں یا اپنی زمین میں جہاں وہ پیدا ہوا، وہاں بیٹھا رہا۔ کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگوں کو خبر نہ کر دیں؟ فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں، ان کو اللہ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھا ہے، ہر دو درجے میں اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان میں ہے، سو جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو کہ وہ اعلیٰ اور اوسط، یعنی افضل جنت ہے اور اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔ اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے۔[2] (رواه الشيخان)

طبرانی، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے[3] اور ترمذی کے نزدیک عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے مثل مرفوعاً مروی ہے۔[4] سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جنت والے جنت کے بالاخانوں کو دیکھیں گے جس طرح تم آسمان میں چمکتے ستاروں کو دیکھتے ہو۔[5] (أخرجاه في الصحيحين)

جنت کا اعلیٰ درجہ مقام وسیلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات جان لینا چاہیے کہ جنت میں سب سے اونچا مقام وہ ہے جسے وسیلہ کہتے ہیں، کیونکہ وہ عرش سے نزدیک تر ہے، وہ جنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسکن ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم مجھ پر درود بھیجو تو اللہ سے میرے لیے وسیلہ مانگو۔ پوچھا: اے اللہ کے رسول! وسیلہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ جنت کا اعلیٰ درجہ ہے، اس کو نہ پائے گا کوئی مگر ایک شخص، میں امید کرتا ہوں کہ وہ شخص میں ہوں۔[6] (رواه أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب تم مؤذن کی آواز سنو تو اس کے مثل کہو جو وہ کہتا ہے، پھر مجھ پر درود بھیجو، جو کوئی مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس بار رحمت بھیجتا ہے۔ پھر مانگو میرے لیے وسیلہ جو جنت میں ایک مقام ہے، وہ کسی کے لائق نہیں مگر اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے،

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٨)
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧)
3. المعجم الكبير (٢٠/ ١٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٣١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩١٣)
4. سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢٤٤)
5. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٠)
6. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦١٢) مسند أحمد (٢/ ٢٦٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٣٦)

«وَأَرْجُوْ أَنْ أَكُوْنَ هُوَ» سو جس نے میرے لیے وسیلے کا سوال کیا، اس پر قیامت کے دن شفاعت نازل ہو گی۔[1] (رواه مسلم) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «سَلُوْا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ فَإِنَّهُ لَمْ يَسْأَلْهَا لِيْ عَبْدٌ فِي الدُّنْيَا إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَهِيْداً أَوْ شَفِيْعاً يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[2] (رواه الطبراني)

جنت کی منظر کشی:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سے جنت کا حال بیان کریں۔ اس کی بنیاد کس چیز سے ہے، فرمایا ایک اینٹ سونے کی ایک اینٹ چاندی کی اور گارا اس کا مشک ہے، اس کی کنکریاں موتی اور یاقوت ہیں اور اس کی خاک زعفران ہے، جو کوئی اس میں جائے گا وہ آرام پائے گا، کبھی تکلیف نہ اٹھائے گا، ہمیشہ زندہ رہے گا، کبھی مرے گا نہیں، نہ اس کے کپڑے میلے ہوں، نہ اس کی جوانی جائے گی۔[3] (رواه أحمد وروي عن ابن عمر مرفوعاً نحوه) سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت میں جھروکے ہیں، جن کا ظاہر باطن سے اور باطن ظاہر سے نظر آتا ہے، ایک اعرابی، یعنی گنوار آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کس کے لیے ہے؟ فرمایا: اس کے لیے جو اچھی بات کہے، کھانا کھلائے، ہمیشہ روزہ رکھے، رات کو نماز پڑھے جبکہ لوگ سوتے ہوں۔[4] (رواه الترمذي وقال: حديث غريب و رواه الطبراني من حديث ابن عمرو وأبي مالك الأشعري رضي الله عنهم كل منهما عن النبي ﷺ بنحوه وكل من الإسنادين جيد حسن وعنده أن السائل هو أبو مالك الأشعري، والله أعلم)

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے: «اَلَا هَلْ مُشَمِّرٌ لِلْجَنَّةِ؟ فَإِنَّ الْجَنَّةَ لَا خَطَرَ لَهَا، وَهِيَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ، نُوْرٌ يَتَلَأْلَأُ، وَرَيْحَانَةٌ تَهْتَزُّ، وَقَصْرٌ مَّشِيْدٌ، وَنَهْرٌ مُطَّرِدٌ، وَثَمَرَةٌ نَضِيْجَةٌ، وَزَوْجَةٌ حَسْنَاءُ جَمِيْلَةٌ، وَحُلَلٌ كَثِيْرَةٌ، وَمَقَامٌ فِيْ أَبَدٍ فِيْ دَارٍ سَلِيْمَةٍ وَفَاكِهَةٍ وَخَضْرَةٍ وَحِبْرَةٍ وَنِعْمَةٍ فِيْ مَحِلَّةٍ عَالِيَةٍ بَهِيَّةٍ قَالُوْا: نَعَمْ، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! نَحْنُ الْمُشَمِّرُوْنَ لَهَا، قَالَ: قُوْلُوْا: إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى، فَقَالَ الْقَوْمُ: إِنْ شَاءَ اللّٰهُ»[5] (رواه ابن ماجه)

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے جنت کے بیان میں ایک کتاب ”حَادِي الْأَرْوَاحِ إِلٰى بِلَادِ الْأَفْرَاحِ“ نہایت جامع حافل (مفصل) لکھی ہے کہ اس جیسی کتاب اسلام میں معلوم نہیں۔ اس کی تلخیص کتاب: ”مُثِيْرُ سَاكِنِ الْغَرَامِ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤) [2] المعجم الأوسط (١/ ١٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٦٣٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٢٦) مسند أحمد (٢/ ٣٠٤) مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١١٦)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩٨٤) مسند أحمد (٢/ ١٧٣) المعجم الكبير (٣/ ٣٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٢٣)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٣٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٨٥۔ ٤٨٦) اس کی سند میں ”ضحاک معافری“ مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: (٣٣٥٨)

إِلىٰ رَوْضَاتِ دَارِ السَّلَامِ“ اور اس کا اردو ترجمہ ”هادي القلب السليم إلىٰ درجات دار النعيم“ ہے۔
یہ تینوں کتابیں ایک ایمان دار تقویٰ شعار کے جنت کے مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

فَحَيَّ عَلیٰ جَنَّاتِ عَدْنٍ فَإِنَّهَا مَنَازِلُنَا الْأُوْلیٰ وَفِيْهَا الْمُخَيِّمُ
وَلٰكِنَّنَا سَبْيَ الْعَدُوِّ فَهَلْ تَرىٰ نَعُوْدُ إِلىٰ أَوْطَانِنَا وَنُسَلِّمُ

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ جَنَّةَ الْفِرْدَوْسِ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ دَرَكَاتِ النَّارِ.

”آؤ جناتِ عدن کی طرف، یہ ہمارے پہلے ٹھکانے ہیں اور انھیں میں خیمے ہیں، لیکن ہمیں دشمن نے اسیر بنا لیا ہے، کیا ہم اپنے وطنوں کو لوٹیں گے اور وہاں ہمیں خوش آمدید کہا جائے گا!“

رضائے الٰہی سب سے بڑی نعمت:

پھر اللہ پاک نے یہ فرمایا کہ اللہ کا راضی ہونا بہت بڑی اور جلیل القدر اور اعظم تر نعمت ہے اُن تمام نعمتوں سے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل جنت والوں سے کہے گا: اے اہلِ جنت! وہ کہیں گے: ”لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ“ فرمائے گا: کیا تم راضی وخوش ہو؟ وہ کہیں گے: ہم کو کیا ہوا ہے کہ ہم خوش نہ ہوں اے رب! اور ہم کو تو تُو نے وہ کچھ دیا ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا۔ فرمائے گا: میں تم کو اس سے بہتر نہ دوں؟ وہ کہیں گے: اے رب! کون سی چیز اس سے بہتر ہے؟ فرمائے گا: میں تم پر اپنی خوش نودی اتاروں گا، پھر اس کے بعد تم پر کبھی خفا نہ ہوں گا۔ (أخرجاه من حديث مالك)

خوش نودیِ تست مطلبِ ما یا رب رحمے بیا رب ما

”تیری خوشنودی ہی ہمارا مطلوب ہے۔ اے رب! ہم پر رحم فرما۔“

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جنت والے جنت میں جا چکیں گے، اللہ عزوجل کہے گا: تم کچھ چاہتے ہو کہ میں تم کو زیادہ دوں؟ وہ کہیں گے: اے رب! کیا بہتر ہے اس سے جو تو نے ہم کو دیا ہے؟ فرمائے گا: میری رضا مندی اکبر ہے۔[1] (رواه الحسين بن إسماعيل المحاملي ورواه البزار في مسنده والحافظ الضياء المقدسي في كتابه صفة الجنة) امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”هٰذَا عِنْدِيْ عَلیٰ شَرْطِ الصَّحِيْحِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ“[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مراد مومنین اور مومنات سے ہر مومن مرد اور عورت ہے۔ نہروں کا باغوں کے نیچے سے

[1] مستدرك الحاكم (١/ ١٥٦) صفة الجنة للمقدسي (١/ ١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٣٦)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٨٦)

جاری ہونا یہ ہے کہ درختوں اور جھروکوں کے نیچے سے بہتی ہوں گی۔ جنات سے مراد وہ باغات ہیں جن کے حسن و جمال کو دیکھنے والا حیران رہ جائے۔ اس کے مکانات ہیرے جواہرات موتیوں اور یاقوت آبدار کے ہوں گے۔ اس میں بسنے والے ان کو صاف ستھرا پا کر خوب عیش کریں گے۔ عدن کے معنی ہیں اقامت گاہ، یعنی گلستانِ جاوداں کی وہ حویلیاں اور وہ بغیر کانٹوں کے باغات ہمیشہ پُر بہار ہوں گے، یا مراد اعلیٰ جنت ہے یا اوسط جنت یا ان میں سونے چاندی کے محل۔ ان میں نبی، صدیق یا شہید کے سوا کوئی اور نہیں جائے گا۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عمران بن حصین اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے اس آیت ﴿ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾ کی تفسیر پوچھی، دونوں نے کہا "عَلَى الْخَبِيْرِ سَقَطتَّ" ہم نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا، فرمایا: ایک محل ہے ایک موتی کا، جنت میں اس محل میں ستر گھر یاقوت سرخ کے ہیں، ہر گھر میں زمرد سبز کے ستر خانے ہیں، ہر خانے میں ستر تخت ہیں، ہر تخت پر ستر رنگ کے ستر فرش ہیں، ہر فرش پر ایک عورت حور عین میں سے ہے۔ ہر گھر میں ستر دستر خوان ہیں، ہر دستر خوان پر ستر رنگ کا کھانا ہے، ہر طعام میں سے ہر خانے میں ستر غلام و کنیز ہیں۔ مومن کو ہر ایک صبح اتنی قوت دی جائے گی کہ وہ ان کے پاس آئے گا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم والطبراني بسنده عن عمران و ابن مردويه عن الحسن)

آیتِ باب میں اس جگہ جنت کے چاروں وصف ذکر فرمائے، ایک اس کے نیچے سے نہروں کا بہنا، تاکہ طبیعت اس کی طرف مائل ہو، دوسرے کہ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، ان کو نہ فنا پیش آئے گی اور نہ وہ کوئی تبدیلی پائیں گے۔ تیسرے یہ کہ وہاں کے گھر نہایت پاک صاف ہوں گے، سب کدورتوں اور نجاستوں سے خالی ہوں گے اور ستھرے ہوں گے، چوتھے یہ کہ ذاتِ عدن ہے، یعنی ایسی اقامت ہے جو منقطع نہ ہونے والی ہے۔ یا یہ کہ عدن اس مکان کا نام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ساری جنتیں عدن ہیں۔ جنات کی صفتوں اور قسموں کے بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے قصیدہ نونیہ کے آخر میں جنت کی صفتیں، تعریفیں اور فضائل نظم رائق عربی میں بیان کیے ہیں۔ وَلِلّٰهِ دَرُّهَا مَا أَعْلَاهَا! اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا.

پھر اللہ نے اپنی رضا مندی کو سب نعمتوں سے بڑا بتایا، کیونکہ ہر خیر و سعادت کا سرچشمہ یہی رضائے الٰہی ہے، ہر شرف و سیادت اسی رضوانِ الٰہی سے وابستہ ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات پر کہ کوئی شے کیسی ہی عظیم اور جلیل کیوں نہ ہو، اللہ کی رضا کے برابر یا اس کے مثل نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کوئی شے جسمانی لذتوں میں سے اگرچہ انتہا کو پہنچی ہو اللہ کی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٣٩۔ ١٨٤٠) المعجم الأوسط (٥/ ١٢٠) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عمران اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے، نیز "جسر بن فرقد" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٧٠٦)

رضوان کی برابری نہیں کر سکتی۔ اسی لیے اہلِ معرفت اپنی عبادت، ریاضت اور مجاہدت کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے جمالِ باکمال کو دیکھ لینے ہی کو بتاتے ہیں۔ اور جنت کے طمع اور آگ کے خوف سے عبادت کرنے کو نفسِ ناطقہ کی ترقی کا ایک ادنیٰ درجہ ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں:

تو بندگی چوں گدایان بشرط فرو مکن — کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

''تو اپنی خدمت و عبادت کو بھیک مانگنے والوں کی مانند اسے مشروط کر کے کم قیمت نہ بنا، کیونکہ آقا اپنے بندوں کی تربیت کے طور طریق خود خوب جانتا ہے۔''

اس لیے فی الواقع کوئی نعمت اس کے برابر نہیں کہ مالک اپنے غلام سے راضی رہے اور غلام اپنے مولا سے۔ ﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ ''اَللّٰهُمَّ ارْضَ عَنَّا رِضًا لَّا يَشُوْبُهٗ سَخَطٌ وَلَا يُكَدِّرُهٗ نَكَدٌ يَا مَنْ بِيَدِهِ الْخَيْرُ دِقَّهٗ وَجِلَّهٗ'' [1] اسی لیے اللہ نے اس امرِ موعود یا خاص اس رضوان کو عظیم کامیابی ٹھہرایا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا (اصل) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بدترین جگہ ہے (73) وہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے (کوئی بات) نہیں کہی، حالاں کہ انھوں نے ضرور کلمۂ کفر کہا تھا اور وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جو وہ نہ کر سکے۔ اور انھوں نے غصہ نہیں نکالا، مگر اس بات پر کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انھیں غنی کر دیا، پھر اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کا زمین میں کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ ہوگا (74)

---

[1] متن القصيدة النونية (۱/ ۳۰۹ـ۳۳۱)

کافروں ومنافقوں کے خلاف جہاد اور سختی کرنے کا حکم:

اکثر منافقین پیچھے بیٹھ کر پیغمبر اور دین کی توہین کرتے، جو پکڑے جاتے تو قسمیں کھاتے کہ ہم نے کچھ نہیں کہا، سورت منافقون میں بھی یہی ذکر آئے گا۔ یہ جو فرمایا کہ انھوں نے قصد کیا تھا جو پورا نہ کر سکے یا یہ مراد ہے کہ لشکر میں خانہ جنگی ہوئی تھی، اس میں کج روی کرنے لگے کہ مہاجر اور انصار میں پھوٹ ڈالیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اصلاح کر دی۔ سورت منافقون میں یہ ذکر آئے گا۔ یا مراد وہ ہے کہ بارہ لوگوں نے سفر میں آدھی رات کو جمع ہو کر چاہا کہ نبی اکرم ﷺ پر ہاتھ چلا دیں، ایک صحابی حذیفہ رضی اللہ عنہ ساتھ تھے، ان کو فرمایا کہ ان کو مارو، تب آگے سے بھاگے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سب کو جانتے پہچانتے تھے، مگر ظاہر کرنے کا حکم نہ تھا۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ آپ کفار اور منافقین سے لڑیں اور ان سے درشتی اور سختی کریں، جس طرح مومنین کے بارے میں خفضِ جناح (بازو جھکانا) کا حکم دیا تھا، یعنی ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں اور یہ خبر دی کہ ان کا انجام آگ ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "بُعِثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِأَرْبَعَةِ أَسْيَافٍ: سَيْفٌ لِلْمُشْرِكِيْنَ: ﴿ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ وَسَيْفٌ لِّكُفَّارِ أَهْلِ الْكِتَابِ: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٢٩] "ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہل کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔" وَسَيْفٌ لِلْمُنَافِقِيْنَ: ﴿ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) وَسَيْفٌ لِّلْبُغَاةِ: ﴿ فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الحجرات: ٩] "تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔"[1]

یہ اس بات کو مقتضی ہے کہ جب وہ نفاق کا اظہار کریں تو ان کے ساتھ تلوار کے ساتھ مجاہدہ کیا جائے، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمانِ باری تعالیٰ: ﴿ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ کے بارے میں کہا: "بِيَدِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَلْيَكْفَهِرَّ فِيْ وَجْهِهٖ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا ہے کہ کافروں سے تلوار لے کر لڑو

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٧٥٢) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٣٨٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

اور منافقوں سے زبان سے۔ اور نرمی کو ان سے دور کر دیا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافروں سے تلوار کے ساتھ جہاد کر اور منافقوں پر کلام سے سختی کر، یہی ان کا مجاہدہ ہے۔ امام مقاتل اور ربیع رحمہما اللہ سے بھی اسی کے مثل مروی ہے۔

امام حسن، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ منافقین کے ساتھ مجاہدہ یہ ہے کہ ان پر حدیں قائم کی جائیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، اس لیے کہ کبھی یوں کرے اور کبھی وُوں کرے، بحسبِ احوال۔ واللہ أعلم.

اسلام کے بعد کلمۂ کفر بولنا، قسمیں کھانا اور سببِ نزول:

رہا حلف اور کلمۂ کفر، سو امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبی کے حق میں اتری ہے۔ دو مرد آپس میں لڑے: جہنی اور انصاری۔ جہنی انصاری پر غالب اور عالی ہوا، عبداللہ نے انصار سے کہا کہ تم اپنے بھائی کی مدد نہیں کرتے، واللہ! ہماری اور محمد ﷺ کی وہی مثل ہے جو کسی نے کہا کہ ''سَمِّنْ كَلْبَكَ يَأْكُلْكَ''، پھر کہا: ﴿ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ﴾ [المنافقون: ٨] ''البتہ اگر ہم لوٹ کر مدینے گئے تو معزز ترین لوگ ذلیل ترین لوگوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔'' ایک مرد مسلمان نے یہ بات نبیِ اکرم ﷺ تک پہنچائی، نبیِ اکرم ﷺ نے اس کو بلا کر پوچھا، وہ اللہ کی قسم کھانے لگا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی ہے، اللہ نے یہ آیت بھیجی۔[2]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جو لوگ میری قوم میں سے واقعہ حَرہ میں مبتلا ہوئے، میں نے ان پر نہایت غم کیا، جب میرے سخت افسوس اور غم کی خبر زید بن ارقم کو پہنچی، تو مجھ کو لکھا کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو سنا ہے، فرماتے تھے: « اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَلِأَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ » ابن الفضل راوی نے ''أَبْنَاءِ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ'' میں شک کیا ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے بعض پاس والوں سے زید بن ارقم کا حال پوچھا، کہا یہ وہی شخص ہے جس سے نبیِ اکرم ﷺ نے کہا تھا: « أَوْفَى اللّٰهُ لَهُ بِأُذُنِهِ » یہ اس بات پر فرمایا تھا کہ زید نے ایک منافق شخص کو سنا تھا کہ وہ کہتا تھا اور نبیِ اکرم ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے: « لَئِنْ كَانَ صَادِقاً فَنَحْنُ شَرٌّ مِّنَ الْحَمِيْرِ » زید بن ارقم نے کہا: ''فَهُوَ وَاللّٰهِ صَادِقٌ وَلَأَنْتَ شَرٌّ مِّنَ الْحِمَارِ''، جب یہ بات نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچی تو اس شخص نے انکار کیا، اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی اور زید کی تصدیق فرمائی۔[3] (رواه البخاري مختصرا)

مشہور یہ ہے کہ یہ قصہ غزوۂ بنی المصطلق کا ہے۔ شاید راوی کو وہم ہوا کہ اس نے اس آیت کا ذکر کیا جب کہ وہ کسی اور آیت کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔ واللہ أعلم.

نبیِ اکرم ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھنے والے منافق:

اموی رحمہ اللہ نے مغازی میں ذکر کیا ہے کہ اس آیت کا نزول جلاس بن سوید بن صامت کے حق میں ہوا ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٥٨۔ ٣٥٩) [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٦٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٨٦) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٢٣) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٨٧)

یہ کلمہ اسی نے کہا تھا۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے بھی اس کلمے کا قائل جلاس کو ٹھہرایا ہے، لیکن یہ کہا ہے کہ جلاس نے توبہ کی اور اچھی توبہ کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے سائے تلے بیٹھے تھے، فرمایا: اب تمھارے پاس ایک انسان آئے گا، وہ تمھاری طرف نظر کرے گا، یعنی شیطان۔ سو جب وہ آئے تو تم اس سے بات نہ کرنا، ذرا دیر نہ ہوئی تو ایک مرد ازرق آیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلا کر کہا: « عَلَامَ تَشْتِمُنِي أَنْتَ وَأَصْحَابُكَ » ”تو اور تیرے ساتھی مجھے برا کیوں کہتے ہیں؟“ وہ شخص جا کر اپنے اصحاب کو بلا لایا، سب نے قسم کھائی کہ ہم نے کچھ نہیں کہا، یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر فرمایا۔ اللہ نے یہ آیت اتاری[1] اور فرمایا: ﴿ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ﴾ (آیتِ باب) یہ جلاس کے بارے میں اتری ہے، اس نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی بی بی کے بیٹے کو جس کا نام عمیر بن سعد یا مصعب تھا، قتل کر ڈالے، اس بات پر کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر کیوں دی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ عبداللہ بن اُبی کے حق میں نازل ہوئی ہے کہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان لوگوں کے حق میں اتری ہے جنھوں نے ابن اُبی کو سردار بنانا چاہا تھا، گو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ ہوئے۔[2] یہ بھی آیا ہے کہ چند منافق لوگوں نے قصد کیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مار ڈالیں، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں تھے۔ کچھ اوپر دس شخصوں کا یہ ارادہ ہوا کہ رات کو چلنے کے وقت بطور شب خون آ گریں اور قتل کر ڈالیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھی کے حق میں یہ آیت اتری ہے۔[3]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ”دلائل النبوۃ“ میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقے کی باگ تھامے ہوئے تھا اور عمار اس کو ہانکتے تھے یا باگ وہ پکڑے ہوئے تھے اور میں ہانکتا تھا، جب ہم گھاٹی پر پہنچے تو یکا یک بارہ سوار سامنے آئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرے سخت لہجے میں ان کو جھڑکا، وہ پشت پھیر کر چل دیے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا: تم نے ان کو پہچانا؟ ہم نے کہا: نہیں، یہ لوگ منہ چھپائے ہوئے تھے، ہاں سواریوں کو پہچانا۔ فرمایا: یہ منافق ہیں قیامت کے دن تک۔ فرمایا: تمھیں معلوم ہے کہ ان کا ارادہ کیا تھا؟ ہم نے کہا: نہیں۔ فرمایا: اس گھاٹی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مزاحمت کا ارادہ رکھتے تھے کہ یہاں پر ان کو مار ڈالیں۔ ہم نے کہا کہ ہم ان کے پاس عشائر یعنی قوم کے آدمی نہ بھیجیں، تاکہ ہر قوم اپنے شخص کا سر کاٹ کر آپ کے پاس بھیج دے۔ فرمایا: نہیں، میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ عرب کے لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قوم کو لے کر لڑتے ہیں، یہاں تک کہ جب اللہ نے ان کو غالب کر دیا تو پھر اسی قوم کو قتل کرنے لگے، پھر کہا: « اَللّٰهُمَّ ارْمِهِمْ بِالدُّبَيْلَةِ » ہم نے پوچھا: دبیلہ کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: ایک شہاب ہے آگ سے، جو ان کے دل کی رگ پر گر کر ہلاک کرے گا۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٣٦٢۔ ٣٦٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٤٥) [3] تفسير ابن كثير (٢/ ٤٨٨)

[4] دلائل النبوة (٥/ ٢٦٠۔ ٢٦١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری سعید بن فیروز رحمہ اللہ کا سماع سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے اس قصے کو ابو الطفیل رضی اللہ عنہ سے مفصلاً روایت کیا ہے، اس میں ان کی تعداد بارہ، چودہ، پندرہ لوگوں کی آئی ہے۔ عمار رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان میں سے بارہ حرب ہیں، اللہ اور رسول کے، دنیا اور آخرت میں۔[1] عروہ بن زبیر رحمہ اللہ بھی اسی قصے کے راوی ہیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نام حذیفہ اور عمار رضی اللہ عنہما کو بتائے کہ ان کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا تھا اور فرمایا: اس امر کو پوشیدہ رکھو۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ایک جماعت کے نام ذکر کیے ہیں۔[2] یہ قصہ معجم طبرانی میں بھی آیا ہے۔[3]

صحیح مسلم کی روایت اس کی صحت کی شاہد ہے۔ اس روایت میں یوں ہے کہ ابو الطفیل رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ سب چودہ آدمی تھے اور اگر میں بھی ان میں ہوں تو پندرہ ہوتے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں اللہ کی کہ ان میں سے بارہ تو اللہ اور رسول کے حرب ہیں، دنیا میں اور اس دن کہ گواہ کھڑے ہوں، یعنی قیامت میں اور تین آدمیوں کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معذور رکھا، انھوں نے کہا: ہمیں قوم کے ارادے کا علم نہ تھا۔[4]

بارہ منافقوں کے نام:

دوسری روایت جو صحیح مسلم میں ہے، اس میں آیا ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اصحاب میں بارہ منافق ہیں، وہ جنت میں نہ جائیں گے اور نہ جنت کی ہوا پائیں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نکلے۔ ان میں سے آٹھ کو دبیلہ کفایت کرے گا۔ ایک چراغ آگ کا ان کے کندھے پر ظاہر ہوگا، یہاں تک کہ ان کے سینوں میں جا کر چمکے گا۔[5] اسی لیے حذیفہ کو صاحبِ سرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی ہم راز) کہتے تھے۔ یعنی وہ منافقین کی جماعت کو پہچانتے تھے، وہ یہی لوگ تھے جن کے نام نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ کو بتا دیے تھے نہ اور کوئی۔ واللہ أعلم

طبرانی نے مسند حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اصحابِ عقبہ کے نام ذکر کیے ہیں، پھر زبیر بن بکار رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ لوگ یہ تھے:

① معتب بن قشیر۔ ② ودیعہ بن ثابت۔

③ جد بن عبداللہ بن نبیل بن الحرث بنی عمرو بن عوف سے۔

④ حارث بن یزید طائی۔ ⑤ اوس بن قیظی۔

⑥ حارث بن سوید۔ ⑦ سعد بن زرارہ۔

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٥٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجالہ رجال الصحیح" (مجمع الزوائد: ٦/ ٢٨٩)

[2] دلائل النبوۃ للبیہقي (٥/ ٢٥٦۔ ٢٥٩) [3] المعجم الأوسط (٤/ ١٤٦)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٧٩) [5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٧٩)

⑧ قیس بن فہد۔ ⑨ سوید۔

⑩ داعس قبیلہ بنی الحبلی سے۔ ⑪ قیس بن عمرو بن سہل۔

⑫ زید بن اللصیت ⑬ سلام بن الحمام۔

یہ دونوں بنی قینقاع میں سے تھے، انھوں نے اظہارِ اسلام کیا تھا۔[1]

رسول کا قصور، باعثِ برکت ہونا؟!

پھر اللہ نے فرمایا کہ ان کے پاس رسول کا اور کوئی قصور نہ تھا، مگر یہی کہ اللہ کی طرف سے برکت اور نبیِ اکرم ﷺ کی بخشش اور عطا نے ان کو تونگر بنا دیا۔ اگر ان پر سعادت تمام ہوتی تو اللہ ان کو ہدایت بھی کرتا، جس طرح نبیِ اکرم ﷺ نے انصار سے فرمایا تھا: «أَلَمْ أَجِدْكُمْ ضَلاَلاً فَهَدَاكُمُ اللّٰهُ بِيْ، وَكُنْتُمْ مُتَفَرِّقِيْنَ فَأَلَّفَكُمُ اللّٰهُ بِيْ، وَعَالَةً فَأَغْنَاكُمُ اللّٰهُ بِيْ» ''کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا تھا، پس اللہ نے تم کو میری وجہ سے ہدایت دی۔ تم آپس میں بٹے ہوئے تھے، اللہ نے میری وجہ سے تمھارے درمیان اُلفت ڈال دی، تم بے مال و زر تھے، اللہ نے تم کو میری وجہ سے تونگر بنا دیا۔'' جب نبیِ اکرم ﷺ یہ بات کہتے وہ کہتے: ''اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمَنُّ''[2]

یہ صیغہ ''وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ إِلَّا كَذَا'' اسی جگہ کہا جاتا ہے، جہاں کوئی قصور، فتور اور گناہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: «مَا يَنْقِمُ ابْنُ جَمِيْلٍ إِلَّا أَنْ كَانَ فَقِيْراً فَأَغْنَاهُ اللّٰهُ»[3] پھر اللہ نے ان کو توبہ کی طرف بلایا اور فرمایا کہ اگر وہ توبہ نہ کریں گے اور اپنی چال پر لگے رہیں گے تو انھیں عذابِ الیم دیا جائے گا، دنیا میں قتل و ہم و غم ہوگا، آخرت میں عذاب اور ذلت اور رسوائی، پھر کوئی روئے زمین پر ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا کہ ان کو کچھ خیر پہنچائے یا ان سے کوئی شر دور کرے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ آیتِ باب کے شانِ نزول کے بارے میں ائمہ تفسیر کا اختلاف ہے، کسی نے کہا ہے جلاس اور ودیعہ کے حق میں اتری ہے، کسی نے کہا ہے کہ راس المنافقین ابن اُبی کے حق میں نازل ہوئی۔ بہرحال، خواہ اس کا نزول ایک کے حق میں ہوا یا دونوں کے حق میں، قول کی نسبت ان کے ارادے کی مناسبت سے سب کی طرف ہے۔

پھر اللہ نے فرمایا کہ یہ منافق اپنی قسموں میں جھوٹے ہیں، انھوں نے ظاہر میں مسلمان ہو کر یہ کفریہ کلمہ کہا اور

---

[1] المعجم الكبير (٣/ ١٦٥۔ ١٦٦)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦١)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٣)

یہ منصوبہ بنایا کہ غزوۂ تبوک میں شب عقبہ میں نبی اکرم ﷺ کو مار ڈالیں، وہ کچھ اوپر دس آدمی تھے۔ سیدنا عمار بن یاسر اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما نے، جبکہ انھوں نے آ گھیرا، سواریوں کو مار کر تیز ہانکا۔ یہ قصہ سیرت حلبی میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔[1] اُن کو یہ برا لگا کہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے طفیل ان کو آسودہ حال کر دیا تھا، حالانکہ وہ تنگ دستی کی زندگی میں تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ مدینے میں آئے تو ان کی معیشت وسیع اور اموال کثرت کے ساتھ ہو گئے۔ بجائے شکر بجا لانے کے تکالیف پہنچانے لگے۔ اب بھی اگر وہ توبہ کریں تو ان کے لیے بہتر ہے دنیا اور آخرت میں۔ چنانچہ جلاس نے اچھی سچی اور پکی توبہ کی۔

منافق کی توبہ:

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ منافق و کافر کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ زندیق میں اختلاف ہے۔ مالک اور مالکیہ کہتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول نہیں، اس لیے کہ وہ ہر دم توبہ اور اسلام کا اظہار کرتا ہے، کیا معلوم کہ صحیح توبہ کی ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ توبہ نہ کریں گے تو دردناک عذاب ملے گا۔ دنیا میں قتل و قید اور اموال کا برباد ہونا ہے، آخرت کا وبال الگ ہے۔ اب کوئی زمین میں مددگار نہ ہوگا، حالانکہ زمین کشادہ اور زمین والے کثرت سے موجود ہیں۔[2] واللہ أعلم

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۷۶ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۷۷ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۷۸

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے ہمیں عطا کیا تو ہم ضرور صدقہ خیرات کریں گے اور ہم ضرور صالحین میں سے ہو جائیں گے (75) پھر جب اللہ نے اپنے فضل سے انھیں عطا کیا تو انھوں نے اس میں بخل کیا اور انھوں نے (حق سے) منہ موڑ لیا، اور وہ (اپنے عہد سے) منحرف ہو گئے (76) پھر اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال کر انھیں اس دن تک کے لیے سزا دی (جس دن) وہ اللہ سے ملیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی

[1] السيرة الحلبية (٣/ ١٢٠۔ ١٢١) [2] فتح البيان (٥/ ٣٤٠۔ ٣٥٢)

اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے (77) کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ان کے بھیدوں اور ان کی سرگوشیوں کو جانتا ہے۔ اور بے شک اللہ غیب کی باتوں کو خوب جانتا ہے (78)

منافقوں کی علامات: مال مانگنا، پھر صدقہ کرنے میں بخیلی کرنا:

ایک منافق تھا ثعلبہ، اس نے نبیِ اکرم ﷺ سے دعا چاہی کہ مجھ کو کشائش (فراوانی) ہو۔ تھوڑا کہ جس کا آدمی شکر کرے وہ بہتر ہے، اس بہت سے مال سے جو غفلت میں مبتلا کر دے۔ پھر آیا اور عہد کرنے لگا کہ اگر مجھ کو مال ملے تو میں بہت خیرات کروں گا اور غفلت میں نہ پڑوں گا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے دعا کی، اس کی بکریوں کو کثرت ملی، یہاں تک کہ مدینے کا جنگل اس کے لیے ناکافی ہو گیا، وہاں سے نکل کر گاؤں میں جا رہا، جمعہ اور جماعت سے محروم ہو گیا۔ نبیِ اکرم ﷺ نے پوچھا کہ ثعلبہ کو کیا ہوا؟ لوگوں نے بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ثعلبہ خراب ہو گیا۔ پھر زکات کا وقت ہوا، سب مدینے میں زکات دینے لگے، اس نے کہا کہ یہ مال دینا تو گویا جزیہ دینا ہے، بہانہ کر کے ٹال دیا۔ پھر نبیِ اکرم ﷺ کے پاس مالِ زکات لے کر آیا، آپ ﷺ نے قبول نہ کیا۔ بعد میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی اپنی خلافت میں اس کی زکات نہ لیتے، خلافتِ عثمان رضی اللہ عنہ میں مر گیا۔ اللہ نے اس آیت میں فرمایا کہ منافقوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ سے عہد و پیمان کر کے بدل جاتے ہیں، اپنا قول و قرار پورا نہیں کرتے اور نہ بات کے سچے ہیں، سو اس کردارِ ناہموار پر ان کے دلوں میں نفاق تا قیامت آ رہا ہے۔ عیاذاً باللہ۔

شانِ نزول:

بہت سے مفسرین نے، جیسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری رحمہ اللہ ہیں، یہ کہا ہے کہ اس آیت کا نزول ثعلبہ بن حاطب انصاری کے حق میں ہوا ہے۔[1] امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے ثعلبہ رضی اللہ عنہ کا قصہ، جس طرح اوپر گزر چکا، روایت کیا ہے اور کسی قدر الفاظ زیادہ ہیں۔[2] پھر اللہ نے کہا کہ یہ نفاق ان کے دلوں میں یوں جما کہ انھوں نے وعدے کا خلاف کیا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: « آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ »[3] یہ اس بات پر دلیل ہے کہ نفاقِ عمل بھی سخت مضر ہوتا ہے اور منافقِ عمل کا عمل مقبول نہیں ہوتا، اسی لیے ہر سہ خلافت میں ثعلبہ کی زکات نہ لی گئی۔ اللہ نے فرمایا کہ اللہ بھید کی باتوں اور چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے۔ وہ ان کے ضمیروں کو خوب جانتا ہے، اس کے شواہد بہت ہیں۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم بالجزئیات ہے۔

---

[1] یہ واقعہ صحیح سند سے ثابت نہیں، اس لیے اس کی نسبت صحابیِ رسول حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں۔ واعظ حضرات کو بھی یہ واقعہ قطعاً بیان نہیں کرنا چاہیے۔ [ص۔ ی]

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٣٧٠۔ ٣٧٢) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٤٧۔ ١٨٤٩) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: ﴿ لَىِٕنْ ﴾ میں لام قسم کا ہے، جیسے: وَاللّٰهِ لَئِنْ۔ صدقے سے مراد زکاتِ مفروضہ وغیرہا ہے۔ صلاح فساد کی ضد کو کہتے ہیں۔ مفسد وہ ہے جو شریعت کے لازمی حکم میں بخل کرتا ہے۔ ثعلبہ نے کہا تھا کہ اللہ اگر مجھ کو مال دے گا تو میں ہر حق دار کو دوں گا، اللہ نے اس کو مبتلا کیا، وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہا، اللہ کو غصہ آیا، اس کا قصہ قرآن میں ذکر کیا ہے۔ ابن منذر رحمہ اللہ نے اس قصے کو مفصل روایت کیا ہے۔[1] اس کے اس بخل اور اعراض پر اللہ نے اس کے دل میں نفاق ڈال دیا، جو قیامت تک نہ نکلے گا، کیونکہ اللہ سے وعدہ خلافی کرنا کچھ آسان بات نہیں ہے اور نبی اور رسول اللہ ﷺ سے جھوٹ بول جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «أَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِّنْ نِّفَاقٍ حَتّٰى يَدَعَهَا... الحديث. وَفِيْهِ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ»[2]

پھر اللہ نے کہا کہ یہ منافق شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ اللہ کو ہمارے بھید اور مشورہ کا کچھ علم نہیں ہے۔ سو اللہ علام الغیوب ہے، اس سے تمھارے دلوں کی کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی۔ یہ محض ان احمقوں کا خام خیال ہے اور جب سب غیب اس کے نزدیک شہادت کے حکم میں ہیں تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر مخفی عمل اور دل کے فعل پر سزا دے گا۔[3]

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

جو لوگ عیب جوئی کرتے ہیں کھلے دل سے خیرات کرنے والے مومنوں پر، (ان کے) صدقات کی بابت اور ان پر بھی جو اپنی (تھوڑی سی) محنت مزدوری کے سوا کچھ نہیں رکھتے، تو وہ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، اللہ بھی ان کا مذاق اُڑائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿79﴾

صدقہ کرنے والے اہلِ ایمان کا مذاق اڑانا:

ایک دفعہ نبیِ کریم ﷺ نے صدقہ و خیرات کی ترغیب دی۔ سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار درہم لائے۔ اور لوگ بھی لانے لگے۔ عاصم چار سیر جو لائے۔ عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں آٹھ ہزار درہم رکھتا تھا، نصف اپنے رب کو قرض دیتا ہوں اور نصف حق اہل و عیال کا۔ عاصم رضی اللہ عنہ نے کہا: مزدوری کر کے آٹھ سیر جو لایا ہوں، نصف

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۳) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۹)
[3] فتح البيان (۵/ ۳۵۳۔ ۳۵۵)

خیرات کرتا ہوں اور نصف عیال کی ضرورت کے لیے۔ منافق آپس میں کہنے لگے کہ عبدالرحمان کو اپنی نمود و نمایش منظور ہے اور عاصم اپنے تئیں زبردستی سے خیرات کرنے والوں میں شامل کرتا ہے، یعنی خون لگا کے شہیدوں میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بھی نفاق کی ایک صفت ہے کہ کوئی منافق عیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے سے باز نہیں رہتا، کسی حال میں بھی، یہاں تک کہ مسلمانوں کے صدقہ خیرات دینے پر بھی طعنہ دیتا ہے، اگر کوئی زیادہ مال لاتا ہے تو اس کو ریا کار ٹھہراتا ہے اور جو تھوڑا مال لاتا ہے تو کہتا ہے اللہ اس کے صدقے سے غنی ہے۔

شانِ نزول:

صحیح بخاری میں سیدنا ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ جب صدقہ کے بارے میں آیت اتری تو ہم اپنی پشت پر لاد کر لاتے، ایک مرد بہت سا صدقہ لایا، اس کو کہا کہ یہ ریاکار ہے۔ دوسرے مرد نے ایک صاع صدقہ دیا، اس کے صدقے سے اللہ کو بے نیاز بتایا، اس پر یہ آیت اتری، اس کو امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[1] نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بقیع میں تھے، فرمایا: «مَنْ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ أَشْهَدُ لَهُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ»

راویِ حدیث نے کہا: میں نے اپنی پگڑی سے ایک یا دو بل کھولے، میں چاہتا تھا کہ صدقہ کروں، پھر میرے جی میں کچھ خیال آیا جو ابن آدم کو آ جاتا ہے، میں نے پگڑی میں باندھ رکھے، ایک آدمی آیا، میں نے کوئی شخص اس سے زیادہ کالا، چھوٹا اور مذموم نہ دیکھا، ایک اونٹ ہانکتا ہوا لایا، اس اونٹ سے زیادہ خوب صورت اونٹ بھی میں نے نہ دیکھا تھا، کہا: اے اللہ کے رسول! یہ صدقہ ہے۔ فرمایا: ہاں، «دُوْنَكَ هٰذِهِ النَّاقَةَ» ایک شخص نے اس پر طعن کی اور کہا: "هٰذَا يَتَصَدَّقُ بِهٰذَا فَوَ اللّٰهِ هِيَ خَيْرٌ مِنْهُ" نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: «كَذَبْتَ بَلْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْكَ وَمِنْهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ» پھر کہا: خرابی ہے سو اونٹ والوں کی، تیرے اصحاب میں سے۔ کہا: پھر کس کی خرابی نہیں ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم؟ فرمایا: جس نے مال دیا هٰكَذَا وَهٰكَذَا اور اپنے دونوں ہاتھ داہنا اور بایاں جمع کیے، پھر فرمایا: «قَدْ أَفْلَحَ الْمُزْهِدُ الْمُجْهِدُ، الْمُزْهِدُ فِي الْعَيْشِ الْمُجْهِدُ فِي الْعِبَادَةِ»[2]

سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے صدقے کا قصہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیر واحد سے مروی ہے، لیکن اس میں یہ ذکر ہے کہ سیدنا عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار اوقیہ زرِ صدقہ میں دیے اور عاصم رضی اللہ عنہ نے سو وسق تمر اور جس نے اپنی جہد سے دیا تھا وہ ابوعقیل اخو بنی انیف تھا، وہ ایک صاع تمر لایا تھا، اس پر قہقہے اڑے اور کہا کہ اللہ ابی عقیل کے ایک صاع سے غنی ہے۔[3]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک لشکر بھیجنا چاہتا ہوں، تم

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٨)

[2] مسند أحمد (٥/ ٣٤) اس کی سند میں دو راوی مجہول ہیں اور ان کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ [3] تفسير الطبري (١٤/ ٣٨٢۔ ٣٨٧)

صدقہ دو۔ اس پر ابن عوف رضی اللہ عنہ چار ہزار لائے، نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: « بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيمَا أَعْطَيْتَ وَبَارَكَ فِيمَا أَمْسَكْتَ » ایک انصاری ایک صاع تمر لایا اور کہا: دو صاع تھے، ایک اپنے رب کو قرض دیتا ہوں اور دوسرا میرے عیال کے لیے ہے، اس پر منافقوں نے طعن کیا۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ ایک صاع کا قصہ ابن عقیل سے نقل کیا ہے، پھر کہا کہ یہ آیت اس پر اتری۔[2] امام طبرانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوعقیل کا نام حباب تھا، کسی نے کہا: عبدالرحمن بن عبداللہ بن ثعلبہ تھا۔[3] اللہ کا یہ تمسخر ان کے تمسخر کے مقابلے میں اس لیے ہے کہ جزا جنسِ عمل سے ہوتی ہے، لہٰذا ان کے ساتھ وہی عمل کیا جو انھوں نے کیا تھا، تاکہ مومنین کا انتصار ہو، دنیا اور آخرت میں منافقوں کے لیے عذابِ الیم ہوگا۔ لِأَنَّ الْجَزَاءَ مِنْ جِنْسِ الْعَمَلِ.

فتح البیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ لمز بہ معنی عیب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بمعنی طعن ہے۔[4] تطوع بمعنی تنفُّل ہے، یعنی تبرع اس چیز کا جو شرع میں واجب نہیں، ﴿ جُهْدَ ﴾ بمعنی طاقت ہے، یہ اہلِ حجاز کی لغت ہے اور بفتح جَھد بمعنی مشقت ہے، یہ اوروں کی لغت ہے۔ کسی نے کہا: "هُمَا لُغَتَانِ وَمَعْنَا هُمَا وَاحِدٌ ﴿سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ﴾" دعا ہے ان پر کہ جس طرح انھوں نے مسلمانوں سے ٹھٹھا کیا ہے، اللہ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کرے۔ ﴿ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ سے مراد ایسا عذاب ہے جو ثابت رہے اور مستقل سخت تکلیف دیتا رہے۔[5]

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾

(اے نبی!) آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں (برابر ہے) اگر آپ ان کے لیے ستر بار (بھی) بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ انھیں نہیں بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (80)

منافقوں کے لیے استغفار کی ممانعت:

یہاں سے بے اعتقاد کا اور گناہ گار کا فرق نکلتا ہے۔ ایسا کون سا گناہ ہے جو پیغمبر کے بخشوانے سے نہ بخشا جائے اور بے اعتقاد کو پیغمبر کے ستر استغفار بھی فائدہ نہ کریں!۔ اب جو بے اعتقاد پیغمبر کی شفاعت پر بھروسا کریں تو

[1] مسند البزار (١٥/ ٢٣٤) [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٨٨۔ ٣٨٩) [3] المعجم الكبير (٤/ ٤٥)
[4] الدر المنثور (٤/ ٢٥٢) [5] فتح البيان (٥/ ٣٥٥۔ ٣٥٦)

کس دلیل سے؟ مثلاً: آدمی کے پاس بدی ہو یا نماز روزہ نہ ہو اور وہ شرمندہ اور نادم ہے تو وہ گناہ گار ہے اور جو کوئی بدکام کو عیب نہ جانے اور اللہ کے فرض کیے ہوئے کام کو کرنا نہ کرنا برابر سمجھے اور طعن کرے، وہ بے اعتقاد ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو خبر دی کہ یہ منافق استغفار کے لائق نہیں ہیں، ان کے لیے گو ستر بار استغفار کی جائے، اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔ ستر کا ذکر مادۂ استغفار کے حَسم (قطع کرنا) کے لیے ہے۔ عرب لوگ اپنی بول چال میں مبالغے کے وقت ستر بار کا ذکر کرتے تھے، کچھ حد مقرر کرنا مراد نہیں ہوتا تھا اور نہ یہ کہ اس سے زیادہ اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس عدد کا مفہوم یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب یہ آیت اتری تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کو سنتا ہوں کہ مجھ کو ان کے بارے میں رخصت دی ہے، سو واللہ! میں ان کے لیے ستر بار استغفار کروں گا، شاید اللہ ان کو بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے شدتِ غضب سے فرمایا کہ تمھارا استغفار کرنا نہ کرنا ان کے لیے یکساں ہے، میں ان کو ہرگز نہیں بخشنے کا۔[1]

امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب عبداللہ بن اُبی بھاری ہوا، یعنی مرنے لگا تو اس کا بیٹا نبیِ اکرم ﷺ کے پاس گیا اور کہا: میرا باپ محتضر (قریب المرگ) ہے، آپ چلیں، نماز پڑھیں، فرمایا: کیا نام ہے؟ کہا: حباب بن عبداللہ۔ فرمایا تُو عبداللہ بن عبداللہ ہے، حباب شیطان کا نام ہے، پھر اس کے ساتھ چلے اور اپنی قمیص اس کو پہنچائی اور نماز پڑھی، کسی نے کہا: آپ اس پر نماز پڑھتے ہیں، فرمایا: اللہ نے کہا ہے: ﴿ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً ﴾ میں ان کے لیے ستر بار، پھر ستر بار، پھر ستر بار استغفار کروں گا۔ عروہ بن زبیر، مجاہد بن جبر اور قتادہ بن دعامہ رحمہم اللہ سے اسی طرح مروی ہے۔[2] (رواه جرير بأسانيده)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ سے کہا کہ آپ کا منافقین کے لیے استغفار کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں، اس لیے کہ یہ نہ استغفار کے لائق ہیں اور نہ بخشش کے لائق ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ﴾ [التوبة: ٥٣] ''کہہ دیجیے: تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔'' اس میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ منافقوں کو نہیں بخشے گا، گو نبیِ اکرم ﷺ ان کے لیے استغفار کریں، یہ مراد نہیں کہ اگر ستر بار سے زیادہ استغفار کریں گے تو وہ مقبول ہوگی، جس طرح کہ تمام اعداد سے عام فہم لیا جاتا ہے، بلکہ مبالغہ ہے اس کے قبول نہ ہونے میں۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٩٦۔ ٣٩٧) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٤/ ٣٩٥۔ ٣٩٧) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٩٣) یہ روایات مرسل ہیں۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے، جیسا کہ آیت نمبر ٨٤ کی تفسیر میں ذکر ہوگی۔

عرب اس محاورے کو اپنے کلام میں بجائے مثل کے بولتے تھے، جبکہ ارادہ کسی امر کو کثرت سے ظاہر کرنے کا کرتے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حد اس لیے ہے کہ اس سے زیادہ تعداد میں قبول ہو سکتا ہے، لیکن یہ ظاہر آیت کے خلاف ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کا یہ کہنا کہ میں اس عدد سے زیادہ بار استغفار کروں گا، کمال رحمت اور مہربانی کے طور پر تھا، اپنی امت کے لیے اور یہ انبیا علیہم السلام کا ادب ہے، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ﴿ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ [إبراھیم: ٣٦] ''جو میری نافرمانی کرے، تو بلاشبہ تو غفور (اور) رحیم ہے۔'' پھر اللہ نے منع کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ یہ عدمِ قبول اس لیے ہے کہ وہ کافر اور اللہ اور رسول کے منکر ہیں اور اللہ فاسقین کو ہدایت نہیں کرتا۔[1]

یہ تعلیل اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے لوگ نبیِ اکرم ﷺ کی شفاعت اور اللہ کی مغفرت سے مایوس ہیں، جو کوئی شخص قیامت تک ان اوصاف کا حامل ہوگا اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اس لیے کہ اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ گور پرست، پیر پرست، رائے پرست، امام شہید ولی پرست دھوکے میں پڑے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ یا پیر صاحب وغیرہ ہماری شفاعت کر کے مغفرت کرا دیں گے، یہ نہیں جانتے کہ پیر خود درماندۂ شفاعت ہیں، بھلا کہیں کفر و شرک اور نفاق کے ہوتے ہوئے بھی کسی کی شفاعت ہو سکتی ہے، شفاعت تو گناہ گار کی ہوگی، جس سے کوئی گناہِ کبیرہ بھول چوک سے ہو گیا اور اصل ایمانِ صریح اور اعتقادِ صحیح رکھ کر دنیا سے اٹھا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ
يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا
تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ
كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝81 فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ
جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝82

جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، وہ رسول اللہ کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے (اوروں سے) کہا کہ گرمی میں کوچ نہ کرو۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: جہنم کی آگ (اس سے) کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ یہ بات سمجھتے (81)
چناں چہ انھیں چاہیے کہ وہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے (82)

غزوۂ تبوک میں پیچھے رہنے والے منافقوں کی مذمت:

اللہ نے اس آیت میں ان منافقوں کی مذمت کی ہے جنھوں نے غزوۂ تبوک میں نبیِ اکرم ﷺ کا ساتھ نہ دیا

[1] فتح البیان (٥/ ٣٥٧۔ ٣٥٨)

اور اپنے بیٹھے رہنے پر اور نبی اکرم ﷺ کے جانے پر خوشی ظاہر کی اور جہاد سے جی چرایا اور لوگوں سے کہا کہ تم بھی اس گرمی میں باہر نہ نکلو، کیونکہ غزوۂ تبوک گرمی کے موسم میں میوہ کے پکنے اور سایہ کے وقت تھا۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا: تم ان سے یہ کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس گرمی سے زیادہ گرم تر ہے، بلکہ کوئی آگ بھی جہنم کی آگ سے زیادہ گرم نہیں ہے۔

جہنم کی آگ کی شدت:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «نَارُ بَنِي آدَمَ الَّتِي يُوقِدُونَهَا جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِينَ جُزْءً مِّنْ نَّارِ جَهَنَّمَ»[1] (رواه مالك والشيخان) دوسرے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ نَارَكُمْ هَذِهِ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِينَ جُزْءً مِّنْ نَارِ جَهَنَّمَ فَضُرِبَتْ فِي الْبَحْرِ مَرَّتَيْنِ وَلَوْ لَا ذٰلِكَ مَا جَعَلَ اللّٰهُ فِيهَا مَنْفَعَةً لِّأَحَدٍ»[2] (رواه أحمد بإسناد صحيح) اس روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں: «أَوْقَدَ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ أَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى احْمَرَّتْ، ثُمَّ أَوْقَدَ عَلَيْهَا أَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى ابْيَضَّتْ، ثُمَّ أَوْقَدَ عَلَيْهَا أَلْفَ سَنَةٍ حَتّٰى اسْوَدَّتْ فَهِيَ سَوْدَآءُ كَاللَّيْلِ الْمُظْلِمِ»[3] (رواه الترمذي) وقال: "لَا أَعْلَمُ أَحَداً رَفَعَهُ غَيْرُ يَحْيٰى كَذَا قَالَ" وقد رواه ابن مردويه وروىٰ أيضا عن أنس قَالَ: تَلَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ نَاراً وَّقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ قَالَ: أُوْقِدَ عَلَيْهَا أَلْفَ عَامٍ حَتّٰى ابْيَضَّتْ، وَأَلْفَ عَامٍ حَتّٰى احْمَرَّتْ، وَ أَلْفَ عَامٍ حَتّٰى اسْوَدَّتْ، فَهِيَ سَوْدَآءُ كَاللَّيْلِ لَا يُضِيءُ لَهَبُهَا»[4] امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح روایت کیا ہے: «لَوْ أَنَّ شِرَاراً مِّنْ نَّارِ جَهَنَّمَ بِالْمَشْرِقِ لَوَجَدَ حَرَّهَا مَنْ بِالْمَغْرِبِ»[5]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اگر اس مسجد میں ایک لاکھ یا زیادہ ہوں اور ان میں ایک آدمی دوزخی ہو، پھر وہ سانس لے اور وہ سانس ان کو پہنچے تو مسجد اور جو لوگ مسجد میں ہوں سب کے سب جل جائیں۔[6] (رواه أبو يعلى وهو غريب) نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ نار میں سے بہت ہلکے عذاب والا

---

[1] الموطأ (٢/ ٩٩٤) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٣)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٤٤) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٤٥)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٩١) اس کی سند میں ''شریک بن عبداللہ'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٠٥)

[4] شعب الإيمان (١/ ٤٨٩) اس کی سند میں ''مبارک بن فضالہ کمزور اور ''محمد بن یونس کدیمی'' ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢/ ١٨٣)

[5] المعجم الأوسط (٤/ ٨٧) اس کی سند میں ''تمام بن نجیح'' ضعیف راوی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٠٢٢)

[6] مسند أبي يعلى (١٢/ ٢٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٥٠٩)

قیامت کے دن وہ شخص ہوگا جس کے دو نعل اور دو تسمے آگ کے ہوں گے، جس سے اس کا دماغ پکے گا جیسے ہنڈیا پکتی ہے، وہ نہ دیکھے گا کہ اہلِ نار میں سے اس سے زیادہ کسی کو عذاب ہو رہا ہے، حالانکہ وہ ان میں سب سے کم عذاب والا ہے۔[1] (رواه الشيخان)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قیامت کے دن اہلِ نار سے سب سے ہلکے عذاب والے کو آگ کی دو جوتیاں پہنا دی جائیں گی، جس سے ان جوتیوں کی گرمی سے اس کا بھیجا پکے گا۔[2] (رواه مسلم)
سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: « إِنَّ أَدْنىٰ أَهْلِ النَّارِ عَذَاباً رَجُلٌ يُّجْعَلُ لَهُ نَعْلَانِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهُ »[3] (رواه أحمد وهو إسناد جيد قوي رجاله على شرط مسلم) والله أعلم.

اس بارے میں احادیث اور آثارِ نبویہ بہت ہیں اور اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے: ﴿ كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴾ [المعارج: ١٥۔ ١٦] ''ہرگز نہیں! بے شک وہ بھڑکتی آگ ہے۔ چمڑیاں ادھیڑ دینے والی۔'' نیز فرمایا: ﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ [الحج: ١٩۔ ٢٢] ''ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا۔ اس سے وہ سب کچھ گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور (ان کی) کھالیں بھی۔ اور ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو!''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ﴾ [النساء: ٥٦] ''بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم جلد انھیں آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں جل جائیں گی تو ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں چڑھا دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں۔'' اور اس جگہ فرمایا: ﴿ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴾ (آیتِ باب) یعنی اگر وہ اس حال کو سمجھتے بوجھتے تو رسول کے ساتھ کوچ کرتے، اللہ کے رستے میں اسی گرمی کے اندر، تاکہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاتے جو اس گرمی سے کئی گنا زیادہ ہے جس طرح کسی شاعر نے کہا ؏

عُمُرُكَ بِالْحَمِيَّةِ أَفْنَيْتَهُ ۔۔۔ خَوْفاً مِّنَ الْبَارِدِ وَالْحَارِّ
وَكَانَ أَوْلىٰ بِكَ أَنْ تَتَّقِيَ ۔۔۔ مِنَ الْمَعَاصِيْ حَذَرَ النَّارِ

''ساری عمر تو نے ٹھنڈے گرم سے بچنے میں گزار دی، حالانکہ تو جس طرح آگ سے ڈرتا ہے، اس طرح تجھ کو گناہوں سے بچنا چاہیے تھا۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١١) [3] مسند أحمد (٢/ ٤٣٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٨٠)

آگ کی خاصیت اور جہنم کے عذاب کے بارے میں جس قدر اور احادیث آئی ہیں، وہ سب کتاب "يقظة أولي الاعتبار" (نواب صاحب کی تالیف) اکٹھی جمع کر دی گئی ہیں، یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اسی طرح اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ولله الحمد وبه الاستعاذ من النار.

روؤ زیادہ، کم ہنسو اور اہلِ جہنم کا رونا:

پھر اللہ نے منافقین کو یہ وعید سنائی کہ تم بہت روؤ اور کم ہنسو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دنیا قلیل ہے، جتنا چاہو اس میں ہنس لو، جب وہ منقطع ہو جائے گی اور تم آخرت میں جاؤ گے تو پھر نئے سرے سے روؤ گے وہ رونا منقطع نہ ہو گا۔ ایسا ہی امام ابو رزین، حسن، قتادہ، ربیع بن خثیم، عون، عقیلی اور زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ مسموعاً مرفوعاً کہتے ہیں: «أَيُّهَا النَّاسُ ابْكُوا فَإِنْ لَّمْ تَبْكُوا، فَتَبَاكَوْا فَإِنَّ أَهْلَ النَّارِ يَبْكُوْنَ حَتّٰى تَسِيْلَ دُمُوْعُهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ كَأَنَّهَا جَدَاوِلُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ الدُّمُوْعُ فَتَسِيْلُ الدِّمَاءُ، فَتَقْرَحُ الْعُيُوْنُ، فَلَوْ أَنَّ سُفُنًا أُجْرِيَتْ فِيْهَا لَجَرَتْ»[2] (رواه أبو يعلى وابن ماجة)

زید بن رفیع رحمہ اللہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ نار جب نار میں داخل ہوں گے، آنسو روئیں گے مدت تک، پھر ایک زمانے تک پیپ روئیں گے، آگ کے داروغے ان سے کہیں گے: اے گروہِ بدبختان! تم نے دنیا میں رونا چھوڑ دیا تھا، وہ گھر ایسا تھا کہ اس کے گھر والے مرحوم ہوتے تھے، یعنی ان پر رحم کیا جاتا ہے، کیا آج کے دن تم کوئی فریاد رس پاتے ہو، تب وہ بلند آواز سے پکاریں گے کہ اے اہلِ جنت! اے گروہِ پدران و مادران و اولاد! ہم قبروں سے پیاسے نکلے ہیں اور ایک طویل مدت تک پیاسے کھڑے رہے ہیں اور آج کے دن پیاسے ہیں، ہم کو کچھ پانی دو یا اس سے دو جو اللہ نے تم کو روزی دی ہے۔ وہ چالیس سال تک پکارتے رہیں گے، کوئی ان کو جواب نہ دے گا، پھر یہ جواب دیں گے، تم آگ ہی میں رہنے والے ہو، تب وہ ہر خیر سے نا اُمید ہو جائیں گے۔[3]

(رواه الحافظ أبو بكر بن عبد الله بن محمد بن أبي الدنيا)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مخلفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اذن لے کر اپنے گھروں میں بیٹھ رہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوۂ تبوک میں نہ گئے اور اللہ کے رستے میں جان و مال سے لڑنا برا جانا اور ایمان

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ١٨٥٥۔ ١٨٥٦) تفسیر الطبري (١٤/ ٤٠١۔ ٤٠٣)

[2] مسند أبي يعلىٰ (٧/ ١٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٢٤) اس کی سند میں "یزید بن ابان القرشی" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٨٨٩)

[3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٤٩٥) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز اس کی سند میں "حماد بن عمرو نصیبی" سخت ضعیف راوی ہے۔

اور اخلاص کے نہ ہونے کی وجہ سے اور نفاق کے موجود ہونے کی وجہ سے بخل کیا۔ خازن نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ انسان طبعی طور پر آرام و راحت اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ بیٹھے رہنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور مال اور جان کے ضائع ہونے کو پسند نہیں کرتا۔ یہ لوگ خود بھی بیٹھ رہے اور دوسروں سے بھی کہا کہ تم اس سخت گرمی اور قحط میں لڑنے کو کیوں جاتے ہو، مت جاؤ۔ یہ بے وقوف اتنا نہ سمجھے کہ یہ گرمی تو تھوڑی ہے۔ جہنم کی آگ اور جہنم تو اس سے کہیں بڑھ کر ہوگی، اس میں ہمیشہ کے لیے جانا پڑے گا۔ "فَرَرْتُمْ مِنْ حَرٍّ يَسِيْرٍ فِيْ زَمَنٍ قَصِيْرٍ وَ وَقَعْتُمْ فِيْ حَرٍّ كَثِيْرٍ فِيْ زَمَنٍ كَبِيْرٍ بَلْ غَيْرُ مُتَنَاهٍ أَبَداً الْآبِدِيْنَ وَدَهْرَ الدَّاهِرِيْنَ"

اب ان مخلفین کو چاہیے کہ اپنی اس بدبختی پر خوب سا روئیں اور کم ہنسیں، کیونکہ یہ بہت سا رونا یہاں کا بہ نسبت اس جگہ کے بہت تھوڑا ہے اس لیے کہ دنیا فانی ہے، آخرت باقی ہے، شی منقطع ہمیشہ باقی رہنے والی شے کی نسبت تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا»[1] (اخرجه البخاري)

فَإِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ إِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ أَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ إِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

(اے نبی!) پھر اگر اللہ آپ کو واپس لے آئے ان (منافقین) میں سے کسی گروہ کی طرف، پھر وہ آپ سے (جہاد پر) نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دیجیے: تم اب میرے ساتھ کبھی بھی (جہاد پر) نہیں نکلو گے اور نہ کبھی میرے ساتھ (مل کر) دشمن سے لڑو گے، یقیناً تم پہلی بار (پیچھے) بیٹھ رہنے پر راضی ہو گئے تھے تو (اب بھی) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو (83)

منافقوں کو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہ دی جائے:

یہ اس لیے فرمایا کہ آیت سفر میں نازل ہوئی، وہ منافق مدینے میں تھے اور ﴿طَآئِفَةٍ﴾ فرمایا اس لیے کہ بعضے منافق پیچھے مڑ گئے اور سب بیٹھنے والے منافق نہ تھے، بعضے مسلمان بھی تھے کہ ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے فرمایا: اے رسول! اگر تو اس جنگ سے ان کے پاس پھر کر جائے اور وہ بارہ منافق آپ سے کسی اور غزوے میں ہمراہ چلنے کے لیے اجازت چاہیں تو آپ ان سے یہ کہہ دیں جو مذکور ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٢٠) فتح البيان (٥/ ٣٥٩ـ ٣٦٠)

کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿ سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ۖ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ ۚ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۖ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ [الفتح: ١٥] ”عن قریب جب تم مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لیے چلو گے تو پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ کہیں گے: ہمیں بھی چھوٹ (اجازت) دیجیے ہم بھی تمھارے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا کلام (وعدہ) بدل دیں، کہہ دیجیے: تم ہرگز ہمارے پیچھے نہیں چلو گے، اللہ نے پہلے ہی سے یہ فرما دیا ہے۔ پھر وہ یقیناً کہیں گے: (نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو، (ایسا نہیں) بلکہ وہ لوگ کم ہی سمجھتے ہیں۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خالفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوے سے متخلف (پیچھے) رہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی عورتیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تفسیر ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ اگر عورتیں مراد ہوتیں تو خوالف یا خالفات آتا اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو راجح ٹھہرایا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ طائفہ کی طرف لوٹ کر جانے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ مقیم مدینہ کے سارے کچھ منافق نہ تھے، بلکہ ان میں ایسے مومن بھی تھے جو صحیح عذر رکھتے تھے اور بعض بے عذر تھے۔ ان کا عذر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کیا اور اللہ نے ان کی توبہ کو پذیرائی بخشی، جیسے تین آدمی پیچھے رہ جانے والے جن کا بیان آئے گا۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافق آدمی بارہ تھے۔[2] بہرحال آیندہ کے لیے منع کر دیا کہ ان کو کسی لڑائی میں نکلنے کی اجازت نہ دینا، کیونکہ پہلی بار تو وہ نکلے ہی نہیں، اب بھی چاہیے کہ وہ خالفین کے ہمراہ ہی بیٹھے رہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد عاجز عورتیں اور مرد ہیں۔ صیغہ جمع مذکر تغلیباً آیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خالفین وہ ہیں جو بغیر کسی عذر کے جنگ کے لیے نہ نکلے۔[3] آیت اس پر دلیل ہے کہ جب ایک آدمی سے کوئی مکر و فریب اور بدعت ظاہر ہو تو اس سے تعلقات منقطع کرنا واجب ہے، اس کی مصاحبت چھوڑ دے۔[4]

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٨٤﴾

اور (اے نبی!) ان میں سے جو مر جائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ حالتِ فسق میں مرے (84)

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٠٤۔ ٤٠٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٩٥۔ ٤٩٦)
[2] تفسير البيضاوي (٣/ ١٦٣)
[3] الدر المنثور (٤/ ٢٥٨)
[4] فتح البيان (٥/ ٣٦١۔ ٣٦٢)

منافقوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور ان کے لیے بخشش کی دعا کرنے کی ممانعت اور شانِ نزول:

اللہ نے نبیِ اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم منافقوں سے بیزار ہو جاؤ، کوئی ان میں مرے تو اس پر نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر استغفار اور دعا کے لیے کھڑے ہو، اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ اسی حال پر مرے ہیں۔ یہ حکم ہر اس شخص کے حق میں عام ہے، جس کا نفاق مشہور ہے، گو آیت کے نزول کا سبب خاص ہو، جس طرح صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ جب عبداللہ بن اُبی مر گیا تو اس کا بیٹا آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کا کرتا مانگا کہ اس میں باپ کو دفن کرے، آپ نے کرتا عطا کیا، پھر کہا: اس پر نماز پڑھیں، آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا کپڑا پکڑا اور کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اس پر نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ اللہ نے آپ کو اس پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے مجھ کو اختیار دیا ہے۔ میں ستر بار سے زیادہ اس کے لیے استغفار کروں گا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ منافق تھا، نبیِ اکرم ﷺ نے اس پر نماز پڑھی، اس پر یہ آیت اتری۔[1] (وكذا رواه مسلم وقال: قال ابن عمر العمري: فَصَلَّى عَلَيْهِ وَصَلَّيْنَا مَعَهُ وَأَنْزَلَ اللَّهُ هَذِهِ الْآيَةَ[2]. ورواه أحمد عن عمر بن الخطاب ورواه الترمذي وقال: حسن صحيح)

اس قصے کو بالفاظ وطرقِ متعددہ امام احمد، نسائی، بزار اور طبری رحمہم اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر میں موجود ہیں۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ جب سیدنا عباس رضی اللہ عنہ آئے تھے تو ان کے لیے ایک قمیص کی ضرورت تھی، عبداللہ بن اُبی نے اپنی قمیص ان کو دی تھی۔ اس لیے نبیِ اکرم ﷺ نے مکافات (بدلہ) کیا۔[3] واللہ أعلم.

امام ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ جب کسی جنازے پر بلائے جاتے تو حال پوچھ لیتے، اگر لوگ اس پر ثنائے خیر کرتے تو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے اور اگر یہ اور طرح کا ہوتا تو اہلِ جنازہ سے فرماتے، تم پڑھ لو اور خود اس پر نماز نہ پڑھتے،[4] اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جس جنازے کا حال نہ جانتے، اس پر نماز نہ پڑھتے، جب تک کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اس پر نماز نہ پڑھتے، کیونکہ وہ منافقین کے اعیان (مخصوص افراد) کو جانتے تھے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے ان کو اہلِ نفاق کے نام بتا دیے تھے۔ (ولهذا كان يقال له صاحب السر الذي لا يعلمه غيره أي من الصحابة)

ابو عبید رحمہ اللہ نے کتاب الغریب میں کہا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھنی چاہی، حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کے چٹکی لی، گویا نماز پڑھنے سے منع کیا۔[5] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں جبکہ اللہ نے منافقین پر نماز پڑھنے اور ان کی قبر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩٥)

[3] مسند أحمد (١/ ١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٠٠) مسند البزار (١/ ٢٩٨) تفسير الطبري (١٤/ ٤٠٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٩٦۔ ٤٩٨)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٩٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٣/ ٨٢)

[5] غريب الحديث (٣/ ٢٦٦)

پر کھڑا ہونے اور ان کے لیے استغفار کرنے سے منع کیا تو معلوم ہوا کہ مومنین کے حق میں یہ کام اکبر قربات اور بڑی نیکیوں سے ہے اور اس کے بجالانے سے بڑا اجر ملتا ہے، جس طرح صحاح ستہ وغیرہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «مَنْ شَهِدَ الْجَنَازَةَ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا فَلَهٗ قِيْرَاطٌ وَمَنْ شَهِدَهَا حَتّٰى تُدْفَنَ فَلَهٗ قِيْرَاطَانِ قِيْلَ وَمَا الْقِيْرَاطُ؟ قَالَ: أَصْغَرُهُمَا مِثْلُ أُحُدٍ»[1]

رہا قبر کے پاس کھڑا ہونا، جب وہ مر جائے سو عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو توقف فرماتے اور فرماتے استغفار کرو اپنے بھائی کے لیے اور اس کے لیے ثابت رہنا مانگو کہ وہ اس وقت سوال کیا جاتا ہے۔[2] (انفرد بإخرجه أبو داود)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قیام کی ممانعت کرنے کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اصلاحِ قبر کی مہمات کے لیے کھڑا نہ ہو اور وہ دفن کرنے کے لیے متولی نہ ہو۔ ان کو کفر کے ساتھ متصف کرنے کے بعد فسق سے متصف کیا، اس لیے کہ کافر کبھی اپنے دین میں عدل پر ہوتا ہے، امانت ادا کرتا ہے، کسی کی برائی اپنے جی میں نہیں رکھتا اور کبھی خبیث النفس کثیر الکذب صاحبِ نفاق اور دھوکے باز اور بزدل ہوتا ہے اور دوسرے کی برائی چاہتا ہے، سو یہ بات ہر کسی کے دین میں ہر کسی کے نزدیک بری ہوتی ہے۔[3]

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ
أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ
وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٨٥﴾

اور (اے نبی!) ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں۔ بے شک اللہ تو چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالتِ کفر میں نکلیں (85)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ وہ بات ہے جو پہلے کہی گئی ہے اور پہلے مضمون کو ہی مقرر (مضبوط) کیا ہے، اس ارادے سے کہ مخاطب ہوشیار رہے، اس امر کو فراموش نہ کرے اور معتقد ہو کر اس پر عمل کرنا ایک اہم کام ہے۔ بعض

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢١) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٩٨) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٠٧)

[3] فتح البيان (٥/ ٣٦٢)

نے کہا ہے کہ پہلی آیت ایک قوم کے حق میں تھی اور یہ دوسری آیت دوسری قوم کے حق میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود کے حق میں ہے اور پہلی آیت منافقین کے حق میں تھی۔ تفسیر اس آیت کی پہلے گزر چکی ہے۔ تفسیر خازن میں ان دونوں آیتوں کے الفاظ کے تفاوت کا ذکر کیا ہے۔[1] اس میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہے۔[2] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''تَقَدَّمَ تَفْسِيْرُ نَظِيْرِ هٰذِهِ الْآيَةِ الْكَرِيْمَةِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.''[3]

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ (مل کر) جہاد کرو تو ان کے دولت مند آپ سے اجازت مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم (گھروں میں) بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہیں (86) وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے، لہٰذا وہ نہیں سمجھتے (87)

بلا عذر جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی مذمت:

اللہ نے یہاں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو جہاد سے متخلف (پیچھے) ہوئے، باوجود اس بات کے کہ جہاد کی قوت اور قدرت رکھتے تھے اور مال دار اور آسودہ حال تھے۔ اس کے باوجود نبیِ اکرم ﷺ سے اجازت چاہی کہ ہم بیٹھ رہیں اور اس عار کو کہ شہر کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہیں، اپنی جانوں کے لیے پسند کیا، جب جنگ ہوتی ہے تو بزدلی دکھانے میں سب سے بڑھ کر ہوتے ہیں اور جب امن ہوتا ہے تو سب سے زیادہ باتیں بناتے ہیں، جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ ﴾ [الأحزاب: ۱۹] ''چناں چہ جب خوف (کا وقت) آئے تو آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی آنکھیں (اس طرح) گھومتی ہیں، جیسے وہ شخص جس پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ دور ہو جائے تو مال (غنیمت) کے انتہائی حریص بن کر تیز زبانوں کے ساتھ تمھارے بارے میں زبان درازی کرنے لگتے ہیں۔'' یعنی اس وقت ان کی زبان بات چیت میں خوب تیز چلتی ہے، امن میں

[1] تفسیر الخازن (۳/ ۱۳۳) [2] فتح البیان (۵/ ۳۶۳) [3] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۹۸)

قوی اور جنگ میں نامرد ہوتے ہیں ؏

أَفِي السَّلْمِ أَعْيَاراً جِفَاءً وَغِلْظَةً وَفِي الْحَرْبِ أَشْبَاهَ النِّسَاءِ الْعَوَارِكِ

''حالتِ امن میں تو درشت، سخت اور گدھوں کی طرح بے عقلی کرتے ہو اور جنگ میں حیض والی عورتوں کی طرح ہو جاتے ہو؟!''

سچ ہے: ؎

خَلَقَ اللّٰهُ لِلْحُرُوْبِ رِجَالًا وَرِجَالًا لِقَصعَةٍ وَثَرِيْد

''اللہ نے کچھ مردوں کو جنگ کے لیے پیدا کیا ہے اور کچھ کو کھانے پینے کے لیے۔''

نیز فرمایا ہے: ﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿٢٠﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ [محمد: ٢٠۔ ٢١] ''اور جو لوگ ایمان لائے، وہ کہتے ہیں: (جہاد کے متعلق) کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں قتال (جہاد) کا ذکر کیا جاتا ہے تو آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں روگ ہے کہ وہ آپ کی طرف اس شخص کی طرح دیکھتے ہیں، جس پر موت کے باعث غشی طاری ہو، چناں چہ ان کے لیے ہلاکت ہے۔ اطاعت کرنا اور بھلی بات کہنا (بہتر ہے)، پھر جب (جہاد کا) قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ سے سچے رہیں تو یہ ان کے لیے بہتر ہے۔'' دل پر مہر اس لیے لگی کہ جہاد سے باز رہے اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ لڑنے کے لیے باہر نہ نکلے، ان کو اس بات کی کچھ سمجھ نہیں ہے جس میں ان کی بھلائی اور فلاح ہے یا جس میں ان کا نقصان ہے کہ اس سے بچیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ سُوْرَةٌ ﴾ ایک پارۂ قرآن کو کہتے ہیں اور جائز ہے کہ اس سے بعض یا تمام سورت مراد ہو یا یہی سورت توبہ مراد ہے۔ ﴿ اُولُوا الطَّوْلِ ﴾ سے مراد اہلِ ثروت وغنا ہیں۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] اصم نے کہا ہے کہ مراد رؤسا اور کبراء ہیں، جن پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو خاص طور پر ذکر کیا ہے، اس لیے کہ ان کی مذمت کرنا ضروری ہے، حالانکہ ان کو بیٹھے رہنے کے لیے کوئی عذر نہ تھا، ورنہ عاجز آدمی کو اذن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ قاعدین سے مراد ضعیف اور زمنیٰ (اپاہج ومعذود) ہیں، خوالف سے مراد عورتیں۔[2]

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ

---

[1] فتح القدیر (٢/ ٥٥٢) [2] فتح البیان (٥/ ٣٦٤)

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

لیکن رسول (ﷺ) اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے، انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا، اور بھلائیاں بھی انہی لوگوں کے لیے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (88) اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم کامیابی ہے (89)

رسول اور مومن مجاہدوں کی تعریف:

جب اللہ نے منافقین کی مذمت کا ذکر کیا تو مومنین کی تعریف بھی فرمائی اور ان کا حال اور انجام ذکر کیا۔ یہ بھلائیاں ان کے لیے دارِ آخرت اور جناتِ فردوس میں ہوں گی۔ خیرات سے مراد بلند درجات ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس استدراک کا مقصد یہ ہے کہ ان کا پیچھے بیٹھے رہنا کچھ نقصان دہ نہیں ہے، کیونکہ جو لوگ ان سے بہتر اور خالص نیت والے ہیں، انھوں نے فریضۂ جہاد بخوبی انجام دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٨٩] ”اب اگر یہ لوگ اس (ہدایت کو ماننے) سے انکار کرتے ہیں تو بے شک ہم نے اس کے لیے ایسی قوم تیار کی ہے کہ وہ ان کا انکار کرنے والی نہیں۔“ اس کے بعد جہاد کے فائدے کا ذکر کیا۔ خیرات خیر کی جمع ہے، خیر دنیا اور دین کے منافع کو شامل ہے، جیسے: مدد، غنیمت، جنت وکرامت یا مراد خوب صورت عورتیں یعنی حور عین ہیں۔ (قاله الحسن كقوله تعالى: ﴿ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴾ [الرحمٰن: ٧٠] ”ان (سب باغوں) میں خوب سیرت (اور) خوب صورت عورتیں ہیں۔“)[1] فلاح سے مراد مطلوب چیز کو کامیابی سے حاصل کر لینا ہے۔ اسم اشارہ کو اس لیے دہرایا گیا ہے کہ اس سے معاملے کی عظمت اور بڑائی ظاہر ہو۔[2]

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

اور دیہاتیوں میں سے بہانے باز آئے کہ انھیں اجازت دی جائے اور وہ لوگ بیٹھ رہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا، ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں جلد ہی دردناک عذاب آ پکڑے گا (90)

---

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٢٢٤) [2] فتح البيان (٥/ ٣٦٥)

عذر پیش کرنے والے اور بیٹھے رہنے والے:

اللہ نے اس آیت میں جہاد میں نہ جانے کے لیے عذر والوں کا حال بیان فرمایا کہ انھوں نے ضعف اور قدرت کے نہ ہونے کا بہانہ بنایا۔ یہ لوگ احیائے عرب تھے جو مدینے کے ارد گرد رہتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لفظ مُعذِّرون کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے: (مُعْذِرُوْن) اور کہا ہے: "هُمْ أَهْلُ الْعُذْرِ" یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ وہ بنی غفار کے چند لوگ تھے، جیسے خفاف بن ایماء بن رحضہ۔[1] یہی قول اس آیت کے معنی میں زیادہ ظاہر ہے، اس لیے کہ اس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ جو اللہ اور رسول سے جھوٹے ہوئے، وہ بیٹھ رہے، یعنی عذر کرنے کو نہ آئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اہلِ عذر کا عذر نہ سنا۔ یہی قول ہے امام حسن، قتادہ اور محمد بن اسحاق رحمہم اللہ کا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ أعلم۔[2] پھر اللہ نے ان کو عذابِ الیم کی وعید دی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ اعراب سے مراد بقول ضحاک کے عامر بن طفیل رضی اللہ عنہ کا گروہ ہے[3] اور بعض نے کہا ہے کہ اسد و غطفان ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عذر کے ساتھ پیچھے رہنے والے۔[4] اعراب صحرا نشینوں کو کہتے ہیں، یہ عرب سے مخصوص لوگ ہیں، کیونکہ عربی وہ ہے جو زبانِ عربی بولے، خواہ صحرا میں رہے یا شہر میں۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کی وہ معذرت تصنع تھی یا صحیح تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر ہم جنگ کے لیے نکلیں تو اعرابِ طے ہمارے اہل و عیال اور مویشیوں پر غارت گری (لوٹ مار) کریں گے۔ یہ لوگ اعراب کے منافقین تھے۔ عذابِ الیم دونوں جہان کے عذاب کو شامل ہے۔ دنیا کا عذاب قتل اور قید ہے۔ آخرت کا عذاب ہمیشہ کے لیے آگ ہے، یہ عذاب معتذرین (عذر پیش کرنے والے) اور غیر معتذرین دونوں کو پہنچے گا، کیونکہ اہلِ عذر کا عذر جھوٹا تھا اور بعض نے سرے ہی سے کچھ عذر نہ کیا، وہ محض بے اعتقاد تھے۔[5]

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى
الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۙ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤١٦۔ ٤١٩) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٤١٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٩٩)
[3] تفسير البغوي (٤/ ٨٣) [4] تفسير البغوي (٤/ ٨٣) [5] فتح البيان (٥/ ٣٦٦۔ ٣٦٧)

قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

ضعیفوں اور بیماروں پر اور جو لوگ کوئی چیز نہیں پاتے کہ وہ خرچ کریں، ان پر (پیچھے رہنے میں) کوئی گناہ نہیں، جبکہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خیر خواہی کرتے ہیں۔ نیکی کرنے والوں پر (گرفت کی) کوئی راہ نہیں۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿91﴾ اور (اے نبی!) نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جو آپ کے پاس آئے کہ آپ انھیں (سفرِ جہاد کے لیے) سواری دیں (اور) آپ نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تو وہ اس حال میں لوٹ گئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں جسے وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں ﴿92﴾ (اے نبی!) (گرفت کی) راہ ان لوگوں پر ہے جو آپ سے رخصت مانگتے ہیں، حالاں کہ وہ مال دار ہیں۔ وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ پیچھے (گھروں میں) رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں۔ اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، چناں چہ وہ نہیں جانتے ﴿93﴾

جہاد میں شرکت نہ کرنے کے شرعی عذروں کا تذکرہ:

اس آیتِ کریمہ پر قرآن مجید کا دسواں پارہ ختم ہوا، وللہ الحمد. فرقان حمید کی ایک تہائی تفسیر آج ۴ ذوالحجہ ۱۳۰۴ھ کو تمام ہوئی۔ اَلثُّلُثُ وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان عذروں کو بیان کیا جن کے ہوتے ہوئے بیٹھ رہنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ ان تمام عذروں میں سے وہ عذر ہے کہ کسی بیماری کی وجہ سے بیمار ہو اور جسم کو اللہ کے راستے میں نکلنے سے باز رکھے یا فقیری کی وجہ سے جنگ کا سامان وغیرہ حاصل کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ سو ایسے لوگ اگر بیٹھ رہیں تو کچھ حرج نہیں، جبکہ بیٹھے رہنے کی حالت میں اللہ اور رسول کے خیر خواہ ہوں اور لوگوں کو جہاد کے لیے بوجھل نہ کرائیں اور اس حال میں محسن ہوں۔ ابو ثمامہ نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کہا تھا: اے روح اللہ! ہم کو خبر دو کہ ناصح للہ کون ہے؟ فرمایا: وہ شخص جو اللہ کے حق کو لوگوں کے حق پر اختیار کرے اور جب اس کو امرِ دنیا اور امرِ آخرت پیش آئے تو ابتدا امرِ آخرت سے کرے، پھر دنیا کے لیے فارغ ہو۔

حکایت:

امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگ استسقاء کے لیے نکلے تھے، بلال بن سعد نے کھڑے ہو کر اللہ کی حمد وثنا کی، پھر کہا کہ اے لوگوں کے گروہ! کیا تم نے اپنی برائی کا اقرار نہیں کیا ہے؟ کہا: "اَللّٰھُمَّ نَعَمْ" کہا: اے اللہ! ہم نے سنا کہ تو نے فرمایا ہے: ﴿ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ﴾ (آیتِ باب) اے اللہ! ہم نے اپنی برائی کا اقرار کیا ہے، سو تُو ہم کو بخش دے، رحم کر اور پانی برسا، پھر سب نے ہاتھ اٹھائے، پانی برسا۔[1]

شانِ نزول:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت عائذ بن عمرو مزنی رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔[2] زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا، سورت براءت لکھتا تھا، قلم میرے کان پر رکھا تھا کہ اتنے میں ہم کو قتال کا حکم ہوا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کی طرف نظر کرتے تھے (غور کرتے تھے) جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتی تھی کہ ایک اندھا آیا، کہا: اے اللہ کے رسول! میرا کیا حال ہے، میں تو اندھا ہوں؟ اس پر یہ آیت اتری۔[3] (رواه ابن أبي الحاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں کہا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تیاری کا حکم دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لیے نکلیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت آئی، ان میں عبداللہ بن مغفل بن مقرن مزنی بھی تھے، کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کو سواری دیں، فرمایا: واللہ میں سواری نہیں پاتا، وہ روتے ہوئے پھرے اور ان پر جہاد سے پیچھے رہ جانا مشکل گزرا، وہ نہ خرچ پاتے تھے نہ سواری۔ اللہ نے جب ان کی اپنے اللہ اور رسول کی محبت کی حرص معلوم کی تو ان کا عذر اپنی کتاب میں نازل کیا۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی مقرن کے قبیلے مزینہ کے حق میں ہوا ہے۔

محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سات اشخاص تھے: بنو عمرو بن عوف سے سالم بن عمیر اور بنو واقف سے ہرمی بن عمرو اور بنو مازن سے عبدالرحمان بن کعب ان کی کنیت ابو لیلیٰ تھی اور بنو المعلی سے سلمان بن صخر (اور بنو حارثہ سے عبدالرحمان بن یزید ابو عبلہ) اور بنو سلمہ سے عمرو بن غنمہ وعبداللہ بن عمرو مزنی۔[5] امام ابن اسحٰق نے غزوۂ تبوک کے سیاق میں کہا ہے کہ کچھ مسلمان لوگ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، وہی باقی تھے، وہ انصار وغیرہم کے سات افراد تھے، بنو عمرو بن عوف سے سالم بن عمیر علیہ بن زید اخو بنی حارثہ وابو لیلیٰ اخو بنی مازن بن النجار وعمرو بن الحمام بن جموح اخو بنی سلمہ وعبداللہ بن مغفل مزنی اور بعض نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عمرو مزنی وہرمی عبداللہ اخو بنی واقف وعیاض بن ساریہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦١۔ ١٨٦٢)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ٤٢٠)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦١)
[4] تفسير الطبري (١٤/ ٤٢٠) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[5] تفسير الطبري (١٤/ ٤٢١۔ ٤٢٣)

فزاری تھے، انھوں نے نبیِ اکرم ﷺ سے سواری طلب کی، یہ لوگ اہلِ حاجت تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس سواری نہیں ہے، وہ روتے ہوئے لوٹ گئے۔[1]

اہلِ عذر کی اجر میں شراکت:

امام حسن رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ تم نے مدینے میں وہ لوگ چھوڑے ہیں کہ تم نے کوئی نفقہ نہیں کیا اور نہ کوئی صحرا عبور کیا اور نہ کسی دشمن پر قابو پایا لیکن وہ تمھارے شریک تھے اجر میں، پھر آیتِ باب پڑھی۔[2] اس کی اصل صحیحین میں ہے۔ اس لفظ سے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ أَقْوَامًا مَا قَطَعْتُمْ وَادِياً وَلَا سِرْتُمْ سَيْراً إِلَّا وَهُمْ مَعَكُمْ وَهُمْ بِالْمَدِيْنَةِ قَالَ: نَعَمْ، حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ»[3] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مرفوع الفاظ یہ ہیں: «لَقَدْ خَلَفْتُمْ بِالْمَدِيْنَةِ رِجَالًا مَّا قَطَعْتُمْ وَادِياً وَلَا سَلَكْتُمْ طَرِيْقاً إِلَّا أَشْرَكُوْكُمْ فِيْ الْأَجْرِ حَبَسَهُمُ الْمَرَضُ»[4] (رواه أحمد و رواه مسلم وابن ماجه)

یہ احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ اجر کا ملنا صرف خالص اور سچی نیت پر بھی ہوتا ہے، گو عمل کسی مرض وغیرہ کے عذر کی وجہ سے واقع نہ ہو۔ وللہ الحمد. یہ بھی معلوم ہوا کہ ساتھ ہونے کے لیے جسم کا متصل ہونا ضروری نہیں ہے، دل سے بھی معیت ہوسکتی ہے اور علم سے بھی۔ وللہ المنة. اسی لیے احادیث میں آیا ہے کہ «اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ»[5] پھر اللہ نے ان پر ملامت کی جو باوجود غنی ہونے کے بیٹھے رہنے کی اجازت مانگتے تھے، ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ضعفا سے مراد وہ لوگ ہیں جو اندھے، لنگڑے، دکھیا بوڑھے، جیسے: شیوخ، بچے اور عورتیں یا جو اصل جسمانی خلقت کے لحاظ سے کمزور پیدا ہوئے ہیں۔ ضعفا ضعیف کی جمع ہے، ضعیف وہ شخص ہے جو بدن میں صحیح ہے مگر لڑائی کرنے سے عاجز ہے۔ مرض سے مراد ہر وہ بیماری ہے جس پر لغت یا شرعی لحاظ سے بیماری کا نام صادق آتا ہے۔ مریضوں میں اندھا اور لنگڑا بھی شامل ہے۔

پھر اس کا ذکر کیا جس کا مرجع مال یا بدن ہے، یعنی فقر کے سبب سے جنگ کے سامان کی تیاری نہیں کر سکتے، جیسے: جہینہ، مزینہ اور بنی عذرہ، اللہ نے ان تینوں قسم کے لوگوں سے حرج کی نفی فرمائی اور ارشاد کیا کہ ان عذروں کے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٥/ ١٩٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦٢) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١١) مسند أحمد (٣/ ٣٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٦٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٤٩٩۔ ٥٠١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

ہوتے ہوئے جہاد ساقط ہے، واجب نہیں، لیکن اس شرط سے کہ اللہ اور رسول کے خیر خواہ اور خیر سگال رہیں۔ اللہ کی خیر خواہی یہی ہے کہ اللہ پر ایمان لائیں، اس کی شریعت پر عمل کریں، جو کام خلافِ شریعت ہو اس کو چھوڑ دیں۔ کوئی سی بات ہی کیوں نہ ہو، اس میں بندوں کی خیر خواہی اور مجاہدین کی محبت لازمی طور پر شامل ہے۔ رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ نبوت کی تصدیق کریں، ہر امر و نہی میں رسول کی اطاعت بجا لائیں، رسول کے دوست کے دوست اور اس کے دشمن کے دشمن بنے رہیں۔ نبیِ اکرم ﷺ کی محبت و تعظیم اور آپ ﷺ کی سنت کا احیا جہاں تک قدرت ہو، عمل میں لائیں۔

صحیح حدیث میں آیا ہے: «اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ، قَالُوْا: لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُوْلِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ»[1] امام خازن نے کہا ہے کہ مراد نصیحت سے اس جگہ یہ ہے کہ شہر میں مقیم رہیں، افواہیں نہ پھیلائیں، فتنوں کو نہ ابھاریں۔ اہلِ جہاد کی طرف خیر خواہی کے جذبات پہنچائیں، مجاہدین کے اہل و عیال کے ساتھ قیام رکھیں، ان کی ضروریات کا خیال رکھیں۔[2] محسنین پر الزام آنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اس میں پہلے مضمون کو مقرر رکھا گیا ہے، یعنی جو لوگ معذور اور خیر خواہ ہیں، ان پر کچھ سزا اور مؤاخذہ نہیں ہے، خواہ یہ لوگ ہوں یا محسنین میں سے کوئی ہو، کہیں ہو، غرض کہ لَا سَبِيْلَ عَلَيْهِ کے معنی ہیں کہ لَا حَرَجَ وَلَا عَتَابَ یعنی کسی عتاب دینے والے کا گزر اس پر نہیں ہوتا، پھر عتاب کا کیا ذکر ہے۔ اور اگر لَا سَبِيْلَ إِلَيْهِ کہیں تو اس کے معنی وصول کے ہیں، جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ع

ألا ليت شعري هل إلى أم سالم سبيل فأما الصبر عنها فلا صبر

ان استعمال کی جگہوں سے آگاہ رہنا چاہیے کہ یہ فصاحت کی اہم باتوں میں سے ہیں۔ اللہ غفور و رحیم ہے، وہ تو مسیئ (برائی کرنے والے) کو بھی بخشتا ہے، پھر محسن (نیکی کرنے والے) کا کیا ذکر۔ اسی معنی میں یہ آیت ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ: ۲۸۶] ''اللہ کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔'' ان معذوروں سے جو تکلیف کو ساقط کر دیا، اس سے کچھ یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو جہاد کا ثواب نہ ملے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ''عَذَرَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ مِّنَ الْعُذْرِ مَا جَعَلَ لِلْمُجَاهِدِيْنَ مِنَ الْأَجْرِ''[3] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں یہ نہیں ہے کہ ان معذوروں پر نکلنا حرام ہے، اس لیے کہ اگر کوئی ان میں سے نکل کر اپنی قدرت کے مطابق مجاہدین کی خدمت کرے اور اس پر بارِ خاطر اور وبال نہ ہو تو اس کی یہ طاعت قبول ہو گی۔[4]

پھر یہ فرمایا کہ ان تمام معذوروں میں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو سواری اور بار برداری کے لیے کوئی ذریعہ نہ ہونے کی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ سات شخص انصاری تھے یا بنو مقرن۔ اس جگہ ﴿لَآ اَجِدُ﴾ فرمایا

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۵)
[2] تفسير الخازن (۳/ ۱۳۵)
[3] الدر المنثور (٤/ ٢٦٢)
[4] تفسير الرازي (١٦/ ١٢٧)

نہ کہ لَيْسَ عِنْدِيْ۔ اس میں لطفِ کلام اور سوال کرنے والوں کے دلوں کی طیبِ خاطر زیادہ ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں تمھاری مانگی ہوئی چیزوں کا طالب ہوں، لیکن وہ چیزیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے معذور ہوں، یہ بات نہیں کہ میرے پاس ہو اور میں کہوں کہ میرے پاس نہیں ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے آیت کے بارے میں کہا ہے کہ مراد پانی اور زادِ راہ ہے۔[1] علی بن صالح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم سے جہینہ کے بوڑھوں نے کہا کہ ہم نے جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوار کیے جانے کا سوال کیا تھا تو وہ حملان علی النعال (جوتیاں) کا تھا۔[2] ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ کسی چوپائے کا سوال نہ تھا، بلکہ نعال کا تھا۔ حسن بن صالح بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] غرض کہ جب اتنا بھی ان کو میسر نہ آیا تو وہ روتے پھرے کہ افسوس ہم جہاد سے جاتے رہے، نہ ہمارے پاس کچھ ہے اور نہ ہی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس۔ وہ سب سات لوگ تھے، ان کی تعیین میں طویل اختلاف ہے۔

پھر فرمایا کہ سزا اور باز پرس تو ان پر ہے جو فراوانی کے باوجود بیٹھے رہنے کی اجازت چاہتے ہیں اور ان کو عورتوں اور بچوں میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ سو اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، ان کو اپنا نفع اور نقصان کچھ نہیں سوجھتا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منافقین کے حق میں ارشاد ہے۔[4]



① تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦٣) ② الدر المنثور (٤/ ٢٦٥)
③ تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦٣) ④ الدر المنثور (٤/ ٢٦٥_ ٢٦٦) فتح البيان (٥/ ٣٦٨_ ٣٧٣)

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ
لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ
ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ
فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

وہ (منافق) تمھارے سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے: تم عذر پیش نہ کرو، ہم ہرگز تم پر یقین نہیں کریں گے، اللہ نے تمھارے حالات سے ہمیں آگاہ کر دیا ہے، اور اللہ جلد تمھارے عمل دیکھ لے گا اور اس کا رسول بھی، پھر تم چھپی اور کھلی (باتیں) جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں بتا دے گا جو تم عمل کرتے رہے (94) عن قریب وہ تمھارے لیے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے، تاکہ تم ان سے درگزر کرو، چناں چہ ان سے درگزر (ہی) کرو۔ بلاشبہ وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، ان (کاموں) کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے (95) وہ تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو بھی اللہ ان (لوگوں) سے راضی نہیں ہوتا، جو نافرمان ہیں (96)

منافقوں کی چالبازی کا تذکرہ:

یعنی جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ منافق ہے، اس کی طرف سے بے پروائی کرنا جائز ہے، لیکن دوستی محبت اور یگانگی جائز نہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے منافقین کے بارے میں خبر دی ہے کہ جب تم لوٹ کر مدینے جاؤ گے تو وہ تم سے عذر کریں گے، تم کہنا کہ ہم تمھاری بات نہیں سنتے، ہم کو اللہ نے تمھارے بارے میں بتا دیا ہے اور دنیا میں تمھارا حال لوگوں پر کھل جائے گا۔ پھر آخرت میں تم کو اپنا خیر وشر معلوم ہو جائے گا، تم کو تمھارے اعمال کی سزا ملے گی۔

پھر فرمایا کہ وہ اپنی صفائی کے لیے قسمیں کھائیں گے، سو تم ان سے حقارت سے منہ پھیر لینا کہ وہ خبیث ہیں، ان کے باطن ناپاک ہیں، آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے، یہ ان کے گناہوں اور خطا کاریوں کا بدلہ ہے اور اگر تم ان کے

قسم کھانے سے خوش اور راضی ہو جاؤ، تو ہو جاؤ۔ لیکن اللہ فاسقوں کی قوم سے خوش نہیں ہوتا۔ فسق اللہ اور رسول کی اطاعت سے باہر ہونے کو کہتے ہیں، اس لیے چوہے کو بھی فویسقہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے سوراخ سے فساد کرنے کے لیے باہر نکلتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے منافقوں کے جھوٹے عذروں کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ مومنوں کے ساتھ غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کے بے جا عذر پیش کریں گے، کہتے ہیں کہ یہ عذر پیش کرنے والے اسّی شخص تھے۔ سو فرمایا کہ اے پیغمبر! تم ان کا عذر قبول نہ کرو اور ان کی قسموں کو سچا نہ جانو، بلکہ ان کو ناپاک سمجھ کر منہ پھیر لو، ان کی جگہ جہنم ہے، یہ تم کو خوش کرنے کے لیے قسمیں کھائیں گے، اگر تم ان کے داؤ میں آ کر ان سے راضی ہو گئے تو ہو جاؤ، مگر اللہ ان سے راضی نہیں ہے۔ اس میں ارشاد ہے کہ جس سے اللہ راضی نہ ہو، مومنوں کو بھی اس سے راضی نہ ہونا چاہیے، بلکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے لیے فاسقوں سے ناراض رہا کریں۔[2]

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

دیہاتی کفر اور منافقت میں زیادہ سخت ہیں اور اس امر کے زیادہ لائق ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جان پائیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے، اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے (97) اور کچھ دیہاتی اس کو تاوان سمجھتے ہیں جو وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور وہ تمھارے خلاف زمانے کی گردشوں کا انتظار کرتے ہیں (مگر) منحوس گردش انھی کے خلاف ہے، اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (98) اور کچھ دیہاتی وہ ہیں جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قربتوں کا ذریعہ اور رسول کی دعاؤں (کے حصول) کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگاہ رہو! یقیناً یہ (خرچ کرنا) ان کے لیے قربت کا ذریعہ ہے، اللہ جلد انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (99)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۰۱) [2] فتح البیان (۵/ ۳۷۳۔ ۳۷۶)

اعراب دیہاتیوں کی اقسام:

یعنی ان کی طبیعت میں بے حکمی، خودغرضی اور جہالت پیدا کی گئی ہے، سو اللہ حکمت والا ہے ان سے وہ مشکل کام بھی نہیں چاہتا اور وہ درجے بلند بھی نہیں دیتا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ دیہاتیوں میں کافر اور منافق اور مومن ہیں، ان کا کفر اور نفاق دوسروں کی نسبت بڑا اور زیادہ سخت ہے اور وہ اسی لائق ہیں کہ اللہ کی حدوں کو نہ جانیں۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے امام ابرہیم رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک اعرابی زید بن صوحان کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے، ان کا ہاتھ نہاوند کے دن بے کار ہو گیا تھا، اعرابی نے کہا: واللہ! تمھاری بات مجھے اچھی لگتی ہے اور تمھارا ہاتھ مجھ کو شک میں ڈالتا ہے۔ زید نے کہا: میرے ہاتھ سے تجھ کو کیا شک آتا ہے؟ یہ تو بایاں ہاتھ ہے۔ اعرابی نے کہا: واللہ! میں نہیں جانتا کہ داہنا ہاتھ کاٹتے ہیں یا بایاں۔ زید نے کہا: اللہ نے سچ کہا ہے: ﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا... الخ ﴾[1] (آیتِ باب)

دیہاتی درشت طبع ہوتے ہیں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا: «مَنْ سَكَنَ الْبَادِيَةَ جَفَا، وَمَنِ اتَّبَعَ الصَّيْدَ غَفَلَ، وَمَنْ أَتَى السُّلْطَانَ افْتَتَنَ»[2] (رواه أحمد و أبو داود والترمذي وقال حسن غريب) اور جبکہ اہلِ بوادی (دیہاتی یا صحرائی) میں درشتی اور سختی ٹھہری تو یہی وجہ ہے کہ اللہ نے کوئی رسول ان میں سے مبعوث نہیں کیا۔ بعثت اہلِ قریٰ (بستی والوں) میں سے ہوئی، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [يوسف: ۱۰۹] ”اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔“ اور جب ایک اعرابی نے نبی اکرم ﷺ کو ہدیہ دیا اور آپ نے اس کو اس ہدیے کا دوگنا دے کر راضی فرمایا تو فرمایا: «لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَّا أَقْبَلَ هَدِيَّةً إِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ أَوْ ثَقَفِيٍّ أَوْ أَنْصَارِيٍّ أَوْ دَوْسِيٍّ»[3] کیونکہ یہ لوگ شہروں میں رہتے ہیں، جیسے: مکہ، طائف، مدینہ اور یمن، ان کے اخلاق اعراب کی نسبت زیادہ لطیف تھے۔ اعراب کی طبیعتوں میں سختی ہوتی ہے،[4] مولانا روم رحمہ اللہ نے فرمایا:

وے مردود مرد را احمق کند   عقل را بے نور و بے رونق کند

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٢٩)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٥٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٥٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٩٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٤٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٥٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١١٩)

[4] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٠١ـ ٥٠٢)

’’افسوس! مردود شیطان صفت آدمی سادہ لوح آدمی کو بے وقوف بنا دیتا ہے، وہ اس کی سوچ اور سمجھ کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔‘‘

اللہ جانتا ہے کہ کون شخص علم حاصل کرنے کا اور ایمان کا مستحق ہے۔ اس نے اپنے بندوں میں علم، جہالت، ایمان، کفر اور نفاق کی جو تقسیم کی ہے وہ اس کی حکمت ہے۔ کس کی مجال ہے کہ وہ اس سے اس کے فعل کا سوال کرے اور علیم و حکیم سے کچھ کہہ سکے۔

پھر فرمایا کہ ان گنواروں میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کو تاوان اور نقصان سمجھتے ہیں اور آپ کے لیے حادثات اور آفات نازل ہونے کا انتظار کرتے ہیں، سو انھی پر حادثے اور آفتیں پڑیں گی نہ تم پر۔ اللہ کو معلوم ہے کہ کون اس کی مدد کا مستحق ہے اور کون ذلت کا مستحق ہے۔ تیسری قسم کے وہ گنوار ہیں جو ایمان بھی رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اس کا قرب حاصل کرنے کی امید پر خرچ بھی کرتے ہیں، سو ایسے لوگوں پر اللہ رحم کیا کرتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اعراب سے اعراب کی جنس مراد ہے نہ کہ ہر اعرابی۔ اللہ نے بیان کیا کہ یہ گنوار جو مدینہ سے باہر بستیوں میں رہتے ہیں، بڑے کافر منافق ہیں، ان کے دل نہایت سخت، ان کی طبیعت نہایت درشت، ان کی بات جفا سے بھری ہوتی ہے، یہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو سننے سے دور ہیں، ان کے افعال وحشیانہ ہوتے ہیں، ان کی نشوونما مشاہدۂ علما سے الگ تھلگ ہوتی ہے، یہ بعض افراد میں سے ایک کی صفت ہے جس طرح فرمایا: ﴿ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٧] ’’اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔‘‘ کیونکہ سارے انسان کفور نہیں ہوتے، بلکہ بعض انسانوں میں سے بعض ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان گنواروں کا حال ہے کہ کوئی ان میں کافر منافق ہے، کوئی مومن اور خرچ کرنے والا۔

اعراب صحرانشینوں کو کہتے ہیں، عرب کے خلاف کہ وہ اس نوع سے عام ہیں، خواہ دیہات میں رہنے والے ہوں یا بستیوں اور شہروں میں رہنے والے خانہ گزیں، اہلِ لغت نے اسی طرح کہا ہے۔ حدود سے مراد اسلام کی شریعت، احکام اور فرائض ہیں، جیسے: جہاد وغیرہ۔ ان کو جو حدود سے ناقابل فرمایا تو اس لیے کہ یہ لوگ انبیا کے مواطن (وطن) اور احکامِ الٰہی کے نازل ہونے کے مقام سے دور تر رہتے ہیں اور معجزات کا مشاہدہ اور کتاب و سنت کا معائنہ نہیں کر پاتے، لیکن عرب کا جاہل ہونا کچھ اس بات کو مانع نہیں کہ ان کے اشعار اور الفاظ کتاب و سنت پر بطورِ حجت پیش کیے جاتے ہیں، کیونکہ ان کی یہ جہالت قرآنِ مجید کے احکام میں ہے نہ کہ زبان کے الفاظ میں اور ہم کچھ ان کی لغت کو حجت کے طور پر نہیں لاتے، بلکہ ان کے الفاظ کے بیان اور معانی سے حجت پکڑتے ہیں، اس لیے کہ قرآن و حدیث انھی کی لغت میں آئے ہیں۔ (قاله الكرخي) امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اسد اور غطفان

کے بارے میں اتری ہے۔[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ بَدَا جَفَا، وَمَنِ اتَّبَعَ الصَّيْدَ غَفَلَ... الْحَدِيْثُ»[2] (رواه أبو داود والبيهقي) اعراب کی دوسری قسم یہ بیان کی کہ وہ جنگ کے خوف سے اور لڑائی کے مقابلے سے ڈرتے ہوئے خرچ کرتے ہیں جو صرف ناخوشی کے ساتھ اور دکھانے اور سنانے کے لیے ہوتا ہے، اسی لیے اس کو تاوان سمجھتے ہیں، ان سے مراد بنو اسد و غطفان ہیں۔

﴿دَآئِرَةُ﴾ کہتے ہیں حالتِ منقلبہ (گردش کرنے والی حالت) کو، نعمت سے بلیت و آزمائش و تکلیف کی طرف۔ دائرہ سے مراد گردشِ روز گار ہے، یعنی ان کو یہ خیال ہے کہ زمانہ ایک حال پر نہیں رہتا، کبھی خیر، کبھی شر، کیا تعجب ہے کہ رسول مر جائے اور مشرک غالب آ جائیں۔ اس لیے اللہ نے کہا کہ بری گردش خود تم پر ہو گی۔ نہ رسول اور مومنین پر۔ اللہ تمھاری بات کو سنتا اور تمھارے دلوں کو جانتا ہے۔ اعراب کی تیسری قسم اہلِ ایمان بتائے۔ عبدالرحمان بن معقل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم مقرن کے دس بیٹے تھے، یہ آیت ہمارے حق میں اتری ہے۔[3]

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد اسلم، غفار، جہینہ اور مزینہ ہیں،[4] یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قرب کی امید اور رسول اللہ ﷺ کی دعائیں لینے کے لیے نفقہ کرتے تھے، کیونکہ آپ ﷺ صدقہ کرنے والوں کو دعا دیتے تھے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ [التوبة: ١٠٣] ''اور ان کے لیے دعا کریں، بے شک آپ کی دعا ان کے لیے سکون (کا باعث) ہے۔'' اور اس میں نبی اکرم ﷺ کا قول ہے: «اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ أَبِي أَوْفٰى»[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ صلواتِ رسول سے مراد نبی اکرم ﷺ کا استغفار ہے۔[6] اللہ نے فرمایا ان کا خرچ کرنا قربت ہے، اس ارشاد میں صدقہ کرنے والوں اور خرچ کرنے والوں کی اس قدر دل جوئی اور اطمینانِ قلب ہے جس کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا، اس پر رحمت کا وعدہ طلب کرنے والوں کو مراد حاصل ہونے کے اور بہت قریب کرتا ہے۔[7]

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝١٠٠

اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبولِ اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے

---

① الدر المنثور (٤/ ٢٦٦)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٦٠) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٠/ ١٠١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٧٢)

③ تفسير الطبري (١٤/ ٤٣٣) ④ تفسير البغوي (٤/ ٨٦)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٨)

⑥ تفسير الطبري (١٤/ ٤٣٢۔ ٤٣٣) اس کی سند حسن ہے۔ ⑦ فتح البيان (٥/ ٣٧٦۔ ٣٨١)

ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے، اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿١٠٠﴾

مہاجرین، انصار اور تابعین کے فضائل:

جنگِ بدر تک جو مسلمان ہوئے ہیں وہ قدیم ہیں اور باقی ان کے تابع ہیں۔ اللہ نے اپنی رضا مندی کی خبر سابقین کے حق میں دی۔ سابقین سے مراد مہاجرین اور انصار و تابعین بالاحسان ہیں اور ان کی رضا مندی اپنی نسبت ظاہر فرمائی۔ اور ان کے لیے نعیمِ مقیم اور جناتِ نعیم کو تیار کیا۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سابقین اولین مہاجرین و انصار میں سے وہ لوگ ہیں جنھوں نے حدیبیہ کے سال بیعتِ رضوان میں شمولیت کی۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، سعید بن مسیب، محمد بن سیرین، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔[1]

محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک شخص پر گزرے، وہ یہ آیت پڑھ رہا تھا، عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تجھ کو یہ آیت کس نے پڑھائی ہے؟ کہا: سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے، فرمایا: تُو مجھ سے جدا مت ہونا، جب تک میں تجھ کو ان کے پاس نہ لے چلوں، جب اُبی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو پوچھا: کیا تم نے یہ آیت اس شخص کو پڑھائی ہے؟ یہ آیت اسی طرح ہے؟ کہا: ہاں، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”لَقَدْ كُنْتُ أَرَى أَنَّا رُفِعْنَا رَفْعَةً لَا يَبْلُغُهَا أَحَدٌ بَعْدَنَا“ سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس آیت کی تصدیق سورت جمعہ کے شروع میں ہے: ﴿ وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [الجمعة: ٣] ”اور (اسے) ان میں سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی (بھیجا) جو ابھی تک ان کے ساتھ نہیں ملے، اور وہ (اللہ) زبردست خوب حکمت والا ہے۔“

نیز سورۃ الحشر میں: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحشر: ١٠] ”اور (فَے ان کے لیے ہے) جو اُن (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ اور سورۃ الانفال میں ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾ [الأنفال: ٧٤] ”اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٤٣٥۔ ٤٣٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦٨)

(مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔"[1] (رواہ ابن جریر)

حسن رحمہ اللہ لفظ انصار کو مرفوع (اَنْصَارُ) پڑھتے، سابقون پر عطف کرتے ہوئے،[2] اور کہتے کہ اللہ عظیم نے خبر دی ہے کہ وہ سابقین وتابعین بالاحسان سے راضی ہے، اب اس شخص کی خرابی ہے جو ان سے بغض رکھے اور ان کو برا کہے، گالی دے، سب کو یا بعض کو خصوصاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سردار اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہتر اور افضل کو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یعنی صدیقِ اکبر خلیفہ اعظم ابوبکر بن قحافہ رضی اللہ عنہ کو، کیونکہ طائفہ مخذولہ رافضہ افضل صحابہ کا دشمن ہے اور ان کو دشمن رکھتا ہے اور گالی دیتا ہے۔ عیاذا باللّٰہ من ذلك.

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان کی عقلیں معکوس اور ان کے دل منکوس ہیں، اب ان کا ایمان قرآن پر کہاں رہا، جبکہ یہ ان کو برا کہتے ہیں جن سے اللہ راضی ہو چکا ہے۔ رہے اہلِ سنت سو وہ راضی ہیں، ان سے جن سے اللہ راضی ہے، وہ اسی کو برا کہتے ہیں جس کو اللہ اور رسول نے برا کہا ہے اور اسی کو دوست رکھتے ہیں جس کو اللہ اور رسول دوست رکھتے ہیں۔ یہ متبعین ہیں نہ کہ مبتدعین اور مقتدین ہیں نہ کہ مبتدین۔ اسی لیے یہی اللہ کی مفلحین کی جماعت ہیں اور مومن بندے ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اعراب کی قسموں کا ذکر کرنے کے بعد مہاجرین اور انصار کا ذکر کیا۔ وہ لوگ دیہاتی تھے، یہ لوگ شہری ہیں۔ پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے ہجرت میں سبقت کی تھی اور بعض ان کے تابع۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لفظ انصار کو رفع پڑھا ہے (اَنْصَارُ)۔[3] باقی سب قاریوں نے کسرے سے (اَنصَارِ)۔ اس آیت میں سابقین کی فضیلت ہے۔ ایک قول میں یہ اہلِ بدر ہیں۔ امام قرطبی وعطا رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں،[4] لیکن اس آیت کو اس پر محمول کرنے میں کہ یہ سب اصناف ان میں شامل ہیں کہ وہ قبلتین کی طرف نماز پڑھنے والے ہیں اور بیعتِ رضوان میں شامل لوگ ہیں، کوئی امر مانع نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب سارے صحابہ ہیں کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی۔[5]

ابو منصور بغدادی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے ساتھیوں کا اجماع اس بات پر ہے کہ سب سے زیادہ فضیلت والے صحابہ چاروں خلفا ہیں، پھر باقی چھے، یہ عشرہ مبشرہ ہوئے، پھر اہلِ بدر، پھر اصحابِ احد اور پھر اہلِ بیعت الرضوان بمقام حدیبیہ۔[6] تابعین بالاحسان سے مراد متاخرین صحابہ اور قیامت تک ان کے بعد آنے والے لوگ ہیں، کچھ

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٣٨) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٤٣٩) [3] تفسير الطبري (١٤/ ٤٣٨)
[4] تفسير القرطبي (٨/ ٢٣٦) [5] تفسير الخازن (٣/ ١٣٨) [6] تفسير القرطبي (٨/ ٢٣٦)

اصطلاحی طور پر تابعین مراد نہیں، یعنی جس نے صحابی کو پایا، نبی اکرم ﷺ کو نہ پایا، بلکہ جو اس آیت کے تحت آتا ہے ساری امت میں سے قیامت کے دن تک۔

ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ”هُمْ مَنْ بَقِيَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ إِلَىٰ أَنْ تَقُوْمَ السَّاعَةُ“[1] صحابہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «هٰذَا لِأُمَّتِي كُلِّهِمْ، وَلَيْسَ بَعْدَ الرِّضَا سَخَطٌ»[2] حمید بن زیاد نے محمد بن کعب قرظی سے کہا کہ مجھ کو نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کے بارے میں خبر دو، ان کی مراد فتنے تھے۔ کہا: اللہ نے نبی اکرم ﷺ کے سارے اصحاب رضی اللہ عنہم کو بخش دیا، ان کے لیے اپنی کتاب میں جنت واجب کی، کیا محسن اور کیا مسی۔ میں نے کہا: کس جگہ جنت کو ان کے لیے واجب کیا ہے؟ کہا تم یہ آیت نہیں پڑھتے: ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ... الخ﴾ (آیتِ باب) اس میں تمام اصحاب کے لیے جنت اور رضوان کو واجب کر دیا ہے اور تابعین پر وہ شرط کی جو ان پر نہ کی تھی۔ میں نے کہا: وہ کیا شرط ہے؟ کہا: یہ پیروی کریں گے ان کی اچھی طرح، یعنی اعمالِ حسنہ میں ان کے مقتدی ہوں گے۔ ابوصخر کہتے ہیں: واللہ! گویا میں نے اس آیت کو نہیں پڑھا تھا اور نہ اس کی تفسیر پہچانی تھی، یہاں تک کہ محمد بن کعب نے اس آیت کو پڑھا،[3] اللہ قبل طاعت کے ان سے راضی ہوا اور ان سے تجاوز (درگزر) کیا اور ان پر خفا نہ ہوا، وہ اللہ کے فضل سے راضی ہوئے، اللہ نے اپنی رضا کے ہمراہ ان کے لیے جنت بھی تیار کی ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہا کریں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسحاق بن ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مردوں میں سے سب سے پہلے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لائے اور عورتوں میں سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں سے سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور غلاموں میں سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے۔[4] یہ چاروں ایمان لانے میں تمام مخلوق سے آگے ہیں۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سیدنا عثمان، زبیر، ابن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ رضی اللہ عنہم مسلمان ہوئے۔ پھر ان کے بعد لگا تار لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہ سابقین اولین ہیں، مہاجرین میں سے۔ انصار وہ لوگ ہیں جنھوں نے شبِ عقبہ میں نبی اکرم ﷺ سے بیعت کی، یعنی عقبہ اولیٰ میں، یہ پانچ آدمی تھے: سعد، عوف، رافع، قطبہ اور جابر، پھر اصحابِ عقبۂ ثانیہ، وہ بارہ مرد تھے، پھر اصحابِ عقبۂ ثالثہ، یہ ستر شخص تھے۔ یہ سابقین انصار ہیں، اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں، جن کے ذکر میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہے۔[5]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٦٩) [2] الدر المنثور (٤/ ٢٧٢) [3] تاریخ دمشق لابن عساکر (٥٥/ ١٤٦۔ ١٤٧)
[4] تفسیر البغوي (٤/ ٨٧۔ ٨٨) [5] فتح البیان (٥/ ٣٨٢۔ ٣٨٤)

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ
مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ
مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾

اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں ان میں بعض منافق ہیں اور بعض اہلِ مدینہ بھی نفاق پر اَڑے ہوئے ہیں۔ (اے نبی!) آپ انھیں نہیں جانتے، ہم انھیں جانتے ہیں۔ ہم جلد انھیں دوہری سزا دیں گے، پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۱۰۱﴾

اعراب اور مدینہ کے منافقین:

یعنی دنیا میں بھی تکلیف پر تکلیف پائیں گے، پھر آخرت میں پکڑے جائیں گے۔ وہ منافق کوئی اندھا ہوا، کوئی کوڑھی اور کسی کے بدن میں پیپ پڑی۔ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ عرب کے قبیلوں میں سے جو مدینے کے اردگرد رہتے ہیں، وہ اہلِ نفاق ہیں اور خاص مدینے میں بھی منافق لوگ بستے ہیں جو اپنے نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، سرکش ہیں، مغرور ہیں اور دشمن ہیں۔ یہ کہنا کہ ہم ان کو جانتے ہیں تو ان کو نہیں جانتا کچھ اس آیت کے منافی نہیں ہے: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ﴾ [محمد: ۳۰] ''اور اگر ہم چاہتے تو یقیناً آپ کو وہ (منافق) دکھا دیتے، پھر آپ انھیں ان کے چہرے کی علامتوں سے ضرور پہچان لیتے، اور یقیناً آپ انھیں گفتگو کے لب و لہجے سے پہچان لیں گے۔''

اس لیے کہ اس سے مراد ان کو صفات معروف کے ساتھ پہچاننا ہے، نہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جتنے منافق ہیں، ان میں سے ہر ایک کو پہچانتے ہیں۔ ہاں اتنا جانتے تھے کہ اہلِ مدینہ میں سے جو لوگ ہم سے ملتے جلتے رہتے ہیں، ان میں بعض اہلِ نفاق و شک بھی ہیں جو صبح و شام نظر آتے ہیں، اس کی صحت پر شہادت یہ ہے کہ سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے ذکر کیا کہ وہ لوگ یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ ہمارے لیے مکے میں کچھ اجر نہیں ہے۔ فرمایا: بے شک تمھارے اجر تم کو ملیں گے، اگرچہ تم ایک لومڑی کے سوراخ میں کیوں نہ ہو اور آپ ﷺ نے سر جھکا کر ان کے کان میں کہا کہ میرے اصحاب میں کچھ لوگ منافق بھی ہیں۔[1] (رواہ أحمد)

یعنی بعض منافقین تمھارے ڈرانے کے لیے ایسی بے اصل بات کہہ دیتے ہیں۔ ایسا غیر صحیح کلام انھی سے صادر ہوتا ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو چودہ پندرہ منافقوں کے نام متعین کر کے بتا دیے تھے۔ اس تخصیص کا یہ تقاضا نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو تمام منافقوں اور ان کے مددگاروں کے ناموں کی اطلاع تھی۔ واللّٰه أعلم.

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٨٣) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (مجمع الزوائد: ٥/ ٤٥٩)

امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص جس کو حرملہ کہتے تھے، اس نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ایمان یہاں ہے اور اشارہ اپنی زبان کی طرف کیا اور نفاق یہاں ہے اور اپنے دل کی طرف اشارہ کیا اور اس نے اللہ کا ذکر نہیں کیا، مگر تھوڑا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لَهُ لِسَاناً ذَاكِراً، وَقَلْباً شَاكِراً، وَارْزُقْهُ حُبِّيْ، وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّنِيْ، وَصَيِّرْ أَمْرَهُ إِلىٰ خَيْرٍ» اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! کچھ منافق میرے یار تھے، میں ان میں سردار تھا، کیا میں ان کو آپ کے پاس نہ لاؤں، فرمایا: جو ہمارے پاس آئے گا، ہم اس کے لیے استغفار کریں گے اور جو اپنے دین پر اڑا رہے گا، اللہ اس کے ساتھ اولیٰ تر ہے اور تُو کسی کا پردہ نہ پھاڑ۔[1] (رواه الحاكم أيضاً)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ لوگوں کے حال جاننے میں تکلف کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ فلاں جنت میں ہے، فلاں نار میں اور جب ان سے ان کے نفس کا حال پوچھو تو ان میں سے کوئی کہتا ہے میں نہیں جانتا، واللہ! تو اپنے حصے کو لوگوں کے حالات کی نسبت زیادہ تر جانتا ہے، تو نے وہ تکلف کیا کہ جو تجھ سے پہلے انبیا نے بھی نہیں کیا۔ نوح علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ١١٢] ''اور مجھے کیا معلوم جو وہ عمل کرتے رہے ہیں۔'' شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴾ [هود: ٨٦] ''اللہ کی بچت (جائز نفع) تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تم پر محافظ نہیں ہوں۔'' اور اللہ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: ﴿ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ﴾[2] (آیتِ باب) یہ آیات اس بات پر دلیل ہیں کہ انبیا علیہم السلام کو علمِ غیب نہیں تھا اور اس بات پر بھی دلیل ہیں کہ خاص زمانہ انبیا میں بھی منافق موجود تھے۔ پھر کسی دوسرے خلیفہ یا امام یا عالم کو کیا توقع ہے کہ اس کے حق میں اہلِ نفاق نہیں ہیں۔

دوہرے عذاب سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آیتِ باب کے بارے میں کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جمعے کے دن کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اور فرمایا: اے فلاں! تو نکل جا، تُو منافق ہے، اور نکل اے فلاں، تُو منافق ہے، اس طرح کئی آدمیوں کو مسجد سے نکال دیا، اتنے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے، وہ لوگ مسجد سے نکالے جاتے تھے، یہ ان سے چھپ گئے، اس شرم سے کہ جمعہ میں حاضر نہ ہوئے تھے، گمان کیا کہ یہ لوگ نماز پڑھ کر نکلے ہیں اور وہ لوگ عمر رضی اللہ عنہ سے چھپ گئے، اس شرم سے کہ ان کو ان کا حال معلوم ہو گیا۔ جب عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ لوگوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی، ایک مسلمان مرد نے کہا کہ اے عمر! خوش ہو جاؤ، اللہ نے آج منافقوں کو رسوا کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے

---

[1] المعجم الكبير (٤/ ٥) تاريخ دمشق لابن عساكر (٦٧/ ٢٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٩/ ٦٨٢)

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٤٤١)

ہیں: پہلا عذاب یہی مسجد سے نکالا جانا ہے۔ دوسرا عذاب قبر کا عذاب ہے۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ﴾ میں یوں کہا ہے کہ مراد قتل اور گرفتاری ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد گرسنگی و عذابِ قبر ہے، پھر عذابِ عظیم ہوگا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذابِ دنیا اور عذابِ قبر ہے، پھر عذابِ نار۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عذابِ دنیا و عذابِ قبر ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذابِ دنیا اموال و اولاد ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [التوبة: ٥٥] ”چناں چہ ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں، یقیناً اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیاوی زندگی ہی میں عذاب دے۔“

چنانچہ یہ مصائب ان کے لیے دنیا کی زندگی میں عذاب ہیں اور مومنین کے لیے اجر ہیں اور عذابِ آخرت نارِ جہنم ہے، پھر عذابِ عظیم ہے، یعنی نار۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک عذاب تو اسلام میں ناخوشی کے ساتھ داخل ہونا ہے، جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا، دوسرا عذاب قبر میں ہوگا، جبکہ وہاں پہنچیں گے، پھر عذابِ آخرت اور اس میں ہمیشہ رہنا ہے، جس کو عظیم فرمایا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرتین سے مراد عذابِ دنیا اور عذابِ قبر ہے، پھر عذابِ عظیم۔

ہم نے سنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بارہ منافقوں کے نام سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو چپکے سے بتا دیے تھے، پھر فرمایا تھا کہ ان میں سے چھے کو تو دبیلہ کفایت کرے گا، وہ جہنم کی آگ سے ایک چراغ ہے کہ کندھے پر چمک کر سینے تک پہنچے گا اور چھے ان میں سے اپنی موت سے مریں گے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھا تھا کہ کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ کہا: نہیں، ”وَلَا أُومِنُ مِنْهَا أَحَداً بَعْدَكَ“[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت منافقین کے حال کو بیان کرتی ہے، یہ منافق مدینے اور مدینے کے ارد گرد والی بستیوں میں تھے، اہلِ حوالی میں جُہینہ، مزینہ، اشجع، غفار اور اسلم تھے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ان کا نام لیا ہے، جیسے: بغوی، واحدی، ابن الجوزی، نسفی، خازن اور سیوطی وغیرہم۔[3] لیکن اس میں اشکال ہے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان قبائل کے لیے دعا کی ہے۔ چنانچہ اگر یہ نقل صحیح ہے تو آیت کو ان کی قلیل تعداد پر محمول کرنا چاہیے، کیونکہ حرف مِن

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٤٤١۔ ٤٤٢) المعجم الأوسط (١/ ٢٤١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفیه الحسین بن عمرو العنقزي وهو ضعیف“ (مجمع الزوائد: ٧/ ١١١)

[2] تفسیر الطبري (١٤/ ٤٤٢۔ ٤٤٥)

[3] تفسیر البغوي (٤/ ٨٩) تفسیر الواحدي (١/ ٤٧٩) تفسیر النسفي (٢/ ١٠٧) تفسیر الخازن (٣/ ١٤٠) تفسیر الجلالین (١/ ٢٥٩)

تبعیض (کچھ لوگوں کو مخصوص کرنا) کے لیے آتا ہے اور دعا کو اکثر کے لیے سمجھا جائے گا، اس طرح ان دونوں میں جمع ہونا ممکن ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے مطلقاً کہا ہے کہ کسی قبیلے کو متعین نہیں کیا، بلکہ من جملہ اہلِ حوالی مدینہ کو بتایا،[1] اور یہی راجح بھی معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ جب اللہ نے رسول ﷺ سے کہا کہ تم بھی ان کو نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں تو پھر مفسرین کا ان کو متعین کرنا کچھ ٹھیک بات نہیں۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ مدینہ سے اوس وخزرج مراد ہیں، ان میں سے بعض منافق نفاق پر قائم تھے اور شک میں مبتلا تھے۔[2] نبی اکرم ﷺ ان کے حال کو نہیں جانتے تھے، مومنین کو کیسے معلوم ہوسکتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو ان کا علم نہ ہونا اس لیے نہیں کہ آپ کو منافقوں کی موجودگی کا علم نہیں تھا، بلکہ علی التعیین (متعین لوگوں کے ناموں کا علم) نہیں تھا، کیونکہ نفاق کی علامتیں آپ ﷺ پر پوشیدہ نہیں تھیں۔ ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ [محمد: ٣٠] کچھ اس کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ آیتِ نفی کا نزول آیتِ اثبات سے قبل ہوا ہے۔ اللہ نے ان کے لیے دوہرا عذاب مقرر کیا: جیسے: قتل وقید اور عذابِ آخرت۔ یا نفاق کا انکشاف اور دنیا میں رسوائی اور عذابِ نار آخرت میں۔

ان دونوں کے بیان میں سلف کے اقوال ہیں، لیکن ان پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہی تفسیر بعینہٖ مراد ہے، ظاہر یہ ہے کہ دنیا میں عذابِ مکرر تو وہ ہے جس پر عذاب کا نام صادق آئے اور وہ بار بار اس میں گرفتار ہوں، پھر اس کے بعد عذابِ آخرت ہے جس کو عظیم فرمایا ہے اور جس نے کہا کہ دوسرا عذاب آخرت کا عذاب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تمام کافروں کی طرح عذابِ نار ہوگا، پھر وہ نار کے سب سے نچلے درجے میں بھیجے جائیں گے۔ یہ عذاب خاص انہی منافقوں کو ہوگا نہ کہ سارے کافروں کو۔[3] عیاذا باللہ منه.

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾

اور کچھ دیگر لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے ملا جلا عمل کیا، ایک اچھا اور دوسرا برا، امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (102)

سستی کی وجہ سے پیچھے رہ جانے والے سچے مومن اور ملے جلے اعمال کرنے والے اور گناہوں کا اعتراف کرنے والے:

مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد سے پیچھے رہ گئے، سستی اور راحت پسندی کی وجہ سے، لیکن اصل ایمان اور تصدیق رکھتے تھے، انھوں نے اپنے اور اللہ پاک کے درمیان اپنے اعمالِ بد کا اقرار کیا اور ان کے اعمالِ صالحہ بھی تھے جن کو

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٤٤٠) [2] تفسیر البغوي (٤/ ٨٩) [3] فتح البیان (٥/ ٣٨٤۔ ٣٨٦)

انھوں نے ان اعمالِ سیئہ سے ملایا تھا، وہ اللہ کی معافی اور بخشش کے تحت ہیں۔ یہ آیت اگرچہ معین اشخاص کے حق میں آئی ہے، لیکن یہ تمام گناہ گاروں، خطا کاروں اور نیکی اور بدی کے کام کرنے والوں اور متلوثین (وہ ایمان دار جو برائی کے کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں) کے حق میں عام ہے۔ وللہ الحمد.

شانِ نزول:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا نزول سیدنا ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا ہے، جبکہ اس نے قریظہ سے کہا تھا کہ یہ ذبح ہے اور اپنے ہاتھ سے حلق کی طرف اشارہ کیا تھا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابولبابہ اور اس کے ساتھیوں کے حق میں اتری ہے کہ وہ غزوۂ تبوک میں نہ گئے، وہ ابولبابہ اور پانچ یا سات یا نو اشخاص تھے، جب نبی کریم ﷺ غزوے سے لوٹ کر آئے تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھا اور قسم کھائی کہ ان کو نہ کھولیں گے مگر اللہ کے رسول ﷺ۔ جب یہ آیت اتری، تب آپ ﷺ نے ان کو معاف کر کے چھوڑ دیا۔[2]

سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہم سے کہا کہ آج کی رات دو آنے والے آئے اور مجھے لے گئے۔ ہم ایک شہر میں پہنچے، جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی تھی، ہمارے سامنے کچھ لوگ آئے، نصف حلق یعنی دھڑ ان کا اس سے بہتر تھا جو تم نے دیکھا ہو اور نصف بدتر تھا اس سے جس کو تم نے دیکھا ہو، ان دونوں نے ان سے کہا: جاؤ اس نہر میں گرو، وہ اس نہر میں گرے، پھر ہمارے پاس آئے، ان سے وہ برائی دور ہو گئی، وہ نہایت اچھی شکل میں ہو گئے، مجھ سے کہا کہ یہ جنتِ عدن ہے اور یہ تمھاری منزل ہے اور یہ قوم جن کا آدھا جسم اچھا اور آدھا برا تھا، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اچھا عمل کیا اور برا عمل ملایا تھا، اللہ نے ان سے تجاوز (درگزر) فرمایا۔[3] (هكذا رواه البخاري مختصرا في تفسير هذه الآية)

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اس آیت میں لفظ عسیٰ تحقیق کے طور پر ہے نہ کہ شک کے واسطے، بلکہ اس سے باشارۃ النص یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر عمل صالح اور عمل سیئ برابر ہوں گے تب بھی بخشش کی امید ہے، رحمتِ الٰہی اللہ کے غضب پر سبقت کرے گی، پھر اگر حسنات غالب ہیں سیئات پر، اگرچہ ذرہ برابر ہی زیادہ ہوں، تو پھر احادیث کی رو سے، ان شاء اللہ تعالیٰ، غفران بھی متعین ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آخرین سے اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو بلا عذر جنگ سے پیچھے بیٹھ رہے، پھر اپنے فعل پر نادم ہوئے اور جھوٹے عذر پیش کیے، جس طرح کہ منافقوں نے کیا تھا اور اپنی صفائی کے لیے جھوٹی

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٥١۔ ٤٥٢) [2] تفسير الطبري (١٤/ ٤٤٧۔ ٤٤٩) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٩٧)

قسمیں کھائی تھیں، بلکہ اپنے قصور کا اعتراف کر کے توبہ کی اور اللہ سے اپنی توبہ قبول ہونے کے امیدوار ہوئے۔ انھوں نے عملِ صالح کے ساتھ عملِ سیئ بھی ملایا تھا۔ عملِ صالح سے مراد اسلام قبول کرنا اور اسلام کے احکام پر کاربند رہنا اور تمام جہادوں میں شرکت کے لیے نکلنا ہے اور عملِ سیئ سے مراد جہاد سے پیچھے رہ جانا (شامل نہ ہونا) ہے اس غزوے سے۔ پھر اس عملِ بد کے بعد عملِ صالح کیا، وہ عمل دراصل اپنے قصور کا اعتراف اور توبۂ نصوح ہے، کیونکہ صرف اقرار کر لینا ہی توبہ نہیں ہوتا، مگر جب کہ اس کے ساتھ گذشتہ عملِ بد پر ندامت ہو، آیندہ کے لیے ترک کرنے کا ارادہ ہو اور فی الحال اس سے علاحدگی ہو، سو ان سے یہ سب امور واقع ہوئے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرف واؤ اس جگہ صرف جمع کے لیے ہے۔[1]

اور غالب مفسرین نے کہا ہے کہ باء موحدہ کے معنی میں ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واؤ بہتر ہے باء سے، کیونکہ مراد جمع ہے نہ کہ حقیقتِ خلط۔[2] امام تفتازانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واؤ جمع کے لیے اور باء الصاق (ساتھ) کے لیے ہے۔ سو جمع اور الصاق ایک ہی قبیل سے ہے۔ یہ استعارے کا طریقہ ظاہر کرتا ہے، یہ فرمانا کہ شاید اللہ ان کی توبہ قبول کر لے، اس بات پر دلیل ہے کہ ان سے توبہ بھی اعترافِ گناہ کے ساتھ واقع ہوئی ہے یا یہ کہ اعتراف جو توبہ سے پہلے ہوتا ہے، توبہ کا قائم مقام ٹھہرا اور اللہ کے کلام میں رجا (امید) کا حرف کسی چیز کے واقع ہونے پر یقینی طور پر مفید ہوتا ہے، کیونکہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کا طمع یا امید دلانا اس کی قبولیت ہوا کرتا ہے۔ اس ذات اکرم الاکرمین اور اس کی صفت ارحم الراحمین ہے۔

مواہبِ لدنیہ میں کہا ہے: "وَاتَّفَقَ الْمُفَسِّرُوْنَ عَلٰی ذٰلِكَ" علامہ قسطلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عسیٰ میں اس بات کا جتلانا ہے کہ اللہ کا یہ فعل ازراہِ تفضّل (احسان) ہے، تاکہ کوئی شخص تکیہ کر کے نہ بیٹھ رہے، بلکہ وہ خوف پر ہو اور ڈرتا رہے۔ یہ ارشاد کہ اللہ غفور و رحیم ہے، ایفائے وعدہ کے لیے مفید ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ دس شخص تھے، ان میں سے سات آدمیوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھا تھا، اس پر یہ آیت آئی۔[3] گو اس کے نزول کا سبب خاص ہے، لیکن یہ آیت تمام مسلمین کے لیے ہے۔ اس کو عام لوگوں پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے ابو عثمان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا ہے: "مَا فِيْ الْقُرْآنِ آيَةٌ أَرْجٰی عِنْدِيْ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ مِنْ هٰذِهِ الْآيَةِ"[4]

---

[1] تفسیر الرازي (١٦/ ١٣٩۔ ١٤٠)
[2] تفسیر الخازن (٣/ ١٤٣)
[3] تفسیر الطبري (١٤/ ٤٤٧۔ ٤٤٨)
[4] تفسیر الطبري (١٤/ ٤٥٢) فتح البیان (٥/ ٣٨٧۔ ٣٨٨)

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

(اے نبی!) ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے (تاکہ) آپ اس کے ذریعے سے انھیں پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لیے دعا کریں، بے شک آپ کی دعا ان کے لیے سکون (کا باعث) ہے، اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (103) کیا انھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے، اور وہی صدقات لیتا ہے اور یہ کہ بلاشبہ اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (104)

زکات لینے اور اس کے فوائد کا ذکر:

یعنی جیسے بعضوں پر عتاب ہوا، کہ ہمیشہ کو ان کی زکات لینی موقوف ہے، ان پر عتاب نہیں۔ رسول بے اختیار ہے جس کے حق میں اللہ نے جو فرمایا وہ ادا کرتا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے، اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر انھی کی طرف پھرتی ہے، جنھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا اور ان کے اعمال ملے جلے تھے، اسی لیے عرب کے قبیلوں میں سے بعض مانعینِ زکات کا یہ اعتقاد تھا کہ زکات امام کو نہیں دینی چاہیے، یہ حق خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کے لیے تھا، اس آیت کی دلیل سے: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ (آیتِ باب) لیکن سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس غلط تاویل اور فہمِ فاسد کی تردید کی اور تمام صحابہ نے ان مانعینِ زکات کے ساتھ جنگ کی، یہاں تک کہ انھوں نے خلیفہ کو زکات دی، جس طرح نبی اکرم ﷺ کو دیتے تھے، حتی کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ”وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِيْ عِنَاقاً أَوْ عِقَالًا يُؤَدُّوْنَهُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ لَأُقَاتِلَنَّهُمْ عَلٰى مَنْعِهِ“ [1]

صلات کا معنی:

صلات کے معنی اس جگہ دعا و استغفار ہیں، چنانچہ سیدنا عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے پاس کسی قوم کا صدقہ آتا تو آپ ان پر صلات بھیجتے (دعائے رحمت کرتے)۔ میرے باپ صدقہ لے کر گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: « اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ أَبِيْ أَوْفٰى » [2] (رواہ مسلم) دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٠٥)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٨)

نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ پر اور میرے شوہر پر صلات بھیجیں، فرمایا: «صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكِ وَعَلٰى زَوْجِكِ»[1]
صلات کے سکن ہونے سے مراد رحمت ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے وقار کہا ہے۔[2] سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو دعا دیتے تو وہ دعا اس کو اور اس کی اولاد، اولاد کی اولاد اور پھر اس کی اولاد کو پہنچتی، یعنی چار پشت تک اس کا اثر باقی رہتا۔[3] (رواہ أحمد) روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «إِنَّ صَلَاةَ النَّبِيِّ ﷺ لَتُدْرِكُ الرَّجُلَ وَ وَلَدَهُ وَ وَلَدَهُ وَ وَلَدَهُ»[4]

توبہ اور صدقہ:

پھر اللہ نے توبہ اور صدقہ پر ابھارا، کیونکہ یہ دونوں کام گناہوں کو مٹاتے ہیں اور ان کو نیست و نابود کر دیتے ہیں، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو کوئی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کے رجوع اور توبہ کو قبول فرماتا ہے اور جو کوئی کسبِ حلال سے صدقہ کرتا ہے تو اللہ اس کے صدقے کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر اس کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ کھجور کا ایک دانہ ایک پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے، جس طرح کہ اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث آئی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ صدقہ قبول کرتا ہے اور اسے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس کو پالتا ہے، جس طرح تم میں سے کوئی اپنی گھوڑی کا بچہ پالتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھجور کا دانہ اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں موجود ہے: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ ﴾ (آیتِ باب) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [البقرة: ٢٧٦] ''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''[5] (رواہ الترمذي) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ صدقہ اللہ کے ہاتھ میں پڑتا ہے، اس سے پہلے کہ سائل کے ہاتھ میں جائے، پھر یہ آیت پڑھی۔[6]

حکایت:

امام ابن عساکر رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں عبداللہ بن شاعر سکسکی دمشقی حمصی الاصل کا ترجمہ نقل کیا ہے کہ سیدنا

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١١٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٥/ ٢٦١)

(2) تفسير الطبري (١٤/ ٤٥٧)

(3) مسند أحمد (٥/ ٣٨٥) اس کی سند میں ''ابن حذیفہ'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤١٩٣)

(4) مسند أحمد (٥/ ٤٠٠) اس کی سند میں ''ابن حذیفہ'' مجہول راوی ہے۔

(5) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦٢) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے دوسرے جملے (اور اس کی تصدیق... تا آخر) کو منکر کہا ہے) تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٣/ ٣٩٤) البتہ اس جملے کے بغیر روایت صحیح بخاری (رقم الحديث: ١٣٤٤) اور صحیح مسلم (رقم الحديث: ١٠١٤) میں بھی مروی ہے۔

(6) تفسير الطبري (١٤/ ٤٦٠)

معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگوں نے جہاد کیا، عبدالرحمان بن خالد بن ولید اس لشکر کے سردار تھے، ایک مسلمان شخص نے سو دینار رومی خیانت کر لیے، جب لشکر چلا گیا، یہ شخص جی میں پشیمان ہوا، امیر کے پاس لایا، امیر نے کہا: میں نہیں لیتا، لوگ اس معاملے میں متفرق ہو گئے ہیں، اب تو اس کو قیامت کے دن اللہ کے پاس لے جانا، وہ شخص صحابہ کے پاس لے جاتا وہ بھی یہی کہتے، جب یہ شخص دمشق میں آیا تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے جا کر بھی وہی دلیلیں دیں، انھوں نے بھی انکار کر دیا، وہ وہاں سے روتا ہوا انا للہ پڑھتا ہوا نکلا، اس کا گزر عبداللہ بن شاعر سکسکی پر ہوا، ان سے یہ سارا حال بیان کیا، عبداللہ نے کہا: "أَوَ مُطِيعِي أَنْتَ؟" یعنی کیا تو میرا مطیع ہوگا، اگر میں کچھ صلاح دوں؟ اس نے کہا: ہاں، فرمایا: تو معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر کہہ کہ تم اپنا خمس مجھ سے لو اور بیس دینار ان کو دے دے۔

اب رہے اسّی دینار، ان کو اس لشکر کی طرف سے صدقہ کر دے، اللہ اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور صدقہ لیتا ہے اور وہ ان کے نام اور مکان خوب جانتا ہے، اس نے ایسا ہی کیا، معاویہ رضی اللہ عنہ نے سن کر کہا: "لَأَنْ أَكُوْنَ أَفْتَيْتُ بِهَا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ أَمْلِكُهُ، أَحْسَنَ الرَّجُلُ" یعنی اگر یہ فتویٰ اس شخص کو میں دیتا تو یہ میری ملکیت کی ہر شے سے مجھ کو زیادہ محبوب تر تھا۔ اس مرد نے خوب کام کیا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ عبداللہ فقہا میں سے تھے۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، حوشب بن سیف سکسکی حمصی ان سے راوی ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اس صدقۂ مامور بہا میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صدقہ فرض ہے اور کسی نے کہا ہے اس گروہ کے ساتھ مخصوص تھا، اس لیے کہ انھوں نے توبہ کے بعد اپنے اموال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیے تھے، اس پر یہ آیت اتری۔ صدقہ صدق سے ماخوذ ہے، اس لیے کہ اس کے ایمان میں صدقِ مخرج پر دلیل ہے۔ اس صدقے کا مقصد صدقہ لینے والے کو پاک صاف کرنا ہوتا ہے۔ تطہیر یہ ہے کہ گناہوں کا اثر دور ہو جائے۔ تزکیہ طہارت میں مبالغہ ہے کہ بالکل پاک صاف ستھرے ہو جائیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال کا ایک تہائی بطورِ کفارہ لے کر صدقہ کیا۔[2] اس لیے کہ جس کسی سے کوئی گناہ ہو جائے اس کو صدقہ کرنا مسنون ہے۔ کلامِ عرب میں صلات بمعنی دعا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کو تسکین اور طمانیتِ نفس ٹھہرایا۔ پھر جب اللہ نے ان کی توبہ قبول کی تو یہ فرمایا کیا وہ یہ بات نہیں جانتے ہیں کہ اللہ بندوں کی توبہ قبول کرنے والا اور ان سے صدقہ لینے والا ہے۔ اس اضافت میں عظیم بزرگی ہے، اس اطاعت اور صاحبِ طاعت کی۔ لفظ اخذ میں فقرا کو صدقات اور خیرات دینے کے لیے ترغیب دلانا ہے۔

---

[1] تاریخ دمشق لابن عساکر (۲۹/ ۱۳۸۔ ۱۳۹) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۰۶) [2] تفسیر الجلالین (۱/ ۲۵۹)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے: « مَا تَصَدَّقَ أَحَدُكُمْ بِصَدَقَةٍ مِّنْ كَسْبٍ حَلَالٍ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ إِلَّا أَخَذَهَا الرَّحْمٰنُ بِيَمِيْنِهِ وَإِنْ كَانَتْ تَمْرَةً فَتَرْبُوْ فِيْ كَفِّ الرَّحْمٰنِ حَتّٰى تَكُوْنَ أَعْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ كَمَا يُرَبِّيْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ أَوْ فَصِيْلَهُ »[1] (اخرجه الشيخان) اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ ﴿ اَلتَّوَّابُ ﴾ مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی اللہ کے کتنے ہی گناہ مکرر سہ کرر کیوں نہ کیے ہوں، جب نادم ہو کر تائب ہو گا تو وہ اپنے رحم و کرم سے اس کی توبہ قبول کرے گا۔[2]

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵

(اے نبی!) کہہ دیجیے: تم عمل کرو، پھر اللہ تمھارے عمل کو عن قریب دیکھے گا اور اس کا رسول اور مومنین بھی اور تم جلد اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے، جو چھپی اور کھلی (باتیں) جاننے والا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ﴿105﴾

نافرمانوں کو وعید:

یعنی اس جہاد میں قصور ہوا تو آگے اور جہاد ہوں گے جو رسول کے اور خلفا کے روبرو ہوں گے، اس وقت تم اپنا کام دکھانا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے وعید ہے[3] کہ ان کے اعمال ہمارے سامنے پیش ہوں گے اور رسول اور اہلِ ایمان پر بھی پیش ہوں گے اور یہ بات قیامت کے دن لامحالہ ہونے والی ہے، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ۱۸] ''اس دن تمھاری پیشی ہوگی اور تمھارا کوئی راز خفیہ نہ رہے گا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ﴾ [الطارق: ۹] ''جس دن راز ظاہر کر دیے جائیں گے۔'' اور کبھی اللہ اس کا دنیا میں بھی لوگوں پر اظہار کر دیتا ہے۔

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ يَعْمَلُ فِيْ صَخْرَةٍ صَمَّاءَ لَيْسَ لَهَا بَابٌ وَلَا كُوَّةٌ لَأَخْرَجَ اللّٰهُ عَمَلَهُ لِلنَّاسِ كَائِنًا مَّا كَانَ »[4] (رواه أحمد) یہ بھی آیا ہے کہ اعمال زندوں کے اُن کے مرے ہوئے رشتے داروں اور قبیلے والوں پر برزخ میں پیش کیے جاتے ہیں۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ أَعْمَالَكُمْ تُعْرَضُ عَلٰى أَقْرِبَائِكُمْ وَعَشَائِرِكُمْ فِيْ قُبُوْرِهِمْ فَإِنْ كَانُوْا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٤)

[2] فتح البيان (٥/ ٣٨٨_٣٩١) [3] تفسير الطبري (١٤/ ٤٦٣)

[4] مسند أحمد (٣/ ٢٨) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٨٠٧)

خَيْراً اِسْتَبْشَرُوْا وَإِنْ كَانَ غَيْرَ ذَلِكَ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ أَلْهِمْهُمْ أَنْ يَّعْمَلُوْا بِطَاعَتِكَ ﴾[1] (رواه أبو داود الطيالسي)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿ إِنَّ أَعْمَالَكُمْ تُعْرَضُ عَلٰى أَقْرِبَآئِكُمْ وَعَشَائِرِكُمْ مِنَ الْأَمْوَاتِ فَإِنْ كَانَ خَيْراً اِسْتَبْشَرُوْا وَإِنْ كَانَ غَيْرُ ذَلِكَ قَالُوْا اَللّٰهُمَّ لَا تُمِتْهُمْ حَتّٰى تَهْدِيَهُمْ كَمَا هَدَيْتَنَا ﴾[2] (رواه أحمد) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ جب تم کو کسی شخص کا عمل اچھا معلوم ہو تو کہو: ﴿ اِعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾[3] (رواه البخاري) دوسری حدیث میں اس کے مشابہ یوں آیا ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم پر کچھ ڈر نہیں اگر تم کسی پر تعجب کرو، یہاں تک کہ تم دیکھو کہ اس کا خاتمہ کیسا ہوتا ہے، کیونکہ عمل کرنے والا اپنی عمر میں ایک زمانے تک اور اپنے زمانے سے ایک وقت پر عملِ صالح کرتا ہے، اگر اس عمل پر مر جائے تو آگ میں جائے۔ پھر وہ نیک عمل کرنے لگتا ہے اور جب اللہ اپنے بندے سے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو مرنے سے پہلے اس سے کام لیتا ہے۔ پوچھا: کیسے کام لیتا ہے؟ فرمایا: اس کو عملِ صالح کی توفیق دیتا ہے، پھر اسی عمل پر اس کو قبض کر لیتا ہے۔[4] (تفرد به أحمد من هذا الوجه)

اے اللہ! مجھ بندۂ عاصی کا یہ آخر عمر ہے، تو مجھ کو کسی عملِ صالح پر موت دے اور ایسی توفیق دے کہ میرے اگلے گناہ اور حال کے گناہ مستقبل میں معاف ہو کر میں تیرے عفو و غفران کے لائق ہو جاؤں، میرے حساب میں میرے ماضی اور حال کے گناہ بارش کے قطروں اور ریت کے ذروں سے زیادہ ہیں، تمام بنی آدم کی بہ نسبت۔ جو لوگ اہلِ کرم ہوتے ہیں وہ آدمی کا قصور معاف کر دیتے ہیں، تُو اکرم الاکرمین اور ارحم الراحمین ہے، تیرے سامنے اس مشتِ خاک کی زیادتیوں اور اسراف کو معاف کر دینا کیا بڑی چیز ہے۔ اَللّٰهُمَّ تَوْفِيْقًا وَّغُفْرَاناً.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم جو چاہو عمل کرو، اچھا یا برا، اللہ و رسول و اہلِ ایمان تمھارے عمل کو دیکھتے ہیں، ان پر تمھارے یہ عمل پوشیدہ نہیں۔ اس میں گناہوں سے ڈرایا گیا ہے اور ڈانٹا گیا ہے کہ عملِ خیر کی طرف جلدی کرو اور عمل کو اللہ کے لیے خالص کرو۔ اور مطیعین کے لیے ترغیب ہے اور خوشی ہے، کیونکہ جس کو یہ بات معلوم ہو گی کہ اس کا عمل مخفی نہیں ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، وہ ضرور اعمالِ خیر میں رغبت کرے گا اور اعمالِ شر سے پرہیز رکھے گا۔ غرض کہ اس آیت میں ترغیب اور ترہیب دونوں ہیں۔

---

[1] مسند الطيالسي (١/ ٢٤٨) اس کی سند میں ''الصلت بن دینار'' ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/ ١٦٤) اس روایت کی سند میں سفیان ثوری رحمہ اللہ اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٨٦٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦/ ٢٧٣٧)

[4] مسند أحمد (٣/ ١٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٣٤)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هٰذَا وَعِيْدٌ مِّنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ" [1] اور ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "زِيَادَةُ تَرْغِيْبٍ لَّهُمْ فِي الْعَمَلِ الصَّالِحِ" [2] عمل کے دکھائے جانے سے مراد مجازاتِ عمل ہے، یعنی جیسا عمل ویسی سزا، خیر کی جزا خیر اور شر کی جزا شر۔ پھر جب اللہ کے سامنے جانا ہوگا وہ تمھارے عمل کی تم کو خبر کر دے گا کہ اچھے تھے یا برے اور ویسا ہی تم کو بدلا دے گا۔ [3] جب نبی اکرم ﷺ زندہ تھے، آنکھ سے یا کان سے امت کے عمل دیکھتے اور سنتے تھے، اب موت کے بعد ان کے اعمال آپ پر پیش کیے جاتے ہیں [4] اور ہر وقت کے مومن اپنے ہم عصر لوگوں کے اعمال دیکھتے ہیں اور موت کے بعد اس عامل کے قریبی رشتے دار اور عشائر (قبیلے والے) اس کے عمل کے بارے میں مطلع کیے جاتے ہیں اور اللہ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ ہے، وہ یکساں سب کے عمل دیکھتا رہتا ہے۔ وہ عالمِ غیب وشہادت ہے، اس سے کوئی شے مخفی نہیں ہے ع

بر او علم یک ذرہ پوشیدہ نیست   که پیدا و پنہاں نزدش یکے ست

"وہ ایک ذرہ کی موجودگی سے بھی بے خبر نہیں ہے، کیونکہ ظاہر و پوشیدہ اس کے نزدیک ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔"

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک مؤخر کر دیا گیا ہے، یا تو وہ انھیں سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کر لے گا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے ﴿106﴾

تین پیچھے رہ جانے والے مخلص مومنوں کے لیے اُمید:

اوپر کئی فرقے مذکور ہوئے، ایک منافق جھوٹے بہانے کرتے۔ ایک گنوار غرض کا وقت تلاش کرتے اور ایک گنوار جو صاف دل اور نرم۔ ایک وہ جو اپنا گناہ مانے، ان کو معاف فرما دیا، مگر جو قدیم دوستوں میں سے تین شخص اپنا گناہ مانے تھے، ان کو ادب سکھانے کی خاطر پچاس دن ڈھیل میں رکھا ہے، اس دوران میں نبی اکرم ﷺ اور سب مسلمان ان سے کلام نہ کرتے اور ان کی عورتیں جدا ہو گئیں۔ جب ان کے دل خوب پشیمان ہوئے، تب معافی نازل ہوئی، وہ آیت آگے ہے، یہ ان کا ذکر فرمایا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، ضحاک رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ وہ تین شخص مراد ہیں جو

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٦٣)   [2] تفسير أبي السعود (٤/ ١٠٠)   [3] فتح البيان (٥/ ٣٩١۔ ٣٩٢)

[4] نبی اکرم ﷺ پر امت کے اعمال کا پیش کیا جانا، کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ [ص۔ ي]

توبہ کرنے سے پیچھے رہ گئے، وہ مرارہ بن ربیع، کعب بن مالک اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم تھے۔[1] غزوۂ تبوک میں سستی اور آرام طلبی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے، نہ کہ شک اور نفاق کی وجہ سے۔ ان میں سے بعض نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا، جس طرح ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا[2] اور بعض نے نہ باندھا، جیسے یہ تینوں شخص، اس لیے اُن کی توبہ ان کی توبہ سے پہلے اتری اور ان کی توبہ میں تاخیر کی گئی، یہاں تک کہ آگے کی آیت نازل ہوئی۔ یعنی ﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ... الخ﴾ ان کو اللہ نے اپنی مشیت کے تحت رکھا، چاہے معاف کرے، چاہے عذاب دے، لیکن اس کی رحمت غضب پر غالب ہے، وہ جانتا ہے کہ کون معافی کا مستحق ہے اور کون سزا کا مستحق ہے، اس کے قول وفعل سب پُر حکمت ہوتے ہیں۔ لا إله إلا هو ولا رب سواه.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے تین قسم کے متخلفین کا ذکر کیا: ایک منافق جو اپنے نفاق پر اڑے رہے۔ دوسرے تائب جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، تیسرے وہ جن کا حکم اس حال میں موقوف رہا، وہ ڈھیل میں پڑے، ان کی توبہ وعدمِ توبہ دونوں کا یقین نہ تھا۔ فرق ان دونوں میں یہ ہوا کہ فرقہ ثانی نے عذر کیا نبی اکرم ﷺ نے قبول فرمایا، ان کی توبہ جلدی قبول ہوگئی، اس تیسرے فریق نے عذر نہ کیا، اس لیے کہ باوجود تلاش کے کوئی صحیح عذر ہاتھ نہ آیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے معاملے میں تاخیر فرمائی کہ اللہ کو اختیار ہے، اللہ نے پچاس دن کی ڈھیل دی۔[3]

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۰۷ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝۱۰۸

اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی، تاکہ (مسلمانوں کو) ضرر پہنچائیں اور کفر پھیلائیں اور مومنوں کے درمیان تفرقہ ڈالیں اور اس شخص کے لیے گھات لگائیں، جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکا ہے۔ اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ تو نیک ہی تھا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں (107) (اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے، اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٦٥۔ ٤٦٦)
[2] یہ واقعہ صحیح سند سے ثابت نہیں۔
[3] فتح البيان (٥/ ٣٩٣)

میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے (108)

مسجدِ ضرار اور مسجدِ تقویٰ:

نبی اکرم ﷺ مکے سے ہجرت کر کے آئے تو مدینے سے باہر بنو عمرو بن عوف کے محلے میں اترے۔ چند دنوں کے بعد شہر میں رہائش اختیار کی اور اس محلے میں مسجدِ نبوی تعمیر کی، جہاں نماز پڑھتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے مسجد تیار کی اور جماعت قائم رہی، مسجد قبا مشہور ہے۔ نبی اکرم ﷺ اکثر ہفتے کے روز وہاں جاتے اور نماز پڑھتے، اس محلے میں بعض منافقوں نے چاہا کہ اور مسجد بنائیں، پہلے مسجد بنانے والوں کی ضد پر اور اپنی جماعت جدا کریں اور ایک راہب ابو عامر جو اسلام کی ضد کی وجہ سے نکل گیا تھا، اس کو نفاق سے بلا کر وہاں سردار اور امام بنائیں۔

نبی اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ ایک دفعہ پہلی بار آپ وہاں نماز پڑھیں تو ہم جماعت قائم کریں، آپ ﷺ کو ان کی دغا معلوم نہ تھی، وعدہ کیا کہ جنگِ تبوک سے جب واپس آئیں گے تو پہلے وہاں نماز پڑھ کر پھر شہر میں داخل ہوں گے، اللہ نے پہلے خبردار کر دیا اور مسجد قبا کے لوگوں کی تعریف کی۔ آدمی خبردار رہے کہ ظاہر بعضی عبادت ہے اور نیت اس میں نفسانیت ہے، اس کا یہ حال ہے۔

سببِ نزول اور مسجدِ ضرار کا تذکرہ:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ تھا کہ مدینے میں نبی اکرم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے خزرج کا ایک ابو عامر راہب نام کا آدمی تھا، وہ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا۔ اس نے اہلِ کتاب کا علم پڑھا تھا، جاہلیت کا عابد تھا۔ خزرج میں اس کی بڑی عزت تھی، جب نبی اکرم ﷺ ہجرت کر کے مدینے آئے اور مسلمان آپ کے پاس جمع ہوئے اور اسلام کا بول بالا ہوا اور اللہ نے بدر کے دن مسلمانوں کو فتح یاب و غالب کیا۔ تو ابو عامر نے اپنی عداوت ظاہر کر دی اور وہاں سے نکل گیا، کفارِ مکہ سے جا ملا، مشرکینِ قریش کو نبی اکرم ﷺ سے لڑنے پر مائل کیا، وہ عرب کے ان قبیلوں کے ساتھ جو ان کے موافق تھے، جمع ہوئے اور احد کے سال میں آئے۔ مسلمانوں کا جو کچھ حال ہوا وہ ہوا، اللہ نے ان کا امتحان لیا۔ انجام نیک انہی پرہیز گاروں کا ہوا، اس فاسق نے دو صفوں کے درمیان کئی خندق کھودے تھے، ان میں سے ایک گڑھے میں نبی اکرم ﷺ گر گئے اور آپ ﷺ کو صدمہ پہنچا، چہرۂ مبارک زخمی ہوا، چار دانت ٹوٹ گئے، دو اوپر کے اور دو نیچے کے، سر میں چوٹ آئی۔ ابو عامر جنگ کے ابتدا میں اپنی قوم انصار کی طرف بڑھ کر مخاطب ہوا اور ان سے اپنی نصرت اور موافقت چاہی۔ جب انھوں نے اس کی بات سمجھی تو کہا: ”لَا أَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا يَا فَاسِقُ! يَا عَدُوَّ اللّٰهِ!“ اور اس کو خوب درشت اور سخت کہا، وہ پھر کہنے

لگا: ”وَاللّٰهِ لَقَدْ أَصَابَ قَوْمِيْ بَعْدِيْ شَرًّا“

نبی اکرم ﷺ نے اس کے فرار سے پہلے اسے اسلام کی طرف بلایا تھا اور کچھ قرآن بھی سنایا تھا، اس نے اسلام سے انکار کیا تھا اور سرکش ہوا تھا، تب آپ ﷺ نے اس پر بد دعا کی تھی کہ وہ بعید اور اسلام سے دور ہی رہ کر مرے۔ یہ دعا اس کو لگ گئی۔ اس طرح کہ جب لوگ احد سے فارغ ہوئے اور اس نے دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ کا بول بالا رہا اور آپ ﷺ غالب آئے تو وہ بادشاہِ روم ہرقل کے پاس گیا اور اس سے نبی اکرم ﷺ کے خلاف مدد چاہی، اس نے وعدہ کیا اور امید دلائی، یہ اس کے پاس ٹھہرا رہا اور اپنی قوم انصار میں سے منافقوں کی ایک جماعت کو لکھا کہ تم خاطر جمع رکھو، ایک لشکر عن قریب آئے گا اور وہ نبی اکرم ﷺ پر غالب آ کر ان کو ہلاک کر دے گا اور ان کو حکم دیا کہ اس کے لیے ایک مضبوط جگہ بنا رکھیں کہ جو کوئی اس کے پاس آئے وہ وہاں ٹھہرے، تاکہ پیغام رسانی کیا کرے اور اس کے لیے ایک مرصد (گھات) ہو جبکہ وہ خود وہاں پہنچے، اس جماعت نے مسجد قبا کے قریب ہی اس مسجد ضرار کا بنانا شروع کیا۔

خوب مضبوط مسجد بنائی اور نبی اکرم ﷺ کے تبوک کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہی تیاری کر لی اور آپ ﷺ سے آ کر کہا کہ آپ چل کر ہماری مسجد میں نماز پڑھیں، تاکہ اس میں جماعت مقرر ہو جائے اور یہ ظاہر کیا کہ ہم نے یہ مسجد موسم سرما میں ضعفا اور مریضوں کی سہولت کے لیے بنائی ہے، اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو وہاں نماز پڑھنے سے محفوظ رکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہم سفر میں جاتے ہیں، جب پھر کر آئیں گے، ان شاء اللہ، تب وہاں نماز پڑھیں گے۔ جب آپ ﷺ تبوک سے پھرے اور مدینہ ایک دن یا دن کے کچھ حصے کا رستہ رہ گیا تو جبریل علیہ السلام مسجدِ ضرار کی خبر لے کر آئے اور بانیانِ مسجد کے کفر اور نفاق کا حال بیان کیا اور بتایا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مسجد قبا سے، جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر ہوئی ہے، متفرق ہو جائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کچھ لوگ بھیجے کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے جا کر اس مسجد کو ڈھا دیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ کچھ انصاریوں نے مسجد بنائی تھی۔ ابو عامر نے کہا: تم سے جتنا بنے، اپنی قوت اور ہتھیار جمع کرو، میں روم کے بادشاہ قیصر کے پاس جاتا ہوں اور ایک لشکرِ روم لاتا ہوں۔ محمد ﷺ اور اصحابِ محمد ﷺ کو نکال دوں گا، وہ لوگ جب مسجد بنا چکے تو نبی اکرم ﷺ کے پاس آ کر کہا کہ ہم مسجد بنا چکے، آپ اس میں نماز پڑھ کر ہمارے لیے دعائے برکت کریں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی۔[1] یہی امام سعید بن جبیر، مجاہد، عروہ بن زبیر، قتادہ رحمہ اللہ اور بہت سے علما کا قول ہے۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے امام زہری، یزید بن رومان، عبداللہ بن ابی بکر اور عاصم بن عمر رحمہم اللہ وغیرہم سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تبوک سے آئے، ذی اوان میں اترے، یہ ایک شہر تھا جو مدینہ منورہ سے ایک دن کے

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٧٠) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٧٨)

کچھ حصے کی مسافت پر تھا۔ جب نبی اکرم ﷺ تبوک جانے کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت مسجد ضرار والوں نے آ کر آپ سے عرض کیا تھا کہ ہم نے بارش اور سردی کے موسم میں بیماروں اور حاجت مندوں کی سہولت کے لیے ایک مسجد بنائی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ وہاں آ کر ہمارے لیے نماز پڑھیں، فرمایا: میں اس وقت سفر کی تیاری میں مشغول ہوں یا جو بھی آپ نے فرمایا اور کہا: ان شاء اللہ ہم جب پھر کر آئیں گے تو تمھارے پاس آ کر تمھارے لیے نماز پڑھیں گے۔ جب آپ ذی اوان میں آ کر اترے، آپ کو مسجد کی خبر ملی۔

نبی اکرم ﷺ نے مالک بن دخشم اخو بنی سالم بن عوف اور معن بن عدی یا اس کے بھائی عامر بن عدی اخو بلعجلان کو فرمایا کہ تم دونوں جا کر اس مسجدِ اہلِ ظلم کو ڈھا کر جلا دو، وہ وہاں سے جلد روانہ ہو کر بنو سالم بن عوف میں آئے، یہ گروہ مالک بن دخشم کا تھا۔ مالک نے معن سے کہا: ذرا ٹھہرو، میں اپنے گھر سے آگ لے آؤں، گھر جا کر ایک پولا نخل کا لے کر اس میں آگ لگا کر دونوں دوڑ کر مسجد میں آئے، وہاں مسجد والے موجود تھے، مسجد میں آگ لگا دی اور مسجد کو ڈھا دیا۔ وہ لوگ متفرق ہوئے، ان کے حق میں قرآن اترا، آخر قصہ تک۔

جن لوگوں نے یہ مسجد بنائی وہ بارہ آدمی تھے، حذام بن خالد قبیلہ بنی عبید بن زید سے، یہ ایک شخص تھا بنی عمرو بن عوف کا اور اسی گھر کا آدمی تھا، اسی نے مسجد شقاق نکالی تھی اور ثعلبہ بن حاطب بنی عبید و موالی بنی امیہ میں سے یہ گروہ ابی لبابہ بن عبدالمنذر رتھا۔[1] اللہ نے فرمایا کہ یہ اس دعویٰ میں کہ ہم نے نہیں چاہی مگر بھلائی، دروغ گو اور جھوٹے ہیں، بلکہ انھوں نے یہ مسجد، مسجدِ قبا کی ضرر رسانی کے لیے تیار کی ہے۔[2] محارب اللہ اور رسول سے مراد ابو عامر فاسق ہے جس کو راہب کہتے تھے۔ لعنه الله.

مسجدِ قبا کی فضیلت اور اہلِ قبا کی طہارت:

پھر نبی اکرم ﷺ کو اس مسجد میں کھڑے ہونے سے منع کیا اور امت اس حکم میں نبی اکرم ﷺ کے تابع ہے۔ پھر مسجد قبا میں کھڑے ہونے کو ابھارا، کیونکہ اس کی بنیاد اللہ کی اطاعت پر ہوئی تھی۔ تقویٰ سے مراد کلمۂ مومنین اور اسلام کی جائے پناہ کا جمع ہونا ہے۔ اس آیت کا سیاق معرضِ مسجد قبا میں ہے، اسی لیے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مسجد قبا کی زیارت سوار اور پیادہ کیا کرتے تھے۔[3] یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے مسجد قبا کو اپنے مدینہ تشریف لانے کے شروع ہی میں بنیاد کیا اور بنایا، اور بنو عمرو بن عوف میں اترے تو جبریل علیہ السلام نے قبلے کی سمت کو متعین کر دیا تھا۔[4] والله أعلم.

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٦٨۔ ٤٦٩) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٠٧۔ ٥٠٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٩) [4] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ یہ آیت اہلِ قبا کے بارے میں اتری ہے: ﴿ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ﴾ (آیتِ باب) وہ پانی سے استنجا کرتے تھے۔[1] (رواه أبو داود والترمذي وقال: غريب من هذا الوجه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ یہ کیا طہور ہے، جس پر اللہ نے تمھاری تعریف کی؟ کہا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی مرد یا عورت غائط سے نہیں نکلتا، لیکن وہ اپنی شرم گاہ اور مقعد کو دھوتا ہے۔ فرمایا: « هُوَ هٰذَا »[2] (رواه الطبراني)

عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں آئے، فرمایا: اللہ نے تمھاری مسجد کے قصے میں طہور کرنے پر تمھاری تعریف کی ہے، سو وہ طہور کیا ہے جو تم کرتے ہو؟ کہا: اے اللہ کے رسول! واللہ! ہم کچھ نہیں جانتے، لیکن ہماری ہمسائیگی میں یہود رہتے تھے، وہ غائط سے آ کر (پاخانہ سے واپس آ کر) اپنی ادبار (پٹھوں) کو دھوتے تھے، ہم نے بھی ان کی طرح دھونا شروع کر دیا۔[3] (رواه أحمد و ابن خزيمة)

ابراہیم بن اسماعیل انصاری رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ سے کہا: « مَا هٰذَا الَّذِيْ أَثْنَى اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا؟ » کہا: اے اللہ کے رسول! "إِنَّا نَغْسِلُ الْأَدْبَارَ بِالْمَآءِ" سیدنا خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اتری اور وہ اپنی پیٹھیں قضائے حاجت کے بعد دھوتے تھے۔[4] محمد بن عبداللہ بن سلام کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں آئے، فرمایا: اللہ نے تم پر ثنا کی ہے، طہور کے بارے میں اچھی ثنا، تم مجھ کو خبر نہیں دیتے؟ کہا: اے اللہ کے رسول! ہم نے تورات میں اپنے اوپر یہ لکھا ہوا پایا ہے کہ پانی سے استنجا کرو۔[5] (رواه أحمد)

تقویٰ کی اساس پر قائم مسجد:

بہر حال سلف کی ایک جماعت نے صراحت کی ہے کہ اس آیت سے مراد مسجد قبا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عروہ بن زبیر، عطیہ عوفی، ابن زید، شعبی، حسن بصری، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں[6] اور صحیح حدیث

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٠٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٧٦٠)

[2] المعجم الكبير (١١/ ٦٧) مستدرك الحاكم (١/ ٢٩٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (٣/ ٤٢٢) صحيح ابن خزيمة (١/ ٤٥) اس کی سند میں ''شرحبیل بن سعد'' ضعیف راوی ہے، البتہ گزشتہ روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

[4] تفسير الطبري (١٤/ ٤٨٧)

[5] مسند أحمد (٦/ ٦) تفسير الطبري (١٤/ ٤٨٤۔ ٤٨٥) اس کے متن میں نکارت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا کلام ملاحظہ فرمائیں۔

[6] تفسير الطبري (١٤/ ٤٧٨۔ ٤٧٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٥١٠)

میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مسجد جو مدینے کے اندر ہے وہی مؤسس علی التقویٰ ہے[1] اور یہ صحیح ہے۔ آیت اور اس حدیث کے درمیان کوئی منافات (تضاد) نہیں ہے۔ اس لیے کہ اساس مسجد قبا کی پہلے دن سے تقویٰ پر ہوئی تو نبی اکرم ﷺ کی مسجد تو بطریق اولیٰ و اخریٰ (یعنی اس لائق ہے) کہ مؤسس علی التقویٰ ٹھہرے۔ اسی لیے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «اَلْمَسْجِدُ الَّذِيْ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مَسْجِدِيْ هٰذَا»[2] (تفرد به أحمد)

سیدنا سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مسجد موسس علی التقویٰ میں اختلاف کیا، ایک نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ کی مسجد ہے، دوسرے نے کہا کہ قبا کی مسجد ہے۔ دونوں نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا، فرمایا: وہ میری مسجد ہے، جو یہ ہے۔[3] (تفرد به أحمد أيضا) سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: «تَمَارٰى رَجُلَانِ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ فَقَالَ أَحَدُهُمَا هُوَ مَسْجِدُ قُبَا وَقَالَ الْآخَرُ هُوَ مَسْجِدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ مَسْجِدِيْ هٰذَا»[4] (تفرد به أحمد ورواه أحمد أيضا من طريق أخرى والترمذي والنسائي و فيه: «هُوَ مَسْجِدِيْ» ورواه مسلم)

تیسرے طریق میں ان دونوں اشخاص کے نام یوں آئے ہیں کہ ایک بنو خدرہ میں سے تھا اور دوسرا بنو عمرو بن عوف سے۔ خدری نے کہا وہ مسجدِ نبوی ہے، عمری نے کہا: وہ مسجدِ قبا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے جواب میں کہا: «هُوَ هٰذَا الْمَسْجِدُ» یہ اپنی مسجد کے بارے میں فرمایا۔[5] چوتھے طریق میں عبدالرحمان بن ابی سعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میرے باپ نبی اکرم ﷺ کے پاس گئے، آپ ﷺ گھر میں اپنی بعض بیویوں کے ساتھ تھے، انھوں نے کہا: مسجد مؤسس التقویٰ کہاں ہے؟ آپ ﷺ نے ایک مٹھی کنکری لے کر زمین پر ماری اور فرمایا: «هُوَ مَسْجِدُكُمْ هٰذَا»[6]

سلف یا خلف کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے کہ اس سے مراد مسجدِ نبوی ہے۔ عمر، ابن عمر، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور سعید بن میبّب رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[7] آیتِ شریفہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ پرانی قدیم مسجدوں میں جن کی بنیاد شروع ہی سے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت پر رکھی گئی ہے ان میں نماز پڑھنا مستحب ہے۔

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٨) ② مسند أحمد (٥/ ١١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٧٠١)

③ مسند أحمد (٥/ ٣٣١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والطبراني و رجالهما رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٣/ ٦٨١)

④ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٨) مسند أحمد (٣/ ٨٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٧)

⑤ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٣) مسند أحمد (٣/ ٢٣) اس کی سند صحیح ہے۔ ⑥ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٨)

⑦ تفسير الطبري (١٤/ ٤٧٦۔ ٤٧٩)

کامل طہارت کا اہتمام:

آیتِ شریفہ میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ جماعت صالحین اور عباد عاملین جو ہمیشہ اچھی طرح وضو کرتے ہیں اور نجاست کو اپنے سے دور کرتے ہیں، ان کے ساتھ نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ ایک صحابی نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو صبح کی نماز پڑھائی، اس میں سورت روم پڑھی، جب نماز پڑھ چکے تو فرمایا: مجھے قرآن میں اشتباہ لگتا ہے، تم میں سے کچھ لوگ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں، اچھی طرح وضو نہیں کرتے، سو جو کوئی ہمارے ساتھ نماز میں حاضر ہو وہ اچھی طرح وضو کرے۔[1] (رواه أحمد بطريق)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ طہارت کو مکمل کرنا عبادت میں کھڑے ہونے کو آسان بنا دیتا ہے اور عبادت کو مکمل کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ ابو العالیہ نے ﴿ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ میں کہا ہے کہ پانی سے طہارت کرنا اچھا ہے، لیکن وہ تو گناہوں سے پاک ہیں۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توبہ گناہوں سے ہوتی ہے اور تطہر شرک سے۔[2] حدیث سنن میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اہلِ قبا سے کہا تھا کہ اللہ نے طہور میں تم پر ثنا کی ہے، سو تم کیا کیا کرتے ہو؟ کہا: ہم پانی سے استنجا کرتے ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت قبا والوں کے بارے میں اتری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہم ڈھیلے کے بعد پانی سے پاک کرتے ہیں۔[4] (رواه البزار) یہ روایت فقہا میں مشہور ہے، لیکن بہت سے محدثین متاخرین، بلکہ سارے اہلِ حدیث اس کو نہیں پہچانتے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے مسجدِ ضرار کے ضمن میں چار باتیں بیان فرمائی ہیں: ایک دوسروں کو ضرر دینا۔ دوسرے اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور اہلِ اسلام پر فخر کرنا کہ ہم نے یہ مسجد اہلِ نفاق کی تقویت کے لیے بنائی ہے۔ تیسرے ایمان داروں کے درمیان جدائی ڈالنا کہ جب ہم مسجد قبا میں نہ جائیں گے تو وہاں کی جماعت کم ہو جائے گی اور کلمۂ مسلمین مختلف ہو کر باہمی الفت باطل ٹھہرے گی۔ چوتھے اس شخص کا انتظار جو اللہ اور رسول سے جنگ کرنا چاہتا ہے۔

محاربین سے مراد منافقین ہیں، یہ بارہ آدمی تھے، ایک ان میں ابو عامر راہب تھا، وہ ان سے پہلے ہی نبی اکرم ﷺ کا مخالف ہو چکا تھا۔ ظاہری طور پر قسم کھائی کہ ہم نے یہ مسجد اس لیے بنائی ہے کہ پانی اور گرمی میں ضعیف اور عاجز لوگ اس جگہ نماز پڑھیں، اگر مسجدِ قبا یا مسجدِ نبوی میں بارش اور گرمی کی وجہ سے نہ جا سکیں۔ اللہ نے فرمایا: یہ اس قسم

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٧١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٥٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٨٣)

[3] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[4] كشف الأستار عن زوائد البزار (١/ ١٣٠۔ ١٣١) اس کی سند میں ''محمد بن عبدالعزیز زہری'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (١/ ٨٣)

کھانے میں جھوٹے ہیں۔ یہ ابو عامر حنظلہ غسیلِ ملائکہ کا باپ تھا مگر اللہ نے منع کر دیا کہ آپ ہرگز کسی وقت میں بھی وہاں جا کر نماز پڑھنے کے لیے کھڑے نہ ہونا۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس مسجد کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جلا کر ڈھا دیا تو وہ جگہ ایک کوڑا کرکٹ پھینکنے والی جگہ ہوگئی، جہاں نجاست کے لتے وغیرہ ڈالے جاتے تھے، پھر حکم دیا کہ مسجد موسس علی التقویٰ میں قیام کرو۔

کسی نے کہا اس مسجد سے مراد مسجدِ قبا ہے اور کسی نے کہا ہے کہ مسجدِ نبوی شریف۔ سمہودی رحمہ اللہ نے احادیث کے درمیان جمع و تطبیق دی ہے اور کہا ہے کہ دونوں مسجدیں مراد ہیں، کیونکہ دونوں کی بنیاد تقویٰ پر ہوئی ہے۔ سائل کو وہم تھا کہ آیت خاص طور پر مسجدِ قبا کے متعلق ہے، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں اپنی مسجد کا ذکر کیا۔[1] امام سہیلی رحمہ اللہ نے کتاب الروض الانف میں سمہودی سے پہلے یہی بات کہی ہے،[2] لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزءًا یہ فرمایا کہ مسجد موصوف یہی میری مسجد ہے اور اس امر کو معین کر دیا۔ اب کسی فرد، صحابی یا جماعتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قول احادیثِ صحیحہ کے برابر نہیں ہو سکتا اور نہ اس قابل کہ صحیح حدیث کے مقابل لایا جائے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ روایت نزولِ آیت کی مسجد قبا میں اس نصِ صریح کے خلاف نہیں ہو سکتی، جس کے تحت وہ مسجد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد، یعنی مسجدِ نبوی ہے۔ اس لیے کہ وہ آیت کچھ اہلِ قبا کی خصوصیت پر دلیل نہیں ہے۔ مسجدِ قبا کے جو فضائل آئے ہیں وہ اس بات کو لازمی نہیں کرتے کہ مسجد موسس علی التقویٰ سے مراد یہی مسجدِ قبا ہو۔ حالانکہ جو فضائل مسجد نبوی کے آئے ہیں وہ بلاشک وشبہہ مسجدِ قبا کے فضائل سے بڑھ کر ہیں۔

اول یوم سے مراد سالِ ہجرت ہے۔ وہ پہلا دن ایامِ تاریخِ اسلام کا سمجھا گیا۔ تطہر سے مراد پاک رہنا ہے احداث و جنابات اور تمام نجاستوں سے۔ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طہارت سے مراد گناہوں سے توبہ و استغفار کے ساتھ پاک ہونا ہے۔ پہلا مطلب زیادہ بہتر ہے، لیکن رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد گناہوں اور معاصی سے پاک ہونا ہے اور تین وجہ سے اس کو متعین کیا ہے،[3] ممکن ہے کہ مراد ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی طہارت ہو۔ پھر اللہ نے خبر دی کہ ہم مُطَّہِّرین کو دوست رکھتے ہیں۔[4]

امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم و کیمیائے سعادت میں ظاہری طہارت کا ذکر کر کے باطنی طہارت کی ترغیب دی ہے اور کہا ہے کہ عبادت کی درستی اسی باطنی طہارت پر موقوف ہے[5] اور سچ کہا ہے اس لیے کہ اگر ظاہر آراستہ پیراستہ ہوا اور باطن ناپاک ہے تو وہ عبادت قبولیت کے لائق نہیں ہوتی۔ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ احادیث ظاہری

---

[1] وفاء الوفاء للسمهودي (١/ ٤٦٩)
[2] الروض الأنف للسهيلي (٢/ ٣٣١)
[3] تفسير الرازي (١٦/ ١٥٥۔ ١٥٦)
[4] فتح البيان (٥/ ٣٩٤۔ ٣٩٩)
[5] إحياء علوم الدين (١/ ٤٨۔ ٤٩)

طہارت کے بارے میں ہیں۔ دراصل ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے، جب باطن پاک ہو گا، تب ہی مسلمان ظاہری طہارت بھی شرعی حکم کے مطابق کرے گا۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

کیا بھلا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور (اس کی) رضا پر رکھی، (وہ) بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد (دریا کے) ایک کھوکھلے گرنے والے کنارے پر رکھی؟ پھر وہ اسے جہنم کی آگ میں لے گرا؟ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (109) انھوں نے جو عمارت بنائی تھی، وہ ہمیشہ ان کے دلوں میں شک ڈالے رکھے گی، الا یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (110)

تقوے کی بنیاد اور نفاق کی بنیاد پر قائم مساجد میں فرق:

یعنی بے انصافی کی شامت سے عمل نیک بھی چاہیں تو بن نہیں آتا۔ اس عملِ بد کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ ان کے دل میں نفاق رہے گا، نفاق کو فرمایا شبہہ۔ اللہ نے فرمایا کہ یہ دونوں عمارتیں برابر نہیں ہیں، کہاں وہ عمارت جو اللہ کے ڈر سے بنائی گئی اور کہاں وہ جو ان چار امور کے لیے تیار کی گئی، جن کا ذکر ہوا۔ ایک کی بنیاد تقوے پر ہے، دوسری کی بنیاد ایسی کھائی کے کنارے پر جو جہنم میں گرے۔ بھلا کہیں مفسدوں کے عمل بھی درست ہوتے ہیں۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں نے مسجدِ ضرار کو دیکھا، اس سے نبی اکرم ﷺ کے عہد میں دھواں نکلتا تھا۔[1] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے لیے ذکر کیا گیا کہ کچھ لوگوں نے اس کو کھودا، وہاں سے دھواں نکلا، امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ خلف بن یاسین کوفی کہتے ہیں کہ میں نے مسجدِ منافقین کو دیکھا جس کا اللہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے، اس میں ایک پتھر تھا، جس سے دھواں نکلتا تھا، آج وہ جگہ ایک مزبلہ ہے۔[2] اللہ نے کہا کہ ان کے اس شنیع (برے) فعل کی وجہ سے یہ بنیاد ان کے دل میں شک اور نفاق کی علامت ہے، جس طرح بچھڑے والوں کے دلوں میں بچھڑے کی محبت سمو دی گئی تھی۔ اسی طرح یہ نفاق ان کے دل میں جم گیا ہے، مگر یہ کہ ان کے دل مر کر

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٩٣) مستدرك الحاكم (٤/ ٦٣٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٤٩٢۔ ٤٩٤)

ٹکڑے ہو جائیں۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ، زید بن اسلم، سدی، حبیب بن ابی ثابت، ضحاک، ابن زید رحمہم اللہ اور بہت سے علمائے سلف کا قول ہے۔[1]

فتح البیان میں ہے کہ آیتِ باب کے معنی یہ ہیں کہ جس کی بنیاد دین کے قاعدۂ قوی اور محکم، یعنی اللہ کے تقویٰ اور رضوان پر ہوئی ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کی بنیاد دینِ باطل اور نفاق پر رکھی گئی ہے۔ اللہ نے باطل کی مثال اس کھائی سے دی جو ڈھے جانے والی ہے اور جلد مضمحل ہو جاتی ہے۔ جہنم میں گرنے کا مطلب یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نفاق نے ان کو جہنم میں پہنچا دیا۔ کہتے ہیں جب اس کی بنیاد کھودی تو دھواں دیکھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی بنا تمام نہیں ہوئی تھی کہ جہنم میں جا گرے۔[2]

اس آیت کی فصاحت، بلاغت، قوت، ترکیب، وقعت، معنی نہایت درجے کو پہنچے ہیں، اللہ ظالموں کو خیر کی توفیق نہیں دیتا ہے۔ بلکہ یہ بنیاد ان کے مزید شک اور نفاق کا سبب ہے۔ یا ریب سے مراد حسرت اور ندامت ہے کہ وہ اس عمارت کے بنانے پر پشیمان ہوئے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے دل میں حسرت اور غصہ ہے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گروا دیا تو ان کا نفاق اور بھی زیادہ ہو گیا، یہ ریب تب جائے گا جب ان کے دل ٹکڑے ہو جائیں، مر کر یا تلوار سے یا قبور میں یا نار میں۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک زندہ ہیں، یہ ریب ہمیشہ ان کے جی میں برقرار رہے گا یا یہ کہ وہ توبہ کریں اور دل ندامت سے پارہ پارہ ہو جائے، تب کہیں وہ ریب ان کے دل سے دور ہو۔[3]

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ اللہ کے ذمے سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ لہٰذا تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اس (اللہ) سے کیا، اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے (111)

جنت کے عوض جانوں اور مالوں کا سودا:

اللہ نے کہا ہے کہ ہم ایمان داروں کو ان کے مال اور جان کے عوض جنت دیں گے، یہ اس کا فضل و کرم اور

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٩٥۔ ٤٩٧) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٨٥) [2] تفسير البغوي (٤/ ٩٧) [3] فتح البيان (٥/ ٤٠٠۔ ٤٠٢)

احسان ہے کہ اس نے عوض سے پہلے ہی اپنے بندوں کو جو فرماں بردار ہیں، اس سے مطلع فرما دیا۔ اسی لیے امام قتادہ اور امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: "بَايَعَهُمُ اللّٰهُ فَأَغْلٰى ثَمَنَهُمْ" شمر بن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان نہیں ہے، لیکن اللہ کی بیعت اس کی گردن میں ہے، وہ اس کو پورا کرے یا مرجائے اس پر۔ پھر یہ آیت پڑھی۔[1] اور اسی لیے کہا ہے کہ "مَنْ حَمَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بَايَعَ اللّٰهَ" یعنی اس عقد سے پہلے اور اس کو پورا کیا۔

سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شبِ عقبہ میں کہا تھا کہ آپ شرط کرلیں اپنے رب کے لیے اور اپنے لیے جو چاہو، فرمایا: میں شرط کرتا ہوں اپنے رب کے واسطے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اپنے لیے شرط کرتا ہوں کہ مجھ کو اس چیز سے بچاؤ جس سے اپنی جان کو اور مال کو بچاتے ہو، کہا جب ہم ایسا کریں تو ہم کو کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت، کہا: "رَبِحَ الْبَيْعُ لَا نُقِيْلُ وَلَا نَسْتَقِيْلُ" اس پر یہ آیت اتری۔[2]

اس میں فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں مارنا اور مرنا برابر ہے، بہر حال جنت ان کے لیے واجب ہے۔ اسی لیے صحیحین میں آیا ہے کہ اللہ اس شخص کے لیے متکفل (ضامن) ہے جو اس کی راہ میں نکلا، نہیں نکالا اس کو مگر میری راہ میں جہاد نے اور میرے رسولوں کی تصدیق نے، اگر میں اس کو وفات دوں تو جنت میں داخل کروں اور اس کے گھر پھیر لاؤں جس سے وہ نکلا تھا تو وہ اجر اور غنیمت لے کر آئے۔[3]

پھر اس وعدے کی تاکید تورات، انجیل اور قرآن سے فرمائی کہ اللہ نے یہ وعدہ اپنے نفسِ کریم پر لکھ رکھا ہے اور اپنی بڑی بڑی کتابوں میں اتارا ہے، جیسے: تورات جو موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی اور انجیل جو عیسیٰ علیہ السلام پر آئی تھی اور قرآن جو خاتم الرسل، سید الانبیا جنابِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ سو جو کوئی اللہ کا عہد پورا کرتا ہے، اللہ سے خلافِ وعدہ نہیں کرتا، جیسے اس کا قول ہے: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴾ [النساء: ٨٧] ''اور بات کہنے میں اللہ سے زیادہ کون سچا ہے؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴾ [النساء: ١٢٢] ''اور اللہ سے بڑھ کر کون قول و قرار میں سچا ہے؟'' اسی لیے فرمایا کہ تم اس بیع میں خوش ہو جاؤ کہ یہ عظیم کامیابی اور نعیمِ مقیم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بندوں کے درمیان اصل فروخت یہ ہے کہ اپنی ملکیت میں سے کوئی چیز کسی ایسی شے کے عوض نکالیں جو اس کے برابر یا کم یا زیادہ بہتر ہو۔ سو ان مجاہدوں نے اپنی جان اس کے ہاتھ فروخت کر دی بہشت کے عوض۔ یہ جان مال تھا اور اس کا بیچ دینا انتہا درجے کی سخاوت ہے، اللہ نے بھی اس شے کے عوض ان کو جنت دی

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٤٩٩)

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٤٩٩) یہ روایت مرسل ہے، البتہ نزولِ آیت کے ذکر کے بغیر اس کے شواہد موجود ہیں۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٧٦)

جو بندوں کی مطلوبہ اشیا میں سب سے عظیم ہے، جس کے لیے اعمالِ صالحہ سے توسل کرتے ہیں۔

اموال سے مراد وہ مال ہے جو اہلِ جہاد اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور نیکی اور اطاعت کے ہر کام میں خرچ کرتے ہیں، اس میں جہاد بھی بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہماری جانیں اس کی مخلوق ہیں، ہمارے اموال ہمارا رزق ہیں۔[1] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، لوگوں نے اللہ اکبر کہا۔ ایک انصاری مرد اپنی چادر کندھے پر ڈالے ہوئے آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ آیت اتری ہے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: یہ سودا نفع کا ہے، ہم نہ اس بیع کا اقالہ (بیع فسخ کرنا) کریں اور نہ اقالہ چاہیں۔[2]

پھر اللہ نے ان کی یہ صفت بیان کی کہ یہ اللہ کی راہ میں اللہ کے دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں، اسی لیے جنت کے مستحق ٹھہرے ہیں، گو ان پر قتل واقع نہ ہو، لیکن جب ان کا امتحانِ جہاد ہو گیا اور انھوں نے جان دینے پر پیش قدمی کی اور موت کے سامنے ہوئے تو اب ان کو جنت کا ملنا ضرور ہے، خواہ مریں یا زندہ بچ کر آ جائیں۔ ان دونوں باتوں کا ہونا، یعنی (قتل کرنا اور قتل ہونا) جنت کے حصول کے لیے شرط نہیں ہے، بلکہ فضلِ عظیم اور فوزِ جسیم واجب ہو گئی، جبکہ ایک وصف بھی پایا گیا۔ صرف ان کے ارادے اور تکثیرِ سواد نے یہ نفع بخشا۔ وللہ الحمد.

اللہ کا یہ وعدہ کتبِ آسمانی میں ہو چکا ہے کہ عہد کو پورا کرنے والا جنت پائے گا۔ اللہ وعدے کا سچا اور پکا ہے، وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور جبکہ وعدہ خلافی عمدہ اخلاق رکھنے والی مخلوق سے امکان کے باوجود صادر نہیں ہوتی تو پھر اس ذات پاک سے جو تمام مخلوق کا پیدا کرنے والا اور تمام جہان والوں سے غنی ہے، اس سے کس طرح ہو سکتی ہے۔ جَلَّ جَلَالُهُ وَعَمَّ نَوَالُهُ.

سو اس لین دین پر خوش ہونا چاہیے کہ بڑے نفع کی تجارت ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا مراد ملے گی۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: "إِنَّ اللّٰهَ بَايَعَكَ وَجَعَلَ الصَّفْقَتَيْنِ لَكَ" امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: "اِسْمَعُوْا إِلٰى بَيْعَةٍ رَبِيْحَةٍ بَايَعَ اللّٰهُ بِهَا كُلَّ مُؤْمِنٍ" اللہ نے تجھ کو دنیا دی ہے تو بعض حصے دنیا سے جنت خرید لے۔[3] امام جعفر صادق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں قیمت تمھارے بدنوں کی مگر جنت، سو تم ان کو فروخت نہ کرو مگر جنت کے عوض۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان سے مول چکایا، سو بھاری قیمت دی۔[5]

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

وہ (مومن) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے

---

[1] تفسير الخازن (۳/ ۱۵۱)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۶/ ۱۸۸۶) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير البغوي (۴/ ۹۸) [4] تفسير الرازي (۱۶/ ۱۵۸) [5] تفسير الطبري (۱۴/ ۴۹۹) فتح البيان (۵/ ۴۰۳۔ ۴۰۶)

والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور (اے نبی!) مومنوں کو خوش خبری سنا دیجیے ﴿112﴾

جنت کا سودا کرنے والے مومنوں کے اوصاف:

بے تعلق رہنا روزہ ہے یا ہجرت ہے، یا دل نہ لگانا دنیا کے مزوں میں، حدوں کا خیال کرنا یہ کہ بغیر حکم شرع کے کوئی کام نہ کریں۔ یہ صفات ہیں ان مومنین کی جنھوں نے اپنی جان و مال اللہ کے ہاتھ ان صفاتِ جمیلہ و خلالِ جلیلہ کے عوض فروخت کر دیے ہیں۔ وہ سارے گناہوں سے تائب ہیں اور تمام فواحش کے تارک ہیں، اپنے رب کی عبادت پر قائم ہیں اور اپنے اقوال اور افعال پر اس کی محافظت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ اور خاص قول حمدِ باری تعالیٰ ہے اور افضل اعمال صوم ہے جو طعام و شراب و جماع کی لذتوں کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ سیاحت سے اس جگہ یہی مراد ہے جس طرح نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے بارے میں لفظ سائحات فرمایا ہے، یعنی صائمات (روزہ رکھنے والیاں)۔

اسی طرح رکوع و سجود سے مراد نماز ہے اور وہ ان تمام صفتوں کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانے والے، یعنی اطاعتِ الٰہی کی طرف ہدایت کرنے والے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کیا کام کرنا چاہیے اور کون سا نہ کرنا چاہیے۔ حلال اور حرام میں اللہ کی حدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ علماً و عملاً عبادتِ حق اور مخلوق کی خیر خواہی پر قائم ہیں، اسی لیے اہلِ ایمان کو بشارت دی ہے، اس لیے کہ ایمان ان تمام امور پر مشتمل ہوتا ہے اور ساری سعادت یہ صفات پیدا کرنے میں ہے۔

سیاحت سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سیاحت صیام کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں سیاحت کا ذکر آیا ہے اس سے مراد روزہ رکھنا ہے۔[1] یہی امام ضحاک رحمہ اللہ کا بھی قول ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ سیاحت اس امت کا صوم ہے۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر، عطا، عبدالرحمان سلمی، ضحاک بن مزاحم اور سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سائحون، صائمون ہیں جو رمضان شریف کا روزہ رکھتے ہیں۔ ابوعمرو عبدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ روزہ رکھتے ہیں۔[2] ایک مرفوع حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «اَلسَّائِحُوْنَ هُمُ الصَّائِمُوْنَ»[3] (رواہ ابن جریر) لیکن

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٥٠٣۔ ٥٠٤) ان دونوں کی اسناد حسن ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٥٠٣۔ ٥٠٦) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٨٩۔ ١٨٩٠)

[3] تفسير الطبري (١٤/ ٥٠٣) اس کی سند میں "حکیم بن خذام" متروک راوی ہے۔

روایت کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔ عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: سائحون کون ہیں؟ فرمایا: صائمون ہیں۔[1] (رواه ابن جرجر وهذا مرسل عبيد وهذا أصح الأقوال و أشهرها)

اور یہ بھی آیا ہے کہ سیاحت سے مراد جہاد ہے۔ حدیث، جس کے راوی ابو امامہ رضی اللہ عنہ ہیں، میں آیا ہے کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ کو سیاحت کی اجازت دیں، فرمایا: میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔[2] (رواه أبو داود) عمارہ بن غزیہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سیاحت کا ذکر ہوا، فرمایا: «أَبْدَلَنَا اللّٰهُ بِذٰلِكَ الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالتَّكْبِيرَ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ»[3] (رواه أبو داود) امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سائحون سے مراد طلبۂ علم ہیں، امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ مہاجرین ہیں۔[4]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیاحت سے یہ مراد نہیں ہے کہ زمین پر پھر کر اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اور غاروں اور جنگلوں میں پھر کر اور سیر کر کے عبادت کرے کہ یہ فتنوں اور دین کے متزلزل ہونے کے دنوں میں ہی جائز ہوگا۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الرَّجُلِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ»[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حدود کی حفاظت کرنے سے مراد اللہ کی اطاعت پر قائم رہنا ہے۔ یہی حسن رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حدود سے مراد فرائض ہیں یا قیام علی امر اللہ۔[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَلتَّآئِبُوْنَ ﴾ مرفوع بابتدا ہے اور خبر اس کی مضمر ہے، یعنی ان سب کے لیے جنت ہے، گو وہ جہادی نہ ہوں[7] اور یہ قول سب اقوال سے اچھا ہے، کیونکہ اگر یہ اوصاف مجاہدین کے ساتھ خاص ہوں، جس طرح کہ مفسرین کے ایک گروہ نے کہا ہے تو یہ وعدہ خاص ٹھہرے گا۔ پھر مراد توبہ سے یہ ہے کہ شرک سے توبہ کرے اور نفاق سے بیزار ہو جائے یا ہر معصیت سے یا تمام معصیتوں سے توبہ کرے، اس لیے کہ لفظ عام ہے اور اس کا اطلاق سب پر ہے۔ یہ سب نو اوصاف ہیں ان میں چھے وصف وہ ہیں جن کا تعلق خالق سے ہے اور ساتویں اور آٹھویں صفت کا تعلق مخلوق کے معاملے سے ہے اور نویں صفت عام ہے دونوں کے لیے۔

(قاله الحفناوي)

---

(1) تفسير الطبري (١٤/ ٥٠٢) یہ روایت مرسل ہے۔

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٨٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٩٣)

(3) الجهاد لابن المبارك (١/ ٣٦) یہ روایت مرسل ہے۔ (4) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٩٠)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩) (6) تفسير الطبري (١٤/ ٥٠٨) تفسير ابن كثير (٢/ ٥١٤)

(7) معاني القرآن (٢/ ٤٧١۔ ٤٧٢)

ان صفات کا اس ترتیب سے ذکر بہت اچھے نظم پر واقع ہوا ہے، تھوڑا سا غور کرنے سے اس کی خوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ پہلے توبہ کا نام لیا، پھر عبادت کا آخر تک۔ عبادت سے مراد اخلاص کے ساتھ اللہ کی پرستش ہے۔ حمد سے مراد شکر کا ادا کرنا ہے، ہر حال میں یعنی خوشی میں اور تکلیف میں دین اور دنیا کی ہر قسم کی نعمت پر۔ سیاحت اصل لغت میں کہتے ہیں زمین میں چلنے پھرنے کو۔ آدمی جب سیاح ہے تو مخلوق سے منقطع رہتا ہے، اللہ کی مخلوقات میں غور وفکر کرتا ہے، اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ سیاحت کا کسی کو مہذب بنانے میں اور اس کے اخلاق کو اچھا کرنے میں بڑا دخل ہے۔ قاموس میں کہا ہے: ''اَلسِّيَاحَةُ ذَهَابٌ فِي الْأَرْضِ لِلْعِبَادَةِ وَمِنْهُ الْمَسِيْحُ بْنُ مَرْيَمَ''[1]

جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ سائح سے مراد صائم ہے، صائم کو سائح اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سیاحِ ارض کی طرح لذات کا تارک ہوگیا ہے، گویا اس کو وطن میں ہی سفر درپیش ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سائح وہ ہے جو علمِ حدیث کو طلب کرنے کے لیے سفر کرتا ہے۔ یا وہ لوگ ہیں جو اپنے افکار سے توحیدِ رب اور اس کی بادشاہت میں حائر (حیران) ہوتے ہیں۔ یا صرف طالب علم ہیں کہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے رہتے ہیں اور زمین میں سیر وسفر کر کے علم کو مظانِ علم سے حاصل کرتے ہیں، ان میں حدیث اور قرآن کا علم تلاش کرنے والے بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں۔ غرض کہ یہ لفظ وسیع ہے، کوئی امر اس بات کا مانع نہیں کہ یہ تمام معانی اس سے مراد لیے جائیں۔ رکوع اور سجدہ سے مراد نماز ہے، نماز کے لیے بڑے ارکان کا ذکر کیا، اس لیے کہ نماز پڑھنے والا ان سے ممتاز ہوتا ہے بخلاف قیام اور قعود کے کہ وہ حالت نمازی اور غیر نمازی کی ہوتی ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو امر بالمعروف اس وقت کیا کہ پہلے خود بجا لائے اور منکر سے اس وقت منع کیا کہ پہلے خود اس سے باز رہے۔[2] حدود سے مراد وہ شریعتیں اور احکام ہیں جو اللہ کی کتاب اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں آئے ہیں۔ یا مطلق فرائض اور شریعت کے احکام اور اللہ اور رسول کی اطاعت ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ''مَنْ مَّاتَ عَلٰى هٰذِهِ التِّسْعِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَمَنْ مَّاتَ وَفِيْهِ تِسْعٌ فَهُوَ شَهِيْدٌ''[3]

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾

نبی اور ایمان والوں کے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار

---

(1) القاموس المحيط (١/ ٢٨٨) (2) تفسير الطبري (١٤/ ٥٠٦۔ ٥٠٧) (3) الدر المنثور (٤/ ٢٩٦۔ ٢٩٩) فتح البيان (٥/ ٤٠٧۔ ٤٠٩)

ہی ہوں، ان کے متعلق یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ وہ بلاشبہ دوزخی ہیں (113) اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا، جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہوگیا کہ یقیناً وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے زار ہوگئے۔ بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے (114)

مشرکوں کے لیے دعا کی ممانعت اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا عذر:

قرآن میں جو ذکر ہوا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ کی بخشش مانگی، شاید نبی اکرم ﷺ کے دل میں بھی آیا ہو اور مسلمانوں نے بھی چاہا کہ اپنے قرابت والوں کے حق میں دعا کریں۔ یہ ممانعت آئی تو معلوم ہوا کہ مشرک بخشا نہیں جاتا۔ ابن میسّب نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ جب ابو طالب مرنے لگے تو نبی اکرم ﷺ اس کے پاس آئے، وہاں ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ موجود تھے، فرمایا: اے چچا! لا إله إلا الله کہہ، یہ وہ کلمہ ہے جس سے میں تیرے لیے اللہ عزوجل کے نزدیک حجت کروں گا، ان دونوں نے کہا: اے ابو طالب! کیا تُو ملتِ عبدالمطلب سے منہ موڑتا ہے؟ کہا: میں ملتِ عبدالمطلب پر ہوں، نبی اکرم ﷺ نے کہا: میں تیرے لیے استغفار کروں گا، جب تک کہ روکا نہ جاؤں۔ تب یہ آیت اور دوسری آیت: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦] ”(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔“ اتری۔[1] (أخرجاه) سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے ایک شخص کو سنا وہ اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کرتا ہے، حالانکہ وہ دونوں مشرک تھے، میں نے کہا: کیا کوئی آدمی مشرک ماں باپ کے لیے استغفار کرتا ہے؟ اس نے کہا: کیا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار نہیں کی تھی، میں نے اس کا ذکر نبی اکرم ﷺ سے کیا، اس پر یہ آیت آئی۔[2]

رسول اللہ ﷺ کو اپنی والدہ کے لیے دعا سے روک دیا جانا:

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے، آپ ﷺ ایک جگہ اترے، ہم تقریباً ایک ہزار سوار تھے، دو رکعت نماز پڑھی، پھر ہماری طرف منہ کیا اور دونوں آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کی کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! آپ کو کیا ہوا ہے؟ فرمایا: « إِنِّي سَأَلْتُ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ فِي الْاِسْتِغْفَارِ لِأُمِّي فَلَمْ يَأْذَنْ لِي فَدَمَعَتْ عَيْنَايَ رَحْمَةً لَّهَا مِنَ النَّارِ... الحديث »[3] (رواه أحمد)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٠١) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٣٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٦٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (٥/ ٣٥٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ١/ ٣١٤)

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ « إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا قَدِمَ مَكَّةَ أَتَى رَسْمَ قَبْرٍ، فَجَلَسَ إِلَيْهِ، فَجَعَلَ يُخَاطِبُ، ثُمَّ قَامَ مُسْتَعْبِراً، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّا رَأَيْنَا مَا صَنَعْتَ قَالَ: إِنِّي اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّي فَأَذِنَ لِي وَاسْتَأْذَنْتُهُ فِي الْإِسْتِغْفَارِ لَهَا فَلَمْ يَأْذَنْ لِّي فَمَا رُئِيَ بَاكِياً أَكْثَرَ مِنْ يَوْمِئِذٍ »[1] (رواہ ابن جریر)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: « خَرَجَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَوْماً إِلَى الْمَقَابِرِ، فَاتَّبَعْنَاهُ، فَجَاءَ حَتّٰى جَلَسَ إِلٰى قَبْرٍ مِّنْهَا، فَنَاجَاهُ طَوِيلًا، ثُمَّ بَكٰى فَبَكَيْنَا، ثُمَّ قَامَ فَقَامَ إِلَيْهِ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَدَعَاهُ، ثُمَّ دَعَانَا، فَقَالَ: مَا أَبْكَاكُمْ؟ فَقُلْنَا: بَكَيْنَا لِبُكَاءِكَ، قَالَ: إِنَّ الْقَبْرَ الَّذِي جَلَسْتُ عِنْدَهُ قَبْرُ آمِنَةَ، وَإِنِّي اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي زِيَارَتِهَا فَأَذِنَ لِي » (رواہ ابن أبي حاتم) پھر اس کو دوسری وجہ سے بھی روایت کر کے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے قریب روایت کیا ہے اور کہا: « وَإِنِّي اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي الدُّعَاءِ لَهَا فَلَمْ يَأْذَنْ لِّي وَأَنْزَلَ عَلَيَّ ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا... الخ﴾ فَأَخَذَنِي مَا يَأْخُذُ الْوَلَدُ لِلْوَالِدِ وَكُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ »[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ تبوک سے واپس لوٹے، عمرہ کیا، جب ثنیۂ عسفان سے نیچے اترے، اصحاب کو حکم دیا کہ جب تک میں آؤں، تم عقبہ میں ٹھہرو، پھر جا کر اپنی ماں کی قبر پر اترے اور دیر تک اپنے رب سے مناجات کی، پھر خوب روئے اور لوگ بھی آپ ﷺ کے رونے سے روئے اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ کا اس جگہ پر رونا اس لیے ہوگا کہ امت کے لیے کوئی ایسا حکم آیا ہے جس کی ان کو طاقت نہیں ہے۔ جب یہ لوگ روئے تو نبی اکرم ﷺ اٹھ کر ان کے پاس آئے، فرمایا: تم کیوں روتے ہو؟ کہا: ہم آپ ﷺ کے رونے سے روئے اور ہم نے کہا: شاید کوئی ایسی شے آپ کی امت کے لیے آئی ہے جس کی امت کو طاقت نہیں ہے، فرمایا: یہ بات نہیں ہے، لیکن بات کچھ یوں ہے کہ میں اپنی ماں کی قبر پر اترا، اللہ سے سوال کیا کہ مجھ کو قیامت کے دن ان کی شفاعت کی اجازت دے، اللہ نے مجھ کو اذن دینا نہ مانا، مجھ کو اس پر رحم آیا، یہ میری ماں ہے، میں رویا، پھر جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ ... الخ﴾ (آیتِ باب) سو تو بھی اپنی ماں سے بیزار ہو جس طرح ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے بیزار ہو گئے تھے۔ سو مجھ کو اس پر رحم آیا، یہ میری ماں ہے... الحدیث۔[3] (رواہ الطبراني بطوله وهذا حديث غريب وسياقه عجيب وإنما عدل إلى قبر أمه لأنها كانت مدفونة تحت كذا)

---

[1] تفسیر الطبري (۱۴/ ۵۱۲) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۶/ ۱۸۹۳۔ ۱۸۹۴) اس کی سند میں "ایوب بن ہانی" متکلم فیہ راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔

[3] المعجم الکبیر (۱۱/ ۳۷۴) اس کی سند میں ایک سے زیادہ مجہول راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: مجمع الزوائد: (۱/ ۳۱۴)

آنحضرت ﷺ کے والدین کے ایمان کے متعلق روایات اور ان کا حکم:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ حدیث اس سے بھی زیادہ غریب اور منکر ہے، جس کو خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے کتاب السابق اللاحق میں مجہول سند کے ساتھ بروایتِ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ایک قصہ روایت کیا ہے کہ "إِنَّ اللّٰهَ أَحْيَا أُمَّهُ فَآمَنَتْ ثُمَّ عَادَتْ" اسی طرح امام سہیلی رحمہ اللہ کی ایک روایت ہے جو روض میں ہے اور جس کی سند میں ایک مجہول جماعت ہے۔ "إِنَّ اللّٰهَ أَحْيٰ لَهُ أَبَاهُ وَأُمَّهُ فَآمَنَا بِهِ"[1] حافظ ابن دحیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث من گھڑت ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن دحیہ پر رد کیا ہے، اس استدلال کے ساتھ جس کا حاصل یہ ہے کہ "إِنَّ هٰذِهِ حَيَاةٌ جَدِيْدَةٌ كَمَا رَجَعَتِ الشَّمْسُ بَعْدَ غَيْبُوْبَتِهَا وَصَلّٰى عَلِيٌّ الْعَصْرَ" امام طحاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیثِ شمس ثابت ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: "لَيْسَ إِحْيَاهُمَا يَمْتَنِعُ عَقْلًا وَلَا شَرْعًا" پھر کہا: میں نے سنا ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کو زندہ کر دیا، وہ آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "وَهٰذَا كُلُّهُ مُتَوَقِّفٌ عَلٰى صِحَّةِ الْحَدِيْثِ، فَإِذَا صَحَّ فَلَا مَانِعَ مِنْهُ" واللہ أعلم.[2]

میں کہتا ہوں کہ احادیثِ ایمانِ ابوین (آپ ﷺ کے ماں باپ کے ایمان لانے کے بارے میں احادیث) سب ضعاف اور مختلقات ہیں اور صحاح وغیرہ میں تو ان کے ایمان نہ لانے کے بارے میں احادیث موجود ہیں۔ متاخرین نے ان ضعیف حدیثوں میں سخت غور وخوض کیا اور ایمان کے قائل ہوئے۔ دل اس طریقے کے بارے میں سخت قلق میں ہے کہ سلف نے اس پر کچھ غور نہیں کیا۔ وہ عافیت میں رہے، ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم بھی خاموش رہیں اور اس مسئلے کو اللہ کے علم پر چھوڑ دیں۔ اہلِ دین کے نزدیک اس قسم کی باتوں پر غور کرنا فضول ہوتا ہے، لیکن نبی اکرم ﷺ کے اپنی ماں کی قبر پر جانے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اپنے غیر مومن قریبی رشتے داروں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، کی قبروں کی زیارت کرنے کی اجازت ہے۔ یہ اجازت ان کی قبروں، بلکہ جملہ مومنین اور مومنات کی قبروں کی زیارت کی اس لیے ہے کہ آخرت یاد آئے، دنیا سے دل اٹھے، نہ اس لیے کہ اہلِ اسلام کی قبروں سے امداد چاہے اور غیر مسلمین اور غیر مسلمات کے لیے استغفار اور دعا کرے کہ یہ دونوں باتیں بنصِ قرآن حرام ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے چاہا کہ اپنی ماں کے لیے استغفار کریں، مگر اللہ نے منع کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار کی تھی، اس پر یہ آیت اتری۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ وہ لوگ ان کے لیے استغفار کرتے تھے،

---

[1] الروض الأنف (١/ ٢٩٦) [2] التذكرة للقرطبي (١/ ٤١۔ ١٥) تفسير ابن كثير (٢/ ٥١٥)
[3] تفسير الطبري (١٤/ ٥١٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

یہاں تک کہ جب یہ آیت آئی تو مردوں کے استغفار کرنے سے رک گئے۔ رہے زندہ لوگ سو وہ جب تک نہ مریں، تب تک ان کے لیے استغفار کرنے سے روکے نہیں گئے ہیں، پھر اللہ نے یہ آیت اتاری۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ کچھ لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کہا: اے اللہ کے نبی! ہمارے آبا میں کچھ ایسے لوگ تھے جو اچھی ہمسائیگی کرتے، صلہ رحمی کرتے، قیدیوں کو چھڑاتے، عہد کو پورا کرتے، کیا ہم ان کے لیے استغفار نہ کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں، واللہ میں اپنے باپ کے لیے استغفار کرتا ہوں، جس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے کی تھی، تب اللہ نے یہ آیت بھیجی اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے عذر بیان کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «أُمِرْتُ أَنْ لَّا أَسْتَغْفِرَ لِمَنْ مَّاتَ مُشْرِكًا»[2]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی شخص مر گیا، اس کا بیٹا مسلمان تھا، وہ اس کے ہمراہ نہ گیا، یہ ذکر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہوا، کہا: اس کو چاہیے تھا کہ اس کے ہمراہ جاتا اور جب تک وہ زندہ تھا، اس کی اصلاح کی دعا کرتا، جب مر گیا تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا، پھر آیتِ باب پڑھی إلی قوله: ﴿ تَبَرَّاَ مِنْهُ ﴾[3]

سنن ابی داود میں آیا ہے کہ جب ابوطالب مر گئے تو سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "إِنَّ عَمَّكَ الضَّالَّ فَقَدْ مَاتَ" فرمایا: «اِذْهَبْ فَوَارِهِ ولا تُحدِثَنَّ شَيْئًا حَتّٰى تَأْتِيَنِيْ»[4] یہ روایت قولِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی شاہد ہے۔ مروی ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کا جنازہ گزرا تو فرمایا: «وَصَلَتْكَ رَحِمَ يَا عَمِّ»[5] عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اہلِ قبلہ میں سے کسی پر نماز پڑھنا ترک نہیں کرتا، اگرچہ وہ ایک حبشی عورت ہو اور زنا کا حمل رکھتی ہو، اس لیے کہ میں نے اللہ کو نہیں سنا کہ اس نے نماز سے روکا ہو، مگر مشرکین سے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ... الآية ﴾ (آیتِ باب) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے اللہ اس شخص پر رحم کرے جو ابوہریرہ اور اس کی ماں کے لیے استغفار کرے۔ کہا اور اس کے باپ کے لیے؟ کہا: میرا باپ مشرک مرا ہے۔[6]

ابراہیم کا اپنے والد کے لیے استغفار:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمیشہ باپ کے لیے استغفار کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ جب ان کو یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ اللہ کا دشمن تھا، تب وہ اس سے بیزار ہو گئے۔ امام مجاہد، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ

---

① تفسير الطبري (١٤/ ٥١٣) اس کی سند حسن ہے۔ ② تفسير الطبري (١٤/ ٥١٣) یہ روایت مرسل ہے۔

③ تفسير الطبري (١٤/ ٥١٦)

④ سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٠٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦١)

⑤ الكامل لابن عدي (١/ ٢٦٠) اس کی سند میں "ابراہیم بن عبدالرحمٰن" ضعیف راوی ہے۔ ⑥ تفسير الطبري (١٤/ ٥١٦۔ ٥١٧)

وغیرہم نے کہا ہے کہ "لَمَّا مَاتَ تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلّٰهِ"[1] عبید بن عمیر اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اُس سے بیزاری قیامت کے دن ہوگی۔ ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو دیکھیں گے، اس کے چہرے پر سیاہی اور غبار ہوگا، وہ کہے گا: اے ابراہیم! میں تیری نافرمانی کرتا تھا اور آج کے دن تیری نافرمانی نہیں کروں گا، وہ کہیں گے: اے رب! کیا تو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا ہے کہ تو مجھ کو دن بعث کے غمگین نہ کرے گا، اب کوئی رسوائی اس میرے باپ ابعد کی رسوائی سے بڑھ کر ہے؟ کہا جائے گا: اپنے پیچھے دیکھو، اچانک ایک ذبح متلطخ دیکھیں گے، یعنی ایک مسخ شدہ لگڑ بگڑ نظر پڑے گا، پھر اس کے پاؤں گھسیٹ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔[2]

﴿اَوَّاهٌ﴾ کی تفسیر:

اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو ﴿اَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ فرمایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: "أَوَّاهٌ" بمعنی دعا ہے، یعنی بڑے دعا کرنے والے۔[3] عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے، پوچھا: "أَوَّاهٌ" کیا ہے؟ فرمایا: تضرع کرنے والا۔[4] (رواہ ابن جریر) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ "أَوَّاهٌ" بمعنی رحیم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابومیسرہ اور حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی عباد اللہ پر مہربان ہیں۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ زبانِ حبشہ میں "أَوَّاهٌ" کے معنی مُوْقِنٌ (یقین کرنے والا) کے ہیں۔ امام مجاہد اور ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ بمعنی مومن ہے، پھر کہا کہ بمعنی مومن تواب ہے۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زبانِ حبشہ میں بمعنی مومن ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔[6] حدیثِ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالبجادین کو کہا کہ یہ شخص اواہ ہے، وہ جب قرآن میں اللہ کا ذکر کرتا تو بلند آواز سے دعا کیا کرتا۔[7] (رواہ أحمد ورواہ ابن جریر)

امام سعید بن جبیر اور شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَوَّاهٌ" بہ معنی مُسَبِّحٌ ہے۔[8] سیدنا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "أَوَّاهٌ" وہ شخص ہے جو نمازِ چاشت کی محافظت کرے۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ "أَوَّاهٌ" وہ شخص ہے جو اپنی خطاؤں کو یاد کر کے استغفار کرے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أَوَّاهٌ" وہ شخص ہے جو مخفی گناہ کرے، مخفی توبہ کرے۔ یہ سب اقوال ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔[9]

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٥١٩۔ ٥٢٠)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٥١٦)
[3] تفسير الطبري (١٤/ ٥٢٣) اس کی سند حسن ہے۔
[4] تفسير الطبري (١٤/ ٥٣١۔ ٥٣٢) یہ روایت مرسل ہے۔
[5] تفسير الطبري (١٤/ ٥٢٤۔ ٥٢٧) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٩٦)
[6] تفسير الطبري (١٤/ ٥٢٧۔ ٥٢٩)
[7] مسند أحمد (٤/ ١٥٩) تفسير الطبري (١٤/ ٥٣٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواہ أحمد و الطبراني و إسنادھما حسن" (مجمع الزوائد: ٩/ ٦١٦)
[8] تفسير الطبري (١٤/ ٥٢٩) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٩٧)
[9] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٩٦۔ ١٨٩٨)

حسن بن مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی اللہ کی بہت سی تسبیح اور ذکر کرتا تھا، یہ ذکر نبی اکرم ﷺ سے ہوا، فرمایا: ﴿ إِنَّهُ أَوَّاهٌ ﴾[1] (رواه ابن جرير) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک میت کو دفن کیا، فرمایا: ﴿رَحِمَكَ اللّٰهُ إِنْ كُنْتَ لَأَوَّاهًا يَعْنِي تَلَّاءً لِّلْقُرْآنِ ﴾[2] (رواه ابن جرير) سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک شخص بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا اور اپنی دعا میں ''اواہ، اواہ'' کہتا تھا، یہ ذکر نبی اکرم ﷺ سے ہوا، فرمایا: ﴿ إِنَّهُ أَوَّاهٌ ﴾ ایک رات میں نکلا، کیا دیکھتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ اس شخص کو دفن کر رہے ہیں۔ وقت رات کا تھا، آپ کے ہمراہ چراغ تھا۔[3] (رواه ابن جرير) یہ حدیث غریب ہے۔ کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام جب دوزخ کا ذکر کرتے تو ''أَوَّاهُ مِنَ النَّارِ'' کہتے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ ''أَوَّاهٌ'' تھے، یعنی فقیہ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے بہتر قول یہی ہے کہ ''أَوَّاهٌ'' بہ معنی دعا ہے۔[4] سیاق کے لحاظ سے بھی یہی مناسب ہے، کیونکہ جب اللہ نے یہ ذکر کیا کہ وہ ایک وعدے تک اپنے باپ کے لیے استغفار کرتے تھے تو وہ کثیر الدعا ٹھہرے۔

﴿ حَلِيمٌ ﴾ کی تفسیر:

حلیم وہ ہے جو ظلم اور ناپسندیدہ چیز پر حوصلہ اور تحمل کرے۔ اسی لیے اپنے باپ کی ایذا دہی کی شدت کے باوجود اس کے لیے استغفار کرتے رہے، کیونکہ باپ نے کہا تھا: ﴿ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴾ [مريم: ٤٦۔ ٤٧] ''اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور رجم کر دوں گا اور تو لمبا عرصہ مجھ سے دور چلا جا۔ ابراہیم نے کہا: تجھ پر سلامتی ہو، عن قریب میں تیرے لیے اپنے رب سے استغفار کروں گا، بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔'' سو باپ کی ایذا دہی پر حوصلہ کیا، دعا اور استغفار کی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اس سورت سے پہلے اور بعد میں فرمایا کہ مشرکین اور منافقین سے اظہارِ بیزاری واجب ہے۔ قرابت داری اس حکم کو متاثر نہیں کر سکتی۔ لفظ ﴿ مَا كَانَ ﴾ قرآن میں دو طرح پر آتا ہے: ایک نفی کے معنی میں، جیسے: ﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [آل عمران: ١٤٥] ''اور کوئی جاندار اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔'' دوسرے نہی کے معنی میں، جیسے: ﴿ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ [الأحزاب: ٥٣] ''اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا دو۔''

اس جگہ نہی کے لیے ہے۔ استغفار سے یہ بات کھل گئی کہ فلاں مشرک ہے تو اب موالات (دوستانہ تعلقات)

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٥٢٩) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسير الطبري (١٤/ ٥٣٠)

[3] تفسير الطبري (١٤/ ٥٣٠) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٤/ ٥٣١۔ ٥٣٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٥١٧)

منقطع ہو گئے، یہاں رشتہ داری کا اعتبار نہیں۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ [النساء: ٤٨] ’’بے شک اللہ (یہ گناہ) نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔‘‘ اس صورت میں بخشش طلب کرنا وعدے اور وعید کی مخالفت کے حکم میں آتا ہے۔ یہ حکم نبی اکرم ﷺ کے دین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ دینِ ابراہیم میں بھی اس کی ممانعت تھی۔ ابرہیم علیہ السلام نے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمھارے لیے مغفرت مانگوں گا، لیکن یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس کو عداوت وکفر پر اصرار و استمرار ہے، تب انھوں نے باپ سے بیزاری کا اظہار کیا اور استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

معلوم ہوا کہ وہ وعدہ اس وقت کیا تھا جب ان کو حال پوری طرح معلوم نہیں تھا۔ یہ حال ان کو اور ہمارے نبی اکرم ﷺ کو اللہ کے خبر دینے کے بعد معلوم ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کفار پر جنازہ پڑھنے کی ممانعت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ﴾ [التوبة: ٨٤] ’’اور (اے نبی!) ان میں سے جو مر جائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں۔‘‘ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کثیر التاوّہ ہیں، نہایت بردبار ہیں۔ تاوّہ یہ ہے کہ آدمی بیماری و درد میں آہ آہ کہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اَوّاہٌ وہ ہے جو ویرانے میں اللہ کو یاد کرے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ وہ ہے جو بغیر کوئی قید لگائے ہوئے ذکر کرتا رہے۔ کسی نے کہا ہے کہ بمعنی شفیق ہے۔ بعض نے کہا ہے بمعنی معلمِ خیر ہے۔ بعض نے کہا ہے: بمعنی خائف من النار ہے۔ حلیم وہ ہے جو کسی کو نہ ستائے مگر اللہ کے لیے یا بمعنی سید ہے۔[2]

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۱۵ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۱۱۶ ﴾

اور اللہ ایسا نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کر دے، جب تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں واضح نہ کر دے جن سے وہ بچیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (115) بے شک آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، وہ زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا تمھارا کوئی دوست اور مددگار نہیں (116)

مواخذہ حجت قائم کرنے کے بعد ہوگا:

اللہ نے اپنے نفسِ کریم کے بارے میں خبر دی کہ میں عادل ہوں، کسی قوم کو گمراہ نہیں کرتا مگر ان کے پاس رسالت بھیجنے کے بعد، تاکہ حجت ان پر قائم ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٢٧٥) [2] فتح البيان (٥/ ٤١٠_ ٤١٤)

الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ١٧] ”اور جو ثمود تھے، تو ہم نے ان کی راہنمائی کی تو انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو پسند کیا، پھر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے انھیں رسوا کن عذاب کی چیخ نے آلیا۔“ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا بیان خاص کر مومنوں کو مشرکوں کے لیے استغفار چھوڑ دینے کے لیے ہے اور ان کی نافرمانی کرنے اور اللہ کی اطاعت کے لیے عام طور پر ہے۔ اب چاہے تم مانو یا نہ مانو۔[1] تو پھر اس کے بعد مومنین کو ابھارا کہ مشرکین و ملوکِ کفر سے لڑو اور اللہ کی نصرت پر جو آسمان و زمین کا مالک ہے، اعتماد کرو اور دشمنوں سے نہ ڈرو کہ ان کا کوئی مددگار اور یار نہیں ہے۔

سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فرمایا: کیا تم سنتے ہو جو میں سنتا ہوں؟ کہا: ہم تو کچھ نہیں سنتے، فرمایا: میں سنتا ہوں چرچرانا آسمان کا اور اس پر ملامت نہیں کہ وہ چرچرائے۔ آسمان میں ایک بالشت بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں پر کوئی فرشتہ سجدے میں یا قیام کی حالت میں نہ ہو۔[2] کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سوئی کے ناکے کے برابر زمین میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، مگر وہاں پر ایک فرشتہ مقرر ہے، اس کا علم اللہ کی طرف پہنچاتا ہے اور آسمان کے فرشتے خاک کے ذروں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں اور حاملانِ عرش کے ٹخنوں سے دماغ تک کا فاصلہ سو برس کا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب پہلی آیت اتری جس میں مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت مانگنے سے منع کیا گیا تو جو لوگ ان کے لیے استغفار کرتے تھے وہ ڈرے کہ کہیں اللہ کی طرف سے اس حرکت پر سزا نہ آئے، تب اللہ نے یہ آیت بھیجی کہ جب تک کوئی شخص محرمات پر اقدام نہیں کرتا، تب تک اللہ اس کو گمراہ نہیں کرتا۔ واضح ہو جانے سے پہلے کچھ گناہ نہیں ہے۔ معلوم ہو جانے کے بعد بچنا چاہیے۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ کے حق میں ہے، یعنی اللہ عمل بالمنسوخ کو باطل نہیں کرتا، جب تک کہ ناسخ کو بیان نہ کر دے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب لوگوں نے بدر کے قیدیوں سے جزیہ لیا، تب یہ آیت اتری، یعنی تم کو اجازت سے پہلے فدیہ نہ لینا چاہیے تھا۔[5]

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ
فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٧﴾

یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی، جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٥٣٧) [2] المعجم الكبير (٣/ ٢٠١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٥٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٩٨) [4] تفسير البغوي (٤/ ١٠٣) [5] الدر المنثور (٤/ ٣٠٨) فتح البيان (٥/ ٤١٥)

کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (117)

غزوۂ تبوک... تنگی اور شدت کے ایام:

مہاجرین و انصار کو دل کے خطروں اور وسوسوں سے معاف کیا اور دو بار فرمایا، مہربان ہوا، پھر مہربان ہوا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت غزوۂ تبوک میں اتری ہے۔[1] اس لیے کہ وہ اس غزوے میں قحط کے سال اور سخت گرمی میں اور زادِ راہ اور پانی کی تنگی میں نکلے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تبوک کے سال سخت لو میں شام کی طرف نکلے، اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کو کس قدر مشقت اور تکلیف پہنچی، یہاں تک کہ ہم نے سنا ہے کہ ایک دانہ کھجور کا دو آدمی آدھا آدھا کر کے کھاتے تھے اور اہلِ لشکر باری باری ایک دانہ کو چوستے تھے، پھر اس پر ذرا سا پانی پیتے، پھر چوستے، پھر پانی پیتے۔ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کو غزوے سے واپس پھیر دیا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس تنگی کے وقت کا حال پوچھا، کہا کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تبوک کے تابستانِ سخت میں نکلے، ایک جگہ اترے، ہم کو پیاس لگی، یہاں تک کہ ہم نے گمان کیا کہ ہماری گردنیں کٹ جائیں گی، نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ کوئی شخص اونٹ نحر کرتا، اس کی مینگنیاں نچوڑ کر پیتا، باقی کو جگر پر رکھتا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اللہ آپ کی دعا پر خیر دینے کا عادی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے دعا کریں، فرمایا: تُو کیا چاہتا ہے کہ میں دعا کروں؟ کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھائے، ابھی ہاتھ کھینچے نہ تھے کہ آسمان نے خوب پانی برسایا، خوب ہی برسا، پھر تھم گیا۔ لوگوں نے اپنے برتن بھر لیے، پھر ہم نے جا کر دیکھا تو اس پانی نے لشکر سے تجاوز نہ کیا تھا، یعنی صرف لشکر ہی پر برسا تھا۔[3] (رواہ ابن جریر) یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا۔

عسرت سے مراد خرچ، سواری اور پانی کے ذخیرے کی تنگی ہے، قریب تھا کہ لوگوں کے دل حق سے پھر جائیں اور دینِ رسول میں شک کرنے لگیں، لیکن اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، یعنی ان کو اپنی طرف رجوع کرنے کی توفیق بخشی اور دین پر ثابت رکھا۔ یہ اللہ کی مہربانی در مہربانی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ توبہ کے لیے پہلے کسی گناہ کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ سارے بندے ہر دم محتاج ہیں توبہ و استغفار کے، یعنی رسول ان کے لیے استغفار کرے۔ توبہ ترکِ اولیٰ پر بھی ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ﴾ [التوبة: ٤٣] ''(اے نبی!) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا،

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٤٠) [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٤١)

[3] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٤١۔ ٥٤٢) مستدرك الحاكم (١/ ٢٦٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

آپ نے ان (منافقین) کو اجازت کیوں دی؟'' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ نبی اکرم ﷺ کا ذکر مومنین کے اشارے کے لیے ہو کہ تم توبہ کرو اور گناہوں سے بچو۔ اہلِ معانی نے کہا ہے کہ یہ تبرک کے لیے مفتاح الکلام ہے، اس میں ان کی بزرگی ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی توبہ کو نبی اکرم ﷺ کی توبہ سے ملا دیا، جس طرح رسول کے نام کو اللہ کے نام کے ساتھ اس آیت سے ملا دیا تھا: ﴿ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ ﴾ [الأنفال: ٤١] ''اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے ہے۔''

اس آیت میں رسول کی بزرگی ہے۔ پھر اللہ نے کہا کہ ہم نے مہاجرین اور انصار کی توبہ بھی ان کے گناہوں سے قبول کی، یہ اس طرح کی بات ہے جو حدیث میں آئی ہے: « إِنَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ »[1] انسان مدت العمر میں لغزشوں اور قصوروں اور ان کے انجام سے خالی نہیں ہوتا، خواہ وہ صغیرہ گناہ ہوں یا ان کا ترک کرنا افضل کام ہو۔

ساعتِ عسرت سے مراد غزوۂ تبوک ہے کہ اس غزوے میں سخت مشکل پیش آئی تھی۔ بعض علما نے ذکر کیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ تبوک کی طرف گئے تو آپ ﷺ کے ساتھ ستر ہزار آدمی تھے، سوار اور پیادہ تمام قبائل سے مہاجرین اور انصار وغیرہ۔ ساعت سے مراد اس غزوے کے سارے اوقات ہیں، کوئی معینہ ساعت مراد نہیں ہے۔ عسرت کسی کام کی تکلیف اور سختی اور تنگی کو کہتے ہیں۔ راویوں کا اتفاق ہے کہ ساعتِ عسرت سے مراد یہی غزوۂ تبوک ہے۔ اس کو غزوۂ عسرہ بھی کہتے ہیں اور اس جیش کو جیشِ عسرہ بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس لڑائی میں ہر قسم کی تنگی تھی، یعنی زادِ راہ، سواریوں اور پانی کی تنگی تھی، قریب تھا کہ اس جنگ میں لوگوں کے دل محنت و مشقت کے سبب حق سے پھر جائیں اور دوسری طرف مائل ہو جائیں، لیکن اللہ کا فضل و کرم دیکھو کہ توبہ کی قبولیت کا ذکر گناہ کے ذکر سے پہلے کیا، تاکہ ان کے جی خوش ہو جائیں۔ رؤف و رحیم میں ایک لطیف فرق ہے، اگرچہ معنی میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رحمت کبھی کراہت کے ہمراہ بھی ہوتی ہے اور رافت (نرمی) کے ساتھ کراہت نہیں ہوتی۔[2]

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور ان تین افراد پر بھی (مہربانی فرمائی) جنھیں (حکم الٰہی کے انتظار میں) چھوڑ دیا گیا تھا، حتی کہ جب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩٤)

[2] تفسير الخازن (٣/ ١٥٨) فتح البيان (٥/ ٤١٦۔ ٤١٨)

زمین فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں (بھی) ان پر تنگ ہوگئیں، اور انھوں نے سمجھا کہ اللہ (کے غضب) سے خود اس کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی، تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (118) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ (119)

تین پیچھے رہ جانے والے صحابہ کا واقعہ اور توبہ:

وہ تین شخص بھی داخل ہوئے۔ پچاس دن میں ان پر سخت حالت گزری کہ موت سے بدتر۔ یہ تین شخص سچ کہنے سے بخشے گئے، نہیں تو منافقوں میں شامل ہوتے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں کسی غزوے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہا مگر غزوۂ تبوک میں۔ اسی طرح غزوۂ بدر میں بھی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھا، لیکن اس غزوے سے پیچھے رہنے پر کسی کو بھی سزا نہ ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلے کے ارادے سے نکلے تھے، اللہ نے بغیر کسی میعاد کے ان کو اور دشمن کو یکجا کر دیا۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ شبِ عقبہ میں حاضر ہوا، جب کہ ہم سب نے اسلام پر موافقت کی، میں اس کے عوض بدر کی جائے شہادت دوست نہیں رکھتا۔ اگرچہ اس کا ذکر اور چرچا لوگوں میں بہت ہے۔

غزوۂ تبوک سے میرے پیچھے رہ جانے کا قصہ یوں ہے کہ میں کبھی اتنا زیادہ آسودہ حال اور مضبوط نہیں ہوا تھا جتنا اس غزوے سے پیچھے رہ جانے کے وقت تھا۔ واللہ! میرے پاس کبھی دو سواریاں جمع نہیں ہوئیں، اس غزوے کے وقت میرے پاس دو سواریاں تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوے کا ارادہ کرتے تو نام کسی اور جگہ کا لیتے، یہاں تک کہ وہ غزوہ ہو جاتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غزوہ سخت گرمی میں کیا اور سفر بھی دور دراز کا تھا اور جنگلوں کی طرف منہ کیا اور بہت سے دشمنوں کی طرف متوجہ ہوئے اور مسلمانوں سے کھلم کھلا کہہ دیا کہ وہ دشمن سے مقابلے کی تیاری کر لیں اور جس طرف کا ارادہ تھا اس کی خبر کر دی اور مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بہت تھے، جن کو کوئی کتابِ حافظ جمع نہیں کر سکتی۔ کتاب سے مراد وہ رجسٹر ہے جس میں لشکر کے تمام نام درج تھے۔ کم لوگ ایسے تھے جن کو یہ گمان ہوا کہ اگر وہ غائب ہوں گے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخفی رہیں گے، جب تک کہ اللہ کی طرف سے وحی نہ آئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے تیاری کی، میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تیاری کروں، لیکن میں نے کچھ تیاری نہ کی، اپنے جی میں کہا: جب چاہوں گا تیار ہو جاؤں گا، یہی سوچتا رہا، یہاں تک کہ لوگ تیار ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہو گئے اور میں کچھ تیاری نہ کر پایا اور کہا کہ میں ایک دو دن کے بعد تیار ہو کر ان کے ساتھ جا ملوں گا، ہر روز ارادہ کرتا اور رہ جاتا اور کچھ نہ کرتا، غرض کہ اتنی دیر ہوئی کہ وہ لوگ کوچ کر گئے۔

میں نے چاہا کہ میں ان سے جا ملوں، کاش! میں نے ایسا ہی کیا ہوتا، لیکن میرے مقدر میں نہ تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد میں جب گھر سے نکلتا تو مجھ کو رنج ہوتا، کیونکہ مجھے صرف وہی لوگ نظر آتے جن پر یا تو منافق ہونے کی تہمت اور طعن تھا یا ایسے لوگ جن کو اللہ نے معذور کیا تھا۔

مجھے نبی اکرم ﷺ نے تبوک پہنچ کر یاد کیا۔ آپ ایک قوم کے درمیان بیٹھے تھے، فرمایا: کعب بن مالک نے کیا کیا؟ بنوسلمہ کے ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اس کو اس کی دو چادروں نے اور اپنے عطف کی طرف دیکھنے نے روک لیا۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بولے: تُو نے بری بات کہی ہے، واللہ اے اللہ کے رسول! ہم نے اس کی کوئی بات سوائے خیر کے نہیں جانی۔ نبی اکرم ﷺ خاموش رہے۔

میں نے جب سنا کہ نبی اکرم ﷺ تبوک سے واپس آ رہے ہیں، مجھ کو میرا رنج و افسوس تازہ ہوگیا۔ میں جھوٹے عذر سوچتا تھا اور کہتا تھا کہ کل کو میں نبی اکرم ﷺ کی ناراضی سے کیسے بچوں گا اور جو لوگ میرے گھر کے عقل مند اور سمجھ دار تھے، ان سے اس بارے میں مدد چاہتا تھا۔ جب یہ بات سنی کہ آپ ﷺ آ گئے ہیں، باطل میرے جی سے جاتا رہا اور میں نے جان لیا کہ مجھے سوائے سچ بولنے کے اور کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ نبی اکرم ﷺ جب سفر سے آتے تو مسجد سے ابتدا کرتے، دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں کے لیے بیٹھتے۔ جب آپ نے اس طرح کیا، متخلفین آئے اور عذر پیش کرنے اور قسمیں کھانے لگے، یہ اسّی سے کچھ اوپر لوگ تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ظاہری طور پر ان کا عذر قبول کیا اور استغفار کی اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد فرمایا۔

یہاں تک کہ جب میں نے آ کر سلام کیا تو آپ ﷺ نے تبسم فرمایا، مگر غصے سے، پھر فرمایا: آؤ، میں چل کر آپ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، فرمایا: تُو کس لیے رہ گیا، کیا تُو نے سواری نہیں خریدی تھی؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اگر میں اہلِ دنیا میں کے سوا کسی اور کے پاس بیٹھتا تو یہ جانتا کہ میں عذر کر کے اس کے غصے سے بچ جاؤں گا، مجھ کو جدل کرنا آتا ہے، لیکن واللہ! میں جانتا ہوں کہ اگر آج آپ کے سامنے کوئی جھوٹی بات کہوں گا جس کے سبب آپ مجھ سے خوش ہو جائیں گے تو قریب ہے کہ اللہ آپ کو مجھ پر خفا کرا دے گا اور اگر آپ کے سامنے سچ بولوں گا اور آپ مجھ پر خفا ہوں گے تو میں اللہ سے اچھے انجام کی امید رکھتا ہوں۔ واللہ! مجھ کو پیچھے بیٹھ رہنے کے لیے کوئی عذر نہیں تھا، واللہ! میں کبھی اتنا فارغ اور آسودہ حال نہ تھا جیسا کہ تخلف کے وقت تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس نے سچ کہا، تُو جا! یہاں تک کہ اللہ تیرے حق میں حکم دے۔

میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، کچھ لوگ بنوسلمہ کے میرے پیچھے آئے اور مجھ سے کہا: واللہ! ہم نہیں جانتے کہ تُو نے کوئی قصور کیا ہے اس سے پہلے، لیکن اس وقت تُو عاجز ہو گیا، تُو نے بھی ویسا عذر کر لیا ہوتا جیسا کہ دوسرے متخلفین نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنے اپنے عذر پیش کیے۔ تیرے اس گناہ کے لیے آپ ﷺ کا استغفار کرنا کافی ہوتا،

واللہ! وہ مجھے سرزنش کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے چاہا کہ پھر کر جاؤں اور اپنے آپ کی تکذیب کروں، پھر میں نے ان سے کہا: میرے جیسے کسی اور شخص نے نبی اکرم ﷺ سے ملاقات کی ہے؟ کہا: دو مردوں نے وہی کہا جو تم نے کہا اور نبی اکرم ﷺ نے ان کو بھی وہی بات کہی ہے جو تم کو کہی۔ میں نے پوچھا: وہ دو مرد کون ہیں؟ کہا: مرارہ بن ربیع عامری اور ہلال بن امیہ واقفی۔ غرض کہ ان دو صالح مردوں کا مجھ سے ذکر کیا، یہ دونوں بدر میں حاضر ہوئے تھے، مجھ کو ان کی اقتدا کرنا چاہیے تھا۔ میں یہ سن کر چلا اور نبی اکرم ﷺ نے مسلمان لوگوں کو منع کر دیا کہ ہم تینوں سے جملہ متخلفین میں سے بات کریں، لوگ ہم سے بچنے لگے اور بدل گئے، یہاں تک کہ میں نے اپنے جی میں زمین کو بھی بدلا ہوا پایا، گویا وہ زمین ہی نہیں ہے جس کو میں پہچانتا تھا، اس حال پر ہم پچاس دن تک رہے۔

ہمارے وہ دونوں یار اپنے گھروں میں بیٹھ کر رویا کرتے اور میں لوگوں میں سے زیادہ چاق و چوبند اور سخت تھا، میں مسلمانوں کے ساتھ نماز میں حاضر ہوتا اور بازاروں میں پھرتا، مجھ سے کوئی بات نہ کرتا اور میں نبی اکرم ﷺ کے پاس جاتا، آپ ﷺ نماز کے بعد بیٹھتے، میں سلام کرتا اور جی میں کہتا کہ کیا آپ ﷺ نے سلام کے جواب میں ہونٹ ہلائے یا نہیں؟ پھر آپ ﷺ کے نزدیک نماز پڑھتا اور نظر چراتا۔ جب میں نماز میں ہوتا تو نبی اکرم ﷺ میری طرف دیکھتے، جب میں آپ ﷺ کی طرف توجہ کرتا تو آپ ﷺ مجھ سے منہ پھیر لیتے۔

جب مسلمانوں کی قطع تعلقی لمبی ہوگئی تو میں چلا، یہاں تک کہ سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی دیوار پر چڑھا، وہ میرا چچا زاد بھائی تھا اور میں اس کو بہت چاہتا تھا۔ میں نے اس کو سلام کیا، واللہ! اس نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے کہا: اے ابو قتادہ! تجھ کو اللہ کی قسم، تُو جانتا ہے کہ میں اللہ اور رسول کو دوست رکھتا ہوں، وہ خاموش رہا، میں نے پھر دوبارہ اس کو قسم دی، وہ پھر چپ رہا، پھر سہ بارہ قسم دی، پہلے وہ چپ ہوا، پھر کہا: اللہ اور رسول جانیں۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہاں سے پھر کر دیوارِ باغ پر چڑھا۔

پھر ایک دن میں مدینے کے ایک بازار میں چلا جاتا تھا کہ اتنے میں ایک نبطی انباطِ شام میں سے جو مدینے میں فروخت کرنے کے لیے غلہ لایا تھا، وہ مجھے ملا۔ وہ کہتا تھا کہ کوئی مجھے کعب بن مالک کا پتا بتا دے، لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگے، اس نے میرے پاس آ کر مجھے ایک خط دیا، وہ غسان کے بادشاہ کا خط تھا، جو میری طرف لکھا گیا تھا، اس نے اس میں لکھا تھا: ”أَمَّا بَعْدُ! فَقَدْ بَلَغَنَا أَنَّ صَاحِبَكَ قَدْ جَفَاكَ، وَأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَجْعَلْكَ فِي دَارِ هَوَانٍ وَلَا مَضْيَعَةٍ فَالْحَقْ بِنَا نُوَاسِكَ“ ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تیرے صاحب نے تجھے چھوڑ دیا ہے، اللہ نے تجھے ذلت یا ضائع ہونے کے لیے نہیں رکھا، ہمارے پاس آ جا، ہم تیرا پورا خیال رکھیں گے۔“ میں نے اس خط کو پڑھ کر اپنے جی میں کہا کہ یہ ایک اور آزمایش پیش آئی، میں نے چولہے میں اس خط کو جلا دیا۔

جب چالیس راتیں پچاس میں سے گزر گئیں تو نبی اکرم ﷺ کا قاصد میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ ﷺ نے تجھے حکم دیا ہے کہ تُو اپنی بیوی کو الگ کر دے، میں نے کہا: کیا میں اس کو طلاق دے دوں یا کیا کروں؟ کہا: بلکہ الگ کر دے، اس کے پاس نہ جا۔ اسی طرح آپ ﷺ کا قاصد ان دونوں کے پاس بھی گیا، میں نے اپنی بیوی سے کہا: تُو اپنے میکے چلی جا، ان کے پاس رہ، یہاں تک کہ اللہ اس کے بارے میں کوئی حکم فرمائے، جو چاہے۔

ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بی بی نے نبی اکرم ﷺ کے پاس آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! ہلال ایک بوڑھا آدمی کمزور ہے، اس کے پاس کوئی خادم نہیں، کیا آپ کو ناپسند ہے کہ میں اس کی خدمت کروں؟ فرمایا: نہیں، لیکن وہ تیرے پاس نہ آئے، اس نے کہا: واللہ! اس کو کسی شے کی طرف حرکت نہیں ہے اور وہ اس دن سے جب سے اس کا یہ حال ہوا ہے، آج تک برابر رو رہا ہے۔ کعب نے کہا: مجھ سے بھی میرے بعض گھر والوں نے کہا: تُو بھی نبی اکرم ﷺ سے اپنی بیوی کی رخصت لے لے، کیونکہ آپ نے ہلال بن امیہ کی بیوی کو اجازت دے دی ہے۔ میں نے کہا: واللہ! میں ہرگز نبی اکرم ﷺ سے اس بارے میں اجازت لینا نہیں چاہوں گا اور میں نہیں جانتا کہ اگر میں اجازت مانگوں تو آپ ﷺ کیا حکم دیں گے اور میں جوان آدمی ہوں، دس رات تک یونہی حال رہا۔

جب بات چیت کے منع ہونے کو پوری پچاس راتیں ہو گئیں اور پچاسویں دن کی فجر کی نماز گھر کی چھت پر پڑھی اور میرا وہی حال تھا جو اللہ نے بیان کیا ہے کہ میرا دل تنگ ہو گیا اور زمین بھی مجھ پر تنگ نظر آئی، باوجود اس کشادگی کے، تو میں نے ایک چلّانے والے کی آواز کوہِ سلع پر سنی، وہ با آوازِ بلند کہتا تھا: ”أَبْشِرْ يَا كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ“ ”کعب! خوش ہو جا“ میں اس آواز کو سن کر سجدے میں گر پڑا اور میں نے چاہا کہ اللہ کی طرف سے توبہ قبول ہونے کی خوش خبری آئے۔

چنانچہ اللہ پاک کے توبہ قبول کرنے کی اطلاع نبی اکرم ﷺ نے دی ہے، جبکہ صبح کی نماز پڑھی جا چکی۔ اب لوگ خوش خبری سنانے کے لیے آنے لگے اور میرے ان دونوں یاروں کے پاس بھی گئے اور میرے پاس ایک شخص گھوڑے پر سوار آیا اور قبیلہ اسلم سے دوڑنے والا دوڑا، اس نے پہاڑ پر چڑھ کر آواز دی، گھوڑے سے بھی جلدی اس کی آواز پہنچی، جب وہ آدمی آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی، میں نے اس خوش خبری کے صلے میں اپنے دونوں کپڑے اتار کر اس کو پہنا دیے۔ واللہ! اس دن میں سوائے ان دو کپڑوں کے کسی اور چیز کا مالک نہیں تھا اور دو کپڑے عاریتاً لے کر میں نے پہنے اور نبی اکرم ﷺ کی ملاقات کے ارادے سے چلا۔

لوگ فوج درفوج میرے سامنے آتے تھے اور مبارک باد دیتے تھے کہ اللہ نے تیری توبہ قبول کر لی اور کہتے تھے: ”لِيَهْنِكَ تَوْبَةُ اللّٰهِ عَلَيْكَ“ یہاں تک میں مسجد میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ مسجد میں بیٹھے ہیں اور لوگ آپ کے آس پاس ہیں۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے جلدی سے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ واللہ! سوا ان

کے مہاجرین میں سے کوئی آدمی اٹھ کر میرے پاس نہیں آیا۔ کعب رضی اللہ عنہ اس بات کو طلحہ رضی اللہ عنہ کے لیے یاد رکھتے تھے، کبھی نہیں بھولتے تھے۔ جب میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمکتا تھا: «اَبْشِرْ بِخَيْرِ يَوْمٍ مَرَّ عَلَيْكَ مُنْذُ وَلَدَتْكَ اُمُّكَ» میں نے کہا: یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ روشن ہو جاتا، گویا چاند کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارک سے پہچانی جاتی تھی۔ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھا تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری توبہ یہی ہے کہ میں اپنے مال سے الگ ہو کر اس کو اللہ کے حوالے کر دوں، فرمایا: کچھ مال اپنے پاس رہنے دے کہ یہ تیرے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کی کہ میں اپنا حصہ جو خیبر میں ہے اس کو روک رکھوں گا۔ پھر میں نے کہا کہ اللہ نے مجھ کو سچ بولنے کے سبب نجات دی، میری توبہ یہی ہے کہ میں سچ بولوں اور جب تک زندہ رہوں، اس پر کاربند رہوں۔ واللہ! میں نہیں جانتا کہ اللہ نے مسلمانوں میں سے کسی شخص کا سچ بولنے کے بارے میں امتحان لیا ہو، جب سے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ذکر کی، اس امتحان سے بہتر جو میرا لیا۔ واللہ! میں نے کبھی جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا، جب سے کہ اس کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آج کے دن تک اور امید رکھتا ہوں کہ اللہ عزوجل باقی عمر میں بھی جھوٹ سے محفوظ رکھے گا اور اللہ نے یہ آیات: ﴿ لَقَدْ تَّابَ ﴾ سے لے کر ﴿ مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ١١٧۔ ١١٩] تک اتاریں۔

واللہ! اللہ نے مجھ پر اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کی، جیسے کہ مجھ کو اسلام کی ہدایت نصیب فرمائی کہ اس دن میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچی بات کہہ دی، اگر میں جھوٹ بولتا تو اسی طرح ہلاک ہو جاتا، جیسے اور جھوٹے لوگ تباہ ہو گئے۔ اللہ نے جب جھوٹوں کے حق میں وحی بھیجی، ان کو بہت برا کہا، ایسا برا کسی کو نہ کہا ہو گا، فرمایا: ﴿ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٩٥۔ ٩٦] ”عن قریب وہ تمھارے لیے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے، تاکہ تم ان سے درگزر کرو، چناں چہ ان سے درگزر (ہی) کرو۔ بلاشبہہ وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، ان (کاموں) کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔ وہ تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو بھی اللہ ان (لوگوں) سے راضی نہیں ہوتا، جو نافرمان ہیں۔“

ہم تین شخص تھے جو ان لوگوں سے علاحدہ رہے، جن کا عذر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر لیا تھا، انھوں نے جب حلف کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے استغفار کی اور ہمارے معاملے میں تاخیر فرمائی، یہاں تک کہ اللہ نے حکم بھیجا

اور فرمایا: ﴿ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ﴾ یہ پیچھے رہنا اور ان کے معاملے میں تاخیر ہونا کچھ وہ نہیں ہے کہ ہم غزوے سے پیچھے رہ گئے، بلکہ یہ تخلیف ان اہلِ حلف اور عذر پیش کرنے والوں کے مقابلے میں ہے جن کا عذر قبول کیا گیا تھا۔[1] (رواہ أحمد، هذا حديث صحيح ثابت متفق على صحته، رواه صاحبا الصحيح البخاري ومسلم من حديث الزهري بنحوه)

یہ حدیث احسن اور تفصیلی وجوہ سے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ بہت سے سلف نے اس کی تفسیر اسی طرح روایت کی ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان تین اشخاص سے مراد کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم ہیں، یہ تینوں انصاری تھے۔ یہی امام مجاہد، ضحاک، قتادہ، سدی رحمہم اللہ اور بہت سے مفسرین کا قول ہے۔[2] سب نے مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ کہا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے ربیع بن مرارہ اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ربیع بن مرار یا مرار بن ربیع اور ایک روایت میں، جو امام ضحاک رحمہ اللہ سے ہے، مرارہ بن ربیع آیا ہے۔ كما وقع في الصحيحين وهو الصواب. یہ قول کہ ان لوگوں نے دو مردوں کا نام لیا جو بدر میں حاضر ہوئے تھے، یہ امام زہری رحمہ اللہ کی خطا ہے، کیونکہ ان تینوں میں سے کسی کا بدر میں حاضر ہونا معلوم نہیں ہوتا، واللہ أعلم.[3]

سچ اختیار کرنے کی تلقین:

باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے ان کو چھوڑ دیا تھا اور ان کی جان اور زمین ان پر تنگ ہوگئی تھی اور سارے راستے بند تھے اور نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا کریں۔ یہ تینوں پچاس رات تک اللہ کے امر پر صابر و شاکر تھے اور یہاں تک ثابت قدم رہے کہ اللہ نے اس وجہ سے ان کی مشکل آسان کر دی کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ بولا اور کہہ دیا کہ ہمیں جنگ میں شریک نہ ہونے کے لیے کوئی عذر نہ تھا، اس پر اتنی مدت تک انھیں سزا ہوئی، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، ان کے صبر کا انجام بہت اچھا ہوا، اسی راستے نے توبہ قبول کرائی، اسی لیے اللہ نے کہا ہے کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو، یعنی سچ بولنے کو لازم پکڑ لو اور اہلِ صدق میں سے ہو جاؤ۔ ہلاک کرنے والی چیزوں سے نجات پاؤ، اللہ تمھارے کاموں میں کشادگی دے گا اور نجات کا رستہ دکھائے گا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يَكُوْنَ صِدِّيْقًا، وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ، وَإِنَّ الْفُجُوْرَ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ، حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا »[4] (أخرجاه في الصحيحين)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "اَلْكَذِبُ لَا يَصْلُحُ مِنْهُ جِدٌّ وَّلَا هَزْلٌ اِقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٩) مسند أحمد (٣/ ٤٥٦)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ٥٤٤۔ ٥٤٦)
[3] تفسير ابن كثير (٤/ ٢٣٠) الطبعة: دار طيبة.
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠٧)

اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾'' پھر کہا: ''فَهَلْ تَجِدُوْنَ لِأَحَدٍ فِيْهِ رُخْصَةً'' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابِ محمد کے ہمراہ۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا ابوبکر، عمر اور ان کے یاروں رضی اللہ عنہم کے ہمراہ۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تُو چاہے کہ سچوں کے ہمراہ رہے تو دنیا میں زہد اختیار کر اور فرقہ پرستی سے باز رہ۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے ان تینوں اشخاص کی توبہ قبول کی جن کی توبہ میں تاخیر کی گئی تھی اور فی الحال قبول نہیں ہوئی تھی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ خُلِّفُوْا ﴾ کے معنی تُرِكُوْا۔[2] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی توبہ قبول نہیں کی، یہاں تک کہ قرآن نازل ہوا اور اللہ نے قبول کی۔ ان پر زمین تنگ و تاریک ہوگئی، زمین کیا بلکہ جان تک سے تنگ آ گئے تھے بسببِ وحشت وظلم اور غم واندوہ کی شدت سے، اور جان لیا تھا کہ اللہ کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں ہے، یہی توبہ اور استغفار کام آئے گی، اس پر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔

ابوبکر وراق رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''اَلتَّوْبَةُ النَّصُوْحُ أَنْ تَضِيْقَ عَلَى التَّائِبِ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَتَضِيْقُ عَلَيْهِ نَفْسُهُ كَتَوْبَةِ هٰٓؤُلَاءِ الثَّلَاثَةِ''[3] آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ معاصی سے علاحدگی اختیار کی جا سکتی ہے ان کو ادب سکھانے کے لیے، تاکہ وہ گناہوں سے باز رہیں اور اس بات پر دلیل ہے کہ توبہ کی قبولیت محض اللہ کی رحمت، کرم، نرمی اور احسان ہے، کچھ اللہ پر واجب نہیں کہ وہ توبہ کو قبول کرے۔

﴿ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ سے مراد:

پھر فرمایا کہ آیت عام طور پر یہ ہدایت کرتی ہے کہ اللہ سے ڈرنا چاہیے اور سچوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ نافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان تین آدمیوں کے لیے ہدایت تھی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کے ساتھ رہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہو۔ ابوجعفر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان تینوں کے ہمراہ رہو۔[5] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمراہ مہاجرین کے رہو۔[6] کسی نے کہا ہے کہ ان کے ہمراہ رہو جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک میں گئے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے ہمراہ رہو جنھوں نے گناہ کا اقرار کیا اور عذر نہ کیا، لیکن قول اول ہی زیادہ بہتر ہے اور یہ سب ان میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں، آیت صدق کی فضیلت پر دلیل ہے۔

سیدنا ابوبکر کا استدلال:

مروی ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے انصار پر حجت قائم کی تھی سقیفہ کے دن، جبکہ

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٠٦۔ ١٩٠٧) ② فتح القدير (٢/ ٥٨٤) ③ تفسير القرطبي (٨/ ٢٨٧)
④ تفسير الطبري (١٤/ ٥٥٩) ⑤ الدر المنثور (٤/ ٣١٦) ⑥ تفسير الطبري (١٤/ ٥٥٩)

انصار نے یہ بات کہی تھی: "مِنَّا أَمِيرٌ وَّمِنكُمْ أَمِيرٌ" سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ [الحشر: ۸] "(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے، جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔" انھوں نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انصار نے کہا: تم ہو۔ کہا: اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) تم کو حکم ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہو، ہم کو یہ حکم نہیں دیا کہ ہم تمھارے ساتھ رہیں۔① بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اجماع حجت ہے، کیونکہ حکم دیا ہے ساتھ رہنے کا ہمراہ صادقین کے۔ لہٰذا ان کی بات کو قبول کرنا لازم ہے یا ﴿ مَعَ ﴾ بمعنی مِنْ ہے، یعنی "كُوْنُوْا مِنْهُمْ. وَاللّٰهُ أَعْلَمُ"②

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اہلِ مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں کے لائق نہیں تھا کہ وہ (جہاد میں) رسول اللہ سے پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ (جائز) کہ اپنی جانوں کو نبی کی جان سے زیادہ عزیز رکھیں، یہ اس لیے کہ یہ بلاشبہہ وہ (لوگ) ہیں کہ انھیں اللہ کی راہ میں جو بھی پیاس اور تھکاوٹ اور بھوک (کی تکلیف) پہنچتی ہے، اور وہ جو بھی ایسی جگہ روندتے ہیں، جو کافروں کو سخت ناگوار ہو، اور وہ دشمن سے جو بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں، اس کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۲۰﴾

پیچھے رہ جانے والوں کو عتاب اور جنگ کے راستے میں درپیش مشکلات کا اجر:

اللہ پاک نے اس آیتِ پاک میں متخلفین پر عتاب کیا ہے کہ اہلِ مدینہ اور اعراب نے غزوۂ تبوک میں نبی اکرم ﷺ کا ساتھ نہ دیا، اپنی جان کا آرام چاہا اور نہ ان لوگوں کے ساتھ کچھ ہمدردی کی جن کو بہت تکلیف اور مشقت پہنچی، انھوں نے اپنے اجر و ثواب کا نقصان کیا۔ اگر ان کو اللہ کی راہ میں پیاس، تکلیف یا گرسنگی پہنچتی یا یہ کسی جگہ میں اترتے

① تفسیر الخازن (۳/ ۱٦٤) نیز اس کی اصل صحیح بخاری (رقم الحدیث: ۳٤٦۷) میں مروی ہے۔ ② فتح البیان (۵/ ٤١٩۔ ٤٢١)

اور دشمنوں کو ڈراتے اور ان پر غلبہ پاتے اور ان کے ان اعمال پر جو ان کی قدرت میں تھے ان کو ان اعمالِ صالحہ کا کتنا بڑا اجر ملتا، اللہ کسی نیک بندے کا اجر ضائع نہیں کرتا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴾ [الكهف: ۳۰] ''یقیناً ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جس نے اچھا عمل کیا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ جنگ کرنے کے واجب ہونے کی سخت تاکید ہے اور آپ کے ہمراہ جنگ میں جانے سے پیچھے رہ جانے کی تحریم وممانعت ہے۔ مدینہ کے آس پاس مزنیہ، جہنیہ، اشجع، اسلم اور غفار رہتے تھے، یہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تبوک میں نہیں گئے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت تمام اعراب کے حق میں ہے، کیونکہ الفاظ عام ہیں، اس کو عمومیت پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے۔ اللہ نے ان کو اس لیے خاص کیا کہ یہ پکارنے پر بھی جنگ کے لیے نہیں نکلے اور عرب کے برعکس کہ ان کو نکلنے کا نہیں کہا گیا تھا اور یہ خود قرب و جوار میں رہتے تھے، اس لیے یہ زیادہ حق رکھتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ کی متابعت اور نصرت کرتے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب اسلام قلیل تھا، کسی کو نبی اللہ ﷺ سے تخلف کرنے کا حق نہیں پہنچتا تھا، جب اسلام سے وفا کرنے والے کثیر ہو گئے تو اللہ نے کہا: ﴿ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ﴾ [التوبة: ۱۲۲] ''اور مومنوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب ہی نکل کھڑے ہوں۔''[1]

پھر اللہ نے فرمایا کہ ان کو زیبا نہ تھا کہ اپنی جان کا بخل کریں اور نبی اکرم ﷺ کی جان کا دھیان نہ رکھیں، بلکہ ان کو تو یہ چاہیے تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ چل کر محنت اور تکلیف اٹھاتے اور آپ کے سامنے اہلِ شقا (بدبخت دشمنوں) سے جہاد کرتے، نبی اکرم ﷺ کو بچاتے، اپنی جان دیتے۔ جنگ اور تکلیف میں آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑتے، کیونکہ جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی جان اللہ کے نزدیک بہت عزیز اور کریم ہے۔ سو جب وہ نفس (ﷺ) باوجود اس عزت اور کرامت کے فکر مند ہو یا کسی سختی میں یا خوف میں ہو تو سارے لوگوں پر واجب ہے کہ وہ پروانے کی طرح شمع پر اپنی جانیں فدا کرتے اور اپنی جان کی کچھ پروا نہ کرتے، بلکہ اس جان دینے کو آسان سمجھتے۔ اس آیت میں ان کو سخت ڈانٹ ڈپٹ ہے۔

پھر فرمایا کہ ان پر نبی اکرم ﷺ کا ساتھ دینا اس لیے واجب ہے کہ جو کچھ تکلیفات انھیں اس کام میں پیش آتیں اور جو کچھ بھی کارروائی وہ کرتے جس میں دشمنوں کو قتل اور قید کرتے یا خود کچھ ہزیمت اٹھاتے، ان سب پر انھیں بہت اجر ملتا۔ اللہ کسی کا اجر برباد نہیں کرتا۔ وہ اپنے وعدے میں کریم ہے۔ ائمہ کی ایک جماعت نے کہا ہے: ''هٰذِهِ الْآيَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ إِلٰى أَنْ تَقُوْمَ السَّاعَةُ'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حکم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہے،[2] مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٠٧)
[2] تفسير الطبري (١٤/ ٥٦٢)

آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جو کوئی اللہ کی اطاعت کا قصد کرتا ہے، اس کا کھڑا ہونا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، حرکت اور سکون سب اللہ کے نزدیک نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔[1]

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور وہ جو بھی چھوٹا اور بڑا خرچ کرتے ہیں اور وہ جو بھی وادی طے کرتے ہیں، وہ (سب) ان کے لیے لکھا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں ان کاموں کی بہترین جزا دے، جو وہ کرتے ہیں ﴿121﴾

اللہ کی راہ میں کیے گئے ہر چھوٹے بڑے عمل کا اجر ہے:

اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان غازیوں کا خرچ کرنا، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، تھوڑا ہو یا زیادہ اور دشمنوں کی طرف جاتے ہوئے جو جو بیابان اور میدان وہ طے کریں، یہ سب ان کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے، اس جگہ لفظ بہ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ یہ اعمال ان سے صادر ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ان کو ان اعمال کا بہت اچھا بدلہ ملے گا۔

امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس آیتِ کریمہ سے وافر حصہ اور عظیم نصیب حاصل ہوا، اس لیے کہ انھوں نے اس غزوے میں بہت زیادہ مال اور نفقاتِ جلیلہ خرچ کیے، جس طرح عبدالرحمان بن خباب سلمی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا، لوگوں کو جیشِ عسرت پر ابھارا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں سو اونٹ ان کے پالان وغیرہ کے ساتھ دیتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رغبت دلائی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میری طرف سے سو اونٹ معہ پالان وغیرہ کے اور ہیں۔

عبدالرحمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ہاتھ ہلا کر اس طرح اشارہ کیا، اور عبدالصمد راوی نے ایک تعجب کرنے والے کی طرح اپنا ہاتھ نکال کر بتایا اور فرمایا: «مَا عَلٰی عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذَا»[2] (رواه عبد الله بن الإمام أحمد) عبدالرحمان بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار اپنے کپڑے میں لائے، جیشِ عسرت کا ساز و سامان کیا اور وہ دینار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیے، میں نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ سے ان کو الٹتے پلٹتے تھے اور فرماتے تھے: «مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ» بار بار یہی کہتے تھے۔[3] (رواه عبد الله بن الإمام أحمد أيضا) امام قتادہ رحمہ اللہ نے قَطْعِ وَادِي کی تفسیر میں کہا ہے: ”مَا ازْدَادَ قَوْمٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بُعْدًا مِنْ أَهْلِيْهِمْ إِلَّا ازْدَادُوْا قُرْبًا مِّنَ اللّٰهِ“[4]

---

[1] فتح البيان (٥/ ٤٢١۔ ٥٢٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٠) مسند أحمد (٤/ ٧٥) اس کی سند میں ”فرقد ابوطلحہ“ مجہول راوی ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠١) مسند أحمد (٥/ ٦٣) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٤/ ٥٦٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ جو کچھ خرچ جنگ کے لیے یا اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، گو ایک تھوڑی سی اور حقیر سی چیز ہو، جیسے کھجور کا ایک دانہ یا اس سے زیادہ یا کم، یہاں تک کہ کوڑا لٹکانے کی چیز، وہ ان کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح صحرا کو جنگ کے لیے جاتے اور آتے ہوئے عبور کرنا بھی لکھا جاتا ہے۔ وادی اصل میں اس میدان کو کہتے ہیں جو پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان ندی نالوں کی گزر گاہ ہوتی ہے۔ یہ آیت جہاد کی فضیلت کی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد بندوں کا سب سے اچھا عمل ہے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت اس سے بعد والی آیت سے منسوخ ہے، کیونکہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ بعض لوگوں کے جہاد کے لیے جانے کے ساتھ بعض لوگوں کا پیچھے رہ جانا جائز۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے:[1]

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْھُمْ طَاۗىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّھُمْ يَحْذَرُوْنَ ١٢٢

اور مومنوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب ہی نکل کھڑے ہوں، تو ہر فرقے میں سے ایک گروہ دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ نکلا، تاکہ وہ جب اپنے قبیلے میں واپس جائیں تو انھیں خبردار کریں، تاکہ وہ (پیچھے والے بھی اللہ سے) ڈریں (122)

ہر قوم سے ایک گروہ دین سیکھنے کے لیے نکلے اور اپنی قوم کو سکھائے:

یعنی ہر قوم میں سے چاہیے کہ بعض لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں، تاکہ علمِ دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھا دیں۔ اب پیغمبر موجود نہیں، لیکن علم اور دین موجود ہے۔ طلبِ علم فرضِ کفایہ ہے۔ جب یہ بات ٹھہری کہ عرب کے سارے احیا (قبیلے) غزوۂ تبوک میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ جائیں گے تو اللہ نے اس حکم کا بیان کیا۔ سلف کے ایک گروہ کا یہ قول ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ جنگ کے لیے باہر نکلیں تو ہر مسلمان کو کوچ کرنا واجب ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ﴾ [التوبة: ٤١] ''تم ہلکے (بھی) نکلو اور بوجھل (بھی)۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِاَھْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَھُمْ ... الخ ﴾ [التوبة: ١٢٠] ''اہلِ مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں کے لائق نہیں تھا۔''

یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہو گیا، بعض نے کہا ہے کہ اس بیان سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ ہر قبیلے سے نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ نکلیں، اگر سب نہ نکلیں۔ وہ جو باہر نکلیں گے، وہ نزولِ وحی کو سمجھیں گے اور جو لوٹ کر آئیں گے

---

[1] فتح البیان (٥/ ٤٢٤)

تو اپنی قوم کو دشمن کے معاملے سے ڈرائیں گے تو اس معین طریقے سے نکلنے میں ان کے لیے دو امر جمع ہو جائیں گے اور نبی اکرم ﷺ کے بعد یہ گروہ جو نکلا تھا وہ یا تو دین میں غور وفکر کرے گا یا جہاد، کیونکہ یہ قبائل پر فرض کفایہ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے یعنی سارے مومنوں کو کوچ نہ کرنا چاہیے کہ نبی کو اکیلا چھوڑ دیں، بلکہ ایک گروہ مغنی عصبہ یعنی سرایا ہے، ان کو رسول کے حکم کے سوا نکلنا نہ چاہیے، پھر جب لشکر لوٹ کر آئے اور اس کے بعد نبی اکرم ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے تو جو لوگ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بیٹھ رہے تھے وہ اس قرآن کو سیکھ لیں اور کہیں کہ اللہ نے تمھارے نبی پر جو قرآن اتارا ہے، ہم نے اس کو سیکھ لیا ہے، تب وہ لشکر ٹھہر کر اس وحی کو جو ان کے بعد نازل ہوئی ہے، سیکھ لیں اور ان کے بجائے دوسرا لشکر باہر جائے۔ یہ معنی ہیں: ﴿ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ ﴾ کے۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت کچھ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں اتری ہے، وہ جنگلوں میں نکل گئے تھے، انھوں نے لوگوں سے بھلائی پائی اور غلہ کی ارزانی سے منافع اٹھایا اور جو لوگ ان کو ملے ان کو ہدایت کی طرف بلایا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم نے اپنے اصحاب کو چھوڑ دیا اور تم ہمارے پاس آئے ہو، ان کو یہ بات دل میں بری لگی اور صحرا سے نکل کر نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے، اس پر اللہ نے یہ آیتِ باب بھیجی کہ کیوں نہ، ہر گروہ میں سے کچھ لوگ خیر کی تلاش میں نکل کر دین سیکھیں، تاکہ لوگوں کا حال سنیں اور جو اللہ نے اتارا ہے اس کو معلوم کریں، یعنی اللہ نے ان کو معذور رکھا اور جب اپنی قوم کے پاس پھر کر جائیں تو ان سب لوگوں کو ڈرائیں اور اللہ کا حکم سنائیں، شاید وہ ڈر جائیں اور راہِ ہدایت پر لگ جائیں۔[2]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری کہ نبی اکرم ﷺ نے لشکر روانہ کیے، اللہ نے حکم دیا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ جنگ کریں اور ایک گروہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رہے، دین کی باتیں سیکھے اور دوسرا گروہ جا کر اپنی قوم کو دعوت دے اور ان کو اللہ کے وقائع (عذاب) سے جو اگلوں پر، یعنی ان سے پہلے لوگوں پر گزرے، ڈرائے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب بنفسِ نفیس جنگ کرتے تو پھر کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں تھا کہ وہ آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑے، سوائے اس شخص کے جو عذر والا ہو اور جب نبی اکرم ﷺ خود مقیم رہتے اور فوج کو روانہ کرتے تو کسی کے لیے درست نہ تھا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی اجازت کے بغیر لڑنے کے لیے چلا جائے۔ پھر جب کوئی شخص جاتا اور اس کے بعد قرآن نازل ہوتا اور نبی اکرم ﷺ وہ وحی لوگوں کو سناتے جو آپ ﷺ کے ہمراہ بیٹھے ہوتے اور وہ لشکر لوٹ کر آتا تو وہ مقیم لوگ اس لشکر والوں سے کہتے کہ اللہ نے تمھارے جانے کے بعد تمھارے نبی پر قرآن اتارا اور ان کو دین کی بات سکھاتے اور قرآن پڑھاتے۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٦٧۔ ٥٦٨) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٦٦)

مطلب یہ ہوا کہ سارے مسلمانوں کو یک بارگی نہ نکلنا چاہیے کہ وہ سب کے سب چلے جائیں اور نبی اکرم ﷺ اسی جگہ بیٹھے رہیں اور مقیم رہیں، بلکہ جب آپ پیچھے رہیں اور لشکر روانہ ہو تو کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس موجود رہیں، تاکہ علم دین سیکھیں۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ جب نبی اکرم ﷺ نے مُضر پر قحط سالی کی بددعا کی اور ان کے شہروں میں خشک سالی ہوئی تو ان کے بعض قبیلے اپنی تکلیف کی وجہ سے مدینے میں آ گئے اور مسلمان بنے، حالانکہ وہ جھوٹے تھے، انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تنگ کیا اور مشقت میں ڈالا، اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو خبر دی کہ یہ مومن نہیں ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ان لوگوں کو واپس ان کے قبیلوں کی طرف بھیج دیا اور اپنی قوم کو ڈرایا کہ تم ان جیسا کام نہ کرنا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ہر قبیلۂ عرب کی ایک جماعت نبی اکرم ﷺ کے پاس آ کر دین کے بارے میں سوال کرتی اور اس معاملے کو سمجھتی بوجھتی اور نبی اکرم ﷺ سے کہتی کہ آپ ہم کو کیا حکم کرتے ہیں کہ ہم وہ کام کریں، ہم کو خبر دیں، تاکہ ہم اپنے قبیلوں میں واپس جا کر اسی بات کا حکم دیں۔ نبی اکرم ﷺ ان کو فرماتے کہ تم اللہ اور رسول کی اطاعت اختیار کرو اور اپنی قوم میں جا کر نماز اور زکات کا حکم پہنچاؤ، وہ کہتے جو مسلمان ہو گا، وہ ہم میں سے ہے۔ اس طرح ان کو ڈراتے، یہاں تک کہ آدمی اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیتا اور نبی اکرم ﷺ ان کو ڈراتے اور وہ اپنی قوم کو ڈراتے، اور اسلام کی طرف بلاتے اور دوزخ کا خوف دلاتے اور جنت کی خوش خبری سناتے۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴾ [التوبة: ٣٩] ”اگر تم نہیں نکلو گے تو وہ (اللہ) تمھیں دردناک عذاب دے گا۔“ اور ﴿ مَا كَانَ لِاَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ ... ﴾ [التوبة: ١٢٠] ”اہلِ مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے ....“ منافقوں نے کہا کہ اہلِ بدو ہلاک ہوئے، جنھوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نہ دیا اور آپ کے ساتھ کوچ نہ کیا۔ کچھ لوگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اپنی بستیوں کی طرف نکل گئے تھے، وہ اپنی قوم کو دین سکھاتے تھے، اس پر یہ آیتِ باب اتری اور دوسری یہ آیت بھی اتری: ﴿ وَالَّذِيۡنَ يُحَآجُّوۡنَ فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِيۡبَ لَهٗ حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ﴾ [الشوریٰ: ١٦] ”اور جو لوگ اللہ کے بارے میں، اس کو تسلیم کر لیے جانے کے بعد، جھگڑا کرتے ہیں، ان کی دلیل ان کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور ان پر (اللہ کا) غضب ہے اور ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے۔“ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو نکلے ہیں، وہ اس بات میں غور و فکر کریں جو اللہ نے ان کو مشرکین پر غلبہ اور بالا دستی عطا کی، اور اپنی مدد دکھائی اور لوٹ کر اپنی قوم کو ڈرائیں۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٦٨) [2] تفسیر الطبري (١٤/ ٥٦٩_ ٥٧١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اس آیت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت بقیہٗ احکامِ جہاد ہے۔ اللہ نے جب جہاد کے معاملے میں مبالغہ کیا اور جنگ کی طرف بلایا تو لشکر کی روانگی کے وقت سارے مسلمان کوچ کرتے، مدینے کو خالی چھوڑ جاتے۔ اللہ نے فرمایا، یہ کچھ بات نہیں ہے۔ ایک گروہ جنگ کے لیے نکلے تو دوسرا گروہ علم حاصل کرنے کے لیے اسی جگہ ٹھہرا رہے اور غازیوں کو تعلیم دے، جب وہ غزوے سے لوٹ کر آئیں یا جس جگہ علم حاصل ہوتا ہو، وہاں جا کر علمِ دین حاصل کریں، پھر اپنی قوم کو ڈرائیں، یعنی علم حاصل کرنے والے کا مقصد استقامت اور تبلیغِ شریعت ہو، نہ کہ بندوں پر بڑائی جتلانے کے لیے یا شہروں کی سیر وتفریح کے لیے علم حاصل کرے، جس طرح کہ عام لوگوں کی عادت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت بقیہ احکامِ جہاد سے نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل حکم ہے علم حاصل کرنے کی خاطر نکلنے کے لیے مشروع ہونے پر کہ گھر سے دین کا علم سیکھنے کے لیے باہر نکلیں۔ اللہ نے اس حکم کو جہاد کے لیے نکلنے کے حکم کے ساتھ ذکر کیا ہے، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ سفر دو طرح کا ہوتا ہے، ایک سفرِ جہاد، دوسرا سفرِ طلبِ علم۔ اس میں شک نہیں ہے، طلبِ علم کے لیے نکلنے کا حکم اس صورت میں ہے کہ طالبِ علم کو کوئی معلم اپنے شہر یا علاقے میں نہ مل سکے، یعنی سفر کے بغیر چارہ نہ ہو۔

فقہ سے مراد احکامِ شریعت کا علم ہے اور وسائل کو اس جگہ مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے، جیسے: علمِ صرف، نحو، لغت، بیان اور اصول وغیرہ کا علم سیکھنا۔ اللہ نے اس سے یہ غرض رکھی ہے کہ دین میں جو سمجھ بوجھ آئے تو یہ اس شخص کو جو ناسمجھ ہو، اس کو ڈرائے۔ یہ دو مقصد صالح اور مطلب صحیح ہو، یعنی ایک علم حاصل کرنا اور دوسرے تعلیم دینا۔ اب اگر کسی کی غرض طلبِ علم سے ان مقاصد کے سوا کچھ اور ہو گی تو وہ طلبِ دنیا کی غرض رکھنے والا ٹھہرے گا نہ کہ دین کی غرض رکھنے والا۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ خبرِ آحاد حجت ہیں، کیونکہ ہر فرقے کا عموم اس بات کا مقتضی ہے کہ کسی گاؤں میں ہر تین میں سے ایک شخص کو علم حاصل کرنے اور لوگوں کو ڈرانے کی غرض سے باہر نکلنا چاہیے، سو اگر سوائے اخبارِ متواتر کے اور کوئی خبر معتبر نہ ہوتی تو یہ افادہ کیوں کیا جاتا۔[1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب و جوار میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے (123)

---

[1] فتح البیان (٥/ ٤٢٤۔ ٤٢٦)

درجہ بہ درجہ قرب و جوار کے کافروں سے قتال اور سختی کرنے کا حکم:

سختی، یعنی قوتِ جنگ یا معاملت میں بے رخی۔ پس کافر سے اُلفت اور ملائمت نہ کریں، مگر جب دیکھے کہ دین کی طرف راغب ہے۔ اس آیت میں مومنین کو اللہ نے کافروں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اولاً فاولاً، الاقرب فالاقرب، یعنی جو کافر حوزۂ اسلام (گرد و نواح) سے نزدیک ہیں، پہلے ان سے لڑو، پھر ان سے جو دور ہیں۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے جنگ کی ابتدا جزیرۂ عرب کے مشرکین سے کی ہے، جب ان سے فارغ ہوئے اور اللہ نے مکہ، مدینہ، طائف، یمن، یمامہ، ہجر، خیبر اور حضر موت وغیر ذلک آپ پر مفتوح کیے اور اقالیم جزیرۂ عرب قبضے میں آئے اور تمام عرب قبائل میں سے لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوئے تو پھر اہلِ کتاب سے جنگ شروع کی اور غزوۂ روم کے لیے تیاری کی، کیونکہ وہ لوگ جزیرۂ عرب سے نزدیک اور ان لوگوں سے دعوتِ اسلام کے لحاظ سے قریب اور اولیٰ تر تھے، اس لیے کہ اہلِ کتاب تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ تبوک پر پہنچ کر لوگوں کی تکلیف اور قحط سالی اور لوگوں کی زبوں حالی کی وجہ سے سنہ نو ہجری میں واپس آئے اور دسویں سال میں حجۃ الوداع میں مشغول ہوئے۔ اتنے میں حج کیا اور اکاسی (۸۱) روز کے بعد انتقال فرمایا، اللہ نے آپ ﷺ کو اپنے پاس بلا لیا۔

آپ ﷺ کی جگہ آپ کے وزیر و صدیق خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے سربراہ بنے، ایسا لگتا تھا کہ دین سست پڑ جائے گا، اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ثابت قدم رکھا، ان کی وجہ سے اسلام سے پھر جانے والے پھر اسلام لے آئے۔ دعائمِ ایمان قائم رہے، قواعد احسان جم گئے۔ جنھوں نے زکات نہ دی تھی ان سے زکات لی، جو حق کو نہ جانتا تھا، اس نے حق کو پہچان لیا اور خوب ہی خلافت کا حق ادا کیا۔ پھر اسلام کے لشکروں کو روم اور صلیب پرستوں اور پارسیوں اور آتش پرستوں پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کرانے میں مشغول ہوئے۔ اللہ نے ان کی سفارت کی برکت سے بہت سے شہر مفتوح کیے اور کسریٰ اور قیصر کے ناک خاک آلودہ کر دیے اور ان کے مطیعوں کو ذلیل و خوار کر ڈالا، ان کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیے، جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی تھی۔

پھر اس امر کو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصی اور ولی عہد، یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مکمل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے کفار ملحدین کو خوب ہی خاک میں ملایا اور سرکش منافقین کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ یہ اکثر ممالک پر مشرق و مغرب میں قابض ہو گئے اور تمام سلطنتوں کے خزانے دور اور نزدیک سے لا کر ان کے پاس آئے۔ انھوں نے ان اموال کو شرعی طریقے سے اور اللہ کی مرضی کے مطابق تقسیم کیا۔

پھر جب وہ شہید ہو کر فوت ہوئے تو صحابہ مہاجرین اور انصار نے سیدنا امیر المومنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع کیا۔ یہ شہید الدار (اپنے گھر میں شہید ہونے والے) تھے، انھوں نے اسلام کو ایک عمدہ اور مکمل لباس

پہنایا اور دین کی دعوت تمام اقالیم میں اللہ کے بندوں کے پاس پہنچ گئی اور اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو گئی، زمین کے مشرق و مغرب میں اسلام ظاہر اور غالب ہو گیا، اللہ کا بول بالا ہوا، دینِ حق نے غلبہ پایا اور ملتِ حنیفیہ اسلامیہ اللہ کے دشمنوں کو مغلوب کرتی ہوئی اپنے آخری مقصد تک پہنچ گئی اور جس ملت اور قوم پر غلبہ حاصل ہوا، اس سے دوسری ملت اور قوم کی طرف جاتے رہے اور ایک کے بعد دوسرے علاقے کے فاسق و فاجر سرکشوں کی خبر لیتے رہے۔ یہ اللہ واحد جبار کے حکم کی بجا آوری تھی کہ اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑتے جاؤ جو تمھارے نزدیک ہوں۔

پھر اسی آیت میں یہ حکم بھی دیا کہ وہ کفار جن سے تم جنگ کرو، وہ تم میں سختی و درشتی پائیں، کیونکہ مومن کامل وہی شخص ہوتا ہے جو اپنے برادر مسلمان کے ساتھ رفیق اور نرم دل ہو اور اپنے دشمن کافر پر بے رحم اور سخت مزاج ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [المائدة: ٥٤] ''تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرتا ہوگا، اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، وہ مومنوں پر نرمی کرنے والے ہوں گے اور کافروں پر سختی کرنے والے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ٢٩] ''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ [التوبة: ٧٣، التحريم: ٩] ''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے۔'' اور حدیث شریف میں آیا ہے: «أَنَا الضَّحُوكُ الْقَتَّالُ»[1] یعنی میں دوست کے منہ پر خندہ پیشانی کرنے والا، دشمن کا سر توڑنے والا ہوں۔

پھر فرمایا کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے، یعنی تم کافروں کے ساتھ جنگ کرتے وقت اللہ پر توکل کرو اور جان لو کہ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے اور اس کی اطاعت کرو گے تو اللہ تمھارے ساتھ ہے، غرض کہ قرونِ ثلاثہ جو بہترین امت تھے، وہ انتہا درجے کی استقامت اور اطاعتِ الٰہی کے قیام میں رہے اور ہمیشہ دشمنوں پر غالب آئے، فتوحاتِ اسلام روز افزوں رہیں اور دشمن ہمیشہ ذلیل و خوار اور خسارے میں رہے۔ وللہ الحمد والمنة.

پھر جب فتنوں کا دروازہ کھلا، ملوک کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے، دشمنوں نے چاروں طرف سے قدم بڑھایا، بادشاہ ایک دوسرے سے مشغول تھے، کسی نے ان کو روکا ٹوکا نہیں، یہاں تک کہ اسلام کے قرب و جوار میں پیش قدمی کر کے بہت سے شہروں کے کناروں پر قبضہ کر لیا، پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اکثر اسلامی شہروں پر غالب ہوئے۔ وَلِلّٰهِ سُبْحَانَهُ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ. پھر جب کبھی کوئی بادشاہِ اسلام قائم ہوا اور اس نے امرِ الٰہی کی اطاعت اختیار کی تو اللہ نے اس پر بلاد مفتوح کیے اور اس نے اپنی طاعت اور اللہ کی ولایت کے مطابق دشمنوں کے

[1] تاريخ الإسلام للذهبي (١/ ٤٨٧) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٢٦)

ہاتھ سے اپنا ملک واپس حاصل کرلیا۔ وَاللّٰهُ الْمَسْئُوْلُ الْمَامُوْلُ أَنْ يُّمَكِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ نَوَاصِيْ الْأَعْدَآءِ الْكَافِرِيْنَ وَأَنْ يُّعْلِيَ كَلِمَتَهُمْ فِيْ سَآئِرِ الْأَقَالِيْمِ إِنَّهُ كَرِيْمٌ جَوَّادٌ" انتہیٰ کلام ابن کثیر رحمہ اللہ۔[1]

انھوں نے اس جگہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے عہد کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ان کے عہدِ خلافت میں فتنوں کی وجہ سے کچھ فتوحات زیادہ نہیں ہوئیں، لیکن قرونِ ثلاثہ میں وہ داخل اور شامل ہیں، انھی کے آخر عہد تک اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے چھے مہینوں کے زمانے تک دورِ خلافتِ نبویہ ختم ہو گیا، پھر اسلام میں ملوک اور سلطان ہونے لگے، گو عموماً لوگ ان کو خلیفہ کہتے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اس زمانے میں آئے جو قیامتِ کبریٰ کا ہم دوش ہے اور ہم نے اسلامی حکومت کا عہد نہ پایا، بلکہ اسلام کا فقط نام ونشان سنا، دگر ہیچ وَ كَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا. ربِ معبود سے ہماری دعا یہی ہے کہ ہم کو ایمان پر موت دے اور اس زرق برق دنیا کو ہمارے لیے دین و آخرت میں رکاوٹ نہ بنائے۔ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ أَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ پاک نے ایمان داروں کو ارشاد کیا کہ تم اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کافروں کی بستیوں اور شہروں میں اور ان کے خاندانوں میں جنگ کرو، جیسے: قریظہ، نضیر، خیبر اور اس جیسے دوسرے علاقے ہیں۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کے پاس کے کفار مراد ہیں، کیونکہ وہ شام میں سکونت پذیر تھے اور شام مدینے سے نزدیک تر ہے، عراق کی نسبت۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد دیلم ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب ہیں، ان سے یہاں تک وہ لڑے کہ فارغ ہو گئے۔ پھر اہلِ کتاب سے جنگ کرنے کا حکم دیا کہ ان سے جہاد کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں یا ذلیل ہو کر جزیہ ہاتھ سے دیں۔[2]

یہی امر ہر اہلِ ناحیہ پر فرض ہے کہ اپنے قریب کے کافروں سے پہلے لڑیں اور سختی اور درشتی کے ساتھ جنگ کریں، یعنی وہ تم کو شجاع، بہادر اور مضبوط پائیں۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ غلظت جرأت اور صبر علی القتال اور شدتِ عداوت اور قتل و گرفتاری میں غیرت کا جامع ہے۔[3] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ان سے جہاد کرنے پر صبر کرنا ہے[4] اور جہاد سارے کفار سے کرنا واجب ہے، اگرچہ ابتدا ان سے کرے جو نزدیک ہوں، جنگ میں انھی کو پہلا نشانہ بنائے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ یہ آیت سارے مشرکین سے جنگ کرنے کے حکم سے پہلے اتری ہے۔

جب یہ فرمایا کہ ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ تو یہ آیت ناسخ ہوئی آیتِ باب کی، لیکن محققین اہلِ علم نے

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٢٥۔ ٥٢٦)
[2] تفسير الخازن (٣/ ١٦٩)
[3] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي للخفاجي (٤/ ٣٧٨)
[4] تفسير البغوي (٤/ ١١٤)

کہا ہے کہ منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ نے سب سے لڑنے کا حکم دیا، پھر جو طریقہ سب سے اچھا اور بہتر تھا، وہ بتا دیا کہ آپ آس پاس کے لوگوں سے لڑتے جاؤ، پھر دور دور تک پہنچنا۔ اس سے وہ مقصد کہ تمام مشرکین سے جنگ کرو، حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ ایک ہی بار میں سب سے جنگ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے پہلے اپنی قوم سے قتال کیا، پھر سارے عرب سے، پھر اہلِ کتاب سے، یعنی قریظہ، نضیر، خیبر، فدک والوں سے، پھر روم اور شام سے۔ یہ فتح زمانۂ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوئی۔ پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عراق پر چڑھائی کی، پھر تمام اطراف پر، کیونکہ نزدیک والے سے جب پہلے جنگ ہوگی اور ان کی غنیمتیں اور مال ہاتھ آئیں گے تو بعد والوں پر قوت حاصل ہوگی۔ پھر اللہ نے مجاہدین کے عزم کو تقویت دینے کے لیے کہا کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے، سو جس کے ساتھ اللہ ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔[1]

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو (طنزاً) کہتے ہیں: تم میں سے کس کو اس (سورت) نے ایمان میں زیادہ کیا ہے؟ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں (124) لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) پلیدی پر مزید پلیدی کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے (125)

قرآن سے مومن کا ایمان بڑھتا ہے اور منافق کی خباثت اور شک میں اضافہ ہوتا ہے:

اللہ کا کلام جس مسلمان کے دل کے خیال کے موافق پڑتا، وہ کہتا مجھ کو اس نے ایمان میں زیادہ کیا، یہی لفظ بولتے منافق جب ان کے چھپے عیب بیان کرتا، لیکن مسلمان کہتے خوشی سے اور منافق کہتے شرمندگی سے، پھر بھی سچی بات نہ کہتے، وہ چاہتے کہ اپنا عیب پہلے سے بھی زیادہ چھپائیں، یہی گندگی پر گندگی ہے۔ عیب والے کو لازمی ہے کہ نصیحت سن کر چھوڑ دے، نہ یہ کہ اس ناصح سے چھپانے لگے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ایمان بڑھتا گھٹتا ہے، جس طرح پر کہ اکثر ائمہ علما سے سلف و خلف کا بھی مذہب ہے، بلکہ کئی ایک نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ وَقَدْ بُسِطَ

[1] فتح البیان (٥/ ٤٢٦۔ ٤٢٧)

الْكَلَامُ عَلٰى هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ فِيْ أَوَّلِ شَرْحِ الْبُخَارِيِّ رَحِمَهُ اللهُ.

رجس سے مراد شک ہے، یعنی جن کے دل میں روگ ہے، ان کو شک پر شک پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' یہ من جملہ ان کی بدبختی کے ہے کہ جس چیز سے دل راہ یاب ہوں، وہ ان کی گمراہی اور ہلاکت کا سبب ہو، جس طرح کہ فاسد مزاج کے لیے کوئی اچھی غذا اس کی خرابی ونقصان وضرر اور مرض کے بڑھ جانے کا سبب ہوتی ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اس آیت میں منافقین کی باقی فضیحتوں کا ذکر کیا کہ یہ لوگ سورت نازل ہونے پر مومنوں سے استہزا کرتے ہیں کہ کہو تم میں سے کس کا ایمان بڑھا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان کو اسلام سے پھیر دیں اور دین میں بے رغبت کر دیں، سو ایمان دار تو سورت کے اترنے پر خوش ہوتے ہیں، کیونکہ اس میں ان کو دنیا اور آخرت کے منافع حاصل ہوتے ہیں، لیکن جن کے دل میں شک اور نفاق کی بیماری ہے ان کی خباثت پر اور خباثت بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسی حالتِ کفر میں مر جاتے ہیں۔[2] عياذا بالله منه.

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

کیا وہ (مومن) نہیں دیکھتے کہ بے شک وہ (منافق) ہر سال ایک یا دو بار فتنے میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں (126) اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی (مسلمان) تمھیں دیکھ تو نہیں رہا، پھر (چپکے سے) کھسک جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے، اس لیے کہ بے شک وہ لوگ سمجھتے نہیں (127)

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٢٧) [2] فتح البيان (٥/ ٤٢٨)

منافقوں کی آزمائش:

یعنی اللہ کے کلام میں جہاں منافقوں کے عیب آئے، وہ آپس میں دیکھتے ہیں کہ مجلس میں کسی نے ہم کو پرکھا نہ ہو، پھر جلدی سے اٹھ جاتے ہیں۔ اللہ نے کہا یہ منافق باوجود اس بات کے کہ سال میں ایک یا دو بار آزمائش میں آتے ہیں، توبہ نہیں کرتے اور نہ آیندہ کا بندوبست کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آزمائش سے مراد قحط سالی وگرسنگی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد سال میں ایک بار یا دو بار جنگ کرنا ہے۔[1] سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم ہر سال میں ان کے ایک یا دو جھوٹ سنتے، اس پر بہت سے لوگ گمراہ ہو جاتے۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے: «لَا يَزْدَادُ الْأَمْرُ إِلَّا شِدَّةً، وَلَا يَزْدَادُ النَّاسُ إِلَّا شُحًّا، وَمَا مِنْ عَامٍ إِلَّا وَالَّذِي بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ، سَمِعْتُهُ مِنْ نَبِيِّكُمْ ﷺ» (رواه ابن جرير)[3]

قرآن سے بدکتے ہیں:

پھر اللہ نے کہا کہ یہ منافق سورت اترنے کے وقت پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ یہ حال ان کا اس دنیا میں ہے کہ حق کے نزدیک ان سے ٹھہرا نہیں جاتا، قبول کرنا اور سمجھنا تو دور کی بات ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ [المدثر: ٤٩۔ ٥١] ''پھر انھیں کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں؟ جیسے وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں۔ جو شیر سے بھاگے ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ﴾ [المعارج: ٣٦۔٣٧] ''پھر (اے نبی!) کافروں کو کیا ہوا ہے کہ آپ کی طرف دوڑے آرہے ہیں؟ دائیں سے اور بائیں سے گروہ کے گروہ۔'' یعنی ان لوگوں پر کیا افتاد آن پڑی ہے کہ یہ تیرے پاس سے دائیں بائیں حق سے بھاگ کر باطل کی طرف جاتے ہیں۔ یہ ارشاد کہ پھر وہ چلے گئے، اللہ نے ان کے دل پھیر دیے، اللہ کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [الصف: ٥] ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' یعنی یہ لوگ اللہ کی بات نہیں سمجھتے نہ اس کے خطاب کو سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ وہ اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کرتے، بلکہ نفرت کرتے ہیں، لہٰذا ان کا جو انجام ہوا وہ ہوا۔

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٥٨٠)

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٥٨١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مسلم بن صبیح ابو الضحیٰ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے، نیز سند میں ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔

[3] اس کا پہلا جملہ «لا يزداد ... شحا» سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٣٩) میں مروی ہے۔ اس کی سند میں ''محمد بن خالد جندی'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٧٧) البتہ دوسرا جملہ صحیح بخاری (رقم الحديث (٦٦٥٧) میں مروی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ فتنہ سے مراد امتحان ہے۔ (قاله ابن جرير) امتحان سے مراد قحط اور تکلیف کی شدت ہے۔[1] (قاله مجاهد) امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بیماریاں اور تکالیف ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ جہاد کی جنگ ہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دشمن کے ساتھ جنگ ہے۔[3] ان کے نفاق کی وجہ سے۔ یہ رسوائی ہر سال میں ایک دو بار ہوتی ہے، یعنی منافق ہو کر ایمان لاتے ہیں، پھر منافق ہو جاتے ہیں۔ یا ہر سال میں ایک دو بار عہد شکنی کرتے ہیں اور اللہ کا نصرت کا وعدہ دیکھ کر نفاق سے توبہ نہیں کرتے۔ حالانکہ آزمائش کا تقاضا ہوتا ہے کہ رجوع کیا جائے اور نصیحت و عبرت حاصل کی جائے، مگر یہ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ یہ اللہ کا اہلِ نفاق کے حال پر تعجب کرنا ہے کہ وہ اپنے نفاق میں کتنے پکے ہیں اور انھوں نے اپنی نظروں اور عبرت پکڑنے کی صلاحیت کو بے کار کر رکھا ہے۔

پھر ان کی ایک اور حالت کا ذکر کیا کہ سورت اترنے پر ایک دوسرے کی طرف نظریں چرا کر دیکھتے ہیں، یہ انکار اور استہزا کے طور پر یا غصے کے طور پر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سورت میں ان کے عیبوں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ لفظ "نَظَرَ" اس جگہ "قَالَ" کے بجائے ہے، یعنی کیا کسی مسلمان نے تم کو دیکھا تو نہیں کہ تم نے آنکھ سے کیا اشارہ کیا، تو ہم اس جگہ سے چل دیں، اس لیے کہ ہم کو ہرگز اس کے سننے کی تاب نہیں ہے یا پھر ہم طعن و استہزا اور مذاق سے پیش آئیں گے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کی مجلس سے اٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے، سو اللہ نے ان کے دل ہدایت سے پھیر دیے، وہ کب راہ پر آنے والے ہیں، ان کو کچھ خاص سمجھ بوجھ نہیں ہے۔[4]

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے ﴿128﴾

بعثتِ رسول... امت پر احسان:

یعنی چاہتا ہے کہ میری امت زیادہ ہوتی رہے۔ اللہ پاک نے مومنوں پر احسان رکھا کہ ہم نے رسول بھی بھیجا تو تمھاری ہی جنس کا اور تمھاری زبان پر جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [البقرة: ۱۲۹]

---

[1] تفسير الطبري (١٤/ ٥٧٩_ ٥٨٠)
[2] تفسير القرطبي (٨/ ٢٩٩)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩١٥)
[4] فتح البيان (٥/ ٤٢٩_ ٤٣٠)

''اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انہی میں سے ایک رسول بھیج۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [آل عمران: ١٦٤] ''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔'' اور یہاں کہا: ''مِنْ أَنْفُسِكُمْ، أَيْ مِنْكُمْ وَبِلُغَتِكُمْ''

سیدنا جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی سے اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کسریٰ سے کہا تھا: ''إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ فِيْنَا رَسُوْلًا مِنَّا نَعْرِفُ نَسَبَهُ وَصِفَتَهُ وَمَدْخَلَهُ وَمَخْرَجَهُ وَصِدْقَهُ وَأَمَانَتَهُ''[1] محمد باقر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ﴿ اَنْفُسِكُمْ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ ولادتِ جاہلیت سے کوئی چیز ان کو نہیں پہنچی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « خَرَجْتُ مِنْ نِّكَاحٍ وَلَمْ أَخْرُجْ مِنْ سِفَاحٍ » یعنی میں نکاح سے پیدا ہوا ہوں، حرام سے پیدا نہیں ہوا۔[2] یہ حدیث موصولاً بھی آئی ہے۔ اس میں اتنا اور ہے: « مِنْ لَّدُنْ آدَمَ إِلٰى أَنْ وَلَدَنِيْ أَبِيْ وَأُمِّيْ لَمْ يَمْسَسْنِيْ مِنْ سِفَاحِ الْجَاهِلِيَّةِ شَيْءٌ »[3] (رواه الحافظ أبو محمد الحسن الرامهرمزي في كتابه الفاصل بين الراوي والواعي)

پھر اللہ نے فرمایا کہ جو چیز امت کو محنت میں ڈالے اور ان پر شاق ہو وہ رسول پر بھاری گزرتی ہے، اسی لیے حدیث میں آیا ہے: « بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ »[4] اور صحیح میں آیا ہے: « إِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ »[5] سو ساری شریعتِ اسلام آسان اور مضبوط اور کامل ہے، جس پر اللہ تعالیٰ آسان کرے۔

پھر کہا کہ پیغمبر دنیا اور آخرت میں تمھاری نفع رسانی کی حرص رکھتے ہیں۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ''تَرَكَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا طَائِرٌ يُّقَلِّبُ جَنَاحَيْهِ فِي الْهَوَاءِ إِلَّا وَهُوَ يُذَكِّرُ لَنَا مِنْهُ عِلْمًا'' پھر کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: « مَا لَقِيَ شَيْءٌ يُّقَرِّبُ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُ مِنَ النَّارِ إِلَّا وَقَدْ بَيَّنَ لَكُمْ »[6] (رواه الطبراني) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ حُرْمَةً إِلَّا وَقَدْ عَلِمَ أَنَّهُ سَيُطْلِعُهَا مِنْكُمْ مُطَّلِعًا أَلَا وَإِنِّيْ آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ أَنْ تَهَافَتُوْا فِي النَّارِ كَتَهَافُتِ الْفَرَاشِ وَالذُّبَابِ »[7] (رواه أحمد)

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٠١) مستدرك الحاكم (٣/ ٥١٠) ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ سیدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے ہم معنی روایت مروی ہے، نیز پہلی روایت حسن اور دوسری روایت صحیح ہے۔

[2] تفسير الطبري (١٤/ ٥٨٥) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] المعجم الأوسط (٥/ ٨٠) المحدث الفاصل بين الراوي والواعي (١/ ٤٧٠) یہ روایت حسن ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (٦/ ٣٢٩)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٦٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٢٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٣٤)

[6] المعجم الكبير (٢/ ١٥٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٠٣)

[7] مسند أحمد (١/ ٣٩٠) اس کی سند میں ''مسعودی'' مختلط راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠٨٢) البتہ اس کا دوسرا جملہ « ألا وإني ... » صحيح البخاري (رقم الحديث: ٦١١٨) صحيح مسلم (رقم الحديث: ٢٢٨٤) میں مروی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری مرفوع روایت امام احمد رحمہ اللہ نے یوں بیان کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے پاس خواب میں دو فرشتے آئے، ایک میرے پاؤں کے پاس بیٹھا اور دوسرا میرے سر کے پاس۔ جو میرے پاؤں کے پاس تھا، اس نے اس سے جو میرے سر کے قریب تھا، کہا کہ اس شخص کی اور اس کی امت کی مثال بیان کرو۔ اس نے کہا کہ اس کی اور اس کی امت کی کہاوت ایسی ہے جیسے ایک قوم مسافر ہو اور کسی جنگل کے کنارے پر جا لگے اور ان کے پاس کچھ زادِ راہ نہ ہو جس کے سبب اس جنگل سے پار ہوں اور نہ اتنا ہو کہ واپس آئیں، اتنے میں ایک مرد عمدہ حلہ (لباس) پہنے ہوئے ان کے پاس آیا اور کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تم کو سرسبز باغوں اور لبریز حوضوں پر لے چلوں تو تم میری تابع داری کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہاں، وہ ان کو لے کر ریاض معشبہ و حیاض رُواء پر پہنچا، انھوں نے وہاں کھایا، پیا، موٹے ہو گئے۔ کہا: کیا میں نے تم کو اس حال پر نہیں پہنچایا؟ تم نے کہا تھا کہ اگر تُو ہم کو گلستانِ سبز اور حوضِ لبریز پر لے جائے گا تو ہم تیری تابع داری کریں گے؟ انھوں نے کہا: ہاں، اس نے کہا: تمھارے سامنے ایسے باغات ہیں جو ان باغوں سے بھی زیادہ سرسبز ہیں اور ایسے حوض ہیں جو ان حوضوں سے بھی زیادہ بھرے ہوئے ہیں، سو تم میری پیروی کرو۔ ایک گروہ نے کہا: واللہ! اس نے سچ کہا، ہم اس کی پیروی کریں گے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ ہم کو تو یہی جگہ پسند آ گئی ہے، ہم اسی جگہ رہیں گے۔[1]

مومن کے لیے مہربان:

یہ آیت ﴿ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴾[الشعراء: ٢١٥۔ ٢١٧] ''اور جو مومنوں میں سے آپ کی اتباع کریں، ان کے لیے اپنے (مشفقانہ) بازو جھکائے رکھیں۔ پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجیے: بلاشبہ تم جو کچھ کر رہے ہو، میں اِس سے بَری ہوں۔ اور آپ (اللہ) غالب (اور) مہربان پر توکل رکھیں۔'' اسی طرح اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیتِ کریمہ میں حکم فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ﴾[التوبة: ١٢٩] ''پھر بھی اگر وہ پھریں تو کہہ دیجیے: مجھے اللہ کافی ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ آیتِ باب میں جمہور مفسرین کے نزدیک عرب کو خطاب ہے اور امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے عالم کو خطاب ہے[2] کہ تمھارے پاس ایسا رسول آیا ہے جو بہت بلند شان اور مقام والا اور منبع البرہان ہے اور تمھاری جنس کا عربی قرشی اولادِ اسماعیل علیہ السلام سے ہے، جس کے حسب ونسب کو تم اچھی طرح جانتے

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٧) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔
[2] فتح القدير (٢/ ٥٩٠)

پہچانتے ہو۔ وہ نہ عجم سے ہے نہ جنوں اور ملائکہ سے ہے، بلکہ نوعِ بشر سے ہے اور بعض نے لفظ اَنْفُسُ کو نفاست سے پڑھا ہے، مراد شرافت، فضیلت اور کرامت ہے، یعنی وہ اشرف و افضل و اکرم بنی آدم اور تمام جہانوں کا ہے۔ عَنَت کہتے ہیں تَعَبُ کو، یعنی اس کو دنیا میں تمھاری تکلیف اور مشقت جو تلوار یا اس جیسی کسی چیز سے پہنچے اور آخرت میں عذابِ نار بہت شاق ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم یہاں اور وہاں کسی مصیبت اور بلا میں گرفتار ہو رہو، بلکہ اس سبب سے کہ وہ من جملہ تمھاری جنس سے ہے، تمھارا بھلا چاہنے والا ہے، اس کو تمھاری خاطر یہ حرص ہے کہ تم آگ میں نہ پڑو یا تمھارے ایمان لانے کی تلاش میں ہے، لیکن پہلا مطلب زیادہ بہتر ہے۔[1] (قاله الفراء)

اللہ نے اس جگہ اپنے اسمائے حسنیٰ میں سے نبی اکرم ﷺ کا نام ﴿ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ رکھا۔ ایسے دو ناموں کو اور کسی پیغمبر کے لیے اکٹھا نہیں کیا، مگر صرف آپ کے لیے کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ عرب میں کوئی ایسا قبیلہ نہیں ہے۔ مُضر یَا رَبِيع یَا يَمَانِي جس میں نبی اکرم ﷺ کا رشتۂ ولادت نہ ہو۔[2] اس بنا پر عرب کو ترغیب دینا مقصود ہے کہ وہ آپ ﷺ کی مدد کریں اور آپ پر ایمان لائیں، کیونکہ ان کا شرف و عزت اور فخر نبی اکرم ﷺ کے شرف و فخر و عزت سے ہی مکمل ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ اپنے حسب، نسب، خاندانی کرامت اور سسرالی رشتے میں ان سب سے زیادہ نفیس تھے۔ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى مِنْ وَلَدِ إِبْرَاهِيْمَ إِسْمَاعِيْلَ، وَاصْطَفٰى مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيْلَ بَنِيْ كَنَانَةَ، وَاصْطَفٰى مِنْ بَنِيْ كَنَانَةَ قُرَيْشاً، وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِيْ هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِيْ مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ »[3] (رواه مسلم)

سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے جب خلق کو پیدا کیا تو مجھ کو خیرِ خلق میں سے ٹھہرایا، پھر جب ان کو جدا جدا کیا، مجھ کو بہتر فریق میں بنایا، پھر جب قبائل پیدا کیے، مجھ کو بہتر قبیلے میں پیدا کیا اور جب جانیں پیدا کیں تو مجھ کو خیر الفس ٹھہرایا، پھر جب خاندان بنائے تو مجھ کو بہترین خاندان میں کیا۔ « فَأَنَا خَيْرُهُمْ بَيْتاً وَخَيْرُهُمْ نَفْساً »[4] (رواه أحمد والترمذي وحسنه وابن مردويه وأبو نعيم والبيهقي) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: « بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ آدَمَ قَرْناً فَقَرْناً حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ »[5] (أخرجه البخاري و في الباب أحاديث) یہ حدیثیں اس بات پر دلیل ہیں کہ نبی اکرم ﷺ شرف و کرامت،

---

① معاني القرآن للفراء (٢/ ١٢٨) ② الدر المنثور (٤/ ٣٢٧)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٠٥)

④ مسند أحمد (١/ ٢١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٢) دلائل النبوة للبيهقي (١/ ١٦٧۔ ١٦٨) اس کی سند میں "یزید بن ابی زیاد" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٧٠٣) البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٦٤) فتح البيان (٥/ ٤٣١۔ ٤٣٢)

نسب وحسب میں نخبۃ النخبہ اور خلاصۃ الخلاصہ وصفوۃ الصفوہ اور خیر الخیرہ تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی اولاد قیامت تک اشرف بنی آدم اور نسب اور حسب کے لحاظ سے بہترین ہے۔ واللہ أعلم.

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝١٢٩

پھر بھی اگر وہ پھریں تو کہہ دیجیے: مجھے اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کا رب ہے (129)

اللہ ہی کافی ہے:

یعنی اگر وہ اس عظیم، پاک اور کامل شریعت سے، جس کو تو لایا ہے، روگرداں ہوں تو تو ان سے یہ کہہ دے کہ جو اس جگہ کہا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ [المزمل: ۹] ''اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے۔'' رب کے معنی ہیں ہر چیز کا مالک اور خالق۔ عرش کو عظیم اس لیے کہا ہے کہ عرش تمام مخلوقات کی چھت ہے اور جمیع خلائق، یعنی آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ عرش کے نیچے ہے، وہ سب قدرتِ الٰہی کے ماتحت اور زیر دست ہیں، اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز پر نافذ ہے، اس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

آخر میں نازل ہونے والی آیت:

سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آخری آیت جو قرآن مجید میں اتری وہ یہی آیت ہے: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ... الخ ﴾[1] (رواہ أحمد) ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں قرآن کو مصحف میں جمع کیا تو کچھ کاتب تھے اور سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان کو املا کرواتے تھے۔ جب سورت براءت کی اس آیت پر پہنچے: ﴿ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ... الآیۃ ﴾ تو گمان کیا کہ یہ قرآن کی آخری نازل شدہ آیت ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ آپ ﷺ نے مجھ کو اس کے بعد دو آیتیں پڑھائی ہیں: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ... الخ ﴾ سو قرآن میں جو سب سے آخر میں نازل ہوئیں وہ یہ آیتیں ہیں، جس سے شروع کیا تھا: "بِاللّٰهِ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَهُوَ قَوْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبیاء: ۲۵] اسی پر ختم کیا۔[2] (رواہ عبد اللہ بن الإمام أحمد وھذا غریب أیضا)

---

[1] مسند أحمد (۵/ ۱۱۷) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (۵/ ۱۳٤) اس کی سند میں ''ابوجعفر رازی'' متکلم فیہ راوی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حرث بن خزمہ آخر براءت میں سے یہ دو آیتیں لائے: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ ... الخ﴾ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس، عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تیرے ساتھ اس بات پر اور کون ہے، کہا: میں نہیں جانتا، واللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ان آیتوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور یاد کر لیا اور محفوظ رکھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، پھر کہا کہ اگر یہ تین آیتیں ہوتیں تو میں ان کو ایک الگ سورت کر دیتا۔ دیکھو کسی سورت کو قرآن میں سے، ان کو وہاں رکھو۔ چنانچہ انھوں نے سورت براءت کے آخر میں رکھا۔[1] (رواہ أحمد)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہی نے اشارہ دیا تھا کہ تم قرآن کو جمع کرو۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ زید رضی اللہ عنہ نے جمع کیا، عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس حاضر ہوتے، وہ قرآن لکھتے۔ صحیح میں آیا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے سورت براءت کی آخری آیات کو خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ یا ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس پایا۔[2] صحابہ کی ایک جماعت نے اس کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کیا تھا، جس طرح کہ خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا جب کہ اس سورت کو لکھنا شروع کیا۔ واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ عرش کو اس لیے عظیم کہا ہے کہ وہ أعظم مخلوقات ہے، یا رب کی عظیم صفت ہے۔ ابوبکر اصم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ قراءت بہت پیاری ہے، اس لیے کہ عظیم کو رب کی صفت ٹھہرایا ہے۔ یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ صفت عرش کی ٹھہرے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عرش کو اس کی بلندی کی وجہ سے عرش کہتے ہیں،[4] یعنی چھت اونچی ہوتی ہے، سو عرش ساری مخلوق سے اونچا اور سب کے اوپر ہے۔ عرش کی صفت اور اس کی شکل اور اس کے حجم کے بارے میں بہت احادیث آئی ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی کرسی۔[5] امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا: کرسی کہنا اس بنیاد پر ہے کہ عرش کرسی کے ساتھ ایک چیز ہے، لیکن یہ قول صحیح کے خلاف ہے، اس لیے کہ عرش کرسی کے علاوہ ہے۔

سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ یہ دونوں آیتیں سب سے آخر میں نازل ہوئیں[6] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث کے خلاف ہے، جس کو شیخین رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے کہ « إِنَّ آخِرَ آيَةٍ نَزَلَتْ: ﴿ يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ﴾ وَآخِرُ سُوْرَةٍ نَزَلَتْ بَرَاءَةٌ »[7] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: « آخِرُ آيَةٍ نَزَلَتْ

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٩٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عباد بن عبداللہ بن زبیر رحمہ اللہ نے اس واقعہ کو نہیں پایا ہے، نیز اس کے متن میں نکارت ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٠٢) [3] تفسیر الرازي (١٦/ ١٨٩)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩١٩) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ [5] تفسیر الجلالین (١/ ٢٦٤)

[6] اس کی تخریج زیر تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [7] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٠٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦١٨)

وَاتَّقُوا يَوْماً تُرْجَعُوْنَ فِيهِ إِلَى اللّٰهِ » اس آیت کے اترنے اور نبی اکرم ﷺ کے وفات پانے میں اسّی دن کا فاصلہ ہوا تھا[1] اور کسی نے کہا ہے کہ نو رات کا۔ بعض نے ارادہ کیا کہ ان روایات میں جمع کرنا چاہیے، لیکن وہ توفیق کدر (دھندلا پن) سے خالی نہیں۔ اس آیت کے بارے میں کتبِ حدیث میں اشکال مشہور ہے۔[2]

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی مراد یہ ہے کہ سورت براءت میں سب سے آخر یہ دونوں آیتیں اتری ہیں، قرآن سے مراد اس جگہ سورت براءت ہے، نہ کہ سارا قرآن اور احکام کے سلسلے میں آیۂ کلالہ سب کے بعد آئی اور قرآن کے آخری جملے کے اعتبار سے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ واللہ أعلم.

﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ﴾ پڑھنے کی فضیلت:

بہرحال براءت کی آخری آیت بڑی مبارک آیت ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ قَالَ إِذَا أَصْبَحَ وَإِذَا أَمْسٰى ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ سَبْعَ مَرَّاتٍ كَفَاهُ اللّٰهُ مَا أَهَمَّهُ» (رواه أبو داود وقد رواه ابن عساكر بلفظ ما من عبد يقول ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ ... الخ﴾ سَبْعَ مَرَّاتٍ صَادِقاً كَانَ بِهَا أَوْ كَاذِباً إِلَّا كَفَاهُ اللّٰهُ مَا أَهَمَّهُ» امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وَهٰذِهِ زِيَادَةٌ غَرِيبَةٌ ثُمَّ رَوَاهُ ابْنُ عَسَاكِرَ بِسَنَدِهِ فَرَفَعَهُ فَذَكَرَ مِثْلَهُ بِالزِّيَادَةِ، وَهٰذَا مُنْكَرٌ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ"[3]

میں کہتا ہوں: اس کو ابن السنی رحمہ اللہ نے بھی ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے[4] اور ابو داود کے نزدیک موقوفاً بھی آئی ہے، لیکن اس کو حکم رفع کا ہے۔ تحفۃ الذاکرین میں اس حدیث پر کچھ کلام نہیں کیا۔[5]

الحمد للہ تعالیٰ کہ آج دوشنبہ کے روز نہم ذوالحجہ یومِ عرفہ یہ تفسیر سورت براءت ۱۳۰۴ھ وقت نواخت یک ساعت روز ختم ہوئی۔ خَتَمَ اللّٰهُ لَنَا بِالْحُسْنٰى وَهُوَ حَسْبِيْ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. اس کے بعد تفسیر سورت یونس کی ان شاء اللہ تعالیٰ شروع ہوگی، تخمیناً یہ نو جز بائیس دن میں لکھے گئے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.



---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٧/ ١٣٧) اس کی سند میں "محمد بن سائب کلبی" ضعیف راوی ہے۔ [2] فتح البيان (٥/ ٤٣٣۔ ٤٣٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٨١) اس کا "صادقاً أو كاذباً" والی زیادتی کے بغیر موقوف ہونا صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٢٨٦)

[4] عمل اليوم والليلة لابن السني (٧١) [5] تحفة الذاكرين (١/ ١٠٦۔ ١٠٧)

سورت یونس

مکی مدنی کی بحث اور وجہ تسمیہ:

سورت یونس کی ایک سونو آیات ہیں، مکہ مکرمہ میں اتری۔ امام حسن، عطا، عکرمہ اور جابر رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مگر تین آیتیں: ﴿فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ ... الخ﴾ [یونس: ۹۴] امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر دو آیتیں یا تین۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: مگر یہ آیت: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ﴾ [یونس: ٤٠] ''اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اور آپ کا رب ان فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔'' کہ یہ آیت مدینے میں اتری ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ سورت کے شروع سے تقریباً چالیس آیات تک مکی ہیں، باقی مدنی ہیں، یہ امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1]

امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت بعد ہفتم کے ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ اللہ نے مجھ کو رائیات دیے ہیں، یعنی طواسین بجائے انجیل کے۔[2] (رواہ ابن مردویہ) امام احنف رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک صبح میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، انھوں نے سورت یونس اور سورت ہود کی تلاوت کی۔[3] امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سورت میں یونس علیہ السلام کا ذکر ہے اسی لیے اس کا نام سورت یونس ٹھہرا۔ مشہور بات یہی ہے کہ سورت کا نام اس کے بعض اجزا سے مقرر کر دیا گیا ہے۔[4] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس سورت کو مکی کہا ہے۔[5]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓرٰ ۣ ١

الٓرٰ۔

﴿الٓرٰ﴾ کی تفسیر:

جلال الدین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ ہی جانے کہ اس سے کیا مراد ہے۔[6] امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تمام

(1) تفسير القرطبي (٨/ ٣٠٤) (2) الدر المنثور (٤/ ٣٣٩) (3) مصنف ابن أبي شيبة (١/ ٣١٠)
(4) فتح البيان (٦/ ٧) (5) تفسير ابن كثير (٤/ ٢٤٥) الطبعة: دار طيبة. (6) تفسير الجلالين (١/ ٢٦٥)

اقوال میں سے ایک قول ہے مگر مکمل اور قابل تسلیم ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ "أنا اللّٰہ أری"۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے ابو اسحاق کو دیکھا کہ وہ اسی قول کی طرف مائل تھے، کیوں کہ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے عرب سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ امام حسن اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: "الٓر، قسم ہے" امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورت کا نام ہے۔[2] اس کے سوا اور بہت اقوال ہیں جو سراپائے تکلف ہیں، ٹھیک بات یہی ہے کہ اس کا علم اسی کو ہے جس کا یہ کلام ہے۔ مخلوق کو اس میں غور وخوض کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ حروفِ مقطعات کے معنی میں جو تکلف کیا گیا ہے اس سے دل کو بہت قلق ہے۔ قاریوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ الٓر آیت نہیں ہے اور طٰہٰ ایک آیت ہے۔ ابو عمرو دانی کہتے ہیں کہ طٰہٰ کو فقط کوفیوں نے آیت گنا ہے، شاید فرق یہ ہے کہ الٓر بعد والے مقاطع آیات کا ہم شکل نہیں ہے۔[3] واللّٰہ أعلم

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱

یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں ①

حکمت والی کتاب کی آیات:

یہ پکی کتاب کی آیتیں ہیں۔ اسمِ اشارہ بعید تعظیم کے لیے ہے یا مراد وہ آیات ہیں جو اس سورت سے پہلے ہیں۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد تورات وانجیل اور تمام پہلی کتابیں ہیں،[4] کیوں کہ ﴿تِلْكَ﴾ غائب مؤنث کی طرف اشارہ ہے یا بمعنی هذه ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد تورات وزبور ہے۔[5] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اس قول اور معنی کی کوئی وجہ نہیں پہچانتا۔[6] بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ آیتیں قرآنِ محکم مبین کی ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ بھی یہی ہیں کہ اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے، اس لیے کہ پہلی کتابوں کا ذکر نہیں ہوا اور حکیم قرآن کی صفت ہے۔ حکیم بمعنی محکم ہے اس لیے کہ یہ حلال وحرام اور حدود واحکام کو شامل ہے۔ ابو عبیدہ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے یا حکیم بمعنی حاکم ہے یا بمعنی محکوم یا بمعنی ذو حکمت۔[7]

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ

کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب (کی بات) ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرائیں۔

---

① فتح البیان (٦/ ٩) ② تفسیر القرطبي (٨/ ٣٠٤) ③ فتح البیان (٦/ ٩) ④ تفسیر الطبري (١٥/ ١١)
⑤ تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٢٢) ⑥ تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٣٠) ⑦ فتح البیان (٦/ ٩)

بشر کے رسول ہونے پر تعجب:

اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس تعجب کرنے پر کہ بشر میں سے رسول آئے، انکار کیا۔ جس طرح پہلی قوموں کے قول کی خبر دی ہے: ﴿ اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ﴾ [التغابن: ٦] ''کیا بشر ہمیں راہ دکھائیں گے؟'' اور ہود اور صالح علیہما السلام نے اپنی قوموں سے کہا تھا: ﴿ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ ﴾ [الأعراف: ٦٣] ''کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک ایسے آدمی کے ذریعے سے نصیحت آ گئی جو تم میں سے ہے؟'' اور اللہ نے کفارِ قریش کے متعلق خبر دی ہے کہ انھوں نے کہا تھا: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ [صٓ: ٥] ''کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟ بے شک یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا تو عرب نے اس امر کا انکار کیا یا بعض عرب نے کہا: "اَللّٰهُ أَعْظَمُ مِنْ أَنْ يَّكُوْنَ رَسُوْلُهُ بَشَراً مِّثْلَ مُحَمَّدٍ" اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ عجب اس حالت کو کہتے ہیں جو کسی خلافِ عادت چیز کو دیکھنے سے طاری ہوتی ہے یا عجب وہ چیز ہے جس کا سبب معلوم نہ ہو۔ اس جگہ لوگوں سے مراد اہلِ مکہ یعنی قریش ہیں۔ ﴿ مِنْهُمْ ﴾ سے مراد مِنْ جِنْسِهِمْ ہے۔ سو ہم جنس کا رسول ہو کر آنا کچھ تعجب کا مقام نہیں ہے، کیوں کہ جنس اپنی جنس ہی کی طرف میلان رکھتی ہے۔ جو ارشاد (نصیحت کرنا) اس سے ممکن ہے وہ دوسرے سے اگر کوئی جن یا فرشتہ آتا، ممکن نہ تھا، کیوں کہ ان کو انسانوں سے کچھ اُنس نہ ہوتا اور مقصد کا حصول مشکل ہوتا، بلکہ وہ بشر کو نظر بھی نہ آتے اور اگر آتے اور انسانی شکل میں نہ ہوتے تو اور زیادہ وحشت ہوتی اور اگر انسان کی صورت میں ہوتے تو بھی یہ لوگ انکار کرتے، اس لیے کہ اصل میں وہ رسول بشر نہ ہوتا۔ یہ عجب اس صورت میں ہے کہ رسول ان کی جنس سے آیا ہے اور اگر یہ تعجب اس لیے کہ وہ رسول یتیم یا فقیر ہے تو یہ بات رسالت کے لیے کوئی مانع چیز نہیں ہے۔ کیا کسی یتیم اور محتاج کا خیر وشرافت کی جملہ خصلتوں کا حامل ہونا یا صفات کی اچھائی کی انتہا کو پہنچنا جہاں تک کوئی غنی اور امیر آدمی نہ پہنچے، مشکل ہے؟ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے قبل کہ رسالت کے لیے منتخب ہوں قریش کے نزدیک کمال کی خصلتوں میں سورج سے زیادہ مشہور اور روزِ روشن سے زیادہ ظاہر تھے، یہاں تک کہ وہ آپ کو امین کہتے تھے۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٣) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] فتح البيان (٦/ ١٠)

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲

اور ان لوگوں کو خوش خبری دیں، جو ایمان لائے کہ بے شک ان کے لیے ان کے رب کے ہاں سچائی کا مرتبہ ہے۔ کافروں نے کہا: بے شک یہ تو یقیناً صاف جادوگر ہے ②

اہلِ ایمان کو سچائی کے مرتبے کی بشارت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کی سعادت ذکر اول یعنی لوحِ محفوظ میں پہلے سے لکھی جا چکی ہے۔[1] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ان کے لیے پہلے کیے گئے اعمال کی وجہ سے اچھا اجر ہے۔ یہی امام ضحاک، ربیع بن انس اور ابن زید رحمہ اللہ کا قول ہے۔[2] اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴾ [الكهف: ٢] ”نہایت سیدھی (بغیر افراط و تفریط کے اتاری) تاکہ وہ اس (اللہ) کی طرف سے سخت عذاب سے ڈرائے اور مومنوں کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بے شک ان کے لیے اچھا اجر ہے۔“

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ سے مراد اعمالِ صالحہ ہیں، جیسے: نماز، روزہ، صدقہ اور تسبیح، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سفارش کریں گے۔ امام ابن زید اور مقاتل رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ سے مراد سلف صدق ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول اختیار کیا ہے کہ ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ سے وہ اعمالِ صالحہ مراد ہیں جو پہلے بھیج چکے۔ ”كَمَا يُقَالُ: لَهُ قَدَمٌ فِي الْإِسْلَامِ“ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح ع

لَنَا قَدَمُ الْعُلْيَا إِلَيْكَ وَخَلْفُنَا ... لِأَوَّلِنَا فِي طَاعَةِ اللّٰهِ تَابِعٌ[3]

”ہمارا تمھارے یہاں بلند مرتبہ ہے اور ہمارے جانشین اللہ کی فرماں برداری میں ہمارے بزرگوں کے تابع ہیں۔“

کافروں کا یہ کہنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھلے جادوگر ہیں، بالکل جھوٹ ہے۔

﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ کی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے، جیسے: مَسْجِدُ الْجَامِعِ، صَلَاةُ الْأُولٰى، حَبُّ الْحَصِيْدِ. اس اضافت کا فائدہ فضل کی زیادتی اور قدم کی تعریف پر متنبہ کرنا ہے، کیونکہ جو شے صدق کی طرف نسبت کی جاتی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ جیسے: ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾، ﴿ مُدْخَلَ صِدْقٍ ﴾۔

---

① تفسير الطبري (١٥/ ١٥) اس کی سند حسن ہے۔ ② تفسير الطبري (١٥/ ١٤۔ ١٥)

③ تفسير الطبري (١٥/ ١٤۔ ١٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٣١)

مفسرین اور اہلِ لغت کا اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ درجۂ عالیہ کے معنی میں ہے۔[1] امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے بمعنی متقدم فی الشرف ہے۔ امام کسائی اور ابو عبید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ پہلے گزرے ہوئے ہر خیر و شر کو عرب لوگ قدم کہتے ہیں۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قدم ہر اس عمل سے کنایہ ہے جس میں دیر نہ لگے۔[2] امام ربیع اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ ثواب اور صدق کے معنی میں ہے۔[3] حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا قدم مقامِ محمود ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ منزل صدق کے معنی میں ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عملِ صالح گزر چکا ہے جس پر قدوم لائیں گے۔ امام لیث اور ابو الہیثم رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ قدم سابقہ ہے، یعنی اللہ کے نزدیک ان کے لیے خیر سابق ہو چکی ہے۔[4] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قدم وہ عمل ہے جو پہلے کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ﴾ [یٰسٓ: ۱۲] ''اور جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے انھیں ہم لکھ رہے ہیں اور ان کے آثار (نشاناتِ قدم) کو بھی۔''

آثار کہتے ہیں پاؤں کے نشان کو۔ نبی اکرم ﷺ مسجد کے دوستونوں کے درمیان چلے، پھر فرمایا: « هٰذَا أَثَرٌ مَّكْتُوْبٌ »[5] ﴿ قَدَمَ صِدْقٍ ﴾ کے بارے میں تابعین کی روایات بہت ہیں۔ لفظ قدم کا ان معانی پر اطلاق اس طرح ہے کہ سعی اور کسی کام میں آگے نکلنا قدم ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے سبب مسمیٰ باسم سبب ہوا، جس طرح کہ نعمت کو ید کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہاتھ سے دی جاتی ہے۔ قراءتِ سحر سے مراد قرآن ہے اور قراءتِ ساحر سے مراد نبی اکرم ﷺ، یعنی کفار نے تعجب کے بعد یہ جواب دیا کہ یہ کتاب جادو ہے یا یہ رسول ساحر ہیں۔[6]

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ
اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا
مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

بے شک تمھارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا، وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ کوئی سفارشی نہیں (بن سکتا) بغیر اس کی اجازت کے۔ یہی اللہ ہے تمھارا رب، چناں چہ تم اسی کی عبادت کرو، پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ (3)

اللہ ہی کائنات کا خالق، رب اور متصرف ہے:

جتنی دیر لگے چھے دن میں، اتنے میں آسمان و زمین بنائے۔ اس ملک کا دربار عرش پر ٹھہرا، سب کام کی تدبیر وہاں سے ہوئی۔ اللہ نے اس آیت میں خبر دی کہ سارے عالم کا رب میں ہوں، میں نے آسمان و زمین کو چھے دن

(1) معاني القرآن (٣/ ٦) (2) فتح القدير (٢/ ٥٩٥۔ ٥٩٦) (3) تفسير الطبري (١٥/ ١٤۔ ١٥)
(4) تفسير الخازن (٣/ ١٧٣) (5) فتح القدير (٢/ ٥٩٨) (6) فتح البيان (٦/ ١١۔ ١٢)

میں بنایا، یہ دن ان ایام کی مثل تھے یا ہر دن ایک ہزار سال کے برابر تھا، اس کا بیان آگے آئے گا۔ عرشِ اعظم مخلوقات (یعنی سب مخلوق میں سے سب سے بڑا) ہے اور تمام مخلوق کی چھت ہے۔ عرش کے نیچے مخلوق ہے اور اس سے اوپر امر ہے۔ سعد طائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرش ایک سرخ یاقوت ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے عرش کو نور سے بنایا ہے،[1] یہ قول غریب ہے۔

مخلوق کے تمام معاملات کی تدبیر عرش کے اوپر سے ہوتی ہے۔ مجال ہے کہ سارے آسمانوں اور زمین سے ایک ذرہ بھی مخفی رہ جائے۔ کوئی حالت اللہ پاک کو دوسری حالت سے مشغول (غافل) نہیں کرتی اور نہ مسائل اس کو غلطی میں ڈالتے ہیں اور نہ گڑگڑانے والوں کے گڑگڑانے سے وہ منقطع ہوتا ہے اور نہ بڑی تدبیر اس کو کسی چھوٹی تدبیر سے غافل کرتی ہے پہاڑوں، سمندروں اور آبادی اور جنگلوں میں۔ ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [هود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔''

سعد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب آیتِ باب اتری تو ایک عظیم کاروان آیا، لوگوں نے سمجھا کہ یہ عرب ہیں، پوچھا: تم کون ہو؟ کہا: ہم جن ہیں، مدینے سے باہر نکلے، اس آیت نے ہم کو نکالا۔[2]

سفارش اللہ کے اذن پر موقوف ہے:

رہی یہ بات کہ کوئی سفارشی نہیں ہو گا مگر اللہ کے اذن کے بعد، سو یہ دوسری آیت کی طرح ہے: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ''کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟'' اور اس کے قول کی طرح: ﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ [النجم: ٢٦] ''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں، جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی، مگر بعد ازاں کہ اللہ اجازت دے، جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔''

نیز اللہ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ ﴾ [سبا: ٢٣] ''اور اس کے ہاں صرف اس شخص کی سفارش نفع دے گی جسے اللہ اجازت دے گا'' یہ اجازت کے ساتھ شفاعت ہونے کے بارے صریح احکام ہیں اور شفاعت کا معاملہ مبہم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور رضا مندی پر رکھا ہے نہ کہ شفاعت کرنے والوں یا جن کی شفاعت کی جائے ان کی رضا مندی پر۔ معلوم نہیں کس کے لیے سفارش کی اجازت کا پروانہ جاری ہو گا اور کس کے لیے نہیں ہو گا۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٢٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٩٢٤) یہ روایت مرسل ہے۔

ایک اللہ کی عبادت کی دعوت:

پھر فرمایا کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اے مشرکو! تم کچھ خیال نہیں کرتے، اللہ کے ساتھ غیر اللہ کی بھی عبادت کرتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو اللہ ہی اکیلا خالق ہے اور اس کا فرمان ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزخرف: ٨٧] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے!'' نیز اللہ کا فرمان ہے: ﴿ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٨٦] ''ساتوں آسمانوں کا رب اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟ وہ ضرور کہیں گے: (یہ) اللہ ہی کے ہیں، کہہ دیجیے: کیا پھر تم ڈرتے نہیں؟'' اسی طرح وہ آیت ہے جو اس سے پہلے اور اس کے بعد ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ چھے دنوں سے مراد دنیا کے دن ہیں، یعنی ہم نے یہ ساری خلق چھے دن کے مقدار میں بنائی، کیوں کہ اس وقت نہ سورج تھا اور نہ چاند۔ اگر اللہ چاہتا تو ایک لمحے میں بنا دیتا، لیکن خلق کو معاملات میں دیر کرنا اور تاخیر کرنا سکھانا منظور تھا۔ رہی چھے دن کی تخصیص، حالانکہ اس سے کم یا زیادہ میں بھی دیر کرنا یا ثابت کرنا حاصل ہو سکتا تھا، سو اس کا بھید اللہ ہی کو معلوم ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جس کا غلبہ اس قدر عظیم ہے جس کے تصور سے عقل بھی تنگ ہے تو اس کے لیے رسول کو لوگوں کی طرف بھیجنا ان کی جنس میں سے کیوں باعثِ تعجب ٹھہرایا جاتا ہے۔ حالانکہ کفار اس خلق کے چھے دن میں ہونے کے قائل اور معترف ہیں، پھر رسالت کے صحیح ہونے کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ استوا سے مراد وہ ہے جو اس کی ذات پاک کے لائق ہے۔ یہی طریقہ پہلے مفوضین کا تھا۔ اس آیت کی تفسیر سورت اعراف میں گزر چکی ہے۔[1]

استویٰ پر ایمان:

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرش پر استوا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ اس صفت پر ایمان لانا واجب ہے اور بغیر تاویل کے ظاہر پر یقین کرنا لازم ہے۔ یہ اس لیے کہ صفات کے ذکر کا مقصد ایمان لانا ہے نہ یہ کہ ان میں غور کرنا۔ ان صفات کا سمجھنا اور ادراک کرنا بشر سے بالاتر ہے۔ خلف کا طریقہ جو آیات و صفاتِ الٰہی کے بارے میں تاویل کرتے ہیں، وہ کتاب و سنت کے صریح احکام اور سلفِ امت کے آثار اور ائمہ ملت کے اقوال میں سے کسی دلیل سے خالی ہے۔ ظاہر آیت اس بات پر دلیل ہے کہ یہ استوا آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد تھا، اس لیے کہ لفظ ﴿ ثُمَّ ﴾ تاخیر کے لیے آتا ہے۔

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کی پیدائش سے پہلے عرش کی ضرورت سے مستغنی تھا، جب اس نے عرش بنایا تو بھی اس کی حقیقت اور ذات کو کسی تبدیلی اور انقلاب کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بات نہیں کہ پہلے غنی تھا، اب

---

[1] رقم الآیة [٥٤]

اسے عرش کی حاجت ہوئی، بلکہ عرش کی پیدایش کے بعد بھی اسی طرح مستغنی اور بے نیاز ہے جس طرح کہ اس پیدایش سے پہلے غنی تھا، لیکن جب ہم کو خبر دی کہ وہ عرش پر مستوی ہوا تو ہمیں اللہ کے جاہ و جلال کی مناسبت سے عرش پر مستوی ہونے پر ایمان لانا واجب ہوا اور پھر بھی اپنی قدرت کے مزید بیان کے واسطے یہ ارشاد فرمایا کہ ہم وہیں سے بیٹھے ہوئے تدابیرِ امر کرتے ہیں، اس سے خلق کے اندر حلول کر جانے کی نفی ثابت ہوئی اور معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے بائن ہے اپنی ذات پاک سے۔ کسی مکان کے اندر یا ہر مکان اور ہر جگہ میں نہیں ہے۔

تدبیرِ کائنات:

تدبیر معاملات کے رموز اور انجام میں غور کرنے کو کہتے ہیں، تا کہ وہ معاملات صحیح صورت میں واقع ہوں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "یَقْضِيُ الْأَمْرَ وَیُقَدِّرُہٗ وَحْدَہٗ عَلَی الْوَجْہِ الْأَتَمِّ الْأَکْمَلِ"[1] کسی نے کہا: "یَبْعَثُ الْأَمْرَ" کسی نے کہا: "یُنَزِّلُ الْأَمْرَ" کسی نے کہا: "یَأْمُرُ بِہٖ وَیَقْضِیْہِ" یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ مراد امر سے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور عرش اور تمام مخلوق کے حالات مختلف طریقوں سے اور مختلف چیزوں کے جن کا شمار کرنا یا ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ قیامت کے دن اس کے پاس کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہوگا، مگر جب کہ وہ شفاعت کرنے کی اجازت دے گا، اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کی بہتری کو خوب جانتا ہے، کسی کو یہ بات جائز نہیں کہ جس کو وہ جانتا نہیں اس کا سوال اللہ تعالیٰ سے کرے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کفار اس آیت کے مخاطب تھے وہ کہتے تھے کہ یہ بت ہمارے سفارشی ہوں گے اللہ کے نزدیک۔[2]

اس پر اللہ نے ان کی تردید کی اور فرمایا کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہ ہوگا، اس لیے کہ حکمت کی جگہ اور کہاں اور کس کی سفارش ہونی چاہیے، اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ تمام عالم میں اختیار اسی کا ہے نہ کسی اور کا، وہ بت ہوں یا اولیائے عظام ہوں یا انبیائے کرام۔ اس میں اس بات کا بیان ہے کہ ہر شے میں بااختیار خالق ہے نہ کہ مخلوق، سو جو ان عظیم کاموں کا سرانجام دینے والا ہے اور صاحبِ خلق و امر ہے وہی تمھارا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود اور رب نہیں تو اب اسی کی عبادت کرنی چاہیے نہ کہ غیر کی، وہ جمادات ہوں یا حیوانات یا نباتات۔ سوالیہ انداز انکار کے لیے اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے، کیوں کہ جو ذرا سی بھی سوچ اور فکر اور عبرت رکھتا ہے وہ اس بات کو بخوبی جان لے گا کہ ایسی ہستی کے سوا، جو ہر چیز کو پہلی دفعہ پیدا کرنے والی (ایجاد کرنے والی) اور عظیم اقتدار کی مالک ہے، کسی اور کی عبادت کرنا زیبا نہیں ہے۔[3]

---

[1] تفسیر القرطبي (٨/ ٣٠٨) [2] معاني القرآن (٣/ ٦) [3] فتح البیان (٦/ ١٢۔ ١٣)

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ④

تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، بے شک وہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے (زندہ کرے) گا، تا کہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا، اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے ④

اللہ ہی کی طرف سب کا لوٹنا ہے:

اللہ نے خبر دی کہ قیامت کے دن ساری مخلوق کا مرجع اللہ کی ذات ہے، کوئی باقی نہ رہے گا جس کو اس نے پیدا کیا ہے، مگر وہ لوٹ کر آئے گا، کیوں کہ تمام مخلوق کو پہلی بار پیدا کرنے والا اور پھر انھیں زندہ کر کے لوٹانے والا ایک ہی ہے، اس کے لیے خلق کو دوبارہ پیدا کرنا مشکل نہیں جس طرح ان کا پہلی دفعہ پیدا کرنا دشوار نہ تھا۔ یہ لوٹانا انصاف کرنے اور ان کو ان کے اعمال کی پوری پوری جزا دینے کے لیے ہوگا۔ نیکوں کو ان کی نیکی کا بدلہ دے گا اور کافروں کو ان کے کفر کی جزا چکھائے گا، مختلف قسم کے عذاب اور سزائیں دے گا، جیسے سموم (گرم ہوا) حمیم (ابلتا ہوا پانی) وظل یحموم (سیاہ دھوئیں کا سایہ)۔ ﴿ هٰذَا فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿57﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوٰجٌ ﴾ [ص: ۵۷۔ ۵۸] ''یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کو چکھیں۔ اور ان کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے۔'' ﴿ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿43﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴾ [الرحمن: ۴۳۔ ۴۴] ''(انھیں کہا جائے گا:) یہی وہ جہنم ہے جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے۔ وہ جہنم کے درمیان اور سخت گرم کھولتے پانی کے درمیان چکر لگائیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیتِ باب میں جو ڈانٹ ڈپٹ، ڈر اور خوف دلایا گیا ہے وہ کچھ مخفی نہیں ہے۔ مرجع سے مراد اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، موت سے یا بعث بعد الموت سے یا دونوں طرح ہے۔ یہ رجوع اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ وہ خلق کو مٹی سے بناتا ہے، پھر اس کو دہراتا (دوبارہ زندہ کرتا) ہے، آیت حشر، نشر اور معاد اور بعث بعد الموت کے واقع ہونے کے حق ہونے کی دلیل ہے اور ان کی تردید ہے جو بعث بعد الموت کا انکار

---

① فتح البیان (۶/ ۱۴۔ ۱۵)

کرتے ہیں۔ اس اعادے (دوبارہ زندہ کرنے) کی غرض و غایت یہ ہے کہ نیک اور بد اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ ﴿حَمِيْمٍ﴾ کہتے ہیں انتہا درجے کی گرم چیز کو، پانی ہو یا اور کچھ۔ ان کو سزا ان کے برے اعتقاد اور برے کاموں کی وجہ سے ملے گی۔[1]

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۝

وہی ہے (اللہ) جس نے سورج کو نہایت روشن بنایا اور چاند کو نور اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرسکو۔ یہ (سب کچھ) اللہ نے حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی آیتیں تفصیل سے ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں ⑤ بے شک رات اور دن کے (بدل بدل کر) آنے جانے میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے (اس میں بھی)، البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں ⑥

ہر چیز اللہ کی قدرت کی دلیل ہے:

اللہ پاک نے خلق میں اپنی نشانیوں کا ذکر کیا جو کہ اس کی کمال قدرت اور عظیم بادشاہت پر دلیل ہیں۔ اور فرمایا کہ جو شعاع سورج سے نکلتی ہے وہ ضیا ہے اور جو چاند سے صادر ہوتی ہے وہ نور ہے۔ یہ ایک فن ہے اور وہ دوسرا فن ہے۔ دونوں میں فرق ہے، تاکہ ایک دوسرے سے مشتبہ نہ ہو جائیں۔ سورج کی سلطنت دن میں رکھی اور چاند کی سلطنت رات میں۔ چاند کے لیے منزلیں مقرر کیں۔ پہلے باریک اور چھوٹا سا نکلتا ہے، پھر اس کا نور اور جسم بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ پورا ہو کر بدر ہو جاتا ہے، پھر گھٹنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت پر آ جاتا ہے ایک ماہ میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یٰس: ۳۹۔ ۴۰] ''اور چاند کی ہم نے (اٹھائیس) منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، حتی کہ وہ کھجور کے خوشے کی پرانی ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ سورج کے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا﴾ [الأنعام: ٩٦] ''اور سورج اور چاند کو اپنے حساب سے چلنے والا (بنایا)۔'' سو سورج سے ایام کا حساب پہچانا جاتا ہے اور قمر سے ماہ و سال کی شناخت ہوتی ہے۔ اللہ نے

ان کو حق سے بنایا ہے نہ کہ بے فائدہ، بلکہ ان میں بڑی حکمت اور حجت بالغہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بٰطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴾ [صٓ: ٢٧] ''اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بیکار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا، تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ [المؤمنون: ١١٥۔ ١١٦] ''کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ چناں چہ بلند و بالا اللہ حقیقی بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ معزز و مکرم عرش کا رب ہے۔''

تفصیل سے مراد بیان ہے۔ آیات سے مراد حجتیں اور دلائل ہیں۔ اختلافِ لیل و نہار سے مراد ان دونوں کا ایک دوسرے کا تعاقب کرنا ہے۔ جب دن آتا ہے تو رات چلی جاتی ہے اور جب رات آتی ہے تو دن چلا جاتا ہے، کیا مجال ہے کہ ذرا سی بھی تاخیر ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے۔''

پھر فرمایا کہ جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمین کے درمیان میں بنایا ہے اور وہ اللہ کی عظمت پر دلیل ہے سو ان نشانیوں کو وہ لوگ جانتے ہیں جو اللہ کے غصے، عذاب اور سزا سے ڈرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [یوسف: ١٠٥] ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [یونس: ١٠١] ''دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [سبا: ٩] ''کیا پھر انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین کی طرف نہیں دیکھا؟'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ [آل عمران: ١٩٠] ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ذکر بعض نعمتوں کا مکلفین پر کیا ہے جس سے اللہ کے وجود، وحدت اور قدرت اور علم و حکمت پر مضبوط استدلال ہوتا ہے، یہ دونوں نورانی ستارے (سورج اور چاند) ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے

آگے پیچھے رہتے ہیں۔ ضیاء وہ ہے جو بالذات ہو، نور وہ ہے جو بالعرض ہو۔ آفتاب کی درخشانی کو ضیاء کہتے ہیں، ماہتاب کی روشنی کو نور بولتے ہیں۔ اسی جگہ سے حکما نے کہا ہے کہ قمر کا نور شمس کی ضیا سے مستفید ہوتا ہے ع

زجام مہر بود ہمچو ماہ مستی ما   بقدر وصل شود محو یار ہستی ما

''ہماری ایک جام کی مستی سے سورج چاند کے مانند ہو جاتا ہے۔ ہمارا وجوہ محوِ یار ہو کر وصل کے مزے لیتا ہے۔''

پھر جو شعاع سورج سے پہنچتی ہے، کسی نے کہا ہے کہ جوہر ہے اور کسی نے کہا ہے کہ عرض ہے۔ امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق یہ ہے کہ عرض ہے، اس لیے کہ وہ جُرم (جسم) سے قائم ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے سورج کو چاند کی صورت پر نہ کیا، تاکہ رات دن سے الگ ہو کر پہچانی جائے اور یہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٢] ''پھر ہم نے رات کی نشانی تو محو (بے نور) کر دی اور دن کی نشانی روشن بنائی، تاکہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو، اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جان لو۔ اور ہم نے ہر چیز خوب تفصیل سے بیان کر دی ہے۔''[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان دونوں کے منہ آسمان کی طرف ہیں اور پشت زمین کی طرف، یہی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول بھی ہے۔[2]

شمسی و قمری سالوں کا حساب:

چاند کے لیے منزلیں مقرر فرمائیں، تاکہ ماہ و سال کا پورا ہونا معلوم ہو، کیوں کہ شریعت میں مہینوں کا صریح طریقے سے ہلال کی رؤیت پر دار و مدار ہے اور شرعی لحاظ سے معتبر سال یہی قمری سال ہے نہ کہ شمسی۔ اور چاند کی منازل یہی فاصلہ ہے جو وہ ایک رات اور دن میں خود حرکت کر کے طے کرتا ہے۔ یہ سب اٹھائیس منزلیں ہیں جس کے بارہ برج ہوئے، ہر برج کی دو منزلیں ہیں اور تین منزل میں چاند ہر رات نزول کرتا ہے، اس وقت تک کہ اٹھائیس منزلیں پوری ہو جائیں، اس میں کوئی خطا نہیں کرتا، اول منزل میں چھوٹا ظاہر ہو کر تھوڑا تھوڑا بڑھ کر مکمل ہو جاتا ہے، آخر منزل پر باریک ہو کر قوس کی طرح ہو جاتا ہے۔ ہر دو رات روپوش رہ کر نظر نہیں آتا جبکہ مہینا پورا ہوتا ہے اور ایک رات، جب کہ مہینا ناقص ہوتا ہے۔

﴿ قَدَّرَهٗ ﴾ کی ضمیر قمر کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ سورج اور چاند دونوں کی طرف۔ پھر بعض منافع کا ذکر کیا کہ یہ تقدیرِ قمر اس لیے ہے، تاکہ مہینوں اور سال اور گھڑیوں اور زیادتی اور کمی اور شروع ہونے اور مکمل ہونے کا وقت معلوم ہو، کیوں کہ اس علم میں بہت سی دینی اور دنیوی مصلحتیں ہیں جن کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ اگر یہ تقدیر نہ ہوتی تو بہت سی مصلحتوں کا پتا ہی نہ چلتا۔ سال بارہ ماہ کا ہوتا ہے۔ مہینا تیس دن کا اگر کامل ہو (۳۰ دن کا) اور انتیس دن کا اگر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٢٧)
[2] الدر المنثور (٤/ ٣٤٣)

ناقص ہو۔ دن رات چوبیس ساعت کا ہوتا ہے اور کبھی ایام استوا میں رات دن برابر بارہ بارہ ساعت کا ہوا کرتا ہے اور ایام زیادت اور ایام نقصان میں ایک دوسرے سے زیادہ اور کم ہو جاتا ہے اور شمسی اور قمری سالوں کا مختلف ہونا مشہور ہے۔ سو اللہ نے ان سب کو حق اور صحیح طریقے سے بنایا ہے، نہ باطل اور بے فائدہ طریقے سے۔

آیاتِ تکوینیہ میں دلائلِ قدرت:

یہ آیاتِ تکوینیہ یا تنزیلیہ یا دونوں عقل مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ علما ان کو پہچان کر اللہ کی الوہیت اور ربوبیت پر ایمان لاتے ہیں۔ رات دن کا یہ اختلاف، ایک دوسرے کا تعاقب کرنا، سورج کے طلوع اور غروب کے مطابق یا ان کا ایک دوسرے سے زیادہ اور کم ہونے کے مطابق آپس میں فرق ہونا یا ان کی لمبائی یا کمی میں اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں میں بنایا ہے، مثلاً: فرشتے، سیارے، ستارے وغیر ذلک اور جو کچھ زمین میں پیدا کیا ہے، جیسے: حیوان، پہاڑ، دریا، سمندر، نہریں اور درخت وغیرہا، ان سب میں ان لوگوں کے لیے معلومات ہیں جو گناہوں سے بچتے ہیں اور اللہ کی مخلوقات میں گہری نظر اور غور وفکر کرتے ہیں۔

امام قفال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی شخص ان سب باتوں میں غور وفکر کرے گا وہ جان لے گا کہ اللہ نے جو دنیا کو لوگوں کے لیے بنایا ہے تو دنیا اور اس کے رہنے والوں کو بے فائدہ اور بے کار نہیں چھوڑا، بلکہ دنیا کو اہلِ دنیا کے لیے دارِ عمل ٹھہرایا ہے۔ سو جب یہ بات ٹھہری تو ایک خلیفہ کے ذریعے امر و نہی کا ہونا ضروری ہوا۔[1] اگر اللہ کی عبادت اس کو دیکھ لینے سے مشروط ہوتی تو کوئی شخص بھی اس کی عبادت نہ کرتا۔ لیکن اہلِ ایمان نے رات دن کے آنے جانے میں تفکر کیا، دیکھا کہ رات جب آتی ہے تو ہر چیز کو چھپا لیتی ہے اور جب دن آتا ہے تو وہ رات کو مٹا دیتا ہے، پھر بادل میں غور کیا کہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہے، گرمی جاڑے میں سوچا کہ یہ کس طرح ہوتا ہے، غرض کہ مخلوقات میں تفکر کرنے سے یقین کر لیا کہ ان سب کا کوئی رب ہے، وہی ہمارا معبود ہے۔[2]

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸

بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے اور وہ دنیاوی زندگی پر راضی اور اسی پر مطمئن ہیں اور وہ لوگ جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ⑦ وہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے ان (عملوں) کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے ⑧

---

[1] فتح القدير (٢/ ٦٠٠) [2] فتح البيان (٦/ ١٥۔ ١٩)

قیامت کے منکر اور محض اس دنیا کے وجود کے قائلین کا انجام:

اللہ نے اس جگہ ان بدبختوں کا ذکر کیا جو قیامت کے منکر ہیں، ان کو اس دن اللہ سے ملنے کی امید نہیں ہے۔ اسی دنیا کی حیاتِ فانی پر راضی اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! دنیا کی زینت اور رفعت نہیں، یہاں تک کہ وہ دنیا سے راضی ہو[1] اور اللہ کی آیاتِ کونیہ پر غور وفکر نہ کرے اور آیاتِ شرعیہ سے بے رغبت اور سست رہے۔ نہ پہلی آیات پر غور وفکر نہ دوسرے احکام کو بجائے لائے۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔ یہ ان کے گناہوں، خطاؤں اور جرائم کی جزا ہے، حالانکہ وہ اللہ اور رسول اور یومِ آخرت کے منکر بھی تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ ان کا ذکر ہے جو قیامت پر ایمان نہیں لاتے۔ رَجا اس جگہ خوف یا طمع یا توقع کے معنی میں ہے۔ انھوں نے آخرت کے عوض دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ہے۔ اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، یعنی توحیدِ الٰہی یا نبی اکرم ﷺ کی ذات یا قرآن سے۔ اس کفر اور تکذیب کا انجام ان کے لیے دوزخ کی آگ ہو گا۔[2]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۹ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کا رب ان کے ایمان کی وجہ سے انھیں (جنت کے باغوں کی) راہ دکھائے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گے، نعمتوں کے باغات میں ⑨ اس (جنت) میں ان کی پکار ہوگی: اے اللہ! تو پاک ہے۔ اور اس میں ان کی دعا ہوگی: سلام۔ اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں ⑩

جنت کی نعمتیں باعمل اہلِ ایمان کے لیے:

پہلے تو اللہ کی عجیب نعمتیں دیکھ کر کہیں گے: پاک ذات، یعنی سبحان اللہ، پھر اس کی لذت پا کر کہیں گے: الحمد للہ اور جنت میں ملاقات کا طریقہ یہی ہے، السلام علیک جو دنیا میں مسلمان کرتے ہیں۔ اللہ نے اس جگہ نیک بخت لوگوں کے بارے میں خبر دی ہے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں، رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں، اللہ کے احکامات کو بجا لاتے ہیں، وہ اپنے ایمان کے سبب راہ یاب ہوں گے، صراطِ مستقیم سے چلتے چلتے جنت میں جا پہنچیں گے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٢٨) [2] فتح البیان (٦/ ١٩۔ ٢٠)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے لیے نور ہو گا جس کے سبب وہ چلیں گے۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا عمل ایک اچھی سی اور خوش بو دار مورت کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ جب وہ قبر سے اٹھیں گے تو سامنے آ کر ہر خیر کی خوش خبری دے گا، یہ کہے گا: تو کون ہے؟ وہ کہے گا: میں تیرا عمل ہوں، پھر آگے آگے نور بن کر چلے گا، یہاں تک کہ جنت میں داخل ہو گا، یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول میں فرمایا گیا ہے: ﴿ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمٰنِهِمْ ﴾ اسی طرح کافر کا عمل ایک بدبو دار اور بدصورت شکل میں ظاہر ہو گا اور اس کو لازمی طور پر جہنم میں لے جائے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1] واللہ أعلم

اہلِ جنت کا پروٹوکول:

اہلِ جنت کی پہلی دعا ہو گی: ﴿ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ﴾ اور آخر ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی پرندہ ان پر گزرے گا تو وہ اللہ پاک کو پکاریں گے، فرشتہ اس کو لے کر آئے گا اور سلام کرے گا، یہ اس کو جواب دیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے: ﴿ وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ﴾ پھر جب اس کو تناول کر چکیں گے تو کہیں گے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾[2] آخر دعویٰ سے یہی مراد ہے۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ جنت میں سے جب کوئی کھانا طلب کرنا چاہے گا تو ﴿ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ﴾ کہے گا، اسی وقت دس ہزار خادم اٹھ کھڑے ہوں گے، ہر خادم کے ہاتھ میں ایک سونے کی رکابی ہو گی، اس میں جو کھانا ہو گا وہ دوسری رکابی میں نہ ہو گا، یہ شخص ان سب میں سے کچھ کچھ کھائے گا۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جنت میں جب کوئی طعام کا ارادہ کرے گا تو ﴿ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ﴾ کہے گا۔[3]

اس آیت میں دوسری آیات کی مشابہت ہے، جیسے: ﴿ تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ [الأحزاب: ٤٤] ''جس دن وہ اس (اللہ) سے ملیں گے تو ان کی دعا ہو گی ''سلام''۔'' نیز آیتِ کریمہ: ﴿ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا ۝ اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ [الواقعة: ٢٥۔ ٢٦] ''اور وہ اس (جنت) میں نہ لغو سنیں گے اور نہ کوئی گناہ کی بات۔ (ہاں!) مگر ایک بول سلام ہے سلام ہے۔'' اور آیتِ کریمہ: ﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ ﴾ [یٰسٓ: ٥٨] ''(انھیں) نہایت مہربان رب کی طرف سے سلام کہا جائے گا۔'' اور آیتِ کریمہ: ﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ [الرعد: ٢٣۔ ٢٤] ''اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ (اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو، اس لیے کہ تم نے صبر کیا، لہٰذا آخرت کا گھر بہت خوب ہے۔''

اللہ کی حمد:

اور اس قول میں کہ ان کی آخری پکار اللہ کی حمد ہو گی، اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ محمود ہے اور لمبی

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٨۔ ٢٧) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٠) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٣٠)

مدت کے لیے معبود ہے۔ اسی لیے اس نے خلق کو پیدا کرتے وقت اور اسے دیر تک رکھنے کے وقت اپنے نفس پر حمد کی ہے اور ابتدائے کتاب اور ابتدائے تنزیل میں، چنانچہ فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ ﴾ ''ساری حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔'' [الکھف: ۱]

وہ مواقع جن پر اللہ نے اپنی حمد کی ہے، ان کو احاطہ کرنا اور بیان کرنا بہت طویل ہے، بہر حال وہ معبود برحق اول و آخر اور دنیا کی زندگی اور آخرت میں بھی محمود ہے، تمام حالات میں۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ جنت کو تسبیح اور تحمید کا الہام ہوگا جس طرح کہ سانس لینے کا الہام ہوتا ہے، سو یہ بات نعمتوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ہو گی کہ ہر دم اللہ کی طرف سے ان پر ایک نئی نعمت آتی رہے گی، جس کی کوئی مدت نہ ہوگی اور وہ منقطع نہیں ہوگی۔ فَلَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، وَلَا رَبَّ سِوَاهُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو لوگ ایمان لائے، یعنی جس طرح ان کا ایمان لانا مطلوب تھا، انھوں نے غور و فکر کے بعد اسے اختیار کیا اور جو کام ایمان کے تقاضے کے مطابق تھے اور اللہ نے مومنین کے لیے وہ مشروع کیے تھے، وہ بجا لائے تو اللہ ان کو اس ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ہدایت دیتا ہے اور وہ جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ قاضی نے کہا ہے کہ ترتیب کا مفہوم اگرچہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت کا سبب ایمان اور عملِ صالح دونوں ہیں، لیکن لفظ ﴿ بِاِيْمَانِهِمْ ﴾ اس بات پر دلیل ہے کہ ہدایت کا اصل سبب ایمان ہے اور عملِ صالح اس کے آخری حصے اور ردیف کے طور پر ہے۔

اس سے کشاف کا رد ہوتا ہے، کیوں کہ اس میں اس طرح کہا ہے کہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جنت کی طرف لے جانے والی ہدایت ایمان ہمراہ عملِ صالح کے نصیب ہوتی ہے نہ کہ صرف ایمان سے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیتِ کریمہ کے نظم میں اس بات کی خبر ہے کہ جنت تک پہنچنے کے لیے صرف ایمان اور عملِ صالح کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہدایتِ ربانی شاملِ حال ہو۔ اور کفر اور نافرمانی کے کام آگ میں جانے کے لیے کافی ہیں۔ اس میں کوئی جھگڑا نہیں کہ جو ایمان ہدایت کا سبب ٹھہرایا گیا ہے وہ خاص ایمان ہے، جس کے ساتھ اعمالِ صالح ہوں نہ کہ صرف ایمان عملِ صالح کے بغیر اور نہ وہ جو ان دونوں سے عام تر ہے، لیکن عقیدہ اہلِ سنت و جماعت کے خلاف اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ ایمان جو عملِ صالح کے بغیر ہو وہ بھی فی الجملہ جنت کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے اور مومن ہمیشہ آگ میں نہیں رہے گا، کیوں کہ آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جو ایمان عملِ صالح کے ساتھ ملا ہوا ہے وہ جنت کی طرف ہدایت کا سبب ہے۔

رہی یہ بات کہ ہر وہ چیز جو جنت کا سبب ہے اس کا جنت کی طرف لے جانے والا ہونا واجب ہے، سو اس پر ہر گز کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے اور کیوں کر ہو کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٨٢] ”جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔“ یہ آیت اس کے خلاف ندا کرتی ہے۔ ظلم سے مراد شرک ہے اسی پر مفسرین کا اتفاق ہے۔ معنی یہ ٹھہرے کہ ایمان میں شرک نہیں ملایا اور اگر ظاہر پر محمول کریں تو پھر اس ہدایت میں وہ شخص داخل ہے جو ایمان لایا اور اس نے کوئی عمل صالح نہیں کیا، پھر کوئی حرام کام کرنے یا کسی واجب کو ترک کر کے ظلم کا ارتکاب کرنے سے پہلے مر گیا۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے مدارک میں کہا ہے کہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ صرف ایمان ہی نجات بخش ہے۔ اس لیے کہ ﴿ بِاِيْمَانِهِمْ ﴾ فرمایا ہے اور عمل صالح کو اس کے ساتھ شامل نہیں کیا۔[2] امام خازن و مہائمی کا بیان یہ ہے کہ ”بِإِيْمَانِهِمْ وَ أَعْمَالِهِمْ“[3] امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”أَيْ وَبِسَبَبِ أَعْمَالِهِمْ أَيْضا“ کیوں کہ ایمان اور عملِ صالح دونوں دارِ سعادت تک پہنچاتے ہیں یا مراد ایمانِ کامل ہے، جس میں اعمالِ صالح شامل ہیں۔ بہر حال یہ مسئلہ ایک معرکہ آرا ہے: ”وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ“

نہروں کے جاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ بہشت کی نہریں ان کے باغوں کے نیچے بہتی ہیں یا ان کے سامنے اس لیے کہ وہ اونچے اونچے تختوں پر ہوں گے، ان کا بہشت کی ان چیزوں کو جن کی وہ خواہش کریں گے، پکارنا، ندا کرنا اور طلب کرنا ان الفاظ سے ہوگا: ﴿ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ﴾ بعض نے کہا ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ یہی لفظ کہیں، بلکہ یہ لفظ یا کوئی اور اس کے ہم معنی لفظ کہیں جس میں اللہ کی پاکیزگی اور تقدیس کی صفات ہوں۔ دعا عبادت ہے یا پکارنے کے معنی میں، یعنی اہلِ جنت دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے عیب سے منزہ ہونے اور اس کی الوہیت کا اقرار کرتے ہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ ان کی سیرت اور طریقت یہ الفاظ ہوں گے یا ان کا قول اور کلام یہی الفاظ ہوگا یا اس جگہ دعا سے مراد ان کی تمنا ہے کہ جنت میں ان کی یہی تسبیح اور تقدیس ہوگی۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ جب وہ ﴿ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ ﴾ کہیں گے تو جنت کی جو چیز بھی وہ چاہیں گے وہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس آ جائے گی۔[4] (رواہ ابن مردویہ) تابعین کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

گویا یہ کلمہ اہلِ جنت اور ان کے خدام کے درمیان کھانا حاضر کرنے کے لیے ایک علامت ہے۔ جس دم یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلیں گے تو فوراً ہی مطلوبہ چیز دستر خوان پر رکھی ہوئی سامنے آ جائے گی۔ ہر رکابی کا کھانا الگ ہو

---

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ١٢٣۔ ١٢٤)
[2] تفسير النسفي (٢/ ١١٩)
[3] تفسير الخازن (٣/ ١٧٦)
[4] الدر المنثور (٤/ ٣٤٥)

گا، ایک کا مزہ دوسرے کے مزے سے نہ ملے گا، جب کھانا کھا چکیں گے تو اللہ کی حمد کریں گے، اس وقت وہ دستر خوان اٹھا لیے جائیں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے بتا دیا کہ اہلِ جنت تعظیم اور پاکیزگی کے بیان سے ابتدا کریں گے اور اختتام شکر، تعریف اور اللہ کی حمد وثنا پر کریں گے۔[1] بعض نے کہا کہ ان کو اس بات کا الہام ہو گا جس طرح حدیث میں آیا ہے۔[2] اور تحیت بعض کی بعض کو سلام ہو گا، خواہ اللہ کی تحیت ہو یا ملائکہ کی۔ اصل تحیت کی یہ ہے کہ "أَحْيَاكَ اللّٰهُ حَيَاةً طَيِّبَةً" اور اسلام کی اصل ہر مکروہ سے سلامتی ہے، اس کی تفسیر سورت نسا میں گزر چکی ہے۔[3] اور دعا کا خاتمہ تسبیح تھی۔

ہر مجلس میں لفظ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ ہو گا۔ اس کے معنی حمد کے منقطع ہونے کے نہیں ہیں، اس لیے کہ اہلِ جنت کے لیے کوئی اقوال یا حالات آخری نہ ہوں گے، اور لفظ دعویٰ اگرچہ دعا کرنے کے معنی میں مشہور ہے، لیکن اس جگہ بمعنی دعا ہے یا بمعنی عبادت، کیوں کہ جنت عبادت کا گھر نہیں ہے، نہ وہاں کوئی تکلیف ہے، ان کی عبادت فقط اسی قول کا کہنا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر ہے اور دوسرے، اس کا بہت باریک سا مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت لذت اٹھانے کی غرض سے ہو گی نہ کہ بطورِ تکلیف۔[4] (ذكره الخفاجي)

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ۭ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝11

اور اگر اللہ لوگوں کو برائی پہنچانے میں جلدی کرتا، جیسے وہ بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی میعاد پوری ہو چکی ہوتی، چناں چہ ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، چھوڑ دیتے ہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں (11)

اللہ بد دعا اتنی جلدی قبول نہیں کرتا جتنی جلدی بھلائی کی دعا قبول کرتا ہے:

یعنی آدمی چاہتا ہے کہ نیکی کا بدلہ جلدی سے مل جائے یا نیک دعا جلدی قبول ہو جائے، سو اگر اللہ تعالیٰ جلدی کرنے لگے تو اپنی بدی کے وبال سے فرصت نہ پائے، مگر دونوں میں تحمل ہے، تاکہ نیک لوگ تربیت پائیں اور بد لوگ غفلت میں پڑے رہیں۔ اللہ پاک نے اس آیت پاک میں خبر دی ہے اپنے حلم اور لطف وکرم کی اپنے بندوں کے ساتھ کہ وہ ان کی تنگ دل اور غصہ ہو کر اپنی جانوں، مالوں اور اولاد کے حق میں کی گئی بددعا کو فوراً قبول نہیں کرتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس ارادے سے ان کا مقصد شر کا نہیں ہے، لہٰذا ان کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔ یہ اس کا لطف وکرم

---

[1] معاني القرآن (٣/ ٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٥) [3] رقم الآية [٨٦]

[4] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي (٥/ ٨) فتح البيان (٦/ ٢٠ـ ٢٣)

ہے، اسی لیے فرمایا کہ اگر اللہ پاک برائی میں جلدی کرے جس طرح وہ بہتری میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مدت ختم کر دے۔ یعنی اگر ان کی ہر دعا قبول کر لے تو وہ ہلاک ہو جائیں، لیکن ان کو کثرت سے بددعا نہ کرنا چاہیے، جس طرح کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: "لَا تَدْعُوْا عَلٰی أَنْفُسِکُمْ، لَا تَدْعُوْا عَلٰی أَوْلَادِکُمْ، لَا تَدْعُوْا عَلٰی أَمْوَالِکُمْ، لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً فِيْهَا إِجَابَةٌ فَيَسْتَجِيْبُ لَكُمْ"[1] (رواه البزار وأبو داود وتفرد به عبادة بن الوليد بن عبادة بن الصامت لم يشاركه أحد فيه) یعنی بددعا نہ کرو، اپنی جان و مال و اولاد پر، کہیں وہ بددعا ایسی ساعت میں واقع ہو کہ اللہ قبول کر لے۔

یہ اس کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١١] "اور انسان برائی کی دعا ایسے مانگتا ہے جیسے اس کی بھلائی کی دعا ہو۔ اور انسان بہت عجلت والا ہے۔" امام مجاہد رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ انسان غصے کے وقت اپنی اولاد یا مال کے حق میں ایسے بددعا کرتا ہے: "اَللّٰهُمَّ لَا تُبَارِكْ فِيْهِ وَالْعَنْهُ" سو اگر اللہ ان کی اس بددعا کو جلدی سے قبول کر لے جس طرح کہ دعائے خیر کو قبول کر لیتا ہے تو ان کو ہلاک کر دے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر اللہ بری دعا کے قبول کرنے میں جلدی کرے جس میں ان کا نقصان ہے اور نفس یا مال میں کوئی کراہت والی چیز ہے جس طرح وہ ثواب اور خیر کے ملنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کو ہلاک کر دے۔ تعجیل کہتے ہیں کسی چیز کو اس کے وقت سے جلدی کرنے میں۔ امام قفال رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے جب ان کی صفت غفلت کے ساتھ بیان کی ہے تو پھر اس پر تاکید کی، اس طرح پر کہ ان کی غفلت کی انتہا یہ ہے کہ جب رسول ان کو ڈراتا ہے تو وہ عذاب کی جلدی کرتے ہیں۔ اللہ نے بیان کیا کہ ان کو شر پہنچانے میں کوئی مصلحت نہیں۔ شاید وہ توبہ کریں یا ان کی نسل سے ایمان دار لوگ پیدا ہوں۔[3]

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگ تنگ دلی یا غصے کے وقت اپنے آپ کو یا اپنی اولاد اور اموال کو کوستے ہیں اور موت مانگتے ہیں اور بلا کے لیے جلدی کرتے ہیں، جس طرح کہ رزق و رحمت اور دوسری چیزوں کا سوال کرتے ہیں۔ سو اگر اللہ تعالیٰ ان کی بددعا جلدی سے قبول کر لے تو ان کی ہلاکت سے فارغ ہو جائے، لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ وہ خیر کی دعا کرنے والے کی دعا تو قبول کرتا ہے اور شر کی دعا کرنے والے کی دعا کو قبول نہیں کرتا۔[4]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہل و عیال کو غصے کے وقت کہنا: "لعنكم الله، لا بارك الله فيكم"[5] امام

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٠٠٩) سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٥٣٢) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٤۔ ٣٥)
[3] فتح القدیر (٢/ ٦٠٣) [4] تفسیر الخازن (٣/ ١٧٧) [5] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٤)

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جیسے کسی شخص کے حق میں یوں کہنا: ''اَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ، اَللّٰهُمَّ أَخْزِهِ'' اور چاہتا ہے کہ یہ دعا قبول ہو جائے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اپنی جان و اہل و مال پر بد دعا کرنا ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول نضر بن حارث کے حق میں ہوا ہے، اس نے کہا تھا: ''اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ'' اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم ان لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں جن کو ہمارے ملنے کی توقع نہیں ہے اور بعث و جزا کے منکر ہیں، وہ اپنے طغیان (سرکشی) میں، یعنی اپنے برے اعمال اور باتوں میں حیران و پریشان ہیں۔ یہ ان کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذلت وخواری اور استدراج ہے۔[3]

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، اپنے پہلو پر (لیٹے) یا بیٹھے یا کھڑے ہوئے، پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ (یوں) گزر جاتا ہے، جیسے اس نے خود کو تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے (برے) عمل پر کشش بنا دیے گئے (12)

تکلیف کے وقت اور آسایش کے وقت انسان کا رویہ:

اللہ پاک نے انسان کی بے چینی اور قلق کا حال بیان کیا، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴾ [حمٓ السجدة: ٥١] ''اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے والا بن جاتا ہے۔'' یہ دونوں آیتیں ایک ہی معنی کی ہیں۔ آدمی کو جب سختی پہنچتی ہے تو قلق اور جزع فزع کرتا ہے اور بہت دعا مانگتا ہے اور اللہ سے چاہتا ہے کہ وہ اسے دور کر دے، لیٹے ہوئے بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے، یعنی تمام حالتوں میں، پھر جب اللہ اس سختی کو دور کر دیتا ہے اور وہ تکلیف دور ہو جاتی ہے تو پھر دعا سے روگردان ہو کر الگ ہو جاتا ہے اور ایسے چلا جاتا ہے کہ گویا اس کو کبھی کوئی سختی وشدت وتکلیف پہنچی ہی نہ تھی۔

اللہ نے اس صفت اور طریقے کی مذمت کی ہے۔ اور فرمایا کہ یہ کام تو ان کے لیے اچھا معلوم ہوتا ہے جو مسرفین (زیادتی کرنے والے) ہوں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور قول و فعل کی مضبوطی اور راستی اور توفیق اور رشد بخشی ہے، وہ اس حال سے مستثنیٰ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [هود: ١١]

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٣٤٦) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٣٥) [3] فتح البيان (٦/ ٢٤_ ٢٥)

”مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور نیک عمل کیے۔“ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق: ”عَجَباً لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، لَا يَقْضِي اللّٰهُ لَهُ قَضَاءً إِلَّا كَانَ خَيْراً لَهُ، إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ فَصَبَرَ كَانَ خَيْراً لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ فَشَكَرَ فَكَانَ خَيْراً لَهُ، وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ“[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ضُرٌّ سے مراد جنس ضر ہے، جیسے: بیماری وفقیری۔ پہلو پر یا بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے سے مراد ہر حالت ہے اور ان حالتوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ انسان عادتاً ان سے خالی نہیں ہوتا اور رکوع اور سجود اور اس جیسی کیفیت ایک نادر حالت ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ اگر کھڑا نہیں ہوسکتا تو بیٹھ کر اور اگر بیٹھ نہیں سکتا تو لیٹ کر دعا کرتا ہے، لیکن پہلے معانی زیادہ بہتر ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دعا کی حالتوں کا شمار کرنا تکلیف کی حالتوں کے شمار سے زیادہ بہتر طور پر بات کو واضح کرتا ہے، کیوں کہ جب وہ ہمیشہ ہی دعا کرتا ہے پھر نرمی اور عیش کی حالت میں بھول گیا تو یہ عجیب بات ہے۔[2]

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ”اُدْعُ اللّٰهَ يَوْمَ سَرَّائِكَ لِيُسْتَجَابَ لَكَ يَوْمَ ضَرَّائِكَ“ یعنی تو خوشی کی حالت میں بہت دعا کر کہ تیری دعا سختی کے وقت قبول کی جائے۔[3] ”اَللّٰهُمَّ اجْمَعْ لَنَا بَيْنَ حَلْبِ الْغَنَمِ وَسَلْبِ النِّقَمِ“ اللہ پاک نے فرمایا کہ جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اسی طریقے پر چلتا ہے جس پر وہ تکلیف پہنچنے سے پہلے تھا اور اس حالت میں وہ سختی، بلا، تنگی اور فقیری کو بھول جاتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کو چھوڑ دیتا ہے یا دعا کی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع اور آہ و زاری نہیں کرتا، گویا اس نے تکلیف پہنچنے کے وقت ہم (اللہ) کو سرے ہی سے پکارا نہ تھا یا مَرَّ کے معنی اِسْتَمَرَّ ہیں، یعنی بدستور اپنے کفر پر جما رہتا ہے اس شخص کی طرح جس نے ہم سے دعا نہیں کی اور نہ شکر کیا اور نہ نصیحت پکڑی۔

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ حالت جس کا اللہ نے ذکر کیا ہے کچھ اہلِ کفر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ بہت سے مسلمان بھی ایسا کرتے ہیں کہ ان کی زبانیں دعا کے لیے نرم ہو جاتی ہیں اور دل خشوع وخضوع کرتے ہیں، یعنی جب کوئی ناپسندیدہ چیز انھیں پہنچتی ہے۔ پھر جب اللہ پاک اس مکروہ چیز کو دور کر دیتا ہے تو وہ دعا اور آہ و زاری سے غافل ہو جاتے ہیں اور نعمت کا شکر بجا نہیں لاتے، وہ نعمت دعا کی مقبولیت، مکروہ چیز کا دور ہونا اور بلا و آزمائش کا ہٹ جانا ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ آیت مسلم اور کافر دونوں کو شامل ہے، چنانچہ لفظ ناس اور لفظ انسان بھی اسی کو ظاہر کرتا ہے: ﴿ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ ﴾ [النمل: ١٩] ”اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩) [2] فتح القدير (٢/ ٦٠٤) [3] الدر المنثور (٤/ ٣٤٧)

انعام کی ہے، اور اس بات کی بھی کہ میں ایسے نیک کام کروں جو تو پسند کرے۔''

سو جس طرح تکلیف کے وقت دعا کرنا اور آسانی کے وقت بے پروائی کرنا اور منہ پھیر لینا ان کی نظروں میں اچھی بات ہے، اسی طرح مسرفین کے اعمال ان کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مُسرف لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت سا مال کسی حقیر غرض کے لیے خرچ کرے۔ ان کے کاموں میں یہ تزئین یا تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے کہ وہ ان کو طبیعتاً خطا کار کر دیتا ہے اور ان پر لطف و کرم نہیں فرماتا۔ یا شیطان کی طرف سے وسوسہ ڈال کر، یا نفسِ امارہ بالسوء کی طرف سے۔ حاصل یہ ہے کہ دعا سے منہ موڑنا اور شکر ادا کرنے سے غافل ہونا اور نفسانی خواہشات میں مشغول رہنا ان کو اچھا نظر آتا ہے۔[1]

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰۗىِٕفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤﴾

اور البتہ ہم نے ان امتوں کو ہلاک کر دیا جو تم سے پہلے تھیں، جب انھوں نے ظلم کیا، اور ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلوں کے ساتھ آئے، اور وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے۔ مجرم لوگوں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں ⑬ پھر ان کے بعد ہم نے تمھیں زمین میں جانشین بنایا، تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ⑭

پہلی قوموں کی ہلاکت میں عبرت اور نیابت:

اللہ پاک نے خبر دی ہے پہلے زمانے والوں کے حال کی، جنھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا اور ان کی آیاتِ بینات اور واضح دلیلوں کا انکار کیا تھا کہ ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، پھر تم کو ان کی جگہ خلیفہ کیا اور رسول بھیجا، تاکہ ہم دیکھیں کہ تم ہماری کیسی اطاعت کرتے ہو اور کس طرح رسول کی تابع داری کرتے ہو۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ دنیا شیریں اور سبز ہے اور اللہ اس میں تم کو خلیفہ بنانے والا ہے۔ پھر دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو، سو تم دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو۔ بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتوں ہی کی طرف سے تھا۔[2] (رواہ مسلم)

اس آیت اور حدیث میں آیندہ کی خبر دی ہے۔ یہ قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے، جیسا کہا ویسا ہی ہوا۔ عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک رسی آسمان سے نیچے لٹکتی ہے، اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچا۔ پھر ویسے ہی ہوا اس کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھینچا۔

[1] فتح البیان (٦/ ٢٥۔ ٢٧) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٤٢)

پھر لوگوں نے منبر کے گرد ناپا تو عمر رضی اللہ عنہ تین گز منبر کے گرد بڑھ گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ چھوڑ دے، اے عوف! ہم کو اس خواب کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ پھر جب عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو کہا: اے عوف! تمھارا خواب کیا تھا؟ عوف نے کہا: تم کو میرے خواب میں کیا حاجت ہے؟ تم نے مجھ کو اس وقت جھڑک نہیں دیا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تجھ کو افسوس ہو، میں نے اس بات کو مکروہ جانا کہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو ان کی موت کی خبر دے۔ تب عوف نے خواب کا قصہ بیان کیا، جب یہاں پہنچے کہ لوگ تین گز منبر کے گرد پہنچے تو کہا کہ ایک خلیفہ تھا اور دوسرا اللہ کی راہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کرتا اور تیسرا شہید ہے، پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِي الْاَرْضِ... الخ﴾ (آیتِ باب) اب اے عمر! تم خلیفہ ہوئے ہو، دیکھو تم کیسا کام کرو گے، یہ بات کہ میں اللہ کی راہ میں لومِ لائم سے نہیں ڈرتا ہوں، مراد اللہ کی مشیت ہے اور یہ بات کہ تیسرا شہید ہے، سو عمر کو کہاں شہادت ملے گی، سارے مسلمان اطاعت کرتے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے گزشتہ امتوں کو ہلاک کیا، یعنی ان کافروں سے پہلے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہیں یا اہلِ مکہ کو خطاب ہے، تاکہ ڈانٹ ڈپٹ میں مبالغہ سے وہ متوجہ ہو جائیں۔ ان کا یہ ہلاک کرنا جب ہوا کہ انھوں نے ظلم کیا اور رسولوں کو جھٹلایا اور گناہوں میں بہت زیادہ بڑھ گئے، پھر تو ان کے ہلاک کرنے میں کچھ دیر نہیں ہوئی، جس طرح تمھارے ہلاک کرنے میں تاخیر کی گئی، یا اس جگہ ظلم سے مراد شرک ہے، ان کے پاس رسول واضح نشانیاں لے کر آئے تھے جو ان کی سچائی پر دلالت کرتی تھیں، لیکن وہ کب ان پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کو یہ استعداد ہی نہ تھی، اللہ نے اپنے لطف و کرم کو ان سے سلب کر لیا تھا، سو مجرموں کو ایسی ہی سزا زمانے میں ملتی ہے کہ ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ ان کفار کے لیے سخت وعید ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے یا خاص اہلِ مکہ کے کافروں کو۔

پھر اللہ نے ان لوگوں کو خطاب کیا جن کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا اور کہا کہ دیکھو ہم نے تم کو ان زمانوں کے بعد خلیفہ بنایا جن کی خبریں تم نے سنی ہیں اور ان کی نشانیاں تم نے دیکھی ہیں، تاکہ ہم دیکھیں کہ ہر خیر و شر کے بارے میں تمھارا کیا طرزِ عمل ہے اور تم کس حالت پر رہو گے، وہ کام کرو گے جو خلیفہ کے منصب کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ یا اس جگہ نظر علم کے معنی میں ہے، اس آیت کی طرح: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ۲] ''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' اس کو امام واحدی اور رازی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے[2] یا ہم اس شخص کا سا معاملہ کریں جو دیکھتا ہے، اس صورت میں یہ استعارۂ تمثیلیہ ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (۱۵/ ۳۹) اس کی سند میں ''زید بن عوف'' ضعیف راوی ہے۔

[2] الوجیز للواحدي (۱/ ۴۹۲) تفسیر الرازي (۱۷/ ٤٤) [3] فتح البیان (٦/ ۲۷۔ ۲۸)

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ
بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ
تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ
عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ۝

اور جب ان پر ہماری واضح آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: تو اس کے علاوہ کوئی (دوسرا) قرآن لے آ یا اسے (کچھ) بدل دے۔ کہہ دیجیے: مجھے اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے (15) کہہ دیجیے: اگر اللہ چاہتا تو میں اس (قرآن) کی تم پر تلاوت نہ کرتا اور نہ وہ (اللہ) تمھیں اس کی خبر دیتا، چناں چہ میں اس (نبوت) سے پہلے تمھارے اندر ایک مدت ٹھہرا ہوں، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (16)

سردارانِ قریش کی ہٹ دھرمی، قرآن کی سچائی کا ثبوت اور رسول اللہ ﷺ کا کردار:

اس قرآن کا پند و نصیحت تو مانتے اور بتوں کو باطل کرنا نہ مانتے۔ کہتے: اتنا بدل ڈالیں تو یہ کلام ہم سب مان لیں گے۔ سو اگر میں اپنی طرف سے بناتا تو چالیس برس کی عمر میں بھی بناتا یا اس قسم کا خیال رکھتا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے تعنت (سخت رویّے) کی خبر دی ہے کہ یہ مشرکینِ قریش جو اللہ کے کلام سے روگرداں ہیں، ان پر جب نبی اکرم ﷺ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کی کھلی ہوئی حجتیں پڑھتے ہیں تو وہ یہ بات کہتے ہیں کہ تم اس قرآن کو پھیر دو اور کسی دوسری طرح کا کلام لاؤ اور اس کی وضع اور طرز بدل دو۔ اللہ نے اپنے نبی سے کہا تو کہہ دے کہ مجھ کو اپنی طرف سے اس کی تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے، میں تو ایک بندہ ہوں جو حکم کا پابند ہوں اور پہنچانے والا رسول ہوں۔ اللہ پاک کی طرف سے جیسے وحی آتی ہے میں ویسے ہی کرتا ہوں، مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو وہ مجھ کو عذاب میں پکڑ لے گا۔ پھر کلام کے صحیح ہونے پر یہ حجت بیان کی کہ اگر اللہ چاہے تو میں یہ کلام نہ پڑھوں نہ تم کو اس کا حال بتلاؤں، لیکن یہ کام تو اللہ کی اجازت اور مشیت سے کیا جاتا ہے اور اس بات کی دلیل کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں ہے اور میں نے اپنی طرف سے اسے افترا نہیں کیا، یہ ہے کہ تم اس کلام کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو اور تم میری سچائی اور امانت کا حال جب سے میں تم میں ہوں میرے رسول

مبعوث ہونے تک بخوبی جانتے ہو۔ تم مجھ پر کسی شے کا انتقاد نہیں کرتے ہو اور نہ میری کسی بات سے چشم پوشی کرتے ہو، کیا تم کو اتنی عقل نہیں ہے کہ تم حق کو باطل سے جدا کر سکو؟ اسی لیے جب روم کے بادشاہ ہرقل نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے نبی اکرم ﷺ کا حال پوچھا تھا اور کہا تھا: بھلا کیا تم اس پر جھوٹ بولنے کی تہمت لگا سکتے ہو اُس سے پہلے جب سے اس نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے تو ابوسفیان نے یہی کہا تھا کہ نہیں اور اس وقت ابوسفیان کفار اور مشرکین کے سردار تھے، اس کے باوجود انھوں نے سچی بات کا اعتراف کیا:

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

ہرقل نے کہا: میں جانتا ہوں کہ یہ بات نہیں ہوسکتی کہ وہ لوگوں پر جھوٹ بولنا چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے۔[1] جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حبشی بادشاہ نجاشی سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان میں ایک رسول مبعوث کیا ہے، جس کے صدق، نسب اور امانت کو ہم جانتے ہیں اور نبوت سے قبل اس کی ہمارے درمیان اقامت کی مدت چالیس سال ہے۔[2] سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تینتالیس سال، لیکن صحیح اور مشہور وہی قولِ اول ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب ان کافروں پر ہماری آیتیں جو توحید کے اثبات اور شرک کے باطل ہونے پر دلیل ہیں، پڑھی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو دوبارہ زندہ ہونے کا ڈر نہیں اور وہ قیامت کے منکر ہیں تو وہ یہ بات کہتے ہیں کہ تم اس قرآن کو بدل ڈالو کوئی اور نئی طرز کا کلام لاؤ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ مشرکینِ مکہ ہیں۔[4] ان کا یہ کہنا اس لیے تھا کہ قرآن میں بتوں کی مذمت کی گئی ہے اور ان کی عبادت کرنے والوں کے لیے شدید وعید ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا اس التماس پر پیش قدمی کرنا یا تو بطورِ مذاق و استہزا تھا یا بطورِ تجربہ و امتحان کہ اگر وہ اس کو بدل دیں گے تو ہم جان لیں گے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ نے ان کے اس سوال کا جواب سکھایا کہ تم ان سے یہ بات کہہ دو کہ یہ کلام کچھ میرا بنایا ہوا نہیں ہے کہ میں اس کو کسی اور طرز پر بدل دوں، بلکہ یہ تو اللہ کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔[5]

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ تم اس میں سے بعث بعد الموت اور قبروں سے اٹھنے کا ذکر نکال دو یا ان کے معبودوں کی برائی نہ پڑھو[6] اور بتوں کی عبادت کرنے والوں کو احمق نہ ٹھہراؤ۔ یا وعید کو وعدہ، حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دو۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ میں تو وحی کا تابع ہوں اور اس کی تبدیلی و تحویل و تحریف و تصحیف کے بغیر اس کا تابع ہوں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٣)
[2] مسند أحمد (١/ ٢٠١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٦/ ٢٤)
[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٣٥۔ ٥٣٦)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٣٤)
[5] تفسير الرازي (١٧/ ٤٦)
[6] معاني القرآن (٣/ ١١)

یومِ عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں گا تو اس دن مجھے عذاب ہوگا، ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر اللہ ہی چاہے کہ میں تم پر اس کو نہ پڑھوں اور تمھیں وہ احکام نہ بتاؤں تو البتہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں ایک عمر دراز تک تمھارے درمیان رہا ہوں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ کلام میرا نہیں۔ تم میری ہمیشہ کی سچائی اور امانت کی عادت کو جانتے ہو اور تمھیں معلوم ہے کہ میں نے کبھی وہ کتابیں جو انبیا پر اتری ہیں، نہیں پڑھیں اور نہ اہلِ علم کی کبھی شاگردی کی اور نہ میں کبھی طالبِ علم ہوا اور نہ اس کام پر کبھی حرص کی۔ پھر تمھارے پاس ایک ایسی کتاب لایا کہ اس جیسی تم ایک سورت، بلکہ ایک آیت بھی نہیں لا سکتے اور اس کے مقابلے سے عاجز ہو، حالانکہ تم مشہور عرب ہو اور تمھاری فصاحت و بلاغت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس فنِ بیان میں اس درجے تک پہنچے ہو کہ دوسرا کوئی نہیں پہنچا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے، تیرہ برس مکے میں رہے، وحی آتی رہی، پھر ہجرت کا حکم ہوا، دس برس ہجرت کے بعد گزرے، جب وفات ہوئی تو تریسٹھ برس کے تھے۔[1] (رواه ابن أبي شيبة والبخاري والترمذي، وعن السُّدي نحوه)

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے بارے میں تین روایتیں آئی ہیں، ایک ساٹھ سالہ ہونا، دوم پینسٹھ سالہ اور سوم تریسٹھ سالہ، یہی زیادہ صحیح اور مشہور ہے۔ اسی کو امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا انس، عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی حدیث میں روایت کیا ہے[2] اور علما اس پر متفق ہیں، باقی کی تاویل کی ہے۔ ساٹھ سالہ والی روایت میں اقتصارِ عقود و ترکِ کسر پر ہوا ہے (یعنی پانچ سے کم کے ہندسے کو چھوڑ دینا) اور پینسٹھ میں اشتباہ واقع ہوا ہے۔[3]

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑ لیا یا اس کی آیتوں کو جھٹلایا؟ بے شک مجرم فلاح نہیں پاتے (17)

سب سے بڑا ظالم... اللہ پر جھوٹ باندھنے والا:

یعنی اگر میں بناتا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں اور اگر میں سچا ہوں تو جھٹلانے والوں پر یہی بات ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں، یعنی نہیں ہے کوئی بڑا ظالم اور بڑا سرکش اور سخت مجرم اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ باندھے

(1) مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٣٢٩) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٢١) الدر المنثور (٤/ ٣٤٨)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤٨_ ٢٣٤٩_ ٢٣٥١)

(3) المنهاج للنووي (١٥/ ٩٩) فتح البيان (٦/ ٢٨_ ٣١)

اور کوئی بات بنائے اور یہ اعتقاد کرے کہ اللہ نے اس کو بھیجا ہے، حالانکہ اللہ نے اسے نہیں بھیجا، سو ایسے شخص سے بڑھ کر کوئی مجرم اور ظالم نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ کسی کند ذہن والے مرد پر بھی مخفی نہیں رہ سکتی۔ بہرحال ایسے شخص کا نبوت کے بارے میں دعویٰ کس طرح کسی پر مشتبہ رہ سکتا ہے جو کوئی یہ بات کہے کہ وہ سچا ہو یا جھوٹا تو ضروری ہے کہ اللہ پاک اس کی نیکی اور فجور پر ایسی دلیل کھڑی کرے گا جو سورج سے بھی زیادہ تر روشن ہوگی۔ جس نے محمد ﷺ اور مسیلمہ کذاب کو دیکھا ہے، اس پر دونوں کا فرق ایسا کھلا ہے جیسا کہ دوپہر اور آدھی رات میں فرق ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سچائی کی تصدیق:

ان دونوں کے خصال و افعال و کلام سے ہر صاحبِ بصیرت نبی اکرم ﷺ کی سچائی اور مسیلمہ، سجاح اور اسود عنسی کے کذب پر استدلال کرسکتا ہے۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب مدینے میں تشریف لائے تو لوگ آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے دوڑے، میں بھی انہی لوگوں میں سے تھا، میں نے جب آپ ﷺ کو دیکھا تو یہ پہچان گیا کہ آپ ﷺ کا چہرہ مرد کذاب کا سا چہرہ نہیں ہے۔ سب سے پہلے میں نے آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ بات سنی: "يَا أَيُّهَا النَّاس! أَفْشُوا السَّلَامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ"[1]

پھر جب ضمام بن ثعلبہ اپنی قوم بنو سعد بن بکر کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، جہاں اور باتیں کیں، ان میں آپ ﷺ سے یہ بات بھی کہی کہ اس آسمان کو کس نے اونچا کیا ہے؟ کہا: اللہ نے، کہا: ان پہاڑوں کو کس نے کھڑا کیا ہے؟ کہا: اللہ نے، کہا: اس زمین کو کس نے بچھایا ہے؟ کہا: اللہ نے، اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے اس آسمان کو اونچا کیا اور ان پہاڑوں کو کھڑا کیا اور اس زمین کو بچھایا، کیا اللہ نے تم کو سب لوگوں کی طرف بھیجا ہے؟ فرمایا: "اَللّٰهُمَّ نَعَمْ" یعنی ہاں، پھر اس نے نماز، زکات، حج اور صیام کا سوال کیا اور ان میں سے ہر ایک امر پر وہی قسم دلائی جو اوپر گزری اور نبی اکرم ﷺ نے بھی قسم کھا کر تصدیق کی، اس نے کہا: تم سچے ہو، قسم ہے اس کی جس نے تم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! میں اس پر نہ زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم۔[2] اس شخص نے صرف اس گفتگو پر اکتفا کیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی سچائی کی تصدیق کی، کیوں کہ آپ ﷺ کی سچائی کی پکی دلیلیں خود مشاہدہ کیں۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ.

سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٥١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٦٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢)

لَوْ لَمْ تَكُنْ فِيهِ آيَاتٌ مُبَيِّنَةٌ   كَانَتْ بَدَاهَتُهُ تُنْبِيكَ بِالْخَبَرِ

''اگر آپ کی ذات میں کھلی نشانیاں نہ بھی ہوتیں، آپ کا چہرہ ہی نبوت (کی دلیل) کے لیے کافی تھا۔''

مسیلمہ کذاب کا حال:

رہا مسیلمہ کذاب سو جس بصیرت والے نے اسے دیکھا ہے اور اس کا حال جانتا ہے اور اس کے اقوالِ رکیکہ اور غیر صحیحہ سنے ہیں اور اس کے افعالِ قبیحہ غیر حسنہ دیکھے ہیں اور اس کا قرآن جو اس کو قیامت کے حسرت وفضیحت کے دن ہمیشہ کے لیے آگ میں داخل کرے گا، سنا ہے وہ اس کے کذب کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے۔ اس آیت میں: ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ... الخ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ''وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کو سنبھالے ہوئے ہے، اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند'' اور مسیلمہ کذاب ۔لعنه الله۔ کے اس قول میں کتنا فرق ہے: ''يَا ضِفْدَعُ بِنْتُ ضِفْدَعَيْنِ، نَقِّي كَمْ تُنَقِّيْنَ، لَا الْمَآءَ تُكَدِّرِيْنَ، وَلَا الشَّارِبَ تَمْنَعِيْنَ'' اسی طرح اس کے قول میں: ۔لَعَنَهُ اللّٰهُ۔: ''لَقَدْ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَى الْحُبْلٰى إِذْ أَخْرَجَ مِنْهَا نَسَمَةً تَسْعٰى، مِنْ بَيْنِ صَفَاقٍ وَّحَشٰى'' اور اللہ اس کو جہنم میں دھکیلے! اس کا یہ قول: ''اَلْفِيْلُ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْفِيْلُ، لَهُ خُرْطُوْمٌ طَوِيْلٌ'' اور اللہ پاک اس کو اپنی رحمت سے دور رکھے! اس کا یہ قول: ''وَالعَاجِنَاتِ عَجْناً، وَالخَابِزَاتِ خُبْزاً، وَاللَّاقِمَاتِ لُقْماً، إِهَالَةً وَّسَمْناً، إِنَّ قُرَيْشاً قَوْمٌ يَعْتَدُوْنَ''

اس کے سوا اور بہت سے خرافات اور ہذیانات ہیں، جس کے تلفظ سے بچے عار کرتے ہیں، مگر مذاق اور استہزا کے طور پر اسی لیے اللہ نے اس کی ناک کو خاک آلودہ کیا اور اس نے حدیقہ کے دن موت کا شربت پیا اور اس کی جمعیت ٹوٹ گئی اور خود اس کے ساتھیوں اور دوستوں نے اس پر نفرت کی اور گھر والوں نے لعنت بھیجی اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس تائب ہو کر آئے اور اللہ پاک کے دینِ حق میں راغب ہوئے۔ صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ تم مسیلمہ ۔لعنه الله۔ کے قرآن میں سے کچھ پڑھ کر سناؤ۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمیں معاف کریں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہ مانا، بلکہ ان سے پڑھوایا، تاکہ جن لوگوں نے اس کا کلام نہیں سنا تھا وہ بھی سن لیں اور ہدایت اور علم جس پر یہ لوگ ہیں، اس کی فضیلت کو پہچان لیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی جو ہم نے ذکر کیا ہے اور اس کی مانند کچھ پڑھا، جب وہ پڑھ چکے تو صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَيْحَكُمْ أَيْنَ كَانَ يَذْهَبُ بِعُقُوْلِكُمْ، وَاللّٰهِ إِنَّ هٰذَا لَمْ يَخْرُجْ مِنَ اللّٰهِ'' ''یعنی افسوس ہے تم پر! تمھاری عقلیں تمھیں کہاں لے گئی تھیں، قسم ہے اللہ کی کہ یہ کلام اللہ کی طرف سے نہیں نکلا ہے۔''

حکایت:

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مسیلمہ کذاب کے پاس گئے، یہ جاہلیت میں اس کے دوست تھے، ابھی اسلام نہ لائے

تھے، مسیلمہ نے ان سے کہا: اے عمرو! افسوس ہے کہ تمھارے صاحب یعنی رسول اللہ ﷺ پر اس مدت میں کیا نازل ہوا؟ میں نے ان کے یاروں کو ایک سورتِ عظیمہ اور چھوٹی سی پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ کہا: وہ کیا ہے؟ کہا: ﴿ وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴾ إلى آخرہ مسیلمہ نے ایک ساعت تفکر کر کے کہا: مجھ پر بھی اسی طرح کی ایک سورت اتری ہے، کہا: وہ کیا ہے؟ کہا: "وَبَرُ يَا وَبَرُ إِنَّمَا أَنْتِ أُذُنَانِ وَصَدْرٌ وَسَائِرُكِ حَقْرٌ نَقْرٌ" پھر کہا: اے عمرو! تم اس کو کیسا دیکھتے ہو؟ عمرو نے کہا: واللہ! تو جانتا ہے کہ میں تم کو کذاب جانتا ہوں۔

سو جب یہ حال ایک مشرک کا اس کے زمانۂ شرک میں ہو کہ نبی اکرم ﷺ کا حال اور ان کی سچائی اور مسیلمہ ،لعنه الله، کا حال اور جھوٹ مشتبہ نہ ہو تو پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو صاحبِ بصیرت و عقل ہوں اور قلبِ سلیم مستقیم رکھتے ہوں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ [الأنعام: ۹۳] "اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا کہے کہ مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے، حالاں کہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں کی گئی، اور جس نے کہا کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر سکتا ہوں، جیسی اللہ نے نازل کی ہے۔" اسی طرح اس شخص سے، جس نے رسولوں کی تکذیب کی ہے، باوجود حق بات بیان ہونے کے اور قیامِ حجت کے، کوئی بڑھ کر ظالم نہیں ہے۔ حدیث میں آیا ہے: "أَعْتَى النَّاسِ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ مَنْ قَتَلَ نَبِيًّا أَوْ قَتَلَهُ نَبِيٌّ"[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: نضر کہتا تھا کہ قیامت کے دن لات اور عزیٰ میری شفاعت کریں گے، اس پر یہ آیت اتری کہ مجرم کو فلاح نہ ہوگی۔[2]

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ
هٰۤؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ
فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝١٨ وَمَا
كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝١٩

اور وہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان دیتی ہے اور نہ نفع دیتی ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دیجیے: کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ آسمانوں میں نہیں جانتا اور نہ زمین میں؟ وہ پاک اور بلند ہے ان سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں (18) اور

[1] ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ اس موضوع کی روایت "مسند أحمد" (۱/ ٤۰۷) میں مروی ہے۔ السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۸۱) تفسير ابن كثير (۲/ ۵۳٦۔ ۵۳۷)

[2] تفسير ابن أبي حاتم ٦۰/ ۱۹۳۵)

پہلے لوگ ایک ہی امت تھے، پھر انھوں نے (باہم) اختلاف کیا، اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے سے طے ہو چکی ہے تو ان میں اس چیز کے متعلق یقیناً فیصلہ کر دیا جاتا، جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ⑲

معبودانِ باطلہ کے عجز کا تذکرہ:

جو مشرک ہے سو یہی کہتا ہے کہ اللہ ایک ہے اور یہ شریک اس کی طرف سے ہم پر مختار ہیں۔ سو فرمایا کہ اگر اس نے مختار کیے ہوتے تو خود ان سے کیوں منع کرتا اور اگر کہیں کہ ہمارے دین میں منع نہیں کیا تم کو منع کیا ہوگا تو اگلی آیت میں اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا دین ایک ہے، جو لوگ بچل گئے ہیں ان کو بتا دیا گیا ہے کہ اعتقاد میں کچھ فرق نہیں ہے اور اگر کہیں کہ اگر تم سچے ہوتے تو ہم پر دنیا میں عذاب آتا، اس کا جواب بھی آگے ہے کہ فیصلے کا دن آتا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان مشرکوں پر انکار کیا ہے جو اللہ کے ساتھ غیر کو پوجتے ہیں، اس گمان پر کہ وہ معبودان کو نفع دیں گے اور اللہ کے نزدیک ان کی شفاعت کریں گے۔

سو اللہ نے کہا ہے کہ یہ نہ نفع دیں نہ نقصان پہنچائیں اور نہ کسی شے کے مالک ہیں اور کوئی چیز جس کا یہ اعتقاد رکھتے ہیں واقع نہ ہوگی اور ان کا زعم ہرگز سچا نہ ہوگا، اسی لیے فرمایا کہ کیا تم اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جس کو وہ آسمان اور زمین میں نہیں جانتا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ تم کیا اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جو آسمان و زمین میں نہیں ہوتی ہے۔ پھر اللہ نے شرک و کفر سے اپنی پاکی بیان کی ہے اور کہا ہے کہ اللہ ان کے شریک کرنے سے پاک ہے۔[1]

توحید اصل ہے اور شرک بدعت ہے:

پھر یہ خبر دی کہ یہ شرک لوگوں میں پہلی دفعہ نکلا ہے، اس سے پہلے نہیں تھا، وہ سب کے سب ایک ہی دین پر تھے، جس کا نام اسلام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان دس قرن گزرے، سب کے سب مسلمان تھے، پھر لوگوں میں اختلاف پڑا، بت پرستی ہونے لگی، بتوں اور آستانوں کی پوجا کرنے لگے، اللہ نے رسولوں کو اپنی آیاتِ بینات و موثر حجتیں اور واضح دلیلیں دے کر خلق کی طرف بھیجا، تاکہ ہلاک ہونے والا اور زندہ ہونے والا بینہ سے ہلاک و زندہ ہو۔ اللہ نے یہ بات ٹھہرا دی تھی کہ وہ کسی کو عذاب نہ کرے گا، مگر قیامِ حجت کے بعد اور خلق کے لیے ایک معین مدت مقرر کر دی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج ہی وہ مومنین کو سعادت مند اور کافروں کو بدبخت کر دیتا۔[2]

---

① تفسیر الطبري (١٥/ ٤٦۔ ٤٧) ② تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٣٨)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ مشرک لوگ اللہ کو چھوڑ کر غیر کی پرستش کرتے ہیں، یہ بات نہیں کہ انھوں نے اللہ کی عبادت کو بالکل چھوڑ دیا ہو، ان کا مقصد اس غیر اللہ کی عبادت سے اللہ کا تقرب حاصل کرنا اور شفاعت ہے۔ سو غیر کی یہ شان نہیں کہ وہ نفع دینے یا نقصان دینے والا ہو سکے۔ معبود کی تو یہ شان ہونی چاہیے کہ وہ فرماں برداری پر ثواب دے اور نافرمانی پر سزا دے۔ اس جگہ بتوں کے نفع اور نقصان پہنچانے کی نفی باعتبار ذات کے فرمائی ہے اور سورت حج کی اس آیت میں یہ نفی باعتبار سبب کے کی ہے: ﴿ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ﴾ [الحج: ١٣] ''وہ اسے پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے۔'' دونوں کے درمیان کچھ تضاد نہیں۔ یہ مشرک اپنے زعم میں شرکا کو آخرت کے دن اپنا سفارشی سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ان کے گناہوں پر عذاب نہ کرے گا۔[1] (قالہ ابن جریج)

سو یہ انتہا درجے کی گمراہی ہے، اس لیے کہ کسی ایسے شخص سے آخرت میں شفاعت کی توقع اور انتظار کرتے ہیں جو حال میں کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس شفاعت سے مراد احوالِ دنیا کی اصلاح ہے، کیوں کہ وہ لوگ تو مر کر دوبارہ زندہ ہونے اور حشر کی ہولناکیوں کے منکر ہیں۔[2] اللہ نے فرمایا کہ کیا تم اللہ کو وہ بات بتلاتے ہو جو اس کو آسمانوں اور زمین میں معلوم نہیں۔ اس بات سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی بادشاہت اور ملک میں اس کے شریک ہیں جن کی عبادت اللہ کی طرح کی جاتی ہے یا یہ بات ہے کہ تمھارے سفارشی ہیں جو اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت کریں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کی ساری مخلوقات میں سے کسی شریک کا یا اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرنے والے کا علم نہیں ہے۔

اس کلام کا حاصل یہ ہے کہ ایسے شخص کا وجود نہیں ہے اور اس میں کافروں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ اس شرک سے پاک ہے۔ پھر فرمایا کہ آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک اور عہدِ ابراہیم علیہ السلام سے عمرو بن لحی تک سارے لوگ مومن اور موحد تھے، کیوں کہ توحید اور اسلام ایک ملتِ قدیم ہے۔ سارے لوگوں کا اسی ملت پر اجماع ہے اور شرک اور شرک کی فروعات جہالت کے کام ہیں، جن کو گمراہ لوگوں نے ایجاد و اختراع کیا ہے۔ پھر لوگ مختلف ہو گئے، کوئی کافر بن گیا اور کوئی مومن رہا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عرب ہیں جو شرک پر تھے اور ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر بلوغ کے وقت مختلف ہو جاتا ہے،[3] لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ ہر گروہ نے کفر کی ایک ملت نکال لی ہے، دوسری ملت کے خلاف، بلکہ مراد یہ ہے کہ بعض لوگ کافر ہو گئے اور بعض توحید پر باقی رہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ سب ہدایت پر تھے۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد فقط آدم علیہ السلام

---

[1] تفسیر الخازن (٣/ ١٨٠)
[2] تفسیر الخازن (٣/ ١٨٠)
[3] معاني القرآن (٣/ ١١۔ ١٢)
[4] الدر المنثور (٤/ ٣٤٩)

ہیں۔ پھر جب ہابیل مارے گئے تو لوگ مختلف ہو گئے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب لوگ ایک دین آدم علیہ السلام پر تھے، پھر کافر ہو گئے[1] اور اگر اللہ کی بات پہلے سے طے شدہ نہ ہوتی تو اسی جگہ دنیا میں عذاب اتارتا اور مکذبین کو سزا دینے میں جلدی کرتا اور ان کے اختلاف کا فیصلہ ہو جاتا، لیکن اس کلمۂ سابقہ کی وجہ سے یہ بات رک گئی ہے۔ یا مراد یہ ہے کہ ابھی قیامت قائم کر کے فیصلہ کر دیتا یا ان کے ہلاک سے فارغ ہو جاتا۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَلِمَةٌ ﴾ یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے اس امت کو مہلت دی ہے، ان کو دنیا میں عذاب سے ہلاک نہ کرے گا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ﴿ كَلِمَةٌ ﴾ یہ ہے کہ کسی کو بے حجت نہیں پکڑتا، وہ حجت رسولوں کا بھیجنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] ''اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔'' بعض نے کہا ہے کہ ﴿ كَلِمَةٌ ﴾ یہ ہے: ''سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ''[3] ماضی کو صیغہ مضارع میں حالِ ماضی کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾

اور وہ کہتے ہیں: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی؟ تو آپ کہہ دیجیے: یقیناً غیب تو اللہ ہی کے لیے ہے، پھر تم انتظار کرو، بے شک میں (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں (20)

معجزے کا مطالبہ:

یعنی اگر کہیں کہ ہم کس طرح جانیں کہ تمھاری بات سچ ہے، فرمایا کہ آگے دیکھو حق تعالیٰ اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل اور برباد ہو جائیں گے، سو ویسا ہی ہوا۔ سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے، فیصلے کا دن دنیا میں نہیں ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافر مکذبین اور معاندین کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری، جیسے کہ ثمود کو اونٹنی ملی تھی۔ یا کوہِ صفا سونے کا ہو جاتا، یا مکے کے پہاڑ جاتے رہتے اور ان کی جگہ باغات ہوتے اور نہریں جاری ہوتیں، یا اس طرح کی کوئی اور نشانی ملتی جس پر اللہ قادر ہے، لیکن وہ تو اپنے افعال و اقوال میں حکیم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ﴿١٠﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ﴾ [الفرقان: ١٠۔ ١١] ''وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جو اگر چاہے تو آپ کے لیے اس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٣٦۔ ١٩٣٧) [2] تفسير القرطبي (٨/ ٣٢٣) [3] فتح البيان (٦/ ٣٢۔ ٣٥)

سے بہتر (چیزیں) بنا دے، (یعنی) ایسے باغ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں اور آپ کے لیے محلات بنا دے۔ لیکن انھوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اس شخص کے لیے جو قیامت کو جھٹلائے، بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔''

نیز جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩] ''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو صرف ڈرانے کے لیے نشانیاں بھیجتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری مخلوقات میں میری سنت اور عادت یہ ہے کہ جب میں ان کے سوال کو پورا کرتا ہوں، پھر اگر وہ ایمان لے آئیں تو خیر، ورنہ پھر ان کو سزا دینے میں جلدی کرتا ہوں، اسی لیے نبی اکرم ﷺ کو اختیار دیا گیا کہ ہم ان کی مانگی ہوئی چیز ان کو دیں، اگر وہ ایمان لائیں تو بہتر، ورنہ ان کو عذاب کیا جائے یا ان کو ہم مہلت دیں، جیسا تم کہو ویسا ہی کریں تو نبی اکرم ﷺ نے مہلت اختیار کی، جس طرح کہ بارہا ان سے حلم کیا۔

معجزہ صادر کرنے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے:

اسی جگہ سے اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو یہ جواب ارشاد کیا کہ غیب یعنی یہ سب امر اللہ پاک کے اختیار میں ہیں، وہ ہر کام کا انجام خوب جانتا ہے، سو تم بھی راہ دیکھو اور میں بھی راہ دیکھتا ہوں، اگر تم اپنے سوال کے پورا ہوئے بغیر ایمان نہیں لاتے تو پھر اپنے بارے میں اور میرے بارے میں اللہ کے حکم کا انتظار کرو، حالانکہ وہ اس سوال سے بڑھ کر اللہ کی نشانی کا مشاہدہ کر چکے تھے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ان کے سامنے شبِ بدر میں اللہ کے حکم سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا، ایک پہاڑ کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف۔

یہ دنیا کی ان تمام نشانیوں سے، جس کے وہ سائل تھے یا نہ تھے، بڑھ کر نشانی تھی اور اگر اللہ جانتا کہ ان کا یہ سوال ہدایت حاصل کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے لیے ہے تو اس کو قبول کر لیتا، لیکن اللہ نے جان لیا کہ وہ سوال دشمنی اور عیب جوئی کے لیے کرتے ہیں، اس لیے ان کو ان کے شک و شبہہ میں چھوڑ دیا اور معلوم کر لیا کہ ان میں کوئی ایمان نہ لائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۹۶ وَلَوْ جَاۗءَتْھُمْ كُلُّ اٰيَةٍ ﴾ [يونس: ٩٦-٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١١] ''اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو

بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"

ان لوگوں میں ایک دوسرے سے بحث کا مقابلہ کرنے کی عادت تھی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴾ [الحجر: ١٤] "اور اگر ہم ان پر آسمان سے ایک دروازہ کھول دیں، پھر وہ اس پر چڑھنے لگیں۔" نیز فرمایا: ﴿ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴾ [الطور: ٤٤] "اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھیں تو وہ کہیں گے: (یہ) تہ بہ تہ بادل ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ [الأنعام: ٧] "اور (اے نبی!) اگر ہم کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب آپ پر نازل کرتے، پھر وہ اپنے ہاتھوں سے اسے چھوتے تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ ضرور کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔" سو ایسے لوگ اس قابل نہیں کہ ان کی بات کا جواب دیا جائے، کیوں کہ ان کے سوال کا جواب دینے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان کے سوال کا مدار بغض و عناد پر ہے۔ یہ لوگ گناہ کرنے اور فساد کرنے میں بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تم منتظر رہو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ بات کہنے والے اہلِ مکہ تھے۔ وہ کھلی نشانیوں اور واضح معجزوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے، حالانکہ اگر کوئی نشانی نہ بھی آتی سوائے ایک قرآن کے تو یہی ایک نشانی روشن دلیل اور مصدوق قاطع ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جس نشانی کا ہم سوال کرتے ہیں، جیسے: مردوں کا زندہ کر دینا اور پہاڑ کا سونا ہو جانا، وہ نشانی رب کی طرف سے کیوں نہیں آتی، جیسے کہ پہلے انبیا کو نشانیاں ملی تھیں، اونٹنی اور ید بیضا کی طرح کی نشانیاں۔ اللہ نے کہا: اے پیغمبر! تم ان کو یہ جواب دو کہ غیب اللہ کے پاس ہے اور اس کا علم نہ مجھ کو ہے نہ تم کو اور نہ کسی اور مخلوق کو۔ میرا کام تو فقط پہنچا دینا ہے، سو میں اور تم دونوں انتظار کریں کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان کیا فیصلہ کرتا ہے، یعنی وہ حق کو باطل پر غلبہ دے گا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو اپنے عذاب اور سزا سے ڈرایا[2] اگر وہ ایمان نہ لائیں گے۔ سو بے شک بے ایمان لوگ آگ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں۔[3]

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝۲۱ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٣٨۔ ٥٣٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٣٧) [3] فتح البيان (٦/ ٣٥)

إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا
جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا
أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا
مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ
يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ
عَلَىٰ أَنفُسِكُم ۖ مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم
بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٢٣﴾

اور جب ہم ان (کافر) لوگوں کو تکلیف پہنچنے کے بعد (اپنی) رحمت (کا مزہ) چکھاتے ہیں تو وہ فوراً ہی ہماری آیتوں میں ان کے لیے چالیں ہوتی ہیں (جو وہ چلتے ہیں) کہہ دیجیے: اللہ سب سے تیز تر ہے چال (چلنے) میں۔ بے شک ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لکھتے جاتے ہیں جو تم مکر و فریب کرتے ہو (21) وہی ہے (اللہ) جو تمھیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے، حتی کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انھیں (سواروں کو) پاکیزہ (موافق) ہوا کے ساتھ لیے چلتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں، تو اچانک ان (کشتیوں) پر طوفانی ہوا آ پہنچتی ہے اور لہریں ان پر ہر طرف سے امڈ آتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ بے شک وہ (طوفان میں) گھیر لیے گئے ہیں (تو اس وقت) خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہوئے اسے پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس (طوفان) سے نجات دی تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے (22) پھر جب اس (اللہ) نے انھیں نجات دے دی تو وہ فوراً ہی زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمھاری سرکشی (کا وبال) تمھاری (اپنی ہی) جانوں پر ہے، (تم) دنیاوی زندگی کا فائدہ (اُٹھا لو)، پھر تمھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ہم تمھیں بتائیں گے جو عمل تم کیا کرتے تھے (23)

تکلیف کے بعد آسایش پہنچنے پر انسان کا رویہ تلون اور تکذیب:

یعنی سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر اللہ پر رہتی ہے، جب کام بن گیا تو لگا اسباب پر رکھنے، سو ڈرتا نہیں کہ اللہ اسی تکلیف کا ایک اور سبب کھڑا کر دے، اس کے ہاتھ میں اسباب تیار ہیں، اسی طرح کی ایک صورت آگے فرمائی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے خبر دی کہ جب ہم تکلیف کے بعد رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں، جیسے سختی کے بعد سہولت، تنگی کے بعد آسانی اور قحط کے بعد بارش اور اس جیسی اور رحمتیں تو یہ لوگ ہماری آیتوں

میں مکر کرنے لگتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی مذاق کرنے اور جھٹلانے کے طریقے سے،[1] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسٰنَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۚ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ [یونس: ۱۲] ''اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، اپنے پہلو پر (لیٹے) یا بیٹھے یا کھڑے ہوئے، پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ (یوں) گزر جاتا ہے، جیسے اس نے خود کو تکلیف پہنچنے پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے (برے) عمل پرکشش بنا دیے گئے۔''

صحیح میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی، اس رات کو پانی برسا تھا، پھر فرمایا: تم جانتے ہو کہ آج کی رات تمھارے رب نے کیا کہا؟ بولے: اللہ اور اس کا رسول جانے، فرمایا: یہ کہا کہ میرے بندوں میں سے کسی نے صبح کی مومن ہو کر اور کسی نے کافر ہو کر، جس نے کہا کہ ہم کو پانی ملا اللہ کے فضل و رحمت سے وہ میرے ساتھ ایمان رکھنے والا ہے اور ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والا ہے اور جس نے کہا کہ ہم کو پانی فلاں فلاں نچھتر سے ملا، وہ میرا کافر ہے اور ستاروں کا مومن ہے۔[2]

اللہ کا طریقہ:

پھر اللہ نے ذکر کیا کہ اللہ مکر میں سریع تر ہے، یعنی اس کا استدراج (درجہ بدرجہ رکھنا) اور امہال (مہلت دینا) بہت سخت ہے، یہاں تک کہ مجرموں میں سے گمان کرنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ عذاب نہ کرے گا، حالانکہ وہ مہلت میں ہوتا ہے، پھر بے خبری میں اچانک اس کو پکڑ لیتا ہے اور کاتبین کرام (فرشتے) جو کچھ وہ کرتا ہے اس سب کو لکھتے اور شمار کرتے رہتے ہیں، پھر اس لکھے ہوئے کو عالم غیب و شہادت کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ ہر بڑے اور چھوٹے اور تل برابر اور کھجور کے چھلکے کے برابر حقیر سے حقیر عمل پر بدلہ دے گا۔ پھر خشکی و تری میں ان لوگوں کے چلنے پھرنے کا ذکر کیا کہ ہم ان کی نگہبانی کرتے ہیں۔

مشرکوں کا مشکل میں صرف ایک اللہ کو پکارنا اور بعد کا رویہ:

موافق ہوا کے چلنے سے ان کی کشتی بہت جلدی سے روانہ ہوتی ہے، اس سے ان کا دل خوش ہوتا ہے، اتنے میں کوئی تیز ہوا آ جاتی ہے اور دریا ہر طرف سے موجزن ہوتا ہے، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم پھنس گئے، تب یہ صرف اللہ کو پکارنے لگتے ہیں، کسی بت اور آستانے کو اللہ کے ساتھ نہیں پکارتے، بلکہ خالص اللہ ہی سے دعا اور آہ و زاری کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٩)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١)

اَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْاِنْسٰنُ كَفُوْرًا﴾ [بني إسرائیل: ٦٧] ''اور جب سمندر میں تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ جنھیں تم اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہو، گم جاتے ہیں، پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

اس جگہ نجات پر شکر گزاری کا ذکر کیا ہے، اس شکر سے مراد ترکِ شرک ہے کہ جس طرح اس دم ہم نے فقط تم کو پکارا ہے، اسی طرح ہم تنہا تیری ہی عبادت کریں گے، کسی کو تیرا شریک نہ ٹھہرائیں گے، لیکن جب اللہ ان کو اس ورطۂ حیرت سے نجات دیتا ہے تو پھر زمین میں اتر کر وہی بغاوت یعنی ناحق شرک و کفر کرنے لگتے ہیں، گویا ان کو کوئی تکلیف پہنچی ہی نہ تھی اور نہ انھوں نے توحید اور ترکِ شرک کا کوئی اقرار کیا تھا۔ اس پر اللہ نے فرمایا کہ سن رکھو کہ تمھاری یہ سرکشی خود تمھاری ہی جانوں پر ہے، اس کا وبال تم پر ہے نہ کہ کسی اور کی جان پر۔

حدیث میں آیا ہے کہ کوئی گناہ اس سے زیادہ اس لائق نہیں کہ اللہ اس کی سزا دینے میں اس دنیا کے اندر ہی جلدی کرے، علاوہ اس سزا کے جو باغی کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر رکھی ہے، اس کی بغاوت اور قطع رحمی کے بدلے میں۔[1] دنیا کی زندگی میں تمھارا یہ طرزِ عمل ایک حقیر اور معمولی چیز ہے، پھر آخر کو ہمارے ہی پاس آؤ گے، ہم اس وقت تم کو تمھارے اعمال کے بارے میں آگاہ کریں گے۔ اب جو کوئی خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو کوئی اور طرح پائے تو وہ اپنی جان کو کوسے اور ملامت کرے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ رحمت چکھانے سے مراد رزق کی فراخی، بارش کے ذریعے سے اپنی نعمتیں فروانی کے ساتھ دینا، مثلاً: خوش حالی اور پھلوں کی بہتری وغیرہ ہے، اور ضُرّ (تکالیف) سے مراد خشک سالی اور تنگیِ معاش ہے۔ سو یہ لوگ اس نعمت کی تو کچھ قدر نہیں کرتے، بلکہ اس کو اپنے بتوں اور آستانوں کی طرف منسوب کرتے ہیں، جن کو کچھ خاک بھی نفع و نقصان کا اختیار نہیں، بلکہ ان کو علم اور شعور تک نہیں ہے اور اللہ کی نشانیوں میں طعن کرنے والے ہر حیلہ اور بہانہ سے آیاتِ الٰہیہ کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ مکر سے یہی مراد ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نہیں کہتے کہ یہ رزق ہم کو اللہ نے دیا ہے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بارش ہمیں فلاں پچھتر سے ملی ہے، تارے کی تاثیر سے پانی برسا ہے۔[3] اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ کا مکر تمھارے مکر سے بھی زیادہ تیز ہے، یعنی اس کی سزائیں اور پکڑ۔ اس کو بڑی قدرت ہے کہ تمھیں جلدی جزا دے، صیغہ افعل التفضیل

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٩٠٢) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٥١١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٢١١) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٧٠٤)

[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٣٩۔ ٥٤٠) [3] تفسیر البغوي (٤/ ١٢٧)

سے معلوم ہوا کہ ان کا مکر اور حیلہ سریع (تیز) ہوتا ہے، مگر اللہ کا مکر ان کے مکر سے بھی زیادہ تیز رفتار ہے۔ اللہ کی عقوبت کا نام مکر رہا۔ یہ بابِ مشاکلت (جس طرح کا لفظ بولا جائے مقابلے میں اسی طرح کا لفظ بولنا) سے ہے۔ قرآن مجید میں یہ عبارت اور محاورہ بہت جگہ آیا ہے۔

پھر یہ وعید بھی سنا دی کہ تمھارے یہ سارے کرتوت ہمارے فرشتے لکھتے رہتے ہیں۔ تم یہ نہ سمجھو کہ تمھارا کوئی فعل اور قول خواہ ظاہر ہو یا باطن، ہم پر مخفی رہتا ہے۔ نہیں ہمیں سب حالات معلوم ہیں، ان افعال کا بدلہ ہوگا۔ تم اتنا نہیں دیکھتے کہ صحرا اور دریا میں تمھیں چلانا پھرانا اور سیر کرانا کس کا کام ہے۔ تم جب گھرے دریاؤں اور سمندروں میں سوار ہوتے ہو تو اللہ ہی تم سے ہلاکت کے ذریعوں کو دور رکھتا ہے، ورنہ کس کی طاقت ہے کہ اس ہلاکت کی جگہ سے ساحلِ نجات پر لائے۔ لفظ فلک کا استعمال واحد اور جمع پر یکساں طور پر آتا ہے اور مذکر و مونث پر بولا جاتا ہے۔ لفظ فلک کی حرکات میں تبدیلی اعتباری ہے، پس بس۔ اس التفات میں احسان جتلانا اور اپنی نعمت کا اظہار کرنا ہے، کیوں کہ دریاؤں اور سمندروں کا سفر کرنے والے مومن اور کافر دونوں ہوتے ہیں اور خطاب ان سب کو ہے، تاکہ صالح ہمیشہ شکر کرے اور شاید بدکردار نصیحت حاصل کرے اور اس نعمت کو یاد کرے۔ ﴿ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ ﴾ سے مراد نرم ہوا ہے جو کشتی کو آرام اور سکون کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف لے جاتی ہے۔ ع

کشتی شکستگانیم اے باد شر بر خیز باشد کہ باز بینم آن یار آشنا را

''ہم ٹوٹی کشتی والے ہیں، اے ہوا! فساد سے باز آ، تاکہ ایسا ہو کہ میں اُس آشنا دوست کو دوبارہ دیکھ سکوں۔''

بالجملہ شرط میں تین اُمور بیان کیے: ایک کشتی میں بیٹھنا، دوسرے کشتی کا ان کو لے کر اچھی ہوا سے چلنا اور تیسرے ان کا خوش ہونا۔ اور جزا میں بھی تین امور کا اعتبار کیا: ایک تند ہوا کا چلنا، دوسرے ہر جانب سے موج کا اٹھنا، موج دریا میں پست پانی کے اونچا ہونے کو کہتے ہیں، یعنی دریا پر سخت حرکت اور پانی کے اختلاف کو اور تیسرے اس طوفان میں گھِر جانے کا گمان، یعنی ہلاک ہونے کا۔ لفظ ظن اس جگہ یقین کے معنی میں ہے یا مراد ہلاکت کے قریب ہونا ہے، سو اس حال میں وہ صرف اللہ کو پکارتے ہیں اور دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہیں، یعنی شرک کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی، جس طرح کہ اور موقعوں پر بتوں کو اپنی دعاؤں میں شریک کرتے ہیں۔ سو دعا کا یہ اخلاص اس لیے نہیں تھا کہ وہ صرف اللہ پر ایمان رکھتے تھے، بلکہ اس لیے تھا کہ اس ورطۂ ہلاک سے جس کے اندر پھنس گئے ہیں، بچ جائیں، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی اور اس بلا سے نکالنے والا نہیں ہے۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ مخلوق کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ سختیوں میں اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور مظلوم کی بددعا قبول ہوتی ہے، اگرچہ کافر ہو۔

جاہلیت کے مشرکوں اور آج کے مسلمانوں کا رویہ اور نواب صاحب کا حقیقی واقعہ:

اس آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ ان مشرکوں کو اس حالت میں اور اس جیسی دوسری حالتوں میں اپنے بتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی تھی۔ اس جگہ اس حدث اور بدعت پر تعجب آتا ہے جو اسلام میں نکلی ہے کہ ایک گروہ مسلمانوں کا مردوں پر اعتقاد رکھتا ہے، پھر جب ان کو دریا میں ایسی حالت پیش آتی ہے تو مردوں کو پکارتے ہیں اور اللہ کے لیے دعا کو خالص نہیں کرتے، جس طرح کہ اگلے مشرک کیا کرتے تھے۔[1]

۱۲۸۵ھ میں جب فریضۂ حجۃ الاسلام ادا کرنے کے لیے بمبئی کی بندرگاہ سے حجاز کا سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو "فتح سلطان" نامی ایک جہاز تھا، اس کو راستے میں ایک دفعہ تیز ہوا کی وجہ سے کچھ خطرہ پیش آیا تو ملاح اور اس کے خدام وغیرہ نے "یا عید روس محي النفوس" پکارنا شروع کیا، کسی نے اللہ کا نام نہ لیا، سوائے غریب حاجیوں کے۔ مجھ کو یہ حال دیکھ کر سخت خطرہ دامن گیر ہوا اور اس خالص شرک کی وجہ سے جہاز کے غرق ہو جانے کا خوف دل پر چھا گیا۔ حصن حصین وغیرہ کا ختم کیا اور اضطراری حالت میں اللہ تعالیٰ سے نجات کی دعا کی۔ اللہ نے اپنے فضل و رحمت سے ہم کو بچا لیا اور اس ہلاکت کے خوف سے نجات دی۔ وہ ملاح ایک مسلمان میمن جاہل مشرک تھا، اللہ کو گویا پہچانتا ہی نہ تھا۔ اس وقت ایک سخت حیرت تھی کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ اگلے مشرک تو اس حالت میں تجھی کو پکارتے تھے اور یہ نام کے مسلمان اس جان کے خطرے میں بھی تجھ کو نہیں پکارتے، اپنے پیروں کو جو ان کے لیے مشرکوں کے آستانوں اور بتوں کی طرح ہیں، اس خطرناک حالت میں پکارتے ہیں۔ ایسے جہازِ شرکِ انبار کا نہ ڈوبنا عجیب تھا، لیکن اللہ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے اور غالب ہے، اس لیے ہم سب گناہ گار باوجود گناہوں کے اس انبار کے اس ہلاکت سے بچ گئے۔ وللہ الحمد.

اس جگہ فتح البیان کی عبارت یہ ہے: فَانْظُرْ هَدَاكَ اللّٰهُ مَا فَعَلَتْ هٰذِهِ الْاِعْتِقَادَاتُ الشَّيْطَانِيَّةُ، وَأَيْنَ وَصَلَ بِهَا أَهْلُهُمْ، وَإِلٰى أَيْنَ رَمٰى بِهِمُ الشَّيْطَانُ، وَكَيْفَ اقْتَادَهُمْ، وَتَسَلَّطَ عَلَيْهِمْ، حَتّٰى انْقَادُوْا لَهُ انْقِيَاداً، مَا كَانَ يَطْمَعُ فِيْ مِثْلِهِ وَلَا فِيْ بَعْضِهِ مِنْ عُبَّادِ الْأَصْنَامِ، فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

اللہ نے فرمایا کہ یہ مشرک لوگ جب دریا سے نجات پا کر زمین میں آتے ہیں تو بجائے شکر گزاروں جیسے افعال کرنے کے منکرین جیسے افعال کرتے ہیں اور شکر کے بجائے بغاوت اور فساد کرنے لگتے ہیں، یہ ان کا فساد دنیا کے چاروں طرف ہوتا ہے اور اگرچہ بغاوت ناحق ہی ہوا کرتی ہے نہ کہ حق سے، لیکن لفظ ﴿ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کا یہ فعل کسی شک و شبہے کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ سرکشی اور دشمنی کی بنا پر ہے اور بعض

[1] فتح البیان (٦/ ٣٦۔ ٤٠)

نے کہا ہے کہ بَغْی کہتے ہیں حد سے تجاوز کرنے کو اور یہ قابلِ تعریف ہوتا ہے، اگر عدل سے احسان کی طرف اور فرائض سے نوافل کی طرف ہو۔ اور قابلِ مذمت ہوتا ہے، اگر حق سے باطل کی طرف یا کسی شبہے کی طرف ہو۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کبھی کوئی بَغْی حق ہوتا ہے جیسے اہلِ اسلام کا کفر کی سرزمین پر استیلاء اور ان کے گھروں کا ڈھا دینا اور ان کی کھیتیوں کا جلا دینا اور ان کے درختوں کا اکھاڑ دینا جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ نے بنی قریظہ کے ساتھ کیا تھا۔[1] سو اسی ﴿ بِغَيْرِ الْحَقِّ ﴾ کی قید لگانے کا یہی فائدہ ہے۔

بغاوت کا وبال باغی ہی اٹھاتا ہے:

پھر اللہ نے بَغْی کا انجام بتایا کہ اس کا وبال باغی ہی کی جان پر پڑتا ہے۔ دنیا کی اس زندگی میں وہ کچھ ذرا سا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں، پھر ان کی بغاوت کا انتقام ہوتا ہے اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ بَغْی ایک ایسی شے ہے جو جلدی زوال پذیر ہونے والی اور جلد ہی نیست و نابود ہونے والی ہے جس طرح کہ سب مال و متاع کا حال ہے کہ جلد ہی متلاشی ہو جاتے ہیں، اس میں کچھ بڑا فائدہ یا نفع نہیں ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: "ثَلَاثٌ هُنَّ رَوَاجِعُ عَلٰى أَهْلِهَا: اَلْمَكْرُ، وَالنَّكْثُ وَالْبَغْيُ" پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ ﴾ [یونس: ٢٣]، ﴿ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ﴾ [الفاطر: ٤٣]، ﴿ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾ [الفتح: ١٠][2] (أخرجه أبو الشيخ وابن مردويه وأبو نعيم والخطيب)

امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے: "ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ كُنَّ عَلَيْهِ: اَلْمَكْرُ، وَالْبَغْيُ، وَالنَّكْثُ"[3] بعض نے کہا ہے کہ قرآن سے ایک اور چیز بھی معلوم ہوئی، اس کو بھی ان تینوں چیزوں کے ساتھ ملانا چاہیے کہ وہ بھی اپنے فاعل ہی پر لوٹ کر آتی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [البقرة: ٩] ''وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں۔''[4]

میں کہتا ہوں کہ یہ خَدْع چوتھی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ مکر کی قسم میں داخل ہے۔ تو حدیث کے موافق تین ہی چیزیں قائم رہیں۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰۤى اِذَاۤ

---

[1] الکشاف (٢/ ٣٢٣)

[2] الدر المنثور (٤/ ٣٥٢) اس کی سند میں ''مروان بن صبیح'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٩٥٠)

[3] الدر المنثور (٤/ ٣٥٣) [4] فتح البيان (٦/ ٤٠۔ ٤٣)

اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَ ازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ
قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ
لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾
وَاللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

بے شک دنیاوی زندگی کی مثال تو اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اُتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کی نباتات مل جال گئیں جس میں سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، حتی کہ جب زمین نے اپنی رونق پکڑی اور مزین ہوگئی اور زمین والوں نے سمجھا کہ بے شک وہ اس (فصل کاٹنے) پر قادر ہیں تو ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کو (اچانک) آ گیا، چناں چہ ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا، گویا کل وہ تھی ہی نہیں، اسی طرح ہم (اپنی) آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں (24)
اور اللہ سلامتی کے گھر (جنت) کی طرف بلاتا ہے، اور وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے (25)

دنیا کی زندگی پھلنے پھولنے اور زوال پذیر ہونے کی مثال:

یعنی روح آسمان سے آئی، بدن میں مل کر قوت پکڑی، پھر کام کیے انسانی اور حیوانی، جب ہر ہنر میں پورا ہو گیا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسا ہوا، اچانک موت آ پہنچی، ہمارا حکم پہنچا، یعنی پک کر زرد ہوگئی، پھر کٹی یا کوئی فوج آ پڑی کہ کچی ہی کاٹ ڈالی، یعنی موت اچانک آتی ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے دنیا کی زندگی کے پھلنے پھولنے اور زینتِ حیاتِ دنیا کی اور تیزی سے اس کے مکمل ہونے اور زوال پذیر ہونے کی مثال سبزے سے دی جس کو زمین سے نکالا ہے، آسمان سے پانی برسا کر۔ لوگ سبزیوں اور پھلوں کو مختلف قسموں پر کھاتے ہیں اور چوپائے جھاڑیوں اور درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کو اپنا چارہ بناتے ہیں۔ زمین جب اچھی طرح آراستہ ہو جاتی ہے اور ہر طرف سبزہ اگتا ہے اور مختلف شکلوں سے رونق پکڑتی ہے اور طرح طرح کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے اس میں ہل جوتا اور بیج بویا ہوتا ہے، ان کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اب ہم اس کو کاٹ کر ذخیرہ کریں گے۔ اتنے میں کوئی صاعقہ (بجلی، آگ کا عذاب) آ جاتا ہے یا سخت اور سرد ہوا چلتی ہے، سارے پتے سوکھ جاتے ہیں اور پھل گر جاتے ہیں، اسی لیے فرمایا ہے: ﴿ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا ﴾ (آیتِ باب) ﴿ حَصِيْدًا ﴾ سے مراد سوکھ جانا ہے، ہریالی اور تازگی کے بعد گویا کہ وہ کھیت اس سے پہلے کسی وقت میں موجود نہ تھے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویا کبھی وہ نعمت نہ پائی تھی،[1] یہی حال تمام امور کا ان کے زوال کے بعد ہوتا ہے، گویا وہ امور پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ دنیا میں سے ایک بڑے آرام اور نعمتوں والے آدمی کو لا کر آگ میں غوطہ دے کر اس سے کہیں گے کہ تو نے کبھی کوئی خیر بھی دیکھی تھی، تجھ پر کسی نعمت اور آرام کا بھی گزر ہوا تھا؟ وہ کہے گا: نہیں، پھر ایک ایسے آدمی کو لائیں گے جو دنیا میں سخت عذاب اور تکلیف میں تھا اور اس کو جنت کی نعمتوں میں ایک غوطہ دے کر اس سے کہیں گے کہ تو نے کبھی کوئی تکلیف بھی دیکھی تھی؟ وہ کہے گا: نہیں،[2] غرضیکہ زوال کے بعد اگلا حال ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا کبھی موجود ہی نہ تھا۔

پھر اللہ نے کہا کہ ہم اسی طرح کھلی حجتوں اور دلائل کو تفصیلاً اس قوم کے لیے بیان کرتے ہیں جو عبرت پکڑتی اور سوچتی ہے اور اس مثال میں دنیا اور اہلِ دنیا کا تیزی سے زوال پذیر ہونا بیان ہوا ہے، باوجود اس بات کے کہ انھیں اعزاز بخشا گیا اور زمین پر ٹھہرایا گیا اور بہت سے پکے وعدے اور پیمان کیے گئے، وہ قوم فکر کرتی ہے، کیوں کہ دنیا کی طبیعت یہ ہے کہ جو کوئی اس کو طلب کرتا ہے وہ اس سے بھاگتی ہے اور جو کوئی اس سے بھاگتا ہے اس کے پاس بغیر طلب کیے آتی ہے۔ اللہ نے دنیا کی کہاوت زمین کی روئیدگی کے ساتھ قرآن مجید میں بہت جگہ بتائی ہے۔ سورت کہف میں فرمایا ہے: ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ [الكهف: ٤٥] ''اور ان کے لیے دنیاوی زندگی کی مثال بیان کیجیے: جیسے پانی (مینہ)، جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کی نباتات خوب مل جل گئی، پھر وہ چورا چورا ہو گئی، جسے ہوائیں اُڑا لے جاتی ہیں اور اللہ ہر شے پر بہت قدرت رکھنے والا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الزمر اور سورۃ الحدید میں حیاتِ دنیا کی مثال زمین کی نباتات کے ساتھ دی ہے۔ مروان بن حکم نے منبر پر اس آیت کو یوں پڑھا: ''وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُهْلِكَهُمْ إِلَّا بِذُنُوْبِ أَهْلِهَا'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے مجھ کو یہ آیت اسی طرح پڑھائی ہے۔[3] یہ قراءت غریب ہے، گویا تفسیر کے طور پر زیادہ کی گئی ہے۔

جنت کی ترغیب اور دعوت:

پھر اللہ نے زوالِ دنیا کے بیان کے بعد جنت کی رغبت دلائی اور اس کی طرف بلایا اور جنت کا نام دار السلام بتایا، اس لیے کہ وہ سارے نقائص و آفات و ذلتوں اور تکالیف سے سالم ہے اور کہا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے راہِ راست کی جو کہ بہشت کی طرف گئی ہے، ہدایت کرتا ہے۔ صراطِ مستقیم سے مراد اسلام کو قرآن کے مفاہیم اور خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٧)

[3] تفسير الطبري (١٥/ ٥٧) اس کی سند میں ''عبدالعزیز بن أبان'' سخت ضعیف راوی ہے۔

کی سنت کے مطابق اختیار کرنا ہے۔

ابو قلابہ رحمہ اللہ سے مرفوع روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا تیری آنکھ سوئے اور تیرا دل سمجھے اور تیرا کان سنے، سو میری آنکھ سو گئی اور میرے دل نے سمجھا اور میرے کان نے سنا، پھر مجھ سے کہا گیا کہ ایک سردار نے گھر بنایا، پھر ایک ضیافت تیار کی اور ایک شخص لوگوں کو بلانے کے لیے بھیجا، جس نے قبول کیا وہ گھر میں آیا اور دعوت میں سے کھایا اور سردار اس سے راضی ہوا اور جس نے قبول نہ کیا وہ گھر میں نہ آیا اور نہ اُس نے اُس ضیافت میں سے کچھ کھایا اور نہ سردار اس سے راضی ہوا۔ سو اللہ پاک سیّد (سردار) ہے اور گھر اسلام ہے اور ضیافت جنت ہے اور بلانے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[1]

یہ حدیث مرسل ہے اور متصلاً بھی آئی ہے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر ہمارے پاس آئے اور فرمایا: میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ گویا جبریل علیہ السلام میرے سر کے پاس ہیں اور میکائیل علیہ السلام میرے پاؤں کے پاس۔ ایک نے دوسرے سے کہا: اس شخص کے لیے کوئی مثال بیان کرو، اس نے کہا: سن! تیرے کان نے سنا، سمجھ! تیری عقل نے بوجھا، تیری اور تیری امت کی کہاوت ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ نے ایک گھر بنایا، پھر اس گھر میں ایک کاشانہ تیار کیا، اس میں دستر خوان بچھایا، پھر ایک قاصد بھیجا کہ لوگوں کو کھانے کے لیے بلا لائے، پھر کسی نے اس قاصد کی بات مانی اور کسی نے اس کو ترک کر دیا، سو اللہ بادشاہ ہے اور تو اے محمد! رسول ہے، یعنی قاصد اور گھر جنت ہے۔ جس نے تیری بات مانی وہ اسلام میں داخل ہوا اور جو اسلام میں داخل ہوا وہ جنت میں داخل ہوا اور جو جنت میں داخل ہوا اس نے جنت میں سے کھایا۔[2] (رواہ ابن جریر)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ سورج نہیں نکلتا کسی دن، لیکن اس کے دونوں جانب دو فرشتے پکارتے ہیں، ساری خلقت ان کی آواز کو سنتی ہے، سوائے ثقلین کے، یعنی انسانوں اور جنوں کے: "أَيُّهَا النَّاسُ هَلُمُّوا إِلىٰ رَبِّكُمْ إِنَّ مَا قَلَّ وَكَفىٰ خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَأَلْهىٰ" اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ... الآية ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواه ابن أبي حاتم وابن جرير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جلدی ختم ہو جانے میں دنیا کی مثال مختلف قسم کے سبزے کی ہے، یعنی اس کی رونق کا

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٦٠) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٦٠) تفسير الطبري (١٥/ ٦١۔ ٦٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٥٩٥)

[3] مسند أحمد (٥/ ١٩٧) تفسير الطبري (١٥/ ٦٠۔ ٦١) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٤٢۔ ١٩٤٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٤٣)

زوال۔ اس کی تازگی کی پژمردگی اور جلد ہی ختم ہو جانا دنیا کی طرح ہے، حالانکہ پہلے وہ نبات سرسبز و تازہ تھی، اس کی شاخیں باہم ملی ہوئی تھیں اور جھکی ہوئی تھیں، پتے بھی ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، پھولوں کی بہار چمکتی تھی، غنچے ہر طرح کے کھلے تھے۔ آسمان سے پانی اترا، اس نے زمین کی پیداوار کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ سبزہ اپنی کثرت سے ایک دوسرے کے ساتھ مل گیا، یہاں تک کہ جب وہ اپنی حدِ کمال کو پہنچی اور انسانوں اور جانوروں کا چارہ جیسے: دانے، پھل اور گھاس پھوس تیار ہوا اور زمین نے اپنا پورا سنگار کر لیا اور وہ سونے کی طرح چمکنے لگی، کسی کا رنگ چاندی کی طرح سفید نکلا اور کوئی یاقوت کے رنگ کی طرح ہوئی اور کوئی زمرد ہوئی، غرضیکہ پھولوں کے رنگوں سے اپنے جوبن پر آئی اور دلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ ہوئی اور طرح طرح کے رنگین لباس پہنے اور زمین والوں نے خیال کیا کہ اب کھیتی کاٹنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا۔ اب ہم اس سے نفع اٹھائیں گے کہ اتنے میں ہمارا حکم رات کے وقت یا دن کے وقت آ پہنچا، ہم نے اس ساری بہار کو کاٹ کر برباد کر دیا، گویا وہ اس روز اس رونق پر تھے ہی نہیں اور یہ سارا ٹھاٹھ ہی نہ تھا۔

"أَمۡس" سے مراد کچھ خاص روز نہیں ہے، بلکہ زمانۂ قریب مراد ہے۔ ہم اسی طرح آیاتِ قرآنیہ کی تفصیل بیان کرتے ہیں، ان سب میں سے ایک یہ آیت ہے جو دنیا کی حالت پر آگاہ کرتی ہے، یا اس سے مراد آیاتِ تکوینیہ ہیں، یہ تفصیل ان لوگوں کے لیے ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ ابو مجلز رحمہ اللہ کہتے ہیں: سورت یونس میں اس آیت کے پہلو میں یہ لکھا تھا: "وَلَوۡ أَنَّ لِابۡنِ آدَمَ وَادِيَيۡنِ مِنۡ مَّالٍ لَتَمَنّٰى ثَالِثاً، وَلَا يَشۡبَعُ نَفۡسَ ابۡنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنۡ تَابَ" پھر یہ آیت محو کر دی گئی۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت دنیا کے حال کے لیے تشبیہ مرکب ہے کہ کس طرح جلدی سے ختم ہوتی ہے اور نعمتیں حاصل ہو جانے کے بعد اختتام کو پہنچتی ہیں۔ جس طرح زمین کی نبات کا حال ہے کہ کس طرح خشک ہو کر کوڑا بن جاتی ہے، خوب بھر کر زمین سے نکلنے اور زینت بخشنے کے بعد۔ اس کو زمین کی سبزی سے تشبیہ دی ہے اور اس تشبیہ کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو آگاہی ہو کہ صفو زندگی کی حیاتِ جوانی ہے اور کدر حیات کا بڑھاپا ہے، جس طرح کہ صفو آب کے اعلیٰ ظرف میں ہوتا ہے ع

أَلَمۡ تَرَ أَنَّ الۡعُمۡرَ كَاسٌ سُلَافَةٌ　　فَأَوَّلُهُ صَفۡوٌ وَآخِرُهُ كَدَرٌ

"تو دیکھتا نہیں زندگانی اعلیٰ قسم کی شراب کا جام ہے جو اوپر سے مصفّا اور نیچے سے گدلا ہوتا ہے۔"[2]

اور حقیقت اس کی مٹی کو آراستہ کرنا ہے، دنیا اور دین کی بہتریوں سے۔ جیسے سبزیوں کا مختلف رنگوں میں ملا جلا ہونا۔ اللہ نے دنیا سے نفرت دلائی، پھر آخرت کی نعمتوں کی طرف بلایا۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ سلام، اللہ ہے

[1] الدر المنثور (٤/ ٣٥٤)　[2] تفسير النسفي (٢/ ١٢٥)

اور دار، جنت ہے۔[1] بعض نے کہا ہے مراد سلام سے تحیت (تحفہ) ہے، کیوں کہ اللہ کی طرف سے وہاں ان کو تحیہ ہوگا، جیسا کہ اس کے فرمان میں ہے: ﴿ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ﴾ [یونس: ۱۰] ''اور اس میں ان کی دعا ہوگی: سلام۔''

یا سات جنتوں میں سے ایک جنت کا نام سلام ہوگا، ایک کا نام دار السلام ہے، دوسری کا نام دار الجلال ہے، تیسری کا نام جنتِ عدن ہے، چوتھی کا نام جنت الماویٰ ہے، پانچویں کا نام جنت الخلد ہے، چھٹی کا نام جنت الفردوس ہے اور ساتویں کا نام جنت النعیم ہے، لیکن سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دار السلام جنت ہے۔ اختلاف صرف وجہ تسمیہ میں ہے۔ اسمائے جنت کے معانی رسالہ ''هادي القلب السليم الى درجات جنات النعيم'' میں لکھے گئے ہیں، یہ رسالہ حالاتِ جنات کے بیان میں بے مثال اور جامع جملہ ابوابِ جمال وکمال ہے۔ وللہ الحمد.

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت کرتا ہے کہ شکوک وشبہات اور فتنوں اور گمراہیوں سے کس طرح بچا اور نکلا جا سکتا ہے[2] اور دینِ اسلام کی راہ دکھا دیتا ہے۔ اللہ نے دار السلام کی طرف دعوت کو عام کیا اور ہدایت کو اپنی مشیت کے ساتھ خاص فرمایا، اس میں حجت کی تکمیل ہے اور مخلوق سے اپنا غنی ہونا ظاہر کیا ہے۔[3]

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٦﴾

جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید (دیدارِ الٰہی) ہے اور ان کے چہروں کو سیاہی اور ذلت نہیں ڈھانپے گی، یہی لوگ جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (26)

محسنین کا اجر اور ﴿ زِيَادَةٌ ﴾ کی تفسیر:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان کی راہ سے اچھا عمل کیا تو وہ دارِ آخرت میں عمل صالح ہوا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴾ [الرحمن: ٦٠] ''احسان کی جزا تو احسان ہی ہے۔'' ﴿ زِيَادَةٌ ﴾ سے مراد دو چند ہونا ہے ثواب کا اعمالِ حسنہ پر دس گنے سے سات سو گنے تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ تر۔ اللہ تعالیٰ جنت میں حور وقصور دے گا اور اہلِ جنت سے راضی ہوگا۔ ان کے لیے اللہ نے وہ چیز چھپا رکھی ہے جو آنکھ کو ٹھنڈا کرے، ان سب نعمتوں سے افضل اور اعلیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے چہرہ مبارک وکریم کا دیدار نصیب ہوگا، یہ زیادت تمام عطاؤں اور مزوں سے اعظم تر ہوگی، اس کا استحقاق کچھ عمل کی وجہ سے نہ ہوگا، بلکہ اس کے فضل ورحمت سے ہوگا۔

زیادت کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے دیدار کے ساتھ کی گئی ہے۔ ابو بکر صدیق، حذیفہ الیمان، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، سعید بن میسّب، عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ، عبدالرحمان بن سابط، مجاہد، عکرمہ، عامر بن سعد، عطا، ضحاک، حسن، قتادہ،

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٣٢٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٤٣) [3] فتح البيان (٦/ ٤٤۔ ٤٨)

سدی اور محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے یہی تفسیر کی ہے [1] اور اس بارے میں بہت سی حدیثیں بھی آئی ہیں۔ صہیب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔

پھر فرمایا کہ اہلِ جنت جب جنت میں جا چکیں گے اور اہلِ نار نار میں، تو ایک منادی ندا کرے گا: اے اہلِ جنت! تمھارے لیے اللہ کے پاس ایک وعدہ ہے، اللہ چاہتا ہے کہ اپنے اس وعدے کو تمھارے ساتھ پورا کرے، وہ کہیں گے کہ وہ کیا وعدہ ہے؟ کیا اللہ نے ہمارے ترازو میں موازین بھاری نہیں کر دیے، کیا ہمارے منہ سفید نہیں کیے اور ہم کو جنت میں داخل نہیں کیا اور آگ سے ہم کو دور نہیں کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ پردہ اٹھائے گا، وہ اللہ کی طرف نگاہ کریں گے، اللہ کی قسم ہے! اللہ نے ان کو اس سے زیادہ اچھی کوئی چیز نہیں دی کہ وہ اس کی طرف نظر کریں اور اس سے زیادہ کوئی اور چیز آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والی نہیں۔ [2] (رواہ أحمد وھکذا رواہ مسلم وجماعة من الأئمة)

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک منادی کھڑا کرے گا، وہ پکارے گا: اے اہلِ جنت! وہ ایسی آواز سے ندا کرے گا جس کو سارے اول اور آخر اہلِ جنت سنیں گے کہ اللہ نے تم سے حسنہ اور زیادہ کا وعدہ کیا ہے، حسنیٰ جنت ہے اور زیادہ رحمان عزوجل کے چہرے کی طرف نظر کرنا ہے۔ [3] (رواہ ابن جریر وابن أبي حاتم) کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اس آیت میں زیادۃ اللہ کے چہرے کی طرف نظر کرنا ہے، [4] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ حسنیٰ جنت ہے اور زیادۃ اللہ عزوجل کے چہرے کا دیدار ہے۔ [5]

﴿ قَتَرٌ ﴾ سے مراد سیاہ چہرہ ہونا ہے۔ محشر کے عرصات میں یہ سیاہی کافروں اور فاجروں کے چہروں پر ہو گی۔ ذلت سے مراد توہین اور رسوائی ہے، یعنی ان کو کوئی توہین ظاہر و باطن میں نہ لگے گی، مگر وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے: ﴿ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴾ [الدھر: ۱۱] ''پھر اللہ نے انھیں اس دن کے شر (عذاب) سے بچا لیا اور تازگی اور سرور سے نوازا۔'' یعنی چہروں پر تازگی اور دلوں پر مسرت ہو گی۔
جَعَلَنَا اللّٰہُ مِنْهُمْ بِفَضْلِهٖ وَرَحْمَتِهٖ آمِیْنَ. [6]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٤٥)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٥٥٢) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٣٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٨٧) مسند أحمد (٤/ ٣٣٣)

[3] تفسیر الطبري (١٥/ ٦٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٤٥) تفسیر طبری والی سند میں ''أبان بن ابی عیاش'' اور تفسیر ابن ابی حاتم والی سند میں ''ابوبکر ہذلی'' ضعیف راوی ہیں۔

[4] تفسیر الطبري (١٥/ ٦٨) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا کعب رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ نیز ''ابراہیم بن مختار'' ضعیف راوی ہے۔

[5] یہ الفاظ سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ دیکھیں: تفسیر الطبري (١٥/ ٦٩) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[6] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٤١۔ ٥٤٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جن لوگوں نے اچھا کام کیا، یعنی ایمان اور عملِ صالح پر قائم رہے اور معاصی سے اپنے آپ کو باز رکھا یا لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کی شہادت صدقِ دل اور اخلاصِ نیت سے ادا کی، ان کے لیے ثوابِ حسنٰی ہے۔ اگرچہ گناہ بھی ہوں، عصاۃ مومنین اس بشارت میں داخل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ حسنٰی سے مراد جنت ہے اور زیادت سے مراد وہ چیز ہے جو اصل ثواب سے زیادہ ہو، جیسے تفضّل اور عنایت۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ﴾ [الفاطر: ٣٠] ''تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اجر پورے دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے۔'' بعض نے کہا ہے کہ زیادۃ اللہ کا دیدار ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے۔ یا نیکیوں کا کئی گنا اجر ہے، دس بلکہ سات سو گنا تک۔ بعض نے کہا ہے کہ زیادۃ موتی کا ایک غرفہ (کمرہ) ہے، جس کے چار دروازے ہوں گے۔[1] (قاله علي بن أبي طالب)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادۃ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضوان ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ مراد وہ فضل ہے جو اللہ ان کو دنیا میں دیتا ہے، اس پر قیامت کے دن کچھ حساب نہ ہوگا۔ اس کے سوا اور بہت اقوال ہیں، جن کے ذکر کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں سے زیادۃ کی تفسیر میں روایات آئی ہیں۔ زیادہ غالب تفسیر یہی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے چہرے کی طرف نظر کرنے کی سعادت نصیب ہوگی۔ یہ تفسیر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ اب کسی قائل کے لیے بات کرنے کی جگہ باقی نہیں رہی۔ مختلف مذاہب والے جو سنتِ مطہرہ کے عارف نہیں ہیں، ان کے آپس کے بحث و مباحث اور جھگڑے اس بارے میں توجہ کے لائق نہیں ہیں، ان کو اگر علمِ سنت کی کچھ معرفت ہوتی تو وہ ان فضول باتوں سے باز رہتے۔ رَهِقَ بمعنی غشیان ہے یا بمعنی غلو، یعنی سیاہی اور رسوائی ان کو ڈھانپ لے گی یا ان کے چہروں پر چڑھے گی۔

﴿قَتَرٌ﴾ سیاہ گرد کو یا روسیاہی کو یا دھوئیں کو یا بدحالی کو کہتے ہیں۔ ذلت سے مراد خضوع، انکسار اور توہین ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ذلت ہے۔[3] صہیب رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ یہ بات اللہ کے دیدار کے بعد ہوگی کہ ان کے مونہوں پر نہ سیاہی ہوگی نہ رسوائی۔[4] یہ لوگ اہلِ جنت میں ہمیشہ طرح طرح کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے، کبھی بھی جنت سے نہ نکلیں گے۔[5] اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ.

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٦٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حکم بن عتیبہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١٥/ ٧٠)
[3] تفسیر ابن ابي حاتم (٦/ ١٩٤٦)
[4] الدر المنثور (٤/ ٣٦٠)
[5] فتح البیان (٦/ ٤٩۔ ٥٠)

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور جن لوگوں نے برے کام کیے تو برائی کا بدلہ اس (برائی) کے برابر ہی ہے اور انھیں ذلت ڈھانپ لے گی۔ کوئی انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا نہیں ہوگا، یوں لگے گا کہ ان کے چہروں پر تاریک رات کے ٹکڑے اوڑھا دیے گئے ہیں، یہی (لوگ) دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿27﴾

برائیاں کمانے والوں کی سزا:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان نیک بختوں کے ذکر کے بعد، جن کی نیکیاں کئی گنا ہوں گی، بلکہ کئی گنا سے بھی زیادہ ہوں گی، بدبختوں کا حال بیان کیا کہ ان کی ہر برائی کا بدلہ اس برائی کے برابر ملے گا اس سے زیادہ نہ ہوگا۔ ان کی نافرمانیوں کی ذلت وخواری اور گناہوں کا ڈر ان پر چڑھ آتا ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ: ٤٥] ''اور آپ انھیں دیکھیں گے کہ وہ جہنم پر پیش کیے جائیں گے تو مارے ذلت کے جھکے جا رہے ہوں گے وہ نظریں چرا کر دیکھتے ہوں گے اور جو لوگ ایمان لائے تھے، وہ کہیں گے: بے شک خسارہ پانے والے تو وہی لوگ ہیں جنھوں نے روزِ قیامت اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا، آگاہ رہو! بلاشبہ ظالم لوگ ہی دائمی عذاب میں ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴾ [إبراهيم: ٤٢۔ ٤٣] ''اور (اے نبی!) آپ مت خیال کریں کہ اللہ ان کاموں سے غافل ہے جو ظالم کرتے ہیں، وہ تو انھیں صرف اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ اپنے سر اٹھائے (محشر کی طرف) دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہ اپنی طرف بھی نہ پھر سکے گی، اور ان کے دل خالی ہوں گے۔''

﴿ عَاصِمٍ ﴾ سے مراد مانع ہے جو عذاب سے بچائے، جیسے فرمایا: ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ࣙالْمُسْتَقَرُّ ﴾ [القيامة: ١٠۔ ١٢] ''انسان اس دن کہے گا: جائے فرار کہاں ہے؟ ہرگز نہیں! (وہاں) کوئی پناہ گاہ نہیں۔ اس دن تیرے رب کے سامنے جا ٹھہرنا ہوگا۔''

منہ کا رات کے اندھیرے سے ڈھک جانا گویا قیامت کے دن سیاہ روئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾
[آل عمران: ۱۰۶۔ ۱۰۷] ''جس دن کئی چہرے سفید ہوں گے اور کئی چہرے سیاہ ہوں گے، پھر جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ پس اب عذاب چکھو اس کفر کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو۔ اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴾ [عبس: ۳۸۔ ۴۱] ''اس دن کئی چہرے چمکتے ہوں گے۔ ہنستے مسکراتے، ہشاش بشاش۔ اور کئی چہروں پر اس دن خاک اُڑ رہی ہوگی۔ ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک سیئہ (برائی) کا بدلہ ایک سیئہ (برائی) ہے، سیئہ پر حسنہ کی طرح زیادتی نہیں ہوتی۔ اس جگہ سیئہ سے مراد شرک ہے یا شرک کے علاوہ دوسرے گناہ؟ آیت میں حسنات اور سیئات کا فرق نہیں بتایا گیا ہے، کیوں کہ حسنات کا ثواب عامل کے لیے بڑھتا رہتا ہے۔ ایک ثواب سے دس گنا تک، بلکہ سات سو گنا تک، بلکہ اضعافِ کثیرہ تک۔ یہ اللہ پاک کا فضل اور کرم ہے اور سیئات کا بدلہ سیئات کے مثل ہی ہوتا ہے، ان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کا عدل و انصاف بلکہ اس کا فضل و کرم ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اہلِ سیئہ کو کوئی شخص اللہ پاک کے غصے اور عذاب سے بچانے والا نہیں۔ ان کے چہرے ایسے ہوں گے کہ جیسے ان کو شبِ تاریک کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیا ہے، یعنی سخت سیاہ۔ بعض نے کہا کہ مراد آخرت کا اندھیرا ہے۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا کہ رات کی سیاہی مراد ہے، یہ دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اس جگہ نار کا اطلاق اللہ کی سنتِ متواترہ کے ساتھ مقید ہے جس میں موحد گناہ گاروں کے آگ سے نکلنے کا ذکر آیا ہے[1] اور آیت اس بات پر دلیل ہے کہ آگ کبھی ختم نہیں ہوگی اور بعض سلف کا قول شاذ و نادر ہے۔ قابلِ ترجیح یہی جمہور کا مذہب ہے کہ جنت اور آگ اور ان میں رہنے والوں کو ہرگز فنا نہ ہوگی۔ قرآن پاک میں کئی جگہ دونوں گھروں (جنت اور دوزخ) میں رہنے والوں کے لیے خلود (ہمیشگی) کا حکم آیا ہے۔ سو وہ حکم اپنی ظاہری شکل پر باقی ہے۔

---

[1] فتح البیان (۶/ ۵۱۔ ۵۲)

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ
أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ
إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن
كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا
أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾

اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے، جنھوں نے شرک کیا، کہیں گے: تم اور تمھارے شریک اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو، پھر ہم ان کے درمیان جدائی ڈال دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے: تم ہماری عبادت تو کرتے ہی نہیں تھے (28) چناں چہ ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے، بے شک ہم تمھاری عبادت سے بالکل غافل تھے (29) وہاں ہر نفس (شخص) جانچ لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا تھا اور وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے، اور (وہ سب کچھ) ان سے گم ہو جائے گا جو وہ جھوٹ گھڑا کرتے تھے (30)

روزِ قیامت مشرکوں کے خداؤں کا اظہارِ براءت کرنا:

جتنے مشرک ہیں وہ اپنے خیال کو پوجتے ہیں یا شیطان کو اور نام لیتے ہیں نیک لوگوں کا، حالاں کہ وہ اس کام سے بیزار ہیں، آخرت میں معلوم ہوگا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا: جس دن ہم زندہ کریں گے زمین والوں کو، کیا جن اور انسان اور کیا نیک اور بد، جیسے اس کا قول ہے: ﴿ وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴾ [الکھف: ٤٧] ”اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے، چناں چہ ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا... الآیة ﴾ (آیتِ باب) یعنی تم اپنی اس جگہ میں ٹھہرو، وہ ایک مکان معین ہوگا جو مومنین کے مقام سے علاحدہ ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ٥٩] ”اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴾ [الروم: ١٤] ”اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن لوگ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو جائیں گے۔“ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ يَوْمَىِٕذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴾ [الروم: ٤٣] یعنی دو فرقے ہو جائیں گے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے آئے گا اور مومنین انبیا سے

شفاعت طلب کر کے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے فیصلے کرنے کے لیے آئے اور ہم اس جگہ سے نکل کر آرام پائیں۔ دوسری حدیث میں آیا ہے: "نَحْنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى كُوْمٍ فَوْقَ النَّاسِ"[1] اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے حال کی خبر دی ہے کہ وہ لوگ آستانوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان سے بیزار ہو جائیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مريم: ٨٢] ''ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ [البقرة: ١٦٦] ''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بے زار ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی تھی اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے تمام تعلقات کٹ جائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً ﴾ [الأحقاف: ٥۔ ٦] ''اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے۔''

اور اس جگہ یہ فرمایا ہے کہ جب مشرک عابدین اور ان کے شرکا کے درمیان ان کی عبادت کے بارے میں بحث و مراجعت ہو گی تو وہ ان کی عبادت سے غافل ہونے پر اللہ کو گواہ ٹھہرائیں گے کہ واللہ! ہم کو کچھ خبر نہیں کہ تم ہماری عبادت کرتے تھے، واللہ! ہم نے ہرگز تمھیں اپنی عبادت کی طرف نہیں بلایا تھا اور نہ اس بات کا تم کو حکم دیا تھا اور نہ ہم اس بات پر تم سے راضی تھے۔ اس میں مشرکین کے لیے بڑی سرزنش ہے جو اللہ کے سوا غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں جو نہ سنے اور نہ دیکھے اور نہ ان کے کچھ کام آ سکے اور نہ اُس نے ان کو یہ حکم دیا تھا اور نہ وہ اس عبادت پر راضی تھا، بلکہ جو وقت نہایت حاجت مندی اور مدد دہی کا ہو گا اسی جگہ وہ معبود ان لوگوں سے اپنی بیزاری ظاہر کریں گے۔

ان مشرکوں نے اس ذات کی عبادت تو چھوڑ دی تھی جو حیی و قیوم ہے، سمیع و بصیر ہے اور ہر چیز پر قادر اور جاننے والا ہے اور اس ذات نے رسول بھیجے ہیں اور کتابیں نازل کی ہیں اور اپنی خالص عبادت کا حکم دیا ہے جو شرک سے پاک ہو اور کسی دوسرے کی عبادت سے منع فرمایا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی، اور ان میں سے بعض پر ضلالت ثابت ہو گئی۔''

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٤٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٥١)

نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبیاء: ٢٥] ''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥] ''اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی اور معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے۔''

روزِ حشر ہر ایک کا حال کھل جائے گا:

مشرکین بہت قسموں کے ہیں، اللہ نے ان کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور ان کے احوال اور اقوال کا بیان فرمایا ہے اور ان پر ان کے افعال کا، جس میں وہ گرفتار ہیں، خوب رد کیا ہے اور فرمایا کہ یومِ حساب میں ہر نفس کا امتحان ہوگا، وہ نفس جان لے گا کہ اس نے کون سا خیر کا کام کیا ہے اور کون سا شر کا: ﴿ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ [بني إسرائیل: ١٤] ''(کہا جائے گا:) اپنا اعمال نامہ پڑھ، آج تیرا نفس ہی تیرا حساب لینے والا کافی ہے۔'' بعض نے کہا ﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا ﴾ کے بجائے ''تَتْلُوْا'' پڑھا ہے۔

پھر کسی نے تفسیر بالقراءت کی اور کسی نے کہا کہ ہر نفس تالی یعنی اپنے عمل کا خیر وشر سے تابع ہوگا اور کسی نے کہا ہے کہ ہر امت اپنے معبود کی پیرو ہوگی جس طرح حدیث میں آیا ہے: « فَيَتَّبِعُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ الشَّمْسَ الشَّمْسَ وَيَتَّبِعُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ الْقَمَرَ الْقَمَرَ وَيَتَّبِعُ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ الطَّوَاغِيْتَ الطَّوَاغِيْتَ »[1] پھر فرمایا کہ سارے امور اللہ احکم الحاکمین اور عادل کی طرف راجع ہوں گے، اللہ فیصلہ کرے گا، اہلِ جنت کو جنت میں اہلِ نار کو نار میں بھیجے گا اور اہلِ شرک عبادت میں جو افترا پردازی کرتے تھے وہ دور ہو جائے گی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ حشر ہر کونے اور ہر طرف سے ایک جگہ میں جمع کرنے کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حشر موت ہے۔[3] اللہ عابد اور معبود کو برابر جمع کرے گا اور جمع ہونے کے وقت مشرکوں سے کہے گا اور یہ کہنا روٴسِ اشہاد پر ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کے طور سے ہوگا اور اس وقت وہ تمام معبودات حاضر ہوں گے جن کو عبادت میں شریک کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا مضمون یہ ہوگا کہ تم سب اسی جگہ ٹھہرے رہو، یہاں سے کسی اور طرف نہ جاوٴ، تم سے سوال کیا جائے گا، تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ کیا کیا جاتا ہے؟ یہ خطاب عابدین اور معبودین دونوں کو ہو

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧٠٠٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٢)

[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٤٣) [3] تفسیر الطبري (١٥/ ٧٩)

گا۔ یہ ان کو ایک وعید اور تہدید ہے۔ شرکا سے اس جگہ ملائکہ مراد ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ بت ہیں۔ اللہ تعالیٰ بتوں کو اس دن بولنے کی طاقت دے دے گا۔ یا مراد عیسیٰ اور عزیر علیہم السلام ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ ہر بنائے گئے معبود سے پوچھا جائے گا، وہ کوئی ہو، کہیں ہو۔

پھر جو دنیا میں ان کے درمیان تواصل (وصیلہ، رابطہ) تھا وہ ختم کر دیا جائے گا۔ مزایلت بمعنی مفارقت (جدائی) ہے اور تزایل بمعنی تباین (پھوٹ)۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی ہم مشرکین اور مومنین کے درمیان تمیز کر دیں گے۔[1] لیکن اس میں مسامحت (آسانی، چشم پوشی) ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تفسیر پہلی اور ملحق آیت سے بعید ہے، اس لیے کہ کلام کا سیاق وسباق مشرکین اور ان کے معبودین کے حق میں ہے، بہتر یہ ہے کہ یہ امتیاز مشرکین اور ان کے شرکا کے درمیان ہوگا۔ امام بیضاوی، خازن اور خطیب رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[2]

یہ امتیاز اس وقت ہوگا جب ہر معبود اپنے عابد سے بیزاری ظاہر کرے گا اور کہے گا کہ تم حقیقت میں اور اصل میں ہمارے عابد نہ تھے، بلکہ تم اپنی خواہشات اور نفس اور گمراہی اور شیاطین کے عابد تھے جنھوں نے تم کو بہکا کر شرک کرنے کا حکم دیا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ﴾ [سبا: ٤١] ”وہ کہیں گے: تو پاک ہے، تو ہی ان کے ماسوا ہمارا کارساز ہے۔“ یہ شرکا کا انکار اس بنا پر ہوگا کہ انھوں نے اپنی عبادت کا حکم ان کو نہیں دیا تھا، اگرچہ مشرکوں نے ان کو معبود ٹھہرا لیا تھا۔ شرکا کہیں گے کہ ہمارے تمھارے درمیان میں اللہ گواہ ہے اگر ہم نے تم کو اپنی پرستش کا حکم دیا ہوگا اور ہم اس کام پر تم سے راضی تھے تو اللہ جانتا ہوگا، بلکہ ہم تو تمھاری اس عبادت سے غافل تھے، ہم کو خبر بھی نہ تھی کہ تم ہم کو پوجتے ہو۔

یا اس جگہ غفلت سے مراد مشرکین کے فعل سے عدمِ رضا مندی ہے، یا یہ دونوں باتیں۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ معبودین غیر شیاطین ہیں، اس لیے کہ شیاطین کی رضا مندی مشرکین کے فعل سے ظاہر ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کلام سے مراد بت ہیں،[3] لیکن ہوسکتا ہے کہ شیاطین مراد ہوں اور یہ انکار کرنا اس بنیاد پر ہو کہ انھوں نے اپنی عبادت کے بارے میں کچھ جبر نہیں کیا تھا اور نہ زبردستی ان سے اپنی پرستش کرائی تھی۔

بالجملہ اس دہشت ناک مقام پر یا اس جگہ پر ہر نفس کا امتحان ہوگا، مومن ہو یا کافر، نیک بخت ہو یا بد بخت۔ یہ ان کے گزشتہ اعمال کی ابتلا ہوگی۔ ہر نفس اپنے اچھے اور برے کاموں کے آثار کا تابع ہوگا یا اس بلا سے مراد عذاب ہے کہ گناہ گار نفس اپنے برے کام پر عذاب دیا جائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ”يُمَثَّلُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَتَّبِعُوْنَهُمْ حَتّٰى يُوَرِّدُوْنَهُمُ النَّارَ“ یعنی ہر معبود

---

[1] تفسير الجلالين (١/ ٢٧٠) [2] تفسير القرطبي (٨/ ٣٣٣) تفسير البيضاوي (٣/ ١٩٥) تفسير الخازن (٣/ ١٨٧)
[3] تفسير أبي السعود (٤/ ١٤٠)

غیر اللہ کی ایک صورت بن کر سامنے آئے گا، یہ اس کے پیچھے چلیں گے، وہ صورت انھیں آگ تک پہنچا دے گی۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿هُنَالِكَ تَبْلُوْا﴾ (آیتِ باب)[1]

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر نفس اپنے اعمال کا معائنہ کرے گا[2] اور یہ اہلِ شرک اللہ کی طرف، جو ان کا سچا مالک ہے، لوٹائے جائیں گے نہ کہ ان معبودانِ باطلہ کی طرف۔ اور ان کی یہ افترا پردازی، کہ یہ معبودانِ باطل عبادت وتعظیم وتذللِ عظیم کے لائق تھے اور یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، باطل ہو جائے گی۔

حاصل یہ ہوا کہ یہ مشرکین اس مقام میں حق تعالیٰ کی طرف لوٹیں گے اور اپنی عبادتِ باطلہ کا اقرار کریں گے، لیکن یہ اقرار ایسے وقت میں ہوگا کہ ان کو کچھ فائدہ نہ دے گا، وہ بے شک اعتراف کرتے رہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ باب کو اس آیت نے منسوخ کر دیا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد: ۱۱] ''یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے اور بے شک (جو) کافر ہیں، ان کا کوئی مددگار نہیں۔''[3] لیکن قول بالنسخ کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس آیت میں مولیٰ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کافروں کا ناصر نہ ہوگا اور آیتِ باب کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مرجع (لوٹ کر جانا) اللہ کی طرف ہوگا جو ہر بشر کا خواہ وہ مشرک ہو یا کافر حقیقت میں مالک ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝۳۱ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ښ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۳۲ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۳

(اے نبی!) کہہ دیجیے: تمھیں آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے یا کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے اور کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، اور کون ہے جو (دنیا کے) کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ تو وہ (کافر) ضرور کہیں گے: اللہ! تو کہہ دیجیے: کیا پھر تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں؟ (31) یہی تو اللہ جو تمھارا حقیقی رب ہے، پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ پھر تم کدھر پھیرے جاتے ہو؟ (32) اسی

[1] الدر المنثور (٤/ ٣٦٢) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٨٢) [3] الدر المنثور (٤/ ٣٦٢۔ ٣٦٣) فتح البيان (٦/ ٥٢۔ ٥٥)

طرح آپ کے رب کا کلمہ ان لوگوں کے بارے میں ثابت ہو کر رہا جنھوں نے نافرمانی کی کہ بے شک وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿33﴾

مشرکوں کا توحیدِ ربوبیت کا اقرار اور ان پر اس کے ذریعے حجت قائم کرنا:

یعنی اللہ نے ازل سے ان کی قسمت میں یقین نہیں لکھا اور اس کا سبب ان کا فسق و فجور ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے مشرکین پر اپنی وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار کرا کے توحید پر اپنی حجت قائم کی اور فرمایا کہ آسمان سے پانی اتارنا اور زمین کا چیرنا جس سے دانے، انگور، گھنے درخت، زیتون، کھجور کے درخت اور باغات اور میوہ جات اور گھاس پھونس نکلتا ہے کس کی قدرت اور مشیت ہے؟ کیا کوئی اور ہے جو اللہ کے ساتھ یہ کام کرتا ہے؟ سو اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ یہ کام اللہ ہی کا ہے۔ اسی طرح اگر یہ پوچھا جائے کہ تم کو سننے اور دیکھنے کی قوت کس نے عطا کی ہے؟ اگر وہ چاہے تو ان قوتوں کو چھین لے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ١ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ [الملك: ٢٣] ”کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِهٖ١ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ هُمْ یَصْدِفُوْنَ﴾ [الأنعام: ٤٦] ”(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے: اگر اللہ تمھارے کان اور تمھاری آنکھیں چھین لے اور تمھارے دلوں پر مہر لگا دے تو بتاؤ اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھیں یہ (چیزیں) لا دے؟ دیکھیے کس طرح ہم آیتیں پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، پھر بھی وہ منہ موڑتے ہیں۔“ تو یہی جواب دیں گے کہ اللہ۔ اسی طرح اللہ نے اپنی قدرتِ عظیمہ اور احسانِ عمیم سے زندہ کو مردہ سے اور مردے کو زندے سے نکالا ہے۔ یہ آیت ہر زندہ اور مردہ کے لیے عام ہے۔

پھر فرمایا کہ ان سب کاموں کی تدبیر کون کرتا ہے، یعنی ہر چیز کی اصل اسی کے ہاتھ میں ہے، اسی کا تصرف و حکم چلتا ہے، کوئی شخص اس کے حکم کو پیچھے ڈالنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ سارے آسمان اور زمین والے اسی سے سوال کرتے ہیں، وہ ہر دن ایک کام میں ہے، تمام جہان، وہ عالم علوی ہو یا عالم سفلی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ فرشتے ہوں، جن ہوں یا انسان، سب اس کے در کے فقیر ہیں۔ سب کے سب اس کے غلام ہیں اور اس کے سامنے خاضع (سرنگوں) ہیں۔

اس بات کا اقرار ان سب مشرکین کو بھی ہے، پھر نہیں معلوم کہ اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے اور اپنی رائے اور جہالت سے اللہ کے ساتھ غیر کی بھی عبادت کرتے ہیں، سو یہی ہر کام کرنے والا، جس کا یہ اعتراف کرتے ہیں، ان کا

رب اور معبودِ برحق ہے۔ صرف اکیلا ہی عبادت کا مستحق ہے، اس حق کے بعد اب سوائے گمراہی کے اور کیا باقی رہا۔ لہٰذا ہر معبود اللہ کے سوا باطل ہے۔ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَاحِدٌ لَّا شَرِيْكَ لَهُ'' اب نہیں معلوم کہ یہ اللہ کی عبادت سے غیر کی عبادت کی طرف کیوں پھر جاتے ہیں، حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ ہر شے کا خالق رب تعالیٰ ہے۔ ہر شے پر اسی کا تصرف (اختیار) ہے۔ سو اللہ کا کلمہ ان پر ثابت ہو چکا کہ یہ سارے مشرک اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے بدبخت ہیں اور آگ میں رہنے والے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [الزمر: ۷۱] ''وہ کہیں گے: کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے نبی! تم ان مشرکوں پر توحید کی حقانیت اور شرک کے بطلان پر حجت قائم کرنے کے لیے یہ بات کہہ دو کہ تمھارا رازق جو آسمانوں سے بارش برسا کر اور زمین سے سبزہ اور اناج اگا کر رزق فراہم کرتا ہے، وہ کون ہے؟ یہ اس لیے کہ رزق کو حاصل کرنے کا ذریعہ آسمانی اور زمینی اسباب سے مل کر پیدا ہوتا ہے یا ہر ایک سبب سے جدا گانہ، یہ اللہ کی طرف سے تم پر ایک وسعت ہے۔ یہ سب آٹھ سوال ہیں، پانچ سوالوں کے جواب مشرکین کی طرف سے ذکر کیے اور دو کا جواب اللہ کی تعلیم سے نبی اکرم ﷺ سے ادا ہوا اور آخری سوال کا جواب عام شہرت اور علم کی وجہ سے ذکر نہ فرمایا۔ کانوں اور آنکھوں کا بالخصوص ذکر اس لیے کیا کہ ان میں عجیب وغریب بناوٹ رکھی گئی ہے اور ان سے ایک بہت بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور ان سے دیگر اتنے فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

پھر انسان کا نطفہ سے پیدا ہونے کا ذکر کیا اور پرندے کا انڈے سے اور گھاس کا دانے سے یا مومن کا کافر سے پیدا ہونے کا ذکر کیا، لیکن یہ حقیقت کے بہت قریب ہے۔ اسی طرح نطفہ انسان سے یا کافر مومن سے یا انڈہ پرندے سے پیدا ہوتا ہے۔ سوالیہ انداز سے یہ معلوم کرانا مراد ہے کہ زندہ کرنے والا اور مارنے والا کون ہے۔ پھر تمام امورِ خلائق کی تدبیر کا ذکر کیا۔ یہ سب پانچ سوال ہوئے۔

ان سب سوالوں کے جوب میں اہلِ شرک یہی کہتے ہیں کہ یہ سارے کام اللہ ہی کرتا ہے اور ان کا یہ کہنا درست ہے، اگر انصاف کریں، کیوں کہ صحیح سوچ اور عقلِ سلیم اسی جواب کو واجب کرتی ہے، تو اب ان کے جواب الجواب میں یہ کہنا چاہیے کہ جب یہ بات تمھارے نزدیک مسلمہ ہو چکی تو پھر تم اللہ سے کیوں نہیں ڈرتے؟ اور اس علم سے جو بات واجب آتی ہے وہ کیوں نہیں کرتے؟ وہ بات یہی اللہ سے ڈرنا اور اس کی خالص عبادت کرنا ہے اور بتوں اور مردوں وغیرہم سے کچھ سروکار نہ رکھنا ہے، کیوں کہ ان مردوں اور آستانوں کو ان میں سے کسی ایک کام پر بھی

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵٤٤)

قدرت نہیں ہے۔ قدرت تو کجا ان کو ان امور کا علم تک نہیں۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم اس شرک پر اللہ کی سزا سے نہیں ڈرتے، حالانکہ ان امور میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔[1] بلکہ جو ان کاموں کا کرنے والا ہے وہی تمھارا سچا معبود ہے اور پروردگار ہے نہ کہ وہ جن کو تم نے اس کا شریک ٹھہرایا ہے، جیسے مردے اور بت اور آستانے۔ حق کے بعد گمراہی ہی گمراہی ہوتی ہے نہ اور کچھ۔ اللہ کی ربوبیت اور غیر اللہ کا بطلان خود ان کے اقرار سے ثابت ہے، کیوں کہ واجب الوجود کا ذات اور صفات میں اکیلا اور یکتا ہونا ضروری ہوتا ہے، تو اب تم کس طرح اس ظاہری حق بات سے منہ پھیر کر ضلال باطل میں گرفتار ہوتے ہو۔ حق و باطل کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ کی بات ان فاسقوں پر ثابت ہو چکی ہے جو حق سے نکل کر باطل میں پڑے ہیں اور کفر میں تکبر اور دشمنی اور مقابلہ کرتے ہیں۔ جو بات ثابت ہو چکی وہ یہ ہے کہ یہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔[2]

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳۴ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۵ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶

کہہ دیجیے: کیا تمھارے (بناوٹی) شریکوں میں سے کوئی ہے جو پہلی بار مخلوق کو پیدا کرے، پھر اسے لوٹا (کر دوبارہ پیدا کر) دے؟ کہہ دیجیے: اللہ ہی پہلی بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر وہی لوٹائے گا، لہٰذا تم کہاں بہکائے جاتے ہو؟ (34) کہہ دیجیے: کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت دیتا ہو؟ کہہ دیجیے: اللہ ہی حق کی ہدایت دیتا ہے، پھر کیا جو حق کی طرف ہدایت دیتا ہے، وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ (حق دار) ہے جو خود ہدایت یافتہ نہیں، مگر یہ کہ اسے (حق کی) ہدایت دی جائے؟ چناں چہ تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ (35) اور ان (کافروں) میں سے اکثر گمان ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں (36)

---

(1) تفسير البيضاوي (٣/ ١٩٦) (2) فتح البيان (٦/ ٥٦۔ ٥٨)

مشرکوں کے دعوے کی نفی اور ان کے خداؤں کے بے قدرت ہونے کا ثبوت:

اس آیت میں مشرکین کے دعوے کا ابطال ہے جو بتوں اور اللہ کے شریکوں اور غیر اللہ کو پوجتے ہیں، یعنی اللہ ہی نے ان آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے اور ان کے درمیان خلقت پیدا کی ہے، پھر آسمانوں اور زمین کے جسموں کو بکھیر کر اور ان کے درمیان تمام مخلوق کو فنا کر کے ان کی دوسری دفعہ پیدائش کرے گا، سو یہ کام اسی وحدہ لاشریک لہ کا ہے، اب تم حق کے راستے سے کس طرح باطل کی طرف پھرے جاتے ہو اور تم جانتے ہو کہ تمھارے شریک ہرگز قدرت نہیں رکھتے کہ کسی گمراہ کو ہدایت کریں۔ یہ کام تو جبار جل جلالہ کا ہے کہ وہ دلوں کو سرکشی سے ہدایت کی طرف پھیرتا ہے، پھر بھلا وہ ہادیِ برحق اتباع کے لائق ہے یا جو ہدایت نہ کر سکے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ابراہیم علیہ السلام سے خبر دیتے ہوئے: ﴿ يَٰٓأَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـٔٗا ﴾ [مریم: ٤٢] ''اے میرے باپ! تو اس کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ تیرے کچھ کام آئے؟''

نیز اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ أَتَعۡبُدُونَ مَا تَنۡحِتُونَ ۝ وَٱللَّهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُونَ ﴾ [الصافات: ٩٥ ـ ٩٦] ''اس نے کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جنھیں تم خود تراشتے ہو؟ حالاں کہ اللہ ہی نے تمھیں اور تمھارے اعمال کو پیدا کیا ہے۔'' بالجملہ تمھاری عقلیں کدھر گئیں، تم کو کیا ہو گیا ہے؟ تم خالق اور مخلوق کو برابر ٹھہراتے ہو۔ اللہ کو چھوڑ کر کبھی اس کی کبھی اُس کی عبادت کرتے ہو۔ صرف مالک اور حاکم کی عبادت نہیں کرتے جو گمراہی میں ہدایت دینے والا ہے اور پکارنے اور رجوع کرنے کے لیے خالص اس کو اختیار نہیں کرتے۔ پھر اللہ نے یہ ذکر کیا کہ یہ مشرکین دلیل کا اتباع نہیں کرتے اور نہ دلیل کو مانتے ہیں، بلکہ اپنے وہم اور خیال میں گرفتار ہیں جو کچھ بھی ان کے کام نہیں آ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے افعال کا حال معلوم ہے۔ یہ ان کے حق میں ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش ہے، اس لیے کہ اللہ ان کو ان کے عمل کی پوری سزا دے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے چھٹی حجت بیان کی اور اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم ان سے اس حجت کا ذکر کرو۔ وہ لوگ اگرچہ معاد (قیامت) کا اقرار نہیں کرتے، لیکن جس صورت میں کہ قیامت کا معاملہ ظاہر ہے اور اس سورت میں اس پر دلائل دیے گئے ہیں، ایسے دلائل جن کا رد کرنا ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً اس شخص کے نزدیک جو انصاف کرنے والا ہے اور مقابلہ کرنے والا نہیں ہے تو گویا یہ قیامت کا معاملہ ان کے نزدیک تسلیم شدہ بات ہے، وہ اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ معنی یہ ٹھہرے کہ کیا ان بتوں اور مردوں میں سے جو تمھارے خیال میں الٰہ ہیں، کوئی ایسا ہے جو بغیر کسی پہلے نمونے کے مخلوق کو عدم سے پیدا کرے، پھر اس مخلوق کی موت کے بعد قیامت میں اسے دوبارہ پہلی شکل میں پیدا کر سکے، تاکہ ان کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دی جا سکے۔ یہ سوال بطورِ استفہامِ انکاری کے ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حقیقتِ توحید اور شرک کے بطلان پر ایک دوسری حجت ہے۔[1] اس میں یہ واضح کیا ہے کہ یہ شرکا الوہیت کے استحقاق سے عاجز ہیں اور مخلوق کو پیدا کرنا اور اس کا دوبارہ پیدا کرنا اور اس کے بعد والی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مختص ہیں۔ پھر تم کدھر پھرے جاتے ہو۔ بھلا تمھارے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ راہِ حق کا راستہ دکھائے۔ یہ استدلال ہے ہدایت کا پیدائش کے استدلال کے بعد اور قرآن میں اس طرح کا استدلال بہت آیا ہے، جیسے: ﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴾ [الشعراء: ۷۸] ''جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔'' نیز جیسے: ﴿ اَلَّذِیْۤ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴾ [طٰہٰ: ۵۰] ''جس نے ہر شے کو اس کی شکل وصورت دی، پھر ہدایت دی۔'' نیز جیسے: ﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۪ۙ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ﴾ [الأعلیٰ: ۲۔ ۳] ''جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھاک بنایا۔ اور جس نے اندازہ کیا، پھر ہدایت دی۔'' ہر تینوں جگہوں پر حق سے مراد باطل کی ضد ہے۔

پھر اس سوال کا جواب یہ فرمایا کہ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ ہادی الی الحق اللہ پاک ہے۔ اس کا گھیر لینا کامل اور مکمل ہے۔ تم کو اور تمھارے شرکا کو سب کو وہ گھیرے ہوئے ہے۔ اللہ کا بندوں کو ہدایت کرنا رسولوں کو بھیج کر، کتابوں کو نازل کر کے اور پیدائش کی نشانیاں دکھا کر ہوتا ہے۔ بندوں کی عقلیں اور فہم اور کان اور آنکھیں ان کے ساتھ توصل کرتے ہیں۔ پھر وہ شخص اتباع یا اقتدا کا زیادہ حق دار ہے جو لوگوں کو راہِ راست پر لائے اور ہدایت کرے یا وہ شخص جسے خود ہدایت کا راستہ معلوم نہیں مگر اس صورت میں کہ اسے راستہ بتایا جائے۔ تم کو کیا ہو گیا ہے جو تم ایسا حکم کرتے ہو۔ یہ تعجب ان کے فعل پر کیا ہے۔ دونوں استفہام ان کو ڈرانے اور دھمکانے کے لیے ہیں۔

اہلِ شرک کا مسئلہ... بے بصیرتی اور گمان کی پیروی:

پھر کہا کہ اکثر اہلِ شرک اپنے گمان کے پیرو ہیں، ان کا شرک کرنا محض ظن اور اندازے اور گمان پر ہے نہ کہ بصیرت سے، حالانکہ ان کا یہ ظن کہ یہ معبود ان کو اللہ کے نزدیک کریں گے اور اللہ کے پاس ان کے سفارشی ہوں گے، محض ان کا خیال اور اندازہ اور گمانِ باطل ہے، یہ تو اس معاملے میں فقط اپنے آبا واجداد کے مقلد ہیں۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ علمِ اصول کا حاصل کرنا واجب ہے اور تقلید اور ظن پر اکتفا کرنا ناجائز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اکثر سے اس جگہ مراد رؤسا ہیں، یہ لوگ غالباً ظن کے تابع ہوتے ہیں، حالانکہ ظن کچھ فائدہ مند نہیں ہوتا، اس لیے کہ دین کے معاملے کی بنیاد علم پر ہے۔ علم ہی سے حق باطل سے ممتاز اور واضح ہوتا ہے اور ظن علم کے قائم مقام نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ظن سے حق ہاتھ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام افعالِ قبیحہ کا جاننے والا ہے جو کہ اہلِ کفر وشرک سے صادر ہوتے ہیں۔[2]

---

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ١٤١)
[2] فتح البيان (٦/ ٥٨۔ ٦١)

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

اور یہ قرآن (ایسا) نہیں کہ غیر اللہ کی طرف سے گھڑ لیا گیا ہو، بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے کی ہیں اور ان تمام کتابوں کی تفصیل (بیان کرتا) ہے، اس میں کوئی شک نہیں، (یہ) رب العالمین کی طرف سے ہے (37) کیا وہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اسے گھڑ لیا ہے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: تو تم اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور (اس میں مدد کے لیے) اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو (38) بلکہ انھوں نے ایسی چیز کو جھٹلایا جس کا اپنے علم سے وہ احاطہ نہ کر سکے اور ابھی تک اس کی اصل حقیقت بھی ان پر نہیں کھلی تھی، اسی طرح ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا تھا جو اُن سے پہلے تھے، پھر دیکھیے ظالموں کا انجام کیسا ہوا! (39) اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اور آپ کا رب ان فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے (40)

قرآن کی حقانیت اور اعجاز کا تذکرہ اور چیلنج:

اس کی حقیقت نہیں آئی، یعنی جو اس قرآن میں وعدہ ہے وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن کے اعجاز کا بیان ہے کہ کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں لا سکتا نہ اس جیسی دس سورتیں اور نہ ایک سورت، کیوں کہ یہ کلام اس فصاحت، بلاغت، جازت، شیرینی اور تروتازگی کے ساتھ اور کثیر المعانی دونوں جہانوں میں نفع دینے والا ہو نہیں سکتا مگر اللہ ہی کی طرف سے کہ اس کی ذات وصفات وافعال اور اقوال کے مشابہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اس کا یہ کلام مخلوق کے کلام کے مشابہ نہیں ہو سکتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آیتِ باب) یعنی ایسا قرآن نہیں ہو سکتا مگر اللہ ہی کے پاس سے۔ بشر کا کلام اس کے

مشابہ نہیں ہوتا ہے، یہ کلام تو اللہ کی پہلی مقدس کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ان کتابوں میں جو تحریف اور تبدیلی ہوئی ہے اس کو بیان کرتا ہے اور حلال وحرام کے احکام کے لیے ایک بیانِ شافی وتفصیلِ کافی ہے۔

اس کے حق ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یہ رب العالمین کی طرف سے ہے، جس طرح کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ حارث اعور میں آیا ہے: "فِيهِ خَبَرُ مَا قَبْلَكُمْ، وَنَبَأُ مَا بَعْدَكُمْ، وَفَصْلُ مَا بَيْنَكُمْ"[1] یعنی اس میں اگلی پچھلی خبر ہے اور لوگوں کے درمیان حال کا فیصلہ شریعتِ الٰہی کے مطابق ہے۔ پھر اگر تم اس کو ایک کلامِ ساختہ و پرداختہ خیال کر کے شک کرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ محمد ﷺ نے بنایا ہے اور محمد ﷺ تمھاری طرح بشر ہیں اور وہ تمھارے زعم میں اس کلام کو اپنی طرف سے لائے ہیں تو بھلا تم اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ، یعنی جنسِ قرآن کی اور اس کام پر جنوں اور انسانوں میں سے جس کسی کو قدرت ہو تم اس کی مدد لو۔ یہ تیسرا تحدی کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس امر کی طرف بلایا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ کلام محمد ﷺ کا ہے تو پھر مقابلہ کرو اور اس کلام جیسا کلام لے آؤ اور جس کسی سے چاہو اس سلسلے میں مدد بھی لے لو۔

پھر یہ خبر دی کہ ان کو ہرگز یہ قدرت نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس طرف راہ پا سکتے ہیں: ﴿ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ۸۸] "کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثل نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔" پھر اس کے بعد اللہ نے ان کے ساتھ چھوٹا راستہ اختیار کیا اور کہا کہ اگر سارے قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو تم دس سورت ہی بنا لاؤ، یہی سہی، چنانچہ سورت ہود کے شروع میں فرمایا: ﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [هود: ۱۳] "کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ کہہ دیجیے: پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔"

پھر اس سے کم کر کے ایک سورت کی حد مقرر کی اور آیتِ باب میں فرمایا: ﴿ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ﴾ اسی طرح سورت بقرہ میں جو مدنی سورت ہے، ایک ہی صورت کی حد لگائی اور خبر دی کہ وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتے، فرمایا: ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ۲٤] "چناں چہ اگر تم (یہ کام) نہ کر سکو اور تم کر بھی نہیں سکو گے، تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور (وہ) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

حالانکہ فصاحت ان کی خصلت تھی اور اس بارے میں ان اشعار اور معلقات میں انتہا درجے کی فصاحت ہوتی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۰٦) اس کی سند میں "حارث اعور" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦۳۹۳)

تھی، لیکن اللہ کی طرف سے ایسا فصیح و بلیغ کلام آیا جس کا مقابلہ کوئی شخص نہ کر سکا، اسی لیے جس نے اس کلام کی بلاغت پہچان لی وہ ایمان لے آیا، کیوں کہ یہ لوگوں میں زیادہ علم وفہم والے اور حق کی اتباع کرنے والے اور ہدایت قبول کرنے والے تھے جس طرح جادوگروں نے سحر کے علم وفنون کی معرفت سے موسیٰ علیہ السلام کے فعل کو پہچان لیا تھا کہ یہ کام سوائے اس شخص کے جس کو اللہ کی تائید حاصل ہو اور جسے اللہ نے بھیجا ہو، کوئی دوسرا شخص کر ہی نہیں سکتا، اسے قدرت ہی نہیں کہ اللہ کے اذن کے بغیر ایسا کام کر سکے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ایسے زمانے میں ہوئی تھی جو طب اور مریضوں کے علاج معالجہ کے علما اور ماہرین کا زمانہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے اذن سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے اور مردے کو زندہ کر دیتے تھے، سو ایسے کام میں علاج اور دوا کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان میں سے جس شخص نے یہ بات پہچان لی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، وہ ایمان لے آیا۔

صحیح میں مرفوعاً آیا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں جس کو اس قدر نشانیاں دی گئیں ہیں کہ اس پر بشر ایمان لے آئیں اور وہ چیز جو مجھ کو دی گئی ہے وہ وحی ہے جو اللہ نے میری طرف بھیجی ہے، مجھے امید ہے کہ میرے تابع لوگ سب سے زیادہ ہوں گے۔[1] لیکن ان لوگوں نے قرآن مجید کو جھٹلایا اور کچھ نہ سمجھا اور نہ پہچانا اور اس قرآن میں جو ہدایت اور دینِ حق ہے اس کو حاصل نہ کیا، بلکہ اپنی جہالت اور بیوقوفی سے ان کو جھٹلاتے ہی رہے۔ اسی طرح اگلی امتوں نے اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی تو دیکھ کہ ہم ان کو رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے جو ان سے براہِ ظلم وغلو وکفر وعناد و جہل صادر ہوئی تھی کس طرح ہلاک کر ڈالا کہ اب کہیں ان کا اتا پتا بھی نہیں۔ سوائے جھٹلانے والو! تم ڈرو، کہیں ان جیسے مصائب تم پر بھی نہ ٹوٹ پڑیں اور تم بھی ان کی طرح برباد ہو کر بے نام ونشان ہو جاؤ۔

پھر فرمایا کہ بعض ان کے ایمان بھی لاتے ہیں اور قرآن کو مانتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں اور رسالت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض جو ایمان نہیں لاتے وہ اسی کفر وشرک پر مر جاتے ہیں اور اسی حالت پر اٹھائے جائیں گے۔ اے پیغمبر! تیرے رب کو ان مفسدوں کا حال خوب معلوم ہے وہ جانتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون ضلالت کا مستحق ہے۔ یہ اس کا عدل ہے وہ ہرگز ظلم نہیں کرتا، بلکہ ہر مستحق کو اس کا حق دیتا ہے۔ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَتَقَدَّسَ وَتَنَزَّهَ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ.[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ قرآن افترا (گھڑا ہوا) نہیں ہے، بلکہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ بھلا یہ کس طرح افترا کیا ہوا ہو سکتا ہے، حالانکہ جو عرب بڑے فصیح، بلیغ، دقیق الذہن، معنی آفرین اور شیوا بیان

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٩٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٢)
[2] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٤٥۔ ٥٤٦)

ہیں وہ اس جیسی ایک سورت بھی نہیں لا سکتے ہیں، پھر افترا کیسا؟ ہاں یہ قرآن اگلی کتبِ آسمانی کی تفصیل بیان کرتا ہے اور ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور یہ تصدیق ایک مستقل معجزہ ہے، کیوں کہ اس کتاب کے قصے پہلی مقدس کتابوں کے موافق ہیں، حالانکہ نبی اکرم ﷺ کو ان کتابوں کی کوئی اطلاع اور علم نہیں تھا اور نہ کسی سے ان کے بارے میں پوچھا تھا اور نہ کسی عالم کے پاس اٹھے بیٹھے تھے کہ سیکھ لیتے۔ کتاب سے مراد پہلے انبیا کی کتابیں ہیں یا قرآن مبین کے احکام ہیں یا لوحِ محفوظ۔ کچھ ہو اس قرآن کے رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کچھ شک وشبہہ نہیں ہے۔

کیا یہ لوگ اس کو رسول اللہ ﷺ کا داختہ و پرداختہ بتاتے ہیں اور ایک گھڑا ہوا کلام کہتے ہیں۔ سو ان سے یہ کہہ دو کہ اچھا اگر یہ بشر کا کلام ہے تو تم بھی بشر ہو، بھلا ایک سورت تو اس جیسی بنا لاؤ، کیوں کہ اے اہلِ عرب تم کو فصاحتِ زبان اور حسنِ نظم و بلاغتِ تبیان میں بڑی مہارت ہے اور مضمون نگاری اور عبارت آرائی میں بڑا ملکہ اور قدرت حاصل ہے۔ مراد یہ ہے کہ مثلاً اس سورت یونس جیسی کوئی سورت بنا لاؤ، کیوں کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا وہ یہی سورت ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ سورت مکی ہے۔[1] لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام سورتوں کو شامل ہے، کیوں کہ انھیں ایک بہت چھوٹی سورت لانے کی بھی قدرت نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ اگر تنہا تم سے یہ کام نہیں ہو سکتا تو تم یہ کام کرو کہ اللہ کے سوا قبائلِ عرب اور اپنے شرکا معبودوں اور جنوں میں سے جس کو چاہو اپنا مددگار بنا لو، سب خلق مل کر اس جیسی کوئی ایک ذرا سی سورت بھلا بنا تو لائے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ قرآن افترا کیا ہوا اور گھڑا ہوا ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ. یہ کیا مضبوط حجت اور واضح دلیل اور برہانِ جلی ہے جس کو بلا تکلف عقلیں تسلیم کر لیں، یعنی اگر تم میں ایک شخص اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، حالانکہ تم بڑے عربی دان، صاحبِ زبان ہو تو جنوں اور بتوں کو بھی اپنا شریکِ حال کر لو، پس اگر تم سب کو شامل کر کے ایسا کلام بنا لاؤ گے تو تم سچے ٹھہرو گے اور تمھاری یہ بات کہ قرآن مخلوق ہے مجھ پر چسپاں ہو جائے گی، لیکن وہ اس بات کو سن کر دم بخود رہ گئے۔ اس کے سوا کچھ جواب نہ بنا کہ دشمنی پر کمر باندھ لی اور بلا دلیل مقابلہ اور مناظرہ کرنے لگے، سو کوئی مبطل بھی اس طرح کے مکابرہ و مقابلہ سے عاجز نہیں ہوتا۔ قرآن کی تحدی مقرر کرنے کے مراتب چار ہیں: ایک تحدی لتمام القرآن، دوسری تحدی بعشر سور، تیسری تحدی بسورت واحدہ، چوتھی تحدی بحدیث، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ ﴾ [الطور: ٣٤] ''پھر (انھیں) چاہیے کہ اس (قرآن) جیسی ایک بات لے آئیں۔'' معلوم ہوا کہ قرآن کی طرح کا ایک جملۂ تامہ بھی کوئی بشر نہیں لا سکتا۔ ﴿ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ﴾ [الأنعام: ١٤٩] ''پھر مضبوط دلیل تو اللہ ہی کی ہے۔''

---

[1] تفسیر الرازي (١٧/ ٧٨)

پھر اللہ نے کہا کہ ان کی تکذیب اس لیے ہے کہ یہ قرآن کے علم کا احاطہ کرنے والے اور ماہر نہیں ہیں۔ اگر غور و تفکر کرتے اور اس کے معانی کو سمجھتے اور مبانی کو دیکھتے بوجھتے تو مان لیتے۔ یہی حال تقلید میں پھنسے ہوئے شخص کا ہے کہ جو کوئی اس حق کی طرف دعوت دیتا ہے اور متمسک بذیلِ انصاف ہوتا ہے تو وہ اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا، بلکہ اس سے سخت بے پروا اور بیزار ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو کوئی روشن حجت اور واضح دلیل کے بغیر اسے اچھی طرح سمجھے ہوئے جھٹلاتا ہے وہ اس جھٹلانے میں کسی شے کے ساتھ متمسک نہیں ہوتا، مگر صرف جہالت کے ساتھ، گویا اس جھٹلانے سے خود اپنی جان کے لیے جہالت ثابت کرتا ہے اور یہ بات جتلاتا ہے کہ میں دلیل کو نہیں سمجھتا ہوں اور نہ حجت کو پہچانتا ہوں، اسی جگہ سے یہ کہا ہے:

مَا يَبْلُغُ الْأَعْدَاءَ مِنْ جَاهِلٍ ۔۔۔ مَا يَبْلُغُ الْجَاهِلَ مِنْ نَّفْسِهِ

''جاہل خود اپنا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔''

یہ تکذیب ان کی اس لیے ہے کہ انھوں نے تاویل اس کی نہیں سمجھی اور ان کی عقل نے وہاں تک رسائی کی اور نہ ذہن اس جگہ تک پہنچا، سو یہی حال اگلے جھٹلانے والوں کا بھی تھا کہ اچھی طرح جان لینے اور سمجھ لینے سے پہلے ہی انھوں نے اپنے انبیا کو جھٹلایا تھا، اب تو دیکھ کہ ان ظالموں کا انجام کیا ہوا، کوئی زمین میں دھنسا دیا گیا، کسی کی صورت مسخ کر دی گئی، ان پر طرح طرح کی سزائیں آئیں اور برباد ہو گئے۔ قرآن پاک میں پہلی امتوں پر گیارہ طرح کے عذاب کا ذکر آیا ہے۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ. یہ خطاب یا تو نبی اکرم ﷺ کو ہے یا ہر فردِ بشر کو۔

پھر فرمایا کہ ان مکذبین میں سے کوئی نہ کوئی آدمی ایمان لاتا ہے اور رسول اور قرآن کو سچا جانتا ہے اور اس کی تکذیب مقابلے اور دشمنی کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ یا مراد وہ شخص ہے جو آیندہ ایمان لائے گا، اگرچہ فی الحال وہ مکذب ہے اور کوئی سرے ہی سے یقین نہیں کرتا، بلکہ جہالت اور تقلید کے طور پر تکذیب سے پیش آتا ہے اور آیندہ بھی اس کے ایمان لانے کی امید نہیں، بلکہ وہ اپنے انکار اور جحود پر اڑا ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ تقسیم اہلِ مکہ کے ساتھ خاص ہے اور بعض نے کہا ہے کہ تمام کفار کے حق میں عام ہے۔ سو تیرے رب کو ان مفسدوں کے حال اور قال کی پوری خبر ہے۔[1]

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿41﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ

[1] فتح البیان (٦/ ٦٢۔ ٦٦)

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ
اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٤﴾

اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم اس سے بَری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بَری ہوں جو تم عمل کرتے ہو (41) اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، پھر کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں، اگرچہ وہ عقل نہ رکھتے ہوں؟ (42) اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، پھر کیا آپ اندھوں کو راہ دکھا سکتے ہیں، اگرچہ وہ نہ دیکھتے ہوں؟ (43) بے شک اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا، مگر لوگ اپنے آپ پر (خود ہی) ظلم کرتے ہیں (44)

مشرکوں سے اظہارِ بیزاری کا حکم:

یعنی اگر میں اللہ کا حکم جھوٹ پہنچاؤں تو میں گناہ گار ہوں، تم نہیں اور اگر میں سچ لاؤں پھر تم اس کو نہ مانو تو گناہ تم پر ہے۔ تو ماننے میں تمھارا نقصان نہیں ہے کسی طرح۔ پھر کہا کہ کان رکھتے ہیں یا نگاہ رکھتے ہیں، اس توقع پر کہ ہمارے دل پر تصرف کر دیں، جیسا کہ بعضوں پر ہو گیا۔ سو یہ بات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بعضوں کے دل پر اثر نہیں ہوتا، سو یہ ان کی تقصیر (قصور) ہے کہ دل صاف کر کے نہیں سنتے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اپنے نبی کو فرمایا ہے کہ اگر یہ مشرکین تیری تکذیب کریں تو تو ان سے بیزار ہو جا اور ان کے عمل سے الگ رہ اور کہہ دے کہ میں جانوں اور تمھارا کام، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴾ [الكافرون: ١۔ ٦] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اے کافرو! میں ان (بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔''

ابراہیم خلیل علیہ السلام اور ان کے اتباع نے اپنی مشرک قوم سے کہہ دیا تھا: ﴿ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ ﴾ [الممتحنة: ٤] ''بے شک ہم تم سے اور ان سے بَری ہیں، جن کی تم عبادت کرتے ہو سوائے اللہ کے، ہم تم سے منکر ہوئے، ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا ہے، حتی کہ تم اللہ اکیلے پر ایمان لے آؤ۔''

ہدایت رسول کے بس میں نہیں:

پھر کہا کہ ان کے بعض تیرے کلامِ حسن اور قرآنِ عظیم کو سنتے ہیں اور احادیثِ صحیحہ نافعہ جو قلوب و اذہان و ابدان میں سود مند ہوں، کان رکھتے ہیں سو اس میں بہت فائدہ ہے، لیکن یہ بات نہ تیرے بس کی ہے اور نہ ان کے بس کی، کیوں کہ جس طرح تو بہرے کو سنا نہیں سکتا، اسی طرح انھیں ہدایت بھی نہیں کر سکتا، مگر جب ہی کہ اللہ بھی چاہے اور ان کا کوئی شخص تیری طرف نگاہ کرتا ہے اور جو محبت، حسنِ سیرت اور خلقِ عظیم اور اہلِ بصائر کے لیے اور عقل مند لوگوں کے لیے جو دلالتِ ظاہرہ تیری نبوت پر اللہ نے تجھے دی ہے وہ اس کو نظر آتی ہے، لیکن ان کا یہ دیکھنا ویسا ہی ہے جیسا کہ سب لوگ دیکھتے ہیں، اس نظر سے حاصل کچھ نہیں ہوتا، بلکہ مومن آپ کی طرف وقار کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کافر حقارت کی نظر سے: ﴿ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴾ [الفرقان: ۴۱] ''اور (اے نبی!) جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے ہیں (اور کہتے ہیں:) کیا یہی ہے وہ جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟''

اللہ ظلم نہیں کرتا:

اللہ تعالیٰ نے اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے سبب سے یہ لوگوں کو ہدایت کی اور اندھوں کو بینا کیا اور نابیناؤں کی آنکھیں کھولیں اور بہروں کو کان دیے اور غلاف میں پڑے ہوئے دلوں کو کھولا اور بعض دوسرے لوگوں کو ایمان سے گمراہ رکھا، سو وہ کسی بندے پر ظلم نہیں کرتا، وہ حاکم ہے جس طرح چاہے اپنے محکومین پر تصرف کرے: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ۲۳] ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔'' یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ عالم و حکیم و عادل ہے، بلکہ خود لوگ ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنی جان پر ظلم کو حرام کیا ہے اور تمھارے درمیان بھی اس کو حرام ٹھہرایا ہے، سو تم آپس میں ظلم نہ کرو، پھر حدیث کے آخر میں ہے کہ اے میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں جن کو میں نے تمھارے واسطے گن رکھا ہے، میں یہ سب تمھیں بھرپور دے دوں گا، پھر جو کوئی خیر پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جو کوئی اور طرح پائے وہ ملامت نہ کرے مگر اپنی ہی جان کو۔[1] (رواہ مسلم بطولہ)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر یہ لوگ تیری تکذیب پر ڈٹے رہیں تو تو ان سے یہ کہہ دے کہ میرے عمل کی جزا مجھ کو ملے گی اور تمھارے عمل کی جزا تم کو۔ تم میرے عمل سے اور میں تمھارے کرتوت سے بری ہوں۔ یعنی ایک کے عمل

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷۷) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۴۷)

کا مواخذہ دوسرے کے عمل سے نہ ہوگا۔ اس آیت کا منسوخ ٹھہرانا غلط ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کافروں میں بعضے لوگ ایسے ہیں کہ وہ تیرے پڑھنے پر قرآن شریف کو سنتے ہیں، یعنی ظاہر میں، لیکن حقیقت میں نہیں سنتے، کیوں کہ اس سنننے کا کوئی اثر ان پر ظاہر نہیں ہوتا، یعنی نہ اُس کو قبول کریں نہ اُس پر عمل کریں۔ ﴿ یَسْتَمِعُوْنَ ﴾ میں ضمیر جمع کی ہے اور ﴿ یَنْظُرُ اِلَیْكَ ﴾ میں ضمیر واحد کی ہے، یہ اس لیے کہ سننے والے بہ نسبت دیکھنے والوں کے زیادہ ہوتے ہیں، معنی یہ ٹھہرے کہ یہ سننے والے صرف ظاہر میں سنتے ہیں، لیکن حقیقت میں بہرے ہیں تو ان کو کس طرح سنا سکتا ہے، یہ تو محض بے عقل ہیں۔ اس آیت میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ بات سننے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے معنی اور مقصد کو سمجھے بوجھے۔ اسی لیے جانوروں کو سننے اور سمجھنے والا نہیں کہتے۔ اسی طرح یہ لوگ وہم کے مریض ہیں، ان کو تقلید کی عادت پڑ گئی ہے، ان کی عقلیں کلام کی باریکیوں اور اس کے مقصد کو برضا و رغبت سنتے اور سمجھتے نہیں۔ اس سننے سے وہ اتنا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں، جتنا کہ چوپائے ایک کلامِ ناعق (پکارنے والے کی بات) سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ بعض لوگ تیری طرف نظر کرتے ہیں، سو کیا تو اندھوں کو راہ دکھا سکتا ہے، اگرچہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ اس کلام میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی ہے، کیوں کہ جب طبیب کسی بیمار کو دیکھتا ہے کہ وہ علاج کے قابل نہیں ہے تو اس سے اعراض کر کے اس کے علاج سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ بالجملہ اللہ تعالیٰ کسی پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا، خود یہی لوگ اپنی جان پر آپ ظلم کرتے ہیں۔ اس جگہ ظلم سے مراد تعصب اور حق کا مقابلہ ہے اور باطل طریقے سے جھگڑا اور لڑائی کرنا اور کفر پر جمے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو شعور عطا کیا تھا جس سے دین و دنیا کی بھلائیوں کو جان سکیں، لیکن انھوں نے کچھ ان حواس سے کام نہ لیا، بلکہ اپنے فہم و شعور کو ضائع کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بن گئے۔[1]

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور جس دن وہ انھیں اکٹھا کرے گا (تو انھیں یوں لگے گا) جیسے وہ (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہ رہے تھے۔ وہ باہم ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ یقیناً وہ لوگ خسارے میں رہے جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت یافتہ نہ تھے (45)

حشر کے دن دنیا کی زندگی کے انتہائی کم ہونے کا احساس:

یعنی قبر میں رہنا اس دن ایک گھڑی بھر معلوم ہوگا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے لوگوں کو ساعت

---

[1] فتح البیان (٦/ ٦٧۔ ٦٩)

(قیامت) کا قائم ہونا اور قبروں سے نکل کر قیامت کا وقت آنا یاد دلایا، جیسے دوسری جگہ ارشاد ہوا: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ﴾ [الأحقاف: ٣٥] ''گویا کہ وہ (کافر) جس دن اس (عذاب) کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (تو سمجھیں گے کہ) وہ تو (دنیا میں) دن کی بس ایک گھڑی ہی ٹھہرے۔'' اور اس کے فرمان کی طرح: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٦] ''جس روز یہ اسے دیکھ لیں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ صرف دن کا آخری حصہ یا اول حصہ ہی (دنیا میں) رہے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ۝ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴾ [طٰه: ١٠٢۔ ١٠٤] ''جس دن صور میں پھونکا جائے گا، اور ہم اس دن مجرم اکٹھے کریں گے اس حال میں کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔ وہ باہم چپکے چپکے کہتے ہوں گے: تم (دنیا میں) نہیں ٹھہرے، مگر صرف دس دن۔ ہم کو خوب معلوم ہے جو وہ کہیں گے، جب کہ ان میں بہترین رائے والا کہے گا: تم تو صرف ایک دن ٹھہرے تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم: ٥٥۔ ٥٦] ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی، مجرم قسمیں کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) گھڑی بھر کے سوا نہیں ٹھہرے، اسی طرح وہ (دنیا میں) بہکے رہے۔ اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا وہ کہیں گے: یقیناً تم تو، جیسا کہ اللہ کی کتاب (لوحِ محفوظ) میں ہے، دوبارہ اُٹھانے کے دن (قیامت) تک ٹھہرے رہے، چناں چہ یہی دوبارہ اُٹھنے کا دن ہے اور لیکن تم تو (اسے حق) نہیں جانتے تھے۔''

یہ سب آیتیں اس بات پر دلیل ہیں کہ دارِ آخرت میں دنیا کی زندگی کم معلوم ہوگی۔ اس دن دارِ فانی کی زندگانی ملکِ جاودانی میں اتنی کم اور تھوڑی معلوم ہوگی جیسے ایک گھڑی رہے ہوں، جیسے اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿ قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ۝ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ۝ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ١١٢۔ ١١٤] ''اللہ فرمائے گا: زمین میں تم کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ہم ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ رہے، گنتی کرنے والوں سے پوچھ لیجیے۔ اللہ فرمائے گا: واقعی تم (وہاں) تھوڑا سا وقت ہی رہے، کاش! تم (یہ بات دنیا میں) جانتے ہوتے۔''

حشر کے دن ایک دوسرے کو پہچاننا:

تعارف سے مراد یہ ہے کہ اپنے آبا کو پہچانیں گے اور بعض رشتے دار بعض کے شناسا ہوں گے جس طرح کہ

دنیا میں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے، لیکن ہر شخص اپنے حال میں گرفتار ہوگا۔ ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۱] ''پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان میں رشتے داریاں رہیں گی اور نہ وہ باہم سوال کریں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴾ [المعارج: ۱۰] ''اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو نہ پوچھے گا۔''

جھٹلانے والوں کے لیے خسارہ:

اور یہ آیت: ﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا... الآية ﴾ (آیتِ باب) مثل اس آیت کے ہے: ﴿ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [المرسلات: ۱۹] کیوں کہ انھوں نے اپنی جان اور گھر والوں کی خرابی کی قیامت کے دن اس لیے یہ ایک خسرانِ مبین ہے، اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں کہ آدمی اور اس کے دوستوں کے درمیان حسرت اور ندامت کے دن جدائی ہو۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے یہ جس دن حشر کریں گے ہم مشرکوں منکروں کو حساب کتاب کی جگہ پر لے جانے کے لیے۔ اصل حشر کا مطلب جماعت کو باہر نکالنا اور جگہ سے ان کو بے خبر کرنا ہے۔ اس جگہ مراد ان کو قبروں میں سے زندہ کرنا ہے۔ سو جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو یہ جانیں گے کہ ان کا دنیا میں رہنا ایک گھڑی سے زیادہ نہ تھا۔ یا مراد قبروں کے اندر رہنا ہے۔ غرضیکہ وہ دنیا کی مدت اور قبروں میں ٹھہرنے کی مدت کو بہت تھوڑا جانیں گے، یہ اس لیے کہ انھوں نے اپنی دنیا کی عمر ضائع کر دی تھی اور وجود کو عدم کی طرح کر رکھا تھا۔ مدت کو یہ کم جاننا دہشت اور حیرت کی وجہ سے ہوگا یا محشر میں بہت لمبا عرصہ ٹھہرنے کی وجہ سے۔ یا عذابِ حشر کے سبب دنیا کی لذتوں کو بھول جائیں گے، گویا کہ وہ لذات تھیں ہی نہیں۔

یا یہ کہ ان کا دنیا میں مقام آخرت کے مقام کے مقابلے میں نہایت قلیل ہوگا۔ اس تشبیہ سے مقصود حشر کی کمال درجے کی سہولتوں کو بیان کرنا ہے، بہ نسبت اللہ تعالیٰ کے، اگرچہ ایک طویل زمانے کے بعد ہو۔ اس میں ان کے انکار کا اظہار ہے، کیوں کہ وہ کہتے تھے: ﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴾ [الصافات: ۱٦] ''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہمیں سچ مچ (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟'' اور اسی طرح کی اور آیات۔ یا مراد یہ ہے کہ دونوں پیدائشوں کے درمیان شکلوں اور صورتوں میں موافقت ہوگی، کیوں کہ لبث یسیر (قبر میں تھوڑا سا ٹھہرنے) کے لیے یہ لازمی ہے کہ شکلوں میں تغیر و تبدل نہ ہو اور ساعت سے مراد تھوڑا زمانہ ہے۔ انتہائی قلت کی جگہ میں مثال ساعت کی دیتے ہیں۔ اور ساعت کی تخصیص دن کے ساتھ اس لیے ہے کہ دن کی ساعتیں

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵٤۷)

رات کی ساعتوں کی نسبت زیادہ جانی جاتی ہیں۔

پھر فرمایا کہ ان کے بعض دوسروں کو پہچانیں گے، گویا ان سے کچھ زیادہ جدا نہیں رہے۔ فقط تھوڑی سی جدائی ہوئی تھی، یہ تعارف حشر اور اجتماع کے شروع میں واقع ہوگا۔ پھر اثنائے امر میں منقطع ہو جائے گا، یا قبروں سے نکلنے کے وقت ہوگا، پھر جاتا رہے گا، کیوں کہ ان کے سامنے خوف ناک اور بدحواس کرنے والے اور عقل لے جانے والے امور درپیش ہوں گے۔

رہا بعث کا وقت سو اس میں کچھ تعارف نہ ہوگا، بسبب عدمِ اجتماع کے۔ امام ابو البقاء اور بیضاوی رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے،[1] لیکن غالب مفسرین اس کے برخلاف ہیں، کیوں کہ انھوں نے حشر کی تفسیر بعث کے ساتھ کی ہے۔ امام خازن، قرطبی اور ابو السعود رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[2] بعض نے کہا ہے کہ یہ تعارف ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کا تعارف ہوگا۔ ایک دوسرے سے کہے گا کہ مجھ کو تو نے گمراہ کیا اور بہکا دیا، یہ کچھ شفقت اور نرمی کا تعارف نہیں ہوگا۔ اسی پر یہ آیت محمول ہے: ﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ اِۨلْقَوْلَ ﴾ [سبا: ۳۱] ”اور (اے نبی!) کاش آپ دیکھیں! جب ظالم لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، جبکہ ان کا بعض بعض کی بات رد کر رہا ہوگا۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۗ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۗ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۳۸] ”جب بھی ایک امت آگ میں داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن (اپنے جیسی دوسری امت) پر لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب اس میں وہ سب اکٹھے ہوں گے تو ان کی دوسری جماعت ان کی پہلی جماعت کے بارے میں کہے گی: اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، لہٰذا تو انھیں آگ کا دوگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا: (تم میں سے) ہر ایک کے لیے دوگنا (عذاب) ہے، مگر تم نہیں جانتے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا ﴾ [الأحزاب: ٦٧] ”اے ہمارے رب! بے شک ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی۔“ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔[3]

اس بارے میں جو مختلف آیتیں آئی ہیں ان میں جمع اس طرح ہو سکتا ہے کہ قیامت میں مواقف (کھڑے ہونے کی جگہ) مختلف ہوں گے جو ماجرا ایک جگہ میں ہوگا وہ دوسری جگہ میں نہیں ہوگا، سو جن لوگوں نے اللہ سے ملنے

---

① تفیسر البیضاوي (۳/ ۲۰۰)

② تفسیر القرطبي (۸/ ۳٤۷۔ ۳٤۸) تفسیر الخازن (۳/ ۱۹۱۔ ۱۹۲) تفسیر أبي السعود (٤/ ۱۵۰)

③ تفسر القرطبي (۸/ ۳٤۸)

کو جھٹلایا ہے وہ اس دن خائب و خاسر اور نامراد ہوں گے، کیوں کہ انھیں راہِ حق میسر نہیں آئی تھی، وہ اپنی جہالت اور تقلید میں پھنسے رہے۔ نجات و نفع و فلاح کے طلب گار نہ ہوئے۔[1]

وَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ ۝۴۶ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝۴۷

اور (اے نبی!) اگر ہم ایسا کوئی عذاب آپ کو دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں یا ہم آپ کو وفات دے دیں، تو انھیں ہماری طرف لوٹنا ہے، پھر اللہ ان کاموں پر گواہ ہے جو وہ کرتے ہیں (46) اور ہر ایک امت کا ایک رسول ہے، پھر جب ان کا رسول آ گیا تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا (47)

دنیا یا آخرت میں مجرموں سے انتقام ضرور لیا جائے گا:

یعنی اسلام کا غلبہ کچھ نبی اکرم ﷺ کے روبرو ہوا اور باقی ان کے خلفا کے دور میں۔ اور عملِ بد آگے سے ہوتے ہیں، لیکن رسول بھیج کر سزا ملتی ہے۔ اللہ نے اپنے رسول سے کہا کہ اگر ہم تیری حیات میں بعض مشرکین سے انتقام کر لیں، تا کہ تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوں یا تجھ کو وفات دیں تو بہرحال ان کو ہماری ہی طرف پھر کر آنا ہے اور تیرے بعد ہم ان کے اعمال کے شاہد ہیں۔ حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ آج کی رات مجھ پر میری امت پیش کی گئی، اس پتھر کے نزدیک اول اور آخر یعنی تمام اور مکمل امت۔ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ پر وہ پیش کیے گئے جو پیدا ہو چکے ہیں، سو ان کا کیا حال ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے؟ فرمایا: وہ میرے لیے مٹی میں مصور ہوئے، یہاں تک کہ ان میں سے میں ہر انسان کو پہچانتا ہوں جس طرح کہ تم اپنے کسی ساتھی کو پہچانتے ہو۔[2] (رواه الطبراني وغيره) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قیامت کے دن ہر امت کا رسول آ چکے گا، تب اس امت کے درمیان منصفانہ فیصلہ ہو گا،[3] جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ﴾ [الزمر: ٦٩] ''اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی۔''

رسول کے سامنے امت کی حاضری:

بالجملہ اللہ کے پاس ہر امت کی حاضری اس کے رسول کے سامنے ہو گی اور نامۂ اعمال خیر ہو یا شر، سامنے رکھا

---

(1) فتح البیان (٦/ ٦٩۔ ٧١)

(2) المعجم الکبیر (٣/ ١٨١) اس کی سند میں ''زیاد بن منذر'' سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعیفة (٣٨٦١)

(3) تفسیر الطبري (١٥/ ٩٩)

ہوگا، وہ ہر عمل کی گواہی دے گا اور ملائکہ حافظین بھی موجود ہوں گے۔ ایک امت کے بعد دوسری امت آئے گی اور یہ امتِ شریفہ اگرچہ پیدائش میں آخری امت ہے، لیکن قیامت کے دن سب سے پہلے اس امت کے فیصلے کیے جائیں گے۔ وللہ الحمد.

صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے کہ "نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الْمَقْضِيُّ لَهُمْ قَبْلَ الْخَلَائِقِ"[1] اس امت کو یہ قصب السبق خاتم الانبیاء رسول اللہ ﷺ کے شرف کی بدولت حاصل ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اس امت کے موحد متبع سب سے پہلے ناجی ہوں گے اور اس امت کے فیصلے میں بہت وقت صرف نہ ہوگا۔ امت سے اس جگہ وہی لوگ مراد ہیں جو فرقہ ناجیہ اور امتِ اجابت (جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کیا) ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے فرمان: « مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ »[2] کے مصداق ہوں گے، نہ کہ ساری امت جن کو دعوت پیش کی گئی، بلکہ اس امت کے مشرک اور بدعتی اولیت کے سبب سے پہلے حکم جہنم کا سن کر آگ میں داخل ہوں گے۔ نَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر ہم تجھ کو تیری حیات میں تیرے دین کا غلبہ اور بعض منکرین کا قتل اور قید ہونا دکھا دیں یا تجھ کو اس دکھانے سے پہلے وفات دیں تو اس سے یہی بہتر ہے کہ ہم ان کو آخرت میں عذاب کریں اور تو دیکھے کہ انھیں عذاب ہو رہا ہے، کیوں کہ وہ جاتے کہاں ہیں، آخر پھر کر ہمارے ہی پاس حاضر ہوں گے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ اگر ہم نے ان کا انتقام عاجلاً (جلدی) نہیں کیا ہے تو آجلاً (ایک مدت کے بعد) ضرور ہی ہوگا، اس کے ساتھ غزوۂ بدر وغیرہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی ان کا قتل ہونا اور قید ہونا، ان کی ذلت اور ان کی عزت وغرور کا خاک میں مل جانا دکھا دیا۔ وللہ الحمد.

اور اللہ ان کے فعل پر یعنی تکذیب اور کفر پر شاہد ہے، وہ سخت عذاب کیے بغیر کب رہتا ہے، ان کو ضرور عذاب کرے گا۔ پہلے وقتوں میں جتنی امتیں ہو چکی ہیں، ان میں اللہ نے اپنی مصلحت کے تقاضے سے ایک ایک رسول بھیجا ہے، جب وہ رسول ان میں آیا اور امت نے اس کی تکذیب کی تو اللہ نے اس امت اور رسول کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا، رسول بچ گیا اور امت ہلاک ہوگئی، سو دنیا میں امتوں کا یہ عذاب انصاف تھا نہ کہ ظلم، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥] "اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب نہیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)

دیتے، یہاں تک کہ ہم کوئی رسول بھیج دیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥] ''اور خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے رسول بھیجے، تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کو الزام دینے کی کوئی گنجائش نہ رہے۔''

اس فیصلہ کرنے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ دنیا میں ہے، دوم یہ کہ آخرت میں ہوگا، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ بہر حال وہ اس فیصلے کے مطابق بغیر کسی گناہ کے عذاب نہیں دیے جائیں گے اور بغیر کسی حجت کے گرفتار نہیں ہوں گے اور اللہ کا فرمان ہے: ﴿ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ﴾ [الزمر: ٦٩] ''اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ٤١] ''پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (ﷺ) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟'' اس سے مراد بندوں کے درمیان عدل و انصاف کے اظہار میں مبالغہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اللہ نے کفار کے ایک اور شبہے کا ذکر کیا اور فرمایا:[1]

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ۭ اٰۗلْــٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝

اور وہ (کافر) کہتے ہیں یہ (عذاب کا) وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ 48 (اے نبی!) کہہ دیجیے: میں اپنی ذات کے لیے کسی نقصان کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ نفع کا، مگر جو اللہ چاہے، ہر امت کے لیے ایک مقررہ وقت ہے۔ جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو وہ (اس سے) ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتے 49 کہہ دیجیے: بھلا دیکھو تو، اگر اس کا عذاب تم پر رات کو یا دن کو آجائے (تو کیا بچاؤ کرلو گے؟ آخر) کیا چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچا رہے ہیں؟ 50 کیا پھر جب (عذاب) واقع ہو جائے گا

[1] فتح البیان (٦/ ٧١۔ ٧٣)

(تب) اس پر ایمان لاؤ گے؟ (اس وقت کہا جائے گا:) کیا اب (ایمان لاتے ہو؟) حالاں کہ تم تو یقیناً اسے جلدی مانگتے تھے ﴿51﴾ پھر جنھوں نے ظلم کیا، ان سے کہا جائے گا: تم دائمی عذاب (کا مزہ) چکھو، تمھیں انھی کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو تم (دنیا) میں کماتے رہے ﴿52﴾

منکروں کا قیامت یا عذاب کو جلد طلب کرنا اور اس کا جواب:

یعنی بچاؤ کر نہ سکو گے، پھر پوچھنے کا کیا فائدہ۔ عذاب آنے پر ایمان لانا کب قبول ہو گا، اس واسطے پوچھو تو بھی عبث ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان مشرکین کے حال کی خبر دی جو عذاب آنے کی جلدی کرتے ہیں اور اس کا وقت پوچھتے ہیں اس سے پہلے کہ اس کا تعین کیا جائے۔ اس میں ان کا کچھ فائدہ نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ﴾ [الشوریٰ: ١٨] ”وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور جو لوگ ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ وہ برحق ہے۔“ یعنی قیامت لامحالہ آنے والی ہے، اگر چہ تم کو اس کا معین وقت معلوم نہیں ہے، اسی لیے اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو اس سوال کا جواب ارشاد کیا کہ تم ان لوگوں سے یہ بات کہہ دو کہ میں اپنی ہی جان کے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، پھر دوسرے کا کیا ذکر۔

رسول کا جواب:

میں نہیں کہتا مگر وہی جو مجھ کو میرے رب نے سکھایا ہے اور جس بات کے ساتھ اللہ پاک متاثر ہے، میں اس پر قدرت نہیں رکھتا مگر یہ کہ اللہ ہی مجھ کو مطلع فرمائے۔ میں تو اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ میں نے تم کو یہ خبر پہنچا دی ہے کہ قیامت ہونے والی ہے، لیکن اللہ نے مجھ کو اس کا وقت نہیں بتایا، ہاں اتنی بات ہے کہ ہر امت کے لیے مدت مقرر ہے۔ ہر قرن (زمانے) کی ایک عمر مقدر ہے۔ جب وہ مدت اور عمر گزر جاتی ہے تو پھر ایک لمحہ کی نہ دیر ہو نہ جلدی۔ وقت موعود میں نہ کمی ہو سکے اور نہ زیادتی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۚ ﴾ [المنافقون: ١١] ”اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا، جب اس کی اَجل آ جائے۔“

اللہ کا عذاب ناگہانی آتا ہے:

پھر فرمایا کہ اللہ کا عذاب یکا یک ناگہاں آتا ہے، کبھی رات کو کبھی دن کو۔ تو پھر اس دم یہ گناہ گار کیا کریں گے، یعنی عذاب آنے پر، کہتے ہیں: ﴿ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا ﴾ [السجدة: ١٢] ”اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا۔“ نیز فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿84﴾ فَلَمْ

يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾

[المؤمن: ٨٤۔ ٨٥] ''چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا، یہی اللہ کا طریقہ ہے، جو اس کے بندوں میں گزرا اور اس (عذاب کے) موقع پر کافروں نے خسارہ اُٹھایا۔''

آخرت کا عذاب:

پھر قیامت کے دن ان کافروں سے کہا جائے گا: لو اب عذابِ دائمی چکھو، یہ کہنا ان کو ڈانٹ اور سرزنش کے طور پر ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۞ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۞ اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۞ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الطور: ١٣۔ ١٦] ''جس دن انھیں نہایت سختی سے دھکے دے دے کر جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا۔ (کہا جائے گا:) یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ کیا پھر یہ جادو ہے؟ یا تم دیکھتے ہی نہیں؟ تم اس (دوزخ) میں داخل ہو جاؤ، اب تم صبر کرو یا صبر نہ کرو تمھارے لیے برابر ہے، تمھیں بس اسی کی سزا دی جائے گی، جو تم عمل کیا کرتے تھے۔''[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ کفار کہتے تھے کہ قیامت کب ہوگی؟ ان کا نبی اکرم ﷺ اور مومنین سے یہ کہنا نبوت کا انکار اور اس سے دور بھاگنے کے لیے تھا نہ کہ آخرت کا وقت معین معلوم کرنے کے لیے کہ بعد میں الزام تراشی کر سکیں جس طرح سورت ملک میں ہے کہ وہاں تو مطالبہ وقت معین معلوم کرنے کا تھا۔ ان کہنے والوں سے مراد یا تو ساری امتیں ہیں جو رسولوں پر ایمان نہیں لائیں یا خاص اس امت کے مکذبین مراد ہیں۔ اللہ نے اس سوال کے جواب میں وہ بات فرمائی کہ جس سے شبہہ کا مادہ ختم ہو جائے اور ان کا اصرار منقطع ہو جائے کہ مجھ کو اپنی ہی جان کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں ہے، ''تا بدیگرے چہ رسد'' یعنی دوسروں کے بارے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔'' لفظ ضَر کو پہلے بیان فرمایا، کیوں کہ آیت کا انداز عاجزی کا اظہار کرنے کا سا ہے۔ اس وقتِ موعود کے اظہار سے جس کے لیے وہ جلدی کرتے ہیں اور جس کو وہ بعید خیال کرتے ہیں۔ استثناء اس جگہ منقطع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ متصل۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٤٨۔ ٥٤٩)

نفع ونقصان کا مالک رسول بھی نہیں:

اس آیتِ شریفہ میں اس شخص کے لیے بڑی نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ ہے، جس کی عادت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو پکارتا اور آپ ﷺ سے مصیبتوں کے نزول کے وقت داد رسی چاہتا ہے، حالانکہ ان آفات کو دور کرنے کی سوائے قادرِ مطلق اور قدیر وحدہ لاشریک لہ کے کسی کو کوئی قدرت نہیں ہے۔ فریاد رسی اور سوال کو پورا کرنے کا مقام رب العالمین کا ہے نہ کہ انبیا مقربین اور اولیا صالحین کا، بلکہ انبیا اور اولیا اس کی ایک عاجز مخلوق ہیں۔ ساری خلق کا خالق اکیلا نرالا اللہ ہی ہے، وہی رزق دے وہی مارے یا زندہ رکھے، پھر کسی پیغمبر یا فرشتے یا نیک بخت سے کچھ مانگنا اس کو پکارنا چہ معنی دارد؟! وہ تو بالکل عاجز غیر قادر ہے۔ رب الارباب کو چھوڑ کر جو کہ ہر شے پر قادر ہے اور سب کا خالق رازق، عطا کرنے والا اور روکنے والا ہے، مخلوق سے طلب کرنا انتہا درجے کی بے عقلی اور بے دینی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟! اس جگہ تجھ کو اتنی ہی نصیحت کافی ہے کہ اللہ نے سیدِ ولد آدم و خاتم رُسل ﷺ کو حکماً یہ ارشاد کیا کہ تم میرے بندوں سے صاف کھول کر کہہ دو کہ مجھ کو اپنے نفس کے نفع ونقصان کا کچھ اختیار نہیں ہے، پھر میں کسی غیر کے سود و زیاں کا کیوں کر مالک ہوسکتا ہوں اور جب کہ نبی اکرم ﷺ غیر کے مالک نہ ہوئے تو پھر غیر کسی کے نفع و نقصان کا مالک کس طرح ہوسکتا ہے؟! جو کہ رتبہ اور مرتبے میں نبی اکرم ﷺ کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ اپنی ہی جان کا مالک نہیں ہے، چہ جائیکہ دوسروں کے نفع ونقصان کا کوئی اختیار رکھے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

قبر پرستوں کی مذمت:

اس جگہ اس قوم پر تعجب آتا ہے جو قبروں پر مجاور ہیں، حالانکہ وہ قبروں والے خاک اور مٹی ہو کر زمین کے نیچے چلے گئے ہیں۔ ان سے حاجتوں کا طلب کرنا جس پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں ہے، کیسا عجیب ہے۔ جس شرکِ اکبر میں یہ گرفتار ہیں، ان کو اس کی کچھ ہوش نہیں آتی اور نہ ہی انھیں لا الٰہ الا اللہ کے معنی کی مخالفت کی کچھ خبر ہوتی ہے اور نہ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کے مقصد ہی کو کچھ سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تعجب کی یہ بات ہے کہ اہلِ علم کو مخلوق کے ان حالات کا علم ہے، اس کے باوجود وہ ایسے لوگوں اور ان کی جاہلانہ روش کے درمیان حائل نہیں ہوتے، بلکہ یہ کام تو اہلِ جاہلیت سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ خالق و رازق اور زندہ کرنے والا اور مارنے والا، نقصان دینے والا اور نفع دینے والا اللہ پاک ہے۔ آستانوں اور بتوں کو تو وہ فقط اللہ کے پاس سفارش کرنے والے اور قریب کرنے والے اعتقاد کرتے تھے، اس کے برعکس یہ لوگ ان مردوں کو نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر جانتے ہیں اور کبھی انھیں استقلالاً اور کبھی اللہ جل جلالہ کے ساتھ پکارتے ہیں۔ شیطان نے اس ذریعے سے اپنا دل خوب ٹھنڈا کیا ہے اور اس امتِ اسلامیہ میں سے ایک جمِ غفیر کو کافر و مشرک کر ڈالا: ﴿ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴾ [الکھف: ۱۰٤] ''جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یقیناً وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔'' فإِنَّا لِلّٰهِ.[1]

---

[1] فتح البیان (٦/ ٧٣۔ ٧٥)

ہندوستان کی حالتِ زار اور علما کی پہلو تہی پر اظہارِ تأسف:

ہم ایسے زمانے میں اس کفرستانِ ہند میں آئے ہیں کہ دنیا مذہبِ دہر (لا دینیت) سے مشحون (معمور) ہو رہی ہے اور اگلے مسلمانوں کی اولاد روز بروز دہریت کے طور طریقے پسند کر کے اسلام کا ربقہ (پٹہ) اپنے گلے سے اتارتی چلی جاتی ہے اور کفر کو ایمان اور شرک کو توحید رحمان سمجھتی ہے۔ ہر نیکی کا کام بدی ہو گیا ہے اور اہلِ معروف کو احمق اور ذلیل سمجھا جانے لگا ہے اور ہر برائی کا کام نیکی بن گیا ہے اور ہر منکر والا عقل مند اور معزز خیال کیا جاتا ہے۔ منکر کو ہاتھ سے مٹانا اسلام کے سلاطین کا کام تھا وہ اب عنقا و کیمیا ہوگیا ہے۔ زبان سے منع کرنا اہلِ علم کا کام تھا سو علم اٹھ گیا اور نام کے علما، دنیا طلب ہو گئے، وہ خود گمراہی میں پڑے ہیں، دوسرے کو کیا ہدایت کریں گے مگر شاذ اور نادر۔

اور بعض افراد جنھوں نے ردِ شرک اور اثباتِ توحید میں رسائل لکھ کر ایمان کو تقویت پہنچائی ہے اور لوگوں کو خالص دین پہنچایا ہے، انھوں نے اس بارے میں قریباً دس رسائل تالیف کیے ہیں۔ منکر کا دل سے برا جاننا عوام اہلِ اسلام کا کام ہے، سو جب اہلِ علم کا یہ حال ہے تو عام سے کیا بہتری کی امید ہوسکتی ہے کہ وہ تو ہر ناہق (گدھے) کی نہیق (ڈھیچوں ڈھیچوں) اور ہر ناعق (پکارنے والے) کی نعیق (پکار) کے تابع ہو جاتے ہیں، اس وقت کے عوام غالباً طریقۂ جاہلیت پر ثابت قدم ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کامل سمجھتے ہیں، حالانکہ ہم جب سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے رجوع کرتے ہیں تو یہ بات چودھویں رات کے چاند کی طرح ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے اسلاف کے زمانے میں اسلام پر جس طرح ایک عام آدمی عمل کرتا تھا، اب وہ کام اس وقت کے بڑے بڑے علما سے بھی ظہور میں نہیں آتے۔ بدعقیدگی اور شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کے علاوہ اکثر نام کے فضلا و علما فسق و فجور میں مبتلا ہیں اور جس قدر قیامت کی آمد کا زمانہ دراز ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اسلام کے نام اور ایمان اور اسلام کے کاموں میں تغیر و تبدل بڑھتا جاتا ہے۔

ہماری ولادت ۱۲۵۰ھ میں ہوئی ہے، اب ۱۳۰۶ھ ہے، اس تھوڑی سی مدت میں جو تغیرِ کثیر ہم نے خود دیکھا ہے اس کو تحریر کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ آیندہ معلوم نہیں جاہلیت کا یہ اندھیرا کس درجے تک ترقی پکڑے، کیوں کہ اب اہلِ اسلام میں تجربہ اور امتحان کے وقت طریقۂ اسلام پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد کے عشرِ عشیر کے مطابق بھی عمل ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ دنیا جہالت کے اندھیرے سے بھر گئی ہے اور تمام عالم میں فسق و فجور کا رواج ہو گیا ہے اور ہر فردِ بشر نے ایمان کے مراتب اور اسلام پر عمل کرنے سے قطع نظر کر لی ہے، سب کی کوشش اب سیم و زر کو حاصل کرنے، اپنے گھروں کی آرایش اور اپنی سواریوں کو خوب صورت بنانے اور شادی بیاہ پر صرف ہو رہی ہے۔ پھر ہزاروں میں اگر کوئی صحیح عقیدہ و عمل کا حامل مسلمان افلاس زدہ کسی جگہ پر نظر آ جاتا ہے تو اس کو شکار سمجھ کر اس پر ہر طرف سے اعتراضات اور انکار کی بھرمار ہوتی ہے۔

پیر زادگی کا پیشہ جو اللہ کے بعض بندوں کی کوششوں سے ساٹھ ستر برس سے مضمحل ہو گیا تھا اب اس چودھویں

صدی سے اس نے پھر گرم بازاری پکڑی ہے۔ جاہل مسلمان مرید ہو کر اپنے آپ کو نجات پانے والا سمجھتے ہیں، نہ انھیں علم سے کچھ کام ہے نہ عمل سے سروکار اور نہ توحید سے کچھ مطلب اور نہ شرک و بدعت سے کچھ نفرت۔ انھوں نے مرید ہو جانے کو مغفرت کی ایک دستاویز سمجھ لیا ہے۔ پیر صاحب اپنے مریدوں کو ہاتھ پکڑ کے سیدھے جنت میں لے جائیں گے اور ہرگز جہنم کی صورت نہ دیکھنے دیں گے۔ بالجملہ اب دین کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ فَإِنَا لِلّٰهِ.

ہر اُمت کا وقت مقرر ہے:

آمدیم برسر مطلب: اللہ تعالیٰ نے اس ذکر کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ ہر امت کے لیے ایک خاص مدت اور وقت مقرر ہے کہ اس وقت پر اللہ جو کچھ چاہتا ہے وہ ان کے سروں پر نازل ہوتا ہے۔ لفظ اجل کا اطلاق عمر کی مدت یا اس کے آخری حصے پر ہوتا ہے، اس جگہ یہی آخری اطلاق مراد ہے جس طرح تفاسیر سے ثابت ہوتا ہے۔ سو جب وہ اجل آ جاتی ہے جو اللہ کے علم میں مقرر ہو چکی ہے تو پھر ایک گھڑی کی دیر اور جلدی نہیں ہوتی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَـْٔخِرُوْنَ ﴾ [الحجر: ٥، المؤمنون: ٤٣] ''کوئی امت اپنے (مقرر) وقت سے نہ آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔'' پھر کسی کی مدت اللہ کے علم میں زیادہ ہے اور کسی کی کم۔ پہلی امتوں کی تاریخ دیکھنے سے اکثر امتوں کی مدت کی مقدار معلوم ہوتی ہے۔

کافروں کا عذاب جلدی مانگنا اور جواب:

اللہ تعالیٰ نے کافروں کی رائے کا کہ عذاب میں جلدی کی جائے ذکر کر کے فرمایا: بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اس کا عذاب راتوں رات یا دن میں آ جائے جب کہ تم غافل پڑے سوتے ہو یا طلبِ معاش اور دوسرے کاموں میں مشغول ہو تو پھر گناہ گار کس بات کی جلدی کریں گے؟! عذاب ایک مکروہ چیز ہے جس سے دل نفرت کرتے ہیں، اس کا جلد طلب کرنا کس غرض سے ہے؟! پھر، مثلاً: جب عذاب آ گیا اور تم ایمان لائے تو اب عذاب کے نزول کے بعد ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔ اب تم ایمان لائے اور یقین کیا، حالانکہ پہلے تم عذاب کے آنے کی جلدی کرتے تھے اور تمھارا یہ جلد عذاب طلب کرنا تکذیب اور استہزا کی نیت سے تھا۔

بالجملہ قیامت کے دن ان لوگوں سے یہ بات کہی جائے گی کہ لو اب ایسے عذاب کا مزہ چکھو جو ہمیشہ رہنے والا اور کبھی نہ منقطع ہونے والا ہے۔ یہ بات کہنے والے جہنم کے داروغے ہوں گے یا خاص طور پر انبیا علیہم السلام ہوں گے یا علی العموم مومنین ہوں گے۔ یہ جزا آخر تمھارے اس کسب کی ہے جو تم نے دنیا میں کمایا تھا، یعنی کفر اور معاصی اور برے اعمال۔ گویا یہ بات ان سے اس وقت کہی جائے گی جب کہ وہ اس بات کی استدعا کریں گے کہ ان کی سزا اور عذاب ختم کیے جائیں۔ فقط

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔؕ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

اور (اے نبی!) وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کیا وہ (عذاب) واقعی سچ ہے؟ (آپ) کہہ دیجیے: ہاں! میرے رب کی قسم! وہ سچ ہے اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے (53) اور اگر بلاشبہہ ہو ہر ظالم شخص کے پاس جو کچھ زمین میں ہے تو وہ اسے (عذاب سے بچنے کے لیے) ضرور فدیہ دے دے گا اور مجرم جب عذاب دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے (54)

قیامت حق ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ آپ سے معاد اور قیامت کے ہونے کی خبر پوچھتے ہیں اور اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ کیا مٹی ہو جانے کے بعد پھر مردے قبر سے زندہ ہو کر باہر نکلیں گے، سو آپ کہہ دیں کہ ہاں یہ بات سچ مچ ہوگی۔ تمھارا خاک ہو جانا کچھ اللہ کو تمھارے دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز نہیں کر سکتا۔ اس نے کس طرح عدم سے تم کو وجود بخشا تھا اسی طرح پھر تم کو موت اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ لوٹائے گا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [یٰسٓ: ۸۲] ”جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔“

اس آیت کی نظیر قرآن پاک میں صرف دو اور آیتیں ہیں، پس بس۔ اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ تم قیامت کے منکرین پر قسم کھاؤ کہ معاد (آخرت) حق ہے۔ سورت سبا میں ارشاد کیا ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ ﴾ [سبا: ۳] ”اور کافروں نے کہا: ہم پر قیامت نہیں آئے گی، کہہ دیجیے: کیوں نہیں! میرے عالم الغیب رب کی قسم! بلاشبہہ وہ تم پر ضرور آئے گی۔“ نیز سورۃ التغابن میں فرمایا ہے: ﴿ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ [التغابن: ۷] ”کافروں نے دعویٰ کیا کہ وہ (قبروں سے) ہرگز نہیں اُٹھائے جائیں گے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تمھیں ضرور اٹھایا جائے گا، پھر تمھیں ضرور بتایا جائے گا جو تم نے عمل کیے اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔“ پھر یہ خبر دی کہ جس دن قیامت ہوگی اس دن کافر یہ چاہے گا کہ کاش زمین بھر خالص سونا دے کر اس عذاب سے چھوٹ جائے اور عذاب کو دیکھ کر دل میں سخت پشیمان ہوگا۔ اس دم اللہ انصاف کا حکم دے گا اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تجھ سے معاد کی خبر استہزا اور انکار کرنے کے لیے دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ عذاب جلد ہی آئے گا یا ایک مدت کے بعد آئے گا جس کا تم وعدہ کرتے ہو؟ حالانکہ ان کا یہ سوال محض جہالت اور ظلمات بالائے ظلمات ہے۔ اس سوال کا جواب گزر چکا ہے۔ پھر بار بار وہی سوال کرنا حماقت کی دلیل ہے کہ نہ اسے اپنے سوال کی سمجھ ہے اور نہ ہی دوسرے کے جواب کی بوجھ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس خبر کے دریافت کرنے سے مراد قرآن شریف کی حقیقت معلوم کرنا ہے کہ کیا سچ مچ یہ سچا کلام ہے اور اس میں جو عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ٹھیک وعدے کے مطابق ہے۔

عذاب، بے بسی اور ندامت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ یہ سچ ہے، اللہ کی قسم ہے کہ اس کے حق ہونے میں کچھ فرق نہیں ہے اور تم چاہو کہ بھاگ کر عذاب سے بچ جاؤ تو خیریت ہے، تمھارا یہ حیلہ اور بہانہ کچھ نہ چلے گا اور یہ مقابلہ ہرگز اللہ کی قضا کو دور نہ کر سکے گا۔ بلکہ وہ عذاب بہرحال ہر اس نفس کو پکڑے گا جس نے ظلم کیا، یعنی کافر ہوا اور ایمان نہ لایا۔ اگر بالفرض اس کے پاس دنیا کی ساری دولت ہوتی اور اس کے پاس اموالِ نفیسہ اور ذخائرِ فائقہ ہوتے اور عذاب کے عوض میں دینا چاہتا تب بھی وہ اس کے لیے کچھ فائدہ مند نہ ہوسکتا۔ اور اس کے مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ﴾ [آل عمران: ۹۱] ’’بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور حالتِ کفر میں مرے ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ فدیے میں دینا چاہے۔‘‘

اسرارِ ندامت (پشیمانی چھپانے) سے یہ مراد ہے کہ جو ندامت اس وقت ترکِ ایمان پر لاحق ہوگی اس کا اظہار نہ کریں گے، بلکہ اس کو مخفی رکھیں گے، کیوں کہ اس جگہ پر وہ وہ آفات موجود ہوں گی جن سے عقل جاتی رہے گی اور بہادری خاک میں مل جائے گی اور ممکن ہے کہ اس حال میں کوئی رگِ حمیت جو دنیا میں تھی باقی رہ جائے، لیکن اس کو یہ سب بوجہ مومنین کی دشمنی کے مخفی رکھیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ سردار لوگ اس ندامت کو اپنے متبعین پر ظاہر نہ کریں گے، اس ڈر سے کہ کہیں وہ ان کو ڈانٹنے نہ لگ جائیں، کیوں کہ انھوں نے ہی ان پیروکاروں کو گمراہ کیا تھا اور ان کے اور اسلام کے درمیان حائل ہو گئے تھے۔ یا اسرار (چھپانے) سے اس جگہ اظہار مراد ہے، اس لیے کہ یہ لفظ من جملہ اضداد کے ہے، لیکن پہلے معنی لغت میں زیادہ مشہور ہیں اور آیت میں دو معنوں کا احتمال ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اپنے دل میں حسرت کی تکلیف پائیں گے، اس لیے کہ ندامت کا اظہار کیے بغیر رہ نہ سکیں گے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی شکلوں پر ندامت

کے آثار ظاہر ہوں گے۔①

بالجملہ اس حالت کا وقوع ان سے عذاب کو دیکھنے کے وقت ہوگا اور جب دوزخ میں جا چکیں گے تو یوں کہیں گے: ﴿ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا ﴾ [المؤمنون: ١٠٦] ''اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آ گئی۔'' اس وقت اللہ تعالیٰ مومنین اور کافرین کے درمیان یا ان سرداروں اور ان کے متبعین کے درمیان یا ظالم کافروں اور مظلوم مومنوں کے درمیان اپنا آخری حکم صادر فرمائے گا جو بالکل انصاف پر مبنی ہوگا، اس جگہ قضا کے معنی یہ ہیں کہ ان پر سزا نازل کرے گا اور اس عذاب کی وجہ سے وہ کچھ مظلوم نہ ہوں گے، کیوں کہ جیسا کیا تھا ویسا پایا، اس میں کوئی ظلم اور ناانصافی نہیں ہے، بلکہ عین عدل و انصاف ہے۔②

أَلَآ إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَآ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيِ وَيُمِيْتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾

آگاہ رہو! بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، آگاہ رہو! بلاشبہہ اللہ کا وعدہ حق ہے، لیکن ان کے اکثر (لوگ) نہیں جانتے (55) وہی زندہ کرتا اور (وہی) مارتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (56)

ہر چیز کا مالک خالق اللہ ہے اور اس کا وعدہ سچا ہے:

اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ میں آسمان اور زمین کا مالک ہوں اور قیامت وغیرہ کے بارے میں میرا وعدہ سچ ہے۔ زندہ کرنا اور مارنا میرا ہی کام ہے اور مجھے ہی یہ قدرت حاصل ہے، کیوں کہ مجھے مختلف جسموں کا جو ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے ہوں اور وہ زمین کے اطراف میں ہوں یا سمندروں میں ہوں یا بیابانوں میں، ان سب کا مجھے علم حاصل ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس تقریر کا انداز زمین اور آسمان کی بادشاہت کا اثبات ہے کہ اس میں صرف اللہ ہی کا تصرف ہے وہ جس طرح چاہے کرے۔ سو جب سب کچھ اللہ پاک ہی کی ملکیت ٹھہرا تو اب کافر کس طرح فدیہ دے سکتے ہیں۔ ان کے پاس ہے کیا کہ وہ فرضاً دے دلا کر اپنی جان عذاب سے چھڑا لیں اور اللہ پاک نے کفار کے ساتھ جو عذاب کا وعدہ کیا ہے وہ حق ہے مگر بات یہ ہے کہ اکثر لوگ جو کافر و مشرک ہیں، اپنی بہتری اور فلاح کو نہیں جانتے پہچانتے کہ اس کے مطابق کام کریں، یہ ان کی عقل کا قصور اور استیلا اور ان کی غفلت کا فتور ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ

① تفسیر القرطبي (٨/ ٣٥٢) ② فتح البیان (٦/ ٧٨۔ ٨٠)

حیات عطا کرنے والا اور چھیننے والا اللہ ہے اور ہم کو دارِ آخرت میں اسی کی طرف جانا ہے، وہ ہر شخص کو اس کے استحقاق کے مطابق سزا اور جزا دے گا یا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے گا اپنا فضل و کرم کرے گا۔[1]

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸

اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت اور شفا، ان (بیماریوں) کے لیے جو سینوں میں ہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ گئی ہے (57) (اے نبی!) کہہ دیجیے: (یہ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے (نازل ہوا) ہے، لہٰذا (لوگوں کو) چاہیے کہ وہ اسی کے ساتھ خوش ہوں، یہ ان چیزوں سے بہت بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں (58)

قرآن نصیحت، شفا، ہدایت اور رحمت ہے:

یعنی یہ نصیحت فواحش سے ڈراتی دھمکاتی ہے اور دل کے شکوک و شبہات سے شفا بخشتی ہے، شفا سے مراد ناپاکی اور گندگی سے نجات ملنا ہے اور اس سے ہدایت اور اللہ کی رحمت ہاتھ آتی ہے۔ سو یہ فائدے ہیں مومنین کے لیے جو تصدیق کرنے والے اور یقین رکھنے والے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ”اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ ﴾ [حمٓ السجدة: ٤٤] ”کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے۔“

یہ ہدایت اور دینِ حق جو اللہ کی طرف سے آیا ہے اسی پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ مال و اسباب جمع کرنے پر کہ دنیا کی مختلف چیزیں اور فنا ہونے والے پھول، خوشی اور فرحت کے لائق نہیں ہیں، کہاں وہ آخرت کی نعمت اور راحت اور کہاں یہ دنیا کی قسمت و جراحت۔ ایفع بن عبد الکلاعی کہتے ہیں کہ جب عراق کا خراج عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو عمر رضی اللہ عنہ ایک غلام کے ساتھ باہر آئے اور اونٹ گننے لگے وہ گنتی سے زیادہ تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَعَالٰى، قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ“ ان کے غلام نے کہا: ”هٰذَا وَاللّٰهِ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهٖ“ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو جھوٹا ہے، اللہ نے تو یوں کہا ہے: ﴿ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴾[2] (ذكره ابن أبي حاتم والطبراني)

---

[1] فتح البيان (٦/ ٨١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٦٠) مسند الشاميين (٢/ ١٢٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں مذکور ہے کہ ﴿ اَیُّھَا النَّاسُ ﴾ سے مراد اس جگہ قریش ہیں بعض نے کہا ہے کہ عموماً سب لوگ ہی مخاطب ہیں، اسی کو امام طبری رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1] اس میں استمالت کی طرف التفات و رجوع ہے، نیز ضلالت کے انجام سے خبردار کیا ہے اور دلائلِ توحید کے بعد رسالت کے دلائل کا آغاز کیا ہے۔ موعظت سے مراد قرآن کریم ہے جو قرآن کو پڑھتا ہے اور اس کے معنی پہچانتا ہے، وہ اس سے نصیحت پکڑتا ہے، یہ اصل وعظ کی یاد دلاتا ہے، عواقبِ امور کے متعلق وعظ و نصیحت ایک طبیب کے مثل ہوتا ہے جو مریض کو نقصان کی چیز سے منع کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وعظ وہ زجر ہے جس کے ساتھ تخویف بھی موجود ہو۔ خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وعظ خیر کے ساتھ وہ تذکرہ ہے جو دل میں رقّت پیدا کرے،[2] چونکہ یہ موعظت اللہ کی طرف سے آئی ہے، اس لیے اہلِ شک کے صدور و قلوب میں جو شکوک و شبہات کے کانٹے ہوتے ہیں، وہ اس قرآن کریم سے دور ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اس میں عقائدِ حقہ کا بیان اور عقائدِ باطلہ کی تردید ہے۔

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں اپنے سینے میں تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ فرمایا: قرآن پڑھو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾[3] (رواه ابن المنذر وابن مردويه) سیدنا واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک مرد نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گلے میں درد کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن پڑھو۔[4] (رواه البيهقي في شعب الإيمان) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قرآن میں دو شفا ہیں: ایک قرآن اور دوسری شہد۔ قرآن سینے کی بیماریوں کی شفا ہے اور شہد بھی ہر بیماری کی دوا ہے۔[5]

سینے کی تخصیص اس لیے ہے کہ دل سینے کے اندر ہوتا ہے اور سینہ اُس کا غلاف ہے۔ سارے بدن میں یہی جگہ عزیز تر ہوتی ہے، اس لیے کہ سینہ، قلب کا مکان ہے اور جہالت کی بیماری بدن کے بجائے دل کے لیے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ قرآن جملہ امراضِ قلب کو ختم کر دیتا ہے، لہٰذا فرمایا کہ یہ قرآن مومنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے، کیوں کہ ان کو دامِ ضلالت سے نجات دے کر ساحلِ مراد پر لا کھڑا کرتا ہے۔

ہدیٰ پر رحمت کا عطف تغایرِ صفات کے سبب ہے۔ ہدیٰ کا مطلب ایسے شخص کی جنت کے راہ کی طرف راہنمائی کرنا ہے جو قرآن کا تابع ہے اور قرآن میں تفکر اور اس کے معانی میں تدبر کرتا ہے، جب کہ رحمت وہ امور ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں پر رحم کرتا ہے اور جس کو ان میں سے چاہتا ہے، اُس رحمت تک پہنچا دیتا ہے، لہٰذا قرآن کریم ان سب امور پر مشتمل اور ان تمام اشیا کو شامل ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٠٤) [2] تفسير القرطبي (١/ ٤٤٤) [3] الدر المنثور (٤/ ٣٦٦)
[4] شعب الإيمان (٢/ ٥١٩) [5] تفسير ابن أبي حاتم (١٥/ ١٩٥٧)

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلاصہ یہ ہے کہ موعظت مخلوق کی ظاہری پراگندگیوں سے تطہیر کا نام ہے، جو شریعت سے عبارت ہے اور شفا عقائدِ فاسدہ اور اخلاقِ ذمیمہ سے باطن کو پاک کرنے کا نام ہے اور اس کو طریقت کہتے ہیں۔ ہدیٰ نورِ حق کے ظہور کی طرف اشارہ ہے اور صدیقین کے ہاں اس کا نام حقیقت ہے، جب کہ رحمت بلوغِ کمال اور اشراقِ تام کی طرف اشارہ ہے، یہاں تک کہ مکمل یقین حاصل ہو جائے، اس کو نبوت کہتے ہیں، لہٰذا یہ درجاتِ عقلیہ اور مراتبِ برہانیہ قرآنی الفاظ کے مدلول ہیں۔

اللہ کے فضل و رحمت پر خوش ہونے کا حکم:

پھر اللہ نے اپنے نبی کو خطاب کیا اور کہا کہ کہہ دے اللہ کا فضل و رحمت لائقِ فرحت ہے۔ اللہ کے فضل سے مراد آجل (آخرت) و عاجل (دنیا) میں بندوں پر تفضّلِ الٰہی ہے، جس کا حصر نہیں ہوسکتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کا فضل قرآن ہے اور اس کی رحمت اسلام۔ امام حسن، ضحاک، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا فضل ایمان ہے اور اس کی رحمت قرآن۔[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ”فَضْلُ اللّٰهِ الْقُرْآنُ، وَرَحْمَتُهٗ أَنْ جَعَلَكُمْ مِنْ أَهْلِهٖ“[2] (رواه أبو الشيخ وابن مردويه) تابعین کی ایک جماعت سے بھی اسی طرح کی روایات مروی ہیں۔ اولیٰ یہ ہے کہ فضل و رحمت کو عموم پر محمول کیا جائے، اس میں قرآن بھی بدرجۂ اولیٰ داخل ہے اور تکرار موحدہ کی دلیل ہے، اس پر کہ ہر ایک ان میں سے فرح (خوشی) کا ایک مستقل سبب ہے۔

سو یوں چاہیے کہ اسی فضل و رحمت کو فرح کے ساتھ خاص کریں۔ فرح ایک لذت ہے جو دل میں ایک سبب اور مطلوب کے ساتھ آتی ہے، اللہ نے بہت جگہ قرآن میں فرح کی مذمت کی ہے، لیکن وہاں اس کا مطلب اللہ کی نافرمانی پر اترانا ہے۔ جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ﴾ [القصص: ٧٦] ”تو اِترا مت، بے شک اللہ اِترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ جب کہ اس آیت میں فرح کو جائز کہا ہے: ﴿فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [آل عمران: ١٧٠] ”جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا اس پر وہ خوش ہیں۔“ یہاں فرح کا مطلب اللہ کے فضل پر خوش ہونا ہے۔ یا جس طرح اس آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ کے فضل و کرم کو جمع کرنا دنیا کے حقیر سامان اور لذاتِ فانیہ سے کہیں برتر ہے۔[3]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٣٥٣) [2] الدر المنثور (٤/ ٣٦٧) [3] فتح البيان (٦/ ٨٢۔ ٨٤)

فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

کہہ دیجیے: بھلا دیکھوتو، اللہ نے تمھارے لیے جو رزق نازل کیا، پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال ٹھہرا لیا۔ کہہ دیجیے: کیا اللہ نے تمھیں (یہ) حکم دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو؟ 59 اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، روزِ قیامت کے بارے میں؟ بے شک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے، لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے 60

حلال وحرام کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد، ضحاک، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ یہ آیت بطور انکار کے مشرکین پر اتری ہے، وہ جو چاہتے حلال کر لیتے اور بحائر وسوائب و وصائل کو حرام ٹھہراتے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا ﴾ [الأنعام: ١٣٦] ''اور انھوں نے اس میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ ٹھہرایا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا۔''[1]

سیدنا مالک بن نضلہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں میلی کچیلی شکل والا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تیرے پاس مال موجود ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: کس قسم کا مال ہے؟ میں نے کہا: ہر طرح کا مال ہے، اونٹ، غلام، گھوڑے اور بکریاں بھی موجود ہیں۔ فرمایا: جب اللہ نے تجھ کو اتنا مال دیا ہے تو چاہیے کہ اللہ اس کے اثر کو بھی تجھ پر دیکھے۔ پھر فرمایا: تیرے اونٹ ایسے بچے دیتے ہیں جن کے کان درست ہوتے ہیں، پھر تو ایک استرا لے کر ان کو کاٹ ڈالتا ہے اور کہتا ہے یہ بحیرہ ہے اور کسی کی کھال پھاڑ ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صُرم ہے، پھر تو اسے اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں کے اوپر حرام کر لیتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، فرمایا: جو چیز اللہ نے تجھ کو دی ہے وہ تجھ کو حلال ہے اور اللہ کا بازو تیرے بازو سے زیادہ سخت ہے اور اس کا استرہ تیرے استرے سے زیادہ تیز ہے۔ الحدیث (رواہ أحمد)[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث جید وقوی الاسناد ہے اور اللہ نے اس شخص کی مذمت کی ہے جو صرف اپنی رائے اور خواہش سے جس کی کوئی سند نہ ہو اور نہ اُس پر کوئی دلیل ہو، اللہ کے حلال کو حرام اور اس کے حرام کو حلال کرے۔ پھر اُس پر قیامت کے دن وعید فرمائی کہ ان لوگوں کو جو ایسا کام کرتے ہیں کیا گمان ہے کہ جس دن وہ ہمارے پاس پھر کر آئیں گے، تو ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، اللہ کا لوگوں پر بڑا فضل ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ

---

1. تفسير الطبري (١٥/ ١١١۔ ١١٣)
2. مسند أحمد (٣/ ٤٧٣) مستدرك الحاكم (١/ ٧٦) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

نے کہا، یعنی دنیا کے اندر ان کو سزا دینا ترک کر دیتا ہے۔[1]

میں کہتا ہوں کہ اس بات کا احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر صاحبِ فضل ہے، دنیا میں جو منافع پیدا کیے ہیں وہ ان کے لیے حلال اور مباح کر دیے اور ان پر کوئی چیز حرام نہیں کی سوائے اس کے جو دنیا یا دین میں ان کے لیے نقصان دہ ہے، لیکن اکثر لوگ اللہ کے اس فضل و کرم کا شکر بجا نہیں لاتے، بلکہ جو چیز اللہ نے ان پر انعام کی ہے اس کو حرام ٹھہراتے ہیں اور اپنی جان پر تنگی کرتے ہیں، کسی چیز کو حلال ٹھہرا لیتے ہیں اور کسی چیز کو حرام۔ مشرکوں نے جو شریعت اپنے لیے مقرر کی ہے اس میں یہ بات بہت ہے۔[2]

آج کے مسلمان کی حالت:

اس حرکت بے برکت کا رواج اب اہلِ اسلام کے مشرکین اور مبتدعین میں بھی بہت ہو گیا ہے۔ قبروں میں دفن مردوں کے نام کی نذریں مانتے ہیں جو مختلف قسم کی اجناس اور طرح طرح کے کھانوں کی ہوتی ہیں۔ پھر اس نذر کی چیز کو کسی پر حلال اور کسی پر حرام ٹھہراتے ہیں۔ کہتے ہیں اس کو مرد کھائے عورت نہ کھائے یا اس کے برعکس۔ ان کی یہ حالت برائی اور جہالت میں پہلے مشرکین اور مبتدعین کی برائی اور جہالت سے بھی بڑھ گئی ہے، کیوں کہ اس کی بنیاد شرک پر ہے۔ پھر اس شرک میں یہ تفریق شروع ہو گئی کہ انھوں نے نفس کی گمراہی میں اہلِ جاہلیت کے بھی کان کتر دیے اور شیطنت میں شیطان کے بھی پیر اور مرشد بن گئے۔

وَكُنْتُ امْرَءً مِّنْ جُنْدِ إِبْلِيْسِ فَارْتَقٰى
بِيَ الْحَالُ حَتّٰى صَارَ إِبْلِيْسُ مِنْ جُنْدِيْ

''ایک وقت تھا میں شیطان کا ایک چیلا تھا، اب اتنی ترقی کر لی ہے کہ شیطان میرا چیلا بن چکا ہے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ﴾ کی تفسیر اور اہلِ جنت کی اقسام:

موسیٰ بن صباح نے ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ عزوجل کے اہلِ ولایت کو لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کی تین قسمیں کی جائیں گی، پھر ایک شخص کو پہلی قسم میں سے لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے میرے بندے! تو نے یہ کام کس لیے کیا؟ وہ کہے گا: اے رب! تو نے جنت بنائی، اس کے درخت اور پھل اور نہریں اور حوریں اور نعمتیں پیدا کیں اور اپنے اطاعت گزار بندوں کے لیے ان چیزوں کو تیار کیا۔ میں رات کو جاگتا تھا اور دن کو پیاسا رہتا تھا، صرف جنت کے شوق میں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے عمل جنت کے لیے کیا، یہ جنت ہے تو اس میں داخل ہو جا۔ یہ میرا فضل ہے کہ میں نے تجھ کو آگ سے آزاد کر دیا اور

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١١٣) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٥٠)

میں تجھ کو جنت میں داخل کرتا ہوں۔ پھر وہ شخص اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جنت میں جائے گا۔

پھر دوسری قسم میں سے ایک آدمی لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ کہے گا: تو نے کس لیے عمل کیا؟ وہ کہے گا: اے رب! تو نے دوزخ پیدا کی اور اس میں اغلال وسعیر وسموم ویحموم رکھے (جہنم کی قسمیں) اور اپنے دشمنوں کے لیے تو نے اس کو تیار کیا اور اہلِ معصیت کے لیے اس کو پیدا کیا، میں رات بھر جاگا اور دن بھر پیاسا رہا، دوزخ کے ڈر سے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے میرے بندے! تو نے یہ کام میری آگ سے ڈر کر کیا، میں نے تجھ کو آگ سے آزاد کر دیا اور میرا فضل ہے تجھ پر کہ اب میں تجھ کو جنت میں بھیجتا ہوں۔ پھر وہ شخص اور اس کے ساتھی سب جنت میں جائیں گے۔

پھر تیسری قسم کے ایک شخص کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا: تو نے عمل کس لیے کیا؟ وہ کہے گا: اے رب! تیری محبت اور تیرے شوق میں، تیری عزت کی قسم! کہ میں راتوں کو جاگا اور دن کو پیاسا رہا "شَوْقاً إِلَيْكَ وَحُبًّا إِلَيْكَ" اللہ تعالیٰ کہے گا: اے میرے بندے! تو نے عمل کیا میری حب اور شوق میں، پھر اللہ تعالیٰ ۔جل جلالہ۔ اس کے لیے تجلی کرے گا اور فرمائے گا: "هَا أَنَا ذَا فَانْظُرْ إِلَيَّ" "لے میں موجود ہوں مجھے دیکھ لے۔" پھر فرمائے گا کہ یہ تجھ پر میرا فضل ہے کہ میں نے تجھ کو آگ سے آزاد کیا اور اپنی جنت تیرے لیے مباح کر دی۔ میرے فرشتے تیری زیارت کو آیا کریں گے اور میں خود تجھ پر سلام کروں گا، پھر وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جنت میں جائے گا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم بسنده)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ عبادت تین غرض سے ہوتی ہے: ایک جنت کے طمع میں، دوسرے آگ کے خوف سے، تیسرے اللہ کی محبت اور شوق میں اور یہ تینوں اغراض صحیح ہیں اور کتاب وسنت سے صراحتاً ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ [الأعراف: ٥٦] "اور اللہ کو خوف سے اور طمع کرتے ہوئے پکارو۔" نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ [التوبة: ١١١] "بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔" نیز فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥] "اور ایمان والے اللہ کی محبت میں زیادہ سخت ہیں۔"

نیز فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٩١] "کہہ دیجیے: وہ اللہ نے (نازل کی تھی)، پھر انھیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے: وہ اپنی نکتہ چینیوں میں کھیلتے رہیں۔" لیکن سب سے بہتر رتبہ تیسری قسم والوں کا ٹھہرا، یہ لوگ فائزین مقربین ہیں اور دوسری دو قسمیں اصحابِ یمین رہے۔ وہ لوگ جو نہ بہشت میں گئے اور نہ دوزخ سے آزاد ہوئے سو وہ ہلاک ہونے والے ہیں اور مجانین (مجنون) اور بچوں کو اہلِ علم نے نجات پانے والے بتایا ہے۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٦١۔ ١٩٦٢)

ایک قسم اور ہے جو پہلے پہل جہنم میں جائیں گے، وہ اپنے برے اعمال اور کبائر کے ارتکاب کی وجہ سے عذاب میں گرفتار ہوں گے، مگر جہنم میں ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں اور اگر ان میں کوئی ایسا گناہ گار بھی ہوگا جس نے ایمان کے ساتھ شرک کو بھی جمع کیا تھا، عمداً یا خطا سے یا جہالت سے تو وہ شخص آگ سے نجات نہ پائے گا۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴾ [النساء: ۱۱۶] ''بے شک اللہ یہ گناہ ہرگز نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ اس کے سوا جسے چاہے معاف کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے، تو وہ یقیناً بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ہے۔''

آج کا مسلمان:

بالجملہ یہ کہ قیامت کے دن موحدین متبعین میں بڑا سعادت مند وہ شخص ہوگا جس نے اللہ کی عبادت فرض اور نفلی خاص شوق اور اللہ کی محبت میں کی ہوگی، کیوں کہ عبادت کا استحقاق اللہ عزوجل کا ہر حال میں ثابت ہے، خواہ وہ جنت اور دوزخ پیدا کرتا یا نہ کرتا اور بندے پر ہر حال میں عبد ہونا واجب ہے، خواہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت دے یا نہ دے اور جہنم میں لے جائے یا نہ لے جائے۔ جن کی نظر کی انتہا مطلوب پر ہے، ان کا مطمحِ نظر اور شوق اور محبت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لیے ہوتے ہیں، اگرچہ وہ جنت اور نار کے منکر نہیں ہیں، اسی لیے کہا ہے:

تو بندگی چو گدایانِ بشرط مزد مکن　　　　که خواجه خود روش بنده پروری داند

''تو فقیروں کی طرح اجرت و مزدوری کی شرط پر بندگی نہ کر، کیوں کہ خواجہ بذاتِ خود بندہ پروری کی روش رکھتا ہے۔''

انھیں یہ بات معلوم ہے کہ اگر ہم جنت کے طمع یا نار کے خوف سے عبادت کریں تو بے شک عبادت کے قبول ہونے پر نار سے بچ کر جنت میں جائیں گے اور اگر مطمحِ خاطر ہمارا صرف اللہ کا دیدار ہوگا تو ہماری آؤ بھگت اور بھی زیادہ ہوگی اور جنت تو بہرحال اس کے فضل و کرم اور عنایت اور رحم سے ملے گی ہی، پھر ہم اپنی ہمت کو کیوں کم کریں کہ یہ تو اس ذوالجلال والاکرام کا ایک ادنیٰ انعام ہے، لیکن اس بحث کے مخاطب اب ظاہری طور پر دنیا میں باقی نہیں ہیں، اِلَّا مَنْ عَلَّمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی. اب تو قیامت کے نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ زمانہ ہے کہ کوئی جنت کے طمع اور نار کے خوف سے بھی پروردگار کی عبادت نہیں کرتا۔

نفلی عبادت کا جس میں رات کو جاگے دن کو پیاسا رہے کیا ذکر ہے۔ عبادت فرض بھی ادا نہیں ہوتی اور اگر ظاہری نماز، روزہ، حج اور زکات ادا ہوتا ہے جو فقہا کے نزدیک امتثالِ امر میں کافی سمجھا جائے اور اہلِ احسان اور عرفان کے نزدیک ایسا عمل محض ناکارہ ٹھہرتا ہے، کیوں کہ اس میں حضورِ قلب نہیں ہوتا اور وسوسوں کی کثرت ہوتی ہے۔ اس میں بھی ہزار خرابیاں لگی رہتی ہیں اور کوئی عمل بھی شرعی طریقے سے کما حقہ ادا نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ جنت کا طمع لگا رہتا ہے، یہ عجیب انصاف ہے۔ ہم کسی اور کو نہیں کہتے، خود ہمارا بھی یہی حال ہے، مگر یہ کہ

اللہ تعالیٰ کلمۂ توحید اور شہادتِ اخلاص کی برکت سے اُس دن اپنے فضلِ عمیم اور بہت زیادہ کرم سے نارِ جہنم اور دوزخ سے بچا لے۔ اَللّٰھُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ.

ہم کس منہ سے کہیں کہ ہمیں جنت ملے اسی عمل و حال و قال پر جس میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی ہے، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ. ہماری بڑی بختاوری اور خوش نصیبی اور ترقیِ مدارج وعروجِ مراتب یہی ہے کہ ہم ان برائیوں کے باوجود دوزخ سے بچ جائیں اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت، جو اس کے غضب اور غصے پر حاوی اور غالب ہے، ہم کو اپنے دامنِ عافیت میں ڈھانپ لے:

تو مگر از طرفِ رحمت خود نزدیکی ورنہ من از طرف خویش بغایت دورم

''اے اللہ! تُو تو اپنی رحمت سے قریب ہے یعنی مجھے اپنی رحمت میں لے لے، ورنہ میں تو اپنے آپ سے بہت دُور ہوں، یعنی برائیوں میں ملوّث ہو کر اپنے نفع ونقصان سے غافل ہوں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اثباتِ نبوت کے ایک دوسرے طریق کی طرف اشارہ کیا۔ حاصلِ تقریر یہ ہے کہ تم بعض اشیا کو حلال کرنے کا اور بعض کو حرام کرنے کا حکم کرتے ہو، سو یہ حکم اگر صرف خواہشات پر مبنی ہے تو تمام عقل مندوں کے نزدیک خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر، توجہ کے قابل نہیں ہے اور اگر اس اعتقاد پر ہے کہ یہ حکم اللہ کا ہے، اس کے دیے ہوئے رزق کے بارے میں تو تم اس بات کو نہیں جان سکتے، مگر اسی طریق سے جو اللہ تک پہنچائے اور ایسا طریق جس میں کہ حلال اور حرام کا بیان ہو کوئی اور نہیں سوائے اس طریق کے جو رسولوں کی طرف سے ہو جن کو اللہ نے اپنے بندوں کی طرف بھیجا ہے۔ پس اب تم بتاؤ کہ اللہ نے جو رزق اتارا ہے اور تم کو دیا ہے جیسے کھیتی اور دودھ وغیرہما اور تم نے اس میں بعض کو حرام ٹھہرا دیا، جیسے: بحیرہ وسائبہ اور بعض کو حلال قرار دے دیا، جیسے مردار اور اس جیسی چیزیں کیا یہ اللہ کا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے سورت انعام میں کھیتی اور چوپائیوں کا ذکر کیا ہے یا یہ تم نے اللہ پر افترا باندھا ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''كَفٰى بِهِ زَاجِراً لِمَنْ اَفْتٰى بِغَيْرِ إِتْقَانٍ كَبَعْضِ فُقَهَاءِ هٰذَا الزَّمَانِ'' امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو لوگ مفتی بن کر لوگوں کو حلال وحرام اور کسی چیز کے جائز اور ناجائز ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں، حالانکہ خود مذاہب کے مقلد ہیں جو نہ حجت کو سمجھیں اور نہ دلیل کو جانیں، بلکہ ان کا علم بس یہیں تک ہے کہ قائلینِ امت کے اقوال ہیں اور یہ ان کے اقوال کی تقلید کرتے ہیں اور اس قائل کو انھوں نے ایک مستقل شارع ٹھہرا لیا ہے۔ یہ آیت شریفہ ان کے لیے ایک سخت قسم کی ڈانٹ ہے اور یہ اہلِ فتویٰ کھلی خطا میں اور بڑی غلطی میں

پڑے ہیں، ان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اجتہاد پر عمل کرنے کی اجازت صرف مجتہد کو ہے۔ وہ اہلِ اسلام جن کے اقوال اس لائق ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے، ان میں سے کوئی شخص اس کا قائل نہیں ہے کہ کسی غیر کے اجتہاد کی تقلید اور اقتدا کرنا جائز ہے اور مقلدین نے جو کچھ اس باطل کو قائم کرنے میں ذکر کیا ہے وہ سب صاف جہالت ہے۔[1]

علامہ نسفی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ڈانٹ ہے، احکامِ مسئولہ میں تجاوز کرنے سے اور اس بارے میں احتیاط کے واجب ہونے کا باعث ہے، کسی شخص کو نہ چاہیے کہ کسی شے کو اپنی رائے سے جائز یا ناجائز کہے مگر اس کی تحقیق کے بعد اس کا یقین حاصل کر لینے کے بعد ورنہ ایسا شخص اللہ پر جھوٹ باندھنے والا ہوگا۔[2]

پھر اللہ نے فرمایا کہ یہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ان کو کیا گمان ہے کہ ان کے ساتھ قیامت کے دن کیا کیا جائے گا؟ اللہ تعالیٰ لوگوں پر مہربان ہے اور طرح طرح کی نعمتیں اور فضل دنیا اور آخرت میں عطا کرتا ہے۔ ان نعمتوں میں سے ایک نعمت رسولوں کا بھیجنا اور حلال اور حرام کے بیان کے لیے اپنی کتابوں کا نازل کرنا اور آخر زمانے تک کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ کو باقی رکھنا ہے۔ لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہیں، یہ نعمتیں جو ہر وقت اور ہر لحظہ ان پر اترتی رہتی ہیں، ان کی کچھ قدر و قیمت نہیں جانتے اور اپنے شعور اور حواس کو حکمتِ ربانیہ کی طرف مبذول نہیں کرتے کہ یہ اشیا کس لیے بنائی گئی ہیں۔[3]

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ
مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا
يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ
وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۱

اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں، جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے (61)

ہر چھوٹی بڑی چیز اور ساری مخلوقات کے حالات اللہ کے علم میں ہیں:

اللہ نے اپنے نبی کو خبر دی کہ وہ تمھارے اور تمھاری امت کے اور ساری خلائق کے احوال سے ہر گھڑی، ہر آن و لحظہ میں واقف ہے، اس کے علم اور بصر سے سارے آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر بھی، بلکہ ذرہ سے بھی

[1] فتح القدير (٢/ ٦٤٨) [2] تفسير النسفي (٢/ ١٣٣ـ ١٣٤) [3] فتح البيان (٦/ ٨٤ـ ٨٦)

کم، غائب نہیں ہے:

بر او علم یک ذرہ پوشیدہ نیست — کہ پیدا و پنہاں بر نزدش یکے ست

''وہ ایک ذرہ کی موجودگی سے بھی بے خبر نہیں، کیوں کہ ظاہر و پوشیدہ اس کے نزدیک ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو۔''

اس آیت پاک میں اس امر کی خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ درختوں وغیرہ کے حرکت کرنے اور جمادات کے تغیر و تبدل، اسی طرح تمام جانداروں کا عالم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے تمام جزئیات کا علم ہونے پر قطعی دلیل ہے۔ تمام مخلوق میں سب سے زیادہ جاہل جو نام نہاد فلسفی اور دانش مند مشہور ہیں، ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے نہ کہ جزئیات کا، کفر بواح اور صریح گمراہی ہے۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ. ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ [الملك: ١٤] ''بھلا وہ نہ جانے گا جس نے (سب کو) پیدا کیا۔ اور وہی باریک بین، بہت باخبر ہے''

نیز اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور اپنے دونوں پروں سے اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [هود: ٦] ''زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے جاندار ہیں سب کی روزیاں اللہ تعالیٰ پر ہیں، وہی ان کے رہنے سہنے کی جگہ کو جانتا ہے اور ان کو سونپے جانے کی جگہ کو بھی، سب کچھ واضح کتاب میں موجود ہے۔''

سو اللہ پاک کا علم ان اشیا کی حرکات کے ساتھ ہے تو پھر کیا ان کی حرکات کا علم نہ ہوگا جن کو عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے، یعنی انسانوں کا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٢١٧۔ ٢١٩] ''اور آپ (اللہ) غالب (اور) مہربان پر توکل رکھیں۔ جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ (اکیلے نماز میں) قیام کرتے ہیں۔ اور آپ کی نقل و حرکت کو سجدہ کرنے والوں میں بھی (دیکھتا ہے)۔'' غرض کہ جب کوئی بشر کوئی کام کرتا ہے تو اللہ اُس کو دیکھتا ہے سنتا ہے اور جانتا ہے، اسی

لیے جب جبرائیل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ سے احسان کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں یہ فرمایا: «أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ شَأْنٍ ﴾ یعنی امر بمعنی مقصد ہے اس کی جمع شؤون ہے اور قرآن مجید کی تلاوت ایک اعظم شانِ نبوت ہے۔ شہود سے مراد اطلاع ہے۔ افاضہ کہتے ہیں عمل میں داخل ہونے کو یا افاضہ سے مراد کسی کام میں غور و خوض کرنا ہے۔ ﴿ يَعْزُبُ ﴾ بہ معنی "يَغِيبُ" یا "يَخْفٰى" یا "يَبْعُدُ" یا "يَذْهَبُ" ہے، یہ سب الفاظ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ﴿ ذَرَّةٍ ﴾ لال چیونٹی کو کہتے ہیں۔

"أَرْضُ و سَمَاءُ" سے مراد امکان اور وجود کا دائرہ ہے۔ اللہ کے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے، خواہ وہ آسمان و زمین کے درمیان ہو یا ان سے خارج ہو، لیکن صرف آسمان و زمین کے ذکر پر اکتفا اس لیے کیا کہ لوگ ان دونوں کو دیکھتے ہیں۔ زمین کو آسمان سے پہلے اس لیے رکھا کہ تمام عالم کے قرار پکڑنے کی جگہ یہی ہے۔ معنی یہ ہیں کہ ذرہ ذرہ لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے، پھر کس طرح اللہ کے علم سے غائب ہوسکتا ہے۔[2] (قاله السدي) آیت میں اس کا رد ہے جس کو یہ زعم ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جزئیات کا عالم نہیں ہے۔[3]

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾

آگاہ رہو! بے شک اولیاء اللہ پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (62) (یعنی) وہ لوگ جو ایمان لائے اور (اللہ سے) ڈرتے رہے (63) ان کے لیے دنیاوی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں (بھی)، اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی، یہی بہت بڑی کامیابی ہے (64)

﴿ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ ﴾ کی تفسیر، پہچان اور مقام:

اللہ نے خبر دی کہ اللہ کے ولی وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز گاری کرتے ہیں۔ اولیا اللہ کی یہ تفسیر اللہ نے خود فرمائی ہے، اب کسی اور شخص کو تفسیر کی کچھ حاجت باقی نہ رہی۔ معلوم ہوا کہ جو شخص متقی ہے وہ اللہ کا ولی ہے۔ اس کو نہ آخرت میں کچھ ڈر ہے اور نہ وہ دنیا کے کسی کام پر رنج کرے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥)

[2] الدر المنثور (٤/ ٣٦٩) [3] فتح البيان (٦/ ٨٦ـ ٨٨)

نے کہا ہے کہ اللہ کے ولی وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ یاد آئے۔[1] بہت سے سلف بھی اسی کے قائل ہیں اور یہ بات حدیث مرفوع میں بھی آئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! اولیاء اللہ کون ہیں؟ فرمایا: « إِذَا رُأُوا ذُكِرَ اللّٰهُ »[2] (رواه البزار وقد روي عن سعيد مرسلا)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ کے بندوں میں ایسے بندے بھی ہیں کہ جن پر انبیا اور شہدا رشک کریں گے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہیں؟ شاید ہم ان کو دوست رکھیں، فرمایا: « هُمْ قَوْمٌ تَّحَابُّوا فِي اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ أَمْوَالٍ وَّلَا أَنْسَابٍ، وُّجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ، لَّا يَخَافُوْنَ إِذَا خَافَ النَّاسُ، وَلَا يَحْزَنُوْنَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ » پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (آیتِ باب)[3] (رواه ابن جرير ورواه أيضا أبو داود بمثله وهذا أيضا إسناد جيد إلا أنه منقطع بين أبي زرعة وعمر بن الخطاب والله أعلم)[4]

سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: "يَأْتِي مِنْ أَفْنَاءِ النَّاسِ وَنَوَازِعِ الْقَبَائِلِ قَوْمٌ لَمْ يَتَّصِلْ بَيْنَهُمْ أَرْحَامٌ مُّتَقَارِبَةٌ، تَحَابُّوا فِي اللّٰهِ، وَتَصَافُّوا فِي اللّٰهِ، يَضَعُ اللّٰهُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ، فَيُجْلِسُهُمْ عَلَيْهَا، يَفْزَعُ النَّاسُ وَلَا يَفْزَعُوْنَ، وَهُمْ أَوْلِيَاءُ اللّٰهِ الَّذِيْنَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا يَحْزَنُوْنَ"[5] (رواه أحمد والحديث طويل)

بالجملہ اس جگہ ولی کی شناخت یہ فرمائی کہ ولی متقی ہوتا ہے تو اب جس کسی فقیر، پیر، شیخ میں تقویٰ نہیں وہ ولی بھی نہیں ہے، خواہ ایک جہاں اس کو ولی کہے یا خود اس کو اپنی نسبت ولی ہونے کا گمان ہو، بلکہ دوسری جگہ ولایت کو اسی تقویٰ میں محصور فرمایا ہے: ﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [الأنفال: ٣٤] "اس کے متولی تو متقی لوگ ہی ہیں۔" تقویٰ کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شرک و بدعت اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رہے اور فرائض اور نوافل پر ہمیشگی کرے اور اطاعتِ الٰہی اور معصیت کے ترک میں کتاب و سنت کے امر و نہی کا پابند ہو نہ کہ لوگوں کی رایوں کی تقلید کرنے والا اور لوگوں کے قیل و قال کا پابند۔ اور تقویٰ کا اوسط درجہ یہ ہے کہ "كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" سمجھ کر ہر حال میں غیر اللہ کے خیال سے اپنی نگہبانی کرے، دل میں ظاہری طور پر سنت کی اتباع اور باطنی طور پر اللہ کے ذکر کے سوا کچھ نہ ہو اور دنیا کی کوئی مشغولیت اسے اللہ کی یاد سے نہ روکے، "دل بیار دست بکار" ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ

---

① تفسير الطبري (١٥/ ١١٩_ ١٢٠)

② مسند البزار (١١/ ٢٥١) تفسير الطبري (١٥/ ١٢٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٣٣)

③ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٦٢) تفسير الطبري (١٥/ ١٢٠_ ١٢١) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٩٣)

④ سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢٧) تفسير الطبري (١٥/ ١٢) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٩٣)

⑤ مسند أحمد (٥/ ٣٤٣) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٩٣)

تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [النور: ٣٧] ''وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔''

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیا اللہ مسلمین کی ہر قسم میں ہوتے ہیں، کسی خاص نسب و حسب پر ہی منحصر نہیں۔ اسی لیے اکثر سلف اولیا کسی نہ کسی پیشے سے منسلک گزرے ہیں۔ اسی طرح حدیث کے علما اور سنت کے راوی اور احادیث کو نقل کرنے والے اور اقوالِ صحابہ پر چلنے والے، بلکہ انبیا علیہم السلام بھی محنت کرنے والے اور تاجر پیشہ تھے۔ اس کا بیان رفو الخرقہ میں تفصیل سے لکھا ہے، لیکن اللہ کے ولی کی شیطان کے ولی سے شناخت عام آدمی کا کام نہیں ہے۔ اس جگہ علم و فضل اور تجربہ کا دعویٰ کرنے والے بھی دھوکے میں مبتلا ہو گئے اور بہت سے اللہ کے دشمنوں نے اولیاء اللہ بن کر ایک جہان کو کتاب و سنت کی سیدھی راہ سے گمراہ کر دیا، ایسے شعبدے نیرنجات لائے جس کو خواص و عوام نے کرامات سمجھ لیا اور احمق آدمی تو ہر ایسے شخص کو، جو ظاہری طور پر صالح ہو، ولی سمجھ لیتا ہے، بلکہ ہر سڑے سودائی، ننگے بدن پھرنے والے اور بڑ مارنے والے، بلکہ ایسے فقرا کو جو نہ نماز پڑھیں اور نہ روزہ رکھیں، بلکہ گالی بکیں اور کتے پالیں اور محض جاہل ہوں کو بھی درجۂ ولایت تک پہنچا ہوا تصور کر لیتا ہے، اس لیے سلف نے ولایتِ حقہ اور ولایتِ باطلہ کے بارے میں رسائل اور تالیفات لکھی ہیں، جیسے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الفرقان بین أولیاء الرحمن و أولیاء الشیطان''، سو جو شخص اس میزان میں تل جائے وہ تو ولی اللہ ہے، ورنہ ولی الشیطان سمجھنا چاہیے۔

﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى ﴾ کی تفسیر:

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى ﴾ (آیتِ باب) کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس سے مراد نیک خواب ہیں جس کو کوئی مسلمان دیکھے یا مسلمان کے لیے دیکھا جائے۔[1] (رواہ أحمد) ان کی مرفوع روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ أَوْ تُرىٰ لَهُ بُشْرَاهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَبُشْرَاهُ فِي الْآخِرَةِ»[2] (رواہ ابن جریر) یہ حدیث کئی طریق سے آئی ہے۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے اللہ کے رسول! اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: «لَقَدْ سَأَلْتَنِي عَنْ شَيْئٍ مَّا سَأَلَنِي أَحَدٌ مِّنْ أُمَّتِي أَوْ أَحَدٌ قَبْلَكَ، تِلْكَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الرَّجُلُ أَوْ تُرىٰ لَهُ»[3] (رواہ أحمد و أبو داود الطيالسي والأوزاعي وغيرهم بطريق) سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: «سَأَلْتُ عَنْهَا نَبِيَّ اللّٰهِ، فَقَالَ: مَا سَأَلَنِي أَحَدٌ قَبْلَكَ، وَهِيَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٤٤٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٨٦)

[2] تفسير الطبري (١٥/ ١٢٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٨٦)

[3] مسند أحمد (٥/ ٣١٥) مسند الطيالسي (١/ ٧٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٧٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

يَرَاهَا الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ فِي الْمَنَامِ أَوْ تُرىٰ لَهُ »[1] (رواه ابن جرير)

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ کوئی آدمی عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں اور ثنا کہتے ہیں، فرمایا: « تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرىٰ الْمُؤْمِنِ »[2] (رواه مسلم و أحمد) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ یہ بشریٰ نیک خواب ہیں جو مومن کو خوش خبری دیتے ہیں، نبوت کے انچاسویں جز کی، جو کوئی اچھا خواب دیکھے وہ بیان کر دے اور جو کوئی اس کے سوا دیکھے تو وہ خواب شیطان کی طرف سے ہے، وہ اس کو غمگین کرتا ہے۔ اب چاہیے کہ یہ بائیں طرف تین دفعہ تھتکارے اور تکبیر کہے اور کسی کو اس کی خبر نہ کرے۔[3] (رواه أحمد)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ بُشریٰ دنیا میں نیک اچھا خواب ہے جس کو بندہ دیکھے یا کوئی اور اس کے لیے دیکھے اور آخرت میں جنت ہے۔[4] (رواه ابن جرير) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: « اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ بُشْرىٰ مِنَ اللّٰهِ وَهِيَ مِنَ الْمُبَشِّرَاتِ »[5] (رواه ابن جرير هكذا وقفا) ام کرز کعبیہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے: « ذَهَبَتِ النُّبُوَّاتُ وَبَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ »[6] (رواه ابن جرير)

اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور امام مجاہد، عروہ بن زبیر، یحییٰ بن ابی کثیر، ابراہیم نخعی اور عطا بن ابی رباح وغیرہم رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس آیت میں آنے والے لفظ بُشریٰ کی تفسیر رؤیائے صالحہ سے کی ہے۔[7] اور بعض نے کہا ہے کہ مراد ملائکہ کا بشارت دینا ہے، مومن کو اس کی موت کے وقت جنت اور مغفرت کی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾ نَحْنُ أَوْلِيَآؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ﴾ [حمٓ السجدة: ٣٠-٣٢] ''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُترتے

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٢٩-١٣٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧٨٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٢) مسند أحمد (٥/ ١٥٦)

[3] مسند أحمد (٢/ ٢١٩) اس کی سند میں ''دراج اور ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہیں۔ نیز اس جیسی روایت "صحيح البخاري" (رقم الحديث: ٦٦١٤) اور "صحيح مسلم" (رقم الحديث: ٢٢٦٣) میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ اس میں ''نبوت کے انچاسویں جز'' کے بجائے ''نبوت کے چھیالیسویں جز'' کا ذکر ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٥/ ١٣١) علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صالح ہے۔

[5] تفسير الطبري (١٥/ ١٣١) اس کی سند صحیح ہے۔

[6] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٩٦) تفسير الطبري (١٥/ ١٣٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٤٣٩)

[7] تفسير الطبري (١٥/ ١٣١-١٣٩)

ہیں: نہ تم ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیاوی زندگی میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (رفیق ہیں) اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تمھارے جی چاہیں گے اور اس میں تمھارے لیے وہ (سب کچھ) ہے جو تم مانگو گے۔ (یہ) بڑے بخشن ہار، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی۔''

سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مومن کو جب موت آتی ہے تو سفید منہ والے فرشتے سفید لباس میں آ کر کہتے ہیں: اے پاک روح! نکل روح و ریحان اور رب غیر غضبان کی طرف نکل! وہ روح مومن کے حلق و منہ سے اس طرح نکل کر باہر آتی ہے جیسے کہ قطرہ مشک کے دہانے سے نکل آتا ہے یا ٹپکتا ہے۔[1]

رہا ﴿ اَلْبُشْرٰى ﴾ آخرت کا، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۳] ''بڑی گھبراہٹ انھیں غم ناک نہیں کرے گی، اور فرشتے ان سے (یہ کہہ کر) ملیں گے: یہ ہے تمھارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ [الحدید: ۱۲] ''اس دن آپ ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔ (کہا جائے گا:) آج تمھیں ایسے باغات کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔'' پھر فرمایا کہ اللہ کے وعدے میں نہ کوئی تبدیلی ہو، نہ اس کے خلاف ہو اور نہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل ہو، بلکہ اس کا وعدہ مقررہ ثابت ہے لامحالہ پورا ہوگا، یہی بڑی مراد ملنی ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لغت میں ولی عدو کے متضاد کو کہتے ہیں، پس ولی کے معنی محبّ ٹھہرے اور اللہ کے لیے بندوں کی محبت یہی ہے کہ بندے اللہ کی اطاعت کریں اور بندے کے ساتھ اللہ کی محبت یہ ہے کہ اللہ بندے کا اکرام فرمائے۔ شق اول پر ولی صیغہ فعیل کا ہے بمعنی فاعل اور دوسری شق پر صیغہ فعیل کا ہے جو مفعول کے معنی میں ہے۔ پس ولی کا لفظ ان دونوں معانی کے درمیان مشترک ٹھہرا اور واؤ اور لام اور یا کی ترکیب قرب کے معنے پر دلالت کرتی ہے، سو ہر شے کا ولی وہ ہے جو اس سے قریب ہو اور ان سے خوف کی نفی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی نہ ڈریں گے، جب کہ ان کے علاوہ دوسرے کو ڈر ہوگا، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے واجبات پر عمل کر کے آگے بھیجا ہے اور اس کی

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٨٧) صحیح الجامع، رقم الحدیث (١٦٧٦)

نافرمانیوں سے باز رہے جن سے اللہ نے ان کو منع کیا تھا، اس لیے وہ اپنے نفس پر وثوق رکھتے ہیں اور اللہ کے ساتھ نیک گمان کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں کسی مقصد کے فوت ہو جانے (حاصل نہ ہو سکنے) پر کچھ غم نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ یہ سارا کارخانہ اللہ کی قضا و قدر سے جاری ہے، اس لیے اس قضا و قدر کو تسلیم کرتے ہیں اور اپنی جان کو اندیشوں اور کدورت سے دور رکھتے ہیں اور راحت دیتے ہیں، اسی لیے ان کے سینے فراخ اور ان کے جوارح خوش اور ان کے دل مسرور ہیں اور ان کے دل مجموع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اولیا کی تفسیر یوں فرمائی کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اس شے پر جس پر ایمان لانا واجب ہے اور جس چیز سے پرہیز کرنا واجب ہے اس سے پرہیز کرتے ہیں، یعنی گناہ۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ تقویٰ سے مراد تیسرا مرتبہ ہے جو پہلے دونوں مراتب کا جامع ہے، پہلا مرتبہ شرک سے دور رہنا ہے جو ایمان کو ضائع کر دیتا ہے۔ دوسرا مرتبہ گناہ سے فعلاً و ترکاً بچنا ہے۔ تیسرا مرتبہ انسان کا ہر اس شے سے تنزہ (پاک رہنا) ہے جو باطن کو حق سے باز رکھے اور منقطع ہو کر بالکل حق کی طرف آ جانا۔ حقیقی تقویٰ جس کا سورت آلِ عمران کی اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، یہی رتبہ ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٠٢] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔“

اسی رتبے سے شہود و حضور و قرب حاصل ہوتا ہے اور اسمِ تقویٰ کا اطلاق اسی کے ارد گرد چکر مارتا ہے۔[1] غرضیکہ ولایت کی اصل یہی تقویٰ ہے اور اولیاء اللہ یہی مومنین متقین ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب تو ان کو دیکھے تو اللہ یاد آئے۔[2] امام ابو حنیفہ اور شافعی رحمہما اللہ نے کہا ہے: ”إِذَا لَمْ تَكُنِ الْعُلَمَاءُ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ وَلِيٌّ“ امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات اس عالم کے حق میں کہی ہے جو باعمل ہو جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ولایت کے لیے علم درکار ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الزمر: ٩] ”کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟“ معلوم ہوا کہ جس کو اللہ کا ڈر اور تقویٰ نہیں ہے وہ گو ظاہر میں عالم کہلائے اور پڑھا لکھا بھی ہو تو حقیقت میں وہ عالم باللہ نہیں ہے، اس مفہوم سے علمائے دنیا خارج ہو گئے اور فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴾ [البينة: ٨] ”یہ (مقام) اس کو ملتا ہے، جو اپنے رب سے ڈر گیا۔“ معلوم ہوا کہ جنت خاص کر اہلِ علم متقین کا حصہ ہے اور گناہ گار اہلِ ایمان جو عذابِ نار کے بعد یا نیک اور بہترین لوگوں کی شفاعت سے بہشت میں جائیں

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ١٥٩) [2] تفسير الطبري (١٥/ ١١٩)

گے، ان کا جانا بطور تبعیت ہو گا نہ کہ اصالتاً۔ متکلمین اور صوفیہ وغیرہ نے ولی کی تعریف اور صفت میں طویل مقالات لکھے ہیں جن کی کچھ حاجت نہیں ہے، یہ آیت اس درازنفسی سے بے نیاز کرتی ہے: "إِذَا جَآءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ"

حاصل مقام یہ ٹھہرا کہ ولی اللہ وہ شخص ہے جو دلیل پر مبنی صحیح اعتقاد رکھتا ہو اور سنتِ مطہرہ کے مطابق بغیر بدعت کی آمیزش کے اعمالِ صالحہ بجا لاتا ہو، کیوں کہ ایمان کی بنیاد عقیدۂ توحید اور صحیح عمل پر ہے اور تقویٰ کا مقام یہ ہے کہ بندہ ہر ممنوعہ چیز سے بچے۔ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، فرماتے تھے کہ بندہ اس وقت تک صریح ایمان کا مستحق نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اللہ کے لیے کسی دوست دار اور کسی کا دشمن ہو۔ پھر جب وہ اللہ کے لیے کسی کا محب اور دشمن ہوا تو اللہ کی طرف سے ولایت کا مستحق ٹھہرا، میرے اولیا میرے بندوں میں اور میرے دوست دار میری خلق میں وہ لوگ ہیں کہ میرے ذکر پر ان کا ذکر آتا ہے اور ان کے ذکر پر میرا ذکر۔[1] (أخرجه أحمد وغيره)

عبدالرحمان بن غنم کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین وہ لوگ ہیں کہ جب نظر آئیں تو اللہ یاد آئے اور بدترین وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کرتے رہتے ہیں اور دوستوں میں تفرقہ ڈالتے ہیں،[2] الحدیث۔ (رواه أحمد) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً روایت کیا ہے: "خِيَارُكُمْ مَنْ ذَكَّرَكُمُ اللّٰهَ رُؤْيَتُهُ وَزَادَ فِيْ عِلْمِكُمْ مَنْطِقُهُ وَرَغَّبَكُمْ فِي الْآخِرَةِ عَمَلُهُ"[3] (أخرجه الحكيم الترمذي) اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کے فضائل میں احادیث آئی ہیں، لیکن ان میں یہ ذکر نہیں ہے کہ اس آیت سے مراد وہی لوگ ہیں۔

بالجملہ اللہ کے ولیوں کے لیے دنیا کی زندگی اور آخرت میں بشارت ہے۔ دنیا کی بشارت یہ ہے کہ اللہ نے نبی کو وحی کی اور اپنی اچھی اور مزے دار کتاب میں مومنین کا حال بیان کیا کہ ہم ان کو بہشت میں داخل کریں گے اور ان سے راضی ہوں گے، چنانچہ اس قسم کی خوش خبریاں قرآن و حدیث میں کثرت سے آئی ہیں، اسی طرح نیک خوابوں کا حاصل ہونا، دعا کا قبول ہونا، ملائکہ کا موت کے وقت خوش خبری سنانا دنیا کی زندگی کی بشارت ہے۔ فرشتے موت کے حاضر ہونے کے وقت کہتے ہیں: لَا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ.[4] (قاله الزهري و قتادة)

رہا آخرت کے وقت میں خوش خبری دینا سو ان سے فرشتوں کا ملاقات کرنا اور کامیابی اور نعمتوں اور عذاب سے ہمیشہ کی سلامتی کی خوش خبری سنانا ہے۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث جو پہلے گزر چکی ہے جس میں کہا ہے: "اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ بُشْرَاهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَبُشْرَاهُ فِي الْآخِرَةِ الْجَنَّةُ"[5] "اس میں ایک مجہول شخص ہے

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۴۳۰) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٦٢١)

[2] مسند أحمد (٤/ ٢٢٧)

[3] نوادر الأصول (۳/ ۱۵۰۔ ۱۵۱) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن زید" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٨٧٤)

[4] تفسير البغوي (٤/ ١٤١) [5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

اور احادیثِ صحیحہ میں رویائے صالحہ کو من جملہ مبشرات کے ٹھہرایا ہے اور اسے نبوت کے حصوں میں سے ایک حصہ بتایا ہے، لیکن وہ احادیث کچھ اس آیت کی تفسیر نہیں ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت میں بشریٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴾ [الأحزاب: ٤٧] ''اور مومنوں کو اس بات کی بشارت دے دیجیے کہ بے شک ان کے لیے اللہ کی طرف سے بہت بڑا فضل ہے۔'' یا یہ آیت: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ﴾ [حمٓ السجدة: ٣٠] ''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے۔'' یا دنیا کا بُشریٰ ثناء حسن (اچھی تعریف کیا جانا) اور آخرت کا بشریٰ جنتِ عدن ہے۔ اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں، وَاللَّفْظُ أَوْسَعُ مِنْ ذٰلِكَ. اللہ کے وعدے میں خلف نہیں ہے، عموماً تو اب عباد صالحین سے جس قدر وعدے کیے ہیں وہ سب اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں، یہ بشارتِ دارین جس کا ذکر ہو چکا ایک ایسی بڑی کامیابی ہے جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی اور کامیابی اس جیسی ہوگی۔[1]

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾
اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ
الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ
هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا
فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور (اے نبی!) ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں، بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے، وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (65) آگاہ رہو! بے شک اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں میں جو (مخلوق) ہے اور جو زمین میں ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں، وہ (کسی اور چیز کی) پیروی نہیں کرتے، مگر صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں، اور وہ محض قیاس کے گھوڑے دوڑاتے (66) وہی ہے (اللہ) جس نے تمھارے لیے رات بنائی، تاکہ اس میں سکون (حاصل) کرو اور دن کو روشن بنایا۔ بے شک اس میں یقیناً بہت بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں (67)

عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ اکیلا ہی کائنات میں تصرف کرنے والا ہے:

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم ان مشرکوں کی بات پر غمگین نہ ہو۔ اللہ سے ان پر مدد مانگو اور اللہ ہی

---

[1] فتح البیان (٦/ ٨٩۔ ٩٣)

پر بھروسا رکھو، کیوں کہ ساری عزت وقوت و زور آوری اللہ اور رسول اور مومنین کو ہے، وہ ان کی باتوں کا سننے والا ہے اور ان کے حالات کا جاننے والا ہے، یہ سب آسمان اور زمین اللہ کی ملکیت ہیں اور وہ بت جن کو یہ مشرک پوجتے ہیں، کسی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں، نہ نقصان کے اور نہ نفع کے اور نہ ہی بتوں کی عبادت کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل ہے، یہ تو محض اپنے ظن اور اٹکلوں و وہم و جھوٹ اور بہتان کے پیرو ہیں۔ اللہ کو دیکھو کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے رات بنا دی، جس میں وہ استراحت کرتے ہیں اور تکلیف، تھکاوٹ اور حرکات سے آرام کرتے ہیں اور دن کو معاش و تگ و دو و سفر اور دوسری مصلحتوں کے لیے روشن کر دیا۔ جو لوگ حجتوں اور دلائل کو سن کر عبرت حاصل کرتے ہیں اور خالق کی عظمت پر استدلال کرتے ہیں اور اللہ ہی کو رات اور دن کا اندازہ کرنے والا اور چلانے والا جانتے ہیں، ان کے لیے اس بیان میں نشانیاں ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کو تسلی اور عزت کا مطلب:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو کفار کی باتوں پر کسی قسم کا رنج و ملال کرنے سے منع فرمایا، وہ لوگ جو دین میں طعنہ کرنے والے جھٹلانے والے اور عیب لگانے والے تھے۔ اس ممانعت کا مقصد آپ ﷺ کو ان کی ایذا رسانی سے تسلی دینا ہے اُس ایذا سے جو ان کفار کی خراب باتوں سے آپ کو پہنچتی تھی اور خوش خبری ہے اس بات کی کہ اللہ تمھاری مدد کرے گا، کیوں کہ اس دنیا کی مملکت میں سارا غلبہ و قدرت و قہر اللہ ہی کو حاصل ہے نہ کسی اور شخص کو۔ سو جب مالک مطلق اللہ تعالیٰ ہو تو اب یہ کفار کس طرح تم پر قدرت پا سکتے ہیں کہ تم ان کی باتوں پر رنج کرو، وہ تو کچھ بھی غلبہ نہیں رکھتے اور تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ آیت کچھ سورت منافقین کی اس آیت کے منافی نہیں ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [المنافقون: ۸] ''اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔''

کیوں کہ ہر عزت اللہ سے ہے تو یہ سب عزتیں رسول ﷺ اور مومنین کی حقیقت میں اللہ ہی کے لیے ہوئیں، لیکن کبھی وہ اس عزت کو رسول ﷺ کے ہاتھ پر اور کبھی مومنین کے ہاتھ پر تکریماً اور تعظیماً ظاہر کر دیتا ہے اور اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ﴾ [المجادلۃ: ۲۱] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے۔'' نیز یہ فرمان: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [المؤمن: ۵۱] ''بلاشبہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں۔'' اللہ ان کی باتوں کو سنتا ہے اور ان کے ارادہ اور عزم سے آگاہ ہے، وہ ان کو ان کے اقوال و افعال کا بدلہ دے گا۔ آسمان اور زمین کی ساری مخلوق اللہ ہی کی ملکیت ہے۔

مشرک کی دلیل... گمان کی پیروی:

من جملہ اسی مخلوق کے ایک یہ مشرکین ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تھے، سو جب یہ لوگ اللہ کے

مِلک میں ٹھہرے تو اب وہ جس طرح چاہے ان میں تصرف کرے اور یہ اللہ کی مشیت اور اذن کے بغیر کب بھلا نبی اکرم ﷺ کو ستا سکتے اور ایذا پہنچا سکتے ہیں۔ اگلی آیت میں حرف مَا کہا ہے اور اس آیت میں حرف مَنْ پایا جاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر شے اللہ کی ملکیت ہے، وہ عُقلا ہوں یا دوسرے۔ اس آیت میں ایسے لوگوں پر سرکشی ہے جو بندوں اور فرشتوں اور جمادات کی عبادت کرتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے مالک کو چھوڑ کر مملوک کی عبادت اختیار کی ہے سو یہ بات عقل کے خلاف ہے، اسی لیے اس کے بعد فرمایا کہ شرکا کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ اپنے گمان کے پیرو ہیں۔ یہ شرکا وہ ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں ہے، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور برابر نہیں۔ یہ بے شک اپنے معبودات کو شرکا کہا کریں، لیکن درحقیقت یہ شرکت محال ہے: ﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢] ''اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو ضرور یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔'' یہ کلام ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ہے۔ اس کلام سے ان پر عار لگائی ہے۔ معنے یہ ہوئے کہ ان کے سارے معبودات اللہ کی ملکیت ہیں اور ان کا یہ گمان کہ وہ اللہ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے، محض خرابی اور خلل ہے: ﴿ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴾ [يونس: ٣٦] ''بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔''

خرص تخمینہ لگانے اور اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال جھوٹ پر ہوتا ہے، گویا ان کا شرکا کو مقدر کرنا ایک اندازۂ باطل اور بے فائدہ قسم کا جھوٹ ہے۔ یہ آیت پہلے سورت انعام میں بھی گزر چکی ہے، پھر اللہ نے اپنی قدرت کے بعض آثار کا ذکر کیا اور نوعِ انسان پر اپنے بعض انعامات کا بطور احسان ذکر کیا اور فرمایا کہ ہم نے رات کو سکون کے لیے اور دن کو مشغولیت کے لیے بنایا۔ رات اندھیری ہوتی ہے اس لیے حرکت سے باز رہ کر محنت اور کام کاج سے آرام پاتے ہیں اور دن کو روشنی ہوتی ہے، اس میں اپنے فائدے کے لیے کوشش اور معاش کے لیے اور ضروریات کے حصول کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ دن کی روشنی میں کوئی بڑی اور چھوٹی چیز پوشیدہ نہیں رہتی، سو ان آیاتِ تنزیلہ میں جو کہ آیاتِ تکوینیہ پر واضح دلیلیں ہیں، سننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ جب ان آیات میں غور و فکر کرتے ہیں تو جان لیتے ہیں کہ جس نے ان سب چیزوں کو پیدا کیا ہے، وہی وحدانیت فی الوجود کے لیے متفرد ہے، یعنی وہ ذات واحد اور احد الصمد ہے اور یہ غور و فکر ان کے ایمان لانے کا بہت بڑا سبب ہوتا ہے۔[1]

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ
اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ ٦٨ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى

[1] فتح البیان (٦/ ٩٤۔ ٩٦)

اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

انھوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ وہ (اولاد) سے پاک ہے، وہ بے پروا ہے، اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تمھارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں۔ کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم جانتے نہیں؟ 68 (اے نبی!) کہہ دیجیے: بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے 69 دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے 70

خدا پر اولاد بنا لینے کا بہتان اور اس کی تردید:

اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر انکار کیا ہے اور تردید کی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی اللہ کا بیٹا ہے۔ اللہ پاک تو ہر ماسوا سے بے نیاز اور پاک ہے اور ہر شے اس کی محتاج ہے۔ جب سارے آسمان و زمین اسی کی ملکیت ہوئے تو پھر کس طرح کوئی مخلوق اس کی فرزند ہو سکتی ہے۔ ہر چیز اس کی مملوک اور عبد ہے، ہاں اگر تمھارے پاس اس دعوے پر کوئی دلیل ہو تو پیش کرو، یعنی اس جھوٹ اور بہتان پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر ایسی بات کہتے ہو جو تم جانتے نہیں۔

یہ ارشاد سخت وعید اور ڈانٹ ڈپٹ اور ان کی بات کے انکار کے لیے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [مریم: ۸۸۔ ۹۵] ''اور انھوں نے کہا: رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔ البتہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات (گناہ) تک آ پہنچے ہو۔ قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس (بات) پر کہ انھوں نے رحمان کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا۔ اور رحمان کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمان کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہ یقیناً اس (رحمان) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یوم قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔''

پھر اللہ نے ان مکذبین اور مفترین کو، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا بھی ہے، یہ وعید سنائی کہ تم کو کبھی دنیا و آخرت میں کامیابی نہ ہوگی۔ دنیا میں اس طرح کہ اللہ نے ان کے ساتھ استدراج کیا اور ان کو مہلت دی اور تھوڑا فائدہ عطا کیا، پھر یہ سخت عذاب کی طرف مضطر ہوں گے، اسی لیے فرمایا کہ یہ دنیا میں تھوڑا سا عیش ہے، یعنی

ایک مدت قریب میں، پھر جب ہمارے پاس پھر کر آئیں گے تو ہم ان کو عذابِ شدید چکھائیں گے جو بہت درد اور دکھ دینے والا ہے، یعنی ان کے کفر اور افترا پردازی کی وجہ سے، کیوں کہ یہ اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اور بہتان تراشی اور جھوٹے دعوے کرتے تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ مشرکین کے باطل اور اہلِ کتاب کے افترا کی ایک دوسری قسم ہے، ان کا یہ اعتقاد ہے کہ اللہ نے متبنیٰ بنایا اور ایک بیٹا ٹھہرا لیا۔ سو اللہ نے احمقوں کی اس بات سے اپنے آپ کو منزہ فرمایا اور اپنی بے نیازی کا بیان فرمایا، کیوں کہ اولاد کی طلب کسی حاجت کی وجہ سے ہوتی ہے، سو جو ذات غنی مطلق ہے اس کو کیا حاجت ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے، جب حاجت ہی نہ ٹھہری تو ولد کی نفی ہوگئی۔ ولد کا محتاج وہ ہوتا ہے جو رک جانے والا یا اختتام کو پہنچنے والا ہو، تاکہ ولد اس کی جگہ قائم ہو اور وہ ذات جو قدیم ازلی ہے اس کے لیے انقراض (اختتام) نہیں ہے کہ وہ ولد کا حاجت مند ہو، اس آیت کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے۔

پھر اس تردید میں بطور دلیل کے مبالغہ کیا کہ جب وہ چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اللہ ہی کی ہے تو ان چیزوں میں سے جو آسمان اور زمین میں ہیں، کسی شے کا ولد ہو صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ملکیت ہونے میں اور بیٹا اور باپ ہونے میں منافات (ایک دوسرے کی نفی) ہے۔ پھر ان کے اس باطل دعوے کی تردید کی اور کہا کہ اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس مدعا پر نہ کوئی حجت ہے اور نہ برہان۔ پھر اس بات اور دلیل پر جسے عقل مند لوگ بیکار اور باطل خیال کرتے ہیں، سخت ڈانٹ کی اور فرمایا کیا تم اللہ پر ایسی بات کہتے ہو جو خود تم کو معلوم نہیں۔ یہ سوالیہ انداز ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو قول ایسا ہو کہ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے تو وہ سراسر جہالت ہے نہ کہ علم۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان سے یہ بات کہہ دو کہ اللہ پر کذب اور افترا کرنے والا کبھی بامراد نہیں ہوتا اور فلاح کو نہیں پہنچتا۔ اللہ پر ہر افترا کرنے والے کا یہی انجام ہے اس میں اس قول کا کہنے والا بھی بدرجۂ اولیٰ داخل ہے۔

افترا کے ساتھ کذب کا ذکر تاکید کے لیے ہے جس طرح کہ قرآن میں بہت جگہ گزر چکا ہے۔ معنی یہ ٹھہرے کہ یہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی کسی مطلب کے ساتھ کامیاب نہ ہوں گے اور نہ سعادت یاب، اگرچہ ان کو سلامتی اور نعمتوں کی بقا کا دھوکا اور فریب دیا گیا ہو۔ پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اگرچہ ایسا افترا پرداز وقتی طور پر کسی مطلب کو حاصل کر کے اپنے آپ کو کامیاب سمجھنے لگ جائے، تب بھی اس کا یہ فائدہ قلیل اور حقیر اور یسیر ہے، یعنی اس دنیا کی زندگی تک ہے، آخر اس کے بعد موت آئے گی اور وہ اللہ کی طرف لوٹ کر جائے گا اور ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہوگا، دنیا کے مقاصد کا یہ حصول اور نفسانی لذتوں کا مل جانا حقیقی کامیابی نہیں ہے اور اس کا کوئی ایسا فائدہ نہیں

ہے جس کو شمار کیا جا سکے، بلکہ کفر کی وجہ سے آخرت میں تکلیف دینے والا ہو گا۔ اس جگہ کفر سے مراد نعمت کا انکار ہے اور اللہ کے ساتھ کسی ایسی شے کو وصف کرنا ہے جو اس کے جلال کے لائق نہیں ہے۔[1]

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝71 فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝72 فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰھُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝73

اور (اے نبی!) آپ انھیں نوح کا قصہ سنا دیجیے: جب اس نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تمھیں میرا قیام اور اللہ کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کرنا ناگوار ہے تو میں نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے، چناں چہ تم اور تمھارے شریک مل کر (میرے خلاف) فیصلہ کر لو، پھر تمھارا فیصلہ تم میں (کسی سے) پوشیدہ نہ رہے، پھر مجھ پر تم وہ نافذ کر دو اور مجھے مہلت نہ دو (71) پھر اگر تم (حق سے) پھر جاؤ، تو میں نے تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کیا، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہو جاؤں (72) پھر انھوں نے اسے جھٹلایا تو ہم نے اسے اور ان لوگوں کو نجات دی، جو اس کے ساتھ کشتی میں (سوار) تھے، اور ہم نے انھیں (ان کا) جانشین بنا دیا، اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا، جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، پھر (اے نبی!) دیکھیے ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا، جنھیں ڈرایا گیا تھا؟ (73)

نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ اور کفارِ مکہ سے مماثلت:

اللہ پاک نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ تم کفارِ مکہ کو، جو تمھارے مکذب اور مخالف ہیں، نوح علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ سنا دو کہ اللہ پاک نے ان کو نوح علیہ السلام کی تکذیب پر از اول تا آخر ڈبو دیا، سو تم بچو کہ کہیں ویسی ہی بلا، ہلاکت اور مار تم کو نہ پہنچے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر تمھیں میرا اپنے درمیان ٹھہرنا پسند نہیں ہے اور جو

[1] فتح البیان (٦/ ٩٧۔ ٩٨)

حجتیں اور اللہ کی براہین میں تم کو یاد دلاتا ہوں وہ تم کو بری لگتی ہیں تو مجھ کو تمھارے منہ پھیرنے اور انحراف کرنے کی کچھ پروانہیں، میرا بھروسا اللہ پر ہے، میں ہرگز اس نصیحت کرنے سے باز نہیں رہوں گا، خواہ تم پر گراں ہو یا نہ ہو۔

اچھا تم اپنا بندوبست کرو اور اپنے سارے شرکا کو جمع کرو، وہ بت ہوں یا آستانے، پھر جو کچھ تم میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو وہ کر گزرو، ہرگز نہ چوکو، کیوں کہ تم اپنے اعتقاد میں حق پر ہو، پھر مجھ کو ایک دم کی بھی مہلت نہ دو، مجھے کچھ تمھارا ڈر نہیں پڑا ہے، کیوں کہ تم کچھ چیز نہیں ہو اور نہ کسی حق بات پر ہو، جس طرح ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ اِنِّيْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ۝ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [هود: ٥٤۔ ٥٦] ”بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ سوائے اللہ کے، چناں چہ تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کر لو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، (زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو، بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے۔“

پھر نوح علیہ السلام نے کہا کہ اگر مجھ کو جھٹلاتے ہو اور اطاعت سے پشت پھیرتے ہو تو میں اس نصیحت پر تم سے کچھ نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ پر ہے، مجھ کو حکم ہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہو جاؤں، سو میں اس حکم کی بجا آوری میں ہوں کہ مسلمان رہوں۔

اسلام سارے انبیا کا دین ہے:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسلام سارے انبیا علیہم السلام کا دین ہے، اول سے آخر تک اگرچہ ان کی شریعتیں اور مناہج (طریقے) الگ اور مختلف قسم کے اور متعدد ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ﴾ [المائدة: ٤٨] ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور طریقہ بنایا۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی سبیلاً وسنۃً۔[1]

یہ نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کے بعد اول انبیا ہیں، انھوں نے کہا: ﴿ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل علیہ السلام کی یہ بات نقل کی ہے: ﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٣١۔ ١٣٢] ”اور جب ابراہیم سے اس کے رب نے کہا: فرماں بردار ہو جا! تو اس نے کہا: میں رب العالمین کا فرماں بردار ہو گیا۔ ابراہیم نے اور یعقوب نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی (کلمۂ حق) کی وصیت کی: اے

[1] تفسير الطبري (١٠/ ٣٨٨) اس کی سند حسن ہے۔

میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ دین چن لیا ہے، پس تمھیں ہرگز موت نہ آئے، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔'' نیز ابراہیم علیہ السلام ہی نے ہمارا نام مسلم رکھا ہے: ﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ ﴾ [الحج: ٧٨] ''اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا۔''

سو ہمارا یہ لقب بہت قدیم ہے اور یوسف علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [یوسف: ١٠١] ''اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے باتوں (خوابوں) کی تعبیر سکھائی ہے، اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔''

نیز موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴾ [یونس: ٨٤] ''اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم فرماں بردار ہو۔'' اور جادوگروں نے کہا تھا: ﴿ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٢٦] ''اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمیں اس حال میں فوت کر کہ ہم مسلمان ہوں۔'' اور بلقیس نے کہا تھا: ﴿ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [النمل: ٤٤] ''اے میرے رب! بے شک (اب تک سورج کی عبادت کر کے) میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، اور (اب) میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی فرماں بردار ہوگئی ہوں۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ﴾ [المائدة: ٤٤] ''بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے ذریعے سے فیصلے کرتے تھے انبیا جو اللہ کی اطاعت کرنے والے تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴾ [المائدة: ١١١] ''اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، تب انھوں نے کہا: ہم ایمان لائے ہیں اور تو گواہ رہ کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں۔''

خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [الأنعام: ١٦٢۔ ١٦٣] ''کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے اس (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔'' یعنی اس امت میں میں پہلا مسلمان ہوں، اسی لیے حدیث میں آیا ہے: « نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أَوْلَادُ عَلَّاتٍ وَدِيْنُنَا وَاحِدٌ »[1] یعنی ہمارا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٦٥)

سب کا دین ایک ہے اور وہ عبادت ہے اللہ وحدہ لاشریک لہ کی، اگرچہ ہماری شریعتیں مختلف ہیں، یہی معنی ہیں اس قول کے: "أَوْلَادُ عَلَّاتٍ" علاتی وہ بھائی ہیں جو مختلف ماؤں سے ہوں اور باپ سب کا ایک ہو۔

جھٹلانے والوں کا انجام اور تصدیق کرنے والوں کا مرتبہ:

بالجملہ جب قومِ نوح نے نوح علیہ السلام کو جھٹلایا تو اللہ نے نوح علیہ السلام کو نجات دی اور جو مومن ان کے ساتھ تھے وہ بھی ناجی ہوئے اور کشتی میں بیٹھ گئے، اللہ نے ان کو زمین کا خلیفہ کیا اور جھٹلانے والوں کو طوفان میں غرق کر دیا۔ تم اے نبی! ذرا نگاہ کرو کہ ان لوگوں کا جن کو نوح علیہ السلام نے ڈرایا تھا، کیا انجام ہوا۔ ہم نے کس طرح مومنین کو بچایا اور مکذبین کو ڈبو دیا۔[1] اے رب! میری دعا بھی تجھ سے اس جگہ یہی ہے کہ ﴿ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۱] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے تیرہ سو برس کچھ اوپر گزر گئے اور اب قیامت سر پر آ گئی ہے، اسلام کی غربت (اجنبیت) انتہا درجہ کو پہنچ گئی ہے۔ گمراہی کے اسباب ہر طرف سے مہیا ہیں اور مسلمانی فقط کتاب میں رہ گئی ہے، سو کتاب کو کوئی پڑھتا اور دیکھتا نہیں اور اگر پڑھے تو بغیر تیری توفیق کے عقیدہ کی درستی اور عمل کی اصلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اے پیغمبر! تم ان ہم عصر کافروں پر جو اقوالِ باطلہ سے تمھارا مقابلہ کرتے ہیں، نوح علیہ السلام کا قصہ پڑھو۔ نبا اس خبر کو کہتے ہیں جو شان دار ہو، مراد قومِ نوح کی بعض گزری ہوئی باتیں ہیں جنھوں نے کفرانِ نوح کیا تھا جس طرح قریش کے کافر ہیں۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر میرا تمھارے پاس ٹھہرنا تم پر بھاری ہے اور میرا اللہ کی نازل کردہ آیاتِ تکوینیہ کا تم کو یاد دلانا تم پر گراں گزرتا ہے تو میں اللہ پر توکل کرتا ہوں، یعنی تمھارے اس جھٹلانے کے مقابلے میں توکل کروں گا، اب تم جو چاہو سو کرو، جو کچھ تم سے ہو سکے وہ سب سامان جمع کر لو اور اپنی مدد کے لیے اپنے شرکا کو بھی بلا لو۔ اس جگہ شرکا سے مراد بت ہیں، بت اگرچہ بے حس اور بے عقل ہیں، لیکن ان کو شرکا ڈانٹ اور ڈپٹ کے طور پر کہا۔ پھر یہ کام تم چھپا کر نہ کرو، بلکہ ظاہری طور پر پورے انکشاف کے ساتھ کرو۔ ہیثم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غُمَّہ سے مراد ابہام ہے[2] اور بعض نے کہا ہے کہ ضیقِ امر (تنگی)۔

پھر جو کچھ تم میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو وہ مہلت دیے بغیر کر گزرو، دیر نہ کرو۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ نوح کو اپنے رب پر کمال درجے کا اعتماد تھا کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا اور انھیں کامیابی عطا فرمائے گا۔ ان کو قوم کی دھمکیوں کی کچھ پروا نہ ہوئی۔

پھر نوح علیہ السلام نے یہ بھی سنا دیا کہ میں جو شریعت لایا ہوں اور تم کو نصیحت کرتا ہوں، یہ کسی لالچ سے نہیں ہے اور

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۵۵۔ ۵۵۶)
[2] فتح القدیر (۲/ ٦٤٧)

نہ اس میں میری کوئی ذاتی غرض اور طمع ہے، بلکہ میں اس کام کا اجر اللہ پر رکھتا ہوں، کچھ تم سے مزدوری یا اجرت نہیں مانگتا اور مجھ کو حکم ہے کہ میں مسلمان رہوں، یعنی اللہ کے حکم محکم کا تابع اور فرماں بردار رہوں اور جو عمل کروں وہ خالص اللہ کے لیے کروں، اس میں کسی مخلوق سے کوئی طمع اور غرض نہ ہو، لیکن قوم نے ان کی بات نہ سنی اور بدستور اپنی تکذیب پر اڑے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے نوح علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں کو جو ان کے دین پر تھے، بچا لیا۔ یہ اسّی لوگ تھے، چالیس مرد اور چالیس عورتیں، اللہ نے ان کو زمین کا خلیفہ کر دیا، جو لوگ غرق ہونے سے ہلاک ہو گئے، ان کی جگہ ان کو بسا دیا، باقی جھٹلانے والوں کو طوفان سے ہلاک کر دیا۔

پہلے نجات اور خلیفہ بنانے کا ذکر کیا، پھر انجاء (نجات دلانے، چھٹکارہ دلانے) کا جس طرح کہ دوسرے قصے میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيٰرِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴾ [هود: ٩٤] ''اور جب ہمارا حکم (عذاب) آیا تو ہم نے نجات دی شعیب کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے، اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں زبردست چیخ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔''

اس میں نجات پانے والوں کے لیے کمال عنایت کا اظہار ہے اور سننے والوں کے لیے مسرت ہے اور اللہ کی رحمت کا غضب پر سبقت لے جانے کا اظہار ہے اور اس کہنے میں کہ اے پیغمبر! تم دیکھو کہ ان ہلاک ہونے والوں کا کیا انجام ہوا، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے اور مشرکین کے لیے ڈر ہے اور انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والوں کو خوف میں ڈالنا ہے۔[1]

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۷۴

پھر ہم نے اس (نوح) کے بعد کئی رسول ان کی (اپنی اپنی) قوم کی طرف بھیجے، چناں چہ وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے، تو (پھر بھی) نہ ہوئے کہ وہ اس (ہدایت) پر ایمان لے آتے، جسے وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم حد سے گزرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں (74)

نوح علیہ السلام کے بعد رسولوں کا سلسلہ، قوموں کا رویہ اور انجام:

یعنی اللہ نے نوح علیہ السلام کے بعد لوگوں کی طرف اور بہت سے رسول بھیجے اور وہ رسول رسالت کی سچائی پر بہت سی حجتیں، دلائل اور براہین لے کر آئے، لیکن یہ قومیں کب مانتی ہیں۔ اپنی اسی ہٹ پر جمی رہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے

[1] فتح البیان (٦/ ٩٨۔ ١٠٢)

ارشاد فرمایا: ﴿ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ''اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔''

سو جس طرح اللہ نے پہلے مکذبین کے دلوں پر مہر لگا دی تھی اسی طرح ان پچھلوں کے دلوں پر بھی مہر لگا دیتا ہے، یہ بھی جب تک عذاب کو نہ دیکھ لیں ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے رسولوں کو جھٹلانے والی امتوں کو ہلاک کر دیا اور ان میں سے جو ایمان لائے تھے ان کو بچا لیا اور یہ کارروائی نوح علیہ السلام کے بعد ہوتی رہی، کیوں کہ نوح علیہ السلام کے زمانے سے پہلے آدم علیہ السلام سے لے کر بتوں کی پرستش شروع ہونے کے زمانے تک لوگ مسلمان تھے۔ جب بت پرستی نکلی تو اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کو بھیجا، اسی لیے لوگ قیامت کے دن نوح علیہ السلام سے کہیں گے کہ «أَنْتَ أَوَّلُ رَسُوْلٍ بَعَثَهُ اللّٰهُ إِلَى الْأَرْضِ»[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن تھے، یہ سب کے سب اسلام پر تھے[2] اور اللہ نے کہا: ﴿ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ﴾ [بني إسرائيل: ١٧] ''اور ہم نے نوح کے بعد کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں۔'' اس بیان میں مشرکینِ عرب کو ایک بڑا ڈراوا ہے جنھوں نے سید الرسل خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی ہے، کیوں کہ جن لوگوں نے پہلے رسولوں کو جھٹلایا تھا، ان کو عذابِ الٰہی پہنچ چکا ہے، تو اب یہ کس خیال میں پڑے ہیں اور کیا گمان کرتے ہیں، حالانکہ یہ پہلے لوگوں سے زیادہ کبیرہ گناہوں اور شرک کے مرتکب ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جن رسولوں کو نوح علیہ السلام کے بعد اللہ نے بھیجا ان کا نام نہیں لیا، سو یہ رسول ہود، صالح، ابراہیم، شعیب اور لوط علیہم السلام تھے۔ یہ سب معجزے اور واضح دلائل لے کر آئے اور جو شریعت اللہ نے جس قوم کے لیے مقرر کی تھی وہ لائے، لیکن ان قوموں نے ایمان قبول نہ کیا، اپنے کفر و شرک اور گناہوں پر بدستور جمے رہے، کیوں کہ وہ پہلے سے رسولوں کی تکذیب کر چکے تھے، سو اللہ تعالیٰ کا زیادتی کرنے والوں کے دلوں پر مہر کرنا اسی طرح پر ہوتا ہے، اللہ ان کو مخذول (رسوا) کر دیتا ہے کہ یہ جانیں اور ان کا کام جانے، یہ اپنی گمراہی اور ضلالت میں منہمک رہتے ہیں۔[3]

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح اللہ نے اس امت کے معتدین کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ معتدین سے مراد مبتدعین (بدعتی) ہیں جو پیر پرستی، قبر پرستی، آثار پرستی، تقلید پرستی، بدعت پرستی اور اس طرح کے دوسرے کام کرتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٨٠) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [3] فتح البيان (٦/ ١٠٢۔ ١٠٣)

ہیں اور دینِ حق اور اسلام اور ہدایت کی راہ پر چلنے سے کنارہ کش رہتے ہیں اور شرعی حدود سے تجاوز کر کے باطل عقیدوں میں منہمک ہو گئے ہیں، اس لیے ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے اور ختم دَرین اور دلوں پر مہر لگنے کی نوبت درجۂ کمال تک آ گئی ہے۔ فَإِنَّا لِلّٰهِ عَلٰى غُرْبَةِ الْإِيْمَانِ، وَذَهَابِ الْإِسْلَامِ، وَإِقْبَالِ الْبِدَعِ وَالْإِشْرَاكِ.

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ
بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ
الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ مُوْسٰۤى
اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ
السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا
وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾

پھر اس کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کی طرف بھیجا تو انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے (75) پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو انھوں نے کہا: بے شک یہ تو یقیناً کھلا جادو ہے (76) موسیٰ نے کہا: کیا تم حق کے بارے میں (یہ) کہتے ہو جب وہ تمھارے پاس آ گیا؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو فلاح نہیں پاتے (77) انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمیں اس (طریقے) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور تم دونوں کے لیے زمین میں اقتدار ہو؟ جب کہ ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں (78)

موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور فرعون کا واقعہ:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے ان رسولوں کے بعد جو نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے، موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس اور اُس کے گروہ کے پاس بھیجا تھا، وہ ہماری حجتیں اور دلیلیں لے کر اُس لعین کے پاس گئے تھے، کیوں کہ وہ مجرم قوم تھی، انھوں نے تکبر کی وجہ سے حق کا اتباع نہ کیا، بلکہ اکٹھے اس بات پر قسم کھائی کہ جو کچھ یہ دونوں لائے ہیں، یہ جادو ہے، حالانکہ وہ دل میں خوب جانتے تھے کہ یہ ان پر ہمارا صاف کذب اور بہتان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ [النمل: ١٤] ''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا، جب کہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا۔ پھر دیکھیے فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟''

موسیٰ علیہ السلام نے بطور انکار کے کہا کہ کیا تم اس رسالت کو جادو کہتے ہو، حالانکہ جادوگر کبھی مراد کو نہیں پہنچے۔ اُس پر قوم نے کہا کہ کیا تو ہم کو ہمارے باپ دادا کی راہ سے پھیرنے کو آیا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ زمین میں تیری ہی ریاست وعظمت ہو، سو ہم تمھاری باتوں کو قبول نہیں کرتے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ قرآن عزیز میں بہت جگہ بیان فرمایا ہے، اس لیے کہ یہ قصہ بہت عجیب ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے خوب ہی حذر (بچاؤ) کیا، لیکن تقدیر نے اس کو پکڑ لیا۔ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے بستر اور دستر خوان پر ایک بیٹے کی طرح پرورش کرائی، پھر جب وہ سیانے ہو گئے تو اللہ پاک نے ایک ایسا سبب کھڑا کر دیا جس کی وجہ سے وہ فرعون کی قوم کے درمیان سے نکل کر باہر ہو گئے۔ پھر ان کو نبوت اور رسالت دی اور ان سے باتیں کیں اور فرعون کی طرف مبعوث کیا (بھیجا) تاکہ اس کو اللہ کی عبادت کی طرف بلائیں اور دینِ حق اور توحیدِ خالص کی طرف رغبت دلائیں، حالانکہ فرعون بڑی مملکت اور سلطنت کا مالک تھا اور جب موسیٰ علیہ السلام رسول بن کر اس کی طرف آئے تو بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کے سوا ان کا کوئی وزیر نہ تھا۔

فرعون نے ان کی بات نہ سنی اور انھیں حقیر اور فقیر جان کر سرکشی اور تکبر کیا اور اس لعین کو حمیتِ جاہلیت اور نفسِ خبیث نے خوب پکڑا اور سرکش ہو گیا، اپنے غرور کی بنا پر ایسا دعویٰ کیا جو اس کو زیب نہیں دیتا تھا اور اللہ تعالیٰ پر سرکشی کرنے والا اور بغاوت کرنے والا بن گیا اور ایمان والوں کی توہین کی۔ اللہ نے موسیٰ و ہارون کو اس کے شر سے محفوظ رکھا اور اپنی چشمِ بے خواب سے اس کی نگہبانی اور حفاظت فرمائی اور ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر یکے بعد دیگرے اپنی حجتوں اور نشانیوں کو جاری رکھا۔

یہ وہ نشانیاں تھیں جن سے عقل حیران ہوتی تھی اور ہوش اڑ جاتے تھے، سوائے اس شخص کے جس کو اللہ کی تائید حاصل ہو، کوئی دوسرا شخص ویسی نشانی نہیں لا سکتا تھا: ﴿ وَمَا نُرِيهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ﴾ [الزخرف: ٤٨] ''اور ہم انھیں جو بھی نشانی دکھاتے تھے، وہ اس جیسی (پہلی نشانی) سے زیادہ ہی بڑی ہوتی تھی۔'' فرعون اور اس کے دوستوں اور ارکینِ سلطنت نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کا پکا ارادہ کر لیا تھا اور ان کے ساتھ انکار، دشمنی اور مقابلے پر خوب کمر باندھ لی، یہاں تک کہ اللہ نے ایسا عذاب بھیجا کہ جو واپس نہ ہو سکے اور ایک ہی صبح کو فرعون لعین اور اس کے ساتھ ساتھیوں کو دریائے نیل میں ڈبو کر واصلِ جہنم کر دیا۔[1] ﴿ مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ﴾ [نوح: ٢٥] ''وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کیے گئے، پھر دوزخ میں داخل کیے گئے۔''

گلستان کند آتشے بر خلیل گروہے بآتش بروز آب نیل

''ایک آگ خلیل پر گلشن بن جاتی ہے اور ایک دن نیل کا پانی ایک گروہ پر آگ (دوزخ) بن جاتا ہے۔''

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٥٧)

اللہ کی حکمت دیکھو کہ اپنے دوست موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اور ان کے دشمن کے ہاتھ سے پرورش کرایا، پھر اسی درست کے ہاتھ سے اس دشمن کا سر تڑوایا۔

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد خمیر مایہ دکان شیشہ گر سنگ ست

''اگر اللہ چاہے تو دشمن بھلائی کا سبب بن جاتا ہے، جس طرح شیشہ گر دکان کا اصل سرمایہ پتھر ہی ہوتا ہے۔''

﴿ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٤٥] ''پھر اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر باوجودیکہ وہ رسل متقدمین میں داخل تھے، محض ان کی مزید بزرگی اور شان کے لیے ہے۔ مَلا سے مراد قوم کے شرفا ہیں یا صرف قوم کے عام لوگوں میں سے بطور خاص کے کچھ افراد ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ کی طرز جلالین میں اسی طریقے سے ہے۔[1] آیات سے مراد وہ نو معجزے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں کیا ہے۔ استکبار سے مراد حق کو قبول نہ کرنا اور تواضع و انکساری کا نہ ہونا ہے۔ استکبار کہتے ہیں بغیر استحقاق کے تکبر کرنا۔ یہ قوم بڑی گناہ گار، نابکار اور غدار تھی، اسی سبب سے حق کو رد کرنے اور رسالت کے ساتھ طرد (دوری اختیار کرنے) کی جسارت کی، کیوں کہ گناہ حق کے سمجھنے اور گناہ گار کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور آنکھیں صحیح راستہ دیکھنے سے قاصر ہو جاتی ہیں۔

بالجملہ انھوں نے نو عدد معجزات دیکھ کر یہ کہا کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے، سو ان کا یہ انکار ایک قسم کا مکابرہ (تکبر) تھا کہ ان آیات کو دیکھ کر ایمان تو نہ لائے، بلکہ ان کو جادو بتانے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس بہتان کے جواب میں تین جملے کہے: ایک یہ کہ جب تمھارے پاس حق آیا تو تم یہ کہتے ہو کہ یہ جادو ہے، سو یہ بات نہ کہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس کو سحر مبین بتاتے ہو، حالانکہ تم کو اس کا یقین کر لینا چاہیے تھا، یہ تو سحر سے بہت دور ہے اور تیسرے یہ کہ ساحر کامیاب نہیں ہوتا، نہ اس کو اس کی مطلوبہ چیز ملتی ہے اور نہ وہ بھلائی کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے اور نہ مکروہ سے نجات پانے والا۔ سو ایسے معاملے میں وہ شخص جو اللہ پاک کا بھیجا ہوا ہے اور اس کو معجزات و براہینِ واضحات کی تائید حاصل ہے، کب گرفتار ہو سکتا ہے، کیوں کہ جادو کا حاصل بھی تمویہ (چکنی چپڑی باتیں اور ملمع کاری) اور طرح طرح کے خیالات پیدا کرنا ہے اور ملمع کار صحیح نہیں ہوتا، ایک نہ ایک دن اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔

تقلید کی مذمت:

بالجملہ موسیٰ علیہ السلام نے انکار بعد انکار کے اور بار بار کی سزاؤں اور تجہیل کے بعد ایسا ہی کلام کیا اور جب موسیٰ علیہ السلام

[1] تفسیر الجلالین (١/ ٢٧٨)

نے یہ فرمایا تو ان کی قوم نے کہا کہ کیا تو اس لیے ہمارے پاس آیا ہے کہ جس راستے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے تو ہم کو اس راہ سے بے راہ کر دے اور ہم ان کی تقلید چھوڑ کر تیری پیروی شروع کر دیں۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ وہ دلیل سے منقطع اور واضح حجت سے عاجز نکلے اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو رد کرنے کے لیے انھیں کوئی صحیح جواب نہ ملا، بالآخر انھوں نے وہ بات کی جو جاہل لوگ کہا کرتے تھے، یعنی کفر و شرک میں اپنے آبا و اجداد کی راہ و رسم کو حجت پکڑنا پھر اس کے ساتھ اپنی غرض بھی شامل کر لی، جو انھیں بہت زیادہ پسند تھی، یعنی اس مقابلے اور انکار کا سبب ان کی دنیا کی ریاست تھی، ان کو خوف تھا کہ اگر ہم ان کے کہنے پر چلیں گے تو یہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس جگہ کیا خوب صورت عبارت لکھی ہے: ”كَمْ لَقِيَ عَلَى الْبَاطِلِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ بَاطِلٌ بِهٰذِهِ الذَّرِيْعَةِ مِنْ طَوَآئِفِ هٰذَا الْعَالَمِ فِيْ سَابِقِ الدَّهْرِ وَلَاحِقِهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ حَبَسَهُ ذٰلِكَ عَنِ الْخُرُوْجِ مِنَ الْكُفْرِ وَمِنْهُمْ مَنْ حَبَسَهُ عَنِ الْخُرُوْجِ إِلَى السُّنَّةِ مِنَ الْبِدْعَةِ وَإِلَى الرِّوَايَةِ الصَّحِيْحَةِ مِنَ الرَّأْيِ الْبَحْتِ“[1] امام ابو السعود مفسر حنفی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ آیت استیناف بیانی (بیان کی ابتدا) ہے، اس بیان کے لیے آئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے منہ میں پتھر کا لقمہ دے دیا، وہ ایسے کلام کو لائے سے، جس کا تعلق کلامِ موسوی سے ہو، منقطع ہو گئے، پھر صحیح جواب دینے کا کیا ذکر اور مضطر ہو کر تقلید کو پکڑا جو دلائل سے ہر عاجز آ جانے والے اور ہر عناد رکھنے والے کا سہارا ہوتا ہے۔[2]

اس آیت سے ثابت ہوا کہ مذہب کی تقلید کرنا اور آبا کے راہ و رسم پر جمود کرنا اہلِ کتاب کا شیوہ ہے، یعنی یہود و نصاریٰ کا۔ اسی لیے سب سے پہلے ہمارے امام ہمام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے تقلیدِ مذہب سے منع فرمایا ہے عموماً و خصوصاً۔ خصوص کے یہ معنی ہیں کہ جب تک امام کے قول کی سند کتاب و سنت سے معلوم نہ ہو، تب تک کسی کو حلال نہیں کہ ان کے قول کی تقلید کرے، پھر جو علما آخری حنفی طبقے سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی تقلید سے منع کرتے آئے ہیں، اسی طرح باقی تینوں ائمہ کرام اور ان کے ائمہ مذہب نے تقلید کو بدعت اور بعض نے شرک کہا ہے۔ ان اہلِ علم کے اقوال اصول و فروع کے رسالوں اور کتابوں میں مدون ہیں اور آرائے رجال اور تقلید پر لکھی جانے والی کتابوں میں منقول ہیں اور پورے قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ میں کہیں ایک حرف بھی ایسا نہیں جو تقلید کے جواز پر صریح دلیل ہو، چہ جائے کہ وجوب پر۔

اگر ہے تو مقلدین، جو تقلید کو واجب سمجھتے ہیں، براہِ کمال عنایت و توجہات ہم کو اس دلیل اور برہان سے مطلع فرمائیں، لیکن ردِ تقلید پر لکھے جانے والے رسائل کی طرف رجوع کرنے اور ظلم کو ترک کرنے کے بعد، وگرنہ صرف قیل و قال اور خلل سے پر استدلال کو ہم موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آلِ فرعون کے جواب کے مثل سمجھیں گے۔ اس

[1] فتح القدير (٢/ ٦٥١) [2] تفسير أبي السعود (٤/ ١٦٩) فتح البيان (٦/ ١٠٣۔ ١٠٥)

مسئلے کی بحث زمانہ حال میں رواج پانے والی تقلید عرفی کذائی اصطلاحی میں ہے نہ کہ سابق صالح لوگوں کی سیرت کی اور نہ ہی علمائے دین کی اتباع میں اور احادیثِ نبوی ﷺ اور آثارِ صحابہ کو قبول کرنے میں کہ یہ معانی تقلید سے دور ہیں اور بالجملہ فرعون کی قوم نے تقلید کے بیان کے بعد یہ بھی کہا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ یہ عظمت حکومت اور سلطنت زمین میں تمھارے لیے ہو، سو ہم تمھاری بات کو نہ مانیں گے، یہ تکذیب کرنے کی صراحت ہے اور اُن کے ایمان میں کسی قسم کے طمع کے نہ ہونے کی، یہ قصہ سورت اعراف میں گزر چکا ہے۔[1]

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

اور فرعون نے کہا: تم میرے پاس ہر ماہر جادوگر کو لے آؤ (79) پھر جب تمام جادوگر آگئے تو ان سے موسیٰ نے کہا: ڈالو جو کچھ تم ڈالنے والے ہو (80) پھر جب انھوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: جو کچھ تم لائے ہو (یہ) جادو ہے۔ بے شک اللہ جلد اسے باطل کر دے گا۔ بے شک اللہ فساد کرنے والوں کا کام نہیں سنوارتا (81) اور اللہ حق کو اپنے کلمات کے ساتھ ثابت کرتا ہے، اگرچہ مجرم لوگ ناپسند کریں (82)

موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا مقابلہ:

اللہ تعالیٰ نے جادوگروں کا قصہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سورت اعراف میں ذکر کیا ہے،[2] وہاں اس کے بارے میں کلام ہو چکا ہے اور اس سورت اور سورت طٰہٰ اور شعرا میں بھی اس قصے کا ذکر کیا گیا ہے،[3] بات یہ تھی کہ فرعون ۔لعنہ اللہ۔ نے لوگوں پر فریب دہی کا ارادہ کیا تھا اور جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے اس حق مبین کا مقابلہ کرانا چاہا تھا جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔ اس کا وہ نظام اسی پر الٹ پڑا اور اس کا مقصد حاصل نہ ہوا اور براہینِ الٰہیہ غالب آئے اور اس محفلِ عام میں حق ظاہر ہو گیا، سارے جادوگر سجدے میں گر پڑے اور ﴿ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۲۱۔ ۱۲۲] ''ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔'' کہنے لگے۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر جادوگروں سے مدد لے کر غالب آنے کا گمان کیا تھا، وہ جنت سے خائب و خاسر ہو کر نار کا مستحق ہو گیا اور کہا ہر ساحر علیم کو میرے پاس لاؤ۔ جب سب جادوگر حاضر ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ جو کچھ تم کو

---

[1] رقم الآية [۱۰۳] [2] رقم الآية [۱۰۷] [3] سورت طٰهٰ: رقم الآية [۵۷] سورة الشعراء، رقم الآية [۳۴]

ڈالنا ہو ڈالو، یہ اس لیے کہ فرعون نے ان کا انتخاب کیا تھا اور اپنے تقرب اور عطا کا وعدہ دیا تھا۔ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تم ڈالو یا ہم ہی پہلے ڈالیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: بلکہ تم ہی ڈالو، یہ اس لیے کہ ابتدا ان کی طرف سے ہو، تاکہ لوگ ان کی کاریگری کو دیکھیں، پھر اس کے بعد حق لائیں، وہ ان کے باطل کو نیست و نابود کر دے۔

اسی لیے جب انھوں نے اپنا سحر ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کا پردہ پڑ گیا اور اس نظر بندی سے سب کو ڈرا دیا اور ایک ایسا بڑا جادو لائے کہ موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے جی میں جھجک گئے۔ اللہ نے کہا: اے موسیٰ! تم مت ڈرو، تمھارا ہی بول بالا رہے گا، یہ عصا جو تمھارے ہاتھ میں ہے، اس کو ڈال دو، یہ ان کے کیے ہوئے کو چٹ کر لے گا، یہ تو ایک جادو کا مکر ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے اور اب تمھارے اس جادو کو اللہ باطل کر دے گا، اللہ تعالیٰ مفسدوں کے عمل کو درست نہیں کرتا اور سچ ہی کو اپنے کلمات سے سچ کر دکھاتا ہے، اگرچہ گناہ گار ناپسند کریں۔

جادو کا توڑ:

لیث بن ابی سلیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ اذن اللہ سے جن آیات سے سحر سے شفا حاصل ہوتی ہے، ایک پانی کے برتن پر پڑھ کر اس کے سر پر وہ پانی ڈال دیا جائے جسے جادو کیا گیا ہو تو جادو کا اثر جاتا رہے گا، یعنی ﴿فَلَمَّآ اَلْقَوْا﴾ سے ﴿اَلْمُجْرِمُوْنَ﴾ تک۔ دوسری آیت یہ ہے: ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الأعراف: ١١٨] سے لے کر چار آیتیں اور اللہ کا یہ فرمان: ﴿اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى﴾ اس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ فرعون نے ید بیضا اور عصا دیکھ کر کہا کہ میرے پاس ہر ساحر علیم کو لاؤ، یہ اس اعتقاد پر کہا کہ اس نے ان دونوں معجزوں کو جادو سمجھا اور یہ سوچا کہ جادوگر اس کا مقابلہ کر لیں گے، اس وقت لوگ سمجھ جائیں گے کہ یہ موسیٰ کا جادو ہے۔ لفظ ساحر کو سحار بصیغہ مبالغہ بمعنی کثیر السحر بھی پڑھا ہے۔ غرضیکہ جب وہ سب جادوگر آئے اور انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم ڈالو یا ہم ڈالیں تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ رسیاں اور لاٹھیاں جو تمھارے پاس ہیں تم ہی ان کو پہلے زمین پر ڈالو، تاکہ حق اور باطل ظاہر ہو جائے اور لوگ جان لیں کہ تمھارا یہ عمل فاسد اور مٹ جانے والا ہے۔ جب انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ تو جادو ہے، جو تم لائے ہو، یعنی اس عمل کا حال ظاہر ہے، کچھ پروا کرنے کے لائق نہیں، اب اللہ اس باطل کو بالکل مٹا دے گا اور محو کر دے گا اور اس کا باطل

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٧٤)

ہونا ظاہر ہو جائے گا، اس کا نشان بھی باقی نہ رہے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے کام سنوارتا نہیں ہے۔ یہ لفظ ہر مفسد کو شامل ہے اور اس میں یہ جادوگر بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں۔ اور جو بات سچی ہے اللہ نے اپنے کلمات سے جو انبیا پر منزل کتابوں نازل فرمائے ہیں اس کا سچ واضح اور آشکار کر دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ کتابیں حجتوں اور براہین پر مشتمل ہیں یا ان میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سچا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے۔ یا فیصلہ تقدیر میں پہلے سے موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب رہیں گے اور اسی طرح کی بات، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ مجرمین سے مراد آلِ فرعون ہیں یا عام لوگ اور آلِ فرعون اس میں شامل ہے، بدرجۂ اولیٰ، جرم بہ معنی گناہ ہے۔[1]

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۸۳

چناں چہ موسیٰ پر اس کی قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کوئی بھی ایمان نہ لایا، فرعون اور اس کے درباریوں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ انھیں فتنے میں نہ ڈال دے، اور بے شک فرعون سرزمین (مصر) میں سرکش (بنا ہوا) تھا اور بے شک وہ حد سے گزرنے والوں میں سے تھا (83)

فرعون اور اس کے درباریوں کے خوف سے صرف چند لوگ ہی مسلمان ہوئے:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ باوجود ایسی آیاتِ بینات اور قطعی حجتوں اور براہین کے جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے، ایمان نہ لائے ان پر، مگر تھوڑے لوگ فرعون کی قوم کی ذریت میں سے، یعنی جوان لوگ۔ سو وہ بھی فرعون اور اس کی حکومت کے ارکان سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں پھر ہم کو اسی کفر کی طرف نہ پھیر دیں، کیوں کہ فرعون لعین ایک ستم گار، جبار، عنید، مسرف فی التمرد اور عالی و طاغی و باغی تھا اور سطوت اور مہابت رکھتا تھا اور اس کی رعیت اس سے سخت ڈرتی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ذریت جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی تھی، بنی اسرائیل کے لوگ نہ تھے، بلکہ فرعون کی قوم سے تھے۔

ان سب میں سے ایک فرعون کی بیوی بھی تھی اور آلِ فرعون کے مومن اور فرعون کا خازن اور خازن کی بیوی تھے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ذریت بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کے قول کے تیسرے الفاظ یہ ہیں اور امام ضحاک اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ ذریت سے مراد تھوڑی مقدار ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان لوگوں کی اولاد تھی جن کی طرف موسیٰ علیہ السلام زمان دراز سے رسول ہو کر آئے تھے اور ان کے آبا مر چکے تھے، اسی کو

---

[1] فتح البیان (٦/ ١٠٦۔ ١٠٧)

ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے کہ وہ ذریت بنی اسرائیل سے تھی نہ کہ قوم فرعون سے، ضمیر کو سب سے پہلے ذکر کیے جانے والوں کی طرف پھیرا ہے۔[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ ذریت سے مراد احداث و شباب، یعنی نوجوان لوگ ہیں، سو وہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور معروف یہ ہے کہ بنی اسرائیل سب کے سب ایمان لے آئے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے خوش تھے، کیوں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی تعریف اور صفات کو پہچانتے تھے اور پہلی کتابوں میں ان کی بشارت دیکھ چکے تھے۔ اور ان کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے سبب سے ان کو فرعون کی قید سے رہائی دے گا اور وہ فرعون پر غالب آئیں گے، اسی لیے جب یہ خبر فرعون کو پہنچی تو اس نے اپنا بہت کچھ بچاؤ کیا، لیکن کچھ کام نہ نکلا اور جب موسیٰ علیہ السلام آئے تو فرعون نے بنی اسرائیل کو اور زیادہ ستانا شروع کیا، انھوں نے کہا: ﴿ اُوْذِیْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِیَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ یَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۲۹] ''ہمارے پاس تمھارے آنے سے پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا: امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

چنانچہ جب یہ بات ٹھہری تو اب ذریت سے مراد یہی قوم موسیٰ کے لوگ کیوں کر ہوں گے، یہ تو فرعون سے خوف زدہ و ترساں و لرزاں تھے اور قوم فرعون سے ڈرتے تھے کہ کہیں پھر اسی بلا میں گرفتار نہ کریں اور بنی اسرائیل میں سے کوئی اپنے ایمان پر خائف نہ تھا مگر قارون کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا اور ان پر باغی تھا اور درِ پردہ فرعون سے ساز باز رکھتا تھا۔ اور جس نے یہ کہا کہ ﴿ مَلَا۟ئِهِمْ ﴾ کی ضمیر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف لوٹتی ہے اس کے متبعین کی کثرت اور آلِ فرعون کے خلاف ہونے کی وجہ سے اور مضاف الیہ قائم مقام مضاف ہے، وہ بہت دور گیا۔ اگرچہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان دونوں تاویلوں کو نحویوں سے روایت کیا ہے[2] اور اس بات پر ایک دلیل اگلی آیت ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نہ تھا مگر مومن۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ذریت کا اطلاق تھوڑے لوگوں پر ہوتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ مراد کم عمر اور قلیل لوگ ہیں۔ ﴿ قَوْمِهٖ ﴾ کی ضمیر موسیٰ علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے، یہ ایک گروہ تھا بنی اسرائیل کی اولاد میں سے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فرعون کی اولاد میں سے ہیں، اس صورت میں ضمیر فرعون کی طرف لوٹے گی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک

[1] تفسیر الطبري (۱۵/ ۱۶۳۔ ۱۶۵) [2] تفسیر الطبري (۱۵/ ۱۶۶۔ ۱۶۷) [3] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۵۸)

قبطی قوم تھی جن کے آبا قبط میں اور مائیں بنی اسرائیل میں سے تھیں۔

یہ قول امام فراء رحمہ اللہ کا ہے، جس طرح کہ فارس کی اولاد کو جو یمن میں آ کر بس گئی تھی، ابناء کہتے ہیں اس لیے کہ ان کی امہات جنس آبا سے نہ تھیں، بہرحال وہ اس ایمان لانے سے فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرے ہوئے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ قومِ فرعون بھی فرعون کہلاتی تھی، مثل ثمود کے۔ اس اعتبار سے ضمیر ان کی طرف راجع ہے یا مضاف محذوف ہے، یعنی عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ میں آلِ فرعون۔

یہ امام فراء رحمہ اللہ سے مروی ہے، لیکن امام خلیل اور سیبویہ رحمہما اللہ نے اس سے انکار کیا ہے اور امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر ذریت کی طرف عائد ہے۔ اس کو نحاس رحمہ اللہ سے قوی بتایا ہے۔[1] ڈر اس بات کا تھا کہ کہیں عذاب میں گرفتار کر کے اس دینِ حق سے پھیر نہ دیں، کیوں کہ زمینِ مصر میں فرعون متکبر و متغلب اور سرکش تھا اور کفر میں حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ قتل کرتا تھا، سولی پر چڑھاتا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا۔ یا اس کو مسرف اس لیے کہا کہ بندہ ہو کر رب ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔[2]

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

اور موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم فرماں بردار ہو (84) چناں چہ انھوں نے کہا: ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے۔ اے ہمارے رب! تو ہمیں ظالم قوم کے ہاتھوں آزمایش میں نہ ڈال (85) اور تو ہمیں اپنی رحمت کے ساتھ کافر قوم سے نجات دے (86)

موسیٰ کا قوم کو اللہ پر بھروسا رکھنے کا حکم:

اللہ نے خبر دی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے یہ بات کہی کہ اگر تم ایمان دار ہو تو اللہ پر توکل کرو، اللہ تعالیٰ توکل کرنے والے کو کافی اور اس کا وکیل ہوتا ہے: ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ [الزمر: ٣٦] ”کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ [الطلاق: ٣] ”اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔“

اللہ تعالیٰ اکثر جگہ عبادت اور توکل کو ساتھ ساتھ بیان فرماتا ہے، جیسے اس کا ارشاد ہے: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ١٢٣] ”چناں چہ آپ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں۔“ نیز فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا

[1] تفسير القرطبي (٨/ ٣٦٩_ ٣٧٠) [2] فتح البيان (٦/ ١٠٨)

﴿ بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ﴾ [الملك: ٢٩] ''کہہ دیجیے: وہ رحمان ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔''
نیز فرمایا: ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ [المزمل: ٩] ''(وہ) مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے۔''

اور اللہ نے مومنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں صبح کے وقت اور شام کے وقت ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٥] ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔'' کہا کریں، بنی اسرائیل سے اس امر کا امتثال کیا اور کہا کہ ہم نے اپنے رب پر توکل کیا، پھر یہ دعا مانگی کہ اے ہمارے رب! تو ہم کو ظالم قوم کا فتنہ نہ کر، یعنی ہم پر ان کو کامیابی نہ دے اور مسلط نہ فرما کہ کہیں وہ گمان کریں کہ ان کو یہ غلبہ اس لیے ہوا کہ وہ حق پر ہیں اور ہم باطل پر۔ پھر اس ظن سے فتنہ میں پڑ جائیں۔ امام ابومجلز اور ابو الضحیٰ رحمہما اللہ سے اسی طرح مروی ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ہمیں آلِ فرعون کے ہاتھوں سے عذاب نہ دے اور نہ تو خود ہم کو عذاب کر کہ قومِ فرعون یہ کہنے لگے کہ اگر یہ لوگ حق پر ہوتے تو عذاب نہ کیے جاتے اور نہ ہم ان پر مسلط ہوتے اور ہمارے سبب سے یہ فتنے میں پڑ جائیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اے رب! تو ہم کو ان پر مسلط نہ کر کہ یہ ہم کو فتنہ میں ڈالیں،[1] بلکہ ہم کو اپنی رحمت سے اس کافر قوم کے پھندے سے رہائی بخش، ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے تجھ پر بھروسا کیا ہے۔

نواب صاحب کا ذاتی واقعہ:

میں کہتا ہوں: ۱۳۰۳ھ میں مجھ پر اہلِ کتاب کے حکام کی طرف سے ایک عظیم الشان خوف طاری ہوا تھا، میری اسیری اور نہب اور جلاوطنی کی خبر نے شہرت پکڑی، جب مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے کہا: ﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (آیتِ باب) اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا، کسی شخص سے امداد نہ چاہی اور نہ یہ ذکر کیا۔ اللہ نے اپنی رحمت سے مجھ ضعیف بے قوت کو اس ظالم ستم گر کے ہاتھ سے بچا لیا، لیکن دارو گیر کا خوف چند روز تک باقی رہا، یہاں تک کہ ماہِ شعبان ۱۳۰۳ھ میں ایک دن صبح کی نماز کے وقت آنکھ کھلی تو یہ الفاظ زبان پر تھے: ﴿ لَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴾ [القصص: ٣١] ''نہ ڈر، بلاشبہہ تو امن والوں میں سے ہے۔''

چنانچہ اس دن سے اللہ نے میرے دل کو اطمینان بخشا اور جب سے اب تک میں بحمدہ تعالیٰ مامون بامنِ ربانی ہوں، اسی ماہ و سال میں دوسری دفعہ صبح کے وقت آنکھ کھلی تو یہ آیتِ شریفہ زبان پر تھی: ﴿ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٧٠] ''اور انھوں نے اس (ابراہیم) کے ساتھ فریب کا ارادہ کیا تو ہم نے انھیں انتہائی خسارے والے بنا دیا۔'' اس کی تاویل اب ان شاء اللہ شروع ہو چکی ہے۔ وللہ الحمد.

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ١٦٩۔ ١٧٠)

اس مقام پر یہ حکایت میں نے اس لیے لکھی ہے کہ جب کوئی بندۂ مسلمان، اگرچہ گناہ گار اور نافرمان ہو، کسی خوف و حادثے کے وقت اللہ پر ایمان و احتساب کے طور پر بھروسا کرتا ہے اور کسی مخلوق پر اپنا دردِ دل ظاہر نہ کر کے: ﴿ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [يوسف: ٨٦] ''میں تو اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ اللہ ہی سے کرتا ہوں۔'' پر عامل ہوتا ہے تو اللہ کی رحمت اس کی دست گیری فرماتی ہے اور وہ اس ورطۂ بلا و ابتلاء سے نجات حاصل کرتا ہے: اے رب! جس طرح تو نے مجھ کو اس عظیم حادثے سے، کہ اس کی نظیر مجھے اس واقعے سے قبل معلوم نہ تھی، مجھے امن کی نوید دی اور عافیت کا مژدہ سنایا، اسی طرح تو مجھے قیامت کے دن عذابِ نار اور جہنم کی سزا سے اپنی عام رحمت سے امن کامل بخشنا۔ میں اگرچہ گناہوں کے سبب اس قابل نہیں ہوں کہ میری بخشش ہو، لیکن تو بے شک و شبہہ حیی، قیوم و ذوالجلال والاکرام اور ارحم الراحمین اور ستار العیوب اور غفار الذنوب اور اکرم الاکرمین ہے، اس لفظ کو جو دنیا میں میری زبان پر اچانک خواب اور بیداری میں جاری فرمایا: ﴿ لَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴾ [القصص: ٣١] تو اس مطلب اور معنی اور مقصد کو میرے لیے کامل کر دے اور دونوں جہانوں میں مجھے اس کا فائدہ پہنچا دے۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَيْكَ بِعَزِيْزٍ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اپنی قوم سے ان کے اطمینانِ قلب اور خوف کو دور کرنے کے لیے کہی تھی اور اپنی قوم ان کو اس لیے کہا کہ وہ ایمان لے آئے تھے، ورنہ وہ لوگ تو قومِ فرعون تھے ع

ہزار خویش کہ بے گانہ از خدا باشد ... فدائے یک تن بیگانہ کآشنا باشد

''ہزاروں اپنے جو اللہ سے دور اور بیگانے ہیں، اس ایک بیگانے پر فدا ہوں جو (اللہ تعالیٰ سے) آشنا ہے۔''

یا مراد بنی اسرائیل ہیں، صرف مومن، اگرچہ وہ قبط کے ہوں۔ وہ بات یہ تھی کہ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو پھر تم اسی اللہ پر بھروسا کرو، اگر مسلمان ہو اور ان فرعونی کافروں سے مت ڈرو۔ معلوم ہوا کہ سارے انبیا مسلمان تھے، یہ لفظ مسلمین بہت پرانا لفظ ہے، سب سے پہلے جس نے ہمارا نام مسلم رکھا وہ حضرت خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام ہیں: ﴿ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ﴾ [الحج: ٧٨] ''اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے)۔'' ان مومنین نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر اعتماد کیا ہے، نہ کسی اور پر، پھر اخلاصِ دل سے یہ دعا کی کہ تو ہم کو ستم گر قوم کی آزمایش اور ان کے فتنہ و فساد کی مشق نہ بنا کہ وہ ہم پر مسلط ہو کر ہم کو عذاب کریں اور ہم کو ہمارے اس دینِ حق سے متزلزل کر دیں۔[1] (قاله مجاهد)

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٧٠)

یا ہم کو ان کا فتنہ نہ بنا کہ وہ ہماری وجہ سے دوسروں کو فتنے میں ڈالیں اور ہم کو اپنی رحمت سے اس کافر قوم سے نجات دے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ان کو امر دین میں بڑا اہتمام تھا، اپنی جان سے بڑھ کر ایمان کی سلامتی کا خیال تھا۔ مسلمان کی یہی شان ہے کہ جان جائے ایمان نہ جائے۔[1] اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِكَ.

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۷

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر بناؤ، اور تم اپنے گھروں کو قبلہ (رو) بناؤ اور نماز قائم کرو، اور مومنوں کو خوش خبری دے دیجیے (87)

گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم:

جب فرعون کی ہلاکت کا وقت نزدیک پہنچا تب حکم دیا کہ اپنی قوم کو ان کے ساتھ شامل نہ رکھو۔ اپنا محلّہ جدا بساؤ کہ آگے ان پر آفتیں پڑنی ہیں، یہ قوم آفت میں شریک نہ ہو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل کے نجات پانے کا سبب فرعون اور قومِ فرعون سے ذکر کیا اور ان کے اخلاص کی کیفیت بیان فرمائی، وہ یہ صورت تھی کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ تم اپنی قوم کے لیے مصر میں الگ گھر بناؤ اور گھروں کو قبلہ رخ رکھو، اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کو حکم ہوا کہ مسجدیں تیار کریں، ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وہ لوگ خوف زدہ تھے، ان کو حکم ہوا کہ گھروں میں نماز پڑھیں۔ امام مجاہد، ابو مالک، ربیع، ضحاک، ابن زید اور زید بن اسلم رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

یہ بات ۔واللہ أعلم۔ اس لیے تھی کہ فرعون کی طرف سے ان پر سختی اور آزمایش اور معاملے کی تنگی تھی، اس لیے حکم دیا گیا کہ تم کثرت سے نماز پڑھو کہ یہ آزمایشیں دور ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ [البقرة: ١٥٣] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔'' اور حدیث میں آیا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امر غمگین کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے لگتے۔[3] (أخرجه أبو داود)

اسی لیے اللہ نے اس جگہ کہا کہ تم اپنے گھر قبلے کی طرف بناؤ اور نماز قائم کرو اور مومنوں کو ثواب اور عنقریب ملنے والی مدد کی بشارت سناؤ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ ہم ان فرعونیوں کے ہمراہ کھل کر نماز نہیں پڑھ سکتے، اللہ نے اذن دیا کہ اچھا تم اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو اور گھروں کا

[1] فتح البيان (٦/ ١٠٩) [2] تفسير الطبري (١٥/ ١٧٢۔ ١٧٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٠٣)

رخ قبلہ کی طرف کرلو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون کی طرف سے قتل کا خوف ہوا کہ کہیں وہ ان کو ان کے کنیساؤں میں جس میں وہ جمع ہوتے ہیں مار نہ ڈالیں تو ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں کو مسجد بنالو، انھیں قبلہ رو رکھو اور وہاں نماز پڑھو، یہی امام قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قبلہ رخ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ مصر سے مراد اسکندریہ ہے یا یہ مصر جو معروف ہے اور اپنے گھروں کا رخ قبلہ کی طرف رکھو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہوا کہ فرعون نے ان کو نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا، تب ارشاد ہوا کہ اپنے گھروں میں مساجد بنالو۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اپنے عبادت خانوں میں آلِ فرعون کے خوف کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، اس لیے گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔[3]

بیوت سے اس جگہ مراد مساجد ہیں، ایک جماعت سلف اسی طرف گئی ہے یا وہ گھر مراد ہیں جن میں وہ رہتے تھے، ان کے بارے میں یہ حکم ہوا کہ ان میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں کرلو۔ پہلے قول کے مطابق قبلے سے مراد بیت المقدس کی سمت ہے جو آج تک یہود کا قبلہ ہے، یا کعبہ کی سمت ہے اور کعبہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں کا قبلہ تھا۔ ابو سنان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے، سب کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے،[4] لیکن قرآن میں قبلہ کی تعیین کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے گھر قبلہ رو بنا لیے تھے، تاکہ چھپ کر نماز پڑھیں، تاکہ کفار کی طرف سے کوئی سختی نہ پہنچے۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ کے الفاظ اسی کی تائید کرتے ہیں، کیوں کہ جس نماز کی اقامت کا حکم کیا ہے اس کا قبلہ یہی نماز کا قبلہ ہے۔ مسجدوں میں پڑھے یا گھروں میں، نہ کہ گھروں کا آمنے سامنے بنانا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو دشمنوں کے علی الرغم ہوا تھا کہ مساجد بناؤ اور اللہ نے ان کو یقین دلایا کہ ہم تم کو دشمنوں کے شر سے محفوظ و مامون رکھیں گے۔ (ذکرہ الخطیب)

پھر فرمایا کہ مومنوں کو اللہ کی نصرت اور جنت کی بشارت دو۔ نماز کے لیے جگہ کا اختیار انبیا کو ہوتا ہے۔ پھر اس کو استقبالِ قبلہ اور اقامتِ صلاۃ میں عام کر دیا، کیوں کہ قبلہ رو ہونا اور نماز پڑھنا سب پر واجب ہے، کچھ انبیا کے لیے خاص نہیں ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کو اس خطاب کے ساتھ خاص کیا، اس لیے کہ رسالت کے اصل وہی تھے اور

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٧٤۔ ١٧٥)
[2] تفسير الطبري (١٥/ ١٧٥)
[3] تفسير الطبري (١٥/ ١٧٢) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٧٧)
[4] فتح القدير (٢/ ٦٥٤)

ہارون علیہ السلام ان کے تابع تھے۔ اس میں بشارت کی تعظیم اور جس کو بشارت دی گئی اس کی عزت ظاہر ہوئی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب ہمارے نبی اکرم ﷺ کو ہے، بطورِ التفات اور اعتراض، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ [1]

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

اور موسیٰ نے کہا: اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کو دنیاوی زندگی میں شان وشوکت اور مال و زر دے رکھا ہے، اے ہمارے رب! تاکہ وہ (لوگوں کو) تیری راہ سے بھٹکا دیں۔ اے ہمارے رب! ان کے مال و زر غارت کر دے اور ان کے دل سخت کر دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب (نہ) دیکھ لیں (88) اللہ نے کہا: یقیناً تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی ہے، چناں چہ تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے راستے کی پیروی مت کرو جو علم نہیں رکھتے (89)

موسیٰ علیہ السلام کی فرعون اور اس کی آل کے لیے بد دعا اور اس کی قبولیت:

سچے ایمان کی ان سے امید نہ تھی، مگر جب کچھ آفت پڑتی تو جھوٹی زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے، اس میں عذاب تھم جاتا، کام فیصل نہ ہوتا۔ دعا اس لیے مانگی کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لائیں، دل ان کے سخت رہیں، تاکہ عذاب پڑ چکے اور کام فیصل ہو۔

پھر فرمایا کہ جلدی نہ کرو حکم کی راہ دیکھو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی خبر دی کہ جب فرعون اور اس کے ارکانِ حکومت نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنی گمراہی پر اور کفر پر عناد و انکار کے طور پر اور ظلم و زیادتی اور تکبر اور اپنی برتری کے زعم میں ڈٹے رہے تو پیغمبر نے ان پر بددعا کی اور کہا: اے رب! تو نے ان فرعونیوں کو اس حیاتِ فانیہ میں بڑا مال و متاع اور اثاثے عطا کیے ہیں اور تو جانتا ہے کہ یہ میری رسالت پر، جو میں تیری طرف سے لایا ہوں، ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ تو تیرا ان کے ساتھ استدراج ہے کہ تو نے باوجود ان کے کفر کے یہ ساز و سامان دے رکھا ہے، سو اب تو ان کے اموال کو خاک میں ملا دے۔

یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ "اِطْمِسْ" بہ معنی "اَهْلِكْ" ہے اور امام ضحاک،

---

[1] فتح البیان (٦/ ١١٠۔ ١١١)

ابو العالیہ اور ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے مالوں کو ان کی پہلی ہیئت کی طرح پتھر کر دے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم کو خبر ملی ہے کہ ان کی کھیتیاں پتھر ہو گئیں۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی شکر پتھر ہو گئی۔[1] ایک دفعہ امام قرظی رحمہ اللہ نے یہ آیت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سامنے پڑھی تو انھوں نے کہا کہ اے ابو حمزہ! طمس کیا چیز ہے؟ کہا کہ ان کے سارے مال سخت پتھر ہو گئے۔ تو عمر بن عبدالعزیز نے اپنے غلام سے کہا کہ تھیلی لے کر آؤ، اس میں کچھ چنے اور انڈے تھے، ان کو کاٹا تو وہ پتھر ہو گئے تھے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تشدید علی القلوب سے مراد طبع (مہر لگ جانا) ہے، یعنی ان کے دلوں پر مہر لگا دی کہ عذاب کے دیکھنے تک وہ زبانی ایمان بھی نہ لائیں۔[3]

موسیٰ علیہ السلام کا یہ بددعا کرنا غصے کے طور پر تھا۔ یہ غصہ ان کو اللہ اور اللہ کے دین کے لیے آیا تھا۔ جب سمجھ لیا کہ فرعون اور اس کے سرداروں میں کوئی خیر نہیں ہے اور ان سے دین کا کوئی کام نہ نکلے گا، تب یہ بددعا کی جس طرح کہ نوح علیہ السلام نے بددعا کی تھی: ﴿ وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦۔ ٢٧] ”اور نوح نے کہا: (اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔ بلاشبہ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آیندہ) فاجر کافر ہی جنیں گے۔“ اسی لیے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا ان کے حق میں قبول فرما لی۔ اس دعا پر ہارون علیہ السلام نے آمین کہی تھی، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہو گئی، خاطر جمع رکھو۔

امام ابو العالیہ، ابو صالح، عکرمہ، قرظی اور ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور ہارون علیہ السلام نے آمین کہی۔[4] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض نے اس آیت سے حجت پکڑی ہے کہ مقتدی کا امام کے فاتحہ کی قراءت پر آمین کہنا قراءتِ فاتحہ کی طرح ہے۔ اس لیے کہ دعا کرنے والے موسیٰ علیہ السلام اور آمین کہنے والے ہارون علیہ السلام تھے۔[5]

میں کہتا ہوں کہ یہ استنباط بہت اچھا ہے، لیکن ہماری شریعت میں قراءتِ فاتحہ کے بارے میں نصِ صریح آ چکی ہے اور سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ ”لا صلاة إلا بفاتحة الكتاب“[6] تو یہ صحیح حدیث عموماتِ واردہ کو خاص کرنے والی ہے اور یہی حکم راجح ہے۔ یہ استنباط اس حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اور اللہ نے کہا: ﴿ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا ﴾ (آیتِ باب) یعنی اب میرے حکم پر قائم رہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میرے حکم پر چلو اور استقامت رکھو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس دعا کے بعد فرعون چالیس برس تک رہا[7] اور امام قرظی اور محمد بن علی بن حسین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چالیس دن تک ٹھہرا۔[8]

---

① تفسير الطبري (١٥/ ١٧٩۔ ١٨١) ② تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٧٩) ③ تفسير الطبري (١٥/ ١٨١۔ ١٨٢)
④ تفسير الطبري (١٥/ ١٨٥۔ ١٨٦) ⑤ تفسير ابن كثير (٢/ ٥٦٠)
⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤) ⑦ تفسير الطبري (١٥/ ١٨٧)
⑧ تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٨٠)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ملاء سے مراد فرعونیوں کے اشراف ہیں اور زینت ہر اس چیز کا نام ہے جس سے آراستگی کریں، جیسے: لباس، سواری، زیورات اور بستر اور ہتھیار وغیرہ اور مال وہ ہے جو ان اشیا پر زیادہ ہو، صامت ونحوہ (سونے وغیرہ) سے۔ پھر دوبارہ دعا کی کہ اے رب! کیا یہ زینت اور اموال تو نے ان کو اس لیے دیے ہیں کہ لوگوں کو تیری راہ سے گمراہ کریں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بددعا ہے کہ تو ان کو ہلاکت میں مبتلا کر۔ بالجملہ اس جگہ ﴿ لِيُضِلُّوا ﴾ کا لام، لام "كَيْ" ہے یا لامِ دعا یا لامِ علت کہ تو نے یہ سامان ان کو بطور استدراج کے دیا ہے۔ صاحبِ کشاف نے اس جگہ کو مقرر کرنے میں کسی بے فائدہ بات کے ساتھ خواہ مخواہ طول دیا ہے۔[1] پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

﴿ لِيُضِلُّوا ﴾ کا لفظ یا (ی) کی پیش یا زبر یا دونوں طرح پڑھا ہے۔ اول کے معنی یہ ہیں کہ اوروں کو گمراہ کریں اور ثانی کے معنی یہ ہیں کہ خود گمراہ ہوں۔ طمس سے مراد مسخ اور صورت کا بدل جانا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: "اِهْلِكْهَا"۔[2] اکثر مفسرین نے کہا ہے: اِمْسَخْهَا وَغَيِّرْهَا عَنْ هَيْئَتِهَا، بہرحال ان پر بددعا کی کہ ان کو اور ان کے اموال کو مٹا دے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے سارے اموال اور کھیتیاں اور زراعت اور ہیرے جواہرات اور دینار و درہم نقش دار پتھر ہو گئے، بالکل اپنی اصلی حالت پر۔

حکایت:

کہتے ہیں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک چمڑے کا تھیلا منگوایا، اس میں آلِ فرعون کی کچھ باقی ماندہ اشیا تھیں، ایک منقش انڈا اور ایک جوزہ مشقوقہ (ٹوٹا ہوا اخروٹ) نکالا، وہ پتھر ہو گیا تھا۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کے اموال اور کھجوروں کے درخت اور پھل اور آٹا اور کھانے کی اشیا کو پتھر کر ڈالا۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خود ان کی صورتیں پتھر ہو گئیں،[3] لیکن اس قول میں ضعف ہے۔ اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اموال پر بددعا کی تھی نہ کہ ان کی جانوں پر کہ وہ مسخ ہو جاتیں۔ یہ طمس ان نو نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھیں، پھر کہا کہ اے رب! ان کے دلوں کو سخت اور درشت کر دے کہ یہ حق کو قبول نہ کریں اور ان کا دل ایمان کے لیے نہ بڑھے اور نہ نرم ہو۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے حق میں یہ بات چاہتا ہے کرتا ہے، اگر ایسے نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام ہرگز اس سوال کی جسارت نہ کرتے۔[4] یہ ایمان لانے والے نہیں، جب تک کہ عذاب

---

[1] الكشاف (٢/ ٣٤٧_ ٣٤٨) [2] تفسير الطبري (١٥/ ١٨١)
[3] تفسير البغوي (٤/ ١٤٧) [4] تفسير الخازن (٣/ ٢٠٥)

کو نہ دیکھ لیں اور اگر عذاب دیکھ کر ایمان لائیں گے تو وہ کچھ فائدہ نہ دے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عذاب غرق ہونے کا تھا۔[1] بعض اہلِ علم نے اس بددعا کرنے کا ان لوگوں پر استشکال کیا ہے اور کہا ہے کہ رسول تو قوم کی ہدایت اور ایمان طلب کرتے ہیں نہ کہ ان کی ہلاکت۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی نبی کو قوم پر بددعا کرنا جائز نہیں، مگر اللہ کے اذن سے اور اللہ پاک اسی وقت اذن دیتا ہے جب یہ جان لیتا ہے کہ ان میں کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ اسی لیے جب اللہ پاک نے نوح علیہ السلام کو جتا دیا کہ ﴿ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ ﴾ [هود: ٣٦] ”تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا، سوائے اس کے جو (پہلے) ایمان لا چکا ہے۔“ تو انھوں نے کہا: ﴿ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] ”(اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔“ غرضیکہ پیغمبر مامور ہوتا ہے نہ کہ امیر اور اللہ کے اذن کے بغیر نہ دعا کرے اور نہ بددعا۔ عالمِ امکان میں سارا اختیار اور غلبہ صرف اور صرف ایک ذات پاک وحدہ لاشریک لہ کا ہے، کسی اعلیٰ وادنیٰ کو ذرہ بھر بھی اختیار کی قدرت حاصل نہیں۔ وللّٰه الحمد.

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم نے فرعونیوں کے حق میں تم دونوں کی بددعا قبول کی۔ اس جگہ دعا کی اضافت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کی طرف فرمائی اور پہلے کی آیات میں صرف موسیٰ علیہ السلام کی طرف اضافت کی تھی۔ کہتے ہیں کہ ہارون علیہ السلام نے آمین کہی تھی، لیکن ہو سکتا ہے کہ دونوں نے دعا کی ہو اور پہلی جگہ میں دعا کی اضافت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اصالتِ رسول کی وجہ سے ہو۔ امام نحاس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے علی بن سلیمان کو سنا، کہتے تھے کہ اس بات پر کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں کی دعا تھی، یہ قول دلیل ہے موسیٰ علیہ السلام کا ”رَبَّنَا“ کہنا۔ اور انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ رَبِّ یعنی واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا۔ یہ دعا قبول ہوگئی اور فرعون ایمان نہ لایا، لوگ کہتے ہیں کہ اس دعا کے بعد فرعون چالیس برس تک باقی رہا۔ اس کی حکمت و مصلحت اللہ ہی جانے۔ امام مجاہد اور ابن جریج رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2]

استقامت سے مراد یہ ہے کہ اپنے کام پر جمے رہو اور اللہ پاک سے دعا کیے جاؤ اور فرعونیوں اور فرعون کو ایمان کی طرف بلاتے رہو، یہاں تک کہ دعا کے قبول ہو جانے کا وقت چالیس سال کے بعد آیا اور وہ سب ہلاک ہو گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ استقامت کے معنی ترکِ استعجال (عجلت کو ترک کرنا) اور اللہ کی قضا و قدر پر پرسکون رہنا اور رضا و تسلیم کو لازم پکڑنا ہے۔ پھر جاہلوں کے طریقے کی پیروی کی ممانعت فرمائی کہ تم دونوں ان بے علموں کی راہ پر نہ چلو۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ممانعت کچھ اس بات پر دلیل نہیں ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے جاہلوں کے طریقے کا اتباع کر لیا ہو، جس طرح کہ یہ آیت: ﴿ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [الزمر: ٦٥] ”اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کے اعمال ضرور ضائع ہو جائیں گے۔“ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کے صادر ہو جانے کی دلیل نہیں ہے۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٨١۔ ١٨٢) [2] تفسير الطبري (١٥/ ١٨٧)

[3] تفسير الرازي (١٧/ ١٢٣) فتح البيان (٦/ ١١١۔ ١١٥)

میں کہتا ہوں کہ اس طرح کی عبارات کا مقصد انبیاءؑ کی امتوں کو تنبیہ کرنا ہے کہ وہ شرک سے بچیں اور کسی بے علم کی پیروی نہ کریں، کیوں کہ یہ کام ایسا ہے کہ اگر بالفرضِ محال پیغمبر بھی اس میں مبتلا ہو جائے تو وہ بھی اللہ کے مؤاخذہ سے نہ بچے، پھر کسی اور شخص کی کیا ہستی ہے؟

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اٰۗلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا، پھر فرعون اور اس کی فوجوں نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے ان کا پیچھا کیا، حتی کہ جب اسے غرق ہونے نے پا لیا، تو پکار اُٹھا: میں ایمان لاتا ہوں کہ بے شک اس ذات کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں مسلمانوں میں سے ہوں (90) (اللہ نے فرمایا:) کیا اب (ایمان لاتا ہے؟) جب کہ تو پہلے نافرمان تھا اور تو فساد کرنے والوں میں سے تھا (91) چناں چہ آج ہم تجھے نجات دیں گے تیرے بدن سمیت (تیرا جسم بچا کر سمندر سے باہر نکال پھینکیں گے)، تاکہ تو اپنے پیچھے والوں کے لیے نشانِ (عبرت) ہو، اور بے شک بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے البتہ غافل ہیں (92)

بنی اسرائیل کی نجات:

جیسا وہ بے وقت ایمان لایا بے فائدہ، ویسے ہی اللہ نے اس کے مرنے کے بعد اس کا بدن دریا میں سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا کہ بنی اسرائیل دیکھ کر شکر کریں اور عبرت پکڑیں، اس کو بدن کے بچنے سے کیا فائدہ؟ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے فرعون اور اس کے لشکر کے غرق ہونے کی کیفیت بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ سرزمینِ مصر سے باہر نکلے وہ اس سے پہلے چھ لاکھ جوان تھے چھوٹے بچوں کے علاوہ۔ انھوں نے قبطیوں سے بہت سا زیور ادھار لیا ہوا تھا، یہ اس سمیت نکل کھڑے۔ فرعون کے حمقاء نے زور کیا، لوگ شہروں میں بھیجے کہ سب اقالیم سے لشکر لے کر آؤ، پھر بنی اسرائیل کے تعاقب میں بڑی عظمت اور شان سے اور ہائل ہونے والے لشکروں کو ساتھ لے کر فرعون خود نکلا۔

اللہ کا ارادہ ہوا کہ ان میں سے جو کوئی حکومت اور سلطنت والا ہے تمام مملکتوں میں سے وہ ایک نہ بچے، سو یہ سب سورج کے طلوع ہونے کے وقت بنی اسرائیل سے آ ملے، جب فریقین کا آمنا سامنا ہوا، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ ہم پھنس گئے، یہ اس لیے کہ وہ دریا کے ساحل تک پہنچ گئے تھے اور ان کے پیچھے فرعون لگا آتا تھا، کچھ فاصلہ باقی نہ رہا، مگر اسی قدر کہ آمنا سامنا ہو جائے اور اصحابِ موسیٰ علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے عاجزی کا سوال کیا کہ اب ہم کس طرح ان کے ہاتھ سے رہائی پائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے یہی حکم ہے کہ میں اسی راہ پر چلوں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھے راہ سجھائے گا۔ جب معاملہ نہایت نازک ہو گیا تو اللہ نے راستہ نکال دیا، موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ تم دریا کو اپنی لاٹھی سے مارو، انھوں نے عصا مارا، دریا پھٹ گیا، ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا اور بارہ راہیں کھل گئیں، ہر خاندان کے لیے ایک راستہ ہو گیا اور اللہ نے ہوا کو حکم دیا، اس نے دریا کی زمین کو خشک کر دیا: ﴿ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴾ [طٰهٰ: ٧٧] ”پھر ان کے لیے سمندر میں خشک راستہ بنا، جبکہ تجھے نہ تو پکڑے جانے کا خوف ہوگا اور نہ (ڈوبنے کا) ڈر“ اور دریا کا پانی راستوں کے درمیان اس طرح ہو گیا جیسے جالی دار دریچے ہوں، یعنی ان میں سوراخ سے بن گئے، تاکہ ہر قوم دوسری قوم کو دیکھتی رہے اور یہ گمان نہ کرے کہ وہ قوم ہلاک ہو گئی اور سارے بنی اسرائیل دریا سے پار نکل گئے۔

فرعون اور اس کے لشکر کی غرقابی اور فرعون کا ایمان لانا:

جب سب آخر تک پار ہو چکے تو فرعون اپنے بھاری لشکر کے ساتھ خود دوسری جانب سے کنارہ پر آیا، سیاہ گھوڑوں پر ایک لاکھ سوار تھے، دوسرے رنگ کے گھوڑے ان کے سوا تھے، اس نے دریا کو دیکھ کر ڈر محسوس کیا اور رک گیا اور چاہا کہ واپس مڑ جائے: ﴿ وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴾ [صٓ: ٣] ”جب کہ وہ فرار و خلاصی کا وقت نہ تھا۔“ تقدیر نافذ ہو گئی اور دعا قبول ہو گئی۔ جبریل علیہ السلام ایک تیز رو اور موٹی تازی گھوڑی پر آئے اور فرعون کے گھوڑے کی طرف گزرے، فرعون کا گھوڑا ہنہنا کر جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے پیچھے ہو گیا اور جبریل علیہ السلام دریا میں گھس پڑے تو فرعون کا گھوڑا جبریل علیہ السلام کے پیچھے دریا میں چلا گیا اور فرعون کا اپنی جان پر کچھ قابو نہ چلا، اپنے سرداروں کے سامنے بہادری جتلانے کو یہ بات کہی کہ بنی اسرائیل دریا پر کچھ ہم سے زیادہ حق نہیں رکھتے کہ وہ تو پار ہو جائیں اور ہم نہ ہوں، وہ سب کے سب شروع سے لے کر آخر تک دریا کے اندر گھس پڑے، میکائیل علیہ السلام پیچھے تھے، کسی ایک کو باقی نہ چھوڑا مگر سب کو فرعون کے ساتھ ملا دیا۔ جب سب اہلِ لشکر مکمل طور پر دریا کے اندر آ گئے اور اگلے لشکر نے چاہا کہ ہم پار ہو جائیں تو اللہ قدیر نے دریا کو حکم دیا کہ ان سب پر مل جا، وہ مل گیا اور ان میں سے کوئی ایک نفر بھی باقی نہ بچا، دریا کی موجیں ان کو اوپر تلے کرتی تھیں اور خود فرعون پر لہروں کا تراکم (تہ بہ تہ) ہوا اور سکراتِ موت نے گھیر لیا، اس وقت

اس نے کہا کہ رب بنی اسرائیل پر ایمان لایا اور میں مسلمان ہوں، لیکن یہ ایمان لانا اس وقت ہوا کہ اس کا کچھ فائدہ نہ ہو سکا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿84﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٨٤۔ ٨٥] ''چناں چہ جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہا: ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور ہم ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جنھیں ہم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے۔ پھر، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا، یہی اللہ کا طریقہ ہے، جو اس کے بندوں میں گزرا اور اس (عذاب کے) موقع پر کافروں نے خسارہ اُٹھایا۔''

ایمان کا وقت موت سے پہلے پہلے:

اسی طرح اللہ نے اس قولِ فرعون کے جواب میں اس جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ ﴾ (آیتِ باب) یعنی تو اب اس وقت یہ بات بناتا ہے اور پہلے اللہ کا نافرمان رہ چکا ہے اور تو بڑا مفسد تھا، لوگوں کو گمراہ کرتا رہا، ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ [القصص: ٤١] ''اور ہم نے انھیں (لوگوں کو) آگ کی طرف بلانے والے سرغنے بنا دیا اور یومِ قیامت ان کی (کوئی) مدد نہیں کی جائے گی۔''

اور یہ ذکر جس کو اللہ نے فرعون سے حکایت کیا ہے کہ اس نے غرق ہونے کی اس حالت میں یوں کہا، یہ من جملہ اسرارِ غیب کے ہے جس کا علم اللہ نے اپنے رسول کو دیا، اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ جب فرعون نے یہ بات کہی تھی: ﴿ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ ﴾ (آیتِ باب) مجھ سے جبریل علیہ السلام نے کہا: ''لَوْ رَأَيْتَنِي وَقَدْ أَخَذْتُ مِنْ حَالِ الْبَحْرِ فَدَسَسْتُهُ فِي فِيهِ مَخَافَةَ أَنْ تَنَالَهُ الرَّحْمَةُ''[1] (رواه أحمد والترمذي وحسنه وابن جرير وابن أبي حاتم) یعنی اگر کبھی آپ مجھ کو اس وقت دیکھتے کہ میں نے دریا کی کالی کیچڑ فرعون کے منہ میں ٹھونس دی، اس ڈر سے کہ کہیں اللہ کی رحمت اس کو نہ لے لے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قَالَ لِي جِبْرَائِيلُ لَوْ رَأَيْتَنِي وَأَنَا آخِذٌ مِّنْ حَالِ الْبَحْرِ فَأَدُسُّهُ فِي فَمِ فِرْعَوْنَ مَخَافَةَ أَنْ تُدْرِكَهُ الرَّحْمَةُ''[2] (رواه أبو داود الطيالسي ورواه أبو عيسى الترمذي أيضا و ابن جرير أيضا من غير وجهٍ مثله وقال الترمذي: حسن غريب صحيح)

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٠٧) تفسير الطبري (١٥/ ١٩٠۔ ١٩٢) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٨٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠١٥)

[2] مسند الطيالسي (١/ ٣٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٠٨) تفسير الطبري (١٥/ ١٩٠۔ ١٩٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠١٥)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب اللہ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے اپنی انگلی سے اشارہ کر کے بآواز بلند کہا: ﴿ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ ... الخ ﴾ (آیتِ باب) اس وقت جبریل علیہ السلام ڈرے کہ کہیں اللہ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت نہ کرے، اپنے پر سے دریا کی کالی کیچڑ لے کر اس کے منہ پر ماری اور اس کے دہن کو چھپا دیا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وكذا رواه ابن جرير موقوفا) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: "قَالَ لِيْ جِبْرِيْلُ: يَا مُحَمَّدُ لَوْ رَأَيْتَنِيْ وَأَنَا أَغُطُّهُ وَأَدُسُّ مِنَ الْحَالِ فِيْ فِيْهِ مَخَافَةَ أَنْ تُدْرِكَهُ رَحْمَةُ اللّٰهِ فَيَغْفِرُ لَهُ"[2] (رواه ابن جرير) اس کی سند میں کثیر بن زاذان مجہول غیر معروف ہے، باقی رجال ثقات ہیں، اس حدیث کو ایک جماعت سلف نے، جیسے: امام قتادہ، ابراہیم تیمی اور میمون بن مہران رحمہم اللہ ہیں، مرسل کہا ہے اور امام ضحاک بن قیس رحمہ اللہ نے اس کو خطبہ میں پڑھا۔[3] واللہ أعلم

فرعون کے بدن کا محفوظ رہنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سلف نے کہا ہے کہ بعض بنی اسرائیل کو فرعون کی موت میں شک تھا، اللہ نے دریا کو حکم دیا کہ اس کے بدن کو اسی طرح پر صحیح سلامت روح کے بغیر باہر نکال کر ڈال دے۔ اس کے بدن پر ایک زِرہ تھی جو مشہور تھی، دریا نے اس کو ایک ٹیلے پر پھینک دیا، تاکہ اس کا مرنا اور ہلاک ہونا حقیقی طور پر معلوم ہو جائے، اسی لیے اللہ نے کہا: آج کے دن ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے، یعنی تیرے جسد و بدن کو ایک اونچی جگہ پر بلند کر دیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدن سے مراد جسم ہے، یعنی تن۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بغیر روح کے جسم ہے۔ عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی صحیح سالم۔[4] مراد اس سے یہ ہے کہ وہ جسم ٹوٹا پھوٹا نہیں تھا، تاکہ لوگ بخوبی اس لعین کو پہچان لیں کہ ہاں یہ فرعون ہی کی لاش ہے، اگر وہ لاش پاش پاش ہو جاتی تو لوگ اس کی شناخت نہ کر سکتے، ابوصخر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدن سے مراد زِرہ ہے،[5] بہرحال ان سب اقوال میں کچھ تضاد نہیں ہے۔

پھر فرمایا کہ ہم نے تیرے بدن کو اس لیے نجات دی کہ تو پچھلوں کے واسطے، یعنی بنی اسرائیل کے لیے ایک دلیل ہو اور وہ تیرا ہلاک ہونا اور مر جانا معلوم کر لیں اور جان لیں کہ اللہ بڑی قدرت والا ہے۔ ہر چلنے والے کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے اور کوئی شے اس کے غضب کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی، لیکن اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں اور نصیحت حاصل نہیں کرتے اور نہ عبرت پکڑتے ہیں۔ ان فرعونیوں کا غرق اور ہلاک ہونا عاشورے کے دن ہوا تھا، جس طرح صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے آئے تو یہود یومِ عاشورا کا روزہ رکھتے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ وہ دن ہے کہ اس دن موسیٰ علیہ السلام فرعون پر غالب ہوئے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو فرمایا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان سے زیادہ مستحق ہو کہ اس دن روزہ رکھو۔[6]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٨٢) تفسير الطبري (١٥/ ١٩٣) [2] تفسير الطبري (١٥/ ١٩١)

[3] تفسير الطبري (١٥/ ١٩٢ـ ١٩٣) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٨٣ـ ١٩٨٤) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٨٤)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٦١ـ ٥٦٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ ہم بنی اسرائیل کو دریا کے اُس پار لے گئے، یہ اس طرح ہوا کہ اللہ نے بحر کو حکم دیا، پانی سوکھ گیا، وہ آسانی سے بحر کو طے کر کے خشکی میں نکل گئے۔ بحر سے اس جگہ مراد بحرِ قلزم ہے، جس کو سویس کہتے ہیں، یہ سویس (سویز) اب تک موجود اور مشہور ہے۔ یہ سب چھے لاکھ آدمی تھے۔[1] (قالہ الخطیب) امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے ہمراہ یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تھے بہتر (۷۲) آدمی تھے اور جب ان کی اولاد موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ایک وقتِ معلوم میں مصر سے باہر نکلے تو چھے لاکھ تھے، اس کی تفسیر سورت بقرہ میں گزر چکی ہے، اس آیت کے تحت: ﴿ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ ﴾ [البقرۃ: ٥٠] ”اور جب ہم نے تمھارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا۔“

آیتِ باب خلقِ افعال پر دلیل ہے۔ غرضیکہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا، یہ تعاقب ظلم، زیادتی، سرکشی اور عداوت کے لیے تھا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عدو وعتو وعلو کے الفاظ کتاب اللہ میں تجبیر (جبر) کے معنی میں ہیں۔[2] یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو اس نے کہا: میں ایمان لایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی غفلت میں بنی اسرائیل کو وہاں سے باہر کیا، جب فرعون نے سنا کہ سارے بنی اسرائیل یہاں سے چل دیے ہیں تو لشکر لے کر ان کے پیچھے دوڑا، تاکہ گرفتار کر لے، اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے دریا کو پھاڑ دیا، وہ سوکھے نکل گئے، اتنے میں فرعون آ پہنچا، دریا اسی حال پر تھا، جس پر کہ بنی اسرائیل کا گزر ہوا تھا، جب فرعون اپنے تمام لشکروں کے ساتھ اچھی طرح دریا کے اندر آ گیا اور قریب تھا کہ پار ہو جائے تو یکایک وہ دریا اس پر منطبق ہو گیا (مل گیا) سب کے سب ڈوب گئے اور فرعون کا ایمان لانا کچھ سود مند نہ ہوا، اس لیے کہ یہ ایمان غرق ہوتے وقت تھا، جب کہ اللہ کے عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیا جس طرح کہ سورت نسا میں گزر چکا ہے۔

اس لعین نے یہ نہ کہا کہ ”آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَآمَنْتُ بِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ“ بلکہ وہ کہا جو اوپر گزرا، اس لیے کہ ابھی اس میں دعویٰ الوہیت کی رگ باقی تھی اور آپ کو مسلمان بنانے لگا، یعنی میں موحد اور تابع فرمان ہوں۔ کوئی کہے: وہ تین بار ایمان لایا، جس طرح کہ اس آیت میں مذکور ہے تو اس کے ایمان کے قبول نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ عذاب کے نزول کے وقت ایمان لایا اور ایسے وقت میں ایمان اور توبہ قبول نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ﴾ [المؤمن: ٨٥] ”پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو انھیں ان کے ایمان (لانے) نے کوئی نفع نہ دیا۔“ اور ایمان مکمل تب ہوتا ہے جب توحید اور نبوت دونوں کا اقرار کرے، فرعون نے اس ایمان میں نبوت کا اقرار نہیں کیا، اس لیے اس کا ایمان صحیح نہیں ٹھہرا۔ اس

[1] تفسير الخازن (٣/ ٢٠٦)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٢٦٧٦) فتح القدير (٢/ ٦٥٨)

کے سوا اور جوابات بھی ہیں۔ (ذکرہ الخطیب)

اور حدیثِ جبریل علیہ السلام میں جو آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اس کے منہ میں کالی کیچڑ ٹھونس دی۔[1] سو یہ کام اللہ کے حکم سے کیا تھا، اس لیے جبریل علیہ السلام پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس حدیث میں استشکال کیا ہے[2] اور امام خازن رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے۔[3] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں: "قَالَ لِيْ جِبْرِيْلُ مَا كَانَ عَلَى الْأَرْضِ يَعْنِيْ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ فِرْعَوْنَ، فَلَمَّا آمَنَ جَعَلْتُ أَحْشُوْ فَاهُ حَمَاةً وَأَنَا أَغُطُّهُ خَشْيَةَ أَنْ تُدْرِكَهُ الرَّحْمَةُ"[4] (أخرج ابن مردويه عن ابن عمر رفعا نحوه وأبو الشيخ عن أبي أمامة نحوه)

اس شخص پر بڑا تعجب ہے جس کو فنِ روایت کا علم نہیں اور اس کے باوجود وہ مفسر ہے اور صحیح ترین اور کاذب ترین احادیث کی تمیز نہیں کر سکتا، پھر اس حالت کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں کلام کرتا ہے اور صحیح حدیث کو باطل ٹھہراتا ہے اور زبانِ قلم اور قلمِ زبان کو بحث کے میدان میں خالص جہالت اور قصور فاضح کے ساتھ کھلا چھوڑ دیتا ہے جس سے فنِ حدیث سے ادنیٰ سے واقفیت رکھنے والے اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ فَيَا مِسْكِيْنُ مَالَكَ وَلِهٰذَا الشَّانِ الَّذِيْ لَسْتَ فِيْهِ فِيْ شَيْءٍ أَلَا تَسْتُرُ نَفْسَكَ وَتَرَبَّعُ عَلٰى ضِلَعِكَ وَتَعْرِفُ بِأَنَّكَ بِهٰذَا الْعِلْمِ مِنْ أَجْهَلِ الْجَاهِلِيْنَ. صاحبِ کشاف کا یہی حال ہے کہ اپنی تفسیر میں احادیث کے ذکر کے ساتھ تعرض کرتا ہے اور موضوعات لاتا ہے اور کبھی صحیح احادیث کو جانتے ہوئے رسول پر جھوٹ بتلاتا ہے، حالانکہ وہ حدیث صحیحین میں ہوتی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اس کی راوی ہے اور سارے رجال اسانید ائمہ ثقات ہوتے ہیں۔

بالجملہ جب فرعون نے ایمان کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تو ایمان لاتا ہے، حالانکہ تو پہلے نافرمان تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس قول کے کہنے والے جبرائیل علیہ السلام ہیں نہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ۔ کسی نے کہا ہے کہ میکائیل علیہ السلام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ خود فرعون نے یہ بات اپنے جی میں اپنے جی سے کہی تھی۔ بہرحال اس قول کا مقصد ڈانٹ اور سرزنش ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے اس کا ایمان قبول نہیں کیا، عذاب کے نزول کے وقت، حالانکہ اس کو فرصت اور مہلت دی تھی۔[5] یاس (عذاب کے وقت) کا ایمان اور توبہ قبول نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس حالت میں ایمان کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ جو توبہ کرنے کا وقت تھا وہ تو ضائع کر دیا اور دنیائے فانی کو باقی رہنے والی آخرت پر اختیار کیا:

توبہا را نفسِ بازپسیں دست رواست بے خبر دیر رسیدی درِ محمل بستند

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠١٥) [2] تفسير الرازي (١٧/ ١٢٥)
[3] تفسير الخازن (٣/ ٢٠٧۔ ٢٠٩) [4] المعجم الأوسط (٦/ ٧١) الدر المنثور (٤/ ٣٨٧) [5] تفسير الخازن (٣/ ٢٠٦)

''توبہ کرنے والوں کو واپسی رجوع بہت جلد نصیب ہوتا ہے۔ (توبہ سے) بے خبر دیری کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے اسی حالت میں روک لیے جاتے ہیں۔''

فرعون کے ایمان کا شبہہ اور اس کا جواب:

شیخ ابن عربی صاحبِ فتوحات نے انہی آیات سے فرعون کے ایمان کی دلیل لی ہے، اس کا جواب ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے کتاب الزواجر میں خوب لکھا ہے اور فرعون کا کفر ثابت کیا ہے[1] اور شیخ عبدالحق دہلوی حنفی نے بھی تکمیلِ ایمان میں فرعون کے ایمان کا انکار کیا ہے اور یہی حق ہے اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔ اس جگہ استدلال پر کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہ قول کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ اور جمہور علمائے سلف و خلف کے اعتقاد کے مخالف ہے اور کیا عجب ہے کہ شیخ کی کتاب میں اس قول کی بحث مدسوس ہو (کسی چیز کے نیچے چھپی ہوئی ہو) اور اگر مدسوس نہیں ہے تو گو صاحبِ فتوحات بڑے شیخ ہیں، لیکن حق ان سے بھی بڑا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرعون کے ایمان نہ لانے پر نص کی ہے اور فرمایا ہے کہ تو ایک مفسد تھا، سو ہم آج کے دن تیرے بدن کو دریا سے نکال کر کنارے پر ڈال دیں گے، یہ اس لیے کہ بنی اسرائیل کو اس کے غرق ہو جانے کی تصدیق نہیں ہوئی تھی، وہ کہتے تھے کہ اس کی شان اس سے بڑی ہے کہ وہ ڈوب جائے۔ اللہ نے ایک اونچے ٹیلے پر اس کی لاش کو ڈال دیا، یہاں تک کہ سب نے دیکھا کہ وہ ایک سرخ بیل چھوٹے قد والے کی طرح مردہ پڑا ہے، پھر ثانیاً اس کو دوبارہ پانی میں لوٹایا، اسی وقت سے پانی کسی مردہ کو قبول نہیں کرتا۔[2] (قاله الخازن) بعض نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تیری قوم دریا کی تہ میں گئی اور ہم تجھ کو پانی کے اوپر کر دیں گے، تاکہ لوگ دیکھیں کہ تو ڈوب کر مرا ہے۔ یا ہم تجھ کو زمین کے ایک کنارے پر پھینک دیں گے۔

لفظ بدن میں مفسرین کا اختلاف ہے، کسی نے کہا ہے کہ مراد جسم ہے روح کے نکلنے کے بعد اور کسی نے کہا ہے کہ بمعنی درع ہے، درع کو بدن کہتے ہیں، یہ قول امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا ہے۔ اور امام اخفش رحمہ اللہ نے پہلے معنی کو راجح کہا ہے[3] اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے بَأَبْدَانِكَ پڑھا ہے، مراد سارے اعضا و اجزائے جسم ہیں[4] اور بعض نے کہا ہے کہ مراد بدن سے یہ ہے کہ برہنہ ڈال دیں گے کہ جسم پر کوئی شے نہ ہو گی۔

آیت سے مراد علامت ہے، یعنی تیرا بدن ظاہر ہوا نہ تیری قوم کا، یہ اس لیے کہ تیرا ہلاک ہونا معلوم کر لیں اور جان لیں کہ تیرا دعویٰ ٹھیک نہ تھا اور تیرے ڈوب کر مرنے میں کوئی شک باقی نہ رہے۔ یا مراد پھینک دینا ہے دریا کے کنارے پر اکیلے نہ کہ دوسرے غرق ہونے والوں کو بھی، تاکہ اس میں اللہ کی نشانی ہو اور لوگ عبرت پکڑیں یا آیندہ

---

[1] الزواجر (١/ ٥٧) [2] تفسير الخازن (٣/ ٢٠٩) [3] فتح القدير (٢/ ٦٥٨) [4] الكشاف (٢/ ٣٥٠)

آنے والی امتیں اس حال کو سن کر عبرت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ پر تکبر و تجبر اور سرکشی سے بچیں، کیوں کہ جس شخص نے الوہیت کا دعویٰ ایک زمانۂ دراز تک کیا اور ایک دعوے پر قائم رہا، اُس کا انجام اس رسوائی، خرابی اور تباہی سے ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ ﴿ لِمَنْ خَلْفَكَ ﴾ بصیغہ ماضی پڑھا ہے، یعنی یہ تیرا ڈوب کر مرنا اس شخص کے لیے نشانی ہے جو تیرے بعد خلیفہ ہوگا یا سردار بنے گا یا تیرے مسکن میں رہے گا۔ یہ آخری مقولہ تھا جبرائیل علیہ السلام کا اور اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے، جو باعثِ عبرت و تفکر و بیداری ہیں، خوابِ غفلت میں بے خبر پڑے ہیں، یہ جملہ اس لیے فرمایا ہے کہ جو بات بیان کی گئی ہے وہ پکی ہو۔[1]

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳

اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو اچھا ٹھکانا دیا اور ہم نے انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، پھر انھوں نے (باہم) اختلاف نہیں کیا، حتی کہ ان کے پاس علم آ گیا۔ (اے نبی!) بے شک آپ کا رب ان کے درمیان روزِ قیامت کو ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے (93)

بنی اسرائیل کو اقتدار اور نعمتوں سے نوازنا:

اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کی جو نعمتیں بنی اسرائیل کو دی تھیں، اس آیت میں ان کی خبر ہے۔ ﴿ مُبَوَّاَ صِدْقٍ ﴾ سے مراد مصر و شام ہے اور جو زمینِ قدس سے متصل ہے مع بیت المقدس کے گرد و نواح کی جگہ کے۔ اس لیے کہ فرعون اور اس کے لشکروں کے ہلاک ہونے کے بعد سارے بلادِ مصر پر دولتِ موسویہ کا ہاتھ غالب ہو گیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٣٧] ''اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔ اور (اے نبی! اس طرح) بنی اسرائیل کے حق میں آپ کے رب کا اچھا وعدہ پورا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے صبر کیا تھا۔ اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ تباہ کر دیا جو (کارخانے) وہ بناتے اور جو (محلات کی عمارتیں) وہ اٹھاتے تھے۔''

نیز دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝۵۷ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝۵۸ كَذٰلِكَ ؕ

[1] فتح البیان (٦/ ١١٥۔ ١٢٠)

﴿ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ [الشعراء: ۵۷۔ ۵۹] ”چناں چہ ہم نے ان (فرعونیوں) کو باغوں اور چشموں سے نکالا۔ اور خزانوں اور بہترین قیام گاہوں سے۔ اسی طرح ہوا، اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان چیزوں کا وارث بنایا۔“ نیز فرمایا: ﴿ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿25﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿26﴾ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿27﴾ كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴾ [الدخان: ۲۵۔ ۲۸] ”وہ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے۔ اور کھیتیاں اور شاندار محل۔ اور سامانِ عیش جن میں وہ مزے کر رہے تھے۔ اسی طرح (ہوا) اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان (سب) کا وارث بنا دیا۔“ لیکن وہ موسیٰ علیہ السلام سے ہمیشہ بلادِ بیت المقدس ہی کے طالب رہے۔

بنی اسرائیل سے اسلام تک مختصر تاریخ:

یہ بلاد خلیل جلیل علیہ السلام کے ہیں اور وہاں عمالقہ کی ایک قوم رہتی تھی۔ بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ جنگ کرنے سے کم ہمتی اور پہلو تہی کی تھی، اللہ نے ان کو تیہ میں چالیس برس تک صحرا نورد رکھا۔ اسی تیہ میں ہارون علیہ السلام کا انتقال بھی ہوا اور موسیٰ علیہ السلام نے بھی وفات پائی۔ پھر ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے بعد یوشع بن نون کے ہمراہ بنی اسرائیل اسی دشت سے باہر نکلے اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر بیت المقدس کو مفتوح کر دیا اور ان کا ہاتھ ان بلاد پر جما دیا، یہاں تک کہ ایک زمانے کے بعد بخت نصر نے بیت المقدس کو ان کے ہاتھ سے لے لیا، پھر وہ ان کے پاس دوبارہ آ گیا۔

پھر یونان کے بادشاہوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ ایک مدت دراز تک وہ یونان کے زیرِ احکام رہا اور اس مدت میں اللہ نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مبعوث فرمایا، اس وقت یہود نا بہبود نے یونان کے بادشاہوں سے عیسیٰ علیہ السلام پر جنگ میں مدد چاہی، کیوں کہ اس زمانے میں بیت المقدس کے حکام یہی یونان کے بادشاہ تھے۔ یہود نے ان سے کہہ دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام تمھاری رعایا کو بگاڑتے ہیں اور تم سے باغی کرتے ہیں۔ یہ وحی شیطان نے ان کے کان میں پھونک دی اور چغل خوری سے ان کو مسیح علیہ السلام کے خلاف بھڑکا دیا۔

مذکورہ ملوک نے کچھ لوگ بھیجے کہ جاؤ عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر لے آؤ، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو تو آسمان پر اٹھا لیا اور ایک حواری اللہ کی مشیت اور تقدیر سے عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل ہو گیا، ان لوگوں نے اس کو پکڑ کر سولی چڑھا دیا اور یہ اعتقاد کیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام ہی کو قتل کیا ہے: ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ١ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ [النساء: ۱۵۸] ”بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف اُٹھا لیا اور اللہ بڑا زبردست، بہت حکمت والا ہے۔“

پھر مسیح علیہ السلام کے بعد جب قریباً تین سو برس گزر گئے تو یونان کا بادشاہ قسطنطین دینِ نصرانیت میں داخل ہوا، یہ نصرانی ہونے سے پہلے ایک فلسفی تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس نے اس دین کو بطورِ تقیہ کے اختیار کیا تھا، کسی نے کہا ہے کہ حیلہ کے طور پر دین میں فساد پیدا کرنے کی خاطر یہ دین اختیار کیا۔ اساقفہ نے اس کے لیے ایک شریعت بنائی

تھی اور قوانین مقرر کیے تھے، یہ شریعت خود ساختہ تھی اور بدعت تھی، اس نے ان کے لیے بڑے اور چھوٹے کنیسا، گرجے، صوامع، ہیکل، عبادت گاہیں اور قلایات (عبادت گاہیں) تیار کروا دیے۔

اس زمانے میں نصرانیت کے دین نے خوب شہرت حاصل کی اور مذہبِ عیسوی خوب پھیلا، حالانکہ اس میں مسیح علیہ السلام کے دین کے مخالف بہت سی تبدیلی اور تغیر وتحریف اور وضع کذب ہو چکا تھا اور حقیقت میں چند راہبوں کے علاوہ کوئی شخص دینِ مسیح پر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ انھوں نے اپنی عبادت گاہیں صحراؤں، جنگلوں اور ویرانوں میں بنا لیں، ان نصاریٰ کا غلبہ مملکتِ شام اور جزیرۂ روم اور اس کے شہروں پر ہو گیا۔

قسطنطین نے شہر قسطنطنیہ، قمامہ، بیتِ لحم، کنائسِ بیت المقدس اور حران کے شہر، مثلاً: بصریٰ وغیرہ کی بینات ہائلہ محکمہ پر عمارتیں تعمیر کیں اور اس دن صلیب کی عبادت شروع کی اور مشرق کی طرف نماز پڑھی اور کنیسوں یعنی گرجا گھروں میں تصویریں بنائیں اور سور کے گوشت کو حلال ٹھہرایا، اسی طرح بہت سے فروع اور اصولِ دین میں نئی نئی باتیں نکالیں اور ایک امانت کبیرہ حقیرہ جس کا نام کبیرہ رکھا ہے اس دین مسیحی کے لیے وضع کی اور قوانین بنائے اور ان کو پھیلایا۔ بالجملہ ان بلادِ مقدس پر ان کا ہاتھ زبردست رہا، یہاں تک کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ملکِ مقدس کو ان کے ہاتھ سے نکال لیا اور امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر بیت المقدس فتح ہوا۔ وللّٰہ الحمد والمنۃ.

میں کہتا ہوں کہ اس فتح کے بعد پھر ایک دفعہ نصاریٰ کا غلبہ قدس اور اس کے گرد ونواح پر ہو گیا تھا، ملک ایوب رحمہ اللہ کے زمانے میں، پھر اسلام غالب آیا، اب یہ مملکت بادشاہ روم کے زیرِ حکومت ہے اور اس وقت سلطان عبدالحمید خان (عافاھم اللہ تعالیٰ) اس جگہ کے مستقل حاکم ہیں، بلکہ حکمتِ الٰہی نے یہ تقاضا کیا ہے کہ اہلِ اسلام اور اہلِ کتاب کی جتنی مساجد اور عبادت گاہیں ہیں وہ سب آج خالصتاً سلطان مذکور کی سلطنت میں داخل ہیں، جیسے: حرمین شریفین زاد اللہ شرفھما وقدس ومسجدِ اقصیٰ اسی طرح کربلا ونحوہا،[1] اگرچہ کربلا اور نجف بدعت کی جگہ ہیں نہ کہ عبادت کی جگہ۔

بنی اسرائیل کا اختلاف:

پھر اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو طیبات دیے، یعنی رزقِ حلال و پاکیزہ اور نفع بخش وطیب طبعاً وشرعاً۔ پھر جو اختلاف بنی اسرائیل کا مسائل میں ہوا وہ علم آنے کے بعد ہوا، یعنی ان کو یہ اختلاف کرنا نہیں چاہیے تھا، حالانکہ اللہ نے ان کو سب مسائل کھول کر بتا دیے تھے اور دھوکے کو ان سے دور کر دیا تھا۔ حدیث میں آیا ہے: ''إِنَّ الْيَهُوْدَ اخْتَلَفُوْا عَلٰى إِحْدٰى وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، وَإِنَّ النَّصَارٰى اخْتَلَفُوْا عَلٰى اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، وَسَتَفْتَرِقُ هٰذِهِ

[1] یہ صورت حال نواب صاحب کے دور کی ہے جب ترکی میں خلافتِ عثمانیہ قائم تھی اور حرمین شریفین سمیت مذکورہ عرب علاقے بھی اس کے ماتحت، یعنی خلافتِ عثمانیہ کا حصہ تھا۔ [ص۔ ی]

الْأُمَّةُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، مِنْهَا وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ، وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ فِي النَّارِ، قِيْلَ: مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ" [1] (رواه الحاكم في مستدركه بهذا اللفظ وهو في السنن والمسانيد)

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تیرا رب قیامت کے دن ان کے درمیان ان کے اختلاف کا فیصلہ کرے گا۔

اسی طرح جو اختلاف کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ کا علم آ جانے کے بعد اس امت میں پڑ گیا اور بہتر فرقے اہلِ بدعت کے پیدا ہو گئے اور خود فرقۂ ناجیہ اہلِ سنت میں سے مختلف گروہ برآمد ہوئے اور ہر کسی نے اپنا ایک خاص نام رکھا، جیسے: مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی، صوفی، چشتی، قادری، سہروردی اور اسی طرح کے اور نام اور سلف صلحا کا اتفاق فرقوں میں بٹ گیا اور ہر گروہ نے اپنے آپ کو درست اور دوسرے کو غلط جان لیا، حالانکہ اصل دینِ خالص میں ہمارا کوئی نام ونشان سوائے اسلام اور مسلمان کے نہیں ہے، سو اس اختلاف ہفتاد و دو ملت کا فیصلہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جبار تعالیٰ شانہ کے سامنے ہو جائے گا اور ہر بدعتی جان لے گا کہ حق پر کون تھا اور پیغمبر آخر الزمان کی سنت سے روگردانی کس نے کی اور کس نے نہیں کی۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مُبَوَّء اسمِ مکان ہے یا مصدر ہے۔ اس لفظ کی اضافت عرب کے قاعدے پر صدق کی طرف کی جاتی ہے۔ عرب جب کسی شے کی مدح کرتے تو اس کو صدق کی طرف اضافت کرتے۔ اس جگہ مراد ایسی جگہ ہے جو محمود ہو، اچھی ہو، جو سب اختیار کر کے خوش ہوں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ زمین مصر تھی۔ [2] بعض نے کہا ہے بلکہ فرعون کے ماتحت جمیع مملکت تھی اور قومِ فرعون کے زیرِ تسلط تمام کھیتیاں اور باغات اور درخت وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد اردن اور فلسطین ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد شام ہے۔ [3]

بعض نے کہا ہے کہ بیت المقدس ہے، اس لیے کہ یہ بلاد فراخی اور خیر و برکت والے ہیں۔ طیبات سے مراد رزق کی لذت والی چیزیں ہیں۔ پھر ان کا اختلاف دین کے معاملے میں تھا اور اس کے بعد وہ مختلف فرقوں اور قبیلوں میں بٹ گئے تھے، حالانکہ اس سے پہلے وہ سب ایک ہی راہ پر تھے، کوئی اختلاف ان میں نہ تھا۔ ان کے پاس علم آیا، علم سے مراد تورات کا نزول ہے۔ تورات میں احکام تھے اور محمد ﷺ کی نبوت کی خبر تھی۔ یا علم سے مراد قرآن ہے کہ انھوں نے اس میں اختلاف کیا اور نبی اکرم ﷺ کی صفت میں مختلف ہو گئے، کوئی ایمان لایا اور کوئی منکر ہوا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علم سے مراد کتاب منزلِ الٰہی ہے اور اللہ کا امر و نہی۔ [4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩٢) مسند أحمد (٣/ ١٤٥) مستدرك الحاكم (١/ ٢١٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)

[2] تفسير الطبري (١٥/ ١٩٨) [3] تفسير الطبري (١٥/ ١٩٩) [4] تفسير الطبري (١٥/ ١٩٩۔ ٢٠٠)

قرآن کا نام علم رکھا، اس لیے کہ ایک علم کا ذریعہ ہے۔ پہلے قول کے مطابق اختلاف کرنے والے یہود ٹھہرتے ہیں، جنھوں نے تورات کے نازل ہونے کے بعد اختلاف کیا۔ دوسرے قول کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے یہود ہیں، سو دین کے جس معاملے میں یہ مختلف ہو گئے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا فیصلہ کرے گا اور مومنوں کو نجات دے گا اور کافروں کو عذاب دے گا۔ محسن کو اچھا بدلہ اور برائی کرنے والوں کو برا بدلہ مل جائے گا، حق پر چلنے والا جزا پائے گا اور باطل پر چلنے والا اپنے عمل کی سزا پائے گا۔[1]

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۙ۝۹۴ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۵ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۙ۝۹۶ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝۹۷

پھر اگر آپ (اس کتاب کے متعلق) شک میں ہوں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھیے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، یقیناً آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں (94) اور آپ ہرگز ان لوگوں میں سے نہ ہوں جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، ورنہ آپ خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے (95) بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے (96) خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں (97)

سابقہ کتابوں میں قرآن اور نبی اکرم ﷺ کی تصدیق:

یہ بات ٹھیک آئی جو ابلیس کو فرمایا تھا کہ تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو دوزخ میں بھر دوں گا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ”لَا أَشُكُّ وَلَا أَسْأَلُ“[2] یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام سعید بن جبیر اور حسن بصری رحمہ اللہ کا بھی ہے،[3] اس میں امت کے لیے ثابت قدمی ہے اور اس بات کی اطلاع ہے کہ ان کے نبی کی صفت پہلی کتابوں میں، جو اہل کتاب کے ہاتھ میں ہیں، موجود ہے، جیسے

---

[1] فتح البیان (٦/ ١٢٠۔ ١٢١) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٠٢) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٠٢) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٨٦)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ [الأعراف: ۱۵۷] ”(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔“

پھر باوجود اس علم کے یہ کتاب والے تلبیس وتحریف وتبدیل کرتے ہیں، حالانکہ نبی اکرم ﷺ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، لیکن حجت قائم ہو جانے کے باوجود نبی اکرم ﷺ پر ایمان نہیں لاتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن پر تیرے رب کا کلمہ ثابت ہو چکا ہے وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے، گو ان کے پاس کیسی ہی کوئی نشانی کیوں نہ آ جائے، یہاں تک کہ وہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اس سے مراد ایسا ایمان ہے جو فائدہ دے، ورنہ حالتِ یاس (عذاب کو دیکھ کر) کا ایمان کچھ فائدہ مند نہیں، اسی لیے موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون اور اس کے سرداروں پر بددعا کی تو اس میں یہ بھی کہا: ﴿ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ۸۸] جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۱۱۱] ”اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے، اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے، تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔“[1]

شک کا مخاطب اور مراد:

فتح البیان میں ہے کہ اے پیغمبر! اگر تم کو اس تنزیل میں کچھ شک ہو، یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور مراد دوسرے ہیں۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے شفا میں کہا ہے کہ دیکھ تیرے دل میں کہیں یہ خطرہ نہ ہو کہ نبی اکرم ﷺ کو وحی میں شک تھا، کیوں کہ آپ ﷺ پر شک کا ورود جائز نہیں ہے۔[2] امام ثعلب اور مبرد رحمہما اللہ نے کہا: اے پیغمبر! تم کافر شخص سے کہہ دو کہ اگر تجھ کو اس میں کچھ شک ہے تو تو اہلِ کتاب سے پوچھ لے۔ جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کی امثال، یہ اس لیے ہے کہ اُس وقت کے بت پرست یہود کے علما ہونے کا اقرار کرتے تھے اور اپنی نسبت ان کو زیادہ عالم جانتے تھے۔[3]

اس لیے اللہ نے شک کرنے والوں کو اہلِ کتاب کے علما سے، جو اسلام لے آئے تھے، سوال کرنے کا کہا، فرمایا کہ وہ کہہ دیں گے کہ ہاں یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور تورات اس کی شاہد ہے اور اسی کے بارے میں بتاتی ہے، کیوں کہ یہ بات ان کے نزدیک حق ثابت ہو چکی تھی اور نبی اکرم ﷺ کے

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ٥٦٤) [2] الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ (۲/ ۹۹) [3] تفسیر القرطبي (۸/ ۳۸۲)

بارے میں بشارت ان کی کتابوں میں موجود تھی۔ مراد نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو احبار کی شہادت کے ساتھ ظاہر کرنا ہے، لیکن اس وجہ میں باوجود اچھائی کے مخالفت ظاہر ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے خطاب نبی اکرم ﷺ کو کیا اور یہ خطاب تمام مخلوق کے لیے ہے۔[1] یہ وجہ بھی اچھی ہے، لیکن اس میں بُعد ہے، اس لیے کہ جب رسول اللہ ﷺ اس خطاب میں داخل رہے تو ایراد موجود اور اعتراض وارد رہا۔ کسی نے کہا کہ اس جگہ حرف اِنْ نفی کے معنے میں ہے، یعنی تم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ تم کسی سے سوال کرو اور یہ وجہ ابعد ہے۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد وہ کافر ہے جو یقینی طور پر نبی اکرم ﷺ کی تکذیب یا تصدیق نہیں کرتا، بلکہ شک میں ہے۔[2]

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے نہ کہ غیر کو اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تو ان لوگوں میں سے ہوتا جن کو شک لگتا ہے اور اہلِ کتاب سے پوچھتا تو وہ تیرے شک کو دور کر دیتے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ شک بمعنی ضیق صدر (سینے کی تنگی) ہے، یعنی اگر تیرا دل ان لوگوں کے کفر سے تنگ ہوتا ہے تو تو صبر کر اور اہلِ کتاب سے پوچھ کہ تجھ سے پہلے جو پیغمبر تھے، انھوں نے قوم کی ایذا رسانی پر کیسا صبر کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کے معنی بطور فرض اور تقدیر کے ہیں کہ اگر مثلاً وفرضاً تجھ کو شک ہو اور شیطان کسی طرح کا خیال دل میں ڈالے تو تو دریافت کر لے، یہ لوگ تجھ کو تیری نبوت کی اور اس قرآن کی خبر دیں گے اور اقرار کریں گے کہ ہاں یہ سچ ہے، اس لیے کہ وہ تیری تعریف اپنی کتابوں میں لکھی ہوئی پاتے ہیں۔

ان میں جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں ان سے حقیقت کو چھپانے کا مقصد زائل ہو چکا ہے۔ بے شک یہ حق ہے جو تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اللہ نے یہ بات قسم کھا کر کہی۔ اب اصل بات سے شک قطع ہو گیا اور تفاسیر کا اختلاف جاتا رہا، سو تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ اپنے یقین پر رہ اور ممکن ہے کہ یہ نہی دوسروں کو بتانے کے لیے ہو، جس طرح قرآن میں بہت جگہ ایسے ہوا ہے۔

جن کے مقدر میں کفر ہے، وہ کافر ہی مریں گے:

اسی طرح نبی اکرم ﷺ کو تکذیب کی ممانعت کرنا دوسروں کو بتانے کے لیے ہے اور اس بتانے میں جو ڈانٹ ڈپٹ شک کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کو ہے وہ زیادہ ظاہر اور مؤثر ہے، اس بات سے کہ خود ان کو ممانعت کی جاتی، کیوں کہ جب ایسے شخص کو منع کیا گیا جس سے ان امور کا صادر ہونا ممکن ہی نہیں ہے تو پھر ایسے شخص کا کیا ذکر جس سے ان کا صادر ہونا ممکن ہے۔ جن لوگوں کے لیے اللہ کی قضا اور قدر جاری ہو چکی ہے کہ وہ کفر پر مصر رہیں

[1] معاني القرآن (٣/ ٣٢)
[2] تفسير القرطبي (٨/ ٣٨٢)

گے اور کفر ہی پر مریں گے، ان سے ایمان لانا کسی حالت میں بھی نہیں ہوتا، اگرچہ ایمان کی صورت واقع ہو، جیسے عذاب دیکھ لینے کے وقت ایمان کا اقرار کرنا کہ یہ حکم عدم میں ہے (یعنی واقع ہی نہیں ہوا)۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا غصہ ان پر نافرمانی کی وجہ سے ثابت ہو چکا۔[1] بعض نے کہا ہے کہ اللہ کی لعنت آ چکی۔ کسی نے کہا ہے کہ کلمہ سے مراد یہ کلمہ ہے: "خَلَقْتُ هٰؤُلَاءِ لِلنَّارِ وَلَا أُبَالِيْ" آیت کے الفاظ آیاتِ تکوینیہ وتنزیلیہ دونوں کو شامل ہیں، چونکہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے اور قول سچ ہو چکا، اب وہ کسی نشانی پر وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، ایمان لانے والے نہیں ہیں، جب تک کہ عذاب کو نہ دیکھ لیں اور اس وقت ان سے ایمان کی صورت واقع ہوگی، لیکن ایسے ایمان پر کسی حکم کا ترتب نہیں ہوتا۔[2]

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

پھر کیوں نہ ہوئی کوئی بستی ایسی کہ وہ (عذاب سے پہلے) ایمان لائی ہو، پھر اس کے ایمان نے اسے نفع دیا ہو، سوائے قومِ یونس کے۔ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے دنیاوی زندگی میں ذلت کا عذاب ٹال دیا، اور ہم نے ایک (مقرر) وقت تک انھیں (اس سے) فائدہ (اُٹھانے) دیا (98)

قومِ یونس کا عذاب سے پہلے ایمان لے آنا:

یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر ایمان لانا کسی کے کام نہیں آیا، مگر یونس علیہ السلام کی قوم کو، اس واسطے کہ ان پر عذاب کا حکم پہنچا تھا، یونس علیہ السلام کی شتابی سے عذاب کی صورت نمودار ہوئی تھی، وہ ایمان لے آئے، پھر بچ گئے، اسی طرح مکے کے لوگ فتح مکہ میں۔ ان پر اسلام کی فوج پہنچی، تاکہ انھیں قتل و غارت کرے، لیکن ان کا ایمان قبول ہو گیا اور امان ملی۔ اللہ فرماتا ہے کہ کوئی قریہ (بستی) پہلی امتوں میں سے جن کے پاس ہم نے رسول بھیجے تھے، پوری کی پوری ایمان نہیں لائی، بلکہ ساری قوم یا ان میں سے زیادہ لوگوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [یٰسٓ: ۳۰] "ہائے افسوس بندوں پر! ان کے پاس جو بھی رسول آیا وہ اس کا مذاق ہی اُڑاتے (رہے)۔"

نیز فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴾ [الذاريات: ٥٢] "اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو بھی رسول آیا تو انھوں نے بس یہی کہا کہ (یہ) جادوگر ہے یا دیوانہ۔" نیز

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٢٠٥) [2] فتح البيان (٦/ ١٢٢۔ ١٢٤)

فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۲۳] ''اور اسی طرح آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا، تو ان کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔''

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مجھ پر انبیا پیش کیے گئے، سو گزرا کوئی نبی اس کے ساتھ لوگوں کا ایک گروہ تھا اور کوئی نبی جس کے ساتھ ایک مرد تھا اور کوئی نبی جس کے ساتھ دو آدمی تھے اور کوئی نبی اس کے ساتھ کوئی نہ تھا، پھر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین کی کثرت کا ذکر کیا، پھر اپنی امت کی کثرت کا ذکر فرمایا، یہ اس کثرت سے تھے کہ خافقین (چاروں اطراف مشرق، مغرب، شمال اور جنوب) اور شرقی اور غربی جانب کو اس نے بھر دیا تھا۔[1]

غرض یہ ہے کہ کوئی ایسی بستی نہ ملی جو سب کے سب کامل ایمان لائے ہوں، ان بستیوں میں سے جو گزر چکیں، سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے۔ یہ اہلِ نینویٰ تھے اور ان کا ایمان لانا عذاب کے ڈر سے تھا، جس عذاب سے ان کے نبی نے ان کو ڈرایا تھا۔ جب قوم نے عذاب کے اسباب کو دیکھا اور رسول ان کے درمیان میں سے نکل کر چلے گئے تب انھوں نے اللہ سے استغاثہ کیا اور عاجزی اور زاری سے پیش آئے اور اپنے بچے اور مویشی اور جانور جمع کر کے اللہ سے عذاب کو ہٹا لینے کا سوال کیا، اس وقت اللہ نے ان پر رحم فرما کر عذاب کو اٹھا لیا اور ان کو مہلت دی۔ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس عذاب کے ساتھ آخرت کا عذاب بھی اٹھا لیا گیا یا صرف دنیا کا عذاب اٹھ گیا۔ اس بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اسی دنیا کا عذاب اٹھایا گیا، جس طرح کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں جگہ کا عذاب اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿١٤٧﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴾ [الصافات: ۱۴۷۔ ۱۴۸] ''اور ہم نے اسے ایک لاکھ (انسانوں) کی طرف بھیجا، یا وہ (اس سے کچھ) زیادہ ہوں گے۔ چناں چہ وہ لوگ ایمان لے آئے تو ہم نے انھیں ایک (مقرر) وقت تک فائدہ (اُٹھانے کا موقع) دیا۔'' ان پر ایمان کا اطلاق فرمایا اور ایمان آخرت کے عذاب سے چھڑاتا ہے، اور یہی قول ظاہر ہے۔ واللہ أعلم

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی کافر بستی کو عذاب آ جانے کے بعد نفع نہ دیا، یعنی عذاب آ جانے کے بعد چھوڑ دیا گیا ہو، مگر قومِ یونس علیہ السلام کی بستی کو۔ جب وہ اپنے نبی کو مفقود کر بیٹھے اور گمان ہوا کہ عذاب قریب آیا تو اللہ نے ان کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ توبہ کریں، انھوں نے ٹاٹ پہنا اور ہر چوپائے کا بچہ اس کی ماں سے جدا کر دیا، پھر چالیس رات تک اللہ سے فریاد کرتے رہے، اللہ نے جب ان کے دلوں کی سچائی کو جان لیا اور جو کچھ ان کے پہلے اعمال تھے ان پر ان کی ندامت اور توبہ کے بارے میں معلوم کر لیا تو ان سے عذاب کو اٹھا لیا، اس کے بعد کہ عذاب

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۳۷۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲۰)

ان کے سروں پر جھک پڑا تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نینویٰ جہاں یونس علیہ السلام کی قوم تھی، موصل میں تھا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ وغیرہ سلف سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں پڑھا ہے: "فَهَلَّا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ" ابو الجلد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب ان پر عذاب اترا تو ان کے سروں پر اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح پھرنے لگا، وہ اپنی قوم کے ایک عالم کے پاس گئے اور کہا ہم کو کوئی ایسی دعا سکھا دو کہ ہم اللہ سے وہ دعا کریں، شاید اللہ تعالیٰ ہم سے اس عذاب کو اٹھا لے۔ اس عالم نے کہا: تم یوں کہو: "يَا حَيُّ حِينَ لَا حَيَّ مُحيِ الْمَوْتىٰ يَا حَيُّ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ" اس دعا سے ان کا عذاب کھل گیا۔[1] ان کا سارا قصہ تفصیل کے ساتھ سورت صافات میں آئے گا۔[2] ان شاء اللہ تعالیٰ

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ﴿ لَوْ لَا ﴾ بمعنی هَلَّا ہے۔ امام اخفش اور کسائی رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[3] اس تخصیص میں سرزنش کے معنی ہیں۔ اللہ پاک نے اہلِ قریٰ مہلکہ کو پہلے یونس علیہ السلام پر ایمان نہ لانے پر عذاب کے نازل ہونے سے قبل جھڑکی دی کہ کس لیے ان بستیوں میں سے جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، کوئی ایک بستی بھی ایمان معتد بہ نہ لائی جو اس کو نفع دیتا، یعنی عذاب سے پہلے اگر وہ لوگ ایمان لے آتے تو عذاب سے بچ جاتے اور جیسی تاخیر فرعون نے کی، ویسی تاخیر نہ کرتے، مگر یونس علیہ السلام کی قوم کہ ان کی توبہ جو عذاب کو دیکھ لینے کے بعد کی تھی، قبول ہوئی۔ مفسرین کی ایک جماعت نے اسی طرح کہا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب واقع نہیں ہوا تھا، انھوں نے فقط عذاب کی علامت دیکھی اور اگر عین عذاب کو دیکھ لیتے تو پھر ایمان لانا کچھ فائدہ نہ دیتا۔[4] یہ بات زیادہ صحیح ہے امام ابن جریر رحمہ اللہ کے قول سے کہ جب وہ عذاب کو دیکھنے سے پہلے اس کی علامات کو دیکھ کر یا شروع شروع میں عذاب کے حلول سے قبل ایمان لے آئے تو وہ دنیا میں ہونے والا ذلت کا عذاب ان سے اٹھ گیا۔[5] یہ وہی عذاب تھا جس کا وعدہ یونس علیہ السلام نے ان سے کیا تھا کہ عنقریب تم پر عذاب آنے والا ہے، سو انھوں نے خود اس عذاب کو نہیں دیکھا، بلکہ اس کی نشانیاں دیکھیں، پھر اللہ نے اس عذاب کو اٹھا لینے کے بعد انھیں دنیا میں ایک وقتِ مقررہ تک باقی رکھا، اس سے مراد ان کی موت آ جانے تک ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ زجاج اچھا ہے، اس لیے کہ جس کے دیکھ لینے کے بعد ایمان نفع نہیں کرتا وہ تلبس بعذاب (یعنی عذاب کا آ جانا) ہے، جیسے فرعون کا قصہ۔[6]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی طرف

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٢٠٧_ ٢١٠) [2] رقم الآية [١٣٩] [3] تفسير القرطبي (٨/ ٣٨٣)
[4] معاني القرآن (٣/ ٣٤) [5] تفسير الطبري (١٥/ ٢٠٥_ ٢٠٦) [6] تفسير القرطبي (٨/ ٣٨٤)

بلایا، قوم نے انکار کیا تو انھوں نے عذاب کا وعدہ کیا اور کہہ دیا کہ فلاں فلاں دن تم پر عذاب آئے گا اور خود ان میں سے نکل کر باہر چلے گئے۔ انبیا جب اپنی قوم کو عذاب کا وعدہ دیتے تھے تو خود باہر نکل جاتے تھے۔ جب عذاب ان پر سایہ فگن ہوا تو قوم نے نکل کر عورت اور اس کے بچے اور جانور اور اس کے بچے کے درمیان جدائی کر دی اور اللہ کی طرف چیخنے چلانے لگے۔ اللہ نے ان کی راستی معلوم کر کے توبہ قبول کی اور عذاب کو پھیر دیا اور یونس علیہ السلام راہ میں بیٹھ کر خبر پوچھتے تھے۔ ایک شخص کا گزر ہوا، اس سے پوچھا: قومِ یونس کا کیا حال ہے؟ اس نے ان کے فعل کا حال بیان کیا، انھوں نے کہا: میں لوٹ کر اس قوم کے پاس نہ جاؤں گا جن سے میں نے جھوٹ کہا اور غصے میں آ کر چل دیا۔[1] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عذاب نے قومِ یونس کو ڈھانپ لیا جس طرح کہ قبر کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے ہیں جب مردہ قبر میں رکھا جاتا ہے اور آسمان سے خون برسا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب عذاب اترا تو ان کے اور عذاب کے درمیان صرف ایک میل کی دو تہائی کے برابر فاصلہ تھا، پھر اللہ نے ان کی دعا پر وہ عذاب کھول دیا (دور کر دیا)۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک میل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ امام وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان پر سخت دھوئیں سے ملا ہوا سیاہ بادل آیا تھا، اس نے ان کے شہر کو ڈھانپ لیا۔ یہ واقعہ عاشورے کے دن ہوا، اس دن جمعہ تھا، انھوں نے دعا: ”يَا حَيُّ ... الخ“ مانگی یا اس طرح کہا: ”اَللّٰهُمَّ ذُنُوبُنَا قَدْ عَظُمَتْ وَجَلَّتْ، وَأَنْتَ أَعْظَمُ وَأَجَلُّ، فَافْعَلْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهُ، وَلَا تَفْعَلْ بِنَا مَا نَحْنُ أَهْلُهُ“[3] (قاله الفضيل بن عياض) یعنی ع

تو مگر از طرف رحمت خود نزدیکی ورنہ من از طرف خویش بہ غایت دُورم

”تو تو اپنی رحمت کی بنا پر نزدیک ہے، ورنہ میں تو اپنی طرف سے (بوجہ گناہ) بہت دور ہوں۔“

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَي الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے، پھر کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے، حتی کہ وہ مومن ہو جائیں؟ (99) اور کسی شخص کے لیے (ممکن) نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر ایمان لائے، اور وہ (اللہ) ان لوگوں پر پلیدی (عذاب) ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے (100)

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٣٩٢) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٢٠٨) الدر المنثور (٤/ ٣٩٢)

[3] تفسير الخازن (٣/ ٢١٢) فتح البيان (٦/ ١٢٤۔ ١٢٦)

سب کو ایمان پر مجبور کرنا اللہ کی حکمت نہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! اگر تیرا رب چاہتا تو ساری زمین والوں کو ایمان لانے کا اذن دے دیتا، وہ سب تجھ پر ایمان لے آتے، لیکن اس کے کام میں حکمت ہے، جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [هود: ١١٨۔ ١١٩] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ ہمیشہ (باہم) اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے رب نے رحم کیا، اور اسی لیے اس نے انھیں پیدا کیا، اور آپ کے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ﴾ [الرعد: ٣١] ''کیا پھر ایمان والوں نے (ابھی تک) نہیں جانا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب ہی لوگوں کو ہدایت دے دیتا؟۔''

اسی لیے فرمایا کہ کیا تو زبردستی لوگوں کو مومن بنانا چاہتا ہے؟ یعنی یہ بات تیرے اختیار کی نہیں ہے اور نہ تجھ پر واجب ہے کہ تو سب کو مار مار کر زبردستی لوگوں کو مسلمان کرے، بلکہ اللہ پاک جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ تو اس حسرت میں اپنی جان کیوں کھوتا ہے؟ ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرة: ٢٧٢] ''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٣] ''وہ لوگ ایمان نہیں لاتے، آپ خود کو ہلاک ہی کر لیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦] ''(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔'' تیرا کام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا۔ ﴿ فَذَكِّرْ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [الغاشية: ٢١۔ ٢٢] ''چنانچہ آپ نصیحت کیجیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔''

ان کے علاوہ اور بہت سی آیتیں اس پر دلیل ہیں کہ ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ''، ''هادي من يشاء'' اور ''مضل من يشاء'' اللہ ہی ہے وہ جو کام کرتا ہے وہ علم و حکمت و عدل ہوتا ہے، اسی لیے فرمایا ہے کہ کوئی نفس اللہ کے اذن کے سوا ایمان نہیں لا سکتا اور گمراہی اس پر پڑتی ہے جو اللہ کی حجتوں اور دلیلوں کو نہیں سمجھتا۔ اللہ پاک ہر مُهدیٰ وَضَالّ کی ہدایت اور گمراہی میں عادل و حکیم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر تیرا رب چاہتا تو سب کے سب لوگ ایمان پر مجتمع ہو جاتے، نہ تفرقہ کرتے اور نہ مختلف ہوتے، لیکن اللہ نے کسی مصلحت سے یہ بات نہیں چاہی، لفظ ﴿ جَمِيْعًا ﴾ سے پہلے ﴿ كُلُّهُمْ ﴾ بطورِ تاکید کے فرمایا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾ [النحل: ٥١] ''دو الٰہ مت بناؤ'' بعض نے کہا ہے کہ ہر لفظ تمام چیزوں کا احاطہ کرنے یا سب چیزوں کو شامل کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن یہ دونوں لفظ اس لیے لائے ہیں کہ اس بات پر دلیل ہیں کہ ایمان کا وجود ان سے اجتماع کی صورت میں نہیں ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کو حرص تھی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں۔ اللہ نے کہا کہ یہ اللہ کی مشیت کے خلاف ہے جو کہ حکمتِ بالغہ اور مصالح راجحہ پر منحصر ہے۔ وہ مشیت اس کا تقاضا نہیں کرتی، کیا تو ان پر زبردستی کرے گا اس معاملے میں جو مشیتِ الٰہی کے خلاف ہے کہ یہ بات تیری طاقت اور قدرت میں نہیں ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کو تادیب اور تسلی ہے اور آپ کے سینے کی تنگی کا دور کرنا ہے کہ اگر بالفرض صلاح کل ہی ہو جائے تب بھی اس کا حقیقی صلاح ہونا نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ صلاح فساد سے زیادہ قریب ہوگی۔ وللہ الحکمة البالغة.

اس سوالیہ انداز میں اس امر کا اظہار ہے کہ اگرچہ زبردستی ہوسکتی ہے اور اس پر قدرت بھی ہے، لیکن دیکھنا چاہیے کہ زبردستی کرنے والا کون ہے، سو وہ اکیلا ہے، یہ اسی کی شان ہے کہ اگر چاہے تو دلوں میں ایسی چیز پیدا کر دے جو ان کو ایمان کی طرف بے چین کر دے۔ یہ بات کسی بشر کی استطاعت میں نہیں ہے اور جب تک اللہ پاک کا اذن نہیں ہوتا، کوئی نفس ایمان نہیں لا سکتا۔ ﴿ اَلرِّجْسَ ﴾ سے مراد عذاب یا غصہ یا کفر یا خذلان ہے۔ سو یہ انہی پر پڑتا ہے جو اللہ پاک کی حجتیں نہیں سمجھتے اور اس کی آیتوں میں تفکر و تدبر نہیں کرتے۔[1]

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے ﴿١٠١﴾ تو یہ لوگ بھی (گویا) ان لوگوں کے سے دِنوں کا

[1] فتح البیان (٦/ ١٢٦۔ ١٢٨)

انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزرے۔ کہہ دیجیے: پھر تم انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں (102) پھر ہم نجات دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اسی طرح ہم پر لازم ہے کہ ہم مومنوں کو نجات دیں (103)

کائنات میں غور وفکر:

اللہ پاک نے بندوں کو ارشاد کیا کہ تم ہماری نعمتوں میں تفکر کرو اور جو آیات درخشاں آسمان اور زمین میں عقل والوں کے لیے رکھی گئی ہیں ان میں غور سے دیکھو، جیسے: کواکب، ستارے، ثوابت، سیارے، سورج، چاند، رات، دن اور ان کا مختلف ہونا اور ایک کا دوسرے میں داخل ہونا کہ ایک بڑھتا ہے اور دوسرا گھٹتا ہے اور کبھی ایک گھٹتا ہے اور دوسرا بڑھتا ہے اور آسمان کا اونچا ہونا اور اس حسن و زینت سے رہنا اور اللہ کا آسمان پر سے پانی اتارنا اور پھر اس سے زمین کو زندہ کرنا اور پھلوں اور کھیتیوں اور پھولوں اور سبزیوں کی مختلف شاخوں کا اس میں سے نکالنا اور مختلف شکل اور رنگ کے چلنے والے جانوروں کا بکھیرنا اور پہاڑوں اور نرم زمین اور چٹیل زمین اور بستیاں اور ویرانے وغیرہ کا بہت سے فوائد کے ساتھ اس میں رکھنا اور دریا میں عجیب چیزوں اور لہروں کا ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرنے والوں کے لیے اس کا مطیع ہونا اور اپنے اوپر کشتیوں اور جہازوں کو لادنا اور کشتیوں کا آرام سے اپنے مسافروں کو لے کر چلنا ”لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاهُ“.

تباہی ونجات میں اللہ کی سنت:

پھر فرمایا کہ یہ آسمانوں اور زمینوں کی نشانیاں اور رسولوں کا حجتوں اور براہین کے ساتھ آنا جو ان کی سچائی کی دلیل ہیں یہ سب چیزیں اس قوم کے لیے کوئی فائدہ مند نہیں جو ایمان نہیں لاتی، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴾ [يونس: ٩٦] ”بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“ کیا یہ لوگ ویسے دنوں کا انتظار کرتے ہیں جیسے دن پہلی امتوں پر آ چکے ہیں، یعنی وہی عذاب اور سزائیں جو پہلے مکذبینِ رسل پر گزر چکی ہیں اور ایام اللہ میں ہو چکی ہیں، سو تم اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمھارے ہمراہ منتظر ہوں۔ پھر جب اللہ کا عذاب کسی قوم اور امت پر آتا ہے تو اللہ رسولوں اور مومنین کو بچا لیتا ہے اور رسولوں کو جھٹلانے والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اللہ نے اپنے نفسِ مقدس پر یہ بات واجب کر رکھی ہے کہ وہ مومنوں کو نجات دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ [الأنعام: ١٢] ”اس نے (مخلوق پر) مہربانی کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔“ حدیثِ صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ كِتَاباً فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ: إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي »[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ ایمان بغیر اللہ کی مشیت کے حاصل نہیں ہوتا تو اب یہ حکم دیا کہ تم لوگ آسمان اور زمین کی نشانیوں اور دلائل میں نظر اور استدلال کرو، نظر سے مراد غور وفکر کرنا اور عبرت حاصل کرنا ہے۔ ان چیزوں پر غور وفکر کرنے سے، جو اپنے پیدا کرنے والے کی کاریگری پر دلالت کرتی ہیں، پیدا کرنے والے کی وحدت اور کمالِ قدرت ثابت ہوتی ہے۔ غور وفکر کرنے کا طریقہ رسالہ "کشف الستر عن وجه الذكر والفكر" میں بیان کیا گیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان دلائل میں تفکر وتدبر اس شخص کے لیے فائدہ مند نہیں ہے جس کی بدبختی مستحکم ہو چکی ہے۔ سو کیا یہ کفار پہلی امتوں پر اللہ کے ایام کا سا انتظار کرتے ہیں کہ مثلاً جو بلا قومِ نوح، عاد اور ثمود پر رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے اتری تھی، ویسا ہی عذاب اپنی تمام تر قسموں کے ساتھ ان پر بھی نازل ہو، نبی اکرم ﷺ کو جھٹلانے کی وجہ سے اور یہ اپنے کفر پر مصمم رہیں اور ڈٹے رہیں، یہاں تک کہ اللہ پاک کا عذاب آ جائے۔ عرب عذاب اور انعام کو ایام کہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ظاہر ہے: ﴿ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ﴾ [إبراهيم: ٥]

"اور انھیں اللہ کے ایام (احسان) یاد دلا۔"

اچھا اگر ان کا انتظار اسی کام کے لیے ہے تو یہ چشم براہ وگوش بر آواز رہیں اور ہم بھی انتظار کریں گے، یعنی اپنے رب کے وعدے کا۔ اس میں سخت قسم کی ڈانٹ اور وعیدِ بالغ ہے کہ جیسی ہلاکت پہلی امتوں پر آئی تھی، اسی طرح کی ہلاکت عن قریب ان پر بھی نازل ہوگی۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ عذاب کو نازل کرتے وقت اپنے رسولوں اور مومنوں کو بچا لیتا ہے اور اس بات کو اس نے ازراہِ فضل وکرم اپنے اوپر واجب وثابت اور لازم کر رکھا ہے۔ مومنین سے مراد اہلِ ایمان کی جنس ہے، اس میں رسول اور ان کے متبعین سب داخل ہیں یا خاص وہ مومنین ہیں جو رسولوں کے تابع تھے، اس لیے کہ رسول تو بالاولیٰ ان میں داخل ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام ہیں جو مشرکین کے عذاب کے وقت موجود ہوں۔[1]

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ۝۱۰۴ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۵ وَ لَا

[1] تفسير الجلالين (١/ ٢٨٢) فتح البيان (٦/ ١٢٨ـ ١٢٩)

تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ
فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ
فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ
يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

کہہ دیجیے: اے لوگو! اگر تم میرے دین سے (متعلق) شک میں ہو تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، لیکن میں تو اللہ کی عبادت کرتا ہوں وہ جو تمھیں وفات دیتا ہے اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں سے ہو جاؤں ﴿104﴾ اور یہ کہ آپ یکسو ہو کر اپنا چہرہ دین (اسلام) کی طرف سیدھا رکھیں اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہوں ﴿105﴾ اور آپ اللہ کے سوا انھیں مت پکاریں جو نہ آپ کو نفع دے سکتے ہیں اور نہ آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، پھر اگر آپ نے ایسا کیا تو بے شک آپ بھی اس وقت ظالموں میں سے ہوں گے ﴿106﴾ اور اگر اللہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی بھی اسے دور کرنے والا نہیں، اور اگر اللہ آپ کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو کوئی بھی اس کے فضل کو رد کرنے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس (فضل) سے نوازتا ہے، اور وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿107﴾

ایک اللہ کی عبادت اور اسی پر توکل کا حکم:

قبض کر لیتا ہے، یعنی موت دے دیتا ہے۔ اللہ کی یہ صفت سب لوگ سمجھتے ہیں، اس لیے یہ بتا دیا کہ آخر اسی کی طرف کھنچے جاؤ گے، کیوں کہ مشہور ہے کہ اللہ ہی کی طرف سب آخر کو کھنچے جائیں گے تو بس اللہ ایک ہے، اس کے سوا کسی طرف رجوع کرنا حماقت سے شرک کرنا ہے۔ حنیف نام ہے دینِ ابراہیم والوں کا، عرب شرک کرتے اور اپنے آپ کو حنیف بھی کہے جاتے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا کہ تم ان لوگوں سے یہ بات کہہ دو کہ یہ دینِ حنیف جس کی وحی اللہ نے تجھ کو کی ہے، اگر تم کو اس کی صحت میں کچھ شک ہے تو جس کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو میں اس کو نہیں پوجتا، میں تو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرتا ہوں۔ میرا معبود وہ ہے جو تم کو وفات دے گا، جس طرح کہ اس نے تم کو زندہ کیا ہے، پھر تم اسی کی طرف پھر کر آؤ گے۔ چنانچہ اگر تمھارے یہ معبود، جن کی تم پوجا کرتے ہو، سچے ہیں تو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، اچھا تم ان کو بلاؤ، یہ مجھ کو کچھ نقصان پہنچائیں۔ یہ تو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع دے سکتے ہیں اور وہ ذات جس کے ہاتھ میں نقصان اور نفع ہے وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں مومن ہوں۔

پھر اللہ نے کہا: اے رسول! تم خالص اللہ کی عبادت کرو، حنیف ہو کر۔ حنیف وہ ہے جو شرک سے منحرف ہو، اسی لیے فرمایا کہ تو مشرکوں میں سے نہ ہو۔ خیر وشر اور نفع ونقصان سب کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، سو ایسا ہی شخص عبادت کا حق رکھتا ہے جو وحدہ لاشریک لہ ہو۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «اُطْلُبُوا الْخَيْرَ دَهْرَكُمْ كُلَّهُ، وَتَعَرَّضُوا نَفَحَاتِ رَبِّكُمْ، فَإِنَّ لِلّٰهِ نَفَحَاتٌ مِّنْ رَّحْمَتِهِ يُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ، وَاسْأَلُوْهُ أَنْ يَّسْتُرَ عَوْرَاتِكُمْ وَيُؤْمِنَ رَوْعَاتِكُمْ»[1] (رواه ابن عساكر بسنده ثم رواه عن أبي هريرة ﷺ مرفوعا بمثله سواه) اللہ غفور ہے، یعنی جو کوئی اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے کسی گناہ سے، یہاں تک کہ شرک سے تو وہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ اپنے طریقے کا فرق طریقۂ مشرکین سے ظاہر کر دے۔ نَاسُ سے مراد سب لوگ ہیں یا خاص کفار یا خاص طور سے اہلِ مکہ کہ اگر تم کو میرے اس دین میں کچھ شک ہے جس پر میں ہوں، یعنی عبادت صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی، اور تم کو اس دین کی حقیقت معلوم نہیں ہے اور نہ تم اس کا صحیح ہونا پہچانتے ہو تو تم جان لو کہ میں تمھارے دینوں سے جن پر تم قائم ہو بری اور بیزار ہوں۔ میں ہرگز اس کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جس کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، لیکن میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو موت دیتا ہے۔ تمام صفات میں سے مارنے کی صفت کو بالخصوص اس لیے ذکر کیا کہ اس میں سخت سرزنش ہے، کیوں کہ جو مار سکتا ہے وہ تم پر سخت قسم کا عذاب بھی نازل کر سکتا ہے۔ نیز اس میں مخلوق کو پہلی بار پیدا کرنے اور مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل ہے۔ یہ حال دلوں میں شدید ہیبت پیدا کرتا ہے اور پہلی امتوں کے کافروں پر ہلاکت اور عذاب نازل ہونے کا ذکر گزر چکا۔ گویا یہ ارشاد کیا ہے کہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس نے مجھ کو تمھارے ہلاک کرنے کا وعدہ دیا ہے اور مجھے ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

پھر اللہ نے ارشاد کیا کہ اے پیغمبر! تم دین پر قائم اور ثابت قدم رہو، کسی حال میں بھی توحید سے انحراف نہ کرو۔ وَجْہ کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ وجہ (چہرہ) تمام اعضا سے اشرف ہے یا اس میں قبلے کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے اور اس کی سمت سے دوسری طرف نہ پھرنا۔ حنیف وہ ہے جو ہر دین سے منہ پھیر کر دینِ اسلام کی طرف آئے اور سیدھا رہے، ٹیڑھی راہ پر نہ چلے، پھر اس نہی کی تاکید نہی کے ساتھ فرمائی اور کہا کہ تو مشرکوں میں سے نہ ہو اور کسی کو اللہ کے سوا کسی حال میں بھی نہ پکارو۔ دعا سے اس جگہ مراد عبادت ہے۔ اللہ کے سوا کوئی شے تجھ کو نفع ونقصان نہیں

[1] المعجم الكبير (١/ ٢٥٠) تاريخ دمشق (٢٤/ ١٢٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٨٩٠)

[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٦٦ـ ٥٦٧)

پہنچا سکتی۔ ایسی شے کا پکارنا جو نفع اور نقصان پہنچانے والی نہیں ہے، کسی عقل مند کا کام نہیں ہوتا، جب کہ کوئی ایسا شخص نہ ملے جو نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہو، پھر جب ایسا قادر قدیر موجود ہو تو اس قادر سے دعا کرنے سے عدول کرنا (منہ پھیرنا) اور کسی غیر قادر کی طرف منہ کرنا اور بھی زیادہ قبیح اور برا اور ذلیل فعل ہے، اس کے ساتھ اگر تو ایسا کرے گا تو تیری گنتی ظالموں میں ہو جائے گی۔ اس خطاب سے مراد غیر کو توجہ دلانا ہے، اس لیے کہ نبوت کا دامن ایسی آلودگی اور گندگی سے پاک ہوتا ہے۔

پھر فرمایا کہ اگر تجھ کو کوئی آفت پہنچے تو اس کا کھولنے والا اور ٹالنے والا سوائے اللہ کے کوئی نہیں۔ معلوم ہوا کہ ضرر اور نفع دینے والا فقط اللہ ہے۔ اس کی ضرر رسانی کو کوئی شے دور نہیں کر سکتی۔ یہ کشف (دور کرنا) اللہ کے ساتھ مختص ہے اور اگر اللہ ارادہ خیر کا کرے گا تو کسی کی یہ قدرت اور طاقت نہیں کہ وہ اس میں حائل ہو سکے یا اس کو روک سکے، وہ کوئی ہو اور کہیں ہو۔

نیسابوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ارادہ کو خیر کی جانب خاص کیا ہے اور مَسّ کو شر کی جانب، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ خیر کا واقع ہونا اللہ پاک سے بالذات ہوتا ہے اور شر کا واقع ہونا سامنے پیش ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔[1] میں کہتا ہوں کہ اس میں نظر ہے، کیوں کہ مس ارادہ کے سوا ایک امر ہے اور وہ مستلزم ہے ارادے کو۔ بعض نے کہا ہے کہ مس ضر بقصد اول نہیں ہے، بلکہ بقصد ثانی اور معنی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

بالجملہ جب اللہ کا ارادہ خیر کا ہوتا ہے تو کوئی اس کے فعل کو دفع کرنے والا نہیں ہے۔ ضمیر کی جگہ لفظ فضل کا اس لیے ذکر کیا کہ اللہ جو خیر عطا کرتا ہے وہ اللہ کا فضل و کرم ہی ہوتا ہے، کسی کا اللہ پر کچھ استحقاق نہیں ہے۔ یہاں استثنا نہیں کیا، اس لیے کہ اللہ کی مراد کا رد کرنا ممکن نہیں ہے۔ اللہ کا ارادہ ایک صفتِ قدیمہ ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس مَسّ ضر ایک صفتِ فعل ہے، اللہ جس بندے پر چاہتا ہے اپنا فضل و کرم یا ضر کرتا ہے، اس کی ذات مقدس غفور و رحیم ہے۔

حکایت:

عامر بن قیس نے کہا ہے کہ کتاب اللہ کی تین آیتیں ہیں، میں نے ساری خلائق کے عوض ان پر اکتفا کیا ہے: ایک یہ آیت: ﴿اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ﴾ (آیتِ باب) دوسری یہ آیت: ﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ﴾ [الفاطر: ٢] ''اللہ لوگوں کے لیے (اپنی) رحمت سے جو کھول دے تو کوئی اسے بند کرنے والا نہیں، اور جسے وہ بند کر دے اس کے بعد کوئی اسے بھیجنے (کھولنے) والا نہیں۔'' اور تیسری یہ آیت: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [هود: ٦] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔''[2] (أخرجه البيهقي في الشعب وأخرج أبو الشيخ عن الحسن نحوه)

[1] فتح القدير (٢/ ٦٦٧) [2] شعب الإيمان (٢/ ١١٢) الدر المنثور (٤/ ٣٩٤) فتح البيان (٦/ ١٣٠۔ ١٣٢)

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَکُمُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ فَمَنِ اہۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَہۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۸﴾ؕ وَ اتَّبِعۡ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیۡکَ وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ۚۖ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

کہہ دیجیے: اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، چناں چہ جس (شخص) نے ہدایت پائی تو یقیناً وہ اپنے ہی لیے ہدایت پاتا ہے، اور جس نے گمراہی اختیار کی تو یقیناً وہ اپنے ہی لیے گمراہی اختیار کرتا ہے۔ اور میں تمھارا وکیل نہیں ہوں (108) اور آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے آپ اس کی اتباع کیجیے، اور صبر کیجیے، حتی کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (109)

دینِ حق آ چکا ہے:

اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو دین میں اللہ کے پاس سے لایا ہوں، وہی حق ہے، اسی کی طرف لوٹنا ہوگا اور جو کوئی اس دین سے گمراہ ہو جائے گا اس کی گمراہی کا وبال اس کی جان پر پڑے گا، میں کچھ تم لوگوں پر داروغہ نہیں ہوں کہ تم چاہو یا نہ چاہو ایمان ہی لاؤ، میں ایک تمھارا ڈرانے والا ہوں اور ہدایت کرنا اللہ کا کام ہے۔ پھر خاص نبی اکرم ﷺ کو ارشاد کیا کہ تم اس وحی کی پیروی کرو اور جب تک اللہ تمھارے اور ان کے درمیان فیصلہ نہ کرے، تب تک تم صبر کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ عدل وحکمت کی راہ سے تمام حاکموں سے بہترین حاکم ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ حق سے مراد قرآن یا اسلام یا محمد ﷺ ہیں۔ ہدایت کا فائدہ ہدایت پانے والے کو اور کفر کا نقصان کافر کو ہوتا ہے، اللہ پاک کو اس سے کچھ غرض نہیں ہے اور نہ یہ نفع یا نقصان اس کی طرف لوٹتا ہے۔ پیغمبر کچھ امت کے وکیل اور معاملات کے محافظ نہیں ہیں، پیغمبر پر تو صرف اللہ کے امر و نہی کا اتباع کرنا اور کافروں کی ایذا رسانی پر صبر کرنا اور اللہ کے احکام کو پہنچانا ہے، چاہے مشرکین متلون الاخلاق ہوا کریں اور جو چاہیں بکیں۔ اس صبر کی غرض یہ ہے کہ اللہ رسول اور امت کو اس دنیا میں اپنی مدد سے نوازتا رہے اور کفار کو آخرت میں عذاب دے اور یہ اہلِ کفر وشرک دیکھیں کہ اللہ رسول اور ان کی امت اجابت جو ان پر ایمان لائی ہے اور ان کے حکم پر چلی ہے اور ان کی نہی سے باز رہی ہے جنت کی نعمتوں میں پھرتے ہیں، کون سی جنت؟ وہ جو کبھی ختم نہ ہو اور جس کی تعریف کسی سے نہ ہو سکے اور اس کے ادنیٰ سے مزے سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت جہاد کے حکم کے ساتھ منسوخ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی

کے قائل ہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صبر کیا، یہاں تک کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم آیا اور اہلِ کتاب سے جزیہ لیا۔[1] اس قول میں قولِ مجاہد کی طرف اشارہ ہے۔ (قاله الكرخي) بیان ناسخ ومنسوخ میں رسالہ "إفادة الشيوخ" میں نسخ کے بارے میں تمام مباحث، دلائل اور اختلافی آرا جمع کر دیے گئے ہیں اور استقراء و مناظرہ کے بعد یہ بات ٹھہری ہے کہ کل پانچ آیتیں اور دس حدیثیں منسوخ ہیں، پس بس، سو اس مقدارِ یسیر کو ہر طالبِ علم نوکِ زبان پر یا کسی کتاب کے صفحے پر لکھ کر یاد کر سکتا ہے یہ عمل بالکتاب والسنہ کا ایک سہل طریقہ ہے اور مقلدین کے تمام عذروں کا توڑ ہے۔ ولله الحمد.[2]



[1] تفسير الجلالين (١/ ٢٨٣) [2] فتح البيان (٦/ ١٣٣)

سورت ہود

مکی مدنی کی بحث:

اس میں ایک سو تیئیس (۱۲۳) آیات ہے۔ امام حسن، عکرمہ، عطاء، جابر، مجاہد اور ابن زید رحمہم اللہ کے مطابق مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سوائے ایک آیت: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ... الآية﴾ [هود: ۱۱۴] کے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے مگر یہ آیت: ﴿ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ ... الخ﴾ [هود: ۱۲] اور ﴿ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ... الآية﴾۔[1] حاصل یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس میں ایک آیت مدنی ہے اور امام مقاتل رحمہ اللہ کے نزدیک دو آیتیں مدنی ہیں۔

فضیلت:

کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پڑھو تم سورت ہود کو جمعہ کے دن۔[2] (أخرجه الدارمي وأبو داود والبيهقي وغيرهم) سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو بڑھاپا جلد آ گیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ کو ہود، واقعہ، مرسلات، نبا اور تکویر نے بوڑھا کر دیا۔[3] (أخرجه الطبراني والترمذي وحسنه) اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ﴾ کو بھی زیادہ کیا ہے۔[4] (رواه البزار) یہ حدیث بہت طریق سے ایک جماعتِ صحابہ سے مروی ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھاپے کا ان سورتوں کو سبب قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں قیامت اور مر کر دوبارہ جی اٹھنے اور حساب و کتاب اور جنت اور دوزخ کا ذکر ہے۔ والله أعلم بمراد رسوله ﷺ.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱

اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝۲ وَّاَنِ

---

[1] تفسير الخازن (٣/ ٢١٦)

[2] سنن الدارمي (٢/ ٥٤٥) المراسيل لأبي داود (١/ ١٠٤) شعب الإيمان (٢/ ٤٧٢) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٧) المعجم الأوسط (٨/ ١٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٥٥)

[4] الدر المنثور (٤/ ٣٩٦)

اَسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴

الٓرٰ، (یہ وہ) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، بڑی حکمت والے، بہت خبر رکھنے والے کی طرف سے ① یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمھارے لیے اسی کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ② اور یہ کہ تم اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر تم اسی کی طرف توبہ کرو، وہ تمھیں بہت اچھا فائدہ دے گا ایک مقرر وقت تک، اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل بخشے گا۔ اور اگر تم منہ موڑو گے تو بے شک میں تم پر ایک بڑے (ہولناک) دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ③ تمھارا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ④

قرآن اور اللہ کی عبادت کی دعوت:

اعمال کا پورا بدلہ دے اور زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ اجر دے، یعنی ایمان لاؤ تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے اور جو کوئی اس سے زیادہ محنت کرے، عمل کرے وہ زیادہ درجہ پائے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حرفِ ہجا پر کلام پہلے گزر چکا، سورت بقرہ کے شروع میں، اب اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان آیتوں کو اللہ تعالیٰ نے الفاظ میں محکم اور معنی میں مفصل فرمایا تو صورت اور معنے دونوں میں کامل ٹھہریں، امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کے قول کا یہی مطلب ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ اپنے اقوال اور احکام میں حکمت والا ہے۔ امور کے انجام کی اس کو خبر ہے، اس نے یہ قرآن محکم مفصل اس لیے اتارا ہے کہ صرف اللہ پاک کی عبادت کی جائے، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ”اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ”اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مخالف کو عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور اطاعت گزار کو خوش خبری سنانے والے، جس طرح صحیح

---

① تفسير الطبري (١٥/ ٢٢٦_ ٢٢٧)

حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کے لوگوں کو قرابت کے لحاظ سے پہلے قریبی کو، پھر دوسرے کو پکارا۔ جب وہ سب آ گئے تو فرمایا: اے قریش کی جماعت! بھلا اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ ایک لشکر یعنی رسالہ سواروں کا صبح کو تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ انھوں نے کہا کہ ہمیں تجھ پر جھوٹ بولنے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ فرمایا: میں تمھارا نذیر ہوں اور ایک آنے والے شدید عذاب سے تمھیں ڈراتا ہوں،[1] الحدیث.

میں تم کو استغفار کرنے کا حکم دیتا ہوں پچھلے گناہوں سے، اور اس بات کا کہ تم اللہ کی طرف توبہ کرو اور رجوع کرو، یعنی آیندہ کے لیے، گزشتہ را صلوات، اور پھر اسی پر قائم رہو، اللہ تعالیٰ تم کو دنیا میں ایک مقررہ مدت تک رکھے گا اور آخرت میں ہر ذی فضل کو اس کا فضل عطا فرمائے گا۔[2] (قاله قتادة) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صٰلِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [النحل: ٩٧] ''جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر و ثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کرتے تھے۔''

حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «وَإِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ إِلَّا أُجِرْتَ بِهَا حَتّٰى مَا تَجْعَلُ فِيْ فِيِّ امْرَأَتِكَ»[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فضل کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس نے برا کام کیا، اس پر ایک برائی لکھی گئی اور جس نے اچھا کام کیا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی گئیں۔ پھر اگر اس برائی پر جو دنیا میں کی تھی، سزا ہوئی تو دس نیکیاں اس کے لیے باقی رہیں، پھر کہا: ''هَلَكَ مَنْ غَلَبَ آحَادُهُ عَلٰى أَعْشَارِهِ''[4]

پھر اللہ نے سخت ڈانٹ دی اس شخص کو جس نے اللہ کے احکامات سے پیٹھ پھیری اور اس کے رسولوں کو جھٹلایا کہ اُس کو لامحالہ قیامت کے دن عذاب ہوگا، سب کا لوٹ کر جانا اللہ کی طرف ہے۔ اللہ ہر شے پر قادر ہے، اپنے اولیا کے ساتھ احسان کرے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے اور ساری مخلوقات کو قیامت کے دن لوٹائے۔ یہ ڈرانے کا مقام ہے جس طرح کہ پہلا مقام ترغیب کا تھا۔[5]

محکم و مفصل کی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ یہ قرآن ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم اور مضبوط ہیں نہ کسی طرح کا ان میں نقص ہے اور نہ ان کے لیے کوئی نقض (عہد شکنی)، جیسے کہ ایک بنیاد سیدھی چنی ہوئی ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ احکام کے معنی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨)
[2] تفسير الطبري (١٥/ ٢٣٠۔ ٢٣١)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨)
[4] تفسير الطبري (١٥/ ٢٣١) اس کی سند میں ''میّب بن شریک'' ضعیف راوی ہے۔
[5] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٦٨۔ ٥٦٩)

یہ ہیں کہ یہ آیات منسوخ ہونے والی نہیں ہیں، تورات اور انجیل کے برعکس۔ اس صورت میں قرآن کی یہ صفت ایسی ہے کہ اس کے احکام ہر حال میں غالب اور قائم رہنے والے ہیں اور آیاتِ محکمہ منسوخ نہیں ہوتیں یا احکامِ آیات سے مراد امر و نہی ہے۔ آیات سے مراد تمام سورتیں ہیں کہ بعض بعض سے جدا ہیں، ان کا نظم ایسا مضبوط ہے کہ کسی قسم کا خلل ان کے سامنے نہیں آتا، یا احکام سے مراد یہ ہے کہ ان میں کسی طرح کا بگاڑ نہیں ہے اور ان کی تفصیل وعدے و وعید و ثواب اور سزا سے کی گئی ہے۔ یا اللہ نے باطل سے ان کو محفوظ رکھا ہے اور حلال و حرام کی تفصیل کر دی ہے یا مجموعی طور پر یہ قرآن محکم ہے اور آیاتاً مفصل۔

یا تفصیل سے مراد یہ ہے کہ لوحِ محفوظ میں جمع ہے، پھر وحی نے اس کی تفصیل کی۔ یا قطعی حجتوں کے ساتھ اس کی تائید کی گئی ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ یہ آیات اللہ کے پاس سے آئی ہیں، بہر حال ان میں جو حکم دیا گیا ہے وہ بہترین حکم ہے اور اس کی تفصیل سب سے اچھی تفصیل ہے، جس طرح کہتے ہیں کہ فلاں کریم الاصل ہے پھر کریم الفعل۔

استغفار و توبہ کا حکم:

یہ احکام اور تفصیل اس لیے ہے کہ تم غیر اللہ کی عبادت کرنا چھوڑ دو اور صرف اللہ کو معبود ٹھہراؤ۔ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں اور جنت اور رضوان کی خوش خبری سناتا ہوں، یعنی گناہ گار کو عذاب ہوگا اور مطیع کو انعامات سے نوازا جائے گا۔ تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی طرف تائب ہو جاؤ۔ استغفار کو توبہ سے پہلے ذکر کیا، کیوں کہ استغفار توبہ کی طرف ایک وسیلہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ توبہ کا اہتمام استغفار سے ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ استغفار اور توبہ سے مراد خلوصِ دل کے ساتھ توبہ کرنا اور اللہ کی طرف رجوع کر کے اس پر استقامت اختیار کرنا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اپنے پہلے گناہوں سے معافی مانگو اور آیندہ کے لیے گناہوں سے تائب ہو جاؤ، یا شرک سے معافی مانگو اور اطاعت کی طرف رجوع کرو، یا صغیرہ گناہوں سے معافی مانگو اور کبیرہ گناہوں سے تائب ہو۔ جب تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے اچھا برتاؤ کرے گا، یعنی دنیا میں پسندیدہ فائدے اور رزق کی فراخی اور کھلی عیش عطا فرمائے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جو میسر آجائے اس پر راضی ہو اور جو مقدر میں ہے اس پر صبر کرے۔ یہ فائدہ اٹھانا اللہ کے نزدیک ایک وقت تک رہے گا، وہ وقت موت ہے، یا قیامت، یا جنت میں داخل ہونا، پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور ہر ذی فضل کو اس کی طاعت و عمل کی جزا دنیا و آخرت میں یا دونوں میں دے گا۔ یا یہ معنی ہیں کہ جس کی نیکیاں زیادہ ہیں وہ اور بندوں پر فضیلت رکھے گا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کی طاعات دنیا میں کثرت سے ہیں، اس کے حسنات اور درجات جنت میں زیادہ ہوں گے۔[1]

---

[1] تفسير البغوي (٤/ ١٦٠)

مخالف کو وعید:

پھر اللہ نے اپنے حکم کی مخالفت پر وعید سنائی اور فرمایا کہ اگر تم اخلاصِ عبادت اور توبہ و استغفار سے منہ موڑو گے تو مجھ کو تم پر بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔ قیامت کو بڑا دن کہا، اس لیے کہ اس میں اہوال (ہول، ڈر) ہوں گے۔ یا مراد یومِ بدر ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اس کے بعد فرمایا ہے کہ تمھارا لوٹنا اللہ کی طرف ہے، پہلے موت ہے، پھر اٹھایا جانا، پھر جزا۔ اللہ کو عدمِ امتثالِ امر (حکم نہ ماننے) پر مؤاخذہ کرنے کی قدرت ہے، لیکن اس ڈرانے اور وعید نے کچھ اثر ان پر نہ کیا اور نہ ان کے دل نرم پڑے، بلکہ وہ اپنے عناد پر مصر رہے اور اپنے کفر پر پکے رہے۔[1]

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُۥ عَلِيمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

آگاہ رہو! بے شک وہ اپنے سینے دوہرے کرتے ہیں، تا کہ اس (اللہ) سے چھپ جائیں۔ آگاہ رہو! جب وہ اپنے کپڑے اوڑھتے ہیں (تب بھی) وہ (اللہ) جانتا ہے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے ⑤

اللہ سے کچھ پوشیدہ نہیں اور شانِ نزول:

کافر کچھ مخالفت کی بات گھر میں کہتے، اس کا جواب قرآن میں اترتا، وہ سمجھتے کہ کوئی کھڑا ہو کر سنتا ہے اور جا کر اللہ کے رسول سے کہہ دیتا ہے، تب سے اس قسم کی بات کہتے تو کپڑا اوڑھ کر جھک کر دوہرے ہو کر کہتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل کی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لوگ کھلے آسمان تلے جماع کی حالت میں شرم گاہوں کو کھولنا مکروہ جانتے تھے، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری۔[2] صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ مرد اپنی عورت سے جماع کرتا، پھر شرماتا یا تنہا ہوتا، اس پر یہ آیت آئی۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ لوگ آسمان کے نیچے خلوت کرنے اور اپنی عورتوں سے جماع کرنے سے شرماتے تھے، اللہ نے ان کے حق میں یہ آیت بھیجی۔ چوتھے الفاظ ان کی روایت کے یہ ہیں کہ اپنا سر کپڑوں میں ڈھانپ لیتے۔[4] پانچویں الفاظ یہ ہیں کہ اس سے مراد اللہ میں شک کرنا اور برائیوں کا ارتکاب

① فتح البيان (٦/ ١٣٧۔ ١٤٠) ② تفسير الطبري (١٥/ ٢٣٦) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٩٨)
③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٥) ④ تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٩٩٩۔ ٢٠٠٠) تفسير الطبري (١٥/ ٢٣٦۔ ٢٣٩)

کرنا ہے۔[1] امام مجاہد اور حسن رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ وہ جب کچھ بات کہتے یا کوئی کام کرتے تو ان کا گمان یہ ہوتا کہ وہ اللہ پاک سے اس قول وعمل کو مخفی رکھتے ہیں۔[2] اللہ نے خبر دی ہے کہ جب وہ سوتے وقت کپڑوں میں لپٹ کر پڑتے ہیں اور رات اندھیری ہوتی ہے، تب بھی اللہ ان کی چھپی اور کھلی بات کو جانتا ہے، اس کو نیتوں ضمیروں اور خفیہ باتوں کا علم یکساں ہے۔ زہیر بن ابی سلمیٰ نے اپنے معلقہ میں کیا خوب کہا ہے:

فَلَا تَكْتُمُنَّ اللّٰهَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ لِيَخْفٰى وَمَهْمَا يُكْتَمِ اللّٰهُ يَعْلَمِ
يُؤَخَّرْ فَيُوْضَعْ فِيْ كِتَابٍ فَيُدَّخَرْ لِيَوْمِ حِسَابٍ أَوْ يُعَجَّلْ فَيُنْتَقَمِ

''تم اپنے دلوں کی کوئی بات اللہ سے چھپا نہیں سکتے، اللہ سے جو بھی چھپایا جائے چھپ نہیں سکتا۔ وہ اس کو مؤخر کر کے روزِ حساب کے لیے ذخیرہ کر لیتا ہے یا دنیا ہی میں انتقام لے لیتا ہے۔''

اس شاعر جاہل نے ان اشعار میں صانع کے وجود اور اس کے علم بالجزئیات اور قیامت اور سزا جزا اور صحیفوں میں اعمال کے لکھے جانے کا اعتراف کیا ہے۔ عبداللہ بن شداد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اُن میں سے جب کوئی رسول اللہ ﷺ پر گزرتا تو اپنا سینہ دوہرا کر لیتا اور اپنا سر کپڑے سے چھپا لیتا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت بھیجی۔[3] ضمیر کا اللہ کی طرف لوٹنا زیادہ صحیح ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سینوں کو دوہرا کرنے سے مراد انحراف اور اعراض کرنا ہے، یعنی سینوں کا کفر اور نبی اکرم ﷺ کی عداوت کی طرف پھیرنا اور موڑنا ہے، اس طرح پر کہ وہ عمل مخفی اور چھپا ہوا رہے اور اللہ اور رسول ﷺ کو اس کی خبر نہ ہو۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب ہم نے گھر کے دروازے بند کر لیے اور کپڑے میں چھپ گئے اور دل میں نبی اکرم ﷺ کی عداوت رکھی تو اب کون ہمارے دل کے راز کو جان سکتا ہے۔ اللہ نے کہا، ہم جان سکتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کفار کا گزر جب نبی اکرم ﷺ پر ہوتا تو سینہ دوہرا کرتے، پیٹھ پھیر لیتے، کپڑا اوڑھ لیتے، تاکہ آپ ﷺ کی بات نہ سنیں۔ اللہ نے کہا کہ اللہ پوشیدہ اور ظاہر کا علم رکھنے والا ہے، تمھارے اس چھپنے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، وہ ہر دل کی بات اور دل کا ہر بھید جانتا ہے، اس کے سامنے ظاہر اور باطن اور چھپا ہوا اور ظاہر سب برابر ہے، اُس کو ان تمام بھیدوں اور خیالات کی جو سینوں کے اندر ہیں، خبر ہے۔ سینوں سے مراد دل ہیں۔[4]

اس آیتِ شریفہ پر قرآن کریم کا گیارھواں پارہ ختم ہوا، وللہ الحمد، اب اس کے بعد بارھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔



[1] تفسیر الطبري (۱۵/ ۲۳۷) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[2] تفسیر الطبري (۱۵/ ۲۳٤۔ ۲۳۵)
[3] تفسیر الطبري (۱۵/ ۲۳۳۔ ۲۳٤) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] فتح البیان (٦/ ۱٤۰۔ ۱٤۱)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے ⑥

اللہ ساری مخلوقات کے رزق کا ذمے دار ہے:

رہنے سہنے کی جگہ بہشت اور دوزخ ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے اس کی قبر ہے، اور روزی تو وہ دنیا میں ہے۔ اللہ نے خبر دی کہ اللہ ساری مخلوقات کی روزی کا متکفل ہے، جتنے چلنے پھرنے والے جانور ہیں، وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، سمندروں میں ہوں یا خشکی پر، سب کے رزق کا وہی ذمہ دار ہے، اسے معلوم ہے کہ زمین میں ان کے چلنے پھرنے کی انتہا کہاں تک ہے اور کہاں اور کس جگہ وہ جا کر ٹھہرتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مستقر سے مراد ماویٰ (ٹھکانا) ہے اور مستودع سے مراد موت ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مستقر رحم ہے اور مستودع صُلب (پیٹھ) جس طرح سورت انعام میں آیا ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک رحمہ اللہ اور ایک جماعت کا قول بھی ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ مفسرین کے اقوال نقل کیے ہیں، جس طرح آیت انعام کے نیچے بھی ذکر کیے تھے۔[2] واللہ أعلم.

سب کچھ کتابِ مبین میں تحریر ہے:

سو یہ سب ماجرا اس کتاب میں، جو اللہ کے پاس ہے، لکھا ہوا ہے اور وہ کتاب اس کی تفصیل بیان کرتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور اپنے دونوں پَروں سے اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾ [الأنعام: ٥٩] ''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا

---

① تفسیر الطبري (١٥/ ٢٤١) اس کی سند حسن ہے۔ ② تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٠١_ ٢٠٠٤) سورة الأنعام، رقم الآية [٩٨]

ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو؟''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ دابہ ہر وہ جاندار ہے جو روئے زمین پر چلتا ہے۔ اس لفظ کا اطلاق ہر چوپایہ پر بطور عرف آتا ہے، اس میں آدمی وغیرہ سارے حیوانات داخل ہیں۔ رزق وہ غذا ہے جو ہر زندہ کے لائق ہو، مختلف قسموں میں سے جس کی طرف اس کو حاجت ہوتی ہے۔ سو یہ ہر دابہ اور حیوان پر اللہ کا تفضل اور احسان ہے، کچھ اس پر واجب نہیں کہ وہ ان سب کو رزق دے، کیونکہ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ وجوب سے مراد اختیاری وجوب ہے، نہ کہ لازمی وجوب۔ چنانچہ رزق کا حوالہ اللہ کی مرضی کی طرف ٹھہرا، خواہ دے یا نہ دے۔ بعض نے کہا ہے کہ حرف علی اس جگہ بمعنی مِن ہے، یعنی یہ مخلوق کے سارے رزق اللہ کی طرف سے ہیں۔ رزق سے مراد سدِ رمق (جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا) ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کچھ روزی ہو وہ اللہ کی طرف کا رزق ہے اور کبھی اللہ رزق نہیں دیتا تو حیوان بھوک سے مر جاتا ہے۔[1]

اس کلام کے اس سے پہلے والے کلام کے ساتھ متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی حیوان کو اس کی قسمت کا رزق دینے سے غافل نہیں ہوتا تو پھر اس کے حالات، افعال اور اقوال سے کس طرح غافل ہوگا۔ مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جو استقرار ہے زمین میں، یا پشتِ پدر میں قرار کی جگہ۔ مستودع سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پر ودیعت کیا جاتا ہے، یعنی ارحام، یا جو چیز ارحام سے جاری ہوتی ہے، مثلاً: انڈا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مستقر وہ جگہ ہے جہاں رات یا دن میں پھر کر آتا ہے اور مستودع وہ جگہ ہے جہاں مرتا ہے۔[2] یہ سارے اقوال سورت انعام میں گزر چکے ہیں۔[3] مستقر کو مستودع سے پہلے ذکر کرنے کی وجہ قولِ فراء کی بنا پر ظاہر ہے اور قولِ اول پر شاید یہ ہوگی کہ مستقر مناسب تر ہے۔ باعتبار "مَا هِيَ عَلَيْهِ" درحالیکہ وہ دابہ ہو۔

آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی چلنے والا نہیں ہے مگر اللہ اُس کو رزق دیتا ہے، جہاں کہیں بھی وہ ہو اس کی جگہوں پر، اس کے باوجود کہ وہ چلنے پھرنے والا ہے، حتی کہ رِحم میں بھی۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اماکن دابہ کی زندگی میں اور موت میں، یا پشت اور رحم میں، یا زمین کے مسکن میں جہاں کہیں کہ وہ بالفعل موجود ہے اور مودع. مادہ اور مقار جو بعد قوت کے ہوتے ہیں۔[4] مواد سے مراد منی یا علقہ ہے اور مقار جیسے پشت یا رِحم۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مستقر ارحام ہیں اور مستودع وہ جگہ جہاں مرا۔[5]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت اسی تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ جب تم میں سے کسی کی اجل کسی زمین

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٢٤٠) [2] معاني القرآن للفراء (٢/ ١٥٢) [3] رقم الآية [٩٨]

[4] تفسير البيضاوي (٣/ ٢٢١) [5] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٧١) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

میں ہوتی ہے اُس کو اس جگہ کی حاجت پیش آتی ہے، یہاں تک کہ جب اس زمین میں پہنچ جاتا ہے تو قبض کر لیا جاتا ہے۔ زمین قیامت کے دن کہے گی: "هَذَا مَا اسْتَوْدَعْتَنِي" یعنی یہ تیری ودیعت ہے جو تو نے میرے پاس رکھی تھی۔[1] (أخرجه الحاکم وصححه) یہ سب جو اوپر گزرا، یعنی دواب و مستقر و مستودع و رزق کا ذکر، یہ پیدائش سے پہلے سے لوحِ محفوظ میں ثابت ہے۔[2]

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ
وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَىِٕنْ
قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ۷ وَلَىِٕنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ
الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ
لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ۸

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دِنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون زیادہ اچھے عمل کرتا ہے۔ اور (اے نبی!) اگر آپ کہیں کہ تمھیں موت کے بعد زندہ کیا جائے گا تو جن لوگوں نے کفر کیا وہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو کھلا جادو ہے ⑦ اور اگر ہم ان گنی چنی مدت تک عذاب مؤخر کر دیں تو البتہ وہ (کافر) ضرور کہیں گے کہ کیا چیز اسے روکے ہوئے ہے۔ خبردار! جس دن وہ (عذاب) ان کے پاس آئے گا (پھر) ان سے ٹلے گا نہیں اور انھیں وہ (عذاب) گھیر لے گا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے ⑧

چھے دنوں میں زمین و آسماں کی تخلیق:

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس نے سارے آسمانوں اور زمین کو چھے دن میں پیدا کیا، اس سے پہلے اس کا تخت پانی پر تھا۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے بنی تمیم! مژدہ قبول کرو۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے ہمیں خوش خبری سنائی، کچھ عطا بھی تو فرمائیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اہلِ یمن! تم اس بشارت کو قبول کرو، انھوں نے کہا: ہم نے قبول کیا، ہم کو خبر دیں کہ یہ معاملہ ایسا کیوں کر تھا؟ فرمایا: اللہ ہر شے سے پہلے تھا اور اُس کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے لوحِ محفوظ میں ہر چیز کی یاد

① سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٣) مستدرك الحاكم (١/ ١٠٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٤٥)
② فتح البيان (٦/ ١٤٢۔ ١٤٣)

لکھی، اتنے میں ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا: اے عمران! تمھاری اونٹنی رسی تڑا کر بھاگ گئی ہے، میں اس کے پیچھے نکلا، پھر مجھے معلوم نہیں کہ میرے بعد کیا ہوا۔[1] (رواه أحمد وهذا الحديث مخرج في الصحيحين بألفاظ كثيرة)

از انجملہ ایک لفظ یہ ہے کہ ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ اس امر کی اولیت کے بارے میں سوال کریں، فرمایا: «كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهُ» دوسرے الفاظ میں «غَيْرُهُ» آیا ہے۔ تیسرے الفاظ میں «مَعَهُ» آیا ہے۔ پھر فرمایا: «وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، وَكَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْءٍ، ثُمَّ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ»[2] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ پاک نے تمام مخلوق کی تقدیر آسمان اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مقرر کر دی، جب کہ اس کا تخت پانی پر تھا۔[3] (أخرجه مسلم)

اس کا عرش پانی پر تھا:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: تو خرچ کر، تجھ کو دیا جائے گا۔ اللہ پاک کا ہاتھ پُر ہے، اس کو خرچ کرنا کم نہیں کرتا۔ رات دن عطا کی بارش برسانے والا ہے، کیا تم نے دیکھا کہ جب سے اللہ نے آسمان و زمین کو بنایا ہے کتنا خرچ کیا، جو چیز اس کے ہاتھ میں ہے وہ کم نہ ہوئی، اس کا تخت پانی پر تھا، اُس کے ہاتھ میں ترازو ہے، جھکاتا ہے، اونچا کرتا ہے۔[4]

لقیط بن عامر عقیلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارا رب خلق کے پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا؟ فرمایا: بادل میں تھا، نہ اوپر اُس کے ہوا اور نہ نیچے اُس کے ہوا، پھر اس نے اس کے بعد عرش کو پیدا کیا۔[5] (رواه أحمد والترمذي في التفسير وحسنه ابن ماجة في السنن) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کا عرش پانی پر تھا، اس سے پہلے کہ کوئی شے پیدا کرے۔ یہی قول امام وہب بن منبہ، ضمرہ، قتادہ، ابن جریر رحمہم اللہ وغیر واحد کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو خبر دیتا ہے کہ اس نے خلق کی پیدائش کیسے شروع کی سماوات و ارض کی پیدائش سے پہلے۔[6]

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا تخت آسمان پر تھا، پھر جب اللہ نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا تو اُس پانی کو دو قسم کیا، نصف پانی عرش کے نیچے رکھا، یہ بحر مسجور ہے۔[7] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عرش کا نام عرش اس لیے ہوا کہ وہ اونچا ہے۔[8] سعد طائی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عرش ایک سرخ یاقوت ہے۔

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۱۹) مسند أحمد (۴/ ۴۳۱) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۱۹۔ ۶۹۸۲)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۵۳) (4) صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۴۰۷)

(5) مسند أحمد (۴/ ۱۱) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۰۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۸۲) اس کی سند میں "وکیع بن حدس" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۵۳۲۰)

(6) تفسير الطبري (۱۵/ ۲۴۵۔ ۲۵۰) (7) تفسير ابن أبي حاتم (۶/ ۲۰۰۵)

(8) تفسير ابن أبي حاتم (۶/ ۲۰۰۵) اس کی سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ اسی طرح پر تھا، جس طرح کہ اس نے اپنے نفس کا وصف بیان کیا ہے، کیونکہ کوئی چیز نہ تھی، سوائے پانی کے، پانی پر عرش تھا، عرش پر ذوالجلال والاکرام تھا جو صاحب عزت، سلطان، ملک، قدرت، حلم، علم، رحمت اور نعمت ہے، ﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴾ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ پانی کس شے پر تھا؟ کہا: پشتِ ہوا پر۔[1] پھر اللہ نے فرمایا کہ ہمارا یہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا بندوں کے فائدہ کے لیے ہے، جن کو ہم نے اپنی عبادت کے لیے بنایا ہے اور تاکہ وہ کسی شے کو ہمارے ساتھ شریک نہ کریں۔

تخلیقِ کائنات کا مقصد:

ان اشیا کا پیدا کرنا کچھ عبث نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴾ [ص: ٢٧] ”اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بیکار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا، تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴾ [المؤمنون: ١١٥۔ ١١٦] ”کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آ ؤ گے۔ چناں چہ بلند و بالا اللہ حقیقی بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ معزز و مکرم عرش کا رب ہے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات: ٥٦] ”اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔“

اس جگہ ﴿ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ کہا، نہ ”أَكْثَرُ عَمَلًا“، سو کوئی عمل حسن نہیں ہوتا، جب تک کہ خالص اللہ کے لیے نہ ہو اور شریعتِ محمدیہ پر نہ ہو اور جب ان دونوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو گی تو وہ عمل ضائع اور باطل ہو جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حسنِ عمل اگرچہ تھوڑا ہو، نجات کے لیے کافی ہے اور اگر عملِ کثیر ہو، لیکن حسن نہ ہو تو وہ کچھ بھی نفع نہیں دیتا۔

موت کے بعد اٹھایا جانا:

پھر اللہ نے کہا کہ اے پیغمبر! تم اگر ان مشرکوں کو یہ خبر دو گے کہ اللہ تعالیٰ تم کو موت کے بعد پھر مبعوث کرے گا جس طرح ابتداءً اس نے تم کو پیدا کیا ہے، حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا اور سورج اور چاند کو مسخر کرنے والا اللہ ہی ہے، لیکن اس کے ساتھ قیامت کے دن مبعوث کیے جانے اور لوٹائے جانے کا انکار کرتے ہیں، باوجود اس بات کے کہ قدرت کے لحاظ سے قیامت کے دن دوبارہ لوٹانا پہلی دفعہ پیدا کرنے سے زیادہ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٠٥)

آسان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ۲۷] ''اور وہی (اللہ) ہے جو مخلوق پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی اسے لوٹائے گا، اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [لقمان: ۲۸] ''تمھیں پیدا کرنا اور تمھیں (دوبارہ) اُٹھانا (اللہ کے نزدیک) ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا۔''

ان کا یہ کہنا، یہ تو ایک کھلا جادو ہے، کفر اور عناد کی وجہ سے ہے کہ ہم مبعوث کیے جانے کو سچا نہیں سمجھتے، یہ بات تو جادو کی ہے، یہی جادو تجھ سے یہ بات کہلاتا ہے۔ اللہ نے کہا کہ اگر ہم ان مشرکوں کو عذاب دینے یا ان کا مواخذہ کرنے میں دیر لگائیں اور انھیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دیں اور ایک اجل تک انھیں وعید سنائیں، پھر بھی یہ جھٹلانے کی غرض سے جلدی سے یہی بات کہیں گے کہ ہم سے عذاب کو کس چیز نے روک رکھا ہے، کیونکہ ان کی خصلتیں تکذیب اور شک سے محبت رکھتی ہیں، یہ ہرگز اس سے باز نہیں رہ سکتے۔

قرآن میں امت کا مفہوم:

لفظ ''اُمَّت'' کا استعمال قرآن پاک اور سنتِ مطہرہ میں کئی معنی میں آیا ہے۔ کبھی امت سے مراد امد، یعنی مدت ہوتی ہے، جس طرح کہ اس آیت میں ﴿ اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ ﴾ اور سورت یوسف میں فرمایا ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ ﴾ [یوسف: ۴۵] ''اور وہ (شخص) جس نے دونوں (قیدیوں) میں سے نجات پائی تھی، اسے (یوسف) مدت کے بعد یاد آیا۔'' اور کبھی اس لفظ کا استعمال ایسے امام کے لیے ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جائے، جیسے: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [النحل: ۱۲۰] ''بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

اور کبھی اس کا استعمال ملت اور دین کے معنی میں آتا ہے، جس طرح مشرکوں کے بارے میں خبر دی ہے کہ وہ کہتے تھے: ﴿ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۲۳] ''بلاشبہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔'' اور کبھی جماعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ﴾ [القصص: ۲۳] ''اور جب وہ مدین کے پانی (کنویں) پر پہنچا تو اس پر اس نے لوگوں کا ایک گروہ پایا، وہ (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ۳۶] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ [یونس: ۴۷] ''اور ہر ایک امت کا ایک رسول ہے، پھر جب ان کا رسول آ گیا تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا

گیا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔'' اس جگہ امت سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں پیغمبر آئے، کیا مومن اور کیا کافر۔ صحیح مسلم میں فرمایا ہے: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ فِيْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ لَا يُؤْمِنُ بِيْ إِلَّا دَخَلَ النَّارَ» [1]

رہے وہ لوگ جو رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہیں، وہ وہی ہیں جو ان کی اتباع کرنے والے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ [آل عمران: ١١٠] ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔'' اور صحیح میں آیا ہے: «فَأَقُوْلُ: أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ» [2] اور کبھی امت کا لفظ فرقہ اور طائفہ کے لیے بھی آیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٩] ''اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک گروہ (ایسا) ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی (حق) کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١١٣] ''اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو چھے دن میں پیدا کیا۔ یہ کلام بطور توزیع (تقسیم) کے ہے۔ دو دن میں آسمان بنائے اور دو دن میں زمین اور دو دن میں ہر قسم کے حیوانات و نباتات و اقوات و جمادات پیدا کیں۔ ﴿ اَيَّامٍ ﴾ سے اس جگہ اوقات مراد ہیں، یعنی "فِيْ سِتَّةِ أَوْقَاتٍ"، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗ ﴾ [الأنفال: ١٦] ''اور جو شخص اس دن ان سے پیٹھ پھیرے گا۔'' اور بعض نے کہا ہے کہ مقدار چھے یوم اور بعض نے کہا ہے کہ چھے دن ہیں بمقابلہ شب۔

پہلا دن شنبہ تھا اور آخری دن جمعہ تھا، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لیے کہ اس وقت نہ زمین تھی، نہ آسمان تھا اور یوم اس مدت کو کہتے ہیں کہ سورج زمین کے اوپر طلوع ہو۔ حاشیہ جمل میں کہا ہے کہ یہ سخت مشکل ہے، نہ شنبہ متعین ہوسکتا ہے نہ کوئی اور دن مگر اسی وقت کہ وہ حقیقتاً موجود ہو اور اس حال میں کوئی زمانہ نہ تھا۔ پھر ایام کی تفصیل کا ذکر کیا ہے، پھر ہر دن کی ایک نام کے ساتھ تخصیص کی ہے، یعنی یہ کیسے۔ اور اس اشکال کا جواب اس طرح سے ہے کہ مراد چھے روز کی مقدار ہے، اس سے اشکال دفع نہیں ہوتا، بلکہ اشکال اس سے دور ہوتا ہے کہ وہاں زمانہ نہیں تھا۔

بہر حال اللہ کریم کا عرشِ عظیم آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پہلے پانی پر تھا، سوائے پانی کے اور کوئی چیز

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٣) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧٠٧٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٣)

عرش کے نیچے نہیں تھی، خواہ ان دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ ہو یا عرش پانی پر ہو، اس میں خلا کے ہونے پر دلیل نہیں ہے اور اگر ہو تو یہ دلیل خلا کے وجود پر ہوگی نہ کہ فقط خلا کے ہونے پر، اور نہ اس بات پر کہ عالم میں عرش کے بعد سب سے پہلے پیدایش پانی کی ہوئی ہے، بلکہ اگر یہ دلیل ہے تو اس بات پر ہے کہ عرش اور پانی کی پیدایش سب سے پہلے ہے اور آسمان و زمین کی پیدایش سے پہلے ہے، دونوں کے درمیان بغیر کسی نسبت کے پیدا ہوئے۔

سلف سے منقول ہے کہ عرش پانی پر تھا۔ "وَهُوَ الْآنَ عَلٰى مَا كَانَ" یعنی اب بھی وہ اسی طرح پر ہے۔ سلیمان جمل کی عبارت اس طرح ہے کہ وہ اُسی اپنی جگہ میں ہے جس میں اس وقت ہے، یعنی ساتویں آسمان کے اوپر اور پانی بھی اسی اپنی جگہ میں ہے، جہاں کہ اس وقت ہے، یعنی ساتویں زمین کے نیچے۔ نبی اکرم ﷺ سے ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا: "أَيْنَ كَانَ رَبُّنَا قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ خَلْقَهُ؟" فرمایا: «كَانَ فِيْ عَمَّاءٍ مَّا فَوْقَهُ هَوَآءٌ وَمَا تَحْتَهُ هَوَآءٌ، وَخَلَقَ عَرْشَهُ عَلَى الْمَآءِ» (رواہ الترمذي) اس حدیث کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔ احمد بن منیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عَمَّاءِ سے مراد یہ ہے کہ "إِنَّهُ لَيْسَ مَعَهُ شَيْءٌ"[1] بیہقی نے کہا ہے کہ اگر ممدود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سحاب رقیق یعنی پتلا بادل۔ معنی یہ ٹھہرے کہ اللہ بادل کے اوپر مدبر و عالی ہے اور اگر مقصور ہے تو اس کے معنی یہ ہیں: "لَا شَيْءَ ثَابِتٌ لِأَنَّهُ عَمًى عَنِ الْخَلْقِ يَكُوْنِهِ غَيْرَ شَيْءٍ" اہلِ علم کی ایک جماعت اسی کی قائل ہے۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے: "فَنَحْنُ نُؤْمِنُ بِهِ وَلَا نُكَيِّفُ صِفَتَهُ"[2] صفتِ عرش اور آسمانوں اور زمین کی پیدایش کی کیفیت کے بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں، یہ جگہ ان کے ذکر کرنے کی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان مخلوقات کو اس لیے پیدا کیا کہ اپنے بندوں کا امتحان لے اور ان کو اعتبار و تفکر و استدلال میں اپنی قدرت کے کمال اور دوبارہ مبعوث کرنے اور سزا اور جزا دینے کے کمال پر آزمائے کہ کون اُن میں سے اچھے عمل کرتا ہے اور امر و نہی بجا لاتا ہے۔ عمل میں اعتقاد بھی داخل ہے، اس لیے کہ من جملہ قلب کے اعمال میں سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ سے مراد أَتَمُّ عَقْلًا ہے یا أَزْهَدُ فِي الدُّنْيَا یا أَكْثَرُ شُكْرًا یا أَتْقٰى لِلّٰهِ۔ یہ مشرک نبی اکرم ﷺ کے اس قول کو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہوگا، ایک کھلا جادو سمجھتے ہیں، یا قرآن کو کھلا جادو بتلاتے ہیں، کیونکہ قرآن میں دوبارہ مبعوث ہونے کی خبر دی ہے۔ سحر کو اس جگہ ساحر بھی پڑھا ہے۔ ساحر سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں۔ عذاب سے مراد عذابِ قیامت ہے یا عذابِ بدر۔

﴿ اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ ﴾ سے مراد قلیل ایام ہیں، جو چیز گنتی میں آتی ہے وہ قلیل ہوتی ہے۔ لفظ امت اُمّ سے مشتق ہے، اُم بمعنی قصد ہے۔ اس جگہ عذاب کے واقعہ ہونے کے لیے وقت مقصود ہے۔ یا مراد حِيْنَ ہے۔ مشرکین مذاق اور استہزا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ عذاب کے آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟ اللہ نے کہا کہ جس دن وہ عذاب آئے گا تو کوئی شخص اس کو پھیر نہ سکے گا، وہ لامحالہ واقع ہوگا اور ان کی یہ ٹھٹھے بازی ان کو گھیر لے گی۔[3]

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [2] تفسیر الخازن (٣/ ٢٢٠) [3] فتح البیان (٦/ ١٤٣۔ ١٤٧)

وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱

اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت (کا مزہ) چکھائیں، پھر وہ اس سے چھین لیں، تو بے شک البتہ وہ بڑا ناامید، بہت ناشکرا ہو جاتا ہے ⑨ اور اگر ہم اسے تکلیف پہنچنے کے بعد نعمتیں چکھائیں تو وہ ضرور کہے گا: مجھ سے سختیاں دور ہو گئیں، بے شک وہ (اس وقت) اترانے والا اور فخر جتانے والا ہو جاتا ہے ⑩ مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور نیک عمل کیے، انھی کے لیے بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ⑪

خوشی اور غمی میں انسان کی تقلب مزاجی اور بندۂ مومن کا استثناء:

اللہ نے انسان کی مذموم صفات کی خبر دی کہ انسان بڑا عیب دار ہے مگر جس بندۂ مومن پر وہ رحم کرے۔ انسان کا یہ حال ہے کہ نعمت کے بعد جب کبھی اُس کو کوئی سختی پہنچتی ہے تو آیندہ کے لیے خیر سے ناامید اور مایوس ہو جاتا ہے اور پہلے حالات کا انکار کرتا ہے اور کفر کرتا ہے، گویا اس نے کبھی بھلائی کو دیکھا ہی نہ تھا اور پھر آسانی کی اسے امید نہیں رہتی۔ اسی طرح جب اس کو اس تکلیف اور سزا کے بعد نعمت پہنچتی ہے تو کہتا ہے کہ اب اس کے بعد مجھے کوئی سختی اور برائی نہیں پہنچے گی، اپنے ہاتھ کے مال پر اتراتا اور خوش ہوتا ہے اور دوسروں پر فخر اور غرور کرتا ہے۔ مگر وہ لوگ جنھوں نے سختیوں اور ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کیا ہے اور اچھے کام بجا لائے ہیں، تکلیف اور عافیت میں ان کے لیے نقصان پہنچنے کے عوض میں مغفرت ہے اور بہت بڑا اجر ہے، اُس عمل کے سبب جو اُس نے تنگی کی حالت میں کیا تھا، جس طرح حدیث میں آیا ہے: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَا يُصِيْبُ الْمُؤْمِنَ هَمٌّ وَلَا غَمٌّ وَلَا نَصَبٌ وَّلَا وَصَبٌ وَّلَا حُزْنٌ حَتَّى الشَّوْكَةَ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ» یعنی مومن کو ہر تکلیف و رنج و اندوہ و فکر و غم پر، یہاں تک کہ کانٹے کے لگنے پر بھی گناہ کا کفارہ ہوتا ہے۔[1]

اور صحیحین میں فرمایا ہے: «وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَا يَقْضِيْ اللّٰهُ لِلْمُؤْمِنِ قَضَاءً إِلَّا كَانَ خَيْراً لَّهُ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّآءُ فَشَكَرَ كَانَ خَيْراً لَّهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ فَصَبَرَ كَانَ خَيْراً لَّهُ وَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ غَيْرَ الْمُؤْمِنِ»[2] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: ۱۔ ۳] ''زمانے کی قسم! بے شک انسان خسارے میں ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۳۱۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷۳) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۹۹)

سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴾ [المعارج: ١٩] ''بے شک انسان کو بے صبر (تھڑ دِلا) پیدا کیا گیا۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ انسان سے مراد جنسِ بشر ہے، جس میں مومن اور کافر دونوں ہیں، اس پر استثنا آیندہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد کافروں کی جنس ہے، کیونکہ ناامیدی، ناشکری، شیخی اور فخر اہلِ کفر کے اوصاف ہیں نہ کہ اہلِ اسلام کے۔ غالباً کسی نے کہا کہ انسان سے مراد ولید بن مغیرہ ہے، یا عبداللہ بن امیہ مخزومی۔ الغرض جب اللہ کسی انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتا ہے، یعنی رزق وصحت کی فراوانی اور تکالیف سے سلامتی اور عیاشی اور آسانی کی فراوانی اور وسعت عطا کرتا ہے، پھر خفا ہو کر وہ نعمتیں اس سے چھین لیتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت سے اور مذکورہ نعمتوں کے دوبارہ ملنے سے اس لیے ناامید ہو جاتا ہے کہ اس میں صبر بہت کم ہوتا ہے اور اللہ پر اعتماد نہیں ہوتا۔[1] (قاله ابن الأعرابي)

''یَئُوْس'' اور ''کفور'' دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، یعنی انسان بہت زیادہ ناامید اور بہت زیادہ ناشکری کرنے والا ہے، جب اس سے کوئی نعمت سلب کر لی جاتی ہے، نہ گذشتہ پر شکر کرتا ہے اور نہ نعمت کے دوبارہ لوٹ آنے کی امید رکھتا ہے، اور اگر تنگی کے بعد نعمت کا مزا چکھتا ہے، مثلاً: فقیری کے بعد غنا، بیماری کے بعد صحت، خوف کے بعد امن اور مصیبت کے بعد عافیت حاصل ہوئی تو پھر یہ کہنے لگتا ہے کہ اب میری مصیبتیں دور ہو گئیں۔ خوشی کرنے لگتا ہے اور اترانے لگتا ہے، اپنے مناقب (صفتیں) گننے لگتا ہے۔ لوگوں پر تطاول (تکبر، سرکشی) کرنے لگتا ہے، مگر وہ لوگ جو صابر وشاکر ہیں اور عملِ صالح کرنے والے ہیں، یعنی حالتِ نعمت اور تکلیف میں ان کے لیے گناہوں کی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے، اس اجر سے مراد جنت ہے۔ اجر کو کبیر اس لیے کہا ہے کہ یہ نعمت سرمدی اور تکالیف سے نجات اور عذاب سے امن اور اللہ کی رضا مندی کی تلاش ان سب کو اکٹھا کرتا ہے اور فواصل کی رعایت سے ''أَجْرٌ عَظِيْمٌ'' کے بجائے ﴿ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴾ کہا۔[2]

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَضَآىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ
اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ
اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۟ؕ۱۲ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ
قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

---

[1] فتح القدير (٢/ ٦٧٧) [2] فتح البيان (٦/ ١٤٧۔ ١٤٨)

دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

تو (اے نبی!) شاید کہ آپ اس وحی سے کچھ چھوڑنے والے ہوں جو آپ کی طرف (نازل) کی جاتی ہے اور آپ کا سینہ اس سے تنگ ہونے والا ہو کہ وہ (کافر) کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اُتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ (کیوں نہیں) آیا۔ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے⑫ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ کہہ دیجیے: پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو⑬ پھر اگر وہ تمھیں جواب نہ دیں تو جان لو کہ یقیناً یہ (قرآن) اللہ کے علم سے اُتارا گیا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر (اے لوگو!) کیا تم مسلمان ہوتے ہو؟⑭

مشرکوں کی باتوں اور مطالبات سے رسول کا پریشان ہونا اور اللہ کا تسلی دینا:

اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی کہ تم ان مشرکوں کے کہنے پر نہ جاؤ، یہ تو اسی طرح کی عیب جوئی کیا کرتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۷۔ ۸] ''اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ (پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادوزدہ شخص ہی کی اتباع کرتے ہو۔''

اللہ نے اپنے رسول کو فرمایا کہ تم ان کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو اور اس کہنے سننے پر دعوت الی اللہ سے باز نہ رہو، بلکہ شب و روز کے اوقات میں اُن کو اللہ کی طرف بلاتے رہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ [الحجر: ۹۷] ''اور یقیناً ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس سے آپ کا سینہ (دل) تنگ ہوتا ہے۔'' اور یہاں یوں کہا: ﴿ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَاۗىِٕقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ ﴾ (آیتِ باب)۔

پھر فرمایا کہ تُو تو ایک ڈرانے والا ہے، تُو اپنے بھائیوں، یعنی پہلے رسولوں کی پیروی کر کہ وہ بھی جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے تھے، لیکن انھوں نے صبر کیا تھا، یہاں تک کہ اللہ کی مدد آئی، اس کے بعد اللہ نے قرآن کا معجزہ ذکر

کیا کہ کوئی اس کے مثل نہیں لاسکتا اور نہ دس سورتیں، بلکہ ایک سورت بھی، کیونکہ رب کا کلام مخلوق کے کلام کے مشابہ نہیں ہوتا، جس طرح اس کی صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں ہوتیں اور کوئی چیز اس کی ذات کے مشابہ نہیں ہے۔ تَعَالٰی وَتَقَدَّسَ وَتَنَزَّہَ لَآ إِلٰہَ إِلَّا ھُوَ وَلَا رَبَّ سِوَاہُ۔

پھر اللہ نے کہا کہ اگر یہ لوگ معارضہ (سامنا، مقابلہ) نہ کریں تو جان لو کہ یہ عاجز ہیں اور یہ کلام اللہ کے پاس سے اترا ہے اس میں اللہ کا امر ونہی ہے اور یہ کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں ہے، سو کیا تم اسلام لاتے ہو؟

قرآن کا معجزہ اور دس سورتوں کا چیلنج:

فتح البیان میں ہے کہ شاید تُو ان لوگوں کے کفر و تکذیب اور بلا سوچے سمجھے باتیں کرنے کو دیکھ کر بعض وحی کو چھوڑ دے گا، جس کو پہنچانے کے لیے تجھ کو حکم ہے اور اُن پر اس وحی کا سننا ناگوار ہے اور تیرا سینہ ان کی عیب جوئی سے تنگ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس طرح کہتے ہیں کہ کوئی خزانہ کیوں نہیں اترا، یعنی مال، خزانہ وغیرہ جس سے تجھ کو نفع ہوتا اور اس کے سبب سے مستغنی ہو جاتا یا کوئی فرشتہ آتا اور وہ تیری رسالت کی تصدیق کرتا اور اسے صحیح کہتا۔ سو بات یہ ہے کہ تُو تو ایک ڈرانے والا ہے۔ تیرے ہاتھ میں کچھ ان کی مطلوبہ چیزوں کو حاصل کرنے یا ان کو ایجاد کر لینے کی طاقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شے پر نگہبان ہے، جو کچھ یہ بکتے ہیں وہ اس کو معلوم ہے، وہ ان کے ساتھ وہی کچھ کرے گا جو کرنا چاہیے۔ کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ تُو نے اس قرآن کو افترا کیا ہے، اچھا تُو ان سے کہہ دے کہ تم اس جیسی دس سورتیں لے کر آؤ جو بلاغت، حسنِ نظم، لفظ کی مضبوطی، معانی کی بزرگی اور بلندی میں اس کی طرح ہو۔ یہ اس لیے کہ جب قرآن ایک گھڑی ہوئی شے ٹھہرے تو ہر عربی دان شخص ایسی چیز گھڑ سکے گا، خصوصاً وہ عرب جو فصاحت و بلاغت میں فردِ زمانہ ہیں اور شعر و شاعری اور زبان دانی میں بے مثال ہیں۔

اللہ نے ان کی تحدید کی اور ان کے دعوے کی باگ ڈھیلی کر دی اور یہاں تک ان کو رعایت دی کہ تم یہ کام بھی کرو کہ اللہ کے سوا جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان میں سے بھی جس کو معارضۂ قرآن کے لیے بلا سکو، بلا لو اور تم وہ سب مل کر ایسا کلام، جس کو گھڑا ہوا کلام کہتے ہو، بنا لاؤ، اگر تم اپنے اس دعوائے افترا میں سچے ہو۔ پھر اگر یہ لوگ ایسا نہ کریں اور مقابلے کے لیے تیار نہ ہوں تو تم اے رسول اور سب مومنو! جان لو کہ اس قرآن کا نزول اللہ کے علم سے ہوا ہے، جس کی کنہ (حقیقت) پر عقلوں کو اطلاع نہیں ہے اور نہ فہم اس کے مطلب کو پا سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ ایسے اعجاز پر مشتمل ہے جو طوق بشر (انسان کی طاقت) سے خارج ہے اور ہرگز کسی نے اللہ پر اس کلام کا افترا نہیں کیا اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ ہی الوہیت کے ساتھ منفرد ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور جس پر اُس کو قدرت ہے وہ کسی کو نہیں۔ سو کیا تم اسلام لانے والے ہو، جبکہ اس قرآن کا اعجاز ثابت ہو جائے گا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو خطاب ہے[1] اور بعض نے کہا کہ عام ہے اور مراد قطعی حجت قائم ہو جانے کے بعد اسلام میں داخل ہونا ہے۔ کبھی تو وہ چیلنج پورے قرآن کے ساتھ کیا، جیسے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ﴾ [بني إسرائيل: ۸۸] ''کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثال نہ لا سکیں گے۔'' اور کبھی دس سورتوں کے ساتھ کیا، جیسے اس آیتِ باب میں ہے، کیونکہ دس کا عدد پہلا عقد ہے عقود میں سے اور کبھی ایک سورت کا چیلنج کیا جس طرح کہ سورت بقرہ میں گزر چکا ہے، یہ اس لیے کہ ایک سورت قرآن کا قلیل ترین حصہ ہے۔[2]

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۝۱۵ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۶

جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ اسی (دنیا) میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی (15) یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں، اور برباد ہو گیا جو کچھ انھوں نے اس (دنیا) میں کیا تھا اور جو عمل وہ کرتے رہے، ضائع ہو گئے (16)

دنیا کے طلبگاروں کا بدلہ دنیا ہی میں چکا دیا جاتا ہے اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں کہا ہے کہ ریاکاروں کو ان کے حسنات کا عوض اسی دنیا میں دے دیا جاتا ہے، ایک تل برابر ان پر ظلم نہیں ہوتا۔ اللہ نے فرمایا کہ جس نے کوئی اچھا کام کیا، دنیا حاصل کرنے کی نیت سے۔ روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا رات کو تہجد ادا کی، اس لیے کہ دنیا ملے تو اللہ اس کو اس کا بھرپور بدلہ اسی جگہ عطا کر دیتا ہے۔ اس کی دنیا درست ہو جاتی ہے۔ رہی آخرت، سو وہاں بالکل خائب و خاسر ہوتا ہے۔[3] امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ اور کئی ایک سے اسی طرح مروی ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے حق میں اتری ہے اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ریاکاروں کے حق میں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کی نیت اور ہمت، طلبِ دنیا ہوتی ہے، اللہ اس کی حسنات کی جزا یہیں دنیا میں دے دیتا ہے، پھر جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے لیے کوئی حسنہ نہیں ہوتا، جس کی جزا پائے۔

مومن کے لیے دنیا میں بھی بدلہ ہے اور آخرت میں بھی:

رہا مومن سو اس کے حسنات کا بدلہ یہاں دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی اس پر ثواب پائے گا۔[4] یہ

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٦١)
[2] فتح البیان (٦/ ١٤٩۔ ١٥٣)
[3] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٦٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[4] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٦٤۔ ٢٦٦)

مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے[1] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۚ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴾ [بني إسرائیل: ١٨۔ ٢١] ''جو کوئی جلدی والی (دنیا) چاہے تو ہم اسی (دنیا) میں جس کے لیے چاہیں جس قدر چاہیں جلد عطا کرتے ہیں، پھر اس کے لیے ہم جہنم ٹھہرا دیتے ہیں، وہ اس میں مذموم اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔ اور جو آخرت چاہے اور اس کے لیے پوری پوری سعی کرے، جب کہ وہ مومن ہو، تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی قابلِ قدر ہے۔ ہم ہر ایک کو آپ کے رب کی عطا سے نوازتے ہیں، اُن کو بھی اور اِن کو بھی، اور تیرے ربّ کی عطا (کسی سے) روکی ہوئی نہیں۔ دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟ اور یقیناً آخرت درجوں میں بڑھ کر ہے اور فضیلت دینے میں (بھی) بڑھ کر ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴾ [الشوریٰ: ٢٠] ''جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اہلِ تفسیر کا اس آیت میں اختلاف ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کافروں اور مشرکوں کے حق میں اتری ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس سے مراد اہلِ شرک ہیں،[2] اس کی دلیل اس سے بعد والی آیت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ منافقین کے حق میں اتری ہے۔ بعض نے کہا کہ نہیں بلکہ سب لوگوں کے حق میں عام ہے، وہ کافر ہوں یا مسلمان۔ اس کو عموم پر محمول کرنا زیادہ صحیح ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جو شخص اپنے عمل سے دنیا کا فائدہ چاہتا ہے اس کا بدلہ اس جگہ مل جاتا ہے۔ مجرد ارادہ مراد نہیں، بلکہ مراد دنیا کے لیے عمل کرنا ہے اور زینتِ دنیا سے مراد صحت اور امن وسکون، رزق کی فراوانی اور زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا، اپنی بات کا نافذ ہونا اور اولاد کی کثرت اور ریاست اور اسی طرح کے دوسرے دنیاوی فائدے ہیں، کیونکہ یہ سب اشیا دنیا کی رونق اور عمر فانی کی بہار اور اپنی ناپائیدار جان کی عارضی زینت ہیں۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٠٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٤٩۔ ٩٥٠)

[2] تفسير الطبري (١٥/ ٢٦٥) معاني القرآن للنحاس (٣/ ٣٣٥)

﴿ كَانَ ﴾ کا لفظ آیت میں جو داخل کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے اس ارادے پر قائم ہیں، نہیں لگتا کہ وہ آخرت کا ارادہ کریں، اسی لیے وہ دنیا کے یہ فوائد اور لطف حاصل کرنے کے بعد آخرت میں عذاب میں گرفتار ہوں گے، اس لیے کہ ان کا مقصود صرف دنیا کے فوائد تھے اور آخرت کے لیے انھوں نے کوئی کام نہیں کیا۔ ظاہر آیت یہ ہے کہ ہم ان کے عمل کا بدلہ اسی دنیا میں دے دیتے ہیں، لیکن واقعہ اس ظاہری صورت کے خلاف ہے، کیونکہ ہر تمنا کرنے والا اور آرزو مند اپنی بھرپور آرزو دنیا میں حاصل نہیں کر پاتا، اگرچہ وہ دنیا کے لیے عمل کرے، اس لیے ضروری ہے کہ اس حکم کو مشیتِ الٰہی کے ساتھ مشروط کیا جائے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر علما اسی طرف گئے ہیں کہ یہ آیت مطلق ہے، اسی طرح سورت شوریٰ کی آیت: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ [الشورىٰ: ٢٠] ''اور جو شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں۔'' اسی طرح آیت: ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ [آل عمران: ١٤٥] ''اور جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہو تو ہم اسے دنیا ہی میں کچھ دے دیتے ہیں۔'' اس آیت کی تقیید و تفسیر آیت سورت سبحان میں ہے: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا... الخ ﴾[1] [بني إسرائيل: ١٨] ''جو کوئی جلدی والی (دنیا) چاہے تو ہم اسی (دنیا) میں جس کے لیے چاہیں...۔''

بہر حال یہ دنیا کا ارادہ کرنے والے دنیا میں اپنی جزا میں کمی نہیں پاتے، بلکہ بحسبِ اعمال غالباً اپنے اعمال کا عوض اللہ کی مشیت کے مطابق پا لیتے ہیں۔ حکمتِ بالغہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ قاضی نے کہا ہے کہ دنیا میں جزا کے پورا دیے جانے سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے صحت اور فراوانی اور ہر قسم کی لذتیں اور کھانے پینے کی چیزیں اور منافع ہیں اور یہ چیز دنیا کے لیے ہر تگ و دو کرنے والے کو ملتی ہیں، گو تھوڑی ہی ہوں۔[2]

رہی آخرت سو وہاں ان کے لیے کچھ نہیں ہے، مگر یہی دوزخ کی آگ۔ اس سے اس آیت کی تخصیص کفار کے ساتھ نکلتی ہے، کیونکہ فرمایا ہے کہ وہاں اُن کا سارا کیا دھرا ضائع ہو جائے گا، اس لیے کہ اگرچہ یہ اعمال طاعات کی صورت میں تھے اور آخرت میں ان کی اچھی جزا ملنا چاہیے تھی، لیکن انھوں نے اپنے مقاصد کی خرابی اور عدمِ خلوص سے اُن کو برباد کر دیا اور صرف دنیا کی زینت پر ہی اکتفا کیا، اس لیے ان کا یہ عمل باطل ہو گیا۔ حقیقت میں فائدے اور جزا کے لائق نہ رہا، کیونکہ صحیح صورت میں واقع نہ ہوا اور جو ثواب اسے اس عمل کے صحیح ہونے کی صورت میں ملنا چاہیے تھا وہ اسے نہ مل سکا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ریاکاروں کے حق میں ہے،[3] لیکن یہ قول مشکل ہے، کیونکہ ﴿ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ... الخ ﴾ مومن کے حال کے لائق نہیں ہے مگر اسی وقت کہ جب اس طرح کہا جائے کہ یہ فاسد اور باطل

[1] تفسیر القرطبي (٩/ ١٤) [2] فتح القدير (٢/ ٦٨٠) [3] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٦٦)

اعمال جبکہ غیر اللہ کے واسطے ہوئے تو ان کا کرنے والا وعید شدید کا مستحق ٹھہرا، یعنی آگ کا عذاب۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث اس پر دلالت کرتی ہے: «مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً لِغَيْرِ اللّٰهِ، أَوْ أَرَادَ بِهِ غَيْرَ اللّٰهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» [1] (أخرجه الترمذي) اور حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ «قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلاً أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ» [2] (أخرجه مسلم وفي الباب أحاديث بمعناه) اور ریا شرکِ اصغر ہے جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے۔[3]

یہ اس آیت کی تفسیر میں ایک قول ہے اور وہ بات جو نظم کریم کی خوب صورتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد صرف کافر ہیں کہ اُس میں قرآن عظیم پر عیب لگانے والے بھی ضرور شامل ہیں، کیونکہ جب اللہ نے اپنے پیغمبر اور مومنوں کو یہ حکم دیا کہ ان کا اس بات پر یقین ہونا چاہیے کہ یہ قرآن اللہ کے علم سے اترا ہے اور کسی غیر اللہ کو ہرگز کسی شے پر قدرت نہیں ہے اور اہلِ اسلام کو اللہ نے اسلام پر ثابت قدم رہنے پر برانگیختہ کیا اور کہا کہ تم راسخ (پکے) رہو۔ قرآن کے مقابلے کے لیے کافروں کی عاجزی ظاہر ہوگئی اور یہ بات کھل گئی کہ وہ ہرگز کوئی چیز نہیں ہیں تو یہ حال اس بات کا مقتضی ہے کہ ان کی بعض وہم کی حالتوں پر تعرض کیا جائے (ٹوکا جائے) جس سے کہ ان کا کوئی شے ہونا معلوم ہوتا ہے، جیسے جلدی کے فائدے کا حاصل ہونا اور دنیاوی اغراض و مقاصد کو حاوی کر لینا۔ سو اللہ نے فرمایا کہ ان کے یہ عارضی فائدے حاصل ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ ان کے لیے کوئی اخروی کامیابی ہے، بلکہ اس مقام سے علاحدہ ہے اور اس کو خوب ہی کھول کر بیان فرما دیا۔[4]

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

کیا بھلا جو شخص اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہو اور اس کے بعد اللہ کی طرف سے ایک گواہ (قرآن) بھی آ جائے، جب کہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب بھی راہنما اور رحمت (رہی) ہو (وہ قرآن کا انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ ہی تو اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں اور ان گروہوں میں سے جو کوئی

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤٥٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ''خالد بن دریک'' کا سماع سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٠١٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥) [3] مسند أحمد (٥/ ٤٢٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٥١)

[4] فتح البيان (٦/ ١٥٣۔ ١٥٦)

اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔ چناں چہ (اے نبی!) آپ اس سے شک میں نہ پڑیں، بے شک یہ (قرآن) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے ⑰

صحیح فطرت والا ہی قرآن پر ایمان رکھتا ہے:

اس کے ساتھ اللہ کی طرف کا گواہ ہو، یعنی دل میں اس دین کا نور اور مزا پاتا ہے اور قرآن کی حلاوت۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے حال کی خبر دی ہے جو اللہ کی فطرت پر ہیں، جس پر اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اپنے بندوں میں سے کہ وہ اس بات کے معترف ہیں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الروم: ۳۰] ''چناں چہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

اور صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ، كَمَا تُوْلَدُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟ الحديث»[1] اور صحیح مسلم میں عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالىٰ: إِنِّيْ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ، فَجَاءَتْهُمُ الشَّيْطَانُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِيْنِهِمْ، وَحَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَّا أَحْلَلْتُ لَهُمْ، وَأَمَرَتْهُمْ أَنْ يُّشْرِكُوْا بِيْ مَا لَمْ أُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَاناً»[2] وَفِي الْمُسْنَدِ وَالسُّنَنِ: «كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلىٰ هٰذِهِ الْمِلَّةِ حَتّٰى يُعْرِبَ عَنْهُ لِسَانُهُ»[3] الحديث.

شاہد کی تفسیر:

بالجملہ مومن اس فطرت پر باقی رہتا ہے اور شاہد سے مراد وہ پاک، مکمل اور معظم شریعتیں ہیں جن کی وحی اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کی طرف فرمائی اور ان شریعتوں کو شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام سے ختم کیا۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، ابو العالیہ، ضحاک، ابراہیم نخعی اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم نے شاہد کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔[4] سیدنا علی رضی اللہ عنہ، امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ شاہد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، سو یہ دونوں ایک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۳۱۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۶۵۸) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸۶۵)

[3] مسند أبي يعلىٰ (۲/ ۲٤۰) المعجم الكبير (۱/ ۲۸۳) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٥۹)

[4] تفسير الطبري (۱۵/ ۲۷۳۔ ۲۷٤)

دوسرے کے قریب ہیں، اس لیے کہ جبریل علیہ السلام اور محمد ﷺ ہر ایک نے ان دونوں میں سے اللہ کی رسالت پہنچا دی۔ جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کے پاس لائے اور آپ ﷺ امت کے پاس لائے۔ بعض نے کہا ہے کہ شاہد سے مراد سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وَهُوَ ضَعِيفٌ، لَا يَثْبُتُ لَهُ قَائِلٌ، وَالْأَوَّلُ وَالثَّانِي هُوَ الْحَقُّ"[1] یہ اس لیے کہ مومن کی فطرت شریعت کی شاہد ہوتی ہے جملتاً۔

رہی تفصیل سو وہ شریعت سے لی جاتی ہے اور فطرت اس کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر ایمان لاتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ بھلا جو شخص اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہے اور اس کے پیچھے ایک شاہد بھی ہے، یعنی قرآن جس کو جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم ﷺ کی طرف پہنچایا اور آپ ﷺ نے امت کو پہنچایا اور اس قرآن سے پہلے تورات موسیٰ علیہ السلام کی کتاب آ چکی ہے، جس کو اللہ نے اُس امت کے لیے پیشوا ٹھہرایا تھا کہ اس کی پیروی کریں اور وہ کتاب ایک اللہ کی رحمت تھی، ان لوگوں کے ساتھ جو اس کتاب پر پورا ایمان لائے تو وہ کتاب ان کے لیے ایمان بالقرآن کی طرف قائد ہے۔ اسی لیے اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔

قرآن جھٹلانے والوں کے لیے وعید:

پھر اللہ نے ان لوگوں کو جو قرآن کو جھٹلاتے ہیں یا قرآن کے بعض حصے کے مکذب ہیں، ان کو وعید سنائی کہ تمام اہلِ زمین میں سے تمام بنی آدم کی جماعتوں میں سے۔ خواہ وہ مشرک ہوں یا اہلِ کتاب یا دوسرے، باوجود رنگ و شکل اور نسل کے مختلف ہونے کے جن کو یہ قرآن پہنچ گیا اور وہ اس کتابِ عزیز کا کفران اور انکار کرے گا تو آگ اس کا وعدہ ہے، یعنی وہ دوزخ میں جائے گا اور ہرگز دوزخ سے نجات نہ پائے گا۔ یہ قرآن پورے بنی نوع انسان کی طرف ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِأُنذِرَكُم بِهِۦ وَمَنۢ بَلَغَ﴾ [الأنعام: ١٩] "تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔" نیز فرمایا: ﴿قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ [الأعراف: ١٥٨] "کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔"

اس وقت بعض نام کے مسلمان ایسے بھی موجود ہیں جو قرآن کے بعض احکامات اور آیات کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم قرآن کے یہ دو تین حکم نہیں مانتے، جیسے فوت ہونے والے کے مال میں سے اس کی بیٹی کا حصہ، بیوہ کا نکاح ثانی کرنا اور اسی طرح کے اور احکام۔ سو اس اعتقاد کے لوگ اس آیتِ باب کی دلیل سے قطعاً کافر ہیں، ان کو مسلمان کہنا اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنا حرام ہے۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِّنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٌّ أَوْ نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ لَا يُؤْمِنُ بِي إِلَّا دَخَلَ النَّارَ»[2] (رواہ مسلم)

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٧٤)

[2] ان الفاظ کے ساتھ روایت صحیح مسلم میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ سنن وغیرہ میں مروی ہیں۔ دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣). سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٩٣)

ہر حدیث کا مصداق قرآن میں موجود ہے:

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: «كُنْتُ لَا أَسْمَعُ بِحَدِيْثٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ عَلٰى وَجْهِهٖ إِلَّا وَجَدْتُ مِصْدَاقَهٗ أَوْ قَالَ تَصْدِيْقَهٗ فِي الْقُرْآنِ، فَبَلَغَنِي أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَّلَا نَصْرَانِيٌّ فَلَا يُؤْمِنُ بِي إِلَّا دَخَلَ النَّارَ، فَجَعَلْتُ أَقُوْلُ: أَيْنَ مِصْدَاقُهٗ فِي كِتَابِ اللّٰهِ، قَالَ: فَلَمَّا سَمِعْتُ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ إِلَّا وَجَدْتُ لَهٗ تَصْدِيْقًا فِي الْقُرْآنِ حَتّٰى وَجَدْتُ هٰذِهِ الْآيَةَ ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾» احزاب سے مراد ساری امتیں ہیں۔[1]

قرآن حق ہے:

پھر یہ ذکر فرمایا کہ قرآن حق ہے، اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [السجدة: ٢۔ ١] ''الٓمّٓ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ (اس) کتاب کا نزول رب العالمین کی طرف سے ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ [البقرة: ١۔ ٢] ''الٓمّٓ۔ اس کتاب کے اللہ کی کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں۔'' لیکن اکثر لوگ یقین نہیں کرتے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [يوسف: ١٠٣] ''اور اکثر لوگ، اگرچہ آپ حرص کریں، ایمان لانے والے نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١١٦] ''اور اگر آپ اہلِ زمین کی اکثریت کی اطاعت کریں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [سبا: ٢٠] ''اور ابلیس نے ان پر اپنا خیال یقیناً سچ کر دکھایا، چناں چہ سوائے مومنوں کی ایک جماعت کے سب نے اسی کی اتباع کی۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بھلا جو شخص اپنے رب کی طرف سے اتباعِ نبی اور ایمان باللہ میں یقینی دلیل پر ہے، کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو دنیا کی زندگی میں مگن ہے اور دنیا کی زیب و زینت کا مرید ہے۔ اُس شخص سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں، یعنی آپ ﷺ کے پاس ایک روشن دلیل ہے اللہ کی طرف سے اور قرآن جیسا معجزہ ہے اور

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٨٠) یہ روایت مرسل ہے، البتہ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موصول ذکر کیا ہے۔ (مستدرك الحاكم: ٢/ ٣٧٢) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

جبریل علیہ السلام جیسا شاہد ہے اور اگلی کتابوں نے آپ کی بشارت دی ہے، سو کہیں آپ ﷺ اور دنیا کا طلب گار برابر ہو گا، ہرگز نہیں۔ ﴿ بَيِّنَةٍ ﴾ سے مراد برہان ہے اور ﴿ شَاهِدٌ ﴾ سے اعجازِ قرآن یا انجیل، یا صاحب بینہ سے مراد اہلِ کتاب مومنین مراد ہیں، جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قریش میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس کے حق میں کچھ قرآن نازل نہ ہوا ہو، ایک آدمی نے کہا کہ تمھارے حق میں کیا نازل ہوا ہے؟ کہا: تُو نے سورت ہود نہیں پڑھی: ﴿ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ ﴾ (آیتِ باب) اللہ کے رسول بینہ ہیں اور میں شاہد ہوں۔[1] (أخرجه أبو نعيم وابن ابی حاتم) دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: « شَاهِدٌ مِّنْهُ عَلِيٌّ »[2] (أخرجه ابن عساكر) تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ « وَدِدْتُ أَنِّي أَنَا هُوَ وَلٰكِنَّهُ لِسَانُ مُحَمَّدٍ » سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ شاہد جبریل علیہ السلام ہیں۔ امام سعید بن جبیر، علقمہ، ابراہیم، مجاہد، ضحاک رحمہم اللہ اور اکثر مفسرین بھی اسی کے موافق کہتے ہیں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ شاہد نبی اکرم ﷺ کی زبان ہے۔[3] وجہ اس کی یہ ہے کہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے اور مافی الضمیر کا بیان کرتی ہے، تو گویا مثل شاہد کے ہے، کیونکہ یہ فضل اور بیان کا ایک نشان ہے، قرآن کی تلاوت اسی زبان سے ہوتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاہد ایک فرشتہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کی حفاظت کرتا ہے اور آپ ﷺ کو مضبوط کرتا ہے،[4] لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

اسی طرح کتابِ موسیٰ علیہ السلام ایک دوسرا شاہد ہے، اگرچہ نزول میں وہ پہلے ہے، لیکن شہادت میں قرآن کے پیچھے آنے والی ہے۔ اس شہادتِ دیگر کے معنی یہ ہیں کہ تورات محمد ﷺ کی خوش خبری دینے والی ہے، اس میں آپ ﷺ کے رسول ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی صفت کتابِ موسیٰ میں آئی ہے۔ لوگ تورات اور انجیل میں آپ کو لکھا ہوا پاتے ہیں۔[5]

پھر کتابِ موسیٰ علیہ السلام کو امام اور رحمت کہا، یعنی شریعت کے احکام میں مقتدیٰ اور پیشوا ہے اور جن لوگوں پر وہ اتری تھی، ان کے لیے رحمت ہے، بلکہ تا قیامت، اس لیے کہ اس میں اکثر شرعی احکام قرآن کے موافق آئے ہیں، سو وہ لوگ نبی اکرم ﷺ پر یا قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور اہلِ مکہ وغیرہم کے جو گروہ یا تمام ملتوں اور ادیان کے جو لوگ نبی اکرم ﷺ کا انکار کریں گے وہ لامحالہ اہلِ نار ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''اَلْكُفَّارُ أَحْزَابٌ كُلُّهُمْ عَلَى الْكُفْرِ''[6] یعنی کفر ملتِ واحدہ ہے، سارے کافر ایک ہیں۔ اس کہنے میں کہ آگ ان کا موعد (وعدہ کی جگہ) ہے، اس

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢١٠٥) معرفة الصحابة لأبي نعيم (٣٢٩) اس کی سند میں ''عباد بن عبداللہ اسدی'' ضعیف راوی ہے۔
[2] الدر المنثور (٤/ ٤١٠) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠١٤) [4] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٧٥)
[5] معاني القرآن (٣/ ٤٤) [6] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٨٠)

بات کی اطلاع ہے کہ عذاب کے جو افانین (شاخیں) اور سزا کے جو قوانین اُس جلانے والی آگ میں ہے ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِّنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ لَا يَهُودِيٌّ وَّلَا نَصْرَانِيٌّ وَّمَاتَ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ»[1] (أخرجه البغوي بسنده) اب تو اے نبی! اس قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں شک میں مت رہ۔ یہ اشارہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور لوگوں کو، اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو قرآن میں یا وعدہ کی جگہ میں شک کرنے میں معصوم ہیں۔ یہ قرآن حق ہے تیرے رب کی طرف سے، لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے، حالانکہ اس قرآن پر ایمان لانا واجب ہے۔ یقین تک پہنچانے والے دلائل ظاہر ہو گئے ہیں، لیکن اللہ نے ان کے دلوں پر عناد اور بغض کی وجہ سے مہر لگا دی ہے، اس لیے یہ ہرگز حق کو نہیں سمجھتے۔[2]

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ
رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ
اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا
عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ
فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ
لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا؟ یہی لوگ اپنے رب کے سامنے پیش کیے جائیں گے اور گواہ (فرشتے) کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا، سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے (18) وہ جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں، اور وہی آخرت کا انکار کرنے والے ہیں (19) یہ لوگ زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہ تھے اور ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی نہ تھا۔ ان کے لیے عذاب دوگنا کر دیا جائے گا۔ ان میں (حق) سننے کی تاب

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣) تفسير البغوي (٤/ ١٦٧) [2] فتح البيان (٦/ ١٥٧ـ ١٥٩)

نہیں تھی اور نہ وہ دیکھتے تھے ⑳ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ افترا باندھتے تھے ㉑ بلا شبہہ یقیناً وہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والے ہیں ㉒

افترا پرداز اور خدا کی راہ سے روکنے والے گھاٹے میں ہیں:

آخرت میں گواہی دینے والے فرشتے ہوں گے جو عمل لکھتے ہیں اور نیک بخت آدمی جو اللہ کو ماننے والے تھے۔ جھوٹ بولنا کئی طرح ہے، علم میں غلط نقل کرنا، یا خواب بنا لینا، یا دین کی بات میں اپنی عقل سے حکم کرنا، یا دعویٰ کرنا کہ کشف رکھتا ہوں، یا اللہ پاک کا مقرب ہوں، اللہ پر جھوٹ بولا، کہاں سے لائے؟ غیب سے۔ سن نہ آتے تھے، غیب کو دیکھتے نہ تھے، آخرت کے دعویٰ میں گم ہو گئے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس جگہ ان لوگوں کا حال بیان کیا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، کہ وہ آخرت میں تمام مخلوق کے سامنے، فرشتوں، رسولوں اور تمام انسانوں اور جنوں کے سامنے رسوا ہوں گے۔

امام صفوان بن محرز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے سامنے آ کر کہا کہ تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن سرگوشی کے بارے میں کیا سنا ہے؟ کہا: میں نے سنا ہے، فرماتے تھے کہ اللہ عزوجل مومن کو نزدیک کر کے اپنا کنف اس پر رکھے گا اور اس کو لوگوں کی نظروں سے اوجھل کرے گا اور اُس سے اُس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور کہے گا: ”أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا، أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا، أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟“ کیا تو فلاں وفلاں گناہ کو پہچانتا ہے؟ یہاں تک کہ جب اس سے اُس کے گناہوں کا اقرار کرا لے گا اور وہ شخص اپنے جی میں سمجھے گا کہ ہلاک ہوا، تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”فَإِنِّي قَدْ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَإِنِّي أَغْفِرُ لَهَا الْيَوْمَ“ میں نے ان گناہوں کو تجھ پر دنیا میں پوشیدہ رکھا تھا اور آج میں ان کو تیرے لیے بخشتا ہوں۔ پھر اس کو اس کے حسنات کی کتاب دی جائے گی۔ رہے کفار اور منافقین سو گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ باندھا تھا، ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔[1] (رواه أحمد والشيخان)

وہ لوگ لوگوں کو حق کی پیروی کرنے اور ہدایت کے راستے پر چلنے سے، جو اللہ تک پہنچاتا ہے، پھیرتے ہیں اور جنت سے محروم کرتے ہیں، ان کا ارادہ ہے کہ یہ لوگ ٹیڑھی راہ پر، جو معتدل نہیں ہے، چلیں اور گمراہ ہو کر جہنم میں جا پڑیں۔ سو یہ آخرت کے اور قیامت کے ہونے کے منکر ہیں، لیکن زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی حامی اور ولی ہے، بلکہ یہ سب اللہ کے قہر و غلبہ و قبضہ و سلطان کے نیچے ہیں۔ اللہ پاک ان سے انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہے، اسی دنیا میں آخرت سے پہلے، لیکن اللہ نے ان کو اس دن تک چھوڑ رکھا ہے جس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٨) مسند أحمد (٢/ ٧٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٧٥)

میں آنکھیں ابھر آئیں گی۔

صحیحین میں حدیث ہے: «إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِي الظَّالِمَ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ» یعنی اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔[1] اس لیے اللہ نے کہا کہ ان کے لیے دوگنا عذاب ہوگا، یہ اس لیے کہ اللہ نے ان کو کان، آنکھ، دل دیے تھے، مگر یہ چیزیں ان کے لیے کچھ کارآمد نہیں ہوئیں، بلکہ وہ حق کو سننے سے بہرے، اتباع کرنے سے اندھے اور بصیرتِ دل سے بے بہرہ تھے، جس طرح کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ وہ جہنم میں داخل ہوتے وقت یوں کہیں گے: ﴿ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴾ [الملك: ١٠] ''اور وہ کہیں گے: کاش ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴾ [النحل: ٨٨] ''جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔'' اسی لیے ہر حکم کو چھوڑ دینے پر اور ہر ممنوعہ کام کے ارتکاب پر عذاب کیے جائیں گے۔ سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ کفار شریعت کے تمام احکام کے مکلّف ہیں، کیا امر اور کیا نہی۔ بہ نسبت دارِ آخرت کے انھوں نے اپنی جان کا نقصان کیا، کیونکہ وہ گرم آگ میں جا پڑے اور ایسے عذاب میں پھنسے جو آنکھ جھپکنے کی مدت کے لیے بھی سست نہ پڑے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] ''جب بھی وہ بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اور بھڑکا دیں گے۔''

جو بت اور شریک اللہ کے سوا جھوٹے معبود ٹھہراتے تھے، وہ سب اُس دن گم ہو جائیں گے، کوئی بھی تو نہیں ملے گا، بلکہ ان کے سبب ان کا سخت ضرر ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [الأحقاف: ٦] ''اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴾ [مریم: ٨١۔ ٨٢] ''اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ ہرگز نہیں! عنقریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔''

نیز خلیل جلیل علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ٢٥] ''تم نے اللہ کے سوا جن بتوں کو معبود ٹھہرا لیا ہے، تو یہ محض تمھاری آپس کی دنیا کی دوستی کی وجہ سے ہے، پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور تم میں سے ایک دوسرے پر لعنت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٣)

بھیجے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے، اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ ہوں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴾ [البقرة: ١٦٦] ''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بے زار ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی تھی اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے تمام تعلقات کٹ جائیں گے۔''

اس کے سوا اور بہت سی آیتیں ہیں جو ان کے خسران اور ہلاکت پر دلیل ہیں، اسی لیے اللہ نے اس جگہ فرمایا کہ لامحالہ یہ آخرت میں خاسر ہوں گے، یعنی ان کا انجام اس دن صفقۂ خاسرہ میں ہے، کیونکہ انھوں نے درجات کو درکات (جہنم کے طبقات) سے بدل لیا اور جنتوں کی نعمتوں کے بدلے کھولتا اور ابلتا ہوا پانی پسند کر لیا اور خالص سربمہر شراب پینے کے بجائے گرم ہوا اور گرم پانی اور سیاہ دھوئیں کے سائے کو لے لیا اور حور عین کے بدلے زخموں کی پیپ کو اور بلند محلوں کے عوض دوزخ کا گڑھا اور رحمان کے قرب اور رؤیت کے بجائے اس کے غضب، سزا اور بدلے کو خرید لیا۔ ﴿ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴾ (آیتِ باب)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ کوئی شخص اس سے بڑھ کر اپنے نفس کا ظالم نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے اور بتوں اور شریکوں کو اللہ کے سامنے اپنا سفارشی ٹھہرائے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بتائے اور اللہ کے کلام کو غیر کی طرف منسوب کرے۔ اس جگہ ایسے شخص کے چودہ وصف بیان کیے، پہلا وصف جھوٹ باندھنا ہے اور پچھلا وصف آخرت میں خاسر ہونا۔ غرض کہ یہ ظلم کی صفت والے لوگ قیامت کے دن اللہ کے روبرو لائے جائیں گے، وہ ان کے اعمال کا حساب لے گا یا ان کے پیش کیے جانے سے مراد ان کے اعمال کا پیش کیا جانا ہے، جس سے یہ سخت رسوا اور ذلیل ہوں گے۔ اشہاد شہید کی جمع ہے یا شاہد کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ملائکہ ہوں گے جو انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مرسلین ہوں گے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ دونوں ہوں گے مع علما، جنھوں نے اللہ کے اوامر ونواہی کو پہنچا دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ساری مخلوق ہو گی۔ یہی قول ہے امام قتادہ رحمہ اللہ کا۔[2]

بالجملہ پیش کیے جانے کے وقت یہ اشہاد کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا میں اپنے پروردگار پر افترا پردازی کی تھی اور دروغ گوئی کی تھی۔ اس جگہ ان کے جھوٹ کی صراحت نہیں کی، یہ اس لیے کہ گویا ان کا یہ معاملہ اہلِ موقف کو معلوم ہو گا۔ پھر وہ اشہاد یہ کہیں گے کہ سن لو! اللہ کی پھٹکار ہے ان لوگوں پر جنھوں نے اپنی جانوں پر افترا بندی سے ظلم کیا ہے۔ یا یہ اللہ کا کلام ہو گا کہ اشہاد کی شہادت کے بعد اس طرح فرمائے گا۔ اشہاد کے اس قول

---

[1] تفسیر البغوي (٤/ ١٦٨) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٢٨٣)

میں کافروں کی فضیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کی زیادتی ہے، ساری مخلوق کے سامنے۔ پھر ان ظالم ملعونوں کا وصف بیان کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جس شخص پر قابو پاتے ہیں، اس کو اللہ کے دین میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریش لوگوں کو نبی اکرم ﷺ سے باز رکھتے تھے[1] اور کہتے تھے کہ محمد ﷺ کی راہ پر نہ چلو کہ یہ راہ ٹیڑھی ہے۔ یا اپنے اہل اور رشتے داروں کو ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے کہ دینِ اسلام چھوڑ کر کفر کی طرف آ جائیں۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یہ امید کرتے تھے کہ مکے میں سوائے اسلام کے کوئی اور دین ہو۔[2] پھر یہ دین نہ ہو اور آخرت کے منکر تھے۔ قیامت قائم ہونے اور دوبارہ زندہ ہو کر لوٹائے جانے کی تصدیق نہ کرتے تھے۔ اللہ نے کہا یہ دنیا میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اگر اللہ ان کو سزا دینے کا ارادہ فرمائے۔ یا معجزین کے معنی اس جگہ سابقین یا فائتین اور اس طرح کے ہیں، یعنی زمین بہت کشادہ اور فراخ ہے، یہ چاہیں کہ ہم کہیں بھاگ جائیں تو ہرگز کسی جگہ بھاگ کر اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے، جیسے کہا گیا ہے ع

بہر کجا کہ رسیدیم آسمان پید است

''ہم جہاں کہیں پہنچے آسمان ظاہر ہے۔''

اللہ کے سوا کوئی ان کا مددگار اور دوستدار نہیں ہے جو اللہ کی سزا اور عذاب کو ان سے دور کر سکے، بلکہ ان کو تو آخرت میں دوگنا عذاب ہوگا، اس وجہ سے کہ اللہ کی راہ سے روکتے اور مر کر جی اٹھنے کا انکار کرتے تھے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس لیے کہ دوسروں کو بہکاتے تھے۔[3] امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیوطی کے قول کا حاصل یہ ہے کہ اجر کا کئی گنا ہو جانا حسنات کے ساتھ مخصوص ہے۔ رہے سیئات سو ان کا بدلہ کئی گنا نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ﴾ [الأنعام: ١٦٠] ''اور جو شخص ایک برائی لے کر آئے گا تو اسے بس اس کے برابر ہی سزا دی جائے گی۔''

تو اب مضاعفت (دوگنا ہونا) کے معنی شدت ٹھہرے، اس لیے کہ ان کو دوہرا عذاب ہوگا: ایک اپنی گمراہی کا اور دوسرا اوروں کو گمراہ کرنے کا۔ وہ حق سے منہ موڑنے میں اس قدر زیادہ تھے اور یہاں تک بغض تھا کہ حق بات سن بھی نہیں سکتے تھے، گویا انھیں حق بات سننے پر بالکل قدرت ہی نہ تھی، بہرے تھے اور نہ ہی ان میں اتنی استطاعت تھی کہ صحیح بات دیکھ سکیں، گویا اندھے تھے۔ یا یہ وصف ہیں ان کے اولیا من دون اللہ کے کہ وہ نہ سن سکتے تھے نہ دیکھ سکتے تھے۔ تو اب کیا خاک ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں یا کوئی نقصان دور کر سکتے ہیں؟!

پیر خود درماندہ شفاعت کجا

''پیر خود عاجز و بے بس ہے، وہ کسی کی شفاعت کیا کرے گا؟!''

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢١٠٧) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠١٨) (3) تفسير الجلالين (١/ ٢٨٧)

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سن نہ سکتے تھے، اس لیے کہ اللہ نے ان کو لوحِ محفوظ میں گمراہ لکھ رکھا تھا۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی دشمنی سے نہ سمجھتے نہ بوجھتے۔[2] امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کا یہ محاورہ ہے کہ "فُلَانٌ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَنْظُرَ إِلَىٰ فُلَانٍ"یعنی اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا، اس لیے کہ وہ اس پر گراں ہے۔[3] بہرحال ان لوگوں نے اپنی جانوں کا غیر اللہ کی عبادت کر کے نقصان کیا۔ اللہ کی عبادت کے عوض عبادتِ آلہۂ باطل کو مول لیا، اس لیے ان کی تجارت میں بڑا ٹوٹا پڑا اور ان کا وہ افترا (جھوٹ) کہ ہمارے معبود اللہ کے نزدیک ہمارے سفارشی و کاروباری ہوں گے، کھو گیا۔ ان کے ہاتھ میں سوائے خسران اور نقصان کے کچھ بھی تو باقی نہ رہا۔ ناچار یہ آخرت میں بڑے نقصان اور گھاٹے میں ہوں گے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے کہ ﴿لَا جَرَمَ﴾ بہ معنی حق ہے بمنزلہ ایک کلمے کے۔ یہی امام فراء رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ بمنزلہ "لَا بُدَّ وَلَا مَحَالَةَ" کے ہے، پھر کثرتِ استعمال سے حق کے معنی میں ٹھہر گیا۔[4]

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور اپنے رب کے حضور عاجزی کی، وہی جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (23) دونوں فریقوں کی مثال ایسے ہے جیسے اندھا اور بہرا، اور دیکھنے والا اور سننے والا، کیا (اس) وصف میں دونوں برابر ہیں؟ کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ (24)

اہلِ ایمان اور عاجزی اختیار کرنے والوں کا بدلہ:

اللہ تعالیٰ نے بد بخت لوگوں کا ذکر کرنے کے بعد نیک بختوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ سعادت مند، بختاور، خوش نصیب، بیدار بخت اور سعید طالع وہ لوگ ہیں جن کے دل ایمان لائے اور ان کے تمام جوارح (اعضا) نے قولاً وفعلاً اعمالِ صالح کیے، اطاعت بجا لائے، منکرات کو چھوڑ دیا، اسی سبب سے وہ جنتوں کے وارث ہوئے۔ یہ جنتیں بلند بالا خانوں اور قطاروں میں بچھے ہوئے پلنگوں اور جھکی ہوئی میووں کی ٹہنیوں اور اونچے فرشوں اور نیک سیرت، خوب صورت عورتوں اور طرح طرح کے پھلوں اور پسندیدہ کھانوں اور لذیذ مشروبات پر مشتمل ہیں اور وہاں یہ مومنین

---

[1] معاني القرآن للفراء (٢/ ١٥٧)
[2] معاني القرآن للزجاج (٣/ ٤٥)
[3] تفسير القرطبي (٩/ ٢٠)
[4] فتح القدير (٢/ ٦٨٥) فتح البيان (٦/ ١٦٠ـ ١٦٤)

جو عمل صالح کرتے رہے، خالقِ ارض و سماوات کا دیدار کریں گے اور ان پاکیزہ جنتوں میں ہمیشہ ہمیشہ اور ابدالآباد تک رہیں گے، نہ ان پر کبھی موت آئے گی، نہ کبھی وہ بوڑھے یا بیمار ہوں گے اور نہ نیند میں جائیں گے، نہ انھیں بول و براز کی حاجت ہوگی، نہ ناک سنکیں گے اور نہ تھوکیں گے۔ یہی رشحِ مشک ہوگا جو پسینے کی طرح پر بہ جائے گا۔

کافروں اور مومنوں کی مثال:

پھر اللہ نے کافروں اور مومنوں کی مثال بیان فرمائی کہ بدبخت کفار ایسے ہیں جیسے کوئی اندھا اور بہرا ہو اور نیک بخت مومنین ایسے ہیں جیسے کوئی دیکھتا اور سنتا ہو، کافر دنیا اور آخرت میں راہِ حق سے اندھا ہے، اس کو کسی خیر کی طرف راستہ نہیں ملتا اور نہ سوجھتا ہے۔ دلائل سننے سے وہ بہرا ہے، نفع کی بات نہیں سنتا۔ اللہ اگر ان میں کوئی خیر معلوم کرتا تو ان کو سنوا دیتا۔ رہا مومن تو وہ عقل مند، پاکیزہ، دانا، حق کو دیکھنے والا، حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے، خیر کا تابع، شر کا تارک، حجت کو سننے والا، یقین اور شبہہ کے درمیان فرق کرتا ہے، اس پر باطل کا کوئی اثر نہیں۔

بھلا پھر یہ دونوں کیسے یکساں اور برابر ہو سکتے ہیں، تم لوگ ذرا نہیں سوچتے سمجھتے اور عبرت پکڑتے کہ ان دونوں میں کتنا واضح فرق اور تفاوت ہے، جس طرح اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَا يَسْتَوِيٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۝ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ۝ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ۝ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴾ [الفاطر: ١٩۔ ٢٤] ''اور اندھا اور دیکھنے والا برابر نہیں (ہو سکتے)۔ اور نہ اندھیرے اور نہ روشنی۔ اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔ اور نہ زندے اور نہ مردے برابر ہو سکتے ہیں، بے شک اللہ جسے چاہے سنوا دیتا ہے اور آپ ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں۔ بلاشبہہ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا (آیا) ہو۔''

میں کہتا ہوں قرآن پاک میں اللہ پاک نے بہت جگہ دو اشیا کے درمیان برابری نہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے، جیسے: ﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الزمر: ٩] ''کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟'' ان سب علاحدہ علاحدہ فرقوں کا بیان مکمل طور پر کتاب حدیث الغاشیہ میں ہے، اس کو دیکھنا چاہیے۔ وباللہ التوفیق.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جن لوگوں نے تصدیق کی کہ قرآن اللہ کے پاس سے اترا ہے، اسی طرح ایمان کی باقی

خصلتوں کو مانا ہے اور اپنے جوارح سے اچھے اچھے کام کیے ہیں، جیسے پابندی سے اقامتِ نماز، روزہ، زکات، حج، ہجرت، جہاد اور اسی طرح کے دوسرے اعمال کا کرنا اور اللہ کی طرف رجوع کیا اور ساکن ہوئے یا خضوع وخشوع کیا، یا اللہ سے ڈرے اور گناہوں سے باز رہے، یا مطمئن ہوئے۔ اس سے مراد اعمالِ قلوب ہیں تو ایسے لوگ جنت والے ہیں، وہ ہمیشہ جنت میں رہا کریں گے، ان سے جنت کی نعمتیں کبھی منقطع نہیں ہوں گی اور نہ وہ جنت سے باہر نکلیں گے۔ کافروں کے فریق کو اندھے اور بہرے کی مانند فرمایا اور ایمان والے فریق کو بصیر وسمیع بتایا، پھر کہا کہ کیا یہ دونوں فریق حالت اور صفت میں برابر ہیں، یعنی اگر تم کچھ سوچو سمجھو تو جان لو کہ ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر ہے۔[1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾

اور البتہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے کہا:) بے شک میں تمھیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں (25) یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ بے شک میں تم پر دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں (26) پھر اس کی قوم کے وڈیرے بولے: ہم تجھے بس اپنے ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بس انھی لوگوں نے بے سوچے سمجھے تیری پیروی کی ہے جو ہمارے کمین ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمھیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں بلکہ ہم تمھیں جھوٹا سمجھتے ہیں (27)

نوح علیہ السلام کی دعوت اور قوم کا جواب:

اللہ پاک نے اس آیت میں نوح علیہ السلام کا ذکر کیا، یہ پہلے رسول ہیں جن کو اللہ نے اہلِ زمین کی طرف مبعوث فرمایا۔ ان کے زمانے میں مشرکین اور بت پرست تھے، انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تم کو اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں، اگر تم غیر اللہ کی پرستش اسی طرح پر کیے جاؤ گے، جیسے کہ اب کرتے ہو تو مجھے تم پر آخرت میں دردناک عذاب کا ڈر ہے، سو تم کسی کو اللہ کے سوا نہ پوجو۔ قوم کے سرداروں نے کہا کہ تم بھی ایک طرح کے بشر ہو، سو ہم کو تو وحی نہیں آئی اور تم کو آئی ہے، یہ کیا بات ہے؟! اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمھارے پیروکار بھی چند نیچ قسم کے لوگ، مثلاً: بیوپاری اور جولاہے وغیرہ ہیں۔ اشراف اور سرداروں نے تمھاری اتباع اختیار نہیں کی اور یہ لوگ جو تمھارے تابع ہو گئے ہیں،

[1] فتح البیان (٦/ ١٦٤۔ ١٦٥)

انھوں نے بھی کسی نظریہ فکر ونظر سے یہ تابع داری اختیار نہیں کی، بلکہ تم نے ان کو اپنی طرف بلایا، یہ آ گئے، کچھ سوچا سمجھا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمھیں ہم پر پیدایش اور خلق کے لحاظ سے یا رزق اور حالت کے لحاظ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے کہ ہم تمھارے دین میں داخل ہو جائیں، بلکہ ہمارا گمان یہ ہے کہ تم جھوٹے ہو اور تمھارا یہ دعویٰ کہ دارِ آخرت میں نیکیوں اور عبادات کا اچھا صلہ ملے گا اور سعادت ملے گی، جھوٹ ہے۔

اشراف کون ہوتے ہیں:

بالجملہ کفار نے یہ اعتراض کیا تھا نوح اور ان کے اتباع (پیروکاروں) پر۔ سو ان کا ایسا اعتراض وارد کرنا ان کی جہالت کی دلیل ہے۔ اسی سے ان کی قلتِ علم وقلتِ عقل ثابت ہوتی ہے، کیونکہ حق پر اس بات سے کوئی عار نہیں لگتی کہ اس کے اتباع ارذل (کم مرتبہ) لوگ ہیں۔ حق اپنے نفس میں صحیح ہے، خواہ اس کے ماننے والے اشراف ہوں یا اراذل، بلکہ وہ سچی بات جس میں کوئی شک نہیں ہے، یہ ہے کہ اشراف وہی ہوتے ہیں جو حق کا اتباع کرتے ہیں، اگرچہ وہ غریب اور فقیر ہوں اور جو لوگ اتباعِ حق سے انکار کرتے ہیں، وہی رذیل لوگ ہیں، اگرچہ مال دار ہوں۔

پھر واقعی حقیقت کے مطابق یہ بات ہے کہ غالباً حق کی تابع داری یہی کمزور لوگ کرتے ہیں اور اشراف اور بڑے لوگوں پر حق کی مخالفت غالب ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٢٣]

''اور اسی طرح آپ سے پہلے ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا، تو ان کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا: بلاشبہہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا، اور ہم تو انھی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔''

ہرقل بادشاہِ روم نے ابوسفیان صخر بن حرب سے نبی ﷺ کا حال پوچھا تھا کہ ان کے تابع اشراف لوگ ہیں یا کمزور لوگ؟ صخر نے کہا: بلکہ کمزور لوگ۔ ہرقل نے کہا: "هُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ"[1] یعنی پیغمبروں کے یہی لوگ تابع ہوا کرتے ہیں، نہ کہ قوم کے بڑے اور اشراف۔ اور یہ کہنا کہ اول رائے میں یہ تمھارے تابع ہو گئے ہیں، کچھ مذمت اور عیب کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ جب حق واضح ہو جاتا ہے تو پھر وہاں رائے اور فکر کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ اس حالت میں حق کی اتباع ضروری ہوتی ہے، یعنی ہر عقل والے اور ہوش مند شخص کے لیے حق کو قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے، بلکہ اس وقت اگر سوچ میں پڑتا ہے تو وہ غبی اور عاجز (کند ذہن اور سمجھ سے عاری شخص) ہے۔ اور سارے انبیا علیہم السلام کھلا اور واضح حکم لے کر آئے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے: «مَا دَعَوْتُ أَحَداً إِلَى الْإِسْلَامِ إِلَّا كَانَتْ لَهُ كَبْوَةٌ غَيْرَ أَبِي بَكْرٍ فَإِنَّهُ لَمْ يَتَلَعْثَمْ»[2] یعنی جس کسی کو میں نے اسلام کی طرف بلایا، اس نے ٹھوکر کھائی، مگر ابوبکر نے کچھ توقف نہیں کیا، یعنی تردد، اس لیے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٣)

[2] الإبانة الكبرىٰ لابن بطة (٩/ ٤٥٢) یہ روایت مرسل ہے، البتہ اس موضوع کی "صحيح البخاري" (رقم الحديث: ٢٤٦١) اور دیگر کتب میں کئی ایک احادیث مروی ہیں۔

کہ انھوں نے ایک امرِ جلی واضح دیکھ کر جلد سے آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیا۔ اور ان کا یہ کہنا کہ ہم کچھ تمھارا فضل اپنے اوپر نہیں دیکھتے، اس لیے تھا کہ وہ حق سے اندھے تھے اور نہ دیکھتے تھے، نہ کچھ سنتے تھے، بلکہ اپنے شک وشبہہ میں متردد اور جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے اور بڑے بہتان تراز، جھوٹے اور رذیل تھے اور آخرت میں خائب وخاسر ہوں گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت پر اللہ پاک نے صرف ڈرانے کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے، بشارت کا ذکر نہیں فرمایا، اس لیے کہ نوح علیہ السلام کی دعوت صرف قوم کو ڈرانے کے لیے تھی یا اس لیے کہ ان کی قوم نے ان کی بشارت پر کوئی عمل نہیں کیا، اس سورت میں بہت سے قصوں کا ذکر ہے۔ ایک قصہ نوح علیہ السلام کا، دوسرا ہود علیہ السلام کا، تیسرا صالح علیہ السلام کا، چوتھا، ابراہیم علیہ السلام کا، پانچواں لوط علیہ السلام کا، چھٹا شعیب علیہ السلام کا اور ساتواں موسیٰ علیہ السلام کا۔ زمانے کی ترکیب کے لحاظ سے یہ آخری قصہ ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمھارے لیے نذیر مبین ہوں، تم کسی کی عبادت نہ کرو، مگر اللہ کی۔ یہ ترتیب حصر کے لیے (صرف اللہ ہی کے لیے حقِ عبادت کے اثبات کے لیے) مفید ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرو گے تو عذابِ الیم میں گرفتار ہو گے، اس کہنے میں انذار کے معنی ثابت ہوئے۔

یوم سے مراد قیامت کا دن ہے یا طوفان کا دن۔ اشرافِ قوم جو کافر تھے، انھوں نے یہ جواب دیا کہ ہم تجھ کو اپنا سا بشر دیکھتے ہیں، یہ ایک طرح کا طعنہ ہے ان کی نبوت میں، یعنی ہم اور تو بشر ہونے میں مشترک ہیں، تجھ کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے کہ جس کے سبب سے نبوت کا تُو حق دار ہو اور ہم نہ ہوں۔ دوسرا طعن یہ کیا کہ تیرے تابع لوگ رذیل ہیں، کسی شریف نے تیری اتباع اختیار نہیں کی، ان رذیل لوگوں کے تیرے پیچھے لگ جانے سے تجھ کو ہم پر کوئی بڑائی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اراذل ارذل کی جمع ہے اور ارذل رذل کی جمع ہے، مراد کم تر لوگ ہیں، جیسے: جولائے اور بڑھئی وغیرہ۔ ہر ادنیٰ شے کو ارذل کہتے ہیں۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اراذل فقرا ہیں اور وہ لوگ جن کا کچھ حسب نہیں ہے۔ حسب سے مراد صناعات ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو حیاکت (کپڑے بنانے) کی طرف منسوب کیا اور یہ نہ جانا کہ صناعات (کاری گریوں) کو دیانت میں کچھ اثر نہیں ہے،[1] کیونکہ دین کی سربلندی اور رسولوں کی متابعت، شرف اور مال اور اعلیٰ مناصب سے نہیں ہوتی، بلکہ فقرائے گمنام سے ہوتی ہے، یہی لوگ رسولوں کے اتباع ہوتے ہیں، ان کے معمولی پیشے ان کے لیے کچھ نقصان دہ نہیں ہیں، جب کہ دین میں ان کا کردار اچھا ہو۔ اللہ کی عادت انبیا اور اولیا میں اسی طرح جاری ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ انبیا کی پیروی کرتے ہیں، وہ یہی ضعیف اور حقیر لوگ ہوتے ہیں۔ خاکساری کی وجہ سے انھیں مال وجاہ کا تکبر نہیں ہوتا۔

امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سفلہ (کمینہ) وہ ہے کہ اپنی دنیا کی اصلاح دین سے کرے، کہا: سفلۃ السفلہ کون

---

[1] فتح القدیر (۲/ ٦٨٨)

ہے؟ کہا: جو دوسرے کی دنیا کو اپنا دین بگاڑ کر درست کرے۔[1] اہل لغت کا ظاہر کلام یہ ہے کہ سفلہ وہ ہے جو حقیر پیشے میں داخل ہو۔ پہلی رائے سے مراد بغیر غور وفکر کے جو رائے دی جائے، یا اول رائے۔ تیسری بات طعن کے طور پر یہ کہی کہ ہم تجھ کو اپنے اوپر کچھ فضل والا نہیں دیکھتے مال وشرف اور عزت اور رائے میں۔ پہلے تنہا نوح علیہ السلام کو خطاب کیا تھا، اس خطاب میں ان کے متبعین کو شامل کر لیا، اس کے بعد طعنوں سے ہٹ کر صرف گمان کرنے لگ گئے اور صرف عصبیت اور حسد سے کام لیا اور اپنی دنیاوی ریاست کے غرور میں یہ بات کہی کہ ہم تم سب کو اپنے دعویٰ میں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔[2]

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

نوح نے کہا: اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح ہدایت پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت (نبوت) بخشی ہو، پھر وہ تم (اندھوں) سے چھپا دی گئی ہو، تو کیا ہم تم پر (زبردستی) چپکا دیں گے اسے جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ (28)

دین واضح ہونے کے باوجود قبول کرنے میں جبر نہیں:

اللہ نے خبر دی کہ نوح علیہ السلام نے اُن پر رد کیا اور کہا کہ اگر میں اللہ کی طرف سے یقین اور ایک واضح امر اور سچی نبوت پر ہوں کہ یہ اُس کی مجھ پر ایک عظیم رحمت ہے اور تم پر بھی رحمت ہے اور یہ بات تم پر مخفی رہی اور تم اس راہ پر چلے اور تم نے اس کی کچھ قدر نہ جانی، بلکہ فوراً ہی اس کی تکذیب اور تردید کے لیے آمادہ ہو گئے تو کیا میں تمھاری کراہت کے باوجود اس امر کو کسی کے گلے باندھ سکتا ہوں؟

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تم مجھے خبر دو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے اپنی نبوت پر کسی برہان پر ہوں جو نبوت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے اور تم پر اس کا قبول کرنا واجب ہے اور جو عیب جوئی تم نے کی ہے وہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ صفتِ بشریت میں برابر ہونا نبوت ملنے سے مانع نہیں اور رذیل لوگوں کا نبوت کے تابع ہونا جیسا کہ تمھارا اعتقاد ہے، کچھ میری نبوت سے منع نہیں کرتا، کیونکہ یہ رذیل لوگ بھی تو بشریت میں تمھاری طرح ہیں اور عقل وفہم رکھتے ہیں، ان کا تابع ہونا تم پر حجت ہے نہ کہ تمھارے اعتقاد کی دلیل۔ یہ جائز ہے کہ اس جگہ بینہ سے مراد معجزہ ہو۔ اس خطاب میں ان کے ساتھ انتہا درجے کی نرمی اور مہربانی ہے۔ رحمت سے مراد نبوت ہے، یا معجزہ، یا رحمت سے مراد یہی بینہ ہو، لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ رحمت کی تفسیر بینہ سے علاحدہ کی جائے، یا رحمت سے مراد حق ہے یا برہان کی پہچان

---

[1] فتح القدیر (۲/ ٦٨٨) [2] فتح البیان (٦/ ١٦٦۔ ١٦٧)

کی طرف راہنمائی ہے یا ایمان پر۔

پھر یہ بینہ اور رحمت تم پر پوشیدہ رہے اور تم راہ یاب نہ ہوئے، جس طرح کوئی قوم صحرا میں ہو اور ان کا راہنما اندھا ہو جائے تو پھر اس قوم کو راہ نہیں سوجھتی تو کیا میں تم کو اس کی معرفت کی طرف مجبور کر سکتا ہوں یعنی نہیں۔ مراد قتل وغیرہ سے روکنا لازم ہے نہ کہ قتل کو قبول کرنا لازم ہے، اس لیے کہ یہ الزام تو حاصل ہے۔ اسی لیے امام سیوطی رحمہ اللہ نے یہ تفسیر کی ہے: ''أَنُجْبِرُكُمْ عَلٰى قُبُوْلِهَا''[1] حالانکہ تم اس کے منکر اور باز رہنے والے اور ناپسند کرنے والے ہو، یعنی جس صورت میں کہ میں نبوت کے صحیح ہونے پر ایک حجت ظاہر الدلالۃ ہوں اور یہ دلالت تم پر مخفی ہے تو میں زبردستی کسی کو اس کا علم نہیں دے سکتا، خصوصاً جب کہ تم اس معاملے میں تدبر بھی نہیں کرتے۔ یہ بات مجھ سے کہاں ہو سکتی ہے، اس پر تو سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: واللہ! اگر نبی اللہ کر سکتے تو ضرور اپنی قوم کو راہ پر لے آتے، لیکن یہ بات ان سے نہ ہو سکی۔[2] معلوم ہوا کہ ہدایت یاب کرنا اللہ کے قبضے میں ہے، نہ کسی پیغمبر، پیر، شہید، صدیق یا صالح کے۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ ہی پر ہے۔ اور میں ان لوگوں کو دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لے آئے، بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کر رہے ہو (29) اور اے میری قوم! اگر میں انھیں دھتکار دوں تو کون مجھے اللہ (کے عذاب) سے بچائے گا؟ کیا پھر تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ (30)

قوم کو جواب:

کافروں نے مسلمانوں کو رذیل ٹھہرایا اور چاہا کہ ان کو اپنے پاس سے ہٹا دو تو ہم تمھارے پاس بیٹھیں اور بات سنیں۔ سو فرمایا کہ دل کی بات کو تو اللہ پرکھ لے گا، جب اس سے ملیں گے اگر میں ان مسلمانوں کو دور ہٹاؤں تو پھر اللہ سے مجھ کو کون چھڑائے گا۔ ان کو رذالہ اس لیے ٹھہرایا کہ وہ ہاتھ سے محنت کر کے کمائی کرتے تھے۔ ہاتھ کی کمائی سے بہتر کوئی کمائی نہیں، اسی لیے فرمایا کہ تم جاہل ہو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ

[1] تفسير الجلالين (١/ ٢٨٨) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٢٩٩) فتح البيان (٦/ ١٦٨۔ ١٦٩)

اگر تم کو یہ خیال ہے کہ میں تم سے کچھ مال لینا چاہتا ہوں تو اس خیر خواہی کے بدلے میں تم سے کسی مال و دولت کا سوال نہیں کرتا، مجھے تو اجر کی طلب، اللہ عزوجل سے ہے اور یہ چند لوگ جو ایمان لائے ہیں ان کو تم چاہتے ہو کہ میں نکال دوں، تم یہ اپنی جاہ وحشمت اور نفاست کے لیے چاہتے ہو، تب تم میرے پاس بیٹھو گے اور میری بات سنو گے۔

مشرکوں اور قوم نوح کے مطالبے میں مماثلت:

جیسے اس قسم کا سوال ان جیسے لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے بھی کیا تھا کہ تم ان مومن ضعیف اور حقیر لوگوں کی جماعت کو اپنے پاس سے دور کرو، تاکہ ہمارے لیے خاص مجلس کا اہتمام ہو۔ اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی تھی: ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ [الأنعام: ٥٢] ''اور ان لوگوں کو اپنے سے مت دور کریں جو اپنے رب کو صبح اور شام پکارتے ہیں، وہ اپنے رب کا چہرہ (رضا مندی) چاہتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٥٣] ''اور ہم نے اسی طرح لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے، تاکہ وہ (انھیں دیکھ کر) کہیں: کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ (ہاں) کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے) زیادہ نہیں جانتا؟''[1] سو یہ بات مجھ سے نہ ہوگی کہ میں ان کو اپنے پاس سے ہانک دوں، تم جو مجھ سے ایسی بات کہتے ہو یہ جہالت حماقت اور کم عقلی ہے، پس بس۔

نبی مال کا طلبگار نہیں ہوتا:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں نوح علیہ السلام نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ میں رسالت تمھاری طرف پہنچا کر کوئی اجر طلب نہیں کرتا کہ مجھے اس بات کی تہمت لگائی جائے اور کفار کو یہ بات کہنے کا موقع دوں کہ یہ نبوت کا دعویٰ اسی دنیا کے طلب کے لیے ہے اور نہ ہی میں ان لوگوں کو جو مومن ہیں اور قیامت کے دن اپنے رب سے ملنے والے ہیں، اپنے پاس سے دور کر سکتا ہوں۔ اللہ ان کو اُس دن اپنے ایمان لانے کا بدلہ دے گا۔ گویا نوح علیہ السلام نے ان مومنوں کی عظمت کے لیے یہ کہا ہو اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ انھوں نے ایسا اس ڈر سے کہا ہو کہ اگر میں ان کو اپنے پاس سے نکال دیتا ہوں تو اللہ کے سامنے مخاصمہ (جھگڑا) ہو گا کہ تُو نے ان کو اپنے پاس سے جدا کیوں کر دیا۔ یہی کیفیت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قریش کی تھی کہ وہ بھی آپ ﷺ سے یہی فرمایش کرتے تھے کہ تم ان غریب اور ضعیف مومنین اور مسلمین کو اپنے پاس نہ آنے دو۔ سبحان اللہ! کافروں نے جو معاملہ اپنے پہلے انبیا سے کیا تھا وہی معاملہ مشرکین نے آخر الانبیا ﷺ کے ساتھ کیا۔ ''فَمَا أَشْبَهَ اللَّيْلَةَ بِالْبَارِحَةِ'' (آج کی رات کل کی رات کے کس قدر مشابہ ہے)۔

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٧٨)

نوح علیہ السلام کا جواب:

نوح علیہ السلام نے بالآخر یہ کہا کہ تم مجھ کو جاہل نظر آتے ہو اور ان کو دور نہ ہٹانے کے لیے یہ کہا کہ اگر میں ان کو اپنے پاس سے ہانک دیتا ہوں، ان کے ایمان کو سب سے پہلے قبول کرنے اور میری دعوت کو قبول کرنے کی وجہ سے تو یہ ایک عظیم ظلم ہو گا۔ اس ظلم کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کون میری مدد کرے گا۔ تم اتنا نہیں سوچتے کہ انبیا معصومین سے ظلم کا واقع ہونا ہرگز ممکن نہیں ہے۔ تم کو اگر کچھ تدبر کرنا ہوتا تو تم جان لیتے کہ تم غلطی پر ہو اور یہ ایمان لانے والے صحیح راستے پر ہیں۔[1]

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ تَزْدَرِیْۤ اَعْیُنُكُمْ لَنْ یُّؤْتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّیْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾

اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں، اور نہ میں کہتا ہوں کہ بے شک میں فرشتہ ہوں اور نہ میں انھیں، جنھیں تمھاری آنکھیں حقیر دیکھتی ہیں، (یہ) کہتا ہوں کہ اللہ انھیں کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے نفسوں میں ہے۔ بے شک (اگر میں نے یہ باتیں کہیں) تب میں ضرور ظالموں میں سے ہوں گا (31)

رسول کی اپنی ذات سے الٰہی خزانوں کی ملکیت، علم غیب اور فرشتہ ہونے کی نفی:

وہ جو کہتے تھے کہ تم میں ہم اپنے سے بڑائی نہیں دیکھتے، سو فرمایا کہ میں فرشتہ نہیں، غیب کی خبر نہیں رکھتا، اللہ کے خزانے میرے ہاتھ میں نہیں ہیں، وہ جو اللہ نے مجھ پر مہربانی فرمائی ہے وہ تمھاری آنکھ سے چھپی ہوئی ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خبر دی کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں کہ صرف اللہ کو پوجو، اللہ نے مجھ کو اس بات کا اذن دیا ہے اور میں اس کام پر مزدوری نہیں مانگتا، بلکہ ہر شریف اور وضیع (کمینے) کو توحید کی دعوت دیتا ہوں، جس نے اس دعوت کو مانا اس نے نجات پائی اور مجھ کو اللہ کے خزانوں پر کسی طرح کی قدرت نہیں ہے جتنا اللہ نے بتایا ہے اس سے زیادہ کوئی بات غیب کی نہیں جانتا اور نہ میں فرشتہ ہوں، بلکہ ایک بشر ہوں، جس کی تائید معجزات سے کی گئی ہے۔ اور نہ میں یہ بات کہوں کہ یہ لوگ جن کو تم حقیر اور خوار کہتے ہو ان کو اللہ کے نزدیک ان کے اعمال کا کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، اگر یہ ظاہر کی طرح باطن میں بھی مومن ہیں تو ان کو بہتر جزا ملے گی، اگرچہ کوئی ان کو اس ایمان لانے پر برا اور بد کیوں نہ کہے۔ جو کوئی یہ یقین کرے گا کہ یہ اشرار ہیں، وہ ظالم ہوگا، اس نے ایسی بات کہی جس کا اسے علم نہیں۔[1]

---

[1] فتح البیان (٦/ ١٦٩۔ ١٧١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ کے خزائن سے مراد رزق ہے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ خزائن غیوب کے معنی میں ہے،[2] لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں، مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں غیب دان ہوں یا فرشتہ ہوں۔ بعض نے اس لفظ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ملائکہ انبیا سے افضل ہیں۔ اس مسئلے میں دلیلیں مختلف ہیں۔ طالبِ حق کو اس بارے میں تحقیق کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ نے ہم کو اس بات کی تکلیف نہیں دی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان مومنین کو جنھیں تم اراذل کہتے ہو اللہ کوئی خیر نہیں دے گا، یعنی ہدایت اور توفیق اور ایمان اور اجر، بلکہ اللہ نے ان کو خیرِ عظیم عطا کی ہے کہ یہ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کے نبی کے تابع ہیں۔

آخرت میں ان کو اللہ بہت زیادہ ثواب عطا کرے گا اور دنیا میں بھی بلندی دے گا اور اعلیٰ درجے کو پہنچائے گا۔ تمھارا ان کو حقیر جاننا انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جو ایمان اُن کے جی میں ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے، وہ ان کے دلی اخلاص کا بدلہ عطا کرے گا، اس میں کچھ مجھ کو اور تم کو اختیار نہیں ہے۔ میں اگر ان کے ساتھ وہ برتاؤ کروں جو تم چاہتے ہو تو میں ظالم ٹھہروں گا۔[3]

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ
اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

انھوں نے کہا: اے نوح! تو ہم سے جھگڑ چکا ہے اور ہمارے ساتھ بہت زیادہ جھگڑا کر چکا ہے، چناں چہ تو ہم پر وہ (عذاب) لے ہی آ جس کا ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو سچا ہے (32) نوح نے کہا: یقیناً اللہ ہی تم پر وہ (عذاب) لائے گا، اگر اس نے چاہا، اور تم (اسے) عاجز کرنے والے نہیں (33) اور تمھیں میری نصیحت نفع نہیں دے گی، اگر میں چاہوں کہ تمھیں نصیحت کروں، جب کہ اللہ تمھیں گمراہ کرنا چاہتا ہو، وہی تمھارا رب ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (34)

قوم کا عذاب کا مطالبہ اور نوح علیہ السلام کا جواب:

یہاں تک جتنے سوال اس قوم کے تھے، وہی نبی اکرم ﷺ کی قوم کے تھے۔ گویا یہ سب جواب ان کو ملے۔

(1) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۷۸) (2) تفسیر الخازن (۳/ ۲۲۸) (3) فتح البیان (۶/ ۱۷۱۔ ۱۷۲)

ایک ان کا نیا دعویٰ تھا، سو آگے فرمایا۔ اللہ نے خبر دی کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے اللہ کی سزا اور عذاب اور غصے کے آنے میں جلدی چاہی۔ سو آزمایش بولنے پر مقرر ہے، یعنی مانگنے پر۔ قوم نے کہا کہ ہم کسی طرح تیری تابع داری نہ کریں گے، تُو جس عذاب اور سزا کے آنے کا ہم سے وعدہ کرتا ہے، دعا کر اور اُس وعدے کو لے آ، اگر تُو سچا ہے۔ نوح علیہ السلام نے کہا کہ عذاب کرنے والا اور اس کو جلد لانے والا اللہ پاک ہے، اس کو کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی اور اگر اللہ کو یہی منظور ہے کہ تم گمراہ رہو تو میری نصیحت تم کو کچھ فائدہ مند نہ ہوگی۔ امورِ خلق کی باگ ڈور کا مالک اور منصف اور بااختیار حاکم صرف اللہ ہے۔ ﴿ لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے۔'' وہی پہلی دفعہ پیدا کرنے والا اور دوبارہ پیدا کرنے والا اور دنیا اور آخرت کا مالک ہے اور بس۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قوم نے کہا: اے نوح! تُو نے ہم سے ہر قسم کے جھگڑے کر لیے اور اس مقام میں ہر قسم کی دلیل دے کر ہمیں دور کیا، اب ہمارے لیے کوئی مجال باقی نہ رہی، ہمارے لیے سارے مسلک تنگ ہو گئے اور حیلوں بہانوں کے سب دروازے بند ہو چکے، اب وہ عذاب جس سے تم ہم کو ڈراتے ہو، وہ نازل کراؤ، اگر تم اپنے قول میں سچے ہو۔ نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ میرے بس کا کام نہیں ہے، یہ تو اللہ کی مشیت اور ارادے پر موقوف ہے، اگر اس کی حکمت عذاب کو جلدی بھیجنے کی ہوگی تو عذاب آ جائے گا اور اگر اس کی مشیت کا تقاضا عذاب میں دیر کرنے کا ہوا تو وہ تاخیر کرے گا۔ تم چاہو کہ اللہ سے فوت ہو جاؤ (بچ جاؤ) اور کہیں بھاگ جاؤ، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تم اس کو عاجز کر دو۔ میری نصیحت تمھارے کچھ کام نہیں آ سکتی، میں تمھارے لیے کتنی ہی خیر خواہی کیوں نہ کروں اور تمھیں تبلیغ، رسالت اور حق کی وضاحت اور شرک و کفر کا بطلان کرنے میں کتنا ہی مبالغہ کروں اگر اللہ کو تمھاری غوایت (گمراہ) کر دینا منظور ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اغوا سے مراد عذاب سے ہلاک کرنا ہے[1] اور ظاہری لغتِ عرب یہ ہے کہ اغوا بمعنی اضلال ہے، یعنی ہدایت کی راہ سے دور کر دینا اور حق کے راستے سے علاحدہ رکھنا، اگرچہ اغوا ہلاک کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اللہ تمھارا رب ہے، اغوا اور ہدایت اس کے ہاتھ میں ہے، تم کو اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے، وہ تمھارے اعمال کی جزا تم کو دے گا، خیر کی بہتر اور شر کی بدتر سزا۔[2]

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: اگر میں نے اسے خود گھڑا ہے تو میرا جرم مجھ ہی پر ہے، اور میں اس سے بَری ہوں جو تم جرم کرتے ہو ﴿35﴾

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٠٥) [2] فتح البیان (٦/ ١٧٢۔ ١٧٣)

رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا تذکرہ:

نوح علیہ السلام کتاب نہیں لائے تھے کہ ان کی قوم یہ بات کہتی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کلام اس قصے کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے آیا ہے۔ اصل موکد اور مقرر مضمونِ قصہ ہے۔ اللہ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ کیا یہ کافر اور منکر آپ سے یہ بات کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن اپنی طرف سے بنا لائے ہو، سو تم اس کے جواب میں ان سے کہہ دو کہ اگر میں بنا لایا ہوں تو یہ کام کرنے کا اور بناوٹی باتیں پیش کرنے کا گناہ مجھ پر ہے اور میں تمھارے جرموں اور گناہوں سے بری ہوں، یعنی اس تہمت سے کہ قرآن میرا ساختہ پرداختہ ہے۔ مجھ کو اس سزا کے متعلق معلوم ہے جو اللہ نے افترا پردازی پر مقرر کی ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ نے قومِ نوح علیہ السلام پر ان کے قول کا انکار کیا، وہ کہتے تھے کہ یہ جو نوح علیہ السلام اپنی طرف وحی کا آنا بیان کرتا ہے یہ بالکل افترا ہے، اللہ پاک نے اس کی طرف کوئی رسالت نہیں بھیجی، اللہ نے اس کا جواب اپنے پیغمبر کو یہ بتلایا کہ اگر میں مفتری ہوں تو یہ گناہ مجھ پر ہے اور اگر میں سچا ہوں اور تم مجھے جھٹلاتے ہو تو اس تکذیب کی سزا تمھیں ملے گی۔ اس تقریر سے یہ نہیں نکلتا کہ نوح علیہ السلام کو شک تھا، بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ جو حق بات کو قبول کرنے سے انکار کی وجہ سے پیدا ہونے والی ناامیدی کے وقت کہی جاتی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ محاورہ نبی اکرم ﷺ اور کفارِ مکہ کے درمیان واقع ہوا تھا،[2] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اس کے پہلے اور بعد میں نوح علیہ السلام کا کلام ہے۔[3]

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۳۷ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۣ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝۳۸ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۳۹

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی ہرگز ایمان نہیں لائے گا، سوائے اس کے جو (پہلے) ایمان لا چکا ہے، چناں چہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں تو اس پر غم نہ کھا (36) اور تو ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۷۹) [2] تفسیر الخازن (۳/ ۲۲۹) [3] فتح البیان (۶/ ۱۷۴)

وحی کے مطابق ایک کشتی بنا، اور مجھ سے ان لوگوں کے متعلق بات مت کرنا جنھوں نے ظلم (کفر) کیا، بے شک وہ غرق کیے جانے والے ہیں (37) اور نوح کشتی بناتا تھا اور جب بھی اس کی قوم کے وڈیرے اس کے پاس سے گزرتے تو وہ اس سے مذاق کرتے، نوح نے کہا: اگر تم (آج) ہم سے مذاق کرتے ہو تو بے شک (ایک روز) ہم بھی تم سے مذاق کریں گے، جیسے تم مذاق کرتے ہو (38) پھر جلد جان لو گے کہ کس شخص پر ایسا عذاب آتا ہے جو اسے (دنیا میں) رسوا کر دے گا اور (آخرت میں) اس پر ہمیشہ کا عذاب نازل ہوگا (39)

قوم کے انجام کی خبر اور کشتی بنانے کا حکم:

وہ کفار ہنستے تھے کہ خشک زمین پر غرق ہونے سے بچاؤ کرتا ہے، نوح ہنستے تھے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جب قومِ نوح علیہ السلام نے عذاب مانگنے میں جلدی کی تو اللہ نے نوح علیہ السلام کو وحی کی کہ تم ان پر بددعا کرو تو انھوں نے یہ دعا کی: ﴿ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] ''(اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔'' اور کہا: ﴿ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴾ [القمر: ١٠] ''بے شک میں بے بس ہوں، اب تو ہی انتقام لے۔'' اس دم اللہ نے پیغام بھیجا کہ یہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، ان کے علاوہ کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔ یعنی اب آیندہ باقی لوگوں میں سے ایمان لانے کی امید نہیں ہے، یہی چند لوگ جو ایمان لائے ہیں، مومن رہیں گے اور بس۔ سو تُو ان پر کچھ غم نہ کر اور فکر میں مت پڑ، بلکہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک کشتی بنا۔ ہم تجھ کو کشتی کا بنانا سکھا دیں گے اور ان ظالموں کے بارے میں پھر مجھ سے کچھ مت کہنا کہ یہ تو ڈوبنے والے ہیں۔

بعض سلف نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ لکڑی کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرو اور اس کو خشک کرو، چنانچہ سو برس میں یہ کام کیا، پھر ایک سو برس یا چالیس برس میں اس کو صاف اور درست کیا۔ واللّٰہ أعلم. امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے تورات سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے نوح علیہ السلام کو یہ حکم دیا تھا کہ کشتی ساج کی لکڑی سے بناؤ، اسّی گز لمبی اور پچاس گز چوڑی اور اس کے باہر اور نیچے قار کا رنگ کرو اور اس کا ایک سینہ (درمیان) اور زور (وسط سینہ) ٹھہراؤ جس سے وہ پانی کو پھاڑے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طول میں تین سو گز تھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بارہ سو گز طول میں اور چھے سو گز عرض میں تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ دو ہزار گز لمبی اور سو گز چوڑی تھی۔[1] واللّٰہ أعلم. لیکن سب کا قول یہ ہے کہ آسمان کی طرف تیس گز بلند تھی۔ تین طبقے تھے، ہر طبقہ دس گز کا تھا۔ نیچے والا طبقہ چوپاؤں اور وحشی جانوروں کے لیے تھا، درمیان والا طبقہ انسانوں کے لیے رکھا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٧٩)

اور اوپر والا طبقہ پرندوں کے لیے تھا۔ کشتی کا دروازہ اس کے عرض میں تھا اور اوپر سے ایک سرپوش تھا، جس نے ساری کشتی کو ڈھانپ لیا تھا۔

ایک اسرائیلی روایت:

امام ابوجعفر بن جریر نے اس جگہ ایک اثر غریب علی بن زید بن جدعان سے، انھوں نے یوسف بن مہران سے، انھوں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حواریوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے کہا کہ کبھی تم ہمارے ایک شخص کو اٹھاؤ جو سفینۂ نوح کا شاہد ہو، وہ ہم سے اس کشتی کا حال بیان کرے۔ عیسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر چلے، مٹی کے ایک ٹیلے پر آئے اور ایک مٹھی بھر خاک اٹھائی اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص ہے؟ کہا: اللہ اور رسول جانیں! کہا: یہ حام بن نوح کا ٹخنا ہے، پھر اس ٹیلے کو لاٹھی سے مارا اور کہا: "قُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ" وہ خاک جھاڑتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا، سر سفید تھا، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا تُو اسی طرح ہلاک ہوا تھا؟ کہا: نہیں، لیکن جب میں مرا تھا تو جوان تھا، مجھے گمان تھا کہ قیامت ہے، اس سے میں بوڑھا ہو گیا، کہا: ہم سے نوح علیہ السلام کی کشتی کا حال کہو۔ کہا: وہ کشتی بارہ سو گز لمبی تھی اور چھ سو گز چوڑی تھی، اس کے تین طبقے تھے: ایک طبقے میں چوپائے اور وحشی جانور اور ایک طبقے میں آدمی اور ایک طبقے میں پرندے۔

جب چوپاؤں کی کثرت سے لید ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ تم ہاتھی کی دم دابو، اس سے ایک جوڑا خنزیر کا نکلا، وہ لید پر جھکا۔ جب کشتی میں چوہے ہو گئے اور انھوں نے لکڑی کو کترنا شروع کیا، اللہ نے وحی کی کہ شیر کی آنکھوں کے درمیان میں مارو، اس سے ایک جوڑا بلی کا برآمد ہوا، وہ چوہے کھانے لگے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ نوح علیہ السلام نے کس طرح جانا کہ سارے شہر ڈوب گئے؟ کہا کہ ایک کوا بھیجا کہ خبر لائے، اس نے ایک مردار پڑا ہوا پایا وہ اس پر جھک پڑا۔ نوح علیہ السلام نے اس کو خوف کی بددعا دی، اسی لیے وہ گھروں سے مالوف (مانوس) نہیں ہوتا، پھر ایک کبوتری بھیجی، چنانچہ وہ اپنی چونچ میں ایک پتا زیتون کا اور اپنے پنجے میں ذرا سی مٹی اٹھا لائی، تب نوح علیہ السلام نے معلوم کیا کہ سارے شہر ڈوب گئے، تب سے کبوتری کے گلے میں سبز رنگ کا طوق ہوتا ہے اور اس کو دعا دی، وہ انسانوں میں امن و امان سے رہتی ہے اور گھروں سے مالوف ہوتی ہے۔ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! تم ان کو ہمارے گھر والوں کے پاس نہیں لے چلتے کہ یہ ہمارے پاس بیٹھ کر یہ حال بیان کریں؟ کہا: بھلا جس کے لیے رزق نہیں ہے وہ کیسے تمھارے ساتھ جا سکتا ہے؟ پھر اس سے کہا: "عُدْ بِإِذْنِ اللّٰهِ" وہ خاک ہو گیا۔[1]

سب سے پہلے جہاز ساز اور جہاز راں:

معلوم ہوا کہ سب سے پہلے جہاز بنانے والے اور جہاز راں نوح علیہ السلام ہیں۔ اللہ نے ان کو یہ صنعت تعلیم فرمائی

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٣١٢) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔

تھی۔ اب تک ہر جہاز میں وہی تین طبقے چلے آتے ہیں، اگرچہ اب مختلف سوچوں کے مل جانے سے کشتیوں اور جہازوں کی شکلیں، لمبائی اور چوڑائی اور رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر صنعت کی اصل اسی فانی دنیا میں کسی نہ کسی نبی اور رسول سے ثابت ہوئی ہے، جس طرح کہ رسالہ "رفو الخرقة بشرف الحرفة" (تالیف نواب صاحب) میں لکھا گیا ہے۔ نوح علیہ السلام جس زمانے میں کشتی بنایا کرتے تھے تو ان کی قوم کے سردار اس کو دیکھ کر دل لگی کرتے اور ہنستے اور غرق ہونے کے وعدہ کو جھٹلاتے۔ یہ کہتے کہ ہم بھی تم پر ہنستے ہیں، یہ وعید شدید اور سخت ڈانٹ تھی کہ رسوا کرنے والا عذاب ضرور آئے گا جو ان کو اسی دنیا میں ذلیل وخوار کرے گا اور مستقل عذاب کا ہونا علاحدہ رہا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے نوح علیہ السلام کو پیغام بھیجا کہ یہ لوگ کفر پر جمے رہیں گے، جن کو ایمان لانا تھا وہ لا چکے، اب کوئی ایمان لانے والا باقی نہیں ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم پر کبھی بددعا نہیں کی، یہاں تک کہ یہ آیت اتری، تب ناامید ہو کر بددعا کی[1] اور اللہ نے کہہ دیا کہ تم ان کے فعل پر کچھ رنج واندوہ نہ کرو اور حکم دیا کہ ایک کشتی بناؤ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم ماننا لازمی تھا، کیونکہ اپنی اور مومنین کی جانوں کو اس طریقے کے بغیر بچانا ممکن نہیں تھا اور ہلاکت سے بچنا اور بچانا واجب ہے اور جس کے بغیر وہ واجب چیز حاصل نہ ہو سکے وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے بنانے سے یہ مراد ہے کہ ہم تیرے اس کام کو دیکھتے ہیں۔ عین ایک صفت ہے جس کی کیفیت معلوم نہیں، اس پر ایمان لانا اور بغیر تمثیل وتقدیر وتشبیہ وتعطیل وتکییف وتاویل کے ظاہر پر جاری کرنا واجب ہے۔ یہ بات کہ عین سے مراد علم ہے، یا فرشتہ محافظ، یا امر یا اسی طرح کی اور چیزیں تاویل میں داخل ہیں جس کی کچھ ضرورت نہیں ہے، آنکھ جانے اور آنکھ والا جانے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کو معلوم نہ تھا کہ کشتی کس طرح بنائیں، اللہ پاک نے ان کو وحی کی کہ پرندے کے سینے کی طرح بناؤ۔[2] اور ظالم لوگوں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا۔ مراد نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا ہیں کہ ان کے لیے مہلت کی اور ہلاکت سے بچنے کی درخواست نہ کرنا، کیونکہ انتقام لینے کا وقت ان کے سر آ گیا ہے اور حکم نافذ ہو چکا ہے کہ یہ غرقاب ہوں گے، اب یہ عذاب اُن سے نہ دور ہو سکتا ہے اور نہ ٹل سکتا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ تو ان کے عذاب اور جلد سزا پانے میں مجھ سے کچھ عرض معروض نہ کرنا، ان کا ایک وقت مقررہ پر ڈوب جانا اس میں کسی قسم کی تاخیر کے بغیر مقرر ہو چکا ہے۔

امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ دوسو سال تک کشتی بناتے رہے اور امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چارسو

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٤١٧) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٠٨) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

سال تک۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دو سال میں بنائی[2] اور کسی نے کہا ہے کہ تیس برس میں تین سو گز لمبی اور تیس گز اونچی اور پچاس گز چوڑی تیار کی اور گز منکب (کندھا) تک کا تھا اور لکڑی ساج کی تھی جس کو اردو میں ساکھو بولتے ہیں۔ تین حصے تھے اور دروازہ چوڑائی میں۔ بعض نے کہا ہے کہ نچلے حصے میں وحشی، درمیان والے حصے میں طعام اور اوپر والے حصے میں مومنین اور نوح علیہ السلام خود تھے۔ خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساج ایک بہت بڑا درخت ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ لکڑی بہت ملتی ہے۔[3]

اور تورات میں آیا ہے کہ صنوبر کی لکڑی سے بنائی تھی۔ جب ان پر ایک جماعت کا گزر ہوتا تو وہ ہنستے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ یہ ہنسنا دو وجہ سے تھا: ایک یوں کہ کشتی کا بننا دیکھ کر کہتے: اے نوح! تم نبوت کے بعد بخار (بھاپ، ہوا) ہو گئے۔ وہ اس کشتی کو جنگل میں پانی سے بہت دور جگہ پر بناتے، جبکہ پانی بہت کم ملتا۔ دوسرے یوں کہ انھوں نے اس سے پہلے کوئی کشتی دیکھی نہ تھی، نہ وہ کشتی کو پہچانتے تھے اور نہ اس کے استعمال کی کیفیت اور اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سے واقف تھے، اس لیے تعجب کرتے اور قہقہے اڑاتے اور کہتے: اے نوح! تم اس کو کیا کرو گے؟ وہ کہتے میں اس کو پانی پر چلاؤں گا اور جس طرح تم مجھ سے ہنستے ہو میں بھی تم سے ہنستا ہوں، یعنی تمھارا ہنسنا میرے کشتی بنانے پر ہے اور میرا ہنسنا تمھارے غرقاب ہونے پر۔

سخریہ سے اس جگہ مراد جہالت ہے، بر سبیل مشاکلت کہ جس طرح تم مجھ کو نادان سمجھتے ہو، اسی طرح میں بھی تم کو نادان خیال کرتا ہوں، کیونکہ سخریہ کرنا انبیا علیہم السلام کے مقام کے لائق نہیں ہے، تو گویا یہ جزا جنسِ صنیع سے ٹھہری۔ پھر کہا کہ اب تم جلد جان لو گے کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور عذابِ مقیم نازل ہوتا ہے۔ مراد اول سے طوفان ہے اور مراد ثانی سے عذابِ نار و خلودِ سقر۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ہزار برس رہے، مگر پچاس سال، یعنی ساڑھے نو سو سال۔ وہ ان کو توحیدِ الوہیت کی طرف بلاتے رہے، یہاں تک کہ ان کے آخر زمانے میں ایک درخت لگا اور بہت بڑا ہو گیا اور ہر طرف اس کی شاخیں پھیل گئیں، نوح علیہ السلام نے اس کو کاٹ کر ایک کشتی بنانا شروع کیا، لوگ اس طرف سے گزرتے اور پوچھتے کہ یہ کیا چیز ہے؟ وہ کہتے کہ ایک کشتی بنا رہا ہوں، وہ ہنستے اور کہتے کہ تم خشک زمین میں کشتی بناتے ہو! یہ ناؤ کیسے چلے گی؟ وہ کہتے: جلد ہی تم جان لو گے۔ جب ناؤ بنا چکے اور تندور نے جوش مارا اور پانی گلی کوچوں میں کثرت سے آ گیا، ایک بچے کی ماں کو اپنے بچے کا ڈر ہوا، وہ اُس کو بے حد چاہتی تھی، وہ پہاڑ کی طرف نکل گئی، یہاں تک کہ ایک تہائی پہاڑ پر چڑھ گئی، جب پانی وہاں پہنچا تو نکل کر پہاڑ کے اوپر جا کھڑی ہوئی،

---

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ٢٠٦) [2] تفسير البغوي (٤/ ١٧٤)

[3] حاشية الشهاب علىٰ تفسير البيضاوي للخفاجي (٥/ ٩٧)

جب پانی اس تک پہنچا تو اپنے دونوں ہاتھوں سے بچے کو اوپر اٹھا لیا، یہاں تک کہ پانی اُس کو لے گیا۔ سو اگر اللہ ان لوگوں میں سے کسی پر رحم کرتا تو اس بچے کی ماں پر کرتا۔[1] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم وأبو الشيخ والحاكم وقد ضعفه الذهبي في مستدركه على مستدرك الحاكم) کشتی کی صفت اور اس کی مقدار کے بیان میں احادیث اور آثار آئے ہیں، اس جگہ ان کے ذکر کرنے میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں۔[2]

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۴۰﴾

حتی کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور نے جوش مارا تو ہم نے (نوح سے) کہا: اس (کشتی) میں ہر قسم (کے جانوروں) کا جوڑا، دو (نر اور مادہ) سوار کر لے اور اپنے گھر والوں کو، سوائے اس شخص کے جس کی بابت پہلے حکم ہو چکا، اور ان کو بھی جو ایمان لا چکے ہیں، اور اس پر تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے تھے (40)

طوفان کا آغاز اور نوح علیہ السلام کا ہر جنس سے جوڑا جوڑا بٹھانا:

موضح قرآن میں ہے کہ ہر جانور جس کی نسل باقی رہنا مقدر تھی، اس کا جوڑا کشتی میں رکھ لیا اور گھر والوں میں سے جس پر بات پڑ چکی تھی، ایک بیٹا کنعان اور اُس کی ماں سو غرق ہوئے اور تین بیٹے بچے جن کی اولاد ساری مخلوق ہے۔ تنور نوح علیہ السلام کے گھر میں تھا۔ طوفان کا نشان بتا رکھا تھا کہ جب اس تنور سے پانی ابلے تب کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ پاک کی طرف سے نوح علیہ السلام کے ساتھ ایک میعاد تھی کہ جب اللہ کا حکم آئے تو ناؤ میں جا بیٹھو۔ امر سے مراد ہے موسلا دھار پانی جو نہ تھمے اور لگا تار برسے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَی الْمَآءُ عَلٰۤی اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴾ [القمر: ١١۔ ١٤] ''چناں چہ ہم نے زور سے برسنے والے پانی کے ساتھ آسمان کے دروازے کھول دیے۔ اور ہم نے زمین سے چشمے جاری کر دیے، تو (آسمان اور زمین کا) پانی ایک امر پر مل گیا، جو بلاشبہ مقدر ہو چکا تھا۔ اور ہم نے اس (نوح) کو تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کیا۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی، (ہم نے یہ کیا) اس شخص کا انتقام لینے کی خاطر جس کا انکار کیا گیا تھا۔''

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣١٠۔ ٣١١) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٢٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٧٢) اس کی سند میں ''موسیٰ بن یعقوب'' متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٩٨٥)

[2] فتح البيان (٦/ ١٧٥۔ ١٧٨)

تنور سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تنور سے مراد روئے زمین ہے،[1] یعنی ساری زمین چشمۂ آب ہو گئی اور پانی ابلنے لگا، یہاں تک کہ تنور جو آگ کی جگہ ہوتے ہیں وہ بھی پانی کے فوارے بن گئے۔ یہی جمہور سلف اور علمائے خلف کا قول ہے۔ غرضیکہ ادھر آسمان سے پانی گرا، ادھر زمین سے ابلا، دونوں طبقے مل گئے، ساری زمین غرقاب ہو گئی۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تنور فلق صبح ہے، یعنی فجر کا چمکنا اور صبح کی روشنی۔[2] لیکن پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ امام مجاہد اور شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تنور کوفے میں تھا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہند میں تھا۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک چشمہ ہے جزیرے میں اس کو عین الوردہ کہتے ہیں،[5] یہ سب اقوالِ غریبہ ہیں۔

پرندوں اور جانوروں کے جوڑے:

بہرحال اللہ نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے ساتھ مخلوقات کی ہر قسم کا ایک جوڑا کشتی میں لاد لو، کیا جانور اور کیا نباتات، نر اور مادہ۔ کہتے ہیں سب سے پہلے پرندوں میں درہ (چھوٹا طوطا) کو داخل کیا اور سب سے آخر میں جانوروں میں سے گدھے کو۔ شیطان اس کی دم سے لٹک گیا۔ گدھا اپنے ہاتھوں سے داخل ہوا اور چاہا کہ اٹھ کھڑا ہو، ابلیس کے بوجھ سے کھڑا نہ ہو سکا، کیونکہ وہ اس کی دم کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ نوح علیہ السلام نے کہا کہ تجھ کو کیا ہوا ہے، تُو ناؤ کے اندر کیوں داخل نہیں ہوتا؟ وہ اٹھنا چاہتا تھا، لیکن کھڑا نہ ہو سکتا، تب فرمایا کہ اندر آ! اگرچہ تیرے ساتھ ابلیس ہو، پھر وہ دونوں داخل ہوئے۔ بعض سلف نے ذکر کیا ہے کہ اہلِ سفینہ شیر کو اپنے ہمراہ نہ اٹھا سکے، یہاں تک کہ اس کو تپ آئی۔

زید بن اسلم عن ابیہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے ہر چیز کا ایک جوڑا کشتی میں لادا تو ان کے اصحاب نے کہا کہ جانوروں کو کیسے اطمینان ہو گا، ان کے ساتھ شیر ہے؟ اللہ نے اس پر بخار مسلط کر دیا، سو پہلا بخار جو زمین میں نازل ہوا وہ یہی شیر کا تھا۔ پھر شکایت موش کی کی اور کہا کہ چوہا ہمارے کھانے کو خراب کرتا ہے، اللہ نے شیر کو وحی کی، اس کو چھینک آئی، ایک بلی نکلی، چوہے اس کے ڈر سے چھپ گئے۔[6]

اہل سے مراد اور اہلِ ایمان کی تعداد:

اہل سے مراد نوح علیہ السلام کے اہلِ بیت اور قریبی رشتے دار ہیں، ان میں بعض ایمان نہ لائے تھے، ان کا ایک بیٹا یام نام کا تھا، وہ تنہا کنارہ کش ہو گیا تھا یا نوح علیہ السلام کی بیوی، وہ کافرہ تھی اور جوان پر ایمان لائے تھے وہ بہت تھوڑے

---

[1] تفسیر الطبري (۱۵/ ۳۱۸) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۱۵/ ۳۱۹) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن اسحاق'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۱۵/ ۳۲۰۔ ۳۲۱)

[4] تفسیر الطبري (۱۵/ ۳۲۱) اس کی سند میں ''نضر بن عبدالرحمٰن خزاز'' ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۶/ ۲۰۲۹)

[6] تفسیر ابن أبي حاتم (۶/ ۲۰۳۱) یہ روایت مرسل ہے۔

تھے، باوجود نوح علیہ السلام کے ان کے درمیان ایک طویل مدت تک رہنے کے، کیونکہ نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس ان میں رہے اور اللہ کی طرف دعوت دیتے رہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایمان لانے والے اسّی لوگ تھے، عورتوں کے ساتھ۔[1] امام کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہتر لوگ تھے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ دس لوگ تھے، بعض نے کہا ہے تین نوح علیہ السلام کے بیٹے تھے: سام، حام و یافث اور چار عورتیں ان میں سے ایک یام کی بیوی، بلکہ نوح علیہ السلام کی بیوی تھی، مگر اس میں نظر ہے، کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ وہ ہلاک ہوگئی، اس لیے کہ وہ اپنی قوم کے دین پر تھی، اس کو عذاب پہنچا، جس طرح کہ لوط علیہ السلام کی بیوی کو عذاب پہنچا۔ والله أعلم وعلمه أحكم.[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امر سے مراد عذاب ہے یا عذاب کا وقت یا کشتی میں سوار ہونے کا حکم۔ تنور کی تفسیر میں اختلاف ہے، مراد زمین کی سطح ہے یا زمین کا بہترین مقام ہے۔ امام عکرمہ، زہری اور ابن عیینہ رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد تنور ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ ابتداءً پانی کا خلافِ عادت ابلنا اسی میں سے ہوا۔ امام عطیہ اور حسن رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ یہی اکثر مفسرین کا قول بھی ہے۔ کہا ہے کہ یہی زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ جب لفظ استعمال حقیقت و مجاز کے درمیان ہو تو اس کو حقیقت پر محمول کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور لفظ تنور حقیقت میں نان پوری پکانے کی جگہ ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ سفینہ میں پانی جمع ہونے کی جگہ ہے، یہ امام حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ مراد طلوعِ فجر ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ مسجد کوفہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ناحیہ تنور (تنور کا کنارہ) کوفہ میں ہے، داہنی طرف داخل ہونے والے دروازے کے ساتھ۔ امام شعبی رحمہ اللہ حلف کرتے تھے کہ پانی ناحیہ کوفہ ہی سے ابلا تھا۔ چھٹا قول یہ ہے کہ تنور سے مراد زمین میں بلند مقام ہے، امام قتادہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

ساتواں قول یہ ہے کہ شام میں ایک چشمہ ہے جس کا نام عین الوردہ ہے۔ امام عکرمہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ آٹھواں قول یہ ہے کہ یہ ہند میں ایک جگہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کا تنور ہند میں تھا، حضرت حوا علیہا السلام اسی میں روٹی پکاتیں، وہ نوح علیہ السلام کو مل گیا تھا۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان اقوال میں کچھ تضاد نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ پانی آسمان اور زمین دونوں سے نکلا، اس سے یہ اقوال مجتمع ہو جاتے ہیں۔

لفظ تنور اسم عجمی ہے، عرب نے اس کو معرب کر لیا ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ فارسی ہے، اس کے سوا اور کچھ نام

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٢٦)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٣٢)
[3] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٨٠-٥٨١)
[4] تفسير القرطبي (٩/ ٣٣-٣٤) تفسير البغوي (٤/ ١٧٦)

نہیں ہے، اسی لیے قرآن میں یہ لفظ آیا ہے، تا کہ خطاب ایسا ہو جس کو مخاطب پہچانتے ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ اسی طرح ہر قسم کے لفظ عربی و عجمی قرآن میں آئے ہیں۔ یہ تنور ایسا لفظ ہے کہ عرب اور عجم اس پر متفق ہیں، جیسے صابون۔ امام ثعلب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تنور بروزن تفعول ہے۔ ابو علی فارسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بروزن فعول ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ فورانِ تنور مثال ہے عذاب کے آجانے کی، جیسے حمی الوطیس کو جنگ کے ہنگامے کے خوب گرم ہو جانے کے وقت بولتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کنایہ ہوا امر کی شدت سے، لیکن مثال سے حقیقت کا ہونا زیادہ بہتر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حوا علیہا السلام کا ایک پتھر تھا، وہ نوح علیہ السلام کے لیے طوفان آنے کی ایک علامت تھی، تا کہ وہ کشتی پر سوار ہو جائیں۔

اللہ نے نوح علیہ السلام سے کہا کہ تُو زمین کے تمام حیوانات میں سے دو دو زوج یعنی ایک ایک جوڑا نر اور مادہ کا اپنی کشتی میں رکھ لے، مراد حیوانات سے وہ جانور ہیں جن سے نفع حاصل ہوتا ہے اور بچہ دیتے ہیں یا انڈا اور جو کیڑے مکوڑے عفونت سے پیدا ہوتے ہیں، جیسے: دود، قمل، بق اور بعض ان میں سے کسی شے کو کشتی میں نہیں لیا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جو روایت ہے کہ ابلیس بھی کشتی میں داخل ہوا، سو یہ بعید ہے، اس لیے کہ وہ جن ہے، ان کا جسم ناری ہوتا ہے، یا ہوائی وہ غرق سے کیوں بھاگنے لگا، اس کے علاوہ اللہ کی کتاب میں بھی اس پر کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی اس بارے میں کوئی صحیح حدیث آئی ہے، اس لیے اس بارے میں غور و خوض نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔[2] گھر والوں کو سوار کرنے سے مراد نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹے ہیں، سوائے ان کے کہ جن کے بارے میں بات طے ہو چکی ہے کہ وہ ڈوب جائیں گے، ان سے مراد یا تو سارے کفار ہیں یا بیوی اور کنعان اور کنعان کی بیوی واعلہ ہے۔

پھر فرمایا کہ نوح علیہ السلام پر تھوڑے لوگ ایمان لائے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ آٹھ آدمی تھے، نوح علیہ السلام اور ان کی بیوی اور تین بیٹے اور ان کی بیویاں، یہ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام ابن جریج اور قرظی رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اسّی مرد تھے، ان میں ایک جرہم بھی تھا، یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[3] امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی روایت صحیح ہے،[4] یہ لوگ جب کشتی سے باہر آئے تو انھوں نے ایک گاؤں بسایا، اس کو قریۃ الثمانین (اسّی آدمیوں کی بستی) کہتے ہیں، یہ گاؤں اب موصل کے کنارے میں موجود ہے۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سات لوگ تھے، نوح علیہ السلام اور ان کے تین بیٹے اور ان کی تین بہوئیں۔[5]

امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے،[6] بعض نے کہا ہے کہ اُناسی تھے۔ ایک مسلمان بیوی نوح علیہ السلام کی اور تین فرزند حام، سام، یافث اور ان کی بیویاں اور ان کے علاوہ بہتر مرد اور عورتیں۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ

---

[1] روح المعاني (١٢/ ٥٢)
[2] تفسير الرازي (١٧/ ١٨٢)
[3] تفسير الطبري (١٥/ ٣٢٥۔ ٣٢٧) تفسير الرازي (٤/ ١٧٧)
[4] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي للخفاجي (٥/ ٩٦)
[5] تفسير الطبري (١٥/ ٣٢٦)
[6] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي للخفاجي (٥/ ٩٧)

نے کہا ہے کہ سب دس لوگ تھے، پانچ مرد اور پانچ عورتیں اور اس کے علاوہ بھی کہا گیا۔ امام طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ (آیتِ باب) اور کسی عدد کو بیان نہیں کیا۔ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم اللہ کے بیان سے تجاوز کریں، کیونکہ اس بارے میں نہ کوئی آیت آئی ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے کوئی خبر صحیح طرح پہنچی ہے۔ (1)

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نوح نے کہا: اس (کشتی) میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے۔ بے شک میرا رب البتہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (41) اور وہ (کشتی) انھیں لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلتی جاتی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا، اور وہ (سب سے) الگ تھلگ تھا: پیارے بیٹے! تو (بھی) ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں میں شامل نہ ہو (42) وہ بولا میں ابھی کسی پہاڑ کی طرف پناہ لے لیتا ہوں، وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔ نوح نے کہا: آج اللہ کے حکم (عذاب) سے کوئی بچانے والا نہیں، مگر جس پر اللہ رحم فرمائے، اور ان دونوں کے درمیان لہر حائل ہوگئی، تو وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا (43)

کشتی پر سوار ہونا اور لہروں پر چلنا:

اس دن بلند پہاڑ کے بلند درخت بھی ڈوب گئے کہ پرندہ کا بچاؤ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے خبر دی کہ انھوں نے ان لوگوں سے جن کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم تھا، یہ بات کہی کہ بسم اللہ تم کشتی میں سوار ہو، یہ کشتی اللہ کے نام سے پانی کے اوپر چلے گی اور اسی کے نام پاک پر ٹھہرے گی، اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۸﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴾ [المؤمنون: ٢٨۔ ٢٩] ”پھر جب تو اور تیرے ساتھی اطمینان سے کشتی پر سوار ہو چکیں تو کہہ: تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔ اور کہہ: اے میرے رب! تو مجھے بابرکت اتارنا اور تو

(1) تفسير الطبري (١٥/ ٣٢٦۔ ٣٢٧) فتح البيان (٦/ ١٧٩۔ ١٨٢)

سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔'' اسی لیے تمام امور کے شروع میں، کشتی پر یا کسی سواری پر سوار ہوتے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ⑫ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ﴾ [الزخرف: ١٢۔ ١٣] ''اور وہ جس نے سب جوڑے پیدا کیے اور تمھارے لیے کشتیاں اور چوپایے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔ تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر بیٹھو۔''

سواری پر سوار ہوتے وقت اللہ کا نام لینے کا حکم:

اور سنتِ مطہرہ میں بسم اللہ کہنے پر رغبت دلائی ہے اور تاکید کی ہے، چنانچہ سورت زخرف میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا بیان ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «أَمَانُ أُمَّتِي مِنَ الْغَرَقِ إِذَا رَكِبُوا فِي السُّفُنِ أَنْ يَقُولُوا بِسْمِ اللّٰهِ الْمَلِكِ ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ ﴾ [الأنعام: ٩١] الآية ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾» [1] (رواه الطبراني بسنده)

انتقام اور رحمت:

یہ کہنا کہ میرا رب بخشندہ اور مہربان ہے کفار سے انتقام کا ذکر کرتے وقت بہت مناسب ہے کہ وہ تو سب کے سب غرق ہو گئے اور یہ بچا دیے گئے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الأعراف: ١٦٧] ''بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [الرعد: ٦] ''اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے ظلم کے باوجود البتہ انھیں بخشنے والا ہے، اور یقیناً آپ کا رب البتہ سخت سزا دینے والا ہے۔'' اس طرح کی اور بہت آیات ہیں جن میں رحمت اور انتقام کو ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

کشتی کو پہاڑ سے تشبیہ:

وہ کشتی موجوں میں ایسے بہتی پھرتی تھی جیسے پہاڑ، بلکہ پہاڑوں کے بھی اوپر چکر مارتی تھی، پندرہ گز اونچی تھی پہاڑوں سے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اسّی گز۔ معہذا یہ کشتی اللہ کے اذن سے پانی میں سیر کرتی اور اللہ کی عنایت و کنف اور نگرانی اور احسان کے تحت تھی اور پانی سے ساری زمین ایک طبق ہو گئی تھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاۗءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ⑪ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ١١۔ ١٢] ''بے شک جب پانی میں طغیانی آئی تو ہم نے تمھیں بہتی ناؤ میں سوار کیا۔ تاکہ ہم تمھارے لیے اس (فعل) کو نصیحت بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰي ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ⑬ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَاۗءً

---

[1] المعجم الکبیر (١٢/ ١٢٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فیه نهشل بن سعید وهو متروك'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ١٨٧)

﴿لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَاۤ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ [القمر: ۱۳۔ ۱۵] ''اور ہم نے اس (نوح) کو تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کیا۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی، (ہم نے یہ کیا) اس شخص کا انتقام لینے کی خاطر جس کا انکار کیا گیا تھا۔ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس (کشتی) کو ایک نشانی (بنا) چھوڑا، پھر کیا کوئی نصیحت پکڑنے والا ہے؟''

بیٹے کا انکار اور غرق ہونا:

وہ بیٹا جس کو نوح علیہ السلام نے پکارا تھا، اس کا نام یام تھا، وہ کافر تھا۔ باپ نے کشتی میں سوار ہوتے وقت اس کو بلایا کہ تُو ایمان لا کر ہمارے ساتھ کشتی میں بیٹھ جا اور کافروں کی طرح پانی میں مت ڈوب۔ اس بدبخت نے ایک نہ مانی اور جواب دیا کہ میں ایک ایسے پہاڑ پر جا کھڑا ہوں گا کہ وہ مجھ کو پانی سے بچا لے گا۔ وہ احمق اتنا نہ سمجھا کہ پانی اور پہاڑ کس کے حکم میں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک کشتی کانچ کی بنائی تھی، لیکن یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے۔ اللہ ہی جانے کہ صحیح ہے یا نہیں۔ قرآن پاک میں تو اسی قدر بیان ہے کہ اس نے پہاڑ کا آسرا پکڑا اور اپنی جہالت سے یہ اعتقاد کیا کہ طوفان پہاڑ کی چوٹیوں تک نہ پہنچے گا، اور وہ اگر کسی پہاڑ کی چوٹی پر جا لٹکے گا تو غرق ہونے سے بچ جائے گا، اُس پر نوح علیہ السلام نے کہہ دیا کہ آج کے دن اللہ کے سوا کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔ پہاڑ کی کیا ہستی ہے کہ وہ تجھ کو یا کسی کو بچا لے، ہاں جس پر اللہ رحم کرے وہ بچ جائے، جس طرح کشتی والے بچ گئے۔ اللہ نے ان پر رحم و کرم فرمایا، غرض کہ وہ بیٹا ناؤ میں نہ آیا اور طوفان میں ڈوب گیا۔

مقام عبرت:

یہ بڑی عبرت کا مقام ہے کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا اور اس کی بیوی غرق ہونے سے نہ بچے اور ابراہیم علیہ السلام کے باپ ایمان نہ لائے اور لوط علیہ السلام کی بیوی ہلاک ہوگئی اور فرعون کی بیوی نجات پانے والی ٹھہری اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کفر پر مرے اور ابو طالب کو ایمان نصیب نہ ہوا، اس کے باوجود کہ یہ لوگ انبیا علیہم السلام کے قریب تھے، بلکہ ان کے قرابت دار تھے۔ اب اگر کوئی شخص کسی پیر، فقیر، مشائخ و ملا کے حق میں یہ اعتقاد کرے کہ اس کا مرید مجرم بھی نجات حاصل کرے گا اور جو کوئی اس کی مسجد میں قدم رکھے گا اس کی عاقبت بخیر ہو گی یا اس کی قبر کے اردگرد چالیس گز یا زیادہ فاصلہ پر دفن ہوگا وہ بخشا جائے گا تو سمجھو کہ وہ محض مشرک ہے، اور بالکل جاہل ہے، اس کو توحید اور اخلاص کی بُو تک نہیں پہنچی، جہاں پیغمبروں کی اللہ کے سامنے نہ چلے اور وہ اپنے اعزہ و اقارب کو اللہ کے غصہ اور عذاب و سزا اور قہر و غضب سے نہ بچا سکیں اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دختر محترمہ رضی اللہ عنہا سے یوں فرمائیں کہ «لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا»[1] وہاں بے چارے پیر، فقیر، شہید، مشائخ بھلا کس قطار و شمار میں ہیں:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲٦٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٠٦)

بجائیکہ دہشت خورند انبیا — تو عذر گناہاں چہ داری بیا

''جس جگہ نبی بھی خوف زدہ ہوں تو گناہوں کے لیے کیا بہانہ پیش کرے گا، لا پیش کر۔''

ایسے ہی پیروں فقیروں نے ایک جہان کو گمراہ کر دیا ہے اور اسلام ساذج اور ایمانِ خالص سے پھیر دیا ہے:

وَمَا أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ — وَأَحْبَارُ سَوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

اللہ تعالیٰ ان درویشوں اور مولویوں کو جو اتباعِ کتاب وسنت کے تارک اور فقرا و مشائخ کی حکایاتِ شطحیات کے دلدادہ اور کرامات اور خارقِ عادات کے مدعی ہیں، راہِ راست پر لائے یا طبقۂ اسلام کو ان کے ادناس و ارجاس سے پاک وصاف کر دے، معاذ اللہ انھوں نے قرآن و حدیث پر کیا کیا طوفان باندھے ہیں اور کس کس طرح کتاب وسنت کے معانی کی تحریف کی ہے۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں اس آیت کا بیان یوں ہے کہ اس کلام کا قائل کہ کشتی میں اللہ کا نام لے کر سوار ہوں یا تو خود اللہ پاک ہے یا نوح علیہ السلام ہیں۔ دوسرا قول زیادہ صحیح ہے۔ آیتِ باب کے ان الفاظ کی رو سے: ﴿ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾۔ رکوب کہتے ہیں کسی شے کی پشت پر چڑھنا جو حقیقتاً متحرک ہو، جیسے دابہ (جانور) یا مجازاً جیسے کہ کہتے ہیں کہ فلاں پر قرض سوار ہے۔ معنی یہ ہیں کہ پانی پر کشتی کے اندر سوار ہو جاؤ اور شعور نہ رکھنے والوں کا اس خطاب کو سمجھنا کچھ ممتنع نہیں ہے، یا بطریق تغلیب ہے یا سب کو سوار کرنے کے بعد مومنین کو خطاب کیا ہو۔

اس پورے قصے میں اور سفینہ میں کس کس کو سوار کیا گیا اور باہر رہنے والے لوگ کس طرح غرق ہوئے اور کشتی کتنے دن پانی پر رہی، ان سب کے بارے میں بہت سی روایات آئی ہیں، ان کو اللہ کے کلام کی تفسیر میں کچھ دخل نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بسم اللہ کہنا ہے، سواری پر سوار ہوتے وقت اور سواری چلنے اور لنگر انداز ہونے کے جری اور رسو کے وقت۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام جب چاہتے کہ ناؤ بہنے سے تھم جائے تو بسم اللہ کہتے[1] اور جب چاہتے کہ اب چلے تب بھی بسم اللہ کہتے، غرض کہ اس کا تھمنا اور چلنا سب اللہ کے نام کی برکت سے تھا۔ ؎

خدا کا نام بھی نامِ خدا کیا راحتِ جان ہے
عصائے پیر ہے، تیغِ جواں ہے، حرزِ طفلاں ہے

اللہ پاک کو نوح علیہ السلام نے غفورِ ذنوب اور رحیمِ عباد کہا۔ ایک رحمت و مغفرت اس کی یہی تھی کہ اس طائفہ مومنہ کو نجات بخشی، تاکہ انسان کی جنس باقی رہے اور اسی طرح دوسرے جان داروں کی نسل بھی چلے اور سب کو غرق کر کے ان کا بالکل خاتمہ نہیں کر دیا۔

غرض کہ وہ کشتی موجوں میں چلتی تھی، موج وہ پانی ہے کہ جب ہوا تیز ہوتی ہے اور دریا میں اضطراب پیدا ہوتا

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٣٠)

ہے تو پانی اوپر کو اونچا اٹھتا ہے پہاڑ کی طرح۔ موج کو پہاڑ سے تشبیہ دی اس کے بہت بڑے حجم میں اور بلند ہونے میں اور بڑا ہونے میں۔ اب بھی دریائے شور میں سمندر کے تلاطم کے وقت موج کی شکل پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہے، خاص طور پر جب شدید ہوا چلتی ہے اور طوفان ہوتا ہے۔ اس وقت بچانے والا اور رحم کرنے والا اللہ ہی ہوتا ہے، ورنہ جہاز کی حیثیت لق و دق صحرا میں ایک تنکے کے برابر ہوتی ہے، اس کا مشاہدہ سمندر میں سفر کرنے والے ہر شخص اور جہازوں کو ہوا ہے اور جہاز پر حج اور عمرہ کے لیے جانے والے بھی اس کیفیت سے واقف ہیں۔

سیرت دانوں نے کہا ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام میں پانی سب سے بلند پہاڑ اور سب سے لمبے کوہستانی سلسلے سے بھی چالیس گز اونچا ہو گیا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ پندرہ گز، یہاں تک کہ ہر شے ڈوب گئی اور سارے شہر غرقاب ہو گئے اور یہ طوفان تمام بندوں کو شامل ہو گیا اور یہ بات کہ زمین اور آسمان کے درمیان ایک طبقہ ہو گیا تھا اور کشتی اس کے جوف (پیٹ) میں مچھلی کی طرح تیرتی پھرتی تھی، ثابت نہیں۔

ایک اعتراض اور جواب:

نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کنعان یا یام نام کو پکارا اور وہ کافر تھا، اس طرح یہ استبعاد (ناممکن خیال) کیا ہے کہ نوح علیہ السلام نے کافر کو اپنی اس دعا کے باوجود کیوں پکارا: ﴿ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا ﴾ [نوح: ٢٦] ''(اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ وہ منافق تھا، نوح علیہ السلام نے گمان کیا کہ وہ مومن ہے اور بعض نے کہا کہ اس پکار پر شفقت پدری داعی ہوئی اور وہ ان کا صلبی فرزند تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کا فرزند تھا، مگر نیت و عمل میں ان کا مخالف تھا[1] اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی بیوی کا بیٹا تھا، نہ خود اُن کا۔ اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابنها پڑھا ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ وہ حرامی بچہ تھا، نوح علیہ السلام کے فراش پر پیدا ہوا، لیکن یہ مردود ہے اس آیت کی رو سے: ﴿ اِنَّ ابۡنِىۡ مِنۡ اَهۡلِىۡ ﴾ [هود: ٤٥] ''بے شک میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔'' حالاں کہ اس میں منصبِ نبوت کی صیانت (بچاؤ) بھی باقی نہیں رہتی۔ انبیا علیہم السلام کی ذات اس سے بہت بلند ہے کہ ان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا جائے۔

سب سے ظاہر تر یہ تاویل ہے کہ نوح علیہ السلام نے اس کو یوں پکارا کہ تو بھی ایمان لا کر کشتی میں آ جا، وہ اپنی قوم اور قرابت سے کنارہ کش تھا اور علاحدہ تھا، یہاں تک کہ اس کو نوح علیہ السلام کا یہ قول: ﴿ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا ﴾ (آیتِ باب) نہ پہنچا، یا اللہ کے دین سے الگ تھا یا سفینہ سے۔ اور یہ پکار لوگوں کے غرق ہونے کا یقین ہونے سے پہلے تھی یا تنور کے ابلنے اور کشتی کے چلنے سے پہلے کی تھی، اس پکار کا مضمون یہ تھا کہ اے میرے چھوٹے بیٹے! تو ہمارے ساتھ سوار ہو جا، یعنی مسلمان ہو کر آ جا۔ ملا علی جیلانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں: ''أَسْلِمْ لِتَسْتَحِقَّ

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٤٣) [2] الدر المنثور (٤/ ٤٣٣)

الرُّكُوْبَ مَعَنَا" اور مت ہو تو ہمراہ کافروں کے دور تر ہم سے کہ تُو بھی انہی کی طرح ڈوب کر مر جائے یا ان کے دین کفر پر مت ہو، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ نوح علیہ السلام تو خود ہلاک ہونے کی سزا کے درپے تھے تو کفر سے نہی اس جگہ موافق نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں کسی پہاڑ کی پناہ پکڑوں گا جو اپنی بلندی کی وجہ سے مجھ کو پانی سے بچا لے گا، اس نے یہ گمان کیا کہ یہ پانی ویسا ہی ہے جیسے کہ سارے ندی نالوں میں پانی ہوتا ہے اور اپنی عادت کے مطابق بہتا ہے۔ اور آدمی کسی ٹیلے پر یا اونچی جگہ پر چڑھ کر اس سیلاب وغیرہ سے بچ جاتا ہے۔

"وَأَنَّى لَهُ ذَلِكَ وَقَدْ بَلَغَ السَّيْلُ الزُّبَى" اور جہالت کی وجہ سے اس نے یہ نہ جانا کہ یہ پانی تو کافروں اور فاجروں کو ہلاک کرنے کے لیے ہے، اس سے بچنا صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ مومنین کے ملجا کی طرف التجا کی جائے، اسی لیے نوح علیہ السلام نے حقیقتِ حال کو اس پر واضح کر دیا اور اُس کو اس کی اس غلط سوچ سے پھیرنا چاہا، کہا: آج کے دن کوئی پہاڑ اور شے اللہ پاک کے حکم سے بچا نہیں سکتی، اُس دن میں اللہ پاک کا عذاب ثابت ہو چکا ہے: "وَجَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ" اس میں نفی ہے جنس عاصم کی تو اس دن غرق ہونے سے بچانے والا بدرجہ اولیٰ داخل ہے اور پانی یا غرق کو امر اللہ کہا، اس کی عظمت اور ہولنا کی کو ظاہر کرنے کے لیے۔

استثنا سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پر اللہ کی رحمت ہے، یعنی سفینہ۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی کوئی نجات پانے والا نہیں ہے، بلکہ وہی لوگ جو کشتی میں سوار ہیں۔[1] پھر نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ غرق ہونے سے نہ بچ سکا یا نوح علیہ السلام کے بیٹے اور پہاڑ کے درمیان موج آ گئی، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ کہا: ﴿ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴾ یعنی وہ اللہ کے علم میں پانی سے غرق یا ہلاک ہونے والا تھا۔[2]

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿44﴾

اور کہا گیا: اے زمین! تو اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تو (برسنے سے) تھم جا اور پانی اتار (کر غائب کر) دیا گیا، اور (کافروں کا) کام تمام کر دیا گیا، اور (کشتی) جودی (پہاڑ) پر جا ٹھہری، اور کہا گیا: ظالم قوم کے لیے دوری (لعنت) ہے ﴿44﴾

طوفان کا اختتام:

چالیس دن آسمان سے پانی برسا اور زمین سے اُبلا، پھر چھ مہینے بعد پہاڑوں کے سر کھلے کہ کشتی جودی پہاڑ سے جا لگی، یہ پہاڑ ملکِ شام میں ہے۔ اللہ پاک نے خبر دی کہ جب سارے زمین والے سوائے کشتی والوں کے غرق

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٣٥) [2] فتح البیان (٦/ ١٨٢ ـ ١٨٦)

ہو چکے تو اللہ نے زمین کو یہ حکم دیا کہ جو پانی تُو نے اُگلا تھا، وہ تُو نگل جا اور آسمان کو حکم دیا کہ بس اب اور پانی مت برسا، تب پانی گھٹنے لگا اور سوکھ چلا اور اہلِ زمین کا قصہ تمام ہوا اور زمین والے سب کے سب جو اللہ کے کافر و منکر تھے ان میں سے کوئی ایک بھی گھر باقی نہ رہا۔

جودی کا محل وقوع:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ پہاڑ جزیرہ میں ہے۔ سب پہاڑوں نے اس دن غرق ہونے سے تکبر کیا، لیکن اس پہاڑ نے کہ یہ خاکسار اور متواضع ہوا۔ اللہ نے اس کو غرق نہیں کیا، نوح علیہ السلام کی ناؤ اس پر آ کر ٹھہر گئی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک ماہ تک اس پر رہی، یہاں تک کہ پھر اس میں سے نیچے اترے۔ اللہ نے اس ناؤ کو جزیرہ کی زمین میں جودی پر عبرت اور نشانی کے طور پر باقی رکھا، یہاں تک کہ اس امت کے شروع کے لوگوں نے اس کو دیکھا، حالانکہ اس کے بعد بہت سی کشتیاں ہلاک ہو کر خاک ہوگئیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جودی موصل میں ایک پہاڑ ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ یہی طُور ہے۔ توبہ بن سالم کہتے ہیں کہ میں نے زر بن حبیش رحمہ اللہ کو زاویہ میں نماز پڑھتے دیکھا، جبکہ وہ ابوابِ کِندہ سے کوفہ میں داخل ہوئے، تیری دائیں طرف سے۔ میں نے کہا: تم اس جگہ بہت نماز پڑھتے ہو، جمعہ کے دن؟ کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ نوح علیہ السلام کا سفینہ اسی جگہ ٹھہرا تھا۔[2]

کشتی کے سوار، مدتِ سفر اور ٹھہراؤ کا دن:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ سفینہ میں اسّی شخص تھے مع اہل کے، وہ کشتی میں ڈیڑھ سو دن رہے اور اللہ پاک نے سفینہ کا رخ مکے کی طرف کر دیا، وہ چالیس دن تک مکے کے گرد پھرا، پھر اس کا منہ جودی کی طرف پھیر دیا، وہاں آ کر جودی پر ٹھہر گیا۔ نوح علیہ السلام نے ایک کوے کو بھیجا کہ زمین والوں کی خبر لا، وہ گیا اور ایک مردار پر گرا، اس کے آنے میں دیر ہوئی، تب ایک کبوتری روانہ کی، وہ زیتون کا پتا لے کر آئی، اس کے پنجے کیچڑ سے بھرے تھے، نوح علیہ السلام نے جانا کہ اب پانی خشک ہو گیا ہے، تب جودی کے نچلے حصے میں اترے اور ایک گاؤں بسایا، اس کا نام ثمانین رکھا، ایک دن صبح کو ان کی زبانیں بدل گئیں، اسّی (۸۰) لغت میں بات کرنے لگے۔ سب میں لائق تر زبان عربی تھی، بعض لوگ بعض کا کلام نہ سمجھتے، نوح علیہ السلام ان کی زبان کا ترجمہ کرتے۔[3]

امام کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کشتی نے مشرق و مغرب کے درمیان کا طواف کیا جودی پر ٹھہرنے سے قبل۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ دسویں رجب کو کشتی پر سوار ہوئے، ڈیڑھ سو دن تک چلتی رہی اور ایک ماہ تک کشتی جودی پر کھڑی رہی۔ دسویں محرم عاشورا کے دن ناؤ سے اترے۔[4] ایک مرفوع حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے کہ اس

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٣٦_ ٣٣٨) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٣٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٣٣)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٣٧_ ٢٠٣٨) [4] تفسير الطبري (١٥/ ٣٣٦) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٨٢)

دن انھوں نے روزہ رکھا۔[1] (رواہ ابن جریر)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ یہودی لوگوں پر سے گزرے، وہ عاشورا کے دن روزہ رکھے ہوئے تھے، کہا: یہ کیسا روزہ ہے؟ کہا: اس دن اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور بنی اسرائیل کو بچایا اور اس دن فرعون غرق ہوا اور اسی دن نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پر ٹھہری۔ نوح اور موسیٰ علیہما السلام نے روزہ رکھا، اللہ کے شکر کے لیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ہم زیادہ حق دار ہیں موسیٰ علیہ السلام اور اس دن کے روزے کے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزہ رکھا اور اپنے اصحاب سے کہا کہ تم میں سے جس کسی کا روزہ ہو وہ اپنا روزہ پورا کرے اور جس نے کچھ کھا لیا ہو تو دن کے باقی حصے کو پورا کرے، یعنی شام تک کچھ نہ کھائے۔[2] (رواه أحمد وهذا حديث غريب من هذا الوجه ولبعضه شاهد في الصحيح)

ظالموں کے لیے ہلاکت:

﴿ بُعۡدًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قوم ظالمین کو ہلاکت اور خسارہ ہے اور وہ اللہ کی رحمت سے دور رہیں، چنانچہ وہ سب کے سب اول سے لے کر آخر تک ہلاک ہو گئے۔ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ «لَوْ رَحِمَ اللّٰهُ مِنْ قَوْمِ نُوحٍ أَحَداً لَرَحِمَ أُمَّ الصَّبِيِّ» (رواه ابن جرير) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں پچاس برس کم ایک ہزار برس رہے۔ سو برس تک اک درخت لگایا، جب وہ درخت بڑا ہو گیا اور ہر طرف پھیل گیا تو اس کو کاٹ کر کشتی بنائی، لوگ اس کشتی پر گزرتے اور ہنستے اور کہتے: تم خشکی میں ناؤ بہاتے ہو، یہ ناؤ کیسے چلے گی؟ نوح علیہ السلام فرماتے: ﴿ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ [الأنعام: ٦٧] جب وہ ناؤ بنا چکے اور فارغ ہوئے اور پانی اُبلا اور گلی کوچوں میں پھیل گیا، ایک بچے کی ماں اپنے بچے پر ڈری، وہ اس بچے کو بہت چاہتی تھی، پہاڑ کی طرف نکل گئی، یہاں تک کہ تہائی پہاڑ پر پہنچی، جب پانی وہاں تک پہنچا تب وہ دو تہائی پہاڑ پر چڑھ گئی، جب وہاں بھی پانی پہنچا تب نکل کر پہاڑ کے اوپر گئی، پانی اس کے گلے تک پہنچا، اس نے اس بچے کو دونوں ہاتھ سے اوپر اٹھا لیا «فَلَوْ رَحِمَ اللّٰهُ مِنْ قَوْمِ نُوحٍ أَحَداً لَرَحِمَ أُمَّ الصَّبِيِّ» (رواه ابن جرير وهذا حديث غريب من هذا الوجه) اسی کے لگ بھگ قصہ ام صبی کا امام کعب احبار اور مجاہد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب طوفان اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور اللہ نے قوم نوح کو غرقاب کر دیا، تب زمین سے یہ

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٣٥) اس کی سند میں ''عثمان بن مطر'' ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٥٩) اس کی سند میں ''حبیب بن عبداللہ ازدی'' مجہول اور ''عبدالصمد بن حبیب'' ضعیف راوی ہیں۔ البتہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ "صحيح البخاري" (رقم الحديث: ١٩٠٠) اور "صحيح مسلم" (رقم الحديث: ١١٣٠) میں مروی ہے۔

[3] تفسير الطبري (١٥/ ٣١٠ـ ٣١١) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٨٣) اس کی سند میں ''موسیٰ بن یعقوب'' متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٩٨٥)

بات کہی گئی کہ تُو اس پانی کو نگل جا۔ جعفر بن محمد عن ابیہ نے کہا ہے: ''اِبْلَعِيْ'' کے معنی لغتِ ہند میں اِشْرَبِيْ ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح آیا ہے،[2] یعنی طوفان کا پانی پی جا، اور سکھا دے نہ کہ دوسرے سارے پانی کے ذخائر اور چشمے اور معروف نہریں، اور آسمان سے کہا گیا کہ تُو پانی برسانے سے رُک جا۔ مہائمی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ ''اِجْذَبِيْ إِلیٰ جِهَةِ الْفَوْقِ مَا نَزَلَ مِنْكِ'' بعض نے کہا ہے کہ زمین کے پانی کو زمین نگل گئی اور آسمان کا پانی سمندر ہو گیا اور پہلے زمین کو نگلنے کا حکم دیا، اس لیے کہ پانی کا ابلنا آسمان سے پانی برسنے سے پہلے تھا۔ غرض کہ اس حکم کے بعد پانی سوکھ گیا۔

امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ پانی بالکل نہیں گیا، بلکہ کچھ باقی رہا اور کام پورا ہو گیا۔ یعنی قومِ نوح علیہ السلام بالکل غرقاب ہو کر تمام ہو گئی اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور کشتی کوہِ جودی پر جا لگی۔ جودی موصل کے قریب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ہر پہاڑ کا نام ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شام میں ہے، کسی نے کہا ہے کہ آمل میں ہے۔ حدیث میں آیا ہے: «لَقَدْ بَقِيَ مِنْهَا شَيْءٌ أَدْرَكَهُ أَوَائِلُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ»[3] کہتے ہیں کہ یہ پہاڑ جنت کا ہے، اسی لیے ناؤ اس پر ٹھہری، اس کے بعد چھے ماہ تک اس نے ساری زمین کا چکر لگایا۔

نوح، آدم ثانی:

اللہ نے کہا ہے کہ ظالموں کی قوم کو بُعد ہے۔ مناسب صدر آیت یہی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بات کہنے والے نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب کرام تھے۔ بُعد کا لفظ بددعا کے ساتھ مختص ہے اور قوم کو ظلم کے ساتھ متصف کرنا ان کی ہلاکت کے سبب کو ظاہر کرتا ہے اور اس قول کی طرف اشارہ ہے: ﴿ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ [هود: ٣٧] ''اور مجھ سے ان لوگوں کے متعلق بات مت کرنا جنھوں نے ظلم (کفر) کیا۔'' عبدالرحمان بن خلدون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو طوفان نوح علیہ السلام کے زمانے میں آیا تھا، ان کی بددعا سے، اس نے زمین کی ساری آبادی کو بالکل برباد کر دیا اور جو زمین آباد نہیں تھی، یعنی ویران تھی، اس کو بھی ڈبو دیا۔ اور جو لوگ سفینے پر سوار تھے، وہ بھی ہلاک ہو گئے، یعنی ان کی نسل نہ چلی۔ سارے اہلِ زمین نسلِ نوح علیہ السلام ہی میں سے ہیں۔ یہ مخلوق کے دوسرے باپ ہیں۔[4]

امام ابن اثیر رحمہ اللہ کامل میں لکھتے ہیں کہ مجوس طوفان کو نہیں پہچانتے، ہاں ان میں سے بعض نے طوفان کا

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٤٣٦)　[2] فتح القدير (٢/ ٦٩٩)

[3] ان الفاظ کے ساتھ مرفوع روایت نہیں ملی ہے۔ البتہ اس موضوع میں امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول مروی ہے۔ تفسير الطبري (٢٢/ ٥٨٢) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٣٧)

[4] تاريخ ابن خلدون (٢/ ٥)

اقرار کیا ہے، لیکن ان کا اعتقاد یہ ہے کہ اقلیم بابل میں آیا تھا اور اس کے قرب و جوار میں رہا اور کیومرت کی اولاد کی رہایش گاہیں مشرق میں تھیں، ان تک طوفان کی رسائی نہیں ہوئی۔[1] اسی طرح مشرق کی تمام امتیں، جیسے: ہند، فارس اور چین والے ہیں ان کو طوفان کا اعتراف نہیں ہے۔ ہاں بعض فارس اس کا اقرار کرتے ہیں، لیکن یہ کہتے ہیں کہ یہ طوفان عام نہ تھا اور عقبہ حلون سے آگے نہیں بڑھا۔ صحیح یہ ہے کہ سارے زمین والے نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ﴾ [الصافات: ۷۷] ''اور ہم نے اس کی اولاد کو باقی رہنے والے بنا دیا۔'' پس سب لوگ اولادِ سام، حام اور یافث ہیں۔

امام مقریزی رحمہ اللہ نے خطط میں کہا ہے کہ سارے اہلِ شرائع جو انبیا کے متبعین ہیں، کیا مسلمین اور کیا یہود و نصاریٰ، سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ نوح علیہ السلام بشر کے دوسرے باپ ہیں اور آدم علیہ السلام کی نسل انھی پر منحصر ہے۔ اللہ نے ان سے ساری اولادِ آدم پھیلائی۔ بنی آدم میں کوئی نہیں ہے مگر وہ اولادِ نوح علیہ السلام میں ہے۔ قبط و مجوس اور اہلِ ہند و چین طوفان کے منکر ہیں۔ بعض کا یہ زعم ہے کہ طوفان کا وقوع اقلیم بابل میں ہوا تھا اور ان شہروں میں جو بلادِ غربیہ ہیں اور کیومرت کی اولاد، جس کو یہ انسانِ اول کہتے ہیں، بلادِ شرقیہ میں تھے، وہاں تک طوفان نہیں پہنچا اور نہ ہندوستان اور چین میں پہنچا، لیکن حق وہی ہے جس پر تمام شریعتوں والے متفق ہیں۔

اللہ نے جب نوح علیہ السلام کو کشتی والوں کے ہمراہ نجات دی تو وہ ان سب کو لے کر اترے، یہ سب اسّی لوگ تھے، ان کی اولاد کے سوا سب مر گئے، ان کی نسل باقی نہ رہی۔ عقب (نسل) آدم فقط نوح علیہ السلام سے ان کی اولادِ ثلاثہ میں رہی، اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ قول کرتا ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ﴾[2]

قرآن کی بلیغ ترین آیت:

علمائے بلاغت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیتِ شریفہ فصاحت و بلاغت کے اس مقام پر پہنچی ہے کہ اس سے تمام وصف کرنے والے قاصر ہیں اور یہ تمام قدرت رکھنے والوں کی قدرت سے باہر ہے۔ فنون معانی و بلاغت کے ائمہ اور علمائے راسخین بیان و فصاحت جنھوں نے عرب کے خطیبوں کے خطبات اور ارشادات اور اہلِ زبان شعرا کے اشعار اور کلام مدوّن کیے ہیں اور جو عربی علوم کے اسرار و رموز اور باریک نکتوں کے حل کرنے میں اعلیٰ مہارت رکھتے ہیں، وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور عاجز آئے۔

امام صاوی اور سلیمان جمل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی سب سے زیادہ بلیغ آیت ہے، اس میں بدیع کی اکیس قسمیں آئی ہیں، حالانکہ اس آیت کے کلمے اُنیس (۱۹) ہیں۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے ان بدائع کے

---

[1] الکامل لابن الأثیر (۱/ ۵۸)
[2] المواعظ والاعتبار للمقریزي (٤/ ۳۸۸)

بیان میں طوالت اور حُسن اختیار کیا ہے۔ ابو حیان محمد بن یوسف اندلسی نے اپنی تفسیر ''النهر الماد من المحیط'' میں بدیع کی اکیس قسموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور سید محمد بن اسماعیل امیر نے رسالہ ''النهر المورود في تفسير آية هود'' میں انواعِ مذکور کے اسمائے حدود تفصیل کے ساتھ ذکر کیے ہیں، جن کا خلاصہ فتح البیان میں دیا گیا ہے۔ آیتِ باب میں فصاحت اور بلاغت دونوں کی راہ سے نظر کی گئی ہے اور اس کے وجوہ بیان ہوئے ہیں، بلکہ چار طرف سے اس پر نظر ڈالی گئی ہے: ایک علمِ بیان کی طرف سے، دوسرے علمِ معانی کی جانب سے، تیسرے اور چوتھے فصاحتِ لفظی و معنوی کی طرف سے۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے مدارک میں ان چاروں اطراف کا کچھ بیان کیا ہے، پھر کہا ہے کہ دشمنوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسی آیت کا لانا کسی بشر کی طاقت سے باہر ہے۔ سبحان اللہ تنزیل کی کیا شان ہے کہ عالم اس کی کسی آیت پر غور نہیں کرتا، لیکن اس کو اتنے لطائف دریافت ہوتے ہیں جن کو محصور نہیں کیا جا سکتا: ''وَلَا تَظُنَّنَّ الْآيَةَ مَقْصُوْرَةً عَلَى الْمَذْكُوْرِ فَلَعَلَّ الْمَتْرُوْكَ أَكْثَرُ مِنَ الْمَسْطُوْرِ''[1] قاضی نے کہا ہے کہ یہ آیت فصاحت و بلاغت کی انتہا تک پہنچی ہے، الفاظ کی بڑائی اور حسنِ نظم کے سبب سے۔ یہ حقیقتِ حال پر باوجود خالی عن الاخلال کے دلیل ہے۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں عجب طرح کی بلاغت ہے، جس سے سرخوشی میں آ کر رقص کرتے ہیں۔[2] اس کی فصاحت و نکات کا بیان شرح مفتاح میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مراتب اعجاز سے انتہا درجے کو پہنچ گئی ہے اور غرر مزایا سے مالک ناصیہ ہو گئی ہے۔ ماہرین متقنین نے اس کی تفصیل لکھی ہے، یہ وصف واصفین سے بہت بلند ہے۔[3]

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، چناں چہ اس نے کہا: اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے اہل میں

[1] مدارك التنزيل (٢/ ١٥٧) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي للخفاجي (٥/ ٩٩۔ ١٠٠)

[3] تفسير أبي السعود (٤/ ٢١٢) فتح البيان (٦/ ١٨٧۔ ١٩٢)

سے ہے، اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب فیصلے کرنے والوں سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والا ہے (45)
اللہ نے کہا: اے نوح! بے شک وہ تیرے اہل میں سے نہیں، بے شک اس کا عمل نیک نہیں، لہٰذا تو مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں۔ بے شک میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے (نہ) ہو جائے (46) نوح نے کہا: اے میرے رب! بے شک میں تیری پناہ میں آتا ہوں، اس سے کہ میں تجھ سے اس چیز کا سوال کروں جس کا مجھے کوئی علم نہیں اور اگر تو نے میری بخشش نہ کی اور مجھ پر رحم (نہ) کیا تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا (47)

نوح علیہ السلام کی بیٹے کے حوالے سے اللہ سے بات چیت اور اللہ کا جواب:

یعنی ایک عورت تو ہلاک میں آ چکی، اب تو چاہے بیٹے کو ہلاک میں کر، چاہے نجات میں۔ آدمی پوچھتا وہی ہے جو معلوم نہ ہو، لیکن مرضی معلوم ہونا چاہیے۔ یہ کام ہے جاہل کا کہ اگلے کی مرضی نہ دیکھے پوچھنے کی پھر پوچھے۔ موضح قرآن میں کہا ہے کہ نوح علیہ السلام نے توبہ کی، لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے، بندے کو کیا مقدور ہے، اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے ایسا پھر نہ ہو۔ نوح علیہ السلام کا یہ سوال اپنے غرق ہونے والے بیٹے کا حال معلوم کرنے کے طور سے تھا کہ یہ لڑکا میرے اہل میں ہے اور تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور تیرا وعدہ سچا ہوا کرتا ہے، تو پھر یہ کس طرح ڈوب گیا۔ اللہ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو نجات دینے کا وعدہ میں نے تجھ سے کیا تھا، یہ اُن میں سے نہیں تھا۔ تیرے گھر والوں میں سے نجات پانے والے وہ تھے جو ایمان لائے تھے، اسی لیے فرمایا: ﴿وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ﴾ [هود: ٤٠] ”اور اپنے گھر والوں کو، سوائے اس شخص کے جس کی بابت پہلے حکم ہو چکا۔“

سو یہ انھی لوگوں میں سے تھا جن پر بات پہلے پڑ چکی ہے اور کفر کی وجہ سے ڈوب گیا۔ بہت سے لوگوں نے اس کے خطا ہونے پر نص کی ہے جس نے یہ کہا کہ وہ نوح علیہ السلام کا بیٹا نہیں تھا، بلکہ ولد الزنا تھا یا بیوی کا بیٹا تھا، اپنا بیٹا نہیں تھا، جس طرح امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ نے کہا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ”مَا زَنَتِ امْرَأَةُ نَبِيٍّ قَطُّ“ ”کسی پیغمبر کی بیوی نے کبھی زنا نہیں کیا۔“ یہی بہت سے سلف کا قول ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ”وَقَوْلُ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي هَذَا هُوَ الْحَقُّ الَّذِي لَا مَحِيْدَ عَنْهُ، فَإِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ أَغْيَرُ مِنْ أَنْ يُّمَكِّنَ امْرَأَةَ نَبِيٍّ مِّنَ الْفَاحِشَةِ“ اسی لیے ان لوگوں پر جنھوں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی، غصہ کیا۔[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض حروف میں ”إِنَّهٗ عَمِلَ عَمَلًا غَيْرَ صَالِحٍ“ آیا ہے۔[3]

اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، یوں پڑھتے تھے: ﴿إِنَّهٗ عَمِلَ غَيْرَ صَالِحٍ﴾[4] (رواه أحمد)

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٤٠ـ ٣٤٢) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٣٤٤) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٨٣ـ ٥٨٤)
[3] تفسير الطبري (١٥/ ٣٤٣)
[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٨٢) مسند أحمد (٦/ ٤٥٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٠٩)

کسی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: ﴿فَخَانَتَاهُمَا﴾ کے کیا معنی ہیں؟ کہا: یہ کچھ زنا نہیں تھا، بلکہ ایک طرف لوگوں کو خبر دیتی تھی کہ یہ شخص دیوانہ ہے، دوسری طرف مہمانوں کی راہ بتاتی تھی، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صٰلِحٍ﴾۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ اللہ جھوٹ نہیں بولتا، اُس نے تو یوں کہا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ بعض علما نے کہا ہے: "مَا فَجَرَتِ امْرَأَةُ نَبِيٍّ قَطُّ" امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نوح علیہ السلام کا اپنے رب کو پکارنا کشتی کے روانہ ہونے سے پہلے تھا، کیونکہ یہ اس کی نجات کا سوال تھا اور سوال اسی وقت کیا جاتا ہے جب نجات کا امکان ہو۔ یہ سوال انھوں نے لاعلمی سے کیا تھا، وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مسبوق القول (جس پر بات پہلے پڑ چکی ہے) ہے۔ اُن کو یہ گمان تھا کہ یہ من جملہ مومنین کے ہے، اس لیے کہا کہ اے رب! تیرا وعدہ حق ہے، یعنی سچا ہے، اس میں خلاف نہیں ہوتا اور تُو احکم الحاکمین ہے، یعنی سب سے زیادہ علم رکھنے والا اور سب سے زیادہ عدل کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرا یہ بیٹا جس کی نجات کا تُو سوال کر رہا ہے، تیرے اہل میں سے نہیں ہے، یعنی ان لوگوں میں سے جو تجھ پر ایمان لائے ہیں اور تیرے تابع ہیں اور تیرے دین پر ہیں، اگرچہ باعتبار قرابت کے تیرے اہل میں سے ہے۔

امام عکرمہ، سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ نوح علیہ السلام کا صلبی بیٹا تھا۔[2] یہی صحیح ہے اور اللہ نے نص کی ہے کہ ﴿وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ﴾ اور نوح علیہ السلام نے بھی نص کی، بقول خود ﴿يٰبُنَيَّ﴾ کلام کا حقیقت سے مجاز کی طرف پھیرنا بغیر ضرورت کے جائز نہیں ہے، جس نے اس کے خلاف کہا اس نے اس بات کو بعید جانا کہ پیغمبر کا بیٹا کافر ہو۔ سو یہ اس کی غلط فہمی ہے، اس لیے کہ اللہ پاک کافر کو مومن سے اور مومن کو کافر سے پیدا کرتا ہے، اس میں انبیا اور غیر انبیا سب برابر ہیں۔ اللہ نے صلبِ آدم سے قابیل کو نکالا، وہ کافر تھا اور آدم علیہ السلام نبی تھے اور ابراہیم علیہ السلام کو پشتِ آزر سے نکالا، آزر کافر تھا۔ اسی طرح کنعان کو صلب نوح علیہ السلام سے پیدا کیا، وہ کافر تھا، اسی طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ علمائے سلف کے نزدیک مومن نہ تھے، ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، غرض کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق میں متصرف ہے، جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣]
''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جب کہ ان (لوگوں) سے باز پرس کی جائے گی۔''

پھر اللہ نے اس کے اہل سے خروج کی وجہ بیان کی کہ اہلِ بیت سے مراد قرابتِ دین ہے نہ کہ قرابتِ نسب۔ چنانچہ کہا کہ وہ ایک ناشائستہ عمل ہے، یہ اُس کی مذمت میں مبالغہ ہے، گویا اس کو نفسِ عمل ٹھہرایا اور اصل میں وہ

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٤٣۔ ٣٤٦)
[2] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٤٣۔ ٣٤٥)

غیر صالح اعمال کا حامل ہے۔ امام ابو اسحاق زجاجی، ابو علی فارسی، ابن الانباری اور واحدی رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضمیر ولد کی طرف لوٹتی ہے، جیسے: زید عدل اور یہی راجح ہے۔ اور عمل غیر صالح سے مراد کفر ہے۔ ابو علی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی اس نے اپنے باپ کی متابعت نہیں کی۔ امام صاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے کہ ضمیر نوح علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے، بحذفِ مضاف، معنی یہ ہیں کہ اللہ نے کہا: اے نوح! یہ تمھارا سوال کرنا عملِ غیر مقبول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ
''مَسْأَلَتُكَ إِيَّايَ يَا نُوحُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ لَا أَرْضَاهُ لَكَ''[1]

پھر اس جیسے سوال سے منع فرما دیا اور کہا کہ میں تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تُو جاہل مت ہو اور جاہلوں کا سا سوال نہ کر، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور: ١٧] ''اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا۔'' سوال کا نام جہل رکھا، اس لیے کہ بیٹے کی محبت نے ان کو سَبْقِ قَوْل کے یاد کرنے سے مشغول کر دیا۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ایک نصیحت ہے جس کے ذریعے سے اللہ نے نوح علیہ السلام کو جاہلین کے مقام سے بلند کر دیا اور مقامِ علمائے عاملین میں پہنچا دیا۔[2]

نوح علیہ السلام نے جب معلوم کر لیا کہ یہ سوال واقع کے مطابق نہیں ہے اور یہ دعا ان کی وہم کے اٹھنے کی وجہ سے ہوئی تو اپنی خطا کے اعتراف میں جلدی کی اور اللہ سے طالبِ مغفرت و رحمت ہوئے اور کہا کہ میں التجا کرتا ہوں اور عذر خواہ ہوں کہ پھر ایسا سوال کروں جس کا مجھ کو علم نہیں ہے اور اگر تُو یہ سوال کرنے کا گناہ مجھے نہ بخشے گا جو میں نے لاعلمی کی راہ سے کیا ہے تو میں اپنے علم میں خاسر ہوں گا۔ اس آیتِ کریمہ میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس بات کی مقتضی ہو کہ نوح علیہ السلام سے کوئی گناہ ہوا ہے سوائے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے اور اپنے اہل کی تاویل کرنے کے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو عتاب کیا، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ پاک کے سامنے کسی مخلوق کو اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی، خواہ کوئی پیغمبر ہو۔ اور انبیا کا خوف سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان سے اجتہادی خطا ہوئی تھی، جس طرح آدم علیہ السلام سے شجرِ ممنوعہ کھانے میں ہوئی تھی، سو اس لغزش کے سوا نوح علیہ السلام نے اور کوئی قصور نہیں کیا تھا۔[3]

معلوم ہوا کہ انبیا علیہم السلام سے بھی زلات (لغزشیں) ہو جاتے ہیں، لیکن ان کو اسی وقت من جانب اللہ تنبیہ کر دی جاتی ہے اور وہ پھسل جانا معاف کر دیا جاتا ہے۔ پس جب انبیا علیہم السلام کا اللہ پاک کے جلال و عظمت کے مقابلے میں یہ حال ہے تو پھر کسی ولی، پیر، شہید، فقیر، شیخ، صوفی وغیرہم کی کیا ہستی ہے کہ وہ کسی طرح کا دعویٰ کریں کہ انھیں چن لیا گیا ہے، یا انھیں کچھ اختیار حاصل ہے، یا اپنے مریدوں کو اولاد یا عمر بخشیں اور ان کے سارے مرید بخش دیے جائیں۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٤٠) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر القرطبي (٩/ ٤٨) [3] فتح البیان (٦/ ١٩٢۔ ١٩٥)

ایک جہان کو ان جاہل پیروں اور مریدوں نے مشرک و بدعتی بنا دیا ہے۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ. نوح علیہ السلام کو علمِ غیب تو کجا ولد کو اپنے اہل سے خارج کیا جانا معلوم نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے آگاہ کرنے پر انھیں اس کی خبر ہوئی اور پھر اللہ سے پناہ طلب کی۔ کسی اور پیر فقیر کو علمِ غیب کہاں سے حاصل ہوسکتا ہے؟ اور بہت ہی خوب ہے جو کہا گیا ہے ع

فَمَا أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ وَ أَحْبَارُ سَوْءٍ وَّرُهْبَانُهَا

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

کہا گیا: اے نوح! اتر تو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ (جو) تجھ پر اور تیرے ساتھ کی جماعتوں پر (نازل کی گئی) اور کچھ جماعتیں ہوں گی کہ ہم انھیں (دنیا میں) فائدہ دیں گے، پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ﴿48﴾

سلامتی اور برکت کے ساتھ کشتی سے اترنے کا حکم:

حق تعالیٰ نے تسلی فرما دی کہ پھر ساری نوعِ انسانی پر ہلاکت نہ آئے گی قیامت سے پہلے مگر بعضے فرقے ہلاک ہوں گے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ جب نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری تو اللہ نے ان کو اور ان کے ہمراہیوں کو بھی سلامتی کی خبر دی۔ وہ سب مومنین تھے اور نوح علیہ السلام کے ہر مومن سے تا قیامت یہ وعدہ کیا کہ وہ صحیح و سلامت رہیں گے، جس طرح محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سلامتی میں قیامت تک ہر مومن اور مومنہ داخل ہے۔ اسی طرح عذاب میں ہر کافر اور کافرہ داخل ہے۔[1] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے جب چاہا کہ طوفان رک جائے، ایک ہوا روئے زمین پر بھیجی، پانی ٹھہر گیا اور زمین کے چشمے بند ہو گئے اور آسمان کے دروازوں سے پانی کا نزول رک گیا۔ زمین سے کہا گیا کہ اپنا پانی پی جا، تا آخر آیت۔ پس پانی کم ہونے لگا اور سوکھنے لگا۔

اسرائیلی روایت:

اہلِ کتاب کے زعم میں جودی پہاڑ پر کشتی کا سیدھا ہونا ساتویں مہینے میں سترہویں رات کو ماہِ دہم کی پہلی تاریخ میں ہوا۔ پہاڑوں کے سر نظر آنے لگے، جب اس پر چالیس دن گزرے تو نوح علیہ السلام نے کشتی کے راستے کو جہاں سے سوار ہوئے تھے، کھولا اور ایک کوے کو بھیجا کہ جا کر دیکھے پانی کا کیا حال ہے۔ جب وہ لوٹ کر نہ آیا تو ایک کبوتری بھیجی، وہ لوٹ کر آئی، اس کے پاؤں رکھنے کو کوئی جگہ نہ ملی، نوح علیہ السلام نے اس کو پھر کشتی میں بیٹھا لیا۔ پھر ایک ہفتے کے بعد دوبارہ بھیجا، وہ صبح کی گئی ہوئی شام کو پھر کر آئی، اُس کی چونچ میں زیتون کا ایک پتا تھا، نوح علیہ السلام نے معلوم کیا کہ

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ١٣٥٤_ ٣٥٥)

پانی کم ہوگیا ہے، پھر سات دن تک انتظار کیا، پھر اس کو تیسری بار بھیجا، وہ پھر کر آئی، جانا کہ زمین کھل گئی ہے۔ جب پورا ایک سال گزر گیا تو نوح علیہ السلام نے کشتی کا پردہ کھولا، اُن سے یہ بات کہی گئی: ﴿ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا... الخ ﴾[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے: یعنی اے نوح! کشتی سے زمین پر اترو، یا پہاڑ سے زمین پر کہ زمین نے اپنا پانی نگل لیا اور خشک ہوگئی ہے اور سلامتی اور امن کے ساتھ اترو یا تحیت وعظمت کے ساتھ، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الصافات: ۷۹] ''نوح پر تمام جہانوں میں سلام ہو۔'' یہ اس لیے کہ غرق ساری زمین کو عام تھا۔ جب وہ کشتی سے نکلے تو جان لیا کہ زمین میں سبزی یا جان داروں میں سے کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے کچھ فائدہ لیا جائے۔ گویا ڈر رہے تھے کہ زندگی کیسی ہوگی اور کھانے پینے کی ضروریات کس طرح پوری ہوں گی؟ جب اللہ نے یہ فرمایا: ﴿ اِهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا ﴾ (آیتِ باب) تو وہ خوف ان کے دل سے زائل ہوگیا، کیونکہ سلامتی صرف رزق اور امن کی فراوانی ہی سے ممکن ہے۔

سلامتی اور برکت سے مراد:

پھر اس کے بعد ﴿ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ... الخ ﴾ فرمایا۔ مراد اس سے بھلائیاں اور ثابت رہنے والی نعمتیں ہیں جو ہمیشہ باقی رہیں ان کی نسل میں اور وہ اشیا ہیں جن سے طرح طرح کے رزق حاصل کرنے اور معاش قائم کرنے میں مدد ہو۔ اس خطاب میں ان کی توبہ کے قبول ہونے کی دلیل ہے کہ ان کا وہ پھسل جانا معاف کر دیا گیا اور خسران سے ان کی خلاصی ہوگئی اور انھیں اس بات کی اطلاع اور بشارت ہے کہ نوح علیہ السلام کو حال میں اور آیندہ بھی اللہ کا فیضان اور طرح طرح کی بھلائیاں ملتی رہیں گی۔

امم سے مراد:

امم سے مراد وہ لوگ ہیں جو نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کی اولاد میں سے مختلف قبیلے وجود میں آئیں گے، یہ آخر زمانے تک کی امتیں ہوئیں۔ کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے ان کی نسل نہیں چلی مگر نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹوں کی نسل باقی رہی۔ نوح علیہ السلام کے بعد نوعِ انسانی صرف انھی کی اولاد میں ہی رہی۔ اسی لیے ان کو آدمِ صغیر کہتے ہیں، آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار برس کا فاصلہ تھا اور آدم علیہ السلام تک ان کے آٹھ اجداد تھے، سو اس آیت سے مراد نوح علیہ السلام کی اولاد کی مومن اور کافر کے لحاظ سے تقسیم ہے نہ کہ ان کی تقسیم جو کشتی میں تھے، اس لیے کہ وہ سب کے سب مومن تھے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٣٨۔ ٣٣٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٨٤۔ ٥٨٥)

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے اور جائز ہے کہ مِنْ بیانیہ ہو، یعنی ان امتوں پر جو تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کو امم اس لیے کہا ہے کہ وہ مختلف احزاب اور متفرق جماعتیں تھیں یا اس لیے کہ ساری امتیں انھی سے بنی ہیں۔ ﴿ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ﴾ سے یہی بعض امتیں مراد ہیں جو ان میں سے پیدا ہوں گی، جو کافر ہیں اور قیامت تک ان کی نسل سے ہوں گے اور مومنہ امتوں کا معاملہ جو ان ہی سے نکلیں گی مبہم رہا۔ ان کے حال سے کچھ تعرض نہیں فرمایا اور ان پر کوئی دلالت نہ ہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ امم ہمراہ سے مراد مومنین ہیں اور امم متمتع سے مراد قیامت تک کے کافر ہیں۔[1] تقدیر یہ عبارت ہوئی ''مِنْهُمْ أُمَمٌ'' یا ''يَكُونُ أُمَمٌ''۔

تمتع سے مراد:

تمتع سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کو دنیا میں معیشت کا ساز وسامان دیں گے، پھر ان کو دنیا یا آخرت میں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ''مِمَّنْ تَبِعَكَ'' سے مراد ''مِمَّنْ لَمْ يُوْلَدْ'' ہے۔ اللہ نے ان کے لیے برکات کو واجب کیا، کیونکہ علمِ الٰہی میں ان کی نیک بختی پہلے سے لکھی جا چکی تھی۔ اور جن کے بارے میں حیاتِ دنیا کی متاع کا ذکر ہے ان کے لیے اللہ کے علم میں شقاوت (بدبختی) لکھی گئی تھی۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ لوگ ناؤ پر سے اترے اور اللہ اُن سے راضی تھا، پھر ان کی نسل چلائی، اُن میں سے کوئی مرحوم (رحم کیا گیا) اور کوئی عذاب کیا گیا ٹھہرایا۔[2] بعض نے کہا: امم متمتعہ سے قومِ ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام مراد ہے اور عذابِ الیم سے وہ بلا مراد ہے جو ان قوموں پر نازل ہوئی۔ بہر حال یہاں تک نوح علیہ السلام کا قصہ ختم ہوا۔[3]

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾

(اے نبی!) یہ کچھ غیب کی خبریں ہیں، ہم انھیں آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ انھیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، اس لیے آپ صبر کریں، بے شک (بہترین) انجام متقین ہی کے لیے ہے ﴿49﴾

یہ غیبی واقعات قرآن کی صداقت کی دلیل ہیں:

اللہ پاک نے اپنے پیغمبر عالی قدر سے فرمایا کہ یہ قصہ اور اس جیسے اور قصے من جملہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں، ہم نے ان کی وحی تیری طرف کی، گویا تُو ان کو دیکھ رہا ہے، ورنہ اس خبر دینے سے پہلے نہ تُو جانتا تھا اور نہ تیری قوم، یعنی علم غیب کسی کو نہ تھا۔ آیتِ کریمہ انبیا علیہم السلام کے علم غیب نہ جاننے کی دلیل ہے۔ سو اب اگر کوئی تجھ کو جھٹلائے اور یہ بات کہے کہ تُو نے یہ قصہ کسی سے سیکھ لیا ہے تو وہ خود جھوٹا ہے، بلکہ اس قصے کی خبر تجھ کو اللہ

[1] تفسير أبي السعود (٤/ ٢١٥) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٣٥٤۔ ٣٥٥) [3] فتح البيان (٦/ ١٩٥۔ ١٩٧)

نے دی ہے، جس طرح پہلے انبیا علیہم السلام کی کتب اس پر شاہد ہیں۔ تُو ان کے جھٹلانے اور ایذا پہنچانے پر صبر کر، ہم جلد تیری مدد کریں گے۔ انجام کو تُو ہی فتح یاب ہو گا اور تیرے تابعدار ہی تقویٰ کے سبب دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے، جس طرح کہ ہم نے پہلے رسولوں کے ساتھ کیا ہے۔

غیب دانی اللہ کی صفت ہے:

من جملہ تقویٰ کے ایک بات یہ ہے کہ کسی شخص کے بارے میں، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، یہ اعتقاد نہ کرے کہ وہ غیب دان ہے۔ پیغمبر ہو یا پیر فقیر یا شیخ یا استاد یا باپ یا امام مجتہد۔ اور جس کو دیکھے کہ وہ غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہے اس کو کافر سمجھے، اس لیے کہ اس علم کے ساتھ اللہ پاک خاص ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے غیب کی جو خبریں اپنے انبیا کی زبان اور بیان سے ہم کو پہنچائی ہیں، جیسے: قیامت سے پہلے فتنوں کے حالات یا عالمِ برزخ میں مردوں کے حالات یا آخرت کے واقعات اور اس کی ہولناکیاں، اس کا علم ہم کو حاصل ہے اور جو بات کشف یا الہام یا منام (نیند) سے معلوم ہو اور اس کا تعلق غیب سے ہو وہ اہلِ علم اور اہلِ سلوک کے نزدیک بالاتفاق حجت نہیں ہے اور نہ یہ امور کسی کی قدرت میں ہیں۔ اور کسی کشف یا الہام یا خواب کے مطابق کوئی واقعہ ہو جانا جبکہ وہ کتاب وسنت اور صحیح شرعی دلائل کے خلاف نہ ہو تو یہ اس واقعہ کے صاحب کی کرامت ہے، جبکہ وہ صاحبِ کرامت متقی، صحیح العقیدہ اور عمل صالح کرنے والا، غیر مشرک اور غیر بدعتی ہو اور اس کا ثبوت اس کے قول، فعل اور حال سے ہو اور وہ سنتِ مطہرہ سے سرِ مو تجاوز نہ کرتا ہو، ورنہ پھر وہ خرقِ عادت کرامت نہ ہو گی، بلکہ استدراج اور اللہ کی خفیہ تدبیر ہو گی۔ نیز وہ کرامت ایسی ہو جس سے اس شخص کا عالم الغیب اور دنیا میں متصرف ہونا ثابت نہ ہو، ورنہ کالائے بد بریش خاوند ہو گی۔ بہت سے اولیائے شیطان، اولیائے رحمان کے لباس میں ظاہر ہو کر لوگوں کو راہِ حق اور دینِ خالص سے گمراہ کر دیتے ہیں اور ان بے چاروں کو معلوم تک بھی نہیں ہوتا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ نوح علیہ السلام کا یہ قصہ غیب کی خبر ہے، یعنی جنسِ غیوب سے ہم نے اس قصے کی وحی تجھ کو کی ہے تُو اس کو جانتا نہیں تھا، یعنی تفصیلاً ورنہ ہر زمانے میں یہ قصہ مشہور ہوتا، ہاں اجمالاً معلوم تھا کہ طوفان آیا تھا اور بس۔ اور نہ تیری قوم اس حال سے واقف تھی، یعنی عرب، بلکہ یہ قصہ ان کے نزدیک مجہول تھا، اس کہنے میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصے کو کسی سے نہیں سیکھا اور عرب نے جبکہ باوجود اس کثرت کے یہ قصہ نہیں سنا تو پھر ایک شخص ان میں سے وحی یا نزولِ قرآن سے قبل یا اس وقت سے پہلے اس کو کس طرح جان سکتا ہے۔ تو جو کچھ ان کفار سے مشاہدہ کرتا ہے اس پر صبر کر، جس طرح نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ایذا رسانی پر صبر کیا۔ حرفِ فا میں بعد کی

ماقبل پر تفریع ہے۔ عاقبتِ محمودہ دنیا اور آخرت میں اہلِ تقویٰ کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی ہے اور اس بات کی بشارت ہے کہ انجام کار کامیابی متقیوں کے لیے ہے۔ مبادی (ابتدائی باتوں) کا کچھ اعتبار نہیں۔[1]

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

اور (ہم نے) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، تمھارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تم تو محض جھوٹ گھڑنے والے ہو (50) اے میری قوم! میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اسی ذات کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (51) اور اے میری قوم! تم اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف توبہ کرو، وہ تم پر خوب برسنے والے بادل بھیجے گا اور تمھاری قوت پر قوت بڑھائے گا اور تم مجرم بن کر (حق سے) منہ نہ موڑو (52)

ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا واقعہ:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ ہود علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دیا کہ تم اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرو اور بتوں کی پوجا سے ان کو منع کیا، کیونکہ ان کی عبادت افترا تھی۔ انھوں نے اپنی طرف سے ان کے نام نشان مقرر کر لیے تھے۔ نیز ہود علیہ السلام نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اس نصیحت اور خیر خواہی پر تم سے کچھ اجر نہیں چاہتا، بلکہ اس کے ثواب کا اس اللہ سے خواہاں ہوں جس نے مجھ کو پیدا کیا۔ تم نہیں سمجھتے کہ یہ شخص تم کو ایسی چیز کی طرف بلاتا ہے جو تمھاری دنیا اور آخرت کو مفت میں بغیر کسی اُجرت کے درست کرے۔

استغفار کا حکم اور فائدہ:

پھر ان کو حکم دیا کہ تم استغفار کرو۔ استغفار گزشتہ گناہوں کا کفارہ ہے اور آیندہ کے لیے توبہ کرو کہ پھر ایسا کام نہ کرو گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے اور اس میں یہ صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں، اللہ اُس پر رزق کو آسان کر دیتا ہے اور اُس

[1] فتح البیان (٦/ ١٩٨)

کا کام سہل ہو جاتا ہے اور وہ ہر حال میں محفوظ رہتا ہے۔ اسی لیے یہ بات کہی کہ آسمان سے تم پر موسلا دھار پانی برسے گا، جس سے تمھارے رزق میں وسعت ہو گی۔ حدیث میں آیا ہے: «مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَّمِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَّخْرَجاً وَّرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ»[1] اس حدیث کا تجربہ یہ سطور تحریر کرنے والے کو ہو چکا ہے، جیسا فرمایا، ویسا ہی استغفار کا اثر پایا، حالانکہ ہمارے جیسے نااہلوں کی استغفار خود ایسی ہے کہ اس سے بخشش مانگی جائے، لیکن اللہ کا فضل عام اور اس کا کرم عمیم ہے۔ اس نے ہمارے غفلتِ قلب کے باوجود استغفار کی وجہ سے بہت سی مصیبتوں کو ہم سے دور کیا۔ وللّٰه الحمد.

اسی طرح ہود علیہ السلام اور دیگر انبیا نے اپنی قوموں سے اللہ کی رحمت اور بخشش کا جو کچھ وعدہ کیا تھا، اگر وہ لوگ ان کی نصیحت اور موعظت پر چلتے تو اس کا نیک بدلہ دیکھتے، لیکن ان کی تکذیب و افترا اور نافرمانیوں نے ان کو عذابِ دارین کا مستحق بنا دیا۔ نَسْئَلُ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ.

رسول کو قوم کا بھائی قرار دینا بے ادبی نہیں:

اس آیتِ شریفہ میں ہود علیہ السلام کو اپنی قوم کا برادر فرمایا، یہ اخوت رسولوں کی شان میں کسی کمی کا معاملہ نہیں ہے۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے بھی فرمایا ہے: «أَكْرِمُوا أَخَاكُمْ... الخ»[2] یہ برادری، قرابت، قومیت، اشتراکِ صفت بہ اعتبار بشریت کے تھی، اس سے کسی پیغمبر کی حقارت ثابت نہیں ہوتی، ورنہ اس صراحت کے ساتھ اس لفظ کا اطلاق کتاب و سنت میں انبیا کے حق میں نہ آتا۔ بعض جاہل کسی پیغمبر کو بشر اور بھائی کہنے کو سوءِ ادب خیال کر کے احتراز کرتے ہیں، حالانکہ یہ احتراز ایسے اطراء (کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا) میں داخل ہے جو ممنوع ہے۔ اللہ نے اپنے رسولوں کو جو بزرگی تمام امتوں پر اور انسانوں بلکہ بزرگ فرشتوں پر دی ہے وہ کچھ ان کے بھائی ہونے سے دور نہیں ہو جاتی۔ یہ لوگ ہمارے ایسے بھائی ہیں کہ ہزار درجہ ہم سے بہتر ہیں۔

یمن میں ہود علیہ السلام کی نسل اور یمن کی فضیلت:

ہود علیہ السلام کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے۔ امام ربانی قاضی محمد علی شوکانی رحمہ اللہ انھی کی اولاد امجاد میں ہوئے اور ایسے عالم کامل ہوئے کہ ان کے بعد پھر ویسا عالمِ قرآن و حدیث اب تک سنا اور دیکھا نہیں، یہ یمن کے دار الامارۃ صنعاء کے قاضی القضاء تھے۔ اہلِ یمن کی افضلیت کتاب و سنت دونوں میں آئی ہے۔ صالحانِ فضائل کا ایک جملہ رسالہ "سلسلة العسجد" میں مرقوم ہے کہ اگر کوئی فضیلت نہ آتی مگر صحیح مسلم کی ایک یہ حدیث کہ «اَلْإِيمَانُ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥١٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨١٩) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٨٥) اس کی سند میں ''الحکم بن مصعب'' مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٧٠٥)

[2] مسند أحمد (٦/ ٧٦) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ وَالْفِقْهُ يَمَانٍ ﴾[1] تو متبعینِ یمن کی بشارت کے لیے ایک سندِ کافی، دلیلِ وافی اور برہانِ شافی ہو سکتی ہے۔

یہ حدیث اس بات پر حجتِ صریح ہے کہ یہ لوگ بڑے ایمان دار، قرآن کے عالم اور سنت کے واقف ہیں، کیونکہ قرآن و حدیث کے محاورے میں حکمت کا لفظ سنتِ مطہرہ کے معنی میں آتا ہے اور فقہ سے مراد فہمِ قرآن و حدیث ہے۔ سو اس فہم میں جو دست گاہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ یمن کے علمائے قرآن و حدیث کو بخشی ہے وہ کسی دوسرے فرقے میں کم معلوم ہوتی ہے اور اس نعمتِ اتباع کی جو قدر اہلِ یمن کے دل میں ہے، شاید ویسی کسی اور کے دل میں نہ ہو۔ واللّٰہ أعلم.

قومِ عاد کا نسب، تقسیم اور مذہب:

فتح البیان میں ہے کہ ہم نے ہود علیہ السلام کو عاد کی طرف بھیجا، یہ ان کے بھائی تھے، یعنی ان کے نسب میں سے ایک شخص تھے نہ کہ دین میں۔ قومِ عاد بت پرست تھی، سورت اعراف میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ عاد دو ہیں: ایک اولیٰ، دوم اخریٰ۔ یہ لوگ جن کی طرف ہود علیہ السلام بھیجے گئے، عادِ اولیٰ تھے، یہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور عاد اخریٰ شداد و لقمان اور ان کی قوم تھے، جن کا ذکر ﴿ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ [الفجر: ۷] ''(عاد) ارم جو اونچے ستونوں والے تھے۔'' میں آیا ہے۔ اصل میں عاد ایک مرد کا نام ہے، پھر قبیلہ کا نام ہو گیا، جیسے تمیم و بکر اور اس جیسے دوسرے۔ ہود اور نوح علیہما السلام کے درمیان آٹھ سو برس کا فاصلہ تھا اور ان کی عمر چار سو چونسٹھ برس کی ہوئی۔ انھوں نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ وحدہ لا شریک لہ کو پُوجو اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تم نے جو غیر کو عبادت میں شریک کیا ہے اور اُس کو اپنا شفیع ٹھہرایا ہے، سو یہ تمھارا افترا ہے اللہ عزوجل پر۔

انبیاء مال کے طلبگار نہیں ہوتے:

پھر ان کو خطاب کیا کہ میں تم سے اس نصیحت اور خیر خواہی پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا۔ یہی خطاب سارے پیغمبروں نے اپنی اپنی قوم کو کیا تھا، تا کہ ان کے دلوں سے وہم جاتا رہے اور ان کی نصیحت خالص ہو، کیونکہ جس نصیحت میں طمع ہوتا ہے اس میں تاثیر نہیں ہوتی۔ یہ ذکر نوح علیہ السلام کے قصے میں گزر چکا ہے۔ یہاں لفظ اجر کہا، وہاں لفظ مال کہا تھا بطورِ تفنن یا اس لیے کہ وہاں خزانوں کا ذکر آیا تھا، اس لیے اس کی مناسبت سے لفظ مال آیا تھا۔ کیونکہ اللہ پر میرا اجر ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے ثواب بھی دے گا، تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ناصحین کا اجر رب العالمین پر ہوتا ہے۔

استغفار کا حکم:

پھر ان کو ارشاد کیا کہ تم استغفار کرو، توبہ کرو، اس سے تم پر آسمان سے رزق کی بارش ہو گی۔ آسمان سے اس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۳۰۸۔ ۴۱۲۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۲)

جگہ بادل مراد ہے، ہود علیہ السلام کی قوم باغوں اور کھیتوں اور عمارتوں کی مالک تھی اور وہ لوگ شام اور یمن کے درمیان ریگستان میں رہتے تھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تین برس تک اللہ تعالیٰ نے ان سے پانی روکے رکھا، ان کے شہروں میں قحط اور خشک سالی ہوگئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ اس پر ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم استغفار کرو اور توبہ کرو، مگر انھوں نے نہ سنا۔[1] یہ بھی کہا کہ اگر تم یہ کام کرو گے تو تم کو قوت پر اور قوت حاصل ہوگی۔ قوت سے مراد فراخی در فراخی یا عزت بالائے عزت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "قُوَّةً فِي النِّعَمِ"[2] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ ﴾ سے مراد ولد الولد ہے، یعنی بیٹوں کی اولاد ہے۔[3] کہتے ہیں کہ تیس برس تک ان کی عورتیں بانجھ رہیں، کسی کے بچہ پیدا نہ ہوا۔ بعض نے کہا: مراد قوت فی الدین ہے، اپنے بدنوں کی قوت کے ساتھ ساتھ۔ تم گناہ گار ہو کر پشت نہ پھیرو۔[4]

قَالُوا يٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٣﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٥٥﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٦﴾

انھوں نے کہا: اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل نہیں لایا اور ہم (صرف) تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور ہم تجھ پر ایمان لانے والے (بھی) نہیں (53) ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تجھے (دماغی) خرابی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہود نے کہا: بے شک میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو (54) سوائے اللہ کے، چناں چہ تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی تدبیر کر لو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو (55) بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے، (زمین پر) چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں، جسے اس نے اس کی پیشانی سے نہ پکڑ رکھا ہو، بے شک میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے (56)

قوم کا جواب، انکار اور الزام اور ہود علیہ السلام کا جواب:

یعنی جو سیدھی راہ چلے وہ اس سے ملے۔ اللہ نے خبر دی کہ عاد نے ہود علیہ السلام سے کہا کہ تم اپنے دعویٰ پر کوئی

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٤٤٢)
[2] معاني القرآن (٣/ ٥٧)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٤٥)
[4] فتح البيان (٦/ ١٩٨۔ ٢٠١)

حجت اور برہان ہمارے پاس لے کر نہیں آئے، ہم صرف تمھارے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ تم پر ایمان لائیں گے، بلکہ ہمارا گمان تو یہ ہے کہ ہمارے بعض معبودوں نے تم کو پاگل کر دیا ہے اور تمھاری عقل میں خلل ڈال دیا ہے، اس لیے کہ تم نے ان کی عبادت سے منع کیا اور تم ان پر عیب لگاتے ہو۔ ہود علیہ السلام نے فرمایا: واللہ! میں تمھارے شرک سے بری ہوں اور سارے انداد (شریکوں) سے بیزار ہوں، اب تم سب مل کر جو میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو وہ کرو اور مجھ کو مہلت مت دو۔ ہر جاندار اللہ کا مقہور و مجبور ہے اور اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، کیونکہ وہ سیدھی راہ پر ہے۔

ایفع بن عبد کلاعی رحمہ اللہ نے آیتِ باب میں کہا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی چوٹی پکڑتا ہے، پھر مومن کو تلقین کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے لیے اس سے بھی زیادہ شفیق ہوتا ہے جتنا ایک باپ اپنی اولاد پر ہوتا ہے اور کہتا ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسٰنُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴾ [الانفطار: ٦] ''اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم کی بابت دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟''[1] یہ رسالت کی سچائی پر اور بتوں کی عبادت کے باطل ہونے پر ایک حجتِ بالغہ ہے، کیونکہ اخلاصِ عبادت کا مستحق اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے جس کے ہاتھ میں سارا ملک ہے اور اسی کا غلبہ ہے اور ہر چیز اس کے قہر کے نیچے ہے۔ لآ إله إلا هو ولا رب سواه.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ بینہ سے مراد حجتِ واضحہ ہے، ان کا یہ کہنا عناد اور حق سے دوری کی وجہ سے تھا، ورنہ ہود علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجتیں اور دلیلیں لے کر آئے تھے، لیکن ان لوگوں نے نہ مانا، بلکہ یہ کہا کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت نہ چھوڑیں گے اور نہ ہی تمھاری تصدیق کریں گے، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تم کو سڑی خبطی بنا دیا ہے، تب ہود علیہ السلام نے یہ جواب دیا کہ میں اللہ کو اپنی جان پر گواہ کرتا ہوں اور تم بھی مجھ پر گواہ رہو کہ میں تمھارے شرک سے بیزار ہوں، اب تم اور تمھارے معبود سب مل جل کر مجھے جو نقصان پہنچانا چاہو، پہنچا لو، جس طرح کہ تمھارا اعتقاد ہے کہ تمھارے یہ معبودانِ باطل مجھ کو ضرر پہنچائیں گے اور انھوں نے مجھ کو دیوانہ بنا دیا ہے اور تم اس کام میں جلدی کرو، دیر نہ کرو، مجھے مہلت نہ دو اور میری ہلاکت کے لیے جو چارہ کرنا چاہو وہ کر گزرو۔ اس میں ہود علیہ السلام کی بے پروائی، ان سے اور ان کے بتوں سے جن کو وہ پوجتے تھے، ظاہر ہوتی ہے اور یہ ایک کھلا معجزہ ہے اللہ کے رسول علیہ السلام کا۔ ہود علیہ السلام نے کہا کہ میں نے اللہ پر بھروسا کیا ہے جو میرا اور تمھارا رب ہے اور مجھ کو تمھارے مکر و فریب سے پناہ دے گا، اگرچہ تم مجھے تکلیف پہنچانے کے ذرائع کو اکٹھا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو، جو شخص اللہ پر بھروسا کرتا ہے، اللہ پاک اس کو کافی ہوتا ہے۔[2]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٤٧)
[2] فتح البيان (٦/ ٢٠١۔ ٢٠٢)

پھر اللہ پاک کی ربوبیت اور اس کی عام بادشاہت کا ذکر کیا کہ ہر جاندار کی چوٹی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور تم من جملہ دواب (چلنے پھرنے والے جانور) کے ہو، تم میرا کچھ برا نہیں کر سکتے۔ یہ انتہا درجے کی تسخیر اور ذلت کی مثال ہے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کسی کو قید کرتے، پھر اس پر احسان رکھ کر چھوڑنا چاہتے تو اس کی پیشانی کے بال کتر دیتے، یہ اس کے مقہور ہونے کی علامت تھی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اخذ ناصیہ (چوٹی پکڑنے) سے مراد بادشاہت اور قدرت ہے۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد قہر ہے، جس کی چوٹی پکڑی وہ مقہور ہوا۔[1] ناصیہ سر کے اگلے حصے کے بالوں کو کہتے ہیں۔

پھر کہا کہ میرا رب عدل وحق پر ہے، وہ تم کو ہرگز مجھ پر مسلط نہ کرے گا یا میرے رب کا دین سیدھا ہے یا میرا رب تم کو صراطِ مستقیم پر لے آئے گا یا اس کی طرف راہ نمائی کرے گا، لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ
قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷
وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ
مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۸ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۵۹
وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ
عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰

پھر اگر تم (حق سے) منہ موڑو گے تو میں نے وہ (پیغام) تمھیں پہنچا دیا ہے جس کے ساتھ مجھے تمھاری طرف بھیجا گیا تھا، اور میرا رب تمھارے سوا ایک اور قوم کو (تمھارا) جانشین بنا دے گا، اور تم اسے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے (57) اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا تو ہم نے ہود اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی اور ہم نے انھیں شدید عذاب سے نجات دی (58) اور (دیکھو) یہ عاد ہیں، انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا تھا، اور اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر سرکش (اور حق سے) عناد رکھنے والے کے حکم کی پیروی کی (59) اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور روزِ قیامت کو بھی (لگی رہے گی۔) آگاہ رہو! بے شک (قوم) عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ خبردار! دوری ہے ہود کی قومِ عاد کے لیے (60)

[1] تفسير القرطبي (۹/ ۵۲)

اتمامِ حجت، ہود علیہ السلام اور اہلِ ایمان کی نجات اور منکروں کی تباہی:

ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم اس چیز سے جو میں تمھارے پاس لایا ہوں، پیٹھ پھیرتے ہو اور روگردان ہوتے ہو تو تم پر میری تبلیغ کی حجت قائم ہو چکی، اب اللہ تمھاری جگہ کوئی اور قوم ہی لائے گا، جو خالص اللہ کو پوجے گی، اللہ کو تمھاری کچھ پروا نہیں ہے، تم اپنے کفر سے اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، بلکہ اس کفر کا وبال خود تمھارے ہی اوپر آئے گا، کیونکہ میرا رب ہر چیز کا حافظ ہے، اس نے بندوں کے تمام اقوال اور افعال محفوظ کر رکھے ہیں اور وہ ان پر شاہد ہے۔ پھر جب اللہ کا حکم آیا، یعنی تیز آندھی تو اس نے ان سب کو آخر تک ہلاک کر ڈالا۔ صرف ہود علیہ السلام اور ان کے اتباع اللہ کی رحمت اور لطف و کرم کے سبب اس سخت عذاب سے بچ گئے۔

اس قومِ عاد نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا، اللہ کے رسول کی نافرمانی کی، کیونکہ ایک نبی کے ساتھ کفر کرنا ایسا ہی ہے جیسے سب انبیا علیہم السلام کا کفر کرنا، اسی لیے ان پر اسی دنیا میں اللہ کا عذاب نازل ہوا اور مومنین کی طرف سے بھی وہ ملعون ہوئے۔ جب ان کا ذکر ہوتا ہے تو سب لوگ ان پر نفرت اور لعنت کا اظہار کرتے ہیں اور قیامت کے دن تمام گواہوں کی طرف سے یہ آواز ہوگی کہ سن لو کہ عاد نے اپنے رب کا کفر کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عاد کے بعد جو نبی آیا، عاد کو اس کی زبان سے لعنت کی گئی۔[1] نَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اگر تم میری دعوت کو قبول کرنے سے اسی طرح منہ موڑتے رہے اور کفر پر اسی طرح ڈٹے رہے تو مجھ کو اس کی کچھ پروا نہیں ہے اور نہ تمھارے حال پر مجھے پکڑ ہوگی، کیونکہ میں اللہ کا پیغام تم تک پہنچا چکا، میرے اوپر صرف اللہ کا حکم پہنچا دینا تھا، تم پر حجت قائم ہوگئی، اللہ کسی اور ہی قوم کو تمھارا خلیفہ کر دے گا اور وہ تمھارے ان گھروں اور مالوں کے مالک ہو جائیں گے۔ تم اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے نہ کم نہ بیش۔ تم بے شک اپنی ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا لو، میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے، وہ ہر چیز کی حفاظت کرے گا، مجھ کو تمھاری ضرر رسانی اور ایذا دہی سے محفوظ رکھے گا۔ پھر جب اللہ کا حکم آیا، یعنی دنیا کا عذاب جو ریحِ عقیم (تیز آندھی) کی صورت میں آ کر قومِ عاد کو ہلاک کر گیا تو اللہ نے ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھ کے ایمان والوں کو نجات دی، باقی قوم، جو چار ہزار لوگ تھے، عذاب سے تباہ ہو گئے۔ یہ ہود علیہ السلام اور مومنوں پر اللہ کی رحمت تھی۔

اس لیے کہ جب اللہ کا عذاب اترتا ہے تو کوئی شخص اُس سے نجات نہیں پاتا مگر اللہ کی رحمت سے۔ یا اس جگہ رحمت سے مراد ایمان ہے کہ سچا اور مخلص مومن نجات پاتا ہے۔ عذاب غلیظ سے مراد وہ سخت عذاب ہے جو آخرت

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٤٨)

میں ہوگا یا وہ گرم ہوا جو ان کی ناکوں میں گھس گئی تھی اور اس نے اسی دنیا میں ان کو برباد کر دیا۔ عاد نے اللہ کی آیات یعنی رسول کے معجزوں کا انکار کیا اور ان کے سرداروں اور عام لوگوں نے اللہ کے رسولوں کی نافرمانی اختیار کی۔ [1]

ہود علیہ السلام ایک رسول تھے، ان کی تعظیم کے لیے جمع کا صیغہ آیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ انھوں نے ہود علیہ السلام اور ان سے پہلے رسولوں کی تکذیب کی تھی یا ان کا کینڈا (طرزِ عمل) ایسا تھا کہ ان کے پاس بہت سے رسول آتے تو وہ سب کو جھٹلاتے، کیونکہ وہ ہر سرکش اور نافرمان کے حکم کے تابع تھے۔ جبار سے مراد تکبر کرنے والا اور عنید سرکش کو کہتے ہیں، یعنی جو حق بات کو قبول نہ کرے اور نہ اُس کا مُذعن (باور کرنے والا) ہو اور ظلم میں حد سے آگے بڑھ جائے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عنید وعنود و عاند و معاند وہ ہے جو مخالفت میں جھگڑا کرنے والا ہو۔ [2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عنید مشرک ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا مشاقق (جھگڑا کرنے والا)۔ [3]

بالجملہ ان سب سرداروں اور سفلہ (نیچے والے لوگ) کو اس دنیا میں لعنت پیچھے لگی، یعنی پیغمبروں کی پھٹکار لگاتار ان پر لگی چلی گئی۔ لعنت سے مراد رحمت سے دور ہونا اور خیر سے ہٹا دیا جانا ہے، یعنی لعنت ان کو شاملِ حال ہوگئی۔ کیا مجال ہے کہ جب تک وہ دنیا میں ہوں، اس سے جدا ہوسکیں۔ پھر اس لعنت کے بعد قیامت کو بھی وہ ان کے پیچھے لگی رہے گی، وہاں بھی لعنت کیے جائیں گے، جس طرح کہ دنیا میں ملعون ہوئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ”تَتَابَعَتْ عَلَيْهِمْ لَعْنَتَانِ مِنَ اللّٰهِ: لَعْنَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَعْنَةٌ فِي الْآخِرَةِ“ [4] نَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ. سن رکھو کہ عاد نے اپنے رب کا انکار کیا کہ ہم اکیلے اس کی عبادت نہ کریں گے، بلکہ اپنے بتوں اور انداد اور شرکا کو بدستور پوجتے رہیں گے۔ سو یہ عاد اللہ کی رحمت سے دور ہوئے۔ دوری سے مراد ہلاکت ہے اور خیر و برکت سے دوری ہے۔ [5] یہاں پر عاد کا قصہ ختم ہوا۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿61﴾

اور (ہم نے) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)۔ اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، اسی نے تمھیں زمین سے پیدا کیا اور اسی نے تمھیں اس میں آباد کیا، چناں چہ تم اس سے بخشش مانگو، پھر اسی کی طرف توبہ کرو۔ بے شک میرا رب بہت قریب ہے، (دعائیں) قبول کرنے والا ہے (61)

---

(1) فتح البیان میں یہاں پر دو صفحات کا سقط ہے۔ (2) تفسير القرطبي (٩/ ٥٤) (3) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٤٧_ ٢٠٤٨)
(4) الدر المنثور (٤/ ٤٤٤) (5) فتح البيان (٦/ ٢٠٢_ ٢٠٤)

صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کا واقعہ:

اللہ پاک نے یہ ذکر کیا کہ ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ اس اخوت سے مراد حسب نسب کی قرابت ہے نہ کہ دینی اخوت۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو باوجود ان اقوام کے کافر ہونے کے اخ (بھائی) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جو لوگ انبیا پر ایمان لائے ہیں اور دین میں ان سے مستفید ہوئے اور ان کے ساتھ رہے پیغمبران کے بھائی تو بدرجہ اولیٰ ٹھہرے، اسلام کی یہ اخوت قرابت کی اخوت سے زیادہ بہتر اور اشرف ہے۔ اس طرح کے اطلاق سے کسی پیغمبر کی کوئی حقارت نہیں نکلتی، اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ١٠] ''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں۔'' اور اس میں شک نہیں کہ مومنین کے لفظ میں انبیا اور رسل علیہم السلام بھی داخل ہیں۔ اس اخوت سے یہ لازم نہیں آیا کہ امتی اور نبی اللہ کے نزدیک برابر ہو، جس طرح کہ جاہل لوگ اس لفظ سے یہ معنی سمجھ کر اخوت کے قائل کو مطعون کرتے ہیں اور اس پر عیب لگاتے ہیں۔

بہرحال صالح علیہ السلام نے اپنی قوم ثمود سے یہ ارشاد فرمایا کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو اور سمجھو کہ اس نے تم کو اور تمھارے باپ آدم کو اسی خاک سے پیدا کیا ہے۔ اور تم کو زمین پر آباد کیا، تم یہاں پر بستے اور کھیتی وغیرہ کرتے ہو، تم کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف رجوع کرو، کیوں کہ وہ قریب ہے اور تمھارے استغفار اور توبہ کو قبول فرمائے گا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ثمود حجر میں بستے اور رہتے تھے۔ ہود علیہ السلام کی قوم عادِ اولیٰ تھی اور صالح علیہ السلام کی قوم عادِ ثانیہ۔ امام محلی رحمہ اللہ نے سورت نجم میں اسی طرح کہا ہے۔ ① ہود اور صالح علیہما السلام کے درمیان ایک سو سال کا فاصلہ تھا اور صالح علیہ السلام کی عمر دو سو اسی برس کی ہوئی۔ ان کے مکانات شام اور مدینہ کے درمیان تھے، ان کا قصہ سورت اعراف میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ ②

غرضیکہ صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے وہی بات کہی جو ہود علیہ السلام نے عاد سے کہی تھی کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اللہ ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے، ہر آدمی صلبِ آدم علیہ السلام سے پیدا ہوا ہے اور آدم علیہ السلام خاک سے بنائے گئے ہیں۔ اللہ نے تم کو اس زمین پر بسایا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تمھاری عمر دراز کی، کیونکہ ان کی عمریں تین سو برس سے لے کر ایک ہزار برس تک کی ہوتی تھیں۔ ③ یا تم کو حکم دیا کہ گھر بناؤ، درخت لگاؤ یا تم کو اس زمین کا خلیفہ کیا، ان نعمتوں کے بدلے میں، تم کو چاہیے کہ تم بتوں کی عبادت کو چھوڑ کر صرف اللہ پاک کی پرستش کرو اور اس کے سامنے اپنے گناہوں سے توبہ کرو، کیونکہ وہ دعاؤں کو جلد قبول فرماتا ہے۔ ④

---

① تفسير الجلالين (١/ ٧٠٤) ② رقم الآية [٧٣_ ٧٩] ③ تفسير البغوي (٤/ ١٨٥) ④ فتح البيان (٦/ ٢٠٤_ ٢٠٥)

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ
مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ
يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ
رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ
تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾

انھوں نے کہا: اے صالح! تحقیق تو اس سے پہلے ہم میں امیدوں کا مرکز تھا۔ کیا تو ہمیں اس بات سے روکتا ہے کہ ہم ان کی عبادت کریں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ اور بلاشبہ جس چیز (توحید) کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، ہم اس کے متعلق ایسے شک میں ہیں جو اضطراب میں ڈالنے والا ہے 62
صالح نے کہا: اے میری قوم! بھلا بتاؤ تو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت (نبوت) دی ہو، پھر اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ (کے عذاب) سے میری مدد کون کرے گا؟ تم تو میرا نقصان ہی بڑھا رہے ہو 63

قوم کے اعتراضات اور صالح علیہ السلام کا جواب:

تجھ پر ہم کو امید تھی، یعنی ہونہار لگتا تھا کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا، تُو لگا مٹانے۔ اللہ پاک نے اس بات چیت کی خبر دی جو صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہوئی۔ قوم نے کہا کہ ہم کو امید تھی کہ تُو عقل مند ہو گا، لیکن تُو تو آبا و اجداد کی رسم و راہ کا منکر نکلا اور ہم کو تیری دعوت میں بڑا شک ہے۔ صالح علیہ السلام نے کہا کہ مجھ کو یقین ہے اس پر جو اللہ نے مجھ کو دے کر بھیجا ہے، میں اپنے رب کی طرف سے برہان پر ہوں۔ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو کوئی میری مدد نہ کر سکے گا۔ پس اگر میں تم کو حق کی طرف نہ بلاؤں اور خالص اللہ ہی کی عبادت کی طرف دعوت نہ دوں تو تم میرے کچھ کام نہ آ سکو گے اور تم سے سوائے خسارہ کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔

قوم کی امیدوں کا مرکز:

فتح البیان میں ہے کہ قوم نے کہا: ہم کو یہ امید تھی کہ تُو ہمارے درمیان ایک سردار ہو گا، جس کی اطاعت کی جائے گی، ہم تیری عقل اور رائے سے نفع اٹھائیں گے اور تیری سرداری سے ہم کو مدد ملے گی، کیونکہ ہم تجھ میں رشد و سداد کے خیالات دیکھتے ہیں، یہ اس لیے کہا کہ صالح علیہ السلام انہی کی قوم اور قبیلے کے ایک شخص تھے اور کمزور کی مدد کرتے تھے اور فقیر سے مالی تعاون کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ صالح علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف بلایا تو ان کی امیدیں منقطع ہو

گئیں۔ انھوں نے ان کی دعوت اور رسالت کا انکار کیا اور کہا کہ کیا تم ہم کو منع کرتے ہو کہ جس کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں، اس کو ہم نہ پوجیں۔

تقلید پر جمے رہنا خسارہ ہے:

یہ حالِ ماضیہ کی حکایت ہے، موجودہ صورتِ حال میں پیش کرنے کے لیے انھوں نے تقلید پر جمود اختیار کیا اور تحقیق کرنے میں اپنے شک کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم کو صرف اللہ کی عبادت کرنے میں ریبت ہے۔ ریبت کہتے ہیں نفس کی بے چینی کو اور انتفاء طمانیت کو۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ظاہری حجت اور صحیح دلیل پر ہوں اور میرے پاس اُس کی طرف سے رحمت آئی ہے، یعنی نبوت اور یہ امورِ رسالت اور توحیدِ خالص اگرچہ حقیقی طور پر واقع ہو چکے تھے، لیکن ان کو کلمۂ شک کے ساتھ ادا کیا، مخاطب لوگوں کے حال کے مطابق، کیونکہ انھیں شک تھا اور کہا کہ اگر میں رسالت کی تبلیغ میں اللہ کی نافرمانی کروں اور اس کی تبلیغ میں، جو مجھ پر واجب ہے، میں کاہل اور سست ہو جاؤں اور تمھارا لحاظ اور مراقبہ نہ کروں (تم سے امیدیں لگاؤں اور تمھارا خیال کروں) تو میری مدد کون کرے گا۔ اور کون مجھے اللہ کے عذاب سے چھڑائے گا، کیونکہ تم سے خسارہ کے علاوہ اور کیا میرے ہاتھ آئے گا۔تم میرے عمل کو باطل کر کے مجھے خاسر اور زیاں کار بنانا چاہتے ہو، تاکہ میں اللہ کی سزا پانے والا ہو جاؤں۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تخسیر سے مراد گمراہی اور بھلائی سے دور ہو جانا ہے۔[1] یا تم جو اپنے آبائی دین کی حجت لاتے ہو بغیر بصیرت کے، اس سے سوائے خسارے کے اور کیا حاصل ہو گا۔ امام مجاہد اور عطا خراسانی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تم زیادہ نہیں ہوتے مگر خسارہ میں۔[2] معلوم ہوا کہ تقلید پر جمے رہنا خسارے کا باعث ہے اور تقلید اہلِ کفر وشرک کی قدیم عادت ہے اور انبیا علیہم السلام ہمیشہ اس سے منع کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے کہ اللہ کے حکم کی نافرمانی کی صورت میں کسی سزا میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

انبیاء اللہ کے عاجز بندے:

قرآن پاک میں جابجا انبیا کا اللہ سے خوف کرنا، اس کے باوجود کہ انھیں معلوم تھا کہ وہ نبی اور رسول ہیں، آیا ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ انبیا اللہ کے عاجز بندے ہیں اور اس سے زندگی کے زمانے میں امید پر خوف کا غلبہ ثابت ہوتا ہے۔ اب جاہلوں کا یہ خیال کہ فلاں پیر فقیر کے مرید بہرحال بخشے جاتے ہیں اور منکر ونکیر یا عرش کے فرشتے کسی مجرم سے کسی پیر کی مریدی کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں کر سکتے، اللہ کی کتاب کے بالکل خلاف ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٩/ ٥٩) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٣٧١) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٤٩) فتح البيان (٦/ ٢٠٥۔ ٢٠٦)

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ
وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ
تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾ كَاَنْ
لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے بطور نشانی ہے، لہٰذا تم اسے چھوڑ دو کہ کھاتی (چرتی) پھرے اللہ کی زمین میں اور تم اسے برائی سے نہ چھونا، ورنہ تمھیں جلد عذاب پکڑ لے گا (64) پھر انھوں نے اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں، تو (صالح نے) کہا: تم اپنے گھروں میں تین دن فائدہ اُٹھا لو۔ یہ ایسا وعدہ ہے جس میں جھوٹ نہیں بولا گیا (65) پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا تو ہم نے صالح اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے نجات دی، اور اس (قیامت کے) دن کی رسوائی سے بھی (نجات دی)، بے شک آپ کا رب، وہی ہے نہایت قوی، بہت زبردست (66) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں زبردست چیخ نے آ پکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (67) جیسے کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے۔ آگاہ رہو! بے شک ثمود (قوم) نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سن لو! پھٹکار (لعنت) ہے ثمود کے لیے (68)

قوم کا معجزہ طلب کرنا:

صالح علیہ السلام سے قوم نے معجزہ مانگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سے پتھر میں سے اونٹنی نکالی، اسی وقت اس نے بچہ دیا اور وہ اسی وقت ماں کے برابر ہو گیا۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تک اس کا خیال رکھتے رہو گے، تب تک دنیا کا عذاب نہ ہو گا۔ جہاں وہ کھانے پینے کے لیے جاتی، سب جانور بھاگ جاتے اور کوئی آدمی اس کو نہ ہانکتا، لیکن انھوں نے اونٹنی کی بابت ہدایت کا خیال نہ رکھا، بلکہ اس کی کوچیں کاٹ ڈالیں تو ان پر عذاب آ گیا، اس طرح کہ رات کو پڑے سوتے تھے، فرشتے نے چنگھاڑ ماری، سب کے جگر پھٹ گئے۔ اس مقام کی تفسیر سورت اعراف میں گزر چکی ہے،[1] اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

[1] رقم الآیة [۷۳۔ ۷۹]

اونٹنی کا پتھر سے نکلنا:

فتح البیان میں ہے کہ یہ ایک کھلا معجزہ تھا، اس کا ذکر سورت اعراف میں ہو چکا ہے۔[1] اس ناقہ کو ناقۃ اللہ اس لیے کہا کہ اللہ ہی نے اس کو ثمود کی فرمایش پر ایک پہاڑ کے اندر سے نکالا تھا یا ایک ٹھوس پتھر سے۔ یہ اضافت اس کی بزرگی کے لیے ہے، جیسے: بیت اللہ اور عبداللہ۔ صالح علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ تم اس کو چھوڑ دو، یہ اللہ کی زمین میں جہاں چاہے چرتی پھرے، اس کا چارہ وغیرہ مہیا کرنے کی تکلیف تم پر نہیں ہے۔ یہ ان کے الزام کا تتمہ (آخری شے) تھا۔

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی چارہ کھائے، پانی پیے، تم اس کو کسی طرح مت ستانا، یہ عام ممانعت تھی، اگر تم اس کو کبھی بھی چھیڑو گے، یعنی قتل وغیرہ کرو گے تو بہت جلد تم کو عذابِ قریب پکڑ لے گا، قریب سے مراد عذابِ دنیا ہے۔ انھوں نے ایک نہ سنی، بلکہ اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ قدار نام ایک شخص تھا، بڑا بد بخت، اس نے یہ حرکت بے برکت کی۔ تب صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تم اپنے گھروں یا شہروں میں اور ٹھکانوں میں تین دن رہ لو، کیونکہ عذاب نازل ہونے والا ہے۔ حیات کو تمتع کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے، اس لیے کہ زندہ آدمی اپنے حواس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اونٹنی کی کوچیں کاٹنا:

کہتے ہیں کہ بدھ کے روز اونٹنی کو عقر کیا (کوچیں کاٹیں)، جمعرات جمعہ اور ہفتہ تک سزا تھمی، پھر اتوار کو عذاب آیا، یہ تین دن تک فائدہ اٹھانے کا سچا وعدہ تھا۔ جب عذاب آیا تو صالح علیہ السلام اور مومنین کو اللہ نے اپنی رحمتِ عظیم سے بچا لیا۔ قصہ ہود علیہ السلام میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ صالح علیہ السلام پر رحمت ان کی نبوت کی وجہ سے ہوئی اور ان کے ساتھ والوں پر ایمان کے سبب سے۔ اس دن کی رسوائی سے جس دن کہ وہ صیحہ (چنگھاڑ) سے ہلاک ہوئے، اللہ نے ان کو نجات بخشی۔ صَیْحہ (چیخ) کا نام خِزْيٌ اس لیے رکھا کہ اس میں کافروں کی رسوائی ہوئی۔ خِزْيٌ سے مراد ذلت اور توہین ہے یا مراد قیامت کے دن کا عذاب ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ بے شک اللہ قادر اور غالب ہے، اس کو کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی اور یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے۔ لفظ ﴿يَوْمِئِذٍ﴾ پر قصہ تمام ہوا۔

عذاب:

عقرِ ناقہ (اونٹنی کی کوچیں کاٹنے) سے چوتھے دن ظالموں کو چنگھاڑ نے پکڑ لیا، وہ سب مر کر رہ گئے۔ صیحہ سے مراد زور سے آواز کرنا ہے، یہ آواز جبریل علیہ السلام کی تھی یا آسمان سے آئی، جس سے ان کے دل پارہ پارہ ہو گئے۔ سورت اعراف میں: ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ﴾ [الأعراف: ۷۸] ''پھر انھیں زلزلے نے آلیا۔'' آیا ہے، شاید یہ زلزلہ چنگھاڑ کے بعد واقع ہوا ہو۔ وہ سب اپنے گھروں میں مردے، بچھاڑے ہوئے، ہلاک اور ساقط الوجود ہو کر رہ گئے۔

---

[1] رقم الآية [۷۳۔ ۷۹]

جس طرح کوئی پرندہ زمین پر پنجے لگا کر جم جاتا ہے، اسی طرح خاک میں مل گئے۔ گویا وہ کبھی اپنے گھروں یا شہروں میں رہے بسے ہی نہ تھے اور نہ ہی کچھ آباد کیا تھا اور نہ کوئی عیش پایا تھا۔ سن لو ثمود نے اپنے رب کا کفر کیا، سو دور ہوئے ثمود، یعنی اللہ کی رحمت سے۔ یہ قصہ سورت اعراف میں بھی آیا ہے۔ دونوں جگہ کے ملانے سے زیادہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔[1]

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿٧٣﴾

اور البتہ تحقیق ہمارے قاصد (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔ انھوں نے کہا: (آپ پر) سلام ہو۔ ابراہیم نے کہا: (تم پر بھی) سلام ہو۔ پھر دیر کیے بغیر وہ ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا (69) پھر جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس (بچھڑے) کی طرف نہیں پہنچتے تو انھیں اجنبی سمجھا اور (دل میں) ان سے خوف محسوس کیا۔ انھوں نے کہا: (ہم سے) نہ ڈر، بے شک ہمیں تو قومِ لوط کی طرف بھیجا گیا ہے (70) اور ابراہیم کی بیوی (قریب) کھڑی تھی تو وہ ہنس پڑی، پھر ہم نے اسے اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی (71) وہ بولی: ہائے ہائے! کیا (اب) میں بچہ جنوں گی، حالاں کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے؟ بے شک یہ تو بہت ہی عجیب چیز ہے (72) انھوں نے کہا: کیا تو اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہے! اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں تم پر اے اہلِ بیت! بے شک اللہ قابلِ تعریف ہے، نہایت بزرگی والا (73)

فرشتوں کا ابراہیم کے پاس آنا اور اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری دینا:

وہ لوگ جو ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے وہ کئی شخص فرشتے تھے، قومِ لوط کے پاس ہلاک کرنے والا عذاب لے کر

[1] فتح البیان (٦/ ٢٠٧۔ ٢٠٩)

جا رہے تھے، پہلے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور بیٹے کی بشارت دی، ان کی بیوی کا بیٹا نہ تھا۔ پہلے ابراہیم علیہ السلام نے نہ پہچانا کہ فرشتے ہیں، کھانا لے آئے، ان کے ساتھ جو عذاب تھا اس کا ڈر پڑا ان کے دل پر۔ اس ڈر کے دور ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے خوشی پر اور خوشی سنائی۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر آئے، کسی نے کہا: اسحاق علیہ السلام کی اور کسی نے کہا: قومِ لوط کی ہلاکت کی تو انھوں نے سلام کیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: سلام ہے، یعنی تم پر۔ علما بیان کرتے ہیں کہ یہ ان کی تحیت سے بہتر ہے، اس لیے کہ رفع ثبوت اور دوام پر دلیل ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی:

پھر ابراہیم علیہ السلام نے دیر نہ کی، ایک بچھڑا بھنا ہوا لے کر آئے، یعنی جلد گئے اور ان کی ضیافت کے لیے عجل لائے۔ عجل کہتے ہیں جوان گائے (بچھڑے) کو۔ حنیذ بھنے ہوئے کو کہتے ہیں، جس کو گرم پتھر پر کباب بنائیں۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کے قول کا معنی ہے۔[1] جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں پہنچتے تو جی میں ڈرے کہ یہ کیسے مہمان ہیں جو کھانا نہیں کھاتے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے جب فرشتوں کو قومِ لوط کی طرف بھیجا تو وہ خوب صورت جوانوں کی صورت چل کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس نازل ہوئے، انھوں نے ان کو جلیل القدر دیکھ کر جلدی سے اپنے گھر والوں کے پاس آ کر ایک موٹا بچھڑا ذبح کیا اور گرم پتھر پر پسندے، یعنی کباب بنائے اور ان کو فرشتوں کے پاس لے کر آئے اور ان کے ساتھ کھانے کو بیٹھے۔ سارہ ان کی خدمت کے لیے کھڑی ہوئیں۔ یہ مطلب ہے ﴿ وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ ﴾ کا اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی ایسے ہی ہے اور ابراہیم علیہ السلام مہمان خانہ میں بیٹھے تھے۔

جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے طعام رکھا تو انھوں نے کہا: اے ابراہیم! ہم کھانا بے قیمت کے نہیں کھاتے، کہا: اس کھانے کی قیمت ہے، کہا: کیا قیمت ہے؟ کہا: اس کے اول میں اللہ کا نام ذکر کرو اور اس کے آخر میں اللہ کی حمد کرو۔ جبریل علیہ السلام نے میکائیل علیہ السلام کی طرف دیکھا، کہا: حق ہے کہ ایسے شخص کو اللہ اپنا خلیل ٹھہرائے۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو نہیں کھاتے تو دل میں ڈرے۔ سارہ نے نظر کی کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کی عزت کی اور وہ خدمت کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں تو ہنس پڑیں اور کہا: ہمارے مہمان عجب طرح کے ہیں کہ ہم تو بذاتِ خود ان کی خدمت کے لیے حاضر ہیں، تاکہ ان کی خاطر داری کریں اور یہ ہمارا کھانا نہیں کھاتے۔[2] فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: تُو ہم سے مت ڈر کہ ہم فرشتے ہیں اور قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں کہ ان کو ہلاک کریں، اس پر سارہ ہنسیں اور

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٨٤_ ٣٨٦) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٣٨٩_ ٣٩٠)

قومِ مذکور کی ہلاکت پر خوش ہوئیں، اس لیے ان کو یہ بدلہ ملا کہ اولاد کی بشارت دی گئی، ناامیدی کے بعد۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارہ نے تعجب کیا اور ہنسیں کہ جس قوم پر عذاب آنے والا ہے وہ قوم غفلت میں ہے۔[1]

ذبیح اسماعیل اور مُبشَّر اسحاق:

اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام تھے، اس لیے کہ بشارت اسحاق علیہ السلام کی دی تھی اور ان سے یعقوب کا عنقریب پیدا ہونا بتایا تھا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ بڑی خرابی کی بات ہے کہ میں بڑھیا اور میرا خاوند بوڑھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ تعجب کے وقت ایسی بات کہتی ہیں۔ فرشتوں نے کہا: تُو اللہ کے حکم سے کیا تعجب کرتی ہے! وہ جب کسی شے کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے: ہو جا! وہ چیز ہو جاتی ہے۔ سو تُو کچھ اچنبھا نہ کر، اگرچہ تُو بڑھیا ہے بانجھ اور تیرا شوہر ایک بڑا بوڑھا آدمی ہے، کیونکہ اللہ قادر ہے جو چاہے سو کرے۔ تم پر اے اہلِ بیت اللہ کی رحمت اور برکت ہے، اللہ حمید اور مجید ہے۔

ابراہیم کا واقعہ لوط علیہ السلام کے واقعے کے لیے بطور تمہید:

فتح البیان میں ہے کہ یہاں سے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ شروع ہوا، لیکن یہ قصہ لوط علیہ السلام کی تمہید کے طور پر، نہ کہ مستقل طور پر۔ اسی لیے پہلے قصوں کے اسلوب پر ذکر نہیں فرمایا کہ ''أَرْسَلْنَا إِبْرَاهِيمَ إِلَىٰ كَذَا'' ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو پچھتر سال کی ہوئی، ان کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان دو ہزار چھے سو چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ اور ان کے گرامی فرزند اسحاق علیہ السلام کی عمر ایک سو اسی برس کی ہوئی اور یعقوب بن اسحاق علیہما السلام ایک سو پینتالیس برس زندہ رہے، لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، لوط علیہ السلام کی قوم کے گاؤں شام کے گرد و نواح میں تھے اور ابراہیم علیہ السلام بلادِ فلسطین میں تھے۔ جب اللہ نے قومِ لوط پر عذاب کرنے کے لیے فرشتے بھیجے، ان کا گزر ابراہیم علیہ السلام پر ہوا، وہ ان کے گھر اترے، ان کے پاس جو کوئی آتا، یہ اس کی مہمانی کرتے، ان ملائکہ کا آنا یہی بشارت پہنچانے کے لیے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے جانا کہ یہ مہمان ہیں، وہ جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام تھے۔[2] (قاله عطاء)

میں کہتا ہوں کہ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ انبیا علیہم السلام کو علمِ غیب نہیں ہوتا اور بشریت کی صفات ان میں بھی موجود رہتی ہیں، کیونکہ اگر علمِ غیب ہوتا تو اول اول ہی معلوم کر لیتے کہ یہ فرشتے ہیں نہ کہ مہمان، اور اگر آپ میں بشریت نہ ہوتی تو دل میں ان فرشتوں سے ڈر نہ آتا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سب نو فرشتے تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گیارہ تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بارہ تھے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام تھے اور ان کے ساتھ سات فرشتے اور تھے۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٣٩٠) [2] تفسير البغوي (٤/ ١٨٧) [3] تفسير البغوي (٤/ ١٨٧)

سلام کا جواب:

لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ انھوں نے کہا: "سَلَامًا" یعنی "سَلَّمْنَا عَلَيْكَ سَلَامًا" یہ ان کی تحیت تھی جو کہ ان سے واقع ہوئی، یعنی لفظ سَلَامًا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: سَلَامٌ، یعنی تمھارا امر سلام ہے، یا تم پر سلام ہے۔ یہ تحیت جواب ہے ان کی تحیت کا۔ ملائکہ کی تحیت جملہ فعلیہ کے ساتھ تھی اور ان کی تحیت جملہ اسمیہ کے ساتھ ہوئی اور یہ بات معلوم ہے کہ اسمیہ جملہ فعلیہ جملے سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے تو ابراہیم علیہ السلام کی تحیت ملائکہ کی تحیت سے بہتر ٹھہری۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَآ ﴾ [النساء: ٨٦] "تو تم اس سے اچھا جواب دو۔"

مہمانوں سے خوف محسوس کرنا:

﴿ حَنِيْذٍ ﴾ مطلق بھنے ہوئے کو کہتے ہیں یا وہ بریان جو گرم پتھر سے کیا ہو اور آگ نے اس کو نہ چھوا ہو۔ یہ کام اہلِ بادیہ (جنگل یا صحرا میں رہنے والے) کا ہوتا ہے کہ وہ گرم پتھر سے گوشت بھون لیتے ہیں۔ یا ﴿ حَنِيْذٍ ﴾ بہ معنی موٹے تازے کے ہے یا بہ معنی سَمِيْطٌ یا نَضِيْج (پکا ہوا، پختہ) ہے۔ عجل اس لیے لائے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے اکثر اموال یہی بیل اور گائے تھے۔ انھوں نے ملائکہ کو اوپرا اس وجہ سے سمجھا کہ ان کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی مہمان آئے اور وہ میزبان کا کھانا نہ کھائے تو یہ گمان کرتے تھے کہ وہ کسی بُرے ارادے سے آیا ہے اور کوئی خیر نہیں لایا ہے۔[1] (قاله قتادة)

سورت ذاریات میں فرمایا ہے: ﴿ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴾ [الحجر: ٦٢] یعنی تم لوگ تو اجنبی ہو، جن کو میں نہیں پہچانتا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں کہی تھی۔ انکار کی وجہ یہ تھی کہ یہ یکا یک بغیر اجازت لیے گھر میں آ گئے تھے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے سلام کرنے سے اُس زمانے میں اوپرے سمجھا،[1] کیونکہ اس سرزمین میں سلام کرنے کا رواج نہیں تھا اور اپنے جی میں خوف اور ڈر محسوس کیا۔ فرشتوں نے کہا کہ تم مت ڈرو، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے ان کا خوف ظاہر ہو، بلکہ دل میں ڈرے تھے، شاید فرشتوں نے کچھ نشانیاں اور علامتیں ایسی دیکھی ہوں جن سے وہ ان کا خوف زدہ ہونا سمجھے، جیسے چہرے پر خوف کا اثر ظاہر ہونا یا اس احساس کے بعد کوئی ڈر کا کلمہ کہہ دیا ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورت حجر میں فرمایا ہے: ﴿ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴾ [الحجر: ٥٢] "بے شک ہم تم سے ڈرتے ہیں۔" اور اس جگہ اس کا ذکر بطور اکتفا کے نہیں فرمایا۔

پھر فرشتوں نے ان کا خوف دور کرنے کے لیے یہ بیان کیا کہ ہم خاص کر قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ سب سے پہلے لوط علیہ السلام ہی ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ ان کے باپ کا نام ہاران تھا اور وہ ابراہیم علیہ السلام کے بھائی تھے اور ممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کوئی ایسی بات کہی ہو جس کا یہ جواب ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالَ فَمَا

---

[1] تفسير البغوي (٧/ ٣٧٦)

خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴾ [الذاریات: ۳۱۔ ۳۲] ’’ابراہیم نے کہا: اچھا تو تمھارا مقصد کیا ہے، اے قاصدو! (فرشتو؟) انھوں نے کہا: بلاشبہہ ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔‘‘

بیوی کا ہنسنا اور خوش خبری:

ان کی بیوی سارہ دختر ہارون بن ناحورا بنت عم ابراہیم علیہما السلام وہاں اس گفتگو کے وقت پس پردہ کھڑی ہوئی بات سنتی تھیں، یا ملائکہ کی خدمت کے واسطے کھڑی تھیں اور ابراہیم علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یہ بات سن کر ہنس پڑیں۔ ضَحِكَ سے اس جگہ مراد یہی معروف ہنسی ہے جو تعجب اور خوشی سے ہوتی ہے جس طرح کہ جمہور نے کہا ہے اور اصل ضحک انبساط وجہ (چہرے کا کھِل اٹھنا) ہے خوشی سے جو دل کو حاصل ہوتی ہے اور چونکہ ہنستے وقت دانت کھل جاتے ہیں اس لیے انسان کے اگلے دانتوں کا نام ضواحک رکھا گیا ہے اور ضحک کا استعمال صرف سرور اور صرف تعجب میں بھی آتا ہے۔ اسی پر اکثر مفسرین ہیں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ فلاں شخص خندہ پیشانی والا ہے۔

امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ضحک سے مراد حیض ہے، مگر بعض اہلِ لغت نے اس کا انکار کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہنسنا تعجب سے تھا، قومِ لوط کی غفلت پر کہ عذاب آیا ہے اور وہ غافل ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے نہ کھانے پر ہنسیں۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ ہنسنا ابراہیم علیہ السلام کے ڈر پر تھا کہ مہمان تین تھے اور یہ اپنے نوکر چاکر اور خواص کے درمیان تھے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ خوف کے زائل ہونے پر ہنسیں، جب کہ انھوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا: ﴿ لَا تَخَفْ ﴾۔ کسی نے کہا ہے کہ بشارت کے سرور سے ہنسیں، کسی نے کہا ہے کہ اس بات پر کہ بڑھاپے میں بچہ ہوگا! اس کے علاوہ اور بہت سے اقوال ہیں، جن کے ذکر میں کچھ فائدہ نہیں۔ اللہ ہی جانے کہ وہ کس سبب سے ہنسیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سارہ کو اٹھانوے برس کی عمر میں حیض آیا۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابراہیم اس وقت سو برس کے تھے۔[3] ظاہر یہ ہے کہ یہ بشارت ہنسنے کے بعد تھی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبارت میں تقدیم تاخیر ہے، یعنی ’’فَبَشَّرْنَاهَا فَضَحِكَتْ سُرُوْراً بِالْوَلَدِ‘‘[4] امام اسحاق بشارت کے سال بھر بعد پیدا ہوئے، ان کی ولادت اسماعیل علیہ السلام سے چودہ سال بعد ہوئی۔ اسحاق علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے، اس جگہ بشارت سارہ کو دی اور آیتِ کریمہ ﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴾ [الصافات: ۱۰۱] ’’چناں چہ ہم نے اسے بہت حلم والے لڑکے کی بشارت دی۔‘‘ ﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [الذاریات: ۲۸] ’’اور انھوں نے اسے بڑے ذی علم بیٹے کی بشارت دی۔‘‘ میں ابراہیم علیہ السلام کو، اس لیے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک بشارت کا مستحق تھا، کیونکہ اسحاق دونوں سے مل کر پیدا ہوئے۔

---

[1] تفسیر البغوي (٤/ ١٨٨۔ ١٨٩)
[2] الدر المنثور (٤/ ٤٥١)
[3] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٩٢)
[4] معاني القرآن للفراء (٢/ ١٧١)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعقوب ولد الولد تھے۔ اس میں یہ خوش خبری ہے کہ سارہ اتنا زندہ رہیں گی کہ پوتا دیکھیں گی، سو انھوں نے یعقوب علیہ السلام کو دیکھا۔ ﴿ یٰوَیْلَتٰٓی ﴾ کا لفظ سارہ نے اپنے لیے کوئی بددعا کے طور پر نہیں کہا، لیکن یہ ایک کلمہ ہے کہ اکثر عورتوں کی زبان پر تعجب کرنے کے وقت جاری ہوتا ہے، پھر اس کا اظہار ہر قطعی امر میں ہوتا ہے اور یہ استفہام کہ کیا میں بڑھیا ہو کر جنوں گی! تعجب کے طریقے پر تھا۔ اپنے شوہر ابراہیم علیہ السلام کو شیخ کہا، کیونکہ اس جیسے بوڑھے مرد سے عورتیں حاملہ نہیں ہو سکتیں۔

بعل کہتے ہیں غیر پر بلند ہونے والے کو، شوہر عورت پر بلند ہوتا ہے اور اُس کا کام کرتا ہے اس لیے اس کا نام بعل ہوا۔ کہتے ہیں ابراہیم علیہ السلام ایک سو بیس برس کے تھے اور سارہ بانوے برس کی یا نوے برس کی تھیں اور یہ خوش خبری سارہ کو دی گئی تھی جو ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں، ورنہ ہاجرہ کنیز سے اسماعیل پیدا ہو چکے تھے۔ سارہ کو تمنا تھی کہ کوئی بیٹا ان سے بھی پیدا ہو، لیکن بڑی عمر کی وجہ سے ناامید ہو چکی تھیں، اللہ نے فرشتوں کی زبان سے ان کو بشارت دی، اس بشارت کے سال بھر بعد بچہ پیدا ہوا۔ سارہ نے اس بشارت پر کہا تھا کہ یہ ایک عجیب بات ہے، سو یہ تعجب کوئی اللہ کی قدرت کے انکار کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اس بات پر تھا کہ عام طور پر اس عمر میں اولاد پیدا نہیں ہوتی، اس پر فرشتوں نے کہا کہ اللہ کی قضا و قدر سے کچھ تعجب نہ کرو، اس پر کوئی چیز محال نہیں ہے۔ ملائکہ کا سارہ پر ان کے تعجب کی وجہ سے انکار کرنا اس لیے تھا کہ خاندانِ نبوت سے ہو کر کس طرح انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت پر تعجب کیا اور اس خارقِ عادت (معجزے) کو نہ جانا۔ اسی لیے کہا کہ اے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت اور برکت ہے، اس کی رحمت ہر چیز کی گنجایش کر دیتی ہے۔

اللہ کی برکتیں:

برکات سے مراد بڑھنے والی اور کثرت کرنے والی خیرات و برکات ہیں، ہر بارے میں ان سے ایک اولاد بخشا ہے۔ برکت نمو و زیادت کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ رحمت سے نبوت مراد ہے اور برکات سے اسباطِ بنی اسرائیل (اولاد، پوتے، نواسے) کیونکہ ان میں انبیا تھے، وہ سب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ لوگوں کی بیویاں ان کے اہلِ بیت میں سے ہی ہوتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منع کرتے تھے کہ تحیت کے جواب میں علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، سے زیادہ نہ کہا جائے اور اس آیت کو پڑھتے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔[1] اللہ حمید ہے، یعنی وہ کام کرتا ہے جس سے بندوں پر حمد کرنا واجب آتا ہے۔ کثرت کے طور پر مجید ہے۔ یعنی بندوں پر کثرت سے احسان کرتا ہے اور بہت سی بھلائیاں عطا فرماتا ہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجید بمعنی واسع کریم ہے۔ مَجد کی اصل عربی زبان میں سعت (فراخی) ہے اور بعض نے کہا ہے کہ شرف اور کرم والے کے معنی میں آتا ہے۔[2]

---

[1] شعب الإیمان (٦/ ٤٥٥۔ ٤٥٦) [2] فتح البیان (٦/ ٢٠٩۔ ٢١٥)

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

پھر جب ابراہیم سے خوف چلا گیا اور اس کے پاس خوش خبری آ گئی تو وہ ہم سے قومِ لوط کی بابت جھگڑنے لگا (74) بے شک ابراہیم بہت بردبار، بہت زیادہ آہ و زاری کرنے والا اور (ہماری طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا (75) (ہم نے کہا:) اے ابراہیم! اس (بات) کو جانے دو، بے شک تمھارے رب کا حکم آ پہنچا ہے اور بے شک ان لوگوں پر (ایسا) عذاب آنے والا ہے جو (ان سے) پھیرا نہیں جائے گا (76)

قومِ لوط کے حوالے سے ابراہیم علیہ السلام کا بحث کرنا:

لوط علیہ السلام کو اُس قوم میں انھی (ابراہیم علیہ السلام) نے بھیجا تھا۔ جب سنا کہ ان پر عذاب آیا، ترس کھا کر سفارش کرنے لگے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ جب جبریل علیہ السلام اور ان کے ہمراہیوں نے کہا کہ ہم اس گاؤں کو ہلاک کریں گے تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم ایسے گاؤں کو برباد کرتے ہو جس میں تین سو مومن ہیں؟ کہا: نہیں۔ کہا: ایسے قریے کو ہلاک کرو گے جس میں چالیس مومن ہیں؟ کہا: نہیں۔ کہا: تیس مومن ہوں جب بھی ہلاک کر دو گے؟ کہا: نہیں، یہاں تک کہ پانچ کا ذکر کیا، کہا: نہیں۔ کہا: بھلا یہ بتاؤ کہ اگر اس میں ایک ہی مرد مسلمان ہو تو کیا تم اس گاؤں کو ہلاک کرو گے؟ کہا: نہیں، تب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اس قریے میں تو لوط ہے۔ کہا: ہم جانتے ہیں، اس کو جو وہاں ہے، ہم لوط علیہ السلام کو اور اس کے گھر والوں کو بچا دیں گے، مگر اس کی عورت۔ تب ابراہیم علیہ السلام خاموش ہو گئے اور ان کا نفس مطمئن ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اسی کے قریب کہا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی اعلیٰ صفات:

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بھلا اگر اس قریے میں ایک ہی مومن ہو؟ کہا: نہیں۔ تب فرمایا: بھلا اگر وہاں لوط ہو تو کیا اس کے سبب سے عذاب دور نہ ہو گا؟ فرشتوں نے کہا: ﴿ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ﴾ [العنكبوت: ٣٢] ''ہم خوب جانتے ہیں جو کوئی اس میں ہے۔''[1] اللہ پاک نے اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی مدح کی کہ وہ حلیم یعنی بردبار اور اوّاہ یعنی رقیق القلب اور منیب یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ یعنی وہ ان اوصافِ جمیلہ و اخلاقِ حمیدہ اور خصالِ پسندیدہ کے ساتھ متصف ہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٠٣۔ ٤٠٥)

اللہ کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے:

پھر کہا کہ اے ابراہیم! ان کے حق میں قضا و قدر جاری ہو چکی ہے، تم یہ خیال چھوڑ دو۔ معلوم ہوا کہ انبیا علیہم السلام کے بھی بعض خیالات اور اقتراحات منظور نہیں ہوتے اور اللہ کے اذن کے سوا ان کی سفارش جاری نہیں ہو سکتی اور وہ اللہ کے حکم اور مرضی (مشیّت) کے پابند ہوتے ہیں، پھر کسی اور ولی، پیر و فقیر کی کیا ہستی ہے کہ وہ جو چاہے سو تصرف کرے یا تصرف اور غیب دانی کا دعویٰ کرے۔ یا کسی مرید اور معتقد کو اللہ کی مرضی کے بغیر دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچا لے۔ یا محض اس کی وجاہت سے اس کا کوئی مرید باوجود جرائم کے مواخذۂ الٰہی سے بچ جائے۔ جاہلوں کا پیروں کے بارے میں اس قسم کا عقیدہ خالص شرک ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ رَوْع بمعنی خوف ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے بمعنی فرق[1] یا فزع (گھبراہٹ) ہے۔ "بُشریٰ" سے مراد بشارتِ ولد یا قول ﴿لَا تَخَفْ﴾ ہے، معنی یہ ہوئے کہ جب جی کا ڈر دور ہو گیا اور بشارت ملی تو ابراہیم علیہ السلام کو اللہ پر خطاب کی جرأت ہوئی، وہ ملائکہ سے جھگڑنے لگے، وہ جھگڑا یہی تھا کہ اس قریہ میں پچاس یا چالیس یا بیس یا دس یا پانچ یا ایک ہی مسلمان ہو تب بھی کیا تم اس کو برباد کر دو گے؟ مجادلہ کے معنی اس جگہ کلام اور سوال ہے، اس لیے کہ بندے کو مقدور نہیں ہے کہ اپنے رب سے جھگڑا کر سکے، اسی لیے جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ "مَعْنَاهُ يُجَادِلُ رُسُلَنَا."

پھر اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کی کہ وہ حلیم ہیں نہ عجول فی الامور ہیں (معاملات میں جلد بازی کرنے والے) اور کثیر التأوّہ ہیں (زیادہ نرمی والے) یا رحیم ہیں۔ ﴿مُنِيْبٌ﴾ وہ ہے جو اللہ کی اطاعت پر جھک پڑے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منیب بمعنی مخلص ہے۔[2] جمہور نے کہا ہے کہ یہ مجادلہ فرشتوں کے ساتھ تھا نہ کہ رب کے ساتھ۔ مقصود یہ ہے کہ اس مجادلے کا باعث ان کے دل کی نرمی اور فرطِ رحمت تھی۔ چاہا کہ اس قوم کے عذاب میں تاخیر ہو، شاید وہ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر اور گناہوں سے رجوع کر لیں۔ فرشتوں نے کہا: اے ابراہیم! تم اس کلام سے باز رہو اور اس جدال کو ترک کرو کہ اس امر سے فراغت ہو چکی ہے، قلم سوکھ گیا اور قضایا ثابت ہو چکی اور تیرے رب کا حکم آ گیا، اب یہ عذاب واپس ہونے والا نہیں ہے، نہ یہ مقام جھگڑے کا ہے، یہ عذاب تو لامحالہ واقع اور نازل ہی ہو گا۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٠٢) [2] الدر المنثور (٤/ ٤٥٥) [3] فتح البيان (٦/ ٢١٦۔ ٢١٧)

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝٧٧ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝٧٨ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝٧٩

اور جب ہمارے قاصد (فرشتے) لوط کے پاس آئے تو وہ ان کی وجہ سے غمگین ہوا اور ان سے دل میں تنگ ہوا اور بولا: یہ انتہائی سخت دن ہے⑰ اور اس کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اس کے پاس آئے، جبکہ وہ پہلے ہی سے برے عمل کرتے تھے۔ اس نے کہا: اے میری قوم! یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں (ان سے نکاح کرلو)، یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں؟⑱ انھوں نے کہا: یقیناً تو جانتا ہے کہ ہمارے لیے تیری (قوم کی) بیٹیوں میں کوئی حق (دلچسپی) نہیں اور بلاشبہ تو یقیناً جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں⑲

فرشتوں کا لوط علیہ السلام کے پاس آنا، ان کی پریشانی اور قوم کی بدکرداری:

یہ فرشتے لڑکے بن کر گئے اور لوط علیہ السلام کو اس قوم کی عادت معلوم تھی، اس سے خفا ہوئے کہ لڑائی کرنی پڑی۔ فرشتے مہمان بن کر ان کے گھر اترے اور قوم دیکھ کر دوڑ پڑی، یہ ان کو بچانے کے لیے اپنی بیٹیاں بیاہ دینے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن وہ کب مانتے تھے۔ اس وقت کافر سے بیاہ دینا منع نہیں تھا۔ اللہ پاک نے خبر دی کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کو جتلا کر وہاں سے روانہ ہوئے اور کہہ گئے کہ آج کی رات لوط علیہ السلام کی قوم ہلاک ہو جائے گی۔ پھر لوط علیہ السلام کے پاس آئے، ان کی زمین میں یا ان کے گھر میں، بہت خوب صورت شکل میں ٹھہرے، جیسے کوئی جوانی میں نہایت خوش شکل ہو، یہ اللہ کی طرف سے امتحان تھا اور اس کی حکمتِ بالغہ تھی۔ ان کا اس حسن و جمال کے ساتھ آنا لوط علیہ السلام کو برا لگا اور دل تنگ ہوئے اور خیال کیا کہ اگر میں ان کی مہمانی نہیں کرتا ہوں تو قوم میں سے کوئی اور شخص ان کو اپنا مہمان بنا لے گا اور ان کے ساتھ برائی کرے گا، پھر کہا کہ یہ دن آج کا بہت دشوار ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ آج کے دن کی آزمائش سخت ہے۔[1] اس لیے کہ وہ جان گئے کہ مجھے قوم کو ان سے ہٹانا پڑے گا اور بغیر لڑے بھڑے یہ بات نہ بنے گی۔ یہ بات لوط علیہ السلام

① تفسیر الطبري (١٥/ ٤١١) اس کی سند حسن ہے۔

کی طبیعت پر شاق گزری۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے لوط علیہ السلام کی زمین میں آ کر مہمانی کی فرمایش کرنے لگے۔ لوط علیہ السلام شرمائے اور ان کے آگے آگے چلے اور راستے کے دوران اُن سے عرض کیا کہ تم میرے پاس سے چلے جاؤ۔ "وَاللّٰهِ يَا هٰؤُلَآءِ مَا أَعْلَمُ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ أَهْلَ بَلَدٍ أَخْبَثَ مِنْ هٰؤُلَآءِ" یعنی کسی شہر کے لوگ اس قوم سے زیادہ خبیث اور ناپاک نہیں ہیں، پھر ذرا چل کے دوبارہ ان سے یہی کہا یہاں تک کہ چار بار یہی کہا۔ فرشتوں کو حکم تھا کہ تم اس قریہ کو اس وقت تک ہلاک نہ کرنا جب تک اس قوم کا پیغمبر ان پر گواہی نہ دے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے نکل کر نہرِ سدوم پر دوپہر کو پہنچے، دیکھا کہ لوط علیہ السلام کی بیٹی پانی بھرتی ہے۔ کہا: اے لڑکی! کوئی جگہ ٹھہرنے کی ہے؟ کہا: تم اسی جگہ ٹھہرو، جب تک کہ میں آؤں، اس دخترِ نیک اختر کو ان کے حال پر اپنی قوم کا ڈر ہوا۔ باپ کے پاس آ کر کہا کہ جا کر دیکھو شہر کے دروازے پر کچھ جوان لوگ آئے ہیں، میں نے ایسے خوب صورت لوگ کبھی نہیں دیکھے، کہیں تمھاری قوم ان کو پکڑ نہ لے اور ان کی قوم نے ان کو منع کیا تھا کہ تم کسی کو اپنے گھر مہمان نہ کیا کرو، چنانچہ ان سے کہا کہ تم چھوڑ دو، ہم ان کو اپنا مہمان کریں گے۔ لوط علیہ السلام ان کو اپنے ساتھ لے آئے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، مگر ان کے گھر والوں کو۔ ان کی عورت نے نکل کر اپنی قوم کو خبر کر دی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے،[1] یعنی جلدی اور شتابی سے بلا توقف۔ ان کا یہ دوڑنا خوشی کے مارے تھا، کیونکہ وہ پہلے سے سیئات کے عامل تھے اور اسی حالِ فجور پر رہے، یہاں تک کہ عذاب نے اُن کو آ پکڑا۔ لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم کو اگر کچھ مطلب ہے تو یہ عورتیں موجود ہیں۔ نبی باپ کی جگہ ہوتا ہے، اس لیے لوط علیہ السلام نے ان کو وہ راہ سجھائی، جو دنیا میں اور آخرت میں ان کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو۔ دوسری آیت میں یہ کہا ہے: ﴿ اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الحجر: ۷۰] "کیا ہم نے تجھے دنیا والوں (کی حمایت) سے روکا نہیں تھا؟" یعنی لوگوں کی مہمانی کرنے سے۔

بیٹیوں سے مراد:

﴿ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ﴾ اس کی توجیہ میں امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کوئی ان کی بیٹیاں نہیں تھیں، بلکہ ہر پیغمبر اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ وغیر واحد نے کہا ہے کہ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوط علیہ السلام نے ان کو حکم دیا کہ وہ عورتوں سے تزویج (نکاح) کر لیں، کچھ ان پر سفاح (بدکاری) کے لیے پیش نہیں کیں،[2] بلکہ یہ کہا کہ جو میں حکم تم کو دیتا ہوں، تم اسے قبول کرو اور عورتوں پر اکتفا کرو، کیا تم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے کہ وہ یہ بات مانے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں عورتوں سے کچھ مطلب نہیں ہے، ہم کو ان کی خواہش نہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ ہماری غرض ان لڑکوں میں ہے، پھر ایک بات بار بار کہنے کی کیا حاجت ہے؟

---

[1] تفسیر الطبري (۱۵/ ۴۰۸۔ ۴۰۹) [2] تفسیر الطبري (۱۵/ ۴۱۳۔ ۴۱۴) تفسیر ابن کثیر (۲/ ۵۹۰)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے باہر نکلے، قریۂ لوط علیہ السلام، قریۂ ابراہیم علیہ السلام سے چار فرسخ پر تھا۔ وہ لوط علیہ السلام کے پاس آئے، لوط علیہ السلام نے دیکھا کہ خوب صورت لڑکے ہیں (جن کی ڈاڑھی مونچھ ابھی نہیں آئی تھیں) ان کو ان کا آنا برا لگا، اس خیال سے کہ مبادا قوم ان کا قصد کرے اور یہ مدافعت نہ کرسکیں، ناچار دل میں تنگ ہوئے۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذَرْع طاقت کی جگہ ہے۔ پس ضیق ذرع اشارہ ہے وسعت اور طاقت کی تنگی اور معاملے کی سختی کی طرف۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قوم کے ساتھ سوءِ ظن کیا اور مہمانوں کی طرف سے دل تنگ ہوا[2] اور اس دن کو بہت زیادہ سختی والا سمجھا۔ قوم نے جو مہمانوں کا حال معلوم کیا تو دوڑتے ہوئے آئے۔ اہراع بہ معنی اسراع ہے، یعنی سرعت کے ساتھ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اہراع ہرولہ (تیز روی) وعَدو (دوڑنا) کے درمیان ہوتا ہے۔[3] (قاله الحسن)

بہرحال ان کا جلدی اور شتابی سے آنا مہمانوں کے ساتھ بے حیائی کے قصد سے تھا، کیونکہ وہ ان کے آنے سے پہلے ہی برے کام کیا کرتے تھے، یعنی مردوں کی پیٹھوں میں آتے۔ ان کو اس کی عادت ہوگئی تھی، کچھ شرم نہ تھی۔ جب وہ لوط علیہ السلام کے گھر پر آئے تو یہ ان کی مدافعت کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا: اے قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ قوم دروازہ کے باہر تھی اور انھوں نے اندر سے خطاب کیا، یعنی اگر تم چاہو تو ان سے بیاہ کرلو اور مہمانوں کے ساتھ اس بے ہودہ خیال سے باز رہو۔ لوط علیہ السلام کی تین صاحب زادیاں تھیں، یا دو، اور وہ پہلے ان سے بیاہ کرنا مانگتے تھے، لیکن لوط علیہ السلام ان کی خباثت کی وجہ سے انکاری تھے، نہ کہ بسبب عدمِ کفایت کے۔ اس قوم کے دو سردار تھے جن کی اطاعت کی جاتی تھی۔ لوط علیہ السلام نے چاہا کہ ان کے ساتھ بیاہ کر دیں، جمع سے اس جگہ مراد ایک سے زیادہ کی تعداد ہے یا بیٹیوں سے اس جگہ مراد ساری عورتیں ہیں، اس لیے کہ نبی قوم کا باپ ہوتا ہے۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما) امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[4]

امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ انسان کا اوباش اور فاجر لوگوں کو اپنی بیٹیاں پیش کرنا بعید از قیاس ہے۔ ان حالات میں یہ مردانگی کے لائق نہیں ہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کا کیا ذکر؟ مزید برآں دو یا تین بیٹیاں ایک عظیم اجتماع کو کافی بھی نہیں ہوسکتیں۔ رہیں امت کی بیٹیاں تو وہ کافی ہوسکتی تھیں، لیکن اس بات میں ظاہر نظم کی مخالفت ہے۔

کہتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کی ملت میں ایک مسلم لڑکی کا نکاح کافر کے ساتھ جائز تھا۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا

---

[1] فتح القدير (٢/ ٧١٤) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٤٠٨) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسير البغوي (٤/ ١٩١) [4] تفسير الطبري (١٥/ ٤١٣۔ ٤١٤) الدر المنثور (٤/ ٤٥٧)

کہ لوط علیہ السلام نے لڑکیوں کو اسلام کی شرط پر پیش کیا تھا۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ان کا ایسا کہنا مدافعت کے طور پر تھا، نہ کہ حقیقت کے طور پر۔ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ لوط علیہ السلام نے چاہا کہ لڑکیوں کو بیاہ دیں اور مہمانوں کو بچا لیں۔[2] ﴿ اَطْهَرُ ﴾ کے صیغہ میں فضیلت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اللہ پاک نے یہ ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ تم لوگ اللہ سے ڈرو اور فاحشہ کا ارادہ نہ کرو اور مجھ کو میرے مہمانوں کے سامنے خوار و رسوا نہ کرو کہ مجھ پر یہ عار لگ جائے۔ ضیف کا اطلاق اصل میں اس مہمان پر ہے جو رات کو میزبان کے پاس آئے، اس لیے ایک یا دو یا زیادہ پر، مرد ہو یا عورت، سب پر بولا جاتا ہے۔[3]

رشید سے مراد وہ شخص ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی "لا إله إلا الله" کہے[4] اور سوالیہ انداز ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ہے کہ تم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اس قبیح کام کو چھوڑنے کی ہدایت کرے۔ انھوں نے کہا کہ تم جان چکے ہو کہ ہم کو عورتوں کی کچھ خواہش نہیں ہے، بلکہ جو بات ہم چاہتے ہیں وہ تم کو معلوم ہے۔ لوط علیہ السلام کو جب ان کا فاحشہ کا ارتکاب کرنے کا پکا ارادہ معلوم ہوا اور جانا کہ یہ اپنے مطلب سے باز نہیں آئیں گے، تب انھوں نے وہ کہا جو اللہ پاک نے اس جگہ بیان فرمایا ہے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝۸۰
قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ
بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ
مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ
بِقَرِيْبٍ ۝۸۱

اس (لوط) نے کہا: کاش! میرے لیے تمھارے مقابلے میں کوئی قوت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ لیتا (80) (فرشتوں نے) کہا: اے لوط! بے شک ہم تیرے رب کے قاصد ہیں، وہ تیری طرف ہرگز نہیں پہنچیں گے، چناں چہ تو اپنے گھر والوں کو رات کے کسی حصے میں لے چل، اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، سوائے تیری بیوی کے، بے شک اسے (وہ عذاب) پہنچنے والا ہے جو ان (لوگوں) کو پہنچے گا۔ بے شک ان کے وعدے (عذاب) کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟ (81)

---

[1] تفسیر البغوي (٤/ ١٩١)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٦٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] فتح البیان (٦/ ٢١٧۔ ٢٢٠)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٦٣) اس کی سند میں ''حفص بن عمر عدنی'' ضعیف راوی ہے۔

لوط علیہ السلام کی لاچاری:

ہمارے نبی اکرم ﷺ کو مکہ صبح کے وقت فتح ہوا، شاید یہ وہی اشارہ ہو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوط علیہ السلام نے قوت اور رکن کا ذکر کر کے ان کو دھمکی دی، یعنی اگر مجھ کو کچھ زور ہوتا کہ میں اپنی ذات اور اپنے قبیلے سے تمھارے ساتھ کچھ کرتا اور تم کو بتا دیتا کہ ایسا ہوتا ہے۔ لہٰذا سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلٰى لُوْطٍ لَقَدْ كَانَ يَاْوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ» اس رکن سے مراد اللہ عزوجل ہے۔ پھر کوئی نبی لوط علیہ السلام کے بعد مبعوث نہ ہوا، مگر اپنی قوم سے ثروت (دولت وحشمت) میں۔[1]

فرشتوں کا حقیقت بتا دینا اور عذاب سے آگاہ کرنا:

اس وقت فرشتوں نے بتایا کہ ہم اللہ کے رسل ہیں اور یہ قوم تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، تم خاطر جمع رکھو۔ پھر ان سے کہا کہ تم راتوں رات شب کے آخری حصے میں اپنے گھربار کے ساتھ یہاں سے چل دو، تم آگے رہو اور اہل تمھارے پیچھے ہوں اور تم میں سے کوئی جب قوم پر عذاب کا نازل ہونا سنے تو پھر کر نہ دیکھے اور وہ خوف ناک آوازیں تمھیں ہولناک نہ کریں، تم تو اپنے سامنے کی راہ پر سیدھے چلے جاؤ مگر تمھاری بیوی۔[2]

کہتے ہیں کہ وہ بھی ان کے ساتھ باہر نکلی تھی، اس نے جب آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور کہا: "وَاقَوْمَاه" اتنے میں آسمان سے ایک پتھر نے آ کر اُس کو قتل کر دیا۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے عذاب کے قریب ہونے کا ذکر کیا، تا کہ وہ خوش ہو جائیں، انھوں نے کہا: اسی وقت ان کو تباہ کر دو، انھوں نے کہا: ان کے ہلاک ہونے کا وقت صبح ہے، کیا صبح قریب نہیں ہے۔ ادھر تو یہ بات چیت ہوئی، ادھر لوط علیہ السلام کی قوم دروازے پر کھڑی تھی، ہر طرف سے آ کر ان کے دروازے پر اکٹھے ہو گئے تھے اور ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔ یہ اپنے دروازے پر کھڑے مدافعت کرتے تھے، وہ لوگ ان کو دھمکا رہے تھے۔ اتنے میں جبریل علیہ السلام نے نکل کر اپنا ایک پر ان کے منہ پر مارا، ان کی آنکھوں کا نور جاتا رہا۔

حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام قومِ لوط علیہ السلام کے پاس آتے اور فرماتے: میں تم کو لوط سے کچھ تعرض سے منع کرتا ہوں، انھوں نے ان کا کہنا نہ سنا، یہاں تک کہ کتاب اپنی مدت کو پہنچ گئی۔ ملائکہ لوط علیہ السلام کے پاس آئے، وہ اپنی زمین پر محنت اور کام کر رہے تھے، لوط علیہ السلام نے ان کی دعوت کی، انھوں نے کہا: آج کی رات ہم تمھارے مہمان ہیں۔ اللہ پاک نے جبریل علیہ السلام سے عہد لیا تھا کہ اس قوم کو عذاب نہ کرے، جب تک کہ لوط علیہ السلام تین بار گواہی نہ دیں۔ لوط علیہ السلام ان کو اپنے ہمراہ لے کر چلے، اپنی قوم کے عمل کا ذکر کیا، پھر ایک ساعت چل کر ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: تم نہیں جانتے کہ یہاں کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ روئے زمین پر ان سے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦١٧)
[2] تفسير ابن كثير (٢/ ٥٩٠۔ ٥٩١)

بدتر کوئی اور ہو۔ میں تم کو کہاں لے جاؤں، کیا اپنی قوم کے پاس جو اللہ کی بدترین مخلوق ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے ملائکہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ان دونوں باتوں کو یاد رکھو، جب گھر کے دروازے پر پہنچے، ان سے شرما کر ازراہِ شفقت روئے اور کہا: میری قوم اللہ کی بدترین مخلوق ہے "أَمَا تَعْلَمُوْنَ مَا يَعْمَلُ أَهْلُ هَذِهِ الْقَرْيَةِ، مَآ أَعْلَمُ عَلٰى وَجْهِ الْأَرْضِ أَهْلَ قَرْيَةٍ شَراً مِّنْهُمْ" جبریل علیہ السلام نے ملائکہ سے کہا کہ اب تم ان تینوں شہادتوں کو یاد رکھو، عذاب کا آنا حق ہو گیا۔

رات کے آخری پہر نکلنے کا حکم اور بیوی کا کردار:

جب وہ لوگ گھر میں داخل ہوئے تو لوط علیہ السلام کی بدکردار بیوی نے بالاخانہ پر چڑھ کر کپڑے سے اشارہ کیا، فساق جلدی سے دوڑتے ہوئے آئے اور کہا: تیرے پاس کون لوگ ہیں؟ کہا: لوط کے مہمان ہیں، میں نے کبھی ان سے بہتر، خوب صورت اور خوش بودار لوگ نہیں دیکھے۔ قوم دروازے کی طرف لپکی اور لوط علیہ السلام کو اندر سے پکارا اور قوم باہر تھی۔ لوط علیہ السلام نے ان کو اللہ کی قسم دلائی اور کہا: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ﴾ [هود: ٧٨] ''یہ میری (قوم کی) بیٹیاں ہیں (ان سے نکاح کر لو)، یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں۔'' ایک فرشتے نے دروازہ بند کر لیا اور جبرائیل علیہ السلام نے عذاب کی اجازت چاہی، اللہ پاک نے ان کو اذن دیا، اس صورت پر جس پر وہ آسمان میں ہوتے ہیں، انھوں نے اپنا ایک پر کھولا، جبریل علیہ السلام کے دو پر ہیں، ایک وشاح (ہار)، درِ منظوم کا دانت خوب چمک دار اور پیشانی خوب روشن۔ انھوں نے کہا: اے لوط! ہم تیرے رب کے رسول ہیں، تو مت ڈر، یہ لوگ تجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے، تم دروازے کے پاس سے چلے جاؤ، مجھے اور ان کو چھوڑ دو۔ لوط علیہ السلام نے دروازہ کھول دیا اور باہر نکل گئے، جبریل علیہ السلام نے ان کے منہ پر ایک ایسا پر مارا کہ جس سے آنکھیں پھوٹ گئیں، وہ سب اندھے ہو گئے، راستہ نہ پہچانتے تھے۔ پھر لوط علیہ السلام سے کہا کہ تم آج کی رات اپنے گھر والوں کے ساتھ نکل جاؤ۔[1] امام قرطبی، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ سے بھی اسی کے لگ بھگ مروی ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ لوط علیہ السلام کا یہ کہنا کہ کاش مجھ کو قوت ہوتی، ایک تمنا کے طور پر تھا۔ یعنی اگر میں کوئی ناصر و معین پاتا تو تم کو سمجھ لیتا اور روکتا اور دفع کرتا، یا اگر میرا کنبہ ہوتا تو میں اُن کی طرف رجوع کرتا کہ وہ سب مل کر مجھ کو تمھارے اس شر سے روکتے، یہ اس لیے فرمایا کہ ان کی قوم میں کوئی شخص ان کا صاحبِ نسب نہیں تھا، بلکہ وہ ان میں غریب (اجنبی) تھے، کیونکہ وہ عراق میں ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ تھے، جب ابراہیم علیہ السلام نے شام کی طرف ہجرت کی تو اللہ نے لوط علیہ السلام کو اہلِ سدوم کی طرف بھیجا، یہ حمص کے پاس ایک قریہ تھا۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٢٩۔ ٤٣٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا سماع سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٢٥۔ ٤٢٨)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: "مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا بَعْدَهُ إِلَّا فِي مَنَعَةٍ مِّنْ عَشِيْرَتِهٖ"[1] بعض نے کہا ہے کہ قوت سے مراد بیٹا ہے اور رکن سے مراد وہ شخص ہے جو مدد کرے، یا قوت سے مراد قوتِ نفس ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جُنْدٍ شَدِيْدٍ (سخت لشکر) ہے کہ اگر میرے پاس لشکر ہوتا تو آج میں تم سے مقابلہ کرتا۔[2] صحیح بخاری وغیرہ میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «يَغْفِرُ اللّٰهُ لِلُوْطٍ إِنْ كَانَ يَأْوِيْ إِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ»[3] یہ صحیح کے علاوہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی آئی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴾ سے مراد اللہ عزوجل ہے، کیونکہ اس کی ذات پاک اشد الارکان ہے اور وہ سب سے زیادہ قوی اور روکنے والا ہے۔[4] لیکن یہ تفسیر آیت شریف اور حدیث کے ظاہر کے مخالف ہے۔ بہرحال جب فرشتوں نے لوط علیہ السلام کی یہ بات سنی اور دیکھا کہ ان کی قوم ان پر چڑھی آتی ہے اور غالب ہے اور وہ ان کی مدافعت سے عاجز ہیں، تب ان کو خبر کر دی کہ ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پھر یہ خوش خبری سنائی کہ یہ لوگ تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

پھر کہا کہ اب تم اپنے اہل کو لے کر رات کے چوتھائی حصے میں یہاں سے نکل جاؤ۔ ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے: مراد ایک ساعتِ شب ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جنح لیل (رات کا ایک حصہ) ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بقیہ شب ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جب شب کا پہلا حصہ گزر جائے تو یہاں سے چل دو۔[5] بعض نے کہا ہے کہ مراد سحرِ اول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نصف شب، کیونکہ یہ ایک قطعہ مساوی ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد رات کا اندھیرا ہے، یعنی اندھیرے میں نکل جاؤ کہ کوئی نہ دیکھے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد بدء لیل (رات کا آغاز) ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد جوفِ لیل (آدھی رات) ہے۔[6]

کسی نے کہا ہے کہ سوادِ لیل (رات کا اندھیرا) ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ با بمعنی في (میں) ہے۔ سورت یونس میں لفظ قطع پر کلام گزر چکا ہے۔[7] السري رات میں چلنے کو کہتے ہیں تو پھر ﴿ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ ﴾ کہنے کی کیا حاجت ہے؟ کہا گیا ہے کہ اگر یوں نہ کہا جاتا تو جائز تھا کہ اول شب میں ہی اندھیرا ہونے سے پہلے ہی نکل کھڑے ہوتے اور یہ مراد نہیں تھی۔

پھر کہا کہ تم میں سے کوئی التفات نہ کرے، یعنی اس کا دل اس کی طرف متوجہ نہ ہو جو کچھ پیچھے ہے یا اپنی پیٹھ پیچھے نہ دیکھے یا جو مال وغیرہ چھوڑ آیا ہے، اس کی طرف توجہ نہ کرے۔ اس ممانعت کا مطلب یہ تھا کہ قوم پر جو عذاب

---

[1] تفسير البغوي (٤/ ١٩٢) [2] تفسير الطبري (٤١٨)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥١) [4] المنهاج للنووي (٢/ ١٨٤_ ١٨٥)
[5] تفسير القرطبي (٩/ ٧٩) [6] تفسير الطبري (١٥/ ٤٣٠) [7] رقم الآية [٢٧]

آیا ہے اسے نہ دیکھے اور جو بلا اُن پر اتری ہے اس سے ہولناک نہ ہو، کہیں ان کی قوم پر رحم آئے اور دل نرمی کرے یا چلنے سے باز رہ جائیں، اس لیے کہ جو کوئی التفات کرتا ہے اس کی سیر (چلنے) میں ضرور سستی پیدا ہوتی ہے۔

پھر لوط علیہ السلام کی بیوی کو مستثنیٰ کیا کہ تم اس کو اپنے ساتھ نہ لے جاؤ، کیونکہ وہ کافرہ ہے، یا وہ التفات کرے گی اور ہلاک ہوگی، یا التفات سے مراد تخلف (پیچھے رہ جانا) ہے کہ وہ پیچھے رہ جائے گی، تمھارے ساتھ نہ جائے گی۔ اس کو بھی وہی عذاب پہنچے گا جو قوم کو پہنچا ہے، یعنی مرمی بالحجارۃ ہوگی (پتھروں کے ساتھ ماری جائے گی)۔ اس قوم کے ہلاک ہونے کا وقت صبح کا ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے۔ صبح کو ہلاک ہونے کا وقت اس لیے مقرر کیا کہ اس وقت نفوس سکون میں ہوتے ہیں اور لوگ اپنے اپنے کام کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور متفرق نہیں ہوتے۔ بالجملہ جب لوط علیہ السلام آخر شب میں اپنے اہل کے ساتھ اس جگہ سے سفر کر گئے، تب سنگ باری ہوئی۔[1]

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ١ۙ۬ مَّنْضُوْدٍۙ۟ ﴿82﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ١ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۠ ﴿83﴾

پھر جب ہمارا حکم (عذاب) آ گیا تو ہم نے اس (بستی) کے اوپر والے (حصے) کو نیچے والا (حصہ) کر دیا اور ان پر کھنگر کے پتھر تہ بہ تہ برسائے (82) جو تمھارے رب کے ہاں سے نشان زدہ تھے۔ اور وہ (پتھر یا سزا یا بستی) ان ظالموں (قریش مکہ) سے دور نہیں (83)

بستی کا الٹا دیا جانا اور پتھروں کی بارش ہونا:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ عذاب سورج کے طلوع کے وقت آیا، سدوم کی بستی تلے اوپر کر دی گئی، یعنی اس کو الٹ مارا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴾ [النجم: ٥٤] ''پھر اس بستی کو ڈھانپ لیا جس (سنگ باری) نے ڈھانپ لیا۔'' یعنی آسمان سے پتھر کی کنکریاں برسیں۔ سجیل فارسی میں پتھریلی مٹی کو کہتے ہیں، یعنی مستحجر اور قوی اور شدید اور بعضوں نے کہا ہے کہ گرم دہکتے ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سخت اور بڑے بڑے۔ اس کو سجین (نون کے ساتھ) بھی بولتے ہیں۔[2]

میں کہتا ہوں کہ یہ لفظ پتھر اور مٹی سے معرب ہے۔ ﴿ مَّنْضُوْدٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایک کے بعد ایک پے بہ پے برستے تھے۔ ﴿ مُّسَوَّمَةً ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس پر علم تھا، ہر شخص کے نام کی مہر لگی تھی، ہر پتھر پر اُس کے صاحب کا نام لکھا تھا کہ یہ فلاں پر نازل ہوگا۔ امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُّسَوَّمَةً ﴾ بمعنی مُطَوَّقَةً

---

[1] فتح البیان (٦/ ٢٢١۔ ٢٢٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤/ ١٧٢٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٩٢)

ہے، وہ سرخ رنگ کی کنکریاں تھیں۔[1] کہتے ہیں کہ یہ سنگ باری شہر والوں پر ہوئی اور ان پر جو ارد گرد کی بستیوں کے متفرق لوگ تھے، ان میں ان کا کوئی شخص کسی شخص کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کرتا ہوتا کہ اتنے میں آسمان پر سے ایک پتھر لوگوں کے درمیان خاص اس پر آ گرتا اور ہلاک کر دیتا، یہاں تک کہ اُس قوم میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا، سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے قومِ لوط کو ان کی چراگاہ اور گھروں میں سے ان کے مویشیوں کے ساتھ پکڑ کر اتنا اونچا کیا کہ آسمان والوں نے ان کے کتوں کی آوازیں سنیں، پھر ان کو اوندھا الٹ مارا، ان سب کو اپنے دائیں پر کے ایک کنارے پر اٹھا لیا تھا، جب ان کو پلٹا تو سب سے پہلے ان کے بڑے بڑے عزت دار لوگ نیچے گرے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ جبریل علیہ السلام نے درمیان بستی کے ایک کنارے کو پکڑ کر آسمان کی فضا کی طرف لپیٹا، یہاں تک کہ آسمان والوں نے کتوں کی بھونکنے کی آواز سنی، پھر بعض کو بعض پر دے مارا، پھر جو لوگ قوم کے اِکا دُکا تھے، ان کو بھی پتھر آ لگا، یہ سب چار گاؤں تھے، ہر گاؤں ایک لاکھ کی بستی تھی اور ایک روایت میں تین گاؤں آئے ہیں،، سب سے بڑی بستی یہی سدوم تھی۔[2]

لونڈے بازی کی سزا:

حدیثِ سنن میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے: «مَنْ وَّجَدْتُّمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِهٖ»[3] یہی معنی ہیں ﴿وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ﴾ (آیتِ باب) کے۔ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ جو شخص اس امت کا قومِ لوط جیسا عمل کرتا ہے اس کو مرنے کے بعد قومِ لوط کے عذاب والی جگہ میں لے جا کر شامل کر دیتے ہیں۔ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا الْعَافِيَةَ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب ہمارا حکم آیا، یعنی وہ وقت آیا جس میں عذاب کا واقع ہونا ٹھہر چکا تھا یا مراد امر سے عذاب ہی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے تو ہم نے قومِ لوط کی بستی والوں کے اوپر والے حصے کو نیچے کر دیا، یعنی اس کو اس طرح پلٹ مارا کہ اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر ہو گیا۔ جبرائیل علیہ السلام نے اپنا پر اُس کے نیچے داخل کر کے زمین کی تہہ سے اکھیڑ کر اور آسمان کے قریب لے جا کر وہاں سے اوندھا کر دیا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اس رات کی صبح ہوئی تو جبریل علیہ السلام نے اس بستی کو اس کے ارکان سے کاٹ

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٣٨) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٤٤٠۔ ٤٤٢) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٩٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٦٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٦١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١١)

کر اپنے پَر پر داخل کیا اور پر کی نوک پر رکھ کر آسمان کی طرف چڑھے، یہاں تک کہ آسمان والوں نے ان کے مرغوں کی آوازیں اور ان کے کتوں کا بھونکنا سنا، پھر اس کو پلٹ مارا، سب سے پہلے ان کے خیمے گرے۔ یہ بلا اس طرح پر، جیسے اس قوم کو پہنچی، کسی قوم کو نہیں پہنچی۔[1] یہ سب پانچ گاؤں تھے، سب میں بڑا سدوم تھا۔ کہتے ہیں کہ اس میں چار لاکھ آدمی تھے۔

سورت براءت میں ''مُؤْتَفِكٰتِ'' سے یہی بستیاں مراد ہیں۔ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے ان بستیوں پر پتھر برسائے سجیل کے۔ اُن کا جو شخص گھر سے یا گاؤں سے باہر تھا، یا سفر میں گیا تھا، یا اس کے الٹنے کے بعد آیا، اس پر بھی پتھر گرا۔ سجیل سے مراد وہ مٹی ہے جو پتھر کی طرح ہو، خواہ آگ سے ہوئی یا خود بخود۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد سخت اور درشت سنگریزہ ہے یا کثیر العدد۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴾ [الذاريات: ٣٣] ''تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر (کھنگر) برسائیں۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''أَوَّلُهَا حَجَرٌ وَّ آخِرُهَا طِيْنٌ'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد خشت ہے۔[2] یہ عرب کی لغت ہے۔ امام ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سجیل آسمانِ دنیا کا نام ہے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے، لفظ ﴿ مَنْضُوْدٍ ﴾ (تہ بہ تہ جمایا ہوا) اس قول کو مردود کرتا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ آسمان و زمین کے درمیان معلق ایک دریا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آسمانِ دنیا میں پہاڑ ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مشتق ہے تسجیل سے، یعنی وہ عذاب جو ان کی قسمت میں لکھا گیا تھا۔ گویا اس معنی میں ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴾ [المطففين: ٨۔ ٩] ''اور تمھیں کیا معلوم وہ سجین کیا ہے؟ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔'' وغیر ذلک۔ پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔[4]

﴿ مَنْضُوْدٍ ﴾ سے مراد تہ بہ تہ ہے۔ غرض اس سے مراد سنگ باری کی کثرت ہے، یعنی لگاتار، تابڑ توڑ۔ ﴿ مُسَوَّمَةً ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے ایک علامت تھی، ان پر مہریں لگی تھیں۔[5] (قاله الحسن والسدي) امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کہتے ہیں کہ ان پر سرخ خطوط تھے اور سفیدی میں سیاہی تھی۔[6] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان پر ایک نشان تھا جو زمین کے پتھروں کی طرح نہیں تھا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کا ہے کہ وہ سرخ لکیریں تھیں، ہیئات جزع (سلیمانی مہرہ) پر۔[7]

﴿ عِنْدَ رَبِّكَ ﴾ سے مراد اللہ کے خزانے یا اس کا حکم ہے اور خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ فرمایا کہ یہ پتھر یا

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٤٠۔ ٤٤١)
[2] تفسير الطبري (١٥/ ٤٣٣) تفسير البغوي (٤/ ١٩٤)
[3] فتح القدير (٢/ ٧١٧)
[4] معاني القرآن (٣/ ٧١۔ ٧٢)
[5] تفسير البغوي (٤/ ١٩٤)
[6] معاني القرآن للفراء (٢/ ١٧٤)
[7] تفسير البغوي (٤/ ١٩٤)

یہ عقوبت ظالموں، یعنی قومِ لوط سے کچھ بعید نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے ظلم کے سبب اسی لائق تھے کہ ان پر پتھر برسیں۔ اس میں ہر ظالم کو وعید ہے۔ من جملہ ظالموں میں سے قریش ہیں اور کفر میں ان کا ساتھ دے کر سید المرسلین ﷺ کا مقابلہ کرنے والے ہیں۔ یا ضمیر قریٰ کی طرف لوٹتی ہے کہ یہ گاؤں مکہ کے ظالمین کے قریب ہیں، کیونکہ یہ شام اور مدینہ کے درمیان تھے۔ کفارِ قریش کا سفر کے دوران ان بستیوں پر گزر ہوا کرتا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے قریش کو ڈرایا ہے کہ کہیں ان پر بھی وہی مصیبت نہ آئے جو قومِ لوط پر آئی تھی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کے ظالم مراد ہیں۔[1]

مفسرین نے قومِ لوط کی ہلاکت کے بارے میں مختلف طویل روایات اور قصے ذکر کیے ہیں، ان کے بیان کرنے میں کچھ زیادہ فائدہ نہیں، خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان قصوں کے راویوں اور قومِ لوط کی ہلاکت کے درمیان ایک طویل زمانہ ہے۔ اس جیسے حال کی صحیح سند ملنا مشکل ہے، غالباً یہ روایات اہلِ کتاب سے ماخوذ ہیں اور اہلِ کتاب کا روایت کے بارے میں حال خوب معلوم ہے اور ہم کو حکم ہے کہ ہم نہ ان کی تصدیق کریں اور نہ تکذیب۔ اسی جگہ سے ہم نے ان روایات کو انبیا علیہم السلام کے قصوں میں حذف کیا ہے۔[2]

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿84﴾

اور (ہم نے) مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، اور تم ناپ تول کم نہ کرو، بے شک میں تمھیں خوش حال دیکھتا ہوں، اور بے شک مجھے تم پر گھیرنے والے عذاب کے دن سے خوف آتا ہے (84)

مدین کا تذکرہ اور شعیب علیہ السلام کی دعوت:

مدین عرب کا ایک قبیلہ تھا، جو حجاز اور شام کے درمیان مقامِ معان کے قریب آباد تھا۔ وہاں کے بلاد کو مدین کہتے تھے۔ اللہ پاک نے شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا، یہ ان میں سب سے اچھے نسب والے تھے، لہٰذا شعیب علیہ السلام کو ان کا بھائی کہا۔ شعیب علیہ السلام نے ان کو حکم دیا کہ تم اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرو اور ماپ تول میں کمی نہ کرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمھارا عیش اور رزق بخوبی ہے اور اگر تم اللہ کی حرام کردہ چیزوں کی ہتک کرو گے تو مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں یہ نعمت تم سے چھین نہ لی جائے اور عذاب میں گرفتار ہو جاؤ۔

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٣٨۔ ٤٤٠) تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٦٩۔ ٢٠٧٠) [2] فتح البيان ٦٠/ ٢٢٤۔ ٢٢٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ مدین ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے، پھر ان کی اولاد میں سے ایک قبیلے کا یہ نام ہو گیا، اس جگہ یہی قبیلہ مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اصل میں مدین اس شہر کا نام ہے جس کو مدین نے آباد کیا تھا۔ عبارت کا انداز یہ ہے کہ ہم نے شعیب علیہ السلام کو اہلِ مدین کی طرف بھیجا۔ امام مقریزی رحمہ اللہ خطط میں کہتے ہیں کہ مدین شعیب علیہ السلام کی امت ہے۔ یہ لوگ بنو مدیان بن ابراہیم علیہ السلام تھے، ان کی ماں کا نام قنطورا تھا۔ وہ یقطان کنعانیہ کی بیٹی تھی، اس کے آٹھ بچے پیدا ہوئے، جن سے نسل چلی اور وہ بہت سی امتیں ہو گئے۔ مدین بحر قلزم پر تبوک کے سامنے چھے مرحلہ پر ہے اور تبوک سے بڑا ہے، وہاں ایک کنواں ہے، جس کا پانی موسیٰ علیہ السلام نے سائمۂ شعیب (شعیب کے جانوروں) کو پلایا تھا، اب اس پر ایک گھر بنا دیا ہے۔[1] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدین شہر کا نام ہے، یہ ایک قطر (کنارہ) ہے۔[2] جمہور کہتے ہیں کہ مدین اعجمی ہے، بعض نے کہا ہے کہ عربی ہے، بہر حال غیر منصرف ہے، خواہ زمین کا نام ہو یا شہر کا، خواہ عربی ہو یا عجمی، امام نحاس رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] سورت اعراف میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔[4]

یہ لوگ شعیب علیہ السلام کی قوم تھے، ان کو نسب کی وجہ سے قوم کا بھائی کہا، کیوں کہ ان کے باپ میکائیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم تھے۔ انھوں نے قوم کو توحیدِ عبادت کی طرف دعوت دی کہ یہ خطیب الانبیاء علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ قوم کے سوالوں کے بڑی اچھی طرح جواب دیتے تھے۔ انبیا کی عادت ہے کہ وہ شروع میں سب سے اہم بات کرتے ہیں، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم۔ توحید کی دعوت سب چیزوں سے زیادہ اہم ہے، لہٰذا پہلے اسی توحیدِ عبادت کی طرف بلایا اور ناپ تول کی کمی سے منع کیا، اس لیے کہ وہ کفر کے ساتھ اہلِ تطفیف بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ ماپ تول میں کمی کرتے اور جب کوئی بیچنے والا طعام لے کر آتا تو اس کا ماپ اور تول زیادہ لیتے اور جب فروخت کرتے تو پیمانہ اور وزن کم کر دیتے، اس پر شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ تم یہ حرکت بے برکت نہ کیا کرو، لین دین میں برابری رکھو، پورا دو اور پورا لو، کچھ کمی بیشی نہ کرو۔ مکیال سے مراد جس سے ناپا جائے اور میزان سے مراد جس سے وزن کیا جائے، یہ پورا کرنے کے سلسلے میں بہت اہم ہے۔

خیر سے مراد مال داری اور رزق کی فراخی ہے، یعنی اللہ نے تم کو غنی اور خوش حال کیا ہے، تم اللہ کی نعمت کو نافرمانی سے مغیر نہ کرو، یعنی بدل نہ دو اور اللہ کے بندوں کو نقصان نہ دو، بلکہ اس نعمت کا حق یہ ہے کہ شکریہ کے طور پر لوگوں پر تفضّل کرو نہ یہ کہ ان کے حقوق دبا کر رکھو۔ پھر ان کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا کہ وہ دن گھیر لینے والا ہو گا یا مراد اسی دنیا میں انتقام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خیر سے مراد نرخ کی ارزانی ہے اور نرخ کی گرانی عذاب ہے۔[5] پھر اس ناپ تول میں کمی کی ممانعت کی اس طرح تاکید کی۔[6]

---

[1] فتح البیان (٦/ ٢٢٤۔ ٢٢٧) [2] المواعظ والاعتبار للمقریزي (١/ ٣٤٥) [3] تفسیر القرطبي (٩/ ٨٥)
[4] رقم الآیة [٨٥] [5] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٤٤) [6] فتح البیان (٦/ ٢٢٧۔ ٢٢٩)

وَيٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِكۡيَالَ وَالۡمِيۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِى الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ۝۸۵ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِحَفِيۡظٍ ۝۸۶

اور اے میری قوم! تم ناپ اور تول انصاف سے پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو، اور تم زمین میں فسادی بن کر نہ پھرو (85) اللہ کی بچت (جائز نفع) تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تم پر محافظ نہیں ہوں (86)

پورا تولنے کا حکم اور ناپ تول میں کمی کرنے سے روکنا:

نقل ہے کہ امانت کے روپے کتر لیتے۔ شعیب علیہ السلام نے پہلے ناپ تول کی کمی سے منع کیا، جبکہ لوگوں کو ماپ تول کر دیں، پھر پورے ماپ تول لینے کا حکم دیا، جبکہ لوگوں سے لیں اور دیں اور زمین میں فساد مچانے سے منع کیا، وہ لوگ رہزنی کرتے تھے۔ اللہ کی بچی چیز کو بخس سے بہتر فرمایا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اللہ کی وصیت ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہلاک عذاب میں ہے اور ﴿ بَقِيَّتُ ﴾ رحمت میں۔[1]

بقیہ سے مراد:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بقیہ سے مراد وہ فائدہ اور نفع ہے جو فاضل بچ رہے ماپ تول کرنے کے بعد، یہ بہتر ہے لوگوں کے مال لینے سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے،[2] یہ اس آیت کے مشابہ ہے: ﴿ قُلۡ لَّا يَسۡتَوِى الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ ﴾ [المائدة: ١٠٠] ''کہہ دیجیے: پاک اور ناپاک برابر نہیں ہوسکتے۔'' میں کچھ نگہبان نہیں، یعنی تم یہ کام اللہ کے لیے کرو نہ لوگوں کو دکھانے سنانے کے لیے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ قسط سے مراد عدل ہے، یعنی زیادتی اور کمی سے منع کرنا، اگرچہ دیتے وقت زیادہ کرنا فضل اور خیر ہے، لیکن اسم عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور کمی سے منع کرنا اگرچہ پورا کرنے کے لیے لازمی ہے، مگر دونوں دلیلوں کو اکٹھا کرنا مبالغۂ تبلیغ اور حسن وشدت کی تاکید کرنے کا اہتمام ہے۔ اس لیے اس کو بار بار ذکر کیا، تاکہ اس پر سختی اور ممانعت کو قوت ہو، معنی یہ ٹھہرے کہ تم ماپ تول کو پورا کرو، ان میں کمی نہ کرو۔ بعض نے کہا ہے کہ قسط سے مراد ترازو کی زبان کا سیدھا کرنا ہے اور کانٹے کا برابر کرنا ہے۔ پھر مزید تاکید کی خاطر یہ کہا کہ لوگوں کو ان کی چیزوں میں

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٢)
(2) تفسیر الطبري (١٥/ ٤٤٧)

نقصان نہ دو۔ یہ بخس کی علی العموم ممانعت ہے اور عام چیزوں کے ناپ اور تول میں کمی کرنے کی ممانعت ہے۔ اس میں ناپ تول میں کمی بیشی داخل ہے، بدرجۂ اولیٰ۔

پھر زمین میں فساد کرنے سے منع کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اصلاح کرو، جس طرح کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کے بارے میں اصلاح کی تھی۔ اب اس قسط کے بعد جو کچھ تمھیں بچے گا وہ حلال ہوگا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ بَقِيَّتُ اللّٰهِ ﴾ سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔[1] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراقبۂ الٰہی ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رب کی طرف سے حظ (حصہ) ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کا رزق ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ آخرت کا ثواب ہے۔ ایمان سے اس جگہ مراد شعیب علیہ السلام کی تصدیق کرنا ہے۔ میں کچھ نگہبان نہیں کہ تم نافرمانیوں میں نہ پڑ جاؤ، یا میں تمھارے اعمال کا محاسب نہیں ہوں کہ ان پر بدلہ دوں، بلکہ میں تو فقط ایک ناصح اور مبلغ ہوں، میں نے تم کو ڈرا دیا اور اپنا عذر کر لیا۔[5]

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿87﴾

انھوں نے کہا: اے شعیب! کیا تیری نماز تجھے یہ حکم کرتی (سکھاتی) ہے کہ ہم ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے یا اپنے مالوں میں وہ نہ کریں جو کرنا چاہیں؟ بلاشبہ تو تو بڑا نرم مزاج، بڑا سمجھ دار ہے ﴿87﴾

قوم کا جاہلانہ جواب:

جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکوں کے کام آپ نہ کر سکیں تو انھی کو چڑانے لگیں، یہی کفر کی خصلت ہے۔ ان کا شعیب علیہ السلام کو یہ کہنا تہکم کے طور پر تھا، یعنی براہِ مسخرہ پن۔ معبودینِ آباء سے مراد آستانے اور بت ہیں یا اپنے مالوں میں جو کچھ چاہیں اس کا کرنا چھوڑ دیں، اس سے مراد اپنے مالوں میں کمی بیشی سے باز آنے سے انکار کرنا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی واللہ! اس کی نماز اس کو حکم کرتی تھی کہ غیر اللہ کی عبادت چھوڑ دیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اموال سے اس جگہ مراد زکات ہے۔ شعیب علیہ السلام کو حلیم رشید بطور استہزا کے کہا، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔[6]

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٤٧) [2] معاني القرآن للفراء (٢/ ١٧٤) [3] تفسير الطبري (١٥/ ٤٤٨)

[4] تفسير الطبري (١٥/ ٤٤٨) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ [5] فتح البيان (٦/ ٢٢٩_ ٢٣٠)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٢_ ٢٠٧٣) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٩٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ سوالیہ انداز انکار کے طور پر ہے، کیونکہ ان کے نزدیک نماز پڑھنا کوئی اچھی بات نہ تھی، یا اس جگہ نماز سے مراد قراءت ہے۔[1] (قاله الأعمش) یا دین ہے یا اتباعِ شعیب علیہ السلام۔ احنف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شعیب علیہ السلام سب انبیا سے زیادہ نماز گزار تھے،[2] لہٰذا انھوں نے یہ بات کہی اور نماز کا نام لیا کہ یہ شعائرِ دین میں سے سب سے بڑا ہے اور کہا کہ کیا ہم عبادتِ اوثان چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں، بلکہ ہمارے مال میں تیرا تصرف ہو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شعیب علیہ السلام نے ان کو دینار اور درہم کے قطع کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہمیں اختیار ہے کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں سو کریں، تم منع کرنے والے کون ہو؟ چاہیں قطع کریں یا جلا دیں یا پھینک دیں! امام قرظی، زید بن اسلم اور ابن میسّب رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[3]

قوم کا طنزیہ انداز:

پھر ان کو حلیم رشید کہا، یعنی تم اپنے نزدیک اور اپنے اعتقاد میں ایسے ہو تو پھر ہم کو تمھارا منع کرنا ان اوصاف کے خلاف ہے۔ یا یہ بات انھوں نے بطورِ استہزا کہی تھی یا وہ ان کے نزدیک ایسے ہی تھے، اس لیے ان کے امر و نہی کو حکم و رشد کے خلاف سمجھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نہ حلیم ہو نہ رشید،[4] بلکہ سفیہ اور غاوی، یعنی بے وقوف اور گمراہ ہو، کیوں کہ عرب کسی شے کی تعریف اس کی ضد کے ساتھ کرتے ہیں۔ لدیغ (سانپ کے ڈسے) کو صحیح سالم اور فلاۃ مہلکہ (بے آب و گیاہ جنگل جو ہلاک کرنے والا ہو) کو مفازہ (کامیابی کی جگہ) کہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بطورِ استہزا کہا تھا۔[5]

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۸۸

اس (شعیب) نے کہا: اے میری قوم! بھلا بتاؤ تو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں اور

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٥١۔ ٤٥٢) [2] الدر المنثور (٤/ ٤٦٦) [3] تفسير الطبري (١٥/ ٤٥٠۔ ٤٥١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٣) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٣) فتح البيان (٦/ ٢٣٠۔ ٢٣١)

اس نے مجھے اپنی طرف سے اچھا رزق دیا ہو (تو کیسے اس کی نافرمانی کروں؟) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کروں (اس طرح کہ) وہ کام کروں جن سے تمھیں روکتا ہوں۔ میں کچھ نہیں چاہتا سوائے (تمھاری) اصلاح کے جہاں تک مجھ سے ہو سکے۔ اور مجھے (اس کی) توفیق ملنا اللہ کی مدد کے سوا (ممکن) نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں (88)

شعیب علیہ السلام کا حکیمانہ جواب:

یہ خصلت ہے اللہ کے لوگوں کی کہ چڑانے سے برا نہ ماننا اور اپنی مقدور بھر سمجھاتے رہنا۔ شعیب علیہ السلام نے کہا: بھلا یہ بتاؤ کہ اگر میں توحید عبادت کی اس دعوت میں بصیرت پر ہوں اور اللہ نے مجھے رزقِ حسن دیا ہے۔ مراد یہ نبوت ہے یا حلال روزی یا دونوں امر۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز سے میں تم کو منع کرتا ہوں، خود وہ کام چھپ کر نہ کروں گا، اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔ میرا مطلب تو فقط اپنی جدوجہد اور طاقت سے تمھارے کام درست کرنا ہے اور بس۔ اور حق بات کی طرف پہنچنے کی توفیق دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے، میرا توکل اور رجوع اسی پر ہے۔[1] (قاله مجاهد)

حکیم بن معاویہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کے بھائی مالک نے کہا: اے معاویہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہمسایوں کو گرفتار کیا ہے، تم ان کے پاس جاؤ کہ وہ تم سے بات چیت کرتے ہیں اور تم کو پہچانتے ہیں۔ میں مالک کو لے کر گیا اور کہا: میرے لیے میرے ہمسایوں کو چھوڑ دو کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض کیا (منہ موڑ لیا) وہ غصے میں کھڑا ہو گیا اور کہا: سن لو! قسم ہے اللہ کی کہ تم یہی کرو، لوگ یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ تم ہم کو ایک حکم کرتے ہو اور خود اس کے خلاف کرتے ہو۔ کہا: کیا وہ یوں کہتے ہیں؟ اگر میں ایسا کرتا ہوں تو اس کا وبال مجھ پر ہے، ان پر کوئی الزام نہیں، اس کے لیے اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔[2] (رواه أحمد)

اسی جگہ یہ حدیث امام احمد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے کہ جب تم میری کوئی حدیث سنو جس کو تمھارے دل پہچانیں اور تمھارے اشعار (بال) اور ابشار (چہرے) اس کے لیے نرم ہوں اور تم دیکھو کہ وہ بات تم سے قریب ہے تو میں تم میں اس کے ساتھ اولیٰ تر ہوں (زیادہ حق دار ہوں) اور جب تم میری کوئی حدیث سنو جس کا تمھارے دل انکار کریں اور تمھارے اشعار اور ابشار اس سے متنفر ہوں اور تم اس کو اپنے آپ سے دور دیکھو تو میں اس سے تم میں سے زیادہ دور ہوں۔[3] اس کی سند صحیح ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٥٣۔ ٤٥٤) تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٩٤)
[2] مسند أحمد (٤/ ٤٤٧) اس کی سند حسن ہے۔
[3] مسند أحمد (٣/ ٤٩٧) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦١٢)

امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک عورت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہا کہ تم واصلہ (بالوں کو دوسرے بالوں سے جوڑنے) سے منع کرتے ہو؟ کہا: ہاں، کہا: تمھاری بعض عورتیں یہ کام کرتی ہیں، کہا: تجھے عبد صالح کی وصیت یاد نہیں ہے: ﴿وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ﴾[1] ابوسلیمان ضبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمارے پاس عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خطوط آتے تھے، ان میں امر و نہی ہوتے اور وہ ان خطوط کے آخر میں لکھتے: "وَمَا كُنْتُ مِنْ ذٰلِكَ إِلَّا كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ: وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ إِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ إِلَيْهِ أُنِيْبُ"[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ ﴿بَيِّنَةٍ﴾ سے مراد بیان و حجتِ واضحہ و بصیرت و ہدایت ہے، اللہ کی طرف سے امر و نہی میں۔ اس نے مجھ کو اپنے فضل و کرم اور اپنی اعانت اور عنایت سے بغیر کسی محنت اور تکلیف سے اپنے خزانوں میں سے بہت زیادہ اور فراخ اور حلال و پاک رزق عطا فرمایا ہے۔ شعیب علیہ السلام کثیر المال والنعمہ تھے یا رزق سے مراد نبوت یا حکمت یا علم یا توفیق یا معرفت یا ہدایت ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تم کو کسی شے سے منع کروں اور خود اس کام میں داخل ہوں، بلکہ تمھارے لیے وہی بات اختیار کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔[3]

اس امر و نہی سے میری مراد تو یہی تمھارا سنوارنا ہے اور تمھارے دین سے فساد کو دور کرنا ہے۔ مجھ سے جہاں تک ہوگا میں تمھارے معاملات درست کرتا رہوں گا۔ میرا موفق دینی و ہادی و مرشد ہونا اللہ کی تائید سے ہے۔ میرا بھروسا سب کاموں میں اللہ پر ہے۔ میں اسی کی طرف رجوع کرنے والا ہوں۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت کریں، فرمایا: «قُلِ اللّٰهُ رَبِّيْ ثُمَّ اسْتَقِمْ» میں نے کہا: "رَبِّيَ اللّٰهُ وَ مَا تَوْفِيْقِيْٓ إِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ إِلَيْهِ أُنِيْبُ" فرمایا: «لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ يَا أَبَا الْحَسَنِ، لَقَدْ شَرِبْتَ الْعِلْمَ شَرْباً وَنَهِلْتَهُ نَهْلًا»[4] (أخرجه أبو نعيم في الحلية) اس کی سند میں محمد بن یوسف کدیمی ہے۔[5]

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ۝۸۹
وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰

اور اے میری قوم! میری مخالفت تمھیں (ایسے کام پر) نہ اُکسائے کہ تم پر ویسا عذاب آئے جیسا قومِ نوح

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٤) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٤)
[3] معاني القرآن للزجاج (٣/ ٧٣)
[4] حلية الأولياء (١/ ٦٥)
[5] "حلية الأولياء" میں اس روایت میں محمد بن یوسف کدیمی کے بجائے محمد بن یونس کدیمی ہے اور یہ ضعیف راوی ہے۔

یا قومِ ہود یا قومِ صالح پر آیا تھا، اور لوط کی قوم (کا علاقہ بھی) تم سے کچھ دور نہیں ﴿89﴾ اور تم اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اسی کی طرف توبہ کرو، بے شک میرا رب بڑا رحم کرنے والا، نہایت محبت کرنے والا ہے ﴿90﴾

قوم کو تنبیہ:

شعیب علیہ السلام نے کہا کہ تم کو مجھ سے عداوت اور بغض ہے، سو کہیں اس وجہ سے تم ان معاصی پر اصرار نہ کرنا کہ تم پر عذاب آ جائے۔ بُعد قوم لوط سے مراد یہ ہے کہ ان کا زمانہ کچھ بہت دراز نہیں ہوا وہ تو ابھی کل کی بات ہے کہ تمھارے سامنے ہلاک ہو چکی ہیں۔ یا مراد ان کی جگہ کا قریب ہونا ہے اور احتمال ہے کہ یہ دونوں باتیں مراد ہوں۔ پھر گذشتہ گناہوں سے استغفار کرنے اور آیندہ کے لیے توبہ بجا لانے کا حکم دیا اور اللہ کو رحیم اور ودود فرمایا، کیونکہ وہ توبہ قبول کرتا اور بخشتا ہے۔[1]

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

انھوں نے کہا: اے شعیب! جو تو کہتا ہے ہم اس میں سے بہت کچھ نہیں سمجھتے اور بے شک ہم تجھے اپنے درمیان کمزور دیکھتے ہیں۔ اور اگر تیرا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم یقیناً تجھے سنگسار کر دیتے، اور تو ہم پر کوئی غلبہ نہیں رکھتا ﴿91﴾ شعیب نے کہا: اے میری قوم! کیا میرا قبیلہ تم پر اللہ سے زیادہ دباؤ والا ہے؟ اور تم نے اس (اللہ) کو اپنی پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے۔ بے شک تم جو عمل کرتے ہو میرا رب انھیں گھیرنے والا ہے ﴿92﴾

قوم کا جاہلانہ جواب:

قوم نے شعیب علیہ السلام سے کہا کہ تمھاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تم کو ضعیف دیکھتے ہیں۔ امام سعید بن جبیر اور ثوری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ شعیب علیہ السلام ضریر البصر (اندھے) تھے۔ ان کا لقب خطیب الانبیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم ضعیف ہو، یعنی اکیلے تنہا۔ ابو روق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ذلیل ہو، کیونکہ تمھارے کنبے کے لوگ تمھارے دین پر نہیں ہیں۔ اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم تجھ کو سنگسار کرتے یا گالی دیتے۔[2] تو ہم کو کچھ عزیز نہیں ہے۔ اس پر شعیب علیہ السلام نے فرمایا: کیا میری قوم تمھارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ عزیز ہے کہ تم قوم کا منہ کر کے مجھ کو چھوڑتے ہو اور جناب رب العزت سے ڈر کر ترک نہیں کرتے۔ تم نے اللہ کی کتاب کو اپنے پس پشت ڈال دیا ہے۔

[1] فتح البیان (٦/ ٢٣٢۔ ٢٣٣)

[2] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٥٧۔ ٤٥٨) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٦۔ ٢٠٧٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ تم ان امور کی ہم کو خبر دیتے ہو جو معہود نہیں ہیں، جیسے: مر کر دوبارہ زندہ ہونا اور اٹھایا جانا، سو ہم ان باتوں کو امورِ حاضرہ کے مثل نہیں سمجھتے، اس صورت میں فہم کی نفی حقیقتاً ہے نہ کہ مجازاً، یہ بات انھوں نے سننے سے منہ پھیرنے کے طور پر کہی اور یہ جتلایا کہ ہم کو ان باتوں کی کچھ پروا نہیں ہے اور ان کی باتوں کو حقیر سمجھا اور ان کو کمزور بتایا، وہ نابینا تھے، لغتِ حمیر میں اندھے کو ضعیف کہتے ہیں، وہ اللہ کی محبت میں اتنا روئے کہ آنکھیں جاتی رہیں۔ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «بَكَىٰ شُعَيْبٌ مِّنْ حُبِّ اللّٰهِ حَتّٰى عَمِيَ»[1] (أخرجه ابن عساكر والواحدي) امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضعف سے مراد یہ ہے کہ تم اکیلے ہو،[2] یا آنکھوں سے نابینے ہو، یا کسی کام کاج سے عاجز ہو۔ امام حسن اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ذلیل ہو۔[3] پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

"رَهْط" سے مراد جماعت اور خاندان ہے، جن سے انسان کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ رہط کا اطلاق تین سے دس تک یا سات تک پر آتا ہے۔ رہط کو ان کے نقصان پہنچانے سے مانع، باوجود اس کے کہ وہ تھوڑے اور کفار ہزاروں تھے، اس لیے کہا کہ وہ انہی کے دین پر تھے، سو ان کے احترام کے لیے شعیب علیہ السلام کو چھوڑ دیا، نہ کہ ان کے خوف سے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: "فَوَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ غَيْرُهُ مَا هَابُوْا جَلَالَ رَبِّهِمْ مَا هَابُوْا إِلَّا الْعَشِيْرَةَ"[4] رجم سے مراد قتل ہے، یہ قتل جو پتھر سے ہوتا ہے، یہ تمام قتلوں سے برا اور سخت ہے۔ یا رجم سے مراد گالی بکنا اور سخت گفتگو کرنا ہے، لیکن پہلے معانی زیادہ ظاہر ہیں۔

پھر کہا کہ تمھاری کچھ عزت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ہم نے محض تمھاری قوم کی وجہ سے تم کو چھوڑ رکھا ہے، شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا گروہ تم کو عزیز ہوا اور اللہ پاک کا عزیز نہ ہوا۔ یہ بات تعجب کے طور پر کہی، کیونکہ انبیا علیہم السلام کی توہین عین اللہ عزوجل کی توہین ہے۔ تم نے اللہ کو اپنے پسِ پشت ڈالا، یعنی نبی کی توہین کی، سو اللہ تمھارے اعمال کا احاطہ کرنے والا ہے، اس پر تمھارے اقوال اور افعال کی کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے وہ قیامت کے دن تم کو اس کا بدلہ دے گا۔[5]

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ
يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ
رَقِيْبٌ ۝۹۳ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

[1] تاریخ دمشق (۲۳/ ۷۳) اس کی سند میں "علی بن حسن بن بندار" سخت ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٢٥٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٧٦)　[3] تفسير الخازن (٣/ ٢٥٠)

[4] الدر المنثور (٤/ ٤٧١)　[5] فتح البيان (٦/ ٢٣٤_ ٢٣٦)

بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ جلد تم جان لو گے کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور تم انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں (93) اور جب ہمارا حکم (عذاب) آیا تو ہم نے نجات دی شعیب کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی رحمت سے، اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انھیں زبردست چیخ نے آ پکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے (94) جیسے وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو! پھٹکار ہے (اہلِ) مدین پر جیسے ثمود پر پھٹکار پڑی (95)

قوم کو دھمکی:

جب شعیب علیہ السلام ان سے ناامید ہوئے تو کہا کہ اچھا تم اپنے طریقے پر رہو۔ یہ ان کو سخت قسم کا ڈرانا تھا۔ پھر کہا کہ عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کو عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے، تم بھی منتظر رہو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ ﴿جٰثِمِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ ثمود کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کے ہمسائے تھے، ان کے دیار کے قریب بستے تھے اور یہ مشابہت کفر اور رہزنی میں ہے اور ان کی طرح عرب تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جب شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کا کفر پر اصرار کرنے اور آبائی دین پر ڈٹے رہنے کا مصمم ارادہ دیکھا اور اپنے وعظ کی ان پر بے اثری محسوس کی تو ان کو یہ وعید سنائی کہ تم خوب اچھی طرح اپنی حتی الامکان استطاعت اور طاقت کے ساتھ اپنے کام کیے جاؤ، میں بھی جس قدر مجھ سے ممکن ہوا اور اللہ کی تقدیر کے مطابق اپنا کام کروں گا اور اب جلد تم جان لو گے کہ کس کو رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے جو اپنے کام کا وبال چکھے گا، ہم تم دونوں منتظر رہیں۔

قوم پر عذاب اور شعیب علیہ السلام اور اہلِ ایمان کی نجات:

غرض کہ جس وقت اس وعید کے مطابق عذابِ الٰہی آیا، اللہ نے شعیب علیہ السلام کو اور جو لوگ ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے، ان کو اپنی رحمت سے بچا دیا اور جن لوگوں نے کفر پر جمے رہنے سے اپنی جان پر ظلم کیا تھا، ان کو چنگھاڑ نے پکڑ لیا۔ جبریل علیہ السلام نے ایک ایسی چیخ ماری کہ ان کی جانیں ان کے بدن سے نکل گئیں۔ سورت اعراف اور سورت عنکبوت میں "رَجْفَةُ"، اور یہاں "صَيْحَةُ"، فرمایا ہے۔ رجفہ زلزلے کو کہتے ہیں اور وہ صیحہ کے بعد آتا ہے، ہوا کے تموج کے

سبب سے۔ یہ عذاب تو اہلِ قریہ کو آیا۔ رہے اصحاب ایکہ وہ عذابِ ظُلّہ سے ہلاک ہوئے۔ ظلہ ایک آگ تھی جس نے آسمان سے اتر کر ان کو جلا دیا۔

بہرحال اس صیحہ سے وہ لوگ اپنے گھروں میں گھٹنے کے بل کر مر کر رہ گئے، گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ سو دوری ہو، یعنی لعنت پڑے، اہلِ مدین پر، جس طرح لعنت پڑی ثمود پر۔ یا بُعد سے مراد ہلاکت ہے۔ کہتے ہیں کبھی دو امتیں ایک عذاب سے ہلاک نہیں ہوئیں، مگر قومِ شعیب علیہ السلام اور قومِ صالح علیہ السلام۔ قومِ صالح علیہ السلام کو چنگھاڑ نے نیچے سے پکڑا اور قومِ شعیب علیہ السلام کو اوپر سے۔[1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿96﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿97﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿98﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿99﴾

اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا ﴿96﴾ فرعون اور اس (کی قوم) کے سرداروں کی طرف، پھر انھوں نے فرعون کے حکم کی اتباع کی اور فرعون کا حکم کوئی رشد و بھلائی والا نہیں تھا ﴿97﴾ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر انھیں آگ میں جا داخل کرے گا، اور برا ہے وہ گھاٹ جس پر (پینے کے لیے) آیا جائے ﴿98﴾ اور اس (دنیا) میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگا دی گئی اور قیامت کے دن بھی، اور برا ہے وہ انعام جو دیا جائے ﴿99﴾

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ:

اللہ پاک نے خبر دی کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کھلی نشانیاں اور ظاہر دلیلیں دے کر بادشاہِ قبط فرعون کے پاس اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تھا۔ وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی راہ پر تو نہ آئے اور فرعون کے طریقہ غیِّ (سرکشی) پر چلے، حالانکہ فرعون کا کام کچھ نیک انجام نہیں تھا۔ سو جس طرح وہ اس دنیا میں فرعون لعین کے تابع رہے، اسی طرح قیامت کے دن بھی وہ نارِ جہنم کی طرف ان کا پیشوا ہوگا اور ان کو لے جا کر جہنم میں جھونک دے گا اور اس کو عذاب کا ایک بڑا حصہ ہوگا اور یہی شان مشرعین یعنی ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنی شریعت بنا لیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ ﴾ [الأحزاب: ٦٨] ''اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے۔''

---

[1] فتح البیان (٦/ ٢٣٧۔ ٢٣٨)

جہنم اور لعنت فرعون کا مقدر:

اس آیت سے باشارۃ النص فرعون کا ناری ہونا ثابت ہے، جس نے اس کو مومن ناجی کہا ہے اس کا استدلال غلط ہے۔ قرآن پاک سے ہر جگہ اس کا کفر پر مرنا ثابت ہے۔ اب کسی عالم وصوفی کی تاویل اور تفسیر کی حاجت نہیں ہے۔ "الصَّبَاحُ يُغْنِيُ عَنِ الْمِصْبَاحِ" سپیدۂ صبح چراغ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ امراء القیس قیامت کے دن شعرائے جاہلیت کا جھنڈا اٹھائے ہوئے دوزخ کی طرف جا رہا ہوگا۔[1] (رواہ أحمد) اللہ نے فرمایا کہ ہم نے آلِ فرعون کے پیچھے لعنت لگائی، یہ عذابِ نار پر جو دنیا اور آخرت میں ہوگا، زیادہ ہے۔ کیا برا انعام ہے! امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک لعنت قیامت میں ہوگی اور ایک لعنت یہاں دنیا میں ہے، یہ دو لعنتیں ہوئیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ اَلرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴾ سے مراد دنیا اور آخرت کی لعنت ہے۔ امام ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] وھو کقولہ: ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ [القصص: ٤١] "اور ہم نے انھیں (لوگوں کو) آگ کی طرف بلانے والے سرغنے بنا دیا۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ ساتواں قصہ ہے جو اس سورت میں ذکر ہوا۔ پہلے نوح علیہ السلام کا، پھر ہود، صالح، ابراہیم اور لوط علیہم السلام اور مدین کا ترتیب وار۔ یہ قصہ موسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ آیات سے مراد تورات ہے، سلطان مبین سے مراد کھلے معجزے ہیں۔ یا آیات سے مراد نو نشانیاں ہیں، ان میں سے آٹھ نشانیوں کا ذکر سورت اعراف میں ہو چکا ہے اور نویں کا سورت یونس میں ذکر ہوا۔ ان آیات سے مراد تورات نہیں ہے، کیونکہ وہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد نازل ہوئی تھی اور سلطان سے مراد عصا ہے، یہ عصا اگرچہ نو نشانیوں میں سے تھا، لیکن چونکہ ان سب نشانیوں میں سے بڑی نشانی تھا اور عقلوں کو حیران کرنے والا تھا اور عام عادات کو توڑنے والا تھا، اس لیے اس کو الگ کر کے ذکر کیا۔ یا آیت وہ ہے جو مفیدِ ظن ہو اور سلطان وہ ہے جو مفیدِ یقین ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ آیات اور سلطان ایک ہی چیز ہیں۔ یعنی ہم نے موسیٰ کو ایسی چیز دے کر بھیجا جو آیت بھی ہے اور سلطان بھی ہے، یا مراد سلطان سے وہ محاورہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوا تھا۔

﴿ مَلَاْ ﴾ اشرافِ قوم کو کہتے ہیں۔ ان کا ذکر کیا، نہ کہ ساری قوم کا، اس لیے کہ باقی قوم انھی سرداروں کے تابع تھی۔ اصدار (صادر کرنا) اور ایراد (نیچے لانا) میں ان لوگوں نے کفر میں فرعون کی پیروی اختیار کی، حالانکہ فرعون کا کفر ایک واضح چیز تھی اور سرداروں کا کفر، اسی کے کفر کو ماننے پر تھا۔ یا امرِ فرعون سے مراد طریقہ اور شانِ فرعون ہے،

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٢٨) اس کی سند میں "ابوالجہم" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٩٣٠)

[2] تفسير الطبري (١٥/ ٤٦٨۔ ٤٧٠)

اس لیے کفر وغیرہ کو عام ہوگا۔ اللہ نے کہا کہ فرعون کا امر درست نہیں تھا، بلکہ غيّ (سرکشی) ہے۔ اس میں یہ بات پیش کی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا امر (کام) ہدایت ہے اور فرعون کا امر (کام) گمراہی ہے۔ بالجملہ فرعون قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور قوم کو لے جا کر آگ میں ڈال دے گا، یہ لوگ اس کے پیچھے ہوں گے۔

وُرُوْد سے مراد دخول ہے، اُس نے ان کو دنیا میں بھی آگ میں جھونک دیا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا ﴾ [المؤمن: ٤٦] ''(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح وشام پیش کیا جاتا ہے۔'' بعض نے کہا ہے کہ اس نے قوم کو ایسی چیزوں پر وارد کیا جو آگ کے عذاب کی موجب اور اس کا سبب ہیں، لیکن اس میں فا کے عطف کی وجہ سے بُعد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون اپنی قوم کے آگے چلے گا، یہاں تک کہ ان کو آگ میں داخل کر دے گا۔[1] اللہ نے کہا: یہ برا گھاٹ ہے، کیونکہ جس پانی پر وارد ہوتے ہیں، وہ پیاس کی گرمی بجھاتا ہے اور تشنگی کو دور کرتا ہے اور آگ برخلاف اس کے ہے تو یہ وارد ہونا برا ٹھہرا۔ قومِ فرعون کے یا اس کے سرداروں کے ساتھ یا ان کو فرعون کے ساتھ لعنتِ عظیم چپکا دی گئی، اس دنیا میں جو امتیں آئیں، سب نے ان پر لعنت کی اور پھر قیامت میں سارے اہلِ محشر بھی ان پر لعنت کریں گے۔ یہ لعنت ان کا انعام ہے، بطریقِ تہکم (استہزاء کے طور پر)۔[2]

﴿ اَلرِّفْدُ ﴾ اصل میں بمعنی اعانت وعطا ہے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اس مقام کے مناسب نہیں ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلرِّفْدُ ﴾ شراب سے بھرے ہوئے پیالے کو کہتے ہیں۔ گویا یہ اس چیز کی مذمت ہے جس کو وہ آگ میں پئیں گے، یہی انسب مقام ہے۔[3]

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾

(اے نبی!) یہ کچھ خبریں ان (تباہ شدہ) بستیوں کی ہیں جو ہم آپ کو سناتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو قائم ہیں اور کچھ تہس نہس کر دی گئیں ﴿۱۰۰﴾ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن انھوں نے (خود ہی) اپنے آپ پر ظلم کیا تھا، تو ان کے وہ معبود جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے ان کے کسی کام نہ آئے، جب آپ کے رب کا حکم (عذاب) آپہنچا، بلکہ انھوں نے ان کو تباہی میں ہی زیادہ کیا ﴿۱۰۱﴾

تباہ شدہ بستیوں سے عبرت خیزی اور سنت اللہ:

اللہ نے انبیا اور ان کی امتوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کی خبریں ہیں جن میں سے کوئی آباد ہے اور کوئی

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٤٦٦) [2] تفسير أبي السعود (٤/ ٢٣٩) [3] فتح القدير (٢/ ٧٢٧) فتح البيان (٦/ ٢٣٩۔ ٢٤١)

ہلاک ہو چکا ہے۔ اس ہلاک کرنے میں ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔ اپنے کفر اور انبیا کی تکذیب کی وجہ سے جب ان پر ہلاک کرنے والا عذاب آیا تو ان کے اوثان جن کو وہ پکارتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آئے اور نہ اُن کو اس ہلاکت اور عذاب سے بچا سکے، بلکہ ان کی ہلاکت کو اور زیادہ کر دیا۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَتۡبِيۡبٍ ﴾ سے مراد تخسیر ہے،[1] یعنی خسران و نقصان میں ڈالنا، کیونکہ ان کی ہلاکت کا سبب یہی ان کا اوثان کا اتباع کرنا ہے۔ وہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خسارہ پانے والے ہو گئے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ سات قصے جو ہم نے اس سورت میں بیان کیے، یہ گزری ہوئی امتوں اور زمانوں کی خبریں ہیں کہ انھوں نے اپنے انبیا کے ساتھ کیا کیا، پھر ان پر کیا بلا آئی۔ من جملہ ان بستیوں کے جن کے رہنے والے ہلاک ہوئے، بعض قائم ہیں، یعنی آباد اور بعض حصید ہیں، یعنی ویران۔ قائم وہ جو اپنے عروش (چھتوں) پر باقی ہے اور حصید وہ جس کا اثر باقی نہ رہا۔ بعض نے کہا ہے کہ قائم وہ بستیاں ہیں جو ویران ہو گئیں اور حصید وہ جو جڑ سے اکھیڑ ڈالی گئیں۔ بستیوں کے آثار کو زراعت کے مشابہ فرمایا جو اپنی ساق (تنے) پر کھڑی ہو اور جو مقطوع (کاٹ ڈلی گئی) اور معفو (مٹا دی گئی) سے اس کو حصید کے مشابہ کہا ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدید ست صنادید عجم را

''ٹوٹے پھوٹے دروازوں اور دیواروں کے بیل بوٹوں سے عجمی سرداروں کے آثار ظاہر ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آباد گاؤں اور ویران دیہات مراد ہیں۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قائم وہ ہیں کہ جن کی جگہ دکھائی دیتی ہے اور حصید وہ ہیں کہ جن کا نشان باقی نہیں رہا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قائم وہ ہیں جو اپنے عروش پر گرے پڑے ہیں اور حصید وہ ہیں جو زمین سے ملصق (پیوستہ) ہیں۔[3] معنی یہ ہوئے کہ بعض باقی ہیں اور بعض فانی ہیں۔ گویا جب قریٰ کا حال بیان کیا تو سوال پیدا ہوا کہ ان کا کیا حال ہے، آثار ان کے باقی ہیں یا نہیں؟

اللہ پاک نے فرمایا: ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اس عذاب و ہلاکت سے، بلکہ خود انھوں نے اپنی جان کو ہلاکت کا نشانہ بنایا، یعنی کفر و معاصی کر کے۔ پھر ان کے بت اس عذاب کو ان سے دور نہ کر سکے جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، یعنی پوجتے تھے، بلکہ ان کو اور زیادہ ہلاکت اور خسارے میں ڈالا، حالانکہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ ان کی مدد کریں گے اور نفع پہنچائیں گے اور ضرر کو دور کریں گے۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٣٧٣) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٧١) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[3] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٧١) [4] فتح البیان (٦/ ٢٤٢)

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲

اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے (102)

ظالموں کی سخت پکڑ:

اللہ پاک فرماتا ہے: جس طرح ہم نے ان قرونِ ظالمہ کو ہلاک کیا ہے، اسی طرح ہم ان جیسی قرون کے ساتھ کریں گے۔ اللہ کی پکڑ سخت اور دردناک ہے۔ صحیحین میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ لِلظَّالِمِ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ » ثُمَّ قَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ: یعنی اللہ پاک ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ظلم سے مراد گناہ ہیں۔ اللہ کا کافروں کو سزا دینا سخت ہے تو یہ گمان نہ کر کہ یہ آیت صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے، جو اگلی امتوں میں گزر گئے ہیں، بلکہ اس آیت کا حکم ہر ظالم کے حق میں عام ہے۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اسی کی تائید کرتی ہے۔[2]

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝۱۰۳ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝۱۰۴ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِىٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝۱۰۵

بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نشانِ (عبرت) ہے جو عذابِ آخرت سے ڈر گیا۔ وہ (یومِ آخرت) ایسا دن ہے جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ ایسا دن ہے جب (سب) حاضر کیے جائیں گے (103) اور صرف ہم ایک مقرر وقت تک ہی اس میں تاخیر کر رہے ہیں (104) (جب) وہ دن آ جائے گا تو کوئی نفس اللہ کے اِذن کے بغیر کلام نہیں کر سکے گا، پھر ان میں سے کوئی تو بد بخت ہوگا اور کوئی نیک بخت (105)

بستیوں کی ہلاکت میں قیامِ قیامت کی دلیل:

اللہ پاک نے فرمایا کہ ہم نے جو کافروں کو ہلاک کیا اور مومنوں کو نجات دی اس میں ایک وعظ ہے اور آخرت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٣)
[2] فتح البيان (٦/ ٢٤٣)

کے بارے میں ہمارے وعدے کی سچائی کے لیے عبرت ہے۔ اس دن اولین اور آخرین جمع ہوں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٧] ”اور ہم ان کو اکٹھا کریں گے، چناں چہ ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴾ (آیتِ باب) اس کو مشہود اس لیے کہا کہ اس دن ملائکہ حاضر ہوں گے، رسول اکٹھے ہوں گے، ساری خلق کا حشر ہوگا۔ عادل غیر ظالم کا حکم چلے گا۔ قیامت کے آنے میں دیر اس لیے ہے کہ اس کا کلمہ بنی آدم کے حق میں گزر چکا ہے کہ جب اتنے لوگ پیدا ہو چکیں گے تب قیامت قائم ہوگی۔ بنی آدم کے سلسلے کو مکمل اور ختم کرنے کے لیے ایک مدتِ معین مقرر ہو چکی ہے۔ اس مقررہ مدت کے پورے ہونے پر قیامت آئے گی۔

اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکے گا:

پھر جب قیامت آئے گی تو کوئی نفس اللہ کے حکم کے سوا بات نہیں کر سکے گا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبا: ٣٨] ”اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ [طٰهٰ: ١٠٨] ”اور سب آوازیں رحمٰن کے سامنے پست ہو جائیں گی۔“ اور صحیحین کے نزدیک حدیثِ شفاعت میں آیا ہے: « وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ إِلَّا الرُّسُلُ، وَدَعْوَى الرُّسُلِ يَوْمَئِذٍ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ »[1]

جنتی اور جہنمی گروہ:

پھر فرمایا کہ ان تمام جمع ہونے والوں میں کوئی بد بخت ہوگا اور کوئی نیک بخت۔ ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ [الشورىٰ: ٧] ”ایک گروہ جنت میں ہوگا اور دوسرا بھڑکنے والی آگ میں۔“ جنت کا فریق نیک بخت لوگ ہیں اور جہنم کا فریق بد بخت لوگ ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴾ (آیتِ باب) تو میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کس لیے عمل کرتے ہیں، اس شے پر جس سے فراغت ہو چکی ہے یا کسی نئی شے پر؟ آپ ﷺ نے فرمایا: بلکہ اس شے پر جس سے فراغت ہو چکی ہے، اے عمر! جس کے ساتھ قلم جاری ہو چکا ہے، ہر کسی پر وہ امر آسان ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔[2] (رواه أبو يعلى في مسنده)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ان ساتوں قصوں میں جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں، عبرت اور نصیحت ہے،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١١) مسند أبي يعلىٰ (٩/ ٤٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٦١)

کیونکہ ان میں دنیا اور آخرت کے عذاب کا بیان ہے۔ سو پہلا تو حاصل ہو چکا ہے، اب عقل منداس سے معلوم کر سکتا ہے کہ جس کو پہلے عذاب کے نازل کرنے کی قدرت ہے، اُسے دوسرے عذاب کے نازل کرنے پر بھی قدرت ہے۔ جس کو عذابِ آخرت کا خوف ہے، وہی ان عبرتوں سے عبرت اور ان نصیحتوں سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔

امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم عن قریب آخرت میں اپنا وعدہ پورا کریں گے، جس طرح کہ ہم نے انبیا کے ساتھ اپنی مدد کا وعدہ پورا کیا ہے۔[1] آخرت کا دن وہ دن ہو گا جس دن سارے اگلے پچھلے لوگ حساب و کتاب اور جزا کے لیے حاضر کیے جائیں گے اور وہاں اہلِ محشر اور ساری خلائق اور اہلِ ارض و سما حاضر ہوں گے۔ ہم نے اس دن میں تاخیر نہیں کی مگر ایک مقررہ مدت تک، یعنی جو گنتی کے لحاظ سے معلوم ہے جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، وہ مدت دنیا کی ہے۔ اللہ نے جزا کا ہونا اس مدتِ مذکور کے بعد مقرر کیا ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مدتِ قلیل کا پورا ہو جانا ہے جو اللہ کے علم اور حکمت کے تقاضے کے تحت مقرر ہو چکی ہے۔[2] جس دن قیامت آئے گی اس دن کوئی جان دار اللہ کی اجازت اور حکم کے بغیر بات نہ کرے گا، یعنی حجت اور شفاعت کے ساتھ، مگر اللہ کی اجازت سے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبأ: ۳۸] ''اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمن اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۵] ''کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟'' نیز فرمایا: ﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾ [المرسلات: ۳۵۔ ۳۶] ''یہ (وہ) دن ہے کہ (لوگ) بول نہیں سکیں گے۔ اور نہ انھیں اذن ملے گا کہ وہ معذرت کر سکیں۔'' رہی یہ آیت: ﴿ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا ﴾ [النحل: ۱۱۱] ''جس دن ہر نفس اپنی طرف سے جھگڑتا ہوا آئے گا۔'' اور کافروں کا بحث کرنا کہ ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ۲۳] ''اللہ، ہمارے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔''

سو ان آیات اور آیتِ باب میں جمع کی صورت یہ ہے کہ یہ حالات کے مختلف ہونے اور قیامت کے مختلف جگہوں پر محمول ہیں۔ اس طرح کی جمع قرآن مجید میں بہت سے موقعوں پر بار بار آئی ہے۔ پھر ان نفوس اور مختلف جگہوں پر ٹھہرے ہوئے لوگوں میں بعض بدبخت اور بعض نیک بخت ہیں۔ بدبخت کا نیک بخت سے پہلے اس لیے ذکر کیا کہ یہ ڈرانے کا مقام ہے۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اہلِ موقف دو ہی قسم کے ہیں، تیسری قسم نہیں ہے۔ ظاہر آیت اور حدیث اسی پر دلالت کرتی ہیں، لیکن ایک قسم وہ ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا، یعنی وہ لوگ جن کی نیکیاں اور بدیاں

---

[1] تفسیر الطبري (۱۵/ ۴۷۷) [2] تفسیر أبي السعود (۴/ ۲۴۱)

برابر ہیں یا نہ ان کی نیکیاں ہیں اور نہ برائیاں، جیسے مجنون اور بچے۔ سو یہ قسم مشیت کے تحت ہے، اللہ جو چاہے گا وہ ان کے درمیان حکم کرے گا۔ دو مذکور اقسام کی تخصیص سے تیسری قسم کی نفی نہیں ہوتی۔[1]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿١٠٦﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾

چناں چہ جو لوگ بد بخت ہوں گے تو (وہ) آگ میں ہوں گے، ان کے لیے اس (آگ) میں بس چیخنا چلانا اور دھاڑنا ہوگا (106) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین (باقی) رہیں گے، مگر یہ کہ آپ کا رب (کچھ اور) چاہے۔ بے شک آپ کا رب جو چاہے اسے کر گزرنے والا ہے (107)

بدبختوں کا ٹھکانا ابدی جہنم اور اس میں چیخنا چلانا:

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ آگ میں اتنی دیر رہیں جتنی دیر دنیا میں آسمان و زمین میں رہ چکے ہیں، مگر جتنا اور تیرا رب چاہے وہ اسی کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ آگ میں اس وقت تک رہیں جب تک اس جہان کا آسمان و زمین رہے، یعنی ہمیشہ، مگر جو رب چاہے وہ موقوف کر دے، لیکن رب تو فیصلہ کر چکا کہ موقوف نہ ہو۔ اس کہنے میں یہ فرق ہوا کہ اللہ کا ہمیشہ رہنا اور بندے کا ہمیشہ رہنا مختلف ہے۔ بندے کے عذاب میں ہمیشہ رہنے میں یہ فرق ہے کہ اللہ چاہے تو فنا کر دے، یہ بیان موضح قرآن میں ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اول نفس چلانا اور آخر نفس دھاڑنا ہوگا۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کی عادت یہ ہے کہ جب کسی چیز کی صفت دوام اور ابد کے ساتھ کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں: "هٰذَا دَائِمٌ دَوَامَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں: "هُوَ بَاقٍ مَا اخْتَلَفَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ"، سو اللہ جل شانہ نے ان کے لیے ان کا وہی متعارف انداز بیان فرمایا۔[3] میں کہتا ہوں کہ اس کا احتمال ہے کہ مراد آسمانوں اور زمین کے دوام سے جنس ہو، اس لیے کہ آخرت میں بھی آسمان و زمین ہوں گے۔ اگرچہ یہاں کا آسمان اور زمین نہ ہو۔ سو مراد وہاں کا آسمان و زمین ہے، وہ ہمیشہ رہے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت میں کہا ہے کہ ہر جنت کے لیے آسمان و زمین ہے۔[4] اور استثنا اس قول کے مثل ہے: ﴿ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [الأنعام: ١٢٨] "آگ ہی تمھارا ٹھکانا ہے، تم

---

[1] فتح البيان (٦/ ٢٤٣۔ ٢٤٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٨٥)
[3] تفسير الطبري (١٥/ ٤٨١) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٨٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

اس میں ہمیشہ رہو گے، ہاں اگر اللہ چاہے (تو دوسری بات ہے)۔'' اہلِ علم نے اس استثنا میں بہت سی وجوہات پر اختلاف کیا ہے، جن کو امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے تفسیر زاد المسیر میں تحریر کیا ہے۔[1] اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں کہا ہے اور امام خالد بن معدان، ضحاک، قتادہ اور ابو سنان رحمہم اللہ کے قول کو نقل کر کے اختیار کیا ہے کہ استثنا کا اطلاق موحد گناہ گار پر ہے[2] اور بعض سلف سے اس کی تفسیر میں اقوالِ غریبہ آئے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''اَللّٰہُ أَعْلَمُ بِثُنْیَاہُ''[3] امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا کلام مکمل ہوا۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ جن لوگوں کے لیے اللہ کے علم میں شقاوت پہلے ثابت ہو چکی ہے اور وہ کفر پر مر گئے ہیں، اگرچہ پہلے ایمان لا چکے تھے، ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے، وہ نار میں زفیر وشہیق (چیخیں چلائیں) کریں گے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زفیر شدتِ انین کو کہتے ہیں جو سخت بلند ہو، یعنی چلا کر رونا اور بصرہ اور کوفہ کے اہلِ لغت کا زعم یہ ہے کہ زفیر گدھے کی شروع کی آواز کی مثل اور شہیق آخر کی آواز کی مثل ہے۔[5] اور بعض نے کہا ہے کہ زفیر گدھے کی آواز ہے اور شہیق خچر کی آواز ہے یا زفیر سخت آواز ہے اور شہیق آوازِ ضعیف یا زفیر سانس باہر نکالنے کی آواز ہے اور شہیق آواز ہے سانس کو اندر کی طرف کھینچنے کی۔ یا زفیر سینے سے ہوتی ہے اور شہیق حلق سے۔ یا زفیر سانس کا آنا جانا ہے جب خوف کی شدت ہو، یہاں تک کہ سانس پھول جائے اور جسم کا ہر حصہ متاثر ہو جائے اور شہیق لمبی آواز یا سانس کا سینے میں پھیرنا ہے۔

بہرحال ان دونوں سے مراد تکلیف اور غم کی شدت کو ظاہر کرنا ہے۔ ان کے حال کو اس شخص کے حال کے مشابہ کہا ہے کہ جس کے دل پر حرارت چھا گئی ہے اور اس کی جان گھٹ رہی ہے۔ امام لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زفیر یہ ہے کہ مرد کا سینہ شدتِ غم سے بھر جائے اور سانس نکلے اور شہیق یہ ہے کہ ٹھنڈی آہ بھرے۔[6] بہرحال دوزخ میں ان کا رہنا وہاں تک ہوگا جہاں تک آسمان اور زمین ہیں، یعنی ان کی دنیا میں دوام کی مدت، یہ مدت اس کے علاوہ ہوگی جو اللہ زیادہ کرے گا، جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

''جب تک زمین وآسمان (باقی) رہیں گے۔'' سے مراد:

لفظ ﴿ دَامَتِ ﴾ اس جگہ تامہ ہے، بمعنی بقیت۔ علما کا توقیتِ مذکور کے معنے میں اختلاف ہے، اس لیے کہ قطعی دلیلوں سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ آگ میں کفار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب ہوگا جو منقطع نہیں ہوگا اور یہ بات بھی

---

(1) زاد المسير (٤/ ١٦٠۔ ١٦١) (2) تفسير الطبري (١٥/ ٤٨١۔ ٤٨٥) (3) تفسير الطبري (١٥/ ٤٨٢)
(4) تفسير ابن كثير (٢/ ٥٩٨۔ ٥٩٩) (5) معاني القرآن (٣/ ٧٩) (6) تفسير الرازي (١٨/ ٥٠)

ثابت ہے کہ آسمان و زمین اس دنیا کے سلسلۂ ایام کے ختم ہونے کے بعد جاتے رہیں گے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ خبر دی جا رہی ہے عرب کی عادت اور محاورے پر کہ وہ لوگ جب کسی چیز کے دوام میں مبالغہ کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ وہ دائم ہے بدوام آسمان و زمین۔ اور ان کے اقوال میں سے یہ ہے: "لَا آتِيكَ مَا جَنَّ اللَّيْلُ وَمَا نَاحَ الْحَمَّامُ وَنَحْوَ ذٰلِكَ" اس صورت میں یہ معنی ہوئے کہ وہ مخلد فی النار رہیں گے بلا انقطاع جس کی کچھ انتہا نہ ہوگی۔ یا مراد آخرت کا آسمان و زمین ہے، کیونکہ اس پر دلیل آئی ہے کہ آخرت میں آسمان و زمین وہاں کا ہوگا سوا اس آسمان و زمینِ دنیا کے۔ تو یہ رہنا ان کا دائم بدوام آخرت ہوا۔ علاوہ اس کے ضروری ہے کہ کوئی جگہ ان کو اٹھائے اور کوئی چیز ان پر سایہ کرے، سو وہ دونوں چیزیں یہی ارض و سما ہوں گے۔ استثنا میں اہلِ علم کے اقوال ہیں۔

فتح البیان میں اس جگہ گیارہ اقوال ان کے کہنے والوں کے ناموں کے ساتھ ذکر کیے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے من جملہ تیرہ اقوال کے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اس جگہ ﴿إِلَّا﴾ عطف کے طور پر آیا ہے، گویا یہ فرمایا کہ ہمیشہ نار میں رہیں گے جب تک کہ آسمان و زمین ہے اور زیادہ اس مدت پر جس کی انتہا نہیں ہے۔[1] جمل میں ہے کہ یہ وجہ حسن ہے۔ سمین نے مذکورہ وجوہ کا استیفاء (مکمل) کیا ہے۔ امام ابن حجر مکی رحمہ اللہ نے زواجر میں کہا ہے کہ آیات و احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کفار کو جہنم میں ابدی دائمی عذاب ہوگا اور جو قول اس کے خلاف آیا ہے اس کی تاویل کرنا واجب ہے، جیسے یہ آیتِ باب۔ علما نے اس آیت میں بیس وجہ بیان کی ہیں، بعض کا مرجع آسمانوں اور زمین کے دوام کی حکمت کے ساتھ مقید ہے اور بعض کا حکمتِ استثنا کی طرف۔[2]

گناہ گاروں کا استثناء:

پھر اکثر وجوہ کا ذکر کیا ہے جو فتح البیان میں منقول ہیں اور ان وجوہ کے علاوہ اور اقوال بھی بیان کیے ہیں اور صاحبِ زواجر (مؤلف کتاب "الزواجر عن اقتراف الکبائر") نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم رحمہما اللہ کا جو تغلیط اور تخطیہ (غلطی اور خطا پکڑنا) کیا ہے اس کا ذکر بھی آیا ہے۔ وہ کچھ اس قول میں اکیلے نہیں ہیں، بلکہ بعض سلف بھی اسی طرف گئے ہیں اور شیخ ابن عربی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ غایت یہ ہے کہ یہ اس قول میں ان بعض سلف سے خطا ہی ہوئی ہے، سو وہ اس خطا پر بھی ایک اجر کے مستحق ہیں، ان کا یہ قول مأوّل ہے، کیونکہ جہنم نار کے طبقۂ اول کا نام ہے، اس میں موحدین گناہ گار اور کبیرہ گناہ والے لوگ جائیں گے، پھر شفاعتِ شافعین اور ارحم الراحمین کے رحم سے ایک مدت کے بعد جہنم سے نکل کر بہشت میں داخل ہوں گے۔ وہ سارا طبقہ خالی رہ

---

[1] تفسیر الجلالین (١/ ٣٠٠) [2] الزواجر (١/ ٦٠ـ ٦١)

جائے گا اس میں کوئی شخص نہ ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے: «لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى جَهَنَّمَ يَوْمٌ تُصْفَقُ فِيْهِ أَبْوَابُهَا لَيْسَ فِيْهَا أَحَدٌ»[1] (رواه أحمد وحكاه البغوي وغيره عن أبي هريرة رضي الله عنه وغيره) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور تابعین کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے اور ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرفوع حدیث معجم کبیر طبرانی میں آئی ہے،[2] لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کشاف میں اس مقام پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ جو مجبرہ کہتے ہیں کہ استثنا سے مراد اہلِ کبائر کا نار سے خروج ہے، سو استثنا ثانی اس کی تکذیب پر منادی اور ان کے افترا کی تسجیل کرتا ہے۔[3] الخ۔

سو امام ربانی قاضی محمد علی شوکانی رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اے مسکین! تجھے یہ معلوم نہیں کہ اس قول کے کہ اہلِ کبائر جہنم سے خارج ہوں گے، قائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جس طرح اسلام کے دیوانوں اور سنتِ مطہرہ کے دفاتر میں یہ بات ایک جماعتِ صحابہ کے طریق سے، جو عددِ تواتر کو پہنچتے ہیں، ثابت ہو چکی ہے۔ تجھ کو طعن کرنے سے کیا مطلب ہے ایک ایسی قوم پر جس نے وہ بات جان پہچان لی جو تجھ سے پوشیدہ رہی اور ایسا عمل کیا جس سے تو ایک دور کے فاصلے پر ہے۔ کون اس کا مانع ہے کہ اس استثنا کو اُس بات پر محمول کیا جائے جو کثیر تعداد میں دلائلِ صحیحہ سے ثابت ہے اور جمہور علمائے سلف و خلف اس کے قائل ہیں اور استثنا ثانی کی بات اس تکذیب پر غلط ہے، کوئی چیز اس امت کے عصاۃ کو مانع نہیں ہے کہ ہر دو استثنا کو ہر دو موقع پر محمول کرے۔ رہا سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر طعن، سوائے محمود! کیا تُو جانتا ہے کہ تُو نے کیا کیا اور تو کس وادی میں جا گرا اور کس پہلو پر گرا اور تو کون ہے کہ اس مکان پر چڑھتا ہے اور بے کار ہاتھ اور لنگڑے پاؤں سے آسمان کے ستاروں کو حاصل کرنا چاہتا ہے، کیا تجھے طالبانِ نحو ولغت کافی نہیں کہ تُو نے ایسے علم میں دخل دیا جس سے تو جاہل ہے۔ فَيَا لِلّٰهِ الْعَجَبُ مَا يَفْعَلُ الْقُصُوْرُ فِيْ عِلْمِ الرِّوَايَةِ وَالْبُعْدِ عَنْ مَّعْرِفَتِهَا إِلٰى أَبْعَدِ مَكَانٍ مِّنَ الْفَضِيْحَةِ لِمَنْ لَّمْ يَعْرِفْ قَدْرَ نَفْسِهِ وَلَا أَوْقَفَهَا حَيْثُ أَوْقَفَهَا اللّٰهُ سُبْحَانَهُ، انْتَهٰى حَاصِلُهُ.[4]

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴿۱۰۸﴾

اور لیکن جو نیک بخت بنائے گئے ہوں گے تو (وہ) جنت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب

[1] مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔ مسند البزار (٦/ ٤٤٢) تفسیر البغوي (٤/ ٢٠٢) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة (رقم الحديث: ٦٠٧) میں بحث کرتے ہوئے مذکور روایت کو ذکر کیا ہے اور اس میں "ابو بلج" راوی کو ضعیف کہا ہے۔

[2] المعجم الكبير (٨/ ٢٤٧) اس کی سند میں "جعفر بن زبیر" اور "عبداللہ بن مسعر" سخت ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٠٧)

[3] الكشاف (٢/ ٤٠٥۔ ٤٠٦) [4] فتح القدير (٢/ ٧٣٣) فتح البيان (٦/ ٢٤٥۔ ٢٥٥)

تک آسمان اور زمین (باقی) رہیں گے، مگر یہ کہ آپ کا رب (کچھ اور) چاہے، (یہ اللہ کا) نہ ختم ہونے والا انعام ہے ﴿108﴾

نیک بختوں کا مقام:

جو لوگ نیک بخت ہوئے وہ اتباعِ رسل ہیں، وہ تا دوامِ آسمان و زمین جنت میں رہیں گے، مگر جو اللہ چاہے۔ اس جگہ استثنا سے مراد وہی ہے کہ اُن کا دوام کوئی امرِ واجب بذاتہ نہیں ہے، بلکہ مشیتِ الٰہی کی طرف موکول (سپرد کیا گیا) ہے۔ امام ضحاک اور حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان گناہگاروں کے حق میں ہے جو موحد ہیں اور آگ میں جائیں گے، پھر آگ سے باہر نکالے جائیں گے، یہ عطا منقطع ہونے والی نہ ہوگی۔[1] (قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما و غیر واحد)

یہ اس لیے کہ مشیت کے ذکر سے کہیں یہ وہم نہ ہو کہ وہاں انقطاع ہوگا جس طرح اہلِ نار کے حق میں کہا ہے کہ عذابِ اہلِ نار دائمی ہے اور مشیتِ الٰہی کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اللہ نے اپنے عدل و حکمت سے ان کو عذاب کیا ہے، اس لیے فرمایا کہ تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ «يُؤْتیٰ بِالْمَوْتِ فِيْ صُوْرَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فَيُذْبَحُ ثُمَّ يُقَالُ: يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ خُلُوْدٌ، فَلَا مَوْتَ، وَيَا أَهْلَ النَّارِ، خُلُوْدٌ فَلَا مَوْتَ»[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو لوگ اللہ کے علم میں سعادت مند ہو چکے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان پر مرتے ہیں، اگرچہ پہلے ان سے کفر یا عصیان ہو چکا تھا، وہ بہشت میں ہوں گے، ہمیشہ کے لیے جب تک کہ آسمان و زمین قائم ہے، مگر جو تیرا رب چاہے اس سے زیادہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس سے دوامِ خلود ثابت ہوا اس لیے اس عطا کو غیر منقطع فرمایا ہے، یعنی اس کا امتداد (جاری رہنا) غیر النہایۃ ہے (جس کی انتہا نہیں ہے)۔ قاضی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس بات کی تصریح ہے کہ ثواب مذکور کبھی منقطع نہیں ہوگا۔[3]

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ
اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿109﴾ وَلَقَدْ
اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿110﴾ وَاِنَّ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٨٧۔ ٢٠٨٨) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٩)
[3] فتح البيان (٦/ ٢٥٦۔ ٢٥٧)

كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١١١﴾

چناں چہ آپ ان کے متعلق تردد میں نہ پڑیں، جن کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں، یہ لوگ تو ویسے ہی عبادت کرتے ہیں جیسے اس سے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے، اور بے شک ہم انھیں ان کا حصہ بغیر کسی کمی کے پورا پورا دیں گے ﴿١٠٩﴾ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے (طے) ہو چکی ہے تو ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور بلاشبہ وہ اس کے متعلق البتہ بے چین کرنے والے شک میں ہیں ﴿١١٠﴾ اور بے شک آپ کا رب ضرور ہر ایک کو ان کے اعمال کی پوری پوری جزا دے گا۔ بے شک وہ جو عمل کرتے ہیں اللہ ان سے خوب باخبر ہے ﴿١١١﴾

شرک بلا شک گمراہی ہے:

یعنی کتاب دی تھی راہ بتانے کے لیے، وہ لوگ اس کے سمجھنے میں اختلاف کرنے لگے اور یہ بات پہلے ہو چکی ہے کہ دنیا میں سچ اور جھوٹ صاف نہ ہوا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے فرمایا کہ جس چیز کو یہ مشرک پوجتے ہیں، تم کچھ شک نہ کرو کہ وہ باطل ہے، ان کے پاس اس کے پوجنے کی کوئی سند نہیں ہے مگر یہی باپ دادا کی پیروی، سو اللہ ان کو اس تقلید اور شرک کا بدلہ دے گا اور عذاب کرے گا۔ اگر ان کی نیکیاں ہیں تو ان کا بدلہ اسی دنیا میں دے دیتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نصیب سے مراد وعدۂ خیر و شر ہے۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب ہے۔[2]

پھر موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ذکر کیا کہ کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس کا منکر ہوا، سو تم کو اگلے انبیا کی چال پر چلنا چاہیے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ کے بندوں کے لیے ایک مدتِ معلوم مقرر کر رکھی ہے تو ابھی فیصلہ ہو جاتا اور احتمال ہے کہ اللہ کسی کو عذاب نہ کرے گا، مگر حجت قائم کرنے کے بعد، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ [طٰہٰ: ١٢٩] ''اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی سے (طے) نہ ہو چکی ہوتی اور میعاد مقرر بھی (نہ ہوتی) تو (انھیں عذاب) چمٹ کے رہتا۔''

پھر یہ خبر دی کہ کافروں کو اس چیز میں شک ہے جو رسول لائے ہیں۔ پھر یہ فرمایا کہ اللہ پہلی اور آخری تمام امتوں کو جمع کر کے ان کے اعمال کی سزا و جزا دے گا۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ مِرْيَةٍ ﴾ سے مراد شک ہے اور ﴿ هٰٓؤُلَآءِ ﴾ سے مراد زمانۂ نبوت کے کافر لوگ ہیں،

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٩٢) اس کی سند میں ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١٥/ ٤٩٢) [3] تفسیر ابن کثیر (٢/ ٥٩٩۔ ٦٠٠)

جیسے: قریش۔ فرمایا تو ان اصنام کے باطل ہونے میں شک نہ کر، یا ان کی بری عاقبت میں، اور اگر سب معانی پر آیت کو محمول کریں تو بھی کوئی امر مانع نہیں ہے اور یہ ممانعت نبی اکرم ﷺ کو ہے، اس میں دوسروں کے لیے اشارہ ہے، جن کے دل میں کچھ شک آئے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ تو اس میں ہرگز شک نہیں کرتے تھے۔

پھر اللہ پاک نے کہا کہ ان کفار کے معبود ویسے ہی ہیں کہ جیسے معبود ان کے آبا کے پہلے سے تھے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ یہ سب شرک میں اور غیر اللہ کی عبادت میں برابر ہیں۔ تو اے رسول! آپ اپنی قوم کے شرک کو دیکھ کر دل میں تنگ نہ ہوں کہ یہ بھی اگلے انسانوں کے گروہوں کی طرح ہیں۔ خازن میں ہے: ”يَعْنِي أَنَّهُ لَيْسَ لَهُمْ فِي عِبَادَةِ هَذِهِ الْأَصْنَامِ مُسْتَنَدٌ إِلَّا تَقْلِيْدُ آبَاءِهِمْ“ یعنی ان کے پاس اس شرک پر سوائے اپنے باپ دادا کی تقلید کے کوئی سند نہیں ہے۔[1] معلوم ہوا کہ تقلید مستند اہلِ شرک ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے تقلید کو اہلِ شرک اور اہلِ کتاب سے حکایت کیا ہے اور ہر جگہ اس کو قابلِ مذمت مقام میں ذکر فرمایا ہے۔

پھر فرمایا کہ ہم ان کا حصہ عذاب سے بھرپور بغیر کسی کمی کے ان کو دیں گے۔ یا نصیب سے مراد رزق ہے۔ یا وہ جو عام ہو خیر اور شر میں سے۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی تھی، اس کی شان اور احکام کی تفاصیل میں اختلاف کیا گیا۔ ایک قوم ایمان لائی، دوسری قوم نے کفر کیا، بعض نے عمل کیا، بعض نے اس کو چھوڑ دیا، اسی طرح اس قوم کا قرآن کے بارے میں حال ہے۔ تم ان کی حالت دیکھ کر دل تنگ نہ ہو۔ اللہ کا کلمہ اگر سابق نہ ہو چکا ہوتا تو فیصلہ ہو جاتا ان کے درمیان، یعنی تیری قوم اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے درمیان۔ کلمہ سابق ہونے سے مراد یومِ قیامت تک مہلت دینا ہے۔ اس اختلاف میں محقق (حق کا ساتھ دینے والے) کو ثواب ملتا ہے اور مبطل (باطل کا ساتھ دینے والے) کو عذاب ہوتا ہے اور فی الحال اللہ ان کی ہلاکت اور عذاب سے فارغ ہو جاتا ہے۔

کلمہ سے مراد یہ کلمہ ہے: ”سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ“ اسی لیے ان کو مہلت دی ہے اور عذاب میں جلدی نہیں کی۔ بعض نے کہا ہے کہ کلمہ سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسا عذاب نہ ہوگا کہ ان کا استیصال ہو جائے، یہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے۔ وہ لوگ شک میں ہیں کہ اس قرآن سے اگر مراد قومِ نبوی ہے یا وہ شک میں ہیں تورات سے اگر مراد قومِ موسیٰ علیہ السلام ہے۔ پھر اولین اور آخرین کو پورا پورا عذاب یا ثواب دینے کے حکم میں دونوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ ساری خلائق کو ان کے اعمال کی بھرپور جزا دی جائے گی۔

اس آیت کی قراءت وتخریج میں لوگوں نے قدیماً وحدیثاً کلام کیا ہے اور اکثر پر اس کی تلخیص مشکل ہوئی، یعنی اس کا خلاصہ کرنا یا بیان کرنا مشکل ہوا۔ اللہ نے سمین رحمہ اللہ پر اس کو سہل کر دیا۔ انھوں نے ان کی اقاویل جمع کر کے راجح کو بتایا ہے، اس جگہ تفصیل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی تفصیل چاہے تو اس کو سمین رحمہ اللہ کی طرف رجوع

[1] تفسیر الخازن (۳/ ۲۵۵)

کرنا چاہیے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ اے اختلاف کرنے والو! تمھارے اعمال میں سے کوئی شے اللہ پر مخفی نہیں ہے، اس میں محسنین اور مصدقین کے لیے وعدہ ہے اور مکذبین اور کافرین کے لیے وعید ہے، پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو ایک ایسے کلمہ جامع اور انواع طاعت کا حکم دیا جس کا بیان اگلی آیت میں ہے:[1]

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿112﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿113﴾

چناں چہ (اے نبی!) آپ ثابت قدم رہیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جنھوں نے آپ کے ساتھ توبہ کی (ایمان لائے) اور تم سرکشی نہ کرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو، وہ (اللہ) انھیں دیکھ رہا ہے (112) اور تم ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تمھیں آگ چھوئے گی، اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست نہ ہوگا، پھر تمھاری مدد نہ کی جائے گی (113)

استقامت اختیار کرنے اور مداہنت سے دور رہنے کا حکم:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنین کو ثابت قدم رہنے اور ہمیشہ استقامت پر رہنے کا حکم کرتا ہے۔ یہ نصرت پر اور بڑی مدد ہے اور سرکشی کی ممانعت ہے، کیونکہ سرکشی پچھاڑ دیتی ہے، اگرچہ کسی مشرک پر کیوں نہ ہو اور یہ بات جتلا دی کہ اللہ بندوں کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ پھر ظالموں کی طرف مائل ہونے سے منع فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تم مداہنت نہ کرو۔ امام عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شرک کی طرف جھکنا ہے،[2] یعنی ظالمین سے مراد مشرکین ہیں۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم ان کے اعمال کو پسند نہ کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان لوگوں کی طرف مت جھکو، جنھوں نے ظلم کیا ہے۔[3] یہ قول حسن ہے، یعنی ظالموں کو مدد نہ دو کہ گویا تم ان کے کام سے راضی ہو، کیونکہ اللہ کے سوا تمھارا کوئی ولی نہیں جو تم کو چھڑائے اور نہ کوئی ناصر جو تم کو رہائی دلائے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اس کہنے میں کہ تو ثابت قدم رہ جس طرح کہ اللہ نے تجھ کو حکم دیا ہے، ہر امر و نہی داخل ہے اور نبی اکرم ﷺ کی امت اس ارشاد کی بجا آوری میں آپ ﷺ کی مقتدی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنے حکم پر استقامت اختیار کرنے کا حکم دیا اور اللہ کی نعمت سے طغیانی کرنے سے منع کیا۔ امام سفیان رحمہ اللہ

[1] فتح البيان (٦/ ٢٥٧_ ٢٦٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٨٩_ ٢٠٩٠)
[3] تفسير الطبري (١٥/ ٥٠١) [4] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٠٠)

نے کہا: یعنی مستقیم رہ قرآن پر۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «شَمِّرُوْا شَمِّرُوْا» پھر کبھی آپ ﷺ کو ہنستے نہ دیکھا۔[2] امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بالجملہ یہ امر تمام محاسن، احکامِ اصلیہ و فرعیہ اور کمالاتِ نظریہ و عملیہ پر قائم رکھنے کے لیے ہے اور اس معاہدے سے خروج کرنے سے انتہائی صعوبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو سورت ہود نے بوڑھا کر دیا۔[3]

پھر اس استقامت کا حکم ان لوگوں کو دیا جو نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ ثابت ہوئے، یعنی کفر سے اسلام کی طرف آئے اور ایمان میں آپ ﷺ کے شریک ٹھہرے۔ یہ آیت موقع کے لحاظ سے بہت عظیم اور اشد الامر ہے، کیونکہ امر کے مطابق استقامت اختیار کرنا ایک ایسی شے ہے کہ سوائے پاک باز اور مقدس لوگوں کے دوسرا اس پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سیدنا سفیان ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: قُلْ لِّيْ فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَّا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَداً بَعْدَكَ، قَالَ: «قُلْ: آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ»[4] (أخرجه مسلم) ''مجھے اسلام میں ایسی بات بتلا دیں کہ آپ کے بعد اس کی بابت کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہہ کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر استقامت اختیار کر۔''

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت عقائد، اعمال اور اخلاق کو شامل ہے۔ عقائد میں تشبیہ، تاویل اور تعطیل اور صرف عن الظاہر (ظاہری مفہوم کو پھیر دینے سے) کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے اور اعمال میں زیادتی اور کمی، بدعت، نئی نئی باتیں نکالنے، قرآن میں تغیر کرنے اور سنتوں کو تبدیل کرنے اور لوگوں کی اور ان کی رایوں کی تقلید کرنے سے بچنا لازم ہے اور اخلاق میں دونوں جانب افراط و تفریط سے دور تر رہنا ضروری ہے۔ وهذا في غاية العسر و بالله التوفيق وهو المستعان.

طغیان سے مراد:

پھر طغیان سے منع کیا، طغیان حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں، اللہ نے استقامت کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ عبادت میں غلو (حد سے بڑھنا) اور اطاعت میں افراط اس طرح سے کہ مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز ہو جائے ممنوع ہے، جیسے کوئی شخص روزہ رکھے اور افطار نہ کرے یا رات بھر کھڑا رہے اور بالکل نہ سوئے اور جس حلال کا اللہ نے اذن دیا ہے یا اس میں رغبت دلائی ہے اس کو ترک کر دے، لہٰذا صادق و مصدوق ﷺ نے حدیثِ صحیح میں فرمایا ہے: «أَمَّا أَنَا فَأَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأَقُوْمُ وَأَنَامُ وَأَنْكِحُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ»[5] ''میں روزہ بھی رکھتا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٨٩) الدر المنثور (٤/ ٤٧٩۔ ٤٨٠) [2] الدر المنثور (٤/ ٤٨٠) یہ روایت مرسل ہے۔
[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٢٣) تفسير أبي السعود (٤/ ٢٤٤)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ رات کو قیام (عبادت) بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا (اور ان کے حقوق بھی ادا کرتا) ہوں (پس یہ سارے کام ہی میری سنت ہیں) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا، اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

یہ خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ کو ہے، لیکن امت کے حال کو آپ کے حال پر غالب رکھا ہے، یا یہ خاص طور پر امت کے ساتھ طغیان سے نہی ہے۔ علاء بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نہی سے اصحاب نبی اکرم ﷺ مراد نہیں ہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو آپ ﷺ کے بعد آئیں گے۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طغیان یہ ہے کہ خلافِ امر کرے اور معصیت کا مرتکب ہو۔[2] اللہ کو تمھارے اعمال کی بصیرت ہے اور وہ تمھارے استحقاق کے مطابق تم کو تمھارے افعال کی جزا دے گا۔ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پر اس سے زیادہ سخت کوئی آیت نہیں اتری۔

میلان کی تفسیر:

ائمہ لغت نے ﴿ تَرْكَنُوْٓا ﴾ (رکون) کی تفسیر میلان اور سکون کے ساتھ کی ہے مگر وہ قید نہیں لگائی جو امام زمخشری رحمہ اللہ نے لگائی ہے کہ رکون میلِ یسیر ہے۔[3] اسی طرح مفسرین نے کہا ہے کہ رکون مطلق میل وسکون ہے، ہاں بعض مفسرین نے رکون کی تفسیر میں ایسی قیود ذکر کی ہیں جن کو ائمہ لغت نے بیان نہیں کیا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رکون کی حقیقت کسی چیز کی طرف استناد واعتماد وسکون ہے اور اس کے ساتھ راضی ہونا۔[4]

ائمہ تابعین میں بعض نے رکون کی تفسیر ایسی کی ہے جو بہت خاص ہے لغوی معنی کے لحاظ سے۔ امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ تم ان کو دوست رکھو اور ان کی اطاعت نہ کرو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رکون اس جگہ اوہان یعنی مداہنت کے معنی میں ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر ان کے کفر کا انکار نہ کرے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم ان کے اعمال سے راضی نہ ہو۔[5] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم ان سے ساز باز نہ کرو۔[6]

ائمہ تفسیر کا اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ساتھ خاص ہے یا عام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خاص ہے، اس میں مشرک لوگوں کی طرف رکون کی نہی فرمائی ہے اور ظالموں سے یہی مشرکین مراد ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[7] بعض نے کہا ہے کہ عام ہے ظالموں میں۔ اس میں کافر اور مسلم کے درمیان کچھ فرق نہیں ہے اور یہی آیت سے بھی ظاہر ہے۔ ہم نے مانا کہ اس آیت کا نزول مشرکین کے حق میں ہوا ہے، لیکن اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔

---

[1] الدر المنثور (٤/ ٤٨٠) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٥٠٠) [3] الكشاف (٢/ ٤٠٨)
[4] تفسير القرطبي (٩/ ١٠٨) [5] تفسير القرطبي (٩/ ١٠٨) [6] الدر المنثور (٤/ ٤٨٠)
[7] تفسير الطبري (١٥/ ٥٠٠) اس کی سند حسن ہے۔

صاحبِ حکومت کی اطاعت:

کوئی یہ کہے کہ ایسی صحیح دلیلوں میں، جو تواتر تک پہنچتی ہیں اور نبی اکرم ﷺ سے اس طرح ثابت ہیں کہ وہ ایسے شخص سے بھی مخفی نہیں جس کو سنتِ مطہرہ سے ذرا سی بھی دلچسپی ہے، یہ آیا ہے کہ ائمہ وسلاطین و امراء کی اطاعت واجب ہے، یہاں تک کہ بعض صحیح روایات کے مطابق فرمایا کہ تم سلطان کی اطاعت کرو، اگرچہ وہ ایک غلام حبشی ہو، جس کا سر کشمش کی طرح ہو، یعنی چھوٹا جیسے منقے کا دانہ اور ان کی اطاعت کو واجب کیا ہے جب تک کہ وہ نماز کو قائم رکھیں اور ان سے کوئی کفرِ بواح، یعنی صریح کفر ظاہر نہ ہو اور جب تک کہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ کریں۔ ان روایات کا ظاہر یہ ہے کہ اگرچہ وہ ظلم میں اعلیٰ مراتب کو پہنچ جائیں اور ظلم کی سب سے بڑی صورت اختیار کریں، لیکن کفرِ بواح نہ ہو تو ان کی اطاعت واجب ہے، جبکہ ان کا حکم اللہ کی معصیت نہ ہو۔

من جملہ احکام ائمہ کے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو متولیِ اعمال (اعمال پر قائم رہنے والا) کرتے ہیں اور دینی منصب میں داخل کرتے ہیں، سو یہ دخول اللہ کی معصیت میں داخل نہیں ہے۔ اسی طرح من جملہ ان کے احکامات کے جہاد اور رعایا سے ان کے واجبات لینا ہے اور باہم جھگڑنے والوں کے درمیان شریعت کی حدوں کو قائم کرنا اور ان لوگوں پر حدود کا قائم کرنا ہے جن پر شرعی حد واجب ہوتی ہے۔ بالجملہ ائمہ کی اطاعت ان کے ہر ماتحت پر واجب ہے ہر امر و نہی میں جب تک وہ امر و نہی اللہ کی معصیت پر نہ ہو اور ایسے حالات میں ان کے ساتھ ملنا اور ان پر داخل ہونا ضروری ہے اور اسی طرح سے ان کی اطاعت کا مذکورہ قیود کے ساتھ واجب ہونا متواتر دلیلوں سے ثابت ہے، بلکہ کتابِ عزیز میں آیا ہے: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ [النساء: ٥٩] ''تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔''

بلکہ یہ بھی آیا ہے کہ ائمہ کا حقِ اطاعت ادا کرو، اگرچہ وہ تمھارا حق نہ دیں، چنانچہ بعض احادیث میں آیا ہے: «أَعْطُوهُمُ الَّذِي لَهُمْ، وَاسْأَلُوا اللّٰهَ الَّذِي لَكُمْ» [1] ''تم ان کو ان کا حق دو اور تمھارا جو حق ان کے ذمے ہے، ان سے اس کا سوال کرو۔'' بلکہ طاعتِ سلطان کا حکم وارد ہوا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے یہاں تک مبالغہ کیا کہ اگرچہ وہ تیرا مال لے لے اور تیری پشت کو مارے، یعنی تب بھی تُو اس کی اطاعت کر۔ [2] پس اگر ہم مطلق میل وسکون کا اعتبار کریں تو صرف یہی اطاعت جس کا حکم دیا گیا ہے، میل جول کے ہمراہ ایک طرح کا میل وسکون ہے اور اگر ظاہری اور باطنی میل وسکون کا اعتبار کریں تو یہ ممانعت جو اس آیت میں آئی ہے اس شخص پر لاگو نہ ہوگی جو ظاہر میں ان کی طرف مائل ہیں، صرف ایک امر کی وجہ سے جو شرعی طور پر اس کا مقتضی ہے، جیسے طاعت یا تقیہ یا کسی ضرر کا خوف یا کسی خاص

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٧)

مصلحت یا عام مصلحت یا عام یا خاص فساد کو روکنے کی خاطر، جبکہ اس کا میل باطنی طور پر ان کی طرف نہ ہوگا۔ اور نہ ان کے ساتھ محبت ہوگی اور نہ ان کے اعمال کے ساتھ رضا مندی ہوگی۔

میں کہتا ہوں کہ اطاعتِ عامہ اپنی تمام قسموں کے ساتھ خود جبکہ معصیتِ الٰہی میں نہ ہوگی، تو بصورتِ فرض صدق مسمی رکون ان دلیلوں سے مخصص عموم نہی کی ٹھہرے گی جن کی طرف اشارہ کیا گیا اور اس میں شک نہیں ہے کہ جس شخص سلطان نے شروع میں اگر کسی ایسے عمل کو کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ کی معصیت میں داخل نہیں ہے، جیسے مناصبِ دینیہ اور اسی طرح کے اور کام تو جب کہ اس شخص کو اپنے نفس پر یہ وثوق ہے کہ وہ اچھی طرح اس عمل پر قائم رہ سکے گا تو اس پر اس عمل کو قبول کرنا فرض ہے، چہ جائیکہ اس کو جائز کہیں اور وہ جو امارت میں داخل ہونے سے نہی آئی ہے وہ اس کے ساتھ مقید ہے کہ ائمہ و سلاطین و امرا سے ایسے احکام نہ صادر ہو جائیں جن کی اطاعت تمام دلائل کو جمع کرنے سے اس پر واجب ہے یا جس کو حکم دیا جائے وہ اس حکم کو بجا لانے سے ضعیف اور قاصر ہے۔ جس طرح کہ یہ تعلیل بعض صحیح احادیث میں آئی ہے۔

ظالم حکمران سے ملنا جلنا:

رہا امرا سے ملنا جلنا اور ان کے پاس کسی عام یا خاص فائدہ حاصل کرنے کے لیے آنا جانا، یا ان کے ظلم سے کراہت کرنے کے باوجود عام اور خاص لوگوں کی تکالیف کو رفع کرنے کے لیے ان کے پاس جانا، ان سے محبت نہ کرنے کے باوجود، یا ان کی طرف میلان نہ رکھنے کے باوجود اور ان سے ملنے میں کراہت ہوتے ہوئے اگر وہ ملنا کوئی فائدہ نہ دے سکے، یا اس سے کسی نقصان کا ازالہ نہ ہو سکے تو برفرض صدق مسمی رکون کے اس صورت پر مخصص ہو گا ان دلائل کے ساتھ جو عوام کے فائدہ حاصل کرنے یا ان کے نقصانات کو دور کرنے کے بارے میں ہیں۔ "وَالْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوىٰ، وَلَا تَخْفىٰ عَلَى اللّٰهِ خَافِيَةٌ"، بالجملہ جو شخص ایسے شخص سے ملتا جلتا ہو جو ظالم ہے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے اقوال و افعال کو شریعت کے ترازو میں وزن کرے، اگر وہ کم ہوں تو اس مثل کا مصداق ہے: "فَعَلىٰ نَفْسِهَا بَرَاقِشُ تَجْنِيْ" اور یہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑا مارنا ہے اور اگر اس سے قبل کہ امیر ہی اس کو کسی کام پر لگا دے بھاگ سکے تو بھاگ جائے کہ اس کے لیے یہی زیادہ بہتر ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم کی صحبت بطورِ تقیہ مستثنیٰ ہے اس نہی سے اضطرار کی حالت میں۔[1]

امام نیساپوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محققین کہتے ہیں ممنوعہ رکون ظالم کے فعل سے راضی ہو جانا ہے یا غیر کے سامنے ان کے طریقے کی تعریف اور تزئین ہے اور ان کے ان ظلم پر مبنی کاموں میں سے کسی میں شرکت کرنا ہے۔ رہی

[1] تفسير القرطبي (٩/ ١٠٨)

کسی ضرر کو دفع کرنے کے لیے یا کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ معاملہ کرنا تو وہ اس رکون میں داخل نہیں ہے۔ پھر کہا ہے کہ میرا یہ کہنا ذریعۂ معاش حاصل کرنے اور رخصت کے طور پر ہے۔ رہا تقویٰ تو وہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ان سے بالکل اجتناب کرے۔ ﴿ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ ﴾ [الزمر: ٣٦] ''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟'' [1] اللہ نے اس رکون پر مسِ نار (آگ کا چھونا) کو مرتب کیا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ظالم اہلِ نار میں یا اہلِ نار کی طرح ہے اور نار کی مصاحبت اختیار کرنا ضروری نار چھونے کا موجب بنتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ رکون کا یہ حکم اہلِ ظلم کی طرف ہے، پھر ظالم کے حال کو کیا پوچھتے ہو۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فی الجملہ اس شخص کی طرف میلان رکھنے کا گمان جس میں ظلم پایا جاتا ہے یہ ہے کہ یہ رکون مساسِ نار کی طرف لے جاتا ہے تو پھر تیرا اس شخص کے بارے میں کیا گمان ہے جو ظلم میں پکا ہے اور زیادتی اور ظلم کرتا ہے اور یہ میلان بھی اس کی طرف میلِ عظیم ہے اور ان کی مصاحبت پر متہالک ہوتا ہے، یعنی اس کام کے لیے مرا ہی جاتا ہے کہ کسی طرح ان کا ہم نشین بنے اور ان کی مصاحبت پر جان دیتا ہے کہ کسی طرح حاصل ہو اور ان کی ہم دردی اور توجہ حاصل کرنے کے لیے بری سے بری بات کو بھی کر لیتا ہے اور ان کا لباس پہن کر ان کی آرائشِ ظاہر اور رونقِ فانی پر آنکھیں کھولتا ہے اور جو قطوفِ دانیہ (پھل) ان کو دیے گئے ہیں، ان پر رشک کرتا ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ حطام (ریزہ کی حیثیت والے) ایک دانہ سے بھی زیادہ طفیف (حقیر) اور مچھر کے پَر سے بھی زیادہ ہلکے ہیں اور میلِ قلوب سے علاحدہ اور طالب و مطلوب دونوں ضعیف۔ پھر کہا ہے کہ ''اَلْآيَةُ أَبْلَغُ مَا يُتَصَوَّرُ فِي النَّهْيِ عَنِ الظُّلْمِ وَالتَّهْدِيدِ عَلَيْهِ'' اور یہ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ اور صحابہ و مومنین کو اور استطاعت پر ان کی تثبیت ہے۔ یہ استطاعت عدل ہے اور افراط و تفریط ہر دو کی طرف میل کرنا ہے اور اپنی اور غیر کی جان پر ظلم کرنا ہے۔ [2]

پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ اگر تم ان ظالموں کی طرف جھکو گے تو تم کو آگ چھوئے گی، در حالیکہ اس آگ سے نکالنے کے لیے تمھارا کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا۔ اور پھر تم کو اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہ ملے گی، کیونکہ اس کے علم میں سابق ہو چکا ہے کہ وہ تم کو اس رکون کے سبب سے عذاب کرے گا، جس سے تم کو منع کیا تھا اور تم باز نہ آئے تھے، بلکہ تم نے سرکشی اور عناد کو اختیار کیا تھا۔ [3]

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾

اور آپ نماز قائم کریں دن کی دونوں طرفوں (صبح و شام) اور رات کی کچھ گھڑیوں میں، بے شک نیکیاں

[1] فتح القدير (٢/ ٧٣٧۔ ٧٣٨) [2] تفسير أبي السعود (٤/ ٢٤٥) [3] فتح البيان (٦/ ٢٦٠۔ ٢٦٦)

برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ (اللہ کا) ذکر کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے ﴿114﴾ اور آپ صبر کریں، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿115﴾

نمازِ پنج گانہ قائم کرنے کا حکم:

نیکیاں برائیوں کو تین طرح دور کرتی ہیں: جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں اور جو نیکیاں اختیار کرے اس سے برائی کی عادت چھوٹے اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے، لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیے جتنا میل اتنا صابن۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دن کے ہر دو طرف سے مراد صبح اور مغرب کی نماز ہے۔[1] امام حسن اور ابن زید رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] دوسری روایت میں امام حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ صبح اول روز میں ہے اور ظہر وعصر آخر روز میں۔ یہی قول امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ ﴿ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ سے مراد نمازِ عشا ہے۔[4] اور مبارک بن فضالہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مغرب اور عشا ہے۔ یہی امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔[5] بالجملہ اس آیت سے نمازِ پنج گانہ ثابت ہوتی ہے۔

نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں:

مطلب یہ ٹھہرا کہ فعلِ خیرات گناہوں کو مٹا دیتا ہے جس طرح اہلِ سنن کی حدیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: نہیں ہے کوئی مسلمان کہ وہ کوئی گناہ کرے، پھر وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے، مگر وہ بخش دیا جاتا ہے۔[6] صحیحین میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ انھوں نے وضو کر کے دکھایا، پھر کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میرا سا وضو کیا، پھر دو رکعت نماز پڑھی اور ان میں حدیثِ نفس نہ کی تو اس کا اگلا گناہ بخش دیا گیا۔[7]

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ انھوں نے پانی منگوا کر وضو کیا، پھر کہا جس شخص نے میرے جیسا وضو کر کے ظہر کی نماز پڑھی تو جو کچھ اُس سے اس نماز اور صبح کی نماز کے درمیان ہوا، وہ بخشا گیا۔ پھر عصر

---

① تفسیر الطبري (١٥/ ٥٠٣) اس کی سند حسن ہے۔
② تفسیر الطبري (١٥/ ٥٠٣)
③ تفسیر الطبري (١٥/ ٥٠٣_ ٥٠٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٩١)
④ تفسیر الطبري (١٥/ ٥٠٧) اس کی سند حسن ہے۔
⑤ تفسیر الطبري (١٥/ ٥٠٧_ ٥٠٨)
⑥ سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٥٢١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٤٠٦) سنن النسائي الکبرىٰ (٦/ ١٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٣٩٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٧٣٨)
⑦ صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٥٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٦)

کی نماز پڑھی تو جو کچھ اس نماز اور نمازِ ظہر کے درمیان ہوا تھا وہ بخشا گیا۔ پھر مغرب کی نماز پڑھی تو عصر اور مغرب کے درمیان جو کچھ ہوا وہ بخشا گیا، پھر عشا کی نماز پڑھی تو مابین عشا و نمازِ مغرب بخشا گیا، پھر شاید وہ رات کو سوتا ہے، کروٹیں لیتا ہے، پھر اٹھ کر وضو کیا اور صبح کی نماز پڑھی تو مابین نمازِ عشا اور صبح بخشا گیا، ﴿وَهِيَ الْحَسَنَاتُ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾[1] (رواه أحمد)

صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے کہ بھلا بتاؤ تو اگر تم میں سے کسی کے گھر کے دروازے پر ایک نہر ہو، وہ اُس میں ہر دن پانچ بار نہائے تو کچھ میل کچیل باقی رہے گا؟ کہا: نہیں اے اللہ کے رسول! فرمایا: اسی طرح یہ پانچوں نمازیں ہیں، اللہ پاک ان کے سبب سے گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔[2] صحیح مسلم میں مرفوعاً آیا ہے کہ نمازِ پنج گانہ اور جمعہ جمعہ تک اور رمضان رمضان تک، ان کے درمیان ہونے والے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں، جب تک کہ کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے گا۔[3] ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿كُلُّ صَلَاةٍ تَحُطُّ مَا بَيْنَ يَدَيْهَا مِنْ خَطِيئَةٍ﴾[4]

شانِ نزول:

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرد نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر خبر دی، اللہ نے یہ آیت اتاری: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ (آیتِ باب) اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میرے لیے ہے؟ فرمایا: بلکہ میری ساری امت کے لیے ہے۔[5] (رواه مسلم) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میں نے ایک عورت باغ میں پائی، اس کے ساتھ سب کچھ کیا بجز اس کے کہ اس سے جماع نہیں کیا، بوسہ لیا، چمٹایا، اب آپ جو چاہیں وہ سزا مجھ کو دیں! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہ کہا، وہ آدمی چلا گیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ نے اس پر پردہ رکھا تھا، اگر وہ اپنی جان پر پردہ رکھتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے اپنی نگاہ لگائی اور فرمایا: اس کو پھیر لاؤ، اس کو پھیر لائے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ (آیتِ باب) سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا یہ صرف اس کے لیے ہے؟ فرمایا: نہیں بلکہ سب لوگوں کے لیے۔[6]

اچھے اخلاق اور نیکیوں کے فوائد:

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے درمیان اخلاق کو تقسیم کیا ہے، جس طرح تمھارے درمیان رزق کو تقسیم کیا ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا جس کو دوست رکھتا ہے اور جس کو دوست نہیں رکھتا دیتا ہے اور نہیں دیتا دین مگر اسی کو جس کو دوست رکھتا ہے، پس جس اللہ نے دین دیا اس کو دوست رکھا، قسم ہے اس کی جس کے

---

[1] مسند أحمد (١/ ٧١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٦٧) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٣)

[4] مسند أحمد (٥/ ٤١٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٤٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣)

ہاتھ میں میری جان ہے! اسلام نہیں لاتا بندہ جب تک کہ اس کا دل سلامت نہ ہو اور زبان بھی اس کی سلامت نہ ہو۔ اور ایمان نہیں لاتا یہاں تک کہ امن میں ہو اس کا ہمسایہ اس کے بوائق یعنی شرور سے۔ پوچھا: اس کے بوائق کیا ہیں؟ فرمایا: اس کو فریب دینا، اس پر ظلم کرنا اور نہیں کماتا کوئی بندہ مالِ حرام پھر خرچ کرتا ہے اُس میں سے پھر اس کے لیے اس مال میں برکت ہو، یعنی نہیں ہوتی اور نہ صدقہ دیتا ہے، پھر اس سے قبول ہو، یعنی قبول نہیں ہوتا اور نہیں چھوڑ جاتا اس مال کو اپنے پیچھے لیکن ہوتا ہے وہ اس کا زادِ راہ آگ کی طرف۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی سے دور نہیں کرتا، لیکن برائی کو نیکی سے دور کرتا ہے۔[1] (رواه أحمد)

علی بن زید نے ابوعثمان رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ایک درخت کے نیچے تھا، انھوں نے ایک خشک شاخ لے کر ہلائی، اس کے پتے جھڑ پڑے، پھر کہا: اے ابوعثمان! تُو نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں نے یہ کام کیوں کیا؟ میں نے کہا: بتاؤ کیوں کیا؟ کہا: ایسا ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ساتھ کیا تھا، پھر فرمایا: جب مسلمان اچھی طرح وضو کر کے نمازِ پنج گانہ پڑھتا ہے تو اس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، جیسے کہ یہ پتے جھڑ پڑے، پھر یہ آیت پڑھی۔[2] (رواه أحمد)

امام احمد رحمہ اللہ کی دوسری روایت کے الفاظ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ»[3] سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوعاً روایت کے الفاظ یہ ہیں: «إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَأَتْبِعْهَا حَسَنَةً تَمْحُهَا، قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَمِنَ الْحَسَنَاتِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ قَالَ: هِيَ أَفْضَلُ الْحَسَنَاتِ»[4] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے: «مَا قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فِيْ سَاعَةٍ مِّنَ اللَّيْلِ أَوْ نَهَارٍ إِلَّا طُمِسَتْ مَا فِي الصَّحِيْفَةِ مِنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰى تُسْكَنَ مِنْهَا مِنَ الْحَسَنَاتِ»[5] اس روایت میں عثمان ضعیف ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! "مَا تَرَكْتُ مِنْ حَاجَةٍ وَّلَا دَاجَةٍ إِلَّا اقْتَطَعْتُهَا، فَقَالَ لَهُ: أَتَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ؟ قَالَ: بَلٰى، قَالَ: فَإِنَّ هٰذَا يَأْتِيْ عَلٰى ذٰلِكَ"[6] یہ حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ کلمۂ توحید خلوصِ دل اور حسنِ نیت کے ساتھ پڑھا جائے تو وہ گناہوں اور خطاؤں کو مٹا دیتا ہے۔ وللہ الحمد.

---

1. مسند أحمد (١/ ٣٨٧) اس کی سند میں ''صباح بن محمد'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٦٢٥)
2. مسند أحمد (٥/ ٤٣٧) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨٧)
3. مسند أحمد (٥/ ٢٢٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٧)
4. مسند أحمد (٥/ ١٦٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٧٣)
5. مسند أبي يعلىٰ (٦/ ٢٩٤) اس کی سند میں ''عثمان بن عبدالرحمٰن زہری'' سخت ضعیف راوی ہے۔
6. مسند البزار (١٣/ ٢٩٩) المعجم الأوسط (٧/ ١٣٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أبو يعلى و البزار بنحوه والطبراني في الصغير والأوسط و رجالهم ثقات" (مجمع الزوائد (١٠/ ٩١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے استقامت کی جملہ اقسام کے ذکر کے بعد اس جگہ اقامتِ نماز کا ذکر فرمایا ہے، اس لیے کہ یہ رأسِ ایمان ہے۔ دو طرف سے مراد نمازِ فجر وعصر ہے یا فجر وظہر یا صبح ومغرب یا ظہر وعصر اور صلاۃِ عشی سے مراد ظہر وعصر ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راجح یہ ہے کہ مراد صبح ومغرب ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایک طرف صبح ہے تو پھر دوسری طرف مغرب ہو گی۔[1] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ کی تفسیر میں کثیر مذاہب ہیں۔ اشہر یہ ہے کہ مراد نمازِ فجر وعصر ہے۔ اور طرف ثانی مغرب نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ یہ نماز ﴿زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ میں داخل ہے، اس لیے دوسری نماز کو عصر پر محمول کرنا واجب ٹھہرا۔[2]

"زُلَف" ساعات کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے: ﴿طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ کے معنی نمازِ شب کے ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نمازِ عشا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نمازِ مغرب وعشا۔[4] ﴿اَلْحَسَنٰتِ﴾ سے مراد حسناتِ واجبہ ومندوبہ (مستحب) وغیرہا عموماً ہیں، من جملہ ان کے بلکہ ان کا عمود نمازِ پنج گانہ ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: "هِيَ الصَّلَاتُ الْخَمْسُ"[5] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اتنا اور زیادہ کیا ہے: "وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ"[6] سیئات سے بھی مراد عام سیئات ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ہیں۔

اِذْهَاب سے مراد تکفیر ہے، گویا وہ گناہ سرے ہی سے نہیں ہوئے تھے۔ صحاح ستہ میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا تھا، اس نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذکر کیا، گویا اس کے کفارے کے بارے میں پوچھتا تھا، اس پر یہ آیت اتری۔ اس شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! "أَلِيَ هٰذِهِ؟" فرمایا: «هِيَ لِمَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ أُمَّتِي»[7]

امام احمد، مسلم اور ابوداود رحمہم اللہ وغیرہم نے سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ ایک مرد نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "أَقِمْ لِي حَدَّ اللّٰهِ" یہ لفظ ایک بار یا دو بار کہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا، پھر نماز کی اقامت ہوئی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تو فرمایا: وہ شخص کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں یہ حاضر ہوں۔ فرمایا: «أَتْمَمْتَ الْوُضُوْءَ وَصَلَّيْتَ مَعَنَا آنِفاً؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَإِنَّكَ مِنْ خَطِيْئَتِكَ كَيَوْمِ وَلَدَتْكَ أُمُّكَ، فَلَا تَعُدْ» اور اس وقت اللہ پاک نے اپنے رسول پر یہ آیت اتاری: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾[8] (آیتِ باب)

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٠٤) [2] تفسير الرازي (١٨/ ٥٨) [3] تفسير القرطبي (٩/ ١٠٠)

[4] تفسير الطبري (١٥/ ٥٠٧) [5] تفسير الطبري (١٥/ ٥١١) [6] تفسير الطبري (١٨/ ٣٢)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٣)

[8] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٨١) مسند أحمد (٥/ ٢٦٥)

اس بارے میں مختلف الفاظ میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں اور احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ پنج گانہ نمازیں ان کے درمیان میں ہونے والی خطاؤں کو مٹا دیتی ہیں۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسنات ان الفاظ کا ادا کرنا ہے: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَلَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ''[2] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ ابن مسیب رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام قرطبی، ضحاک اور جمہور مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ حسنات پانچ نمازیں ہیں، احادیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔[3] یہ یعنی استقامت یا قرآن نصیحت پکڑنے والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذاکرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو خوشی، غمی، سختی، آسانی، عافیت اور آزمائش میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔[4]

پھر اللہ نے فرمایا کہ تُو صبر کر، استقامت و عدمِ طغیان و ظالموں کی طرف مائل نہ ہونے پر۔ یا مراد ہے کہ امر و نہی پر ثابت قدم رہو، اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ محسنین سے مراد عمل صالح کرنے والے ہیں یا ہر محسن ہے۔[5]

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾

پھر ان امتوں میں، جو تم سے پہلے گزریں، ایسے عقل و بصیرت والے کیوں نہ ہوئے جو زمین میں (لوگوں کو) فساد (پھیلانے) سے روکتے، مگر تھوڑے ہی ان میں سے جنھیں ہم نے نجات دی اور جن لوگوں نے ظلم کیا، وہ ان چیزوں کے پیچھے لگے رہے جن میں وہ (ظالم) آسودگی دیے گئے تھے، اور وہ مجرم تھے (116) اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ وہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ ہلاک کرے، جب کہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں (117)

اصلاحِ کار جماعت کے وجود کا ہونا ضروری ہے:

اللہ نے فرمایا کہ قرونِ گزشتہ میں ایسے اہلِ خیر کیوں نہ ہوئے جو برائیوں اور منکرات سے منع کرتے۔ ہاں ایسے لوگ قلیل ہوئے، انھی کو اللہ نے اپنی سزا سے بچایا، اس لیے اللہ نے اس امت کو حکم دیا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ [آل عمران: ١٠٤] ''اور تم

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٣) [2] تفسير الطبري (١٥/ ٥١٤۔ ٥١٥) [3] تفسير القرطبي (٩/ ١١٠)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٩٣) [5] فتح البيان (٦/ ٢٦٧۔ ٢٦٩)

میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے، جو خیر کی طرف بلائے۔‘‘

پھر فرمایا کہ ظالم لوگ گناہوں پر قائم رہے اور انھوں نے انکار کی طرف کچھ توجہ نہ کی، یہاں تک کہ اچانک ان پر عذاب آ گیا۔ اللہ نے کوئی بستی ہلاک نہیں کی، لیکن اس بستی کے لوگ ظالمِ نفس تھے، اپنی جان کا آپ برا کرتے تھے، ورنہ اللہ کا عذاب کسی قریۂ مصلحہ پر کبھی نہیں آیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾ [هود: ۱۰۱] ’’اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن انھوں نے (خود ہی) اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔‘‘

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ گزشتہ امتوں میں عذاب آنے کا سبب یہ تھا کہ ان میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو فساد سے منع کرتا اور ہدایت کا حکم کرتا۔ بقیہ سے مراد رائے و عقل و دین ہے، لیکن ایسے لوگ جو بچ گئے اور ہم نے ان کو بچا دیا، تھوڑے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو انبیا کے متبعین تھے اور انھوں نے لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے منع کیا، باقی سب لوگوں نے نہی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں یہ قلیل قومِ یونس تھی، اس آیتِ کریمہ کی رو سے: ﴿ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ﴾ [یونس: ۹۸] ’’سوائے قومِ یونس کے۔‘‘ بعض نے کہا کہ تمام انبیا کے متبعین مراد ہیں، یعنی بالعموم تمام امتوں کے اہلِ حق لوگ اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا فساد فی الارض میں مصروف ہو کر اور نہی عن المنکر کو چھوڑ کر، وہ بدستور اپنی شہوات و نافرمانیوں اور فسق و فجور پر جمے رہے، اسبابِ عیش کا اہتمام کرتے رہے اور حق سے روگرداں ہوئے۔

مُترَف وہ شخص ہے جس کو عیب جوئی اور ثروت و جاہ نے متکبر کر دیا اور عیش کی فراخی اور آسودگی حال اور رزق کی فراوانی کی وجہ سے وہ آخرت کی خاطر عمل کرنے سے باز رہا اور دنیا کی جلدی کا فائدہ اختیار کیا اور آخرت میں ایک مقررہ مدت کے بعد ملنے والے فائدے کو چھوڑ دیا اور اس کی تمام عمر شہواتِ نفسانی میں ڈوبے ہوئے بسر ہوئی، سو یہ لوگ شہوات کے پیچھے لگنے کی وجہ سے مجرم تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہے کہ وہ کسی قریے کو بطورِ ظلم ہلاک کر دے۔

اس میں اس بات کی خبر ہے کہ مصلح لوگوں کو ہلاک کرنا ایک ظلمِ عظیم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے سے بالکل پاک ہے، گویا اللہ سے ظلم کا صادر ہونا محال ہے، ورنہ اللہ جو کچھ اپنے بندوں کے ساتھ کرے، کچھ بھی ہو وہ ہرگز ظلم نہیں ہے۔ اہلِ سنت کا قاعدہ یوں ہی مقرر ہو چکا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جائز ہے کہ آیت کے معنی یوں ہوں کہ تیرا رب کسی کو ہلاک نہیں کرتا درحالیکہ وہ ظالم ہو،[1] اگرچہ وہ شخص انتہائی اصلاح پر ہو، اس لیے کہ اُس کا اپنے مِلک میں تصرف ہے۔ اس کی دلیل یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا ﴾ [یونس: ٤٤] ’’بے شک اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا۔‘‘

---

[1] معاني القرآن (۳/ ۸۳)

نیز یہ آیتِ کریمہ: ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [الحج: ١٠] ''اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔'' کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ ظلم سے مراد شرک ہے، یعنی مجرد شرک پر کسی کو ہلاک نہیں کرتا، یہاں تک کہ اس شرک کے ساتھ فساد فی الارض اور خواہشاتِ نفسانی کی اتباع بھی آ ملے جس طرح قومِ شعیب علیہ السلام کو تول اور ماپ کی کمی پر ہلاک کیا اور قومِ لوط علیہ السلام کو فاحشہ کے ارتکاب کے سبب سے برباد کر ڈالا۔ اصلاح سے مراد یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا حق ادا کرتے ہیں، لوگوں پر ظلم نہیں کرتے، سو یہ ان کو ہلاک نہ کرنا اپنی فرطِ رحمت اور اپنے حقوق میں چشم پوشی کے سبب سے ہے۔ اسی جگہ سے فقہا نے حقوق ادا کرتے وقت فقرا کے حقوق کو غنی حمید کے حقوق پر فوقیت دی ہے۔

کہتے ہیں کہ ''اَلْمُلْكُ يَبْقٰى مَعَ الْكُفْرِ وَلَا يَبْقٰى مَعَ الظُّلْمِ'' لیکن تو جانتا ہے کہ یہ مقام منکرات سے نہی کا ہے اور سب سے قبیح منکر شرک باللہ ہے، سو یہ مقام ملائم اس جگہ کے نہیں ہے، کیونکہ شرک بدرجہ اولیٰ فساد فی الارض میں داخل ہے۔ اسی لیے ہر رسول نے جس کا قصہ قرآن پاک میں آیا ہے، سب سے پہلے اپنی قوم کو اسی شرکِ شوم سے منع کیا ہے، پھر تمام گناہوں سے جن کو وہ عمل میں لاتے تھے۔ سو اس جگہ ظلم کو فساد پر محمول کرنا جس میں شرک بھی شامل ہے اور تمام گناہوں کی اقسام بھی عام طور پر اور اصلاحِ مذکور پر محمول کرنا اور شرک سے باز رہنا اس طرح کہ بعض لوگ نہی کرتے رہیں اور بعض وعظ و نصیحت کو قبول کرنے کی طرف متوجہ ہوں اور شرک وغیرہ فساد کی قسموں پر جمے نہ رہیں تو مناسب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ ان کو ان کے گناہوں پر ہلاک نہیں کرتا، جبکہ وہ ایمان میں مخلص ہوتے ہیں اس صورت میں ظلم سے مراد معاصی ہیں۔ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر کا سوال کیا گیا، فرمایا: « وَأَهْلُهَا يَنْصِفُ بَعْضُهُمْ بَعْضاً »[1] (أخرجه الطبراني وأبو الشيخ وابن مردويه والديلمي وروي موقوفا علىٰ جرير) بعض نے کہا ہے کہ ہلاک سے مراد دنیا میں عذابِ استیصال (بالکل تباہ و برباد کر دینا) ہے، رہا آخرت کا عذاب سو وہ لازمِ حال ہے۔[2]

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿١١٨﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١١٩﴾

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یقیناً تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن وہ ہمیشہ (باہم) اختلاف کرتے

---

[1] المعجم الكبير (٢/ ٣٠٨) الدر المنثور (٤/ ٤٩١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه عبيد بن القاسم الكوفي وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٧/ ١٢٠)

[2] فتح البيان (٦/ ٢٦٩۔ ٢٧٢)

رہیں گے ﴿118﴾ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے رب نے رحم کیا، اور اسی لیے اس نے انھیں پیدا کیا، اور آپ کے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا ﴿119﴾

دین و مذہب میں اختلاف کی حکمت اور فرقہ ناجیہ:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ سب لوگوں کو ایک طرح پر ایمان یا کفر میں کر ڈالے، لیکن وہ ہمیشہ دین، مذہب اور آرا میں مختلف رہیں گے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہدی میں مختلف ہوں گے۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رزق میں بعض بعض کو بیگار میں پکڑیں گے۔[2] لیکن پہلی بات صحیح ہے، مگر جس پر اللہ رحم کرے۔ یہ رحم کیے گئے لوگ رسولوں کے متبعین ہیں کہ جو خبر ان کو پیغمبروں نے دی، انھوں نے اس کو تھام لیا، ان کا طریقہ ہمیشہ اسی طرح رہا، یہاں تک کہ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم آئے، ان کا اتباع کیا، یہی رحم کیے گئے لوگ فرقہ ناجیہ ہے، جس طرح کہ مسانید اور سنن میں چند طرق سے جو ایک دوسرے کو قوت دیتے ہیں، مروی حدیث میں آیا ہے: «إِنَّ الْيَهُوْدَ افْتَرَقَتْ عَلٰى إِحْدٰى وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، وَّإِنَّ النَّصَارٰى افْتَرَقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، وَسَتَفْتَرِقُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً، كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا فِرْقَةً وَّاحِدَةً، قَالُوْا: وَمَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَآ أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ»[3] (رواه الحاكم في مستدركه بهذه الزيادة) یعنی یہود اکہتر فرقے ہو گئے اور نصاریٰ بہتر اور یہ امت تہتر فرقے ہو جائے گی، یہ سب فرقے دوزخی ہیں، مگر ایک فرقہ، کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کون سا فرقہ ہے؟ فرمایا: جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔

ان بہتر فرقوں کا اور فرقہ ناجیہ کا بیان رسالہ ”کشف الغمه“ اور رسالہ ”معتقد منتقد“ اور رسالہ ”خبيئة الأكوان“ میں کیا گیا ہے (یہ سب نواب صاحب رحمہ اللہ کی تالیفات ہیں)۔ علمائے کلام نے اس حدیث کی تفسیر میں بہت مفصل کلام کیا ہے۔ ہر شخص نے اپنی رائے کے مطابق فرقہ ناجیہ کی تنقیح (توضیح) تنقید اور تعیین (متعین کرنا) بیان کی ہے، لیکن اس تفسیر کے بعد جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی ہے، کسی عالم یا درویش کے قول کی کچھ ضرورت باقی نہیں ہے، جیسے کہا گیا: ”إِذَا جَآءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ“ یہ حدیث ہم پر بھی دلیل ہے کہ مذاہب کا اختلاف قابلِ مذمت چیز ہے اور حق بات پر متفق ہو جانا ایک قابلِ تعریف بات ہے، یہ بھی فحوائے نص سے ثابت ہوا کہ جس طریقہ و سیرت و دیانت و امانت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، وہ مذہب اختلاف سے پاک ہے اور نجات

---

[1] یہ اثر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، البتہ ابن جریر الطبری رحمہ اللہ نے امام عکرمہ رحمہ اللہ سے یہ اثر نقل کرتے ہوئے ”هدی“ کے بجائے ”هوی“ کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (٢/ ٦٠٤) تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٣)

[2] تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) مستدرك الحاكم (١/ ٢١٨)

اسی طریقے میں منحصر ہے۔

سو ((مَآ أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ)) کا زمانہ وہ ہے جس کے خیر القرون ہونے کی شہادت دی گئی ہے۔ اس زمانہ پرآشوب تک یہی فرقہ اہلِ حدیث ہے کہ جنھوں نے اپنے عقائد و اعمال کو ظاہری طور پر کتابِ عزیز اور واضح سنتِ مطہرہ کی اتباع میں منحصر کر رکھا ہے اور پیغمبر ﷺ کے قول و فعل سے سرِمُو اختلاف کو جائز نہیں رکھتے اور صرف کسی فقیہ کی رائے اور فلسفی کے خیال اور صوفی کے کشف اور متکلمین کے جدل اور اسی طرح کی دوسری چیزوں سے بمراحل دور ہیں اور ان کا یہ شیوہ خالص توحید اور حسنِ اتباع اور صلاحِ طویت اور خوبیٔ نیت کے ساتھ موجب نجات ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور بات بھی یہی ہے کہ جب اصل موجود ہو تو پھر فرع کیا چیز ہے اور کون عالم اور صوفی کچھ اپنے گھر سے یا باپ کے گھر سے لایا ہے، جس کسی کو جو کچھ ملا ہے وہ اسی قرآن و حدیث سے ملا ہے اور جو کوئی ان دو اصل اصول کا تابع نہیں ہے وہ دنیا اور آخرت میں پریشان حال اور مشتت البال (پراگندہ) ہے ؎

کسانیکہ زین راہ برگشتہ اند برفتند و بسیار سرگشتہ اند

''وہ لوگ جو اس سیدھی راہ سے منہ موڑ گئے، وہ چلے گئے اور بہت سے (اب بھی) پریشان ہیں۔''

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مجوس ہمیشہ مختلف رہیں گے، مگر جس پر رب نے رحم کیا، یعنی حنیفیہ۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ رحمتِ الٰہی یہی جماعت اہلِ سنت ہے، اگرچہ ان کے دیار اور جسم جدا جدا ہیں اور اہلِ معصیت ان کے فرقے ہیں، اگرچہ ان کے دیار اور جسم اکٹھے ہوں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو دو فریق پیدا کیا ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴾ [هود: ۱۰۵] ''پھر ان میں سے کوئی تو بد بخت ہوگا اور کوئی نیک بخت۔'' اور بعض نے کہا ہے کہ ان کو رحمت کے واسطے پیدا کیا۔[2]

حکایت:

امام طاؤس رحمہ اللہ کے پاس دو آدمی جھگڑتے ہوئے آئے اور بہت جھگڑا کیا، طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: تم دونوں نے باہم اختلاف کیا اور خوب کیا۔ ایک نے کہا: ہم اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: تُو جھوٹا ہے، اس نے کہا: کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ﴾ (آیتِ باب) امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا: ''لَمْ يَخْلُقْهُمْ لِيَخْتَلِفُوْا، وَلٰكِنْ خَلَقَهُمْ لِلْجَمَاعَةِ وَالرَّحْمَةِ''[3] ''اللہ نے ان کو اختلاف کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا، البتہ ان کو جماعت اور رحمت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ''لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ'' یہی امام مجاہد،

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٢۔ ٥٣٣)
[2] تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٦) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٩٥)

ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاريات: ٥٦] ''اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔'' امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''لِلرَّحْمَةِ وَالْاِخْتِلَافِ خَلَقَهُمْ'' امام ابن وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ [الشورىٰ: ٧] ''ایک گروہ جنت میں ہوگا اور دوسرا بھڑکنے والی آگ میں۔'' امام مالک رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ''لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ أَيْ لِلرَّحْمَةِ وَالْاِخْتِلَافِ''[2]

قضا وقدر کا فیصلہ کوئی جنتی کوئی جہنمی:

پھر اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ قضا وقدر میں یہ بات ٹھہر چکی ہے کہ من جملہ مخلوق کے کوئی جنت کا مستحق ہے، کوئی دوزخ کا، بھرنا ان دونوں جگہوں کا ضروری ہے۔ ''وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ وَالْحِكْمَةُ التَّامَّةُ'' صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ جنت اور نار میں جھگڑا ہوا، جنت نے کہا: میرا کیا حال ہے کہ داخل نہیں ہوتے مجھ میں مگر ضعیف و ناتواں لوگ، نار نے کہا: میں متکبرین اور متجبرین کے لیے اختیار کی گئی ہوں۔ اللہ عزوجل نے جنت سے کہا: ''أَنْتِ رَحْمَتِيْ أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَآءُ'' اور نار سے فرمایا: ''أَنْتِ عَذَابِيْ أَنْتَقِمُ بِكِ مِمَّنْ أَشَآءُ'' ان میں سے ہر ایک نے بھرنا ہے، سو جنت میں ہمیشہ فضل رہے گا، یعنی زیادتی، یہاں تک کہ اللہ اس کے لیے ایک خلق پیدا کرے گا۔ رہی دوزخ، سو کہے گی: ''هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'' یہاں تک کہ رب العزت اس میں اپنا قدم رکھے گا، تب وہ کہے گی: ''قَطْ قَطْ وَعِزَّتِكَ''[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اگر تیرا رب چاہتا تو ان سب لوگوں کو ایک دین والا کر دیتا، خواہ اہلِ ضلالت ہوتے یا اہلِ ہدایت یا سب کو حق پر فراہم کرتا، یہ مختلف نہ ہوتے، یا فقط دینِ اسلام پر سب کو جمع کر دیتا نہ کسی اور دین پر، لیکن اللہ نے اس طرح نہ چاہا، اسی لیے اس طرح پر نہ ہوا، لہٰذا فرمایا کہ لوگ ہمیشہ مختلف رہیں گے اور مختلف ادیان پر ہوں گے، کوئی یہودی، کوئی نصرانی، کوئی مجوسی، کوئی مشرک اور کوئی مسلم، کیونکہ یہ سب اپنے ادیان میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں، ان کا ضبط میں آنا مشکل ہے۔ یا مراد حق میں یا دینِ اسلام میں اختلاف ہے۔ یا مراد رزق میں اختلاف ہے کہ کوئی غنی ہے اور کوئی فقیر۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد اہلِ حق اور اہلِ باطل ہیں۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٦۔ ٥٣٧) [2] تفسير ابن كثير (٢/ ٦٠٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٨٤، ٧٠١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٦۔ ٢٨٤٨)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠٩٣) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «اِفْتَرَقَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى إِحْدٰى وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً أَوْ ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ، وَالنَّصَارٰى كَذٰلِكَ، وَسَتَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً»[1] (أخرجه أبو داود والترمذي)

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: "قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: إِنَّ مَنْ قَبْلَكُمْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوْا عَلٰى اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِرْقَةً وَّإِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّسَبْعِيْنَ، ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ فِي النَّارِ، وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ"[2] (اخرجه ابو داود)

امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ فرقے ملت و دین سے خارج نہیں ہیں۔[3] اور بعض نے کہا ہے کہ ان سے مراد اہلِ بدعت اور اہلِ ہویٰ ہیں جو متفرق، یعنی فرقہ فرقہ ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے بعد ظاہر ہوئے، جیسے: خوارج، قدریہ، معتزلہ، رافضہ وغیرہم اور فرقہ واحدہ سے مراد فرقۂ سنت و جماعت ہیں، جنھوں نے قول و فعل میں رسول اللہ ﷺ کا اتباع اختیار کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی شخص کی تقلید نہیں کرتے۔

پھر اللہ نے ان میں سے اہلِ رحمت کو مستثنیٰ فرمایا ہے، یعنی ان لوگوں میں مختلفین نہیں ہیں جن پر رحم کیا گیا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس پر اللہ مہربان ہے وہ مختلف نہیں ہوا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مختلف اہلِ باطل ہیں اور مرحوم اہلِ حق۔[4] اللہ نے اہلِ حق کو دینِ حق کی توفیق اور ہدایت بخشی، اسی لیے انھوں نے اختلاف نہیں کیا، من جملہ مختلفین فی الحق یا دینِ اسلام میں سے جس پر اللہ نے رحم کیا اسی کو صحیح راہ سجھائی، یہی صواب، اللہ کا حکم ہے اور یہی حکم وہ حق ہے جس کے سوا کوئی حق نہیں ہے۔ یا جس کو اللہ نے رحمت دی ساتھ قناعت کے، لیکن آیت کی زیادہ صحیح تفسیر یہ ہے کہ مراد حق پر اجتماع ہے، تاکہ استثنا کے معنی واضح ہو جائیں اور ان میں کسی قسم کے تکلف کی حاجت نہ رہے۔

ذٰلِكَ کا اشارہ اختلاف اور رحمت دونوں کی طرف ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: "خَلَقَهُمْ لِلرَّحْمَةِ" یہی امام عکرمہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: "خَلَقَهُمْ فَرِيْقَيْنِ: فَرِيْقاً يُرْحَمُ فَلَا يَخْتَلِفُ، وَفَرِيْقاً لَّا يُرْحَمُ فَيَخْتَلِفُ" امام حسن اور عطاء رحمہما اللہ نے کہا ہے: "خَلَقَهُمْ لِلْاِخْتِلَافِ"[5] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ رحمت کو رحمت کے لیے اور اہلِ اختلاف کو اختلاف کے لیے پیدا کیا۔[6]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب "الرّد على المنطقيين" میں کہا ہے کہ قوم رسولوں اور کتبِ منزلہ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٨٣)
[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٤)
[3] معالم السنن للخطابي (٤/ ٢٩٥)
[4] تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٢)
[5] تفسير الطبري (١٥/ ٥٣٥۔ ٥٣٧)
[6] معاني القرآن للفراء (٢/ ١٨١) تفسير البغوي (٤/ ٢٠٧)

سے جتنی دور جا پڑتی ہے، ان کا اختلاف اور تفرق اتنا ہی بڑا ہو جاتا ہے اور وہ گمراہ تر ہو جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جماعت اور ائتلاف (آپس میں الفت کرنا) کا حکم دیا ہے اور فرقہ بندی اور اختلاف سے منع فرمایا ہے، جیسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾ [آل عمران: ۱۰۳] ''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ۱۵۹] ''بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ بازی کی، اور وہ گروہوں میں بٹ گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ﴾ [آل عمران: ۱۰۵] ''اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آ جانے کے بعد انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔''

اور یہ خبر دی کہ اہلِ رحمت مختلف نہیں ہوتے، جس طرح آیتِ باب میں فرما دیا ہے، لہٰذا جو لوگ رسول کے بڑے تابع ہیں وہ اختلاف میں اقل (بہت قلیل) ہیں، جیسے اہلِ حدیث و اصحابِ سنت کہ یہ تمام اسلامی گروہوں کی نسبت کم اختلاف رکھتے ہیں، پھر جو کوئی ان سے قریب تر ہے وہ اختلاف سے دور تر ہوتا ہے اور جو شخص سنت سے بعید تر ہے، جیسے: معتزلہ اور رافضہ وہ تمام گروہوں میں سب سے زیادہ اختلاف رکھتے ہیں۔ رہا فلسفیوں کا اختلاف سو کوئی شخص اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے ''کتاب المقالات'' میں غیر اسلامی فلسفیوں کے ان مقالات کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر فارابی، ابن سینا اور ان جیسوں نے بھی نہیں کیا۔ اسی طرح قاضی ابوبکر بن الطیب نے ''کتاب الدقائق'' میں فلسفیوں اور منجمین پر رد کیا ہے اور اس میں منطقِ متکلمینِ عرب کو منطقِ یونان پر ترجیح دی ہے۔ اسی طرح متکلمینِ شیعہ و معتزلہ وغیرہم نے فلسفیوں پر رد کیا ہے اور ان کے بہت سے مقالات ذکر کیے ہیں۔[1]

بالجملہ فلسفیوں کے بہت زیادہ گروہ ہیں اور طبیعات و الٰہیات میں بہت زیادہ اختلاف رکھتے ہیں، اس طرح ہیئت میں سب سے پہلے جس نے ان کی منطق کو اصولِ مسلمین میں شامل کیا، وہ ابو حامد غزالی رحمہ اللہ ہیں اور اہلِ علم نے اس پر بہت کلام کیا،[2] اور آخر عمر میں خود غزالی رحمہ اللہ نے ان علومِ شوم سے اعراض کیا، یہاں تک کہ ملا علی قاری کی تصریح کے مطابق جس وقت ان کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری کی کتاب ان کے سینے پر تھی۔ رحمه الله. کتاب ''تہافت الفلاسفہ'' جس میں امام غزالی رحمہ اللہ نے حکما کے مقالات کا اچھی طرح رد کیا ہے، ان کے اس رجوع پر شاہدِ عدل ہے۔ ولله الحمد.

بالجملہ فلسفیوں کے مختلف فرقوں کا افتراق اتنا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو شمار کر سکے۔ یہ اختلاف

---

[1] الرد علی المنطقیین (۱/ ۳۳۲۔ ۳۳٤) [2] فتح البیان (٦/ ۲۷۳۔ ۲۷٦)

اس اختلاف سے کہیں بڑھ کر ہے جو ایک ملت میں ہوتا ہے، جیسے یہود و نصاریٰ۔ یہ عظمت اختلاف کی اضعاف مضاعف ملتِ واحدہ ہے۔ الحاصل ہمیشہ صاحبِ نظر مسلمین فلاسفہ پر ان کی منطق وغیرہ کا رد کرتے رہتے ہیں اور ان کی خطاؤں کو ثابت کرتے ہیں ان کے جملہ مقالات میں۔ اس لیے کہ جس معاملے میں لوگ تنازع کریں، اس میں سوائے اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور نبیِ مرسل کے کوئی حکم دینے والا نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [البقرة: ۲۱۳] ”اور ان کے ساتھ اس نے برحق کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے آپس کی ضد سے کیا، جنھیں کتاب دی گئی تھی، حالاں کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ گئی تھیں، پھر جو ایمان لے آئے انھیں اللہ نے اپنے حکم سے اس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔“

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ۵۹] ”پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔“

آیتِ شریفہ سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ نے اہلِ باطل کو پیدا کیا اور ان کو مختلف بنایا اور اہلِ حق کو پیدا کیا اور ان کو متفق ٹھہرایا اور بعض پر حکم اختلاف کا دیا، ان کی بازگشت دوزخ کی طرف ہے اور بعض پر حکم رحمت کا کیا، ان کی بازگشت جنت کی طرف ہے، وہ اہلِ افتراق و اختلاف ہیں اور یہ اصحابِ اتفاق و ائتلاف۔ اس پر دلیل آیتِ باب کا تتمہ ہے کہ کلمہ تیرے رب کا تمام ہو گیا، یعنی جس طرح کہ ازلِ آزال میں مقدر کیا تھا، اسی طرح ثابت ہوا اور تغیر اور تبدیل سے محفوظ رہا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ کلمہ یہ تھا کہ ملائکہ سے کہا تھا کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا، یعنی ان دونوں قسم کی مخلوق میں سے جو کوئی نار کا مستحق ہو گا وہ نار میں جائے گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے آپ کو وہ (خبر) سناتے ہیں جس سے ہم آپ کا دل مضبوط رکھتے ہیں، اور اس (سورت) میں آپ کے پاس حق آ گیا اور مومنوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی بھی (120)

پیغمبروں کے واقعات کی حکمت... اطمنانِ خاطر:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے پیغمبروں کا حال اور ان کی امتوں کا حال اور جو کچھ ان کے درمیان حجت وتکرار اور بحث ہوئی تھی اور انبیا علیہم السلام نے جو تکالیف اٹھائی تھیں اور جس طرح ہم نے مومنوں کی نصرت کی اور کافروں کو ذلیل وخوار کیا، سب تجھ پر ظاہر کر دیا، یہ اس لیے کہ تیرا دل ٹھہرے اور تُو ان کی اقتدا کرے اور پریشان خاطر نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اور ایک جماعت نے کہا ہے کہ ﴿ هٰذِهِ ﴾ کا اشارہ اس سورت کی طرف ہے[1] اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا کی طرف ہے،[2] یعنی اس دنیا میں تیرے پاس پیغمبروں کے سچے قصے آئے اور نصیحت آئی جس سے کافر ڈریں اور مومنوں کو فائدہ ہو۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ یہ قصے بیان کرنا اس لیے ہے کہ تم کو زیادہ یقین ہو اور تمھارا دل مطمئن ہو جائے اور تمھارا نفس رسالت ادا کرنے پر ثابت قدم رہے اور تم کفار کی اذیت کا تحمل کرو، پہلی امتوں کے حالات پر ٹھہرنے (غور کرنے) کی وجہ سے کہ وہ لوگ گمراہی پر کس قدر جمے ہوئے تھے اور رسولوں نے ان کی طرف سے کیا کچھ تکلیف پائی اور مشقتیں اٹھائیں، کیونکہ دلائل کی کثرت دل کو ثابت تر کرتی ہے اور دلوں میں بہت مضبوط ہوتی ہے اور علم کو زیادہ پکا کرتی ہے۔

﴿ هٰذِهِ ﴾ سے مراد یہ سورت ہے یا دنیا، لیکن اس میں بُعد ہے، اس لیے کہ دنیا کا ذکر اس جگہ نہیں آیا۔ یا مراد یہ آیت ہے یا یہ معنے کہ ﴿ اَلْحَقُّ ﴾ سے مراد قطعی دلیلیں ہیں جو مبداء اور معاد کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔ یا مراد نبوت ہے، اگر پہلی بات مراد ہے تو اس سورت کی حق کے آنے کے ساتھ تخصیص ہے، حالانکہ اور سورتوں میں بھی حق آیا ہے، اس ارادہ سے کہ یہ سورت سچے بیان پر مشتمل ہے نہ اس لیے کہ حق صرف اس سورت میں موجود ہے نہ کہ کسی دوسری سورت میں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سورت دوسری سورتوں کی نسبت امتوں کی ہلاکت اور حالات زیادہ بیان کرتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ذکر کے ساتھ اس سورت کو مخصوص کرنا اس سورت کی عزت وشرف کو بڑھاتا ہے۔ جو شخص پہلے گزری ہوئی امتوں کے حالات کو یاد کرتا ہے، اس کے لیے یہ سورت نصیحت ہے اور جو کوئی ان قصوں میں غور وفکر کرتا ہے اس کی یہ سورت یادگار ہے۔ نصیحت حاصل کرنے کی تخصیص مومنوں کے ساتھ اس لیے ہے کہ یہی لوگ عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٤٠) [2] تفسیر الطبري (١٥/ ٥٤٢_ ٥٤٣) [3] فتح البیان (٦/ ٢٧٧_ ٢٧٨)

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿١٢١﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٢٢﴾

اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے جو ایمان نہیں لاتے: تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں (121) اور تم انتظار کرو، بے شک ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں (122)

نہ ماننے والوں کو دھمکی:

یہ ارشادِ الٰہی بطورِ تہدید کے ہے کہ تم اپنی راہ پر رہو، ہم اپنی راہ پر ہیں، جلد تم یہ بات جان لو گے کہ عاقبت کس کے لیے ہے، چنانچہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت فرمائی۔ وللہ الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ جو لوگ اس حق پر ایمان نہیں لاتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں اور نہ اس امر میں کچھ سوچتے ہیں ان سے کہہ دو کہ تم اپنے حال پر قائم و ثابت رہو، یعنی کفر کیے جاؤ، ہم اپنے حال پر یعنی ایمان پر قائم ہیں۔ اس کہنے میں کافروں کے لیے سخت وعید اور ڈانٹ ہے اور تم انجام کا انتظار کرو۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی شیطان کے وعدوں کی راہ دیکھو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں[1] کہ اللہ کی سزا اور عذاب کس پر نازل ہوتا ہے۔ اس ارشاد میں جو وعید اور ڈانٹ ہے وہ مخفی نہیں ہے۔[2]

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٣﴾

اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب، اور سب کام اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، چناں چہ آپ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں، اور آپ کا رب اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو (123)

علمِ غیب اور امر کا مرجع اللہ ہی ہے:

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ میں عالم الغیب ہوں، مجھ کو ہر غیب، خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں، معلوم ہے۔ لام اس جگہ تخصیص کے لیے ہے۔ معلوم ہوا کہ سوائے اللہ کے کوئی غیب دان نہیں۔ نبی مرسل ہو یا مقرب فرشتہ، پھر کسی پیر فقیر کی کیا ہستی ہے کہ وہ غیب دانی کا دعویٰ کرے۔ ہر امر کا مرجع اللہ کی طرف ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو حکم

---

(1) تفسير الطبري (١٥/ ٥٤٤) (2) فتح البيان (٦/ ٢٧٨)

دیا کہ تم خاص میری عبادت کرو اور مجھی پر تمھارا بھروسا ہو کیونکہ جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کو کافی ہوتا ہے۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا: تورات کا خاتمہ بھی خاتمۂ ہود ہے۔[1] (رواه ابن جرير بسنده)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ جو کچھ بندوں سے آسمان و زمین میں غائب اور مخفی ہے اس کا علم اللہ کو ہے۔ اس جگہ غیب کی تخصیص باوجود اس بات کے کہ اللہ کو ظاہر کا علم بھی ویسا ہی ہے جیسے کہ غیب کا، اس لیے کی ہے کہ یہ وہ علم ہے جس میں کوئی بھی اللہ کا شریک نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس غیب سے عذاب کا آسمان سے اترنا اور عقاب (سزا) کا زمین سے آنا ہے، لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں۔ ابو علی فارسی رحمہ اللہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ غیب کی اضافت مفعول کی طرف فراخی کے لیے کی ہے[2] اور ساری مخلوق کا کاروبار دنیا اور آخرت میں اللہ کی طرف لوٹنے والا ہے۔ وہ ہر کسی کو اس کے عمل کی جزا دے گا اور گناہ گار سے انتقام لے گا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کرے گا۔[3]

عبادت و توکل کا حکم:

پھر نبی اکرم ﷺ کو خطاب کیا کہ عبادت و توکل کرو۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ اور ساری خلق کو ہے، کیا مومن اور کیا کافر۔ پھر فرمایا کہ تیرا رب ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے، بلکہ خلق کے تمام اعمال اور حالات سے واقف ہے، ان کا علم رکھتا ہے، وہ ان کی جزا دے گا۔ خیر کی جزا خیر اور شر کی جزا شر۔ کعب نے کہا ہے کہ فاتحۂ تورات فاتحۂ انعام ہے اور خاتمۂ تورات خاتمۂ ہود ہے۔ (رواه عبدالله بن أحمد وأبو الشيخ) مراد خاتمہ ہود سے یہ آیتِ شریفہ ہے: ﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ... الآية﴾[4] (آیتِ باب)۔



[1] تفسير الطبري (١٥/ ٥٤٥) [2] فتح القدير (٢/ ٧٤٣)

[3] تفسير الطبري (١٥/ ٥٤٥) [4] الدر المنثور (٤/ ٤٩٣) فتح البيان (٦/ ٢٧٨ ـ ٢٧٩)



ہماری دیگر مطبوعات

سلسلۂ مطبوعات (47)

تذکرہ محدث العصر

علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ

تالیف

عبدالرشید عراقی

مجلد // صفحات: 312

سلسلۂ مطبوعات (48)

اضافہ شدہ جدید اڈیشن

استاذ المناظرین

مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ

تالیف

مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 360

سلسلۂ مطبوعات (49)

برصغیر میں

اہلحدیث کی اوّلیات

تالیف

مولانا محمد اسحاق بھٹی

مجلد // صفحات: 184

سلسلۂ مطبوعات (50)

قرآن مجید پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات کا مسکت اور مدلل جواب...

ایک نایاب دستاویز پہلی بار منظر عام پر

برهان التفاسیر

لإصلاح سلطان التفاسير

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری

مجلد // صفحات: 432

سلسلۂ مطبوعات (51)

ارمغان

مولانا محمد اسحاق بھٹی

حمید اللہ خان عزیز

مجلد // صفحات: 948

سلسلۂ مطبوعات (52)

اہلحدیث کا منہج

اور

احناف سے اختلاف کی حقیقت و نوعیت

تالیف

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

مجلد // صفحات: 288